تبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا

معارف القرآن



ترجمہ: حقیقت آگاہ معرفت پناہ عارف باللہ حضرت شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ اسرارہما

تفسیر: شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ

موضح فرقان معروف بہ

تفسیر عثمانی

ترجمہ: شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ

اول

تفسیر
شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ
۱۲۶۸ھ - ۱۳۳۹ھ
(سورۃ الفاتحہ تا سورۃ النساء)

تفسیر
حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
۱۳۰۵ھ - ۱۳۶۹ھ
(سورۃ المائدہ تا سورۃ الناس)

مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ

بسم اللہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ

نام کتاب ——— معارف القرآن وتفسیر عثمانی

جلد ——— اول

سن اشاعت ——— محرم الحرام ۱۴۳۹ھ مطابق اکتوبر 2017ء

کمپوزنگ ———

ناشر ——— مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ (رجسٹرڈ)

باہتمام ——— انیس احمد مظاہری

اسٹاکسٹ ——— مکتبۃ المظاہر، جامعہ احسان القرآن لاہور
0332-4377501

(کاوش) اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کا احسان عظیم ہے کہ ہم تشنگانِ علوم نبویہ کی خدمت میں تفسیر قرآن کی عظیم کتاب معارف القرآن وتفسیر عثمانی پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ شب وروز کی محنتِ شاقہ اس کے ظہور پذیر ہونے میں کارفرما رہی اس عظیم کام کو بحسن وخوبی سرانجام دینے میں ہیئۃ العلماء کے معزز اراکین نے حتی المقدور سعی کی۔ اس نسخے کی تیاری زرِ کثیر خرچ کر کے کروائی گئی ہے اور بار بار پروف ریڈنگ کروائی گئی تاکہ اغلاط کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہو، بہرکیف انسان خطا کا پتلا ہے اس کے ہاتھوں غلطی کا صدور ہر لحہ ممکن ہے، ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیں حسب سابق اصلاح کی طرف گامزن کرتے رہیں گے۔

(استدعا) اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم نے اپنی طاقت اور بساط کے مطابق کتاب کی تصحیح میں حتی الامکان محنت وکوشش کی ہے اس کے باوجود اگر طالبانِ حدیثِ رسول وقرآن کو کسی مقام پر کوئی قابلِ تصحیح عبارت نظر آئے تو وہ ہمیں ضرور اطلاع فرمائیں، ہم ان کے شکرگزار ہوں گے اور اس غلطی کی درستگی کریں گے۔ آپ کے اس علمی تعاون کی بدولت ہی ہم اشاعتِ دین کے ساتھ ساتھ حفاظتِ دین کا فریضہ سرانجام دینے کے قابل ہوں گے۔

مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ (رجسٹرڈ)

حرفِ آغاز

بسم اللہ الکریم والحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ''تفسیر معارف القرآن'' مؤلفہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ اشاعت نو اور بہت سی خصوصیات کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

عرصہ سے خواہش تھی کہ ''تفسیر معارف القرآن'' کو سہل الاستفادہ بنایا جائے، اس میں ہم کتنے کامیاب رہے، یہ فیصلہ اب قاری ہی کرے گا۔ چند اشاعتی خصوصیات جن کا اس میں خیال رکھا گیا:

① حاشیہ میں ''تفسیر عثمانی'' کا اضافہ، جس کی ترتیب یہ ہے کہ متن قرآنی کے تحت دو ترجمہ ہیں، پہلا ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا اور دوسرا حسب سابق شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ کا۔ چونکہ تفسیر معارف القرآن طویل ہونے کے باعث آگے کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اس لیے حتی المقدور کوشش یہ کی ہے کہ ہر صفحہ پر جتنا متن قرآن آیا ہے اتنی ہی تفسیر عثمانی اسی صفحہ پر مکمل کی جائے۔ نیز دونوں تفاسیر میں فرق رکھنے کے لیے فونٹ کا الگ استعمال کیا گیا ہے، اور تفسیر عثمانی کا خط حاشیہ کی مناسبت سے قدرے باریک رکھا گیا ہے۔

② دونوں ترجمے بین السطور رکھے ہیں۔

③ سابقہ اشاعتوں کو سامنے رکھتے ہوئے تصحیح کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے، جس میں ایک پروف ''پنجاب قرآن بورڈ'' کے رجسٹرڈ پروف ریڈر سے پڑھوایا گیا ہے۔

④ چیدہ چیدہ مقامات پر فارسی عنوانات کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔

⑤ اکابر علماء مفسرین خمسہ (حضرت شاہ عبدالقادر، حضرت شیخ الہند، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہم اللہ) کے مختصر احوال شامل اشاعت ہیں جب کہ سابقہ تمام اشاعتیں اول الذکر (اردو مترجم اول یعنی حضرت شاہ صاحب) کے احوال سے خالی ہیں۔

⑥ آٹھویں جلد کے آخر میں مضامین قرآن کے ''جامع اشاریہ'' کا اضافہ ہے جس سے قرآن پاک کے تمام مضامین ایک نگاہ میں آجاتے ہیں۔

⑦ صاحب تفسیر کے پوتے گرامی قدر جناب مولانا ڈاکٹر محمد سعد صدیقی کاندھلوی زیدت عنایتکم کی نگارشات اور اجازت نامہ شامل اشاعت ہے۔

⑧ ''تفسیر عثمانی'' کا اضافہ اس انداز سے کیا ہے کہ قیمت قاری کی قوتِ خرید سے زیادہ باہر نہ ہو۔

اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ اس کو قبول و مقبول فرمائے، اور باعث خیر و برکت، علم نافع کا ذریعہ اور نجات آخرت بنائے۔ تمام مسلمانوں اور احباب مکتبہ کے لیے ہر، ہر اعتبار سے دونوں جہانوں میں نفع بخش بنائے۔ آمین

انیس احمد مظاہری عفی عنہ

مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ

غزنی اسٹریٹ، اردو بازار لاہور

۱۴ ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ، 2 جنوری 2018ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کے دست مبارک کے لکھی ہوئی بسم اللہ کا عکس جب کہ موصوف محترم حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کی تعزیت کیلئے لاہور تشریف لائے اور ناچیز کو معارف القرآن کی تکمیل کیلئے فرمایا تو آیندہ مسودہ کی ابتداء اپنے قلم مبارک سے بسم اللہ لکھ کر فرمائی اس کیفیت کے ساتھ کہ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کے فراق پر آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ —————— محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ

فہرست مضامین

مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ

غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور

پیش لفظ

فوائد عثمانی، علامہ شبیر احمد عثمانی: (م 1369ھ / 1949ء)

پروفیسر ڈاکٹر محمد سعد صدیقی کاندھلوی حفظہ اللہ
استاذ الحدیث جامعہ اشرفیہ، ڈائریکٹر ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

برصغیر میں قرآن کریم کے تراجم کا آغاز اگرچہ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ سے قبل ہو گیا تھا لیکن شاہ صاحب کے ترجمہ کو جو شہرت حاصل ہوئی، کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی تھی۔ اس لیے شاہ صاحب کے ترجمہ کو برصغیر کا پہلا باقاعدہ ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب کا ترجمہ عوام و خواص میں بہت مقبول ہوا یہاں تک کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کا زمانہ (268۔1339ھ 1920-1851ء) آ گیا، شیخ الہند سے یہ درخواست کی گئی کہ شاہ صاحب کے ترجمہ میں مستعمل اردو کے بعض الفاظ اب متروک ہو چکے ہیں اور بعض مقامات پر اختصار بہت زیادہ ہے جو ترجمہ کا تقاضہ ہے لیکن علمی انحطاط کے دور میں لوگ اس کو سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں لہٰذا ایک جدید ترجمہ ہو جس میں متروک الفاظ کی جگہ زیر استعمال الفاظ بھی آ جائیں اور جہاں کہیں ضرورت ہو، اختصار کی وضاحت بھی ہو جائے، چنانچہ شیخ الہند نے شاہ صاحب کے ترجمہ کو بنیاد بنا کر ایک جدید ترجمہ مرتب کیا جو 1336ھ / 1912ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا ترجمہ کے بعد آپ نے اس پر حواشی کا اضافہ شروع کیا، ابھی سورۃ آل عمران مکمل کر پائے تھے کہ اس جہان فانی سے دار البقاء کی طرف رحلت فرما گئے، پھر اس تشنہ تکمیل کام کی تکمیل کا سہرا علامہ شبیر احمد عثمانی کے سر ہوا۔

علامہ عثمانی نے جدید ترجمہ کرنے کے بجائے اسی ترجمہ کو بنیاد بنا کر شاہ صاحب اور خود شیخ الہند کی طرز پر حاشیہ میں مختصر توضیحات کا اضافہ کیا۔

اسلوب: مولانا کا اسلوب یہ ہے کہ قابل وضاحت مقام کو لے کر حاشیہ میں قرآن کریم میں دوسرے کسی مقام پر اگر وہ مضمون ہے اس کے حوالہ سے یا احادیث، صحابہ کے آثار اور سلف کے اقوال کی روشنی میں وضاحت کرتے ہیں۔ علامہ عثمانی کا انداز بہت سادہ اور دلنشین ہے، اور بات کو مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے۔ مولانا نے بھی شاہ صاحب کی طرح مسائل فقہیہ کو واضح کیا ہے نہ ہی فقہی اختلافات کا ذکر کیا ہے صرف اس حد تک مسائل کو بیان کیا ہے جہاں تک توضیح آیت کے ضمن میں ضروری محسوس ہوا۔

مولانا کی یہ تفسیر 9 ذی الحجہ 1350ھ / 1931ء کو پایہ تکمیل تک پہنچی چودھویں صدی ہجری کے نصف اول کے اختتام پر مکمل ہونے والی اس تفسیر نے اردو تفسیری ادب میں عہد جدید کا باب کھولا ہے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اردو زبان اپنے ابتدائی تغیرات سے گزر کر ایک پختہ زبان کی شکل اختیار کر چکی تھی یہی وجہ ہے کہ مولانا کی اس تفسیر کے مطالعہ کے وقت یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس تفسیر کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے۔

معارف القرآن، مولینا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ :(م1394ھ/1974ء)

مولینا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کا تعلق ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایک مردم خیز قصبہ، کاندھلہ سے تھا۔ علمی اعتبار سے مولینا کو سہ جہتی فضیلت حاصل تھی، ایک جانب آپ کے خاندان میں علماء، محدثین اور مفسرین کی کثیر تعداد موجود تھی، دوسری جانب آپ کے وطن مالوف سے ایک کثیر تعداد علماء محدثین ومفسرین کی منسوب نظر آتی ہے۔ بقول احسان دانش۔

''کاندھلہ میں متعدد شاعر بھی تھے، جید مولوی بھی، انگریزی کے فارغ التحصیل بھی اور اصول وعقیدہ کے لحاظ سے انگریزی کو گناہ خیال کرنے والے صاحب نظر بھی، نیز پرانے فیشن کے وہ علماء بھی جن کی علیت کے باعث دنیا بھر کے دارالعلوم کاندھلہ کا نام عزت سے لیتے ہیں۔'' (دیکھئے احسان دانش، جہاں دانش: ۲۰۵)

مولینا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی پیدائش اگرچہ بھوپال میں ہوئی لیکن آپ کا، آپ کے آباؤ اجداد کا وطن مالوف کاندھلہ ہی تھا۔ 12ربیع الثانی 1317ھ/20اگست 1899ء کو مولینا نے اس دنیا میں آنکھ کھولی۔

تعلیم کا آغاز حفظ قرآن کریم سے ہوا، 9 برس کی عمر میں حفظ کی تکمیل کے بعد ابتدائی تعلیم مولینا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے مدرسہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں حاصل کی اور پھر پہلے مظاہر علوم سہارنپور میں، مفتی عزیز الرحمن، مولینا محمد احمد قاسی، سید محمد انور شاہ کاشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولینا ظفر احمد عثمانی جیسے اجلاء محدثین ومفسرین سے آپ نے کسب فیض کیا۔

مولانا کی زندگی ایک نظر میں

پیدائش	12ربیع الثانی 1317ھ/20اگست 1899ء بھوپال
حفظ قرآن کریم	1326ھ/1908ء کاندھلہ
سند فراغ	1336ھ 1918ء مظاہر علوم سہارن پور
تخصص فی الحدیث	1337ھ 1919ء دارالعلوم دیوبند

تدریسی زندگی

1338ھ تا 1339ھ 1921ء تا 1922ء مدرسہ امینیہ دہلی

1339ھ تا 1347ھ 1922ء تا 1929ء دارالعلوم دیوبند (دور اول)

1347ھ تا 1357ھ 1929ء تا 1939ء قیام حیدرآباد دکن

1357ھ تا1367ھ 1939ء تا1949ء　دار العلوم دیو بند شیخ التفسیر (دور ثانی)

1367ھ تا1369ھ 1949ء تا1951ء　جامعہ عباسیہ بہاول پور

1369ھ تا1394ھ 1951ء تا1974ء　جامعہ اشرفیہ شیخ التفسیر والحدیث

تصانیف کی تعداد تقریبا　100

انواع　تفسیر، حدیث، سیرۃ، عقائد، رد باطل، قوانین اسلامی

وفات　8رجب1394ھ 28جولائی1974ء لاہور

برصغیر کے ممتاز علماء سے استفادہ اور کثرت مطالعہ کی عادت کی وجہ سے مولینا ایک سہ جہت شخصیت کے مالک ہو گئے تھے کہیں آپ کے اندر علامہ شبیر احمد عثمانی کا محدثانہ رنگ نظر آتا ہے تو بخاری کی شروح تالیف کرتے ہیں، کبھی آپ کے اندر علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا متکلمانہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے تو آپ عقائد وکلام پر قلم اٹھاتے ہیں، تو کبھی مولینا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تربیت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو عارفانہ رنگ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

معارف القرآن چونکہ مولینا نے اپنی حیات مستعار کے انتہائی مراحل میں مرتب کی اسی وجہ سے مولینا کی نصف صدی کی خدمات تفسیر وحدیث کا جوھر اور نچوڑ معارف القرآن کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ معارف القرآن کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے مولینا نے ترجمہ قرآن اور پھر برصغیر کے تفسیری ادب پر مختصراً بحث کی ہے۔ ان مفسرین میں ایک جانب آپ نے نام لیکر جن مفسرین کا تذکرہ کیا، ان میں، مولینا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، مولینا عبدالحق دھلوی، علامہ شبیر احمد عثمانی کے نام شامل ہیں جبکہ دوسری طرف مولینا نے کچھ مفسرین کا تذکرہ نام لیئے بغیر کیا، آپ لکھتے ہیں۔

ان آزاد مفسروں کی ہمہ تن کوشش یہ ہوتی ہے کہ لفظ تو عربی ہوں اور معنیٰ مغربی یہاں اگرچہ مولینا نے کسی خاص تفسیر یا کسی مخصوص مولف کا نام تو نہیں لیا البتہ تعبیر والفاظ اور فحوائے کلام اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ مولینا کا اشارہ ان مفسرین کی جانب ہے جو سلف کے علوم سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں اور ان حدود وقیود کی پاسداری نہیں کرتے جو ایک مترجم اور مفسر کے لیئے ضروری ہیں۔ مولینا نے اپنی کتاب کی دو وجوہ تالیف بیان کی ہیں۔

① صحیح ترجمہ اور مختصر وجامع تفسیر کی منزل کے بعد ضرورت اس امر کی تھی کہ بیان القرآن کی طرز پر ایک ایسی مسبوط تفسیر لکھی جائے جو سلف صالحین کے مسلک سے ذرہ برابر بھی ہٹی ہوئی نہ ہو، عہد صحابہ وتابعین سے آج تک راسخین فی العلم نے قرآن کریم کی جو توضیحات بیان کی ہیں انھیں ایک امانت سمجھتے ہوئے، مسلمانوں تک پہنچا دیا جائے، اور اپنی رائے کو اس میں بالکل دخل نہ ہو۔

② مترجمین ومفسرین کے روپ میں آزاد منش گروہ جو فتنہ وفساد پھیلا رہا ہے، اس فتنہ سے مسلمانوں کو متنبہ اور محفوظ کیا جائے۔

مولینا نے اپنی تفسیر کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، ان کی روشنی میں بھی اور خود تفسیر کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے اور پورے شرح صدر کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مولینا کی یہ تفسیر متقدمین کے تفسیر ماثور کے انداز پر مرتب ہے، تمام

تر تفسیری اقوال صحابہ وتابعین اور سلف صالحین کے آثار پر مبنی ہے۔مولینا لکھتے ہیں:

''اس حقیر وفقیر کی یہ تفسیر گداگروں کی جھولی کی طرح ہے کہ جو قسم قسم کے کھانوں اور طرح طرح کے نوالوں سے لبریز ہے، اور فقیروں کی گدڑی کی طرح ہے جس میں ناظرین کو رنگ برنگ کے پیوند نظر آئیں گے اگر کوئی اس گدائے بے نوا سے پوچھے کہ تیرے پاس یہ قسم قسم کے کھانے اور رنگ برنگ کے اطلس وکمخواب کے ٹکڑے کہاں سے میسر آئے تو یہ ناچیز جواب میں یہ عرض کریگا کہ میں تو گدائے بے نوا ہوں، مگر بادشاہوں اور امیروں کے دروازوں پر بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہوں، وہاں سے بھیک میں جو کھانے مل جاتے ہیں، وہ لاکر دوستوں کے سامنے رکھدیتا ہوں، جس کو جو لقمہ اور نوالہ خوش ذائقہ معلوم ہو، اسے نوش جاں کرے، اور جو مرغوب طبع نظر آئے، وہ تناول کرے، یہی حال اس علم کے گدائے بے نوا کا ہے کہ اس تفسیر میں جو کچھ بھی علم ہے وہ سب کا سب مختلف خسروان علم وحکمت کے دروازوں سے ملی ہوئی بھیک ہے جو ایک دریوزہ میں جمع کردی گئی ہے۔اور اکثر وبیشتر ان دروازوں کے نام بھی بتادیئے ہیں جہاں سے یہ فقیر بھیک مانگ کر لایا ہے تاکہ جسے اور کچھ مانگنا اور لینا ہو تو وہ خود ان دروازوں تک پہنچ جائے''۔(دیکھئے معارف مقدمہ)

مولینا کے ان الفاظ پر غور کریں تو محسوس ہوگا، کہ ایک جانب تو مولینا نے اپنی تفسیر کو احادیث، آثار صحابہ اور اقوال سلف پر مشتمل بتایا تو دوسری جانب ان علماء، محدثین اور مفسرین کے سامنے کس قدر تواضع کا اظہار کیا۔ایک ایسا انسان جسے علوم دینیہ کے درس وتدریس اور اس میدان تصنیف وتالیف میں قدم رکھے چوالیس برس سے زائد گزر چکے ہیں۔نہ تو اپنے علم و مطالعہ کے بلند وبانگ دعوے کررہا ہے اور نہ ہی سلف کی کاوشوں کو بیجا تنقید کا نشانہ بنارہا ہے نہ یہ دعوٰی ہے کہ قرآن کریم کے مفاہیم ومطالب کو آج تک کسی نے سمجھا نہیں، نہ یہ الزام کہ برصغیر میں خصوصا اور دنیاء میں عموما تمام غیر صائب تفسیری اقوال معروف ہیں اور نہ یہ ادعا کہ مجھے سلف کی تفسیروں سے کوئی تسلی بخش مواد نہیں ملا۔واقعی ایک مفسر قرآن کو اسی قسم کی تواضع کا خوگر ہونا چاہیے کہ کلام الٰہی کو سمجھنے، اس کے مفہوم کو پانے اور پھر اسے سمجھانے کے لیے جہاں مختلف علوم میں مہارت ضروری ہے وہاں تقویٰ وطہارت نیک اعمال اور پاکیزہ خیالات کا ہونا بھی ضروری ہے یہی چیزیں دراصل معانی قرآن کی روح ہیں اور تواضع سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔

زمانہ تالیف: سلف صالحین کے مسلک ومشرب آثار صحابہ وتابعین اور قدوۃ المفسرین کے اقوال پر مشتمل اس تفسیر کی تالیف کا آغاز 1360ھ/ 1941ء میں ہوا، یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ایک جانب تو قرارداد پاکستان منظور ہورہی ہے، مسلمان ایک علیحدہ مملکت کے لیے بھرپور جدوجہد کررہے ہیں اور دوسری جانب ابوالکلام آزاد اپنی تفسیر میں قومی وحدت کا تصور اجاگر کرنے کی کوشش میں ہیں۔ان حالات کی وجہ سے آغاز میں مولانا تسلسل اور یکسوئی کے ساتھ اس تفسیر پر توجہ نہ دے سکے۔پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد مسلمانوں کی پاکستان ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور مولانا بھی پاکستان ہجرت کرآئے۔

1949ء/ 1369ھ میں ہندوستان سے ہجرت کرکے بہاول پور آئے اور جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز ہوئے۔1951ء/ 1371ھ کے اوائل میں آپ کو جامعہ اشرفیہ لاہور آنے کی دعوت دی گئی جو آپ نے

قبول کرلی اور 6 اگست 1371/1951ء کو آپ جامعہ اشرفیہ لاہور آ گئے۔

ملکی حالات اور سفری مشکلات کی وجہ سے تفسیر کی تالیف کا کام معرض التوا میں رہا اور 10 جمادی الاولی 1375ھ/1955ء یعنی پندرہ سال کے عرصہ میں مولانا صرف سورۃ فاتحہ وبقرہ کی تفسیر لکھ پائے۔

جب کہ اس کے بعد قیام لاہور کے دوران رمضان المبارک 1382ھ/1962ء تک یعنی سات سال دو ماہ کے عرصہ میں آپ سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء کی تفسیر کی تالیف سے فارغ ہوئے۔

14 رجب الحرام 1387ھ 1967ء کو دس پاروں کی تفسیر مکمل ہوئی۔

14 ذی الحجہ الحرام 1389ھ 1969ء کو نصف قرآن کریم کی تفسیر مکمل ہوئی۔

27 صفر 1394ھ/1974ء کو مولانا سورۃ صٰفٰت کی آخری آیات کی تفسیر سے فارغ ہوئے۔

اور اس کے بعد شدید علالت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ مولانا اس سے آگے تفسیر نہ لکھ سکے تا آنکہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس طرح معارف القرآن کی شکل میں موجود علمی ذخیرہ مولانا کی تقریباً 34 سال کی تحقیق ومحنت اور جانکاہی کا نتیجہ ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ معارف القرآن آپ کی ساری زندگی کے علمی مطالعہ اور تحقیقی ذوق کا نمونہ ہے۔ سورۃ ص تا ختم قرآن کریم تفسیر کی یہ تکمیل شیخ الحدیث مولینا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ کے حکم اور ان کے دست مبارک سے لکھی گئی بسم اللہ کے بعد والد محترم مولینا محمد مالک کاندھلوی کے دست مبارک سے اللہ نے مولینا مالک صاحب کو جو عظیم صلاحیتیں عطاء فرمائی تھی، اس کے نتیجہ میں نہ تو جامعہ اشرفیہ کے درس بخاری میں کوئی خلا اور وقفہ آیا اور نہ معارف القرآن کی تکمیل میں، مولینا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ کی شخصیت اس طرح دو آتشہ ہوئی کہ ایک جانب وہ مولینا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ جیسے محدث ومفسر کے شاگرد رشید، مولینا نے اپنے والد گرامی کے اسلوب نگارش اور انداز بیان کو اپنے والد گرامی کے رنگ میں برقرار رکھا اور آج کے قاری کے لیے یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ کہاں تک والد کے رشحات قلم ہیں اور کہاں سے بیٹے کے الفاظ کا آغاز ہوتا ہے۔

خصوصیات

مولانا نے وجہ تالیف میں ایک مخصوص قسم کی تفسیر کی ضرورت کا ذکر کیا جس کی درج ذیل خصوصیات ہونی چاہئیں۔

① مطالب قرآنیہ کی توضیح وتشریح کے ساتھ ربط آیات کا بیان

② قدرے احادیث صحیحہ، اقوال صحابہ وتابعین پر مشتمل

③ بقدر ضرورت لطائف ومعارف بھی شامل ہوں

④ مسائل مشکلہ کی صحیح تحقیقات پیش کی گئی ہوں

⑤ ملاحدہ اور زنادقہ کے شکوک وشبہات کی تردید کی گئی ہو اور ان کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہوں

⑥ سلف صالحین کے مسلک اور ان کے نظریات سے سرمو انحراف نہ ہو

⑦ اپنی رائے کو ذرہ برابر دخل نہ ہو۔

برصغیر کے تفسیری ادب میں مختصر تفاسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے فوائد عثمانی اور تفصیلی تفاسیر میں مولینا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی تفسیر معارف القرآن میں درج ذیل خصوصیات نمایاں طور پر مشترک نظر آتی ہیں:

1) دونوں تفاسیر سلف کے علوم کا نچوڑ اور جوہر ہیں۔

2) دونوں تفاسیر میں محدثانہ ومتکلمانہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

دونوں تفاسیر علیحدہ علیحدہ عرصہ سے شائع ہو رہی ہیں، مولینا انیس احمد مظاہری حفظہ اللہ مبارک باد کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے ان دونوں تفاسیر کو اپنے مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ سے یکجا شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے، دونوں تالیفات کا بیک وقت مطالعہ یقینا قاری کے لیئے زیادہ استفادہ کا باعث ہوگا اور وہ ان دونوں علمی پھولوں سے ان کی الگ الگ خوشبو اور علیحدہ علیحدہ رنگ وبو سے لطف اندوز ہوگا کہ

ہر گل را رنگ وبو دیگر است۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین

والسلام

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی ابن مولینا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ

۲۴ صفر المظفر ۱۴۳۹ھ

۱۴ نومبر 2017ء

شاہ عبدالقادر فاروقی دھلوی ﷫ کے حالات زندگی

مرتب: محمد احمد

مدرس جامعہ احسان القرآن والعلوم النبویہ، لاہور

تمہید: ...... حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ﷫ کے تیسرے فرزند ارجمند شاہ عبدالقادر دہلوی ﷫ اپنے مقبول و مستند ترجمہ قرآن کی بدولت جانے جاتے ہیں۔ اردو زبان میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے آپ ہیں۔ آج اس ترجمہ پر سوا دو صدیوں سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے، جس میں متعدد ترجمے ہوئے ہیں، مگر آپ کے ترجمہ کی اہمیت وافادیت پر کوئی اثر نہیں پڑا، بلکہ تمام مترجمین ومفسرین بجا طور پر آپ کے ترجمہ کو "ماخذ اول" کی حیثیت دیتے آئے ہیں۔

خداوند عالم نے اس خاندان کو حدیث، فقہ، کلام وتصوف کے علوم کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کا خصوصی علم عطا فرمایا تھا اور قرآن حکیم کی گہری بصیرت اور اس کی تعلیمات کی اشاعت اس خاندان کے حصہ میں آئی۔ آپ کے دادا حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب ﷫ بڑے مشہور مدرّسِ قرآن تھے، والد ماجد نے ۱۱۵۶ھ میں "فتح الرحمان" کے نام سے فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ مکمل کیا، جس کی حیثیت تمام اردو تراجم میں "استاد اور معلم" کی ہے۔ اسی نے آگے صاحبزادوں کو ترجمہ قرآن کی راہ بتائی اور عجمی زبانوں میں سے ہندی میں کلام الٰہی کو سمجھانے کا حوصلہ بخشا۔ پھر بڑے دونوں بھائیوں نے بھی قرآن مجید کی تحریری خدمت کی اور آپ نے سب سے پہلے اردو کا بامحاورہ ترجمہ کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ یہی تینوں ترجمے آگے چل کر دیگر مترجمین کے لئے سنگ بنیاد ثابت ہوئے۔

ارباب مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ نے حالات اور وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اچھا اقدام کیا کہ معارف القرآن (ادریسی، کاندھلوی) کی جدید طباعت میں تفسیر عثمانی کو بھی شامل کر دیا اور حضرت شاہ صاحب اور شیخ الہند دونوں بزرگوں کے ترجمہ لگا دیئے۔ ایسا کرنے میں گوناگوں پڑھنے والے، خریدنے والے اور سنبھالنے والے کو جگہ گھیرنے کے حوالے سے فائدہ ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الہند ﷫ کے ترجمہ کی بھی بنیاد حضرت شاہ عبدالقار صاحب ﷫ کا ترجمہ ہے، اس لئے انہوں نے ضروری خیال کیا کہ اس منفرد اور تجدیدی کام میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی شامل ہونے چاہیے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ان حضرات نے مجھ بندہ سے اس کا تذکرہ کیا تو بندہ نے بزرگوں کی سوانح کے مطالعہ کے بعد اس کے مرتب کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے ہوئے اس کام کا والد ماجد حضرت مولانا مفتی انیس احمد مظاہری (ادام اللہ ظلالہ بالعافیہ) کی خدمت میں تذکرہ کیا اور ان کی دعاؤں وسرپرستی میں اس کو ترتیب دینا شروع کر دیا۔ اب ان کی اصلاح اور مشورہ سے یہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔

تلاش اور ترتیب کے دوران اندازہ ہوا کہ شاہ صاحب کے حالات جہاں کہیں ملتے ہیں وہ صرف مختصر سے چند سطروں پر مشتمل ہوتے ہیں، جس سے مفصلاً پڑھنے والے کی تشنگی باقی رہ جاتی ہے اور مزید کی حسرت دل میں آتی ہے۔ چونکہ آپ کی عظیم شخصیت کو صرف قرآن کی خدمت نے زندہ جاوید رکھا ہوا ہے، اس وجہ سے آپ کے حالات ملنے بھی مشکل ہوئے اور آپ کی جلالت قدر اور عظیم خدمت انجام دینے کا تقاضا یہ ہے آپ کے حالات کو حتی المقدور بسط کے ساتھ یکجا کیا جائے، نیز آپ کے تذکرہ کے ساتھ ''موضح القرآن'' کا تعارف نہ کرانا آپ کے تذکرہ کو نامکمل چھوڑنے کے مترادف ہے۔ اس لئے یہاں قدرے تفصیل سے آپ کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

آپ کے حالات کو مرتب اور منضبط کرنے میں کئی کتابوں سے استفادہ کیا گیا، چنانچہ مذکورہ عنوان پر آپ کے ہر اہم لمحہ زندگی کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ مسلسل طوالت کا خوف آڑے آتا رہا، جس کے باعث آپ کی زندگی کے دور دور کے گوشوں کو فروگزاشت بھی کر دیا گیا لیکن ان کی طرف مراجعت کے لئے جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، ان کا تذکرہ آخر میں ''حوالہ جاتی کتب'' کے عنوان کے تحت کر دیا ہے، تاکہ کسی کو مزید کا شوق ستائے تو تلاش بسیار اس کے لیے تکلیف اور مشقت کا سبب نہ بنے، بلکہ اس تک رسائی آسان ہو۔ البتہ ان حالات کو مرتب کرنے اور ''موضح القرآن'' کے مطالعہ میں مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فصل ختم کی تصنیف ''مستند موضح القرآن اور محاسن موضح القرآن'' سے غیر معمولی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس تذکرہ نے بے حد اختصار کے باوجود مقالہ کی شکل اختیار کر لی ہے جس کا چنداں قصد وارادہ نہ تھا۔ رب العالمین سے دعا اور امید ہے کہ اس سے قارئین کو فائدہ ہوگا، شاہ صاحب کا فیض عام ہوگا اور یہ کاوش بندہ فقیر اور مستفیدین کیلئے دنیا وآخرت میں نفع مند ثابت ہوگا۔

نام ونسب:...... شاہ عبد القادر۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے باقیات صالحات چار صاحبزادوں (شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر اور شاہ عبد الغنی، رحمۃ اللہ علیہم) میں تیسرے نمبر پر تھے۔ آپ کو بھی اپنے والد ماجد سے وفات سے پہلے خلافت مل گئی تھی۔ آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ دوم امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، اس اعتبار سے آپ ''فاروقی النسب'' تھے اور ''عمری'' بھی کہلاتے تھے۔

ولادت:...... آپ کی ولادت شریفہ ''احمد شاہ'' کے عہد ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء دہلی، ہندوستان میں ہوئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے وقت آپ کے سب سے بڑے فرزند ارجمند اور جانشین حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی عمر ۱۷ سال تھی، باقی تینوں صاحبزادوں کی عمر میں تین تین، چار چار سال کا فرق تھا۔ اس حساب سے آپ کی عمر تقریباً ۹ یا ۱۰ سال تھی۔

تعلیم وتربیت:...... بچپن ہی میں والد کی وفات ہو گئی تھی، بڑے بھائی شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سایہ عاطفت میں تربیت پائی، پھر ان ہی سے جملہ علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کی۔ آخری درجہ کی کتابیں شاہ محمد عاشق پھلتی (اپنے ماموں اور والد بزرگوار کے صحبت یافتہ بزرگ) کے پاس پڑھیں، انہوں نے بڑے بھائیوں کی طرح شفقت کے ساتھ پڑھایا۔ تحصیل علوم کے بعد آپ نے مسجد اکبر آبادی میں تعلیم وتدریس اور روحانی تربیت کا سلسلہ شروع کیا اور آپ کے دوسرے بھائی اپنے خاندانی مدرسہ، مدرسہ رحیمیہ، کلاں محل میں تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مدرسہ کا تعارف آگے آرہا ہے۔

علم طریقت:...... آپ نے سلسلہ نقشبندیہ میں شیخ عبد العدل دہلوی رحمہ اللہ سے رشتہ سلوک قائم کیا اور طریقت کی تعلیم پائی۔ مشہور نقشبندی بزرگ حضرت شاہ فضل الرحمان گنج مراد آبادی کا قول ہے کہ ''شاہ ولی اللہ کے صاحبزادوں میں صرف شاہ عبد القادر، صاحب نسبت بزرگ تھے''۔ آپ سے مولانا عبد الحی بن ہبۃ اللہ بڑھانوی (شاہ عبد العزیز کے داماد)، مولانا شاہ محمد اسماعیل بن شاہ عبد الغنی دہلوی (آپ کے بھتیجے)، مولانا فضل حق بن فضل امام خیر آبادی، شاہ اسحاق بن شاہ افضل عمری دہلوی (نواسہ و جانشین شاہ عبد العزیز، مدفون مکہ مکرمہ)، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، اور بہت سے لوگوں نے کسب فیض اور استفادہ کیا۔

فضل وکمال:...... آپ بڑے شیخ امام، عالم کبیر، عارف باللہ، علوم الٰہیہ کے ممتاز علماء میں تھے، آپ کی ولایت وجلالت پر لوگوں کا عام اتفاق ہے۔ علم وعمل، زہد وتواضع اور حسن سلوک میں امتیاز کے مالک تھے اور جامع شریعت وطریقت تھے۔ ان فضائل کی وجہ سے اللہ پاک نے اپنے بندوں کے دلوں میں آپ کی محبت ڈال دی تھی اور آپ اپنے شہر دلی میں مرجع عام بن گئے۔ علم روایت ودرایت، اصلاح نفس اور روحانی تربیت میں آپکی طرف لوگوں نے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ شاہ صاحب کے ترجمے اور تفسیری فوائد کا دقت نظر اور شوق وانہماک سے مطالعہ کیا جائے تو لفظ لفظ سے ان کے علمی ادبی اور روحانی کمالات و بصائر مترشح ہو کر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ قرآن کے علوم، اسرار وحکم اور لطائف وعجائب پر ان کو علیٰ وجہ الکمال دسترس تھی۔

نکاح اور اولاد:...... شاہ صاحب نے شادی کی، لیکن اپنی زندگی کا اکثر حصہ عزلت میں گذارا ہے۔ کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی، صرف ایک اکلوتی بیٹی تھی جو منجھلے (درمیانے) بھائی شاہ رفیع الدین کے بیٹے سے منسوب تھیں۔ (یعنی اس کی شادی اپنے بھتیجے مولوی مصطفی سے کی) جس سے ایک بیٹی پیدا ہوئی، اس کی شادی شاہ اسماعیل شہیدؒ سے ہوئی۔ کل جائداد اور متاع دنیو یہ اپنی زندگی میں صاحبزادی اور دوسرے بھائیوں پر تقسیم فرما کر اکبرآبادی مسجد کی ایک سہ دری میں ساری زندگی بسر کر دی۔

طبیعت ومزاج:...... طبعاً خاموش مزاج اور گوشہ نشین تھے، مدۃ العمر خاموشی و یکسوئی کے ساتھ دہلی کے محلہ اکبرآبادی کی مسجد کے ایک حجرہ میں مقیم رہے، کبھی کبھی اعزہ واقارب سے ملاقات کے لئے گھر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ مگر زیادہ وقت مسجد ہی میں درس وافادہ میں مشغول رہ کر گذارتے۔ آپ انتہائی خلوت پسند تھے، سرسیدؒ نے ''آثار الصنادید'' میں لکھا ہے کہ ''آپ کو دلی والوں نے اسی وقت دیکھا جب آپ کا جنازہ مسجد سے قبرستان لے جایا رہا تھا''۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اور سر سید لکھتے ہیں: ''شاہ عبد القادر کے لیے دو وقت کا کھانا روزانہ شاہ عبد العزیز کے گھر سے ہی اکبری مسجد جاتا تھا۔ وہی اپنے اس متوکل (اللہ پر بھروسہ کرنے والا) بھائی کے سال بھر میں دو کپڑے کے جوڑے بنا دیا کرتے تھے''۔

کشف وکرامات:...... آپ کی دو کرامات کا تذکرہ ملتا ہے، جن سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے۔ آپ کی قوت کشفیہ بہت مضبوط تھی۔ جس سے آپ اندازہ لگالیا کرتے تھے کہ رمضان ۲۹ کا ہوگا یا ۳۰ کا؟ چنانچہ اس کا پتہ چلانے کے لئے ہمیشہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ رمضان کی پہلی تاریخ کو آدمی بھیج کر دریافت کرواتے کہ میاں عبد القادر نے آج کتنے پارے پڑھے ہیں؟ اگر آدمی آکر یہ کہتا کہ آج دو پڑھے ہیں تو شاہ صاحب فرماتے کہ عید کا چاند تو انتیس ہی کا ہوگا۔ اگر چہ اَبر وغیرہ کی وجہ سے چاند دکھائی نہ دے اور حجت شرعیہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم رویت کا حکم نہ لگا سکیں۔ (بحوالہ امیر الروایات، ص ۱۰۵)

دوسری کرامت یہ تھی کہ آپ اپنی کشفی قوت سے سنی اور شیعہ کے درمیان امتیاز کر لیتے تھے۔ اگر آپ کو سنی سلام کرتا تو آپ پورا جواب ''وعلیکم السلام'' اور اگر شیعہ کرتا تو صرف ''وعلیکم'' پر اکتفاء کرتے۔ لوگ آپ کی کشفی قوت کا تجربہ کرتے، لیکن کبھی بھول چوک اور غلطی نہ پاتے تھے۔

دہلی کے اصحاب ثلٰثہ:...... مختلف واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز باوجود بڑے ہونے کے، شاہ عبدالقادر کی ولایت کے کافی حد تک قائل تھے، چاروں بھائیوں میں باہمی تعلقات بہت گہرے، مخلصانہ اور محبت و مودت کے تھے۔ چنانچہ والد کے انتقال کے بعد جب شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ نے اپنے والد کے چھوڑے ہوئے کام کو سنبھالا تو والد صاحب کے مخصوص دینی و اصلاحی فکر ونظر سے خواص وعوام کو آگاہ کرنے کے لئے اصلاحی جد و جہد کو اپنے دونوں بھائیوں کے تعاون اور رفاقت سے جاری کیا اور شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ نے کام کی تقسیم اس طرح سے کی کہ عقلی مسائل کے لئے جس قدر تحقیق کی ضرورت ہوتی اسے شاہ رفیع الدین پورا فرماتے۔ کشفی مسائل، تزکیہ وتربیت شاہ عبدالقادر کے سپرد تھی اور منقولات کی تعلیم شاہ جی نے خود اپنے ذمہ لی۔ اور پھر یہ تینوں بھائی دہلی میں ''اصحاب ثلٰثہ'' کے لقب سے مشہور رہے۔

تصنیف: ترجمہ وتفسیر موضح القرآن:...... آپ پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عنایت یہ ہوئی تھی کہ آپ کو ہندوستانی زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر کی توفیق بخشی گئی۔ آپ نے ترجمہ لکھنے سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ آپ پر قرآن نازل ہوا ہے، آپ نے یہ خواب اپنے سب سے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز سے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے، مگر اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی آنے کا سلسلہ موقوف ہو گیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے قرآن کی ایسی بے مثال خدمت لے گا جو اس سے پہلے کسی نے بھی اس طرح کی خدمت نہ کی ہوگی۔ چنانچہ یہ بشارت ''موضح القرآن'' کی صورت میں پوری ہوئی۔

آپ کی صرف ایک ہی تصنیف ''موضح القرآن'' کے نام سے قرآن مجید کا اردو ترجمہ وتشریح یہ آپ کے لیے عظیم صدقہ جاریہ ہے اس کے علاوہ آپ کی کوئی تصنیفی خدمات نہیں ہیں، مگر اس کے باوجود آپ کی شخصیت کو صرف اسی ایک خدمت نے زندہ رکھا ہوا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پچھلی دو صدیوں کے ارباب نظر علماء ومفسرین نے اس کو خراج تحسین پیش کیا، اس کو ایک ''الہامی کارنامہ'' قرار دیا، اس کی بڑی قدردانی کی اور اسے معجزات نبوی میں سے ایک معجزہ ہونے کا ایوارڈ دیا ہے۔ ہر دور کے علماء نے موضح القرآن کو بھی مصدر وماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے، بعض علمی حلقوں میں اس کی تعلیم سبقاً وسنداً ابھی ہوتی رہی ہے۔

حقیقت میں قرآن کریم کا یہ واحد ترجمہ ہے جو اردو میں پہلا بامحاورہ ترجمہ ہونے کے ساتھ ساتھ قرآنی الفاظ کی ترتیب اور اس کے معانی ومفہوم سے حیرت انگیز طور پر قریب اور مطابق اصل ہے۔ قرآن کے مفاہیم ومطالب کی ادائیگی میں یہ ترجمہ کسی بھی مقام پر قاصر نظر نہیں آتا اور نہ کہیں قرآن کے حقیقی مدلول سے زائد کوئی لفظ اس میں لایا گیا ہے۔ شاہ صاحب نے اس ترجمہ کی تکمیل میں تقریباً چالیس سال محنت شاقہ اٹھائی ہے۔ مسجد میں معتکف رہ کر ۱۲ سال کے عرصہ میں جہد مسلسل سے گذر کر ۱۲۰۵ھ میں اپنا ترجمہ مکمل کیا۔ ترجمہ کے ساتھ شاہ صاحب نے جابجا تفسیری فوائد کا بھی اضافہ فرمایا ہے۔ ان تفسیری فوائد یا حواشی میں شاہ صاحب کی انفرادی شان کی ایک نمایاں جھلک نظر آتی ہے، جہاں چند ہی لفظوں میں آپ نے وہ

کمال کر دکھلایا ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ چنانچہ آپ کا یہ ترجمہ آئندہ ترجموں کے لئے سند کی حیثیت اختیار کر گیا۔ پھر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اسی ترجمہ کی روشنی میں ۱۳۴۶ھ میں ترجمہ کیا، جو خود اردو تراجم کا ایک شاہکار ہے، کلامی اور فقہی اعتبار سے بے مثل ہے۔ اس عرصہ کے دوران اور اس کے بعد بھی بہت سے ترجمہ ہو کر چھپتے رہے ہیں۔ مگر جو مقبولیت ان دو کو ملی ہے وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔

آپ کی اور آپ کے خاندان کی شان یہ ہے کہ آپ نے بامحاورہ ترجمہ اور اس کے ساتھ تشریح بھی کی، جبکہ آپ سے بڑے بھائی شاہ رفیع الدین نے لفظی ترجمہ کیا، سب سے بڑے بھائی نے قرآن مجید کی تفسیر فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام ''تفسیر عزیزی'' ہے۔ (یہ شروع کے دو پاروں اور آخر کے دو پاروں پر مشتمل ہے) اور آپ کے والد حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنے تجدیدی اور اصلاحی مشن کا آغاز فارسی زبان (جو اس وقت کی عوامی اور دفتری زبان تھی) میں قرآن کریم کے ترجمہ سے کیا جس کا نام ''فتح الرحمان'' ہے۔ اور آپ کے جد امجد درس قرآن دیا کرتے تھے۔ مولانا ڈپٹی نذیر احمد فرماتے ہیں:

''جب ایک خاندان کے ایک چھوڑ تین تین ترجمے لوگوں کو مل گئے ایک فارسی، شاہ ولی اللہ صاحب کا، اکٹھے دو دو اردو میں، ایک شاہ عبدالقادر کا، دوسرا شاہ رفیع الدین صاحب کا تو اب ہر ایک کو ترجمہ کا حوصلہ ہو گیا۔ مگر خاندان شاہ ولی اللہ کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور وہ ہرگز مترجم ہو بھی نہیں سکتا، بلکہ وہ شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کا مترجم ہے۔ انہی ترجموں میں اس نے ردوبدل، تقدیم وتاخیر کر کے جدید ترجمہ کا نام کر دیا ہے۔

ترتیب کے اعتبار سے شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب کے بعد ہے، کیونکہ شاہ رفیع الدین کا تحت اللفظ ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب کے اردو بامحاورہ ترجمہ کے چند سال بعد مکمل ہوا۔ اگرچہ عمر کے لحاظ سے شاہ رفیع الدین بڑے ہیں۔

موضح القرآن کی چند نمایاں خصوصیات

۱۔ یہ اردو کا پہلا بامحاورہ ترجمہ ہے، جو ۱۷۹۰ء میں لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ''ام التراجم'' اور اس کے فوائد ''ام التفاسیر'' ہیں۔

۲۔ اپنی غیر معمولی خصوصیات کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں میں ''الہامی ترجمہ'' کے نام سے مشہور رہا ہے۔

۳۔ حضرت شیخ الہند کا قول ہے: ''یہ ترجمہ جیسے محاورات کے استعمال میں بے نظیر سمجھا جاتا ہے، ایسے ہی قلتِ تغیر اور خفتِ تبدل میں بھی بے مثل ہے''۔

۴۔ ترجمہ کے ساتھ شاہ صاحب نے مختصر حواشی بھی تحریر فرمائے ہیں، جو اپنی مثال آپ ہیں۔

۵۔ یہ ترجمہ لاتعداد مرتبہ مستقل طور پر بھی طبع ہوا اور بعد کے زمانہ میں متعدد خدام القرآن مفسرین نے اپنی تفسیروں پر اسی ترجمہ کا انتخاب کیا۔

۶۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''شاہ صاحب نے اس میں زبان کے مقابلہ میں ایسی زبان اختیار کی ہے، جس میں عموم وخصوص اور اطلاق و

تقیید اور محل استعمال کا پورا لحاظ ہے، یہ آپ پر اللہ کی ایسی عنایت ہے جس کے لئے وہ چند ہی لوگوں کو مخصوص کرتا ہے۔ مختلف مثالوں سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب کو عربی زبان و ادب کا جیسا صحیح ذوق اور قرآنی الفاظ کی روح، طاقت اور انشاء کے مطابق اردو کے الفاظ کے انتخاب میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کی نظیر کم سے کم ہندوستان میں نہیں ہے۔ بعض مقامات پر وہ علامہ زمخشری و راغب اصفہانی جیسے علمائے بلاغت اور ائمہ لغت سے بھی بڑھ جاتے ہیں، تائید الٰہی، اعلیٰ درجہ کا اخلاص اور وہبی، ادبی اور لسانی صحیح ذوق کے سوا کسی چیز سے اس کی توجیہ نہیں کی جا سکتی"۔

۷۔ آپ کے ترجمہ میں ایک کمال اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ جس زمانہ میں آپ ترجمہ فرما رہے تھے اس دور میں اردو زبان ابتدائی منزل سے گذر رہی تھی اور بالکل طفولیت کی حالت میں تھی۔ اس کا دامن ابھی الفاظ و تراکیب کی وسعت سے خالی تھا، مگر آپ نے جو با محاورہ ترجمہ کیا ہے اس کو آپ کی مذہبی صلاحیت اور ذہانت و فراست کا کمال ہی کہا جا سکتا ہے۔ ایسا کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو زبان کے ڈھالنے والے ہوتے ہیں۔

شاہ صاحب کے تفسیری فوائد کی خصوصیت

۱۔ فقہی مسائل کی تشریح میں شاہ صاحب اپنے حنفی فقہی مسلک کی پابندی فرماتے ہیں، لیکن عقائد و کلام کے مسائل میں آپ کی اجتہادی شان نظر آتی، جو تفسیر کی بڑی بڑی کتابوں میں نظر نہیں آتی۔

۲۔ آپ کی روحانیت کا اثر ہے کہ بڑی بڑی طویل عبارتوں کو نہایت سیدھے سادھے چند موثر جملوں میں پڑھنے والے کے دل و دماغ میں اتار دیتے ہیں اور قاری اس سے مطمئن ہو جاتا ہے، جن باتوں کو بڑے بڑے صاحب طرز ادیب مفسر بڑی بڑی طویل تشریحی عبارتوں سے قارئین کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ شاہ صاحب کے فوائد نہایت بلیغ انداز میں ہیں۔ ہر اہم مسئلہ کی تشریح ملتی ہے جو کہ بڑی بڑی طویل تفسیروں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

اسلوبِ ترجمہ موضح القرآن

۱۔ شاہ صاحب کا اسلوب یہ بتاتا ہے کہ آپ نے اپنے اردو ترجمہ میں ہندی اور سنسکرت کے خاص خاص الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جب کہ اس دور کی اردو نظم و نثر کے نمونے یہ بتاتے ہیں کہ ہندی الفاظ کا استعمال اس وقت اتنا عام نہیں تھا، صرف ہندو طبقہ میں ان لفظوں کا رواج تھا، لیکن شاہ صاحب نے کہیں کہیں چھانٹ چھانٹ کر، مشکل ہندی الفاظ کے ذریعہ قرآن کا مفہوم بیان کیا ہے، عام ترجمہ ہلکی پھلکی ہندی زبان میں کرتے ہوئے عام فہم محاورے لائے ہیں، اور کسی جگہ آپ اس کے برعکس کافی آسان ترجمہ کرتے ہوئے درمیان میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ مثلاً پینٹھ، گہہ، گھو، گہاسنکارے، چکوتی اور پوجے وغیرہ داخل دیتے ہیں۔ بظاہر اس اسلوب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مقصد غیر مسلم قوموں کو قرآن کے پیغام سے قریب کرنا ہے۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں لکھا:

''کسی غیر مسلم قوم پر دین حق کی تبلیغ اتمام حجت کی حد تک کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کی زبان میں اسلامی اصول پیش کیے جائیں؛ تا کہ وہ سمجھیں۔ اگر اس درجہ ابلاغ دین نہ ہوگا تو وہ قوم اصحاب الاعراف کی حیثیت میں ہوگی''۔ (جلد اول، باب طبقات الامۃ)

اس مقصد تبلیغ کی بناء پر شاہ صاحب نے ترجمہ میں کہیں ٹھیٹھ ہندی اور کسی جگہ سنسکرت کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

۲۔ بامحاورہ ترجمہ کے باوجود قرآن کریم کی اصلی ترتیب کو کمال کے ساتھ باقی رکھا ہے۔

۳۔ آپ ایجاز واختصار کا بے حد لحاظ رکھتے ہوئے ترجمہ کو متن کے الفاظ سے زیادہ بڑھنے نہیں دیتے، کہیں لغوی ترجمہ کرتے ہیں اور کہیں اسی لفظ کے مرادی معنیٰ ظاہر کرتے ہیں۔

۴۔ بڑے بڑے تفسیری مسائل، الفاظ ترجمہ میں سمو دیتے ہیں، ایک ہی لفظ کے اندر بڑی بڑی تشریحات کا شاہکار نظر آتا ہے۔

۵۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے اسرائیلی روایات سے اجتناب نہیں کیا۔ یہ بات صحیح ہے، مگر اس کا سبب بھی ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کو ایک مختصر حاشیہ لکھنا تھا، اس لئے مشہور واقعات کو تحقیق کے بغیر نقل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ (شاہ صاحب کے اسلوب سے مزید واقفیت حاصل کرنے کے لئے ملاحظہ فرمائیے، مقدمہ ترجمہ شیخ الہند اور محاسن موضح القرآن)

وفات اور تدفین:...... آپ کی وفات اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۴ء میں بروز بدھ دہلی میں ہوئی۔ والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر رسول اللہ ﷺ کی عمر شریف کے مطابق ۶۳ سال تھی۔ اس نسبت سے آپ نے مسنون عمر پائی، عمر کی یہ مساوات حضور کی ذات مبارکہ سے گہرے تعلق کی دلیل ہے۔ انتقال کے وقت دونوں بڑے بھائی حیات تھے، اس لئے قدرتی طور پر انہیں بہت صدمہ ہوا، وہ دونوں حضرات ان کے دفن کے وقت یہ کہہ رہے تھے: ''ہم ایک انسان کو نہیں، بلکہ سراپائے علم وعرفان کو دفن کر رہے ہیں''۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں:

''یہ عجائبات زمانہ میں سے ہے کہ ہم چاروں بھائیوں کی وفات میں عکسی (الٹی) ترتیب ہے۔ سب سے پہلے سب سے چھوٹے بھائی عبدالغنی کی وفات ہوئی، اس کے بعد عبدالقادر کی، تیسرے نمبر شاہ رفیع الدین کی ہوئی اور اب میری باری ہے''۔

شاہ صاحب کی سکونت گاہ اکبر آبادی مسجد کا تعارف:...... آپ کا خاندانی مدرسہ اس وقت کے ''کوچہ فولاد خاں'' میں قائم تھا جو کلاں محل دہلی کے قریب ہے۔ اس مدرسہ کا نام ''مدرسہ رحیمیہ'' تھا، جسے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنی حیات میں چھوڑ دیا تھا۔ پھر اسی جگہ کا نام ''مدرسہ شاہ عبدالعزیز'' پڑا، جس میں عرصہ دراز تک شاہ صاحب کی اولاد اور آپ کے شاگردوں نے تعلیم وارشاد کا سلسلہ جاری رکھا۔

لیکن شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے لئے مسجد اکبر آبادی کو منتخب فرمایا اور یہیں تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ نہایت شاندار اور خوبصورت مسجد شاہجہاں بادشاہ کی بیگم اعز النساء عرف اکبر آبادی نے ۱۰۶۰ھ میں بنوائی تھی۔ بیگم کا خطاب

اکبر آبادی محل تھا۔ اسی وجہ سے مسجد ''اکبر آبادی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اس مسجد کے تین گنبد اور سات در ہیں، مسجد کی عمارت ۶۳ گز طول میں اور سترہ گز عرض میں ہے۔ اس میں ایک حوض ۱۲ * ۱۲ گز کا ہے جس میں نہر کا پانی آکر گرتا ہے، اس کے اردگرد حجرے ہیں۔ مسجد کے دو بلند مینار ہیں، ایک شمالی مینار بجلی کے صدمے سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس مسجد کے اندر ایک عظیم الشان مدرسہ تھا۔

موضح القرآن اور موضح الفرقان میں فرق:......معارف القرآن ادریسی، کاندھلوی میں حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ والا لگایا تھا، اور اب مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ اس کو قارئین کی سہولت کے خاطر جدید انداز میں ترجمہ شاہ عبدالقادر اور ترجمہ حضرت شیخ الہند کے ساتھ شائع کر رہا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے فرق اور اسلوب کو بھی واضح کر دیا جائے، تاکہ قارئین اور استفادہ کرنے والوں کو کسی قسم کا خلجان نہ ہو۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ نے سب سے پہلے موضح قرآن کی علمی اور ادبی جلالت شان ،حکمت قرآن کے پوشیدہ اشارات اور تفسیری لطائف پر اصول تفسیر کی روشنی میں تبصرہ فرمایا۔ اس کو آسان اور سہل کیا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ۱۳۳۶ھ میں موضح الفرقان کے نام سے قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ اس میں آپ نے جدید ترجمہ کرنے کے بجائے صرف موضح القرآن کی زبان میں معمولی تبدیلی کرنے پر اکتفا فرمایا۔ اس کے شروع میں گرانقدر تحقیقی مقدمہ تحریر فرمایا۔ اس میں حضرت وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں: ''موضح الفرقان شاہ صاحب کے ترجمہ میں اصلاح نہیں ہے، بلکہ تیسیر وتسہیل ہے''۔ بلاشبہ شاہ صاحب کا ترجمہ قدیم اسلوب کے لحاظ سے اعلیٰ اردو کا بہترین نمونہ ہے اور اس کا مقصد غیر مسلم ہندوستانیوں کو تبلیغ دین تھا۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ شاہ صاحب کے ترجمہ اور فوائد میں جو تفسیری نکات اور لطائف پوشیدہ ہیں، علماء ان سے بڑے غور وفکر کے بعد ہی واقفیت حاصل کر پاتے تھے، تو جب علماء کا یہ حال ہو گیا تھا تو عام لوگوں سے اس کو سمجھنے کی توقع کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ اس لئے حضرت شیخ الہند نے شاہ صاحب کے ترجمہ کا نہایت عمیق مطالعہ فرمایا اور اس کو اپنے زمانہ کے لحاظ سے آسان اور عام فہم کر کے لکھا۔ خلاصہ یہ کہ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ کی بنیاد موضح القرآن ہے اور اس کی تسہیل ہے۔ نیز حضرت شیخ الہند نے شاہ صاحب کے ترجمہ سے استفادہ کیا لیکن اس کا اسلوب استعمال نہیں فرمایا۔ اور شیخ الہند رحمہ اللہ نے اپنا ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر صاحب ہی کے ترجمہ اور فوائد کی تسہیل وتیسیر کی غرض سے مرتب کیا تھا۔ جس کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ مملکت سعودیہ عربیہ نے اس کے لاکھوں نسخے چھاپ کر مفت تقسیم کئے۔ پھر شیخ الہند کے شاگرد حضرت مولانا شبیر عثمانی رحمہ اللہ نے اپنے تفسیری حواشی میں موضح القرآن ہی کو اسوہ ورہنما بنایا ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے فوائد کا تعارف:......تفسیر عثمانی میں سورہ بقرہ کے اختتام تک حضرت شیخ الہند کے تفسیری فوائد ہیں، جن کو آپ مکمل نہیں کر سکے تھے۔ اس سے آگے اختتام تک مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کے تحریر کئے ہوئے تفسیری فوائد ہیں۔ حضرت نے شاہ صاحب کے ترجمہ کی بہت سی مشکلات کو واضح کیا ہے اور بعض مشکل الفاظ کی تشریح جگہ جگہ حاشیہ پر کی ہے۔ مولانا عثمانی رحمہ اللہ نے اکثر جگہ حضرت شاہ صاحب کے فوائد کو اپنی عبارت میں نقل کیا ہے اور

ان کی تشریح بڑے دل نشین انداز میں فرمائی ہے۔ البتہ جہاں موضح القرآن کا حوالہ دیا ہے وہاں قاری کو آسانی ہو جاتی کہ وہ شاہ صاحب کے پورے فائدہ سے استفادہ کر لے اور اکثر حوالہ دیئے بغیر شاہ صاحب کی عبارت کو اپنی عبارت میں ضم کر کے بیان کر دیتے ہیں وہاں پتہ نہیں چلتا کہ یہ حکیمانہ تفسیر شاہ صاحب سے لی گئی ہے یا دوسرے کسی بزرگ سے منقول ہے۔ لیکن بہر حال آپ نے شاہ صاحب کے تفسیری فوائد کی تسہیل ضرور فرما دی ہے۔ فجزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین۔

ترجمہ قرآن پڑھنے کے فوائد:...... حضرت امام شاہ ولی اللہ ﷫ نے پورے وثوق کیساتھ لکھا ہے کہ قرآن کریم کے ترجمہ کی برکات یہ ہیں:

۱۔ اس کے پڑھنے سے بچوں اور بچیوں اور کم علم لوگوں میں فطری سلامتی قائم رہتی ہے اور خدا تعالیٰ نے پیدائشی طور پر ہر انسان کو جو فطرت سلیمہ عطا فرمائی ہے وہ ماحول کے برے اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔

۲۔ اگر ماحول کے برے اثرات مسلمانوں کو گناہوں کی طرف کھینچ بھی لیں تو پھر بھی ترجمہ کی برکت سے مسلمان کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے۔

اللہ کریم اس سعی کو بندہ واس کے والدین کریمین، اساتذہ ومشائخ اور اصول فروع کے حق میں قبول فرما کر خدام قرآن کی نسبت عطاء کر دیں۔

محمد احمد عفی عنہ

۱۹/ذوالحجہ ۱۴۳۸ھ/ ۲۰۱۷ء/ ۱۰/ستمبر (شب پیر)

ماخذ اور حوالہ جاتی کتب

۱۔ مستند موضح القرآن (مختصر تذکرہ شاہ عبدالقادر صاحب)، مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحبؒ

۲۔ مقدمہ مستند موضح القرآن، مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحبؒ

۳۔ مقدمہ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی

۴۔ تاریخ دعوت وعزیمت مولانا ابوالحسن علی ندوی (ج ۵ ص ۳۸۷)

۵۔ تذکرہ مفسرین ہند، ج ۱، محمد عارف اعظمی عمری۔ دار المصنفین، شبلی اکیڈمی

۶۔ تمہید معارف القرآن، عثمانی (۱/ ۶۸)

۷۔ تفسیر عثمانی کے ترکیبی عناصر، ولی رازی

۸۔ تذکرۂ شاہ ولی اللہ، مولانا سید مناظر احسن گیلانی (ص ۲۰۲)

۹۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، مولانا محمد رحیم بخش

۱۰۔ محاسن موضح القرآن، مولانا اخلاق حسین قاسمی

۱۱۔ نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحی لکھنوی

۱۲۔ آثار الصنادید، سید احمد خان

۱۳۔ ابجد العلوم، نواب صدیق حسن خان قنوجی

۱۴۔ آثار التنزیل، علامہ خالد محمود (۱/ ۲۸۴)

۱۵۔ حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ

مقدمہ
حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

خدا در انتظارِ حمد مانیست — محمد چشم بر راہِ ثنا نیست
خدا مدح آفریں مصطفیٰ بس — محمد حامدِ حمد خدا بس
منا جاتے اگر باید بیاں کرد — بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد
محمد از تو میخواہم خدارا — خدایا از تو عشقِ مصطفیٰ را
دگرلب وامکن مظہر فضولیست — سخن از حاجت افزوں تر فضولیست

امابعد، **بندۂ آثم و عاجز محمود ابن مولوی ذوالفقار علی** دیوبند ضلع سہارنپور کا رہنے والا (غفر اللہ تعالیٰ لہ ولوالدیہ) عرض کرتا ہے کہ بعض احباب اور مکرمین نے بندہ سے درخواست کی کہ قرآن شریف کا ترجمہ سلیس مطلب خیز اردو زبان میں مناسب حال اہل زمانہ کیا جائے جس سے دیکھنے والوں کو فائدہ پہنچے اور وہ نقصان اور خلل اور لفظی ومعنوی اغلاط جو بعض آزادی پسند صاحبوں کے ترجمہ سے لوگوں میں پھیل رہی ہیں ان سے بچاؤ کی صورت نکل آئے۔ اس عاجز نے اس درخواست کے جواب میں اپنی بے بضاعتی کے علاوہ یہ عرض کیا کہ اول تو مقدسین اکابر کے فارسی اردو کے متعدد تراجم موجود ہیں۔ اس کے علاوہ علمائے متدینین زمانۂ حال کے متعدد تراجم یکے بعد دیگرے بحمد اللہ شائع ہو چکے ہیں، جو لوگوں کو مذکورہ بالاخرابیوں سے بچانے کے لئے کافی ووافی وشافی ہیں۔ چنانچہ بندہ کے احباب میں بھی اول مولوی عاشق الٰہی صاحب سلمہ، ساکن میرٹھ نے ترجمہ کیا اس کے بعد مولانا اشرف علی صاحب سلمہ اللہ نے ترجمہ کیا احقر نے دونوں ترجموں کو تفصیل سے دیکھا ہے، جو ان خرابیوں سے پاک وصاف ہیں اور عمدہ ترجمے ہیں۔ پھر اب کسی جدید اردو ترجمہ کی کیا حاجت ہے، بجز اس کے کہ اسمائے مترجمین میں ایک نام اور زیادہ ہو جائے اور کوئی نفع نہیں معلوم ہوتا۔ مگر مکرمین احباب نے اس پر بھی بس نہ کی اور اسی اصرار پر قائم رہے تو مجبور ہو کر مجھ کو یہ عرض کرنا پڑا کہ اس وقت تک میرے خیال میں کوئی ایسا نفع نہیں آیا کہ جس کی وجہ سے جدید ترجمہ کی جرات اور ہمت کروں۔ اب آپ کے اصرار پر احقر تراجم قدیمہ اور جدیدہ کو بنام خدا غور سے دیکھتا ہے اس کے بعد اگر کوئی نفع سمجھ میں آیا تو اس کے موافق آپ صاحبوں کے فرمانے کی تعمیل کا ارادہ کروں گا ورنہ معذور ہوں۔ اس کے بعد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ اور مولانا شاہ رفیع الدین اور مولانا شاہ عبدالقادر (قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم) کے تراجم کو جو غور سے دیکھا تو یہ امر تو بے تامل معلوم ہو گیا کہ اگر یہ مقدسین اکابر قرآن شریف کی اس ضروری خدمت کو انجام نہ دے جاتے تو اس شدت ضرورت کے وقت میں ترجمہ کرنا بہت دشوار ہوتا۔ علماء کو صحیح اور معتبر ترجمہ کرنے کے لئے متعدد تفاسیر کا مطالعہ کرنا پڑتا

اور بہت ہی فکر کرنا ہوتا اور ان دقتوں کے بعد بھی شاید ایسا ترجمہ نہ کر سکتے جیسا اب کر سکتے ہیں۔ پھر بھی کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہوتا تو ہوتا کہ کمال عمل و تدین کے ساتھ اس مشقت کو گوارا کر کے اس خدمت کو کما ینبغی انجام دینے کے لئے موفق ہوتا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کو دیکھئے کہ اس بے نظیر علمی و عملی کمالات پر جو انہوں نے اپنے اوپر حق سبحانہ تعالیٰ کے انعامات، متعدد رسالوں میں بیان فرمائے ہیں ان انعامات عظیمہ میں یہ ترجمہ مسمی بہ ''فتح الرحمٰن'' بھی داخل ہے اور عاجز نے اپنے بعض مرحوم بزرگواروں سے سنا ہے کہ مولانا شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ جب موضح القرآن لکھ چکے تو فارسی کا ایک شعر تھوڑا سا تصرف کر کے اس طرح پڑھتے تھے۔ شعر

روز قیامت ہر کسے با خویش دارد نامہ　　　من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآں در بغل

اس سے ان حضرات مرحومین کا کمال علم و تدین تو معلوم ہوتا ہی ہے اسی کے ساتھ قرآن شریف کے صحیح تراجم کی عظمت اور ضرورت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

بالجملہ اگر اکابر مرحومین ہماری ضرورت اور منفعت کو احساس فرما کر پہلے ہی سے اس کا انتظام نہ کر جاتے تو آج اس کثرت اور سہولت کے ساتھ ہم کو تراجم کلام الٰہی اچھے سے اچھے ہرگز میسر نہ ہوتے اور کچھ عجب نہ تھا کہ جیسے خود ہندوستان میں بہت سی زبانیں اور دیگر ممالک میں مسلمانوں کی بڑی بڑی قومیں اس نعمت اور عزت سے خالی یا مثل خالی کے ہیں، ہم بھی اسی نکبت میں مبتلا ہوتے۔ فجزاہم اللہ عنا وعن جمیع المسلمین احسن الجزاء وافضل الجزاء۔ والحمد للہ اسی کے ساتھ یہ بات بھی دلنشین ہوگئی کہ ہر چند ترجمہ تحت لفظی میں بعض خاص فائدے ہیں، مگر ترجمہ سے جو اصلی فائدہ اور بڑی غرض یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو قرآن شریف کا سمجھنا آسان ہو جائے یہ غرض جس قدر بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہو سکتی ہے تحت لفظی ترجمہ سے کسی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ جو بامحاورہ ترجمہ کے بانی اور امام ہیں انہوں نے بامحاورہ ترجمہ کو اختیار فرمانے کی یہی وجہ بیان کی ہے اور یہی وجہ ہے جو اسلاف ممدوحین کے بعد اس زمانہ میں جس نے اس میدان میں قدم رکھا اس نے جناب شاہ صاحب ممدوح کا اتباع کیا اور بامحاورہ ترجمہ کرنے کو اختیار کیا۔ جن پر کسی کا شعر یاد آتا ہے۔ شعر

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری　　　اول بشگوں کرد طواف قفس ما

اور یہ امر بھی خوب معلوم ہو گیا کہ جیسے شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ کا یہ کمال ہے کہ تحت لفظی ترجمہ کا التزام کر کے ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ایسے ہی حضرت مولانا عبدالقادر رحمہ اللہ کا یہ کمال ہے کہ بامحاورہ ترجمہ کا پورا پابند ہو کر پھر نظم و ترتیب کلمات قرآنی اور معانی لغویہ کو اس حد تک مہیا یا ہے کہ زیادہ کہتے ہوئے تو ڈرتا ہوں مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ ہم جیسوں کا ہرگز کام نہیں۔ اگر ہم ان کے کلام کی خوبیوں کو اور ان اغراض اور اشارات کو جو ان کے سیدھے مختصر الفاظ میں ہیں سمجھ جائیں تو ہم جیسوں کے فخر کے لئے یہ امر بھی کافی ہے۔

اس کے بعد ہم کو ضرور ہوا کہ خاص طور پر حضرت شاہ مولانا عبدالقادر رحمہ اللہ کے ترجمہ بامحاورہ مسمی بہ ''موضح القرآن'' کو دیکھ کر اول یہ سمجھیں کہ جناب شاہ صاحب ممدوح کا ترجمہ جس کا اپنی نوعیت میں اول و افضل ہونا جملہ اہل علم و فہم اور ارباب انصاف و دیانت کو مسلم ہے، اس میں ایسے امور کیا ہیں جن کی وجہ سے ہم کو دوسرے کسی ترجمہ کی ضرورت ہو۔ پھر

یہ دیکھیں کہ جو تراجم جدیدہ اس زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں ان سے ہماری وہ ضرورت پوری ہوگئی یا اب تک کچھ باقی ہے کہ جس کے پورا کرنے کیلئے اور ترجمہ کی ابھی تک حاجت چلی جاتی ہے۔

امر اول کی بابت جہاں تک ہم نے ملاحظہ کیا اور دیگر حضرات نے بھی اس کی تصدیق فرمائی کل دو باتیں ایسی پائیں جسکی وجہ سے عام طور پر لوگ ترجمہ موصوف سے نفع اٹھانے میں قاصر ہیں۔

اول بعض کلمات و محاورات کا اس زمانہ میں متروک یا قریب بمتروک ہو جانا۔

دوسرے چونکہ حضرت شاہ صاحب مرحوم کلمات قرآنی کی موافقت اور مطابقت کا خیال زیادہ فرماتے ہیں اور شرائط ترجمہ کی پابندی بہت کرتے ہیں۔ اس لئے بعض مواقع میں بوجہ اختصار عبارت آج کل کی سہولت پسند طبائع کو مطلب سمجھنے میں بہت دقت معلوم ہوتی ہے۔

باقی رہا امر ثانی، تو یہ بات توسب جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں اردو با محاورہ طرز پر بکثرت تراجم یکے بعد دیگرے شائع ہو چکے ہیں۔ سو ان میں بالیقین بعض ایسے تراجم بھی ہیں جو علمائے معتبر اہل علم و دیانت کی لوجہ اللہ سعی کا نتیجہ ہے، اور بعض بعض کو ہم نے بھی تفصیلی نظر سے دیکھا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ تراجم بیشک ہماری اس حاجت کے پورا کرنے کے لئے کافی ہیں جو اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے بینظیر ترجمہ میں اہل زمانہ کو پیش آ رہی تھی۔ جزاھم اللہ سبحانہ، عنا و عن جمیع مسلمی الھند خیراً۔ اور ان اغلاط و مفاسد سے بچانے کے لئے بھی مفید ہیں جو بعض آزاد خیال صاحبوں کے تراجم میں موجود ہیں۔

اس لئے امر ثانی کی بابت اس عاجز کی یہ رائے ہے کہ وہ نزاکت و لطافت اور وہ ہر امر کی رعایت جو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ترجمہ کے امتیازات اور خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں ان کا تو ذکر نہیں۔ باقی وہ امر جو ترجمہ سے مقصود اصلی اور غرض ضروری ہے یعنی کلام الٰہی جل جلالہ کا صحیح مطلب سلف صالحین کے ارشادات کے موافق سہولت کے ساتھ مسلمانانِ ہند کی سمجھ میں آ سکے۔ اس امر کے لئے تراجم جدیدہ جو اہل علم و دیانت کی توجہ سے شائع ہو چکے ہیں وہ بالکل کافی اور وافی ہیں۔ ہم کو کسی جدید ترجمہ کی اس وقت حاجت نہیں رہی۔ شَکَرَ اللّٰہ تعالیٰ مَسَاعِیَھِم۔ ہم فخر و مسرت کے ساتھ حق سبحانہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے معتبر علماء کی حسن سعی سے تراجم مفیدہ قدیمہ جدیدہ اتنے شائع ہو چکے ہیں کہ ایسے اور اتنے تراجم ہم کو کسی عجمی زبان میں نظر نہیں آتے۔ ذٰلک من فضل اللّٰہ علینا۔

اب اس کے بعد یہ بات تو بحمد اللہ ہم کو خوب محقق اور منقح ہوگئی کہ تراجم موجودہ صحیحہ معتبرہ کے ہوتے، ہمارا جدید ترجمہ کرنا لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا ہے، جس سے نہ مسلمانوں کو کوئی نفع معتبر پہنچ سکتا ہے نہ ہم کو۔ بلکہ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا جدید ترجمہ کرنا گویا زبان حال سے یہ کہنا ہے کہ تراجم موجودہ میں کوئی خلل ہے جس کا تدارک کیا جاتا ہے یا ہمارے ترجمہ میں کوئی خوبی اور منفعت زائد ہے جس کی وجہ سے جدید ترجمہ کی حاجت ہوئی تو ہم کو جدید ترجمہ کرنا فضول سے بڑھ کر نہایت مذموم اور مکروہ تک نظر آتا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

خیر یہ بات تو خوب دلنشین ہوگئی، اور ظاہر ہے کہ اس کا مقتضے یہ تھا کہ ترجمہ کلام الٰہی کے متعلق اب ہم کچھ ارادہ نہ

کرتے مگر اس چھان بین اور دیکھ بھال میں تقدیر الٰہی سے یہ بات دل میں جم گئی کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا افضل و مقبول و مفید ترجمہ رفتہ رفتہ تقویم پارینہ نہ ہو جائے۔ یہ کس قدر نا قدر دانی اور بدقسمتی بلکہ کفرانِ نعمت ہے اور وہ بھی سرسری عذر کی وجہ سے اور عذر بھی وہ جس میں ترجمہ کا کوئی قصور نہیں۔ اگر قصور ہے تو لوگوں کی طلب کا قصور ہے۔ اگر دیکھنے والے غور سے دیکھیں اور جو غور کے بعد بھی سمجھ میں نہ آئے، اس کو جاننے والوں سے دریافت کریں تو پھر سب کام سہل ہو جائے۔ چنانچہ حضرت ممدوح نے خود شروع میں لکھ دیا ہے کہ قرآن شریف کے معنی بغیر سند کے معتبر نہیں اور بغیر استاد کے معلوم نہیں ہوتے۔

علاوہ ازیں عوام کو یہ دشواری تو سب ترجموں میں پیش آتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کے ترجمہ میں کچھ زیادہ سہی۔

اس لئے اس تنگِ خلائق کو یہ خیال ہوا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ ممدوح کے مبارک مفید ترجمہ میں لوگوں کو جو کل دو خلجان ہیں یعنی الفاظ و محاورات کا متروک ہو جانا۔ دوسرے بعض بعض مواقع میں ترجمہ کے الفاظ کا مختصر ہونا۔ جو اصل میں تو ترجمہ کی خوبی تھی مگر ابنائے زمانہ کی سہولت پسندی اور مذاق طبیعت کی بدولت اب یہاں تک نوبت آ گئی کہ جس سے ایسے مفید و قابل قدر ترجمہ کے متروک ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سو اگر غور و احتیاط کے ساتھ ان الفاظ متروکہ کی جگہ الفاظ مستعملہ لے لئے جائیں اور اختصار و اجمال کے موقعوں کو تدبر کے ساتھ کوئی لفظ مختصر زائد کر کے کچھ کھول دیا جائے تو پھر ان شاء اللہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کا یہ صدقہ فاضلہ بھی جاری رہ سکتا ہے اور مسلمانان ہند بھی اس کے فوائد مخصوصہ سے خالی نہ رہ جائیں گے۔ اس مضمون کو سوچ سمجھ کر جو اپنے مکرمین مخلصین کی خدمت میں پیش کیا تو ان حضرات نے بھی اس عاجز کی رائے سے اتفاق ظاہر فرمایا۔ اور یہی بات دل نشیں ہو گئی کہ مستقل ترجمہ سے یہ امر زیادہ مناسب اور مفید ہے کہ موضح قرآن میں جو شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ جب یہاں تک نوبت پہنچ چکی تو یہ عاجز بنام خدا اس خدمت کے انجام دینے لے لئے تیار ہو بیٹھا، گویا دوشالہ میں کمبل سے جگہ جگہ رفو کرنے کا ارادہ کر دیا۔ جب ایک ثلث قرآن کا ترجمہ کر چکا تو بوجہ بعض عوارض ایسا طول طویل حرج پیش آیا کہ ترجمہ کی تکمیل کی توقع بھی دشوار ہو گئی مگر بتوفیق الٰہی عین ایام حرج میں اتنا اطمینان نصیب ہو گیا کہ ترجمہ موصوف باطمینان ۱۳۳۶ھ میں پورا کر لیا۔ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ۔

اب حق تعالیٰ کو منظور ہے تو انہی احباب مکرمین کی خدمت میں اس ترجمہ کو پیش کر کے تفصیلی نظر کی درخواست کریں گے۔ اگر ہماری یہ پیوند کاری ان حضرات کے نزدیک مفید و مناسب سمجھی گئی تو ان شاء اللہ شائع بھی ہو جائے گا ورنہ مجبوراً جہاں ہے وہیں رہے گا۔ شعر

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر　　　میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

اب اس کے بعد مناسب ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے اصل ترجمہ کی بابت اور نیز اپنی ترمیم کے متعلق چند ضروری مفید باتیں عرض کر دی جائیں، جن سے دیکھنے والوں کو بالا جمال دونوں ترجموں کی حالت اور کیفیت بھی معلوم ہو جائے اور بعض شبہات جن کے پیش آنے کا کھٹکا ہوتا ہے، وہ بھی دفع ہو جائیں۔ سو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے شروع میں اپنے ترجمہ کی نسبت اتنا مضمون تو خود فرما دیا ہے کہ ہندی اور عربی زبان کا محاورہ ہرگز موافق نہیں۔ اس لئے اگر قرآن

شریف کی ترتیب کے موافق ہر ہر لفظ کا جدا جدا ترجمہ کیا جائے یعنی تحت لفظی تو ہندیوں کی سمجھ میں آنا دشوار ہو۔اس لئے ہم نے مجموعہ آیت کی پابندی کی ہے، ہر ہر لفظ کی پابندی نہیں کی یعنی ہندی محاورہ کے موافق ترجمہ کیا ہے، تحت لفظی نہیں کیا۔ یہ حضرت ممدوح کے ارشاد کا خلاصہ ہے۔مگر اس میں اجمال بہت ہے۔اس ارشاد سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ حضرت ممدوح اپنے ترجمہ میں ہر ہر لفظ کی پابندی نہ کریں گے ہاں آیت کی پابندی ضروری ہے مگر یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس عدم پابندی کی کیا حد ہے اور کہاں تک اس عدم پابندی کو حضرت ممدوح نے اپنے ترجمہ میں اختیار اور استعمال فرمایا ہے اور کتنی تقدیم و تاخیر کو جائز رکھا ہے یعنی بقدر ضرورت و حاجت کسی لفظ کو آگے پیچھے کر لیا ہے یا صرف آیت کے احاطہ میں رہ کر پھر کسی تقدیم و تاخیر کی پرواہ نہیں کی تھوڑی ہو یا زیادہ ضروری ہو یا غیر ضروری ایک تغیر ہو یا متعدد۔اس کے سوا حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ امر اجمالاً بھی نہیں بیان کیا کہ ہم نے اپنے ترجمہ میں کس کس امر کا خیال رکھا ہے اور اس میں کیا کیا خوبیاں اور فوائد ہیں۔سو احقر ان دونوں باتوں کو مفید سمجھ کر انکی نسبت کچھ کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔

سو یہ بات تو سب پر ظاہر ہے کہ احقر اس کے متعلق جو کچھ بھی عرض کرے گا وہ موضح قرآن ہی کی عبارت سے مستنبط ہوگا۔اس کے سوا ہمارے لئے اور کیا امر ذریعہ علم ہو سکتا ہے۔بعینہ جیسا کہ حضرات علمائے کرام نے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی خود کتاب صحیح بخاری سے استنباط کر کے ان کی شروط و قیود و اغراض کو بیان فرما دیا ہے۔

سو امر اول کی نسبت یہ عرض ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ ترتیب قرآنی کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اصل اور ترجمہ کی مطابقت میں بہت زیادہ سعی فرماتے ہیں مگر چونکہ ترجمہ بامحاورہ کا التزام کیا ہے اس لئے بضرورت توضیح و تسہیل بعض مواقع میں تقدیم و تاخیر لازم ہے۔مگر جیسا کہ آٹے میں نمک۔ یہ نہیں کہ آخر کا ترجمہ اول اور اول کا آخر ہو جائے۔الغرض فصل بعید سے احتراز رکھتے ہیں۔الا ماشاء اللہ کسی خاص ضرورت کے وقت میں دو تین کلموں کا فصل ہو جائے اور وہ بھی النادر کالمعدوم۔دیکھئے عربی زبان میں مضاف کو مقدم ذکر کرتے ہیں۔اور اردو کا محاورہ یہ ہے کہ مضاف الیہ کو مقدم کرتے ہیں۔وہ غلام زید کہتے ہیں۔تو ان کے محاورہ میں زید کا غلام کہیں گے۔سو ترتیب تو بدل گئی مگر دونوں کلمے متصل ہی رہے فاصلہ اور فرق کچھ نہیں ہوا۔اس لئے حاجت کے وقت یہ تغیر کچھ تغیر نہیں سمجھا جاتا۔اس قسم کی مثالیں شاہ صاحب کے ترجمہ میں کثرت سے ملیں گی۔مثلاً عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ کا ترجمہ بامحاورہ کریں گے تو "ان کے دل پر اور ان کے کان پر اور ان کی آنکھوں پر" کیا جائے گا اور ترجمہ تحت لفظی میں "اوپر دلوں ان کے کے اور اوپر کانوں ان کے کے اور اوپر آنکھوں ان کی کے" کہنا پڑے گا۔مگر سب جانتے ہیں کہ ایسے اختلاف جتنے بھی ہوں ان میں کوئی حرج نہیں، بلکہ ضروری ہیں۔بامحاورہ ترجمہ کرنے والے کو اس سے مفر نہیں لیکن حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی احتیاط قابل تحسین اور لائق قدر ہے کہ اس پر بھی ہر جگہ مضاف الیہ کو مقدم نہیں کرتے، بلکہ جہاں ترجمہ میں ذرا گنجائش مل جاتی ہے وہاں اتنے قلیل تغیر کو بھی پسند نہیں کرتے ترتیب قرآنی ہی کو اختیار فرماتے ہیں۔دیکھو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" میں چونکہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ مضاف مضاف الیہ مل کر صفت واقع ہوئے ہیں۔اس کے ترجمہ میں یہ گنجائش نکل آئی کہ ترجمہ محاورہ کے خلاف بھی نہ ہو اور کلام الٰہی کی ترتیب بھی باقی رہے۔اس لئے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا ترجمہ اصلی ترتیب پر رکھا اور مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ بھی صفت واقع ہوا ہے

مگر اس میں دو اضافتیں مجتمع ہیں۔ اول اضافت میں اصلی ترتیب باقی رکھنے کی گنجائش ہے۔ دوسری اضافت میں نہیں۔ اس لئے ترجمہ میں "مَالِكِ" کا ترجمہ اصل کے موافق مقدم رکھا۔ اور "يَوْمِ" کے ترجمہ کا محاورہ اردو کے موافق "دِين" سے مؤخر کر دیا۔ چنانچہ سب پر ظاہر ہے اس میں کسی کو تردد نہیں صرف توضیح اور تسہیل کی غرض سے ہم نے عرض کر دیا لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہیں کہ وہاں محاورہ اردو کے ساتھ ترتیب قرآنی کا لحاظ رکھنا دشوار ہے حضرت شاہ صاحب ان مقامات میں بھی اپنی غائر اور باریک بین نظر سے ایسا اسلوب اختیار فرماتے ہیں۔ کہ محاورہ کی پابندی کے ساتھ ترتیب بھی باقی رہے، یا فرق آئے تو خفیف ولطیف۔

بعینہ یہی حال ہے فعل اور فاعل اور مفعول اور جمیع متعلقات فعل کا اور صفت موصوف، حال تمیز وغیرہ کا کہ اکثر مواقع میں ترتیب کی موافقت فرماتے ہیں اور بہت سے مواقع میں اسی تغیر لطیف مذکورہ بالا سے کام لیتے ہیں۔

اور سنئے حروف روابط جن کو حروف جر بھی کہتے ہیں۔ جیسے ل، ب، علی، الی، من، فی بہت کثرت سے مستعمل ہیں۔ مگر کلام عرب میں یہ حروف ہمیشہ اپنے معمول پر مقدم ہوتے ہیں۔ اور ہمارے محاورہ میں علی العموم مؤخر بولے جاتے ہیں۔ مگر شاذ و نادر۔ لیکن ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ ان کا مؤخر ہونا ضروری ہے۔ ہماری زبان میں ان کو مقدم لانے کو کوئی صورت ہی نہیں جیسے من اور عن سب کو معلوم ہے کہ ﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ کے ترجمہ میں اردو زبان کے اندر ممکن نہیں کہ من کا ترجمہ مقدم ہو سکے اور ترتیب قرآنی کی موافقت کی جا سکے۔ ایسے ہی لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ کے ترجمہ میں کوئی صورت نہیں کہ عن کا ترجمہ نَّفْسٍ کے ترجمہ سے مقدم ہو سکے اسی وجہ سے تحت لفظی ترجمہ میں بھی یہ تغیر گوارا کرنا ہوتا ہے اور اس میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا۔ اور بعض ایسے ہیں کہ ان کو مقدم کرنا تو درست ہے مگر محاورہ کے خلاف ہے۔ سو تحت لفظی ترجمہ میں ان کو نظم قرآنی کے موافق مقدم لا سکتے ہیں۔ مگر با محاورہ ترجمہ کے لئے ان کو بھی مؤخر کرنا ضرور ہوگا۔ جیسے علی۔ الی وغیرہ حروف مذکورہ۔ دیکھئے ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ کے تحت لفظی ترجمہ میں "مہر کر دی اللہ نے اوپر دلوں ان کے کے" کہنا مناسب ہوگا اور با محاورہ ترجمہ میں "مہر کر دی اللہ نے ان کے دلوں پر" کہنا ٹھیک سمجھا جائے گا۔ پہلی صورت میں لفظ علی، اپنی اصلی ترتیب پر رہا۔ دوسری صورت میں تھوڑا سا بقدر ضرورت اپنی جگہ سے ہٹ گیا اسی پر دیگر حروف کو قیاس فرما لیجئے۔ سو اول تو یہ حروف فی نفسہ غیر مستقل اور دوسروں کے تابع ہیں ان کا تقدم تاخر چنداں قابل اعتبار نہیں۔ دوسرے بے وجہ نہیں بلکہ ضرورت اور حاجت اور نفع کی وجہ سے کرنا ہوا۔ تیسرے اتنا لطیف وخفیف کہ ترجمہ لفظی میں بھی بعض مواقع میں قابل قبول اور ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ان سب کے بعد پھر وہی بات ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یعنی جہاں کچھ گنجائش نکل آتی ہے۔ وہاں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ اس خفیف قابل قبول تغیر کو بھی چھوڑ کر اصلی ترتیب کو قائم رکھتے ہیں اور ایسا ترجمہ کرتے ہیں جو ترتیب قرآنی کی پابندی کے ساتھ محاورہ کے بھی مخالف نہ ہونے پائے اس کی مثالیں حروف مذکورہ کے متعلق جگہ جگہ موجود ہیں مثلاً ﴿اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ﴾ کا ترجمہ یہ فرمایا ہے "مگر انہی پر جن کے دل پگھلے ہیں" یعنی اللہ سے ڈرتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں۔ دیکھ لیجئے لفظ علی کے ترجمہ کو مقدم رکھا خاشعین پر اور محاورہ کے مخالف بھی نہیں ہوا۔

الحاصل حضرت شاہ صاحب جگہ جگہ ترتیب میں تصرف کرتے ہیں مگر جچا تلا بقدر ضرورت اور عند الحاجت غور

اور احتیاط کے ساتھ جسکی وجہ سے حضرت ممدوح علیہ الرحمہ کا ترجمہ جیسے استعمال محاورات میں بینظیر سمجھا جاتا ہے ویسا ہی باوجود پابندی محاورہ قلت تغیر اور خفت تبدل میں بھی بے مثل ہے۔ فللّٰہ درہ ثم للہ درہ۔ اس کے سوا بعض بعض تصرفات خفیفہ مفیدہ اور بھی کر جاتے ہیں۔ مثلاً ترجمہ میں کوئی لفظ مختصر بڑھا دیتے ہیں۔ جس سے مطلب واضح ہو جائے یا مراد خداوندی معین ہو جائے سو یہ امر ایسا ہے کہ ترجمہ تحت لفظی میں بھی اس کی نظائر موجود ہیں۔ ایسا ہی ترجمہ میں بعض الفاظ کو چھوڑ بھی جاتے ہیں۔ مثلاً بعض مواقع میں اِنَّ کا ترجمہ نہیں کرتے۔ یٰٓاَبَتِ کے ترجمہ میں ''اے میرے باپ'' نہیں کہتے صرف ''اے باپ'' پر قناعت کر جاتے ہیں یٰبُنَیَّ کا ترجمہ ''اے میرے چھوٹے بیٹے'' کی جگہ فقط ''اے بیٹے'' فرمایا ہے۔ ایسا ہی یَارَبِّ کا ترجمہ ''اے رب'' متعدد مواقع میں اختیار فرمایا ہے۔ سو اس قسم کے تصرفات میں کچھ حرج نہیں ترجمہ لفظی تک میں ان کی گنجائش ہے۔

اب باقی رہی دوسری بات کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ترجمہ میں کن کن امور کا خیال رکھا ہے اور اس میں کیا کیا فائدے ہیں۔ سو یہ بات تو ظاہر نظر آتی ہے کہ حضرت ممدوح عامۃً چند باتوں کا بہت لحاظ رکھتے ہیں۔ ترجمہ میں اختصار و سہولت اور الفاظ قرآنی کی لفظی اور معنوی موافقت اور صرف لغوی معنی پر بس نہیں بلکہ معنی مرادی اور غرض اصلی کا ہر موقع میں بہت لحاظ رکھتے ہیں۔ اور ترجمہ میں کبھی ایسا لفظ لاتے ہیں جس کی وجہ سے اگر کسی قسم کا اجمال اور اشکال ہو تو زائل ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ فرماتے ہیں دوسری جگہ کچھ اور حالانکہ معنی لغوی اس لفظ کے ایک ہی ہیں مگر ہر مقام کے مناسب جدے جدے عنوان سے بیان فرماتے ہیں جس سے قرآن کی غرض اور مراد سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی سہولت اور وضاحت کی رعایت سے کبھی مضمون ایجابی کو عنوان سلبی میں ادا کرتے ہیں۔ اور اکثر مواقع میں نفی اور استثناء کا جدا جدا ترجمہ نہیں کرتے بلکہ حصر جو اس سے مقصود ہے اس کو مختصر ہلکے لفظوں میں محاورہ کے موافق بیان کر جاتے ہیں۔ حال، تمیز، بدل وغیرہ حتی کہ مفعول مطلق کے عنوانات کی رعایت رکھتے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ اردو کے محاورہ کے موافق بالجملہ الفاظ اور معانی دونوں کے متعلق بوجوہ متعددہ بہت غور اور رعایت سے کام لیا گیا ہے اور مطالب و مقاصد کی تسہیل اور توضیح میں پورے خوض اور احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے۔ ہم نے بغرض تنبیہ یہ چند باتیں مختصر طور سے عرض کر دی ہیں اہل فہم توجہ فرمائیں گے تو ان شاء اللہ ان کو ہماری عرض کی صداقت جگہ جگہ برابر ملے گی۔ ہم کو کسی طول کی حاجت نہیں۔ اور حاشا وکلا ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فوائد مذکورہ کا اور کسی نے خیال نہیں فرمایا۔ فضلائے معتبرین مشہورین وغیرہ علماء کے تراجم میں ہر ایک نے اس قسم کے فوائد کا اپنی اپنی فہم اور رائے اور مصلحت اور گنجائش کے موافق ضرور خیال فرمایا ہے، مگر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ ممدوح نے چونکہ ہر موقع پر ان چھوٹے بڑے فوائد متعددہ کی طرف پوری توجہ فرمائی ہے۔ اور ترجمہ میں ہر موقع پر ان کا اہتمام رکھا ہے۔ اس لئے کماً اور کیفاً دونوں طرح یہ امور موضح قرآن میں زائد ہیں، جنکی وجہ سے ترجمہ موصوف، جملہ تراجم میں ممتاز اور مفید تر نظر آتا ہے۔ اور بنظر فہم و انصاف اس کا مستحق ہے کہ سہل ممتنع کے ساتھ ملقب ہو۔ یہ حضرت ممدوح کا کمال ہے کہ ہر موقع پر جملہ امور پیش نظر رہتے ہیں اور ترجمہ میں حسب حاجت انکی رعایت کرتے ہیں اور اسی کے مطابق الفاظ بھی ان کو بسہولت مل جاتے ہیں۔ گویا محاورات و لغات اردو بھی سب سامنے رہتے ہیں، جس کو مناسب سمجھا بے تکلف

لے لیا اور اس پر ترجمہ اپنے محدود احاطہ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ فَبَارَكَ اللّٰهُ فِيْ حَسَنَاتِهٖ وَاَفَاضَ عَلَيْنَا مِنْ بَرَكَاتِهٖ یہ بات کس قدر قابل قدر اور مفید ہے کہ حضرات مفسرین اور شراح حدیث کے مبسوط ارشادات کا خلاصہ بسہولت ہر درجہ کے مسلمانوں کو ایک لفظ سے سمجھ میں آسکے بلکہ بعض مواقع میں تو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ایک دو لفظ وہ کام دیتا ہے کہ مبسوط ارشادات سے احق بالقبول معلوم ہوتا ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ اس موقع پر ارشاد خداوندی فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا کا نقشہ اور نمونہ ناخواستہ سامنے آگیا۔ دیکھئے حضرت سلیمان علیہ السلام لڑکے تھے مگر حق سبحانہ نے اپنی رحمت سے ان کو وہ بات سمجھادی کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی تسلیم فرمالیا اور اپنے حکم کو واپس کرلیا اور اس سے کسی کے علم وفہم میں کوئی نقصان اور اعتراض بھی نہ ہوا۔ شعر

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حق تعالیٰ کے غیر متناہی خزانے ہیں جس کو جس میں سے چاہتے ہیں حصہ معین عنایت فرمادیتے ہیں۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ چند فوائد عرض کئے ہیں، ایسے ہی چند مثالیں بھی کسی موقع سے عرض کردی جائیں۔ جن سے ہمارے معروضات کی تصدیق ہوجائے اور ناظرین کے لئے تسکین اور اطمینان کا باعث ہو۔ سو اول ہی سے لیجئے۔ دیکھئے "بِسْمِ اللّٰهِ" کا ترجمہ محاورہ کے موافق کیا جس میں توضیح اور اختصار دونوں کی بقدر مناسب رعایت ہے، اس سے بہتر اور خوبصورت ترجمہ اردو میں سمجھ میں نہیں آتا۔ اور رحمٰن اور رحیم جو مبالغہ کے صیغے ہیں ان کے مبالغہ کو بھی ظاہر فرمادیا اور لطیف اشارہ دونوں کے فرق مراتب کی طرف بھی کرگئے۔ جتنے تراجم سابقہ ہیں ان میں مبالغہ سے تعرض نہیں فرمایا۔ اس کے بعد سورۃ فاتحہ میں بھی رحمٰن اور رحیم کا ترجمہ ایسا ہی کیا گیا۔ "يَوْمِ الدِّيْنِ" کا ترجمہ جملہ حضرات نے "روز جزا" یا "دن جزا کا" فرمایا ہے۔ مگر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے صاف لکھ دیا ہے کہ میں نے عوام کی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور عوام کے کلام میں جزا کا لفظ شائع اور مستعمل نہیں۔ دوسرے اہل لغت اور حضرات مفسرین نے دین کے معنی جزا اور حساب دونوں فرمائے ہیں۔ ان وجوہ سے غالباً حضرت ممدوح نے جزا کے بدلے "انصاف" کا لفظ اختیار فرمایا کہ عوام میں بھی شائع ہے اور اس ایک لفظ میں جزا اور حساب دونوں آگئے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" جملہ حضرات "ہدایت" کا ترجمہ کبھی تو لفظ "ہدایت" ہی سے کرجاتے ہیں۔ اس لئے کہ لفظ "ہدایت" فارسی اردو میں برابر مستعمل ہے اور کبھی اپنی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں تو "ہدایت" کا ترجمہ "راستہ دکھانے" اور "راہنمائی" کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر حضرت ممدوح علی العموم ہدایت کا ترجمہ اپنی ہی زبان میں فرماتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ لیکن ہر موقع پر اس کا بھی لحاظ رکھتے ہیں کہ "ہدایت" کے کون سے معنی اس موقع کے مناسب ہیں کیونکہ "ہدایت" کے لغت عرب میں دو معنی ہیں۔ ایک "صرف راستہ دکھلادینا" دوسرے "مقصود تک پہنچادینا" اول کو "اراءۃ" اور دوسرے کو "ایصال" کہتے ہیں۔ اس لئے اوروں نے اِهْدِنَا کا ترجمہ "دکھا ہم کو" فرمایا ہے اور شاہ صاحب نے "چلا ہم کو" فرماتے ہیں جس سے "ایصال" کی طرف اشارہ کرنا مفہوم ہوتا ہے۔ اسی طرح پر هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں اور حضرات نے "ھدی" کے ترجمہ میں "راہنما" یا "راہ دکھاتی ہے" فرمایا ہے۔ اور حضرت ممدوح نے "راہ بتلاتی ہے" فرمایا ہے چونکہ "اھدنا" میں "ہدایت" حق تعالیٰ کی صفت

ہے تو وہاں ''چلانے'' کا لفظ لائے ہیں اور اس موقع میں ہدایت قرآن کی صفت ہے تو اس لئے ''راہ بتانے'' کا لفظ بیان فرمایا۔ ورنہ دونوں جگہ مقصود 'ایصال' کی طرف اشارہ کرنا معلوم ہوتا ہے۔ فرحمہ اللہ فما ادق نظرہ وارق الفاظہ۔

''متقین'' میں تقویٰ کا ترجمہ سب حضرات مرحومین نے پرہیزگاری فرمایا ہے جو تفاسیر کثیرہ کے موافق ہے پھر حضرات مفسرین نے اس پر شبہ کیا کہ ہدایت کے محتاج گمراہ ہیں نہ متقی۔ اس لئے ھدًی لِلضَّآلِّیْنَ فرمانا چاہیے تھا۔ بعض حضرات نے متقین کے معنی صَائِرِیْنَ اِلَی التقویٰ کے لے کر جواب دیا۔ بعض نے دیگر جوابات دے کر شبہ کا قلع قمع کیا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی طبع لطیف اور باریک بین نظر اس طرف گئی کہ ''تقویٰ'' کا ترجمہ ''ڈر اور خوف'' کے ساتھ کرنا پسند کیا۔ جو ''تقویٰ'' کے اصلی اور لغوی معنی ہے اور متقین سے وہ لوگ مراد لئے جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے۔ اس لئے ھدی للمتقین کا ظاہر اور معروف ترجمہ ''یعنی راہ دکھاتی ہے پرہیزگاروں کو' اس کو چھوڑ کر 'راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو' اختیار فرمایا جس سے شبہ مذکورہ کے خطور کا موقع ہی نہ رہا، جو کسی جواب کی حاجت ہو۔ اور اگر ہدایت سے ایصال مراد لیں جیسا کہ ترجمہ میں اس کی طرف اشارہ مفہوم ہوتا ہے۔ پھر تو شبہ کیا، کسی وہمی کے توہم کی بھی گنجائش نہیں۔ آگے دیکھئے ''یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ'' کے ترجمہ میں اگر 'ایمان لاتے ہیں ساتھ غیب' یا 'غیب' پر کہا جائے تو بہت صحیح اور ظاہر کے موافق ترجمہ ہے اور لفظ 'ایمان' اور 'غیب' دونوں ایسے مشہور ہیں کہ دوسرے لفظوں سے ان کے ترجمے کرنے کی ضرورت نہیں لیکن لفظ 'ایمان' اصطلاح شرع میں دو معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ ایک نفس تصدیق اور یقین قلبی، جو ضروریات دین کے ساتھ متعلق ہو، جس کو حقیقت ایمانی سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور معنی لغوی کے بالکل مطابق ہے۔ دوسرے تصدیق اور اعمال ایمانی کا مجموعہ جس کو ایمان کامل بھی کہتے ہیں۔ سو اول تو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی عام عادت ہے کہ حتی الوسع ترجمہ میں اردو کے لفظ کو اختیار فرماتے ہیں۔ دوسرے لفظ ایمان جب دو معنوں میں مستعمل ہے تو حضرت ممدوح کے اصول کے موافق ضرور ہوا کہ ترجمہ میں ایسا لفظ لائیں کہ ایمان کے جو معنی اس جگہ مراد ہیں ان کی تعیین ہو جائے اور دوسرا احتمال نہ رہے۔ علیٰ ہذا لفظ 'غیب' میں اجمال ہے۔ معلوم نہیں کس چیز سے غائب ہونا مراد ہے۔ ان وجوہ سے وہ صحیح اور ظاہر ترجمہ جس کا پہلے ذکر ہو چکا اس کو چھوڑ کر یہ ترجمہ اختیار فرمایا۔ ''یقین کرتے ہیں بن دیکھے'' جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ آیت میں ایمان کے اول معنی مراد ہیں نہ کہ دوسرے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ غیب کے یہ معنی ہیں کہ جن چیزوں کو انہوں نے نہیں دیکھا اور (وہ) انکے علم و ادراک سے غائب ہیں۔ جیسے دوزخ، بہشت، پل صراط، وزن اعمال، عذاب قبر، فرشتے، جنات؛ سو وہ لوگ ان سب چیزوں کا اللہ اور رسول کے فرمانے سے یقین کرتے ہیں۔ مع ہذا حضرات مفسرین رحمہم اللہ نے جو ''بِالْغَیْبِ'' میں چند احتمال ذکر فرمائے ہیں ان میں سے ایک معنی جو ظاہر اور راجح ہیں اس ترجمہ سے وہ بھی متعین ہو گئے جیسا کہ کتب تفسیر میں مذکور ہے۔

تنبیہ:...... ایمان کا ذکر قرآن شریف میں ماضی، مضارع، امر، اسم فاعل مختلف صیغوں کے ضمن میں بہت کثرت سے موجود ہے۔ سو حضرات مترجمین تو اکثر مواقع میں اس کا حسب ظاہر ترجمہ 'ایمان' یا 'اسلام' سے فرما جاتے ہیں اور حضرت ممدوح ''ایمان' 'اسلام، یقین، ماننا جو لفظ جس موقع کے مناسب اور مفید سمجھتے ہیں؛ اس کو اختیار کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے ترجمہ کے متعلق کار آمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ''یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ'' کے ترجمہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ اور انہی

چھوٹے چھوٹے فرقوں اور ہلکی ہلکی رعایتوں کی وجہ سے بعض مواقع میں بڑے بڑے شبہے بسہولت دفع ہوجاتے ہیں اور تحقیقی باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔ دیکھئے احادیث میں وارد ہے کہ جب آیت کریمہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ الخ نازل ہوئی تو حضرات صحابہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کو بہت ہی شاق گزرا۔ آخر آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا۔ "اَیُّنَا لَمْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ" یعنی یا رسول اللہ ہم میں ایسا کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم یعنی گناہ نہ کیا ہو۔ تو پھر اب تک سب عذاب الٰہی سے غیر مامون اور ہدایت سے محروم ہوگئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا لَیْسَ ذٰلِكَ اِنَّمَا هُوَ الشِّرْكُ اَلَمْ تَسْمَعُوْا قَوْلَ لُقْمٰنَ لِابْنِهٖ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ یعنی لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ میں ظلم سے مراد شرک ہے مطلق گناہ نہیں۔ جو یہ دشواری پیش آئے۔ حضرات مفسرین اور شراح احادیث کے اقوال اس جواب کی تقریر میں مختلف ہوگئے۔ جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے۔ سو ایک خلجان تو لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ میں تھا۔ جو حضرات صحابہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کو پیش آیا تھا۔ دوسرا اختلاف، خلجان مذکور کے جواب میں مفسرین وغیرہ علمائے کرام کو پیش آگیا کہ جواب کا مقصد اور اس کا ماخذ کیا ہے۔ سو خلجان معروضہ اصحاب کرام تو آپ ﷺ کے ارشاد سے جاتا رہا مگر آپ کے ارشاد کے مقصد و ماخذ میں علماء کو جو اختلاف پیش آگیا وہ موجود ہے اس پر حضرات مترجمین نے تو ان لمبی لمبی بحثوں کو دیکھا کہ ترجمہ ان کو متحمل نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے مناسب۔ اس لئے ترجمہ میں اس سے قطع نظر کرکے ظاہر کے موافق صحیح ترجمہ فرمادیا اور لمبی بحثوں کے لئے دوسرا موقع ہے۔ اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی دقیق نظر نے دیکھا کہ جب ہم کو ترجمہ میں کوئی زیادتی اور طول کرنا نہیں پڑتا صرف ایک لفظ کی جگہ دوسرا ویسا ہی لفظ بول دینے سے سب امور طے ہوجاتے ہیں۔ تو پھر اس میں کیوں کوتاہی کی جائے اور کام کی بات سے کیوں محروم رکھا جائے۔ تو انہوں نے اپنی عادت کے موافق یہ کیا کہ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ" کے ترجمہ میں یہ الفاظ فرمائے "جو لوگ یقین لائے اور ملائی نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر" جس سے معلوم ہوگیا کہ ایمان سے حقیقت ایمان یعنی تصدیق قلبی مراد ہے۔ حسب معروضہ سابق جس کو "ایمان بالمعنی الاول" کہتے ہیں۔ اہل فہم و انصاف کو تو بس یہی کافی ہے مگر اس پر اتنا اور کیا کہ "ظلم" کے ترجمہ میں لفظ "تقصیر" بیان فرمایا۔ جس سے اور بھی وضاحت اور تکمیل ہوگئی اب اس میں غور کرنے سے نہ آیت میں کوئی خلجان ہوتا ہے۔ نہ آپ ﷺ کے ارشاد میں اختلاف باقی رہتا ہے۔ دو لفظوں میں ایسی تحقیق فرمادی کہ لمبی لمبی بحثوں کی ضرورت نہ رہی اور طرفہ یہ کہ تحقیق دو لفظی سب سے احق بالقبول معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلجان کا منشاء کیا تھا اور ارشاد نبوی علیہ السلام کا منشاء کیا ہے اور ترجمہ میں جو لفظ "کچھ" داخل فرمایا ہے، جو اور ترجموں میں نہیں، وہ یہ صاف بتلاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اقوال علماء کو پیش نظر رکھ کر جو بات محقق اور راجح ہے اس کو بیان فرمانا چاہتے ہیں۔ یہاں تمثیلات کے ذیل میں یہ ذکر استطراداً آگیا اس سے زائد بسط کا موقع نہیں اور حضرات اہل علم خود بھی جانتے ہیں۔ البتہ "سورۃ انعام" میں اس آیت کے متعلق حاشیہ پر کچھ بسط سے عرض کردیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

اس کے بعد مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ کے ترجمہ میں مِن تبعیضیہ کا ترجمہ لفظ "کچھ" سے بیان فرماکر ممانعت اسراف کی طرف اشارہ کردیا جیسا کہ تفسیر بیضاوی وغیرہ میں مذکور ہے یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں "دغا بازی کرتے ہیں اللہ

سے" جونہایت صاف اور مناسب ترجمہ ہے۔ اور کوئی خلجان اور وہم اس میں نہیں ہوسکتا۔ "عذاب الیم" کے ترجمہ میں "دکھ کی مار" فرما کر اشارہ کردیا کہ فعیل بمعنی مفعول ہے جو استعمال مفرد اور راجح ہے اور محاورہ کے موافق۔ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ میں يَكْذِبُونَ کا ترجمہ ظاہر کے خلاف "جھوٹ کہتے تھے" فرماتے ہیں جھوٹ بولتے تھے نہیں فرمایا جو سہل اور ظاہر کے موافق تھا سواس کی وجہ ان شاء اللہ یہی ہے کہ جھوٹ بولتے تھے۔ بظاہر اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کا کاذب ہونا بیان کرنا مقصود ہے اور اس کی وجہ سے ان پر عذاب الیم ہوگا۔ حالانکہ یہ بات نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ لوگ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ جھوٹ کہا کرتے تھے۔ یعنی منافق تھے اور عذاب الیم اس نفاق کے بدلے میں ہوگا۔ فَلِلّٰهِ درہ ما الطف طبعه واسلم ذوقه واحد نظره۔ اور سنیئے مَا يَشْعُرُونَ اور لَا يَشْعُرُونَ جو ان آیات میں مذکور ہیں دونوں جگہ يَشْعُرُونَ ایک لفظ ہے کوئی فرق نہیں۔ اس لئے حضرات مترجمین دونوں کے ترجمہ میں کچھ فرق نہیں فرماتے مگر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اول کا ترجمہ "نہیں بوجھتے" اور دوسرے کا "نہیں سمجھتے" فرماتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں تامل اور فکر کی حاجت ہوتی ہے اس کے سمجھنے کو "بوجھنا" کہتے ہیں حضرت ممدوح کے اس فرق فرمانے سے ادھر اشارہ ہوگیا کہ امر اول یعنی منافقوں کا اپنے نفسوں کو دھوکا دینا اس کے سمجھنے میں کچھ تامل کی حاجت ہے اور امر ثانی یعنی منافقوں کا مفسد ہونا بالکل ایک امر ظاہر ہے۔ ادنی تامل کی بھی حاجت نہیں۔ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اس موقع میں لَا يَشْعُرُونَ اور لَا يَعْلَمُونَ کا فرق بیان کیا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ کیا کہ ایک لفظ يَشْعُرُونَ کو دو موقعوں میں لانے سے بوجہ اختلاف محل جو باریک فرق نکلتا تھا اس کی طرف اشارہ فرما گئے۔

اس کے بعد یہ عرض ہے کہ ہم نے یہ چند نظائر چھوٹی بڑی جو شروع قرآن مجید کے صفحہ ڈیڑھ صفحہ کے متعلق ہیں، موضح القرآن سے بطور نمونہ اور تنبیہ عرض کردیے ہیں۔ اس کو دیکھ کر ترجمہ موصوف کی خوبی اور کیفیت بالاجمال معلوم ہوسکتی ہے اور ہمارے معروضات سابقہ کی تصدیق کیلئے ان شاء اللہ کافی ہیں۔ اور ترجمہ مذکور کا، اول سے آخر تک یہی رنگ ہے۔ چنانچہ اہل علم پر واضح ہے، مگر ہم اس امر سے معذور ہیں کہ جیسا ہم نے بطور نمونہ اس مقام کے متعلق چند نظائر عرض کی ہیں، اسی طرح پر تمام ترجمہ کے نظائر اور فوائد کو بیان کریں اور نہ اس کی حاجت۔ البتہ جو بات قابل تنبیہ ہوگی اس کو اپنے اپنے موقع پر بالاجمال یا بالتفصیل حاشیہ پر فوائد کے ذیل میں ان شاء اللہ عرض کردیں گے۔ اور اہل فہم کو ایک دو جز و غور سے سمجھ لینے کے بعد ان امور کے سمجھنے میں خود سہولت ہوجائے گی۔

یہ امر بھی عرض کردینے کے قابل ہے کہ حضرت حجۃ اللہ علی العلمین شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے جب اول قرآن شریف کا ترجمہ فرمایا تو حاشیہ پر ضروری فوائد بھی کچھ تحریر فرمائے۔ مگر نہایت مختصر اور مجمل اور بہت کم موقعوں پر جو عام مسلمانوں کو کسی مرتبہ میں بھی کافی نہیں ہوسکتے۔ اس کے بعد جب حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا تو حضرت ممدوح نے فوائد کو بھی ایک مقدار کافی ضروری تک بڑھا دیا۔ جو نہایت مفید اور کارآمد ہیں۔ مگر مختصر عبارت اور سادہ الفاظ میں کہ بعض مواقع میں ہر کوئی سہولت سے نہیں سمجھ سکتا۔

اب اصل ترجمہ کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اپنی ترمیم کے متعلق عرض ہے کہ یہ تو پہلے معلوم ہوچکا کہ ترمیم صرف

دو امر کے متعلق ہے۔ لفظ متروک کو بدل دینا اور کہیں کہیں حسب ضرورت اجمال کو کھول دینا۔ اس کے بعد اتنا اور عرض ہے کہ جس موقع پر ہم کو لفظ بدلنے کی نوبت آئی ہے وہاں ہم نے یہ نہیں کیا کہ اپنی طرف سے جو مناسب سمجھا بڑھا دیا۔ نہیں، بلکہ حضرات اکابر کے تراجم میں سے لینے کی کوشش کی ہے۔ خود موضح القرآن میں دوسری جگہ کوئی لفظ مل گیا یا حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی اردو تفسیر میں یا حضرت مولانا رفیع الدین کے ترجمہ میں یا ''فتح الرحمن'' میں۔ حتی الوسع ان میں سے لینے کو پسند کیا ہے۔ البتہ کچھ مواقع ایسے بھی نکلیں گے جہاں کسی وجہ سے ہم نے اپنے خیال کے موافق کوئی لفظ داخل کر دیا ہے۔ اور جہاں ہم نے کوئی لفظ بدلا ہے وہاں دونوں باتوں کا خیال رکھا۔ یعنی لفظ ہلکا، سہل، محاورہ کے موافق بھی اور مطابق غرض اور موافق مقام بھی پورا ہو اور جس جگہ ایسا لفظ ہم کو نہیں ملا وہاں جانب معنی کو ترجیح دی ہے یعنی لفظ موافق مراد اور مناسب مقام کو اختیار کیا ہے۔ گو اس میں کسی قدر طول ہو یا لفظ بہت مشہور نہ ہو۔ اور ہم نے جس جگہ کسی مصلحت سے ترتیب کو بدلا ہے یا اور کوئی تغیر کیا ہے تو یہ ضرور لحاظ رکھا ہے کہ اس کی نظیر حضرات اکابر کے تراجم میں موجود ہونی چاہیے۔ ایسا تغیر جس کی نظیر مقدس حضرات کے تراجم میں نہ ہو ہم نے کل ترجمہ میں جائز نہیں رکھا۔ اتفاق سے اگر کوئی موقع اس عرض کے خلاف ہو تو وہ یقیناً ہمارا سہو ہے یا خطا۔ بالقصد جان بوجھ کر ہم نے ایسا کہیں نہیں کیا۔

حضرات علماء میں بعض کلمات قرآنی کے ترجمہ میں باہم کچھ اختلاف ہوا ہے۔ اور بعض آیات کے مطلب میں بھی کچھ نزاع ہے۔ سو ایسے مواقع میں ہم نے حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ ہی کا اتباع کیا ہے۔ الا ماشاء اللہ کہ کسی موقع پر حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی متابعت اختیار کی ہے۔

فوائد کے متعلق یہ عرض ہے کہ موضح القرآن کے جملہ فوائد کے لینے کا التزام کیا گیا ہے۔ مگر شاذ و نادر کہ کسی وجہ سے اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں سمجھی اور فوائد میں چونکہ ہر طرح سے گنجائش اور وسعت ہے ترجمہ کی طرح قید اور تنگی نہیں تو اس لیے ہم نے اکثر یہ کیا ہے کہ حضرت ممدوح کے فوائد کو اپنی عبارت میں بیان کیا ہے اور تقدیم و تاخیر تغیر و تبدل، اجمال و تفصیل وغیرہ امور سے احتراز نہیں کیا۔ اور بہت سے فوائد بالاستقلال مفید اور نافع سمجھ کر مختلف موقعوں سے لے کر اپنی رائے سے بڑھا دیئے ہیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تقلید کی وجہ سے ترجمہ میں اگر کسی جگہ قدرے تنگی رہ گئی تو اس کے بدلے میں مکافات سے بھی زائد فوائد میں اس کو واضح کر دیا گیا ہے۔ اور بغرض تشریح و تسہیل و تکمیل فوائد کی تکثیر کو ہم نے اختیار کیا۔ فوائد میں طول ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو کوئی مترجم فوائد لکھتا ہے وہ صرف کلام مجید کے متعلق لکھتا ہے اور احقر کو اس کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ترجمہ کے متعلق بھی بعض مواقع میں کچھ کچھ عرض کرنے کی نوبت آئی ہے کیونکہ ہماری تمام سعی کا لب لباب دراصل ترجمہ موصوف کی خدمت گزاری ہے، بس۔ چونکہ بعض بعض مقامات پر کچھ کچھ ترمیم کرنے سے حقیقت میں یہ دوسرا ترجمہ نہیں ہو گیا۔ اس لیے اس کا کوئی نام مستقل مقرر کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا، مگر صرف دفع التباس اور رفع اشتباہ کی مصلحت سے مناسب معلوم ہوا کہ اگر اصل ترجمہ کے نام کے علاوہ اس کا بھی کچھ نام رکھ دیا جائے تو التباس و اشتباہ سے پورا بچاؤ رہے گا۔ اُس کا نام ''موضح قرآن'' ہے اس کا نام ''موضح فرقان'' بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک کے ہیں ایک، اور ہیں دو کے دو کہنے کو دو اور حقیقت میں ہیں ایک۔ مگر موضح قرآن میں یہ خوبی ہے کہ تاریخی بھی ہے۔ موضح فرقان تاریخی نہیں۔

ہاں گھٹا بڑھا کر کچھ تکلف کے بعد تاریخی بھی ہو سکتا ہے۔ قطعہ

یادگار شہ عبدالقادر رحمہ اللہ ترجمہ موضح قرآن مجید

دہ کہ آں معدنِ صد خوبیٔ ا کرد ترمیم اقل العبید

بے شش وپنج بکفتہ محمود سالِ اوموضح فرقان حمید

اس کے بعد یہ عرض ہے کہ سب مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے رب کو پہچانیں اور اس کی صفات اور اس کے احکام کو معلوم کریں اور تحقیق کریں کہ حق تعالیٰ کونسی باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کونسی باتوں سے غصہ ہوتا ہے اور اس کی خوشی کے کاموں کو کرنا اور اسکی ناخوشی کے کاموں سے بچنا۔ اسی کا نام بندگی ہے اور جو بندگی نہ کرے وہ بندہ نہیں۔ اور سب کو معلوم ہے کہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے سب چیزوں سے ناواقف اور محض انجان ہوتا ہے پھر سکھلانے سے سب کچھ سیکھ لیتا ہے اور بتلانے سے ہر چیز جان لیتا ہے اسی طرح حق کا پہچاننا اور اس کی صفات اور احکام کا جاننا بھی بتلانے اور سکھلانے سے آتا ہے۔ لیکن جیسا حق تعالیٰ نے ان باتوں کو قرآن شریف میں خود بتلایا ہے ویسا کوئی نہیں بتلا سکتا اور جو اثر اور برکت اور ہدایت خدائے تعالیٰ کے کلام پاک میں ہے وہ کسی کے کلام میں نہیں ہے اس لیے عام خاص جملہ اہل اسلام کو لازمی ہے کہ اپنے اپنے درجہ کے موافق کلام اللہ کے سمجھنے میں غفلت اور کوتاہی نہ کریں، سو قرآن شریف کے اوپر کے درجہ کے مطالب اور خوبیاں تو عالموں کے سمجھنے کی بات ہے۔ مگر جو لوگ کہ علم عربی سے ناواقف ہیں ان کو بھی کم سے کم اتنا ضرور کرنا چاہیے کہ علمائے دین نے جو سلیس ترجمے ان کی زبان میں عوام کی واقفیت اور ہدایت کے لیے کر دیئے ہیں ان کے ذریعہ سے اپنے معبود حقیقی کے کلام کے سمجھنے میں ہرگز کاہلی نہ کریں اور اس نعمت لازوال سے بالکل محروم نہ رہیں کہ بہت بڑی بدبختی اور کم قسمتی ہے مگر اس میں اتنا اندیشہ ضرور ہے کہ صرف فارسی خواں یا اردو داں جو محاورات عرب سے ناواقف ہے محض سلیس ترجمہ کو دیکھ کر کچھ کا کچھ سمجھ جائیگا، کیونکہ پچھلی بات کا پہلی بات سے ملنا یا جدا ہو جانا اکثر مواقع میں بدون بتلائے ناواقف کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور کسی مضمون مجمل اور مبہم میں کچھ کا کچھ سمجھ جانا عوام سے کچھ بعید نہیں۔ یہاں تک کہ بعض آیتوں میں ضمیر کے مرجع میں غلطی کھا کر خرابی میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ نیز یہ امر بھی ضروری ہے کہ کلامِ الٰہی کے معنی بلا سند معتبر نہیں اور سلف صالحین کے مخالف کسی آیت کے معنی لینے جہل اور گمراہی ہے۔ بالخصوص موضح القرآن کے ان فوائد کو سمجھنا جو کہ جگہ جگہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اشارۃً ارشاد فرمائے ہیں بدون بتلائے عالم واقف کے ممکن نہیں، جیسا کہ ابھی معروض کر آیا ہوں۔ سوان وجوہ سے لازم ہے کہ استاد سے سیکھنے میں مسلمان کاہلی اور کوتاہی نہ کریں اور محض اپنی رائے پر اعتماد کر کے ثواب کے بدلے اللہ کا غصہ نہ کمائیں۔ واللہ الموفق وھو یھدی السبیل۔

یہ مضمون حضرت شاہ صاحبؒ کا ہے جو تھوڑی سی تفصیل اور تغیر کے ساتھ ہم نے مفید سمجھ کر عرض کر دیا ہے۔ اگر کاش مسلمانان ہند اس مفید قابل اہتمام مضمون کی پابندی کرتے تو آج ترجمہ موضح القرآن کے سمجھ میں نہ آنے کی شکایت نہ کرتے اور جو حضرات ترجمہ موصوف کے سمجھنے میں آج سست اور کاہل نظر آتے ہیں وہ دوسروں کے سمجھانے میں چست اور مستعد نظر آتے۔ حضرات علماء عام اہل اسلام کی بہبودی اور نفع رسانی کی غرض سے سہل سے سہل نئے نئے ترجمے شائع کرتے رہتے ہیں

مگر انصاف سے اس وقت تک نفع مذکور باوجود کثرت تراجم عام اور شائع طور پر اہل اسلام میں نہیں پھیلا۔ جب تک خود اہل اسلام ترجمۂ قرآن شریف کو ضروری اور مفید سمجھ کر اپنے شوق اور توجہ سے سیکھنا اور سمجھنا نہ چاہیں گے۔ اس وقت تک تکثیر تراجم سے عوام کو کیا نفع پہنچ سکتا ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔ قطعہ

فہم سخن تا نکند مستمع قوت طبع از متکلم مجو ے

فسحت میدانِ ارادت بیار تابزند مرد سخن گوئے گوئے

حضرات علماء نے عوام کی بہبودی کی غرض سے جیسے سہل اور آسان متعدد ترجمے شائع فرمائے ہیں ایسے ہی اس کی بھی حاجت ہے کہ علی العموم مسلمانوں کو اُن ترجموں کے سیکھنے اور اُن کے سمجھنے کی طرف رغبت بھی دلائی جائے علمائے کرام اہل اسلام کو خاص طور سے ترجموں کے سمجھنے اور پڑھنے کی ضرورت اور اس کی منفعت دل نشین کرنے میں کوتاہی نہ فرمائیں۔ بلکہ ترجمہ کی تعلیم کے لیے ایسے سلسلے بھی قائم فرمادیں کہ جو چاہے بسہولت اپنی حالت کے مناسب اور فرصت کے موافق حاصل کر سکے۔ واللہ الموفق والمعین۔

التماس اخیر

حضرت شاہ صاحبؒ کے اصل ترجمہ کا احسن التراجم اور انفع التراجم ہونا تو ان شاء اللہ ایسا نہیں کہ اہل علم و دیانت میں کوئی اس کا منکر ہو۔ ہاں! احقر نے جو اس کی خدمت اور ترمیم کی ہے اس کی نسبت ضرور ہم کو خلجان ہے۔ اس لیے اہل علم و انصاف کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر یہ ترجمہ شائع ہو کر کسی وقت آپ حضرات تک پہنچے تو اس کی حاجت ہے کہ ایک نظر اس کو ملاحظہ فرما کر جو امور قابل اصلاح معلوم ہوں ان سے ہم کو مطلع فرمانے میں تامل نہ فرمائیں۔ اور اگر کوئی صاحب بالاستقلال ترمیم فرمانا زیادہ پسند کریں تو وہ بالاستقلال اس خدمت کو انجام دینے میں سعی فرمائیں۔. ہماری غرض صرف یہ ہے کہ یہ عمدہ اور مفید ہے، یہ تھوڑے سے بہانہ سے نظروں سے نہ گر جائے اور ہم اس کے نفع سے محروم نہ رہ جائیں اور ایک صدقہ جاریہ میں خلل اور نقصان نہ آ جائے۔ ترجمہ جو اہل علم اور عوام دونوں کو مفید جو کوئی اس کی تلافی اور تدارک بہتر سے بہتر کر سکے وہ اس میں کوتاہی نہ کرے۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔

ضمیمہ (یاداشت) بعض امور کی، جو ترجمہ یا فوائد خیال کئے گئے

(حضرت شیخ الہند کی یہ مختصر یاداشت مسودات ترجمہ میں موجود تھی جس سے فوائد پر ایک روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے اس کو بطور ضمیمہ مقدمہ کے شائع کیا جاتا ہے۔) بسم اللہ الرحمن الرحیم لغت میں یہ بات مسلم ہے کہ الرحمن میں بہ نسبت الرحیم مبالغہ زیادہ ہے لیکن اس کے فرق کی طرف سوائے شاہ صاحبؒ کسی نے اشارہ نہیں کیا۔ بعض مترجموں نے تو بالکل الٹا کر دیا۔ شاہ صاحبؒ کا فرق ایسا دقیق تھا کہ اس کو کسی نے خیال نہیں کیا۔ شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے ''جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔ ہمارے ترجمہ میں اس کو خوب کھول دیا گیا اور یہ ترجمہ کیا گیا۔'' بےحد مہربان نہایت رحم کرنے والا۔ رحمن اور رحیم دونوں کے مبالغہ کو ظاہر کر دیا اور بےحد اور نہایت نے باہمی فرق بھی بتلا دیا۔

الحمد للہ۔ الحمد کا ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب نے ہر ہر طرح کی تعریف کیا ہے۔ لیکن اس ترجمہ میں نہایت باریک نقص تھا۔ کیونکہ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی تعریفیں اللہ کے واسطے ہیں۔ اس سے استغراق انواع ثابت ہوا نہ کہ استغراق افراد اور استغراق افرادی بڑھا ہوا ہوتا ہے اور وہی مراد بھی ہے اس ترجمہ کو چھوڑ کر یہ ترجمہ کیا گیا سب تعریفیں اللہ کے لیے۔ اس ترجمہ اور شاہ صاحبؒ کے ترجمے میں صرف الفاظ کے کم وبیش کا فرق ہے۔ امر مذکور کے فائدہ میں مضمون کھول دیا ہے۔

مالك يوم الدين۔ مولوی نذیر احمد صاحب نے اس کا ترجمہ بادشاہ کا کیا ہے۔ اگر چہ یہ ترجمہ اس قراءت کے موافق درست ہو جس میں ملك يوم الدين ہے مگر اس قراءۃ کے موافق درست نہیں۔ اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔

غير المغضوب عليهم۔ اس آیت شریفہ کا ترجمہ نہایت غور طلب امر ہے۔ تمام تفاسیر میں لکھا ہے۔ غیر الذین کی صفت ہے یا بدل ہے۔ لیکن تمام مترجموں نے اس کا خیال نہیں کیا۔ بلکہ خلاف ترکیب لفظی یہ ترجمہ کیا ہے۔ نہ اس کی راہ البتہ شاہ صاحبؒ کے ترجمہ میں دونوں احتمال تھے۔ اس لیے تمام تراجم کے خلاف اس آیت کے ترجمہ کو تفاسیر کے موافق کر دیا۔ اور فائدہ میں اصل مدعا کو کھول دیا ہے۔

الٓمٓ۔ حروف مقطعات کے معانی میں مولوی نذیر احمد صاحب نے علماء کے اوپر شخصی رائے کا الزام لگایا تھا۔ جس کے جواب کی طرف فائدہ میں اشارہ کیا ہے۔

لا ريب فيه۔ اس آیت کے فائدے میں بہت سے شبہات اور اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

دو جگہ لفظ يشعرون وارد ہوا ہے۔ تمام مترجموں نے دونوں جگہ ایک ہی ترجمہ کیا ہے یعنی نہیں سمجھتے۔ البتہ شاہ صاحبؒ نے فرق کیا ہے جو نہایت باریک ہے وہ یہ کہ اول میں بوجھتے اور دوسرے میں سمجھتے۔ لیکن یہ فرق بہت مخفی تھا۔ اس کو ہمارے ترجمہ میں کھول دیا گیا ہے۔

ولهم عذاب اليم الخ، يكذبون کا ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب وغیرہ نے ''جھوٹ بولتے تھے کیا ہے۔ اور شاہ صاحبؒ نے جھوٹ کہتے تھے'' لیکن صحیح ترجمہ یہی ہے جو شاہ صاحبؒ نے کیا ہے۔ کیونکہ یہ سزا مطلقاً جھوٹ بولنے کی عادت کی نہ تھی۔ بلکہ خاص اس جھوٹ کہنے کی کہ امنا باللہ یعنی نفاق کے بولنے اور کہنے میں باریک فرق ہے۔ اور فائدہ میں اس کو واضح کر دیا ہے۔

يمدهم في طغيانهم۔ اس آیت کے ترجمہ میں مولوی نذیر احمد صاحب وغیرہ مترجموں نے سب نے غلطی کی ہے کہ في طغيانهم کو يعمهون کے متعلق کیا ہے۔ حالانکہ اس سے معتزلہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اس کو یمد کے متعلق کیا جاوے۔ اور جو مذہب اہل سنت کا ہے اس کو ظاہر کر دیا جاوے۔ شاہ صاحب کا ترجمہ اسی طرح پر ہے۔ اور ہمارے ترجمہ میں اس کو واضح کر دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے عمی اور عمہ کے فرق کو بالکل اڑا کر بے موقع ترجمہ کیا ہے دیکھنے سے یہ فرق معلوم ہوگا فما ربحت تجارتهم الخ اس کا ترجمہ غلط کیا ہے۔

ذهب الله بنورهم۔ مولوی نذیر احمد صاحب نے آنکھوں کا نور مراد لیا ہے۔ حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ فلما

اضاءت ما حوله۔ اس آیت میں فعل لازم کا ترجمہ کیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ہماری قراءت فعل متعدی کی ہے۔ من الصواعق حذر الموت۔ اس کے ترجمہ میں بلا داعی تقدیم وتاخیر ایسی کی کہ مطلب الٹا ہو گیا۔

واتوا به متشابها۔ مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے ترجمہ میں جنت کے تمام پھلوں کو ہم شکل بتایا ہے۔ یہ احتمال مرجوح ہے۔ اس آیت پر فائدہ میں خوب تشریح کر دی گئی ہے۔ فیعلمون انه الحق من ربهم۔ اس کا ترجمہ سب کے خلاف اور غلط معلوم ہوتا ہے۔

وزوجك الجنة۔ ترجمہ زوجہ کا بی بی کیا ہے۔ آگے جا کر محصنہ کا یہی ترجمہ ہے۔ انه هو التواب الرحيم۔ غائب کا ترجمہ مخاطب کیا ہے۔ مصدقا لما معكم اس کا ترجمہ عطف کے ساتھ کیا ہے۔ بکر کا ترجمہ بچھیا کیا ہے۔ الا امانی کے معنی مخدوش اور مرجوح لیے۔ فلن يخلف الله عهده۔ میں فا کا ترجمہ اور کیا ہے۔ قالوا سمعنا کا ترجمہ ''ان لوگوں نے گویا زبان حال سے یہ کہا۔ الخ کیا ہے'' فانه نزله على قلبك باذن الله مصدقا۔۔۔ الخ حال کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ یا بنی ان الله اصطفی۔۔۔ الخ بنی کا ترجمہ مفرد کیا ہے۔

لئلا يكون للناس۔۔ الخ کو ترجمہ نذیریہ میں بار بار حکم دینے کو استقبال کعبہ کی علت بتایا ہے۔ جو غلط ہے فمن كان منكم مريضا۔۔ الخ فا کا پارہ سیقول ترجمہ غلط کیا ہے۔ وعلى الذين يطيقونه۔۔ الخ اس سے مسئلہ غلط بیان کیا ہے شهر رمضان الذى انزل فيه القرآن اس کا ترجمہ بہت بے موقع کیا ہے۔ مگر تفسیر کبیر کا حوالہ دیا ہے۔ اجيب دعوة الداع۔۔ الخ کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ ثم افيضوا من حيث افاض الناس۔ کا ترجمہ خراب کیا ہے۔ والذين أمنوا معه کا ترجمہ الٹا کیا۔ فلما جاوزه هو والذين أمنوا معه۔ معه کو أمنوا کے متعلق کیا۔ جاوز کے نہیں کیا۔ فلما تبين له قال اعلم۔۔ الخ اس کے ترجمہ اور فائدہ میں اظہار خباثت معلوم ہوتا ہے۔ للذين يؤلون من نسائهم۔ اس کے ترجمہ اور فائدہ میں تعارض ہے اور مذہب کے بھی خلاف ہے۔

تلك الرسل او كالذى مر على قرية۔۔ الخ کا ترجمہ بے ڈھنگا خلاف محاورہ کیا ہے۔ فخذ اربعة اس کا ترجمہ بے موقع ہوا ہے۔ فتركه صلدا۔ صلدا کا ترجمہ ''سپاٹ نادرست معلوم ہوتا ہے۔ وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله اس کا ترجمہ خبط سے خالی نہیں۔

ولوانناقل هي للذين امنوا فى الحيوة الدنيا۔ فى الحيوة کو غلطی سے أمنوا کے متعلق کر دیا ہے۔

❁❁❁

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمد حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے ممتاز عالم، عظیم مجاہد رہنما اور نامور شیخ طریقت تھے ان کا تعلق دیوبند (ضلع سہارنپور ہندوستان) کے عثمانی شیوخ کے ایک معزز خاندان سے تھا جو علم وعمل، شرافت و دین داری کے ساتھ ساتھ دنیاوی وجاہت سے بھی مالا مال تھا۔ ان کے والد مولانا ذوالفقار علی عربی زبان کے مشہور ادیب تھے، انہوں نے عرب ادب کی بعض کتابوں کی شروحات بھی لکھی ہیں۔

پیدائش:...... آپ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء شہر بریلی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد مولانا محمد ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔

تحصیل علم:...... چھٹے سال کی عمر میں آپ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ آپ نے فارسی کی سب کتب اور عربی کی ابتدائی کتب اپنے چچا سے پڑھیں۔ ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو آپ دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم تھے، آپ نے کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند سے پڑھیں اور سفر وحضر میں بھی ان کے ہمراہ رہے۔ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں تحصیل علم سے فارغ ہوئے۔

درس وتدریس:...... آپ نے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں بطور معین مدرس دارالعلوم میں ہی پڑھانا شروع کر دیا اس وقت آپ کو ابتدائی کتابوں کی تعلیم سپرد کی گئی تھیں لیکن کچھ ہی عرصہ میں آپ کی علمی استعداد اور ذہانت وفطانت کے جوہر کھلنے لگے تو آپ کو بڑی کتب کی تدریس کے مواقع ملنے لگے یوں کچھ ہی عرصہ میں آپ کتب حدیث کا درس دینے لگے۔ ۱۳۰۵ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ آپ نے اپنے تبحر علمی، فرض شناسی، تندہی اور دل سوزی سے اس کو دنیائے اسلام کی ایک مرکزی درسگاہ بنا دیا۔ ان کے زمانے میں ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ترکستان اور انڈونیشیا تک کے طلبہ علوم دینیہ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم وتربیت سے مستفید ہوئے۔ شیخ الہندؒ کو جملہ علوم دینیہ میں رسوخ حاصل تھا لیکن ان کے درس حدیث کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی۔ ان کے درس حدیث کی نمایاں خصوصیت جمع بین اقوال الفقہاء والاحادیث تھی۔ الغرض آپ نے چالیس سال مسلسل دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث دیا اور اسارت مالٹا کے زمانہ میں اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس عرصہ میں اطراف واکناف عالم میں آپ کے تلامذہ پھیل گئے، جن کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔

تلامذہ:...... آپ کے ممتاز تلامذہ میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ اور مولانا عبد السمیع دیوبندیؒ جیسے مشاہیر علم وفضل شامل ہیں۔

وفات:...... مالٹا کی اسیری کے دوران آپ بیمار پڑ گئے، وطن واپسی کے بعد بھی طبیعت سنبھل نہ سکی۔ طبیعت کی ناسازی کے باوجود تحریک آزادی وطن میں بھرپور جدوجہد سے صحت پر کافی اثر پڑا۔ آخر کار ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ دیوبند کے مایہ ناز سپوت اور جلیل القدر فضلاء میں سے تھے۔ آپ ایک بہت بڑے محدث، جلیل القدر مفسر، عظیم المرتبت متکلم اور بہترین خطیب اور بلند پایہ سیاست دان تھے۔

ولادت:...... آپ ۷ محرم الحرام ۱۳۰۴ھ بمطابق ۱۸۸۵ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرہ نسب خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

تحصیل علم:...... ۱۳۱۲ھ میں دار العلوم دیوبند کے استاذ حافظ محمد نعیم صاحب کے سامنے بسم اللہ کی تقریب ہوئی اور قرآن مجید کے ساتھ ساتھ اردو کی بعض کتابیں بھی انہیں سے پڑھیں۔ ۱۳۱۴ھ میں منشی منظور احمد صاحب سے حساب اور فارسی کی ابتدائی کتب پڑھیں۔ ۱۳۲۵ھ میں دورہ حدیث سے فراغت پائی۔

درس وتدریس:...... دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد چند ماہ دار العلوم دیوبند میں تدریس کی اور پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں صدر مدرس ہو کر تشریف لے گئے، وہاں کے زمانہ قیام میں آپ کی علمی لیاقت اور تحریر وتقریر کے جوہر آشکار ہوئے۔ آپ کی علمی لیاقت کو دیکھتے ہوئے انتظامیہ نے دوبارہ آپ کو دار العلوم بلا لیا اور آپ کے استاد حضرت شیخ الہندؒ اور دار العلوم کے دوسرے ذمہ دار حضرات نے دار العلوم میں استاذ کی حیثیت سے آپ کا باضابطہ تقرر کا فیصلہ کیا اور شروع ہی میں اہم اسباق آپ کے ذمہ ہوئے اور پانچ چھ سال بعد جب حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز مقدس کا سفر کیا اس کے بعد سے بالخصوص مسلم شریف کا درس آپ ہی سے متعلق رہا جس کی ملک کے درسی حلقوں میں غیر معمولی شہرت تھی۔ آپ بدوں کسی معاوضہ کے اٹھارہ سال تک دار العلوم میں درس وتدریس میں مصروف رہے۔ ۱۹۲۸ء میں دار العلوم کو خیر باد کہہ کر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں اقامت پذیر ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں پھر دار العلوم دیوبند کے صدر مہتمم منتخب ہوئے اور اور پھر مستقل وہیں کے ہو رہے۔

تلامذہ:...... دار العلوم کے ۱۸ سالہ کا ایام میں ہزاروں طلبہ آپ سے بلا واسطہ مستفید ہوئے۔ آپ کے تلامذہ میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا ادریس کاندھلویؒ، مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، مولانا یوسف بنوریؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا شمس الحق افغانیؒ اور مولانا عبد الرحمن کامل پوریؒ جیسے مشاہیر علماء شامل ہے۔

وفات:...... ۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بہاولپور کے وزیر اعظم کی درخواست پر جامعہ اسلامیہ کے افتتاح کے لیے تشریف لے گئے۔ ۱۲ دسمبر کی شب کو بخار ہوا۔ ۸ بجے سینے میں تکلف ہو گئی اور سانس میں رکاوٹ ہونے لگی۔ بالآخر ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو گیارہ بج کر چالیس منٹ پر بروز منگل ۶۴ سال کی عمر میں یہ آفتاب علم وعمل ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

(احوال وآثار)

ہندوستان کے صوبہ یوپی میں شاہدرہ دہلی اور سہارنپور ریلوے لائن پر مظفر نگر سے ۵۰، دہلی سے ۶۴ اور سہارنپور سے ۶۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ایک قصبہ ہے جسے ''کاندھلہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چالیس پچاس ہزار نفوس پر مشتمل یہ قصبہ برگ وگل کے اعتبار سے زرخیز اور افراد کے اعتبار سے مردم خیز ہے۔

بارہویں، تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں جس قدر اہل علم وفضل اس قصبہ کی خاک سے اٹھے، وہ شرف کسی اور قصبہ کو حاصل نہ ہوسکا۔ بقول احسان دانش ''کاندھلہ میں متعدد شاعر بھی تھے، اور جید مولوی بھی، انگریزی کے فارغ التحصیل فضلاء بھی اور اصول وعقیدہ سے انگریزی کو گناہ خیال کرنے والے صاحب نظر بھی، نیز پرانی فیشن کے وہ علماء بھی جن کی علمیت کے باعث بڑی بڑی درس گاہیں، اور دنیا بھر کے دارالعلوم کاندھلہ کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ جس روشن ضمیر نے مثنوی مولانائے روم کا ساتواں دفتر لکھا وہ بھی اسی قصبہ کی خاک سے اٹھا تھا۔''

کاندھلہ کے ارباب علم وفضل کی ایک طویل فہرست ہے، جسے اس وقت چھیڑنا طوالت کا باعث ہوگا، کاندھلہ کے انہی علماء وفضلاء کے باعث دنیائے علم ودانش میں دیوبند اور علی گڑھ کی طرح کاندھلہ کا نام بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق بھی اسی مردم خیز قصبہ سے ہے۔ اگرچہ آپ کی جائے پیدائش بھوپال ہے لیکن آپ کا وطن مالوف کاندھلہ ہے۔ مقدمۃ التفسیر میں مولانا نے خود اس بات کی صراحت فرمائی۔

''بھوپال میری جائے ولادت اور کاندھلہ میرا وطن ہے''

شہر بھوپال میں مولانا ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ، ۲۰ اگست ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، اس طرح آپ صدیقی النسب ہیں، آپ مثنوی مولانا روم کے ساتویں دفتر کے مؤلف مولانا مفتی الٰہی بخش کی اولاد میں ہیں۔

تعلیم وتربیت: خاندانی روایات کے مطابق مولانا نے قرآن کریم حفظ کیا۔ کاندھلہ میں قرآن کریم کی تکمیل کے بعد آپ کے والد مولانا حافظ محمد اسماعیل کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو تھانہ بھون لے گئے اور وہاں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ اشرفیہ میں آپ نے درس نظامی کی ابتدائی کتب پڑھیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولوی عبداللہ، مؤلف تیسیر المنطق سے آپ نے کسب فیض کیا۔ مولانا تھانوی کے مدرسہ میں چونکہ صرف ابتدائی تعلیم کا اہتمام تھا، اس لیے اعلیٰ تعلیم کے لیے مولانا آپ کو سہارنپور لائے اور مدرسہ عربیہ مظاہر العلوم میں داخل کیا۔ مظاہر العلوم میں آپ نے مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا حافظ عبداللطیف، مولانا ثابت علی جیسے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا اور ۱۹ برس کی عمر میں سند فراغ

حاصل کی۔ مظاہر العلوم سے سندِ فراغ حاصل کرنے کے بعد ذوق پیدا ہوا کہ دارالعلوم دیوبند میں بھی جو عالمِ اسلام کی مقتدر ہستیوں کا مرکز تھا، دورۂ حدیث کیا جائے چنانچہ مظاہر العلوم سے سندِ فراغ حاصل کر کے دوبارہ دورہ حدیث کیا، اور مولانا علامہ انور شاہ کاشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، میاں اصغر حسین دیوبندی، اور مفتی عزیز الرحمن رحمہم اللہ جیسے اجلاء محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

تدریسی زندگی:...... ۱۳۳۸ھ، ۱۹۲۱ء سے آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ مفتی محمد کفایت اللہ کے قائم کردہ مدرسہ امینیہ دہلی سے آپ نے تدریس شروع کی اور ایک سال بعد ہی ارباب دارالعلوم دیوبند نے آپ کو دیوبند میں تدریس کی دعوت دی۔ مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی تدریس ایک بڑا اعزاز تھا، مولانا نے اس پیش کش کو قبول کیا اور دیوبند فروکش ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعزاز کو اس طرح دو آتشہ کیا کہ ایک سال قبل جن کبار اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا، انہی کے پہلو میں بیٹھ کر ان سے حاصل کردہ فیض کو عام کرنا شروع کر دیا۔ دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے سال اول ہی میں آپ نے فقہ کی اعلیٰ ترین کتاب الھدایہ، ادب کی ایک اہم کتاب مقامات حریری جیسی مشکل کتب پڑھائیں۔ دارالعلوم دیوبند سے یہ تعلق کم وبیش نو سال قائم رہا۔ اس دوران نماز فجر کے بعد نو درہ میں درس قرآن دیتے جس میں دارالعلوم کے متوسط اور اعلیٰ درجات کے طلباء حتیٰ کہ بعض اساتذہ بھی شریک ہوتے۔ اسی درس کی بناء پر آپ کو بیضاوی اور تفسیر ابن کثیر پڑھانے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم چھوڑ کر حیدرآباد دکن آ گئے۔

حیدرآباد دکن میں قیام:...... حیدرآباد دکن کا نو برس پر مشتمل قیام آپ کی زندگی میں اس اعتبار سے تاریخی گردانا جاتا ہے کہ وہاں قیام کے دوران آپ نے عظیم الشان کتاب التعلیق الصبیح علیٰ مشکوٰۃ المصابیح تالیف کی۔ حیدرآباد دکن میں قیام کے دوران دنیائے علم کے ایک عظیم کتب خانہ، کتب خانہ آصفیہ میں موجود بعض نادر مخطوطات سے استفادہ کیا جن میں تورپشتی کی المفاتیح شرح مصابیح سب سے اہم ہے۔ جس سے آپ نے تعلیق میں استفادہ کیا اور بعض مقامات پر سیرۃ المصطفیٰ میں بھی اس کے حوالہ جات موجود ہیں۔ حافظ تورپشتی کی یہ کتاب مصابیح کی ایک بلند پایہ شرح ہے جس کا مخطوطہ نسخہ دنیا میں صرف کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں:...... علامہ شبیر احمد عثمانی، صدر مہتمم اور قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہوئے تو ان حضرات نے آپ کو بحیثیت شیخ التفسیر دارالعلوم آنے کی دعوت دی جو آپ نے قبول کر لی اور حیدرآباد دکن کے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ پر ستر روپے ماہانہ کی دارالعلوم کی تدریس کو ترجیح دی۔ اور ۱۹۳۹ء میں دوبارہ دارالعلوم آ گئے۔ دارالعلوم میں یہ قیام ہجرت پاکستان تک (دس سال) رہا اور وہاں آپ نے تفسیر بیضاوی، تفسیر ابن کثیر، سنن ابی داؤد اور طحاوی کی مشکل الآثار جیسی امہات الکتب پڑھائیں۔

پاکستان ہجرت:...... مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی اور اس کے بعد پورے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کے حصول کے لیے بھرپور تحریک شروع ہوگئی۔ مولانا نے اگرچہ عملاً تو سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن آپ دو قومی نظریہ کے زبردست حامی تھے۔ سیرۃ المصطفیٰ میں بھی جہاد کی بحث میں دو قومی نظریہ پر مدلل اور علمی

گفتگو کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا۔ مئی ۱۹۴۹ء میں مولانا نے پاکستان ہجرت کرنے کا ارادہ کر کے بادل ناخواستہ دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا۔ اس موقع پر آپ کو دارالعلوم ہاٹھ ہزاری چاٹگام، مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی جانب سے بحیثیت شیخ الحدیث آنے کی دعوت دی گئی لیکن آپ نے مغربی پاکستان آنے کو ترجیح دی اور دسمبر ۱۹۴۹ء میں ریاست بہاولپور کی دعوت پر آپ پاکستان آگئے اور جامعہ عباسیہ بہاولپور میں بحیثیت شیخ الجامعہ تدریسی خدمات کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔

جامعہ عباسیہ بہاولپور سے وابستگی:...... ۲۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو آپ نے جامعہ عباسیہ میں بحیثیت شیخ الجامعہ چارج لیا۔ جامعہ عباسیہ میں عصری و دینی تعلیم کے اختلاط کی وجہ سے روحانیت اور للّٰہیت نہ تھی، جو دینی مدارس کا خاصہ ہوتی ہے، مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کو وہاں کا یہ ماحول اور مادی دوڑ پسند نہ آئی اور جلد ہی طبیعت میں تکدر پیدا ہو گیا۔

جامعہ اشرفیہ لاہور سے تعلق:...... ۱۹۵۱ء کے اوائل میں مولانا جامعہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے اور یہاں خطاب فرمایا، مولانا مفتی محمد حسن کی نظر انتخاب نے مولانا کو جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث کے طور پر منتخب کر لیا۔ چنانچہ بہاولپور واپس جانے کے بعد ایک خط میں مولانا کو جامعہ اشرفیہ آنے کی دعوت ان الفاظ میں دی:

''میں آپ کو پلاؤ اور بریانی چھوڑ کر دال روٹی کی دعوت دے رہا ہوں۔''

مولانا نے دال روٹی کی اس مخلصانہ دعوت کو بصد اخلاص قبول کیا۔ مفتی صاحب نے دل کی گہرائیوں سے جو بات کہی تھی، مولانا کے دل پر اثر کر گئی اور مولانا ۱۶ اگست ۱۹۵۱ء کو جامعہ عباسیہ سے کم مشاہرہ پر جامعہ اشرفیہ آگئے اور پھر عمر عزیز کے آخری لمحہ تک جامعہ اشرفیہ سے اپنا تعلق قائم رکھا۔

وفات حسرت آیات:...... ۲/ اگست ۱۹۷۳ء کی شب اچانک ہچکیاں آنی شروع ہوئیں۔ ڈاکٹر اور اطباء معائنہ کے بعد اس بات پر متفق ہوئے کہ معدہ بہت کمزور ہو گیا ہے اور جگر نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ کمزوری میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۲/ اگست ۱۹۷۳ء سے جولائی ۱۹۷۴ء تک کا یہ تمام سال اسی طرح کمزوری اور نقاہت میں گزرا۔ لیکن شدید مرض اور اضمحلال میں بھی درس بخاری کا سلسلہ بند نہ کیا۔ ۱۶ جولائی ۱۹۷۴ء کو شدید دورہ پڑا اور طبیعت پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اخیر وقت میں جب ذرا ہوش آتا تو کلمہ طیبہ کا ورد ہوتا اور یہ آیت تلاوت کرتے: ﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾۔ ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء، ۸ / رجب ۱۳۹۴ھ کو صبح صادق کے وقت طلوع آفتاب سے قبل علم کا یہ آفتاب و ماہتاب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسی دن ظہر کی نماز کے بعد نماز جنازہ ہوئی۔ خلف الرشید، والد محترم مولانا محمد مالک کاندھلوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور اس طرح اس پیکر علم و عرفان کو سپرد خاک کیا گیا۔ مولانا کی وفات حسرت آیات برصغیر میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً اہل علم پر غم کا ایک پہاڑ بن گئی۔ مولانا کی وفات سے ایک ایسا علمی خلا پیدا ہوا کہ جو بعد میں پورا نہ ہوا۔

تصنیفی خدمات:...... تدریسی خدمات کا ایک مختصر خاکہ گزشتہ اوراق میں پیش کیا جا چکا ہے، درس و تدریس اور وعظ و خطبات کے علاوہ تحریر و تصنیف سے بھی مولانا نے دین متین کی لازوال خدمات سرانجام دی ہیں۔ تصنیف و تالیف میں مولانا کسی خاص میدان کے شہسوار نہیں بلکہ ہر میدان علم میں شہسواری کا ایسا ملکہ رکھتے ہیں کہ گویا زندگی ہی اس میدان میں گزری ہے۔

علم تفسیر، حدیث، عقائد وکلام، سیرت نبی کریم، ردِ فرقِ باطلہ، غرض کہ ہر علمی میدان میں مولانا نے اپنی لازوال خدمات کے ایسے سنگِ میل نصب کیے ہیں کہ جو رہتی دنیا تک قائم ودائم رہیں گے۔ مولانا کی تصانیف کے مفصل تذکرہ کا تو یہ موقع نہیں لیکن اختصار کے ساتھ آپ کی چند تصانیف کا تعارف پیش خدمت ہے۔

علم تفسیر...... معارف القرآن:...... علوم ومعارف کا ایک بھر پور خزینہ اور علماء متقدمین کے علوم کا ایک بہترین مجموعہ ہے، مطالب قرآنیہ کی توضیح وتشریح، ربط آیات کا بیان، احادیث صحیحہ اور اقوال وآثار صحابہ وتابعین پر مشتمل تفسیری نکات، ملاحدہ اور زنادقہ کی تردید، ان کے شبہات اور جوابات کلام الٰہی کی عظمت وشوکت، اس کی جامعیت اور اس کے اعجاز کا بیان، یہ چند خصوصیات ہیں جو معارف القرآن میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ۲۴ شوال المکرم ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء میں اس تفسیر کی تالیف کا آغاز کیا گیا اور ابھی سورۂ صافات کے اختتام تک پہنچے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ پھر سورۂ ص سے آخر تک بطور تکملہ مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ نے تحریر فرمائی۔ مولانا محمد مالک صاحب نے بھی مولانا ہی کے طرز واسلوب کا تتبع کیا ہے۔

الفتح السماوی بتوضیح تفسیر البیضاوی:...... ساتویں صدی ہجری کے مفسر قرآن قاضی ناصر الدین ابو الخیر عبد بن عمر الشیر ازی البیضاوی م ۶۸۵ھ کا نام علم تفسیر میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ کی مرتب کردہ تفسیر انوار التنزیل واسرار التاویل ہمیشہ علماء مفسرین کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے اور اس پر متعدد تعلیقات کی گئیں اور بہت سی شروح لکھی گئیں۔

۲۰ شوال ۱۳۶۰ھ کو اس کتاب کی تالیف کا آغاز کیا گیا یہ تفسیر ہنوز زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی اور اس کا واحد مخطوطہ ادارہ اشرف التحقیق میں موجود ہے۔

بیضاوی کی توضیح اور اس کے ادق نکات کی تشریح میں یہ کتاب ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ طوالت واطناب سے گریز کیا گیا ہے اور نہ اس قدر اختصار سے کام لیا گیا کہ بیضاوی کے دقیق نکات وضاحت طلب رہ جائیں۔ اس مسودہ کی تدوین کے بعد اگر موزوں سائز پر طبع کرایا جائے تو تقریباً چار ہزار صفحات اس کی ضخامت ہوگی۔

مقدمۃ التفسیر بم...... اصول وتاریخ تفسیر پر ایک جامع اور مفصل رسالہ ہے جو ابھی تک مخطوط شکل میں ہے۔

علم حدیث...... تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری:...... بخاری کے مشکل مقامات خصوصاً تراجم ابواب جو امام بخاری کی ایک امتیازی شان ہے، کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ اس کے تین اجزاء طبع ہو چکے ہیں جب کہ بقیہ اجزاء ابھی طبع نہیں ہو سکے۔ ①

التعلیق الصبیح علیٰ مشکوۃ المصابیح:...... ولی الدین محمد بن عبد اللہ الخطیب کی کتاب مشکوۃ المصابیح مجموعہائے حدیث میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ علماء نے اس کتاب کی جس قدر شروح لکھی ہیں، شاید کسی اور کتاب کو یہ سعادت حاصل نہ ہوئی ہو۔ مولانا نے اس کتاب میں مشکوۃ کی عمدہ اور آسان زبان میں بلیغ پیرایہ میں توضیح وتشریح کی ہے۔ مولانا کی حیات میں اس کتاب کے چار اجزاء دمشق اور باقی چار اجزاء پاکستان میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد یہ کتاب از سر نو سات جلدوں میں مکمل طبع ہوئی ہے۔

---

① ادارہ اشرف التحقیق (جامعہ دار العلوم الاسلامیہ لاہور) میں جدید انداز پر مولانا ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی حفظہ اللہ کام کر رہے ہیں اور تحقیق کے بعد مجلدات زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر پر آ چکی ہیں۔ انیس احمد مظاہری

حجیت حدیث:...... حدیث کی قطعیت، اس کی حجیت اور اس کا مصدر شرعی ہونا اس پر مولانا نے اپنی اس کتاب میں دلائل عقلیہ ونقلیہ سے بڑی بھرپور بحث کی ہے اور یہ کتاب منکرین حدیث کے لیے ایک مسکت جواب ہے۔

علم عقائد وکلام...... الکلام الموثوق فی ان کلام اللہ غیر مخلوق:...... قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور کلام الٰہی کے غیر مخلوق اور قدیم ہونے پر مولانا نے اس رسالہ میں بھرپور علمی، تحقیقی اور مدلل گفتگو کی ہے اور معتزلہ وفلاسفہ کے غلط نظریات کی تردید کی ہے۔

احسن الحدیث فی ابطال التثلیث:...... عیسائیت کے نظریہ تثلیث کی تردید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت وبشریت پر ایک عظیم تحقیق ہے عیسائیت کے خلاف مولانا کے متعدد رسائل ہیں جن کو تدوین وتعلیق کے بعد شائع کیا جائے اور قوم کے ان بدنصیبوں کو پڑھایا جائے جو عیسائی مشنری سکولوں میں پڑھ کر اپنے ایمان واسلام کو ضائع کر رہے ہیں۔

عقائد اسلام:...... دین اسلام کے بنیادی واساسی عقائد جن میں توحید ورسالت، قیامت اور ملائکہ پر ایمان شامل ہیں، پر مشتمل اردو زبان میں ایک منفرد کتاب ہے جو اس مسئلہ میں علمی بحث پر مشتمل ہے۔

علم الکلام:...... مذہب اسلام کی خصوصیات، احوال قیامت، جنت وجہنم، عالم برزخ، حوض کوثر کے وجود پر مدلل ومحکم بحث پر مشتمل ہے۔

دستور اسلام:...... اسلامی نظام حکومت کے بیان پر مشتمل ایک عمدہ کتاب ہے جس میں اسلامی نظام انتخاب، اقتصادی نظام اور تعلیمی نظام پر بحث کی گئی ہے اور نظام حکومت کی بنیادوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

خلافت راشدہ:...... صحابہ کی عظمت پر ایمان، عقائد اسلامی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، مولانا نے اپنی اس کتاب میں خلافت راشدہ پر علمی بحث کی ہے۔

سیرۃ المصطفیٰ:...... مولانا کی خدمات دینی وعلمی میں سیرۃ رسول اللہ ﷺ کی خدمت ایک تابندہ ستارہ کی مانند ہے۔ آپ کی تصانیف میں سب سے زیادہ قبولیت عامہ سیرۃ المصطفیٰ کو حاصل ہوئی۔

اس کتاب کے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جو شخص اردو کی ضروری استعداد رکھتا ہو کتاب مذکور کے مطالعہ یا درس سے محروم نہ رہے''۔ ان کتب کے علاوہ مولانا کی بہت سی دیگر مؤلفات ہیں جن کو خوف طوالت سے ترک کر دیا گیا۔

محمد سعد صدیقی

پوتے حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ

حضرت کاندھلوی رحمہ اللہ کے دست مبارک سے لکھا ہوا صفحہ

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ
وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ
اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ
الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا
لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ
حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا
عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ

حضرت کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک سے لکھا ہوا صفحہ

لطائف و معارف

اس آیت سے حضرت ابو بکر صدیق کی جو فضیلت نکلتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے واقعی واقعہ غار میں انکی جان نثاری قابل صد آفرین ہے یارِ غار کی مَثَل جو دنیا میں مشہور ہے وہ یہیں سے چلی ہے حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ابو بکر مجھے صرف غار کی فضیلت دیدیں اور مجھ سے تمام عمر کی عبادت اور نیکیاں لے لیں تو میں اسپر راضی ہوں

امت مرحومہ کا اسپر اتفاق ہے کہ اسوقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق غار صرف حضرت صدیق تھے حتی کہ مخالفین بھی اسکا مقر اور معترف ہیں پس یہ ایک ایسی فضیلت ہے جو حضرت صدیق کی شان عظمت کو واضح کر رہی ہے اور اگر عند اللہ انکو شرف قبولیت حاصل نہ ہوتا تو انکی اس فضیلت

مقدمۂ کاندھلوی رحمہ اللہ

بسم اللہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ عَبْدِہٖ وَرَسُوْلِہٖ سَیِّدِ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ وَعَلٰیٓ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّاتِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلَیْنَا مَعَھُمْ یَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

حمد بے حد اور سپاس بے قیاس خاص تیرے ہی لیے ہے اے خداوند ذوالجلال کہ تو نے ہم کو وجود عطا کیا اور ایمان اور اسلام کی دولت سے سرفراز فرمایا اور سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ کی امت میں ہم کو پیدا کیا اور قرآن سکھایا تاکہ دل روشن ہو اور اظہار مافی الضمیر اور بیان کے لیے زبان عطا کی تاکہ تیرا کلام پڑھ سکیں اور تیرا نام لے سکیں اور تیرے حکموں کو گاتے اور بجاتے پھر سکیں۔ اور ہزاراں ہزار صلاۃ و سلام ہوں رسول مقبول ﷺ پر جن کے ذریعہ ہم نابکاروں اور ناہنجاروں کو تیرا پیغام پہونچا اور جن کے ذریعہ ہم گم گشتگانِ راہ کو تجھ تک پہونچنے کا راستہ معلوم ہوا اور ہزاراں ہزار رحمتیں اور برکتیں ہوں حضور پرنور کے آل واصحاب پر جنہوں نے بلا کم و کاست نہایت امانت و دیانت اور کمال حفاظت کے ساتھ تیرے کلام کو؟ اور تیرے دشمنوں سے جہاد و قتال کیا اور تیری راہ میں اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کو پانی کی طرح بہایا اور اپنے اہل و عیال کو تجھ پر اور تیرے رسول پر قربان کیا حتی کہ تیرے دین کو سربلند کیا اور کفر کو سرنگوں کیا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

اور ہزاراں ہزار رحمتیں ہوں ان علمائے دین پر جنہوں نے تیرے عطا کردہ نورِ فہم اور نورِ تقویٰ سے کتاب وسنت کے حقائق و دقائق کو اور شریعت کے لطائف و معارف کو ایسا روشن کیا کہ جس کو دیکھ کر دنیا حیران ہے اور کسی امت میں یہ جرات نہیں کہ وہ امت محمدیہ جیسے مفسرین اور محدثین اور فقہاء و متکلمین اور اولیاء اور عارفین کے مقابلہ میں توریت وانجیل کا مفسر اور محدث اور فقیہ اور متکلم اور صوفی اور مفتی پیش کر سکے کہ وہ علما اسلام کی طرح توریت وانجیل کی تفسیر کرتا ہو اور توریت وانجیل کی روشنی میں اپنے مذہبوں کو فتوے دیتا ہو اور حلال و حرام سے انکو آگاہ کرتا ہو۔ یہود و نصاریٰ میں اگر کچھ ہمت ہے تو کرۂ ارضی کے کسی گوشہ میں توریت اور انجیل کا کوئی پکا کچا حافظ یا چھوٹا موٹا مفسر اور محدث اور مفتی ہو تو نکال کر لائیں اور دنیا کو دکھلائیں۔

اے اللہ تو اپنی رحمت اور عنایت سے اس نابکار و ناہنجار حرف نگار کو ان علماء ربانیین کے زمرہ میں داخل فرما جنہوں نے تیرے کلام کی خدمت کی اور اس کی تفسیریں لکھیں اور میرے والدین پر بھی رحمت فرما جنہوں نے اس ناچیز کو قرآن کریم حفظ کرایا اور دین کا علم سکھایا

روح پدرم شاد کہ می گفت باستاد
فرزند مرا عشق بیا موزود گر ہیچ

اور اے اللہ مجھ کو اور میری اولاد کو اور اولاد اولاد کو اپنے علم کا صحیح وارث بنا اور ہمارے ظاہر و باطن کو اپنے دین کے

رنگ سے رنگین فرما اور صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ کا صحیح مصداق بنا آمین یارب العالمین۔

اما بعد

بندۂ ناچیز حافظ محمد ادریس بن مولانا[1] حافظ محمد اسمٰعیل کاندھلوی رحمہ اللہ جو نسباً صدیقی اور مذہباً حنفی اور مشرباً چشتی ہے۔ اہل اسلام کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے اپنے بندوں کو ہدایت کے لئے سرور عالم سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا پس عام بندوں پر اس کا سمجھنا اور علماء پر اس کا سمجھانا فرض ہوا تاکہ خدا تعالیٰ کے حکموں اور اس کی اتاری ہوئی ہدایتوں پر عمل کر کے فریضہ بندگی بجالا سکیں جو بندہ خدا تعالیٰ کے حکموں کو نہ مانے اور بندگی نہ بجالائے تو وہ بندہ نہیں بلکہ وہ گندہ ہے۔ قرآن کریم عربی زبان میں اُترا جس کا ہندوستان کے عوام کو سمجھنا بہت مشکل تھا اس لیے ہندوستان میں سب سے پہلے عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ۱۱۵۰ھ میں کلام اللہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جس کا نام ''فتح الرحمٰن'' رکھا، اس زمانہ میں ہندوستان کے مسلمان بکثرت فارسی زبان سمجھتے تھے اور خط وکتابت اکثر وبیشتر فارسی میں ہوتی تھی اور سرکاری مراسلے سب کے سب فارسی میں ہوتے تھے اس لیے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے لوگوں کی سہولت کے لیئے فارسی میں ترجمہ کیا بعد ازاں فارسی کا رواج کم ہوتا چلا گیا اور ضرورت اس کی ہوئی کہ اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا جائے چنانچہ شاہ ولی اللہ کے ترجمہ کے پچپن سال بعد ۱۲۰۵ھ میں ان کے فرزند ارجمند شاہ عبدالقادر دہلوی نے اردو میں قرآن کریم کا بامحاورہ ترجمہ کیا مگر اس کا پورا پورا لحاظ رکھا کہ محاورہ، مدلول قرآنی کے تابع رہے ایسا نہ ہو کہ مدلول قرآنی کو محاورۂ زبان پر قربان کر دیا جائے۔ یہ اردو میں سب سے پہلا ترجمہ تھا جو نہایت عمدہ ہے اور بے مثال اور بے نظیر ہے اور ہر طرح سے قابل اطمینان اور قابل وثوق و اعتماد ہے اور علماء ربانیین کے نزدیک مستند اور معتمد ہے شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ نے علاوہ ترجمہ کے مختصر اور ضروری فوائد بھی لکھے ہیں جو مشکلات میں مشعل راہ کا کام دیتے ہیں اور جن مشکل مقامات پر اکابر علماء کا قلم خاموش نظر آتا ہے وہاں شاہ عبدالقادر کا قلم بولتا ہے اور بالبداہت اس شعر کا مصداق نظر آتا ہے۔

بینی اندر خود علوم اولیاء   بے کتاب و بے معید و اوستا

اور اس ترجمہ کا نام ''موضح القرآن'' رکھا جو اس کی صفت بھی ہے اور تاریخ بھی، شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے ۱۲۳۰ھ میں بمقام دہلی وفات[2] پائی۔

دوسرا اردو ترجمہ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ دہلوی متوفی ۱۲۳۳ھ نے کیا مگر شاہ رفیع الدین کا ترجمہ تحت اللفظ تھا کہ جو ترتیب الفاظ قرآنی کی ہے وہی ترتیب اردو ترجمہ کے الفاظ کی رہے تاکہ کم استعداد والے کو یہ معلوم ہو سکے کہ یہ کس لفظ کا ترجمہ ہے اس امر کو ملحوظ رکھ کر شاہ رفیع الدین نے لفظی ترجمہ فرمایا اور یہ امر ایک درجہ میں بہت مشکل ہے

---

[1] والد صاحب مرحوم یعنی مولانا حافظ محمد اسمٰعیل نے بتاریخ ۱۹ شوال شب جمعہ ۱۳۶۱ھ بمقام قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر انتقال فرمایا اور جمعہ کی نماز کے بعد عیدگاہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ ربنا اغفرلی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب۔ آمین

[2] مراٰۃ التفسیر ص: ۶۴ مصنفہ مولانا ذوالفقار احمد میں شاہ عبدالقادر کی تاریخ وفات ۱۲۳۰ھ لکھی ہے اور صاحب حدائق الحنفیہ نے یہ لکھا ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی اور مشہور یہی تاریخ وفات ہے۔ دیکھو حدائق الحنفیہ ص: ۴۷۱، واللہ اعلم۔

کہ اردو ترجمہ میں الفاظ قرآنی کی ترتیب بھی ملحوظ رہے اور تا حد امکان اردو زبان کی فصاحت بھی ملحوظ رہے الغرض اس مصلحت کی بناء پر شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ کا ترجمہ لفظی تھا اور شاہ عبد القادر رحمہ اللہ کا ترجمہ با محاورہ تھا تا کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے اور مطلب بخوبی ذہن میں آجائے اس لیے کہ جو سہولت فہم با محاورہ ترجمہ سے حاصل ہو سکتی ہے وہ لفظی ترجمہ سے ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی اگر چہ تحت اللفظ ترجمہ کرنا اور ایک حاصل نہیں ہو سکتی نہ جانے دینا یہ بھی بہت بڑا کمال ہے لیکن آسانی سے مطلب سمجھنا جو با محاورہ ترجمہ سے ممکن ہے وہ تحت اللفظ ترجمہ سے ممکن نہیں غرض یہ کہ شاہ عبد القادر نے با محاورہ ترجمہ کیا جو عجب شان رکھتا ہے کہ جس کے الفاظ، فصاحت و بلاغت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس کے تحت معانی کا ایک سمندر موجزن ہے۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ اگر قرآن اردو زبان میں نازل ہوتا تو انہی محاورات اور الفاظ کے لباس میں نازل ہوتا جو شاہ عبد القادر نے استعمال کیے ہیں اسی عرصہ میں شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادہ شاہ عبد العزیز نے ۱۲۰۷ھ میں فارسی زبان میں ایک مبسوط تفسیر لکھنی شروع کی جو حقائق و معارف میں بلاشبہ امام رازی کی تفسیر کبیر کا نمونہ تھی کاش کہ مکمل ہو جاتی مگر افسوس کہ مکمل نہ ہو سکی ایک حصہ میں صرف پارہ الٓم اور پارہ سیقول کی آیت ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ تک تفسیر آئی اور دوسرے حصہ میں پارہ تبارک الذی اور پارہ عم کی تفسیر آئی۔ درمیان قرآن کی تفسیر نہ ہو سکی اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو بسیط ارض پر اس تفسیر کی نظیر نہ ہوتی جیسا کہ تفسیر عزیزی کے موجودہ حصہ کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے دقیق اور عمیق علوم کسی اور تفسیر میں نظر نہیں آتے۔

شاہ عبد[1] العزیز رحمہ اللہ نے ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی نماز جنازہ بیرون شہر دہلی ادا کی گئی۔ اطراف و اکناف سے آنے والوں کے ہجوم کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا پچپن مرتبہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اور دہلی کے ترکمان دروازہ کے باہر اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

غرض یہ کہ ہندوستان میں فارسی اور اردو میں ترجمہ اور تفسیر لکھنے کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ کے وقت سے شروع ہوا۔ شاہ ولی اللہ ۱۱۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۵۰ھ میں فارسی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا جس کا نام "فتح الرحمٰن" رکھا اور ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔ "مقتدائے دقیقہ شناس" تاریخ وفات ہے۔

تفسیر قرآن کا پہلا وہ بنیادی پتھر اس کا وہ صحیح ترجمہ ہے جو قواعد عربیت اور قواعد شریعت کے پورا پورا مطابق ہو ہندوستان میں تفسیر قرآن کا یہ سنگ بنیاد یعنی صحیح ترجمۂ قرآن، شاہ ولی اللہ اور ان کے دونوں بیٹوں شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین کے ہاتھوں رکھا گیا اور ہندوستان میں یہ خیر کثیر (ترجمۂ قرآن کریم) اس مبارک باپ اور مبارک بیٹوں کے ہاتھوں سے جاری ہوئی اور یہی تین ترجمے اردو زبان میں تفسیر قرآن کے لیے سنگ بنیاد بنے اور ہندوستان میں کوئی عالم ان ترجموں سے بہتر ترجمہ نہ کر سکا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ بہ عن الاسلام وسائر المسلمین خیرا آمین یارب العالمین۔

غرض یہ کہ یہ حضرات ترجمۂ قرآن کے بانی اور امام ہیں اور علوم دینیہ میں تمام ہندوستان کے استاد ہیں اور حق تو یہ

---

[1] شاہ عبد العزیز کا تاریخی نام غلام حلیم ہے۔ جس سے ۱۱۵۹ھ نکلتا ہے یہی آپ کا سن ولادت ہے۔ تحفۂ اثنا عشریہ کے دیباچہ میں غلام حلیم کے نام سے اپنے کو مؤلف کتاب ظاہر کیا ہے علوم و فنون اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ سے حاصل کیے اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے نوے سال کی عمر میں وفات پائی۔

ہے کہ اگر یہ تین ترجمے نہ ہوتے تو ہر کس و ناکس کو ترجمہ کا حوصلہ بھی نہ ہوتا اس لیے کہ کسی کے کلام اور مطلب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ادا کرنے کا نام ترجمہ ہے اور یہ کام نہایت دشوار ہے جب تک مترجم دونوں زبانوں کے لغات اور محاورات اور استعارات و کنایات اور حقیقت و مجاز اور اسالیب کلام سے پورا واقف نہ ہو تو ترجمہ نہیں کر سکتا ہر کس و ناکس کا تو کیا ذکر ہے۔ اگر ان حضرات کے یہ تراجم نہ ہوتے تو بڑے بڑے علماء کو ترجمہ دشوار ہو جاتا اور شاید بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعہ کے بعد بھی ایسا ترجمہ نہ کر سکتے۔ ان حضرات جیسا نورِ فہم اور نورِ تقویٰ کس کے پاس ہے جو ان جیسا ترجمہ کر سکتے۔ ان تین ترجموں کے بعد جس کسی نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا سو اس نے شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کی مدد اور سہارے سے کیا۔ حق جل شانہ نے اپنے کلام پاک کی اس خدمت یعنی ترجمہ کے لیے سرزمین ہند سے شاہ ولی اللہ اور اس کے بیٹوں کو منتخب فرمایا۔ وَذَالِكَ فضلُ اللهِ يؤتيه مَن يشآء۔

بحمدہٖ تعالیٰ جب فہم قرآن کی یہ پہلی منزل یعنی ترجمہ کی منزل گذر گئی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ان تین علماء ربانیین اور راسخین فی العلم کے تین نہایت صحیح اور بے مثال ترجمے پہونچ گئے تو اب اس منزل کے طے ہو جانے کے بعد ضرورت اسکی تھی کہ اردو زبان میں قرآن کریم کی کوئی مختصر اور جامع تفسیر لکھی جائے جس میں فقط حل مطالب اور ربط آیات کا خاص اہتمام کیا جائے اور شیخ جلال الدین سیوطی ؒ کی طرح اقوال مختلفہ میں سے ارجح الاقوال پر اکتفا اور اقتصار کیا جائے اور لطائف اور نکات اور مذاہب باطلہ کی تردید کی تفصیل سے گریز کیا جائے تاکہ خاص و عام اس سے نفع اٹھا سکیں۔

یہ خدمت اور یہ سعادت من جانب اللہ حکیم الامت حضرت مولانا حافظ محمد اشرف علی صاحب تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ قدس اللہ سرہ کے حصہ میں آئی اور بیان القرآن کے نام سے ۱۳۲۵ھ میں ایک تفسیر لکھی جو اپنی افادیت اور جامعیت اور مقبولیت میں ثریٰ سے ثریا تک پہونچ گئی،

اور اسی زمانہ میں "بیان القرآن" سے کچھ عرصہ پہلے حضرت مولانا عبدالحق صاحب دہلوی نے "فتح المنان" کے نام سے ایک تفسیر لکھی جو تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے جس میں مختصر حل القرآن و توضیح مطالب کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور ملاحدہ اور زنادقہ کی تردید پر بھی کلام فرمایا اور فلسفہ قدیم و جدید کے اعتراضات کے تسلی بخش جوابات دیئے یہ تفسیر بھی بحمدہٖ تعالیٰ بہت مقبول ہوئی اور گم کشتگان راہ کے لیے مشعل ہدایت بنی مگر تفسیری حیثیت سے مطالب قرآنیہ کی بالاستیعاب توضیح اور مسلسل تشریح اور ربط آیات اور حل مشکلات اور بیان معانی میں جو نرالی شان "بیان القرآن" کو حاصل ہوئی وہ اردو زبان میں کسی اور تفسیر کو حاصل نہیں ہوئی۔ وَاللهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔

اور اسی طرز پر ایک نہایت مختصر اور جامع تفسیر جو جدید شبہات کے قلع قمع کے لیے کافی اور شافی ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی قدس اللہ سرہ نے لکھی جو نہایت مقبول ہوئی۔ اور فصاحت و بلاغت اور حسن تعبیر کے اعتبار سے بھی بے نظیر ہے۔

بحمدہٖ تعالیٰ جب فہم قرآن کی یہ دو منزلیں اور طے ہو گئیں اول صحیح ترجمہ دوم مختصر اور جامع تفسیر جس سے قرآن کریم کے مطالب اور معانی بخوبی و آسانی سمجھ میں آسکیں تو اب ضرورت اس کی ہوئی کہ بیان القرآن کے طرز پر ایک ایسی تفسیر لکھی

جائے جو مطالب قرآنیہ کی توضیح وتشریح اور ربط آیات کے علاوہ قدرے احادیث صحیحہ اور اقوال صحابہ وتابعین پر اور بقدر ضرورت لطائف و معارف اور نکات اور مسائل مشکلہ کی تحقیقات اور ملاحدہ و زنادقہ کی تردید اور ان کے شبہات اور اعتراضات کے جوابات پر بھی مشتمل ہوتا کہ کلام خداوندی کی عظمت وشوکت اور اس کی جامعیت اور اس کے اعجاز کا کچھ نمونہ نظروں کے سامنے آجائے پھر یہ کہ وہ ترجمہ اور تفسیر سلف صالحین کے مسلک سے ذرہ برابر ہٹا ہوا نہ ہو عہد نبوت اور عہد صحابہ و تابعین سے لے کر اس وقت تک امت کے علماء ربانیین اور راسخین فی العلم نے جس طرح قرآن کریم کا مطلب سمجھا ہے اسی طرح اس امانت کو بلاکسی خیانت کے مسلمانوں تک پہونچا دیا جائے اور کسی جگہ بھی اپنی رائے اور خیال اور نظریہ کو قرآن کے بہانہ سے پیش کر کے مسلمانوں کو دھوکہ اور فریب نہ دیا جائے جیسا کہ آج کل آزاد منشوں کا یہ طریقہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیریں لکھ کر اس لیے شائع کررہے ہیں کہ تاویل وتحریف کے ذریعہ قرآنی تعلیمات کو مغربی تہذیب وتمدن کے مطابق کردیں ان آزاد مفسروں کی ہمہ تن یہ کوشش ہوتی ہے کہ لفظ تو عربی ہوں اور معنی مغربی ہوں اور یورپ کے ملحدین کے خیالات باطلہ کو قرآن کے نام سے مسلمانوں میں پھیلایا جائے۔ غرض یہ کہ یہ گروہ قانون خداوندی کو مسخ کررہا ہے اور اپنے حسب منشاء قرآن کے معنی گھڑ کر لوگوں میں شائع کررہا ہے۔ اللهم احفظنا منهم

اے مسلمانو! خوب سمجھ لو یہ گروہ قرآن کریم کا مترجم اور مفسر نہیں بلکہ یورپ کے نفسانی تمدن کا مترجم اور مفسر ہے ان سے بچتے رہنا ناچیز نے مسلمانوں کو اس فتنہ سے بچانے کے لیے یہ تفسیر لکھنی شروع کی کہ جیسا مطلب قرآن کریم کا اللہ کے رسول نے اور صحابہ وتابعین نے سمجھا ہے وہی مسلمانوں کے سامنے پیش کردے تاکہ لوگ صحیح طور پر قرآن کو سمجھ سکیں اور صحیح طور پر اس پر عمل کرسکیں بغیر علم صحیح کے عمل صحیح ناممکن ہے یہ ناچیز سلف صالحین کے اتباع کو سعادت سمجھتا ہے اور سلف کے مسلک سے ہٹ کر تفسیر کو ضلالت اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت سمجھتا ہے۔

تو مباش اصلاً کمال اینست وبس   تو در و گم شو وصال اینست وبس

بحمدہٖ تعالیٰ اس فقیر وحقیر نے اسی التزام کے ساتھ تقریباً ۱۳۶۰ھ میں تفسیر لکھنی شروع کی مگر دیگر مشاغل کی بناء پر پابندی نہ ہوسکی، جب موقعہ ملا کچھ لکھ لیتا۔ اور ارادہ یہ کیا کہ جس طرح صحابہ وتابعین اور سلفِ صالحین نے قرآن کریم کو سمجھا ہے بعینہٖ اسی طرح اس کو مسلمانوں تک پہونچا دیا جائے مغربیت اور عصریت کے نفسانی تقاضوں سے مرعوب ہوکر قرآنِ کریم کے مدلول اور مفہوم کو نہ بدلا جائے۔

اور "مَعَارِفُ الْقُرْآن" اس تفسیر کا نام رکھا جو اس رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ میں سورۂ نساء کے ختم تک پہونچی وللہ الحمد والمنۃ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور عنایت سے باقی کی تکمیل فرمائے اور قبول فرمائے۔ آمین

اس حقیر وفقیر کی یہ تفسیر گداگروں کی جھولی کی طرح ہے جو قسم قسم کے کھانوں اور طرح طرح کے نوالوں سے لبریز ہے اور فقیروں کی گدڑی کی طرح ہے جس میں ناظرین کو رنگ برنگ کے پیوند نظر آئیں گے۔ اگر کوئی اس گدائے بے نوا سے پوچھے کہ تیرے پاس یہ قسم قسم کے کھانے اور رنگ برنگ کے اطلس وکمخواب کے ٹکڑے کہاں سے میسر آئے تو یہ ناچیز جواب میں یہ عرض کرے گا کہ میں تو گدائے بے نوا ہوں مگر بادشاہوں اور امیروں کے دروازوں پر بھیک مانگنے کے لیے جاتا

ہوں وہاں سے بھیک میں جو کھانے مل جاتے ہیں وہ لا کر دوستوں کے سامنے رکھ دیتا ہو جس کو جو لقمہ اور نوالہ خوش ذائقہ معلوم ہو نوش جان کرے اور جو مرغوب طبع نظر آئے وہ تناول کرے۔ یہی حال اس علم کے گدائے بے نوا کا ہے کہ اس تفسیر میں جو کچھ بھی علم ہے، وہ سب کا سب خسروانِ علم وحکمت کے دروازوں سے ملی ہوئی بھیک ہے جو ایک دریوزہ میں جمع کر دی گئی ہے اور اکثر و بیشتر ان دروازوں کے نام بھی بتلا دیئے ہیں جہاں سے یہ فقیر بھیک مانگ کر لایا ہے تاکہ جسے اور کچھ مانگنا اور لینا ہو تو وہ خود ان دروازوں پر پہونچ جائے اس اظہارِ حقیقت کے بعد امید ہے کہ احباب کرام اس ہیچمدان کو اس تالیف میں ایک دستر خوان بچھانے والے سے زیادہ نہ سمجھیں گے۔ اور گاہ بگاہ اس سُفرہ چین کو جو غرق معصیت ہے، دعاءِ مغفرت سے نواز دیا کریں گے۔ آخر جو خادم دستر خوان بچھائے اور اس پر کھانے لاکر چنے اس کا بھی کچھ حق ہے۔ علمی سُفرہ چین کا حق یہ ہے کہ اس کے لیے یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی مغفرت اور رحمت سے نوازیں اور آخرت کی ذلت اور ندامت سے محفوظ رکھیں۔ آمین

عرض حال کے بعد اب یہ ناچیز اپنے خدائے پروردگار سے بصد ہزار عجز و نیاز ملتجی ہے کہ اس تفسیر کو اس فقیر و حقیر کے ہاتھ سے تکمیل کو پہونچائے اور اس کو قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ اور میرے لیے اور میرے والدین کے لیے اور میری اولاد جسمانی اور روحانی کے لیے خصوصاً اور عام مسلمانوں کے لیے عموماً مفید اور نافع اور مشعلِ ہدایت بنائے آمین۔ اور اس تحریر سراپا تقصیر کو اس فقیر و حقیر کے لیے زادِ معاد اور توشۂ آخرت اور خیر جاری اور ذریعۂ مغفرت اور سرمایۂ سعادت بنائے آمین یارب العالمین۔

ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

دَر قیامت ہر کسے در دست آرد نامۂ　　　من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآن در بغل

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

بندۂ ناچیز

محمد ادریس کان اللہ لہ، وکان ہو للہ ووفقہ، لما یحب

ویرضاہ وجعل آخرتہ خیراً من اولاہ۔ آمین

۲۴ شوال المکرم ۱۳۸۲ھ

جامعہ اشرفیہ لاہور

پاکستان

پیش لفظ

(از مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ)

اس صدی کے مایۂ ناز شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی تمام زندگی ہی علم اور دین کی خدمت میں گزری، علوم اسلامیہ میں شغف وانہماک، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف ہمیشہ سرمایۂ حیات رہا۔ دنیائے اسلام ان کی علمی عظمت ومنقبت سے پوری طرح واقف ہے۔ جس زمانے میں اپنی مشہور ومعروف کتاب التعلیق الصبیح شرح مشکوۃ المصابیح طبع کرانے کے لیے دمشق تشریف لے گئے اور وہاں ایک سال قیام فرمایا تو شام وعراق اور مصر کے اکابر علماء نے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا۔

اپنی تحریرات میں خصوصیت کے ساتھ اعتراف کیا کہ آپ عرب وعجم کے ایک مایۂ ناز محدث ومفسر ہیں، تفسیر وحدیث اور علم کلام میں آپ کی گرانقدر تصانیف اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہر فن میں آپ کا مقام بہت بلند تھا، لیکن اپنے شیخ ومربی حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی طرح تفسیر قرآن کریم اور علوم کتاب اللہ کی شرح وتحقیق کا رنگ سب پر غالب تھا، اسی جذبے اور شوق میں تفسیر معارف القرآن شروع فرمائی جو اپنے موضوع پر ایک بے مثال تفسیر ہے اور تمام متقدمین کے علوم ومعارف قرآن کا ایک جامع خزانہ ہے، دورانِ تالیف ہی سلسلۂ طباعت شروع فرمادیا، اخیر حیات میں ضعف ونقاہت کی کوئی حد نہیں رہی حتیٰ کہ اٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہ تھی، لیکن اس ضعف کے باوجود تفسیر کا سلسلۂ تالیف برابر جاری رہا دن رات یہی فکر تھا کہ کسی طرح تفسیر مکمل کرلوں، وفات سے کچھ عرصہ قبل جب ایک مرتبہ ناچیز رمضان المبارک میں عمرہ کے لیے جارہا تھا تو مکتوب گرامی میں والہانہ انداز میں تکمیل تفسیر کے لیے دعا کا ذکر فرماتے ہوئے یہ الفاظ تحریر تھے:

> میرا دل از حد پریشاں ہے، سوائے تفسیر کے کسی چیز میں دل نہیں لگتا اس لیے سب سے فارغ اور یکسو ہونا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تفسیر اور شرح بخاری کو جلد مکمل فرمادے اور ان کی طباعت کا غیب سے انتظام فرمادے۔

لیکن ان اللہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمی۔

اللہ کو یوں ہی منظور تھا کہ پانچویں جلد کی طباعت کے بعد حضرت والد صاحب رحمہ اللہ اس دار فانی سے رحلت فرماگئے۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اس عظیم سایۂ عاطفت کے اٹھ جانے سے جس نے نہ صرف ہم کو بلکہ کل علماء اور طلباء ہی کو یتیم بنادیا۔

قلب ودماغ مجروح تھا اور اس گراں قدر علمی خزانہ کے دفن ہوجانے کے غم کے ساتھ تفسیر معارف القرآن کی تکمیل کا غم اور فکر بھی قلب پر پہاڑ بنا ہوا تھا، میں اپنی بے سروسامانی کے باعث یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ یہ عظیم سلسلہ آئندہ جاری رکھا

جا سکے گا لیکن حق تعالیٰ کا فضل وانعام ہے کہ اس کی توفیق وتائید سے جلد ششم سے نہم تک چار جلد طبع کرا کر حضرات اہل علم کی خدمت میں پیش کیں۔

عجیب شانِ خداوندی ہے کہ مسودۂ تفسیر سورۂ صافات کی آخری آیت ﴿سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۝ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ پر پہنچ کر ختم ہوگیا اور اس آیت کی تفسیر کے بعد حضرت والد صاحب رحمہ اللہ دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ گویا رحمت خداوندی نے اہل جنت کا وَاٰخِرُ دَعۡوٰهُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ والا تشبہ عطا فرما دیا۔

حدیث میں انہی کلمات تسبیح وتحمید پر ہر مجلس کے اختتام کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ خدا کی شان ان کی ساری مجلس زندگی ہی ان کلمات کی تشریح وتفسیر پر ختم ہوئی۔ طبرانی رحمہ اللہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے ایک روایت تخریج کی ہے۔ اس میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جس شخص نے ہر نماز کے بعد یہ کلمات کہہ لیے یعنی "سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ الخ" تو اس نے بڑے بڑے پیمانوں سے ناپ کر اجر وثواب کے عظیم ذخیرے جمع کر لیے۔ تو حق تعالیٰ جل شانہ نے حضرت والد ماجد رحمہ اللہ کی تمام علمی خدمات کے بعد حیات مبارکہ کا اختتام انہی کلمات پر مقدر فرمایا۔ وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

یہ ناچیز گنہ گار علم وعمل سے تہی دامن اس عظیم المرتبہ تفسیر کی تکمیل کا یقیناً اہل تو نہ تھا اور اس کے تصور کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اپنے بزرگ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کے حکم فرمانے پر سورۂ ص سے معارف القرآن کے تکملہ کا ارادہ کر لیا۔ حضرت شیخ الحدیث کے قلم مبارک سے بسم اللہ ● لکھوا کر مسودہ کی ترتیب شروع کر دی۔

"ریشم میں ٹاٹ کا پیوند" ایک مثال ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرا ناقص پیوند اس سے بھی کم درجہ رکھتا ہے، بہر کیف جو بھی کچھ ہو سکا بتوفیق خداوندی جهد المقل دموعه کے طور پر انتہائی ندامت کے یہ جلد حضرات اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ میں اپنے عجز وقصور کا معترف ہوں اور بلا کسی جھجک اپنے اکابر اور احباب سے درخواست کرتا ہوں کہ ناچیز کے اس حصۂ تفسیر میں جو خامی اور غلطی محسوس فرمائیں، اس سے اس ناچیز کو مطلع فرمائیں۔ بڑا ہی احسان ہوگا اور حق تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

اپنے تمام بزرگوں اور احباب کی خدمت میں عاجزانہ درخواست ہے کہ دعا فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ رب العزت اپنی توفیق وتائید سے تکملۂ معارف القرآن کی تکمیل واشاعت آسان فرما دے۔

آمین یا رب العالمین

صلی اللہ تعالیٰ علیٰ صفوۃ البریۃ سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

برحمتك يا ارحم الراحمين۔

بندہ محمد مالک کاندھلوی (رحمہ اللہ)

(سابق) شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

● اس تسمیہ کا عکس شروع میں ص ۳ پر ملاحظہ کریں۔ (ناشر)

مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ

احوال وآثار

شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند اور ان کے جانشین تھے۔ کاندھلہ کے جس علمی خانوادہ سے آپ کا تعلق ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اور والدہ کی جانب سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

ولادت وتعلیم:...... آپ صوبہ یو۔ پی (انڈیا) کے قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کا آغاز حفظ قرآن کریم سے ہوا، دس برس کی عمر میں آپ نے قرآن کریم حفظ کرلیا پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا۔

والد ماجد مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ ان دنوں دار العلوم دیو بند میں شیخ التفسیر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے، آپ بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے مادر علمی دار العلوم دیو بند آگئے، اور وہاں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث مولانا اعزاز علی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع دیو بندی اور والد ماجد حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔

تحریک آزادیٔ ہند کے دوران علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے مسلم لیگ سے وابستگی اختیار کرلی جبکہ حضرت مولانا سید حسن احمد مدنی رحمہ اللہ کانگریس کے حامی تھے۔ علامہ عثمانی رحمہ اللہ نے اس خدشہ کو محسوس کرتے ہوئے کہ یہ سیاسی اختلاف کسی ذاتی مخالفت میں تبدیل نہ ہوجائے۔ دار العلوم دیو بند کو خیر باد کہا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) سے وابستگی اختیار کرلی، مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ اس وقت دورۂ حدیث کے آخری مرحلہ میں تھے آپ بھی مولانا کے ساتھ ڈابھیل آگئے اور جامعہ اسلامیہ میں آپ نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور مولانا بدر عالم میرٹھی جیسے کبار محدثین سے کسب فیض کیا۔ ۱۳۶۲ھ میں آپ درس نظامی کی تعلیم سے فارغ ہوئے۔

فراغت کے بعد اس خیال سے کہ مادر علمی میں اپنے اساتذہ کی زیر نگرانی تدریس اور تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول ہوں گے دار العلوم دیو بند تشریف لائے اس زمانہ میں دار العلوم میں جامع العلوم بہاول نگر کے مہتمم صاحب آئے ہوئے تھے انہوں نے مولانا سے بہاول نگر میں تدریس کی درخواست کی آپ اپنے والد گرامی کے مشورہ اور ان کی رائے سے بہاولنگر آگئے، یہاں سے آپ نے تدریس کا آغاز حدیث میں صحیح مسلم اور ابوداؤد، تفسیر میں جلالین اور فقہ میں ہدایہ کی تدریس سے کیا۔

۱۳۶۵ھ میں آپ کو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کی پیش کش ہوئی جو اس اعتبار سے قابل قدر تھی کہ اس مدرسہ سے آپ نے فراغت حاصل کی تھی اور پھر وہاں آپ اپنے اساتذہ کے پہلو بہ پہلو تدریس کا موقع مل رہا تھا، چنانچہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر آپ ڈابھیل آگئے یہاں آپ نے نابغۃ العصر حضرت علامہ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ درس حدیث کی ذمہ داریوں کو نبھایا۔

قیام پاکستان کے بعد حیدر آباد سندھ کے مضافات میں ٹنڈو الہ یار کے مقام پر دارالعلوم دیوبند کی طرز پر ایک مدرسہ قائم کیا گیا اور اس کا نام بھی دارالعلوم اسلامیہ رکھا گیا۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش اور فیصلہ کے مطابق مولانا احتشام الحق تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو مدرسہ کا مہتمم بنایا گیا۔

مولانا محمد مالک کاندھلوی ؒ نے بھی قیام پاکستان کے بعد پاکستان ہجرت کا ارادہ کرلیا تھا۔ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ آپ کو ملتان خیر المدارس لے جانا چاہتے تھے لیکن استاد محترم علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ کی خواہش تھی کہ آپ ٹنڈو الہ یار جائیں۔

چنانچہ ۱۳۶۷ھ ۱۹۵۰ء میں آپ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ دہلی سے کراچی آئے اور ٹنڈو الہ یار کو ترجیح دی۔

۱۹۵۰ء سے اواخر ۱۹۷۴ء تک آپ نے ۲۵ برس ٹنڈو الہ یار میں گزارے یہاں آپ کو اکابر محدثین کے ہمراہ درس حدیث کا موقع ملا۔ بڑی تعداد میں اندرون و بیرون کے طلبہ نے آپ سے کسب فیض کیا۔ یہ بات میں نے مولانا سے خود کئی مرتبہ سنی، آپ فرماتے تھے: ''میں اپنے وطن کاندھلہ میں اتنا عرصہ نہیں رہا جتنا وقت میں نے ٹنڈو الہ یار میں گزارا''

۱۳۹۴ھ ۱۹۷۴ء میں جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث اور میرے جد امجد حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی ؒ رحمۃ واسعۃ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ حضرت مولانا صاحب کی وفات کے بعد علماء کرام خصوصاً مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی ؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کی اہلیہ، محترمہ پیرانی صاحبہ کے اصرار پر آپ ۲۹ راکتوبر ۱۹۷۴ء۔ ۱۱ شوال المکرم ۱۳۹۴ھ کو ٹنڈو الہ یار کو خیر باد کہہ کر لاہور آ گئے۔ اور اپنے والد گرامی کی جگہ جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گئے۔

بخاری شریف پڑھانا یوں بھی نہایت وقیع اور مشکل امر ہے پھر اس جگہ پر بخاری پڑھانا جہاں حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی ؒ جیسا محدث بخاری پڑھاتا رہا ہو۔ یقیناً یہ ایک ایسا معاملہ تھا کہ جسے مولانا محمد مالک کاندھلوی ؒ جیسی صاحب علم شخصیت ہی نبھا سکتی تھی۔

چند ہی سالوں میں مولانا ؒ کا درس بخاری علماء و طلباء میں مقبول ہو گیا اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ مولانا نے پہلے سال جب بخاری شریف پڑھائی تو طلباء کی تعداد ۲۸ تھی اور جس سال مولانا کا انتقال ہوا، طلبہ کی تعداد ۱۴۰ سے متجاوز تھی۔

۲۱ راکتوبر ۱۹۸۸ء۔ ۹ ر ربیع الاول ۱۴۰۹ھ کو جمعرات و جمعہ کی درمیانی شب میں آپ کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور اسی دورہ سے آپ چند لمحوں میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ حق جل مجدہ نے آپ کی وفات میں نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ سے کئی مناسبتیں پیدا کیں جو نبی کریم ﷺ سے آپ کے تعلق اور علم حدیث سے مناسبت کی مظہر ہیں۔

① آپ کی وفات ربیع الاول کے مہینہ میں ہوئی۔ ② آپ کی وفات ربیع الاول کی ۹ تاریخ کو ہوئی۔

③ وفات کے وقت آپ کی عمر ۶۳ برس تھی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو جمعہ کا روز عطا فرمایا۔ جامعہ اشرفیہ میں نمازِ جمعہ کے بعد سہ پہر ۳ بجے نماز جنازہ ادا کی گئی۔

آپ کی نماز جنازہ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی۔

قومی وملی خدمات:...... مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ تحریک پاکستان میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے ساتھ رہے اور ان سے شرف تلمذ اور ان کی تربیت کے نتیجہ میں ان کو پاکستان سے والہانہ محبت وعقیدت تھی، ہمہ وقت اسی فکر میں رہتے کہ کسی طرح پاکستان میں دین اسلام نافذ ہو جائے۔

جولائی ۱۹۷۷ء میں جب جنرل ضیاء الحق برسر اقتدار آئے تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا، ان سے اسی موضوع پر گفتگو ہوتی۔

جنرل صاحب نے آپ کو مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا۔ میں اس مجلس میں موجود تھا جس میں جنرل صاحب نے مولانا سے شوریٰ کی رکنیت قبول کرنے کی درخواست کی۔ مولانا نے فرمایا یہ میرا مزاج نہیں جس پر جنرل صاحب مرحوم نے فرمایا ''یہ بھی آپ کا ایک قسم کا درسِ بخاری ہوگا''۔ وہاں درس میں طلبہ مستفید ہوتے ہیں، یہاں ہم لوگ مستفید ہوں گے۔ چنانچہ مولانا نے شوریٰ کی رکنیت قبول کرلی۔ اور اخیر تک اس کے لیے رکن رہے۔ مولانا نے وہاں جو دینی وملی خدمات سرانجام دیں اور قانون اسلامی کے لیے جو کوششیں کیں وہ محتاج تفصیل ہیں، جنہیں پھر کسی موقع پر سپردِ قلم کروں گا۔

انصاری کمیشن کے رکن کی حیثیت سے اسلامی نظام حکومت کے لیے سفارشات مرتب کیں اور ایجوکیشن کے رکن کی حیثیت سے نظام تعلیم کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لیے آپ کی کوششیں تاریخ پاکستان کا حصہ ہیں۔

تصنیفات وتالیفات:...... آپ کو درس وتدریس اور تبلیغ و وعظ کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف سے خصوصی شغف تھا، متعدد تبلیغی رسائل کے علاوہ التحریر فی اصول التفسیر منازل العرفان فی علوم القرآن، سراج الهدایہ تاریخ حرمین، پیغام مسیح۔ ترجمہ تجرید صحیح مسلم تالیف فرمائیں تصنیفی میدان میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ اپنے مرحوم والد گرامی رحمہ اللہ کی تفسیر ''معارف القرآن'' کی تکمیل ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابھی اس تفسیر کے ۲۲ سپارے مکمل فرمائے تھے ۲۳واں پارہ جاری تھا اور سورۂ صٰفٰت مکمل ہوئی تھی کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا محمد مالک رحمہ اللہ نے سورۂ صٓ سے سورت ''والناس'' تک بقیہ تفسیر مکمل کی۔ تفسیر کے اس حصے میں آپ نے اپنے والد ماجد کے اسلوب کی پیروی کی اور کتاب کے کسی حصہ سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کتاب کا مصنف تبدیل ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا رحمہ اللہ کی ان خدمات جلیلہ کو شرف قبول عطا فرمائے۔ ان کو اعلیٰ علیین میں شامل فرمائے اور ان کے علوم سے ہمیں مستفید ہونے کی ہمت وتوفیق مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین وما توفیقی الا باللہ

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

۲۰ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ مطابق ۲۵ مئی ۲۰۰۰ء

١ سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ ٥   بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ   اٰياتها ٧ رکوعها ١

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ ف۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿١﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿٢﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ﴿٣﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں ف۲ جو پالنے والا سارے جہان کا ف۳ بے حد مہربان نہایت رحم والا مالک روز جزا کا ف۴ تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں

سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہاں ● کا بہت مہربان نہایت رحم والا مالک انصاف کے دن کا تجھ ہی کو ہم بندگی کریں

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۭ﴿٤﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿٥﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ

اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ف۵ بتلا ہم کو راہ سیدھی راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا ف۶

اور تجھ ہی سے مدد چاہیں چلا ہم کو راہ سیدھی راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا نہ جن پر

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ۝﴿٧﴾ ع١

جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے ف۷

غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے

ف۱ رحمٰن اور رحیم دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے ترجمہ میں، ان سب باتوں کا لحاظ ہے۔

ف۲ یعنی سب تعریفیں عمدہ سے عمدہ اول سے آخر تک جو ہوئی ہیں اور جو ہوں گی خدا ہی کو لائق ہیں۔ کیونکہ ہر نعمت اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور عطا کرنے والا وہی ہے خواہ بلا واسطہ عطا فرمائے یا بالواسطہ جیسے دھوپ کی وجہ سے اگر کسی کو حرارت یا نور پہنچے تو حقیقت میں آفتاب کا فیض ہے۔ شعر

حمد را با تو نسبتے ست درست   بر در ہر کہ رفت بر در تست

تو اب اس کا یہ ترجمہ کرنا کہ (ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے) بڑی کوتاہی کی بات ہے جس کو اہل فہم خوب سمجھتے ہیں۔

ف۳ مجموعہ مخلوقات کو عالم کہتے ہیں اور اسی لئے اس کی جمع نہیں لاتے۔ مگر آیت میں عالم سے مراد ہر ہر جنس (مثلاً عالم جن، عالم ملائکہ، عالم انس وغیرہ وغیرہ) ہیں۔ اس لئے جمع لائے تاکہ جملہ افراد عالم کا مخلوق جناب باری ہونا خوب ظاہر ہو جائے۔

ف۴ اس کے خاص کرنے کی اول وجہ تو یہی ہے کہ اس دن بڑے بڑے امور پیش آئیں گے ایسا خوفناک روز جو نہ پہلے ہوا نہ آگے کو ہوگا دوسرے اس روز بجز ذات پاک حق تعالیٰ کے کسی کو ملک وحکومت ظاہری بھی تو نصیب نہ ہوگی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ

ف۵ اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

ف۶ جن پر انعام کیا گیا وہ چار فرقے ہیں نبیین وصدیقین وشہداء وصالحین کلام اللہ میں دوسرے موقع پر اس کی تصریح ہے اور ﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے یہود اور ﴿ضَّالِّيْنَ﴾ سے نصاریٰ مراد ہیں۔ دیگر آیات وروایات اس پر شاہد ہیں اور صراط مستقیم سے محرومی کل دو طرح پر ہوتی ہے۔ عدم علم یا جان بوجھ کر کوئی فرقہ گمراہ اگلا پچھلا ان دو سے خارج نہیں ہو سکتا سو نصاریٰ تو وجہ اول میں اور یہود دوسری میں ممتاز ہیں۔

ف۷ یہ سورت خدا تعالیٰ نے بندوں کی زبان سے نازل فرمائی کہ جب ہمارے دربار میں حاضر ہو تو ہم سے یوں سوال کیا کرو اس لئے اس سورت کا ایک نام =

● مترجم گوید یعنی عالم انس وعالم جن وعالم ملائکہ وعلی ہذا القیاس۔ فتح الرحمن

سورۂ فاتحہ کی تفسیر

سورۂ فاتحہ جمہور علماء کے نزدیک مکی ہے بعض علماء اس کے مدنی ہونے کی طرف گئے ہیں مگر یہ قول شاذ ہے ابتداء بعثت میں سب سے پہلے ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ الخ چند آیتیں نازل ہوئیں جیسا کہ صحیحین میں ہے اور چند روز کے بعد پوری سورۂ فاتحہ مع بسم اللہ کے نازل ہوئی جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ اور ابونعیم اور بیہقی کی دلائل النبوت میں عمرو بن شرجیل رضی اللہ عنہ سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ سے یہ فرمایا کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو غیب سے کچھ آوازیں سنتا ہوں خدا کی قسم مجھ کو اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ حضرت خدیجہ نے فرمایا معاذ اللہ خدا تعالیٰ کبھی آپ کے ساتھ ایسا نہ کرے گا۔ خدا کی قسم آپ امانتیں ادا کرتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اتفاق سے اسی وقت ابوبکر آ گئے۔ حضرت خدیجہ نے کہا اے ابوبکر تم محمد رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لیکر ورقہ کے پاس جاؤ اور یہ واقعہ بیان کرو چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور (ﷺ) کا ہاتھ پکڑ کر ورقہ کے پاس لے گئے۔ ورقہ نے آپ سے حال دریافت کیا اس پر آپ نے یہ فرمایا:

فقال اذا خلوت وحدی سمعت نداء خلفی یا محمد یا محمد فانطلق ھاربا فی الأرض فقال لاتفعل اذا اتاك فاثبت حتی تسمع ما یقول ثم ائتنی فاخبرنی فلما خلا ناداہ یا مُحمّد قل بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ الحمدللہ ربّ العٰلمین حتی بلغ ولا الضالین قال قل لا الٰه الا اللّٰه فاتی ورقة فذکر ذلك له فقال له ابشر ثم ابشر فانی اشهد انك الذی بشر به ابن مریم وانك علیٰ مثل ناموس موسیٰ وانك نبی مرسل الحدیث (تفسیر در منثور: ۱۵/۱، وتفسیر قرطبی: ۱/۲)

''کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو پیچھے سے غیبی آوازیں یا محمد یا محمد کی سنتا ہوں، جس کی دہشت سے بھاگنے لگتا ہوں۔ ورقہ نے کہا ایسا مت کرو ٹھہر کر اس کی بات سنو اور پھر جو کہے، اس کی آ کر مجھ کو خبر دو۔ چنانچہ اس کے بعد آپ ایک جگہ تنہا تھے آواز آئی اے محمد یہ پڑھئے، بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمدللہ رب العالمین الی آخر السورۃ۔ اس کے بعد کہا لا الہ الا اللہ کہو آپ یہ سب سن کر ورقہ کے پاس آئے اور سارا واقعہ ذکر کیا۔ ورقہ نے کہا اے محمد تم کو بشارت ہو اور پھر بشارت ہو۔ تحقیق میں گواہی دیتا ہوں کہ تم بلاشبہ وہی نبی ہو کہ جن کی مسیح بن مریم نے بشارت دی ہے اور تمہاری شریعت موسیٰ کی شریعت کے طرز کی ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم یقیناً نبی مرسل ہو۔''

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سورت ابتداء بعثت کے چند روز بعد اتری ہے کہ جب خدیجۃ الکبریٰ اور ابوبکر صدیق مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ اور ورقہ نوفل ابھی بقید حیات تھے۔ ابتداء بعثت میں نزول وحی کی شدت اور اس کی عجیب وغریب کیفیت کی وجہ سے جو اس سے پہلے نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی تھی آپ پر ایک خاص خشیت اور دہشت طاری ہو جاتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ جب آدمی پر کوئی خاص کیفیت اور شدت طاری ہوتی ہے تو دل کی تسلی اور تشفی کے لیے اپنے محرم خاص اور محب باختصاص سے ذکر کرتا ہے تا کہ دل کو سکون اور اطمینان ہو۔ آنحضرت ﷺ کا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کرنا اور ورقہ کے پاس جانا محض اس لیے تھا کہ یہ محرم راز اور ہمدم

= تعلیم مسئلہ بھی ہے۔ اس سورت کے ختم پر لفظ آمین کہنا مسنون ہے۔ اور یہ لفظ قرآن شریف سے خارج ہے۔ معنی اس لفظ کے یہ ہیں "الٰہی ایسا ہی ہو" یعنی مقبول بندوں کی پیروی اور نافرمانوں سے علیحدگی میسر ہو اس سورت کے اول نصف میں اللہ تعالیٰ کی ثناء اور صفت اور دوسرے حصے میں بندہ کے لئے دعا ہے۔ فائدہ ﴿صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ الخ الَّذِيْنَ کا بدل ہے یا اس کی صفت ہے اس لئے اس کے مناسب ترجمہ کیا گیا۔ بعض تراجم دہلویہ میں جو اس کا ترجمہ کیا ہے خلاف ترکیب وخلاف مقصود ہے۔

وہم ساز ہیں۔ حبیب اور لبیب ہیں۔ ہوشمند اور دانش مند ذی علم اور ذی فہم ہیں ان سے مل کر تسلی ہوگی۔ معاذ اللہ آپ کو اپنی نبوت و رسالت میں کوئی شبہ اور تردد نہ تھا اور نہ ورقہ سے کوئی تعلیم و تلقین مقصود تھی۔ ورقہ تو صرف توریت اور انجیل کے ایک عالم تھے۔ اور حضرت تو اوتیت علم الاولین والآخرین کے مصداق تھے۔ حضور ورقہ سے کیا علم اور فیض حاصل کرنے جاتے۔ اصل بات یہ تھی کہ ورقہ اگرچہ عالم تھے مگر صاحب حال اور صاحب کیفیت نہ تھے، آپ کے قلب مبارک پر جو وحی کی کیفیت گزر رہی تھی۔ اس کی حقیقت اور اس کی لذت کی کیفیت تو آپ ہی کو معلوم تھی۔ ورقہ ذوقی طور پر نہیں جانتے تھے۔ بلکہ محض علمی طور پر اتنا جانتے تھے کہ حضرات انبیاء پر نزول وحی کے وقت یہ کیفیات گزرتی ہیں۔ اس لیے وہ آپ کی تسلی کرتے تھے اور ایسے وقت میں تسلی اور تشفی وہی کرسکتا ہے کہ جس پر یہ حالت اور یہ کیفیت نہ گزر رہی ہو اور کچھ اجمالی طور پر اس قسم کی چیزوں سے واقف اور باخبر ہو۔ جیسے تیماردار بیمار کی تسلی کرتا ہے۔ ورنہ جس پر یہ کیفیت گزرے گی اور جس پر یہ حالت طاری ہوگی وہ خود ہی خوف زدہ اور دہشت زدہ ہوجائے گا۔ اسے اپنی ہی خبر نہ رہے گی دوسرے کی کیا تسلی اور کیا تشفی کرے گا۔ اور عقلاً یہ ضروری نہیں کہ تسلی دینے والا صاحب حال سے افضل اور اکمل یا اعلم اور افہم ہو۔ فافہم ذلک واستقم۔ ورقہ بن نوفل کا حضور ﷺ کو تسلی دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ انجیل متی کے باب سوم میں یوحنا حواری کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلی دینا مذکور ہے۔ اس نکتہ کو خوب سمجھ لیا جائے۔

چونکہ سب سے پہلے ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ کا نزول ہوا جس میں یہ حکم تھا کہ اللہ کے نام سے پڑھو اس لیے اس کے چند روز بعد ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ الخ کا نزول ہوا یعنی ہم اسی حکم سابق کے مطابق اللہ ہی کے نام سے پڑھتے ہیں۔

بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی، مگر صحاح ستہ کی تمام روایتوں میں سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیتوں کا سب سے پہلے نزول ہونا مذکور ہے اور یہی جمہور کا قول ہے۔ عجب نہیں کہ ان بعض علماء کی مراد یہ ہو کہ سب سے پہلے پوری سورت جو نازل ہوئی، وہ سورۂ فاتحہ ہے اور سورۂ اقرأ ابتداءً پوری نازل نہیں ہوئی، بلکہ اس کی چند آیتیں اتریں اور بقیہ سورت بعد میں نازل ہوئی اور سورۂ فاتحہ پہلی ہی مرتبہ میں پوری نازل ہوئی جیسا کہ روایت مذکورہ سے ظاہر ہے۔

اسماء سورۂ فاتحہ

اس سورت کے بہت سے نام ہیں، مشہور نام فاتحہ ہے، اس لیے کہ قرآن شریف اسی سے شروع ہوتا ہے اور سورۂ الحمد ہے۔ اس لیے کہ ابتداء میں یہ لفظ حمد واقع ہے اور اس سورۃ کو فاتحۃ الکتاب اور فاتحۃ القرآن بھی کہتے ہیں اس لیے کہ کتاب الٰہی کا آغاز اور شروع اسی سورت سے ہوتا ہے اور اس کا ایک نام ام الکتاب بھی ہے یعنی تمام کتاب الٰہی کا خلاصہ اور اجمال۔

حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم کی ہدایت کے لیے ایک سو چار کتابیں مختلف انبیاء و رسل علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام پر اتاریں اور تمام علوم اور حکمتوں کو ان میں ودیعت رکھا اور پھر ان سب کا خلاصہ توریت و انجیل و زبور اور قرآن حکیم میں درج فرمایا اور پھر ان سب علوم کو قرآن حکیم میں بھر دیا اور پھر قرآن کے تمام علوم کو مفصل میں اور علوم

مفصل کو فاتحۃ الکتاب میں ودیعت فرمایا اور فاتحۃ الکتاب کے علوم کو اپنی حکمت بالغہ سے ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ میں بھر دیا۔

کہتی ہے سو زبان سے قرآن کی خامشی
لاریب ذات پاک کی سچی کتاب ہوں
مجھ میں بھرے جہاں کے علوم وفنون ہیں
قرآن میرا نام ہے اُم الکتاب ہوں

اور اس سورۃ کا نام سورۃ الکنز بھی ہے۔ یعنی یہ علوم الٰہی کا ایک عظیم خزانہ ہے ایک حدیث میں ہے کہ یہ سورت ایک خزانہ سے نازل ہوئی ہے جو عرش کے نیچے ہے اور چونکہ اس سورت میں حق جل شانہ نے بندوں کو اپنی بارگاہ میں عرض ومعروض کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے اس لیے اس سورۃ کا نام تعلیم المسئلہ بھی ہے، یعنی جب ہمارے دربار میں حاضر ہوا کرو تو اس طرح معروض کیا کرو کہ اپنی التجاء پیش کرنے سے پہلے خدا کی حمد وثناء کرو اور اس کی عظمت اور طاقت اور اس کی قدرت اور ربوبیت کا دل اور زبان سے اعتراف کرو اور پھر اس کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرو اور اسی کو اپنی حاجتوں کا برلانے والا اور معین ومددگار سمجھو اور یہ دعا مانگو کہ اے اللہ ہمیں ان لوگوں کا راستہ دکھا جن پر تیرا فضل وکرم ہو چکا ہے نہ ایسے لوگوں کا راستہ جن پر تیرا قہر وغضب ہوا اور نہ گمراہوں کا راستہ۔ سبحان اللہ کیسی دعا ہے جو دین ودنیا کی ایسی تمام نعمتوں کو شامل ہے جو قہر وغضب اور گمراہی سے پاک صاف ہوں یعنی سعادت عطا فرما اور شقاوت سے بچا۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ انعام کی طرح ہم کو فضائل سے آراستہ فرما اور اہلِ غضب اور اہلِ ضلال کے ذمائم اور رذائل سے ہم کو بچا تاکہ نابکار ونابکار بندے تیرے مقبول بندوں کی صف میں کھڑے ہو کر تیرے انعام واکرام سے بہرہ یاب ہو سکیں۔ آمین یارب العالمین۔

اہل عقل غور کریں کہ کیا اس سے بڑھ کر کوئی دعا ہو سکتی ہے جو لاکھوں امیدوں اور آرزوؤں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہو۔ اور اس سورت کا ایک نام سورۃ الشفاء اور سورۂ شافیہ بھی ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ سورۂ فاتحہ ہر مرض کے لیے شفاء ہے اور ایک نام اس کا کافیہ اور وافیہ بھی ہے کہ خیرات وبرکات کے لیے کافی اور وافی ہے اور اس سورت کا ایک نام سورۃ الصلاۃ بھی ہے کہ نماز میں اس کا پڑھا جانا ضروری ہے۔ جاننا چاہیے کہ اس سورت کا نماز میں پڑھا جانا ضروری ہے۔ مگر ہر نمازی کے لیے نہیں بلکہ جو امام ہو یا منفرد ہو یعنی اپنی تنہا نماز پڑھتا ہو۔ اس کے لیے نماز میں فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سننا اور خاموش رہنا فرض ولازم ہے، مقتدی کو امام کے پیچھے کچھ پڑھنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَہٗ وَاَنۡصِتُوۡا لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ﴾ یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو نہایت غور اور توجہ کے ساتھ امام کی قرأت کی طرف کان لگا کر سنو اور بالکل خاموش رہو۔ امید ہے کہ اگر تم نے امام کی قرأت کو سنا اور خاموش کھڑے رہے اور امام کے ساتھ قرآن میں کوئی منازعت اور مخالجت نہ کی تو تم پر رحم کیا جائے گا۔ یعنی مقتدیوں سے رحمت خداوندی کا وعدہ استماع اور انصات کے ساتھ مشروط ہے ورنہ پھر یہ وعدہ نہیں اور یہ آیت بالاجماع قرأت خلف الامام کے بارہ میں نازل ہوئی جیسا کہ امام بیہقی اور زرقانی نے اس کی تصریح کی ہے اور احادیث صحیحہ مشہورہ میں ہے کہ "اذا قرأ

فانصتوا" (جب امام پڑھے تو خاموش رہو) اور جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ "لا صلاۃ إلا بفاتحة الکتاب" کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی۔ سوامام احمد بن حنبل اور سفیان بن عیینہ سے ترمذی اور ابوداؤد میں ہے کہ یہ حکم امام اور منفرد کا ہے۔ احادیث دو قسم کی ہیں ایک وہ قسم ہے کہ جس میں امام اور منفرد کے احکام وارد ہوئے ہیں، ان میں یہ آیا ہے کہ نماز میں فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور دوسری قسم احادیث کی وہ ہے کہ جس میں مقتدی کے احکام آئے ہیں۔ ان تمام احادیث میں صرف یہی حکم آیا ہے اذا قرأ فانصتوا کہ جب امام پڑھے تو خاموش رہو امام کے احکام الگ ہیں اور مقتدی کے احکام الگ اپنی اپنی جگہ دونوں ٹھیک ہیں، امام پڑھے اور مقتدی خاموش رہے دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

استعاذہ

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

پناہ پکڑتا ہوں اور حمایت ڈھونڈتا ہوں خدا تعالیٰ کی بہکانے اور پھسلانے سے شیطان مردود کے۔

جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ تلاوت قرآن کی ابتداء سے پہلے "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھنا سنت ہے، جس کے معنی ہیں کہ میں شیطان مردود کے فتنہ سے اللہ کی پناہ میں آنے کی درخواست کرتا ہوں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ اس لیے کہ استعاذہ شیطان کے مکر اور شر سے بچنے کے لیے تریاق کا حکم رکھتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ اور عطاء یہ کہتے ہیں کہ ہر قراءت کے شروع میں استعاذہ واجب ہے خواہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں، استعاذہ کی حقیقت یہ ہے کہ شیطان کے جال میں پھنسنے سے محفوظ ہو جائے اور بسم اللہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ کی رحمت میں داخل ہو جائے اس لیے استعاذہ بسم اللہ پر مقدم ہوا، کیونکہ دفع مضرت، جلب منفعت پر مقدم ہے۔ نیز قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس کی تلاوت سے پہلے زبان اور قلب کی طہارت ضروری ہے، اس لیے تلاوت قرآن سے پہلے استعاذہ کا حکم دیا گیا تا کہ زبان اور قلب کو ایک گونہ طہارت حاصل ہو جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ ہی کے نام نامی [1] اور اسم گرامی کی اعانت اور امداد سے کہ جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ اس کے کلام کو شروع کرتا ہوں اور اس کے کلمات قدسیہ کے انوار و تجلیات اور ظاہری اور باطنی ثمرات و برکات کا امیدوار ہوں۔

﴿بِسْمِ اللّٰهِ﴾ بعض علماء کے نزدیک سورۂ فاتحہ اور ہر سورت کا جزو ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سوائے سورۂ نمل کے کسی سورۃ کا جزو نہیں دو سورتوں میں محض فصل کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ تبرکاً ہر سورت کے ابتداء میں اس کو لکھا جاتا ہے۔

سنن ابی داؤد میں باسناد صحیح ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

"ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یعرف فصل السورۃ حتی ینزل بسم اللہ الرحمن الرحیم۔"

---

[1] نام نامی۔ یہ ترجمہ اسم کی اصل کی طرف اشارہ کے لیے کیا گیا ہے اس لیے کہ اسم کی اصل سمو ہے جو علو اور رفعت پر دلالت کرتی ہے اور شروع کرتا ہوں الخ تک۔ بسم اللہ کے متعلق کی طرف اشارہ ہے کہ تقدیر کلام اس طرح سے ہے: بسم اللہ اشرع کلام اللہ وارجو برکۃ اسمہ انوار کلماتہ القدسیہ وتجلیاتہ اور اس طرف اشارہ ہے کہ جار مجرور کی تقدیر موخر امناسب ہے تا کہ فائدہ حصر اور اختصاص کا حاصل ہو اور اسی حصر کے ظاہر کرنے کے لیے ترجمہ میں "ہی" کا لفظ بڑھایا اللہ ہی کے نام نامی الخ۔

رسول اللہ ﷺ دو سورتوں میں فصل نہ جانتے تھے یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل ہوئی۔

اسی وجہ سے ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ﴾ الخ کو نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ جہراً نہیں پڑھا جاتا تا کہ جزء فاتحہ ہونے کا واہمہ نہ ہو۔ اور اسی لیے ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ﴾ الخ کو کسی سورۃ کے ساتھ ملا کر نہیں لکھتے بلکہ ہمیشہ سورۃ سے علیحدہ دو خطوں کے درمیان میں لکھتے ہیں تا کہ جزء سورت ہونے کا شبہ نہ ہو، مگر سورۂ نمل میں بسم اللہ بالاتفاق سورت کا جزء ہے اس لیے اس کو مثل دیگر آیات کے ملا کر لکھا جاتا ہے۔

نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم اور خلفائے راشدین کی مستمرہ سنت یہ تھی کہ بسم اللہ کو نماز میں آہستہ پڑھتے تھے۔ (ابن کثیر، ترمذی، زاد المعاد)

امام ابوبکر رازی رحمہ اللہ نے احکام القرآن میں اس مسئلہ کی خوب تفصیل فرمائی ہے اور امام اعظم نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مسلک کا خوب مدلل اور مبرہن ہونا ثابت کیا ہے۔ حضرات اہل علم اس کی طرف مراجعت فرمائیں۔

بسم اللہ کے شروع میں جو ''با'' ہے بعض علماء کے نزدیک وہ مصاحبت اور الصاق کے لیے ہے اور بعض علماء کے نزدیک استعانت کے لیے ہے اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس صورت میں ابتداء ہی سے اپنی عبودیت اور عجز و استکانت کا اظہار اور پہلے ہی وهلہ میں اپنی حَول اور قوۃ سے تبری کا اعلان ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی اعانت اور توفیق سے ہم شروع کرتے ہیں۔ حاشا اپنی حول اور قوۃ سے نہیں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ اور بارگاہ الوہیت کا ادب بھی اسی کو مقتضی ہے کہ وہاں عبودیت اور تذلل ہی کا اظہار ہو۔ اور ادعاء مصاحبت نہ ہو۔ ﴿تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً﴾ اور یہی معنی ﴿اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ کے زیادہ مناسب ہیں اور یہی معنی لاحول ولاقوۃ الا باللہ کے مرادف ہونے کی وجہ سے ''كَنْزٌ مِّنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ'' (یعنی جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ) کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور بسم اللہ کی ''با'' کا کسرہ بھی انکسار اور ذل عبودیت ہی کی طرف مشیر ہے۔

اَللہ اس ذات واجب الوجود کا عَلَم ہے جو تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے اور ہر قسم کے عیب اور نقص کے شائبہ اور واہمہ سے بھی پاک اور منزہ ہے اور اسی وجہ سے لفظ جلالت ہمیشہ موصوف ہی واقع ہوتا ہے اور اسماء حسنیٰ کو بطور صفت اس اسم عظیم کے بعد ذکر کیا جاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡمَلِكُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ الۡمُؤۡمِنُ الۡمُهَيۡمِنُ الۡعَزِيۡزُ الۡجَبَّارُ الۡمُتَكَبِّرُ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ﴾۔

اور یہ اسم عظیم رب اعلیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے اس کا اطلاق ہمیشہ سے صرف اسی وحدہ لاشریک لہ کی ذات پاک کے لیے ہوا ہے۔ جس طرح کوئی اس کی ذات اور صفات میں اس کا شریک وسہیم نہیں، اسی طرح اس اسم عظیم میں بھی اس کا کوئی قسیم نہیں۔ اسی وجہ سے تمام اولیاء اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اسم ذات ہی اسم اعظم ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ نے بھی لفظ ''اللہ'' ہی کو اسم اعظم فرمایا ہے، جیسا کہ امام طحاوی نے اپنی سند سے نقل کیا ہے:

حدثنا محمد بن الحسن عن ابی حنیفة قال اسم الله الاکبر ھو الله قال محمد الا تریٰ ان الرحمن اشتق من الرحمة والرب من الربوبیة وذکر اشیاء نحو ھذا والله غیر مشتق من شیئ"۔ (مشکل الآثار: ۱/۶۲)

محمد بن حسن نے روایت کیا امام ابوحنیفہ سے کہ اسم اعظم وہ لفظ اللہ ہے کہا محمد بن حسن نے اس لیے کہ رحمٰن مشتق ہے رحمت سے اور رب مشتق ہے ربوبیت سے اور اس قسم کی مثالیں ذکر فرمائیں اور لفظ اللہ کسی شیٔ سے مشتق نہیں۔ (مشکل الآثار)

خود چہ شیرین ست نام پاک تو   خوشتر از آب حیات ادراک تو
نام تو چوں بر زبانم میرود   ہر بُنِ موازعل جوئے شود
اللہ اللہ ایں چہ شیرین است نام   شیر وشکر می شود جانم تمام
اللہ اللہ ایں چہ نام خوش مذاق   حرف حرفش میدہد جان را رواق
اسم اعظم ہست اللہ العظیم   جانِ جان و محی عظم رمیم

(خاتمہ مثنوی از مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قدس اللہ سرہ)

اسم اللہ کے بعد تمام اسماء حسنیٰ میں اسمِ رَحْمٰن کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿قُلِ ادْعُوا اللهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو۔

بظاہر اسی وجہ سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب یہ دو نام ہیں: عبداللہ اور عبدالرحمن۔ عبداللہ میں عبد، اسمِ اعظم کی طرف مضاف ہے اور عبدالرحمن میں اسم رحمٰن کی طرف مضاف ہے جس کا مرتبہ اسم اعظم کے بعد ہے، اسی وجہ سے حدیث میں نبی کریم ﷺ نے عبداللہ کو پہلے ذکر فرمایا اور عبدالرحمن کو بعد میں۔

رَحْمٰن اور رَحِیْم دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اختلاف اس میں ہے کہ کس میں مبالغہ زیادہ ہے۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ رحمٰن میں بہ نسبت رحیم کے زیادہ مبالغہ ہے اس لیے کہ لفظ رحمٰن اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور رحیم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن کریم میں رحیم کا اطلاق نبی کریم ﷺ کے حق میں بھی آیا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ پس رحمٰن کے معنی ایسا انعام کرنے والا کہ کوئی اس جیسا انعام نہ کر سکے اور یہ معنی حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور رحیم مطلق منعم کو کہتے ہیں خواہ دوسرا اس جیسا انعام کر سکے یا نہ کر سکے اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ دونوں ہم معنی ہیں جیسے ندمان اور ندیم تاکید کے لیے دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ اور ان صفتوں کا اطلاق حق جل وعلاء پر ایسا ہی حقیقی ہے جیسا علیم وقدیر اور سمیع وبصیر کا اطلاق اس پر حقیقی ہے۔ اور جس طرح اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں اور اس کا سننا اور دیکھنا اور کلام کرنا ہمارے سننے اور دیکھنے اور کلام کرنے کے مشابہ نہیں اسی طرح اس کی رحمت بھی ہماری رحمت کے مماثل نہیں۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ کوئی شے اُس کے مثل نہیں وہ خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

وہ اپنے سننے اور دیکھنے میں اور ادراک اور علم میں جوارح کا محتاج نہیں۔

﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ﴾ اللہ ہی ہر طرح سے بے نیاز ہے اور تم ہی ہر طرح سے اس کے محتاج ہو۔

اسی طرح وہ اپنی صفت رحمت میں بھی نہ رقتِ قلب کا محتاج ہے اور نہ انفعال نفس کا، جیسے اُس کی ذات بے چون وچگون ہے اسی طرح اس کی صفت علم وقدرت اور صفتِ رافت ورحمت وغیرہ بھی بے چون وچگون ہے۔

اُس کی بے چون وچگون رحمت حقیقیہ۔ علماء کی مجاز وتاویل اور استعارہ وتمثیل کی ذرہ برابر محتاج نہیں۔

اے برون از وہم وقال وقیل من　　　　خاک بر فرق من وتمثیل من

صفات باری تعالیٰ میں صحابہ وتابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا یہی مسلک تھا اور وہ حضرات اس ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کے اسماء حسنیٰ میں تاویل کو بدعت سمجھتے تھے۔

امام ابوالحسن اشعری نے اخیر عمر میں متکلمین کے طریق تاویل وتمثیل کو چھوڑ کر مذہب سلف ہی کی طرف رجوع فرمایا، جیسا کہ امام موصوف نے اپنی آخری تصنیف کتاب الابانہ میں اس کی تصریح کی ہے قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ رحمت کے حقیقی معنی رقت قلب کے ہیں باری تعالیٰ کی شان میں رحمت کا اطلاق مجاز ہے حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ سبحان اللہ جہاں رحمت حقیقی تھی وہاں تو مجاز بنادیا اور جہاں مجاز سرتاپا مجاز تھا وہاں حقیقت بنادی یعنی حقیقت کے اعتبار کو دیکھا جائے تو رحمت بارگاہ خداوندی میں حقیقت ہے اور بندہ میں سراسر مجاز مگر ارباب تاویل نے معاملہ برعکس کردیا۔

اور ابتداء کے لئے ان تین ناموں کو یعنی اللہ اور رحمٰن اور رحیم کو اس لیے خاص فرمایا کہ انسان پر تین حالتیں گزرتی ہیں۔ اول، اس کا عدم سے نکل کر وجود میں آنا۔

دوم، اس کا باقی رہنا اور جس قدر خلاق علیم نے اُس کے لیے مدۃ بقا مقرر فرمائی ہے اس کو پورا کرنا جس کو عرف میں حیاتِ دنیا اور زندگی کہتے ہیں۔

سوم، اس نشاۃ دنیا کے ختم ہونے کے بعد حیاتِ دنیویہ پر ثمرات کا مرتب ہونا۔ عمل نیک پر جزاء اور عمل بد پر سزا پانا۔

پس ابتداء میں تین نام ذکر فرمائے تاکہ تینوں حالتوں کی جانب اشارہ ہوجائے لفظ اللہ میں پہلی حالت کی جانب اشارہ ہے اس لیے کہ تخلیق وتکوین بارگاہِ الوہیۃ سے متعلق ہے اور لفظ رحمٰن سے دوسری حالت کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے کہ دنیا دار ابتلاء اور دار امتحان ہے جو اس جگہ ٹھیک راستہ پر چلا اس کے لیے آخرت کی تمام منزلیں آسان ہیں۔ شیطان اور نفس امارہ ہر وقت اس کی تاک میں ہے اس لیے بندہ ایسی حالت میں بے پایاں اور بے انتہا رحمت کا محتاج ہے۔

اور لفظ رحیم کو تیسری حالت یعنی نشاۃ آخرت کے یاد دلانے کے لیے ذکر فرمایا۔

دار دنیا چونکہ مومن وکافر سب کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ مومن کے لیے تو ظاہر ہے کافر کے حق میں دنیا اس لیے رحمت ہے کہ وہ اپنے کفر سے توبہ کرسکتا ہے اور اگر سوء اختیار سے توبہ بھی نہ کرے تو فی الحال اس کا عذاب جہنم سے رہا رہنا ہی بہت بڑی رحمت ہے نیز بعثت انبیاء اور ارسال رُسل اور انزالِ کتب ایک ایسی عظیم رحمت ہے کہ جو مومن اور کافر سب کے لیے ہے یہ امر آخر ہے کہ کوئی اس رحمت سے متمتع اور منتفع ہوا اور کوئی نہ ہوا۔ الحاصل دار دنیا مومن اور کافر سب کے لیے باعث

رحمت ہے اور دار آخرت صرف مومنوں کے لیے باعث رحمت ہے اور کافروں کے واسطے باعث عذاب وظلمت۔ کما قال تعالیٰ: ﴿فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ﴿٨﴾ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ﴿٩﴾ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ﴾.

جب صور پھونکا جائے گا تو وہ دن کافروں پر نہایت سخت اور دشوار ہوگا۔ کسی قسم کی اس میں آسانی نہ ہوگی۔

اس لیے نشاۃ دنیا کے یاد دلانے کے لیے لفظ رحمٰن ذکر فرمایا کہ جس میں بہ نسبت رحیم کے زائد مبالغہ ہے اور نشاۃ آخرت کے یاد دلانے کے لیے رحیم کا لفظ استعمال فرمایا اس لیے کہ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہونے کی وجہ سے عموم رحمت پر دلالت کرتا ہے اور عموم رحمت کا محل صرف دار دنیا ہے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا اور دار آخرت صرف مومنوں کی رحمت کے لیے ہے۔

نیز رحمٰن فعلان کا وزن ہونے کی وجہ سے کچھ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ کلام عرب میں وزن فعلان اکثر صفات عارضہ اور اوصاف متجددہ اور حادثہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیسے عطشان اور غضبان اور ریّان اور لہفان وغیرہ لہٰذا لفظ رحمٰن سے اس دار حدوث وتجدد اور دار فانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔ اور لفظ رحمٰن چونکہ عموم رحمت پر دلالت کرتا ہے اس لیے قرآن کریم میں ﴿اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾ کو صفت رحمٰن کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ ﴿الرَّحْمَٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ﴾ اس لیے کہ عرش تمام مخلوقات کو محیط ہے۔ جیسا کہ اس کی رحمت تمام مخلوق کو محیط اور واسع ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ پس ﴿الرَّحْمَٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ﴾ سے یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ وسیع مخلوق یعنی عرش پر سب سے زیادہ وسیع صفت رحمٰن کے ساتھ استواء فرمایا ہے اور صحیحین میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قضائے خلق کے بعد ایک کتاب میں یہ لکھ کر "ان رحمتي تغلب غضبي" یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ اپنے قریب عرش پر رکھا۔ حضرت مولانا انور شاہ قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ سبقت رحمتی غضبی مراحم خسروانہ کا قانون ہے جو عرش پر آویزاں ہے۔

رحیم صفت مشبہ کا صیغہ ہے یا اس کے ہم وزن ہونے کی وجہ سے دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے فعیل کا وزن کلام عرب میں معانی ثابتہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ علیم وحکیم وجمیل، لہٰذا لفظ رحیم سے دار باقی اور عالم جاودانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔ علامہ آلوسی کے کلام سے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ رحمٰن سے عام رحمت مراد ہے خواہ بالواسطہ یا بلاواسطہ صورۃً اور معنیً ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہو یا فقط معنیً اور باطناً رحمت ہو۔ اگرچہ صورت اور ظاہر کے لحاظ سے وہ عذاب ہو۔ جیسے مریض کو تلخ دوا کا پلانا صورۃً ایلام اور تکلیف ہے مگر معنیً سراسر رحمت ہے پس رحمٰن سے ایسی ہی عام رحمت مراد ہے کہ جو ان تمام انواع واقسام کو شامل ہو۔ یہ دار فانی اسی قسم کی رحمت کا محل ہے اس کی رحمت راحت وانعام کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مصائب وآلام کی شکل میں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿عَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ اور رحیم سے وہ رحمت مراد ہے، جو بلاواسطہ ہو۔ اور ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہی رحمت ہو۔ دار آخرت میں اسی قسم کی رحمت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ بھی ہوگی اور کسی قسم کا اس میں شائبہ رنج والم کا بھی نہ ہوگا۔

خلاصہ

یہ کہ لفظ اللہ میں جس کے معنی یہ ہیں کہ جو ذات تمام صفات کمال کی جامع اور تمام نقائص وعیوب سے پاک اور منزہ

ہے۔تمام مباحث الٰہیات کی طرف اشارہ ہے۔

اور لفظ رحمٰن میں مباحث نبوت وشریعت کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے بغیر خدا کی مرضی کے موافق ایک لمحہ گزارنا محال ہے۔

اور لفظ رحیم میں اجمالاً تمام امور آخرت کی طرف اشارہ ہے اور یہی وہ تین امر ہیں کہ جو تمام انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی تعلیم کا لباب اور عطر ہیں۔ اور تفتازانی اور جرجانی انہیں تین مقاصد اور مواقف کی شرح میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی اور تمام متکلمین کو تمام اہلِ اسلام کی طرف سے جزائے خیر عطاء فرمائے۔ کہ دین کے مقاصد اصلیہ کو خوب واضح فرمایا اور امت کے لیے صحیح مؤقف کو خوب واضح اور روشن کر دیا۔ آمین یارب العالمین

سورۂ فاتحہ میں بھی انہی تین باتوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں صفات الٰہیہ کو بیان فرمایا ہے اور ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے احوال آخرت کی طرف اشارہ فرمایا اور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ سے مباحث نبوت ورسالت، ایمان اور کفر، سعادت اور شقاوت، ہدایت اور ضلالت کے فرق کی جانب اشارہ فرمایا۔

اور تمام قرآن انہیں مضامین ثلاثہ کی تفصیل ہے۔ جو سورۂ فاتحہ میں اجمالاً ذکر فرمائے اسی وجہ سے اس سورت کا نام ام الکتاب ہے یعنی تمام کتاب الٰہی کا خلاصہ اور اجمال اور چونکہ کتاب الٰہی کی ہر سورت انہی مضامین ثلٰثہ کی تفصیل ہے جو اجمالاً ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ میں درج ہیں۔ اس لیے ہر سورت کی ابتداء میں بسم اللہ کا لکھنا اور پڑھنا مسنون قرار دیا گیا۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

حقیقی (۱) ستائش اللہ ہی کے لیے مخصوص (۲) ہے جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے۔

ا۔ جو فعل علم اور اختیار اور قدرت اور ارادہ سے صادر ہو اس کی واقعی خوبی بیان کرنے کو حمد کہتے ہیں۔ مدح میں نہ فعل کا اختیاری ہونا ضروری ہے اور نہ اس خوبی کا واقعہ ہونا لازمی ہے اسی وجہ سے مدح کسی وقت ممنوع بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

"احثوا التراب وجوہ المداحین"۔

"مدح کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈال دو"

مگر حمد سے کسی وقت منع نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس میں واقعی خوبی کا اظہار ہوتا ہے۔

بعض علماء نے تعریف حمد سے قید اختیار کو حذف کر دیا ہے اس لیے کہ اس قید کے ہوتے ہوئے حق تعالیٰ شانہ کی صفات ذاتیہ کی ثناء کو حمد کہنا دشوار ہوگا۔ اس لیے کہ صفات ذاتیہ جیسے علم وقدرت افعال خداوندی کی طرح اختیاری نہیں۔ اگر چہ

(۱) قولہ حقیقی ستائش اشارۃ الی ان الاولی ان یکون لام التعریف فی الحمد للجنس والحقیقۃ کما اختارہ جار اللہ العلامۃ وھو ابلغ من الاستغراق۔ کما لا یخفی علی ارباب الذوق فافہم ذلک واستقم۔

قولہ مخصوص ہے۔ ھذہ ترجمۃ لام الاختصاص فی للّٰہ۔

یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ یہ صفات اگرچہ غیر اختیاری ہیں مگر ان کے ثمرات ضرور اختیاری ہیں یا ان کے موصوف کا فاعل مختار ہونا حمد کے لیے کافی ہے۔ حمد اور مدح میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حمد انہی صفات کمال پر ہوسکتی ہے جن کا صفات کمال ہونا قطعی اور یقینی ہو۔ اور اُن میں کسی قسم کے نقص اور عیب کا شائبہ بھی نہ ہو۔ بخلاف مدح کے کہ اس میں نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صفت قطعاً اور یقیناً صفت کمال ہو، ظناً بھی صفت کمال ہونا مدح کے لیے کافی ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ صفت کمال شائبہ نقص سے پاک ہو، بلکہ اگر اس میں کچھ نقص بھی ہو تب بھی مدح ہوسکتی ہے۔

نیز حمد میں یہ ضروری ہے کہ محاسن وکمالات کا ذکر محبت اور اجلال کے ساتھ ہو اور مدح میں یہ ضروری نہیں۔ مطلقاً محاسن اور کمالات کے بیان کرنے کو خواہ وہ محبت اور اجلال سے ہو یا نہ ہو مدح کہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک برابر والا دوسرے برابر والے کی مدح کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ لفظ حمد سے جو تعظیم وتفخیم مترشح ہوتی ہے وہ لفظ مدح سے نہیں ہوتی اس لیے کہ حمد کا اکثر اطلاق اس غنی حمید ہی پر ہوتا ہے۔ نیز حمد زندہ ہی کی ہوتی ہے اور مدح زندہ اور غیر زندہ دونوں کی ہوتی ہے اور حمد کے بعد سب سے پہلے اسمِ ذات کو ذکر فرمایا اور اس کے بعد پھر دیگر اسماء صفات وافعال کو ذکر کیا، تاکہ ذاتاً اور صفۃً اور فعلاً ہر طرح سے اس کا مستحق حمد وثناء ہونا معلوم ہوجائے۔

۲۔ ربوبیت بمعنی پرورش کرنا اور کسی شیٔ کو بتدریج حد کمال تک پہنچانا تربیت اگرچہ والدین سے بھی ظہور میں آتی ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا﴾ اور یہ دعا مانگ کہ اے اللہ میرے ماں باپ پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے خوردسالی میں مجھ کو پالا۔

مگر والدین کی تربیت نور آفتاب کی طرح اصلی اور ذاتی خانہ زاد نہیں بلکہ نور زمین کی طرح مستعار اور عطاء غیر ہے۔ جس طرح نورِ زمین آفتاب کا فیض اور عطیہ ہے اسی طرح والدین کی تربیت بھی عطیۂ الٰہی ہے۔

نیز حقیقی تربیت جب ہوسکتی ہے کہ کسی شے کو نیست سے ہست کیا جائے...... اور پھر اس کے تمام اسباب تربیت کو پیدا کیا جائے۔ اور پیدا کرنے کے بعد انتفاع کے تمام موانع دور کردیے جائیں، تب تربیت مکمل ہوسکتی ہے۔ والدین اولاد کی تربیت کرتے ہیں، مگر نہ اولاد ان کی مخلوق ہے اور نہ وہ سامان تربیت کی خالق ہیں بلکہ سب کا سب خدا ہی کا پیدا کیا ہوا ہے نیز والدین کی تربیت چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہے۔ تمام عالم کے لئے عام اور محیط نہیں اور حق تعالیٰ شانہ کی تربیت غیر محدود اور عام اور محیط ہے۔ پس قابل ستائش وہی ربوبیت ہوسکتی ہے، جو اصلی اور ذاتی ہو۔ مستعار اور عطاء غیر نہ ہو۔ ہر طرح سے کامل اور مکمل ہو، کسی قسم کا اس میں نقص نہ ہو۔ تمام عالمین کے لیے عام اور محیط ہو، اس لیے ارشاد ہوا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

یعنی حقیقی (۱) ستائش خدا تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے کہ جس کی ربوبیت اصلی اور ذاتی اور کامل ہونے کے علاوہ تمام جہانوں کے لیے عام اور محیط ہے اسی وجہ سے جب فرعون نے کہا، "وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" "رب العالمین کیا چیز ہے"۔

(۱) اشارہ اس طرف ہے کہ الحمد کا لام تعریف۔ لام حقیقت اور لام جنس ہے یعنی حمد کی حقیقت اور جنس ہی اللہ کے لیے مخصوص ہے اور جن علماء نے لام کو استغراق کے لیے لیا ہے انہوں نے اس طرح ترجمہ کیا کہ سب تعریف واسطے اللہ کے۔

تو موسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا: "رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا"، "یعنی رب وہ ہے کہ جس کی تربیت سبع سموات اور سبع ارضین اور کل عالم کو محیط ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد شاید فرعون کو یہ تردد ہوا ہو کہ تربیت کو صرف ذات خداوندی میں منحصر کر دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ جب کہ ہم والدین اور آفتاب اور ماہتاب کی تربیتوں کا بھی روزانہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اس لیے موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام دوبارہ جواب کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا:

"رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ"، "وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے اگلے آباؤ و اجداد کا۔"

یعنی تمہارے آباؤ اجداد کی تربیت اصلی اور ذاتی نہیں بلکہ عطیۂ الٰہی ہے، تمہارا اور تمہارے تمام آباء اولین کا حقیقی رب اور پروردگار وہی ہے اور تیسری بار یہ فرمایا:

"رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ"، "وہ رب ہے مشرق اور مغرب کا اور ان کے درمیان کا اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔"

یعنی آفتاب اور ماہتاب کو اپنی کھیتیوں کا مربی سمجھنا غلط ہے اس لیے کہ خود آفتاب و ماہتاب اور ان کے نور کو اسی رب العالمین نے پیدا کیا ہے۔

"هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا"، "اسی نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا۔"

اگر وہ رب العالمین شمس و قمر کو روشنی نہ بخشتا یا کھیتیاں پکانے کی خاصیت ان میں نہ رکھتا تو کہاں سے کھیتیاں پکاتے۔

رب العالمین میں ربوبیت خداوندی کا تمام اجناس وانواع اور تمام افراد واشخاص کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پہلی آیت یعنی ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ میں اس کی ربوبیت کا تمام امکنۂ مختلفہ کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ اور دوسری آیت ﴿رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ میں اس کی ربوبیت کا ماضی اور حال اور مستقبل اور تمام اوقات اور ازمنۂ مختلفہ کو محیط ہونا بیان فرمایا اور تیسری بار ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ فرما کر اس کی ربوبیت کا تمام اوضاع اور حالات تمام تغیرات اور کیفیات کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کسی شخص اور کسی زمان، کسی مکان اور کسی حالت اور وضع کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ سب کو عام اور محیط ہے اس لیے وہی لائق عبادت اور مستحق حمد وثناء ہے۔

حضرات صوفیۂ کرام قدس اللہ اسرارہم فرماتے ہیں کہ ارواح کے کانوں میں سب سے پہلے وصف ربوبیت ہی کا نغمۂ جانفزا پہنچا ہے اور اسی وصف سے اول خدا کو پہچانا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۗ قَالُوْا بَلٰى﴾ "اس وقت کو یاد کرو کہ تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا اور خود ان کو ان کی جانوں پر گواہ بنایا کیا میں تمہارا رب نہیں۔ سب نے کہا بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔"

حق تعالیٰ شانہ نے سب سے پہلے اسی اسم رب کے ساتھ ارواح کو مخاطب کیا اور اسی نام سے ان سے عہد اور میثاق

لیا اور بظاہر یہی وجہ ہوگی کہ اول الانبیاء حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء ﷺ تک تمام انبیاء ومرسلین اور عباد مخلصین کی جو دعائیں حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں ذکر فرمائی ہیں، وہ اکثر وبیشتر کلمۂ "رَبَّنَا" سے وارد ہوئی ہیں۔ اور ایک مقام پر یعنی ﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا﴾ الخ ان آیات میں کلمہ "رَبَّنَا" سے دعا کرنے والوں کو اولوا الالباب فرمایا ہے۔

۳۔ عالم اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے خالق کا علم حاصل ہوتا ہو۔ عَالَمْ علامت سے مشتق ہے۔ عالم کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ علامت ہے اسماء الٰہی اور صفات خداوندی کے لیے عالم میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسی کے کسی اسم کا مظہر اور آئینہ ہے۔ مؤمن وکافر اس کی شان اور انعام اور انتقام کے مظہر ہیں۔ صاحب عزت اور صاحب ذلت اس کی شان ﴿تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ کے آئینہ میں ہیں۔ عالم غیب اور عالم شہادت اس کے نام نامی ہو الظاہر والباطن کے لیے آئینہ ہیں۔

﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ بے حد مہربان، نہایت رحم والا۔

عجب نہیں کہ بسم اللہ میں وہ شان رحمت مراد ہو کہ جو تکوین اور تربیت عالم کے لیے باعث ہوئی۔ اور الحمد میں الرحمٰن سے وہ رحمت مراد ہو جو خاص حالت تربیت میں مبذول ہوتی ہے اگر یہ رحمت روک لی جائے تو تربیت اور پرورش ناممکن ہو جائے۔

اور الرحیم سے وہ رحمت مراد ہو کہ جو تربیت اور پرورش کے بعد جزاء اور سزا کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ اس لیے کہ تربیت اور تکمیل کے بعد آثار اور ثمرات کا نہ مرتب ہونا اس تربیت کے ضائع کرنے کے مرادف ہے۔

کھیتی پک جانے کے بعد اگر اس پر درانتی نہ چلائی۔ گندم اور بھوسہ الگ الگ نہ کیا جائے تو کھیتی کو ضائع کرنا ہے۔

اسی طرح اگر اس عالم کی تربیت ختم ہو جانے کے بعد مومن اور کافر۔ سعید اور شقی کو جدا جدا نہ کیا جائے تو عالم کی تربیت کا ضائع اور بیکار ہونا لازم آئے گا۔ اور آئندہ آیت یعنی ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا تکرار اس کی رحمت کے مکرر اور مضاعف ہونے کی طرف مشیر ہے لیکن مبادا رحمت کی یہ فراوانی کہیں بندوں کو مغرور نہ بنادے اس لیے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کا اضافہ فرمایا تاکہ رغبت کے ساتھ رہبت کا ضروری ہونا معلوم ہو جائے۔ جیسے: ﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ﴾ کے بعد ﴿شَدِيْدِ الْعِقَابِ﴾ کی صفت کا ذکر فرمایا۔ اھ کلامہ

اور عجب نہیں کہ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ سے پہلے ذکر کرنا سبقت رحمتی غضبی کی جانب مشیر ہو۔

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ روز جزاء کا مالک۔

یعنی اللہ تعالیٰ قیامت اور جزاء کے دن کا مالک ہے جس میں فرمانبرداروں اور نافرمانوں کی جزاء کا فیصلہ فرمائے گا۔ اس لیے کہ نیکی اور بدی اور فرمانبردار اور نافرمان اور موافق اور مخالف میں فرق کرنا عقلاً ونقلاً ضروری ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى﴾. وقال تعالیٰ: ﴿اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ

اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى﴾۔ نیز دنیا میں کوئی ظالم ہے اور کوئی مظلوم اور مظلوم کا ظالم سے انتقام عین عدل اور عین حکمت ہے اور دنیا میں یہ انتقام نہیں لیا گیا تو آخرت میں لامحالہ لیا جائے گا۔

اس آیت میں دو قراءتیں ہیں اور دونوں صحیح اور متواتر ہیں۔ ایک ﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ یعنی روز جزاء کا بادشاہ اور دوسری قراءت ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ یعنی روز جزاء کا مالک۔ اور اس کی مالکیت اور ملکیت یعنی بادشاہت کے لیے روز جزاء کو اس لیے خاص کیا گیا کہ اس کے جلال و جمال کا بلاواسطہ ظہور علی وجہ التمام والکمال۔ عالم کے ہر ہر فرد کے لیے ایک ہی آن میں صرف اسی روز ہوگا۔ دنیا میں بھی وہی حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ ہے مگر دنیا میں اس کی مشیت اور حکمت سے کچھ مجازی بادشاہت اور مجازی مالکیت نظر آتی ہے۔ قیامت کے دن سارے مجاز ختم ہو جائیں گے اور صرف حقیقت ہی حقیقت رہ جائے گی۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں قراءتوں میں سے کون سی قراءت افضل ہے بعض علماء مَلِک بمعنی بادشاہ کی قراءت کو راجح قرار دیتے ہیں اور وجہ ترجیح یہ بیان کرتے ہیں:

۱۔ کہ ملکیت یعنی بادشاہت میں جو عظمت ہے وہ وصفِ مالکیت میں نہیں۔ مالک تو ہر ایک ہوتا ہے مگر بادشاہ ہر ایک نہیں ہوتا۔

۲۔ مالک کا حکم فقط اپنے مملوک پر چلتا ہے اور بادشاہ کا حکم تمام ملک اور تمام رعایا پر جاری اور نافذ ہوتا ہے۔

۳۔ بادشاہ کی اطاعت سب پر واجب ہے اور مالک کی طاعت فقط اس کے مملوک پر واجب ہے۔

۴۔ نیز لفظ ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ بھی مالکیت پر دلالت کرتا ہے۔ پس اگر ملک کے بجائے مالک پڑھا جائے تو تکرار لازم آتا ہے۔

۵۔ قرآن کریم کی آخری سورت میں ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ آیا ہے لہٰذا قرآن کی پہلی سورت میں بھی ﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پڑھنا چاہیے تاکہ اول قرآن اور آخر قرآن ایک دوسرے کے مناسب اور ہم رنگ ہو جائے۔

اور جو حضرات علماء "مٰلِكِ" کی قراءت کو ترجیح دیتے ہیں وہ یہ وجوہ بیان کرتے ہیں:

۱۔ کہ ملکیت یعنی بادشاہت انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور مالکیت انسان اور غیر انسان سب کو شامل ہے۔

۲۔ مالک اپنی مملوک کو فروخت کر سکتا ہے۔ بادشاہ رعایا کو فروخت نہیں کر سکتا۔

۳۔ رعیت بادشاہ کے ملک اور سلطنت سے بھاگ کر نکل سکتی ہے اور مملوک بھاگ کر مالک کی ملکیت سے نہیں نکل سکتا۔

۴۔ غلام پر مولیٰ کی خدمت واجب ہے۔ رعایا پر بادشاہ کی خدمت واجب نہیں۔

۵۔ غلام بغیر آقا کی اجازت اور اذن کے کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور رعیت بغیر بادشاہ کی اجازت کے کام کر سکتی ہے۔ اور مملوک چونکہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے اس لیے اس کو سوائے مولیٰ کے کسی چیز سے تعلق بھی نہیں ہوتا۔ غلام کے پیش نظر ہر وقت آقا کی خوشنودی رہتی ہے رعایا چونکہ اپنی چیزوں کی مالک بھی ہوتی ہے اس لیے ان کو بادشاہ سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔

۶۔ غلام کو آقا سے توقع رحم و کرم کی ہوتی ہے اور رعیت کو بادشاہ سے عدل و انصاف کی امید ہوتی ہے۔ اور بندہ رحم و کرم کا زیادہ محتاج ہے۔

۷۔ بادشاہت میں ہیبت زیادہ ہے اور مالکیت میں شفقت اور عنایت زیادہ ہے۔

۸۔ بادشاہ کے سامنے جب لشکر پیش ہوتا ہے تو ضعیفوں اور کمزوروں اور بیماروں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور مالک ضعیف اور کمزور غلاموں پر اور مزید توجہ کرتا ہے اور ان کی اعانت اور خبر گیری میں مشغول ہوتا ہے۔

۹۔ مالک کو مملوک سے تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ بادشاہ کو رعایا سے اتنی محبت اور تعلق نہیں جتنا کہ آقا کو غلام سے ہوتا ہے اور عاشقوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی مژدۂ جانفزا نہیں کہ محبوب کو ہم سے محبت اور تعلق ہے۔

۱۰۔ "مٰلِكِ" میں مَلِكِ سے ایک حرف زیادہ ہے۔ لہٰذا "مٰلِكِ" کی قراءت میں ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ اس لیے کہ ایک حرف کے زیادہ ہونے کی وجہ سے دس نیکیاں اور زیادہ ہوں گی۔ فِتِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ (خاص تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے ہر کام میں مدد چاہتے ہیں اس لیے کہ بغیر تیری اعانت اور امداد کے کچھ نہیں ہوسکتا)

یعنی اجسام علویہ اور سفلیہ اور کواکب اور نجوم اور نور اور ظلمت کسی کو تیرا شریک نہیں ٹھہراتے ہیں ہر خیر و شر اور سعادت ونحوست کا تجھے ہی مالک سمجھتے ہیں۔ پہلی آیت میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمت کو بیان کیا اور معرفت ربوبیت کے بعد معرفت عبودیت کا درجہ ہے۔ اس لیے اس کے بعد عبادت کا ذکر کیا گیا۔

ا۔ کسی کی نہایت درجہ تعظیم کے لیے دل وجان سے غایت درجہ کا تذلل اختیار کرنا اس کا نام عبادت ہے۔ لہٰذا جو تذلل اختیاری نہ ہو بلکہ اضطراری یعنی بلا اختیار کے ہو وہ عبادت نہیں کہلائے گا اور اسی طرح جو تذلل کسی کے جبر اور قہر اور زور سے ہو وہ بھی عبادت نہ کہلائے گا اور جس تذلل سے تعظیم مقصود نہ ہو وہ استہزاء اور تمسخر کہلائے گا اور لائق عبادت اور مستحق بندگی وہی ذات ہوگی، جو غایت درجہ کی عظمت اور جلال اور نہایت درجہ خوبی اور کمال اور انتہائی انعام واکرام اور انتہائی جود ونوال کے ساتھ متصف ہو کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی درجہ اور مرتبہ عقل اور خیال میں نہ آسکے۔ اور جو انتہائی عظمت وجلال کے ساتھ موصوف نہ ہو اس کے سامنے انتہائی تذلل اختیار کرنا سراسر بے موقع اور بے محل ہے اسی وجہ سے قرآن کریم نے شرک کو ظلمِ عظیم کہا ہے۔ اور کسی چیز کو بے محل رکھنے ہی کا نام ظلم ہے۔ خداوندِ ذوالجلال کو اگرچہ کسی کی عبادت اور بندگی کی ذرہ برابر حاجت نہیں، مگر مقتضائے حکمت یہ ہے کہ صاحب نقصان صاحب کمال کے سامنے تذلل اور پستی اختیار کرے ورنہ کمال اور نقصان کی مساوات لازم آئے گی جو سراسر خلاف حکمت ہے ابتدائے آفرینش عالم سے اس وقت تک دنیا کے تمام عقلاء اور عالم کے تمام حکماء اس پر متفق رہے ہیں کہ ہر صاحبِ کمال کی تعظیم اور اس کا احترام عقلاً واجب اور فرض ہے یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی ناقص کامل کی تعظیم کو اس لیے ضروری نہ سمجھے کہ اس ناقص کو اپنے زعم میں اس کامل کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ احتمال خداوند ذوالجلال میں جاری نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ مخلوق کا خالق سے مستغنی ہونا ناممکن اور محال ہے۔ ممکن کا وجود ہی واجب الوجود کے سہارے سے ہے۔

پناہ بلندی وپستی توئی　　همہ نیستند آنچہ ہستی توئی

اسی وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جو شخص وجود باری یا توحید باری کا منکر ہو وہ ناجی نہیں بلکہ ناری ہے،

اگر چہ اس کو کسی نبی کی دعوت نہ پہنچی ہو۔اس لیے کہ وجود باری اور توحید باری کا مسئلہ فطری اور عقلی اور بدیہی ہے اور عقلاء عالم کا اجماعی ہے۔بعثت انبیاء پر موقوف نہیں، حجت پوری ہو چکی ہے لہٰذا اب کوئی عذر مسموع نہیں۔

اور اسی وجہ سے کہ عبادت اختیاری تذلل کا نام ہے حضرات فقہاء نے عبادات کے لیے نیت کا ہونا بالا جماع شرط قرار دیا ہے۔حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کمال محبت کے ساتھ کمال اطاعت کا نام عبادت ہے۔کمال عظمت کے ساتھ کمال محبت بھی عبادت کے مفہوم میں داخل ہے۔جس درجہ کی محبت اور عظمت ہوگی اسی درجہ کی عبادت ہوگی۔عظمت کے ساتھ جب تک محبت نہ ہو عبادت نہیں کہلائے گی اور ﴿اِيَّاكَ﴾ جو ﴿نَعْبُدُ﴾ کا مفعول ہے اس کی تقدیم حصر کے لیے ہے یعنی خاص تیری بندگی کرتے ہیں کسی اور کی نہیں نیز تقدیم مفعول میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عابد کی نظر اپنی عبادت پر نہ ہونی چاہیے بلکہ معبود پر ہونی چاہیے۔نیز عبادت سے فقط معبود کی رضا اور خوشنودی مقصود و مطلوب ہونی چاہیے۔

خلاف طریقت بود کا ولیا تمنا کنند از خدا جز خدا

گر از دوست چشمت بر احسان اوست تو در بند خویشی نہ در بند اوست

اور ﴿نَعْبُدُ﴾ صیغہ جمع ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب تیری بندگی کرتے ہیں، بجائے "اَعْبُدُ" کے صیغہ جمع لانے میں التزام جماعت کی طرف اشارہ ہے نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بندگی کرنے والا اپنی عبادت پر ناز نہ کرے۔ بلکہ یہ سمجھے کہ عبادت کرنے والا صرف وہی ایک نہیں بلکہ بے شمار بندگی کرنے والوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

ابتداء سورت میں طرز کلام غائبانہ تھا۔اور ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں بجائے غائبانہ کے حاضرانہ طرز کلام اختیار کیا گیا اور اس طرح غَیْبَت سے خطاب کی طرف انتقال کیا گیا وجہ اس کی یہ ہے۔

۱۔کہ شروع سورت میں حمد اور ثناء کا ذکر تھا اور تعریف اور ثناء غائبانہ زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ غائبانہ حمد زیادہ اخلاص کی علامت ہے اور ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت اور خدمت حضوری میں ہوتی ہے۔

۲۔نیز نمازی نے جب نماز شروع کی تو شروع نماز میں بمنزلہ اجنبی کے آکر کھڑا ہو گیا اور خداوند ذوالجلال کی غائبانہ حمد و ثناء شروع کی یعنی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہا یعنی اسم ظاہر کے ساتھ اس کی حمد و ثناء کی اور اسم ظاہر حکم میں غائب کے ہے اور جب حمد و ثناء حدِ کمال کو پہنچی تو جو حجابات درمیان میں تھے وہ اٹھ گئے اور بُعد، قرب سے اور اجنبیت یگانت سے بدل گئی اور یہ شخص اس قابل ہو گیا کہ خداوند ذوالجلال کے حضور بصیغہ خطاب عرض معروض کر سکے۔

۳۔نیز ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے بعد ہدایت کے سوال کا ذکر ہے اور سوال اور درخواست حضوری ہی میں زیادہ بہتر اور مناسب ہوتی ہے اس لیے کہ جب سخی کے سامنے سوال کیا جائے تو سخی اور کریم اس کے رد کرنے سے شرماتا ہے۔

اور ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے بعد ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کو اس لیے ذکر فرمایا کہ اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت پر قوت اور قدرت بدون اس کی اعانت اور توفیق کے حاصل نہیں ہو سکتی اور توفیق کا طلب کرنا یہی استعانت ہے مطلب یہ ہے کہ عبادت کے لیے بندہ کی حول اور قوت کافی نہیں جب تک خدا کی اعانت حاصل نہ ہو۔لا حول ولا قوۃ الا باللہ غرض یہ کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے بعد ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کا ذکر کرنا عُجب (گھمنڈ) کو زائل کرتا اور نخوت اور کبر کو فنا کرتا ہے۔﴿اِيَّاكَ

﴿نَعْبُدُ﴾ میں فرقہ جبریہ کے رد کی طرف اشارہ ہے۔ جبریہ بندہ کو جماد کی طرح مجبور محض بتاتے ہیں۔ ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ﴾ سے اس فرقہ کا رد ہو جاتا ہے کیونکہ عبادت کے معنی اختیاری تذلل کے ہیں۔ فی الجملہ بندہ کے لیے اختیار ثابت ہوا اور جبر محض کی نفی ہوئی اور ﴿اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ میں فرقہ معتزلہ کے رد کی طرف اشارہ ہے۔ ارباب اعتزال بندہ کو اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل قرار دیتے ہیں۔ ﴿اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ سے اس فرقہ کا رد ہو جاتا ہے اس لیے کہ مطلب یہ ہے کہ بندہ اگر چہ عبادت اور بندگی اپنے اختیار سے کرتا ہے لیکن جماد کی طرح مجبور محض اور اختیار سے عاری اور کورا نہیں مگر ایسا فاعل مستقل بھی نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کی اعانت سے مستغنی اور بے نیاز ہو جائے بندہ فاعل مختار ضرور ہے مگر اپنے اس خداداد اختیار میں مختار نہیں ہر لمحہ اور ہر لحظہ اس کی اعانت اور امداد کا محتاج ہے۔ فافهم ذلك فانه دقيق ولطيف وسيأتي تفصيل ذلك ان شاء الله تعالىٰ۔

(سوال) دربارۂ استعانت بغیر اللہ

اس آیت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگی جائے حالانکہ قرآن وحدیث میں جا بجا اس کا ذکر ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرو۔ بیمار ہو تو علاج کرو۔ آخر یہ طبیب اور دوا سے استعانت اور استمداد نہیں تو اور کیا ہے لہٰذا یہ بتلایا جائے کہ وہ کون سی استعانت ہے جو غیر اللہ سے جائز ہے اور کون سی کفر اور شرک ہے۔

جواب

جاننا چاہیے کہ غیر اللہ سے مطلقاً استعانت حرام نہیں استعانت بغیر اللہ بعض صورتوں میں کفر اور شرک ہے اور بعض صورتوں میں جائز ہے۔ ضابطہ اس کا یہ ہے کہ اگر سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو فاعل مستقل اور قادر بالذات سمجھ کر یا بعد عطاء الٰہی اور تفویض خداوندی اس کو قادر مختار جان کر اس سے مدد مانگے تو بلا شبہ کفر اور شرک ہے یا اس شیٔ کو تاثیر اور فاعلیت میں مستقل بالذات یا مستقل بالعرض تو نہیں سمجھتا لیکن معاملہ اس کے ساتھ مستقل بالذات کا سا نہیں کرتا لیکن دوسروں کو اس کے استقلال کا توہم ہوتا ہے تو یہ استعانت بالغیر ناجائز اور حرام ہوگی۔ اور بعض صورتوں میں کفر اور شرک کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل سے معلوم ہوگا۔

پہلی صورت جب کہ غیر اللہ کو فاعل مستقل اور قادر بالذات سمجھے اس کے شرک ہونے میں تو کسی کو بھی کلام نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ غیر کو قادر بالذات تو نہیں سمجھتا لیکن قادر بعطائے الٰہی سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قدرت اور اختیار عطاء کیا ہے کہ جو امور طاقت بشری سے باہر ہیں۔ ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے جیسے بادشاہ اپنے وزراء اور حکام کو کچھ اختیارات عطاء کر دیتا ہے اور وہ بعد عطائے اختیارات مستقل سمجھے جاتے ہیں۔ اور پھر بادشاہ کے علم اور ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح معاذ اللہ۔ خدا تعالیٰ نے بھی کچھ اختیارات انبیاء اور اولیاء کو عطاء کیے ہیں اور وہ بعد عطاء الٰہی مستقل اور مختار ہیں۔ مشرکین عرب، ملائکہ اور اصنام کے متعلق بعینہٖ یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی﴾۔ مشرکین ان کو مستقل بالذات نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کو فاعل مستقل بعطاء الٰہی سمجھتے تھے۔ اور یہ کہتے تھے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا دیا ہے، قرآن کریم میں جا بجا اسی عقیدہ کو باطل کیا

گیا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ﴾۔ یہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ خدائی اور خدائی اختیارات کا کسی طرف منتقل ہونا یا عطاء کیا جانا نہ اختیاراً ممکن ہے اور نہ اضطراراً۔ کفار بغیر عطاء الٰہی کسی چیز پر ان کو قادر نہیں سمجھتے تھے۔ وقال تعالیٰ: ﴿قُلْ إِنِّيْ لَآ أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا﴾ وقال تعالیٰ: ﴿قُلْ لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ﴾ ان آیات میں بالذات نفع اور ضرر کے مالکیت اور اختیار کی نفی نہیں اس لیے کہ نہ کوئی نفع اور ضرر کے بالذات مالک اور مختار ہونے کا مدعی تھا اور نہ کوئی عاقل اس کو تسلیم کر سکتا ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نفع اور ضرر کا بالذات مالک ہو۔ مشرکین بھی اس کے قائل تھے۔ اصل مالک اور خالق وہی اللہ ہے۔

تیسری صورت کہ جب اس غیر کو نہ مستقل بالذات سمجھے نہ مستقل بالعرض لیکن معاملہ اس کے ساتھ مستقل بالذات کا سا کرے۔ مثلاً اس کو یا اس کی قبر کو سجدہ کرے یا اس کے نام کی نذر ماننے تو یہ بھی حرام اور شرک ہے لیکن یہ شرک اعتقادی نہیں بلکہ عملی ہے۔ اس کا مرتکب حرام کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہوگا۔ چوتھی صورت کہ جب استعانت بالغیر میں اس غیر کے استقلال کا ایہام ہوتا ہو جیسے روحانیات سے مدد مانگنا۔ اگرچہ یہ شخص مستقل نہ سمجھتا ہو لیکن مشرکین چونکہ ارواح کو فاعل مستقل سمجھ کر مدد مانگتے ہیں اس لیے ارواح سے مدد مانگنا قطعاً حرام ہوگا۔ حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں تردد اس میں ہے کہ اس شخص کو دائرۂ اسلام سے خارج کیا جائے یا نہیں یہ فعل چونکہ شرک کا مظہر اتم ہے اس لیے دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اول کی دو صورتیں قطعاً کفر اور شرک ہیں اور ان کا مرتکب دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور اخیر کی دو صورتیں قطعاً حرام ہیں تردد اس میں ہے کہ ایسے شخص کو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج مانا جائے یا نہیں لیکن اگر ایسی شے سے مدد مانگے کہ جس سے مدد مانگنا کفار اور مشرکین کے شعائر سے ہو۔ تو ایسی صورت میں اگر کوئی فقیہ اور مفتی زُنّار باندھنے والے کی طرح اس پر بھی ظاہر کے اعتبار سے کفر اور شرک کا فتویٰ دے اور کافر ہونے کا حکم لگائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ چونکہ وہ شے شعار کفر اور شرک سے ہے اس لیے اس کی نیت کا اعتبار نہ کیا جائے گا البتہ امور عادیہ جو طاقت بشریہ کے تحت داخل ہوں اور کارخانۂ عالم اسباب ان کے ساتھ مربوط اور متعلق ہو اور کسی شخص کو ان کے فاعل مستقل ہونے کا توہم بھی نہ ہوتا ہو۔ جیسے روٹی کی امداد سے بھوک دفع کرنا اور پانی کی امداد سے پیاس دفع کرنا تو یہ استعانت بالغیر جائز ہے بشرطیکہ اعتماد محض اللہ پر ہو اور غیر کو محض ایک ذریعہ اور وسیلہ اور عونِ الٰہی کا ایک مظہر سمجھے جیسے نل محض پانی کے آنے کا راستہ ہے اسی طرح اسباب فیض خداوندی کے راستے ہیں اصل دینے والا وہی ہے اور مشرک یہ سمجھتا ہے کہ یہ نل ہی مجھ کو پانی دے رہا ہے۔ اس لیے نل ہی سے پانی مانگتا ہے اور نل ہی کی خوشامد کرتا ہے مثلاً جو شخص دوا کو محض ایک وسیلہ سمجھے اور طبیب کو محض معالج جانے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن اگر دوا کو مستقل مؤثر سمجھے اور طبیب کو صحت بخشنے والا جانے تو یہ شرک ہوگا جاننا چاہیے کہ اسباب شرعیہ کا بھی وہی حکم ہے کہ جو اسباب عادیہ کا حکم ہے صرف فرق اتنا ہے کہ اسباب عادیہ کا اسباب ہونا عادت سے معلوم ہوا اور اسباب شرعیہ کا سبب ہونا شریعت سے معلوم ہوا۔ پس جس طرح اسباب عادیہ سے استعانت اور استمداد جائز ہے اسی طرح اسباب شرعیہ مثل دعاء اور رقیہ صبر اور نماز وغیرہ سے بھی استعانت جائز ہے اس لیے کہ ان امور کا اسباب ہونا شریعت سے معلوم ہوا۔ اور امور غیر عادیہ

میں اگر چہ غیر کو مظہرِ عون الٰہی سمجھے اور اصلِ اعتماد بھی اللہ ہی پر ہو مگر چونکہ امور غیر عادیہ کا تسبب نہ عادۃً ثابت ہے نہ من جانب اللہ اور بالفرض اگر ثابت بھی ہو تو قطعی اور دائمی نہیں اس لیے امور غیر عادیہ میں استعانت بغیر اللہ کفر اور شرک تو نہ ہوگی۔ مگر بدعت وضلالت ضرور ہوگی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:

''دریں جا باید فہمید کہ استعانت از غیر بوجہے کہ اعتماد برآں غیر باشد واورا مظہر عون الٰہی نداند حرام است واگر التفات محض بجانب حق است واورا یکے از مظاہر عون دانستہ ونظر بکارخانہ اسباب وحکمت اوتعالیٰ درآں نمودہ بغیر استعانت ظاہری نماید دور از عرفان نخواہد بود ودر شرع نیز جائز ورواست وانبیاء واولیاء ایں نوع استعانت بغیر کردہ اند ودر حقیقت ایں نوع استعانت بغیر نیست بلکہ استعانت بحضرت حق است لاغیر۔'' (فتح العزیز، ص:۸)

''اس جگہ جاننا چاہیے کہ غیر اللہ سے استعانت اس وقت حرام ہے کہ جب اعتماد اور بھروسہ اس غیر پر ہو اور اس غیر کو امداد الٰہی کا مظہر نہ سمجھے۔ اور اگر التفات اور نظر صرف خدا پر ہو۔ اور اس غیر کو اعانت الٰہیہ کا محض مظہر جان کر کارخانہ اسباب پر نظر کرتے ہوئے اس غیر سے ظاہری طور پر مدد چاہے تو خلاف عرفان نہیں اور شریعت میں بھی جائز ہے اور حضرات انبیاء اور اولیاء نے بھی غیر اللہ سے اس قسم کی استعانت کی ہے اور چونکہ نظر صرف حق تعالیٰ پر ہے اس لیے یہ استعانت بالغیر نہیں بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔''

اور دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''استعانت یا بچیزے است کہ توہم استقلال آنچیز درو ہم وفہم ہیچ کس از مشرکین وموحدین نمے گزرد مثل استعانت بحبوب وغلات در دفع گرسنگی واستعانت بآب در دفع تشنگی واستعانت براۓ راحت بسایۂ درخت ومانند آں ودر دفع مرض بادویہ وعقاقیر ودر تعین وجہ معاش بامیر وبادشاہ کہ درحقیقت معاوضہ خدمت بمال است وموجب تذلل نیست یا باطباء ومعالجان کہ بسبب تجربہ واطلاع زائد از انہا طلب مشورہ است واستقلالے متوہم نمی شود پس ایں قسم استعانت بلاکراہت جائز است زیرا کہ درحقیقت استعانت نیست واگر استعانت است استعانت بخدا است ویا بچیزے لیست کہ توہم استقلال در مدارک مشرکین جا گرفتہ مثل استعانت بارواح وروحانیات فلکیہ یا عنصریہ یا ارواح سائرہ مثل بھوانی وشیخ سدو وزین خاں وایں نوع استعانت عین شرک است ومنافی ملت حنفی۔'' (فتح العزیز، ص:۴۷)

''استعانت اور استمداد یا تو ایسی چیز سے ہے کہ موحدین اور مشرکین کو بھی اس کے مستقل ہونے کا شبہ نہیں ہوتا جیسے بھوک دفع کرنے کے لیے غلہ اور اناج سے مدد حاصل کرنا اور پیاس دفع کرنے کے لیے پانی اور شربتوں سے مدد حاصل کرنا اور راحت آرام حاصل کرنے کے لیے درخت کے سایہ سے مدد حاصل کرنا اور بیماری دفع کرنے کے لیے دواؤں اور بوٹیوں سے مدد حاصل کرنا۔ معاشی امور میں امیر اور بادشاہ سے مدد چاہنا کہ جو درحقیقت معاوضہ خدمت ہے موجب تذلل نہیں۔ یا اطباء اور معالجین سے اُن کے تجربہ اور زیادتی واقفیت کی بناء پر مشورہ لینا ان صورتوں میں استقلال کا وہم بھی نہیں ہوتا پس اس قسم کی استعانت بلاکراہت جائز ہے۔ اس

لیے کہ یہ استعانت حقیقۃً نہیں محض ظاہری استعانت ہے حقیقۃً استعانت خدا تعالیٰ سے ہے۔ یا ایسی چیز کے ساتھ استعانت ہے کہ جس کا مستقل بالتاثیر ہونا مشرکین کے ذہنوں میں جگہ لیے ہوئے ہے جیسے ارواح سے یا روحانیات فلکیہ اور عنصریہ سے استعانت کرنا یا ارواح سائرہ یعنی چلنے پھرنے والی ارواح سے مدد طلب کرنا جیسے بھوانی اور شیخ سدو اور زین خاں اس قسم کی استعانت عین شرک ہے اور ملتِ حنفیہ اسلامیہ کے بالکل منافی اور مباین ہے۔"

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ ہم کو راہِ راست دکھا اور اس پر چلا اور منزل مقصود تک پہنچا۔

ا۔ ہدایت کے معنی لطف اور مہربانی کے ساتھ رہنمائی کے ہیں اسی وجہ سے یہ لفظ حقیقۃً ہمیشہ خیر ہی کے موقعہ پر مستعمل ہوتا ہے اور ﴿فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ﴾ میں بطور تہکم اور بطریق استہزاء آیا ہے۔

۲۔ ہدایت کا استعمال تین طرح سے ہوتا ہے اگر ہدایت سے کسی شئ کی نشاندہی اور رہنمائی مراد ہو تو لفظ الیٰ کے ساتھ متعدی ہوگا۔ اور اگر ہدایت سے منزلِ مقصود تک پہنچنا مراد ہو تو لام کے ذریعے سے متعدی ہوگا۔ اور اگر راستہ کا قطع کرانا اور منزل مقصود تک پہنچانا مراد ہو تو بلاواسطہ متعدی ہوگا جیسا کہ اس آیت میں بلاواسطہ متعدی ہے۔ اس لیے ہم نے اس کے ترجمہ میں دکھانا اور چلانا اور پہنچانا تینوں چیزوں کا ذکر کیا۔

۳۔ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ صراط اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں، جس میں پانچ باتیں پائی جائیں:

(۱) مستقیم یعنی سیدھا ہو۔ (۲) اور موصل الی المقصود ہو یعنی مقصد تک پہنچانے والا ہو۔ (۳) اور سب سے زیادہ قریب اور نزدیک ہو۔ (۴) اور وسیع اور کشادہ ہو۔ (۵) اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو۔ جس راستہ میں یہ پانچوں باتیں پائی جائیں اس کو صراط کہتے ہیں جب تک یہ پانچ باتیں نہ پائی جائیں اس وقت تک صراط کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔

اس جگہ صراط کی صفت مستقیم ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے سب سے قریبی راستہ یہی ہے اس لیے کہ اقلیدس کا قاعدہ ہے کہ جب دو نقطوں میں مختلف اور متعدد خطوط ملائے جائیں تو تمام خطوط میں سب سے قریب اور سب سے چھوٹا خط ہی خطِ مستقیم ہوگا اور سیدھا ہی راستہ منزل مقصود تک پہونچاتا ہے نیز خطِ مستقیم متغیر نہیں ہوتا اور غیر مستقیم متغیر ہو جاتا ہے اور اسی ایک راستہ کا تمام عالم کے مرور اور عبور کے لیے کافی ہونا اس کے وسیع ہونے کی دلیل ہے اور خدا تک پہنچنے کے لیے یہی ایک راستہ ہے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ﴾۔ اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی راستہ پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو مبادا تم کو خدا کے سیدھے راستہ سے نہ ہٹا دیں۔

مطلب یہ ہوا کہ اے پروردگار! میں عاجز اور ناتواں ہوں مجھ کو قریب اور سیدھے راستہ سے اپنے تک پہنچا دے ٹیڑھے راستہ پر پڑ جانے سے خطرہ ہے کہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچوں اور دور کے راستہ میں مشقت ہے۔

۴۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صِرَاطَ مُسْتَقِيمٌ سے دین اسلام مراد ہے

اور بعض احادیث صحیحہ سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے اسلام مراد ہے جو مابین السّماء والارض سے بدرجہا زائد وسیع ہے۔ محمد بن الحنفیہ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے اللہ کا دین مراد ہے جس کے سوا اور کوئی دین مقبول نہیں۔ (ابن کثیر)

۵۔ اس آیت میں صراط کو اہلِ انعام کی طرف مضاف فرمایا اس لیے کہ سیدھے راستہ پر چلنے والے یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص انعام فرمایا اور متعدد آیات میں صراط کو اللہ کی طرف مضاف فرمایا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِيٓ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ﴿صِرَاطِ اللّٰهِ﴾ ﴿وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ﴾. اس لیے کہ وہ صراط مستقیم اللہ ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ سنا ہے کہ قادیان کے دہقان یوں کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے راستہ پر چلنے سے آدمی نبی بن جاتا ہے۔ اللہ اکبر اگر یہی قاعدہ ہے تو پھر خدا کے راستہ پر چلنے سے خدا بن جانا چاہیے اور تفسیر ابن کثیر جلد ۱، ص: ۴۹ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ﴿الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سے ملائکہ اور انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین سب مراد ہیں لہٰذا قادیانیوں کے نزدیک فرشتوں کے راستہ پر چلنے سے فرشتہ بن جانا چاہیے۔

۶۔ استقامت کے معنی توسط اور اعتدال کے ہیں جو ٹھیک افراط اور تفریط کے درمیان میں ہے حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت پر قدم کا ٹھیک جم جانا کہ اب ڈگمگانے کا احتمال نہ رہے اس کا نام استقامت ہے اور استقامت کا مقام نہایت بلند ہے اسی وجہ سے حضرات عارفین استقامت کو کرامت سے فوق اور برتر سمجھتے ہیں۔

۷۔ ہدایت اور استقامت کے مراتب نہایت مختلف اور متفاوت ہیں۔ ہدایت اور استقامت کا کوئی مرتبہ ایسا نہیں کہ اس کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ اور افضل مرتبہ نہ ہو۔ اور صراط مستقیم اگرچہ ایک ہے لیکن وسیع ہونے کی وجہ سے اور سالک کے سریع اور بطی ہونے کی وجہ سے اس میں بھی قرب اور بعد کا تفاوت ہوسکتا ہے اس لیے طلب ہدایت کا ہر شخص مامور ہے۔ طالب کو اگر ہدایت واستقامت کے بعض مراتب حاصل بھی ہوں تب بھی وہ ہدایت کے اعلیٰ مراتب سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

اے برادر بے نہایت در گہیست ہرچہ بروے میرسی بروے بایست

علاوہ ازیں ہدایت پر قائم اور ثابت رہنے کے لیے ہر لمحہ اور ہر لحظہ اس کی اعانت اور توفیق کی حاجت ہے جیسا کہ ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا﴾ اے ایمان والو ایمان لاؤ۔ اس آیت میں ایمان داروں کو پھر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے اسلام پر ثابت اور مستقیم رہنا مراد ہے۔ اسی طرح ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں مزید ہدایت کی طلب اور ثابت قدمی اور استقامت کی دعا تعلیم کرنا مقصود ہے۔

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ ①

① غیر المغضوب علیہم چونکہ الذین انعمت کی صفت ہے اس لیے ہم نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے کہ ترجمہ ہی سے اس کی صفت موصوفہ ہونا معلوم ہوجائے اور بعض نے اس طرح ترجمہ کیا ہے نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہوئے۔ انتہی یہ ترجمہ بتقدیر المضاف ہے۔ کما قال ابو حیان وقدر بعضهم فی غیر المغضوب محذوفا قال التقدیر غیر صراط المغضوب علیهم واطلق هذا التقدیر فلم یقیده بجر غیر ولا نصبه وهذا لا یتاتی الا بنصب غیر فیکون صفة لقوله الصراط وهو ضعیف=

یعنی ان لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تو نے اپنا ایسا خاص انعام فرمایا کہ اس خاص انعام اور خاص فضل کی بناء پر وہ نہ تیرے مغضوب اور معتوب ہیں بلکہ تیرے مقرب اور محبوب ہیں۔ تیری رضا اور خوشنودی کا تمغہ اور پروانہ حاصل کیے ہوئے ہیں اور نہ وہ گمراہ ہیں۔ صحیح راستہ اُن کو معلوم ہے منزلِ مقصود سامنے ہے بصد ذوق وشوق خطِ مستقیم کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ یمین ویسار کی طرف التفات بھی نہیں کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پروردگارِ عالم ہم نابکاروں کو انعام اور اہلِ انعام کی راہ پر چلا اور دارِ انعام میں پہنچا اور غضب اور ضلال کی راہ سے محفوظ اور دور رکھ اور اپنی توفیق اور اعانت کو ہمارا ہادی اور معین اور دستگیر بنا اور انبیاء وصدیقین وشہداء وصالحین کو رفیق طریق بنا تا کہ ان کی معیت اور رفاقت میں اُفتاں وخیزاں تیری بارگاہ میں پہنچ سکیں۔ آمین

پس قول اللہ تعالیٰ: ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾، ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور قولہ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾، ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سے ملائکہ اور انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین مراد ہیں۔ جن کو حق تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور عبادت کی نعمت سے سرفراز فرمایا (ابن کثیر) اور انعام کی خاص نوع اور کسی خاص قسم کو نہ ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اے اللہ ہم پر ہر قسم کا انعام فرما اور وہ تمام الطاف وکرم اور وہ تمام آلاء ونعم جو تو نے اپنے تمام انعام والے بندوں پر متفرقاً نازل فرمائے وہ ہم پر مجتمعاً نازل فرما۔ آمین

نیز لفظ ﴿صِرَاطَ﴾ کو ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کی طرف مضاف کرنے میں سالکین راہِ حق اور راہروانِ منزلِ آخرت کے لیے ایک عظیم الشان تسلیہ ہے کہ وہ سفر اور راستہ کی تنہائی سے ہرگز نہ ڈریں نبیین اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ان کے رفیق سفر ہیں۔ ﴿وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾

نیز مقامِ سوال میں منعم کے انعامات واحسانات کا تذکرہ۔ اجابت اور قبول میں خاص اثر رکھتا ہے اسی طرح سوالِ ہدایت کے وقت حق جل وعلا کے انعامِ عام کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اے ربُّ العالمین اور اے ارحم الراحمین تو نے اپنی رحمت واسعہ سے بہت بندوں پر ہدایت کا انعام فرمایا۔ ہم کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے سرفراز اور اس پر استقامت نصیب فرما۔ اور ہم گنہگاروں کو بھی اپنے لطفِ عمیم سے اہلِ انعام کے زمرہ میں داخل فرما۔ آمین

﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے وہ فریق مراد ہے جو دیدہ ودانستہ راہِ راست کو چھوڑ دے اور علمِ صحیح کے باوجود ہوائے نفس کی پیروی میں غلط راستہ اختیار کرے۔ اس نوع کے کامل ترین افراد یہود بے بہبود ہیں کہ باوجود تورات کے عالم ہونے کے کتمانِ حق اور استکبار اور اتباع ہوائی جیسے امراض میں مبتلا رہے۔

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ہمیشہ معاندانہ رویہ رکھا، جان بوجھ کر قتلِ انبیاء اللہ کے مرتکب ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر اب تک ذلت ومسکنت کی مہر لگا دی گئی۔ غضب اور لعنت کا طوق ان کی گردنوں میں ڈال دیا گیا۔ ﴿مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ﴾

=الخ کذا فی البحر المحیط: ۱/۳۰

اور ﴿ضَّآلِّيْنَ﴾ سے وہ گروہ مراد ہے جو سواء السبیل سے بھٹک کر غلط راستہ پر جا پڑا۔ اس نوع کے کامل ترین افراد نصاریٰ ہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ﴾ ''بہتوں کو گمراہ کیا اور خود سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔''

یہود اور نصاریٰ کے کامل ترین افراد ہونے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ کی تفسیر یہود سے اور ﴿ضَّآلِّيْنَ﴾ کی تفسیر نصاریٰ سے فرمائی۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ اور ﴿ضَّآلِّيْنَ﴾ کے مصداق صرف یہود اور نصاریٰ ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان دو قسموں کے تحت میں ہر قسم کے گمراہ اور کافر اور فاسق وفاجر عاصی اور مبتدع علی اختلاف المراتب داخل ہیں مگر یہود ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ کے کامل ترین فرد اور نصاریٰ ﴿ضَّآلِّيْنَ﴾ کے اولین مصداق ہیں۔ سلف صالحین یہ فرمایا کرتے تھے کہ اس امت کے علماء میں سے جو بگڑا وہ یہود کے مشابہ ہوا اس لیے کہ وہ اپنی اغراض کی وجہ سے کلمات الٰہیہ کی تحریف اور کتمانِ ما انزل اللہ اور تلبیس الحق بالباطل اور اہلِ علم وفضل کے حسد میں گرفتار ہوا۔ کہ یہود کے اخلاق ہیں اور اس امت کے عباد اور زہاد سے جو بگڑا وہ نصاریٰ کے مشابہ ہوا۔ اس لیے کہ اس نے اپنی عبادت میں بجائے شریعت غراء اور سنت بیضاء کے ہوائے نفس کا اتباع کیا اور نصاریٰ کی طرح تعظیم مشائخ میں اس درجہ کا غلو کیا کہ اعتقاداً نہ سہی عملاً تو ضرور ان کو رب اور ان کی قبور کو مساجد بنالیا۔ بعض مرتبہ چونکہ نعمت ہی علم وعمل کے فساد کا باعث ہوتی ہے اکثر عیش اور تنعم ہی میں پڑ کر انسان خدا کو بھول جاتا ہے، احکامِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے اس لیے ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کے بعد ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کا اضافہ مناسب ہوا کہ اے رب العالمین اپنی نعمتوں پر حمد وشکر کی توفیق عطا فرما خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ تیرے انعام کے بعد غرور اور تکبر میں مبتلا ہو کر سیدھے راستہ سے بہک جائیں اور تیری لعنت وغضب کے مستحق بنیں۔ اپنی نعمت کو اطاعت کا ذریعہ بنا۔ معصیت کا سبب نہ بنا۔

آیت موصوفہ میں صرف انعام کو اپنی جانب منسوب فرمایا۔ غضب اور ضلال کو اپنی جانب منسوب نہیں فرمایا۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ انعام محض اس کا فضل ہے بلا کسی استحقاق کے بندوں پر مبذول فرماتا ہے۔ مگر غضب ابتداءً نازل نہیں فرماتا۔ بلکہ ان کی نافرمانی اور دیدہ ودانستہ عدول حکمی کے بعد اور علی ہٰذا گمراہ جب ہوتے ہیں کہ جب صراط مستقیم کو چھوڑ کر غلط راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

نیز ادبِ الٰہی کا اقتضاء یہ ہے کہ جب افعال احسان ورحمت کا ذکر ہو تو صراحۃً اللہ جل جلالہ کی طرف اُس کی اسناد ہونی چاہیے اور جب افعال جزاء اور عقوبت کا ذکر ہو تو پھر فاعل کا حذف اور فعل کا مبنی للمفعول لانا مناسب ہے مثلاً ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۙ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۙ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾

''جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھ کو راہ دکھاتا ہے اور وہی مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔''

خلق اور ہدایت اور اطعام اور اسقاء اور شفاء ان تمام افعال کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔ مگر مرض کو جو مکروہ

ہونے کی وجہ سے ادباً اپنی جانب منسوب کیا اور یہ کہا:

﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾ ''جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھ کو شفاء دیتا ہے۔''

اور یہ نہیں کہا:

''وَاِذَا اَمْرَضَنِیْ فَهُوَ يَشْفِيْنِیْ''۔ ''کہ جب وہ مجھ کو بیماری میں مبتلا کرتا ہے تو وہی مجھ کو شفاء دیتا ہے۔''

اور مؤمنین جن نے کہا:

﴿وَّاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ﴾ ''اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا گیا یا ان کے رب نے ان کے ساتھ خیر اور بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔''

میں ارادۂ شر کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا اور صیغۂ مجہول کے ساتھ اس کو ذکر کیا۔ یعنی ''شَرٌّ اُرِيْدَ'' کہا اور ﴿اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾ میں ارادۂ رشد کو رب العزت کی جانب منسوب کیا۔

اور علیٰ ہذا خضر علیہ السلام نے ﴿فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا﴾ (میں نے ارادہ کیا اس کشتی کو عیب دار بنادوں) عیب اور ارادۂ عیب دونوں کو اپنی جانب منسوب کیا اور ﴿فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ﴾ ''تیرے رب نے ارادہ کیا وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچیں۔ اور خدا کی مہربانی سے اپنا خزانہ نکالیں۔''

اس آیت میں ارادۂ رحمت کو ربُّ العالمین کی جانب منسوب کیا اور ﴿وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ﴾ (میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا) کہہ کر اُس کو اور مؤکد کر دیا۔

اور اسی طرح ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ اور ﴿اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ روزہ کی راتوں میں اپنی عورتوں سے مخالطت تمہارے لیے حلال کر دی گئی۔ ان محرمات کے سوا اور عورتیں تمہارے لیے حلال کر دی گئیں۔

میں اس خاص اِحلال کو چونکہ اللہ جل جلالہ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب تھا۔ اس لیے دونوں جگہ ''اُحِلَّ'' کو مبنی للمفعول ذکر کیا گیا۔

اور ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ میں یہ مانع نہ تھا۔ اس لیے اس احلال اور تحریم کی اسناد صراحۃً اللہ کی طرف کی گئی۔

نیز منعمِ حقیقی صرف وہی تبارک وتعالیٰ ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ اس لیے انعام کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا۔ اور غضب خدا کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ملائکہ اور انبیاء اور عباد صالحین کی طرف سے بھی خدا کے نافرمان اور سرکش بندوں پر ہو سکتا ہے۔

نیز ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ کے فاعل کا حذف اہل غضب کی تحقیر اور تذلیل کی طرف مشیر ہے اور انعام کے فاعل کی تصریح اہل انعام کے تشریف وتکریم کی طرف مشیر ہے۔ مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا ''هذا الذی اکرمه السلطان وخلع علیه'' (بادشاہ نے اس شخص کا اکرام کیا اور اس کو خلعت عطاء کیا) بہ نسبت ''هذا الذی اُكْرِمَ وَخُلِعَ

عَلَيْهِ" (اس شخص کا اکرام کیا گیا اور اس کو خلعت دیا گیا) کے بدر جہا بلیغ ہے اور ذکر فاعل کی وجہ سے یہ پہلا کلام جس قدر ممدوح کی مدح وثناء اور تشریف وتکریم پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرا کلام اس دلالت میں اس کے پاسنگ بھی نہیں۔

نیز حذف فاعل کچھ اعراض اور ترک التفات پر دلالت کرتا ہے جو اہلِ غضب کے مناسب ہے، اہلِ انعام کے مناسب نہیں اس لیے انعام کا فاعل ذکر کیا گیا اور غضب کا فاعل حذف کیا گیا اور چونکہ انعام کی ضد غضب ہے۔ ضلال انعام کا مقابل نہیں بلکہ رشد اور ہدایت کا مقابل ہے اس لیے اہلِ انعام یعنی ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کے بعد متصلاً ہی اہل غضب یعنی ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ کا ذکر فرمایا اور اہلِ ضلال کو بعد میں ذکر کیا۔ کیونکہ ایک ضد کے بعد دوسری کا ذکر کلام میں ایک خاص شان اور خاص تناسب پیدا کر دیتا ہے۔

اور اہلِ غضب کی تقدیم کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ یہود بہ نسبت نصاریٰ کے اسلام سے زیادہ دور ہیں۔ اس لیے کہ نصاریٰ نے صرف ایک نبی یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی اور یہود نے دو پیغمبروں کی یعنی مسیح بن مریم علیہ السلام اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی تکذیب کی۔ حق تعالیٰ شانہ نے ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ کو لفظ "غیر" کے ساتھ ذکر فرمایا اور حرف "لا" کے ساتھ یعنی "لا المغضوب علیھم" نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ حرف "لا" فقط ماقبل کی نفی کے لیے آتا ہے اس صورت میں کلام کے یہ معنی ہوئے کہ اے اللہ! ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا نہ اہلِ غضب کا۔ اور لفظ غیر ماقبل کی نفی اور مغایرت دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ مغایرت پر صراحۃ اور نفی ماقبل پر ضمناً۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے اللہ! ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا جن کا راستہ اہلِ غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے بالکل مغایر اور مباین ہے۔ خود اہل انعام اور ان کا راستہ غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکلیہ پاک ہے۔ اہل فہم غور کریں کہ یہ معنی بہ نسبت پہلے معنی کے کس قدر لطیف ہیں اور کیا یہ لطافت بجائے لفظ "غیر" کے حرف "لا" لانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کلّا، ہرگز نہیں۔

نیز لفظ "غیر" کے لانے میں ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کا یہ زعم کہ ہم ہی اہل انعام ہیں جیسا کہ وہ کہتے تھے، ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ غلط ہے بلکہ اہل انعام ان کے سوا اور غیر ہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ "آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔"

اور ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ میں حرف عاطف یعنی واؤ کے ہوتے ہوئے حرف لا کا اس لیے اضافہ فرمایا تا کہ اہل انعام کے راستہ کا اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے فرداً فرداً اور علیحدہ علیحدہ مغائر ہونا معلوم ہو جائے ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ سے اگر حرف لا کو حذف کر کے "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلِّيْنَ" کہا جائے تو مجموعۂ فریقین کے راستہ سے اہل انعام کے راستہ کا مغایر ہونا مفہوم ہوگا۔ اہل انعام کے راستہ کا ہر واحد سے علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم نہ ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ مجموع من حیث المجموع کی مغایرت ہر واحد کی مغایرت کو مستلزم نہیں۔ ہاں ہر واحد کی مغایرت مجموع من حیث المجموع کی مغایرت کو بالاولویت مستلزم ہے۔ فافھم ذلك واستقم۔

اسرار مجموعہ سورت

۱۔اس سورت میں دس چیزیں مذکور ہیں۔ پانچ چیزیں خدا تعالیٰ کے متعلق ہیں اور پانچ بندوں کے متعلق ہیں۔خدا تعالیٰ کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں: الوہیت، ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت۔ بندہ کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں: عبادت، استعانت، طلب ہدایت، طلب استقامت، طلب نعمت۔

بندہ کی یہ پانچ صفتیں اسی ترتیب سے خدا تعالیٰ کی پانچ صفتوں سے متعلق ہیں اور معنی کلام یہ ہیں کہ اے خدا تعالیٰ ہم خاص تیری عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ تو ہمارا اللہ یعنی معبود ہے اور خاص تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اس لیے کہ تو ہی تمام جہانوں کا مربی اور پرورش کرنے والا ہے اور تجھ ہی سے ہدایت کی درخواست کرتے ہیں۔اس لیے کہ تو رحمٰن ہے تیری رحمت اور مہربانی عام ہے اور تجھ ہی سے استقامت کی التجا کرتے ہیں اس لیے کہ تو رحیم ہے۔تیری خاص رحمت خاص اہلِ ایمان اور اہلِ ہدایت ہی پر مبذول ہے اور تجھ ہی سے انعام کے امیدوار ہیں۔اس لیے کہ تو ہی جزاء اور سزا کا مالک ہے ایسی کاملِ نعمت ہم کو عطاء فرما کہ جو غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکل پاک ہو۔(تفسیر کبیر: ۱۵۱/۱)

۲۔نیز بندہ جب مقامِ مناجات میں کھڑا ہوا اور خدا کی صفاتِ کمال بیان کرتا ہوا ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ تک پہنچا تو بے اختیار سیر الی اللہ کا شوق دامن گیر ہوا۔ارادہ سفر کا مصمم کیا تو سفر کے لیے عبادت کا توشہ لیا۔اور استعانت اور امداد خداوندی کی سواری پر سوار ہوا۔زاد اور راحلہ کے مکمل ہوجانے کے بعد راستہ معلوم کیا۔جب سیدھا راستہ معلوم ہوگیا تو رفقاء طریق کی فکر ہوئی کہ جن کی رفاقت اور معیت سے راستہ سہولت سے قطع ہو اور راہزنوں یعنی اہلِ غضب اور اہلِ ضلال کا کوئی خدشہ اور دغدغہ باقی نہ رہے۔(تفسیر عزیزی، ص:۴۸)

۳۔جن علوم کی حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام نے دعوت دی۔ وہ تین علم ہیں: علمِ شریعت، علمِ طریقت، علمِ حقیقت اور پھر علمِ شریعت کی دو قسمیں ہیں: اول علمِ عقائد۔ دوم علمِ احکام۔سو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ میں الٰہیات یعنی خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان ہے اور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ الخ میں ہدایت اور ضلالت سعادت اور شقاوت کا بیان ہے اور چونکہ ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سے انبیاء وصدیقین، شہداء اور صالحین مراد ہیں اس لیے اس آیت میں مباحث نبوت وامامت کی طرف اشارہ ہے اور ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں علمِ احکام کی طرف اشارہ ہے علمِ طریقت جس میں نفس اور قلب کے امراض اور معالجات سے بحث کی جاتی ہے۔اس کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ توحید فی العبادۃ ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہ کرے۔ دوسرا مرتبہ توحید فی الاستعانت ہے یعنی سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگے۔تیسرا مرتبہ استقامت ہے یہ سلوک کا اعلیٰ مرتبہ ہے کہ طریق عبودیت اور جادۂ اخلاص ومحبت پر قدم ایسا ٹھیک جم جائے کہ ذرہ برابر ادھر اُدھر ہٹنے نہ پائے ان مراحل اور مقامات کے طے ہوجانے کے بعد درجہ ہے مکاشفات اور تجلیات کا کہ قلب پر سحائب الہام کی بارش ہونے لگے اور علوم اور معارف اسرار اور لطائف منکشف ہونے لگیں۔ یہ علمِ حقیقت ہے اللہ تعالیٰ جس پر چاہے اپنا انعام فرمائے۔ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ

عَلَيْهِمْ﴾ میں اسی علم کی طرف اشارہ ہے۔

فائدہ

اس سورت کے ختم پر امین کہنا مسنون ہے اور لفظ آمین اسم فعل ہے یعنی یہ کلمہ دراصل تو اسم ہے مگر معنی میں فعل کے ہے یعنی افعل (ایسا ہی کر) کے معنی میں ہے جیسے رُوَيْدًا اور حَيَّهَلْ اور هَلُمَّ۔ اسماء افعال ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ جو ہم نے تجھ سے مانگا ہے وہی کر دے یعنی اہل انعام کے راستہ پر چلا اور اہل غضب اور اہل ضلال سے ہم کو الگ رکھ اور لفظ آمین بالاتفاق سورۂ فاتحہ کا جز نہیں بلکہ جس طرح عام دعاؤں کے بعد آمین کہنا سنت ہے اسی طرح الحمد کے بعد بھی آمین کہنا بالاتفاق سنت ہے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ آمین آہستہ کہنا بہتر ہے یا آواز سے، جمہور صحابہ و تابعین کا یہی مذہب ہے کہ آہستہ کہنا بہتر ہے اور یہی امام ابوحنیفہ اور امام مالک اور سفیان ثوری کا قول ہے کیونکہ آمین دعا ہے اور دعا کے آہستہ مانگنے کا حکم قرآن حکیم میں صراحتاً موجود ہے۔ ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾۔ اور صحیح حدیثوں میں قولوا امین یعنی آمین کہنے کا حکم آرہا ہے جس سے جہر ثابت نہیں ہوتا ورنہ قولوا التحیات للہ الخ اور قولوا ربنا لك الحمد (متفق علیہ) میں بھی جہر کا قائل ہونا پڑے گا حالانکہ امت کا کوئی عالم اس کا قائل نہیں دلائل کی تفصیل شرح بخاری اور شروح ہدایہ میں دیکھیں۔

صلوٰۃِ مسلمین اور صلوٰۃ نصاریٰ کا تقابل

کلام الٰہی کے دقائق و اسرار کا تو کون احاطہ کر سکتا ہے؟ بڑے سے بڑے فہیم اور ذکی اور صاحب فہم ثاقب کی بھی وہاں تک رسائی نہیں۔ یہ مختصر سورت یعنی سورہ فاتحہ جس کے معارف و لطائف کا ایک نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے اس کے وہ اسرار و معارف جو اللہ ربّ العزت کے علم میں ہیں وہ تو درکنار، علماء اسلام اور حضرات مفسرین نے جو اس مختصر سورت کے حقائق و معارف بیان فرمائے ہیں۔ ہم انہیں کے استیعاب اور استقصاء سے عاجز اور درماندہ ہیں۔ جس کی تصدیق علماء اسلام کے تفاسیر سے بخوبی ہو سکتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ سورۂ فاتحہ جیسی سورت نہ توریت میں اتاری گئی اور نہ زبور میں اور نہ انجیل میں (اخرجہ الترمذی وصححہ)

اسی وجہ سے ہر نماز میں اس سورت کا پڑھنا لازم قرار دیا گیا۔ اس وقت ہم انجیل کی وہ عبارت ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس کو نصاریٰ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ تاکہ دونوں کے موازنہ اور مقابلہ سے اہل اسلام کے ایمان اور ایقان میں اضافہ ہو اور نصاریٰ کے لیے اگر وہ خدا سے ڈریں اور غور و فکر سے کام لیں تو اُن کے لیے موجب ہدایت ہو۔

انجیل متی باب ششم آیت نہم میں ہے کہ اس طرح نماز پڑھا کرو۔

"اَبُوْنَا الَّذِیْ فِی السَّمٰوٰتِ لِیَتَقَدَّسْ اِسْمُكَ لِیَاْتِ مَلَكُوْتُكَ لِتَكُنْ مَشِیْئَتُكَ كَمَا فِی السَّمَآءِ عَلَی الْاَرْضِ خُبْزُنَا كَفَافَنَا اَعْطِنَا الْیَوْمَ وَاغْفِرْ لَنَا خَطَایَانَا كَمَا نَغْفِرُ نَحْنُ لِمَنْ

اَخْطَآءَ لَهُنَا۔ وَلَا تُدْخِلْنَا فِی التَّجَارِبِ لٰکِنْ نَجِّنَا مِنَ الشَّرِّیْرِ اٰمِیْنَ۔"

"اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے۔ تیرا نام پاک ہو۔ تیری بادشاہت آئی چاہیے تیری مشیت جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ایسے ہی زمین پر بھی ہو ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہماری خطاؤں کو معاف کر جیسا کہ ہم اپنے خطا کاروں کی خطائیں معاف کرتے ہیں اور ہم کو آزمائش میں نہ لا بلکہ برے لوگوں سے بچا۔ آمین۔ یعنی قبول فرما۔"

ارباب فہم و بصیرت اگر سورۂ فاتحہ کے بعد اس عبارت پر ایک نظر ڈالیں تو ان کو بخوبی منکشف ہو جائے گا کہ اس عبارت کو سورۂ فاتحہ کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں جو ثریٰ (خاک) کو ثریا سے ہے۔ صیغۂ امر سے تقدیس اسم اور اتیانِ ملکوت کو طلب کرنا محض لاطائل اور تحصیل حاصل ہے وہ ہمیشہ سے قدوس اور سلام اور ملیک مقتدر اور عزیز وحکیم ہے اُس مالک الملکوت اور قدوس وحکیم کی شان میں یہ لفظ کہنا کہ چاہئے کہ تیرا نام پاک ہو اور تیری بادشاہت آئے سراسر خلاف ادب ہے۔

اور علیٰ ہٰذا یہ کہنا (لتکن مشیتك کما فی السَّمَاء علی الارض) چاہیے کہ تیری مشیت جیسے آسمان میں ہے ویسے ہی زمین میں بھی ہو۔ یہ بھی سراسر خلاف ادب ہے کیا اس کی مشیت سبع سمٰوات اور سبع ارضین میں جاری اور ساری نہیں؟ اور کیا کوئی ذرہ اس کی قدرت اور مشیت سے مستثنیٰ ہے؟ حاشا وکلا۔ "بَلٰی اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" اور علیٰ ہٰذا آج کی روٹی کے سوال کو ہدایت اور صراط مستقیم کے سوال (جو دنیا اور آخرت کی صلاح اور فلاح اور سعادت دارین) کو علیٰ وجہ الاتم شامل ہے۔ اس سے کیا نسبت؟ اور پھر اس غفور رحیم اور ﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ سے یہ سوال کرنا کہ ایسی مغفرت عطا فرما جیسا کہ ہم اپنے گنہگاروں اور خطا کاروں کی مغفرت کرتے ہیں۔ کھلی ہوئی سفاہت اور صریح گستاخی ہے اس کی کامل وعظیم اور وسیع وعمیم مغفرت کو اپنی ناقص اور محدود اور برائے نام مغفرت کیساتھ تشبیہ دینا اور در پردہ اپنے خطا کاروں کو خدا کے خطاروں کے ساتھ مماثل بتلانا اور ضمناً اپنی نافرمانی کو خدا کی نافرمانی کے ہم پلہ قرار دینا یہ کھلی ہوئی گستاخی نہیں؟۔

اُس رب العالمین اور اس حنان ومنان کی تمام آلاء ونعم میں سے صرف آج کی روٹی کا سوال کرنا۔ رب غفور اور ارحم الراحمین سے اپنی ناقص اور محدود مغفرت کے مماثل مغفرت طلب کرنا، نصاریٰ کے فہم وفراست کو خوب واضح کرتا ہے۔

اخیر میں لفظ آمین مذکور ہے۔ جو اہل اسلام سے سرقہ ہے سوائے اہل اسلام کی دنیا میں کوئی بھی آمین کو نہیں جانتا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ

رب العلمین

٢ سُورَةُ البَقَرَة مَدَنِيَّة ٨٧ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰياتها ٢٨٦ رکوعاتها ٤٠

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ

الم ف۱ اس کتاب میں کچھ شک نہیں ف۲

الم۔ اس کتاب میں کچھ شک نہیں

سورہ بقرہ کی تفسیر

اس سورۃ کو سورۂ بقرہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں ذبح بقرہ کا واقعہ مذکور ہے جو حق جل وعلا کی الوہیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے اس لیے کہ ایک مقتول کا محض ایک مذبوحہ گائے کا ایک ٹکڑا لگا دینے سے زندہ ہو جانا فقط اس ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ کے ارادہ اور مشیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا کسی مادہ اور طبیعت کے اقتضاء کو اس میں اصلاً دخل نہ تھا۔ علاوہ ازیں یہ واقعہ منکرین حشر اجساد کے لیے ایک عظیم الشان حجت ہے کہ وہ اس واقعہ سے عبرت پکڑیں اور خوب سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بھی مردوں کو اس طرح زندہ فرمائے گا۔ جس طرح اس مقتول کو زندہ فرمایا۔ نیز یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتبار سے ایک معجزہ تھا جو ان کی نبوت اور رسالت کی تصدیق کے لیے من جانب اللہ ظاہر کیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ بقرہ کا یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور احیاء موتی اور قیام قیامت، تینوں کی دلیل ہے اور یہی تین امور قرآن کریم کے عظیم مقاصد ہیں۔ نیز اس واقعہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ صراط ① مستقیم کا اقتضاء یہی ہے کہ بغیر تفتیش اور تفحص کے انبیاء علیہم السلام کے حکم کے بعد تفتیش میں پڑنا شک اور نفاق کی علامت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر پر اطمینان ہوتا تو اس تفتیش کے خلجان میں نہ پڑتا اور حضرات انبیاء کی اطاعت سے انحراف ضلال مبین (کھلی گمراہی) ہے۔ اور ان حضرات سے حجتیں کرنا موجب غضب اور لعنت ہے اعاذنا اللّٰه تعالیٰ من ذلك آمین۔ نیز دنیا کی محبت ہی تمام فتنہ اور فساد کی جڑ ہے۔ جب دنیا کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے تو اعزہ اور اقارب کی محبت بھی دل سے نکل جاتی ہے۔ اللہ جل جلالہ ② کی

ف۱ ان حروف کو مقطعات کہتے ہیں ان کے اصلی معنی تک اوروں کی رسائی نہیں۔ بلکہ یہ بھید ہے اللہ اور رسول کے درمیان جو بوجہ مصلحت و حکمت ظاہر نہیں فرمایا۔ اور بعض اکابر سے جو ان کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل وتنبیہ وتسہیل مقصود ہے یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے تو اب اس کو رائے شخصی کہہ کر تغلیط کرنا محض شخصی رائے ہے۔ جو تحقیق علماء کے بالکل خلاف ہے۔

ف۲ یعنی اس کے کلام الٰہی ہونے اور اس کے جملہ مضامین کے واقعی ہونے میں کچھ شک نہیں جاننا چاہیئے کہ کسی کلام میں اشتباہ ہونے کی دو صورتیں ہیں یا تو خود اس کلام میں کوئی غلطی اور خرابی ہو یا سننے والے کے فہم میں خلل ہو۔ اول صورت میں محل ریب یہ کلام ہے اور دوسری صورت میں محل ریب حقیقت میں سمجھنے والے کا فہم ہے۔ کلام بالکل حق ہے گو اس کو اپنی ناسمجھی سے وہ کلام محل ریب معلوم ہو۔ سو اس آیت میں ریب کی صورت اول کی نفی فرمائی ہے تو اب یہ شبہ کہ کلام اللہ کے کلام الٰہی اور حق ہونے میں تو سب کفار کو ریب و انکار تھا پھر اس نفی کے کیا معنی۔ بالکل جاتا رہا۔ باقی رہی صورت ثانی اس کو آگے چل کر فرما دیا گیا ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ﴾ الخ

① سورۂ بقرہ اور سورۂ فاتحہ کے باہمی ربط کی طرف اشارہ ہے۔ فافهم ذلك واستقم۔ ۱۲ منه عفا الله عنه

② اس میں بھی ربط کی طرف اشارہ ہے کہ هدى للمتقين اور سواء عليهم أأنذرتهم أم لم تنذرهم کو مغضوب عليهم اور ضالين کے =

ہدایت اور انبیاء کرام کی نصیحت جب ہی نفع دیتی ہے کہ دل میں خدا کا خوف اور کچھ ڈر ہو۔ جب خدا کا خوف دل میں ہوتا ہے تب ہی صراط مستقیم اور راہ حق کی تلاش اور خداوند ذوالجلال کے غضب اور لعنت سے بچنے کی فکر ہوتی ہے ورنہ جس شقی اور بدبخت کا دل خدا کے خوف سے خالی ہے اس کے حق میں انبیاء کا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے۔ نیز سورہ فاتحہ میں ہدایت اور صراط مستقیم کا ذکر تھا اور سورہ بقرہ میں شروع ہی سے ہدایت اور صراط مستقیم کا ذکر فرمایا۔ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ ابتدا میں ہی ہدایت ذکر فرمایا اور پھر یہ بتلایا کہ صراط مستقیم کیا ہے۔ وہ ایمان اور تقویٰ اور اعمال صالحہ کی راہ ہے پھر یہ بتلایا کہ یہ ہدایت کی نعمت کس کو نصیب ہوئی۔ اور کون اس دولت وسعادت سے محروم رہا۔ ﴿هُدًى﴾ سے ﴿أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ تک اس فریق کا ذکر فرمایا جس کو ہدایت نصیب ہوئی اور جو ظاہراً اور باطناً اللہ کی ہدایت اور صراط مستقیم پر چلنے والے تھے۔ اور پھر اہل غضب اور اہل ضلال کے دو فرقوں کا ذکر فرمایا ایک کافرین مجاہرین جو ظاہراً اور باطناً صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے تھے۔ دوم منافقین جو ظاہراً صراط مستقیم پر تھے اور باطناً غضب اور ضلال کی راہ پر تھے۔ اور چوتھی قسم یعنی جو ظاہراً تو غضب اور ضلال کی راہ پر ہو اور معنیٰ صراط مستقیم پر ہو یہ قسم عقلاً اور شرعاً باطل ہے اس لیے اس قسم کو ذکر نہیں فرمایا۔ نیز سورہ فاتحہ میں حق تعالیٰ شانہ کی ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت کا ذکر تھا اس لیے سورہ بقرہ کے شروع میں ہی صحیفہ ہدایت ⓫ کا ذکر فرمایا کہ جس سے بڑھ کر کوئی تربیت اور رحمت نہیں پھر ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ﴾ الخ میں اس ظاہری ربوبیت اور رحمت کا ذکر فرمایا جس کا تمام نوع انسانی سے تعلق ہے اور ﴿يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ میں تمام لوگوں کو اپنی عبادت اور بندگی کا خطاب عام فرمایا۔ بعد ازاں اس خاص ربوبیت اور اس خاص رحمت کا ذکر فرمایا کہ جو دو خاص فرقوں سے متعلق تھی۔ ایک فرقہ بنی اسرائیل دوم فرقہ بنی اسماعیل پھر مسئلہ ملت اسلام اور قبلہ اسلام کا ذکر فرمایا اور یہ بتلادیا کہ ملت ابراہیمی اور قبلہ ابراہیمی کا اتباع ہی صراط مستقیم ہے اور اس راہ سے اعراض سراسر سفاہت اور حماقت ہے اور آیت ﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ﴾ میں جو ٹھیک سورہ بقرہ کے نصف پر ہے۔ صراط مستقیم کی تفصیل فرمائی کہ صراط مستقیم اللہ اور یوم آخرت اور ملائکہ اور انبیاء پر ایمان لانا ہے گویا کہ یہ آیت ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ کی تفسیر ہے کہ غیب سے یہ چیزیں مراد ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں بعد ازاں اخیر سورت تک احکام کا سلسلہ چلا گیا۔ اخیر سورت میں ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۚ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾ الآیۃ میں پھر صراط مستقیم کی حقیقت اور ایمان بالغیب کی کیفیت کو واضح فرمایا اور مغفرت اور رحمت اور نصرت کی دعاء پر سورت کو ختم فرمایا۔ خلاصہ کلام یہ کہ سورہ بقرہ کے شروع میں بھی ہدایت اور صراط مستقیم اور رحمت اور ربوبیت کا ذکر فرمایا اور درمیان میں بھی اور اخیر میں بھی گویا کہ یہ تمام سورت سورہ فاتحہ کی تفسیر اور تشریح ہے۔

﴿الٓمّٓ﴾

اس قسم کے حروف جو سورتوں کی ابتدا میں ذکر کیے جاتے ہیں ان کو ''حروف مقطعات'' کہتے ہیں اس لیے کہ یہ

= ساتھ کیا ربط ہے۔ ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ۔

⓫ یعنی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔ ۱۲ منہ۔

کلمات حروف تہجی کی طرح جدا جدا پڑھے جاتے ہیں اس لیے مقطعات (جدا جدا) کہلاتے ہیں۔ ان کے بارے میں حضرات مفسرین کے مختلف اقوال ہیں

۱۔ خلفاء راشدین اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے نزدیک یہ حروف متشابہات میں سے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ان کی مراد معلوم نہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ﴾ ''ان متشابہات کی حقیقت سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔''

۲۔ بعض سلف اور جمہور متکلمین اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں جن کے شروع میں یہ مذکور ہیں جو مضامین اس سورت میں بالتفصیل مذکور ہیں یہ حروف مقطعات اس تفصیل کا اجمال ہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری کا نام (الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وأیامہ) کتاب موصوف کے تمام مفصل مضامین کا اجمال ہے۔ جس طرح مرکبات کلامیہ کا مفید معنی ہونا ان کے اجزاء یعنی کلمات مفردہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے اسی طرح کلمات مفردہ کا مفید معنی ہونا حروف ہجائیہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے جس درجہ کلام میں ترکیب ہوگی اسی درجہ معنی میں بھی ترکیب ہوگی یہی وجہ ہے کہ مرکبات اضافیہ اور مرکبات توصیفیہ کے معنی میں اتنی ترکیب نہیں جتنی کہ مرکبات تامہ خبریہ کے معنی میں ترکیب ہے ترکیب لفظی کے انحطاط سے ترکیب معنوی میں بھی انحطاط آ گیا۔

مرکبات اضافیہ اگرچہ فی حد ذاتہا مرکبات ہیں مگر مرکبات تامہ خبریہ کے لحاظ سے فی الجملہ بسیط ہیں اور اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی بساطت اور اجمال ہے مگر حروف ہجائیہ مادہ کلمات ہونے کی وجہ سے انتہا درجہ کے بسیط ہیں پس اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی انتہا درجہ کی بساطت اور غایت درجہ کا اجمال ہوگا جن جن کا بغیر تفہیم الٰہی اور بدون تائید غیبی کے سمجھنا ناممکن اور محال ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے ''فوز الکبیر'' میں اسی مسلک کو اختیار فرمایا ہے۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات کے اسرار اور رموز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہی حضرات پر منکشف ہوتے ہیں جو من جانب اللہ خاص طور پر علوم نبوت کے وارث بنائے گئے بلکہ کسی وقت حروف مقطعات خود بخود ان وارثین علوم نبوت کے سامنے اپنے اندرونی اسرار اور غوامض بولنے لگتے ہیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر سنگریزے تسبیح پڑھتے تھے اور صحابہ کرام اپنے کانوں سے سنگریزوں کی اس تسبیح کو سنتے تھے۔ اور گوہ اور ہرن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کرتے تھے باقی ہم جیسوں کا حروف مقطعات کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہنا ہرگز اس کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ کہ نفس الامر اور واقع میں یہ حروف معانی اور حقائق سے عاری ہیں۔ (روح المعانی) حدیث میں ہے کہ ہر آیت کے لیے ایک ظہر ہے اور ایک بطن ہے یعنی ظاہری معنی کے علاوہ اس آیت کے کچھ باطنی اور معنوی اسرار اور لطائف بھی ہوتے ہیں جن کو ارباب باطن ہی سمجھتے ہیں اور وہ باطنی اسرار مدلول لفظی کے ماتحت ہوتے ہیں مخالف نہیں ہوتے ہیں بلکہ باطنی اسرار کے حق اور باطل ہونے کا معیار ہی یہ ہے کہ وہ آیت کے ظاہری مدلول کے مطابق ہوں نہ کہ مخالف۔ کیونکہ شرط یہ ہے کہ وہ باطنی معنی ظاہری مدلول کے ماتحت ہوں اور ظاہر ہے کہ ماتحت ہو کر مافوق کا مخالف کیسے ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ حروف مقطعات ظاہر کے اعتبار سے مجہول الکنہ اور غیر معلوم المراد ہوں اور باطن کے اعتبار سے ارباب باطن کے نزدیک معلوم المراد ہوں۔

۳۔ علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات۔ حروف تہجی کے اسماء ہیں اور ظاہر ہے کہ کلام کا مادہ اور عنصر یہی حروف تہجی ہیں۔، انہی سے مل کر کلام بنتا ہے۔ قرآن کریم کی بعض سورتوں کو ان حروف سے شروع کرنے میں اعجاز قرآن کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قرآن جس کے کلام الٰہی ہونے کا تم لوگ انکار کرتے ہو وہ انہی حروف سے مرکب ہے جن سے تم اپنے کلام کو

ترکیب دیتے ہو پس اگر یہ قرآن خدا کا کلام نہیں تو تم اس جیسے کلام کے بنانے سے کیوں عاجز ہو پھر اس ذاتی اعجاز کے علاوہ اس پر بھی تو نظر کرو کہ ان مقطعات کا پیش کرنے والا شخص محض اُمی ہے جس نے نہ کبھی کسی مکتب کا دروازہ جھانکا اور نہ کسی استاذ اور کاتب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور تم فصحاء اور بلغاء اور ادباء اور خطباء ہو اور اس نبی امی نے جن حروف کو پیش کیا ہے ان میں ایسے دقیق اور نکات کی رعایت کی گئی ہے کہ جن کی بڑے سے بڑا ادیب اور ماہر عربیت بھی رعایت نہیں کرسکتا۔

صد ہزاراں دفتر اشعار بود پیش حرف امیش آں عار بود

مثلاً یہ کہ قرآن مجید کی انتیس سورتوں میں جو شمار کے اعتبار سے حروف تہجی کے برابر ہیں۔ چودہ حروف لائے گئے ہیں جو حروف تہجی کا نصف ہیں۔ نیز حروف کی تمام اقسام یعنی مہموسہ اور مجہورہ۔ شدیدہ اور رخوہ۔ مطبقہ اور منفتحہ وغیرہ وغیرہ میں سے ہر قسم کے نصف نصف حروف لائے گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے کشاف اور بیضاوی کی مراجعت فرمائیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ حروف مقطعات کی تفسیر میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ اس ناچیز کا گمان یہ ہے کہ تمام اقوال اپنی اپنی جگہ پر سب درست ہیں حروف مقطعات لغت عربیہ کے اعتبار سے حروف تہجی کے اسماء ہیں۔ جیسا کہ علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں اور یہی خلیل بن احمد اور سیبویہ اور دیگر ائمۂ عربیت کا مذہب ہے اور ظاہر شریعت کے اعتبار سے متشابہات اور خداوند ذوالجلال کے مخفی اسرار ہیں جن کے معانی سے عام طور پر لوگوں کو اطلاع نہیں دی گئی اور نہ ان میں اس کی استعداد ہے اس لیے ان پر ایمان لانا لازم ہوا اور ان کی تحقیق اور تفتیش کرنا ممنوع ہوا اور اگر یہ شبہ کیا جائے کہ جب حروف مقطعات کو سر الٰہی مانا گیا تو قرآن مفہوم المعنی نہ رہے گا تو پھر نزول سے کیا فائدہ؟ جواب یہ کہ نزول قرآن کا فائدہ۔ فہم معانی میں منحصر نہیں بلکہ بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ جہاں مکلفین سے فقط ایمان لانا مطلوب ہے اسی طرح حروف مقطعات کے نازل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور ان کے من جانب اللہ ہونے کا یقین کریں تاکہ بندوں کا کمال انقیاد ظاہر ہو۔

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

یہ حضرات مفسرین اور محدثین (بکسر الدال) کا مذہب ہے اور حضرات محدثین (بفتح الدال) یعنی جو حضرات محدث من اللہ اور ملہم من اللہ ہیں ان کا مسلک یہ ہے کہ حق تعالیٰ کبھی کبھی اپنے مخصوص بندوں کو حروف مقطعات کے معانی اور اسرار سے بذریعہ الہام کے مطلع فرمادیتے ہیں۔ محدثین (بکسر الدال) اور محدثین (بفتح الدال) حقیقی نزاع نہیں۔ محض لفظی نزاع ہے۔ محدثین۔ جو علم اور ادراک کی نفی کرتے ہیں وہ عوام کے اعتبار سے ہے اور اس نفی سے بھی علم یقینی کی نفی مراد ہے علم ظنی اور وجدانی کی نفی مراد نہیں اور محدثین (بفتح الدال) جو حروف مقطعات کے معانی کے علم اور ادراک کے قائل ہیں وہ خواص کیلیے قائل ہیں نہ کہ عوام کے لیے اور پھر خواص کو بھی جو علم ہوتا ہے وہ ظنی اور وجدانی ہوتا ہے۔ قطعی اور یقینی نہیں ہوتا اور عجب نہیں کہ حروف مقطعات عالم غیب میں ذوالوجوہ ہوں کسی پر کوئی معنی اور کسی پر کوئی معنی منکشف ہوں۔ مثلاً کسی پر یہ منکشف ہوا ہو کہ حروف مقطعات اسماء الٰہی ہیں اور کسی پر یہ منکشف ہوا ہو کہ یہ اسماء سور ہیں جس کسی نے جو کچھ کہا وہ اپنے مکاشفہ اور مشاہدہ کے لحاظ سے کہا اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کریم کو عربی زبان میں اتارا عربی زبان کے اعتبار سے حروف مقطعات حروف تہجی کے اسماء ہیں۔ سورتوں کے شروع میں طرح طرح کے لطائف اور معارف اور قسم قسم اعجاز کی رعایت کے ساتھ ان کو لایا گیا ہے لہٰذا ائمہ عربیت

اور علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی کا یہ قول محدثین اور محدثین کے قول کے ہرگز منافی اور مخالف نہیں علامہ زمخشری اور بیضاوی کا قول "لسان عربی مبین" کے قواعد پر مبنی ہے اور محدثین (بکسر الدال) کا قول کہ حروف مقطعات متشابہات سے ہے ظاہر شریعت پر مبنی ہے اور محدثین (بفتح الدال) یعنی اولیاء اللہ اور عارفین کا قول باطن شریعت پر مبنی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ہر آیت کے لیے ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور پھر ہر ظاہر اور ہر باطن کے لیے کچھ وجوہ ہوتے ہیں کوئی عالم کسی وجہ کو اختیار کرتا ہے اور کوئی کسی وجہ کو۔ ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم علمہ واتم واحکم۔

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾

یہی کتاب حقیقت میں کتاب ہے کہ تمام کتب الہیہ اور صحف سماویہ کے متفرق علوم اور مضامین کی جامع ہے اور اسی وجہ سے اس کا اتباع تمام کتب سماویہ کا اتباع ہے اور اس کا انکار تمام کتب الہیہ کا انکار ہے کتاب کا اصل مادہ لغت میں جمع کرنے کے معنی میں آتا ہے اس لیے اس کے مناسب معنی بیان کیے گئے اور ذلک اسم اشارہ اس لیے لایا گیا کہ اس طرف اشارہ ہو جائے کہ اس کتاب کی جامعیت محسوس اور مشاہد ہے۔ ارباب معنی تو علوم اور معارف کی روشنی میں اس کی جامعیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اصحاب لفظ۔ فصاحت اور بلاغت کے آئینہ میں اس کی جامعیت کا جلوہ دیکھتے ہیں۔

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ می دارد   برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

اور بجائے لفظ "ھٰذا" کے جو اشارہ قریب کے لیے مستعمل ہوتا ہے لفظ "ذٰلِكَ" کا استعمال فرمایا جو اشارہ بعیدہ کے لیے وضع ہوا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی بے مثال جامعیت اور عجیب و غریب حقائق و معارف اور اسرار وغوامض اور دقائق اور لطائف پر مشتمل ہونے کی وجہ سے نظر وفکر کی جولانگاہ سے بہت ہی دور اور بلند اور برتر ہے۔ یعنی قرآن اگرچہ باعتبار صورت کے حاضر وقریب ہے مگر اسرار وحقائق کے اعتبار سے ہمارے فہم وادراک سے بہت بعید ہے۔ اس لیے بجائے "ھٰذا" کے "ذٰلِكَ" اسم اشارہ بعید لایا گیا۔

﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾

اور اس کتاب کے کامل اور بے مثال ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے تمام مطالب مدلل اور مبرہن ہیں اس میں کسی قسم کے شک اور تردد کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ایسی جامع اور مکمل۔ اور واضح اور مدلل کتاب میں بھی اگر کسی کو کوئی شک اور شبہ پیش آئے تو وہ اس کے فہم کا قصور ہے اس کتاب میں تو کوئی شبہ نہیں یہ نافہم اپنی سے شبہ میں پڑ گیا۔ قرآن کی کوئی بات بھی عقل سلیم کے خلاف نہیں۔

یہ پہلی سورت ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ میں سب سے پہلے نازل ہوئی۔ مگر ایک آیت ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾۔ بالاتفاق حجۃ الوداع میں دسویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ میں اتری۔ تبع کے زمانہ سے یہود نبی آخر الزمان کے انتظار میں مدینہ منورہ آکر آباد ہوئے تھے ان آیات میں انہیں کو خطاب ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کی خبر انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں۔ مالک بن صیف یہودی مسلمانوں کے دلوں میں شک ڈالتا تھا کہ یہ وہ کتاب نہیں کہ جس کی خبر اگلی کتابوں میں دی گئی ہے اور اس میں کوئی شک اور شبہ نہیں۔ علماء بنی اسرائیل میں سے جو حقیقت میں علماء تھے۔ وہ قرآن کو سنتے ہی ایمان

لے آئے اور جن کے دل ثمن قلیل اور دراہم معدودہ کی محبت میں گرفتار تھے وہ اس سعادت سے محروم رہے کما قال تعالیٰ:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا﴾

''قرآن کو ہم نے بتفریق نازل کیا تا کہ آپ ان کو لوگوں کے سامنے آہستہ آہستہ پڑھیں اور بتدریج ہم نے اس کو نازل کیا آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ مگر وہ لوگ جن کو اس کے نازل ہونے سے پہلے اس کا علم دیا گیا ان کی حالت تو یہ ہے کہ جب ان پر اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو ٹھوڑیوں پر سجدہ میں گر جاتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ سبحان اللہ بیشک خدا کا وعدہ (جو اس کتاب کے نازل کرنے کے متعلق تھا) وہ پورا ہو کر رہا اور گریہ وزاری کرتے ہوئے ٹھوڑیوں پر گرتے ہیں اور ان کے خشوع میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔''

(ف ۱) اس روایت سے ذلک اسم اشارہ بعید لانے کی ایک اور وجہ بھی معلوم ہوگئی کہ ذلک کا اشارہ اس کتاب کی طرف ہے کہ جس کی انبیاء سابقین خبر دیتے چلے آئے تھے۔ یعنی یہ وہی کتاب ہے جس کی خبر کتب سابقہ میں دی گئی ہے۔

(ف ۲) یہ خصوصیت قرآن کریم ہی کی ہے کہ اس کے تمام مضامین عقل سلیم کے مطابق اور سب کے سب یقینی ہیں۔ تقلیدی اور ظنی نہیں کہیں ریب اور تردد کی گنجائش نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس کتاب کے مضامین اور مطالب اس درجہ قطعی اور یقینی ہوں کہ اس میں کہیں شک اور شبہ کی گنجائش نہ ہو تو اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں کیا شک اور شبہ ہوسکتا ہے توریت اور انجیل کو دیکھئے کہ اصل ہی سے مشکوک ہے تثلیث اور الوہیت مسیح اور کفارہ کے مضامین فقط اس درجہ ہی میں نہیں کہ عقل کو ان میں کوئی شک اور تردد ہو بلکہ عقل قطعاً ان کو لغو اور باطل سمجھتی ہے توریت میں العیاذ باللہ حضرات انبیاء کا بت پرستی کرنا اور جھوٹ بولنا اور العیاذ باللہ حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں سے زنا کرنا مذکور ہے اس کو کون عقل باور کرسکتی ہے۔ وید اور دساتیر میں جا بجا عناصر اور کواکب پرستی کے مضامین مذکور ہیں جن سے عقل نفرت کرتی ہے لنگ اور بھگ (فرج) کی پوجا کا ذکر ہی عقل کے لیے باعث صد عار و ننگ ہے۔ شرک اور بے شرمی کی بھی حد ہوگئی کہ شرمگاہ کو بھی پرستش سے نہ چھوڑا۔

مولانا عبدالحق صاحب حقانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں، ص: ۶۱، ج ۲، گبن جو کہ انگلستان کا بڑا مشہور مؤرخ اور مقنن ہے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

محمد کا مذہب شکوک وشبہات سے پاک ہے مکہ کے پیغمبر نے بتوں اور انسانوں اور ستاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا ہے کہ جو شئے طلوع ہوتی ہے غروب ہوجاتی ہے اور جو حادث ہے وہ فانی ہے اور جو قابل زوال ہے وہ معدوم ہوجاتی ہے الخ ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا الخ ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر یقین رکھتا ہو وہ مسلمانوں کے عقائد مذکورہ بالا کو کہہ سکتا ہے کہ وہ عقائد ہمارے ادراک اور قوائے عقلی سے بڑھ کر ہیں وہ اصل کہ جس کی بناء عقل اور وحی پر ہے محمد کی شہادت سے استحکام کو پہنچی انتہی ملخصاً۔ اور سیل باوجود سخت تعصب کے اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں اقرار کرتا ہے۔ کہ تھوڑے سے دنوں میں جو محمد کا دین شرقاً غرباً روئے زمین پر پھیل گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس

مذہب کے جملہ امور وہ امور ہیں کہ جن کو عقل بہت جلد تسلیم کرتی ہے جو لوگ تلوار کے زور سے اس دین کا پھیلنا خیال کرتے ہیں وہ بڑی غلطی میں ہیں۔ انتہی ملخصا۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

راہ بتلاتی ہے ف۱ ڈرنے والوں کو ف۲ جو کہ یقین کرتے ہیں بن دیکھی چیزوں کا ف۳ اور قائم رکھتے ہیں نماز کو ف۴ اور جو ہم نے روزی دی ہے ان کو

راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو بے یقین کرتے ہیں بن دیکھے اور درست کرتے ہیں نماز کو اور ہمارا دیا

يُنْفِقُوْنَ ۝۳

اس میں سے خرچ کرتے ہیں ف۵

کچھ خرچ کرتے ہیں۔

صفات مومنین مخلصین

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ یہ کتاب ہدایت ہے متقیوں کے لیے جس درجہ کا تقویٰ ہے اس درجہ کی ہدایت ہے یہ جملہ ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ کی دوسری دلیل ہے یعنی کتاب حقیقت میں یہی ہے اس لیے کہ اول تو اس میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش نہیں دوم یہ کہ یہ کتاب خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایک نور مبین اور مشعل ہدایت ہے۔ جب تک دل میں خدا کا خوف نہ ہو اس وقت تک راہ ہدایت نظر نہیں آتی یا یہ کہو کہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ کی دلیل ہے یعنی اس جامع کتاب میں اس لیے شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ کتاب تو مشعل ہدایت ہے لوگوں کے شبہات اور توہمات کی ظلمتوں اور تاریکیوں کو دور کرنے کیلیے اتاری گئی ہے ہر بات اس کی میزان عقل میں تلی ہوئی ہے ہر بیان اس کا شافی کافی مدلل اور مبرہن ہے۔ اور ہام پرستوں کے لیے سیف قاطع ہے بھلا ایسی کتاب میں کہاں شک اور شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے چند سال میں جو لوگوں کو ہدایت کی طرف کھینچا توریت انجیل اس کی نظیر تو کیا عشر عشیر بھی نہیں پیش کر سکتی۔ چند ہی روز میں عرب جیسے وحشی ملک کو خدا پرستی کا گہوارہ بنا دیا۔ عرب کے درندے یکلخت شمع نبوت کا پروانہ بن گئے حواریین کی بے وفائی کے خود نصاریٰ معترف ہیں کہ حضرت مسیح کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہودا نے تیس درہم رشوت لے کے حضرت مسیح کو گرفتار کرا دیا۔ سورۂ فاتحہ میں بندوں کی جانب سے خدا کی حمد وثنا کا ذکر تھا۔ سورہ بقرہ میں اس کے برعکس خدائے عز وجل کی

ف۱ یہاں سے اخیر قرآن تک جواب ہے ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کا جو سوال بندوں کی طرف سے ہوا تھا۔

ف۲ یعنی جو بندے اپنے خدا سے ڈرتے ہیں ان کو یہ کتاب راستہ بتلاتی ہے کیونکہ جو اپنے خدا سے خائف ہو گا اس کو امور مرضیہ اور غیر مرضیہ یعنی طاعت ومعصیت کی ضرور تلاش ہو گی اور جس نافرمان کے دل میں خوف ہی نہیں اس کو اطاعت کی کیا فکر اور معصیت سے کیا اندیشہ۔

ف۳ یعنی جو چیزیں ان کی عقل وحواس سے مخفی ہیں (جیسے دوزخ۔ جنت۔ ملائکہ وغیرہ) ان سب کو اللہ اور رسول کے ارشاد کی وجہ سے حق اور یقینی سمجھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ان امور غائبہ کا منکر ہدایت سے محروم ہے۔

ف۴ اقامت صلوٰۃ کا یہ مطلب ہے کہ ہمیشہ رعایت حقوق کے ساتھ وقت پر ادا کرتے ہیں۔

ف۵ سب طاعتوں کی اصل تین ہیں۔ اول جو باتیں دل سے تعلق رکھتی ہیں، دوسری بدن سے، تیسری مال سے سو اس آیت میں ہر سہ اصول کو ترتیب وار لے لیا۔

جانب سے عبادِ متقین کی مدح وثناء کا ذکر ہے۔ سبحان اللہ۔ خود اپنی رحمت اور فضل سے ایمان اور تقویٰ کی صفت عطا فرمائیں اور پھر خود ہی اس کی توصیف فرماتے ہیں: اللھم لا نحصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك۔

لغت میں تقویٰ کے معنی صیانت اور حفاظت کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں ان چیزوں سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں جو آخرت کے لحاظ سے ضرر رساں ہوں۔ خواہ از قبیل عقائد و اخلاق ہوں یا از قبیل اقوال و افعال و احوال ہوں۔ اور چونکہ ضرر کے درجات مختلف ہیں اسی اعتبار سے تقویٰ کے درجات بھی مختلف ہیں۔

پہلا مرتبہ

یہ ہے کہ کفر سے تائب ہو کر اسلام میں داخل ہو اور اپنے کو عذاب دائمی کی مضرت سے بچالے۔ ﴿وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ میں تقویٰ سے یہی معنی مراد ہیں۔

دوسرا مرتبہ

یہ ہے کہ اپنے نفس کو ارتکاب کبائر اور اصرار علی الصغائر کی مضرت سے محفوظ رکھے کما قال تعالیٰ: ﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا﴾۔ اہل شریعت کی اصطلاح میں جب تقویٰ کا لفظ بولا جاتا ہے تو یہی معنی مراد ہوتے ہیں اور کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقٰى
چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دے۔ یہی تقویٰ ہے۔
وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى
خدا کی راہ میں اس طرح چل جس طرح کہ خاردار جنگل میں ڈر ڈر کر اور سنبھل سنبھل کر کوئی چلتا ہے
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى
چھوٹے چھوٹے گناہ کو بھی حقیر مت سمجھ۔ چھوٹے چھوٹے سنگریزوں سے پہاڑ بنتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب سے تقویٰ کی حقیقت دریافت کی تو یہ جواب دیا کہ اے امیر المومنین کیا آپ کبھی کسی پرخار راستہ سے بھی گزرے ہیں فرمایا کیوں نہیں۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المومنین پھر آپ نے اس وقت کیا کیا۔ فرمایا کہ میں نے دامن چڑھائے بچا بچا کر قدم رکھے کانٹوں سے بچنے کیلیے اپنی تمام جدوجہد کو خرچ کر ڈالا۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المومنین یہی تقویٰ ہے یعنی حق جل [1] وعلا کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کیلیے اپنی پوری ہمت اور طاقت کو خرچ کر دینے کا نام تقویٰ ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ ''یقیناً خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہے۔''

[1] یہ قید اس لیے لگائی کہ اگر دنیاوی ذلت وندامت سے ڈر کر معصیت کو چھوڑ اتو وہ تقویٰ نہیں خدا کے ڈر سے گناہ کو چھوڑنے کا نام تقویٰ ہے۔ ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ۔

تیسرا مرتبہ

یہ ہے کہ قلب کو ہر اس چیز سے محفوظ کر لیا جائے جو خدا تعالیٰ سے غافل کرتی ہو اور ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾ (اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) اس آیت میں تقویٰ کا یہی مرتبہ مراد ہے۔ خدا کا خوف ہی ہدایت کا مبداء اور ہر قسم کے فوز و فلاح کا سر چشمہ ہے اسی لیے حضرت نوح اور حضرت ہود اور حضرت صالح اور حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام نے سب سے پہلے اپنی قوم کو یہی نصیحت فرمائی۔ ﴿أَلَا تَتَّقُونَ﴾ کیا تم کو خدا کا خوف نہیں اور ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ﴾ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اس لیے کہ بغیر خدا کے خوف کے کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ کما قال تعالیٰ: ﴿سَيَذَّكَّرُ مَن يَخْشَىٰ﴾ یعنی نصیحت وہی قبول کرے گا جو خدا سے ڈرتا ہوگا۔

حق جل وعلا نے دوسرے موقعہ پر بجائے ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (یعنی ہدایت ہے انسانوں کے لیے) ارشاد فرمایا جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو متقی نہیں وہ درحقیقت انسان نہیں انسانیت اور آدمیت کا اقتضاء یہ ہے کہ اپنے خالق اور مالک سے ڈرے اور جو اس احکم الحاکمین سے نہیں ڈرتا وہ انسان نہیں بہائم کے مثل ہے بلکہ بہائم سے بدتر قال تعالیٰ: ﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾۔

سفر آخرت کے لیے تقویٰ ہی کا توشہ اور تقویٰ ہی کا لباس کارآمد ہو سکتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ﴾ ''سفر کے لیے توشہ لے لو پس تحقیق سب سے بہتر توشہ تقویٰ ہے۔''

جس طرح بغیر زادراہ کے مسافر کا دنیاوی سفر ناممکن ہے۔ اسی طرح بغیر تقویٰ کے توشہ کے آخرت کا سفر ناممکن ہے اور جس طرح ایک معمولی راستہ سے برہنہ اور عریاں گزرنا خلاف حیا اور خلاف شرم ہے۔ اس طرح اس عظیم الشان شاہراہ سے جو ایک لحہ کے لیے بھی بے شمار ملائکۃ اللہ سے خالی نہیں رہتی لباس تقویٰ سے برہنہ اور عریاں گزرنا کس طرح بے حیائی اور بے شرمی نہ ہوگا۔ اعاذنا اللہ من ذلک امین۔

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں ایمان بالغیب متقیوں کا خاص شعار ہے یہ کلمہ المتقین کی صفت ہے یا یوں کہو کہ پرہیزگاروں کی تعریف بیان فرماتے ہیں کہ پرہیزگار وہ ہیں جو خدا پر اور خدا کی نازل کردہ تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور عبادت گزار ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں المتقین میں تمام بری باتوں کے ترک کی طرف اشارہ تھا۔ اب امور خیر کا ذکر فرماتے ہیں چونکہ اجزاء انسانی میں سب سے اعظم اور اشرف جزء قلب ہے۔ اس لیے سب سے پہلے فعل قلب یعنی ایمان کا ذکر فرمایا جو درستی اعتقاد کا نشان ہے۔ اور آئندہ آیت ﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ الخ میں اعمال بدنیہ کا ذکر فرمایا جو درستی اعمال کی نشانی ہے۔

ایمان اور کفر کی تعریف

لغت میں ایمان کے معنی تصدیق اور تسلیم کے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں ایمان اس کو کہتے ہیں کہ جو چیز۔ اللہ کا نبی۔ اللہ کی طرف سے لے کر آئے نبی کے اعتماد اور بھروسہ پر دل سے اس کی تصدیق کرنا یعنی دل سے اس کو سچا جاننا اور

زبان سے اس کا اقرار کرنا یہ تو ایمان ہے اور دین کی کسی ایک چیز کا نہ ماننا اور انکار کرنا کفر ہے۔

تشریحات

۱۔ تصدیق قلبی سے محض علم اور معرفت مراد نہیں۔ تصدیق اور چیز ہے اور علم اور معرفت اور چیز ہے اور علم کے معنی جاننے کے ہیں۔ اور معرفت کے معنی پہچاننے کے ہیں اور تصدیق کے معنی ماننے کے ہیں اور ایمان نام ماننے کا ہے۔ جاننے کا نام ایمان نہیں۔ کفار مکہ دلائل نبوت کو دیکھ کر جانتے تھے کہ آپ نبی ہیں اور علماء یہود آپ کو خوب پہچانتے تھے کہ یہ وہی نبی آخر الزمان ہیں جن کی انبیاء کرام بشارت دیتے چلے آئے آپ کی جو علامتیں توریت اور انجیل میں تھیں وہ تمام علامتیں اپنی آنکھوں سے آپ میں دیکھتے تھے۔

﴿يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ﴾ ''یہود اپنے بیٹوں کی طرح حضور کو پہچانتے تھے۔''

مگر مانتے نہ تھے اس لیے ایمان سے بے بہرہ تھے۔ ایمان محض جاننے اور پہچاننے کا نام نہیں بلکہ اپنے اختیار اور ارادہ اور رضاء ورغبت سے ماننے کا نام ایمان ہے وقال تعالیٰ: ﴿وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَآ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا﴾ ''آپ کی نبوت کا محض تکبر کی وجہ سے انکار کرتے ہیں مگر دل ان کے یقین کیے ہوئے ہیں۔''

خلاصہ کلام یہ کہ محض علم اور ایقان۔ ایمان کی حقیقت نہیں بلکہ ایمان کی حقیقت تسلیم اور اذعان ہے یا بالفاظ دیگر۔ ایمان جاننے اور پہچاننے اور یقین کرنے کا نام نہیں بلکہ ماننے کا نام ایمان ہے۔

۲۔ ایمان کی تعریف میں نبی کے بھروسہ اور اعتماد کی قید اس لیے لگائی گئی کہ ایمان وہی معتبر ہے جو اللہ کی باتیں محض نبی کے کہنے سے اور محض نبی کے اعتماد اور بھروسہ پر مانے مثلاً کوئی شخص توحید اور رسالت دونوں کا اقرار کرتا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ میں توحید خداوندی کا فلاسفہ کی طرح محض دلائل عقلیہ کے بناء پر قائل ہوں۔ رسول اللہ کے کہنے سے توحید کا قائل نہیں تو ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں اس کی توحید فلاسفۂ یونان کی توحید ہے اہل ایمان کی توحید نہیں جیسا کہ عارف جامی شواہد النبوت کے پہلے ہی صفحہ میں حمد ونعت کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

''تحسین رکن از ارکان اسلام اقرار بکلمہ شہادت است وحقیقت ایمان تصدیق بمضمون آں وآں مشتمل بر دو امر است یکے اقرار بوحدانیت حق سبحانہ تعالیٰ وگرویدن بآں ودوم اقرار نبوت ورسالت محمد ﷺ وگرویدن بآں۔ وامر اول وقتے معتبر است کہ مقتبس از مشکوٰۃ نبوت باشد اگر بمجرد دلائل عقلی اکتفا کند چوں فلاسفہ واز مشکوٰۃ نبوت نگیرد مفید نجات نیست'' انتہی کلامہ۔

۳۔ دین کی باتوں کا ماننا وہی معتبر ہے کہ جب ان کو اس طرح مانا جائے کہ جس طرح اور جس ہیئت سے ان کا دین ہونا ثابت ہوا ہے۔ مثلاً کوئی شخص نماز کا شعار اسلام اور فریضۂ دین ہونا تو تسلیم کرتا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ صلوٰۃ سے مطلق دعاء اور خشوع وخضوع مراد ہے اور نماز کی فرضیت بہ ہیئت مخصوصہ یعنی بطریق قیام وقعود اور رکوع وسجود۔ تسلیم نہیں کرتا تو ایسا شخص قطعاً دائرہ ایمان سے خارج ہے۔ یا مثلاً زکوٰۃ کی فرضیت کو تسلیم کرے مگر یہ کہے کہ زکوٰۃ سے محض تزکیہ اور تطہیر مراد ہے یہ

خاص نصاب اور مال کی خاص مقدار ضروری نہیں تو ایسا شخص مؤمن نہیں۔ ملحد اور زندیق ہے۔ اصطلاح شریعت میں ملحد اور زندیق اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو شریعت کے الفاظ کو بحال اور برقرار رکھے اور اس کی حقیقت کو بدل دے یہ ایمان نہیں بلکہ دین کا تمسخر اور مذاق ہے اور حق جل شانہ کا یہ ارشاد: ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ ''اور جب کہا جاتا ہے ان سے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ یہ لوگ یعنی صحابہ ایمان لائے۔''

اسی طرف مشیر ہے کہ ایمان میں وہی تصدیق اور اذعان معتبر ہے جو صحابہ کرام کے قبول اور تسلیم اور ان کے تصدیق اور اذعان کے ہمرنگ ہو یہ نہیں کہ نام تو وہی ہو اور حقیقت کچھ اور ہو۔

۴۔ اصل ایمان تو تصدیق قلبی ہے اور زبانی اقرار حقیقت ایمان کی حکایت ہے اگر حکایت محکی عنہ کے مطابق ہے تو فبہا۔ ورنہ سوائے مکر وفریب کے کوئی شئے نہیں محض ایک جھوٹ ہے جو صدق اور راستی کے لباس میں نمودار ہے۔

۵۔ حضرات متکلمین فرماتے ہیں کہ ایمان کی اصل حقیقت تو تصدیق قلبی ہے اور اقرار لسانی دنیوی احکام کے جاری کرنے کے لیے شرط ہے کیونکہ زبان دل کی ترجمان ہے بغیر زبان کے دل کا حال کیسے معلوم ہو تصدیق قلبی چونکہ ایک پوشیدہ چیز ہے ہر شخص اس کو نہیں جان سکتا اس لیے بطور علامت اقرار لسانی اس کیلیے ضروری قرار دیا گیا کہ ظاہری احکام جاری ہو سکیں ورنہ اگر کوئی شخص گونگا ہو یا کسی کے اکراہ اور زبردستی سے محض زبان سے کلمۂ کفر کہے اور دل میں تصدیق موجود ہو تو کافر نہیں یا تصدیق قلبی کے بعد مر جائے اور زبانی اقرار کی نوبت نہ آئے تو اس کے ایمان میں کوئی خلل نہیں۔

حضرات محدثین اگرچہ اقرار باللسان اور عمل بالارکان کو جزء ایمان قرار دیتے ہیں لیکن ایمان کی اصل اور جز تصدیق قلبی ہی کو بتاتے ہیں اور یہ تصریح فرماتے ہیں کہ ایمان بغیر عمل صالح کے ناقص ہے کفر نہیں۔ حضرات متکلمین اور حضرات محدثین میں محض صوری نزاع ہے حقیقی اور معنوی نزاع نہیں۔ امام غزالی قدس اللہ سرہ ''**فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ**'' میں ایمان اور کفر کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:

''اَلْکُفْرُ ھُوَ تَکْذِیْبُ الرَّسُوْلِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ شَیْئٍ مِّمَّا جَآءَ بِہٖ وَالْاِیْمَانُ تَصْدِیْقُہٗ فِیْ جَمِیْعِ مَا جَآءَ بِہٖ''۔

''رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کی بھی تکذیب کر دینے کا نام کفر ہے اور تمام امور میں آپ کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔''

امام غزالی قدس سرہ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایمان کے لیے فقط ایک دو امر کی تصدیق کافی نہیں۔ تمام امور میں رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ ہاں کفر میں تمام امور کی تکذیب ضروری نہیں۔ ایک شئ میں بھی رسول کی تکذیب کفر ہے۔

مسئلہ تکفیر اہل قبلہ

یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ شریعت کی اصطلاح میں اہل ایمان اور اہل قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام متواترات اور ضروریات دین پر ایمان رکھتے ہوں گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے ان کی تکفیر نہیں کی

جائے گی، جیسا کہ معتزلہ اور خوارج کا مذہب ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ فقط قبلہ کی طرف نماز پڑھنے سے اہل ایمان اور اہل قبلہ کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک رسول کی تمام باتوں کی تصدیق نہ کرے۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ﴾ "نیکی اور بھلائی اس میں منحصر نہیں کہ فقط تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی جانب پھیر لو لیکن نیکی اور بھلائی یہ ہے کہ ایمان لائے اللہ پر اور یوم قیامت پر اور تمام فرشتوں پر اور اللہ کی ہر کتاب اور تمام پیغمبروں پر۔"

الحاصل اصطلاح شریعت میں اہل قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام ضروریات دین کی تصدیق کرتے ہوں اور کسی امر دینی کے مکذب اور منکر نہ ہوں اور ضروریات دین سے وہ امور مراد ہیں کہ جو شریعت میں ایسے معلوم اور مشہور ہوں کہ خواص و عوام سب ان کو جانتے اور پہچانتے ہوں جیسے توحید اور رسالت اور جو شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک امر کا بھی انکار کردے کہ جس کا دین سے ہونا قطعی ① اور بدیہی طور سے ثابت ہے تو وہ شخص قطعاً دائرہ ایمان اور زمرہ اہل قبلہ سے خارج ہے اگرچہ وہ شخص قبلہ رو ہو کر دن میں پچاس نمازیں ادا کرتا ہو۔ قال تعالیٰ:

﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ "کیا تم لوگ کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے اور بعض کا انکار کرتے ہو۔ ایسے شخص کی جزاء سوائے اس کے کچھ نہیں کہ دنیا میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں۔"

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ محض بعض احکام کا مان لینا کافی نہیں جب تک تمام احکام کی تصدیق نہ کرے۔ ایسے ہی لوگوں کی بابت پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ۝ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ﴾

"ایسے ہی لوگوں نے حیات دنیاویہ کو اخروی حیات کے بدلہ میں خرید لیا ہے پس ان پر سے نہ عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی اور البتہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو کھلے ہوئے نشانات دیئے اور روح القدس سے ان کی تائید کی تو پھر کیا تم ایسے ہو گئے

① یہ قید اس لیے لگائی کہ جن امور کا ثبوت ظنی ہے ان کے انکار سے کافر نہیں ہوتا۔

کہ جب بھی رسول تمہارے پاس تمہاری خواہشات کے خلاف کچھ لے کر آیا تو تم نے سرکشی کی۔ پھر کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔ نہیں بلکہ اللہ نے ان کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی پس وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔"

اس آیت کریمہ میں جس خاص کفر پر لعنت فرمائی ہے وہ یہی کفر ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام من جانب اللہ ایسی چیز لیکر آئے جو نفسانی خواہشوں کے خلاف ہو تو یہود بے بہبود نے اس کے ماننے سے سرکشی کی اور حضرات انبیاء کی تکذیب کی۔

"امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ فلاسفہ یونان جو سموات وکواکب کے فنا و فساد کے قائل نہیں وہ قطعاً کافر ہیں۔ جیسا کہ امام غزالی نے اپنے رسائل میں اس کی تصریح کی ہے اس لیے کہ یہ لوگ نصوص قطعیہ اور اجماع انبیاء کرام کے منکر ہیں کما قال تعالیٰ: ﴿إِذَا [11] الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿إِذَا [12] السَّمَاءُ انْشَقَّتْ﴾، وقال تعالیٰ: ﴿وَفُتِحَتِ [13] السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا﴾۔ مجدد صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

"نمیدانند کہ مجرد تفوہ بکلمۂ شہادت در اسلام کافی نیست تصدیق جمیع ما علم مجیئہ من الدین بالضرورۃ باید"۔ (مکتوبات: ۱/ ۳۲۳)

"نہیں جانتے کہ محض کلمہ شہادت پڑھ لینا مسلمان ہونے کے لیے کافی نہیں ان تمام امور کی تصدیق ضروری اور لازمی ہے کہ جن کا دین سے ہونا قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو گیا ہو۔"

البتہ جو امور ظنی طور پر ثابت ہوئے ہوں ان کی تصدیق جزء ایمان نہیں اور نہ انکار کفر کے درجہ تک پہنچاتا ہے۔ ہاں جو امور احادیث صحیحہ سے ثابت ہوں اور تواتر کے درجہ کو نہ پہنچے ہوں ان کے انکار سے اگرچہ کفر لازم نہیں لیکن گمراہی یقیناً ہے اور کفر کا اندیشہ ہے اور یہ گمراہی کا حکم بھی اس شخص کے لیے ہے جو کسی ایسے خاص امر کا انکار کر دے جو خبر واحد سے ثابت ہوا ہو اور جو شخص سرے ہی سے حدیث کا منکر ہو اور پیغمبر علیہ السلام کے اقوال و افعال کو حجت نہ سمجھتا ہو وہ بلاشبہ کافر ہے اور جو اس کفر میں شبہ کرے وہ بھی کافر ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا﴾

"تحقیق جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بعضوں کو مانتے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ

---

[11] یعنی جب سورج بے نور ہو جائے گا اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔

[12] جب آسمان پھٹ جائے گا۔

[13] اور آسمان کھل جائے گا تو اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔

بین بین ایک راہ نکالیں۔ ایسے لوگ پکے کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے اور کسی میں فرق نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ ضرور ان کا ثواب عطا کریں گے اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والے ہیں۔''

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول کے درمیان تفریق کرنا اللہ کے کلام کو حجت سمجھنا اور پیغمبر کی حدیث کو حجت نہ سمجھنا قطعاً کفر ہے اور جو شخص ایسا عقیدہ رکھے وہ پکا کافر ہے۔ وقال تعالیٰ:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

''قسم ہے تیرے پروردگار کی لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو آپس کے جھگڑوں میں حکم اور منصف نہ بنائیں اور پھر آپ کے فیصلہ کے بعد ذرہ برابر قلب میں کوئی انقباض نہ پائیں اور برضا و رغبت آپ کے فیصلہ کو اچھی طرح تسلیم کرلیں۔''

معلوم ہوا کہ ایمان محض اقرار کرنے کا نام نہیں بلکہ شرط یہ ہے کہ پیغمبر کے حکم اور فیصلہ پر دل و جان سے راضی ہو اور بہزار رضا و رغبت اس کو تسلیم کرے اور اگر کسی ایک بات کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کردے تو قطعاً کافر ہے۔ کفر کے لیے یہی ضروری نہیں کہ توحید و رسالت ہی کا انکار کرے جب ہی کافر ہو۔ جو حکم بھی دین کا نبی ﷺ سے قطعی طور سے ثابت ہوا ہو اس کا انکار کفر ہے۔ مثلاً جس شئی کی حلت یا حرمت نص قرآنی یا حدیث متواتر سے ثابت ہو جیسے زنا اور لواطت اس کا انکار بھی۔ کما قال تعالیٰ:

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ﴾

''ان لوگوں سے ضرور جہاد و قتال کرو جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور نہ حرام سمجھتے ہیں اس چیز کو جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے''۔

ایمان کے لیے کفر سے برأت اور بیزاری شرط ہے

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ ونفعنا بعلومہ وبرکاتہ۔ آمین اپنے ایک طویل مکتوب میں جو عقائد اسلامیہ کی تحقیق میں قلم مبارک سے نکلا ہے فرماتے ہیں:

''ایمان عبارت از تصدیق قلبی است آنچہ از دین بطریق ضرورت وتواتر بمارسیدہ است واقرار لسانی نیز رکن ایمان گفتہ اند کہ احتمال سقوط دارد وعلامت ایں تصدیق تبرّی است از کفر و بیزاری از کافری وآنچہ در کافر نیست از خصائص ولوازم آں ہمچناں بستن زنار وشل آں واگر عیاذاً باللہ سبحانہ باد عوائے ایں تصدیق تبرا از کفر نماید مصدق دینین است کہ بداغ ارتداد متسم است وفی الحقیقت حکم منافق است (لا الیٰ ھؤلاء ولا الیٰ ھؤلاء) پس در تحقیق ایمان از تبرّی کفر چارہ نبود وادنائے آں۔ تبری قلبی است واعلائے آں تبری قلبی وقالبی۔ وتبرّی عبارت از

دشمنی است با دشمنانِ حق جل وعلا، آں دشمنی خواہ بقلب بود اگر خوف ضرر ایشاں داشتہ باشد وخواہ بقلب وقالب ہر دو دروقت عدمِ آں خوف وآیتِ کریمہ: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ﴾ مؤید ایں معنی است چہ محبت خدائے عز وجل ومحبت رسول او علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات۔ بے دشمنی دشمناں صورت نہ بندد

تولا بے تبرا نیست ممکن

ایں جا صادق است حضرت ابراہیم خلیل الرحمن علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام ایں ہمہ بزرگی کہ یافت وشجرۂ انبیاء گشت بواسطہ تبری از دشمنان او تعالیٰ بودہ۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ﴾ (مکتوبات، ص: ۳۲۵، دفتر اول مکتوب نمبر ۲۶۶)

''ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل سے ان چیزوں کی تصدیق کی جائے جو دین سے بطرق بداہت اور تواتر ہم تک پہنچی ہیں۔ علماء نے اقرار لسانی کو بھی ایمان کا جز اور رکن کہا ہے مگر یہ ایسا رکن ہے کہ بعض حالات میں مثلاً اجبار اور اکراہ کی حالت میں ساقط ہو جاتا ہے اور اس تصدیق کی علامت یہ ہے کہ کفر اور کافری اور کفر کے تمام خصائص ولوازم جیسے زنار باندھنا ان سب سے تبری اور بیزاری کا اظہار کرے اور اگر کوئی شخص باوجود دعویٰ ایمان کے معاذ اللہ کفر سے تبری اور بیزاری نہ ظاہر کرے تو وہ دو متضاد دینوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو داغ ارتداد سے داغی ہے اور درحقیقت ایسا شخص منافق کے حکم میں ہے نہ ادھر نہ ادھر پس ایمان کے ثابت کرنے کے لیے کفر سے تبری اور بیزاری ضروری اور لابدی ہے جس کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ کم از کم دل سے بیزار ہو اور اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ قلب اور قالب یعنی زبان اور قلب اور ظاہر اور باطن دونوں سے کفر سے تبری اور بیزاری ظاہر کرے اور تبری کے معنے یہ ہیں کہ خدا کے دشمنوں سے دشمنی رکھے خواہ فقط دل سے ہو اگر اظہار میں ضرر کا اندیشہ ہو اور خواہ زبان اور دل دونوں سے اس دشمنی کا اظہار ہو اگر کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔ اور یہ آیت ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ﴾ [۱] اسی معنی کی مؤید ہے اس لیے خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے دشمنوں سے دشمنی اور عداوت نہ ہو (تولا بے تبرا نیست ممکن) دوستی اور محبت بغیر دشمنوں سے بیزاری کے ممکن نہیں۔ یہ مقولہ ایسے ہی موقعہ پر صادق آتا ہے۔ حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام نے یہ جو کچھ بزرگی پائی اور شجرہ انبیاء ہوئے یہ سب حق تعالیٰ کے دشمنوں سے تبری اور بیزاری ہی کی وجہ سے ان کو حاصل ہوئی، چنانچہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں۔ اے ایمان والو تحقیق تمہارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں میں اسوہ حسنہ ہے جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے یہ کہہ دیا کہ ہم بالکل بری اور بیزار ہیں تم سے اور ان تمام چیزوں سے جن کی تم سوائے خدا کے پرستش کرتے ہو ہم تمہاری تکذیب کرتے ہیں یعنی ہم اللہ کے

[۱] اے نبی کفار ومنافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

مومن اور تمہارے کافر ہیں اور ظاہر ہوئی ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہمیشہ کیلیے یہاں تک کہ ایمان لاؤ تم اللہ وحدہ لاشریک پر۔''

یہ آیتیں سورہ ممتحنہ کی ہیں بظاہر یہ سورت اسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے نازل ہوئی جیسا کہ اس کے شان نزول سے ظاہر ہے تفصیل کے لیے اس سورۃ کی تفسیر کا مطالعہ کریں۔ وقال تعالیٰ:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ﴾

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو زبان سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہوئی مگر باوجود اس دعوے کے حالت یہ ہے کہ اپنا مقدمہ شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کو اللہ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ شیطان کو ہرگز نہ مانیں۔''

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کے بعد طاغوت کے ساتھ کفر اور اس کی تکذیب بھی ضروری اور لازم ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص رات کو سوتے ہوئے بیدار ہو جائے اگر وہ دس بار بسم اللہ اور دس بار سبحان اللہ اور دس بار ''اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ كَفَرْتُ بِالطَّاغُوْتِ''۔ (تصدیق کی میں نے اللہ کی اور تکذیب کی میں نے طاغوت یعنی شیطان کی) پڑھے تو وہ ہر خوفناک چیز سے محفوظ رہے گا۔ (رواه الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمر رضی اللہ عنہما، حصن حصین ۶۷)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منشاء نبوی یہ ہے کہ خدائے عز وجل کی تصدیق اور اس کے دشمنوں کی دشمنی اور برأت اور بیزاری قلب میں اس درجہ راسخ ہو جائے کہ غفلت کے وقت میں بھی اس سے ذہول اور غفلت نہ ہو۔ وقال تعالیٰ:

﴿فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۞ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا﴾

''پس جب ہمارے قہر کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے خدا وحدہٗ لاشریک لہ پر اور اس چیز کے منکر ہوئے جس کو خدا کے ساتھ شریک گردانتے تھے پس یہ ایمان ان کو نفع بخش نہ ہوا کہ ہمارے قہر کو دیکھ کر ایمان لائے۔''

معلوم ہوا کہ اگر مشاہدہ عذاب سے پہلے شرک اور مشرکین سے تبری اور بیزاری کا اظہار کرتے تو مفید اور نافع ہوتا۔ ناظرین غور کریں کہ کافروں نے مشاہدہ عذاب کے وقت فقط ایمان پر اکتفاء نہیں کیا۔ بلکہ ایمان کے ساتھ خدا کے دشمنوں کی تکذیب اور ان سے تبری اور بیزاری کو بھی ظاہر کیا۔ معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ کفر اور کافری سے تبری اور بیزاری بھی ضروری ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں جا بجا مہاجرین کی جو مدح اور ثناء فرمائی ہے وہ بھی اس تبری اور کفر سے بیزاری کی بدولت ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں کفر سے اس قدر بیزار ہوئے کہ اپنے وطن مالوف اور آباؤ ابناء، بیوی اور بچے، خویش اور اقارب، دوست احباب سب ہی کو چھوڑ دیا۔ اور علیٰ ہذا اصحاب کہف کا سوائے ہجرت اور اعتزال عن الکفار کے کوئی اور عمل ایسا نمایاں نہیں کہ اس کی جانب اس منقبت کبریٰ کو منسوب کیا جا سکے۔ اصحاب کہف کو یہ تمام درجات وفضائل

صرف دشمنانِ حق سے ہجرت کی بدولت حاصل ہوئے۔

غلبہ اعداء اور ہجوم دشمن کے وقت سپاہیوں کی معمولی نقل وحرکت بھی بہت وقعت رکھتی ہے۔ بخلاف زمانہ امن وسکون کے کہ اس وقت کی غیر معمولی نقل وحرکت بھی کسی شمار میں نہیں۔ زمانہ جنگ میں معمولی وفاداری کا اظہار بھی حکومت کی نظر میں غیر معمولی شمار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ عنفوان شباب کی عبادت زمانہ پیری کی عبادت سے ہزار درجہ افضل اور بہتر ہے اس لیے کہ زمانہ شباب میں اعداء دین یعنی نفس امارہ اور شیطان لعین کا غلبہ اور ہجوم ہوتا ہے۔ شیاطین اور شہوات کا لشکر ہر طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ دشمنان دین کے مقابلہ ہی کی وجہ سے زمانہ شباب کی عبادت پر قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ دینے کا وعدہ آیا ہے۔

ایمان کی صورت اور اس کی حقیقت

حضرات صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ایمان کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ایمان کی صورت ہے اور اطمینان نفس یعنی نفس کا مطمئن ہو جانا یہ ایمان کی حقیقت ہے۔ اطمینان نفس سے مراد یہ ہے کہ مقتضائے شریعت، مقتضائے طبیعت بن جائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ"۔

"تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی طبعی خواہش میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے۔"

اس حدیث میں ایمان سے یہی اطمینان نفس مراد ہے یعنی نفس اس درجہ مطمئن ہو جاتے کہ اللہ اور اس کے رسول کا ہر حکم اس کو لذیذ اور شیریں معلوم ہو اور اس کی معصیت اور نافرمانی کا ادنیٰ سا خیال اور معمولی سا وسوسہ بھی آگ میں جلنے سے بدرجہا زائد اس پر شاق وگراں ہو۔ ایمان کی اس کیفیت اور حالت کو نبی کریم ﷺ نے ذالك صریح الایمان (یہی کھلا ہوا ایمان ہے) فرمایا ہے۔

حاشا وکلا نبی کریم ﷺ کی ہرگز ہرگز یہ مراد نہیں کہ معصیت کا وسوسہ صریح ایمان ہے ورنہ ہم نالائقوں کے ایمان کا صحابہ کے ایمان سے زیادہ صریح اور جلی ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ ہمارے نفوس تو ہر وقت وساوس کی جولان گاہ بنے رہتے ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جب قلب (۱) میں کفر اور فسوق اور عصیان کی کراہت اور ناگواری اس درجہ راسخ ہو جائے کہ معصیت کا وسوسہ اور خیال بھی اس قدر شاق اور گراں ہو کہ آگ میں جلنا اس سے آسان معلوم ہوتا ہو تو اس کیفیت اور حالت کو نبی کریم ﷺ نے صریح ایمان فرمایا۔

اور علیٰ ہذا نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد مبارک "اذا زنی العبد خرج منه الایمان" (بندہ جب زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے۔) اس حدیث میں ایمان سے اسی یقین اور اطمینان کا زائل ہونا مراد ہے اور حق تعالیٰ شانہ کے

---

(۱) اشارۃ "الی قوله تعالیٰ ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾ (فائدہ) عجب نہیں کہ خلفائے راشدین اس معنی کی بناء پر کہا جاتا ہو۔ فافہم واستقم۔

اس ارشاد میں ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا﴾ (اے یمان والو ایمان لاؤ) ایمان اول سے تصدیق قلبی مراد ہے اور دوسرے ایمان سے ایمان نفس یعنی نفس کا مطمئن ہوجانا مراد ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿يٰۤاَيَّتُهَا [1] النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۞ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾

حق سبحانہ وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ایمان بمعنی اطمینان نفس کو مدار نجات نہیں قرار دیا بلکہ اپنی بے پایاں رحمت سے ایمان کی صورت یعنی تصدیق اور اقرار لسانی ہی کو قبول فرما کر عذاب جہنم سے نجات اور دخول بہشت کا وعدہ فرمایا۔ ہاں تقرب اور وصول الی اللہ کا مرتبہ بغیر اطمینان نفس اور یقین کامل کے حاصل نہیں ہوسکتا۔

ایمان صوری اور ظاہری اگرچہ ایمان حقیقی کے لحاظ سے بہت معمولی اور ادنیٰ شئے ہے مگر کفر اور شرک کے اعتبار سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔

آسمان نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تود

اسی وجہ سے حدیث میں ہے: "مَنْ قال لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ دخل الجنة وان زنیٰ وان سَرَقَ"۔ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگیا اگرچہ زنا اور چوری کرے۔ معاذ اللہ

اس حدیث سے زنا سرقہ کی اجازت مقصود نہیں بلکہ مقصد یہ ہے اے لوگو تم کسی طرح لا الہ الا اللہ کہہ کر کفر اور شرک کے دائرہ سے نکل آؤ۔ زنا اور سرقہ اگرچہ فی حد ذاتہ کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں مگر کفر اور شرک کے سامنے سب ہیچ ہیں۔ بخار اور زکام اگرچہ فی حد ذاتہ مرض اور بیماری ہے مگر سل اور جذام کے مقابلہ میں عافیت ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے جس جگہ بخار کی طرح زنا اور سرقہ کا مرض ہونا بیان فرمایا۔ وہاں یہ ارشاد فرمایا "لَا [2] یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن" اور "اذا [3] زنی العبد خرج منه الایمان" اور جس جگہ زنا اور سرقہ کو کفر اور شرک کے لحاظ سے ذکر فرمایا وہاں یہ ارشاد فرمایا "من قال لَآ الٰه الا اللہ دخل الجنة وان زنیٰ وان سرق"۔ یعنی زنا اور سرقہ کو کفر اور شرک کے ساتھ وہی نسبت ہے جو بخار اور زکام کو سل اور جذام کے ساتھ ہے۔

ہرقل شاہ روم نے جب ابوسفیان سے نبی کریم ﷺ کے حالات دریافت کیے تو اس میں یہ بھی دریافت کیا کہ کوئی شخص آپ پر ایمان لانے کے بعد آپ کے دین سے بیزار ہوکر مرتد بھی ہوجاتا ہے؟ ابوسفیان نے کہا نہیں۔ اس پر ہرقل نے کہا:

"كذلك الایمان حین تخالط بشاشته القلوب۔"، "ایمان کی یہی خاصیت ہے کہ جب اس کی مسرت دلوں میں رچ جاتی ہے تو وہ پھر کسی طرح نکل نہیں سکتی۔"

اس جگہ بشاشت سے وہی اطمینان نفس اور انشراح صدر مراد ہے جس کا ہم ذکر کرچکے ہیں یہی حقیقی ایمان ہے کہ جس کے بعد مرتد ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ حضرات صوفیہ کا ارشاد ہے "اِنَّمَا رَجَعَ مَنْ رَّجَعَ مِنَ الطَّرِيْقِ"۔ جز ایں نیست

---

[1] اے نفس مطمئنہ تو اپنے خدا کی طرف لوٹ جا کہ تو خدا سے راضی اور خدا تجھ سے راضی۔

[2] حالت ایمان میں زانی زنا نہیں کرتا۔

[3] جب بندہ نے زنا کیا تو اس سے ایمان نکل گیا۔

کہ جو شخص واپس ہوتا ہے وہ راستہ ہی سے واپس ہوتا ہے۔ منزل مقصود پر پہنچ جانے کے بعد واپسی ناممکن ہے اور اس دعاء ماثورہ "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ اِیْمَانًا لَّا یَرْتَدُّ"۔ (اے اللہ تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں کہ جس کے بعد ارتداد نہ ہو سکے) میں اسی ایمان کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ ایمان صوری کے بعد مرتد ہونا ممکن ہے۔ وہ ایمان جس کے بعد ارتداد ناممکن ہو وہ یہی ایمان ہے کہ جس سے نفس مطمئن ہو جائے۔

ایمان کے وجودی مراتب

علامہ نیسابوری تفسیر غرائب القرآن میں فرماتے ہیں کہ ایمان کے تین وجود ہیں۔ ایک وجود عینی دوسرا وجود ذہنی تیسرا وجود لسانی۔ اصل ایمان وجود عینی یعنی وجود خارجی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان حجابات مرتفع ہو جائیں تو اس وقت مومن کے دل میں ایک نور حاصل ہوتا ہے۔ یہی نور ایمان کا وجود عینی ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾ "اللہ تعالیٰ دوست ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف۔"

جب کوئی جدید حجاب مرتفع ہوتا ہے اتنا ہی یہ نور کامل اور قوی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسلام کے متعلق اس کو شرح صدر ہو جاتا ہے اور نبی کریم ﷺ اور تمام انبیاء کرام ؑ کا صدق اس کے نزدیک آفتاب سے زیادہ روشن اور جلی ہو جاتا ہے۔ وقال تعالیٰ:

﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ "جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا وہ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک نور پر ہے۔"

اور یہی نور قیامت کے دن پل صراط پر اہل ایمان کی رہنمائی کرے گا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ﴾ "ان کا نور سامنے اور دائیں جانب دوڑتا ہوگا۔"

ایمان کا نور علی نور ہونا اہل ایمان قیامت کے دن آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اور جو شخص دنیا میں نور ایمان سے محروم رہا وہ قیامت کے دن بھی نور ایمان سے محروم رہے گا۔

﴿وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾ "جسے اللہ نے نور نہیں دیا پھر اس کے لیے کہیں نور نہیں۔"

قیامت کے دن تو سب ہی کو ایمان کا نور ہونا معلوم ہو جائے گا لیکن اس دار دنیا میں بھی جب کبھی کسی عارف اور صاحب بصیرت کو رویائے صالحہ یا کشف سے ایمان مکشوف ہوا تو وہ نور ہی کی شکل میں منکشف ہوا۔

اور اس نور کا مطالعہ اور تصور یہی ایمان کا وجود ذہنی ہے اور زبان سے توحید و رسالت کا اقرار یہ ایمان کا وجود لسانی ہے یاد رکھنا چاہئے کہ ایمان کا محض لسانی وجود بغیر نور کے مفید اور کارآمد نہیں جیسا کہ پیاسے کے لیے آب زلال کا فقط تلفظ اور تصور کافی نہیں۔ جب تک کہ اس سے سیراب نہ ہو۔ اَللّٰهُمَّ اشْرَحْ صُدُوْرَنَا لِلْاِسْلَامِ وَنَوِّرْ قُلُوْبَنَا بِنُوْرِ طَاعَتِكَ اٰمِیْنَ یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔

﴿بِالْغَيْبِ﴾

یعنی جو چیزیں ان کی عقل اور حواس سے پوشیدہ ہیں جیسے جنت اور جہنم اور ملائکہ وغیرہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے فرمانے سے ان سب چیزوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور ان کو حق جانتے ہیں اور جو لوگ ان امور غیبیہ کے منکر ہیں وہ سراسر ایمان اور ہدایت سے محروم ہیں اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے شاعر نے کہا ہے

چوآں [1] کرمے کہ در سنگے نہان است زمین و آسمان او ہماں است

اور ایمان بالغیب کو تقویٰ کی علامت اس لیے قرار دیا کہ محسوسات کی تصدیق ایمان اور تقویٰ کی علامت نہیں اس لیے کہ جو چیز ظاہری یا باطنی حواس سے محسوس اور مدرک ہو اس کی تصدیق اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہے اور شرعاً وہی تصدیق معتبر ہے جو ارادہ اور اختیار سے ہو۔

غیب سے کیا مراد ہے

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ بظاہر غیب سے وہ امور مراد ہیں جن کا ذکر حدیث جبریل میں آیا ہے اللہ تعالیٰ۔ ملائکہ۔ کتب الٰہیہ۔ رسل۔ یوم آخرت۔ قضاوقدر۔ ایمان بالغیب سے ان چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے۔ کتاب اور رسول اگرچہ ظاہر کے لحاظ سے محسوس ہیں غیب نہیں لیکن کتاب کا منزل من اللہ ہونا اور پیغمبر کا مرسل من اللہ اور فرستادہ خدا ہونا ایک غیبی امر ہے اس اعتبار سے کتب اور رسل بھی ضرور غیب میں داخل سمجھے جائیں گے اور صحابہ کرام کا رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ایمان بالغیب ہی کہلائے گا۔ اس لیے کہ رسول کی ذات اگرچہ محسوس اور مشاہد ہے مگر وصف رسالت اور فرستادہ خدا ہونا یقیناً غیب ہے۔ یہ کسی نے آنکھوں سے نہیں دیکھا اور ایمان کا اصل تعلق اسی وصف رسالت کے ساتھ ہے۔

بعض اہل علم نے غیب اور غائب میں فرق بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ

”اَلْغَائِبُ مَا لَا یَرَاكَ وَلَا تَرَاهُ وَالْغَيْبُ مَا لَا تَرَاهُ اَنْتَ۔“ ”غائب تو وہ ہے کہ نہ وہ تجھ کو دیکھے اور نہ تو اس کو دیکھے اور غیب وہ ہے کہ تو اس کو نہ دیکھتا ہو اگرچہ وہ تجھ کو دیکھتا ہو۔“

اسی وجہ سے حق تعالیٰ پر غیب کا اطلاق درست ہے غائب کا اطلاق درست نہیں۔ اس لیے کہ وہ ہر شئے کو دیکھتا ہے کوئی شئے اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔

لطیفہ:...... بعض شیعہ کہتے ہیں کہ بالغیب سے مہدی موعود اور امام غائب مراد ہیں جن کا شیعہ انتظار کر رہے ہیں۔ واہ واہ

﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾

اور قائم اور درست رکھتے ہیں نماز کو یعنی خشوع اور خضوع اور تمام آداب کے ساتھ نماز کو ٹھیک ادا کرتے ہیں۔ سورۂ لقمان میں ہے۔

﴿هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ ”ہدایت اور رحمت ہے ان نیکی کرنے

[1] اس کیڑے کی مانند جو پتھر میں پوشیدہ ہے اور وہی اس کا زمین و آسمان ہے۔

والوں کے لیے جو نماز کو قائم کرتے ہیں۔"

اس آیت میں ﴿اَلَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ﴾ کو المحسنین کی صفت گردانا ہے اور غالباً جبرئیل امین نے نبی اکرم ﷺ سے "ما الاحسان" (احسان کیا چیز ہے) کہہ کر اسی احسان کی حقیقت دریافت کی ہے جو آیت موصوفہ میں مذکور ہے جس کا جواب نبی ﷺ نے بدیں الفاظ ارشاد فرمایا کہ:



﴿اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنۡ لَّمۡ تَكُنۡ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ﴾ "یعنی نماز اور عبادت کا احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہی خیال رکھ کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ تعظیم کا دارومدار تیرے دیکھنے پر نہیں بلکہ اس کے دیکھنے پر ہے کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿اَلَمۡ یَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی﴾ کیا نہیں جانتا کہ اللہ اس کو ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ دربار میں بادشاہ کی تعظیم سب ہی پر فرض ہے خواہ کوئی بادشاہ کو دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو۔ قریب ہو یا بعید۔

﴿وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ﴾ میں اسی قسم کی نماز مراد ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے عباد متقین کی عبادت اور بندگی کو جب بھی مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے تو مقیمن الصلوۃ کے ساتھ فرمایا ہے مصلین کا لفظ صرف ان لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جن کی نماز میں اس سرسری ہیئت اور محض ظاہری قیام قعود کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ ایک جگہ مقام مذمت میں ارشاد ہے: ﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی﴾ یعنی اس شخص نے نہ تصدیق کی اور نماز کو قائم کرنا اور ٹھیک طرح سے ادا کرنا تو درکنار اس نے تو کبھی نماز کی ہیئت اور صورت بھی نہیں بنائی۔

بعض علماء کے نزدیک اس مقام پر صلوۃ سے مطلق نماز مراد ہے۔ فرض ہو یا نفل۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ فرض نماز مراد ہے۔ اس لیے کہ فلاح جو کہ ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ میں مذکور ہے وہ فقط فرض نماز پر موقوف ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ ایک اعرابی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے کچھ مسائل اور احکام دریافت کیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ نے دن رات میں پانچ نمازیں تم پر فرض کی ہیں۔ اعرابی نے کہا کیا اور بھی کوئی نماز ان پانچ کے علاوہ مجھ پر فرض ہے آپ نے فرمایا نہیں۔ اس کے بعد اس شخص نے زکوۃ اور صوم کے متعلق دریافت کیا اور یہ کہتا ہوا رخصت ہوا۔ وَاللّٰہِ لَا ازید علی ھذا ولا انقص منہ خدا کی قسم! اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اَفۡلَحَ الرَّجُلُ اِنۡ صَدَقَ"۔ "فلاح پائی اس شخص نے اگر سچ کہا۔"

﴿وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ﴾ اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ حصہ ہمارے لیے خاص کر لیتے ہیں جسے وقتاً فوقتاً ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

انفاق سے اس جگہ عام معنی مراد ہیں۔ جو زکوۃ اور صدقات نافلہ اور ہر قسم کے انفاق فی سبیل اللہ کو شامل ہے بعض اہل علم نے باطنی اور معنوی رزق یعنی علم نافع کے انفاق کو بھی اس آیت شریفہ کے عموم میں داخل فرمایا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے سب سے اول ایمان کا ذکر فرمایا جو تمام اعمال صالحہ کی جڑ ہے پھر نماز کا ذکر فرمایا جو عبادات

بدنیہ میں سب سے افضل ہے۔ پھر عبادات مالیہ زکوۃ اور صدقات کا ذکر فرمایا۔ یا یوں کہو کہ ﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ﴾ میں متقین کے حسن اعمال کا ذکر تھا۔ اور ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ﴾ میں حسن اخلاق کا ذکر ہے اور مما میں من تبعیضیہ ہے یعنی مال کا بعض حصہ خرچ کرتے، مسرف اور فضول خرچ نہیں اور ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ کی اپنے عامل یعنی ینفقون پر تقدیم کچھ اہتمام اور اختصاص کی طرف مشیر ہے یعنی ان کے مال کا کچھ حصہ ہمیشہ تصدق اور انفاق فی سبیل اللہ کے لیے مخصوص رہتا ہے۔

ف:...... جاننا چاہیے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی سات قسمیں ہیں:

(۱) زکوۃ مفروضہ۔

(۲) صدقۂ فطر۔

(۳) خیرات و مبرات جیسے فقراء کو دینا اور مہمانوں کی ضیافت اور حاجتمندوں کو قرض دینا۔

(۴) وقف جیسے بناء مساجد و مدارس اور کنواں اور مہمان سرائے اور مسافر خانہ۔

(۵) مصارف حج۔

(۶) مصارف جہاد۔

(۷) نفقات واجبہ جیسے نفقۂ عیال اور نفقۂ زوجہ اور نفقۂ محارم۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقینی جانتے ہیں ف۱

اور جو یقین کرتے ہیں جو کچھ اترا تجھ پر اور جو اترا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے ف۲

انہوں نے پائی ہے راہ اپنے رب کی اور وہی مراد کو پہنچے

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ... الی ... وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

اور وہ متقی لوگ ایسے ہیں جو ایمان لائے اس کتاب پر جو تیری طرف نازل ہوئی اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے نازل ہوئیں اس سے مومنین اہل کتاب مراد ہیں۔ جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ ؓ اسی لیے اس جگہ "والذین" کو مکرر لائے کہ یہ متقین کا دوسرا گروہ ہے۔ اور پہلی آیت میں اہل عرب اور امیین کا ذکر تھا۔ ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ اور متقین کے یہ دونوں گروہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں آخرت کا تذکرہ اور استحضار متقین کا خاص شعار ہے بخلاف کافروں کے کہ وہ ہر وقت دنیا ہی کی فکر میں رہتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ ایسے ہی لوگ ہدایت پر قائم ہیں

ف۱ اس سے پہلی آیت میں ان لوگوں کا بیان تھا جن مشرکین نے ایمان قبول کیا (یعنی اہل مکہ) اور اس آیت میں ان کا بیان ہے جو اہل کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) مشرف با اسلام ہوئے۔

ف۲ یعنی اہل ایمان کے دونوں گروہ مذکورہ بالا دنیا میں ان کو ہدایت نصیب ہوئی اور آخرت میں ان کو ہر طرح کی مراد ملے گی جس سے معلوم ہو گیا کہ جو نعمت ایمان اور اعمال حسنہ سے محروم رہے ان کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہیں اب ان دونوں فریق مومنین سے فارغ ہو کر اس کے آگے کفار کی حالت بیان کی جاتی ہے۔

جوان کو خدا کی توفیق اور فضل سے ملی ہے کلمہ علیٰ جو استعلاء کے لیے مستعمل ہوتا ہے اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ لوگ ہدایت پر حاوی اور متمکن ہیں اور ہدایت پر جم گئے ہیں اور ﴿مِّن رَّبِّهِمْ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ نور ہدایت محض اس رب العالمین کی رحمت اور مہربانی اور اس کی توفیق سے ان کو عطاء ہوا ہے جس سے ان کی تربیت اور اصلاح مقصود ہے۔

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ اور ایسے ہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ یعنی مومنین کے یہ دونوں گروہ دنیا میں حق تعالیٰ کی توفیق سے نور ہدایت سے سرفراز ہوئے اور آخرت میں اس کی رحمت اور فضل سے مراد کو پہنچیں گے اور مفلح اس کو کہتے ہیں کہ جو اپنی مراد کو بخوبی پہنچ جائے اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ اور کمی واقع نہ ہو پہلے جملہ یعنی ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ﴾ میں ایمان اور تقویٰ کے دنیاوی ثمرہ کا ذکر ہے اور دوسرے جملہ یعنی ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ میں اخروی ثمرہ کا ذکر ہے۔ بمبئی کا مسافر اگر غلطی سے کلکتہ میل میں بیٹھ جائے اور ریل چھوٹنے کے بعد معلوم ہو کہ یہ گاڑی بجائے بمبئی کے کلکتہ جا رہی ہے تو اس مسافر کی پریشانی کی کوئی حد نہیں رہتی اور کلکتہ کے مسافروں کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ ان کو اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارا راستہ صحیح ہے اور ہم دیر یا سویر میں ضرور منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

اور "وَأُولَٰئِكَ" کو مکرر لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ان متقین کو ہدایت پر تمکن اور استعلاء کی خصوصیت حاصل ہے اسی طرح ان کو فلاح کی بھی خصوصیت حاصل ہے یہ لوگ غیروں سے ان دو خصوصیتوں کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥ خَتَمَ

بیشک جو لوگ کافر ہو چکے برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہیں لائیں گے ف۱ مہر کر دی

وہ جو منکر ہوئے برابر ہے کہ تو ان کو ڈراوے یا نہ ڈراوے وہ نہ مانیں گے مہر کردی ہے

ع اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦

اللہ نے ان کے دلوں پر اور انکے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے ف۲ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اللہ نے ان کے دل پر اور ان کے کان پر اور ان کی آنکھوں پر ہے پردہ اور ان کو بڑی مار ہے۔

صفاتِ کافرین

قَالَ تَعَالَىٰ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ ⑪ كَفَرُوا ... الى ... عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾

یہاں تک گروہ اتقیاء کا ذکر فرمایا کہ جو قرآن کریم کی ہدایت سے متمتع اور منتفع ہوئے اب آئندہ اشقیاء کا ذکر فرماتے ہیں

ف۱ ان کفار سے خاص وہ لوگ مراد ہیں جن کے لئے کفر مقرر ہو چکا اور دولت ایمان سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیئے گئے (جیسے ابوجہل، ابولہب وغیرہ) ورنہ ظاہر ہے کہ بہت سے لوگ جو کافر تھے مشرف با سلام ہوتے اور ہوتے رہتے ہیں۔

ف۲ ان کے دلوں پر مہر کردی (یعنی حق بات کو نہیں سمجھتے) اور کانوں پر مہر کردی (یعنی سچی بات کو متوجہ ہو کر نہیں سنتے) اور آنکھوں پر پردہ ہے (یعنی راہ حق کو نہیں دیکھتے) کفار کا بیان ختم ہو گیا اب منافقوں کا حال اس کے بعد تیرہ آیتوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔

⑪ یہ آیت نازل ہوئی ان کے حق میں جن کی موت کفر پر اللہ تعالیٰ نے اپنے علم قدیم میں جانی تھی جیسا کہ عتبہ وشیبہ و ابی جہل و ولید بن مغیرہ۔ (موضح القرآن)

کہ جو اپنی شقاوت اور فساد فطرت کی وجہ سے اس چشمۂ ہدایت سے منتفع نہیں ہوئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ تحقیق جن لوگوں نے کفر کیا یعنی جو لوگ اللہ کے علم میں کافر ہیں اُن کے حق میں آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے وہ ایمان نہ لائیں گے۔ آپ اس قسم کے لوگوں کے ایمان نہ لانے سے رنجیدہ اور ملول نہ ہوں قرآن کی ہدایت اور آپ کی تبلیغ اور دعوت کا قصور نہیں بلکہ ان کی فاسد اور بگڑی ہوئی استعداد اور فطرت کا قصور ہے اصل کافر وہی ہے کہ جس کا خاتمہ اور موت اللہ کے علم میں کفر پر مقرر ہو چکا ہو۔ جیسے ابوجہل اور ابولہب وامثالہم۔ ورنہ جس شخص کا خاتمہ ایمان پر ہونے والا ہے وہ فی الحال محض ظاہر کے اعتبار سے کافر ہے حقیقت اور انجام کے اعتبار سے مومن ہے۔

بد عمر را نام اینجا بت پرست　　لیک مومن بودنامش درالست

جو لوگ محض ظاہر کے اعتبار سے کافر تھے ان میں سے بہت سے مشرف باسلام ہوئے اور ہوتے رہیں گے لیکن جو اللہ کے علم میں کافر تھے ان میں سے کوئی ایمان نہیں لایا۔ ایسے کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے۔

گزشتہ آیات میں اہل انعام کا ذکر تھا یعنی جن کو حق تعالیٰ نے ایمان اور ہدایت اور تقویٰ کی نعمت سے سرفراز فرمایا اب اہل غضب اور اہل ضلال کا ذکر فرماتے ہیں۔ ان دو آیتوں میں خالص کافروں کا ذکر ہے اور اس کے بعد تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر ہے۔

حرف تحقیق یعنی "اِنَّ" کا استعمال اکثر ان مواقع میں ہوتا ہے کہ جہاں مخاطب کو کسی قسم کا کوئی تردد ہو۔ مگر کبھی کبھی ایسے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے کہ جہاں متکلم یا مخاطب کے گمان کے خلاف کوئی شی ظاہر ہو جیسے مریم کی والدہ کا بطور حسرت یہ فرمانا:

﴿رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَآ أُنثَىٰ﴾ اے پروردگار تحقیق میں نے تو یہ لڑکی جنی ہے۔

خلاف امید لڑکی کی ولادت کو بطور حسرت حرف "اِنَّ" کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اور علیٰ ہذا نوح علیہ السلام کو اپنی قوم سے یہ امید تھی کہ وہ میری تصدیق کریں گے جب خلاف امید انہوں نے تکذیب کی تو بطور حسرت یہ فرمایا: ﴿رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ﴾ اے پروردگار تحقیق میری قوم نے تو میری تکذیب کی۔

اسی طرح اس جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امید کے خلاف کفار کے نہ ایمان لانے کو حرف "اِنَّ" کے ساتھ ذکر فرمایا کہ اے ہمارے نبی آپ ان کافروں کے ایمان کی امید نہ رکھیں۔ ان کے حق میں آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے۔ یہ ایمان نہ لائیں گے اور ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ﴾ اس لیے فرمایا کہ کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے لیکن آپ کے حق میں برابر نہیں آپ تو مامور من اللہ ہیں۔ آپ کو تبلیغ اور دعوت کا اجر ہر حال میں ملے گا اس آیت سے یہ مقصود نہیں کہ آپ ان کو تبلیغ اور ہدایت نہ فرمائیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے سے غمگین اور ملول نہ ہوں۔

کفر کی تعریف

ہم ﴿يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ کی تفسیر میں ایمان کے ساتھ کفر کی حقیقت بھی امام غزالی سے نقل کر چکے ہیں لیکن امام رازی نے جو کفر کی تعریف فرمائی ہے وہ زیادہ واضح ہے اور کفر کی تمام اقسام کو حاوی اور جامع ہے وہ یہ ہے:

"اَلْكُفْرُ عَدَمُ تَصْدِيقِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا عُلِمَ بِالضَّرُوْرَةِ مَجِيئُهٗ بِهٖ"۔ (تفسیر کبیر: ۱/۱۵۹)

''یعنی کفر کے معنی یہ ہیں کہ رسول اور پیغمبر کی اس چیز میں تصدیق نہ کرنا جس کا بدیہی اور قطعی طور پر دین سے ہونا معلوم ہو چکا ہے۔''

کیونکہ کفر کی یہ تعریف یعنی عدم تصدیق الرسول۔ تکذیب اور ترک تصدیق دونوں کو شامل ہے اور امام غزالی نے جو تعریف کی ہے یعنی تکذیب الرسول وہ بظاہر اس شخص کے کفر پر صادق نہ آئے گی کہ جو نہ تصدیق کرتا ہے نہ تکذیب حالانکہ وہ شخص بالاجماع کافر ہے، نبی کی تصدیق نہ کرنا ہی کفر ہے خواہ تکذیب کرے یا نہ کرے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ کفر کی تعریف بجائے تکذیب کے ترک تصدیق کے ساتھ کی جائے تا کہ کفر کی دونوں صورتوں پر صادق آسکے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا﴾ ''جو اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ کرے تو ہم نے ایسے کافروں کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

اس آیت شریفہ میں نہ تصدیق کرنے والوں کو کافر کہا گیا۔ وقال تعالیٰ:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ ''کافروں نے کہا ہم ہرگز اس قرآن کی تصدیق نہ کریں گے۔''

سورۂ صافات میں ہے کہ اہل جنت اہل نار سے یہ کہیں گے۔

﴿بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ ''بلکہ تم تصدیق کرنے والے نہ تھے۔''

﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى﴾ ''اس کافر نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔''

بلکہ خود یہی آیت یعنی ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ امام رازی کی تائید کرتی ہے اس لیے کہ اس آیت میں نہ ایمان لانے والوں اور نہ تصدیق کرنے والوں کو کافر کہا گیا ہے۔

اقسام کفر:...... علماء نے کفر کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) کفر تکذیب: یعنی انبیاء و رسل کو جھٹلانا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ﴾ ''کافروں نے کہا یہ ساحر اور جھوٹا ہے۔

﴿اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ﴾ ''ان قوموں میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا پس میرا عذاب ان پر ثابت ہو گیا۔''

(۲) کفر استکبار: تکبر کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو نہ ماننا اور اس کے قبول سے انکار کر دینا۔

﴿اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ ''ابلیس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور تکبر کیا اور تھا وہ کافروں میں سے۔''

(۳) کفر اعراض: یعنی پیغمبر کی نہ تصدیق کرے اور نہ تکذیب بلکہ اعراض اور روگردانی کرے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ﴾ ''اور کافر جس چیز سے ان کو ڈرایا جاتا ہے اس سے اعراض کرتے ہیں۔''

شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ ﴿مُّعْرِضُوْنَ﴾ کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ "دھیان نہیں کرتے" یعنی نبی ﷺ کی نصیحت کی طرف توجہ اور التفات نہیں کرتے۔ وقال تعالیٰ:

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ "کہہ دیجئے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی۔ اور اگر روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ اللہ کافروں کو محبوب نہیں رکھتا۔"

اس آیت میں روگردانی کرنے والوں کو کافر بتایا گیا ہے اور اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں۔

(۴) کفر ارتیاب یعنی پیغمبر کے نہ صادق ہونے کا یقین ہے نہ کاذب ہونے کا۔ بلکہ شک اور تردد ہے۔ یہ بھی کفر ہے۔ چنانچہ ﴿وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ﴾ کی علت حق تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے۔ ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ﴾ (یعنی بیشک تھے وہ شک میں متردد)۔

(۵) کفر نفاق: یعنی زبان سے اقرار اور قلب سے انکار کرے اور ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ سے دور تک اسی کفر نفاق کا بیان ہے۔

حق جل شانہ کا یہ ارشاد ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ پہلے جملہ کی دلیل ہے یعنی ان کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا اس لیے برابر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمرد اور عناد اور سرکشی کی سزا میں ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے ان کی آنکھوں پر ایک خاص قسم کا پردہ ہے جو ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور عناد کے سزا میں ان پر علم اور ہدایت کے دروازے بند کر دیئے ہیں نہ آنکھ کے راستہ سے ہدایت پہنچ سکتی ہے اور نہ کان کے راستہ سے لہذا اب کوئی صورت نہیں کہ ہدایت ان کے دلوں تک پہنچ سکے۔ دل کا دروازہ اگر کھلا ہوا ہوتا تو پھر شاید ہدایت اندر داخل ہو جاتی مگر وہ بند کر دیا گیا۔ یہ دنیا میں ہوا اور آخرت میں ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے جو فلاح کی سراسر ضد ہے۔

نکتہ:......اور ﴿عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ اور ﴿عَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ میں کلمۂ علیٰ کو مکرر لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ قلوب اور اسماع ہر ایک کی مہر جداگانہ اور مستقل ہے جمہور علماء مفسرین و متکلمین یہ فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ میں ختم اور غشاوہ سے یہ مراد نہیں کہ حق تعالیٰ نے حقیقۃً ان کے دلوں اور کانوں پر کوئی مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر کوئی پردہ ڈال دیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ متکبرین اور معاندین اور ہوا پرست اور دشمنان حق وہدایت اپنی طبعی زیغ اور جبلی کجروی کی وجہ سے اس درجہ اور اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ اخلاق ذمیمہ اور رذائل ان کے دلوں میں اس درجہ راسخ اور پختہ ہو چکے ہیں کہ ہر فحشاء اور منکر ان کو مستحسن نظر آتا ہے اور حق جل وعلاء کی ہر نافرمانی ان کو لذیذ معلوم ہوتی ہے ان کی حالت نجاست کے کیڑے کی طرح ہے کہ جس کو گندگی سے طبعی رغبت ہوتی ہے اور خوشبو سے اس کو طبعی نفرت ہوتی ہے اور بسا اوقات یہ نجاست کا کیڑا عطر کی تیز خوشبو کو برداشت بھی نہیں کر سکتا اور بعض اوقات عطر کی خوشبو سے مر بھی جاتا ہے یہی حالت ان کافروں کی ہے کہ کفر کی نجاست پر فریفتہ ہیں اور حق اور ہدایت کے عطر سے ان کو نفرت ہے۔

حق تعالیٰ نے کافروں کی اس حالت کو بطور استعارہ ختم اور غشاوہ کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح مہر اور پردہ بیرونی اشیاء کے وصول اور نفوذ سے مانع ہوتے ہیں اسی طرح ان کی یہ حالت ایمان اور ہدایت کو ان کے

دلوں تک نہیں پہنچنے دیتی اور اندرونی کفر کو اندر سے باہر نہیں آنے دیتی اور نہ ان کے کان کسی حق بات کی طرف التفات کرتے ہیں اور نہ ان کی آنکھیں کسی امر حق کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے۔

قدوۃ الاولیاء امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت میں ختم اور غشاوہ (مہر اور پردہ) ظاہر اور حقیقت پر محمول ہے کافروں کے دلوں پر حقیقۃً ایک مہر ہے اور حقیقۃً ان کی آنکھوں پر ایک پردہ ہے جو مجہول الکیفیۃ ہے اور ہماری نگاہوں سے مستور ہے اللہ کے فرشتے اس ختم اور غشاوہ کا مشاہدہ کرتے ہیں اسی مہر اور پردہ کو دیکھ کر یہ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کافر کبھی ایمان نہیں لائیں گے اور ان پر لعنت کرتے ہیں جس طرح قلوب مؤمنین پر نقش ایمان لکھا ہوا دیکھ کر ان کے لیے دعاء اور استغفار کرتے ہیں کما قال تعالیٰ: ﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ﴾ یہی لوگ ہیں جن کے دل میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے پس جس طرح مؤمنین کے دلوں پر ایمان کی کتابت حقیقت ہے اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہر آنکھوں پر پردہ بھی حقیقت ہے اگرچہ کتابت ایمان کی طرح اس کی کیفیت مجہول ہے ملائکۃ اللہ جس طرح قلوب مؤمنین پر کتابت ایمان کا حساً اور عیاناً مشاہدہ کرتے ہیں اسی طرح وہ قلوب کافرین پر مہر اور ان کی ابصار پر پردہ کا بھی حقیقۃً معائنہ کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر: ۱/ ۱۹۰)

"واخرج البزار والبيهقي في الشعب وضعفه عن ابن عمر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال الطابع معلق بقائمة العرش فاذا انتهكت الحرمة وعمل بالمعاصي واجترئ على الله بعث الله الطابع فطبع على قلبه فلا يقبل بعد ذلك شيئا"۔ (تفسير درمنثور، ص: ۲۳۸) تفسير سورة نساء تحت تفسير قوله تعالىٰ: ﴿بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾"۔

"امام بزار اور امام بیہقی شعب الایمان میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں اور امام بیہقی نے اس کی سند کو ضعیف بتایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہر لگانے والا فرشتہ عرش کا پایا پکڑے کھڑا رہتا ہے جب کوئی شخص اللہ کے حکم کی بے حرمتی کرتا ہے اور کھلم کھلا اس کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اللہ کے مقابلہ میں گستاخ اور دلیر ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس مہر لگانے والے فرشتے کو حکم دیتے ہیں وہ فوراً اس گستاخ اور بیباک کے دل پر مہر لگا دیتا ہے جس کے بعد وہ کسی حق کو قبول نہیں کرتا۔" (تفسیر درمنثور)

اور احادیث صحیحہ اس معنی کی تائید کرتی ہیں چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے ایک سیاہ نقطہ اس کے قلب پر لگ جاتا ہے پس اگر توبہ کر لی اور اس گناہ سے باز آ گیا تو دل کو صیقل کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی اور گناہ کیا تو وہ نقطہ اور بڑھ جاتا ہے حتی کہ رفتہ رفتہ اس کے دل کو گھیر لیتا ہے اور یہی وہ رین (زنگ) ہے جس کی حق تعالیٰ نے ﴿كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ میں خبر دی ہے۔ رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح۔

پس جس طرح ہم ظاہری سیاہی اور سفیدی اور زنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس سے کہیں زائد ملائکۃ اللہ

قلوب بنی آدم کی سیاہی اور سفیدی اور زنگ کا معائنہ کرتے ہیں مجاہد فرماتے ہیں کہ رین یعنی زنگ کا درجہ۔ ختم اور طبع سے کم ہے اور ختم اور طبع کا درجہ۔ اقفال سے کم ہے اور اقفال سب سے زائد سخت ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ کیا ان کے دلوں پر قفل ہے۔

امام [1] قرطبی فرماتے ہیں کہ حدیث رین اور مجاہد کا قول اس امر کی دلیل ہے کہ آیت میں جس ختم کا ذکر ہے وہ امر حقیقی ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۱/۱۸۸)

"عن ابن عمر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا کذب العبد تباعد عنه الملك میلا من نتن ما جاء به"۔ رواه الترمذی۔

"عبداللہ بن عمر رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ بندہ جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے فرشتہ ایک میل دور چلا جاتا ہے۔" (ترمذی)

"وعن جابر قال کنا مع النبی صلی الله علیه وسلم فارتفعت ریح منتنة فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اتدرون ما هذه الریح هذه ریح الذین یغتابون المؤمنین۔" رواه احمد۔

"حضرت جابر راوی ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے یکا یک ایک بدبو اٹھی آپ نے ارشاد فرمایا جانتے ہو یہ کیسی بدبو ہے؟ پھر فرمایا یہ بدبو ان لوگوں کے منہ سے آرہی ہے جو اس وقت مسلمانوں کی غیبت کر رہے ہیں۔" (مسند احمد)

ہم اگر قصور بصیرت کی وجہ سے کذب اور غیبت کے رائحہ وکریہہ اور اس کی بدبو کا احساس نہ کر سکیں تو ہمارا یہ عدم احساس معاذ اللہ ملائکہ مکرمین اور انبیاء ومرسلین کے عدم احساس کی ہرگز ہرگز دلیل نہیں بن سکتا۔

اسی طرح ہم اپنی درماندہ اور قاصر بصیرت سے قلوب کافرین کی مہر اور ان کی آنکھوں کا پردہ نہ دیکھ سکیں تو ملائکۃ اللہ کے نہ دیکھنے کی کیسے دلیل ہوسکتا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم		چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ ختم اور طبع حق جل شانہ کی جانب سے ابتداء نہ تھا بلکہ ان کے اعراض اور استکبار اور تکذیب اور انکار کی پاداش اور سزا میں تھا جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾

---

[1] امام قرطبی حدیث رین کو نقل کر کے فرماتے ہیں: قلت وفی قول مجاهد هذا۔ وقوله علیه السلام ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب۔ دلیل علی ان الختم یکون حقیقیا والله اعلم۔ (تفسیر قرطبی: ۱/۱۸۸)

''پس بسبب ان کے عہد توڑ دینے اور آیات الٰہی کے انکار کر دینے اور انبیاء کو دیدہ ودانستہ ناحق قتل کرنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل پردہ میں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر ان کے کفر اور عناد کی وجہ سے مہر لگا دی پس یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے مگر ان میں کے بہت تھوڑے۔''

وقال تعالیٰ: ﴿فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِينَ﴾

''پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی اور حق سے انحراف کیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو بالکلیہ حق سے پھیر دیا اور اللہ نہیں توفیق دیتا حد سے نکلنے والوں کو۔''

وقال تعالیٰ: ﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهٖ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾۔

آیات مذکورہ میں اس امر کی تصریح ہے کہ اللہ کی جانب سے یہ ختم اور طبع ان کے نقض میثاق اور قتل انبیاء اللہ اور زیغ اور انحراف کی پاداش اور سزا تھی ان کی دیدہ دلیری اور علی الاعلان نافرمانی کی ان کو یہ سزا ملی کہ ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم کر دیئے گئے اور مہر لگا کر ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہی سلب کر لی گئی۔ اور معرفت اور ہدایت کی سب راہیں ان پر بند کر دی گئیں اب وہ نہ حق کی باتوں کو سمجھ سکیں گے اور نہ سن سکیں گے۔ اور نہ دیکھ سکیں گے اس لیے اب ان کو ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے۔

اور اگر بالفرض حق تعالیٰ جل شانہ ابتداءً ہی کسی کے دل پر مہر لگا دیں اور اپنی توفیق اور ہدایت سے محروم کر دیں تب بھی ذرا برابر کوئی ظلم نہیں جیسا کہ عطاء بن ابی رباح سے منقول ہے کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے یہ سوال کیا کہ اگر حق تعالیٰ مجھ سے اپنی ہدایت روک لیں اور گمراہی اور ہلاکت کو میرے لیے مقدر فرما دیں تو کیا یہ ظلم نہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ نے تیری کسی مملوک شئ کو روک لیا ہے تو بے شک تجھ پر ظلم کیا اور اگر خدا نے اپنی مملوک شئ کو روک لیا ہے تو وہ اس کی ملک ہے اس کو اختیار ہے جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾

اسی طرح ہدایت بھی اس کی ملک ہے اور اس کی رحمت ہے جس سے اپنے وفاداروں اور اطاعت شعاروں کو نوازتا ہے اور متکبرین اور سرکشوں کو اس سے محروم کرتا ہے۔ (کتاب الہجرتین للحافظ ابن القیم، ص:۹۹)

حق تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت بالغہ سے لوگوں کو مختلف الاستعداد بنایا کسی کو غبی اور کسی کو ذکی کسی کو خوبصورت اور کسی کو بدصورت کسی کو بینا اور کسی کو نابینا۔ کسی کو صحیح سالم تندرست اور کسی کو معذور اور اپاہج اور گونگا اور بہرا۔ جس کسی کو جو کمال اور خوبی عطاء کی وہ محض اس کا فضل ہے اس پر کسی کا کوئی حق اور قرضہ نہیں اور جس کو نہیں دیا اس پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اسی طرح اس نے اپنی قدرت اور حکمت بالغہ سے کسی کی طینت میں تکبر اور عصیان اور اباء اور سرکشی کی استعداد رکھی اور کسی کی فطرت میں اطاعت اور فرمانبرداری کی استعداد رکھی اور اپنے احکام کو ان استعدادوں کے ظہور کا ذریعہ بنایا حکم کے بعد استعدادوں کا ظہور ہوا۔ جس میں عصیان اور اباء کی استعداد تھی اس نے نافرمانی کی اور جس میں اطاعت اور فرمانبرداری کی استعداد تھی وہ

حکم خداوندی سنتے ہی سربسجود ہوگیا۔ جیسے بیج میں برگ و بار سب نہاں ہوتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو سب باہر نکل آتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس نے بندوں کو مختلف الاستعداد کیوں بنایا سو یہ سوال بالکل مہمل ہے وہ مالک مطلق اور ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ ہے ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ﴾۔

کرازهره آنکه ازبیم تو | کشاید زباں جز بہ تسلیم تو
زباں تازه کردن باقرار تو | نینگیختن علت از کار تو

حق تعالیٰ نے جس زمین کو چاہا ایسا شور بنایا کہ جو تخم اس میں ڈالا جائے وہ سوخت ہو جائے اور کسی زمین کو مرغزار اور لالہ زار بنایا کوئی فلسفی اور سائنس دان اس کی وجہ بیان نہیں کرسکتا کہ خدا تعالیٰ نے زمین کی صلاحیتوں اور استعدادوں میں یہ فرق کیوں رکھا۔ ﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا﴾۔

ایں زمین پاک وآں شور است وبد | ایں فرشتہ پاک وآں دیوست ودد
ہردو گوں زنبور خوردند از محل | لیک شدزاں نیش وزاں دیگر عسل
ہردو گوں آہو گیا خوردند وآب | زیں یکے سرگین شد وزاں مشک ناب
ہردو نے خوردند از یک آب خور | آں یکے خالی وآں پر از شکر
صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ ہیں | فرق شاں ہفتاد سالہ راہ ہیں
ایں خورد گردد پلیدی زو جدا | واں خورد گردد ہمہ نور خدا

لطائف ومعارف

(۱) قلب: لغت میں اس صنوبری گوشت کے ٹکڑے کا نام ہے جو سینہ کے بائیں جانب ایک خالی جگہ میں رکھا ہوا ہے اور یہی مضغۂ لحم۔ روح حیوانی کا منبع اور سرچشمہ ہے اسی میں روح حیوانی پیدا ہوتی ہے جس کے وجود پر بدن کی حس وحرکت موقوف ہے۔ اور جو شرائین کے ذریعے تمام اعضاء میں پہنچتی ہے مگر اصطلاح شرع میں اس لطیفہ ربانی کو قلب کہتے ہیں جو اس مضغہ لحم میں من جانب اللہ رکھا ہوا ہے اور انسان کی انسانیت اسی سے قائم ہے اور اسی کی وجہ سے احکام شرعیہ کا مکلف اور مخاطب بنتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ اور اسی لطیفۂ ربانی کو قرآن کریم میں کہیں نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ اور کبھی روح کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ ﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي﴾ اس قسم کی آیات میں روح سے وہی لطیفہ انسانی مراد ہے انسان کا بدن عالم خلق سے ہے اور یہ لطیفہ انسانی عالم امر سے ہے اور الہام یزدانی کا محل اور مورد ہے اس لطیفہ پر جب مہر لگ گئی تو استدلال اور کشف اور الہام کے سب دروازے بند ہو گئے۔

(۲) سمع: کے معنی کان کے ہیں جو ایک عضو ہے اور کبھی اس کا اطلاق قوت سامعہ پر بھی آتا ہے آیت میں یہی معنی مراد ہیں اس قوت پر جب مہر لگ گئی تو کان کے ذریعہ سے جو ہدایت دل تک پہنچ جاتی تھی اس کا دروازہ بند ہو گیا۔

(۳) ابصار: جمع بصر کی ہے آنکھ کی روشنی کو بصر کہتے ہیں جس طرح دل کی روشنی کو بصیرت کہتے ہیں۔

(۴) ختم اور غشاوہ: ختم کے معنی مہر کرنا تا کہ وہ چیز بند ہو جائے اور چیزیں باہر سے اندر کی طرف نہ پہنچ سکیں اور غشاوہ پردہ کو کہتے ہیں آنکھ پر غشاوہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ پردہ آنکھ کی شعاع کو باہر سے روک دے۔

(۵) معتزلہ کا گمان یہ ہے کہ کسی کے دل پر مہر لگا دینا ایک امر قبیح ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قبیح سے پاک اور منزہ ہے اس لیے معتزلہ قرآن کریم کے اس قسم کی تمام آیتوں کی تاویل کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ختم اور طبع کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف اسناد مجاز ہے۔ اہل حق کہتے ہیں کہ یہ اسناد حقیقی ہے۔ قلوب بنی آدم اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے قلوب کو پلٹیں دیتا رہتا ہے۔ اور پھیرتا رہتا ہے کبھی خیر کی طرف اور کبھی شر کی طرف کما قال تعالیٰ: ﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾. اس قسم کی آیات سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ تمام قلوب اس کی انگلیوں میں ہیں قلوب کی ہدایت اور ضلالت اور ان کی سعادت اور شقاوت اس کے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے بغیر اس کی توفیق اور عنایت کے ایمان اور ہدایت ممکن نہیں۔ ﴿يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ ﴿وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ﴾ ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ﴾.

تمام کائنات اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اسی نے اپنی قدرت سے ان کو عدم کے پردہ سے نکال کر وجود کی مسند پر بٹھلایا ہے لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ عالم کا کوئی ذرہ بدوں اس کے ارادہ اور مشیت کے حرکت کر سکے ایمان اور ہدایت کفر اور ضلالت سب اسی کی مخلوق ہیں تخلیق و تکوین کے اعتبار سے ہر چیز کی اسناد اس کی طرف ہوگی۔ اور اسناد حقیقی ہوگی۔

البتہ کسب اور حصول کے اعتبار سے بندوں کی طرف اسناد ہو سکتی ہے چونکہ یہ ختم اور تغشیہ بندوں کے اختیاری تمرد اور سرکشی کا نتیجہ اور اس کی سزا ہے اس لیے متمردین اور معاندین کے تقبیح اور تشنیع کے لیے اس کو ذکر کیا لہٰذا امور ذمت اور مستحق ملامت صرف وہی لوگ ہوں گے جو ان خبیث استعدادوں کے ظرف اور محل ہیں۔ زہر اور سنکھیہ کا پیدا کرنا تو کمال ہے مگر اس کا استعمال قبیح اور مذموم ہے۔ اسی طرح روحانی زہر۔ (کفر و ضلالت) اور روحانی تریاق (ایمان و ہدایت) کو پیدا کرنا تو کمال ہی کمال ہے مگر اس کو اپنے اختیار سے استعمال کرنے کا حکم دوسرا ہے زمین اچھی ہو یا بری۔ شور اور بنجر ہو یا گلزار اور مرغزار ہو پیدا کرنا تو دونوں ہی کا حکمت ہے مگر برائی کے ساتھ شور اور بنجر زمین ہی کو موصوف کیا جائے گا۔ پیدا کرنے والا تو ہر حال میں قابل حمد و ستائش و لائق صد آفرین و تحسین ہے۔ ﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا﴾ جس زمین کو حق تعالیٰ نے شور اور بنجر بنایا اور انبات کی صلاحیتوں سے اسے محروم کر دیا تو خداوند ذوالجلال نے زمین کے اس ٹکڑے پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اسی طرح خداوند علیم و حکیم نے اگر کسی کے دل پر مہر لگا کر اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر ان کی زمین قلب کو ہدایت کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا تو کوئی ظلم نہیں کیا اہل حق کہتے ہیں کہ یہ ختم اور غشاوہ۔ ان کی سرکشی اور عناد کی سزا ہے یہ مہر ان کو کفر پر مجبور نہیں کرتی اس مہر کا توڑنا ان کے اختیار میں ہے۔ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں ابھی مہر ٹوٹتی ہے۔

حق جل شانہ نے گمراہی کے قفل پیدا کیے اور کافروں کے دلوں پر ڈال دیئے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾. مگر اس علیم و حکیم نے ان قفلوں کے کھولنے کے لیے مفاتیح (کنجیاں) بھی پیدا کیں تا کہ اگر کوئی قفل ضلالت کو کھولنا چاہے تو کلید ہدایت اور مفتاح سعادت اس کے ہاتھ میں ہے اس سے بسہولت قفل کھل سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی

بد نصیب کنجی کا استعمال نہ کرے تو قفل خود بخود تو کھلنے سے رہا۔

(۶) امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ کفر اور کافروں کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ، کو ذاتی عداوت ہے اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والے اس حق جل وعلا کے بالذات دشمن ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا عذاب دائمی ہے اور ان کی مغفرت ناممکن ہے اس لیے کہ صفت رأفت ورحمت جو کہ صفات انعال میں سے ہے وہ ذاتی غضب اور ذاتی عداوت کے مقتضاء کو ہرگز نہیں بدل سکتی۔ ایک صفتِ فعل کا مقتضا دوسری صرف فعل کے مقتضا سے متغیر اور متبدل ہوسکتا ہے مثلاً صفت احیاء سے صفت اماتہ کا مقتضا بدل سکتا ہے مگر مقتضائے ذات مقتضائے فعل سے نہیں بدل سکتا، اسی لیے کہ اقتضائے ذاتی بلاشبہ اقتضائے فعلی اور اقتضاء صفاتی سے بدر جہا اعلیٰ وارفع ہے۔ اس لیے قیامت میں کافروں کو اس کی صفت رأفت ورحمت سے کوئی حصہ نہ ملے گا۔ کیوں کہ وہ اس وحدہ لاشریک لہ کے بالذات دشمن ہیں اور حدیث قدسی میں جو سبقت رحمتي علی غضبي۔ (میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے) وارد ہوا ہے۔ اس سے ذاتی غضب مراد نہیں جو کفار ومشرکین کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ صفاتی اور فعلی غضب مراد ہے جو گنہگار مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے عصاۃ مؤمنین (گنہگار مومنین) کیساتھ ذاتی عداوت اور ذاتی غضب متعلق نہیں مومنین مذنبین کے حق میں جو عقاب اور عتاب بھی آیا ہے وہ ان کے افعال سیئہ کی طرف راجع ہے بلکہ گنہگاروں کے ساتھ ایمان کی وجہ سے ذاتی محبت متعلق ہے اور اسی ذاتی محبت کی وجہ سے اہل ایمان جنت میں ہمیشہ رہیں گے اور گناہوں کی وجہ سے جو صفاتی اور فعلی غضب ان سے متعلق ہو گیا ہے اس کی وجہ سے چند روز عذاب میں رہیں گے اور پھر اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ روح وریحان اور نعیم مقیم میں رہیں گے۔ رہا یہ سوال کہ کافر کے لیے آخرت میں تو رحمت سے کوئی حصہ نہیں مگر دنیا میں بھی کیا اس کے لیے کوئی رحمت ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ دنیا میں کافر کے لیے کسی رحمت کا حاصل ہونا فقط ظاہر اور صورت کے لحاظ سے ہے ورنہ حقیقت میں وہ استدراج اور کید متین ہے اور دار آخرت کی طرح دار دنیا میں بھی کفار سے ذاتی عداوت اور ذاتی غضب رحمت کے فیضان سے مانع ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ﴾

''کیا یہ کافر یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مال اور اولاد سے امداد کیے جا رہے ہیں تو ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں بلکہ یہ لوگ سمجھتے نہیں کہ یہ استدراج ہے۔''

وقال تعالیٰ: ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾

''ہم بتدریج ان کو جہنم کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ایسی طرح سے کہ ان کو معلوم بھی نہیں اور ان کو ڈھیل دے رہا ہوں۔ بے شک میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔''

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸ يُخٰدِعُوْنَ

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور وہ ہرگز مومن نہیں ف۱ دغابازی کرتے ہیں

اور ایک لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم یقین لائے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور ان کو یقین نہیں دغا بازی کرتے

ف۱ یعنی دل سے ایمان نہیں لائے جو حقیقت میں ایمان ہے صرف زبان سے فریب دینے کے لئے اظہار ایمان کرتے ہیں۔

ک

اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ؕ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ

اللہ سے اور ایمان والوں سے اور دراصل کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں سوچتے ف۱ ان کے دلوں میں بیماری ہے

ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور کسی کو دغا نہیں دیتے مگر آپ کو اور نہیں بوجھتے ان کے دل میں آزار ہے

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ

پھر بڑھا دی اللہ نے انکی بیماری ف۲ اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے ف۳ اور جب کہا جاتا ہے ان کو

پھر زیادہ دیا ہم نے ان کو آزار اور ان کو دکھ کی مار ہے اس پر کہ وہ جھوٹ کہتے تھے اور جب کہئے ان کو

لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ

فساد نہ ڈالو ملک میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ف۴ جان لو وہی ہیں خرابی کرنے والے

فساد نہ ڈالو ملک میں کہیں ہمارا کام تو سنوارنا ہے سن رکھو وہی ہیں بگاڑنے والے

وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ

لیکن نہیں سمجھتے ف۵ اور جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ جس طرح ایمان لائے سب لوگ تو کہتے ہیں ف۶ کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے

پر نہیں سمجھتے اور جب کہیے ان کو ایمان میں آؤ جس طرح ایمان میں آئے سب لوگ کہیں کیا ہم اس طرح مسلمان ہوں جیسے مسلمان

ف۱ یعنی ان کی فریب بازی نہ خدائے تعالیٰ کے اوپر چل سکتی ہے کہ وہ عالم الغیب ہے اور نہ مومنین پر کہ حق تعالیٰ مومنین کو بواسطہ پیغمبر ﷺ اور دیگر دلائل و قرائن کے منافقین کے فریب سے آگاہ فرما دیتا ہے بلکہ انکی فریب بازی کا وبال اور اسکی خرابی حقیقت میں ان ہی کو پہنچتی ہے مگر وہ اس کو اپنی غفلت اور جہالت اور شرارت سے نہیں سوچتے اور نہیں سمجھتے اگر غور کریں تو سمجھ لیں کہ اس فریب بازی سے مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اس کا نتیجہ خراب ہم کو پہنچ رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ (شاہ عبدالقادر صاحبؒ) کے فہم کی نزاکت ہے کہ یہاں یَشْعُرُوْنَ کا ظاہر ترجمہ چھوڑ کر اس کا ترجمہ بوجھنا یعنی سوچنا فرمایا۔

ف۲ یعنی ان کے دلوں میں نفاق اور دین اسلام سے نفرت اور مسلمانوں سے حسد اور عناد، یہ مرض پہلے سے موجود تھے اب نزول قرآن اور ظہور شوکت اسلام اور ترقی و نصرت اہل اسلام کو دیکھ دیکھ کر ان کی وہ بیماری اور بڑھ گئی۔

ف۳ اس جھوٹ کہنے سے وہی اسلام کا جھوٹا دعویٰ ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ مراد ہے جو اوپر گذر چکا۔ یعنی عذاب الیم حقیقت میں انکے نفاق کی سزا ہے نہ مطلق جھوٹ بولنے کی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو اسی باریک فرق پر متنبہ فرمانا منظور ہے جو یکذبون کا ترجمہ جھوٹ بولنے کی جگہ "جھوٹ کہنا" فرماتے ہیں فجزاہ اللہ صادق نظرہ۔

ف۴ خلاصہ یہ ہے کہ منافقین بچند وجوہ فساد پھیلاتے تھے، اول تو خواہشات نفسانیہ میں منہمک تھے اور انقیاد احکام شریعہ سے کاہل اور متنفر تھے دوسرے مسلمانوں اور کافروں دونوں کے پاس آتے جاتے تھے اور اپنی قدر و منزلت بڑھانے کو ہر ایک کی باتیں دوسرے تک پہنچاتے رہتے تھے۔ تیسرے کفار سے نہایت مدارات و مخالطت سے پیش آتے تھے اور امور دین کی مخالفت پر کفار پر اصلاً مزاحمت نہ کرتے تھے اور کفار کے اعتراضات و شبہات کو جو دین کی باتوں پر ہوتے تھے مسلمانوں کے روبرو نقل کرتے تھے تاکہ ضعیف الاعتقاد اور ضعیف الفہم احکام شریعہ میں متردد ہو جائیں اور جب کوئی ان فسادات سے ان کو منع کرتا تو جواب دیتے تھے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام قوم اور ملک مثل زمانہ سابق شیر و شکر ہو کر رہیں اور دین جدید کی وجہ سے جو مخالفت بڑھ گئی ہے بالکل جاتی رہے چنانچہ ہر زمانہ میں دنیا طلب ہوا پرست ایسا ہی کہا کرتے ہیں۔

ف۵ یعنی اصلاح تو حقیقت میں یہ ہے کہ دین حق جملہ ادیان پر غالب ہو اور جملہ اغراض و منافع دنیوی سے احکام شریعہ کی رعایت زیادہ کی جائے اور رد، بارا دنیا کسی کی موافقت اور مخالفت کی پرواہ نہ ہو۔ ع "خاک بر دلداری اغیار باش" منافقین بعلتہ مصالحت و مصلحت اندیشی جو کچھ کرتے ہیں وہ حقیقت میں فساد محض۔

السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا

بیوقوف ف۱ جان لو وہی ہیں بیوقوف لیکن نہیں جانتے ف۲ اور جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں

بیوقوف سنا ہے وہی ہیں بیوقوف پر نہیں جانتے اور جب ملاقات کریں مسلمانوں سے

اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہا ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس ف۳ تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں ف۴ ہم تو ہنسی کرتے ہیں ف۵ (یعنی

کہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب اکیلے جاویں اپنے شیطانوں پاس کہیں ہم ساتھ ہیں تمہارے ہم تو ہنسی کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا

مسلمانوں سے) اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے ف۶ اور ترقی دیتا ہے انکو ان کی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں ف۷ یہ وہی ہیں جنہوں نے مول لی

اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور بڑھاتا ہے ان کو ان کی شرارت میں بہکے ہوئے۔ وہی ہیں جنہوں نے خرید لی راہ کے بدلے گراہی

= ہے مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔

ف۶ یعنی اپنے دلوں میں یہ کہتے تھے یا آپس میں یا ان ضعفائے مسلمین سے جو کسی وجہ سے اُن کے راز دار بن رہے تھے۔

ف۱ سفہاء کہا سچے مسلمانوں کو کہ احکام خداوندی پر دل سے ایسے فدا تھے کہ لوگوں کی مخالفت اور اسکے نتائج بد سے اور انقلاب زمانہ کی مضرات گوناں گوں سے اپنا بچاؤ نہ کرتے تھے بخلاف منافقین کے کہ مسلمان و کفار سب سے ظاہر بنا رکھا تھا اور اغراض نفسانی کے سبب آخرت کا کچھ فکر نہ تھا مصلحت بینی اس درجہ غالب تھی کہ ایمان و پابندیٔ احکام شرع کی ضرورت نہ سمجھتے تھے فقط دعویٔ زبانی اور ضروری اعمال بمجبوری ادا کر لینے پر قناعت تھی۔

ف۲ یعنی بیوقوف حقیقت میں منافقین ہی ہیں کہ مصالح و اغراض دنیوی یاد رہوا کی وجہ سے آخرت کا خیال نہ کیا فانی کو لینا اور باقی کو چھوڑنا کس قدر حماقت ہے اور مخلوقات سے ڈرنا کہ جن سے ہزار طرح اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں اور علام الغیوب سے نہ ڈرنا کہ جہاں کسی طرح کوئی امر پیش ہی نہ جا سکے کتنی جہالت ہے اور صلح کل کیسے کہ جس میں احکم الحاکمین اور اس کے مقبول بندوں سے مخالفت کی جاتی ہے۔ مگر منافقین اس درجہ بیوقوف ہیں کہ ایسی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔

ف۳ شیاطین (یعنی شریر لوگ) مراد ان سے یا تو وہ کفار ہیں جو اپنے کفر کو سب پر ظاہر کرتے تھے یا وہ منافقین مراد ہیں جو ان میں رئیس سمجھے جاتے تھے۔

ف۴ یعنی کفر و اعتقاد دین کے معاملے میں ہم بالکل تمہارے ساتھ ہیں تم سے کسی حالت میں جدا نہیں ہو سکتے۔

ف۵ یعنی ظاہری موافقت جو ہم مسلمانوں سے کرتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا کہ ہم واقعی میں ان کے موافق ہیں ہم تو ان سے تمسخر کرتے ہیں اور ان کی بیوقوفی سب پر ظاہر کرتے ہیں کہ باوجودیکہ ہمارے افعال ہمارے اقوال کے مخالف ہیں مگر وہ اپنی بیوقوفی سے صرف ہماری زبانی باتوں پر ہم کو مسلمان سمجھ کر ہمارے مال اور اولاد پر ہاتھ نہیں ڈالتے اور مال غنیمت میں ہم کو شریک کر لیتے ہیں اور اپنی اولاد سے ہمارا نکاح کر دیتے ہیں اور ہم اُن کے راز کی باتیں اڑا لاتے ہیں اور وہ اس پر بھی ہمارے فریب کو نہیں سمجھتے۔

ف۶ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو فرما دیا کہ منافقین کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کرو ان کے جان و مال سے ہرگز تعرض نہ کرو اس سے منافقین اپنی حماقت سے سمجھ جائیں گے کہ ایمان لانے سے جو فائدہ مسلمانوں کو ہوا وہ سب فوائد ہم کو بھی صرف زبانی اظہار اسلام سے حاصل ہو گئے اس وجہ سے بالکل مطمئن ہو گئے حالانکہ انجام کار یہ امر منافقین کو سخت بلا میں پھنسانے والا ہے اس کا انجام نہایت خراب ہے۔ تو اب انصاف کیجئے کہ حقیقت تمسخر مسلمانوں کا ہوا یا منافقین کا اور تمسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تمسخر کا بدلہ اور سزا اُن کو دے گا۔

ف۷ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل دی گئی حتیٰ کی انہوں نے سرکشی میں خوب ترقی کی اور ایسے بہکے کہ اس کا انجام کچھ نہ سوچا اور خوش ہوئے کہ ہم مسلمانوں سے ہنسی کرتے ہیں حالانکہ معاملہ بالعکس تھا جاننا چاہئے کہ آیت میں فی طغیانہم فعل یمدھم کے متعلق ہے۔ مگر تراجم دہلویہ جدیدہ میں اس کو یعمھون کے متعلق کر دیا (جس سے معنی بگڑ کر معتزلہ کے موافق اور اہل سنت کے خلاف اور استعمال عرب کے مخالف ہو گئے) جو غلط ہے اور جاننے والے اس کو خوب جانتے ہیں۔

الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ⑯

گمراہی ہدایت کے بدلے سو نافع نہ ہوئی ان کی سوداگری ف۱ اور نہ ہوئے راہ پانے والے ف۲

سو نفع نہ لائی ان کی سوداگری اور نہ راہ پائی۔

قبائح منافقین

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ... الی... وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾

ربط:...... ابتداء سورت میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی مدح فرمائی جنہوں نے دل سے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کو مانا اور زبان سے اس کا اقرار کیا۔ یہ اتقیاء کا گروہ تھا بعد میں اشقیاء کا حال ذکر کیا۔ اشقیاء میں دو گروہ تھے۔ پہلا گروہ وہ تھا جو دل اور زبان دونوں سے منکر تھے۔ ان کا ذکر ہو چکا۔ اب آئندہ آیات میں اشقیاء کے دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو کسی دباؤ اور مصلحت کی بناء پر زبان سے تو مانتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ ایسے شخص کو اصطلاح شریعت میں منافق کہتے ہیں۔ کافروں میں سب سے بدتر یہی فرقہ ہے کہ جس نے کفر کے ساتھ جھوٹ کو جمع کیا۔

آنحضرت ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اوس اور خزرج کے اکثر قبائل سچے دل سے اسلام میں داخل ہو گئے مگر بعض قبائل جو یہود سے تعلق رکھتے تھے وہ اسلام کی قوت اور شوکت کو دیکھ کر ظاہر میں مسلمان بنے تا کہ ان کے جان و مال اور اہل و عیال محفوظ رہیں مگر اندرونی طور پر یہود اور مشرکین کے ساتھ رہے اللہ تعالیٰ نے ان کے بارہ میں یہ آیتیں نازل کیں اور ان آیتوں میں منافقین کے اخلاق ذمیمہ اور افعال قبیحہ کو بیان کیا۔

پہلی قباحت

یہ ہے کہ وہ اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں اور تعجب ہے کہ بعضے لوگ باوجود انسان ہونے کے ایسے کمینہ اور کج فہم ہیں کہ محض زبان سے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر حالانکہ وہ کسی درجہ میں بھی مومنین نہیں یعنی اللہ اور یوم آخرت کی کیا تخصیص وہ تو کسی چیز پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ ان کی ذوات کو ایمان اور اہل ایمان سے ذرہ برابر الصاق ① اور اتصال نہیں۔ الحاق اور اتصاف کا تو ذکر ہی فضول ہے۔

خاص اللہ اور یوم آخرت کو ذکر کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ سلسلۂ ایمان بالغیب میں سب سے زائد مہتم بالشان اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانا ہے یا یہ وجہ ہے کہ بعض مرتبہ کسی سلسلہ کی پہلی اور آخری چیز کا ذکر کر دیتے ہیں اور مقصود استیعاب اور احاطہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں مقصود یہ ہے کہ ہم اہل ایمان کی طرح اول سے آخر تک تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور سلسلہ ایمان کو

ف۱ تجارت سے مراد وہی گمراہی کا ہدایت کے بدلے مول لینا ہے جو اس سے پہلے مذکور ہے۔

ف۲ یعنی منافقین نے بظاہر ایمان قبول کیا اور دل میں کفر کو رکھا جس کی وجہ سے آخرت میں خراب اور دنیا میں خوار ہوئے کہ حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ان کے احوال پر سب کو مطلع فرما دیا۔ ایمان لاتے تو دارین میں سرخرو ہوتے۔ تو اب انکی تجارت نے کوئی نفع ان کو نہ پہنچایا نہ دنیا کا اور نہ آخرت کا۔ اور وہ کچھ نہ سمجھے کہ مجرد ایمان زبانی کو کافی اور نافع سمجھ کر اس خرابی اور رسوائی میں گرفتار ہوئے۔ اب منافقین کے مناسب حال دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔

① لفظ الصاق سے بمؤمنین کے باء کے ترجمہ کی طرف اشارہ ہے۔ فان الباء للالصاق ۱۲۔

اول سے آخر تک پکڑے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: ﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ﴾ یہ منافقین اپنے زعم میں اللہ اور مومنین سے فریب اور دھوکہ کرتے ہیں۔ حالانکہ نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنے نفسوں کو اس لیے کہ حق تعالیٰ عالم الغیب والشہادہ ہیں۔ ان سے کوئی شے مخفی نہیں اور مومنین کو بذریعہ وحی ان کی دغابازی کی اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ ان کے اس فریب سے اہل ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ الٹا انہی کو نقصان ہوتا ہے۔

ف:...... مخادعت مفاعلت کا وزن ہونے کی وجہ سے مشارکت کو مقتضی ہے۔ سو منافقین کی طرف سے تو خداع اور مکر ظاہر ہے۔ مگر حق جل شانہ کی طرف سے ان پر ظاہراً احکام اسلام کا جاری ہونا یا دنیوی نعمتیں دے کر استدراج اور امہال میں مبتلا کرنا یہ حق تعالیٰ کی طرف سے خداع ہے کہ ظاہر میں تو اعزاز اور اکرام ہے اور در پردہ ارادۂ تذلیل و تحقیر ہے۔ ﴿وَمَا یَشْعُرُوْنَ﴾ یعنی یہ منافقین اس قدر احمق اور بدحواس ہیں کہ اس امر کا ذرہ برابر احساس نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ پر کسی کا کوئی فریب اور دھوکہ کسی طرح نہیں چل سکتا۔

فائدہ:...... (۱) اگر زبان سے اسلام اور ایمان کا اقرار ہو اور دل میں انکار ہو تو یہ اعتقادی نفاق کہلاتا ہے اگر دل میں بھی اقرار ہو مگر اعمال اسلام کے پورے مطابق نہ ہوں تو یہ عملی نفاق کہلاتا ہے اس سے کافر نہیں ہوتا اگر حال قال کے مطابق نہ ہو تو سلف صالحین اس کو بھی نفاق کہتے تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ عبداللہ بن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس صحابہ کو پایا کہ ہر ایک اپنے نفس پر نفاق سے ڈرتا تھا۔ حضرات صحابہ ؓ کا یہ حال تھا کہ ذرا قلب کی نورانیت میں فرق پایا تو اس کو نفاق سمجھتے تھے۔ حضرت حنظلہ ؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ حنظلہ تو منافق ہوگیا۔ آپ کی حضوری میں قلب کی جو حالت ہوتی ہے وہ اہل وعیال میں جاکر نہیں رہتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ حالت ہمیشہ نہیں رہ سکتی، اگر ہمیشہ یہی حالت رہتی تو گلی کوچوں میں اور بستروں پر فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔

(۲) جاننا چاہیے کہ شیعوں کا تقیہ بھی کھلا ہوا نفاق ہے۔ اگرچہ وہ اس کو ایمان کہیں کما قالوا اَلَا لا ایمان لِمَن لاتقیۃ لہ۔ اور کیوں نہیں منافق تو اپنے نفاق کو ایمان اور اخلاص ہی سمجھتا ہے۔

(۳) تفسیر ابن کثیر میں امام مالک سے منقول ہے کہ اس زمانہ میں ملحد اور زندیق حکم میں منافق کے ہے انتہی۔

تشریح:...... جو شخص شریعت کے الفاظ تو بحال رکھے مگر معنی ایسے بیان کرے جس سے اس کی حقیقت ہی بدل جائے ایسے شخص کو قرآن کی اصطلاح میں ملحد اور حدیث کی اصطلاح میں زندیق کہتے ہیں ایسا شخص دعویٰ تو اسلام کا کرتا ہے مگر دل میں کفر مضمر ہے اور آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں تاویلات فاسدہ کرکے مسلمانوں کو دھوکا دیتا ہے وجہ یہ ہے کہ دل میں زیغ اور کجی کی بیماری ہے جو اس کو تاویلات فاسدہ پر آمادہ کرتی ہے اور جتنی تاویلات فاسدہ زیادہ کرتے جاتے ہیں اتنی ہی ان کے دل کی بیماری میں زیادتی ہوتی جاتی ہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے۔

اور ان منافقین کا اپنے نفسوں کو دھوکہ اور فریب دینا بالکل ظاہر ہے مگر ان کو اس لیے ظاہر نہیں ہوتا کہ ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ ان کے دلوں میں ایک خاص قسم کا مرض ہے جس سے ان کی قوت ادراکیہ ماؤف ہو چکی ہے اور یہ کتاب بلاشبہ پیغام شفاء اور نسخہ ہدایت تھی۔ اگر دلوں کو بغض اور عناد سے صاف کرکے اس نسخۂ اشفاء کو استعمال کرتے تو شفایاب ہوجاتے۔ مگر اس کتاب ہدایت کے ساتھ ان کا بغض اور عناد زیادتی مرض کا سبب بن گیا۔ پس اللہ نے ان کے مرض

کو اور بڑھا دیا۔ جو عضو اور جو حاسہ جس غرض اور جس مقصد کے لیے وضع کیا گیا ہے اس حاسہ سے اس غرض کے نہ حاصل ہونے کا نام مرض ہے۔ زبان کے حق میں نطق اور گویائی اور آنکھ کے حق میں نظر اور بینائی کا۔ اور جسم کے حق میں گرفت اور احساس کا دشوار ہو جانا یہ زبان اور آنکھ اور جسم کا مرض ہے علیٰ ہذا قلب کے حق میں اللہ جل جلالہ کی معرفت اور اس کی محبت اور اس کی اطاعت کا دشوار ہو جانا کہ جس کے لیے یہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ قلب کا مرض ہے۔

ہرچہ جز عشق خدائے احسن است　　　گرشکر خوردن بودجان کندن است

حالت مرض میں مرغ تنجن اور بہتر سے بہتر غذا بھی مفید نہیں ہوتی بلکہ اور مرض اور بیماری میں قوت اور شدت پیدا کر دیتی ہے۔ ع

ہرچہ گیرد علتی علت بود

اول ازالہ مرض کی فکر چاہیے اس کے بعد مناسب غذا دی جائے۔ اس طرح باطنی اور روحانی مریض کو ایمان وہدایت کی تلقین کوئی نفع نہیں دیتی بلکہ اور مرض میں اضافہ کر دیتی ہے۔

جو شخص صفراء کے مرض میں مبتلا ہے اس کو قند اور نبات بھی تلخ معلوم ہوتی ہے اور قند اور نبات کے استعمال سے اس کا صفراء اور زیادہ ہو جاتا ہے۔

وَمَنْ يَّكُ ذَافَمٍ مُّرٍّ مَرِيضٍ　　　يَجِدْ مُرًّا بِهِ الْمَاءَ الزُّلَالَا

جس کے منہ کا مزہ تلخ ہو اس کو آب زلال بھی تلخ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص کفر اور نفاق کے مرض میں مبتلا ہو اس کو ایمان کی حلاوت اور شیرینی کہاں محسوس ہو سکتی ہے۔ کفر اور نفاق کے صفراء نے اس کی قوت ذائقہ کو تلخ بنا دیا ہے اس لیے اس کو ایمان اور ہدایت کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک آزار یہ تھا کہ جس دین کو دل نہ چاہتا تھا ناچار قبول کرنا پڑا اور دوسرا آزار اللہ نے زیادہ دیا کہ حکم کیا جہاد کا جن کے خیر خواہ تھے۔ ان سے لڑنا پڑا۔ (موضح القرآن)

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ﴾۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ وہ دعوائے ایمان میں جھوٹ بولتے تھے۔ اور پھر طرفہ یہ کہ اس جھوٹ کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ مردوں کی طرح اپنے عقیدہ کو کھول کر نہیں بیان کرتے۔ عورتوں کی طرح ڈرتے ہیں اسی وجہ سے منافق کھلے کافر سے بدتر ہے۔ اس لیے کہ کافر فقط کفر کرتا ہے مگر جھوٹ تو نہیں بولتا۔ اور نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے بخلاف منافق کے کہ وہ کفر بھی کرتا ہے اور زبان سے جھوٹ بھی بولتا ہے کہ مسلمان ہوں اور اہل ایمان کو دھوکہ دیتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾.

امام مالک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو منافق تھا وہ اس زمانہ میں زندیق ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) یعنی زندیق وہ ہے جو منافقوں کی طرح دعویٰ تو اسلام کا کرے مگر دل میں کفر مضمر ہو۔

منافقین کی دوسری قباحت

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ ... الی ... وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ﴾

اور یہ منافقین اپنے باطنی مرض کی وجہ سے اس درجہ کو پہنچ گئے ہیں کہ فساد کو صلاح اور صلاح کو فساد اور مرض کو صحت

سمجھنے لگے ہیں۔ کیونکہ جب اسے یہ کہا جائے کہ زمین میں فسادمت کروتو یہ کہتے ہیں کہ جزایں نیست کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ منافقین کئی طرح سے فساد پھیلاتے تھے۔ کبھی مسلمانوں کے راز فاش کرتے کبھی کافروں کو مسلمانوں کی مخالفت پر آمادہ کرتے اور کبھی کافروں کے اعتراضات ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے سامنے نقل کرتے تاکہ وہ مذبذب اور متزلزل ہوجائیں ان سب کو حق تعالیٰ نے فساد سے تعبیر فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں نفاق خواہ دین کا ہو یا دنیا کا خود ایک مستقل فساد ہے۔ دورو یہ ہونے سے بڑھ کر کوئی فساد نہیں۔ ایسا شخص ہمیشہ فساد پھیلاتا ہے اور کسی کا خیرخواہ نہیں ہوتا۔ مسلمان جب ان کو اس قسم کے فسادوں سے منع کرتے تو جواب میں یہ کہتے کہ ﴿إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ﴾ جزایں نیست کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ سب شیر وشکر ہوجائیں۔ آپس میں کوئی اختلاف نہ رہے۔ نئے دین کی وجہ سے جو جھگڑا اور اختلاف پیدا ہوگیا ہے کہ ایک دوسرے کے درپے قتل وغارت اور ایذاء اور ہتک حرمت ہوگیا ہے وہ سب یک لخت ختم ہوجائے اور ملک اور ملت پہلی حالت پر لوٹ آئے اور سلسلہ معاش وتجارت حسب سابق جاری ہوجائے۔ حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ﴾ آگاہ ہوجاؤ کہ یقینا یہی لوگ مفسد ہیں۔ کہ کفر اور ایمان اور شرک اور توحید کو ایک کرنا چاہتے ہیں اور جس کفر وشرک کے فتنہ اور فساد کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے یہ فتنہ پرداز پھر اسی فساد کو دوبارہ اپنی جگہ پر لانا چاہتے ہیں۔ اور لیکن قلبی مرض کی وجہ سے ان کا باطنی احساس اس درجہ مختل ہوگیا ہے کہ اصلاح اور فساد کے فرق کو بھی محسوس نہیں کرتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ دین حق فتنہ نہیں بلکہ کفر اور شرک ہی فتنہ اور فساد ہے۔ اسی کے مٹانے اور اسی کی اصلاح کے لیے حضرات انبیاء مبعوث ہوئے اور کفر اور شرک ہی کے فتنہ کے استیصال کے لیے جہاد وقتل کرنا عین اصلاح ہے۔ جہاد کو فساد بتانا یہی فتنہ اور فساد ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ﴾

وقال تعالیٰ: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾

"کافروں سے قتال وجہاد کرو یہاں تک کفر اور شرک کا فتنہ اور فساد باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہوجائے۔"

"لوگ آپ سے ماہ حرام میں قتال کرنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ بے شک ماہ محرم میں ابتداء قتال کرنا بہت بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کے دین سے لوگوں کو روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے مسلمانوں کو تنگ اور پریشان کرکے نکالنا ماہ حرام میں قتل کرنے کے جرم سے کہیں زیادہ ہے اور کفر اور شرک کا فتنہ قتل وغارت گری کے فتنہ سے بہت بڑا ہے۔"

اگر کسی مریض کا ہاتھ گل یا سڑ گیا ہو تو اس عضو کا کاٹ دینا اور اس کا داغ دے دینا ہی حاذق طبیب کے نزدیک اصلاح ہے ورنہ اگر اس عضو کو قطع نہ کیا گیا تو تمام بدن کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح سے اگر اعداء اللہ سے جہاد وقتال نہ کیا جائے تو روحانی طور پر تمام عالم کے خراب ہونے کا اندیشہ بلکہ ظن غالب ہے۔ اب آئندہ آیت میں ان کی بے شعوری کی ایک دلیل بیان فرماتے ہیں کہ وہ اہل عقل اور حق تعالیٰ کا اتباع کرنے والوں کو بے وقوف اور احمق سمجھتے ہیں۔

یہی حال ملاحدہ اور زنادقہ کا ہے کہ آیات اور احادیث میں تاویلات فاسدہ کر کے مسلمانوں کو فتنہ اور فساد میں ڈالتے ہیں اور بے عقلی سے اس فساد کو اصلاح سمجھتے ہیں۔

منافقین کی تیسری قباحت

قال تعالیٰ: ﴿وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ ... الی ... اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لائے وہ لوگ جو حقیقۃً انسان اور آدمی ہیں۔ انسان حقیقت میں وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر اخلاص کے ساتھ ایمان رکھتا ہو ورنہ وہ شخص ''نہ ابن آدم بل غلاف آدمند'' کا مصداق ہے۔ ناس سے اس جگہ مطلقاً صحابہ کرام مراد ہیں یا علماء بنی اسرائیل مراد ہیں جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ اور تاریخ ابن عساکر میں ابن عباس سے ''کما آمَنَ النَّاسُ'' کی تفسیر اس طرح منقول ہے۔ کما آمن ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ وعثمان رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ عنہ اور ان چار کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ ایمان وہی معتبر ہے جو خلفائے راشدین کے منہاج اور منوال پر ہو اور کما آمن الناس کے لفظ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور تصدیق اسی قسم کی معتبر ہے جس قسم کی صحابہ کرام اور خلفاء راشدین نے تصدیق کی ورنہ جو شخص ملائکہ اور جنت اور جہنم وغیرہ وغیرہ کی تصدیق اس معنی کے لحاظ سے نہ کرے کہ جس معنیٰ سے صحابہ کرام تصدیق کرتے تھے۔ بلکہ اپنی ہوائے نفسانی اور شیطان قرین کے القاء کیے ہوئے معنی کے لحاظ سے کرے تو وہ اصلاً معتبر نہیں۔ ایسی تصدیق تکذیب کے مترادف ہے اور ایسا ایمان بلاشبہ کفر کے ہم معنی ہے۔ الحاصل جب منافقین سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم ایسا ایمان لاؤ کہ جیسا صحابہ کرام ایمان لائے تو جواب میں یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں جیسا کہ ایمان لائے بیوقوف کہ دین کے دیوانے بنے ہوئے ہیں اور زمانہ کے انقلابات سے نہیں ڈرتے ممکن ہے کہ دوسری طرف کا غلبہ ہو جائے دین کی محبت میں دنیاوی مصالح کو نظر انداز کر دیا۔ روافض اور خوارج بھی صحابہ کرام کو احمق اور کافر اور منافق کہتے ہیں۔ سفیہ اس کو کہتے ہیں جو اپنے نفع اور ضرر کو نہ پہچانتا ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ آخرت کے نفع اور ضرر کے فکر میں اس درجہ سرشار اور منہمک تھے۔ کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے کسی نفع اور ضرر کی ذرہ برابر ان کو پرواہ نہ رہی تھی۔ اس لیے دنیا کے کتے ان کو دیوانہ اور بیوقوف کہتے تھے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد　　اوست فرزانہ کہ فرزانہ نشد

منافقین کا مخلصین کو دیوانہ اور سفیہ کہنا بھی ان کے عقل اور سمجھ دار ہونے کی دلیل ہے۔

واذا اتتك مذمتي من ناقص　　فهي الشهادة لي باني كامل

ناقص العقل کا میری مذمت کرنا یہی میرے کامل العقل ہونے کی شہادت ہے اس لیے آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

آگاہ ہو جاؤ کہ یہی لوگ احمق اور بیوقوف ہیں جنہوں نے باقی کو چھوڑ کر فانی کو اختیار کیا ہے۔ اور عاقلوں کو احمق سمجھتے ہیں۔ اور حق کو باطل اور ہدایت کو ضلالت سمجھتے ہیں۔ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والاحمق من اتبع نفسه هواها وتمنى

علی اللہ"۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

''عاقل اور سمجھ دار وہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بنایا اور مابعد الموت یعنی آخرت کے لیے عمل کیا اور احمق اور بیوقوف وہ ہے کہ جس نے ہوائے نفسانی کا اتباع کیا اور اللہ پر آرزوئیں اور تمنائیں باندھیں۔'' (ترمذی شریف، ابن ماجہ)

علاوہ ازیں لیل ونہار آپ کے معجزات کا مشاہدہ کیا اور جو نعت اور صفت آپ کی آسمانی کتابوں میں دیکھی اور پڑھی تھی وہ ہو بہو آپ پر منطبق پائی اور پھر بھی ایمان نہ لائے۔ اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی۔ اور یہ منافق ایسے احمق اور بیوقوف ہیں کہ وہ اپنی حماقت اور بیوقوفی کو بھی نہیں جانتے۔ جو احمق اپنی حماقت کو جانتا ہو وہ غنیمت ہے لیکن جو احمق اپنی حماقت اور سفاہت کو دانائی اور فراست سمجھتا ہو اس کا مرض لا علاج ہے۔ ان آیات میں یہ بیان فرمایا کہ منافقین اہل اخلاص کو زبان سے بیوقوف بتلاتے ہیں۔ آئندہ آیات میں یہ بتلاتے ہیں کہ محض زبان سے نہیں دل سے بھی ان کو بیوقوف سمجھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

منافقوں کی چوتھی صفت

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ... الی ... وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ﴾

اور جب وہ منافقین ملتے ہیں اہل ایمان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب یہ اپنے شیاطین الانس یعنی اپنے رؤسا کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ سوائے اس کے نہیں کہ ہم تو مسلمانوں کے ساتھ تمسخر اور ہنسی کرتے ہیں تاکہ لوگوں پر مسلمانوں کی سفاہت اور بیوقوفی ظاہر ہو کہ محض زبانی اقرار سے ہمکو دوائے ایمان میں سچا سمجھتے ہیں۔ شیاطین سے منافقین کے پیشوا اور سردار مراد ہیں جو دین الٰہی کے مقابلہ میں ہر قسم کے فتنہ اور فساد کے سرغنہ بنے ہوئے تھے۔ شیطان لغت میں سرکش اور حد سے گزرنے والے کو کہتے ہیں۔ خواہ جنوں میں سے ہو خواہ انسانوں میں سے ہو۔ کما قال تعالیٰ: ﴿شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ اہل نفاق کو چونکہ ایمان سے دلی رغبت نہ تھی محض قتل سے جان بچانے کے لیے ایمان کا ظاہراً اقرار کرتے تھے۔ اس لیے "اٰمَنَّا" کہنے میں کسی حرف تاکید کا استعمال نہ کیا۔ اور جب اپنے شیاطین اور ائمۃ الکفر کی معیت اور مسلمانوں کے استہزاء کو بیان کیا تو حرف انّ اور انما اور جملہ اسمیہ سے اس کو مؤکد کیا۔ یہ تاکیدی کلمات انکار کی بناء پر نہیں بلکہ اظہار شوق ورغبت کے لیے تھے۔ کمافی المطول۔ آئندہ آیت میں ان کے استہزاء اور تمسخر کا جواب ہے کہ یہ نادان کیا اہل ایمان کا استہزاء اور تمسخر کرتے ہیں ان کو یہ خبر نہیں کہ یہ لوگ خداوند علام الغیوب کے استہزاء اور تمسخر کا محل بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ یہ کیا اہل ایمان اور اہل اخلاص کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں۔ ﴿اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ﴾ ان کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً تمسخر کرتا رہتا ہے۔ اور ان کی سرکشی اور گمراہی میں ان کو ترقی دیتا رہتا ہے درآنحالیکہ وہ اس میں سرگشتہ اور سرگرداں ہیں۔ دنیا میں تو اللہ تعالیٰ کا استہزاء یہ ہے کہ ان کو خوب مال ودولت دیا تاکہ خوب مغرور اور مست ہو جائیں اور پھر دفعۃً ان کو پکڑ لیا جائے۔ کافر اس مال ودولت کو

نعمت سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ عذاب اور نقمت ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ﴾

''کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ جس مال اور اولاد سے ہم ان کی مدد کرتے ہیں اور ان کے لیے خیر اور بھلائی کے لیے سعی کر رہے ہیں۔ نہیں بلکہ ان کو اس کا احساس نہیں کہ (یہ استدراج اور امہال ہے)۔''

بعض سلف صالحین سے منقول ہے کہ کافر جب کوئی معصیت کرتا ہے تو اللہ جل شانہ ظاہراً اس کے لیے کوئی دنیوی نعمت پیدا فرماتے ہیں۔ اور وہ حقیقت میں بلاء عظیم اور نقمت یعنی مصیبت ہوتی ہے۔ قال تعالیٰ:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ﴾

''پس جب کہ وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ہر چیز کے دروازے ان پر کھول دیے یہاں تک کہ جب وہ خوش ہو گئے اس شئے سے جو ان کو دی گئی تھی تو ہم نے ناگہانی طور پر ان کو پکڑ لیا پس وہ ناامید رہ گئے۔''

اور آخرت کا استہزاء اور تمسخر وہ ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ قیامت کے دن ان کے لیے ایک جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ جب وہ اس دروازے تک پہنچیں گے تو وہ دروازہ فوراً بند کر لیا جائے گا۔ اور ان کو آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔ اہل جنت ان کی یہ حالت دیکھ کر ہنسیں گے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝ عَلَي الْاَرَاۗىِٕكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ﴾

''پس آج کے دن اہل ایمان کفار پر ہنسیں گے اور تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھیں گے۔'' (اخرجہ البیہقی فی الاسماء والصفات) (درمنثور)

اور ایک استہزاء اور تمسخر قیامت کے دن یہ ہوگا کہ پل صراط پر اہل ایمان کے لیے ایک نور پیدا کیا جائیگا جب منافقین پہنچیں گے تو اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی جائے گی۔ کما قال تعالیٰ: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ﴾

﴿يَعْمَهُوْنَ﴾ عمہ دل کی بینائی ضائع ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ آنکھ کی بینائی جاتے رہنے کو عمی کہتے ہیں۔ قال تعالیٰ: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (دراصل آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔)

آئندہ آیت میں ان کے قابل استہزاء ہونے کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ یہ لوگ کیوں قابل استہزاء نہ ہوں۔ یہ لوگ تو ایسے بیوقوف اور نادان ہیں کہ انہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ ایسے ہی لوگوں نے یعنی جن کے دل نابینا اور اندھے ہو گئے۔ نہایت خوشی اور رغبت سے گمراہی کو ہدایت کے عوض خرید لیا۔ اشتراء کے معنی خوشی اور رضامندی سے خریدنے کے ہیں۔

تجارت اور خرید وفروخت میں خرید نے والے کی رضا شرط ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾ لہٰذا اس مقام پر بجائے لفظ استبدال کے لفظ اشتراء لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے گمراہی کو ہدایت کے عوض میں نہایت خوشی سے قبول کیا ہے۔

﴿فَمَا رَبِحَت تِّجَٰرَتُهُمْ وَمَا كَانُوا۟ مُهْتَدِينَ﴾ پس نہ سود مند ہوئی ان کی تجارت اور وہ آخرت کی تجارت سے واقف بھی نہیں۔ آخرت کی تجارت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اور جان ومال سے اس کی راہ میں کوئی دریغ نہ ہو۔

کما قال تعالیٰ: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَٰرَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُجَٰهِدُونَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ بِأَمْوَٰلِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ﴾ اور یہ لوگ تجارت میں نفع تو کہاں سے حاصل کرتے انہوں نے تو اصل سرمایہ ہی کو ضائع کر دیا۔ یہاں اصل سرمایہ سے فطرت سلیمہ اور قبول حق کی استعداد مراد ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ ٱلَّذِى ٱسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ أَضَآءَتْ مَا حَوْلَهُۥ ذَهَبَ ٱللَّهُ بِنُورِهِمْ

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب روشن کر دیا آگ نے اس کے آس پاس کو تو زائل کر دی اللہ نے ان کی روشنی

ان کی مثال جیسے ایک شخص نے سلگائی آگ پھر جب روشن کیا اس کے گرد کو لے گیا اللہ ان کی روشنی

وَتَرَكَهُمْ فِى ظُلُمَٰتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ۝١٧ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝١٨

اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے ف۱ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹیں گے ف۲

اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں نظر نہیں آتا۔ بہرے ہیں گونگے اندھے سو وہ نہیں پھریں گے۔

منافقین کی دو مثالیں

قال تعالیٰ: ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ ٱلَّذِى ٱسْتَوْقَدَ نَارًا ... الی ... فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ﴾

ربط:...... حق تعالیٰ جب منافقین کے قبائح بیان کر چکے تو مزید ایضاح کے لیے دو مثالیں بیان کرتے ہیں تاکہ اچھی طرح ان کی سفاہت اور بے وقوفی واضح ہو جائے۔ جس کا ماقبل میں بیان ہوا۔

حق جل شانہ نے قرآن کریم میں بار بار ایمان اور ہدایت کو نور فرمایا ہے اور مردہ دلوں کے لیے حیات اور زندگی فرمایا ہے اور کفر اور ضلالت کو ظلمت اور تاریکی اور دلوں کی موت اور بربادی بتایا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے منافقین کے

ف۱ یعنی منافقوں کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اندھیری گھنگھور رات میں آگ روشن کرے جنگل میں راستہ دیکھنے کو اور جب آگ روشن ہوگئی اور راستہ نظر آنے لگا ہوا تو خدا تعالیٰ نے اس کو بجھا دیا اور وہ اندھیری رات میں جنگل میں کھڑا رہ گیا کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسے ہی منافقین نے مسلمانوں کے خوف سے کلمہ شہادت کی روشنی سے کام لینا چاہا مگر سر دست کچھ فائدہ حقیر (مثل حفظ جان ومال) اٹھانے پائے تھے کہ زور کلمہ شہادت اور منافع سب نیست ونابود ہو گئے اور مرتے ہی عذاب الیم میں مبتلا ہو گئے۔

ف۲ یعنی بہرے ہیں جو سچی بات نہیں سنتے گونگے ہیں جو سچی بات نہیں کہتے۔ اندھے ہیں جو اپنے نفع ونقصان کو نہیں دیکھتے سو جو شخص بہرا بھی ہو اور گونگا بھی ہو وہ کس طرح راہ پا سکے صرف اندھا ہو تو کسی کو پکارے یا کسی کی بات سنے تو اب ان سے ہرگز توقع نہیں کہ گمراہی سے حق کی طرف لوٹیں۔

مناسب جنہوں نے ہدایت کے عوض میں ضلالت اور گمراہی کو اختیار کیا۔ دو مثالیں بیان فرمائیں ایک ناری اور دوسری مائی اس لیے کہ نار مادہ نور ہے اور ماء یعنی پانی مادہ حیات ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾۔

مثالِ اول منافقین

مثال ان منافقین کی کوتاہ نظری اور غلط فہمی اور نور ہدایت کے بدلہ میں ظلمات ضلالت کو خرید کر خسارہ اٹھانے میں اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی پس جب آگ نے اس کے آس پاس کو خوب روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو سلب فرمالیا اور چھوڑ دیا ان کو ایسی تاریکیوں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حکم سے محمد رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی مشعل کو روشن کیا جس کی وجہ سے حق اور باطل اور ہدایت اور ضلالت خوب واضح اور روشن ہو گئے اور تمام مخلوق نے اس میں راہ پائی لیکن منافق اس وقت اندھے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے نور فطرت اور نور بصیرت کو سلب فرمالیا۔ آفتاب نبوت اور ہدایت نے اگر چہ تمام عالم کو روشن اور منور کر دیا مگر جب تک آنکھ میں نور اور بینائی نہ ہو تو آفتاب کی روشنی کیا کام آوے گی۔ کاش کہ نرے اندھے ہوتے تب بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ اندھا کسی کو پکار کر اس کی بات سن سکتا ہے مگر جب بہرا اور گونگا بھی ہو تو پھر راہ پر آنے کی کوئی امید نہیں۔ نابینا ہونے کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا، بہرا ہونے کی وجہ سے کسی کی نصیحت بھی نہیں سن سکتا اور گونگا ہونے کی وجہ سے کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا۔ اسی طرح منافقوں کو نہ عقل کی آنکھ ہے کہ جس سے خود سیدھا اور غلط راستہ پہچانیں اور دیکھ سکیں اور نہ مرشد اور کسی اللہ والے کی طرف رجوع ہے کہ وہ ان کی دستگیری کرے اور ان کا راہنما بن جائے۔ اور نہ خود حق کی طرف کان لگاتے ہیں۔ پھر ایسے شخص کی راستہ پر آنے کی کیونکر امید ہو۔ هذا توضیح ما قاله الشاه عبد القادر الدهلوی فی موضح القرآن۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں: مترجم گوید حاصل مثل آنست کہ اعمال منافقان ہمہ حبط شدند چنانکہ روشنی آں جماعۃ دور شد۔ انتہی خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ہدایت کے بعد گمراہی میں چلا جانا ایسا ہے جیسا کہ روشنی کے بعد اندھیرے میں جا پھنسنا۔

عبداللہ بن مسعود اور دیگر حضرات صحابہ کرام ؓ سے اس آیت شریفہ کی تفسیر اس طرح منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف فرما ہوئے تو کچھ لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور بعد چندے منافق بن گئے تو ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص ظلمت اور تاریکی میں تھا اس نے آگ سلگائی اس کی روشنی سے آس پاس کی تمام چیزیں نظر آنے لگیں اور جو چیزیں بچنے کے قابل تھیں۔ وہ اس کو معلوم ہو گئیں۔ یکایک وہ آگ بجھ گئی اور راستہ کے کانٹے اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ اب وہ حیران اور سرگرداں ہے کہ کس چیز سے بچے اور کس چیز سے نہ بچے۔ اسی طرح یہ منافقین پہلے سے کفر اور شرک کی ظلمتوں اور تاریکیوں میں تھے کہ اسلام لے آئے جس کی وجہ سے حلال و حرام، خیر اور شر سب معلوم ہو گیا۔ اور یہ سمجھ گئے کہ کس چیز سے بچیں اور کس چیز سے نہ بچیں۔ اسی حالت میں تھا کہ منافق ہو گیا۔ اور مثل سابق پھر ظلمات کفر میں جا پھنسا اب اس کو حلال اور حرام، خیر اور شر کی کوئی تمیز نہیں۔ (ابن کثیر)

امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ نہایت صحیح ہے اول ایمان لا کر نور حاصل کیا۔ پھر نفاق کر کے اس نور کو ضائع کیا۔ اور ہمیشہ کے لیے حیرت میں پڑ گئے۔ راہ دنیا میں جو ظلمت کی وجہ سے پریشانی لاحق ہوتی ہے اس کو اس پریشانی اور حیرت

سے کہ جو راہ آخرت میں باطنی ظلمات کی وجہ سے پیش آئے۔ وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو دریا کے ساتھ ہے۔ دنیا کی ہر پریشانی محدود اور متناہی ہے اور آخرت کی پریشانی غیر محدود اور غیر متناہی۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ لوگ کسی وقت میں بھی ایمان نہیں لائے۔ ابتداء ہی سے منافق تھے کسی وقت بھی دل سے ایمان نہیں لائے۔ یہ لوگ از اول تا آخر منافق رہے تو اس صورت میں آیت کا مطلب وہ ہوگا جو حضرت ابن عباس اور ابو العالیہ اور ضحاک اور قتادہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ منافقین نے محض زبان سے لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا اور محض ظاہراً اسلام لائے تو ان کو یہ نفع ہوا کہ اس کلمہ طیبہ کی روشنی میں دنیا میں خوب امن سے رہے۔ جان و مال محفوظ رہا۔ مسلمانوں کے ساتھ مال غنیمت میں شریک رہے۔ جب تک زندہ رہے کلمہ شہادت کی روشنی سے یہ دنیوی منافع حاصل کرتے رہے۔ مرتے ہی ان کا یہ نور جاتا رہا اور عقاب سرمدی کے ظلمات میں جا پھنسے۔ (ابن کثیر) کلمہ توحید اور کلمہ شہادت اگر اخلاص سے کہا جائے تو سبحان اللہ نور علی نور ہے۔ لیکن یہ کلمہ اگر نفاق سے بھی کہا جائے تب بھی اس میں ایک نور ہے اگرچہ وہ اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے ناتمام اور ناکافی ہے۔ اس لیے کہ یہ کلمہ سراسر حق ہے اگرچہ منافق اس کو اپنی حماقت سے حق نہ سمجھے۔ اور ہر حق میں نور اور روشنی ہے۔ بہرحال منافق کو اس کلمہ طیبہ کے اعتراف و اقرار کی وجہ سے ایک درجہ کا نور ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ ظلمت اور تاریکی جو کچھ ہے وہ نفاق کی وجہ سے ہے۔ اور اس کلمہ حق کی روشنی سے دنیاوی فوائد اور منافع حاصل کیے جن کو حق جل شانہ نے ماحولہ سے تعبیر فرمایا۔ ہر منافق اور خود غرض کا طریق یہی ہے کہ ہر وقت اس کی نظر ماحول پر رہتی ہے۔ اسی طرح ان منافقین نے ظاہری ماحول کو دیکھ کر فقط زبانی قول پر اکتفا کیا اور بجائے مغز کے خول کو کافی سمجھا اور یہ نہ سوچا کہ ظاہری ماحول کو دیکھنا اَحول (بھینگا) کا کام ہے۔ چونکہ دنیاوی منافع چند روز ہوتے ہیں اس لیے اس کو تشبیہ اس جلانے والی آگ سے دی گئی جو تھوڑی دیر میں بجھ گئی اور اس کا نفع جاتا رہا اور دائمی حیرت و حسرت نے اس کو آگھیرا۔ ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾۔ امام غزالی قدس اللہ سرہ مشکوٰۃ الانوار میں فرماتے ہیں کہ نور اس کو کہتے ہیں جو بذاتہ اور بنفسہ ظاہر ہو اور دوسرے کے لیے مظہر ہو۔ علامہ سہیلی روض الانف، ص: ۱۲۶ میں فرماتے ہیں کہ ضیاء اس روشنی کو کہتے ہیں جو نور سے منتشر ہو۔ نور، ضیاء کے لیے اصل مبداء اور سرچشمہ ہے یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ﴿جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا﴾ میں شمس کو ضیاء اور قمر کو نور فرمایا۔ اس لیے قمر کی روشنی میں وہ انتشار اور پھیلاؤ نہیں جو آفتاب کی روشنی میں ہے اور حدیث میں ہے کہ الصلوة نور والصبر ضیاء نماز نور ہے اور صبر ضیاء ہے۔ نماز چونکہ عمود اسلام ہے اور فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے اس لیے اس کو نور فرمایا کہ یہی نماز اس صبر کی اصل اور جڑ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ضیاء فرمایا ہے۔ فحشاء اور منکر سے بچنا ہی صبر کا سرچشمہ ہے صبر کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفس کو خدا کی اطاعت پر روکنا اور اس کی معصیت سے بچانا۔ اس لیے صبر اسلام اور ایمان کے اکثر شعبوں کو حاوی اور شامل ہے لہٰذا صبر میں بہ نسبت نماز کے بہت زائد وسعت اور انتشار ہے جو نماز کی محافظت اور پابندی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے نماز کو نور اور صبر کو ضیاء فرمایا اور چونکہ نور اصل اور مبداء ہے ضیاء اس کے تابع ہے۔ اس لیے حق جل وعلا پر نور کا اطلاق درست ہے۔ كما قال الله تعالیٰ: ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾) اور ضیاء کا اطلاق جائز نہیں۔ اس لیے کہ اس کا نور تمام روشنیوں کی اصل ہے اس کا نور کسی کے تابع نہیں۔ آہ کلامہ

حکماء نے نور اور ضیاء میں یہ فرق کیا ہے کہ جس روشنی میں حرارت اور گرمی ہو اس کو ضیاء کہتے ہیں اور جس روشنی میں ٹھنڈک ہو اس کو نور کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی آسان اور نرم شریعت کو نور فرمایا کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾ (بے شک آیا تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان نور اور ایک روشن کتاب) اور شریعت موسویہ کو احکام شاقہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ضیاء فرمایا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً﴾ بیشک دی ہم نے موسیٰ کو حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتاب اور تیز روشنی اور اسی وجہ سے کہ نماز میں آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور صبر میں حرارت اور گرمی ہے نماز کو نور اور صبر کو ضیاء فرمایا۔

اور اس مقام پر حق تعالیٰ شانہ نے ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ فرمایا اور "ذَهَبَ اللّٰهُ بضوءهم" نہ فرمایا اس لیے کہ مقصد یہ ہے کہ نور ان سے بالکلیہ زائل ہو گیا اور روشنی کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ ہر طرف سے ظلمت اور تاریکی نے ان کو آگھیر الہٰذا اگر اس مقام پر بجائے "ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ" کے "ذَهَبَ اللّٰهُ بضوءهم" کہا جاتا تو یہ معنی ہوتے کہ اللہ نے ان کی ضیاء یعنی نور کی شدت اور اس کے انتشار کو زائل کر دیا۔ اور اصل نور باقی رہ گیا۔ اور یہ معنی مقصود کے خلاف ہیں۔ اس لیے کہ مقصود تو یہ ہے کہ نور ان سے بالکلیہ زائل ہو گیا۔ اور یہ مقصد نہیں کہ اصل نور تو باقی رہا محض اس کی شدت اور اس کی تیزی زائل ہو گئی۔ فافهم ذٰلك فانه دقيق ولطيف۔

ابتداء آیات میں چونکہ تذکرہ نار کا تھا اس لیے بظاہر اس کا اقتضاء یہ تھا کہ "ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ" میں بجائے نور کے نار کا ذکر کیا جاتا اور اس طرح کہا جاتا "ذَهَبَ اللّٰهُ بِنَارِهِمْ" (اللہ نے ان کی آگ کو بجھا دیا) لیکن بجائے نار کے نور کو اس لیے ذکر کیا گیا کہ نار میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک نور اور ایک حرارت اور احراق (جلانا) لہٰذا اشارہ اس طرف ہے کہ اس نار میں سے نور (روشنی) کو تو سلب کر لیا گیا اور حرارت اور احراق کو باقی چھوڑ دیا گیا۔

﴿وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ﴾ اور چھوڑا ان کو ایسی تاریکیوں میں کہ کسی شئے کو بھی نہیں دیکھتے۔ حدیث میں ہے کہ "الايمان بضع وسبعون شعبة" ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایمان کا ہر شعبہ ایک نور اور مشعل ہے۔ علیٰ ہذا کفر اور نفاق کا ہر شعبہ ظلمت اور تاریکی ہے پس کفر اور نفاق کے شعبوں کے بقدر یہ لوگ ظلمات اور تاریکیوں میں مبتلا ہیں۔ ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پس یہ لوگ اب کسی صورت سے حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ اس لیے کہ جب ان کی روشنی چھین لی گئی اور اندھیروں میں چھوڑ دیئے گئے تو ایسے مدہوش ہو گئے کہ سارے حواس مختل ہو گئے لہٰذا اب نہ حق کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں اور نہ زبان سے کسی سے پوچھ سکتے ہیں پس ضائع کردہ نور ہدایت کی طرف کیسے لوٹ سکتے ہیں۔

تنبیہ: ...... یہ مثال ان منافقین کی ہے جن کے دلوں میں نفاق خوب راسخ ہو چکا ہے اب وہ کسی طرح ہدایت کی طرف رجوع کرنے والے نہیں۔ جیسا کہ ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ سے معلوم ہوتا ہے اور دوسری آنے والی مثال ان منافقین کی ہے جو ابھی متردد اور مذبذب ہیں۔ کبھی اسلام کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کبھی کفر کی طرف حیران ہیں کہ کیا کریں۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم

یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے زور سے مینہ پڑ رہا ہو آسمان سے اس میں اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی دیتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں

یا جیسے مینہ پڑتا آسمان سے اس میں اندھیرے اور گرج اور بجلی، ڈالتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں

مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ⑲ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ

مارے کڑک کے موت کے ڈر سے اور اللہ احاطہ کرنے والا ہے کافروں کا ف۱ قریب ہے کہ بجلی اچک لے

مارے کڑک کے ڈر سے موت کے اور اللہ گھیر رہا ہے منکروں کو۔ قریب ہے بجلی کہ اچک لے

أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ

ان کی آنکھیں جب چمکتی ہے ان پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ

ان کی آنکھیں جس بار چمکتی ہے ان پر چلتے ہیں اس میں اور جب اندھیرا پڑا کھڑے رہے اور اگر چاہے

لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ⑳ ع ۲

تو لیجائے ان کے کان اور آنکھیں بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ف۲

اللہ لے جاوے ان کے کان اور آنکھیں۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

منافقین کی دوسری مثال

قَالَ تَعَالَىٰ: ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ... إلى... إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

یا مثال ① ان منافقین کی گمراہی کو ہدایت کے بدلہ خرید کر خسارہ اٹھانے میں ایسی ہے جیسے آسمان سے زوردار پانی پڑ رہا ہو۔ ﴿مِّنَ السَّمَاءِ﴾ کا لفظ بڑھانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بارش آسمان کے تمام اطراف اور جوانب کو محیط

ف۱ دوسری مثل ان منافقین کی ان لوگوں کی سی ہے کہ ان پر آسمان سے مینہ شدت کے ساتھ پڑ رہا ہو اور کئی طرح کی تاریکی اس میں ہو۔ مثلاً بادل بھی تو بر تو بہت لطیف اور کثیف ہے اور قطرات ابری بھی بہت کثرت اور ہجوم ہے اور رات بھی اندھیری ہے اور تاریکی شدید کے ساتھ بجلی کی کڑک اور چمک بھی ایسی ہولناک ہے کہ وہ لوگ موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں کہ آواز کی شدت سے دم نہ نکل جائے۔ اسی طرح پر منافقین تکالیف وتہدیدات شرعیہ کو سن کر اور اپنی خواری و رسوائی کو دیکھ کر اور اغراض و مصالح دنیوی کو خیال کر کر عجب کشمکش اور خوف و پریشانی میں مبتلا ہیں اور اپنی بیہودہ تدبیروں سے اپنا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ کی قدرت سب طرف سے کفار کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس کی گرفت وعذاب سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتے۔

ف۲ حاصل یہ ہے کہ منافقین اپنی ضلالت اور ظلماتی خیال میں مبتلا ہیں لیکن جب غلبہ نور اسلام اور ظہور معجزات آیہ دیکھتے ہیں اور تاکید وتہدید شرعی سنتے ہیں تو متنبہ ہو کر ظاہر میں صراط مستقیم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جب کوئی اذیت ومشقت دنیوی نظر آتی ہے تو کفر پر اڑ جاتے ہیں جیسے شدت باراں اور تاریکی میں بجلی چمکی تو قدم رکھ لیا پھر کھڑے ہو گئے مگر چونکہ اس کو سب کا علم ہے اور اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں تو ایسے حیلوں اور تدبیروں سے کیا کام نکل سکتا ہے فائدہ سورت کے اول سے یہاں تک تین طرح کے لوگوں کا ذکر فرمایا، اول مومنوں کا پھر کافروں کا (جن کے دلوں پر مہر ہے کہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے) تیسرے منافقوں کا (جو دیکھنے میں مسلمان ہیں مگر دل ان کا ایک طرف نہیں)۔

① حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ فرماتے ہیں: مترجم گوید حاصل مثل آں ست کہ منافقان در ظلمت نفسانی افتادہ اند و چوں مواعظ بلیغہ شنوند فی الجملہ ایشاں را تنبیہ میشود و آں فائدہ نکند مانند مسافراں کہ در شب تاریک و ابر حیران باشند و در برق دو سہ قدم بروند و باز نشینند۔ واللہ اعلم۔

ہے جس طرح پورے آسمان کو سماء کہتے ہیں اسی طرح آسمان کی جانب کو بھی سماء کہتے ہیں۔ نیز ﴿مِّنَ السَّمَآءِ﴾ کے لفظ میں ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ اس بارش کوئی روک نہیں سکتا۔ کس کی مجال ہے کہ آسمان سے آنے والی چیز کو روک سکے۔ اس میں اندھیرے اور گرج اور بجلی ہے۔ جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں۔ خوف کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہے کہ انگلیوں کے پورے نہیں بلکہ پوری انگلیاں اپنے کانوں کے انتہائی سوراخ تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ ہولناک آواز کی وجہ سے موت کے ڈر سے اور اس خوف کی شدت میں یہ بھی نہیں سمجھتے کہ اللہ تو کافروں کا احاطہ کرنے والا ہے۔ کانوں میں انگلیاں دینا اس کے عذاب سے کسی طرح نہیں بچا سکتا۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اچک لے جب وہ برق ان کے لیے چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں وہ چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو حیران کھڑے رہ جاتے ہیں یعنی دین اسلام بمنزلہ باران رحمت کے ہے جو مردہ دلوں کے لیے آب حیات سے کہیں بڑھ کر ہے اور سراسر رحمت ہی رحمت اور نعمت ہی نعمت ہے۔ مگر ابتداء میں کچھ محنت اور سختی ہے جیسے بارش رحمت ہی رحمت ہے اور مردہ زمین کی حیات اور زندگی ہے۔ مگر اول میں کچھ کڑک اور بجلی بھی ہے۔ منافق اول کی سختی سے ڈر گئے اور وہ برائے نام مصائب جو حقیقت میں ان کے تزکیہ نفس کے لیے تھیں ان سے گھبرا گئے۔ اور جس طرح بجلی کی چمک سے روشنی پیدا ہو کر راستہ نظر آجاتا ہے اور بادل کی کڑک سے دل کانپ جاتا ہے۔ اسی طرح منافق جب دنیوی منافع (جیسے جان ومال کی حفاظت، مال غنیمت میں سے حصہ ملنا) ان منافع پر نظر کرتا ہے تو اسلام کی طرف جھک جاتا ہے اور مثلاً جب جہاد کی سختی پر نظر کرتا ہے تو پھر اسلام سے بدک جاتا ہے۔ بہر حال جس طرح بجلی میں کبھی روشنی اور اجالا اور کبھی تاریکی اور اندھیرا۔ اسی طرح منافق کے دل میں کبھی اقرار ہے اور کبھی انکار۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ﴾

الحاصل:...... ان آیات شریفہ میں دین اسلام کو باران رحمت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور ان کے شبہات اور نفسانی اغراض کو ظلمات کے ساتھ اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والی آیات کو رعد کے ساتھ اور فتوحات اسلام اور غلبہ دین حق کو برق کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ جب عذاب سے ڈرانے والی آیتیں نازل ہوتی ہیں تو یہ منافق ان کو سننا نہیں چاہتے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں اور جب کبھی غلبہ اسلام کی برق کوندنے لگتی ہے اور اسلام کا نور چمکنے لگتا ہے تو اسلام کی طرف چلنے لگتے ہیں اور جب اغراض نفسانی کی ظلمت اور تاریکی کا غلبہ ہوتا ہے مثلاً کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم آتا ہے تو پھر اسلام کی طرف چلنے سے رک جاتے ہیں۔ ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اور اگر خدا چاہتا تو بغیر بجلی اور کڑک ہی کے ان کے کان اور آنکھیں سب ہی لے جاتا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ کسی سبب کا محتاج نہیں اور نہ اس کے لیے کوئی مانع ہے۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ ابھی اس فریق کو پہلے فریق کی طرح بالکل اندھا اور بہرہ نہیں بنایا۔ اس فریق سے ابھی ایمان کی امید بالکل قطع نہیں ہوئی ہے۔ شاید یہ ایمان لے آئیں۔ بخلاف پہلے فریق کے کہ جن کی مثال ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ میں ذکر کی گئی۔ ان کے ہدایت پر آنے کی کوئی امید نہیں اس لیے کہ اللہ نے ان کے نور کو بالکل سلب فرمالیا کما قال تعالیٰ: ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ اور وہ بہرے اور گونگے اور اندھے ہیں ﴿فَهُمْ

﴿لَا يَرْجِعُونَ﴾۔ وہ گمراہی سے ہدایت کی طرف لوٹنے والے نہیں اسی وجہ سے اس فریق کے لیے ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ﴾ نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اللہ نے ان کے نور فطرت کو ابھی بالکل زائل نہیں فرمایا۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾

اے لوگو بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ

لوگو بندگی کرو اپنے رب کی جس نے بنایا تم کو اور تم سے اگلوں کو شاید تم پرہیزگاری پکڑو

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ

جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے

جس نے بنا دیا تم کو زمین بچھونا اور آسمان عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے

بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

اس سے میوے تمہارے کھانے کے واسطے سو نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو ف۱

اس سے میوے کھانا تمہارا۔ سو نہ ٹھہراؤ اللہ کے برابر کوئی اور تم جانتے ہو۔

تعلیم توحید

قَالَ تَعَالٰی: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي ... الی ... وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

ربط:...... یہاں تک مومنین اور کافرین اور منافقین کے احوال علیحدہ علیحدہ بیان فرمائے اب اس آیت میں علی العموم سب کو خطاب فرماتے ہیں۔ نیز وہ ہدایت جس کے لیے یہ کتاب نازل کی گئی وہ دو اصولوں پر منقسم ہے ایک توحید اور دوسرے رسالت۔ اس لیے اول توحید اور عبادت کا مضمون ارشاد فرماتے ہیں جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی جڑ ہے۔ یعنی یہ کتاب متقین کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے۔ لیکن تقویٰ کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ صرف خدائے وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرو اسی وجہ سے ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا﴾ کے بعد ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ شروع سورت میں اس کتاب کا متقین کے لیے موجب ہدایت ہونا بیان فرمایا تھا اب ان آیات میں تحصیل تقویٰ کا طریقہ بتلاتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

اے لوگو اگر واقع میں تم انسان ہو اور اپنی انسانیت کی حفاظت چاہتے ہو تو اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا یعنی تم کو اور تمہارے اصول (آباء واجداد) کو پردۂ عدم سے نکالا اور وجود کا عجیب وغریب خلعت تم کو پہنایا تاکہ تم اس غیر مترقب نعمت اور عمدہ مرحمت کا شکر کرو اور متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔ متقی بننے کا طریقہ یہی ہے کہ ہر وقت تم اس امر کو پیش نظر رکھو کہ وہ تمہارا پروردگار ہے ایک لمحہ اور ایک لحظہ کے لیے تم اس کی تربیت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتے

ف۱ اب سب بندوں کو مومن ہوں یا کافر یا منافق خطاب فرما کر توحید جناب باری سمجھائی جاتی ہے جو ایمان کے لئے اصل الاصول ہے۔ خلاصہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو پیدا کیا اور تمہاری ضروریات اور کل منافع کو بنایا۔ پھر اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو معبود بنانا جو تم کو نہ نفع پہنچا سکے نہ مضرت (جیسے بت) کس قدر حماقت اور جہالت ہے حالانکہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس جیسا کوئی نہیں۔

اسی نے تم کو اور تمہارے آباء واجداد کو جن سے تم پیدا ہوئے ہو محض اپنی قدرت سے کتم عدم سے نکال کر وجود کا خلعت پہنایا ہے۔ اپنے امکان کو سوچو تا کہ اس کا وجوب معلوم ہو۔ اپنی عاجزی اور درماندگی کو سوچو تو اس کا قادر مطلق ہونا معلوم ہو اپنی ذلت اور خواری کو سوچو تو اس کا عزیز مطلق اور ذوالجلال والاکرام ہونا معلوم ہو۔ اپنے مملوک ہونے کو سمجھو تا کہ اس کا مالک ہونا سمجھ میں آئے۔ وعلی ہذا القیاس غایت محبت اور نہایت تعظیم واجلال کے ساتھ انتہائی تذلل کا نام عبادت ہے۔ مطلق محبت اور مطلق تعظیم اور مطلق تذلل کا نام عبادت نہیں۔ اسی وجہ سے اولاد کی محبت اور والدین اور اساتذہ کی تعظیم اور ان کی تواضع عبادت نہیں کہلائے گی۔ تمام عالم عبادت ہی کے لیے پیدا کیا گیا اور سب سے پہلے انبیاء ﷺ نے اسی عبادت کی دعوت دی۔ حضرت نوح، ہود، صالح، اور شعیب وغیرہم علیہم الصلوۃ والسلام نے یہی فرمایا۔ ﴿اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ ایک اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وقال تعالیٰ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (آپ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی بھیجتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کرو۔) اس لیے اب آئندہ آیت میں معرفت معبود کا طریقہ بتاتے ہیں کہ معبود وہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنایا۔ الخ ﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ وہ پاک ذات کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس پانی سے تمہارے کھانے کے لیے قسم قسم کے کچھ پھل اور میوے نکالے پس خدا کے لیے اس کے مقابل اور مماثل ہمتا اور شریک نہ بناؤ اور حالانکہ تم خوب جانتے ہو۔ کہ تمہارا اور ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا صرف ایک وحدہ لاشریک لہ ہے اور ان انعامات اور انتظامات میں کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں پس ان انعامات کے شکر میں خاص اسی کی عبادت کرو اور کسی دوسرے کو شریک نہ کرو یعنی یہ سارا عالم بمنزلہ ایک مکان کے ہے۔ آسمان اس کی چھت ہے اور زمین اس کا فرش ہے اور شمس وقمر اور نجوم وکواکب اس گھر کے شمع اور چراغ ہیں۔ قسم قسم کے پھل اور الوان نعمت اس کے دسترخوان پر چنے ہوئے ہیں۔ عالم کے تمام شجر وحجر اور تمام چرند پرند انسان کی خدمت کے لیے حاضر اور مسخر ہیں اور یہ مکان اس کے رہنے کے لیے ہے پس جس خدا نے یہ تمام نعمتیں پیدا کیں وہی قابل پرستش ہے جب ان نعمتوں کے پیدا کرنے میں اس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں تو اس کی عبادت اور بندگی میں دوسروں کو کیوں شریک کرتے ہو۔

ابر و باد ومہ وخورشید وفلک درکارند — تا تو نانے بکف آری وبغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ وفرماں بردار — شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

خلاصہ کلام یہ کہ جو باران رحمت آسمان سے برس رہی ہے وہ بندہ کی زندگی اور حیات ہے اور رزق اس کی غذا ہے عاقل اور دانا کا کام یہ ہے کہ باران رحمت کو نعمت عظمیٰ سمجھے نہ یہ کہ اس سے بھاگے۔ اسی طرح اہل ایمان اور اہل اخلاص کو چاہئے کہ ہدایت خداوندی کی جو بارش آسمان سے ہو رہی ہے اس کو اپنی روحانی زندگی کا آب حیات سمجھیں۔ منافقوں کی طرح نہ اس سے بھاگیں اور نہ کانوں میں انگلیاں دیں۔ مسند احمد بن حنبل میں باسناد حسن حارث اشعری سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ جل شانہ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ چیزوں کے متعلق حکم فرمایا کہ ان پر خود بھی عمل کریں اور بنی

اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم کریں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل کو حکم کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے یحییٰ علیہ السلام ان احکام کا یا تو خود آپ بنی اسرائیل کو جلد حکم کریں یا مجھ کو اجازت دیں کہ میں بنی اسرائیل کو ان پر عمل کرنے کا حکم کروں۔ یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ نے سبقت کی تو مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ کوئی عذاب نہ آجائے۔ یحییٰ علیہ السلام نے فوراً ہی بنی اسرائیل کو مسجد اقصیٰ میں جمع فرمایا اور منبر پر تشریف فرما ہوئے اور یہ کہا کہ اللہ نے مجھ کو پانچ چیزوں کا حکم دیا ہے کہ خود بھی ان پر عمل کروں اور تم کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم کروں۔ پہلی بات یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے اپنے خالص مال سے بغیر کسی کی شرکت کے ایک غلام خریدا وہ غلام دن میں جو کچھ کماتا ہے وہ بجائے آقا کے کسی اور کو دے دیتا ہے کیا کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو۔ حاشا ہرگز نہیں۔ اسی طرح سمجھ لو کہ حق تعالیٰ ہی تمہارا خالق اور رازق اور مالک ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ (بقیہ حدیث کے لیے تفسیر ابن کثیر کی طرف رجوع کریں)

ف:...... امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت شریفہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اگر ہزار اطاعت اور عبادت بھی کرے تو ذرہ برابر ثواب کا مستحق نہیں اس لیے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبادت اس لیے واجب ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اول تو تم کو پیدا کیا اور پھر بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ لہٰذا اس منعم حقیقی کا شکر بذریعہ عبادت کے تم پر واجب اور لازم ہے۔ بادشاہ کے انعام و اکرام کے بعد اگر کوئی بادشاہ کا شکر کرے تو اس شکر کی وجہ سے وہ شخص اپنے کو کسی انعام کا مستحق نہیں سمجھتا بلکہ محض فریضہ شکر سے عہدہ برآ ہو جانے کو غنیمت سمجھتا ہے اور یہ خوب سمجھتا ہے کہ میرا یہ شکر بادشاہ کے انعام و احسان کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کے شکر کو سمجھو کہ بندہ کتنی ہی عبادت کرے۔ اس کی ایک نعمت کا بھی شکر نہیں ادا کر سکتا۔ استحقاق تو در کنار۔ مگر اس نے محض اپنی رأفت و رحمت اور اپنے فضل عمیم سے ہماری ناقص عبادتوں پر بھی اجر اور ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔ آمین۔

حق تعالیٰ شانہ نے اس آیت میں عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ معبود کی معرفت کے پانچ طریقے بتلائے یا یوں کہو کہ پانچ قسم کے دلائل بیان کیے دو تو نفس کے متعلقات میں سے ہیں اور تین آفاق سے متعلق ہیں اول ﴿خَلَقَكُمْ﴾ فرمایا کہ تم اپنے نفسوں میں غور کرو کہ تم کو عدم کے بعد وجود کی نعمت عطاء کی۔ دوم یہ کہ تمہارے آباؤ اجداد کو وجود عطا فرمایا۔ اور نیست سے ہست کیا جس کو ﴿وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ سے ذکر فرمایا۔ سوم یہ کہ زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا۔ چہارم یہ کہ آسمان کو تمہارے لیے چھت بنایا۔ پنجم یہ کہ آسمان اور زمین کی شرکت سے تمہارے رزق کے لیے قسم قسم کے پھل اور میوے پیدا کیے۔ پس جس خداوند ذوالجلال نے یہ عجیب و غریب نعمتیں تم کو عطاء کی ہیں اس سے تم اس کی قدرت و عظمت کا اندازہ لگالو۔ اور ہمہ تن اس کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو۔ کیونکہ عبادت خالص اسی منعم حقیقی کا حق ہے۔

غرض یہ کہ "اعبدوا" اس سورت میں پہلا حکم ہے اور ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ پہلی نہی ہے اور یہی اسلام کی سب سے پہلی تعلیم ہے کہ صرف خدا کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور کسی کو اس کا شریک اور مثل نہ جانو۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ استحقاق عبادت کے وجوہ اور دلائل بھی بیان کیے جو سب کے سب فطری اور عقلی ہیں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو اتارا ہم نے اپنے بندہ پر تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی ف۱ اور بلاؤ

اور اگر ہو تم شک میں اس کلام سے جو اتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس قسم کی اور بلاؤ

شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۳ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا

اس کو جو تمہارا مددگار ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو ف۲ پھر اگر ایسا نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو پھر بچو

جن کو حاضر کرتے ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر نہ کرو اور البتہ نہ کرو گے تو بچو

النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝۲۴

اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار کی ہوئی ہے کافروں کے واسطے ف۳

آگ سے جس کی چھپیاں ہیں آدمی اور پتھر تیار ہے منکروں کے واسطے۔

اثباتِ رسالت نبی کریم علیہ افضل الصلوۃ والتسلیم بضمنِ اثبات حقیقت قرآنِ عظیم

قَالَ تَعَالٰى: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا ... الى ... اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾

ربط:......گزشتہ آیات میں عبادت اور معرفت معبود کے طریقے بتلائے اور محکم دلائل سے وجود صانع اور اس کی توحید کو ثابت کیا اور شرک کو باطل کیا اب ان آیات میں دلائل نبوت بیان کرتے ہیں جس سے آنحضرت ﷺ کی نبوت ورسالت کی معرفت حاصل ہو۔ اور معرفت نبوت کا طریقہ معجزہ ہے اس لیے ان آیات میں نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور رسالت ثابت کرنے کے لیے آپ کے سب سے اعلیٰ اور افضل معجزہ کو ذکر کرتے ہیں۔ تاکہ آپ کی نبوت ورسالت میں منکرین کو کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

ربط دیگر:...... علاوہ ازیں گزشتہ آیات میں عبادت کا حکم فرمایا تھا اور ظاہر ہے کہ اللہ کے نزدیک وہی عبادت مقبول ہے جو اس کی نازل کی ہوئی کتاب سے معلوم ہو لہٰذا آئندہ آیات میں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل ذکر فرمائی کہ اگر تم

ف۱ یہ بات گذر چکی ہے کہ اس کلام پاک میں شبہہ کی وجہ یا یہ ہو سکتی تھی کہ اس کلام میں کوئی بات کھٹکے کی ہو سو اس کے دفعیہ کے لئے لاریب فیہ فرما چکے ہیں اور یا یہ صورت ہو سکتی ہے کہ کسی کے دل میں اپنی کوتاہی فہم یا زیادت عناد سے شبہ پیدا ہو تو یہ صورت چونکہ ممکن بلکہ موجود تھی تو اس کے رفع کرنے کی عمدہ اور سہل صورت بیان فرمادی کہ اگر تم کو اس کلام کے کلام بشری ہونے کا خیال ہے تو تم بھی تو ایک سورت ایسی فصیح وبلیغ تین آیات کی مقدار بنا دیکھو اور جب تم باوجود کمال فصاحت وبلاغت چھوٹی سی سورت کے مقابلہ سے بھی عاجز ہو جاؤ تو پھر سمجھ لو کہ یہ اللہ کا کلام ہے کسی بندہ کا نہیں اس آیت میں آپ کی نبوت کو مدلل فرمادیا۔

ف۲ یعنی اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ بندہ کا کلام ہے تو جس قدر قابل اور شاعر اور فصحاء وبلغاء موجود ہیں خدائے تعالیٰ کے سوا سب سے مدد لے کر ہی ایک چھوٹی سی سورت ایسی بنالاؤ یا یہ مطلب ہے کہ خداوند کریم کے سوا تمہارے جتنے معبود ہیں سب سے تضرع اور گریہ وزاری کے ساتھ دعا مانگو کہ اس مشکل بات میں تمہاری کچھ مدد کریں۔

ف۳ پھر اس پر بھی اگر تم ایسی ایک سورت نہ بنا سکو اور یہ بات یقینی ہے کہ ہرگز نہ بنا سکو گے تو پھر ڈرو اور بچو نار دوزخ سے جو سب آگوں سے تیز ہے اس کا ایندھن کافر اور پتھر ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو اور بچنے کو صورت یہی ہے کہ کلام الٰہی پر ایمان لاؤ اور وہ آگ کافروں کے واسطے تیار کی ہوئی ہے جو کہ قرآن شریف اور نبی کریم کو جھوٹا بتلاتے ہیں۔

اس کتاب کو کتاب اللہ نہیں سمجھتے بلکہ معاذ اللہ اسے محمد ﷺ کی تصنیف اور بنائی ہوئی کتاب سمجھتے ہو تو اس کتاب کی ایک سورت ہی کے مثل ایک سورۃ بنا کر پیش کرو۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾۔ اور اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں ذرہ برابر کوئی شک اور تردد نہیں جیسا کہ ابتداء سورت میں ارشاد ہوا: ﴿ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ لیکن اگر تم قصور فہم یا عناد کی وجہ سے اس کتاب کے بارہ میں جس کو ہم نے اپنے بندہ پر بتدریج نازل کیا۔ تم کسی شک اور خلجان میں مبتلا ہو گئے تو تم بھی اسی طرح ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت جو فصاحت وبلاغت اور ہدایت وارشاد اور علوم اور معارف میں اس کتاب کے مماثل اور مشابہ ہو لے آؤ قرآن کریم کا وقتاً فوقتاً ضرورت اور واقعات کے لحاظ سے بتدریج نازل ہونا یہی مشرکین کے شک کا زیادہ سبب تھا کہ اگر یہ کلام الٰہی ہے تو تورات وانجیل کی طرح دفعۃً کیوں نہیں نازل کیا گیا کما قال تعالیٰ: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً﴾ تدریج تو بشر کے کلام میں ہوتی ہے جیسا کہ شعراء اور خطباء وقتاً فوقتاً حسب موقعہ اور ضرورت اشعار اور خطبات لکھتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تم ان کافروں سے یہ کہہ دو کہ اگر تم اس زعم فاسد اور خیال باطل کی وجہ سے اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں متردد ہو تو تم بھی اسی طرح ایک ہی [1] مرتبہ اس جیسی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت بنا لاؤ جو فصاحت وبلاغت اور حسن معانی اور لطائف اور احکام معاش ومعاد میں قرآن کا نمونہ ہو اور یہ قرآن اگرچہ بتدریج نازل ہوا ہے مگر اول تا آخر مربوط اور مسلسل ہے۔

کلام عرب میں تحقیق اور یقین کے لیے کلمہ اِذَا اور شک اور تردد۔ ظن اور تخمین کے لیے کلمہ اِن مستعمل ہوتا ہے اس مقام پر بجائے۔ "وَإِذَا كُنتُمْ فِي رَيْبٍ" کے ﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ﴾ میں کلمہ اِن استعمال کرنے میں بظاہر اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ابھی اس میں بھی تردد ہے کہ تم کو اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں واقعی شک اور تردد ہے۔ یا دل سے تو تم اس کو کتاب الٰہی سمجھتے ہو اور ظاہر میں محض عناد کی وجہ سے اس کے کتاب الٰہی ہونے میں شک اور تردد ظاہر کرتے ہو۔ اور ریب کی تنوین تحقیر کے لیے ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا شبہ کوئی قوی نہیں بلکہ ایک نہایت معمولی اور مہمل اور حقیر شبہ ہے جو سراسر قصور فہم اور عناد پر مبنی ہے۔ اس عجیب وغریب بے مثل اور بے نظیر کتاب میں بھی اگر تردد اور شک کی گنجائش ہے تو پھر توریت وانجیل کے کتاب الٰہی تسلیم کرنے کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا۔

جس شپرہ چشم کو عین نصف النہار کے وقت نور آفتاب میں شک اور تردد لاحق ہوتا ہو۔ وہ شب دیجور میں کواکب اور نجوم کا نور کہاں تسلیم کر سکتا ہے رہا وید سو آج تک اس کا بھید کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ اس کی کیا مراد ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔ لہٰذا جس کتاب کا کوئی مفہوم ہی معلوم اور متعین نہ ہوا اس کے بارہ میں شک اور تردد کا سوال ہی عبث ہے علیٰ عبدنا (اپنے خاص بندے پر) اس سے سرور عالم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔ اس اضافت میں یعنی ہمارے عبد کہنے میں) ایک تو آں حضرت ﷺ کی تعظیم وتکریم کی طرف اشارہ ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔

لا تدعنی الا بیا عبدھا فانه اشرف اسمائی

---

[1] اشارۃ الی ان الامر بالاتیان فی قولہ تعالیٰ فاتوا بسورۃ من مثلہ لا یقتضی التکرار ۱۲ عفا عنہ

مت پکارا کر مجھ کو مگر اس محبوب کا عبد اور غلام کہہ کر میرا یہ نام سب ناموں سے افضل اور بہتر ہے۔

اگر یکبار گوید بندۂ من از عرش بگذرد خندۂ من

دوسرے اس اضافت میں آپ کے مطیع ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ ہمارے نہایت ہی مطیع اور فرمانبردار بندہ ہیں۔ اور علیٰ عبدنا میں کلمہ علیٰ کے لانے میں جو کہ کلام عرب میں استعلاء۔ غلبہ اور احاطہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ اس طرف اشارہ ہے کہ کلام الٰہی کے انوار و برکات اور وحی ربانی کے تجلیات خدا کے اس خاص بندہ کو ہر طرف اور ہر جانب سے احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

﴿بِسُوْرَةٍ﴾. لفظ سورت قرآن کریم کی ہر سورت کو شامل ہے خواہ وہ طویل ہو یا قیصر جس طرح قرآن کی طویل سورتیں معجز ہیں اسی طرح چھوٹی سورتیں جیسے سورۂ اخلاص اور سورۂ کوثر اور سورۂ عصر بھی معجز ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ لوگ اگر فقط سورۂ والعصر میں تدبر اور تامل کریں تو ان کے لیے کافی اور وافی ہے۔ آہ۔ بلکہ قرآن کا جملہ تامہ معجز ہے۔ تمام عالم کے فصحاء اور بلغاء مل کر بھی اگر چاہیں کہ قرآن کریم جیسا ایک جملہ بنالائیں تو ناممکن اور محال ہے۔

اول حق تعالیٰ شانہ نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمام جن اور انس مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔ جیسا کہ سورہ اسراء ① میں ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ تمام قرآن کا مثل اگر نہیں لا سکتے تو دس سورتیں ہی اس جیسی بنا کر پیش کر دو۔ جیسا کہ سورہ ہود ② میں ہے۔ اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت اس سورت کے مماثل بنالاؤ جیسا کہ سورہ یونس ③ میں ہے اور یہ تمام اعلانات مکہ مکرمہ ہی میں کیے گئے اس لیے کہ یہ تمام سورتیں مکی ہیں یعنی سورہ اسراء جس میں تمام قرآن کے مثل لانے کا ذکر ہے اور سورۂ ہود جس میں دس سورتوں کے لانے کا اور سورۂ یونس جس میں ایک سورت کے لانے کا ارشاد ہے یہ تمام سورتیں مکہ ہی میں نازل ہوئیں۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں پہنچ کر پھر ایک سورۃ کے مثل لانے کا اعلان کیا گیا ہے جیسا کہ اس آیت یعنی ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ میں مذکور ہے اس لیے یہ سورت یعنی بقرہ مدنی ہے۔

اور ہجرت کے بعد سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی۔ ﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ اور اگر تم تنہا اس کے مثل لانے پر قادر نہیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ تم سوائے خدا تعالیٰ کے اپنے تمام اعوان و انصار کو بلالو اگر تم اپنے اس اعتقاد میں سچے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں تاکہ وہ تمہاری اس کام میں مدد کر سکیں اور اس مشکل کو حل کر سکیں اور سب مل کر قرآن کے ہم پلہ کلام لا سکیں۔ پس اگر تم سب مل کر بھی ایسا نہ کر سکو۔ یعنی اس کے مثل کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی نہ لا سکو اور ہم پیشن گوئی کیے دیتے ہیں کہ تم ہرگز نہ لا سکو گے۔ قرآن کا ایک اعجاز تو یہ تھا کہ کوئی اس کے مثل نہیں لا سکتا۔ دوسرا اعجاز یہ

① کما قال تعالیٰ: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ ۱۲

② کما قال تعالیٰ: ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ۱۲

③ کما قال تعالیٰ: ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ۱۲

ہے کہ پہلے ہی پیشگوئی کر دی گئی اور غیب کی خبر دے دی گئی کہ قیامت تک کوئی شخص اس کے مثل نہ لا سکے گا۔ بحمد اللہ ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے اور کوئی شخص اس کے مثل نہ لا سکا۔ بالفرض اگر کوئی شخص قرآن کا معارضہ کرتا تو ضرور نقل ہوتا اس لیے کہ ہر زمانہ میں قرآن کے مخالفوں کا عدد ہمیشہ زیادہ رہا ہے اگر کسی نے قرآن کریم کا معارضہ کیا ہوتا تو اس کا مخفی رہنا ناممکن تھا۔

خلاصہ یہ کہ اگر تم اس کا مثل نہ لا سکو اور ہرگز نہ لا سکو گے تو پھر میری نبوت کی تصدیق کرو۔ اور اس کو کلام ربانی اور وحی رحمانی سمجھو۔ تم ذرا تو غور کرو کہ ایک یتیم بیکس اور امّی جس کا سارا عرب مخالف اور دشمن ہو وہ ایسا عظیم الشان دعویٰ بغیر تائید الٰہی کیسے کر سکتا ہے کہ تمام جن اور انس بھی اس کا مثل نہیں لا سکتے اور اگر تم اس کی تصدیق نہیں کرتے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ اس جگہ پتھر سے یا تو عام پتھر مراد ہیں یا گندک کے پتھر مراد ہیں یا وہ بت مراد ہیں جن کو کافر پوجتے تھے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ ''یعنی تم اور وہ بت جن کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہیں۔'' جو دراصل خاص کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ البتہ گناہوں کا میل کچیل صاف کرنے کے لیے گنہگار مسلمانوں کو چند روز کے لیے جہنم میں رکھا جائیگا۔ پھر جو اصل ذات ہی سے نجاست اور گندگی ہیں وہ تو دوزخ میں رہ جائیں گے اور جو اصل سے پاک ہیں یعنی مومن ہیں اور گناہوں کی عارضی نجاست ان پر لگ گئی۔ (کما فی حدیث البخاری ان المؤمن لاینجس) وہ پاک صاف ہونے کے بعد نکال لیے جائیں گے۔

ف:...... اس آیت سے اور آئندہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے صاف ظاہر ہے کہ دوزخ ابھی موجود ہے جو لوگ اس کے قائل ہوئے کہ جنت وجہنم ابھی موجود نہیں بلکہ قیامت کے دن موجود ہوگی۔ صریح غلطی پر ہیں اور یہ قول سراسر آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ علامہ زبیدی اتحاف شرح احیار: ۲۲۱/۲ میں فرماتے ہیں کہ اسی پر تمام صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ حادی الارواح الی بلاد الافراح میں فرماتے ہیں۔ جنت تیار کی جا چکی ہے مگر اس میں کچھ خالی میدان ہیں جن میں بندوں کے اعمال صالحہ سے باغات اور محل تیار ہوتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنا کرے اس کے لیے جنت میں ایک محل تیار ہو جاتا ہے یا جو شخص ایک مرتبہ سبحان اللہ ایک مرتبہ الحمد للہ، ایک مرتبہ اللہ اکبر یا ایک مرتبہ لا الہ الا اللہ کہے اس کے لیے جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے۔ تفصیل کسی اور موقعہ پر کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو رسول اللہ کی رسالت میں شک ہے اور ہماری وحی کو انسانی کلام جانتے ہو تو اٹھو اور میدان معارضہ میں آ جاؤ۔ مگر ہم پہلے ہی پیشن گوئی کیے دیتے ہیں کہ تم سب مل کر بھی اس کا معارضہ نہیں کر سکتے پس اگر تم معارضہ نہ کر سکو اور تم پر اپنا عجز اور قصور واضح ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ ایمان لے آؤ ورنہ سخت عذاب میں گرفتار ہو گے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا

اور خوشخبری دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ ان کے واسطے باغ ہیں کہ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں جب ملے گا

اور خوشی سنا ان کو جو یقین لائے اور کام نیک کیے کہ ان کو ہیں باغ بہتی نیچے ان کے ندیاں جس بار

رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ

ان کو وہاں کا کوئی پھل کھانے کو تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ملا تھا ہم کو اس سے پہلے اور دیئے جائیں گے ان کو پھل ایک صورت کے ف۱

ملے ان کو وہاں کوئی میوہ کھانے کو کہیں یہ وہی ہے جو ملا تھا ہم کو آگے اور ان پاس وہ آویگا ایک طرح کا

وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور انکے لئے وہاں عورتیں ہوں گی پاکیزہ اور وہ وہیں ہمیشہ رہیں گے ف۲

اور ان کو ہیں وہاں عورتیں ستھری اور ان کو وہاں ہمیشہ رہنا۔

ذکرِ معاد یعنی قیامت کا دن...... وبشارت مومنین صالحین

قال تعالیٰ: ﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ... الی ... وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

ربط:...... حق تعالیٰ شانہ کی یہ سنت ہے کہ جب کبھی ترغیب اور وعدہ اور بشارت کا ذکر فرماتے ہیں تو اس کے ساتھ ترہیب اور وعید اور انذار کو بھی ذکر فرماتے ہیں تاکہ خوف اور رجاء سے مل کر ایمان میں ایک اعتدالی کیفیت پیدا ہو جائے اسی سنت کے مطابق حق تعالیٰ نے ان آیات میں جب انذار اور کافروں کی وعید کو ذکر فرمایا تو آئندہ آیات یعنی ﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ الآیۃ میں مومنین صالحین کے لیے بشارت کا ذکر فرمایا۔ نیز وہ انذار اور تہدید اگرچہ دشمنوں کو تھی مگر عاشقان جاں نثار میں تو اس کے سننے کی بھی سہار نہیں وہ تو سن کر گھبرا جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی تسلی اور دل تھامنے کے لیے بشارت ذکر فرمائی۔ تاکہ بشارت کی مسرت اور مخاطبت کی لذت سے وہ پریشانی، مبدل بہ شادمانی ہو جائے چنانچہ فرماتے ہیں اور خوشخبری دے دیجئے آپ ان لوگوں کو جو اس کتاب پر ایمان لائے اور اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کی اور اس کتاب کی ہدایت کے مطابق نیک عمل کیے ان کے لیے عجیب قسم کے باغات ہیں۔ ہر ایک کا باغ اس کے ایمان اور عمل صالح کے مطابق ہوگا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی عثمان غنی فرماتے ہیں کہ عمل صالح اس عمل کو کہتے ہیں جو خالص اللہ کے لیے ہو اور ریاء سے بالکلیہ پاک ہو۔ کما قال تعالیٰ: ﴿فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾۔ معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ عمل صالح وہ عمل ہے جس میں چار چیزیں جمع ہوں۔

۱۔ علم ۲۔ نیت ۳۔ صبر ۴۔ اخلاص (معالم التنزیل) ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر اس لیے فرمایا کہ بشارت کا پورا استحقاق جب ہے کہ جب ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی ہوں۔ اس آیت میں متعلقات ایمان اور اعمال صالحہ کی تفصیل نہیں فرمائی صرف بالاجمال اتنا کہہ دیا کہ جو لوگ ایمان دار اور نیک کردار ہوں گے ہم انہیں ان کے وہم وخیال سے

ف۱ جنت کے میوے دنیا کے میووں سے شکل وصورت میں ملتے جلتے ہوں گے مگر لذت میں زمین وآسمان کا فرق ہوگا یا جنت کے میوے باہم ایک شکل و صورت کے ہوں گے اور مزا جدا جدا تو جب کسی میوے کو دیکھیں گے تو کہیں گے وہی قسم ہے جو پہلے دنیا میں یا جنت میں کھا چکے ہیں اور چکھیں گے تو مزہ اور ہی پائیں گے۔

ف۲ جنت کی عورتیں نجاسات ظاہرہ و باطنہ (اخلاق رذیلہ) سے پاک وصاف ہوں گی فائدہ یہاں تک تین چیزیں جن کا جاننا ضروری تھا بیان فرمائیں اول مبداء (یعنی ہم کہاں سے آئے اور کیا تھے) دوسرے معاش (کہ کیا کھائیں اور کہاں رہیں) تیسرے معاد (کہ ہمارا انجام کیا ہے)۔

بڑھ کر انعام دیں گے۔

جنت لغت میں باغ کو کہتے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں ایک خاص مکان کا نام ہے جو نشاۃ آخرت میں ہمیشہ کے لیے ابرار و متقین کو عنایت ہوگا۔ جیسا کہ جہنم اس مخصوص مکان کا نام ہے جس میں کفار کو ہمیشہ کے لیے اور گنہگار مسلمانوں کو چند روز کے لیے رکھا جائیگا۔ جنت اور جہنم پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں اور اس کی حقیقت کی تحقیق کے درپے نہیں۔ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ نے جس قدر جنت اور جہنم کے احوال واوصاف بیان کیے ہیں ان پر ان سے ایک حرف بھی زیادہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ عالم غیب میں قیاس نہیں چلتا۔

﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''جن کے نیچے سے نہریں نہایت تیزی سے بہتی ہیں۔''

﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾ جب بھی دیئے جائیں گے ان باغوں میں سے کوئی پھل کھانے کے لیے تو یہ کہیں گے یہ وہی ہے جو ہم پہلے دیئے گئے اور دیئے جائیں گے وہ ایسا پھل کہ جو محض دیکھنے میں ایک دوسرے کے مشابہ اور ہمرنگ ہوگا۔ مگر ذائقہ میں مختلف ہوگا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس اور دیگر حضرات صحابہ سے منقول ہے کہ یہ تشابہ اور تماثل محض لون اور صورت کے اعتبار سے ہوگا۔ مزہ اور لذت میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوگا۔ یہ اس لیے ہوگا کہ ہر مرتبہ جدید مسرت اور نئی خوشی حاصل ہو۔ خلاصہ یہ کہ جنت کے میوے شکل اور صورت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے مگر مزے میں جدا اور مختلف ہوں گے۔ اہل جنت جب کسی پھل کو دیکھیں گے تو یہ کہیں گے کہ یہ وہ پہلا ہی پھل ہے۔ مگر جب چکھیں گے تو مزہ اور ہی پائیں گے۔ ﴿وَلَهُمْ فِیْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ اور ان کے لیے وہاں ایسی عورتیں ہوں گی جو ہر قسم کی ظاہری اور باطنی گندگی سے پاک ہوں گی۔

﴿وَّهُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی یہ نعمتیں ہمیشہ رہیں گی۔ دنیا کی نعمتوں کی طرح ان کو زوال اور فنا نہیں۔ نعمت کتنی ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو مگر زوال اور فنا کا اندیشہ اس کو مکدر کر دیتا ہے جیسے کسی نے کہا ہے۔

مرا در منزل جاناں چہ من وعیش چوں ہر دم جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

اس لیے ارشاد ہوا کہ تم مطمئن رہو۔ ہمیشہ تم انہیں نعمتوں میں رہو گے تنعم اور لذائذ کا مدار تین چیزوں پر ہے۔

۱۔ عمدہ مکان، ۲۔ لذیذ کھانے، ۳۔ حسین وجمیل عورتیں، اس لیے حق تعالیٰ شانہ نے ﴿جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ میں عمدہ مکان کا اور ﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا﴾ میں لذیذ کھانوں کا اور ﴿وَلَهُمْ فِیْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ میں حسین وجمیل ازواج کا ذکر فرمایا۔

ف:...... انسان کے لیے تین چیزوں کا جاننا ضروری ہے: ۱۔ کہاں سے آیا ہے۔ ۲۔ اور کہاں رہتا ہے۔ ۳۔ اور کہاں جانا ہے۔ ﴿الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم عدم سے آئے ہو اور ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ چند روز زمین میں قیام ہے اور ﴿فَاتَّقُوا النَّارَ﴾ سے اس طرف اشارہ ہے کہ عالم آخرت کو جانا ہے۔ عذاب الٰہی سے بچنے کی کوشش کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

بیشک اللہ شرماتا نہیں اس بات سے کہ بیان کرے کوئی مثال مچھر کی یا اس چیز کی جو اس سے بڑھکر ہے ف۱ سو جو لوگ مومن ہیں

اللہ کچھ شرماتا نہیں کہ بیان کرے کوئی مثال ایک مچھر یا اس سے اوپر پھر جو یقین رکھتے ہیں

فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا

وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ مثال ٹھیک ہے جو نازل ہوئی انکے رب کی طرف سے اور جو کافر ہیں سو کہتے ہیں کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے

سو جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے ان کے رب کا کہا اور جو منکر ہیں سو کہتے ہیں کیا غرض تھی اللہ کو اس

مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ

گمراہ کرتا ہے خدائے تعالیٰ اس مثال سے بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتیروں کو ف۲ اور گمراہ نہیں کرتا اس مثل سے مگر بدکاروں کو جو

مثال سے گمراہ کرتا ہے بہتیرے اور راہ پر لاتا ہے اس سے بہتیرے اور گمراہ کرتا ہے انہیں کو جو بے حکم ہیں جو

يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ

توڑتے ہیں خدا کے معاہدہ کو مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ نے فرمایا ملانے کو ف۳

توڑتے ہیں عہد اقراراللہ کا مضبوط کیے پیچھے اور توڑتے ہیں جو چیز اللہ نے فرمائی جوڑنی

وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور فساد کرتے ہیں ملک میں ف۴ وہی ہیں ٹوٹے والے ف۵

اور فساد کرتے ملک میں انہیں کو آیا نقصان۔

ف۱ اس آیت میں اس معارضہ کا جواب دیا گیا ہے جو کفار کی طرف سے پہلی آیت پر ہوا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب چھوٹی سی سورت بھی اس کلام جیسی ان سے نہ ہو سکی جس سے اس کا کلام الٰہی ہونا ثابت ہو چکا تو کفار نے کہا ہر چند ہم اس کلام کے مقابلہ سے عاجز ہیں مگر ہم دوسری دلیل سے اس کا کلام الٰہی نہ ہونا اور کلام بشری ہونا ثابت کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ بڑے بڑے بزرگ عظیم الشان اپنے کلام میں ذلیل وحقیر چیزوں کے ذکر سے اجتناب کیا کرتے ہیں حق تعالیٰ جو سب بزرگوں سے برتر اور اعظم ہے اس نے کیسے اپنے کلام میں مکھی اور مکڑی کا ذکر فرمایا۔ اس معارضہ کا جواب دیا گیا اس میں کوئی شرم اور عار کی بات نہیں کہ حق تعالیٰ مچھر یا اس سے بڑی چیز مکھی اور مکڑی کی مثال بیان فرمائے کیونکہ مثال سے تو توضیح وتفصیل ممثل لہ کی مطلوب ہوتی ہے حقارت اور عظمت سے کیا بحث اور یہ مطلوب جبھی حاصل ہوگا کہ مثال اور ممثل لہ میں پوری مطابقت ہو ممثل لہ حقیر ہوگا تو اس کی مثال بھی حقیر ہونی چاہیے ورنہ تمثیل ہی بیہودہ سمجھی جائے گی ہاں اگر تمثیل میں یہ ہوتا کہ مثال اور مثال دینے والے میں موافقت ضروری ہوتی تو بیوقوفوں کا یہ اعتراض چل سکتا۔ مگر اس کا تو کوئی بیوقوف بھی قائل نہ ہوگا اور تورات وانجیل وکلام حکماء وسلاطین میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں اس کے خلاف کہنا کفار کی حماقت اور عناد کی بات ہے اور ما فوقھا کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مچھر سے حقارت اور چھوٹائی میں زیادہ ہو جیسے مچھر کے بازو کہ بعض احادیث میں اس کو دنیا کی تمثیل میں ذکر فرمایا ہے۔

ف۲ یعنی ایمان والے تو ان مثالوں کو حق اور مفید سمجھتے ہیں اور کفار بطور تحقیر کہتے ہیں کہ ایسی حقیر مثالوں سے خدا کی مراد اور غرض کیا ہوگی جواب دیا گیا کہ اس کلام سراپا ہدایت سے بہتیروں کو گمراہی میں ڈالنا اور بہتیروں کو راہ راست دکھلانا منظور ہے (یعنی اہل حق اور اہل باطل میں تمیز تام منظور ہے جو نہایت مفید اور ضروری ہے)۔

ف۳ جیسے قطع رحم کرنا، انبیاء اور علماء اور واعظین اور مومنین اور نماز اور دیگر جملہ امور خیر سے اعراض کرنا۔ .... =

⑪ کافراں چوں ذکر عنکبوت در قرآن شنیدند طعن کردند وگفتند کہ خدا تعالیٰ بذکر ایں چیز ہائے خسیس چہ ارادہ کردہ است ایں آیت نازل شد واللہ اعلم (فتح الرحمن)

قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے پر کافروں کا ایک شبہ اور اس کا جواب

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا ... الٰی ... اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾

گزشتہ آیات میں اعجاز قرآن کی دلیل مذکور تھی۔ یہاں منکرین کے ایک شبہ کا جواب مذکور ہے۔ شبہ کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں کہیں مکھی اور کہیں مکڑی کی مثال دی ہے اس پر کافروں نے یہ اعتراض کیا کہ یہ قرآن اگر اللہ کا کلام ہے تو اس میں ایسی حقیر اور خسیس چیزوں کا ذکر نہ ہونا چاہیے کیونکہ ایسی خسیس اور حقیر چیزوں کا ذکر کلام الٰہی کی عظمت کے لائق نہیں۔ یعنی اگرچہ ہم قرآن کا مقابلہ نہ کرسکیں لیکن اس کتاب میں ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں ہے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا﴾ بیشک اللہ نہیں شرماتا اس بات سے کہ کوئی مثال بیان کرے کسی مچھر کی یا اس چیز کی جو حقارت میں مچھر سے بھی بڑھ کر ہو پس اہل ایمان خوب جانتے ہیں کہ یہ تمثیل بالکل حق ہے اور درست ہے ان کے رب کی طرف سے۔ اس لیے تمثیل سے مثل لہ (جس کی مثال دی گئی) کی توضیح اور تفصیل مقصود ہوتی ہے۔ لہٰذا حقیر اور ذلیل چیزوں کی حقارت اور ذلت کی توضیح و تشریح کے لیے اس کے مناسب مچھر مکھی اور مکڑی اسی قسم کی حقیر و ذلیل چیزوں کی مثال ذکر کی جائے گی تاکہ اس شئ کی حقارت و ذلت واضح ہو جائے عزیز و عظیم چیزوں کی مثال سے حقیر اور خسیس چیزوں کی حقارت اور ذلت کو کس طرح سمجھایا جاسکتا ہے۔ مثال کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مثال دینے والے کے مطابق ہو۔ بلکہ مثل لہ کے مطابق ہونی چاہیے حقیر کی مثال حقیر سے اور عزیز کی مثال عزیز سے دینی چاہیے۔ ورنہ ہر عاقل جانتا ہے کہ حقیر کو عزیز سے مثال دینا احمقوں کا کام ہے۔ توریت اور انجیل اور کلام حکماء میں اس قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ﴾

''اور البتہ تحقیق ہم نے بیان کی ہے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر مثال تاکہ نصیحت پکڑیں۔''

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ﴾

''یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ تفکر اور تامل کریں۔''

بعض سلف سے منقول ہے کہ جب میں قرآن کی کسی مثل کو سنتا ہوں اور اس کو نہیں سمجھتا تو میں اپنے اوپر روتا ہوں اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا یَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴾

''یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے ان کو مگر اہل علم۔''

= ف۴ فساد سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو ایمان سے نفرت دلاتے تھے اور مخالفان اسلام کو ورغلا کر مسلمانوں سے مقاتلہ کراتے تھے اور حضرات صحابہ اور صلحائے امت کے عیوب نکال کر تشہیر کرتے تھے تاکہ آپ کی اور دین اسلام کی بے وقعتی لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے اور مسلمانوں کا راز مخالفوں تک پہنچاتے تھے اور طرح طرح کی رسوم و بدعات خلاف طریقہ اسلام پھیلانے میں سعی کرتے تھے۔

ف۵ مطلب یہ کہ ان حرکات ناشائستہ سے اپنا ہی کچھ کھوتے ہیں، توہین اسلام اور تحقیر صلحائے امت کچھ بھی نہ ہو سکے گی۔

ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ مچھر کی مثال اللہ نے دنیا کے لیے بیان فرمائی ہے مچھر جب تک بھوکا رہتا ہے زندہ ہے اور جب کھا کر موٹا ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے اسی طرح اہل دنیا جب دنیا سے خوب سیر اور سیراب ہو جاتے ہیں تو اللہ ان کو پکڑتا ہے پس وہ ہلاک ہوتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ﴾

''پس جب بھول گئے وہ اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی تو کھول دیے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کہ جب وہ خوش ہو گئے اس سے جو ان کو دیا گیا پس پکڑ لیا ان کو ناگہاں پس وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔'' (تفسیر ابن کثیر)

خلاصہ یہ کہ اہل ایمان مثالوں کو حق سمجھتے ہیں کہ اشیاء کی خست اور حقارت بیان کرنے کے لیے یہ مثالیں دی گئی ہیں۔ اور کافر لوگ اپنی حماقت سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی ان حقیر مثالوں سے کیا غرض ہے۔ اور کیا ارادہ خداوندی ایسی حقیر چیزوں کے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ آئندہ آیت میں اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾۔ گمراہ کرتا ہے اللہ اس مثال سے بہتوں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتوں کو۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ اہل حق اور اہل باطل۔ اہل ہدایت اور ضلالت میں فرق ہو جائے۔ قرآن اور اس کی تمثیلات سب حق اور عین ہدایت ہے صحیح المزاج سلیم الطبع اشخاص (اہل ایمان) جب ان تمثیلات کو سنتے ہیں اور ان میں تفکر اور تامل کرتے ہیں تو ان کی ہدایت میں اور اضافہ ہوتا ہے اور ان تمثیلات سے ان کو صراط مستقیم اور حق کا راستہ خوب واضح ہو جاتا ہے اور جن کی روح کا مزاج بالکل فاسد اور خراب ہو چکا ہے ان کو ان تمثیلات سے کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ ان کی گمراہی میں اور زیادتی ہو جاتی ہے۔ فاسد المزاج کو جس قدر بہتر غذا دی جائے گی اسی قدر اس کے فساد اور مرض میں اضافہ ہوگا۔

قرآن عزیز میں جس طرح ہدایت اور اضلال کو حق جل شانہ کی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح ہدایت کو انبیاء و مرسلین اور علماء ربانیین اور ائمۂ مجتہدین کی جانب اور اضلال کو شیاطین اور اخوان شیاطین کی جانب بھی منسوب کیا گیا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ہدایت اور اضلال کے معانی اور مراتب کو ذکر کیا جائے۔ تاکہ خدا کی ہدایت اور انبیاء و مرسلین کی ہدایت میں فرق معلوم ہو اور جو اضلال حق تعالیٰ جل شانہ کی جانب منسوب ہے اس کی کیا حقیقت ہے اور جو اضلال شیاطین اور اخوان شیاطین کی جانب منسوب ہے اس کی کیا ماہیت ہے۔

مراتب ہدایت

مرحلۂ اولیٰ: ...... ہدایت بیان۔ یعنی حق کو بیان کرنا اور واضح کرنا اور لوگوں کو حق کی تعلیم اور دعوت دینا۔ اس معنیٰ سے ہدایت اللہ کی طرف اور اس کے انبیاء و مرسلین اور ائمہ مجتہدین کی طرف منسوب ہو سکتی ہے۔

اللہ نے بھی حق کو بیان کیا اور اس کی طرف اپنے بندوں کو دعوت دی اور اس کے حکم سے انبیاء و مرسلین اور علماء نے بھی حق کو بیان کیا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دی اور اس کی طرف بلایا۔

قال تعالیٰ: ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ ''تحقیق ہم نے انسان کو راستہ بتایا تو شکر

کرے یا ناشکری کرے۔"

وقال تعالیٰ: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾

"قوم ثمود کو ہم نے سیدھا راستہ بتایا لیکن انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔"

اور نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہیں:

وقال تعالیٰ: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾

"ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔"

ان تمام آیتوں میں ہدایت بمعنی البیان مراد ہے اور یہ ہدایت اللہ رب العزت کے ساتھ مخصوص نہیں۔ انبیاء اور علماء کی طرف بھی اس کی اسناد ہوسکتی ہے۔ نیز یہ ہدایت اہل ایمان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مومن اور کافر سب کے لیے ہے۔

مرتبۂ ثانیہ:...... ہدایت توفیق۔ یعنی خدا کا اپنے فضل و کرم سے بندہ کے لیے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کو اس کی خواہش اور طبعی میلان کے ایسا موافق بنا دینا کہ اس کی اطاعت لذیذ اور شیریں معلوم ہو اور اس کی معصیت حنظل سے بھی زیادہ تلخ معلوم ہو۔ خیر کے اسباب اور دواعی کو اس کے لیے جمع کر دینا اور اس کے تمام عوائق اور موانع کو یکلخت اٹھا دینا۔ یہ ہدایت اللہ جل جلالہ کے ساتھ مخصوص ہے اس ہدایت پر نہ کوئی ملک مقرب قادر ہے نہ کوئی نبی مرسل۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾

"تحقیق آپ جس کو چاہیں راہ پر نہیں چلا سکتے۔ لیکن اللہ ہی جس کو چاہے راہ پر لائے۔"

اس آیت میں اللہ کے لیے جس ہدایت کو ثابت کیا گیا اور نبی کریم ﷺ سے جس ہدایت کی نفی کی گئی وہ یہی ہدایت بمعنی التوفیق ہے اور ﴿اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ میں جس ہدایت کو نبی کریم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ ہدایت بمعنی البیان و دعوۃ الحق ہے۔ نبی کا کام ہی یہ ہے کہ حق کو بیان کرے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دے اور اس کی طرف بلائے مگر خداوندی اطاعت کا ہوائے نفسانی کے مطابق بنا دینا۔ اور خدا کی عبودیت اور بندگی کی حلاوت اور شیرینی کسی کے دل میں اتار دینا یہ سوائے اسی ملیک مقتدر کے کسی کے قبضہ میں نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے "لا یتوفق عبد حتی یوفقه الله"۔ بندہ خود بخود توفیق نہیں پاتا یہاں تک خدا اس کو توفیق دے۔ نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام غزوہ احزاب میں خندقیں کھودتے وقت یہ پڑھتے تھے۔

اللّٰهم لو لا انت ما اهتدينا ولا تصدقنا ولا صلينا فانزل سكينة علينا۔ (اے اللہ اگر تیری توفیق نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے۔ اور نہ صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔ پس تو ہم پر سکینت اور طمانینت نازل فرما۔) اور یہ ہدایت اہل ایمان کے ساتھ مخصوص ہے۔ حق تعالیٰ نے اس نعمت کبریٰ اور رحمت عظمیٰ سے ان بندوں کو سرفراز فرماتا ہے جو اس کی رضا اور خوشنودی کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت کی جانب گوشۂ چشم سے ایک ادنیٰ التفات کو بھی روا نہ رکھتے ہوں۔ کما قال تعالیٰ:

﴿يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

"جو اللہ کی رضامندی کا تابع ہو اس کو اللہ تعالیٰ سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ظلمت سے نکال کر نور کی طرف

لاتے ہیں اور سیدھے راستہ پر اس کو چلاتے ہیں۔"

مراتب اضلال

اضلال ہدایت کا مقابل ہے جس طرح ہدایت کے دو معنی ہیں اسی طرح اضلال کے بھی دو معنی ہیں۔

معنی اول:...... اضلال کے ایک معنی یہ ہیں کہ خدائے عزوجل کی معصیت کی دعوت دینا اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کو قبیح کر کے بتلانا اور اس کی نافرمانی کو مزین اور مستحسن کر کے ظاہر کرنا اور حق کو باطل کے ساتھ ملتبس کرنا۔ حق تعالی نے اسی اضلال کو شیطان کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ﴾ وقال تعالی:

﴿زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ﴾

"اور شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے سامنے خوبصورت بنا کر دکھایا۔ پس اس طرح سے ان کو سیدھے راستہ سے روکا۔"

اور ایک مقام پر اسی اضلال کو فرعون کی طرف منسوب کیا ہے:

﴿وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰی﴾

"اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ان کو سیدھا راستہ نہ بتایا۔"

اور ایک جگہ سامری کی طرف منسوب کیا:

﴿وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ﴾ "سامری نے ان کو گمراہ کیا۔"

اس معنی کر اضلال ہمیشہ شیاطین اور اخوان شیاطین اور ائمۃ الکفر کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ حق سبحانہ وتعالی کی جانب کبھی اس اضلال کی اسناد نہیں کی جاسکتی، وہ قدوس حکیم اس سے پاک اور منزہ ہے کہ وہ معاذ اللہ اپنے بندوں کو شر، فحشاء اور منکر کی طرف بلائے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾

"تحقیق اللہ تعالی تم کو حکم کرتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور صلہ رحمی کا اور منع کرتا ہے تم کو ہر بے حیائی اور نامعقول بات اور سرکشی سے اللہ تعالی تم کو سمجھاتے ہیں شاید تم یاد رکھو۔"

معنی ثانی:...... اضلال کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حق تعالی شانہ اپنی توفیق اور لطف و رحمت سے کسی کو محروم فرمادیں۔ توفیق اور لطف سے اس شخص کو محروم فرماتے ہیں جو اللہ کی آیتوں کی تکذیب اور انبیاء و مرسلین کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کرے۔ قال تعالی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ﴾ "اللہ نہیں ہدایت کرتا اس شخص کو جو حد سے تجاوز کرنے والا اور جھوٹا ہو۔"

﴿وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ "اللہ نہیں ہدایت کرتا حد سے گزرنے والوں کو۔"



﴿وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ''اور گمراہ کرتا ہے اللہ ظالموں کو۔''

یہ اضلال حقیقت میں ان کے اسراف، تکذیب، ظلم اور تعدی کی سزا ہے حق تعالیٰ شانہ کی طرف یہی اضلال منسوب ہوتا ہے۔ اور یہ آیت یعنی ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ جس کی اس وقت تفسیر کی جارہی ہے۔ اس میں ہدایت اور اضلال کے دوسرے معنی مراد ہیں۔ یعنی خدا اپنی خاص ہدایت اور توفیق اور لطف ورحمت سے بہت سے بندوں کو سرفراز فرماتا ہے جو اس حق جل وعلاء کے کلام کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کی تمثیل کو حق اور عین ہدایت جانتے ہیں۔ اور اس کے کلام اور تمثیل کا استہزاء اور تمسخر نہیں کرتے۔ اور بہتوں کو ان تمثیلات سے گمراہ کرتا ہے یعنی اپنے توفیق اور لطف ورحمت سے محروم کرتا ہے۔ محروم ان لوگوں کو کرتا ہے جو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی حدود سے نکل جاتے ہیں اور خدا سے پختہ عہد کر کے توڑ ڈالتے ہیں جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ﴾ الخ ''اور نہیں گمراہ کرتا اللہ تعالیٰ ان تمثیلات سے مگر نافرمانوں کو نافرمانی اور سرکشی کی نحوست سے عقل ماری جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق کو باطل سمجھنے لگتا ہے اور گمراہ ہوتا ہے۔ اطاعت سے خارج ہونے والوں کو فاسق کہتے ہیں۔ فاسق کا لفظ کافر اور مومن عاصی دونوں کو شامل ہے لیکن کافر کا فسق مومن عاصی کے فسق سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ مگر اس آیت میں فاسق سے کافر ہی مراد ہے۔ قرآن کریم میں فاسق کا لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ اس آیت میں منافقین کو فاسقین کہا گیا ہے۔ اور ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ﴾ اور ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ ان دونوں آیتوں میں فاسق سے مومن عاصی مراد ہے کافر فاسق تو حدود ایمان سے ہی خارج ہو جاتا ہے۔ اور مومن عاصی حدود ایمان سے خارج نہیں ہوتا مگر حدود اطاعت سے خارج ہو جاتا ہے۔ الحاصل حق تعالیٰ شانہ۔ ان اشیاء حقیرہ کی تمثیل سے صرف انہی لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں جو بدکار اور نافرمان ہیں۔'' اور ان لوگوں کو جو خدا کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں۔'' عہد سے اس جگہ وہ وصیت مراد ہے جس کی حق تعالیٰ نے اپنے تمام پیغمبروں کی زبانی تاکید کی کہ خدا کو ایک جانو اور ایک مانو اور اس کے پیغمبروں کی تصدیق کرو۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ عہد سے وہ عہد مراد ہے جو حق تعالیٰ نے توریت میں یہودیوں سے نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا۔ اور بعض کا قول ہے کہ عہد سے عہد الست مراد ہے یا یوں کہو کہ عہد سے عام مراد ہے خواہ وہ عہد الست ہو یا توریت وانجیل میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کا عہد ہو۔'' اور توڑتے ہیں اس چیز کو جس کا اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے'' اس آیت کے عموم میں ان تمام علائق کا قطع داخل ہے جن کے وصل کا خدا نے حکم دیا ہے۔ قطع رحمی اور خدا اور اس کے پیغمبروں سے قطع تعلق کرنا یہ بھی اس میں شامل ہے اور ''فساد کرتے ہیں زمین میں'' جو قول اور عمل اور جو حرکت اور سکون خدا کی رضامندی کے خلاف ہو وہ سب فساد اور فتنہ ہے۔'' یہ لوگ وہی ہیں جو خسارہ اور نقصان اٹھانے والے ہیں۔'' دنیا میں آخرت کی تجارت کے لیے آئے تھے۔ نفع تو کیا حاصل کرتے اصل رأس المال یعنی عقل اور فطرت سلیمہ کا جو سرمایہ ان کے پاس تھا اس کو بھی ضائع اور برباد کر دیا۔ اور صلاح اور رشد اور ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا اور منعم حقیقی کو چھوڑ بیٹھے اور اس سے اپنا تعلق قطع کر لیا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا خسارہ اور نقصان ہوگا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ

کس طرح کافر ہوتے ہو خدا تعالیٰ سے حالانکہ تم بیجان تھے ف۱ پھر جلایا تم کو ف۲ پھر مارے گا تم کو ف۳ پھر جلائے گا تم کو ف۴

تم کس طرح منکر ہو اللہ سے اور تھے تم مردے پھر اس نے تم کو جلایا پھر تم کو مارتا ہے پھر جلاوے گا پھر اسی پاس

اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ف۵

الٹے جاؤ گے۔

استعجاب بر کفر و نافرمانی و تذکیر انعامات ربانی اور مبداء و معاد کی یاد دہانی

قَالَ تَعَالٰى: ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ ... الى ... ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾

حق جل شانہ جب دلائل توحید و نبوت و معاد بیان کر چکے اور عبادت کا حکم دے چکے تو اب آئندہ آیات میں اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ ایسے قدیر و عظیم اور رحیم و کریم پروردگار سے سرکشی سراسر تعجب خیز ہے ان انعامات و احسانات کا مقتضی تو یہ تھا کہ تم شکر کرتے نہ کہ کفر۔ حیرت ہے کہ ان انعامات اور احسانات کے بعد تم کو کفر پر جرأت کیسے ہوئی اور اس توبیخ اور عتاب میں دوسرے عنوان اور دوسرے رنگ میں اس دلیل سابق کا اعادہ فرمایا پھر اس سلسلۂ تذکیر میں اولاً نعم عامہ کو بیان فرمایا یعنی ان نعمتوں کا ذکر کیا جس کا تعلق عام بنی آدم سے ہے۔ اور ثانیاً نعم خاصہ کو بیان فرمایا یعنی ان نعمتوں کا ذکر کیا جن کا خاص بنی اسرائیل سے تعلق ہے اور دور تک سلسلہ کلام چلا گیا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ کس طرح اور کیسے تم اللہ جل شانہ کے ساتھ کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے۔ بس اس نے تم کو حیات اور زندگی عطاء کی اور پھر تم کو موت دے گا اور پھر قیامت کے وقت تم کو دوبارہ زندہ کرے گا پھر تم سب حساب و کتاب کے لیے اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ تاکہ دنیاوی زندگی میں تم نے جو کچھ کیا ہے تم کو اس کی جزاء اور سزا ملے۔ پہلی آیت ﴿ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ﴾ میں وجود صانع کو ثابت کیا کہ خدا وہ ہے جس نے تم کو عدم سے نکال کر وجود عطاء کیا اور نیست سے ہست کیا اور دوسری آیت ﴿ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ﴾ میں حشر و نشر کو ثابت کیا اور ساتھ ساتھ دلیل عقلی بھی بیان کی کہ جو ذات پاک پہلی مرتبہ تم کو موت کے بعد زندہ کرنے پر قادر ہے وہ دوسری مرتبہ بھی زندہ کرنے پر قادر ہے اور یہ امر بدیہی اور مسلم ہے کہ موت سے کسی کو چارہ نہیں۔ مرنا سب کو ضرور ہے تو سمجھ لو کہ مر کر خدا ہی کے پاس جانا ہے پس ان تمام باتوں کے جاننے کے بعد تم خدا کا کیسے انکار کرتے ہو۔

ف۱ یعنی اجسام بے جان کہ حس و حرکت کچھ بھی نہ تھی اول عناصر تھے اس کے بعد والدین کی غذا بنے، پھر نطفہ پھر خون بستہ پھر گوشت۔

ف۲ یعنی حالات سابقہ کے بعد نفخ روح کیا گیا جس سے رحم مادر میں اور اس کے بعد دنیا میں زندہ رہے۔

ف۳ یعنی جب دنیا میں وقت مرنے کا آئے گا۔

ف۴ یعنی قیامت کو زندہ کیے جاؤ گے حساب لینے کے واسطے۔

ف۵ یعنی قبروں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے روبرو حساب و کتاب کے واسطے کھڑے کیے جاؤ گے، سو اب انصاف کرو کہ جب تم اول سے آخر تک اللہ تعالیٰ کے احسانات کے مرہون ہو اور ہر حالت اور حاجت میں اس کے محتاج اور اس کے متوقع ہو۔ پھر اس پر بھی کفر کرنا اور اس کی نافرمانی کرنا کس قدر تعجب خیز امر ہے۔

الحاصل:...... ﴿كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ﴾ میں وجود صانع کی دلیل بیان فرمائی کہ تم کو خدا کا انکار نہ کرنا چاہیے کیونکہ تم پہلے مردہ اور معدوم تھے اللہ تعالیٰ نے تم کو وجود عطاء کیا۔ اور جو خود بخود موجود ہو اور دوسروں کو وجود عطاء کرے وہی خدا ہے اور ﴿ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾ سے حیات ثانیہ کی حجت اور دلیل کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس قادر مطلق نے پہلی مرتبہ تم کو چھوٹے چھوٹے ذروں اور حقیر و ذلیل نطفوں اور خون کے لوتھڑوں اور خون کے ٹکڑوں سے پیدا کیا اور احسن تقویم کا خلعت تم کو پہنایا کیا اس کی نسبت تمہارا یہ گمان باطل ہے کہ وہ دوبارہ بکھرے ہوئے ذرات کو جمع کر کے تم کو حیات عطاء نہیں کر سکتا۔ تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ تمہیں خدا کی قدرت کے انکار سے شرم نہیں آتی۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ

وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب پھر قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا انکو سات

وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب پھر چڑھ گیا آسمان کو تو ٹھیک کیا ان کو سات

ع ۳

سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

آسمان اور خدائے تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے ف۱

آسمان اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔

ذکر تخلیق سامان حیات جسمانی

قَالَ تَعَالَىٰ: ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ... الى... وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾

حق تعالیٰ نے نعمت حیات کا ذکر فرمایا۔ اب ان آیات میں سامان حیات کا ذکر فرماتے ہیں جس پر حیات اور زندگی کا بقاء موقوف ہے۔ اول حیات جسمانی کے سامان کا ذکر فرمایا یعنی تمہاری اس ظاہری اور جسمانی حیات کے بقاء کے لیے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور پھر زمین سے مطعومات و مشروبات اور لذائذ و طیبات اور قسم قسم کے ملبوسات تمہارے لیے پیدا کیے۔ اس کے بعد حیات روحانی کے سامان کا ذکر فرمایا یعنی آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور منصب خلافت پر سرفراز فرمایا اور ہدایت کے علوم عطاء فرمائے۔ اور انبیاء و مرسلین کا سلسلہ جاری فرمایا۔ انبیاء و مرسلین اللہ کی طرف سے جو ہدایت اور رشد کے علوم اور معارف لے کر آتے ہیں وہی لوگوں کی روحانی حیات کا سامان ہوتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ﴾ ''اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا جبکہ وہ تم کو ایسی شئ کی طرف بلائے کہ جو تم کو روحانی اور معنوی حیات اور زندگی عطاء کرے۔''

چنانچہ فرماتے ہیں۔ وہی ایک پاک ذات ہے کہ جس نے پیدا کیا تمہارے منافع اور فوائد کے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب حتیٰ کہ سمیات اور نجاسات بھی نفع سے خالی نہیں، جاننا چاہیے کہ کسی چیز سے انتفاع یعنی نفع حاصل کرنا اور

ف۱ اس آیت میں دوسری نعمت بیان فرمائی یعنی اللہ نے تم کو پیدا کیا اور تمہاری بقا اور انتفاع کے لیے زمین میں ہر طرح کی چیزیں بکثرت پیدا فرمائیں (مطعومات اور مشروبات اور ملبوسات اور ہر چیز کے لیے آلات و سامان) اس کے بعد متعدد آسمان بنائے گئے جس میں تمہارے لیے طرح طرح کے منافع ہیں۔

چیز ہے اور کھانا اور چیز ہے۔ انتفاع کی اجازت اور اباحت سے کھانے کی اجازت اور اباحت لازم نہیں۔ پھر وہ رب العزت متوجہ ہوا۔ آسمانوں کی تخلیق و تکوین کی طرف پھر ٹھیک ان کو سات آسمان بنائے کہ کہیں ان میں سوراخ اور شگاف اور ٹیڑھا پن نہیں اور وہ پروردگار ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے کہ کیوں اور کس کے لیے پیدا کیا۔ امام جلیل و کبیر حافظ عماد الدین ابن کثیر قدس اللہ روحہ ونور ضریحہ فرماتے ہیں کہ اس آیت اور حم سجدہ ① کی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول زمین پیدا کی گئی۔ اور پھر آسمان پیدا کیے گئے۔ اور تعمیر کا طریقہ بھی یہی ہے کہ نیچے سے بنانا شروع کرتے ہیں جب تحتانی حصہ مکمل ہو جاتا ہے تب چھت ڈالتے ہیں اور علماء کا اس بارے میں کوئی نزاع اور اختلاف نہیں یعنی سب علماء کی یہی رائے ہے۔ صرف قتادہ سے ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ قتادہ کا گمان یہ ہے کہ آسمان پہلے پیدا کیے گئے جیسا کہ بظاہر سورہ والنازعات کی اس آیت سے متبادر ہوتا ہے۔

﴿ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا﴾

''کیا تم بنانے میں مشکل ہو یا آسمان۔ اسے آسمان بنایا اور اس کی بلندی کو بہت اونچا کیا پھر اس کو صاف کیا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور پھر اس میں سے کھول کر دھوپ نکالی اور اس کے بعد زمین کو بچھایا اور اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا''

اس آیت میں آسمان کی پیدائش کو زمین کی پیدائش سے پہلے ذکر فرمایا ہے جو بظاہر سورہ بقرہ اور حم سجدہ کی آیات سے متعارض معلوم ہوتا ہے صحیح بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس تعارض کے متعلق دریافت کیا گیا تو یہ جواب ارشاد فرمایا کہ اول زمین پیدا کی گئی اور پھر آسمان (جیسا کہ سورہ بقرہ اور حم سجدہ کی آیات سے ظاہر ہے) اور آسمان بنانے کے بعد زمین کو پھیلایا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین کا محض مادہ تو آسمان سے پہلے پیدا کیا گیا مگر زمین حالت موجودہ پر آسمان بنانے کے بعد پھیلائی گئی بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین اسی حالت موجودہ پر آسمان سے پہلے پیدا کی گئی اور پھر آسمان بنائے گئے تاکہ ان کے ذریعہ سے زمین پر بارش ہو اور پھر اس بارش سے وہ اثمار و اشجار اور فواکہ و طیبات زمین سے نمودار ہوں جن کا مادہ قدرت ازلیہ نے زمین میں ودیعت رکھا ہے پس زمین کو آسمان کے بعد بچھانے کا یہ مطلب ہے کہ آسمان بنانے کے بعد زمین سے فواکہ اور ثمرات اور قسم قسم کے لذائذ و طیبات کو اگایا۔ خود قرآن نے زمین کو آسمان کے بعد بچھانے کی یہی تفسیر کی ہے۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا﴾ ''اور زمین کو آسمان کے بعد بچھایا یعنی اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا''

اور اسی جواب کو علماء سلف اور خلف نے اختیار کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ زمین کے بچھانے سے ان اشجار و نباتات کا اگانا

① سورۂ حم سجدہ کی وہ آیت جس سے زمین کا پہلے پیدا ہونا معلوم ہوتا ہے یہ ہے: ﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ﴾ الآیۃ. ۱۲

مراد ہے جو زمین میں بالقوہ موجود ہیں۔ اسی معنی کر زمین کا بچھانا آسمان بنانے کے بعد ہوا۔ باقی زمین بحالت موجودہ آسمان سے پہلے پیدا کی گئی۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانیوالا ہوں زمین میں ایک نائب ف۱ کہا فرشتوں نے کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب۔ بولے کیا تو رکھے گا اس میں جو

يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ

اسکو جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے اور ہم پڑھتے رہتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو ف۲ فرمایا بیشک مجھ کو معلوم

شخص فساد کرے وہاں اور کرے خون اور ہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو۔ کہا مجھ کو معلوم ہے

مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ

ہے جو تم نہیں جانتے ف۳ اور سکھلا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے پھر سامنے کیا ان سب چیزوں کو فرشتوں کے پھر فرمایا

جو تم نہیں جانتے اور سکھائے آدم کو نام سارے پھر وہ دکھائے فرشتوں کو۔ کہا

أَنۢبِـُٔونِي بِأَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ ﴿۳۱﴾ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا

بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر تم سچے ہو بولے پاک ہے تو ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا تو نے ہم

بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر تم ہو سچے۔ بولے تو سب سے نرالا ہے ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا تو نے

عَلَّمْتَنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓـَٔادَمُ أَنۢبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ ۖ فَلَمَّآ

کو سکھایا بیشک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا ف۴ فرمایا اے آدم بتا دے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام پھر جب

سکھایا۔ تو ہی ہے اصل دانا پختہ کار۔ کہا اے آدم بتادے ان کو نام ان کے پھر جب

ف۱ اب ایک بڑی نعمت کا ذکر کیا جاتا ہے جو جملہ بنی آدم پر کی گئی اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی آفرینش کا قصہ ہے جو تفصیل سے بیان کیا گیا اور ان کو خلیفۃ اللہ بنایا گیا۔ پہلی آیت میں جو ﴿خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ فرمایا تھا اس میں کسی کو انکار پیش آئے تو قصہ حضرت آدمؑ سے اس کا جواب بھی نکل ہوگیا۔

ف۲ ملائکہ کو جب یہ گمان ہوا کہ ایسی مخلوق کہ جس میں مفسد اور خونریز تک ہوں گے ہم ایسے مطیع اور فرمانبردار کے ہوتے ان کو خلیفہ بنانا اس کی وجہ کیا ہوگی ؟ تو بطریق استفادہ یہ سوال کیا۔ اعتراض ہرگز نہ تھا۔ رہا یہ امر کہ ملائکہ کو بنی آدم کا حال کیونکر معلوم ہوا اس میں بہت سے احتمال ہیں۔ جنات پر قیاس کیا یا حق تعالیٰ نے پہلے بتا دیا تھا یا لوح محفوظ پر لکھا دیکھا۔ یا سمجھ گئے کہ حاکم و خلیفہ کی ضرورت جب ہی ہوگی جب ظلم و فساد ہوگا یا حضرت آدم کے قالب کو دیکھ کر بطور قیافہ سمجھ گئے ہوں (جیسا ابلیس نے حضرت آدم کو دیکھ کر کہا تھا کہ بھکول ہوں گے) اور ایسا ہی ہوا۔

ف۳ فرشتوں کو سردست بالاجمال یہ جواب دیا گیا کہ ہم خوب جانتے ہیں اس کے پیدا کرنے میں جو حکمتیں ہیں۔ تم کو ابھی تک وہ حکمتیں معلوم نہیں ورنہ اس کی خلافت اور افضلیت میں شبہ نہ کرتے۔

ف۴ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم کو ہر ایک چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع اور نقصان کے تعلیم فرما دیا اور یہ علم ان کے دل میں بلا واسطہ کلام القا کر دیا کیونکہ بدون اس کلام علمی کے خلافت اور دنیا پر حکومت کیونکر ممکن ہے اس کے بعد ملائکہ کو اس حکمت پر مطلع کرنے کی وجہ سے ملائکہ سے =

أَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ

بتا دیے اس نے ان کے نام فرمایا کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی

اس نے بتادیئے نام ان کے کہا میں نے نہ کہا تھا تم کو مجھ کو معلوم ہیں پردے آسمان اور زمین کے

وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝۳۳ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ

اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو ف۱ اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو

اور معلوم ہے جو تم ظاہر کرو اور جو تم چھپاتے ہو اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۤ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ

تو سب سجدہ میں گر پڑے مگر شیطان ف۲ اس نے نہ مانا اور تکبر کیا اور تھا وہ کافروں میں کا ف۳ اور ہم نے کہا اے آدم رہا کر

سجدہ کرپڑے مگر ابلیس نے قبول نہ رکھا اور تکبر کیا اور وہ تھا منکروں میں کا اور کہا ہم نے اے آدم بس تو اور

اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ

تو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو جہاں کہیں سے چاہو اور پاس مت جانا اس درخت کے

تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں سے محظوظ ہو کر جس جگہ چاہو اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے

=امور مذکورہ کا سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنی اس بات میں کہ تم کار خلافت انجام دے سکتے ہو، سچے ہو تو ان چیزوں کے نام و احوال بتاؤ لیکن انہوں نے اپنے عجز و قصور کا اقرار کیا اور خوب سمجھ گئے کہ بدون اس علم عام کے کوئی کار خلافت زمین میں نہیں کر سکتا اور اس علم عام سے قدر قلیل ہم کو اگر حاصل ہوا بھی تو اتنی بات سے ہم قابل خلافت نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر کہہ اٹھے کہ تیرے علم و حکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

ف۱ اس کے بعد حضرت آدمؑ سے جو تمام اشیائے عالم کی نسبت سوال ہوا تو فر فر سب امور ملائکہ کو بتادئے کہ وہ بھی سب دنگ رہ گئے اور حضرت آدمؑ کے احاطہ علمی پر عش عش کر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ کہو ہم نہ کہتے تھے کہ ہم جملہ مخفی امور آسمان و زمین کے جاننے والے ہیں اور تمہارے دل میں جو باتیں مکنون ہیں وہ بھی سب ہم کو معلوم ہیں۔ فائدہ اس سے علم کی فضیلت عبادت پر ثابت ہوئی۔ دیکھئے عبادت میں ملائکہ اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم، مگر علم میں چونکہ انسان سے کم ہیں اس لیے مرتبہ خلافت انسان ہی کو عطا ہوا اور ملائکہ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے کیونکہ عبادت تو خاصہ مخلوقات ہے خدا کی صفت نہیں البتہ علم خدائے تعالیٰ کی صفت اعلیٰ ہے اس لیے قابل خلافت یہی ہوتے۔ کیونکہ ہر خلیفہ میں اپنے مستخلف عنہ کا کمال ہونا ضروری ہے۔

ف۲ جب حضرت آدمؑ کا خلیفہ ہونا مسلم ہو چکا تو فرشتوں کو اور ان کے ساتھ جنات کو حکم ہوا کہ حضرت آدمؑ کی طرف سجدہ کریں اور ان کو قبلہ سجود بنائیں جیسا سلاطین اپنا اول ولی عہد مقرر کرتے ہیں پھر ارکان دولت کو نذریں پیش کرنے کا حکم کرتے ہیں تاکہ کسی کو سرتابی کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ سب نے سجدہ مذکورہ ادا کیا سوائے ابلیس کے کہ اصل سے جنات میں تھا اور ملائکہ کے ساتھ کمال اختلاط رکھتا تھا اور سبب اس سرکشی کا یہ ہوا کہ جنات چند ہزار سال سے زمین میں متصرف تھے اور آسمان پر بھی جاتے تھے جب ان کا فساد اور خونریزی بڑھی تو ملائکہ نے بحکم الٰہی بعض کو قتل کیا اور بعض کو جنگل پہاڑ اور جزائر میں منتشر کر دیا۔ ابلیس ان میں بڑا عالم و عابد تھا اس نے جنات کے فساد سے اپنی بے لوثی ظاہر کی، فرشتوں کی سفارش سے یہ بچ گیا اور ان ہی میں رہنے لگا اور اس طمع میں کہ تمام جنات کی جگہ اب صرف میں زمین میں متصرف بنایا جاؤں عبادت میں بہت کوشش کرتا رہا اور خلافت ارض کا خیال پکاتا رہا جب حکم الٰہی حضرت آدمؑ کی نسبت خلافت کا ظاہر ہوا تو ابلیس مایوس ہوا اور عبادت ریائی کے رائگاں جانے پر جوش حسد میں سب کچھ کیا اور ملعون ہوا۔

ف۳ یعنی علم الٰہی میں پہلے ہی کافر تھا اوروں کو گو اب ظاہر ہوا یا یوں کہو کہ اب کافر ہو گیا۔ اس وجہ سے کہ حکم الٰہی کا بوجہ تکبر انکار کیا اور حکم الٰہی کو خلاف حکمت و مصلحت اور موجب عار سمجھا یہ نہیں کہ فقط سجدہ ہی نہیں کیا۔

فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا

پھر تم ہو جاؤ گے ظالم ف۱ پھر ہلا دیا انکو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا انکو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے ف۲ اور ہم نے کہا

پھر تم بے انصاف ہوگئے پھر ڈگایا ان کو شیطان نے اس سے پھر نکالا ان کو وہاں سے جس آرام میں تھے اور کہا ہم نے

اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

تم سب اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے ف۳ اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک وقت تک ف۴

تم سب اترو تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تم کو زمین میں ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک وقت تک

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہوگیا اللہ اس پر بیشک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان ف۵

پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے کئی باتیں پھر متوجہ ہوا اس پر برحق وہی ہے معاف کرنے والا مہربان

ذکر تخلیق سامان حیات روحانی و اعطاء خلافت ربانی

قال تعالیٰ: ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ ... الی ... اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾

گزشتہ آیات میں زمین و آسمان اور دیگر مخلوقات کی پیدائش کو بیان فرمایا کہ ہم نے ان تمام مخلوقات کو تمہارے نفع کے لیے پیدا کیا ہے۔ آئندہ آیات میں ان مخلوقات سے منتفع ہونے والی مخلوق یعنی انسان کا ذکر فرماتے ہیں۔ انسان سے پہلے دو قسم کی مخلوق موجود تھی۔ ایک فرشتے دوسرے جن اور یہ دونوں قسمیں علوی اور سفلی۔ ارضی اور سماوی اشیاء سے متمتع اور منتفع نہیں ہوسکتیں۔ فرشتوں کا نہ منتفع ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔ فرشتوں کو نہ زن اور فرزند کی ضرورت اور نہ طعام و شراب اور طعام و شراب کے لوازم یعنی شہوت اور غضب کی ان کو حاجت۔

جنات اگرچہ بعض چیزوں سے متمتع اور منتفع ہوتے ہیں مگر لطافت بدنی اور غلبہ ناریت کی وجہ سے بہت سے سامان

ف۱ مشہور ہے کہ وہ درخت گیہوں کا تھا یا بقول بعض انگور یا انجیر یا ترنج وغیرہ کا واللہ اعلم۔

ف۲ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ اور حوا بہشت میں رہنے لگے اور شیطان کو اس کی عزت کی جگہ سے نکال دیا شیطان کو اور حسد بڑھا بالآخر مور اور سانپ سے مل کر بہشت میں گیا اور بی بی حوا کو طرح طرح سے ایسا پھسلایا اور بہکایا کہ انہوں نے وہ درخت کھالیا اور حضرت آدم کو بھی کھلایا اور ان کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کے کھانے سے اللہ کے ہمیشہ کو مقرب ہو جاؤ گے اور حق تعالیٰ نے جو ممانعت فرمائی تھی اس کی توجیہ گھڑ دی۔ آئندہ یہ قصہ مفصل آئے گا۔

ف۳ اس خطا کی سزا میں حضرت آدمؑ اور حوا اور جو اولاد پیدا ہونے والی تھی سب کی نسبت یہ حکم ہوا کہ بہشت سے زمین پر جا کر رہو باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے جس کی وجہ سے تکلیفیں پیش آئیں گی۔ بہشت دار العصیان اور دار العداوۃ نہیں ان امور کے مناسب دار دنیا ہے جو تمہارے امتحان کے لیے بنایا گیا ہے۔

ف۴ یعنی دنیا میں ہمیشہ نہ رہو گے بلکہ ایک وقت معین تک وہاں رہو گے اور وہاں کی چیزوں سے بہرہ مند ہو گے اور پھر ہمارے ہی روبرو آؤ گے اور وہ وقت معین ہر ہر شخص کی نسبت تو اس کی موت کا وقت ہے اور تمام عالم کے حق میں قیامت کا۔

ف۵ جب حضرت آدمؑ نے حق تعالیٰ کا حکم عتاب آمیز سنا اور جنت سے باہر آگئے تو بحالت ندامت و انفعال گریہ زاری میں مصروف تھے۔ اس حالت میں حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے چند کلمات ان کو القا اور الہام کے طور پر بتلائے جن سے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ وہ کلمات یہ ہیں۔ ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا﴾ (اعراف۔ ۲۳) آخر آیت تک۔

حفاظت سے مستغنی ہیں۔ نہ ان کو کسی مکان اور عمارت کی ضرورت اور نہ کسی قلعہ اور برج کی حاجت ہے اور نہ وہ اپنی حفاظت میں تیر وتلوار اور کسی قسم کے ہتھیار کے محتاج ہیں۔ پس اگر وہ عالم کی بعض اشیاء سے منتفع بھی ہیں تو وہ انتفاع ناتمام اور ناقص ہے۔ علاوہ ازیں جنات کی قوت خیالیہ ان کی قوت عقلیہ پر اس درجہ غالب ہے کہ جس چیز کا وہ خیال کر لیتے ہیں اس کو واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کا انتفاع حقیقی اور واقعی نہیں بلکہ خیالی ہے۔ بخلاف انسان کے کہ وہ ان تمام چیزوں سے حقیقۃ اور علی وجہ الکمال منتفع ہوسکتا ہے اس لیے منصب خلافت کے لیے انسان ہی کو خاص کیا گیا۔ جسمانی حیثیت سے تمام عناصر اربعہ اور عالم سفلی کی تمام اشیاء سے نفع اٹھا سکتا ہے۔ اور روحانی حیثیت سے عالم علوی کی تمام چیزوں سے متمتع اور متخلق باخلاق الٰہیہ اور متصف بصفات ربانیہ ہوسکتا ہے۔ ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ﴾ اور اے محمد ﷺ آپ اس وقت کو یاد دلائیے جب تیرے پروردگار نے حضرت آدم کی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے ان کی پیدائش سے پہلے ہی فرشتوں سے یہ فرمایا ﴿اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ تحقیق میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ اور نائب بنانے والا ہوں جو میرا نائب ہو کر زمین پر حکومت کرے گا اور زمین والوں پر میرے حکموں کو جاری اور نافذ کرے گا اور وہ خلیفہ عناصر اربعہ سے مرکب ہونے کی وجہ سے زمین کا انتظام کرے گا۔ اور منافع ارضیہ سے منتفع ہوگا۔ اور اس میں ایک روح آسمانی پھونکوں گا جس کی وجہ سے وہ آسمان والوں پر حکم چلائیگا۔

گدائے مصطبہ ام لیک وقت مستی بیں　　　که ناز برفلک وحکم برستارہ کنم

حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا تذکرہ ملائکہ سے اس لیے فرمایا کہ کائنات ارضی اور سماوی کے منافع فرشتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ آسمان سے پانی کا برسانا۔ زمین سے اشجار ونباتات کا اگانا۔ گرم اور سرد ہواؤں کا چلانا وغیرہ ذلک۔ من جانب اللہ ان تمام چیزوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے۔ اور یہ تمام امور فرشتوں ہی کی محافظت اور نگرانی میں ہیں۔ پس جب تک فرشتے اللہ کے خلیفہ کی اطاعت نہ کریں اس وقت تک خلافت کا کام سرانجام نہیں پاسکتا۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے اول فرشتوں کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کا علمی فضل وکمال ظاہر فرمایا اور پھر ان کو سجدہ کا حکم دیا۔

سلاطین عالم جب کسی کو منصب وزارت پر سرفراز کرتے ہیں تو حکومت کی تمام فوجیں اس کی ماتحتی میں دیدی جاتی ہیں اور وہ آکر سلامی دیتی ہے۔ اسی طرح حق جل شانہ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو منصب خلافت پر سرفراز فرمایا تو اپنے تمام جنود وعساکر (یعنی ملائکہ) سے حضرت آدم علیہ السلام کو اطاعت اور فرمانبرداری کا سجدہ کرادیا۔ تاکہ خلافت کے کام میں کسی قسم کا کوئی خلل نہ پیش آئے۔ اور چونکہ یہ تمام عالم بمنزلہ ایک شہر کے ہے اور فرشتے اس کے عامل اور کارکن ہیں اس لیے خلافت کا تذکرہ فرشتوں ہی سے فرمایا۔ اور مخلوق سے ذکر نہیں فرمایا اس لیے کہ اور سب فرشتوں ہی کے ماتحت ہیں۔

حقیقت ملائکہ:...... اہل اسلام کے نزدیک ملائکہ اللہ کے محترم اور مکرم بندے ہیں جو نور [1] سے پیدا کیے گئے ہیں۔ معاصی سے معصوم۔ خطا اور نسیان سے محفوظ ہیں۔ ﴿لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ کھانے اور [2] پینے سے پاک۔ تذکیر وتانیث سے منزہ اور مبرا ہیں۔ قرآن میں ملائکہ کے حق میں ضمیر مذکر کا استعمال محض تشریف وتکریم کی

---

[1] اشارۃ الی ما اخرجہ مسلم عن عائشۃ مرفوعاً خلقت الملائکۃ من نور ۱۲ فتح الباری: ۶/۲۹۱

[2] قال الحافظ وفی قصۃ الملائکۃ مع ابراھیم وسارۃ ما یؤید انھم لا یاکلون ۱۲ فتح الباری: ۶/۲۱۷

وجہ سے ہے مذکر ہونے کی وجہ سے نہیں جیسے حق جل وعلاء کے لیے ضمیر مذکر کا استعمال محض عظمت واجلال کی وجہ سے ہے جس طرح بعض انسانوں کو حق تعالیٰ نے اپنی رسالت اور پیمبری کے لیے برگزیدہ فرمایا ہے۔ اسی طرح بعض ملائکہ کو رسالت پیمبری کے لیے برگزیدہ فرمایا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾

فرشتوں نے ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ سے یہ سمجھا کہ جب وہ خلیفہ زمین سے پیدا ہوگا تو اس میں لذات سفلیہ سے منتفع ہونے کی خواہش اس کی جبلت میں مرکوز ہوگی۔ جب ان لذتوں کی اس کو ضرورت ہوگی تو قوت شہویہ جوش میں آئے گی اور جو شخص ان لذات اور منافع میں اس کی مزاحمت کرے گا تو قوت غضبیہ جوش میں آئے گی۔ اور مدافعت کے لیے جنگ وجدال اور قتل وقتال کی نوبت آئے گی۔ اس لیے فرشتوں کو یہ شبہ ہوا کہ زمین کی عمارت اور اصلاح کے لیے ایسے شخص کو خلیفہ بنانا بظاہر خلاف حکمت معلوم ہوتا ہے۔ ﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ فرشتوں نے کسی اعتراض کے طور پر نہیں بلکہ محض حکمت دریافت کرنے کے لیے بارگاہ خداوندی میں یہ عرض کیا کہ زمین میں آپ اس شخص کو خلیفہ بناتے ہیں جو زمین میں فساد اور خونریزی کرے۔ حالانکہ ہم سب ہر لحہ تیری ذات پاک کی ستائش کے ساتھ مسلسل تسبیح کرتے ہیں تا کہ حق تیری ذات اور صفات کا ادا ہو اور نیز ہم خاص تیرے لیے تقدیس کرتے ہیں۔ یعنی ہم تیرے افعال کو اس بات سے پاک جانتے ہیں کہ تیرا کوئی فعل معاذ اللہ خلاف حکمت ہو یا معاذ اللہ اس میں سفہ اور عبث کا شائبہ ہو۔ بخلاف بنی آدم کے کہ اگر وہ تیری تسبیح وتقدیس بھی کریں گے تو بسا اوقات ریا اور حرص وہوا کی آمیزش اور شرکت سے پاک نہ ہوں گی۔ رہا یہ سوال کہ ملائکہ کو بنی آدم کا مفسد اور خوں ریز ہونا کیسے معلوم ہوا۔ سو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ سے مروی ہے کہ جب اللہ نے یہ فرمایا ﴿جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ تو فرشتوں نے یہ عرض کیا کہ وہ خلیفہ کیسا ہوگا تو اللہ رب العزت نے یہ فرمایا کہ اس خلیفہ کے ذریت ہوگی اور زمین میں فساد کرے گی۔ اور ایک دوسرے کو قتل کرے گی۔ (تفسیر ابن کثیر) اس پر ملائکہ نے یہ سوال کیا۔ ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا﴾ الخ اور ملائکہ کا یہ سوال محض حکمت دریافت کرنے کے لیے تھا کہ فساد اور خون ریزی کرنے والوں کو پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔ حاشا بطور اعتراض نہ تھا۔ اس لیے کہ ملائکہ کی تو یہ شان ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ﴾ یعنی بغیر اذن الٰہی کے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتے۔ وقال تعالیٰ: ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ خدا کے محترم بندے ہیں۔ مقصد فقط یہ تھا کہ اس قسم کی مخلوق پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔ اگر عبادت اور بندگی مقصود ہے تو ہم اس کے لیے حاضر ہیں۔ ہر وقت تیری اطاعت اور بندگی میں سرشار ہیں اور تیری معصیت اور نافرمانی سے بالکلیہ پاک اور بری ہیں۔ اس لیے حق جل شانہ نے جواب ارشاد فرمایا۔ ﴿اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ تحقیق میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی تم کو معلوم نہیں کہ منصب خلافت کے لیے ایسی ہی حقیقت جامعہ مناسب ہے جو جسمانیت اور روحانیت دونوں کی جامع ہو اور قوت عقلیہ کے ساتھ اس میں قوت شہویہ اور غضبیہ بھی ہو۔ جس نوع کا مزاج ان مختلف قوی سے مرکب ہوگا وہی عالم کے انتظام اور تدبر وتصرف پر قادر ہوگا۔ کائنات ارضیہ کے حقائق اور منافع کو بخوبی سمجھے گا اور طرح طرح کی صنعتیں ایجاد کرے گا۔ تا کہ منافع ارضیہ قوت سے نکل کر فعلیت میں آجائیں اور ظاہر ہے کہ فرشتوں میں یہ استعداد اور صلاحیت نہیں۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

جاننا چاہئے کہ ہر انسان میں دو قوتیں ہیں ایک تو قوت شہویہ۔ جس سے زنا وغیرہ صادر ہوتا ہے۔ جس کو فرشتوں نے ﴿مَن يُفْسِدُ فِيهَا﴾ سے تعبیر کیا ہے۔ اور دوسری قوت غضبیہ جس سے قتل اور ضرب اور خونریزی ظہور میں آتی ہے۔ جس کو ملائکہ نے ﴿وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾ سے تعبیر کیا ہے۔ فرشتوں نے انسان کے یہ دو عیب ذکر کر کے اشارۃً ان دونوں عیبوں کی اپنے سے نفی کی اس لیے کہ ﴿مَن يُفْسِدُ فِيهَا﴾ کے مقابلہ میں ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ﴾ اور ﴿وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾ کے مقابلہ میں ﴿وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ کہا۔ اس میں شک نہیں کہ قوت شہویہ اور قوت غضبیہ بہت سے مفاسد کا سرچشمہ ہیں لیکن ان دو قوتوں میں منافع اور مصالح اور فوائد بھی نہایت عجیب وغریب ہیں۔ ملائکہ نے قوت شہویہ اور غضبیہ کے مفاسد کا تو ذکر کیا لیکن ان دونوں قوتوں کے منافع اور فوائد سے ان کو ذہول ہوا۔ فرشتوں کا خیال اس طرف نہ گیا کہ یہی قوت شہویہ جب اس کا رخ خداوند ذوالجلال کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تو اس سے وہ ثمرات ونتائج ظہور میں آتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر فرشتے بھی عش عش کرنے لگتے ہیں۔ یعنی غلبۂ عشق خداوندی اور اس کی محبت کا جوش اور ولولہ خدا کی محبت اور اس کے عشق میں قلب کا بے چین اور بیتاب رہنا یہ وہ نعمت ہے کہ جس پر ملائک بھی رشک کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ملائک میں قوت شہویہ نہ ہونے کی وجہ سے عشق کا مادہ نہیں اطاعت میں اگر فرشتوں کا پلہ بھاری ہے تو عشق اور محبت میں آدم اور بنی آدم کا پلہ بھاری ہے۔ اور علیٰ ہذا جب قوت غضبیہ کو کارخانہ خداوندی میں صرف کیا جاتا ہے تو اس سے بھی عجیب وغریب نتائج وثمرات ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی خدا کی راہ میں جانبازی اور سرفروشی اور اس کے دشمنوں سے جہاد وقتال۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یہی وجہ ہے کہ صحابۂ بدریین کی طرح وہ ملائکہ جو جنگ بدر میں شریک ہوئے ان ملائکہ سے افضل ہیں جو جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے جیسا کہ بخاری میں مذکور ہے اور خدا کی راہ میں شہید ہو جانا یہ ایسی عظیم نعمت ہے کہ ملائکہ اس سے بالکلیہ محروم ہیں۔ نیز جب تک قوت عقلیہ کے ساتھ قوت شہویہ اور قوت غضبیہ نہ ہو تو تنہا قوت عقلیہ تجارت وزراعت اور صنعت وحرفت اور تمدن ومعاشرت کے اصول اور قوانین مرتب نہیں کر سکتی جن پر تمام کارخانۂ عالم کا دارومدار ہے۔ لہذا خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہوا کہ قوت عقلیہ کے ساتھ قوت غضبیہ اور قوت شہویہ کا بھی حامل ہو۔ نیز اگر جہان میں برائیاں اور قباحتیں موجود نہ ہوں تو بعثت رسل اور انزال کتب وشرائع واحکام واوامر ونواہی سب معطل وبیکار ہو جائیں۔

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است　　دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

شیخ اکبر قدس اللہ سرہ فصوص الحکم میں فرماتے ہیں کہ ملائکہ نے علی الاطلاق تسبیح وتقدیس کا دعویٰ کیا حالانکہ ان کی تسبیح وتقدیس فقط ان اسماء وصفات کے ساتھ مقید اور مخصوص ہے جن اسماء وصفات کا ان کو علم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ﴿قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ سے معلوم ہوتا ہے مگر ملائکہ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ کے ایسے اسماء بھی ہیں کہ وہاں تک ملائکہ کے علم کی رسائی نہیں اور اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان اسماء وصفات کا علم عطا فرمایا۔ خصوصاً وہ اسماء وصفات جن کا تعلق نعمت اور عذاب، موت اور ہلاک، صحت اور مرض سے ہے جیسے رزاق اور مطعم اور مصور محی اور ممیت، ملائکہ ایسے اسماء وصفات کے ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ کی تسبیح وتقدیس نہیں کرتے جن کا تعلق عالم اجسام سے ہے۔ اس لیے ملائکہ کی تسبیح وتقدیس بھی آدم کی تسبیح

کے لحاظ سے مطلق نہیں بلکہ مفید ہے۔ انتہی کلامہ۔ علاوہ ازیں بنی آدم کی تسبیح وتقدیس، شیطان اور نفس، قوۂ شہویہ اور قوۂ غضبیہ کے معارضہ اور مقابلہ کی وجہ سے زیادہ اکمل اور بہتر ہے۔ بخلاف ملائکہ کے کہ ان کی تسبیح وتقدیس بمنزلہ سانس کے اضطراری ہے اور اختیاری تسبیح وتحمید اضطراری تسبیح تحمید سے بہتر ہے۔

جواب تفصیلی بعد جواب اجمالی

گزشتہ آیات ﴿اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ میں فرشتوں کے شبہ کا اجمالی جواب تھا۔ اب آئندہ تفصیلی جواب ارشاد فرماتے ہیں جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور زیادتی بیان فرمائی تا کہ فرشتوں پر ان کی فوقیت اور افضلیت ثابت ہو اور یہ ظاہر ہو جائے کہ جو شخص علوی اور سفلی کائنات کے اسماء وصفات سے واقف ہو وہی مستحق خلافت ہے یا یوں کہو کہ پہلا جواب حاکمانہ تھا اور یہ جواب حکیمانہ ہے۔ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ الخ اور سکھائے اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام مع اُن کے خواص اور آثار کے اس لیے کہ جب تک کہ عالم کی تمام چیزوں کے نام اور ان کی حقیقت اور اوصاف اور خواص اور آثار اور طریقہ استعمال معلوم نہ ہو تو ان کا انتظام اور ان میں تصرف کیسے کر سکتا ہے محض نام جاننے سے نہ تو حضرت آدم علیہ السلام کی فوقیت ثابت ہوگی اور نہ محض نام جاننے سے انتظام ہو سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ قیامت کے روز اول اہل ایمان شفاعت کے لیے حضرت آدم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور یوں کہیں گے۔

"انت ابو الناس خلقك الله بيده واسجد لك ملائكته وعلمك اسماء كل شئ"۔

"آپ سب انسانوں کے باپ ہیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے آپ کو پیدا کیا اور فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور تمام چیزوں کے نام آپ کو سکھائے۔"

حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتوں کو بھی بعض چیزوں کے نام کا علم تھا مگر ان کا علم انہیں چیزوں میں منحصر تھا جن کی خدمت پر وہ مامور تھے۔ دوسری چیزوں سے ان کو کوئی تعلق اور سروکار نہ تھا۔ خلافت کے لیے علم تام اور عام چاہئے۔ بخلاف حضرت آدم علیہ السلام کے کہ اللہ نے ان کو علم تام اور عام عطا فرمایا۔ مفردات اور مرکبات کے اسماء اور خواص اور آثار بتلائے صنعتوں اور حرفتوں کا علم عطا فرمایا، حفظانِ صحت اور معالجۂ امراض کے اصول وقواعد بتلائے۔ اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کو ان چیزوں کا علم نہیں دیا گیا۔ لہٰذا وہ خلافت کا کام کیسے انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے حضرت آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے اور اسی آیت میں ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ کے بعد جو لفظ "كُلَّهَا" بڑھایا گیا وہ اسی عموم کی تاکید ہے کیونکہ آدم اور فرشتوں میں یہی مابہ الامتیاز ہے کہ فرشتوں کو تمام اسماء کا علم نہیں اور حضرت آدم کو اسماء کی تعلیم بذریعہ الہام کے تھی کہ ان کے دل میں ڈال دیا کہ فلاں چیز کا فلانا نام ہے فلانی چیز کا فلانا نام ہے۔ اور اس تعلیم میں کلمہ اور کلام اور صوت اور حرف درمیان میں نہ تھی، بلا واسطہ حرف اور صوت کے اور بغیر کلمہ اور کلام ان کے دل میں ڈالا اور یہ تعلیم بواسطہ الفاظ کے نہ تھی۔ بلکہ بطریق القاء فی القلب تھی جیسے ﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾ میں تعلیم بواسطہ الفاظ کے نہ تھی۔ بلکہ القاء فی القلب کے ذریعے سے تھی کہ ان کے دل میں زرہ بنانے کا طریقہ ڈال دیا۔ پھر جن چیزوں کے نام اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو سکھائے ان چیزوں کی تصویروں کو فرشتوں پر

پیش کیا پھر فرمایا کہ تم مجھے ان چیزوں کے نام ٹھیک ٹھیک بتاؤ اگر تم اس بارہ میں سچے ہو۔ کہ تم میں خلافت کی صلاحیت ہے اور تم خلافت کی خدمت انجام دے سکتے ہو۔ اس لیے کہ جب تک کہ حقائق اشیاء اور ان کی صفات اور خواص اور آثار اور طریقہ استعمال کا علم نہ ہو اس وقت تک ان میں تصرف اور ان کا انتظام ناممکن ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا تو پاک اور منزہ ہے ہم کو کسی شئ کا بھی علم نہیں مگر فقط اس چیز کا جس کا تو نے ہم کو جتنا علم عطاء کر دیا بے شک حقیقت میں تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے تو اس سے منزہ ہے کہ تیرا کوئی کام عبث اور خلاف حکمت ہو ہمارا علم ہماری استعداد کے مطابق ہے اور آدم کا علم ان کی استعداد کے مطابق ہے اور استعدادوں اور صلاحیتوں کا تفاوت اور اختلاف تیرے علم اور حکمت پر مبنی ہے آپ مالک مطلق ہیں جس میں جو استعداد چاہیں وہ پیدا کر دیں فرشتوں پر جب یہ بات واضح ہوگئی کہ آدم علیہ السلام خلافت کی استعداد اور صلاحیت میں ہم سے بہتر اور برتر ہیں تو بصد عجز و زاری بارگاہ خداوندی میں یہ بولے۔ ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ﴾

فائدہ:...... جاننا چاہئے کہ عرضہم کی ضمیر اسماء کی طرف باعتبار مُسمیات کے راجع ہے ظاہر کا مقتضی یہ تھا کہ ضمیر مؤنث کی لاتے اور یوں کہتے "ثُمَّ عَرَضَهَا" جیسا کہ ایک قراءت میں ﴿ثُمَّ عَرَضَهُنَّ﴾ ضمیر مؤنث کے ساتھ آیا ہے لیکن بجائے ضمیر مؤنث کے ذوی العقول کی ضمیر لائے یعنی ھم کی ضمیر لائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ عرض باعتبار وجود خارجی اور جسامت ظاہری کے نہ تھا بلکہ باعتبار وجود روحی اور ملکوتی یا بطور وجود مثالی کے تھا۔ اور اس وجود کے اعتبار سے تمام مخلوقات عاقل اور مدرک ہیں اور تذکیر و تانیث سے مبرا ہیں "حق جل شانہ نے فرمایا اے آدم تم فرشتوں کو ان تمام چیزوں کے نام مع خواص" اور آثار کے بتلا دو کیونکہ اے آدم ہم نے تم کو اَدیم ارض (یعنی روئے زمین) کی ⑪ تمام اقسام کے مٹیوں سے ملا کر اور مختلف قسم کے پانیوں میں گوندھ کر بنایا ہے اور پھر برابر بنا کر تم میں روح پھونکی ہے۔ جو جنس ملائکہ سے ہے اس لیے تم میں یہ استعداد اور صلاحیت ہے کہ تم ان چیزوں کے نام اور خواص اور آثار بتلا سکو اس لیے کہ ساری استعدادیں اور صلاحیتیں تم میں جمع ہیں۔ جسمانی حیثیت سے تم زمینی ہو اور روحانی حیثیت سے تم علوی ہو اس لیے تم علوی اور سفلی چیزوں کو جس قدر سمجھ سکتے ہو دوسرا ویسا نہیں سمجھ سکتا۔ غرض یہ کہ تمہارے خمیر میں زمینی اور آسمانی دونوں قسم کی استعدادیں اور صلاحیتیں علی وجہ الکمال موجود ہیں۔ پس ان چیزوں کے نام مع خواص اور آثار کے فرشتوں کے سامنے بیان کر دو تاکہ تمہارا فضل و کمال ظاہر ہو اور تمہاری فطرت میں جو عجیب و غریب استعدادیں اور صلاحیتیں ہم نے ودیعت کر رکھی ہیں وہ بروئے کار آجائیں اور فرشتوں پر یہ امر منکشف ہو جائے کہ یہ استعداد بشر کے ساتھ مخصوص ہے ملائکہ کو میسر نہیں پس جب بتائے آدم نے ان تمام چیزوں کے نام جو بے شمار اور بے انتہا تھیں۔ اور اس بیان میں کوئی غلطی بھی نہیں کی تو فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کے اس کمال علمی کو دیکھ کر حیران رہ گئے تو اس وقت اللہ جل جلالہ نے فرشتوں سے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے پہلے ہی کہا نہ تھا کہ میں تمام آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو خوب جانتا ہوں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے ﴿اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اس کو بھی خوب جانتا ہوں۔

---

⑪ اور اسی وجہ سے کہ حضرت آدم کو تمام روئے زمین کی مٹیوں سے بنایا گیا ہے ان کی اولاد میں کوئی سرخ رنگ ہے اور کوئی گورا اور کوئی بین بین اور کوئی نرم خو اور کوئی ترش رو اور کوئی نیک طینت اور کوئی بد طینت جیسا کہ مسند احمد اور ابوداؤد اور ترمذی کی ایک حدیث میں آیا ہے۔ ۱۲

خلاصہ یہ کہ خلافت کے لیے ایسے حاوی اور کلی علم کی ضرورت ہے بغیر ایسے علم کے خلافت ناممکن ہے۔ فرشتوں کا علم حاوی اور کلی نہیں، جس خدمت پر وہ مامور ہیں فقط اسی کے قواعد اور ضوابط ان کو معلوم ہیں کسی دوسری خدمت اور نظام کا ان کو علم نہیں۔ اور علیٰ ہذا ملائکہ کی قدرت و مشیت ان کے اختیار اور مرضی کے تابع نہیں بلکہ حق جل شانہ کی مرضی کے تابع ہے۔ بخلاف انسان کے کہ اس کی قدرت و مشیت خود اس کی مرضی کے تابع ہے انسان ہی کا علم اور قدرت حق تعالیٰ شانہ کے علم اور قدرت کا نمونہ ہے جو ضدین اور نقیضین سے متعلق ہوسکتا ہے۔ نیز بہت سی چیزوں کا علم محض عقل سے نہیں ہوسکتا جب تک قوت شہویہ اور غضبیہ عقل کی معین اور مددگار نہ ہو اس لیے ایسی چیزوں کا نام وہی بتلا سکتے ہے جس میں قوت عقلیہ اور ادراکیہ کے علاوہ قوت شہویہ اور غضبیہ بھی ہو اور علیٰ ہذا جنات کا علم بھی ناقص ہے اور علاوہ ناقص ہونے کے غلبہ ناریت اور قوت خیالیہ کے غلبہ کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے۔ اس لیے یہ خدمت ان کے سپرد نہیں کی جاسکتی۔ خلاصہ کلام یہ کہ جب فرشتوں نے یہ عرض کیا کہ ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا﴾ الخ تو حق تعالیٰ شانہ نے دو جواب ارشاد فرمائے ایک حاکمانہ اور ایک حکیمانہ۔ حاکمانہ جواب تو یہ فرمایا کہ ﴿اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ "رموز مملکت خویش خسرواں دانند" اور حکیمانہ جواب یہ ارشاد فرمایا ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ﴾ کہ آدم علیہ السلام کو اشیاء کے تمام اوصاف اور خواص اور اسماء کی تعلیم دی تاکہ وہ ان اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہوں۔ اس سے حضرت آدم کا بمقابلہ ملائک فضل و کمال ظاہر ہوا

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں یہاں ایک شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ جو چیزوں آدم علیہ السلام کو بتلائیں اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیتے تو وہ بھی اسی طرح بتلا سکتے یہ تو ایسا ہوا کہ دو طلبہ کو شریک امتحان کریں اور ایک کو خلوت میں جواب سکھلا دیں اور پھر امتحان لیں۔ جواب یہ ہے کہ کہیں ثابت نہیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے سامنے بھی بتلایا ہو اور یہی احتمال خدا تعالیٰ کے لطف کے اعتبار سے راجح ہے تو اب وہ مثال صحیح نہیں ہوسکتی ہے بلکہ اب اس کی مثال ایسی ہے کہ استاد نے اقلیدس کی کسی شکل کی دونوں طلبہ کے سامنے تقریر کی مگر امتحان کے وقت ایک تو بوجہ مناسبت کے بتلا سکا اور دوسرا نہ بتلا سکا۔ کیونکہ علم کے لیے استعداد کی ضرورت ہے اور یہ استعداد حضرت آدم علیہ السلام ہی میں تھی۔ مثلاً بھوک کی حقیقت جبرئیل علیہ السلام نہیں سمجھ سکتے تو فرشتے باوجود سننے کے بھی اس لیے نہ بتلا سکے کہ ان میں اس کی استعداد نہ تھی۔ حق تعالیٰ شانہ نے اس امتحان سے یہ بتلا دیا کہ تم میں وہ استعداد نہیں اور وہی شرط تھی خلافت کی رہا یہ شبہ کہ جب آدم علیہ السلام نے ان کو بھی بتلا دیا تو وہ ضرور سمجھے ہوں گے تو ان میں بھی استعداد ثابت ہوگئی مگر یہ اعتراض لغو ہے کیونکہ بتلانے کے لیے مخاطب کا سمجھنا لازمی نہیں۔ اس لیے اَنْبَأَ فرمایا عَلَّمَ نہیں فرمایا۔ تعلیم کے معنی سمجھا دینے کے ہیں اور اَنْبَأَ کے معنی اخبار یعنی تقریر کر دینے کے ہیں گو مخاطب نہ سمجھا ہو اور یہ استعداد خاصہ بشر کا ہے۔ اگر فرشتوں کو یہ استعداد عطاء کر دی جائے تو فرشتے فرشتے نہ رہیں جیسے حس و حرکت خاصہ حیوان کا ہے اگر جماد میں یہ صفت پیدا فرما دیں تو جماد۔ جماد نہ رہے گا بلکہ حیوان بن جائے گا۔ لہذا اس سوال کا حاصل یہ ہوگا کہ فرشتون کو بشر کیوں نہ بنا دیا سو ظاہر ہے کہ یہ سوال بے معنی ہے جواب اس کا ظاہر ہے کہ اس صورت میں فرشتوں کے پیدا کرنے میں جو حکمت ہے وہ معطل ہو جائے گی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اول ہی فرشتوں کو بشر بنا کر خلیفہ

بنادیتے تو یہ مسئلہ تقدیر کا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کو بشر کیوں نہیں بنایا اس کی نسبت صرف یہی کہا جائیگا۔

حدیث مطرب دمی گودراز دھر کمتر جو ۔۔۔ کہ کس نہ کشود ونکشاید بحکمت ایں معمار۔

(ہذا کلہ ملخص من وعظ نفی الحرج پندرھواں وعظ از سلسلۂ تبلیغ) خلاصۂ کلام یہ کہ جب حضرت آدم کی فضیلت ظاہر ہوگئی تو فرشتوں کو ان کی تعظیم کا حکم ہوا چنانچہ فرماتے ہیں:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اور اے بنی آدم تم خاص طور پر اس احسان کو بھی یاد کرو کہ جس وقت ہم نے تمام فرشتوں کو تمہارے باپ کی تعظیم وتکریم کا حکم دیا کہ سب مل کر آدم کو سجدہ کرو تاکہ تمہارے باپ کی فضیلت اور فوقیت عملی طور پر علی الاعلان ظاہر ہوجائے بادشاہ جب کسی کو اپنا خلیفہ بناتا ہے تو ارکان دولت کو حکم دیتا ہے کہ اس کو نذر پیش کریں اور فوج کو سلامی کا حکم دیتا ہے تاکہ سب کو معلوم ہوجائے کہ اس خلیفہ کی فرمانبرداری کرنا ہوگی تو سب سجدہ میں گر گئے بعض روایات میں ہے کہ سب سے پہلے اسرافیل علیہ السلام نے سجدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مرتبہ عطاء فرمایا کہ تمام قرآن ان کی پیشانی پر لکھ دیا۔ رواہ ابن ابی حاتم وابو الشیخ وابن عساکر غرض یہ کہ سب فرشتے حکم الٰہی بجالائے اور سب نے آدم کو سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے حکم ماننے سے انکار کیا اور تکبر کیا اور اللہ کے علم میں وہ پہلے ہی سے کافروں سے تھا اگرچہ ظہور اس کے کفر کا اب ہوا اس لیے کہ حکم خداوندی کے امتثال سے انکار کرنا ایک کفر تو یہ ہوا۔ دوسرا کفر یہ کیا کہ حکم خداوندی کو خلاف حکمت اور خلاف مصلحت سمجھا، تیسرا کفر یہ کیا کہ اپنے تمرد اور سرکشی کو حکم خداوندی کے تعمیل سے بہتر سمجھا میں نے سنا ہے کہ اس زمانہ کے بعضے ملحد شیطان کو موحد اعظم کہتے ہیں۔ اللہ اکبر جو خبیث ذات اپنے کو خداوند ذوالجلال کا ہم پلہ اور ہم رتبہ سمجھتی ہو وہ تو مشرک اعظم ہے۔ شیطان کو موحد اعظم کہنا یہ اس شخص کے نادان اعظم اور احمق اعظم ہونے کی روشن دلیل ہے۔

ف:...... ابلیس اصل میں جنات سے ہے مگر ابتداء میں ملائکہ کے ساتھ اختلاط رکھتا تھا۔ فساد اور خونریزی کی وجہ سے جب جنات کو زمین سے نکال کر جزائر اور جبال میں منتشر کیا گیا تو ابلیس ان میں بہت بڑا عالم اور عابد تھا۔ فساد اور خونریزی سے اپنا بے لوث ہونا ظاہر کیا تو فرشتوں کی سفارش سے بچ گیا اور فرشتوں میں رہنے کی اجازت ہوئی مگر دل میں یہ طمع لگی رہی کہ کسی طرح زمین کی فرمانروائی مجھ کو مل جائے اس طمع میں خوب عبادت کرتا رہا۔ جب حضرت آدم کی خلافت کا وقت آیا اور تمام ملائک کو سجدہ کا حکم ہوا۔ تو ابلیس اس وقت ناامید ہوا اور استکبار اور حسد نے اس کو حق جل شانہ کے مقابلہ اور معارضہ پر آمادہ کیا اور ہمیشہ کے لیے ملعون ومطرود ورجیم ومردود ہوا۔

ابلیس اگرچہ ملائکہ میں سے نہیں کما قال تعالیٰ: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ (اور تھا ابلیس جنات میں سے) مگر خطاب سجود میں بتبعیۃ ملائکہ بالاولیٰ داخل تھا۔ بادشاہ جب سپاہیوں کو حکم دیتا ہے تو سائیس اور فراش بدرجہ اولیٰ اس حکم کے مامور ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ شیطان کو علاوہ ملائک کے سجدہ کا کوئی صریح حکم کیا گیا ہو جیسے ﴿مَا [1] مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ سے متبادر ہے۔

فائدہ:...... سجدہ کی دو قسمیں ہیں ایک سجدہ عبادت یعنی کسی کو خدا اور معبود سمجھ کر سجدہ کرنا اس قسم کا سجدہ تمام ملتوں میں کفر ہے

[1] یعنی تجھ کو سجدہ کرنے سے کیا چیز مانع ہوئی جبکہ تجھ کو میں نے حکم دیا تھا۔ ۱۲ مدیر

اور شرک ہے۔ اس قسم کا سجدہ کسی ملت اور شریعت میں کسی وقت میں جائز نہیں رکھا گیا۔ دوسرا سجدۂ تحیت وتکریم یعنی بطور تعظیم کسی کے سامنے سر جھکانا جیسے ابتداء ملاقات میں سلام کرتے ہیں۔ اسی طرح شرائع سابقہ میں بطور تسلیم یہ سجدہ تکریم مشروع تھا۔ شریعت محمدیہ نے اب اس کو بھی ممنوع اور حرام قرار دیا ہے جیسا کہ آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ سے اس کی حرمت ثابت ہے، دونوں سجدوں میں فرق اتنا ہے کہ سجدہ عبادت تو کفر ہے اور سجدہ تعظیم حرام ہے یوں کہو کہ سجدہ عبادت شرک اعتقادی اور سجدہ تعظیمی شرک عملی ہے تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سجدہ عبادت نہ تھا اس لیے کہ سجدہ عبادت سوائے خدا کے کسی کو کرنا کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کفر کا حکم نہیں دیتا۔ یہ سجدہ تعظیم وسلام تھا جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں ہے ﴿وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾

مناظرۂ ① عدوّ اللہ در بارۂ فضیلت خلیفۃ اللہ

"ابلیس علیہ اللعنة الی یوم القیام" نے جب سجدہ سے انکار کیا تو علت یہ بیان کی۔

﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ "اے خدا میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔"

اور آگ مٹی سے بہتر ہے اس لیے میں آدم سے بہتر ہوا مگر اس کا یہ دعویٰ کہ آگ مٹی سے بہتر ہے بالکل غلط بلکہ عنصر ترابی کا عنصر ناری سے بہتر ہونا متعدد وجوہ اور دلائل سے ثابت ہے۔

۱- آگ بالطبع مفسد اور مہلک ہے، احراق اور اتلاف اس کا خاصہ ہے بخلاف تراب کے کہ وہ نہ مہلک ہے نہ محرق۔

۲- آگ کی طبیعت ہی خفت اور حدت اور طیش سے بھری ہوئی ہے بخلاف تراب کے کہ اس میں رزانت ووقار سکون اور ثبات ہے۔

۳- زمین ہی حیوانات کے ارزاق واقوات اور انسانوں کے لباس اور زینت اور تمام سامان معیشت کا معدن اور منبع ہے، بخلاف آگ کے کہ وہ ان تمام نفع رسانیوں سے بالکل بیگانہ ہے۔

۴- عنصر ترابی کی ہر حیوان کو ضرورت ہے کوئی حیوان زمین سے مستغنی نہیں۔ بخلاف عنصر ناری کے کہ وحوش وبہائم تو اس سے بالکل مستغنی ہیں، انسان بھی بعض اوقات آگ سے مستغنی ہو جاتا ہے۔

۵- زمین میں کسی شے کا اگر ایک تخم بھی ودیعت رکھ دیا جاتا ہے تو زمین ایک تخم کو اضعافاً مضاعفہ بنا کر واپس کر دیتی ہے۔ آگ میں جو کچھ بھی رکھا جائے جلا کر سب کو خاکستر بنا دیگی۔

۶- حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں بکثرت زمین اور زمین کے منافع کا ذکر فرمایا ہے کہ زمین کو ہم نے مہاد اور فراش بساط اور قرار احیاء اور اموات کا ماوی اور ملجاء بنایا زندہ اس پر زندگی بسر کرتے ہیں اور مر کر اس میں دفن ہوتے ہیں اور بار بار زمین اور زمین کے عجائب میں تفکر اور تدبر کا حکم دیا۔ بخلاف آگ کے کہ اکثر وبیشتر اس کو موقع عقاب وعذاب اور مقام تخویف وترہیب میں ذکر فرمایا۔ صرف ایک دو جگہ یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ﴾ کہ یہ آگ آخرت کی

---

① یہ مناظرہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بدائع الفوائد: ۴/ ۱۳۹ میں ذکر فرمایا ہے۔

آگ کی یاددہانی اور مسافروں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

۷-حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں بار بار زمین کا منبع برکات اور سرچشمہ ہونا بیان فرمایا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَنْدَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ﴾ اس آیت میں برکت عامہ کا ذکر فرمایا۔ اور آیت ﴿وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ﴾ اور آیت ﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً﴾ اور آیت ﴿وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا﴾ میں ان برکات کو ذکر فرمایا کہ جو زمین کے خاص خاص قطعوں کو حاصل ہیں۔ بہرحال زمین برکات عامہ اور برکات خاصہ دونوں کا معدن اور منبع ہے۔ بخلاف آگ کے کہ وہ منبع برکات تو کیا ہوتی۔ اس کے برعکس وہ تو برکات کی مٹانے والی اور فنا کرنے والی ہے۔

۸-مساجد اور وہ بیوت کہ جن میں صبح وشام اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ ہر وقت اس کی عبادت اور بندگی سے معمور رہتے ہیں وہ سب زمین ہی پر واقع ہیں۔ تمام روئے زمین پر اگر سوائے اس بیت حرام کے جس کو خدا نے مبارک اور "هُدًى لِّلْعَالَمِينَ" اور "قِيَامًا لِّلنَّاسِ" فرمایا ہے اور کچھ بھی نہ ہوتا تو یہ زمین کے شرف اور فضیلت کے لیے کافی اور وافی تھا۔

۹-جو چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ آگ ان کی خدمت کے لیے ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے تب آگ سلگائی جاتی ہے۔ ضرورت ختم ہوتے ہی آگ کو بجھا دیا جاتا ہے۔ آگ زمین کے لیے بمنزلہ ایک خادم کے ہے اور زمین بمنزلہ مخدوم کے ہے۔

علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نار تراب سے بہتر ہے تب بھی یہ استدلال فاسد ہے اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ ایک شئے کا مادہ دوسری شئ کے مادہ سے مفضول اور کمتر ہو مگر وہ شئ بہ ہیئت موجودہ دوسری شئ سے افضل اور بہتر ہو مثلاً انبیاء مرسلین نطفہ اور علقہ سے پیدا کیے گئے اور ملائکہ نور سے پیدا کیے گئے مگر خدائے عزوجل نے انبیاء ومرسلین کو ملائکہ مقربین پر فضیلت دی آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنایا اور جبرئیل اور میکائیل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر وزیر بنایا اور ابوبکر وعمر کو زمین میں آپ کا وزیر اور مشیر بنایا اور اگرچہ آدم کو ہم نے زمین کی خلافت اور اس کی عمارت کے لیے پیدا کیا ہے مگر سردست ہم نے ان کو حکم دیا کہ اے آدم علیہ السلام تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ تاکہ بہشت کے محلات اور باغات اور چشموں اور نہروں کو دیکھ کر دنیا میں اس کا نمونہ قائم کر سکو اور فقط سیر پر اکتفا نہ کرو بلکہ چند روز وہاں کی رہائش اختیار کرو اور فی الحال اس کو وطن سکونت بناؤ۔ تاکہ اس کی تعمیر کی کیفیت خوب ذہن نشین ہو جائے۔ اور حضرت حواء کو جنت میں رہنے کا اس لیے حکم دیا گیا کہ وہ بہشت کے محلوں کی آرائش اور ان کی زیب وزینت اور وہاں کے زیورات اور حریری لباس کو خوب غور سے دیکھ لیں۔ اور سمجھ لیں تاکہ دنیا کی عورتوں کو اس طریق پر چلا سکیں اور کھاؤ تم اس بہشت سے خوب وسعت اور فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو تاکہ تمام ماکولات اور مشروبات کے خواص اور آثار، منافع اور مضار تم کو معلوم ہوں اور پھر اسی علم کے مطابق دنیا کے ماکولات ومشروبات میں تصرف کر سکو اور زمین میں جو شجر اور ثمر تمہارے لیے پیدا کیے گئے ہیں ان سے نفع اٹھا سکو۔ مگر باوجود اس عام اجازت کے بطور ابتلاء اور امتحان جس میں تمہارے لیے سراسر خیر ہی خیر ہے ہم تم کو بعض چیزوں کے استعمال سے منع بھی کرتے ہیں تاکہ تم لذائذ اور مرغوبات کے خوگر نہ ہو جاؤ اور وہ یہ کہ تم اس درخت کے قریب بھی نہ جانا۔ درخت کے تعین میں علماء کے اقوال مختلف ہیں کسی آیت یا حدیث صحیح سے ثابت نہیں کہ وہ

کیا درخت تھا۔ گیہوں کا تھا کہ انجیر کا۔ زیتون کا تھا یا انگور کا۔ سلف اور خلف میں مشہور یہی ہے کہ وہ گیہوں کا درخت تھا اور اصل حقیقت خدا ہی کو معلوم ہے کہ وہ کیا درخت تھا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس کا علم کچھ مفید اور نافع نہیں اور اس کا جہل کچھ مضر نہیں۔ غرض یہ کہ تم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

ف:...... حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کو جس جنت میں رہنے کا حکم ہوا تھا اس سے وہی جنت الخلد مراد ہے جس کا قیامت کے بعد متقین سے وعدہ ہے جیسا کہ قرآن کریم کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے پیشتر آیت ﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ میں اسی جنت الخلد کا ذکر ہو چکا ہے اس کے بعد حضرت آدم اور حوا کو ﴿يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ کا حکم ہوا اور الجنۃ کو معرف باللام ذکر فرمایا جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اس مقام پر الجنۃ سے معہود اور معروف جنت مراد ہے جس کا سابق میں ذکر ہو چکا ہے پھر اس کے بعد جب حضرت آدم کے ہبوط کا ذکر فرمایا اور ہبوط کے معنی اوپر سے نیچے اترنے کے ہیں بعد ازاں یہ فرمایا ﴿وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ابتداء میں جس جگہ رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ زمین کے علاوہ کوئی اور جگہ تھی۔ ورنہ اگر پہلے ہی سے زمین پر تھے تو پھر اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ تم زمین پر اترو اور وہاں جا کر ٹھہرو۔

صحیح مسلم میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ اول حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور یہ عرض کریں گے:

"یا ابانا استفتح لنا الجنۃ فیقول وھل اخرجکم من الجنۃ الا خطیئۃ ابیکم"۔

''اے ہمارے باپ آپ علیہ السلام ہمارے لیے جنت کا دروازہ کھلوائیے تو آدم یہ جواب دیں گے کہ تمہارے باپ کی غلطی تو تم کو جنت سے باہر لائی ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اسی جنت سے نکالے گئے تھے کہ جس جنت کا دروازہ مومنین کھلوانا چاہتے ہیں۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"احتج آدم وموسیٰ عند ربھما فحج آدم موسی قال موسیٰ انت آدم الذی خلقك الله بیدہ ونفخ فیك من روحہ واسجد لك ملائکتہ واسکنك فی جنۃ ثم اھبطت الناس بخطیئتك الارض الی آخر" الحدیث۔

''عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام وموسیٰ علیہ السلام کا مناظرہ ہوا۔ آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ تو وہی آدم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور اپنی خاص روح تم میں پھونکی۔ اور فرشتوں سے تم کو سجدہ کرایا اور اپنی جنت میں تم کو سکونت عطاء فرمائی اور پھر تم ہی نے لوگوں کو اپنی خطاء سے جنت سے زمین کی طرف اتارا۔''

یہ حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ ﴿يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ میں "الجنۃ" سے وہی جنت مراد ہے جو آسمان پر ہے حاشا جنت سے زمین کا کوئی باغ مراد نہیں جیسا کہ بعض کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ آدم کو جس جنت میں رہنے کا

حکم دیا گیا تھا وہ دنیا ہی کے باغوں میں سے کوئی گھنا اور گنجان باغ تھا یہ بالکل غلط ہے پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آیت میں جنت سے کوئی دنیاوی باغ مراد ہے جہاں حضرت آدم وحوا علیہما السلام آرام سے رہتے تھے اس باغ میں شیطان نے جا کر حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو دھوکہ دیا یہ قول بالکل غلط ہے اور ذرہ برابر قابل التفات نہیں۔ رہا یہ سوال کہ جنت میں جانے کے بعد وہاں سے نکلنا نہیں تو حضرت آدم علیہ السلام جنت میں جانے کے بعد کیسے نکلے، جواب یہ ہے کہ قیام قیامت کے بعد جو جنت میں داخل ہوگا وہ کبھی جنت سے نہ نکالا جائے گا۔ اللہ نے دخول جنت پر جو خلود اور دوام کا وعدہ فرمایا اس دخول سے وہ دخول جنت مراد ہے جو قیام قیامت اور جزاء اور سزا کے بعد ہوگا۔ کیا احادیث صحیحہ سے یہ ثابت نہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے لیلۃ المعراج میں جنت کی بھی سیر فرمائی اور پھر صبح سے قبل ہی اس عالم میں تشریف لے آئے اسی طرح حضرت آدم کے دخول کو سمجھئے۔

خلاصۂ کلام:...... یہ کہ حق جل شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو آئین خلافت سیکھنے کے لیے قسم قسم کی اشیاء سے تمتع اور انتفاع کے طریقے معلوم کرنے کے لیے اپنے حرم خاص جنت میں چندروزہ سکونت کے لیے حکم دیا اور تمام اشیاء سے تمتع اور انتفاع کی عام اجازت عطاء فرمائی۔ صرف ایک قسم کے درخت سے منع فرمایا۔ شیطان تاک میں تھا کہ ان سے کوئی گناہ اور لغزش صادر ہو مگر گناہ اور لغزش اسی وقت ہو سکتی ہے جب کوئی قید اور ممانعت ہو جب کسی چیز کی ممانعت ہی نہ ہو تو معصیت کیسے سرزد ہو۔ شیطان کو جب ﴿لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ کی نہی اور ممانعت کا علم ہوا تو سمجھا کہ شاید اس راہ سے آدم علیہ السلام پر میرا کوئی وار چل جائے اور اس طرح اپنی دشمنی نکالنے کا موقع مل جائے، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے بہکانے اور پھسلانے کی فکر شروع کی۔ حضرت آدم اور حضرت حواء کے پاس گیا اور یہ کہا کہ تم اپنی اس تعظیم وتکریم پر مغرور نہ ہونا۔ انجام کو بھی سوچو۔ انجام تمہارا موت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ موت کیا ہے۔ شیطان نے مردہ جانور کی صورت بنا کر نزع اور قبض روح کی طرح کچھ کیفیت اور شدت اور غرغرہ کی حالت ان کو دکھلائی دیکھتے ہی گھبرا گئے اور خوف زدہ ہو کر پوچھا کہ اچھا اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر کیا ہے۔

شیطان نے کہا ﴿هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ ''کیا میں تم کو اس درخت کی نشان دہی نہ کروں کہ جس کے کھانے سے موت اور فنا نہ آئے اور بقاء اور دوام اور دائمی سلطنت اور لازوال بادشاہت حاصل ہو جائے۔''

حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا وہ کون سا درخت ہے۔ شیطان نے وہی درخت بتلایا جس کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو منع کیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ یہ درخت تو فنا اور زوال کا ہے۔ بقاء اور دوام کا نہیں بلکہ رسوائی اور ندامت کا درخت ہے۔ قرب اور وجاہت کے بجائے بُعد اور ذلت کا موجب ہے اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے ہم کو اس کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ اگر اس درخت میں یہ فائدے ہوتے تو وہ ارحم الراحمین ہم کو منع نہ فرماتا۔ شیطان نے کہا۔

﴿مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ﴾ ''تمہارے پروردگار نے اس درخت سے اس لیے منع نہیں کیا کہ اس کا پھل تمہارے لیے موجب ضرر ہوگا بلکہ اس لیے منع کیا ہے کہ تم اس کے کھانے سے ہمیشہ زندہ رہنے والے یا فرشتے بن جاؤ گے جو ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے اور کھانے اور پینے اور زن وفرزند اور دنیا ومافیہا سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔''

پس اگر یہ حالت تم کو حاصل ہو جائے تو خلافت کا کام کیسے انجام پائے۔ دنیا کی خلافت کا کام تو زن وفرزند اور طعام

وشراب اور کسب معاش کی فکر میں مشغولی سے انجام پا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ زن و فرزند میں مشغول رہ کر خدا کے ساتھ مشغول نہیں رہ سکتا۔

حق تعالیٰ شانہ کو چونکہ تم سے خلافت کا کام لینا ہے اس لیے تم کو اپنے سے دور بھیج رہا ہے اور اس درخت کے میوہ کا استعمال خداوند ذوالجلال کے قرب و اتصال کا موجب ہے اور بہشت میں موت نہیں۔ تم کو محض آئین خلافت کے سکھانے کے لیے چند روز بہشت میں رہنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد تم کو اپنی بارگاہ قرب سے علیحدہ کر کے دنیا میں بھیجے گا۔ وہاں جا کر تم اور تمہاری اولاد طرح طرح کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوں گے اور انجام سب کا موت ہوگا اور خداوند ذوالجلال کا قرب اور وصال اور یہاں کا یہ ملک لازوال دنیا میں جانے کے بعد اور خلافت ارضی کے ملنے کے بعد باقی نہیں رہ سکتا۔

حضرت آدم علیہ السلام اور حواء ابلیس کی ان دلفریب باتوں سے تردد اور اضطراب میں پڑ گئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک عاشق صادق حکومت اور سلطنت کو چھوڑ سکتا ہے مگر محبوب کی مفارقت اور جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ عاشق صادق کے لیے تو مفارقت کا ملفظ ہی فراق روح کا پیغام ہوتا ہے۔ ابلیس نے جب دیکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام تردد میں پڑ گئے تو ان کو پختہ کرنے کے لیے بہت سی قسمیں کھائیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ کہ خدا کی قسم محض تمہاری خیر خواہی سے تم کو یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ تم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے جو بے ادبی اور گستاخی مجھ سے سرزد ہو چکی ہے اس خیر خواہی سے اس کی کچھ تلافی کر دوں تا کہ عمر بھر تم مجھ کو یاد کرو اور میرے شکر گزار رہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہوا کہ مخلوق کی یہ جرات اور مجال نہیں کہ خداوند ذوالجلال پر جھوٹی قسم کھائے اور اس تاکید کے ساتھ کھائے۔ اس لیے بظاہر یہ سچ ہوگا اور قرب اور وصال کے حصول کے شوق میں ﴿لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ کے حکم سے ذہول ہو گیا اور اس کی عداوت کو بھی بھول گئے ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا﴾ پس شیطان نے آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو اس درخت کے بچنے سے اس طرح پھسلا دیا اور معلوم نہیں کہ حضرت حوا اور حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے اس لعین نے کیا کیا دلفریب باتیں بنائیں ہوں گی جس سے وہ دھوکہ میں آ گئے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں بجائے ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا﴾ کے ﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا﴾ آیا ہے۔ کما فی الکشاف۔ اس قراءت میں لغزش کی ایک کیفیت کا بیان ہے۔ شیطان نے بذریعہ وسوسہ حضرت آدم اور حوا کو لغزش دی ﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا کَانَا فِیْهِ﴾ پس نکالا ان دونوں کو اس راحت اور آرام سے جس میں وہ تھے اور گناہ کی برائی ظاہر کرنے کے لیے ہم نے آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام سے کہا کہ اترو تم بہشت سے اس لیے کہ تم میں سے بعض بعض کا دشمن ہوگا۔ اور بہشت نہ معصیت کا محل ہے نہ عداوت اور دشمنی کا۔ اس کے لیے تو دار دنیا ہی موزوں اور مناسب ہے دنیا ہی میں خدا کی نافرمانی اور آپس کی عداوت ممکن ہے خدا کی بہشت اور ساتوں آسمان حق جل وعلاء کی معصیت سے بالکلیہ پاک اور آپس کی عداوت سے بالکل منزہ ہیں۔

فائدہ: ...... ﴿اهْبِطُوْا﴾ کا خطاب حضرت آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام کو ہے جیسا کہ دوسری جگہ ﴿قُلْنَا اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًا﴾ بصیغہ تثنیہ وارد ہوا ہے۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام ابو البشر اور حضرت حوا ام البشر علیہا السلام ہونے کی وجہ سے تمام بنی نوع انسان کے قائم مقام ہیں اس لیے اس جگہ ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا﴾ حضرت آدم اور حوا کو صیغہ جمع کے ساتھ مخاطب فرمایا اور چند روز تک تم کو زمین پر

ٹھہرنا ہے اور وہاں کے ساز و سامان سے ایک وقت معین تک تم کو متمتع اور منتفع ہونا ہے یعنی وہ انتفاع دائمی نہ ہوگا بلکہ ایک وقت معین تک ہوگا اور وہ وقت معین ہر شخص کے لحاظ سے تو موت ہے اور سارے عالم کے اعتبار سے قیامت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اس خطاب سراپا عتاب کو سنتے ہی بے چین اور بے تاب ہو گئے۔ فوراً بارگاہ خداوندی میں ایسے تضرع اور ابتہال کے ساتھ ملتجی ہوئے کہ سارے عالم کا تضرع اور ابتہال بھی اس کے پاسنگ نہیں ہوسکتا۔ حق تعالیٰ شانہ کی شان عفو اور مغفرت جوش میں آ گئی۔

اے خوشا چشمے کہ آں گریان اوست وے ہمایوں دل کہ آں بریان اوست

در پئے ہر گریہ آخر خندہ ایست مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

اور حضرت آدم کو توبہ اور معذرت کے کلمات تلقین فرمائے گئے۔ ابلیس کی معصیت چونکہ تمرد اور سرکشی کی بناء پر تھی۔ اس لیے اس کو توبہ اور معذرت کی تلقین نہیں فرمائی۔ اور حضرت آدم کی معصیت سہو اور نسیان اور ذہول اور غفلت کی بناء پر تھی اس لیے ان کو بارگاہ خداوند سے کلمات معذرت کا القاء اور الہام ہوا جو ان کی توبہ کی قبولیت کا سبب ہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ پس حاصل کیے آدم نے اپنے رب کے الہام سے معذرت کے چند کلمے۔ پس توجہ فرمائی ان پر اللہ نے اپنی رحمت اور مغفرت سے۔ اور بیشک وہی توبہ قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ توّاب کے بعد رحیم کی صفت ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ توبہ کا قبول کرنا اس پر واجب نہیں محض اپنی رحمت سے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور وہ کلمات یہ ہیں: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ جیسا کہ سورہ اعراف میں ان کا ذکر ہے۔

فائدہ ا:...... حضرت حواء چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے تابع تھیں۔ اس لیے اس جگہ ان کی توبہ کا ذکر نہیں فرمایا۔ اور سورہ اعراف میں دونوں کی توبہ ذکر فرمائی۔ ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا﴾ الخ یعنی دونوں نے کہا ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا﴾ الخ اس پر اللہ نے اپنی رحمت سے ان کے گناہ کو معاف کیا اور توبہ کو قبول فرمایا اور اللہ تعالیٰ کے محبوب بن گئے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ﴾ (اللہ تعالیٰ توابین کو محبوب رکھتا ہے)۔

فائدہ ۲:...... توبہ کے اصلی معنی رجوع کے ہیں اور "أَوْب" کے معنی بھی رجوع کے ہیں۔ تائب اور تواب اس کو کہتے ہیں کہ جو معصیت سے طاعت کی طرف رجوع کرنے اور آئب اور اوّاب وہ ہے جو غفلت سے ذکر اور فکر کی طرف رجوع کرے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ﴾ اور جب "تَابَ" کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف کی جائے مثلاً "تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا" کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کے انتقام اور عقوبت سے عفو اور رحمت اور لطف وعنایت کی طرف رجوع فرمایا۔

فائدہ ۳:...... حضرت آدم علیہ السلام کے توبہ قبول ہو جانے سے عیسائیوں کے عقیدہ کی تردید ہوگئی کہ آدم کی معصیت کی وجہ سے ان کی تمام اولاد گناہ کے بوجھ میں لدی ہوئی تھی عیسیٰ نے آ کر تمام بنی آدم کو اپنی صلیبی موت سے گناہوں سے مخلصی دی۔ نصاریٰ کا یہ عقیدہ بالکل مہمل ہے عقل اور نقل کے خلاف ہے۔

ازالۂ اشتباہ از لغزش سیدنا وابینا آدم علیہ الصلاۃ والسلام

وتحقیق مسلک علماء اسلام در بارۂ عصمت انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام

قبل اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب دیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے باوجود اول الانبیاء اور نبی مکلم اور رسول محترم ہونے کے یہ زلت (1) (لغزش) کیسے صادر ہوئی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسئلہ عصمت انبیاء کی مختصراً توضیح اور تشریح کردی جائے اور عصمت اور معصیت کی حقیقت سمجھا دی جائے۔ اصل مسئلہ سمجھ جانے کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی اشکال نہ رہے گا اہل حق کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام خداوند ذوالجلال کی نافرمانی سے معصوم ہوتے ہیں۔ صغیرہ اور کبیرہ سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ قصداً اور ارادۃً ان سے حق تعالیٰ کی نافرمانی ممکن نہیں۔ اگر قصداً ان سے حکم الٰہی کی مخالفت ممکن ہوتی تو حق جل شانہ۔ مخلوق کو ان کی بے چون وچرا اطاعت (2) اور متابعت کا حکم نہ دیتا اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت نہ قرار دیتا اور انبیاء کرام کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو اپنے ہاتھ پر بیعت کرنا نہ قرار دیتا۔

قال تعالیٰ: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ ''تحقیق جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔''

دست او را حق چو دست خویش خواند تا ید اللہ فوق ایدیھم براند

اور ظاہر ہے کہ یہ اتباع نبوی اور اقتداء مطلق کا حکم جو آیات قرآنیہ سے ثابت ہے وہ کسی خاص امر کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عقائد لے کر اعمال تک کوئی عقیدہ اور کوئی خلق اور کوئی حال اور کوئی عمل کیوں نہ ہو سب میں اقتداء نبوی ضروری ہے جیسا کہ مقتضائے اطلاق یہی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام کی ذوات بابرکات۔ قدسی صفات اور ملکی سمات ہوتی ہیں۔ انبیاء کرام کی اصل فطرت وہی ہوتی جو ملائکہ کی ہوتی ہے۔ فطرت کے اعتبار سے انبیاء اور ملائکہ ایک ہوتے ہیں۔ فرق فقط لباس بشری کا ہوتا ہے اور عصمت ملائکہ کا خاصہ لازمہ ہے اور انبیاء کرام، ملائکہ سے افضل ہیں جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ اس پر شاہد عدل ہے۔ ابلیس لعین اسی وجہ سے ملعون اور مطرود ہوا کہ اس نے حضرت آدم کی افضلیت اور برتری کو تسلیم نہیں کیا جس سے ثابت ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام ملائکہ معصومین سے افضل اور برتر ہیں اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم معصوم سے افضل نہیں ہوسکتا۔

---

(1) زلت بمعنی لغزش فتح زاء کے ساتھ ہے جس کے معنی بلا ارادہ اور اختیار قدم پھسل جانے کے ہیں۔ یہ لفظ زاء کے ساتھ ہے ذال کے ساتھ نہیں۔ ذال کے ساتھ لفظ ذلت بکسر ذال ہے جو عزت کی ضد ہے اور قرآن کریم میں ﴿فَاَزَلَّهُمَا﴾ زاء کے ساتھ آیا ہے، ذال کے ساتھ نہیں۔ خوب سمجھ لو کہیں لغزش نہ ہو جائے۔

(2) حافظ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: واز انجملہ آنست کہ ہونائے ایشاں پے فرمان حق بودہ است ونفس ایشاں ہموار در طاعت او بفرمان ایشان واز یں وجہ ایشاں از نافرمانی خدا بقصد معصوم مانند وایشاں واجب العصمت اند ومخالفت امر خدائے تعالیٰ برایشاں روا نیست زیرا کہ حق خلق را فرمودہ است کہ پیروی ایشاں بکنند واگر عصیاں بقصد از ایشاں یافت شدے خدائے تعالیٰ خلق را متابعت ایشاں نفرمودے۔ (معتمد فی المعتقد، ص: ۶۳)

عصمت کے معنی:...... عصمت کے معنی یہ ہیں کہ ظاہر و باطن نفس اور شیطان کی مداخلت سے پاک اور منزہ ہوں اور نفس اور شیطان یہی دو چیزیں مادہ معصیت ہیں اور مادہ معصیت سے پاک ہونے کا نام عصمت ہے اور معصوم وہ شخص ہے جو اپنے تمام اعتقادات اور نیات اور ارادات اور مقامات اور اخلاق و عادات اور عبادات و معاملات اور اقوال و افعال میں نفس اور شیطان کی مداخلت سے محفوظ ہو اور حفاظت غیبی اس کی محافظ اور نگہبان ہو کہ ان سے کوئی ایسی شئ سرزد نہ ہو جائے کہ ان کے دامن عصمت کو آلودہ کر سکے۔ حق تعالیٰ کی نظر عنایت اور فرشتوں کی محافظت ان کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہو جو کشاں کشاں ان کو راہ راست پر چلاتی ہو اور خلاف حق کے میلان سے بھی ان کی مانع ہو حق جل شانہ نے قرآن کریم میں انبیاء کرام کو مرتضیٰ اور مصطفین [۱] الاخیار اور عباد مخلصین فرمایا ہے۔ جس سے "من کل الوجوہ ارتضا" اور "اصطفاء" اور اخلاص کامل مراد ہے اور مخلص وہ ہے کہ جو خالص اللہ کا ہو غیر اللہ کا اس میں شائبہ نہ ہو یعنی مادہ شیطانی سے بالکلیہ پاک ہو لہٰذا ضروری ہوا کہ نبی صغائر اور کبائر دونوں سے معصوم ہو اس لیے کہ مادہ شیطانیہ ہی صغائر اور کبائر کا منشاء ہے اور حق جل شانہ کے اس ارشاد ﴿اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ میں لفظ "مِنْ" بیانیہ ہے اور لفظ رسول نکرہ لایا گیا ہے معلوم ہوا کہ ہر رسول کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا پسندیدہ اور برگزیدہ بندہ ہو یعنی تمام اخلاق و عادات اور افعال و ملکات اور احوال و مقامات میں من کل الوجوہ حق تعالیٰ کا برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ ہو اور بلا شرکت غیرے خالص اللہ کا بندہ ہو اور ظاہر ہے کہ ان آیات میں بعض وجوہ سے پسندیدگی مراد نہیں اس لیے کہ بعض وجوہ سے تو ہر مسلمان خدا کا پسندیدہ بندہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کے اصطفاء اور اجتباء اور ارتضاء سے من کل الوجوہ پسندیدگی اور برگزیدگی مراد ہے من کل الوجوہ پاک وصاف اور خدا کا پسندیدہ اور بلا شرکت غیر خالص حق تعالیٰ کا بندہ وہی ہو سکتا ہے جس کا ظاہر و باطن نفس اور شیطان کی بندگی اور اطاعت سے بالکلیہ پاک ہو اور اسی مادہ معصیت سے بالکلیہ پاک ہو اور اسی مادہ معصیت سے بالکلیہ طہارت اور نزاہت کا نام عصمت ہے اور اصطفاء اور ارتضاء باب افتعال کے مصدر ہیں جو اپنے لیے ہوتا ہے۔ اکتیال اور اتزان اپنے لیے کیل و وزن کرنے کو کہتے ہیں اور کیل اور وزن عام ہے خواہ اپنے لیے ہو یا غیر کے لیے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾ اپنے لیے کیل کرنے کو ﴿اكْتَالُوْا﴾ یعنی باب افتعال کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا اور دوسروں کے لیے تولنے کو کالوہم اور اوزنوہم ثلاثی مجرد سے تعبیر کیا گیا پس اس قاعدہ لغویہ کے بناء پر اصطفاء اور ارتضاء کے معنی اپنے لیے پسندیدہ اور برگزیدہ بنانے کے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾ پس عصمت کا ماحصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تمام اخلاق و ملکات و عادات و حالات۔ اقوال و افعال عبادات و معاملات میں سرتاپا پسندیدہ خداوندی اور برگزیدہ ایزدی ہوتے ہیں اور ظاہراً اور باطناً دخل شیطانی اور عوارض نفسانی سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے بھی عنایت ربانی وحمایت یزدانی

---

[۱] کما قال تعالیٰ: ﴿وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ۝ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ﴾ وقال تعالیٰ حاکیا عن اللعین: ﴿رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾

سے علیحدہ نہیں ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء کی بے چون وچرا اطاعت فرض ہے اور ان کا ہر قول اور ہر فعل قابل قبول ہے اور ان کی اطاعت سے انحراف شقاوت ابدی اور خسران دارین کا موجب ہے حضرات انبیاء کرام سے اگر کسی وقت بمقتضائے بشریت کوئی لغزش بطور سہو ونسیان صادر ہو جاتی ہے تو وہ باہر سے آتی ہے اندر سے نہیں آتی جیسے آب گرم میں حرارت خارجی اثر سے آتی ہے باقی پانی میں مادہ حرارت کا نام ونشان نہیں پانی کی طبیعت میں سوائے برودت کے کچھ بھی نہیں یہی وجہ ہے کہ پانی کتنا ہی گرم ہو اگر آگ پر ڈال دیا جائے تو آگ فوراً بجھ جاتی ہے اسی طرح حضرات انبیاء کرام کا باطن مادہ معصیت (نفس وشیطان) سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ البتہ کبھی خارجی اثر سے کوئی لغزش ہو جاتی ہے لیکن فوراً ہی دست قدرت اس باہر سے آئے ہوئے غبار کو چہرہ عصمت سے صاف کر دیتا ہے اور چہرہ نبوت پہلے سے زیادہ صاف اور روشن ہو جاتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصہ میں حق جل شانہ ارشاد۔

﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴾ ''اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے خالص بندوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے تاکہ (یوسف علیہ السلام) سے برائی اور بے حیائی یعنی صغیرہ اور کبیرہ کو اس سے دور رکھیں کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔''

اسی طرف مشیر ہے کیونکہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ سوء اور فحشاء کو یوسف علیہ السلام سے دور رکھیں اور یہ نہیں فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو سوء اور فحشاء سے دور رکھیں۔ پھیرنا اور ہٹانا اور دور رکھنا اس کے حق میں ہوتا ہے جو آنا چاہتا ہو معلوم ہوا کہ سوء اور فحشاء حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف آنا چاہتا تھا۔ جس کو حق تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی طرف آنے سے روک دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام ادھر جانا نہیں چاہتے تھے۔ معاذ اللہ اگر حضرت یوسف کا میلان سوء اور فحشاء کی طرف ہوتا تو حق تعالیٰ اس طرح فرماتے ﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَهٗ عَنِ السُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ﴾ یعنی ہم نے یوسف کو سوء اور فحشاء سے روکا اور بچایا معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام تو سوء والفحشاء سے بھاگ رہے تھے مگر سوء اور فحشاء ان کے پیچھے لگا ہوا تھا جس کو دست قدرت نے دھکے دیدیے اور یوسف علیہ السلام کو بالکل بچا لیا کیونکہ یوسف علیہ السلام تو خالص اللہ کے بندے تھے ان کا قلب مادہ معصیت سوء اور فحشاء سے بالکلیہ پاک تھا زلیخا کی طرف سے یہ سوء اور فحشاء چلا مگر حق تعالیٰ کی رحمت اور عنایت نے اس کو خدا مخلص اور برگزیدہ بندہ تک پہنچنے نہ دیا۔

غرض یہ کہ خارجی اثر کی بناء پر حضرات انبیاء کرام سے بطریق سہو ونسیان جو لغزش ہو جاتی ہے تو محض صورت کے اعتبار سے اس پر عصیان یا معصیت کا اطلاق ہو جاتا ہے یا ان کے مقام عالی اور مرتبہ علیا کے لحاظ سے اس کو عصیان کہہ دیا جاتا ہے۔

معصیت کے معنی: ......اور معصیت (گناہ) مطلق مخالفت حکم کا نام نہیں بلکہ معصیت اس مخالفت کو کہتے ہیں جو عمداً اور قصداً اور بوجہ نسیان اور غلطی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موقع عذر میں یوں کہا کرتے ہیں کہ میں بھول گیا تھا یا میں سمجھا نہ تھا اگر باوجود نسیان اور غلط فہمی کے بھی کسی مخالفت کو معصیت اور گناہ اور جرم کہا جائے تو پھر موقع عذر میں یہ کہنا کہ میں بھول گیا تھا تو سراسر لغو ہوگا۔

معلوم ہوا کہ مطلق مخالفت کا نام معصیت نہیں بلکہ معصیت اس مخالفت کو کہتے ہیں جو عمداً ہو اور جو مخالفت سہو اور

نسیان کی بناء پر ظہور میں آئے یا بتقاضائے عظمت یا بتقاضائے محبت کوئی مخالفت سرزد ہو جائے تو اس کو معصیت اور گناہ نہیں کہتے بلکہ اس کو "زَلّت" اور لغزش کہتے ہیں۔ جیسے کوئی مخدوم اپنے کسی چھوٹے کو سرہانے بیٹھنے کو کہے اور وہ اس کے کہنے کو نہ مانے تو یہ سرکشی اور معصیت نہیں بلکہ عین ادب اور دلیل اطاعت ہے صلح حدیبیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لفظ رسول اللہ مٹا دینے سے انکار کر دینا اسی قبیل سے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کا گیہوں کھا لینا بھول چوک کی بناء پر تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾۔ حضرت آدم حق جل شانہ کی ممانعت ﴿لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ کو بھی بھول گئے اور شیطان کی عداوت سے بھی ذہول ہو گیا اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ لَّكُمَا فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى﴾ یہ بھی یاد نہ رہا سو یہ ماجرا بھولے سے ہو گیا اور بھول چوک کو گناہ اور جرم قرار دینا سراسر غلط ہے۔ حضرت آدم اور حواء دونوں جنت پر شیدا اور فریفتہ تھے اس لیے ابلیس کی قسم سے دھوکہ میں آ گئے اور یہ سمجھے کہ خدا کا نام لے کر کوئی جھوٹ نہیں بول سکتا، نیز حضرت آدم کا گیہوں کو کھا لینا بتقضائے محبت خداوندی تھا۔ خلود اور قرب خداوندی کے شوق میں تھا۔ جیسا کہ ﴿مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ﴾۔ اس پر دلالت کرتا ہے نیز بتقضائے عظمت بھی تھا اس لیے کہ جب شیطان نے یہ قسم کھائی ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ﴾ تو حضرت آدم کو یہ شبہ بھی نہیں ہوا کہ خدا کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے گا وہ یہ سمجھے کہ بندہ خدا تعالیٰ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا پس معلوم ہو گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ فعل بارادہ مخالفت نہ تھا اور نہ بتقاضائے ہوائے نفسانی تھا۔ بلکہ بتقاضائے محبت وعظمت خداوندی تھا لہٰذا اس کو [illegible]ت اور گناہ نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ از قسم زلت ولغزش ہے، یعنی ارادہ تو اطاعت اور قرب خداوندی کا تھا مگر دشمن نے ایسا دھوکہ دیا کہ قدم پھسل کر دوسری جانب جا پڑا اسی کی لغزش کہتے ہیں۔ ﴿فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ﴾ اور ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ لغزش تھی جو بھولے سے ہو گئی ارادہ نافرمانی کا نہ تھا۔

پس جن آیات قرآنیہ میں اس فعل پر معصیت کا اطلاق کیا گیا ہے وہ محض ظاہر اور صورت کے اعتبار سے ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں یا ان کے مقام بلند اور رتبہ عالیہ کی نسبت سے اس کا نام عصیان رکھا گیا۔ (مباحثہ شاہجہان پور، ص: ۴۷۔۴۸)

اور حضرات انبیاء کے حق میں ترک اولیٰ ایسا ہے جیسا کہ دوسروں کے حق میں خطاء (حاشیہ ملا عبدالحکیم علی خیالی، ص: ۲۹۱)

حضرات انبیاء کی خطاء کے معنی یہ ہیں کہ افضل اور اولیٰ سے چوک گئے اور بھولے سے غیر اولیٰ اور غیر افضل کے مرتکب ہونے اور [illegible]ں کی خطاء کے معنی یہ ہیں کہ حق اور ہدایت سے چوک گئے اور باطل اور ضلالت میں مبتلا ہو گئے۔ حضرات انبیاء کرام باجماع امت ایسی خطاء سے معصوم ہیں۔ حضرات انبیاء کی خطاء اجتہادی کے یہ معنی ہیں کہ کسی وقت بھول چوک سے اولیٰ وافضل کے بجائے خلاف اولیٰ امر ان سے صادر ہو جاتا ہے۔ اور بجائے عزیمت کے رخصت پر عمل کر لیتے ہیں۔

حضرت آدم کی زَلّت اور لغزش کو اسی معنی پر محمول کرنا چاہیے اور یہ معلوم رہنا چاہیے اگر بالفرض والتقدیر انبیاء کرام معاذ اللہ ہماری طرح اسیر حرص وشہوت ہوتے تو خدا تعالیٰ ہم پر ان کی بے چون وچرا اطاعت اور متابعت فرض نہ کرتا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خلاصہ موجودات اور زبدۂ کائنات ہیں ان کو انبیاء کرام کی اقتداء کا حکم نہ دیتا اور یہ ارشاد نہ فرماتا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (کذا فی المعتمد فی المعتقد للحور بشتی)

امام ① ابومنصور ماتریدی فرماتے ہیں کہ نظر اور فکر کا اقتضاء یہ ہے کہ انبیاء کرام کے حق میں عصمت کا اعتقاد۔ ملائکہ کی عصمت کے اعتقاد سے زیادہ مؤکد اور اہم ہو اس لیے کہ لوگ انبیاء کرام کی اتباع اور متابعت پر مامور ہیں اور ملائکہ کی اطاعت پر مامور نہیں۔ (المعتمد فی المعتقد للعور بشتی، ص: ۷۳)

متعلقات عصمت

امام رازی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ عصمت کا تعلق چار چیزوں سے ہے اول عقائد۔ دوم تبلیغ احکام۔ سوم فتویٰ اور اجتہادات۔ چہارم۔ افعال وعادات وسیرت وکردار۔

قسم اول:...... یعنی عقائد کے متعلق اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرام ابتداء ہی سے توحید اور ایمان پر مفطور ہوتے ہیں، جب سے پیدا ہوتے ہیں اسی وقت سے ان کے قلوب کفر اور شرک سے پاک اور منزہ اور ایقان وعرفان سے لبریز ہوتے ہیں اور ان کے مبارک چہرے معرفت اور قرب الٰہی کے انوار وتجلیات سے ہر وقت جگمگاتے رہتے ہیں آج تک کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوا کہ حضرت حق جل شانہ نے اپنی نبوت ورسالت کے لیے کسی وقت بھی ایسے شخص کو منتخب فرمایا ہو جو اس عظیم الشان منصب کی سرفرازی سے پہلے کفر اور شرک کی نجاست میں ملوث اور آلودہ ہو چکا ہو ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ اور حق جل شانہ کا یہ ارشاد ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ﴾۔ اسی طرف مشیر معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام اگرچہ قبل از بعثت نبی نہیں ہوتے مگر خدا کے ولی اور مقرب ضرور ہوتے ہیں اور ایسے ولی اور مقرب ہوتے ہیں کہ دوسرے اولیاء اور مقربین کی ولایت اور قرب کو ان کی ولایت اور قرب کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں ہوتی کہ جو قطرہ کو دریائے عظیم کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لیے امت محمدیہ کے تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء کرام کے دلوں میں کفر اور گمراہی کا اعتقاد ناممکن اور محال ہے۔ البتہ فرقہ لامیہ کے نزدیک بطور تقیہ انبیاء کے لیے کفر جائز ہے۔

قسم دوم:...... تبلیغ احکام۔ سو اس بارہ میں بھی تمام امت محمدیہ کا اتفاق ہے کہ احکام الٰہیہ کی تبلیغ میں انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں۔ دربارہ تبلیغ ان سے نہ قصداً کوئی غلطی ہوسکتی ہے اور نہ سہواً تبلیغ کے بارہ میں جھوٹ اور تحریف سے بالکلیہ پاک اور معصوم اور منزہ ہوتے ہیں کسی طور اور کسی صورت سے کذب اور تحریف کا ان سے سرزد ہونا محال ہے تندرست ہوں یا مریض خوش ہوں یا ناراض کوئی حالت ہو مگر یہ ناممکن ہے کہ وحی الٰہی کے پہنچانے میں ان سے کسی قسم کی سہواً یا عمداً کوئی غلطی ہو جائے۔ ورنہ پھر وحی الٰہی پر وثوق اور اطمینان کی کوئی صورت نہ رہے گی اور نبی کی تبلیغ سے وثوق اور اعتماد بالکل جاتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نزول وحی کے وقت فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے تاکہ وحی الٰہی، شیطان وغیرہ کی مداخلت سے بالکلیہ محفوظ رہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾

① اصل عبارت یہ ہے امام ابومنصور ماتریدی ﷫ گفتہ است کہ نظر اقتضاء آں می کند کہ تاکید وجوب عصمت درحق انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام افزوں از انست کہ درحق ملائکہ زیرا کہ خلق بمتابعت انبیاء مامورند بہ متابعت ملائکہ مامور نیستند (کذا فی المعتمد فی المعتقد للعور بشتی، ص: ۷۳)

"وہی عالم الغیب ہے اپنے خزانہ غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ مگر اپنے برگزیدہ یعنی رسول کو بقدر حکمت و مصلحت بذریعہ وحی کے کچھ بتلا دیتا ہے اور نزول وحی کے وقت اس رسول کے آگے اور پیچھے فرشتوں کا پہرہ لگا دیتے ہیں کہ شیطان اور نفس اس میں کسی قسم کا دخل نہ کرنے پائے اور یہ انتظام اس لیے کیا گیا کہ معلوم ہو جائے کہ فرشتوں نے اپنے رب کے پیام ٹھیک ٹھیک پہنچا دیئے ہیں۔ غلطی سے پاک اور مبرا ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام احوال کے محیط ہیں اور ہر چیز ایک ایک ان کو معلوم ہے۔"

قسم سوم:...... یعنی فتویٰ اور اجتہاد کے متعلق علماء اسلام کا مسلک یہ ہے کہ انتظار وحی کے بعد انبیاء کرام کبھی کبھی امور غیر منصوصہ میں اجتہاد فرماتے ہیں اگر کسی وقت کوئی اجتہادی خطا ہو جاتی ہے تو فوراً بذریعہ وحی کے متنبہ کر دیئے جاتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ انبیاء سے کوئی اجتہادی خطا واقع ہو اور من جانب اللہ ان کو مطلع نہ کیا جائے۔

قسم چہارم:...... یعنی افعال و عادت سوان کے متعلق اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ انبیاء کبائر سے تو بالکلیہ پاک ہوتے ہیں۔ البتہ صغائر یعنی خلاف اولیٰ امور کبھی کبھی سہواً اور نسیاناً ان سے صادر ہو جاتے ہیں۔ ظاہراً وہ معصیت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان سے کسی حکم کی تشریع مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً نبی کریم علیہ السلام سے ظہر یا عصر کی نماز میں سہو کا پیش آنا بظاہر غفلت معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں سجدہ سہو کا حکم بتلانا مقصود تھا۔ اگر نبی اکرم ﷺ کو نماز میں سہو نہ پیش آتا تو امت کو سجدہ سہو کا حکم کیسے معلوم ہوتا۔ اور علیٰ ہذا اگر لیلۃ التعریس میں آپ کی نماز نہ فوت ہوتی تو قضاء فوائت یعنی فوت شدہ نمازوں کی قضاء کا مسئلہ کیسے معلوم ہوتا اس اعتبار سے یہ سہو اور نسیان عین رأفت اور عین رحمت ہے اسی وجہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"یالیتنی کنت سهو محمد"۔ "کاش میں رسول اللہ ﷺ کا سہو ہو جاتا یعنی حضور کا سہو میری یاد سے کہیں بہتر ہے۔"

اور حق تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ پیغمبر کا نسیان حقیقت میں کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ حضرات انبیاء کو بمقتضائے بشریت سہو اور نسیان ضرور پیش آتا ہے۔ اس لیے کہ انسان جب تک جامہ بشریت میں ہے خواص بشریہ سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ بھوک بھی ہے اور پیاس بھی ہے۔ مسرت اور فرحت بھی ہے اور رنج و غم بھی ضحک اور تبسم بھی ہے۔ ناراضی اور غصہ بھی۔ اور حق تعالیٰ شانہ کے اس ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ "آپ کہہ دیجئے کہ جز ایں نیست کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔"

یعنی باوجود نبوت و رسالت کے پھر میں بشر ہوں فرشتہ نہیں۔ تمہاری طرح کھاتا اور پیتا ہوں اپنی حوائج ضروریہ کے لیے بازاروں میں بھی آتا جاتا ہوں۔ یہ سب بشریت کے لوازم اور خواص ہیں۔ نبوت و رسالت کے منافی نہیں۔ بہر حال سہو اور نسیان انسانیت کے لوازم میں سے ہے۔ جس طرح دوسرے لوازم انسانیت مثلاً بھوک اور پیاس وغیرہ نہ نبوت و رسالت کے منافی ہیں اور نہ عصمت کے اسی طرح افعال و عادات میں سہو اور نسیان بھی نبوت اور عصمت کے منافی نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حضرات انبیاء کے سہو اور نسیان کو دوام اور قرار۔ بقایا اور استمرار نہیں۔ کبھی کبھی بمقتضائے بشریت سہو ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ

کسی نبی کو جب کبھی کوئی سہو ہوا تو وہ ایک ہی مرتبہ ہوا یعنی اس نوع کا سہو پھر اس کو مدت العمر کبھی پیش نہیں آیا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے "لایلدغ المؤمن من جحر مرتین"۔ یعنی مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا جن کے قلوب ایمان کی حلاوت اور شیرینی دیکھ چکے ہیں وہ شیطان کے دو مرتبہ نہیں ڈسے جاتے ہاں جو حقیقۃً مومن نہیں محض نام کے مومن ہیں وہ دو مرتبہ نہیں بلکہ صد ہا مرتبہ نفس اور شیطان سے ڈسے جاتے ہیں اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کا اس درخت کو کھالینا بھی اسی مقتضائے بشریت اور خاصہ انسانیت یعنی سہو اور نسیان کا ثمرہ اور نتیجہ تھا۔ چنانچہ خود حق جل شانہ کا ارشاد ہے ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾۔ آدم علیہ السلام بھول گئے۔ حق تعالیٰ شانہ کی ممانعت اور شیطان کی عداوت کا اس وقت استحضار نہ رہا۔ معصیت اور نافرمانی کا بالکل ارادہ نہ تھا۔ فقط شیطان کی قسم سے دھوکہ میں آگئے۔ حدیث میں ہے: "المؤمن غِرٌّ کریم"۔ مؤمن دھوکہ میں آجاتا ہے۔ وقال تعالیٰ: ﴿وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَٰكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ (تم پر بھول چوک میں کوئی گناہ نہیں ولیکن گناہ اس میں ہے جس کا تمہارے دل پختہ ارادہ کرلیں۔) اس آیت کے مطابق جب خطا اور نسیان میں کوئی گناہ ہی نہیں تو وہ پھر عصمت کے منافی کیسے ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ حالت صوم میں بھول کر کھالینا مفسد صوم بھی نہیں۔ حضرت آدم کا قلب مطہر اور سینہ مبارک چونکہ حق جل وعلاء کی عظمت اور جلال سے بھرا ہوا تھا۔ اس لیے جب شیطان نے اللہ کی قسم کھا کر یہ کہا کہ ﴿إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ﴾ (میں یقیناً تمہارا خیر خواہ ہوں۔) تو حضرت آدم علیہ السلام کو یہ وہم بھی نہ ہوا کہ کوئی بے حیا اور گستاخ حق تعالیٰ شانہ کا نام لیکر قسم کھائے گا۔ اس فریب کے ساتھ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو لغزش میں ڈالا۔ قال تعالیٰ: ﴿فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ﴾ (یعنی شیطان نے ان کو دھوکہ اور فریب کے ساتھ پھسلا دیا)۔ غرور کے لفظ سے خود معلوم ہوتا ہے کہ یہ معصیت دھوکہ سے ہوگئی ورنہ حضرت آدم علیہ السلام کا ارادہ نہ تھا۔ وہ تو مزید قرب الٰہی کے متمنی اور متلاشی تھے۔ دشمن نے طاعت کے بہانہ سے معصیت میں مبتلا کردیا مگر یہ معصیت فقط ظاہراً اور صورۃً معصیت تھی حقیقت میں عظیم الشان نعمت اور بے پایاں رحمت تھی۔ مقصود یہ تھا کہ گنہگاروں کو توبہ اور استغفار کا طریقہ معلوم ہو۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو سے سجدہ سہو کا حکم بتلانا مقصود تھا۔ اگر آپ کو نماز میں سہو نہ پیش آتا تو امت کو سجدہ سہو کا حکم کیسے معلوم ہوتا۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے سہو سے توبہ اور استغفار کا طریقہ بتلانا مقصود تھا۔ کہ جب کبھی کسی سے کوئی گناہ صادر ہو تو فوراً اپنے باپ آدم علیہ السلام کی طرح تضرع اور زاری کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں رجوع کرے شیطان کی طرح معارضہ اور مقابلہ نہ کرے۔ بالفرض اگر حضرت آدم علیہ السلام سے یہ معصیت نہ سرزد ہوتی تو ہم گنہگاروں کو توبہ اور استغفار کا طریق کیسے معلوم ہوتا؟

عارف ربانی شیخ عبدالوہاب شعرانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے علم میں سعادت اور شقاوت دونوں ہی مقدر تھیں اس کی حکمت اس کو مقتضی ہوئی کہ سعادت کا بھی افتتاح ہو۔ اور شقاوت کا بھی اس لیے سعادت کا افتتاح حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھ سے کرایا اور شقاوت کا افتتاح ابلیس کے ہاتھ سے کرایا۔ اہ کلامہ۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص سنت حسنہ جاری کرتا ہے تو جتنا اجر اور ثواب اسی سنت پر عمل کرنے والوں کو ملتا ہے اسی قدر اجر وثواب اس سنت کے جاری کرنے والے کو بھی ملتا ہے۔ جب تک وہ سنت جاری رہے گی اس شخص کے اجر میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام نے اس عالم میں توبہ اور استغفار، تضرع اور ابتہال اور بارگاہ خداوندی میں گریہ وزاری کی مبارک سنت جاری فرمائی۔ تاقیام قیامت جس قدر بھی تائبین اور مستغفرین توبہ اور استغفار کرتے رہیں گے اسی قدر حضرت آدم علیہ السلام کے درجات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہی تمام تائبین اور مستغفرین کے امام اور تمام متضرعین اور خاشعین کے قدوہ اور پیشوا ہیں۔

اور ابلیس نے اِباء اور استکبار کی سنت سیئہ کو جاری کیا۔ قیامت تک جو شخص بھی حکم خداوندی سے اعراض وانکار کریگا۔ اس سے ابلیس کی ملعونیت اور مطرودیت میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لیے کہ وہ کافرین اور مستکبرین کا امام اور احکام خداوندی پر اعتراض کرنے والوں کا پیشوا ہے۔ شیخ ابوالعباس عریبی جو کہ شیخ محی الدین ابن عربی کے شیخ ہیں وہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ معاذ اللہ حضرت آدم علیہ السلام نے خدا کی نافرمانی نہیں کی بلکہ یہ معصیت اس بدبخت ذریت نے کی جو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں مستور تھی اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت بمنزلہ سفینہ کے تھی جس میں ان کی تمام صالح اور طالح ذریت سوار تھی۔

حافظ ابن قیم قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ جب کسی بندہ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو ظاہراً اس کو ذنب اور معصیت میں مبتلا کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ ایک باطنی مرض یعنی اعجاب اور خود پسندی کا علاج ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ذنب اور معصیت میں مبتلا ہونا ہزار طاعتوں سے زائد نافع اور مفید ہوتا ہے اور صاحب بصیرت کے نزدیک یہ معصیت ''ایں خطا از صد ثواب اولیٰ تر است'' کا مصداق ہوتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بعض مرتبہ صحت اور عافیت اتنی مفید اور کارآمد نہیں۔ جتنا مرض مفید اور کارآمد ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مرض کے آتے ہی طبیعت فوراً پرہیز اور علاج کی جانب متوجہ ہو جاتی ہے اور طبیعت حاذق کے مشورہ سے پورے اہتمام کے ساتھ تنقیہ اور مسہل کو شروع کر دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ہی روز میں تمام فاسد اور ردی مادہ خارج ہو کر طبیعت، پہلے سے زائد صاف اور ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر جب لذائذ وطیبات۔ فواکہ وثمرات، لطیف غذاؤں اور مقوی دواؤں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ تو اس قدر قوی ہو جاتا ہے۔ کہ اس مرض سے قبل بحالت صحت بھی اتنا قوی نہ تھا۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کا اس معصیت میں مبتلا ہو کر مسلسل تین سو سال تک توبہ اور استغفار اور گریہ وزاری کرتے رہنا۔ (جیسا کہ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے) بجائے منقصت کے رفعت شان کا باعث ہو گیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

> ﴿وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۞ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى﴾ ''آدم نے اپنے پروردگار کی حکم عدولی کی۔ پس ان کی عیش مکدر [۱] ہو گئی۔ پھر خدا نے ان کو برگزیدہ بنایا اور ان پر خاص توجہ فرمائی اور ان کی رہنمائی کی۔''

کیا ہر معصیت سے انسان معاذ اللہ خدا کا مجتبیٰ اور برگزیدہ بندہ بن جاتا ہے۔ حاشا ثم حاشا ہاں ایسی معصیت کے

---

[۱] اشارہ اس طرف ہے کہ غوی کے معنی گمراہ ہونے کے نہیں بلکہ عیش کا مکدر ہونا مراد ہے (لسان العرب مادہ غوایت)

بعد خدا کے فضل و رحمت سے مجتبیٰ اور برگزیدہ بن سکتا ہے جس معصیت کے بعد آدم علیہ السلام جیسی ندامت اور شرمساری اور تضرع اور زاری ظہور میں آئے۔ ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ وارضاہ ایک صحابی تھے۔ حضرات صحابہ میں ان کو کوئی خاص شان امتیازی حاصل نہ تھی۔ بمقتضائے بشریت زنا میں مبتلا ہو گئے۔ مگر بعد میں اس درجہ صمیم قلب اور اخلاص سے توبہ کی کہ نبی کریم ﷺ اس توبہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ واللہ اگر ماعز کی توبہ تمام مدینہ پر تقسیم کی جائے تو یقیناً سب کی نجات کے لیے کافی اور وافی ہوگی۔ زنا بیشک معصیت تھا مگر ماعز اسلمی کی مضطربانہ اور بے تابانہ ندامت اور شرمساری اور گریہ وزاری نے اس کو عند اللہ ایسا مقبول اور محبوب بنا دیا کہ سارے عالم کی عفت و عصمت اس پر فدا اور قربان ہے۔ ماعز اسلمی کو زنا کے سبب سے جو عند اللہ تقریب حاصل ہوا وہ اب بڑے سے بڑے ولی کو نماز سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ خوب سمجھ لو کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ اس مثال سے معاذ اللہ یہ مقصد نہیں کہ حضرات انبیاء بھی اس قسم کے کبائر میں مبتلا ہو سکتے ہیں اس لیے کہ میں ابتداء ہی میں بتلا چکا ہوں کہ انبیاء کرام کبائر سے بالکلیہ معصوم ہوتے ہیں۔ اس مثال سے صرف اتنا بتلانا مقصود ہے کہ بعض مرتبہ زلت اور معصیت کا صدور طاعت سے زیادہ نفع بخش ہوتا ہے۔ اور وہ معصیت بجائے منقصت کے رفعت شان کا باعث ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اس زلت اور لغزش سے حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ توبہ اور استغفار کے مقرون ہو جانے کی وجہ سے ان کی شان اور بلند ہوگئی۔ اور گویا کہ بزبان حال حضرت آدم علیہ السلام سے اس وقت یہ کہا جا رہا تھا۔

"یا أدم لا تجزع من كاس زلل كانت سبب كيسك فقد استخرج منك داء لا يصلح ان تجاور نا به والبست به حلة العبودية." "اے آدم! تو اس لغزش کے پیالہ سے مت گھبرا کہ جو تیری ہوشیاری اور احتیاط کا سبب بنا اسی کی وجہ سے تجھ سے وہ عجب کی بیماری نکال دی گئی جس کے ساتھ ہماری مجاورت ناممکن ہے اب اس کے بعد تم کو عبودیت اور بندگی کا حلہ اور خلعت عطا کیا گیا۔"

لعل عتبك محمود عواقبه ورب ما صحت الاجسام بالعلل

يا أدم ذنب تزل به لدينا احب الينا من طاعة تدل بها علينا يا أدم انين المذنبين احب الينا من تسبيح المدلّين۔ (مدارج السالكين: ۱/۱۶۲)

ترجمہ شعر: "امید ہے کہ تیرے عتاب کا انجام نہایت محمود اور بہتر ہوگا اور بسا اوقات بیماریوں سے اجسام پہلے سے زائد تندرست ہو جاتے ہیں"۔ اے آدم وہ گناہ جس نے تو ہمارے نزدیک ذلیل ہو وہ اس طاعت سے بدرجہا محبوب ہے جس پر تو ناز کرے اور اے آدم گنہگاروں کی آہ وزاری ہمارے نزدیک نازوالوں کی تسبیح وتہلیل سے بدرجہا بڑھ کر محبوب ہے۔

مرکب توبہ عجائب مرکبست بر فلک تازد بیک لحظہ زپست
چوں برارند از پشیمانی انین عرش لرزد از انین المذنبین

وَلی اور رسُول میں فرق

ولایت تقویٰ اور طہارت کی ایک سند (ڈگری) ہے جو بندہ کی جد وجہد اور سعی اور اکتساب سے ملتی ہے اور نبوت

ورسالت ایک عہدہ اور منصب ہے جو بدون حکم شاہی کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ ولایت بمنزلہ ایک سند کے ہے کہ جو امتحان سے فراغت کے بعد مل جاتی ہے اور نبوت ورسالت بمنزلہ عہدہ کے ہے محض قابلیت سے خود بخود کوئی وزیر اور سفیر نہیں بن جاتا جب تک حکم شاہی نہ ہو۔ ﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اولیاء کی تعریف میں حق تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے: ﴿اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ اور رسول کی تعریف میں یوں فرماتے ہیں ﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ غرض حاصل ولایت اتقاء ہے۔ (جو بندہ کا فعل ہے) اور اتقاء مبنی للفاعل۔ اتقاء مبنی للمفعول کو مستلزم نہیں۔ تیر اور تلوار سے ہر ایک بچنے کی اپنی سی تدبیر کرتا ہے مگر اس پر بھی کبھی زخمی ہو ہی جاتا ہے اور حاصل رسالت کا ارتضاء ہے کیونکہ من رسول بیان ہے من ارتضی کا۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ کا مرتضیٰ ہوتا ہے اور اتضاء فعل خداوندی ہے کیونکہ ارتضیٰ کا فاعل ضمیر راجع الی اللہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اطاعت سے راضی ہوتے ہیں اور معصیت سے ناخوش ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾ معلوم ہوا کہ رسول کے لیے من کل الوجوہ مرتضیٰ ہونا ضروری ہے اور من کل الوجوہ ارتضاء یہی حاصل معصومیت کا ہے۔ (اجوبہ اربعین، ص: ۹۱، حصہ دوم)

فَائِدَۃ:...... حق جل شانہ نے قرآن کریم میں انبیاء کی لغزشوں کو اس لیے بیان فرمایا ہے کہ ان حضرات کی شان اور مرتبہ معلوم ہو کہ یہ حضرات خدا تعالیٰ کے اس درجہ مقرب تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر مواخذہ ہوتا تھا اور وہ خداوند ذوالجلال کے مواخذہ سے لرزاں اور ترساں رہتے تھے حضرات انبیاء کی یہ لغزشیں ہی درحقیقت ان کی معصومیت کی دلیل ہیں جس شخص کا مرتبہ جس قدر بلند ہوتا ہے اسی قدر اس کی معمولی سی بات بھی غیر معمولی بن جاتی ہے۔

عصمت انبیاء اور حفاظت اولیاء میں فرق

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام ہر وقت بارگاہ خداوندی میں مقیم رہتے ہیں کسی وقت حق تعالیٰ شانہ کی عظمت اور جلال ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء معاصی سے معصوم ہوتے ہیں اور اولیاء اللہ بارگاہ خداوندی میں آتے جاتے رہتے ہیں مگر مقیم نہیں اس لیے اولیاء معاصی سے محفوظ تو ہوتے ہیں مگر معصوم نہیں ہوتے اور عصمت اور حفاظت میں یہ فرق ہے کہ اولیاء بسا اوقات مباحات اور جائز امور کو محض حظ نفس اور طبعی میلان اور خواہش کے لیے کر گزرتے ہیں۔ مگر حضرات انبیاء کسی وقت بھی طبعی میلان اور حظ نفس کے لیے مباح اور جائز امر کا ارتکاب نہیں فرماتے۔ ہاں جب کسی شی کی عند اللہ اباحت اور اس کا خدا کے نزدیک جائز ہونا بتلانا مقصود ہوتا ہے تب اس مباح کو استعمال فرماتے ہیں تاکہ امت کو نبی کے کرنے سے اس فعل سے اس کا مباح اور جائز ہونا معلوم ہو جائے اور جس طرح نبی پر فرض کی تعلیم فرض ہے اسی طرح فعل مباح اور امر جائز کی اباحت اور جواز کا بتلانا بھی فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کو ایک فعل مباح پر بھی فرض ہی کا ثواب اور اجر ملتا ہے اس لیے کہ نبی کے ذمہ مباح کی اباحت کا بتلانا بھی فرض ہے۔

اب ہم حضرات انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے کچھ دلائل ذکر کرتے ہیں۔ جو زیادہ تر امام فخر الدین رازی قدس اللہ سرہ

کی تفسیر کبیر سے لیے گئے ہیں۔

دلائل عصمت انبیاء کرام علیہم السلام

دلیل اول:...... قال اللہ تعالیٰ: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ''جس شخص نے رسول کی اطاعت کی پس تحقیق اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔''

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ ''اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

پہلی آیت میں رسول کی اطاعت کو اپنی ہی اطاعت قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم کی اطاعت کو عین اطاعت خداوندی نہیں کہا جا سکتا۔ اطاعت رسول اور اطاعت خداوندی میں اتحاد اور عینیت جب ہی ممکن ہے جب رسول حق جل وعلا کی معصیت کے شائبہ سے بھی بالکلیہ پاک ہو اور تاکید وتحقیق کے لیے کلمہ قد کا اضافہ فرمایا۔ تا کہ کوئی شخص اطاعت حق جل شانہ اور اطاعت رسول میں کسی قسم کی تفریق نہ قائم کرے۔ کما قال سبحانہ وتعالیٰ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ﴾

اور دوسری آیات میں رسول کی علی الاطلاق اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اور اس پر رحمت کا وعدہ فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم شخص کی اطاعت کا علی الاطلاق کسی طرح حکم نہیں دیا جا سکتا اور اسی وجہ سے کہ خلفاء اور امراء معصوم نہیں۔ علی الاطلاق ان کی اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ان کی اطاعت کا یہ معیار مقرر ہوا۔

"السمع والطاعة حق مالم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة"۔ (بخاری)۔ ''امیر کی سننا اور اس کی اطاعت ضروری ہے جب تک معصیت کا حکم نہ کیا جائے۔ اور امیر جب معصیت کا حکم کرے تو پھر اس کی اطاعت نہیں۔''

اور جن آیات میں نبی کی اطاعت کا حکم فرمایا۔ ان میں کسی جگہ "مالم يؤمر بمعصية" (جب تک معصیت کا حکم نہ دیا جائے) کی قید نہیں اضافہ کی گئی جس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی کا کوئی فعل معصیت ہوتا ہی نہیں تا کہ امراء اور خلفاء کی طرح ان کے اتباع میں یہ قید لگائی جائے اور علی ہذا غیر معصوم شخص کی علی الاطلاق اطاعت بلا قید مذکور رحمت خداوندی کا سبب بھی نہیں ہو سکتی۔

دلیل دوم:...... نیز اگر انبیاء کرام معاصی سے معصوم نہ ہوں تو عیاذاً باللہ انبیاء کرام کا غیر مقبول الشہادۃ ہونا لازم آئیگا اس لیے کہ عاصی فاسق ہوتا ہے اور فاسق کی شہادت مقبول نہیں لقولہ تعالیٰ: ﴿اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ تو پھر قیامت کے دن بمقابلہ امم حضرات انبیاء کی شہادت کیسے مقبول ہوگی۔ حالانکہ قرآن عزیز میں ہے کہ ہر نبی قیامت کے دن اپنی امت پر گواہی دے گا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ ''پس کیا حال ہوگا جب

کہ ہم بلائیں گے ہر امت میں سے گواہی دینے والا اور حال کا بیان کرنے والا اور آپ کو ان سب پر گواہ بنائیں گے۔"

دلیل سوم:...... نیز صورت مفروضہ میں نبی کا مستحق عذاب اور مستحق لعنت ہونا لازم آتا ہے جو ایک عاصی اور گنہگار کا حکم ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَآ﴾ "جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو یقیناً اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔"

﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ "خبردار کہ اللہ کی لعنت ہے نافرمانوں پر۔"

حالانکہ کوئی نبی علیہ السلام کسی کے نزدیک مستحق عذاب اور مستحق لعنت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ جو شخص عذاب الٰہی اور لعنت خداوندی کا مستحق ہو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو درکنار متقی اور صالح بھی نہیں ہو سکتا۔

دلیل چہارم:...... نیز حضرات انبیاء کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو حق جل شانہ کی اطاعت کی طرف بلائیں پس اگر وہ خود اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بندے نہ ہوں تو وہ اس آیت کے مصداق ہوں گے۔

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ "کیا تم دوسروں کو بھلی بات کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب اللہ کو پڑھتے رہتے ہو پس کیا تم عقل نہیں رکھتے۔"

﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ "کیوں کہتے ہو وہ باتیں جو تم خود نہیں کرتے دوسروں کو کہنا اور خود نہ کرنا اللہ کے نزدیک سخت مذموم اور اس کے غضب اور ناراضی کا سبب ہے۔"

حالانکہ یہ بات ایک ادنیٰ واعظ اور معمولی عالم کے لیے بھی مناسب نہیں۔ حضرات انبیاء و مرسلین کی شایان شان تو کیسے ہو سکتی ہے۔

دلیل پنجم:...... نیز اگر انبیاء کرام سے کبائر و معاصی کا صدور جائز رکھا جائے تو پھر معاذ اللہ انبیاء کرام کو معاصی پر تنبیہ اور زجر و توبیخ اور ایذاء رسانی بھی جائز ہونی چاہیے جو خدائے عز و جل کے نافرمانوں کے لیے لازم اور ضروری ہے حالانکہ نبی کو کسی قسم کی ایذاء اور تکلیف پہنچانا دنیا اور آخرت کی لعنت اور عذاب الیم کا سبب ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ "بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہو۔"

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ "جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذاء پہنچاتے ہیں ان کے لیے نہایت ہی دردناک عذاب ہے۔"

دلیل ششم:...... نیز انبیاء کرام کا تمام گنہگاروں سے زائد مستحق عذاب ہونا لازم آئے گا۔ اس لیے کہ انبیاء کا مرتبہ سب سے بلند ہے اس لیے انبیاء سے معصیت کا صدور بھی بہت بڑا سمجھا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ جاریہ پر بمقابلہ حرہ نصف حد آتی ہے اور

زانی محصن پر رجم اور غیر محصن پر فقط جلد ہے۔ اور ازواج مطہرات کے لیے ارشاد ہے:

﴿يٰنِسَاۗءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ ''اے نبی کی عورتو! تم میں سے جو صریح بے حیائی کا کام کرے تو اس کو دو چند مار ہوگی۔''

اور ظاہر ہے کہ نبوت اور رسالت سے کوئی اعلیٰ اور ارفع مرتبہ نہیں۔ پس اگر نبی ﷺ سے بھی معاصی کا صدور روا رکھا جائے تو پھر نبوت و رسالت کے منصب کے مناسب نبی کو سب سے زائد معذب اور معتوب اور مغضوب خداوندی ماننا لازم آئے گا۔ اور جب نبی ہی معاذ اللہ خدا کا معتوب اور مغضوب ٹھہرا تو پھر مقبول الٰہی کون ہوگا؟۔

دلیل ہفتم: ...... نیز معصیت کا صدور ہمیشہ اتباع شیطان ہی کی وجہ سے ہوتا ہے پس اگر نبی معصوم نہ ہو تو نبی کا متبع شیطان ہونا لازم آئے گا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''اور ابلیس نے ان پر اپنے گمان کو سچ کر دکھایا سوائے تھوڑے سے ایمانداروں کے لوگ اس کے پیرو ہوئے۔''

حالانکہ نبی کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ شیطان کے اتباع سے محفوظ رہیں۔

دلیل ہشتم: ...... نیز غیر نبی کا نبی سے افضل ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ آیت بالا میں متبعین شیطان سے مومنین کے ایک فریق کو مستثنیٰ فرمادیا گیا ہے لہذا یہ فریق جو اتباع شیطان سے محفوظ ہے اگر حضرات انبیاء کا فریق ہے تو اس کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے وہوالمراد۔ اور حضرات انبیاء کرام کے سوا کوئی اور جماعت ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ایک گروہ مومنین کا ایسا ہے جو اتباع شیطان سے بری ہے مگر عیاذاً باللہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اتباع شیطان سے بری نہیں اور ظاہر ہے کہ جو شخص اتباع شیطان سے بری ہوگا وہ اس شخص سے یقیناً افضل ہوگا جو اتباع شیطان سے بری نہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾

دلیل نہم: ...... حق تعالیٰ شانہ نے بندوں کو دو قسموں پر تقسیم فرمایا ہے ایک حزب الشیطان یعنی شیطان کا گروہ۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ''یہ شیطان کا گروہ ہے آگاہ ہو جاؤ شیطان کے گروہ والے ہمیشہ خراب ہوتے ہیں۔''

دوسرے حزب اللہ یعنی اللہ کا گروہ۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ''یہ اللہ کا گروہ ہے اور آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ ہی کا گروہ کامیاب ہوتا ہے۔''

لہذا اگر نبی سے معاصی کا صدور روا رکھا جائے تو نبی کا عیاذاً باللہ بجائے حزب اللہ مفلحین کے حزب الشیطان اور خاسرین کی جماعت اور گروہ میں شمار کرنا لازم آئے گا۔

دلیل دہم: ...... حق تعالیٰ شانہ نے خود ابلیس سے نقل فرمایا ہے کہ میرے اغواء سے تیرے مخلص بندوں کا گروہ مستثنیٰ ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ، اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ ''قسم ہے تیری عزت کی سوائے

عباد مخلصین کے سب کو گمراہ کروں گا۔"

اور من کل الوجوہ۔ عباد مخلصین کا مصداق صرف انبیاء ہی ہیں جیسا کہ حضرت ابراہیم اور حضرات اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی شان میں ہے۔ ﴿اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ﴾ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں ہے ﴿اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴾۔

دلیل یاز دہم:...... حق تعالیٰ نے جا بجا قرآن عزیز میں انبیاء کرام کا بلا کسی تخصیص کے مصطفیٰ اور مجتبیٰ ہونا ذکر فرمایا ہے یعنی یہ نبی ہمارے منتخب اور برگزیدہ بندے ہیں یہ کسی جگہ نہیں فرمایا کہ فلاں امر اور فلاں صفت میں یہ ہمارے برگزیدہ ہیں۔ یا فلاں وصف کے اعتبار سے یہ ہمارے منتخب بندے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات کسی خاص صفت یا کسی خاص فعل کے لحاظ سے برگزیدہ نہیں بلکہ تمام افعال واقوال کے اعتبار سے منتخب اور برگزیدہ ہیں۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ﴾ "اور تحقیق وہ ہمارے نزدیک منتخب اور چنے ہوئے اور نیک لوگوں میں سے ہیں۔"

اور ظاہر ہے کہ من کل الوجوہ خدا کا برگزیدہ اور پسندیدہ مصطفیٰ اور مجتبیٰ ہونا صدور معاصی کے بالکل منافی اور مباین ہے۔

دلیل دواز دہم:...... نیز حق تعالیٰ شانہ نے حضرات انبیاء کی یہ شان ذکر فرمائی ہے:

﴿يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ﴾ "وہ بھلائیوں اور نیک کاموں میں نہایت تیز رو ہیں۔"

اور الخیرات کو معرف بلام الاستغراق ذکر فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام سے سوائے خیر محض کے کسی امر کا صدور ہوتا ہی نہیں۔

دلیل سیز دہم:...... ہر عاصی اور گنہ گار کو شرعا اور عرفاً ظالم کہنا جائز ہے اور قرآن عزیز میں بکثرت خدا کے نافرمانوں کو ظالم کہا گیا ہے، لہٰذا اگر نبی علیہ السلام سے بھی معاصی کا صدور جائز ہو تو نبی علیہ السلام کو بھی معاذ اللہ ظالم کہنا جائز ہوگا۔ حالانکہ ظالم کبھی نبی اور رسول نہیں ہو سکتا۔ کما قال تعالیٰ:

﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ "میرا منصب ظالموں کو نہیں ملتا۔"

کیونکہ اس آیت میں اگر عہد سے نبوت ورسالت مراد ہے تو صاف ظاہر ہے کہ گنہ گار اور ظالم کبھی نبی اور رسول نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ولایت یا امامت ہے تب بھی مدعا حاصل ہے اس لیے کہ جب امامت اور ولایت جس کو نبوت ورسالت سے وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو دریائے عظیم کے ساتھ ہے جب وہی ظالم اور عاصی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ تو نبوت ورسالت کا عظیم الشان اور جلیل القدر منصب کہاں حاصل ہو سکتا ہے۔

دلیل چہار دہم:...... قال تعالیٰ: ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾

"اسی نے ان پڑھوں میں ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو اپنی تعلیم وتربیت سے پاک اور صاف کرتا ہے۔"

پس اگر نبی علیہ السلام معصیت سے پاک نہیں تو وہ دوسروں کو کیسے مزکی اور پاک اور مطہر یعنی پاک اور صاف بنا دیتا ہے۔

دلیل پانزدہم: ...... نیز نبی تو اللہ جل جلالہ کی جانب سے امت کے لیے اسوہ حسنہ اور حق تعالیٰ شانہ کی اطاعت اور اخلاق خداوندی کا بہترین نمونہ ہوتا ہے تاکہ لوگ بے چون وچرا اس کا اتباع کریں اور اس کی ہر حرکت اور سکون اور اس کے ہر قول وفعل کو اپنے لیے راہ عمل سمجھیں۔ کما قال تعالیٰ:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ ''تمہارے لیے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ ہے ان کو دیکھ کر اللہ کی اطاعت کرو یہ اس کے لیے ہے جو اللہ سے اور یوم آخرت سے ڈرے اور اللہ کو بہت یاد کرے۔''

اور اخلاق خداوندی اور اطاعت ربانی کا نمونہ اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے اسوہ حسنہ وہی شخص ہوسکتا ہے جو حق جل وعلا کی معصیت اور نافرمانی سے بالکلیہ پاک اور منزہ ہو۔

دلیل شانزدہم: ...... کوئی شخص اگر نبی اور پیغمبر کی موجودگی میں کوئی کام کرے اور نبی علیہ السلام اس فعل پر سکوت کرے تو نبی علیہ السلام کا یہ سکوت بالاجماع اس فعل کے جواز کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ پس جب نبی علیہ السلام کا سکوت ہی اس فعل کو معصیت سے خارج کرکے جواز اور اباحت کی حد میں داخل کر دیتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نبی کا فعل معصیت سے خارج نہ ہو۔

دلیل ہفدہم: ...... بعض لوگوں نے جب اللہ کی محبت کا دعویٰ کیا یہ آیت نازل ہوئی:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ ''اے محمد آپ یہ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم کو محبوب رکھے گا اور تمہارے گناہوں کی مغفرت کرے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں آپ کے اتباع کو اپنی محبت کا معیار قرار دیا۔ اور پھر آپ کی اتباع پر دو وعدے فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر تم ہمارے نبی کا اتباع کروگے تو ہم تم کو محبوب بنالیں گے۔ دوسرے یہ کہ تمہارے گناہوں کی مغفرت کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کی محبت کا معیار ایسے ہی شخص کا اتباع ہوسکتا ہے جو معصوم ہو ورنہ ایک عاصی اور گنہ گار کا اتباع محبت خداوندی کا معیار کیسے بن سکتا ہے اور نہ محبت الٰہی اور مغفرت ذنوب کا سبب ہوسکتا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ

ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب ف۱ پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہو گا

ہم نے کہا تم اترو یہاں سے سارے پھر کبھی پہنچے تم کو میری طرف سے راہ کی خبر تو جو کوئی چلا میرے بتائے پر نہ ڈر ہوگا

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝٣٨ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے ف۲ اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے

ان کو اور نہ ان کو غم۔ اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری نشانیاں وہ ہیں دوزخ کے لوگ

ف۱ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی توبہ تو قبول فرمائی مگر فی الفور جنت میں جانے کا حکم نہ فرمایا بلکہ دنیا میں رہنے کا جو حکم ہوا تھا اسی کو قائم رکھا کیونکہ مقتضائے حکمت ومصلحت یہی تھا ظاہر ہے کہ زمین کے لئے خلیفہ بنائے گئے تھے نہ کہ جنت کے لئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا کہ جو ہمارے مطیع ہوں گے ان کو دنیا میں رہنا مضر نہ ہوگا بلکہ مفید، ہاں جو نافرمان ہیں ان کے لئے جہنم ہے اور اس تفریق وامتحان کے لئے بھی دنیا ہی مناسب ہے۔

هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

وہ اسی میں رہ پڑے۔

اعادۂ حکم ہبوط

قَالَ تَعَالٰی: ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ... الی ... هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ﴾

گزشتہ آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کا قبول ہونا ذکر فرمایا اب آئندہ آیات میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ توبہ قبول ہونے کے بعد بھی آدم علیہ السلام کو بہشت میں آنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ دنیا میں ہدایت اور حضرات انبیاء ومرسلین کی بعثت کا سلسلہ جاری کرنا ہے تاکہ اطاعت اور نافرمانی کا مادہ ظہور میں آجائے۔ چنانچہ ہم نے ان کو حکم دیا کہ تم فی الحال اسی جگہ رہو جہاں تم کو بہشت سے اتارا گیا ہے، یعنی فی الحال دنیا ہی میں رہو۔ سردست بہشت میں جانے کی اجازت نہیں۔ تم سب کے سب فی الحال اسی جگہ رہو اس لیے کہ اگر تم کو اسی وقت بہشت میں جانے کی اجازت نہیں۔ اس لیے کہ اگر تم کو اسی وقت بہشت میں جانے کی اجازت دی جائے تو سب کا اجتماع ایک جگہ نہ رہے گا۔ تمہارا یکجائی اجتماع مبدل بہ تفرقہ ہو جائیگا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیروی کرنیوالوں کو بہشت میں پہنچا دیا جائیگا اور بدوں اور بدکاروں کو یا تو یہیں چھوڑ دیا جائیگا یا پھر دوزخ میں بھیج دیا جائیگا اور یہ تفرقہ مقصود اور غرض کے منافی ہے۔ اتارنے سے مقصود تکلیف احکام اور اطاعت اور فرمانبرداری کا امتحان ہے پس زمین میں اتارنے سے مقصد ہی یہ ہے کہ امر ونہی کے ذریعہ سے تمہارا امتحان کریں۔ پس اے اولاد آدم خوب سمجھ لو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے، پس جو لوگ میری ہدایت کا اتباع کریں گے ان پر نہ آئندہ کا کوئی ڈر ہوگا کہ مثلاً یہاں سے نکالے جائیں گے اور نہ گزشتہ پر وہ مغموم ومحزون ہوں گے یہ حسرت کہ ہم سے فلاں راحت اور لذت فوت ہوگئی وہاں پہنچ کر ایسی لذتیں اور مسرتیں ہیں کہ دنیا کی ساری لذتیں اور

ف ۲ جو صدمہ اور اندیشہ کسی مصیبت پر اس کے ہونے سے پہلے ہوتا ہے اس کو "خوف" کہتے ہیں اور اس کے واقع ہو چکنے کے بعد جو غم ہوتا ہے اس کو "حزن" کہتے ہیں۔ مثلاً کسی مریض کے مرجانے کے خیال پر جو صدمہ ہے وہ خوف ہے اور مرجانے کے بعد جو صدمہ ہے وہ حزن ہے۔ اس آیت میں جو خوف وحزن کی نفی فرمائی اس سے اگر خوف وحزن دنیوی مراد لیا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ جو لوگ ہماری ہدایت کے موافق چلیں گے۔ اس میں اس اندیشہ کی گنجائش نہیں کہ شاید یہ ہدایت حقہ نہ ہو شیطان کی طرف سے دھوکہ اور مغالطہ ہو اور نہ وہ اس وجہ سے کہ ان کے باپ سے بالفعل بہشت چھوٹ گئی محزون ہوں گے کیونکہ ہدایت والوں کو عنقریب جنت ملنے والی ہے اور اگر خوف وحزن آخرت مراد ہو تو یہ مطلب ہوگا کہ قیامت کا اہل ہدایت کو نہ خوف ہوگا نہ حزن مگر حزن کا نہ ہونا تو بے شک مسلم لیکن خوف کی نفی فرمانے پر ضرور یہ خلجان ہوتا ہے کہ اس روز خوف تو حضرات انبیاء علیہم السلام تک کو ہوگا۔ کوئی بھی خوف سے خالی نہ ہوگا۔ تو بات یہ ہے کہ خوف دو طرح ہوتا ہے کبھی تو خوف کا باعث اور مرجع خائف (یعنی ڈرنے والے) میں پایا جاتا ہے جیسے مجرم بادشاہی جو بادشاہ سے ڈرتا ہے تو موجب خوف جرم ہے جو مجرم کی طرف رجوع ہوتا ہے اور کبھی مرجع خوف مخوف منہ یعنی جس سے ڈرتے ہیں اس میں کوئی امر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی بادشاہ صاحب جاہ وجلال کے روبرو یا شیر کے روبرو ہو تو اس کے خائف ہونے کی یہ وجہ نہیں کہ اس نے بادشاہ یا شیر کا جرم کیا ہے بلکہ قہر وجلال سلطانی اور ہیبت اور غضب ودرندگی شیر موجب خوف ہے جس کا مرجع ذات سلطانی اور خود شیر ہے۔ آیت سے پہلی قسم کی نفی ہوئی نہ دوسری قسم کی شبہ تو جب ہو سکتا تھا کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ کی جگہ لا خوف فیھم یا لا یخافون فرماتے۔

سرنگیں ان کے سامنے ہیچ ہو جائیں گی۔

فائدہ: پہلی بار ہبوط کا حکم جنت سے اترنے کے لیے تھا اور دوسری بار ہبوط کا حکم زمین میں مقیم رہنے کے لیے ہے۔

فائدہ: خدا کی ہدایت پر چلنے والوں کو اس قسم کا خوف نہ ہوگا جیسا کہ مجرمین اور نافرمانوں کو ہوتا ہے کہ دیکھئے اس جرم کی اب کیا سزا ملتی ہے۔ اس آیت میں اس قسم کے خوف کی نفی مراد ہے۔ باقی حق تعالیٰ شانہ کی عظمت اور جلال کا خوف وہ سب پر طاری ہوگا۔ انبیاء و مرسلین بھی خدا کی عظمت اور جلال سے کانپتے ہوئے ہوں گے نیز اس آیت میں بالکلیہ خوف کی نفی نہیں کی گئی بلکہ خوف کے احاطہ اور استیلاء کی نفی کی گئی ہے۔ اس لیے کہ کلمہ علیٰ کلام عرب میں استیلاء اور احاطہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ پس ﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ کے یہ معنی ہوں گے کہ خوف ان پر غالب اور ان کو محیط نہ ہوگا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر خوف اگرچہ غالب نہ ہو مگر کسی نہ کسی قسم کا خوف ضرور ہوگا۔ وہ خوف خدا کی عظمت اور جلال کا ہے۔ نیز اس میں کافروں کی طرف تعریض بھی ہے کہ قیامت کے دن خوف ان کو محیط ہوگا۔ اور ڈر اور اندیشہ ہر طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہوگا۔ بخلاف اہل ایمان کے کہ ان پر خوف غالب نہ ہوگا۔ اور جو لوگ میری ہدایت سے منکر ہوئے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ایسے ہی لوگ جہنم والے ہیں ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ کبھی بھی اس سے نہ نکلیں گے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾

ہبوط آدم علیہ السلام کے اسرار و حکم

گزشتہ آیت یعنی ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توبہ اور اس کی اجابت کا ذکر تھا کہ ہم نے آدم کی توبہ قبول کی تو ممکن ہے اس سے یہ شبہ ہو کہ ہبوط اور زمین پر اترنے کا حکم لغزش کی وجہ سے تھا شاید قبول توبہ کے بعد وہ حکم باقی نہ رہے۔ اس لیے ہبوط کے حکم کا پھر اعادہ فرمایا۔ اگرچہ توبہ قبول ہو چکی۔ مگر یہ حکم بحالہ باقی ہے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ ہبوط کا حکم لغزش کی وجہ سے نہیں تاکہ قبول توبہ سے اس کے منسوخ ہونے کا خیال یا شبہ کیا جائے بلکہ وہ حقیقت میں ﴿اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ کا وعدہ پورا کرنے کے لیے ہے زمین کی خلافت جس کا حضرت آدم سے وعدہ کیا گیا تھا وہ خود اس کو مقتضی ہے کہ ان کو زمین پر اتارا جائے حضرت آدم علیہ السلام سے جنت کی خلافت کا وعدہ نہ تھا بلکہ زمین کی خلافت کا وعدہ تھا اس لیے ہبوط کا حکم قبول توبہ کے بعد بھی برقرار رہا۔ بعض عارفین سے یہ منقول ہے کہ جب حضرت حق جل شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء کو یہ خطاب فرمایا: ﴿لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ تو اس خطاب میں خود اس طرف اشارہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام اس خطا میں مبتلا ہو کر جنت سے علیحدہ ہوں گے۔ اور جنت کی یہ سکونت چند روزہ ہے دائمی نہیں۔ چنانچہ ﴿وَيٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنت چند روز کے لیے دار سکونت ہے نہ کہ دار اقامت اس لیے کہ ہمیشہ رہنے والے کے لیے امر و نہی حظر و اباحت (روک ٹوک) کے احکام نہیں جاری ہوتے اس کے علاوہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اتارنے میں اور بھی بہت حکمتیں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے اسماء حسنیٰ میں سے غفور اور رحیم۔ عفو اور حلیم۔ خافض اور

رافع۔ معزاور مذل بھی ہیں۔ اس لیے حق تعالیٰ شانہ کی حکمت بالغہ اس کو مقتضی ہوئی کہ کوئی دار اور محل ایسا ہونا چاہئے جس میں ان اسماء حسنیٰ اور صفات علیٰ کے آثار ظاہر ہوں جس کے لیے چاہے مغفرت کرے اور جس پر چاہے رحم کرے جس کو چاہے پست کرے اور جس کو چاہے بلند کرے۔ جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے اس لیے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کو جنت سے زمین پر اتارا تاکہ ان اسماء حسنیٰ کے آثار ظاہر ہوں جن کے ظہور کے لیے دار دنیا ہی مناسب ہے نہ کہ دار آخرت۔

نیز حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں وہ لوگ بھی تھے جو جنت میں رہنے کے اہل نہ تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت بمنزلہ سفینہ کے تھی جس میں نیک و بد ہر قسم کے لوگ سوار تھے۔ اس لیے دنیا میں اترنے کا حکم ہوا تا کہ خبیث کو طیب سے اور شقی کو سعید سے اور مومن کو کافر سے جدا اور الگ کیا جائے اور پھر خبیثین کو دار الخبیثین یعنی جہنم میں اور طیبین کو دار الطیبین یعنی جنت میں بسائے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ ''تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے جدا کردے۔''

اور تاکہ ان اشقیاء اور خبیثین کے مقابلہ میں انبیاء و مرسلین اور عباد صالحین کا سلسلہ جاری ہو۔ دوستوں کو دشمنوں کے ذریعے امتحان ہو۔ جب اللہ کے مخلص بندے اس کی راہ میں جان و مال کو خرچ کریں۔ اور اس کے دشمنوں سے اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جہاد و قتال کریں۔ جانبازی اور سرفروشی سے کسی قسم کا دریغ نہ کریں خدا کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے دشمنی کریں تو حق تعالیٰ شانہ ان کو درجات عالیہ اور اپنے تقرب اور رضا و خوشنودی سے سرفراز فرمائے۔

نبوت و رسالت، امامت اور خلافت شہادۃ فی سبیل اللہ اور حب فی اللہ اور بغض فی اللہ خدا کے دوستوں سے محبت اور موالات۔ اور اس کے دشمنوں سے نفرت اور بیزاری اور دشمنی اور معادات یہ تمام فضائل و کمالات زمین ہی پر اتارے جانے کے نتائج و ثمرات ہیں۔ جنت میں رہ کر یہ باتیں کہاں ممکن تھیں۔

ہبوط آدم علیہ السلام کے اسرار و حکم کی اگر تفصیل درکار ہے تو حافظ شمس الدین ابن قیم قدس اللہ سرہ کی تصنیف لطیف یعنی مفتاح دار السعادۃ کا مطالعہ فرمائیں۔ حافظ موصوف مدارج السالکین میں فرماتے ہیں:

”یا اٰدم انما ابتلیتك بالذنب لانی احب ان اظهر فضلی وَجُودی و کرمی علی من عصانی۔ لو لم تذنبوا لذهب الله بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون فیغفر لهم یا اٰدم اذا عصمتك وعصمت بنیك من الذنوب فعلی من اجود بحلمی وعلی من اجود بعفوی ومغفرتی وتوبتی وانا التواب الرَّحِیْم یا اٰدم لا تجزع من قولی لك (اخرج منها) فلك خلقتها ولکن اهبط الیٰ دار المجاهدة وابذر بذر التقویٰ وامطر علیه سحائب الجفون فاذا اشتد الحب واستغلظ واستویٰ علی سوقه فتعال فاحصده یا اٰدم ما اهبطتك من الجنة الا لتوسل الی فی الصعود وما اخرجتك منها نفیاً لك عنها ما

اخرجتك عنها الا للعود۔"

شعر

ان جری بیننا وبینك عتب — وتناءت منا ومنك الدیار
فالوداد الذی عهدت مقیم — والعثار الذی اصبت جبار
(مدارج السالکین: ۱/۱۶۶)

"اے آدم میں نے تجھ کو گناہ میں مبتلا کیا اس لیے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے فضل اور جود وکرم کو گنہ گاروں پر ظاہر کروں حدیث میں ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تم کو فنا کر دیتا اور ایسی قوم کو پیدا کرتا جو گناہ کر کے خدا سے مغفرت طلب کرتے اور خدا ان کی مغفرت فرماتا اے آدم تجھ کو اور تیری ذریت کو اگر معصوم بنادوں تو اپنا حلم اور عفو و کرم اور مغفرت اور معافی کس پر ظاہر کروں حالانکہ میں تو رحیم ہوں۔ پس ضرور ہے کہ گنہ گار موجود ہوں تا کہ میں ان کی توبہ قبول کروں اور ان پر رحم کروں۔ اے آدم میرے (اخرج منھا) کہنے سے گھبراؤ مت اس لیے کہ جنت کو میں نے تیرے ہی لیے پیدا کیا ہے لیکن اس وقت تم مجاہدہ اور ریاضت کے لیے زمین پر اترو جو تمہارے لیے بمنزلہ خانقاہ یا غار کے ہے اور زمین آسمان کے اعتبار سے بمنزلہ غار ہی کے ہے۔ اور یہاں آ کر تقویٰ کے تخم کی کاشت کرو اور چشم گریاں کی بارش سے اس کو سیراب کرو۔ جب یہ دانہ قوی اور مضبوط ہو جائے اور اپنے تنے پر کھڑا ہو جائے تو اس کو کاٹ لو۔ اے آدم تجھ کو اس لیے جنت سے اتارا تا کہ تیرے درجات اور مدارج اور بلند ہوں۔ اور جنت سے چند روز کے لیے اس لیے نکالا تا کہ اس سے بہتر حالت میں جنت کی طرف تو لوٹ کر آئے۔ ترجمہ شعر: اگر ہمارے اور تیرے درمیان میں کوئی رنجش پیش آگئی ہے اور اگر ہمارے اور تیرے درمیان میں منزلوں کا فصل ہو گیا ہے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں اس لیے کہ محبت و مودت کا تعلق اسی طرح باقی ہے۔ اور جو لغزش تم سے ہو گئی ہے اس کا تدارک ہو سکتا ہے۔"

فوائد مستنبط از قصہ آدم صلی اللہ علی نبینا وعلیہ وبارک وسلم وشرف وکرم

ف ۱:...... قرآن کریم کے ظاہر سیاق وسباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی اور رسول مکلم ہیں۔ یعنی ایسے رسول ہیں جن سے اللہ نے بالمشافہ کلام فرمایا۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

"اخرج الطبرانی وابو الشیخ فی العظمة وابن مردویه عن ابی ذر قال قلت یا رسول الله ارایت ادم أنبیاً کان قال نعم کان نبیا رسولا کلمه الله قبله قال یا أدم اسکن انت وزوجك الجنة۔ واخرج عبد بن حمید والأجری فی الاربعین عن ابی ذر قال یا رسول الله من کان اولهم یعنی الرسل قال أدم قلت یا رسول الله انبی مرسل قال نعم خلقه الله بیده

ونفخ فیہ من روحہ وسواہ قبلہ" (کذا فی الدر المنثور: ۵۱/۱)

"طبرانی اور ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں اور ابن مردویہ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں نبی بھی تھے اور رسول بھی جن سے اللہ نے بالمشافہ کلام فرمایا اور یہ کہا کہ یاآدم اسکن انت وزوجك الجنة۔ اور عبد بن حمید اور آجری نے اربعین میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یارسول اللہ سب سے پہلے رسول کون ہیں؟۔ آپ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ حضرت آدم علیہ السلام کیا نبی مرسل تھے۔ فرمایا کہ ہاں اللہ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اپنی خاص روح ان میں پھونکی اور پھر ان کو ٹھیک بنایا۔"

ف ۲:...... افعال خداوندی کے اسرار و حکم سوائے اس علیم و حکیم کے کسی کو معلوم نہیں۔ ملائکہ مقربین کو بھی سوائے ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ﴾ کہنے کے کوئی چارہ نہ ہوا۔ عاقل کا کام یہ ہے کہ افعال خداوندی کے اسرار کے درپے نہ ہو۔ ملائکہ کی طرح ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ﴾ کہہ کر بے چون و چرا تسلیم کرے۔

کرا زہرہ کہ آں از بیم تو | کشاید زباں جز بہ تسلیم تو
زبان تازہ کردن باقرار تو | نینگیختن علت از کار تو

ف ۳:...... حضرت آدم کی پیدائش سے پہلے ہی ملائکہ کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا ذکر کچھ تعلیم مشورہ کی جانب مشیر معلوم ہوتا ہے کہ کام کرنے سے پہلے مشورہ کر لینا چاہیے۔ اگرچہ حق تعالیٰ مشورہ سے بے نیاز ہے۔

ف ۴:...... استحقاق خلافت کے لیے جب ملائکہ نے ﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ کہہ کر تسبیح و تحمید تقدیس و تمجید کو پیش کیا تو حق جل شانہ نے ملائکہ کے تسبیح و تقدیس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام کا علمی کمال ظاہر فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم میں مشغول ہونا تسبیح و تہلیل سے افضل اور بہتر ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ علم اللہ کے نزدیک بھی علم ہو۔ اللہ کے نزدیک علم وہ ہے جس سے خدا کی خشیت اور اس کی عظمت دل میں راسخ ہوتی ہو۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ "جز این نیست کہ ڈرتے ہیں اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء۔"

معلوم ہوا کہ خدا کے نزدیک عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہو اور جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ اللہ کے نزدیک عالم نہیں اگرچہ سارا عالم اس کو عالم کہے۔ علمے کہ راہ حق ننماید جہالت است۔

ف ۵:...... ملائکہ کو سجدہ کا حکم دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام ملائکہ سے افضل ہیں۔ اس لیے کہ مسجود ساجد سے افضل ہوتا ہے۔

ف ۶:...... حدیث میں ہے کہ جب فرشتے صبح اور عصر کی نماز سے یا کسی محفل ذکر سے لوٹ کر جاتے ہیں تو حق تعالیٰ دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں دیکھا تو عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھتے چھوڑا۔ حکمت اس میں یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک بار کہا تھا: ﴿اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ اور کلمہ "مَنْ" عام ہے جس کا مطلب یہ

ہوا کہ سب ایسے ہی ہوں گے تو فرشتے موجبہ کلیہ کے مدعی تھے۔ ان کے جواب کے لیے سالبہ جزئیہ کا ذکر کافی ہو گیا۔ یعنی ایک شخص یا ایک جماعت کا پیش کر دینا جو اللہ کی مطیع کامل ہوائکے موجبہ کلیہ توڑنے کے لیے کافی ہے یہ ضروری نہیں کہ سارے ہی مطیع ہوں قیامت تک اسی طرح سوال وجواب ہوتا رہے گا۔

ف ۷:...... اعجاب اور استکبار اور اللہ جل جلالہ کے حکم پر اعتراض اور خودستائی نے ابلیس کو ملعون اور مطرود بنایا اور اطاعت اور انقیاد اور رضا و تسلیم اور عجز اور انکساری اور ندامت اور شرمساری اور توبہ اور استغفار نے حضرت آدم علیہ السلام کی شان کو بڑھایا۔

ف ۸:...... نیز اس قصہ سے معلوم ہوا کہ جنت پیدا ہو چکی ہے جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے معتزلہ کہتے ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی۔

ف ۹:...... کافر ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے کبھی نجات نہ پائیں گے۔

ف ۱۰:...... غلطی سے خلاف حکم خداوندی کوئی کام کر گزرنا معصیت ہے اور حکم خداوندی کو غیر معقول اور خلاف سمجھنا یہ کفر ہے۔

(۱۱) فائدہ جلیلہ

ترک اطاعت اور ارتکاب معصیت میں فرق

سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترک امر یعنی امر الٰہی کا امتثال نہ کرنا اور حکم خداوندی کو نہ ماننا ارتکاب نہی سے زیادہ سخت ہے۔ ابلیس نے حکم الٰہی اور امر خداوندی یعنی حکم سجود سے انحراف کیا۔ مطرود و مردود ہوا اور آدم علیہ السلام نے ایک نہی کا ارتکاب کیا یعنی جس درخت سے کھانے کی ان کو ممانعت کی گئی تھی اس کو کھایا۔ بارگاہ خداوندی سے عتاب ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اس عتاب کی کہاں تاب تھی فوراً ہی توبہ اور استغفار کی اور صد ہزار گریہ وزاری کے ساتھ اپنے رب کریم سے عفو اور مغفرت کی درخواست کی اللہ نے اپنی رحمت سے توبہ قبول فرمائی اور خلعت اجتباء واصطفاء سے سرفراز فرمایا۔

اول یہ کہ ترک امر کا جرم ارتکاب نہی کے جرم سے اس لیے زیادہ سخت ہے کہ ارتکاب نہی کا منشاء ہمیشہ غلبہ شہوت ہوتا ہے اور ترک امر کا منشاء ہمیشہ استکبار اور اعجاب (خود پسندی) ہوتا ہے، حدیث میں ہے کہ جس کے قلب میں ذرا برابر بھی کبر یعنی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ ایک حدیث قدسی ہے کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں، کبریائی میری رداء ہے اور عظمت میری ازار ہے، جو شخص اس میں میری منازعت کرتا ہے میں اس کو کچل ڈالتا ہوں۔ بخلاف اس شخص کے کہ جو ایمان لانے کے بعد شہوات میں منہمک رہا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جس نے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہا وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔ اگرچہ وہ چوری اور زنا کرے۔

دوم: یہ کہ اللہ کے نزدیک امتثال امر اور فعل مامور بہ یعنی حکم الٰہی کا بجالانا بہ نسبت منہیات سے احتراز اور اجتناب کے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ سب سے زیادہ محبوب عمل اللہ کے نزدیک اپنے وقت پر نماز کا ادا کرنا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ خیر الاعمال یعنی سب سے بہتر عمل ذکر اللہ ہے۔ اسی وجہ سے حق جل شانہ نے جابجا

قرآن کریم میں اپنی محبت کو امتثال احکام اور اوامر کی بجا آوری پر معلق فرمایا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا﴾ وقال تعالیٰ: ﴿وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿وَاللهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ﴾ ان آیتوں میں اللہ نے اپنی محبت کو ان لوگوں کے لیے مخصوص فرمایا ہے جو اس کے ان احکام اور اوامر کو بجالاتے ہیں۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ احسان، عدل۔ واقساط۔ صبر وتحمل یہ سب اللہ کے احکام ہیں۔ ان کی بجا آوری سے اس کی محبت حاصل ہوتی ہے اور محظورات اور منہیات کو حق جل شانہ نے جب کبھی ذکر فرمایا ہے تو محبت کی نفی کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَاللهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿وَاللهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿لَا يُحِبُّ اللهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا﴾۔

سوم: یہ کہ اوامر و احکام کی تعمیل مقصود لذاتہ ہے اور منہیات سے بچنا مقصود بالذات نہیں بلکہ فعل مامور بہ کی تکمیل کے لیے ہے اس لیے کہ منہیات اور محظورات کا ارتکاب۔ عبادت اور بندگی اور احکام کی بجا آوری میں مخل ہے۔ چنانچہ حق جل شانہ نے تحریم خمر اور تحریم قمار کی علت یہ ذکر فرمائی ہے۔

﴿يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ﴾ ''شراب اور قمار اللہ کے ذکر اور نماز سے تم کو روکتے ہیں پس کیا تم ان سے باز نہ آؤ گے۔''

چہارم: یہ کہ طاعات اور مامورات کی بجا آوری ہی روح کی غذا ہے۔ بغیر ایمان وتسلیم اور بغیر اطاعت اور انقیاد کے روح کی حیات ناممکن ہے اور محظورات ومنہیات سے بچنا بمنزلہ پرہیز کے ہے۔ پرہیز اس لیے کرایا جاتا ہے تاکہ حیات اور قوت میں فتور نہ آئے۔ اصل مقصود حیات اور پرہیز حیات کی نگہبانی کے لیے ہے۔

پنجم: یہ کہ عبادت جس کے لیے جن وانس کو پیدا کیا گیا۔ وہ امتثال اوامر اور احکام خداوندی کی بجا آوری ہی کا نام ہے جن وانس کو فقط منہیات اور محظورات سے بچنے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا (بلکہ عبادت اور بندگی اور احکام خداوندی کی تعمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے) زنا اور سرقہ وغیرہ سے باز رہنے کا نام عبادت نہیں بلکہ جو حکم اس احکم الحاکمین نے دیا اس کو دل وجان سے بجالانے کا نام عبادت اور بندگی ہے۔

ششم: یہ کہ ایک حکم کی تعمیل سے دس گونہ سے لیکر سات سو گونہ بلکہ لا الیٰ نہایۃ ثواب ملتا ہے اور منہی عنہ کے ارتکاب سے صرف ایک گناہ لکھا جاتا ہے۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ترک امر اور عدم تعمیل حکم کا جرم ارتکاب نہی کے جرم سے کس قدر اعظم ہے۔

ہفتم: یہ کہ طاعت اور عبادت اور احکام کی بجا آوری اور ان کا اجر وثواب تمام تر صفت رحمت سے متعلق ہے، اور محظورات وممنوعات کا ارتکاب اور ان پر سزا اور عقاب یہ سب صفت غضب اور انتقام سے متعلق ہے، اور صفت رحمت صفت غضب پر سابق ہے۔ غضب رحمت پر سابق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نزدیک رحمت عذاب سے اور عفو انتقام سے زیادہ محبوب ہے۔ وقال تعالیٰ:

﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ "تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کولکھ لیا ہے یعنی لازم کر لیا ہے۔"

مگر اس ارحم الراحمین نے غضب کو اپنے اوپر لازم نہیں فرمایا۔ وقال تعالیٰ:

﴿وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً﴾ "اللہ ہر چیز کو باعتبار رحمت کے محیط ہے۔"

مگر غضب اور انتقام کے اعتبار سے محیط نہیں۔ رحمت اسکی دائمی ہے کبھی منفک نہیں ہوتی مگر غضب دائمی نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ قیامت کے روز فرمائیں گے۔

"ان ربی قد غضب الیوم غضبا لم یغضب قبلہ مثلہ ولن یغضب بعدہ مثلہ"۔

"میرا پروردگار آج غصہ ہوا ہے ایسا غصہ ہوا کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا غصہ ہوا اور نہ اس کے بعد کبھی ایسا غصہ ہوگا۔"

ہشتم: یہ کہ طاعت وعبادت کے آثار جلد زائل نہیں ہوتے۔ بخلاف منہیات ومحظورات کہ ان کے آثار بہت جلد زائل ہوجاتے ہیں۔ معاصی اور سیئات کے آثار کبھی عفو اور مغفرت سے اور کبھی توبہ اور استغفار سے زائل ہوجاتے ہیں کبھی اعمال صالحہ اور مصائب سے انکا کفارہ ہوجاتا ہے اور کبھی شفاعت سے اور کبھی اقارب اور احباب کی دعاؤں سے ان معاصی سے درگزر کیا جاتا ہے اور اگر صمیم قلب اور اخلاص کے ساتھ توبہ کرے تو ان سیئات کو حسنات سے بدل دیا جاتا ہے۔

نہم: یہ کہ نجات کا دارومدار احکام کی بجا آوری پر ہے۔ اگر کوئی شخص تمام مناہی اور محظورات سے بچتا ہے مگر احکام خداوندی کو نہیں مانتا تو اس کی نجات ناممکن ہے۔ اور اس کے برعکس اگر کوئی شخص احکام خداوندی کو تسلیم کرتا ہے مگر زنا اور سرقہ اور کسی فحشاء اور منکر سے پرہیز نہیں کرتا تو اس کی نجات ممکن ہے۔

دہم: یہ کہ اوامر اور احکام سے کسی فعل کا وجود مطلوب ہوتا ہے اور نہی سے کسی شئے کا عدم اور ترک مقصود ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ عدم میں کوئی کمال نہیں۔ کمال وجود اور ایجاد ہی میں ہے اسی وجہ سے شریعت کی نظر میں اوامر کا امتثال مناہی کے اجتناب سے زیادہ بہتر ہے اور حکم خداوندی سے سرکشی کرنا منہی عنہ کے ارتکاب سے زیادہ جرم ہے۔ ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾

كذا في كتاب الفوائد، ص: ۱۱۹، للحافظ ابن القيم قدس الله سره۔

يٰبَنِيْٓ ① اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ

اے بنی اسرائیل ف ۱ یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے ف ۲ اور تم پورا کرو میرا اقرار تو میں پورا کروں

اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان میرا جو میں نے کیا تم پر اور پورا کرو قرار میرا تو میں

ف ۱ اول ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ خطاب عام تھا اور ان نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا جو تمام بنی آدمؑ پر عام تھیں مثلاً زمین و آسمان و جملہ اشیاء کا پیدا کرنا۔ پھر حضرت آدمؑ کو پیدا کر کے ان کو خلیفہ بنانا اور بہشت میں داخل کرنا وغیرہ۔ اب ان میں سے خاص بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا اور خاص نعمتیں جو وقتاً فوقتاً پشت در پشت ان پر ہوتی چلی آئیں اور انہوں نے جو کفران نعمت کیا ان سب باتوں کو مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل تمام فرقوں سے۔ بنی آدمؑ میں ممتاز اور اہل علم و=

① مترجم گوید خدا تعالیٰ بنی اسرائیل را نعمتہائے خود یاد داد و معجزہا کہ دریں قوم ظاہر شدہ بود ذکر فرمود آنگاہ شبہات و ہفوات ایشاں را رد کرد بدلائل وایں قصہ ممتد است تا قولہ تعالیٰ ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ﴾۔ ۱۲ فتح الرحمن

بِعَهْدِكُمْ ۚ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴿۴۰﴾ وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا

تمہارا اقرار ف۱ اور مجھ ہی سے ڈرو ف۲ اور مان لو اس کتاب کو جو میں نے اتاری ہے سچ بتانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے ف۳

پورا کروں قرار تمہارا اور میرا ہی ڈر رکھو اور مانو جو کچھ میں نے اتارا سچ بتاتا تمہارے پاس والے کو اور مت ہو تم

أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ ۖ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ

اور مت ہو سب میں اول منکر اس کے ف۴ اور نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچتے رہو۔ اور مت ملاؤ صحیح میں غلط

پہلے منکر اس کے اور نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچتے رہو۔ اور مت ملاؤ صحیح

بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۴۲﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا

اور مت چھپاؤ سچ کو جان بوجھ کر اور قائم کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور جھکو نماز میں

میں غلط اور یہ کہ چھپاؤ سچ کو جان کر اور کھڑی کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور جھکو

مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۴۳﴾ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ

جھکنے والوں کے ساتھ ف۵ کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو پڑھتے ہو کتاب

ساتھ جھکنے والوں کے۔ کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو آپ کو اور تم پڑھتے ہو کتاب

=کتاب و نبوت اور انبیاء کو پہچاننے والے سمجھے جاتے تھے۔ کیونکہ حضرت یعقوبؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک چار ہزار نبی ان میں آچکے تھے تمام عرب کی نظریں انکی طرف تھیں کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے ان انعامات اور خرابیوں کو بسط کے ساتھ ذکر فرمایا کہ شرما کر ایمان لائیں ورنہ اور لوگ انکی حرکات سے واقف ہو کر انکی بات کا اعتبار نہ کریں اور اسرائیل نام ہے حضرت یعقوبؑ کا اس کے معنی ہیں عبداللہ۔

ف۲ ہزاروں انبیاء ان میں بھیجے گئے۔ توریت وغیرہ کتابیں نازل فرمائیں فرعون سے نجات دے کر ملک شام میں تسلط دیا، من وسلوٰی نازل ہوا۔ ایک پتھر سے بارہ چشمے جاری کئے جو نعمتیں اور خوارق عادات کسی فرقہ کو نصیب نہیں ہوئیں۔

ف۱ توریت میں یہ اقرار کیا تھا کہ تم توریت کے حکم پر قائم رہو گے۔ اور جس پیغمبر کو بھیجوں اس پر ایمان لا کر اس کے رفیق رہو گے تو ملک شام تمہارے قبضہ میں رہے گا (بنی اسرائیل نے اس کو قبول کر لیا تھا) مگر پھر اقرار پر قائم نہ رہے بدنیتی کی، رشوت لے کر مسئلے غلط بتائے، حق کو چھپایا، اپنی ریاست جمائی، پیغمبر کی اطاعت نہ کی بلکہ پیغمبروں کو قتل کیا، توریت میں جہاں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی صفت تھی اس کو بدل ڈالا اس لئے گمراہ ہوئے۔

ف۲ یعنی منافع دنیوی کے فوت ہونے سے مت ڈرو۔

ف۳ توریت میں بتا دیا گیا تھا کہ جو نبی آئے اگر توریت کی تصدیق کرے تو اس کو جانو سچا ہے نہیں تو جھوٹا ہے جاننا چاہیئے کہ احکام قرآنی درباره اعتقادات اور اخبار انبیاء واحوال آخرت و اوامر ونواہی توریت وغیرہ کتب سابقہ کے موافق ہیں۔ ہاں بعض اوامر ونواہی میں نسخ بھی کیا گیا ہے مگر وہ تصدیق کے خلاف نہیں تصدیق کے خلاف تکذیب ہے اور تکذیب کسی کتاب الٰہی کی ہو بالکل کفر ہے منسوخ تو بعض آیات قرآنی بھی ہیں مگر اس کو نعوذ باللہ کون تکذیب کہہ سکتا ہے۔

ف۴ یعنی قرآن کی دیدہ ودانستہ تکذیب کرنے والوں میں اول مت ہو کہ قیامت تک کے منکرین کا وبال تمہاری گردن پر ہو اور مشرکین مکہ نے جو انکار کیا ہے وہ جہل اور بیخبری کے سبب کیا ہے دیدہ ودانستہ ہرگز نہ تھا اس میں تو اول تم ہی ہو گے اور یہ کفر پہلے کفر سے سخت تر ہے۔

ف۵ یعنی با جماعت نماز پڑھا کرو پہلے کسی دین میں با جماعت نماز نہیں تھی اور یہود کی نماز میں رکوع نہ تھا خلاصہ آیت کا یہ ہوا کہ صرف امور مذکورہ بالا نجات کے لئے تم کو کافی نہیں بلکہ تمام اصول میں نبی آخر الزماں کی پیروی کرو۔ نماز بھی ان کے طور پر پڑھو جس میں جماعت بھی ہو اور رکوع بھی۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾

پھر کیوں نہیں سوچتے ہو ف۱ اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے ف۲ اور البتہ وہ بھاری ہے مگر انہی عاجزوں پر

پھر کیا نہیں بوجھتے اور قوت پکڑو محنت سہارنے سے اور نماز سے اور البتہ وہ بھاری ہے مگر انہیں پر جن کے دل پگھلے ہیں

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع

جن کو خیال ہے کہ وہ روبرو ہونے والے ہیں اپنے رب کے اور یہ کہ انکو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ف۳

جن کو خیال ہے کہ ان کو ملنا ہے اپنے رب سے اور ان کو اسی طرف الٹے جانا ہے۔

تذکیر اجمالی انعامات خاصہ بر اسلاف یہود وامر ایشاں بایفاء عہود ونہی از دین فروشی وحق پوشی

یعنی ان نعمتوں کا بیان جو خاص بنی اسرائیل پر مبذول ہوئیں

قَالَ تَعَالٰی: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ ... الی ... وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

ربط:...... شروع سورت میں حق تعالیٰ نے متقین اور کافرین اور منافقین کے اوصاف اور احوال بیان کیے۔ بعد ازاں ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا﴾ میں خطاب عام فرمایا اور کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیا پھر توحید اور رسالت اور قیامت کے دلائل بیان کیے تا کہ عبادت کر کے آخرت کی تیاری کر سکیں بعد ازاں اپنے انعامات کو بیان کیا جو تمام بنی آدم کو عام اور شامل ہیں اب عنان خطاب ایک خاص گروہ یعنی بنی اسرائیل کی طرف پھیرتے ہیں اور ان نعم خاصہ کو بیان کرتے ہیں جو خاص بنی اسرائیل پر مبذول ہوئیں اور منجملہ دیگر قبائل عرب۔ گروہ بنی اسرائیل کو اس لیے خطاب کے لیے مخصوص فرمایا کہ یہ سورت پہلی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی اور مدینہ میں یہود ایک کثیر تعداد میں آباد تھے یہود کو اگرچہ اوس اور خزرج اور دیگر قبائل عرب کے مقابلہ میں عددی اکثریت حاصل نہ تھی لیکن یہود کو دیگر قبائل کے مقابلہ میں علمی تفوق اور امتیاز حاصل تھا یہ لوگ اہل کتاب اور اہل علم کہلاتے تھے اور خاندان نبوت سے تھے اور مشرکین عرب امی اور ان پڑھ تھے اور اہل علم اگر حق کو قبول کر لیں تو عوام پر اس کا بہت اثر پڑتا ہے اس لیے اس رکوع میں خاص بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا اور اولاً ان نعمتوں کو اجمالاً یاد دلایا جو اس خاندان پر مبذول ہوئی تھیں۔ اور دوسرے رکوع سے ان کی

ف۱ بعض علمائے یہود یہ کمال کرتے تھے اپنے لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ دین اسلام اچھا ہے اور خود مسلمان نہ ہوتے تھے۔ اور نیز علمائے یہود بلکہ اکثر ظاہر بینوں کو اس موقع پر یہ شبہ پڑ جاتا ہے کہ جب ہم تعلیم احکام شریعت میں قصور نہیں کرتے اور حق پوشی بھی نہیں کرتے تو اس کی ضرورت نہیں کہ ہم خود بھی احکام پر عمل کریں جب ہماری ہدایت کے موافق بہت سے آدمی اعمال شریعت بجالاتے ہیں تو بحکم قاعدہ اَلدَّالُّ عَلَی الْخَیْرِ كَفَاعِلِهٖ وہ ہمارے ہی اعمال ہیں تو اس آیت میں دونوں کا بطلان فرما دیا گیا اور آیت سے مقصود یہ ہے کہ واعظ کو اپنے وعظ پر ضرور عمل کرنا چاہیے یہ غرض نہیں کہ فاسق کسی کو نصیحت نہ کرے۔

ف۲ علمائے اہل کتاب جو بعد وضوح حق بھی آپ پر ایمان نہ لاتے تھے اس کی بڑی وجہ حب جاہ اور حب مال تھی اللہ تعالیٰ نے دونوں کا علاج بتا دیا صبر سے مال کی طلب اور محبت جائے گی اور نماز سے عبودیت وتذلل آئے گا۔ اور حب جاہ کم ہوگی۔

ف۳ یعنی صبر اور نماز حضور دل سے بہت بھاری ہے مگر ان پر آسان ہے جو عاجزی کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں جن کا خیال اور دھیان یہ ہے کہ ہم کو خدا کے روبرو ہونا اور اس کی طرف پھر جانا ہے (یعنی نماز میں خدا کا قرب اور گویا اس سے ملاقات ہے) یا قیامت میں حساب وکتاب کے لئے روبرو جانا ہے۔

---

(۱) یعنی در جمیع حاجات ومصائب واللہ اعلم۔ فتح الرحمن

تفصیل فرمائی جو دور تک چلی گئی اور مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل ان نعمتوں کو یاد کر کے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور اپنے رب کریم اور منعم قدیم کے الطاف وعنایات کو یاد کر کے ایفاء عہد کے لیے دل وجان سے تیار ہو جائیں کیونکہ توریت میں نبی آخر الزمان کی بشارتیں اور صفتیں مذکور تھیں۔ اور نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کے عہد کا بھی ذکر تھا اور علماء یہود اس سے بخوبی واقف تھے اس لیے مناسب ہوا کہ اولاً اہل علم کو اسلام کی طرف متوجہ کیا جائے تا کہ اور لوگ بھی ان کی تقلید سے راہ حق پر آجائیں اور ان کا اتباع اوروں کے لیے حجت بن جائے اور بنی اسرائیل کے خطاب سے پہلے حضرت آدم کا قصہ ذکر کیا جس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ابلیس نے محض حسد اور تکبر کی وجہ سے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو یعنی یہود کو خطاب کیا تا کہ متنبہ اور خبردار ہو جائیں کہ تم کو تکبر اور حسد کا انجام معلوم ہے لہٰذا تم کو چاہیے کہ تکبر اور حسد کی وجہ سے محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع سے اعراض نہ کرو چنانچہ فرماتے ہیں اے فرزندان یعقوب یاد کرو تم میری ان خاص ① نعمتوں کو جن کا میں نے خاص تم پر انعام کیا۔ اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے جو اسرا اور ایل سے مرکب ہے۔ اسراء کے معنے بندہ یا برگزیدہ کے ہیں اور ایل اللہ کا نام ہے لہٰذا اسرائیل کے معنی عبداللہ یا صفوۃ اللہ کے ہوں گے۔ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ بجائے یا بنی یعقوب کے یا بنی اسرائیل فرمانے میں ایک خاص لطافت ہے۔ وہ یہ کہ اس لقب کی طرف مضاف کرنے سے یہ معنی ہوں گے کہ اے اولاد ہمارے مطیع اور فرمانبردار اور برگزیدہ بندہ کی تم کو تو اتباع حق میں اپنے باپ کا نمونہ ہونا چاہیے۔ جس طرح کہتے ہیں: "یا ابن الکریم افعل کذا" اے کریم کے بیٹے ایسا کر "یا ابن الشجاع بارز الابطال"۔ اے شجاع کے بیٹے بہادروں کا مقابلہ کر۔ "یا ابن العالم اطلب العلم"۔ اے عالم کے بیٹے علم حاصل کر۔ پھر اس کے علاوہ تمہارے خاندان میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چار ہزار نبی آئے۔ اس لیے تم کو پیغمبروں کی علامتیں خوب معلوم ہیں لہٰذا تم کو نبی اکرم محمد مصطفیٰ ﷺ کے اتباع میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے اکثر مناظرہ اور مکالمہ قریش کے ساتھ رہتا تھا جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود سے مناظرہ اور مکالمہ شروع ہوا۔ یہود چونکہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے علماء کہلاتے تھے، تمام عرب کی نگاہیں ان پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ لوگ اہل علم ہیں ان کے خاندان میں ہزاروں نبی ہوئے۔ انبیاء کی علامتوں سے خوب واقف ہیں۔ دیکھیں یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب اس لیے حق تعالیٰ شانہ نے اپنے خاص خاص انعامات کو جو وقتاً فوقتاً بنی اسرائیل پر ہوتے رہے۔ یاد دلایا اس لیے کہ عام نعمتوں کا تذکرہ اتنا مفید اور موثر نہیں ہوتا۔ جتنا کہ خاص نعمتوں کا تذکرہ دل میں اثر رکھتا ہے اس لیے اولاً اجمالی طور پر حق جل شانہ نے اس رکوع میں بنی اسرائیل پر اپنے خاص انعامات کا ذکر فرمایا تا کہ شرما کر ایمان لائیں اس کے بعد دوسرے رکوع میں تفصیلی طور پر اپنے انعامات کا اور بنی اسرائیل کی شرارتوں کو ذکر فرمایا تا کہ لوگ ان کی شرارتوں سے واقف ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ ان کا قول اور فعل قابل اعتبار نہیں۔

اور پورا کرو تم اس عہد کو جو تم نے مجھ سے کیا تھا میں بھی پورا کروں گا اس عہد کو جو میں نے تم سے کیا ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں اس عہد سے وہ مراد ہے جو سورہ مائدہ کی اس آیت میں مذکور ہے: ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ

① هذه ترجمة الاضافة التي في قوله تعالىٰ نعمتي لان الاضافة تفيد الاختصاص فافهم ۱۲

﴿وَأَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ﴾

اور بعض کہتے ہیں کہ اس عہد سے وہ عہد مراد ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا کہ تمہارے بھائیوں میں سے یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا عہد مراد ہے۔ اور اہل کتاب سے اللہ کا عہد یہ تھا کہ تم میں سے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیگا اس کو دو اجر ملیں گے جیسا کہ سورہ قصص کی اس آیت میں ہے ﴿أُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ﴾۔ ایک اجر حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی وجہ سے اور دوسرا اجر محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی وجہ سے۔ پس اے اہل کتاب تم محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاؤ۔ اور اس سے نہ ڈرو کہ ایمان لانے سے تمہارے ہدیے اور نذرانے بند ہوجائیں گے۔ اور قوم تمہاری مخالف ہوجائے گی اور درپے ایذاء واضرار ہوجائے گی اور قوم تم کو اپنی جماعت سے نکال باہر کرے گی۔ جس سے طرح طرح کے نقصان اٹھانے پڑیں گے بلکہ خاص مجھ سے ڈرو قوم تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بھلائی اور برائی سب میرے ہاتھ میں ہے۔

ایمان لانے سے دنیا کے حقیر اور معمولی اور چند روزہ اور فانی ہی منافع فوت ہونگے مگر ایمان نہ لانے سے خدا کی رضا اور خوشنودی اور آخرت کے دائمی بیش بہا منافع فوت ہوجائیں گے۔

لکل شيء اذا فارقته عوض ولیس لله ان فارقت من عوض

(جس چیز کو بھی چھوڑو اس کا عوض مل سکتا ہے مگر خدا کو چھوڑ کر اس کا عوض پانا ناممکن اور محال ہے)۔ اس لیے ارشاد ہوا مجھ سے ہی ڈرو امراء اور رؤساء سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا اور آخرت کے نفع اور ضرر کا مالک صرف میں ہی ہوں۔

﴿وَاٰمِنُوْا بِمَآ أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ﴾ اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے محمد ﷺ پر نازل کی درآنحالیکہ وہ کتاب اس توریت کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے۔ یعنی اول تو محض اس وجہ سے ایمان لے آنا چاہیے تھا کہ قرآن کو اللہ نے نازل کیا ہے جیسے تم توریت پر اس وجہ سے ایمان لائے کہ اللہ نے اس کو اتارا ہے اسی طرح یہ قرآن بھی اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے اسی طرح اس پر بھی ایمان لاؤ۔ علاوہ ازیں یہ کتاب اس توریت کی جو موسیٰ علیہ السلام پر اتاری گئی۔ اس کے منزل من اللہ اور کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے اس لحاظ سے بھی تمکو اس پر ایمان لانا چاہیے پھر یہ کہ توریت میں نبی آخر الزمان کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی کا تم کو بخوبی علم ہے لہٰذا تم کو چاہیے کہ سب سے پہلے حضور پرنور پر ایمان لاؤ اور دیدہ دانستہ سب سے پہلے [1] قرآن کے منکر اور مکذب یعنی جھٹلانے والے نہ ہو کہ قیامت تک قرآن کریم کی تکذیب کرنے والوں کا وبال تمہاری گردن پر رہے۔ اس لیے کہ ہجرت کے بعد پہلا فرقہ یہود کا ہے جو مدینہ اور خیبر میں رہتا تھا اور دوسرا فرقہ نصاریٰ کا ہے جو زیادہ تر شام میں رہتا تھا۔ پس اگر یہود آنحضرت ﷺ کی نبوت کا انکار کریں گے تو نصاریٰ بھی ان کے دیکھا دیکھی انکار کریں گے اس لیے فرمایا کہ اے یہود تم پہلے کافر نہ بنو۔

ف:...... مشرکین مکہ اگرچہ اہل کتاب سے پہلے انکار اور تکذیب کر چکے تھے مگر وہ تکذیب جہالت اور نادانی پر مبنی تھی دیدہ ودانستہ

[1] اشارة الی ان الضمير فی قوله به عائد الی القرآن الذی تقدم ذكره قوله بما انزلت واختاره ابن جرير وقيل الی محمد صلی الله عليه وسلم۔

حق پوشی نہ تھی۔ اہل کتاب حق سے خوب باخبر تھے۔ دیدہ ودانستہ حق کو چھپاتے تھے اس لیے ارشاد ہوا۔ ﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾ یعنی اے اہل کتاب سب سے پہلے تم حق پوشی کرنے والے نہ بنو۔ اس لیے کہ کفر کی حقیقت حق پوشی ہے۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ﴾ اور میری آیتوں کے عوض میں ایک نہایت قلیل اور حقیر معاوضہ لینے پر آمادہ اور راضی نہ ہو جاؤ۔ آخرت کے ضرر کو دنیا کے ضرر سے بڑھ کر جانو اور کثیر اور باقی کے مقابلہ میں قلیل اور فانی کو ہرگز ترجیح نہ دو۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ساری ہی دنیا کا کل ساز وسامان قلیل ہے۔ قال تعالیٰ: ﴿مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ دراہم معدودہ کی طمع میں میری آیتوں میں تحریف اور تبدیلی نہ کرو۔ اور خاص مجھ سے ہی ڈرو۔ عوام الناس سے مرعوب ہو کر حق سے اعراض نہ کرو۔

ف:...... ظاہر کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس طرح فرماتے: "لَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي متاعا قَلِيلًا"۔ میری آیات کے بدلے میں تھوڑا سامان مت خریدو اس لیے کہ عرف میں سامان خریدا جاتا ہے۔ ثمن اور قیمت نہیں خریدی جاتی لیکن بجائے اس کے ﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ فرمانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ تمام دنیا کا ساز وسامان بمنزلہ قیمت کے ہے اور اصل مقصود آخرت ہے اور یہ مسلم ہے کہ معاملہ میں مقصود بالذات قیمت نہیں ہوتی۔ اصل مقصود سامان ہوتا ہے اور قیمت اور زر ثمن مقصود کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ پس اشارہ اس طرف ہے کہ تم نے اپنی نادانی اور غلط فہمی سے ثمن اور قیمت کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور باقی کو دیکر فانی کو خرید لیا۔

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے ہو کہ حق کو باطل کے ساتھ ملانا اور حق کو چھپانا کس قدر مذموم ہے۔ زہر کو زہر جان کر کھانا انتہائی نادانی ہے۔

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو یہ حکم تھا کہ تم خود گمراہی سے باز آؤ اور ایمان اور ہدایت کو قبول کرو۔ اس آیت میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کو گمراہ نہ کرو۔ جن لوگوں کے کان کچھ حق سے آشنا ہو چکے ہوں اور کلمہ حق ان کے کان میں پڑ چکا ہو ان کو گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ حق اور باطل صدق اور کذب ہدایت اور ضلالت کو ان کے سامنے خلط ملط کر دیا جائے تا کہ حق کے قبول کرنے میں متردد ہو جائیں۔ ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے اور جس شخص نے کلمہ حق سنا ہی نہ ہو۔ رشد اور ہدایت سے بالکل بے خبر ہو۔ اس کے گمراہ کرنے کا طریق یہ ہے کہ حق کو اس کے سامنے ظاہر نہ کیا جائے کہ مبادا وہ حق بات سن کر اس کو قبول نہ کرے۔ اور ﴿تَكْتُمُوا الْحَقَّ﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

یہاں تک اہل کتاب کو ایمان کی دعوت دی گئی۔ ایمان کے بعد سب سے زائد محبوب عمل اللہ کے نزدیک نماز ہے اس لیے آئندہ آیت میں نماز کا پھر زکوٰۃ کا حکم فرمایا کہ جان اور مال کی اطاعت میں لگے رہو یعنی اے بنی اسرائیل ایمان کے بعد اور نماز کو قائم اور درست رکھو۔ یعنی محض کتمان حق اور تلبیس اور خلط ملط سے باز رہنا نجات کے لیے کافی نہیں جب تک کہ احکام خداوندی پر عمل نہ ہو۔ لہذا ضروری ہوا کہ ایمان کے بعد نماز کو قائم رکھو۔

علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ ﴿الصَّلٰوةَ﴾ میں الف لام عہد کا ہے۔ یعنی ایسی نماز پڑھو کہ جیسی صحابہ کرام پڑھتے ہیں۔ منافقوں کی سی نماز نہ پڑھو۔ جو حقیقت میں نماز نہیں بلکہ فقط صورت اور ہیئت نماز کی ہے اور طیب خاطر اور انشراح صدر

کے ساتھ زکوٰۃ دیا کرو۔ جس طرح سے لغت عرب میں ایتان سہولت سے آنے کا نام ہے۔ اسی طرح ایتاء سہولت سے دینے کا نام ہے اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا شریعت اسلامیہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہود نماز پڑھتے تھے مگر تنہا۔ اس لیے حکم ہوا کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھو اس لیے کہ نماز بھی ایک قسم کا جہاد ہے جس میں اجتماع ضروری اور لازمی ہے۔ اور محراب مسجد محاربہ شیطان کا محل ہے اور قتال کے لیے صفوف کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے صفوف جماعت کے سیدھا رکھنے کی حدیثوں میں بہت تاکید آئی ہے۔

توبیخ عالم بے عمل

﴿اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴾ کیا تم دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب یعنی توریت کو پڑھتے ہو جس میں عالم بے عمل کی مذمت جابجا مذکور ہے۔ پس کیا تم سمجھتے نہیں کہ دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا راستہ بتلانا اور دیدہ ودانستہ اپنے کو ہلاک اور برباد کرنا یہ عقل اور فراست نہیں بلکہ عین سفاہت اور عین حماقت ہے۔ تعجب ہے کہ تم دوسروں کے ساتھ تو احسان کرتے ہو مگر اپنے نفس کے ساتھ احسان نہیں کرتے حالانکہ وہ احسان کا زیادہ مستحق ہے۔ اپنی بدخواہی اور دوسروں کی خیرخواہی عقل کا اقتضاء نہیں عقل کو عقل اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ انسان کو بری باتوں سے روکتی ہے اور اس لیے کہ عقل کے معنی لغت میں روکنے کے ہیں۔ پس جب انسان نے اپنے ہی کو گمراہی سے نہ بچایا اور بری باتوں سے نہ روکا تو وہ کس طرح عاقل کہلا سکتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ عالم بے عمل کی مثال شمع کی سی ہے کہ دوسروں کو روشنی پہنچاتی ہے اور اپنے کو جلاتی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت یہود کے بارہ میں نازل ہوئی جو اپنے خویش اقارب کو جو ایمان لے آئے تھے ان کو یہ کہا کرتے تھے کہ تم دین اسلام پر قائم رہو۔ محمد ﷺ جو فرماتے ہیں وہ حق ہے دوسروں کو ایمان اور اسلام کی ترغیب دیتے اور خود ایمان اور اسلام کو قبول نہ کرتے مطلب یہ ہوا کہ تم توریت کی تلاوت کرتے ہو اور اس میں نبی آخر الزمان کی بشارتیں پڑھتے ہو باوجود اس علم کے تم خود تو ایمان نہیں لاتے اور تمہارے اقارب اور احباب میں سے جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لے آتا ہے اس کو ایمان اور اسلام پر قائم رہنے کی تاکید کرتے ہو تمہارا عجب حال ہے کہ باوجود کتاب کے پڑھنے اور اہل علم کہلائے جانیکے کہ دوسروں کو تو نیک باتوں کا حکم کرتے ہو مگر خود ان پر عمل نہیں کرتے۔

تنبیہ:...... اس آیت شریفہ کا یہ مقصد نہیں کہ عالم بے عمل کسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے یا کسی کو راہ حق نہ بتلائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ خود بھی ضرور عمل کرے عالم ہو کر بے عمل نہ رہے بلکہ عالم با عمل بنے۔ جب وہ دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے تو اس کو یہ سوچ لینا چاہیے کہ سب سے پہلے میرا نفس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا محتاج ہے۔

عالم پر دو چیزیں فرض ہیں۔ ایک ترک معصیت یعنی خود معصیت نہ کرنا۔ دوم یہ کہ دوسروں کو معصیت سے منع کرنا۔ اگر دونوں فرض نہیں بجالا سکتا تو دونوں کو چھوڑ ابھی نہیں جا سکتا۔ "ما لا یدرك كله لا يترك كله"۔ طبیب اگر کسی

مرض میں خود مبتلا ہو تو اسی مرض کے مریض کا معالجہ کرسکتا ہے لیکن خود اس کا مرض جب ہی زائل ہوگا جب وہ خود بھی دوا کا استعمال کرلے دوسرے مریض کو دوا کا بتلانا بلاشبہ ضروری اور مستحسن ہے اور مریض کے لیے غایت درجہ مفید ہے مگر اس بدپرہیز طبیب کو فائدہ جب ہوگا کہ جب خود بھی دوا کا استعمال کرے محض دوسرے کو دوا بتلادینا اس کے مرض کے ازالہ کے لیے کافی نہیں اور ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ میں انکار فقط قول حق اور امر بالمعروف کی طرف راجع نہیں بلکہ "تَقُوْلُوْنَ" کی قید یعنی "لَا تَفْعَلُوْنَ" کی طرف راجع ہے یعنی حق کہنے کے بعد اس پر عمل کیوں نہیں کرتے بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی شئ کسی قید کے ساتھ مقید ہو تو نفی اور انکار فقط قید کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ علماء اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نبی برحق ہیں مگر حب مال اور حب جاہ آپ کے اتباع سے مانع تھے کہ اگر آپ پر ایمان لے آئیں گے تو ہمارے ہدیے اور نذرانے بھی بند ہو جائیں گے اور رؤساء اور امراء کی نظروں سے ہم گر جائیں گے اور جو عزت اور وجاہت ہم کو حاصل ہے وہ جاتی رہے گی۔ آئندہ آیت میں اس کا علاج ارشاد فرمایا۔

اصلاح نفس کا طریقہ اور حب مال اور حب جاہ کا علاج

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ اور اگر تم حب دنیا اور ہوا و ہوس کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے ہو تو شہوات اور لذات سے پرہیز کرو اور اس کے معالجہ کے لیے یہ دوائیں استعمال کرو یعنی صبر سے مدد طلب کرو یعنی نفس کو صبر اور قناعت کا خوگر اور ترک لذات اور شہوات کا عادی بناؤ۔ تاکہ دنیا کی محبت دل سے زائل ہو۔ اور حق اور باطل میں تمیز کرسکو مرض کا ازالہ جب ہی ممکن ہے کہ اول مضرات سے پورا پورا پرہیز ہو اور پھر دوا کا استعمال ہو۔ اسی طرح باطنی امراض کے ازالہ کے لیے صبر بمنزلہ پرہیز کے ہے اور شکر بمنزلہ دوا کے ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ "اَلْاِيْمَانُ نِصْفَانِ نِصْفٌ فِى الصَّبْرِ وَنِصْفٌ فِى الشُّكْرِ"۔ ایمان کے دو حصے ہیں ایک صبر اور دوسرا شکر۔ یعنی ایمان کی صحت اور سلامتی دو چیزوں پر موقوف ہے ایک صبر پر یعنی مضرات سے پرہیز کرنے پر اور دوم دواء شکر کے استعمال پر۔ جب تک پرہیز کامل نہ ہو اس وقت تک دوا پورا نفع نہیں کرتی اس لیے اول پرہیز یعنی صبر کا حکم دیا اور پھر دوا کے استعمال کا حکم دیا یعنی نماز کا کہ حمد و ثناء تسبیح و تقدیس رکوع و سجود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کا شکر ہے۔

برمراد نفس تا گردی اسیر صبر گزین وقناعت پیشہ گیر

یعنی اگر تم کو اجر اور معاوضہ ہی مطلوب ہے تو حطام دنیا اور دراہم معدودہ پر کیوں گرے جاتے ہو آؤ صبر کرو تاکہ بارگاہ خداوندی سے تم کو بے حساب اور بے شمار اجر ملے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾۔ اور اگر کو عزت اور وجاہت کے طالب ہو تو عزت اور وجاہت کو ان کے پاس کہاں ڈھونڈتے ہو۔ عزت کی اگر تلاش ہے تو اس عزیز مقتدر کے پاس تلاش کرو جس کی شان یہ ہے۔ ﴿تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ﴾

عزیزے کہ از در گہش سر بتافت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

پس اگر تم عزت کے متلاشی ہو تو آؤ اور اس ذوالجلال والاکرام کی بارگاہ بے نیاز پر جبین نیاز کو خم کرو تاکہ دنیا اور

آخرت کی عزتیں تم کو حاصل ہوں۔ یعنی نماز پڑھو۔ نماز کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کی محبت اور عظمت کو اور دنیا کی نفرت اور آخرت کی رغبت کو دل میں راسخ کرتی ہے۔ مخلوق سے تعلق کو قطع کرتی ہے اور خالق ذوالجلال سے تعلق کو مستحکم اور مضبوط کرتی ہے۔ مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی امر پیش آتا تو فوراً گھبرا کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

اور مسند احمد اور سنن نسائی میں صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرات انبیاء کو جب پریشانی پیش آتی تو نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ سفر میں تھے کہ بیٹے کی وفات کی خبر دی گئی تو سواری سے اترے اور دو رکعت نماز پڑھی اور ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ پڑھا اور یہ فرمایا کہ ہم نے ویسے ہی کیا جیسا اللہ نے ہم کو حکم دیا۔ اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ (اخرجہ سعید بن منصور روابن المنذر والحاکم وغیرہم) ضرورت اور پریشانی کے وقت جو نماز پڑھی جائے وہ صلوۃ الحاجۃ کہلاتی ہے اس آیت میں اسی صلوۃ الحاجۃ کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

اور تحقیق وہ یعنی صبر اور صلاۃ سے استعانت اور استمداد البتہ بہت شاق اور گراں ہے مگر انہیں پر جن کے دل خدا کے خوف سے پگھلے جاتے ہیں۔ جن کو خیال ہے کہ ہم یقیناً خدا سے ملنے والے ہیں اور بلاشبہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یعنی صبر اور نماز حقیقت میں دشوار نہیں کہ جس کا بجالانا ممکن ہو ہاں ان لوگوں پر جو خدا سے ملنے کی امید نہیں رکھتے۔ نماز ان پر بہت شاق اور گراں ہے وہ اس کو محض مشقت اور محنت خیال کرتے ہیں مگر ان خاشعین پر جو عذاب الیم سے ڈرتے ہیں اور ثواب عظیم اور نعیم مقیم کی امید رکھتے ہیں ان پر نماز شاق اور گراں تو کیا ہوتی ان کے لیے تو آنکھوں کی ٹھنڈک اور دلوں کی فرحت اور مسرت ہے۔

ف:...... جو علم اور ادراک ان علامات سے حاصل ہو جو نہ حسی ہوں اور نہ بدیہی لغت میں اس کو ظن کہتے ہیں کبھی دلائل اور براہین کے انضمام سے اسمیں قوت پیدا ہو جاتی ہے جو جزم اور یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی اس درجہ ضعیف ہو جاتا ہے کہ شک اور وہم کے قریب پہنچ جاتا ہے اس لیے لفظ ظن کبھی یقین کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور کبھی شک کے معنی میں اور کبھی گمان غالب کے معنی میں۔ اس آیت میں اگر ظن سے یقین کے معنی مراد لیے جائیں جیسا کہ مجاہد اور ابوالعالیہ اور قتادہ وغیرہ ہم سے منقول ہے تو آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ نماز ان لوگوں پر شاق اور گراں نہیں جو خدا سے ملنے کا یقین رکھتے ہیں اور اگر ظن کے معنی گمان اور خیال کے لیے جائیں تو یہ معنی ہوں گے کہ جس شخص کو خدا کی ملاقات اور اس کی جزاء اور سزاء کا گمان اور خیال بھی ہو جائے تو اگر عقل سلیم رکھتا ہے تو صبر اور نماز اور معاصی سے پرہیز اور طاعات خداوندی کا بجالانا اس کو شاق اور گراں نہیں بلکہ سہل اور آسان ہوگا مریض کو جن لذائذ وطیبات کے استعمال سے ضرر کا گمان اور خیال بھی ہو جاتا ہے ان سے پرہیز کرنا اس کو دشوار نہیں معلوم ہوتا اور تلخ سے تلخ دوا کا استعمال کہ جس سے صحت اور شفا کی امید ہو آسان اور سہل معلوم ہوتا ہے۔ بعض عارفین فرماتے ہیں کہ ﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ وہ خاشعین نماز پڑھتے وقت یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ" عبادت کر۔ اللہ کی اس طرح کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے"۔ خلاصہ یہ کہ اگر تم کو نفس کا تزکیہ اور اس کی اصلاح مقصود ہے تو صبر اور نماز سے اس بارہ

میں مدد حاصل کرو۔ اور اگر یہ طریق تم کو دشوار معلوم ہوتا ہے تو دوسرا طریق یہ ہے کہ تم نعمائے الٰہیہ کا مراقبہ کیا کرو اور سوچا کرو کہ حق تعالیٰ شانہ نے ہم پر کیا کیا نعمتیں برسائیں اور باوجود ہماری نافرمانیوں کے ہم پر کیا کیا احسانات ہوتے رہے۔ اس تفکر اور مراقبہ کا اثر یہ ہوگا کہ قلب میں حق جل شانہ کی محبت کا ولولہ اور جوش پیدا ہوگا۔ "اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ" انسان بندہ ہے احسان کا۔ جہاں یہ جوش اور ولولہ پیدا ہوا مقصد حاصل ہو گیا۔

ہر آنکہ عشق یکے در دلش گرفت قرار   روا بود کہ تحمل کند جفائے ہزار

عشق آں شعلست کو چوں برفروخت   ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

اس لیے آئندہ آیت میں پھر ان نعمتوں کے یاد کرنے کا حکم دیتے ہیں اور جن نعمتوں کو پہلے اجمالاً یاد دلایا تھا اب ان کو تفصیلاً بیان فرماتے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کئے اور اسکو کہ میں نے تم کو بڑائی دی تمام عالم پر ف ۱

اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان میرا جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے تم کو بڑا کیا جہان کے لوگوں پر

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ

اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اسکی طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے

اور بچو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے ایک ذرہ اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش اور نہ لیں

مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ

اس کی طرف سے بدلہ اور نہ ان کو مدد پہنچے ف ۲ اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ رہائی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کرتے تھے تم پر

اس کے بدلہ میں کچھ اور نہ ان کو مدد پہنچے اور جب چھڑایا ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے دیتے تم کو بڑی تکلیف

ف ۱ چونکہ تقویٰ اور کمال ایمان کا حاصل کرنا صبر وحضور واستغراق عبادات کے ذریعہ سے دشوار تھا۔ اس لئے اس کا سہل طریقہ تعلیم فرماتے ہیں اور وہ شکر ہے اس وجہ سے حق تعالیٰ اپنے احسانات وانعامات جو ان پر وقتاً فوقتاً ہوتے تھے۔ ان کو یاد دلاتا ہے اور انکی بدکرداریاں بھی ظاہر فرماتا ہے۔ انسان بلکہ حیوانات تک میں یہ مضمون موجود ہے کہ اپنے منعم کی محبت اور اسکی اطاعت دل نشین ہو جاتی ہے اور چند رکوع میں اس مضمون کو شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ فائدہ اہل عالم پر فضیلت کا یہ مطلب ہے کہ جس وقت سے بنی اسرائیل کا وجود ہوا تھا اس وقت سے لے کر اس خطاب کے نزول تک تمام فرقوں سے افضل رہے کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا جب انہوں نے نبی آخر الزماں اور قرآن کا مقابلہ کیا تو وہ فضیلت بالکل جاتی رہی اور مغضوب علیہم اور ضلال کا لقب عنایت ہوا۔ اور حضور کے متبعین کو کنتم خیر امة کا خلعت ملا۔

ف ۲ جب کوئی کسی بلا میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے رفیق اکثر یہی کیا کرتے ہیں کہ اول تو اس کے ادائے حق لازم میں کوشش کرتے ہیں یہ نہیں ہو سکتا تو سعی وسفارش سے بچانے کی تدبیر کرتے ہیں یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر تاوان وفدیہ دے کر چھڑاتے ہیں اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو بالآخر اپنے مددگاروں کو جمع کر کے بزور پرخاش اس کی نجات کی فکر کرتے ہیں حق تعالیٰ نے اسی ترتیب کے موافق ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص کو کیسا ہی مقرب خداوندی ہو مگر کسی نافرمان عدو اللہ کافر کو منجملہ چاروں صورتوں کے کسی صورت سے نفع نہیں پہنچا سکتا۔ بنی اسرائیل کہتے تھے کہ ہم کیسے ہی گناہ کریں ہم پر عذاب نہ ہوگا۔ ہمارے باپ دادا جو پیغمبر ہیں ہمیں بخشوا لیں گے سو خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ خیال تمہارا غلط ہے اس سے اس شفاعت کا انکار نہیں نکلتا جس کے اہل سنت قائل ہیں اور جو دیگر آیات میں مذکور ہے۔

الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ

بڑا عذاب ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو ف۱ اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے

ذبح کرتے تمہارے بیٹے اور جیتی رکھتے تمہاری عورتیں اور اس میں مدد ہوئی تمہارے رب کی

عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ

بڑی ف۲ اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھر بچا دیا ہم نے تم کو اور ڈبا دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم

بڑی اور جب ہم نے چیرا تمہارے پیٹھنے کے ساتھ دریا پھر بچادیا تم کو اور ڈبادیا فرعون کے لوگوں کو اور تم

تَنظُرُونَ ﴿٥٠﴾ وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ

دیکھ رہے تھے ف۳ اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنا لیا بچھڑا موسیٰ کے بعد اور تم

دیکھتے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنالیا بچھڑا اس کے پیچھے اور تم

ظَالِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى

ظالم تھے ف۴ پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم احسان مانو ف۵ اور جب ہم نے دی موسیٰ کو

بے انصاف ہو پھر معاف کیا ہم نے تم اس پر بھی شاید تم احسان مانو اور جب دی ہم نے موسیٰ کو

الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ

کتاب اور حق کو ناحق سے جدا کرنے والے احکام تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ ف۶ اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے ف۷ اے قوم تم نے نقصان کیا

کتاب اور چکوتی شاید تم راہ پاؤ اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم تم نے نقصان کیا

ف۱ فرعون نے خواب دیکھا تھا۔ نجومیوں نے اس کی تعبیر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہوگا۔ جو تیرے دین اور سلطنت کو غارت کر دے گا۔ فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بیٹا پیدا ہو اس کو مار ڈالو اور جو بیٹی ہو اس کو خدمت کے لئے زندہ رہنے دو خدائے تعالیٰ نے موسیٰ کو پیدا کیا اور زندہ رکھا۔

ف۲ بلاء کے چند معنی آتے ہیں اگر ذٰلکم کا اشارہ ذبح کی طرف لیا جائے تو اس کے معنی مصیبت کے ہوں گے اور اگر نجات کی طرف اشارہ ہے تو بلاء کے معنی نعمت کے ہوں گے اور مجموعہ کی طرف ہو تو امتحان کے معنی لئے جائیں گے۔

ف۳ یعنی یاد کرواے بنی اسرائیل اس نعمت عظیم کو کہ جب تمہارے باپ دادا فرعون کے ڈر سے بھاگے اور آگے دریا اور پیچھے فرعون کا لشکر تھا اور ہم نے تم کو بچا لیا اور فرعون اور اسکے لشکر کو غرق کر دیا۔ یہ قصہ آئندہ مفصل آئے گا۔

ف۴ اور یہ قصہ اور احسان بھی یاد کرنے کے قابل ہے کہ ہم نے توریت عطا فرمانے کا وعدہ موسیٰؑ سے چالیس دن رات کا کیا اور ان کے طور پر تشریف لے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی اور تم بڑے بے انصاف ہو کہ بچھڑے کو خدا بنالیا۔ مفصل یہ قصہ آئندہ آئے گا۔

ف۵ مطلب یہ ہے کہ باوجود اس شرک جلی کے ہم نے تم سے درگذر فرمائی اور تمہاری توبہ منظور کی اور تم کو فی الفور ہلاک نہ کیا (جیسے آل فرعون کو اس سے کم قصور پر ہلاک کر دیا تھا) کہ تم ہمارا شکر ادا کرو اور احسان مانو۔

ف۶ کتاب تو توریت ہے اور فرقان فرمایا ان احکام شریعہ کو جن سے جائز ناجائز معلوم ہو یا فرقان کہا حضرت موسیٰؑ کے معجزوں کو جن سے جھوٹے سچے اور کافر مومن کی تمیز ہو یا توریت ہی کو کہا کہ وہ کتاب بھی ہے اور اس سے حق اور ناحق بھی جدا ہوتا ہے۔ ....=

اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ

اپنا یہ بچھڑا بنا کر سو اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان ف۱ یہ بہتر ہے

اپنا یہ بچھڑا بنالیکر اب توبہ کرو اپنے پیداکرنے والے کی طرف اور مارڈالو اپنی اپنی جان یہ بہتر ہے تم کو

لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۵۴ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى

تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر متوجہ ہوا تم پر ف۲ بیشک وہی ہے معاف کرنے والا نہایت مہربان، اور جب تم نے کہا اے موسیٰ

اپنے خالق کے پاس پھر متوجہ ہوا تم پر برحق وہی ہے معاف کرنے والامہربان اور جب تم نے کہا اے موسیٰ

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۵ ثُمَّ

ہم ہرگز یقین نہ کریں گے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے پھر آلیا تم کو بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے پھر

ہم یقین نہ کریں گے تیراجب تک نہ دیکھیں اللہ کو سامنے پھرلیا تم کو بجلی نے اور تم دیکھتے تھے پھر

بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۶ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا

اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مر گئے پیچھے تاکہ تم احسان مانو ف۳ اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا اور اتارا

اٹھاکھڑاکیاہم نے تم کو مرگئے پیچھے شاید تم احسان مانو اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا اور اتارا

عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا

تم پر من اور سلویٰ ف۴ کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دیں ف۵ اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا

تم پر من اور سلویٰ کھاؤ ستھری چیزیں جو دیں ہم نے تم کو اور ہمارا کچھ نقصان نہ کیا پر اپنا

=ف۷ قوم سے مراد خاص وہ لوگ ہیں جنہوں نے بچھڑے کو سجدہ کیا۔

ف۱ یعنی جنہوں نے بچھڑے کو سجدہ نہ کیا تھا وہ سجدہ کرنے والوں کو قتل کریں اور بعض کا قول ہے کہ بنی اسرائیل میں تین گروہ تھے ایک وہ جنہوں نے گوسالہ پرستی نہ کی اور دوسروں کو بھی روکا۔ دوسرے وہ جنہوں نے گوسالہ کو سجدہ کیا تیسرے وہ جنہوں نے خود تو سجدہ نہ کیا مگر دوسروں کو منع بھی نہ کیا۔ فریق دوم کو حکم ہوا کہ مقتول ہو جاؤ۔ تیسرے فریق کو حکم ہوا کہ ان کو قتل کرو تا کہ ان کے سکوت کرنے کی توبہ ہو جائے۔ اور فریق اول اس توبہ میں شریک نہیں ہوئے۔ کیونکہ ان کو توبہ کی حاجت نہ تھی۔

ف۲ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مقتول ہو جانا ہی توبہ تھی یا توبہ کا تتمہ تھا جیسا کہ ہماری شریعت میں قاتل عمد کی توبہ کے مقبول ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے آپ کو وارثان مقتول کے حوالے کر دے انکو اختیار ہے بدلہ لیں یا معاف کریں۔

ف۳ اس وقت کو بھی ضرور یاد کرو کہ باوجود اس قدر احسانات کے کہ جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ کریں گے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جب تک آنکھوں سے صریحاً خدائے تعالیٰ کو نہ دیکھ لیں۔ اس پر بجلی نے تم کو ہلاک کیا اس کے بعد موسیٰ کی دعا سے ہم نے تم کو زندہ کیا اور یہ اس وقت کا حال ہے کہ حضرت موسیٰ ستر آدمیوں کو منتخب فرما کر کوہ طور پر کلام الہٰی سننے کی غرض سے لے گئے تھے۔ پھر جب انہوں نے کلام الہٰی کو سنا تو انہی ستر نے کہا اے موسیٰ پردے میں سننے کا ہم اعتبار نہیں کرتے آنکھوں سے خدا کو دکھاؤ۔ اس پر ان ستر آدمیوں کو بجلی نے ہلاک کر دیا تھا۔

ف۴ جب فرعون غرق ہو چکا اور بنی اسرائیل بحکم الہٰی مصر سے شام کو چلے جنگل میں ان کے خیمے پھٹ گئے اور گرمی آفتاب کی ہوئی تو تمام دن ابر رہتا اور اناج مدہا تو من و سلویٰ کھانے کے لئے اترتا من ایک چیز تھی شیریں دھنیے کے سے دانے ترنجبین کے مشابہ رات کو اوس میں برستے لشکر کے گرد ڈھیر لگ جاتے صبح=

أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا

ہی نقصان کرتے رہے ف۱ اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں ف۲ اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو فراغت سے

ہی نقصان کرتے رہے اور جب کہا ہم نے داخل ہو اس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو محظوظ ہو کر

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝

اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے ف۳ اور کہتے جاؤ بخش دے تو معاف کر دیں گے ہم تمہارے قصور اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو ف۴

اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرکر اور کہو گناہ اترے تو بخشیں ہم تم کو تقصیریں تمہاری اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ

پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اسکے جو کہہ دی گئی تھی ان سے پھر اتارا ہم نے ظالموں پر عذاب

پر بدل لی بے انصافوں نے اور بات سوائے اس کے جو کہہ دی تھی ان کو پھر اتارا ہم نے بے انصافوں پر عذاب

السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ ع

آسمان سے ان کی عدول حکمی پر ف۵ اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا مار اپنے عصا کو

آسمان سے ان کی بے حکمی پر اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو کہا ہم نے مار اپنے عصا سے

الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا

پتھر پر سو بہہ نکلے اس سے بارہ چشمے ف۶ پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ کھاؤ

پتھر کو پھر بہہ نکلے اس سے بارہ چشمے۔ پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ کھاؤ

=کو ہر ایک اپنی حاجت کے موافق اٹھا لیتا اور سلویٰ ایک پرندہ ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں۔ شام کو لشکر کے گرد ہزاروں جمع ہو جاتے۔ اندھیرا ہوئے بعد پکڑ لاتے کباب کر کے کھاتے مدتوں تک یہی کھایا کئے۔

ف۵ یعنی اس لطیف و لذیذ غذا کو کھاؤ اور اس پر اکتفا کرو، نہ آگے کے لئے ذخیرہ جمع کر کے رکھو اور نہ دوسری غذا سے مبادلہ کی خواہش کرو۔

ف۱ اول ظلم یہ کیا کہ ذخیرہ کر کے رکھا تو گوشت سڑنا شروع ہو گیا دوسرے مبادلہ چاہا کہ مسور، گیہوں ککڑی پیاز وغیرہ ملے۔ جس سے طرح طرح کی تکلیف و مشقت میں مبتلا ہوئے۔

ف۲ جب جنگل مذکورہ بالا میں پھرتے پھرتے تنگ آگئے اور من و سلویٰ کھاتے کھاتے اکتا گئے تو بنی اسرائیل کو ایک شہر میں داخل ہونے کا حکم ہوا اس کا نام ریحا تھا اس میں قوم عمالقہ جو قوم عاد سے تھی مقیم تھی اور بعض نے بیت المقدس فرمایا ہے۔

ف۳ اس شہر کے دروازہ میں سے سجدہ شکر کرتے ہوئے جاؤ (اور یہ شکر بدنی ہوا) اور بعض فرماتے ہیں کہ براہ تواضع کمر کو جھکا کر جاؤ۔

ف۴ اور زبان سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے جاؤ (یہ شکر زبانی ہوا) جو یہ دونوں باتیں کرے گا اس کی خطائیں ہم معاف کر دیں گے اور نیک بندوں کے لئے ثواب بڑھا دیں گے۔

ف۵ تبدیل یہ کی کہ بجائے حطۃ کے براہ تمسخر حنطۃ کہنے لگے (یعنی گیہوں) اور سجدہ کی جگہ اپنے سرینوں پر گھسلنا شروع کیا جب شہر میں پہنچے تو ان پر طاعون پڑا، دوپہر میں ستر ہزار یہود مر گئے۔

ف۶ یہ قصہ بھی اسی جنگل کا ہے پانی نہ ملا تو ایک پتھر پر عصا مارنے سے بارہ چشمے نکلے اور بنی اسرائیل کے قبیلے بھی بارہ ہی تھے کسی قوم میں آدمی زیادہ کسی میں کم ۝

وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴿۶۰﴾

اور پیو اللہ کی روزی اور نہ پھرو ملک میں فساد مچاتے فل

اور پیو روزی اللہ کی اور نہ پھرو ملک میں فساد مچاتے۔

تفصیل انعامات وعنایات خداوند جلیل وشرح جنایات وتقصیرات

قوم بنی اسرائیل وحکم مراقبہ عنایات وملاحظۂ جنایات کہ در حیاء حکم اکسیر دارد

قَالَ تَعَالٰی: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ... الی ... وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو اجمالی طور پر اپنی نعمتیں یاد دلائیں اب آئندہ آیات میں ان کی تفصیل ہے جو دور تک چلی گئی اور تفصیل میں سب سے پہلی نعمت تفضیل کو ذکر فرمایا اس لیے کہ تفضیل علی العالمین سب سے افضل نعمت ہے پھر لطف یہ کہ اپنے الطاف وعنایات کے بعد ان کی جنایات اور تقصیرات کو ذکر فرمایا اس لیے کہ جب ایک طرف خداوند کریم کی عنایتوں کو دیکھیں گے اور دوسری طرف اپنی جنایات اور تقصیرات کو دیکھیں گے تو لامحالہ حق تعالیٰ سے شرمائیں گے اور اس وقت ان کا یہ حال ہوگا اور قال بھی ہوگا۔

شکر نعمتہائے تو چند انکہ نعمتہائے تو　　عذر تقصیرات ما چند انکہ تقصیرات ما

اور حیاء ایمان کا ایک درمیانی اور مرکزی شعبہ ہے جس پر ایمان کے باقی شعبے گھومتے ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ اے بنی اسرائیل یاد کرو تم میری ان خاص نعمتوں کو جن کا میں نے خاص تم پر انعام کیا اور پھر اپنی جنایتوں پر نظر کرو کہ کیا ان نعمتوں کا یہی حق تھا جو تم کر رہے ہو اور ہماری اس تذکیر اور یاد دہانی کی نعمت کو بھی یاد کرو کہ ہم نے تم کو خواب غفلت سے جگایا۔

انعام اول

﴿وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور سلسلہ انعامات میں سب سے پہلے اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تم کو اس زمانہ میں جہان والوں پر فضیلت دی کہ دنیا کی بادشاہت کے ساتھ دین کی بادشاہت بھی تم کو دی یعنی تمہارے خاندان میں پیغمبری بھی دی کما قال تعالیٰ: ﴿جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ حضرت یعقوب علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمہارے ہی خاندان سے انبیاء مبعوث ہوتے رہے اور توریت اور انجیل اور زبور سب تمہارے ہی خاندان میں نازل

= ہر قوم کے موافق ایک چشمہ تھا اور وجہ شناخت بھی یہی موافقت تھی۔ یا یہ مقرر کر رکھا تھا کہ پتھر کی فلاں جہت فلاں جانب سے جو چشمہ نکلے گا وہ فلاں قوم کا ہوگا اور جو کوتاہ نظر ان معجزات کا انکار کرتے ہیں ع خیستہ آدم غلاف آدم اند　دیکھو مقناطیس تو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس پتھر نے پانی کھینچ لیا تو انکار کی کیا وجہ۔

فل یعنی پھر فرمایا حق تعالیٰ نے کھاؤ من وسلویٰ اور پیو ان چشموں کا پانی اور عالم میں فساد مت پھیلاؤ۔

ہوئی۔ تمہارا ہی خاندان نبوت ورسالت اور امامت اور حکمت کا مخزن رہا۔ غرض یہ کہ اس وقت تک تم ہی کو تمام عالم پر بزرگی اور برتری اور فضیلت حاصل رہی اب وقت آیا کہ وہ نبی آخر الزمان ظاہر ہوں جن کی تمام انبیاء ومرسلین حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خبر دیتے چلے آئے لہٰذا اگر تم کو اپنی فضیلت اور بزرگی کو باقی رکھنا منظور ہے تو فوراً محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لاؤ اور دل وجان سے ان کی اعانت اور امداد کرو۔ اور جس طرح قارون اور سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کر کے خاندان یعقوبی کے شرف کو ضائع کیا تم بھی قارون اور سامری کی طرح محمد ﷺ کی مخالفت کر کے اپنی فضیلت اور بزرگی اور اپنے شرف اور منصب کو ضائع نہ کرو۔ اگر تم محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاتے ہو تو اپنی سابق فضیلت اور گزشتہ منصب پر قائم ہو بلکہ تم سے دو اجر کا وعدہ ہے اور اگر تم ایمان لانے سے انحراف کرتے ہو تو سمجھ لو کہ تم اپنے منصب سے معزول ہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے وقت سے اس وقت تک بنی اسرائیل ہی سب سے افضل اور اشرف تھے۔ یہ وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے گزشتہ زمانہ سے لیکر اس وقت خطاب تک بنی اسرائیل کا ان فضیلتوں میں کوئی شریک اور سہیم نہیں رہا اور یہ وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے۔ گزشتہ فضیلت اور گزشتہ شرف کو باقی رکھنا ہے تو اس نبی برحق کی دعوت کو قبول کرو۔ مگر افسوس ان لوگوں نے اس دعوت کو ٹھکرایا اور مغضوب علیہم اور ضالین کے نام سے موسوم ہوئے اور جو لوگ ایمان لائے وہ خیر الامم کے لقب سے سرفراز ہوئے اس تقریر سے یہ شبہ رفع ہو گیا کہ اس آیت سے بنی اسرائیل کا امت محمدیہ سے افضل ہونا لازم آتا ہے جواب یہ ہے کہ آیت میں اس وقت کی تفضیل کا ذکر نہیں۔ گزشتہ زمانہ کی تفصیل کا ذکر ہے وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے۔

آئندہ ان کے ایک شبہ کا جواب دیتے ہیں کہ اگر تم کو یہ خیال ہے کہ باجود نہ ایمان لانے کے قیامت کے دن ہم اپنے آباؤ اجداد کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے تو سمجھ لو کہ قیامت کے دن نمرود اور فرعون سامری اور قارون کی طرح انبیاء اللہ سے انحراف کرنے والوں کے لیے کوئی شفاعت نہ ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾ اور ڈرو تم اس دن سے کہ ایک نفس دوسرے نفس کے کچھ بھی کام نہ آئیگا اور نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش اور نہ اس کی طرف سے کوئی فدیہ لیا جائیگا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔ البتہ اہل ایمان کی مدد کی جائے گی انسان جب کسی بلا میں گرفتار ہوتا ہے تو شفاعت وسفارش فدیہ دیکر رستگار ہونا چاہتا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنے اعوان وانصار کو جمع کر کے آمادہ پیکار ہوتا ہے۔ اور ﴿وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾ سے یہی مراد ہے کہ تمہارا کوئی حامی اور مددگار بھی نہ ہوگا۔ جو تم کو زور اور قوت کے ذریعے سے عذاب سے چھڑائے۔

ف:...... جو لوگ مال کی محبت میں زیادہ گرفتار ہوتے ہیں وہ یہ چاہا کرتے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو سفارش سے کام چل جائے۔ مال نہ خرچ کرنا پڑے اور بعض عزت اور وجاہت کے دلدادہ ہوتے ہیں ان کو مال خرچ کرنا آسان ہوتا ہے اس لیے حق تعالیٰ شانہ نے اس مقام پر شفاعت کو فدیہ پر مقدم فرمایا اور اسی پارہ کے آخیر میں فدیہ کو شفاعت پر مقدم فرمایا۔ حیث قال ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾ تا کہ دونوں قسم کی طرف اشارہ ہو جائے۔

تنبیہ:...... اس آیت شریفہ میں مطلق شفاعت کی نفی نہیں کی گئی بلکہ فرعون اور ہامان کی طرح انبیاء اللہ سے انحراف کرنے

والوں کی شفاعت کی نفی مقصود ہے۔ لہٰذا مؤمنین یعنی گنہگار مسلمانوں کی شفاعت جو دیگر آیات اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے اس کی نفی مقصود نہیں تفصیل اگر درکار ہے تو تفسیر کبیر کی مراجعت فرمائیں۔

نیز ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی اور منشاء کے خلاف کوئی شخص اپنی وجاہت سے سفارش نہ کر سکے گا اور آیت ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ میں لفظ اذن اس کی دلیل ہے کہ خدا تعالیٰ کی اجازت سے سفارش ہو سکے گی۔

انعام دوم: ...... ﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ... الی ... مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ﴾ اور یاد کرو اس انعام کہ جبکہ ہم نے تم کو قوم فرعون سے نجات دی جو تم کو سخت ترین عذاب کی تکلیف دے رہے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔ غیور طبیعتیں سمجھ سکتی ہیں کہ عورتوں کا زندہ چھوڑنا بیٹوں کے ذبح سے سخت ہے۔ اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی تم نے دیکھ لیا کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی نے بھی دنیا میں ان سختیوں میں تمہاری کوئی مدد نہ کی پس سمجھ لو کہ آخرت میں جبکہ نفسی نفسی ہوگی کون تمہاری مدد کر سکے گا۔ فرعون نے ایک وحشت ناک خواب دیکھا تھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نکلی ہے جس نے مصر کا احاطہ کر لیا ہے۔ ہر قبطی کے گھر میں داخل ہوتی ہے اور اس کو جلاتی ہے بنی اسرائیل سے کوئی تعرض نہیں کرتی۔ کاہنوں نے اس کی یہ تعبیر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیرے اور تیری قوم اور تیری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا اس لیے فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اس زمانہ میں نجوم کا بڑا چرچا تھا۔ اور مجوسیوں کو خواب کی تعبیر کا بھی ملکہ تھا اسی زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھو کہ فرعون ہی کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش ہوئی۔

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود — قصہ فرعون زیں افسانہ بود

انعام سوم: ...... ﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ اور اے بنی اسرائیل اس نعمت کو بھی یاد کرو جب کہ ہم نے محض تمہاری وجہ سے دریا کو پھاڑا یعنی محض تمہارے صحیح سالم گزر جانے کی وجہ سے ہم نے اپنے ارادہ اور مشیت سے دریا کو شق کیا۔ اتفاقی طور پر جزر و مد نہ تھا پس تم کو نجات دی دشمن سے بھی نجات ملی۔ اور خدا تعالیٰ کے علم و قدرت میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں جو شبہات تھے ان سے بھی تم کو نجات ملی۔ سارے شبہے رفع ہوئے اور فقط تمہارے نجات دینے پر کفایت نہیں کی۔ بلکہ قوم فرعون کو جو تمہاری دشمن تھی غرق کیا۔ تا کہ آئندہ بھی دشمنوں کا خطرہ دل سے نکل جائے۔ اور پھر غرق بھی ان کو ایسی حالت میں کیا کہ تم ان کو غرق ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جس میں اب کسی قسم کے شک و شبہ کی بھی گنجائش نہ رہی تھی اور دشمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے غرق ہوتے ہوئے دیکھنا یہ بہت ہی بڑی نعمت ہے اور ایسی نعمت کا تو بہت ہی شکر چاہیے۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ دن جس میں بنی اسرائیل کو نجات اور قوم فرعون کو غرق کیا گیا عاشورہ کا دن تھا۔ اس نعمت کے شکر میں موسیٰ علیہ السلام نے اس روز کا روزہ رکھا۔ نبی کریم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کو عاشورہ کا روزہ رکھتے دیکھا تو فرمایا کہ تم سے زائد موسیٰ علیہ السلام کا حقدار میں ہوں۔ خود بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی روزہ کا حکم دیا۔ فرعون سے نجات دینا تو نعمت تھا ہی لیکن دریا کو ان کے گزرنے کے لیے راستہ بنا دینا ایک

مستقل انعام تھا اس لیے فلق بحر کو علیحدہ ذکر فرمایا۔

انعام چہارم:...... ﴿وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ فرعون کے غرق ہونے کے بعد جب بنی اسرائیل مصر میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے توریت عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا اور یہ بھی وعدہ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر چالیس شب کا اعتکاف فرمائیں۔ موسیٰ علیہ السلام تو کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ سامری جو کہ منافق تھا اس نے بعد میں گوسالہ پرستی کا فتنہ کھڑا کر دیا جس کا مفصل قصہ آئندہ آئے گا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اے بنی اسرائیل اور تم ہمارے اس انعام کو یاد کرو جبکہ ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا۔ تیس راتیں ذی قعدہ کی اور دس راتیں ذی الحجہ کی۔ رات کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ رات کی عبادت میں مجاہدہ زیادہ ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا﴾ ”تحقیق رات کا اٹھنا نفس کے روندنے اور پامال کرنے اور بات کے سیدھا نکلنے میں شدید مؤثر ہے۔“

نیز سماء دنیا کی طرف حق جل جلالہ کا نزول اجلال شب ہی میں ہوتا ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے اور رحمتیں اور برکتیں بھی اکثر رات ہی میں نازل ہوتی ہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾. ہم نے قرآن کو مبارک رات میں اتارا۔ ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ علاوہ ازیں قرب الٰہی کے حاصل کرنے کے لیے رات سے بہتر کوئی وقت نہیں جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

”عَنْ عمرو بن عنبسة رضی اللہ تعالیٰ عنه انه سمع النبی صلی اللہ علیه وسلم یقول اقرب مایکون الرب من العبد فی جوف اللیل الاخر فان استطعت ان تکون ممن یذکر اللہ فی تلك الساعة فکن رواہ الترمذی واللفظ له وابن خزیمة فی صحیحه وقال الترمذی حدیث حسن صحیح غریب۔“

”عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حق جل شانہ بندہ کے ساتھ سب سے زائد قریب اور نزدیک وسط شب میں ہوتے ہیں پس اگر تم سے یہ ممکن ہو کہ تو اس وقت میں اللہ کے ذکر کرنے والوں میں سے ہو تو ضرور ہو جا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا اور یہ لفظ ترمذی کی روایت کے ہیں اور ابن خزیمہ نے بھی اپنی صحیح میں اس کو روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں۔ یہ حدیث حسن اور صحیح اور غریب ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کو قیام لیل کا حکم ہوا۔ ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ① قُمِ الَّیْلَ﴾ اور رات ہی میں تہجد کا حکم ہوا۔ ﴿وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ اور رات ہی میں آپ کو آسمان کی سیر کرائی گئی۔ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا﴾ الآیۃ۔

عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب سفر کرتے تو رات کو چلتے اور دن کو ٹھہرتے اس لیے کہ رات میں راستہ جلد قطع ہو جاتا ہے اسی طرح سیر الی اللہ کے لیے رات کو خاص کیا گیا تاکہ سالک جلد منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ رہا یہ امر کہ چالیس کا عدد کیوں

خاص کیا گیا سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اعداد کے مختلف مرتبے ہیں آحاد (اکائیاں) عشرات (دہائیاں) مأت (سینکڑے) الوف (ہزار) جن میں سے دس کا عدد فی حد ذاتہ فی نفسہ کامل اور مکمل ہے جیسا کہ حق جل شانہ کا ارشاد ہے:

﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ (یہ دس کامل ہے۔) پس جس چیز کی خاص طور پر تکمیل مقصود ہوتی ہے تو اس عدد یعنی دس کو چار گنا کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کا خمیر چالیس دن تک کیا گیا اور حدیث میں ہے کہ بطن مادر میں چالیس روز تک نطفہ رہتا ہے پھر چالیس روز تک علقہ (خون بستہ) پھر چالیس روز تک مضغہ یعنی پارہ گوشت اس کے بعد روح پھونکی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عدد کو عروج اور ترقی سے کوئی خاص مناسبت ہے پس جس طرح جسمانی عروج اور ترقی کے لیے چالیس کا عدد منتخب ہوا اسی طرح حق جل شانہ نے اپنی اس قدیم سنت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے باطنی اور روحانی عروج اور ترقی کے لیے چالیس کا عدد خاص فرمایا۔ ﴿سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾

"وروی عن ابن عباس ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال من اخلص لله اربعین یوما ظهرت ینابیع الحکمة من قلبه علی لسانه ذکره رزین العبدری۔" (ترغیب وترهیب: ۱/۲۵)

"ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو چالیس دن تک عمل خاص اللہ کے لیے کرے تو علم اور حکمت کے چشمے اس کے قلب سے نکل کر اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔" (رواہ رزین العبدری)

بینی اندر خود علوم اولیاء ۔۔۔ بے کتاب و بے معید و اوستا

اور اسی نبوت و رسالت پیغمبری اور بعثت کے لیے چالیس کا عدد خاص کیا گیا۔ علاوہ ازیں اصل عمر انسان کی چالیس سال ہے اس کے بعد انحطاط اور زوال ہے۔ جیسا کہ ﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ (سورۃ احقاف) سے معلوم ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے حضرات اہل اللہ (حشرنا اللہ تعالیٰ فی زمرتهم واماتنا علی حبهم وسیرتهم آمین۔) نے مجاہدہ اور ریاضت خلوت اور عزلت کے لیے چلہ تجویز فرمایا۔ حافظ شیرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

شنیدم رہروے در سرزمینے ۔۔۔ ہمی گفت ایں معما با قرینے

کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف ۔۔۔ کہ در شیشہ بماند اربعینے

الحاصل:...... ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے توریت دینے کے لیے چالیس رات کا وعدہ کیا۔ پھر تم نے موسیٰ کے جانے بعد ہی کہ جن کی ساری عمر ہی مدعی الوہیت کے مقابلہ اور غیر اللہ کی عبادت اور پرستش سے روکنے میں صرف ہوئی ان کے جاتے ہی تم نے عجلت اور جلد بازی میں ایک عجل (گوسالہ اور بچھڑا) بنا کر کھڑا کر لیا اور لوگوں سے یہ کہا کہ دیکھو تمہارا خدا یہ ہے جو اس گوسالہ کی صورت میں ظاہر اور نمودار ہوا ہے اور جو تمہارے پاس ہے اور موسیٰ خدا کو کوہ طور پر ڈھونڈتا پھرتا ہے جیسا کہ آج کل ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ خدا کسی جسم میں حلول کر سکتا ہے اصطلاح متکلمین میں اس فرقہ کا نام فرقہ حلولیہ ہے سامری نے لوگوں کو یہی سمجھایا کہ تمہارے پروردگار نے اس گوسالہ کی صورت میں ظہور کیا ہے۔ غرض یہ کہ سامری نے گوسالہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ اول تو گوسالہ بنانا ہی برا تھا اس لیے کہ ذی روح کی تصویر بنانا قطعاً حرام ہے۔ پھر یہ کہ گوسالہ بنا کر کیا کیا وہ زبان پر لانے کی

چیز نہیں۔ اندیشہ ہے کہ کہیں زمین اور آسمان نہ پھٹ جائیں اور تم بڑے ہی ظالم تھے۔ کہ خدائے عزوجل کو چھوڑ کر ایسے جانور کہ جو حماقت میں ضرب المثل ہے اس کی محض ایک تصویر کو اپنا خدا بنالیا۔ بیل حماقت میں ضرب المثل ہے اور بیل کا بچہ تو بیل سے بھی کم ہے اس لیے کہ وہ بے شعوری اور بے عقلی میں اس سے بڑھا ہوا ہے کیا یہ انتہائی ظلم نہیں۔ ذرا تم اپنے عدل اور انصاف فہم وفراست کا کچھ اندازہ لگاؤ کیا ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز بھی خدا اور معبود ہوسکتی ہے۔ نیز تم نے یہ نہ سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام جب تم کو فرعون کی عبادت سے روکتے تھے حالانکہ وہ کسی درجہ میں نفع وضرر پر بھی قدرت رکھتا تھا تو اس بے عقل اور بے جان حیوان کی عبادت کی کیسے اجازت دے سکتے ہیں۔ آخر فرعون بیل کے بچہ سے تو بہتر ہی تھا۔ اس عمل شنیع کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہلاک کردیا جاتا مگر ہم نے اپنی کمال رحمت اور غایت رافت سے درگزر کیا جیسا کہ آئندہ آیت میں فرماتے ہیں۔

انعام پنجم: ﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ پھر ہم نے اس جرم عظیم کے بعد بھی تم کو معاف کیا تاکہ تم احسان مانو کہ ہم نے اپنے فضل اور رحمت سے تم کو معاف کیا آل فرعون کی طرح ہلاک نہ کیا، ورنہ یہ جرم قابل عفو نہ تھا۔ عفو سے اس جگہ مراد ترک مواخذہ ہے۔ کہ تم کو اس جرم کے بعد نیست ونابود کرکے نہیں چھوڑا۔

حکایت: ...... بارگاہ خداوندی میں موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار تو نے بے شمار نعمتیں مجھ کو عطا فرمائیں اور ان پر شکر کا حکم دیا تیری نعمتوں کا شکر خود ایک عظیم الشان نعمت ہے پھر کس طرح شکر کروں۔ اللہ جل جلالہ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ بندہ کا یہ سمجھ لینا کہ جو نعمت بھی ہے وہ میری ہی طرف سے ہے یہی بس اس کے لیے کافی ہے۔ (خازن)

انعام ششم: ...... ﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾۔ اور اے بنی اسرائیل اس انعام کو بھی یاد کرو جبکہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب یعنی توریت دی جو احکام الٰہی کی جامع ① تھی اور جو حق اور باطل روا اور ناروا میں فرق کرنے والی تھی۔ شاید کہ تم راہ راست پاؤ۔ علامہ زمخشری کے نزدیک اس جگہ الکتاب اور الفرقان دونوں سے توریت ہی مراد ہے۔ اور یہ دونوں توریت کی صفتیں ہیں۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک کتاب سے توریت مراد ہے اور الفرقان سے معجزات مراد ہیں کہ جن سے حق اور باطل کا فرق واضح اور نمایاں ہوتا ہے جب بنی اسرائیل نے سامری کے اغوا سے گوسالہ کی پرستش شروع کردی تو بنی اسرائیل میں تین گروہ ہوگئے۔ ایک حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے متبعین کا کہ خود بھی اس سے علیحدہ رہے اور دوسروں کو بھی منع کیا۔ دوسرا فریق سامری اور اس کے متبعین کا اور تیسرا فریق ساکتین کا کہ نہ خود گوسالہ پرستی کی اور نہ دوسروں کو منع کیا۔ پہلے فریق کو توبہ کی حاجت نہ تھی۔ دوسرے اور تیسرے فریق کو توبہ کا اس صورت سے حکم ہوا کہ تیسرا فریق یعنی ساکتین دوسرے فریق یعنی سامری اور اس کے متبعین اور مرتدین کو قتل کریں تاکہ مقتول ہونے سے مرتدین کی توبہ ہوجائے اور قتل سے ساکتین کی توبہ ہوجائے اس لیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض تھا۔ اس سے سکوت کیسے جائز تھا اس لیے اس سکوت کی توبہ یہ ہے کہ تم اپنے ان خویش اور اقارب اور احباب ومخلصین کو کہ جو گوسالہ پرستی کی وجہ سے مرتد ہوگئے ہیں ان کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرو جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے۔

انعام ہفتم: ...... ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ الآیۃ۔ اور اے بنی اسرائیل اس انعام کو

① اشارۃ الی ان اصل الکتاب ھو الجمع وسمی الکتاب کتابا لکونہ جامعا للعلوم والقواعد واللہ اعلم۔ ۱۲ منہ

بھی یاد کرو جب کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بچھڑا بنا کر تم نے اپنی جانوں پر بڑا ہی ظلم کیا اس بچھڑے سے تو فرعون اور ہامان ہی بہتر تھا۔ جب ایک انسان کی پرستش کفر اور شرک ہوئی تو ایک احمق حیوان کی پرستش کیسے کفر اور شرک نہ ہوگی۔ لہذا فوراً ہی بلا کسی تاخیر اور مہلت کے اپنے اس خالق کی طرف رجوع کرو۔ جس نے تم کو کفر اور شرک سے پاک اور بری منزہ اور مبرا پیدا کیا اس علیم وحکیم نے تم کو حنیف اور فطرۃ اسلام پر پیدا کیا تھا تم نے اپنی جہالت اور نادانی سے اس کو شرک اور ظلم عظیم کے ساتھ آلودہ اور ملوث کیا۔ لہذا تم اپنے خالق کی طرف رجوع کرو اور اسی کو اپنی مرجع [11] اور اپنا منتہی سمجھو اور پھر اس توبہ کی تکمیل اس طرح کرو کہ اپنے آپ کو قتل کرو یعنی ساکتین مرتدین کو خنجر لیکر قتل کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کو یہ حکم خداوندی سنایا تو سب نے کہا کہ ہم دل وجان سے اپنے مولیٰ کے حکم پر راضی ہیں۔ چنانچہ سب ایک میدان میں جمع ہو گئے جن لوگوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی تھی خنجروں اور تلواروں سے گوسالہ پرستی کرنے والوں کو قتل کرنا شروع کیا جیسا کہ حضرت [12] علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری اور سعید بن جبیر اور مجاہد اور قتادہ اور ابو العالیہ وغیرہم سے مروی ہے اور توریت سفر خروج کے بتیسویں باب میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ مقتولین کی تعداد ستر ہزار تھی۔ جب ستر ہزار آدمی قتل ہو گئے تو حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے نہایت تضرع اور ابتہال کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں عفو کی درخواست کی۔ حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی مقتولین کی بھی مغفرت فرمائی اور بقیۃ السیف کو بھی معاف فرمایا۔ جو مارا گیا اس نے مرتبہ شہادت پایا اور جو زندہ رہا وہ گناہوں سے پاک ہوا۔

ف:...... امام رازی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ جس طرح ہماری شریعت میں قاتل عمد کی توبہ کی تکمیل اور تتمیم کے لیے ضروری ہے کہ قاتل اپنے کو اولیاء مقتول کے سپرد کرے کہ چاہیں قتل کریں اور چاہیں معاف کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ مرتدین کی توبہ جب مکمل ہوگی کہ جب وہ اپنے کو قتل کے لیے سپرد کریں اھ۔ (تفسیر کبیر) یہی تمہارے لیے ہر طرح سے بہتر اور نافع ہے تمہارے خالق کے نزدیک۔ جب تم نے اللہ کے حکم کی دل وجان سے تعمیل کی تو اللہ نے تم پر توجہ فرمائی اور تمہاری توبہ قبول کی۔ اگرچہ تمہارا جرم فرعون سے بھی زیادہ سخت تھا اس لیے کہ وہ ابتداء ہی سے کافر تھا اور تم نے ایمان کے بعد کفر کیا اور مرتد ہوئے۔ دین الٰہی کی بے حرمتی اور آبرو ریزی کی۔ بے شک وہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا ہے اور بڑا ہی مہربان ہے کہ ایک گھڑی کی تکلیف برداشت کر لینے پر ہمیشہ کی عزت اور کرامت عطاء فرماتا ہے۔ وہ حیات جس کی حقیقت لہو ولعب سے زائد نہیں ایسی حیات لے کر حیات سرمدی اور ابدی سے سرفراز فرماتا ہے۔

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد
آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

واقعۂ قتل کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے باذن الٰہی ستر آدمیوں کو کوہ طور پر لیجانے کے لیے منتخب فرمایا تا کہ گوسالہ پرستی کی

[11] ھذا تفسیر کلمۃ الی التی ھی لانتھاء الغایۃ فی قولہ الی بارئکم۔ ۱۲

[12] آثار صحابہ اور تابعین اور توریت سب سے یہی ثابت ہے کہ یہ قتل تلواروں اور خنجروں سے تھا لہذا ﴿فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ﴾ سے نفس کشی مراد لینا صحیح نہیں۔ نیز نفس کشی ایک امر خفی ہے جس کا علم بہت دشوار ہے۔

معذرت کریں۔ سب نے روزہ رکھا اور غسل کیا اور عمدہ کپڑے پہنے جب کوہ طور پر پہنچے تو موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ بارگاہ خداوندی میں عرض کیجئے کہ ہمیں اپنا کلام پاک سنائے۔ تھوڑی دیر میں ایک نورانی ابر ظاہر ہوا موسیٰ علیہ السلام اس میں غرق ہو گئے اور بنی اسرائیل نیچے کھڑے رہے۔ سب نے اللہ کا کلام سنا۔ جب کلام الٰہی ختم ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام اس ابر سے برآمد ہوئے اور دریافت کیا کہ تم نے کلام الٰہی سنا تو اس پر یہ کہا ہم تو کلام الٰہی ہونے کا اس وقت تک یقین نہ کریں گے جب تک علانیہ طور پر خدا کو نہ دیکھ لیں۔ آئندہ آیت میں اسی قصہ کی طرف اشارہ ہے۔

انعام ہشتم:...... ﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ اور یاد کرو اے بنی اسرائیل اس وقت کو کہ جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام ہم محض تمہارے کہنے سے اس کا ہرگز یقین نہ کریں گے کہ ہم نے جو کچھ سنا وہ اللہ جل جلالہ ہی کا کلام ہے ممکن ہے کہ پس پردہ کوئی اور کلام کرتا ہو جب تک کہ ہم خود اللہ کو علانیہ طور پر دیکھ نہ لیں اس طرح کہ ہمارے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب حائل نہ ہو پس آ پکڑا تم کو اس گستاخی پر بجلی نے اور تم اس بجلی کو آتے ہوئے دیکھ رہے تھے بنی اسرائیل اس موقعہ پر دو وجہ سے غضب الٰہی کے مورد بنے۔ اول تو اس کہنے کی وجہ سے کہ اے موسیٰ علیہ السلام ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے اور محض تمہارے بھروسہ اور اعتماد پر اس کا کلام الٰہی ہونا تسلیم نہ کریں گے۔ یہی ایک گستاخی نزول عذاب کے لیے کافی تھی اس لیے کہ اللہ کے نبی پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرنا اور حسن ظن کے بجائے اس سے بدظن اور بدگمان ہونا یہ کچھ معمولی گستاخی نہیں۔ نبی پر اعتماد نہ کرنا صریح کفر ہے۔ نبی ہی کے اعتماد پر اللہ کی باتوں کو ماننا ایمان ہے اور جو شخص نبی پر اعتماد نہیں کرتا آخر وہ یہ تو سوچے کہ نبی کے بعد پھر کس پر وہ اعتماد کرے گا۔ دوم یہ کہ گستاخانہ اور بے باکانہ طور پر یہ کہہ دینا کہ ﴿حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ کہ ہم موسیٰ کی تصدیق جب کریں گے کہ جب اللہ کو علانیہ اور ظاہر طور پر دیکھ لیں ہاں اگر ادب کے ساتھ یہ کہتے کہ اے موسیٰ علیہ السلام کہ ہم دیدار الٰہی کے مشتاق اور آرزومند ہیں تو مورد غضب نہ بنتے اس کا جواب تو یہ ہوتا کہ تم ابھی اس نعمت کے قابل نہیں آخرت میں جب آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک ہو جاؤ گے۔ تب دیکھو گے غرض یہ کہ اس گستاخانہ اور بے باکانہ سوال کی وجہ سے عذاب الٰہی نے آگھیرا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا ﴿رَبِّ أَرِنِيْ أَنْظُرْ إِلَيْكَ﴾ کہہ کر دیدار الٰہی کا سوال کرنا سو اول تو وہ سوال تھا یعنی عاجزانہ اور مودبانہ ایک استدعا اور درخواست تھی مطالبہ نہ تھا دوم یہ کہ وہ ایک والہانہ اور عاشقانہ استدعاء نیاز تھی جو سراسر محبت اور اشتیاق پر مبنی تھی۔ حاشا بنی اسرائیل کی طرح تعنت اور عناد اس کا منشانہ تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر جس کا مفصل قصہ سورہ اعراف میں آئیگا۔ ہم نے تم کو زندہ کیا تمہارے مرجانے کے بعد یعنی حقیقۃً تم مر چکے تھے غشی اور سکتہ کی حالت نہ تھی اور نہ کوئی خواب تھا حقیقۃً مرنے کے بعد ہم نے تم کو اپنی رحمت سے دوبارہ زندہ کیا شاید کہ تم شکر کرو کہ حق جل شانہ نے اپنی رحمت سے ہمارا قصور معاف فرمایا اور اپنی عبادت اور بندگی توبہ اور استغفار انابت اور اعتذار کے لیے اور مہلت عطاء فرمائی اور بعث بعد الموت کا نمونہ آنکھوں سے دکھلا دیا تا کہ بعث بعد الموت کے بارہ میں تم کو ذرہ برابر شبہ نہ رہے اور تم اس ایمان شہودی کا شکر ادا کرو۔ ایمان استدلالی میں تزلزل آسکتا ہے مگر ایمان شہودی میں تزلزل ممکن نہیں گویا کہ قیامت تم کو آنکھوں سے دکھلا دی گئی۔

انعام نہم:...... ﴿وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾ جب بنی اسرائیل کو عمالقہ سے جہاد

کرنے کا حکم ہوا تو بہت شاق اور گراں ہوا اور بالآخر یہ کہہ دیا کہ اے موسیٰ تم اور تمہارا رب جا کر جہاد اور قتال کرلو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں اس جرم میں چالیس سال تک ایک میدان میں حیران و پریشان پھرنے کی سزا ملی اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ایک سفید ابر سایہ کے لیے بھیجا تاکہ دھوپ کی تکلیف نہ ہو اور کھانے کے لیے من وسلویٰ نازل فرمایا اور ایک نور کا ستون عطاء فرمایا جو اندھیری راتوں میں چاند کا کام دیتا تھا آئندہ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور اے بنی اسرائیل سایہ کیا وادی تیہ میں ہم نے تم پر ابر کا۔ قتادہ سے منقول ہے کہ غمام اس ابر کو کہتے ہیں جو سفید ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ ابر نہایت ٹھنڈا اور پاکیزہ تھا ویسا ابر نہ تھا جو لوگوں میں معروف ہے بلکہ وہ اس قسم کا ابر تھا کہ جس میں بدر کے دن فرشتے نازل ہوئے اور جس میں قیامت کے دن ملائکہ اور حق جل شانہ نزول اجلال فرمائیں گے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ﴾۔ ابر دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جو بخار یا دخان وغیرہ کے انجماد سے ظاہر ہو دوسرا وہ جو عالم غیب اور عالم مثال سے بدون کسی سبب ظاہری کے ظہور میں آئے لہٰذا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ابر دوسری قسم کا تھا اور اسی طرح قیامت کے دن جو ابر ظاہر ہوگا وہ بھی اسی قسم کا ہوگا۔ اور اتارا ہم نے وادی تیہ میں خزانہ غیب سے تم پر من سلویٰ۔ من ایک شیریں چیز تھی۔ دھنیے کے سے دانے ترنجبین کے مشابہ رات کو اوس میں برستی صبح کو ہر شخص اپنی ضرورت کے موافق چن لیتا اور سلویٰ ایک پرند کا نام ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں یا اور کوئی پرند ہے جو مشابہ بٹیر کے ہوتا ہے شام کو لشکر کے گرد ہزاروں جانور جمع ہو جاتے اندھیرا ہونے کے بعد پکڑ لاتے اور کباب بنا کر کھاتے۔ مدت تک اسی طرح کرتے رہے۔

ف:...... اطباء نے من یعنی ترنجبین کے بہت فوائد بیان کیے ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ اس کو باریک پیس کو سونگھا جائے تو مالیخولیا اور وہم اور وساوس اور دماغی ریاح فاسدہ کے لیے بہت مفید پڑتا ہے عجب نہیں کہ بنی اسرائیل کے دماغوں کے تنقیہ کے لیے من تجویز کی گئی ہو، کہ ان کے دماغ اس قسم کے وساوس اور شبہات سے پاک ہو جائیں اور بٹیر کا گوشت دل کو نرم کرتا ہے یہ ان کی قساوت قلبی دور کرنے کے لیے تجویز کیا گیا ہو واللہ اعلم ﴿كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ اور کہا ہم نے ان سے کہ کھاؤ تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دیں یعنی یہ چیزیں محض تمہارے کھانے کے لیے اتاری ہیں ذخیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں بنی اسرائیل نے اس حکم کی تعمیل نہ کی اور باوجود اس کے کہ خدا کی رافت و رحمت کا کرشمہ روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے پھر بھی خدا پر بھروسہ اور اعتماد نہ کیا۔ انجام یہ ہوا کہ جو ذخیرہ رکھتے وہ سڑ جاتا۔ اللہ فرماتے ہیں اور ہمارا کچھ بھی نقصان نہیں کیا۔ بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے کہ ایسا رزق کھویا جس میں نہ دنیا کی مشقت تھی اور نہ آخرت کا حساب تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی فضیلت دوسرے حضرات انبیاء کے صحابہ پر ظاہر ہوتی ہے اس لیے کہ صحابہ نے دھوپ اور گرمی میں غزوات اور سرایا کے لیے سفر کیے مگر کبھی اس قسم کے خوارق کے خواہشمند نہ ہوئے کہ بنی اسرائیل کی طرح ہم پر من وسلویٰ نازل کیا جائے۔ اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے ابر بھیج دیا جائے حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر دعا فرماتے تو ضرور ایسا ہو جاتا۔

انعام دہم:...... ﴿وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ الآیۃ۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت میں قریہ سے بیت المقدس

مراد ہے اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل چالیس سال کے بعد میدان تیہ سے یوشع بن نون علیہ السلام کی معیت میں نکلے۔ جمعہ کی شام کو بیت المقدس فتح ہوا اور کچھ دیر کے لیے سورج روکا گیا یہاں تک کہ یوشع بن نون علیہ السلام کو فتح حاصل ہوئی۔ اس وقت یہ حکم ہوا کہ تم اس شہر کے دروازہ میں سجدہ شکر کرتے ہوئے اور زبان سے استغفار اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور اقرار کرتے ہوئے داخل ہو جیسے حق جل جلالہ نے اپنے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو حکم دیا۔

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا﴾

''جب اللہ کی نصرت اور فتح آپہنچی اور آپ نے لوگوں کو دین اسلام میں فوج درفوج داخل ہوتا ہوا دیکھ لیا تو اس کے شکر میں اللہ کی تسبیح اور تحمید اور استغفار کیجئے بیشک اللہ تعالیٰ بڑا توبہ فرمانے والا ہے۔''

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ مکرمہ کے لیے تشریف فرما ہوئے تو مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے وقت خشوع اور خضوع تواضع اور تذلل کے آثار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر اور نمایاں ہو رہے تھے۔ اس شان سے مکہ میں داخل ہوئے اور فتح ہو جانے کے بعد غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز پڑھی بعض علماء کے نزدیک یہ نماز صلوۃ الضحی یعنی چاشت کی نماز تھی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صلوۃ الفتح تھی یعنی فتح مکہ کے شکر کی نماز تھی۔ سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جب ایوان کسریٰ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو محل میں پہنچ کر آٹھ رکعت نماز پڑھی آئندہ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور یاد کرو اس وقت کو جب کہا ہم نے کہ داخل ہو اس شہر میں پس کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو وسعت اور فراغت کے ساتھ اور داخل ہو اسکے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوتے یہ شکر بدنی ہوا اور بخشش بخشش کہتے ہوئے۔ یعنی توبہ اور استغفار کرتے ہوئے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہوئے داخل ہو۔ یہ شکر لسانی ہوا اور ان دونوں عملوں کی روح ندامت قلبی ہے پس اگر ایسا کرو گے تو ہم تمہاری تمام خطاؤں کو بخش دیں گے اور اخلاص کے ساتھ نیکی کرنے والوں کے اجر میں بقدر ان کے اخلاص کے اور اضافہ کریں گے پس بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس طریقہ کے کہ جو ان سے کہی گئی تھی۔ بجائے سجدہ کے سرین کے بل داخل ہوئے اور حطۃ کے بجائے ''حَبَّةٌ فِي شَعْرَةٍ'' (گیہوں کا دانہ جو کے دانہ میں) ایک مہمل لفظ بطور تمسخر کے کہنے لگے۔ پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا تھا ایک عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ حکم عدولی کرتے تھے یعنی اس درجہ بے باک تھے کہ بجائے اس کے کہ نعمت کا شکر کرتے بے ادبی کی اور توبہ اور استغفار کی جگہ مسخرا پن اور ہنسی کا طریقہ اختیار کیا اس لیے عذاب دیئے گئے اور بجائے علیہم کے ﴿عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ کہنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ عذاب تمام بنی اسرائیل پر نازل نہیں کیا گیا۔ بلکہ خاص ان لوگوں پر نازل کیا گیا جنہوں نے حکم عدولی کی اور اللہ کے حکم کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کیا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں رجز سے مراد طاعون ہے۔ اور سعد بن مالک اور اسامۃ بن زید اور خزیمۃ ابن ثابت رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ طاعون رجز یعنی عذاب ہے جس سے پہلے لوگوں کو عذاب دیا گیا (رواہ النسائی) کہا جاتا ہے کہ اس طاعون سے ایک ساعت میں ستر ہزار آدمی مرے۔

تتمہ انعام دہم:......﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ﴾ الآیۃ.

(ربط) گزشتہ آیات میں آسمانی خوراک یعنی من وسلویٰ کا ذکر تھا اب ان آیات میں غیبی پانی اور غیبی چشموں کا ذکر

فرماتے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے ظاہر ہوئے کھانے کے بعد پانی درکار ہوتا ہے۔ پھر لطف یہ کہ جس طرح کھانا بطور خرق عادت عطا فرمایا اسی طرح پانی بھی بطور خرق عادت عطا فرمایا تا کہ خداوند ذوالجلال کی قدرت اور کلیم الٰہی اعجاز نبوت ورسالت ظاہر ہو کر قلوب کے لیے موجب سکینت وطمانینت ہو اور اس غیبی طعام وشراب کے استعمال سے قلب کی حالت درست ہو چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ علیہ السلام نے استسقاء کی دعاء کی اور خاص اپنی قوم کے لیے خدا سے پانی مانگا۔ یہ قصہ بھی میدان تیہ کا ہے۔ جب بنی اسرائیل پیاسے ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ شانہ سے بنی اسرائیل کے لیے پانی کی دعا مانگی۔ پس کہا ہم نے مارا ے موسیٰ اپنے عصاء سے پتھر کو پس مارتے ہی فوراً ہی خوب رواں ہو گئے اور خوب بہ نکلے موسیٰ علیہ السلام کے مارنے سے بنی اسرائیل کے بارہ خاندان کے مطابق بارہ چشمے۔ تحقیق خوب جان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ اس آیت میں حق جل شانہ نے ﴿فَانْفَجَرَتْ﴾ فرمایا جس کے معنی خوب رواں ہو جانے کے ہیں اور سورہ اعراف میں ﴿فَانْۢبَجَسَتْ﴾ فرمایا جس کے معنی رسنے اور تھوڑا تھوڑا پانی نکلنے کے ہیں۔ عطا فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام اس پتھر پر بارہ مرتبہ عصا مارتے جس سے ہر جگہ پر عورت کے پستان کے مثل ایک شئ ظاہر ہوتی پھر اس سے پانی رسنا شروع ہوتا اس کے بعد وہ رواں ہوتا اور خوب بہتا۔ (معالم التنزیل) امام رازی فرماتے ہیں ممکن ہے کہ جب ضرورت زیادہ ہوتی ہو اس وقت زیادہ بہتا ہو اور جب ضرورت کم ہوتی ہو تب تھوڑا بہتا ہو۔ اور یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کا متعدد اعتبارات سے معجزہ تھا۔ اول تو پانی کا پتھر سے نکلنا۔ دوسرے یہ کہ ایک چھوٹے سے پتھر سے اس قدر کثیر پانی نکلنا۔ تیسرے یہ کہ پانی کا بقدر حاجت نکلنا۔ چوتھے یہ کہ محض عصا مارنے سے پانی کا بہ پڑنا۔ پانچویں یہ کہ ضرورت پوری ہو جانے پر پانی کا بند ہو جانا۔ ان اعتبارات سے یہ واقعہ قدرت الٰہیہ کا ایک خاص نشان اور موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا اور اس کے علاوہ بنی اسرائیل کے لیے ایک عظیم الشان نعمت تھی کہ جس کے بغیر حیات اور زندگی کا بقاء ناممکن ہے وہ بغیر کسی مشقت کے عطا فرمائی۔

ف:...... موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا استسقاء خاص اپنی قوم کے لیے تھی اس لیے صرف پتھر سے پانی جاری کیا گیا۔ بخلاف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر حضرات انبیاء کرام کے کہ انہوں نے خاص اپنی اپنی قوم کے لیے استسقاء کی دعا نہیں کی بلکہ تمام جہان کے لیے پانی مانگا اس لیے آسمان سے پانی برسایا گیا اور اس باران رحمت سے مومن اور کافر دوست اور دشمن سب ہی منتفع ہوئے۔

ف:...... موسیٰ علیہ السلام کا استسقاء کے لیے فقط دعا پر اکتفا فرمانا مسئلہ استسقاء میں امام اعظم قدس اللہ سرہ کے مسلک کی تائید کرتا ہے کہ استسقاء کے لیے خاص نماز ضروری اور لازم نہیں فقط دعاء پر بھی اکتفاء کیا جا سکتا ہے۔ نماز استسقاء سنت ہے واجب نہیں۔

اور کہا ہم نے بنی اسرائیل سے کھاؤ اور پیو تم اللہ کے خاص رزق سے جو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر بغیر ظاہری اسباب کے توسط کے تم کو عطاء فرمایا ہے اور دل وجان سے اللہ کا شکر کرو اور اللہ کا رزق کھا کر اس کی معصیت اور نافرمانی پر دلیر مت بنو۔ اور زمین میں فساد مچاتے اور پھیلاتے نہ پھرو یعنی زمین پر اللہ کی معصیت نہ کرو۔

ف:...... ﴿لَا تَعْثَوْا﴾ "عثو" سے مشتق ہے جس کے معنی سخت فساد مچانے کے ہیں۔ یعنی مفسد اور فسادی تو تم پہلے ہی سے ہو مگر خیر اس فساد کو تم اپنی ہی ذات تک محدود رکھو۔ اس میں اور کسی قسم کا اضافہ نہ کرو اور نہ لوگوں میں اس کو پھیلاؤ۔

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے کہ نکال دے ہمارے واسطے جو اگتا ہے

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ علیہ السلام ہم نہ ٹھہریں گے ایک کھانے پر سو پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ نکال دے ہم کو جو اگتا ہے

الۡاَرۡضُ مِنۡۢ بَقۡلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوۡمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِىۡ

زمین سے ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز ف۱ کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز

زمین سے زمین کا ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز بولا کیا تم لیا چاہتے ہو ایک چیز

هُوَ اَدۡنٰى بِالَّذِىۡ هُوَ خَيۡرٌ ؕ اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَكُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ ؕ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ

جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو بہتر ہے ف۲ اترو کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو ف۳ اور ڈالی گئی ان پر

جو ادنیٰ ہے بدلے ایک چیز کے جو بہتر ہے اترو کسی شہر میں تو تم کو ملے گا جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی ان پر ذلت

الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ ۚ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

ذلت اور محتاجی اور پھرے اللہ کا غصہ لے کر ف۴ یہ اس لئے ہوا کہ نہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو

اور محتاجی اور کمالائے غصہ اللہ کا یہ اس پر کہ وہ تھے نہ مانتے حکم اللہ کے

وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوۡا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ع

اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق یہ اس لئے کہ نافرمان تھے اور حد پر نہ رہتے تھے ف۵

اور خون کرتے نبیوں کا ناحق یہ اس سے کہ بے حکم تھے اور حد پر نہ رہتے تھے۔

ذکر شنائع بنی اسرائیل و بیان تعنت ایشان بانبیاء رب جلیل

شناعت اول کفران نعمت بنا بر دناء ت وخساست

قَالَ اللہُ تَعَالٰی : ﴿وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ ... الی ... ذٰلِكَ بِمَا عَصَوۡا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ﴾

ف۱ یہ قصہ بھی اسی جنگل کا ہے۔ بنی اسرائیل طعام آسمانی من وسلویٰ کھاتے کھاتے اکتا گئے تو کہنے لگے کہ ہم سے ایک طرح کے کھانے پر صبر نہیں ہو سکتا۔ ہم کو تو زمین کا اناج، ترکاری، ساگ، سبزی چاہیے۔

ف۲ یعنی من وسلویٰ جو ہر طرح بہتر ہے۔ لہسن اور پیاز وغیرہ سے بدلتے ہو۔

ف۳ اگر یہی جی چاہتا ہے تو کسی شہر میں جاؤ تمہاری مطلوب چیزیں تم کو سب ملیں گی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔

ف۴ ذلت یہ کہ ہمیشہ مسلمان اور نصاریٰ کے محکوم اور رعیت رہتے ہیں کسی کے پاس مال ہوا تو کیا۔ حکومت سے بالکل محروم ہو گئے جو موجب عزت تھی اور محتاجی یہ کہ اول تو یہود میں مال کی قلت اور جن کے پاس مال ہو بھی تو حکام وغیرہ کے خوف سے اپنے آپ کو مفلس اور حاجت مندی ظاہر کرتے ہیں شدت حرص اور بخل کے باعث محتاجوں سے بدتر نظر آتے ہیں اور یہ بھی درست کہ "تونگری بدل است نہ بمال" اس لئے مالدار ہو کر بھی محتاج ہی رہے اور عظمت اور عزت جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اس سے رجوع کر کے اس کے غضب وقہر میں آ گئے۔

ف۵ یعنی اس ذلت اور مسکنت وغضب الٰہی کا باعث ان کا کفر اور انبیاء کا قتل کرنا تھا اور اس کفر وقتل کا باعث احکام کی نافرمانی اور حدود شرع سے خروج تھا۔

ربط:...... یہاں تک حق تعالیٰ شانہ نے اپنے انعامات اور احسانات کا ذکر فرمایا آئندہ بنی اسرائیل کی شرارتوں اور عادات شنیعہ اور انبیاء اللہ کے ساتھ ان کے تعنت اور عناد کو بیان فرماتے کہ جس قدر ہماری طرف سے ان پر نعمتیں برتی رہیں اسی قدر ان کے تمرد اور سرکشی میں اضافہ ہوتا رہا اور پھر اس سلسلہ میں سب سے پہلی شناعت جو ذکر فرمائی تو وہ کفران نعمت اور ان کی طبعی دناءت اور خست کی ذکر فرمائی کہ جو خسیس کو نفیس پر ترجیح دینے کا باعث بنی اس لیے اب انعامات کے بعد ان کی شناعتوں شرارتوں اور عقوبتوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ گزشتہ انعامات کو یاد کر کے اللہ کی محبت اور اس کی اطاعت کی رغبت پیدا ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کمال بے ادبی سے موسیٰ علیہ السلام کا نام لیکر پکار اور تم نے یہ کہا اے موسیٰ مقتضائے ادب یہ تھا کہ یا رسول اللہ اور یا نبی اللہ یا کلیم اللہ کہہ کر ان سے عرض ومعروض کرتے۔ دوسری گستاخی تم نے یہ کی کہ کہا کہ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے یہ کلام بھی تمہاری اندرونی خباثت اور باطنی شرارت کی خبر دے رہا ہے کہ صبر اور تحمل کر تو سکتے تھے مگر قصداً ہرگز ایسا نہیں کریں گے ورنہ اگر حقیقۃً صبر کی طاقت ہی نہ تھی تو یہ کہنا تھا۔ "لن نستطیع الصبر" یعنی ہم میں صبر کی طاقت نہیں بلکہ مناسب تو یہ تھا کہ بصد شکر اللہ کی نعمت کو قبول کرتے اور پھر بصد ادب رب العزۃ سے یہ درخواست کرتے ﴿رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا﴾ (اے اللہ ہم تیرے عاجز اور ناتواں بندے ہیں ہم کو صبر اور تحمل عطا فرما)۔

غرض یہ کہ تم نے موسیٰ علیہ السلام کا نام لیکر یہ کہا کہ ہم ایک قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے اس لیے آپ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ نکالے ہمارے واسطے ان چیزوں میں سے کہ جن کو زمین اگاتی ہے ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ بنی اسرائیل کا موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہنا کہ آپ اپنے رب سے دعا کیجئے اس کلام سے بیگانگی کی بو آتی ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کے تو رب ہیں مگر ان کے رب نہیں ہیں اس طرح کیوں نہ کہا "فَادۡعُ لَنَا رَبَّنَا" اے موسیٰ ہمارے لیے ہمارے رب سے دعا کیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم ادنیٰ چیز کو بہتر اور عمدہ شئے کے بدلہ میں لینا چاہتے ہو اتنا نہیں سمجھتے کہ مسور اور وہ پیاز جس کی بدبو سے ملائکۃ اللہ کو نفرت ہے اور پیاز کھانے والے کو بیوت اللہ کے پاس آنے کی بھی ممانعت ہے۔ بھلا ایسی چیزوں کو من اور سلویٰ سے کیا نسبت۔ پھر یہ کہ من وسلویٰ براہ راست خدائے عزوجل کا آسمان سے اتارا ہوا رزق ہے۔ دنیا میں کمانے کی محنت اور مشقت نہیں اور آخرت میں اس پر کوئی حساب نہیں۔ خیر اگر تم اپنی پست ہمتی اور طبعی دناءت سے اس بہترین رزق کے بدلہ میں ایک ادنیٰ اور معمولی سی چیز لینا چاہتے ہو تو کسی شہر میں جا کر اترو پس تمہارے لیے ہوگا جو تم مانگتے ہو۔ سبزی منڈی میں مسور اور پیاز وغیرہ بغیر حاجت دعاء کے تم کو مل جائیں گی اور میرے لیے یہ لائق نہیں کہ بارگاہ خداوندی میں ایسی چیزوں کی درخواست کروں جو پستی اور کم ہمتی پر دلالت کرے۔

ف:...... ہبوط لغت میں بلندی سے پستی کی طرف آنے کو کہتے ہیں۔ انسان جب تک سفر میں رہتا ہے تو علی العموم سواری پر سوار رہتا ہے جب شہر میں پہنچتا ہے تو سواری سے اتر کر قیام کرتا ہے اس لیے سفر سے شہر میں واپس آنے کو ہبوط اور نزول اور فروکش ہونے سے تعبیر کرتے ہیں اور اس لفظ میں ان کے معنوی ہبوط کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بلند حالت سے پست حالت کی طرف نزول کیا اور اعلیٰ رزق سے ادنیٰ رزق کی طرف تنزل اختیار کیا۔ ﴿وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اور خیمہ کی طرح ذلت اور رسوائی اور بے چارگی اور بے نوائی ان پر لگا دی گئی خیمہ کی طرح ذلت اور بے

نوائی نے ان کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ یا اس طرح کہئے کہ ذلت اور مسکنت کی مہران پر لگادی گئی کہ اب وہ کسی طرح ان سے علیحدہ نہیں ہوسکتی۔ یہود جہاں بھی ہیں وہاں دوسروں کے محکوم اور باج گزار ہی ہیں۔ یہ تو ذلت ہوئی کہ دوسروں کی نظر میں ذلیل ہوئے اور مسکنت یہ کہ خود ان کی طبیعت میں دناءت اور پستی پیدا ہوگئی۔ سرکاری محاصل کے خوف سے ہمیشہ اپنے کو مسکین اور فقیر ظاہر کرتے ہیں ہمیشہ اپنے مال کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس ذلت اور مسکنت سے بڑھ کر یہ ہے کہ اللہ کے غضب کو کمایا۔ جس کو کوئی برداشت نہیں کرسکتا۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾۔ یہ ذلت اور مسکنت اور خدا کا غضب اس لیے ہوا کہ وہ خدا کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور خدا کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے یعنی خود بھی ان کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک بھی حضرات انبیاء کے قتل کی کوئی وجہ نہ تھی محض عناد اور سرکشی اس کا باعث ہوئی۔ انبیاء اللہ کا قتل ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے ان کے جرم کی شدت بتلانے کے لیے بطور تاکید بغیر الحق کا لفظ ذکر کیا گیا جیسا کہ ﴿رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ (اے پروردگار حق کے مطابق حکم دیجئے۔) اس آیت میں "بِالْحَقِّ" کا لفظ محض تاکید کے لیے ہے۔ یہ مقصد نہیں کہ معاذ اللہ اللہ کے حکم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حق اور ایک ناحق۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہ کا حکم ہمیشہ حق پر ہوتا ہے اسی طرح انبیاء اللہ کا قتل بھی ہمیشہ ناحق ہوتا ہے، یہود بے بہبود کے جرم کی شدت بیان کرنے کے لیے بغیر الحق کا لفظ محض تاکید کے لیے بڑھایا گیا حاشا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انبیاء کا قتل کبھی حق ہوتا ہے اور کبھی ناحق۔ یا بعنوان دیگر اس طرح سمجھئے کہ بغیر الحق سے ظلم اور تعدی مراد ہے۔ یعنی سوائے ظلم اور تعدی اور سوائے جور و ستم اور اور سوائے تمرد اور سرکشی کے اور کوئی امر انبیاء کے قتل کا باعث نہ تھا۔ حضرات انبیاء نے تو ان کو حق کی دعوت دی اور نصیحت کی اور فلاح دارین کی طرف بلایا اور ان لوگوں نے ان کا ناحق مقابلہ کیا۔

خلاصہ یہ کہ یہ لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو قتل کرتے تا کہ رشد و ہدایت کا سلسلہ ہی منقطع ہوجائے اور فیض عام کا دروازہ ہی بند ہوجائے۔ اسی لیے ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی کے مورد بنے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے زائد سخت عذاب والا قیامت کے دن وہ شخص ہوگا کہ جس کو کسی نبی علیہ السلام نے قتل کیا یا اس نے کسی نبی علیہ السلام کو قتل کیا۔ یا کسی گمراہی کا پیشوا یا تصویر بنانے والا۔ (مسند احمد)

ف:...... عبداللہ بن عباس اور حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں جن پیغمبروں کو حق جل شانہ نے کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم دیا انہی سے دشمنوں کے مقابلہ پر فتح و نصرت کا وعدہ کیا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا﴾ وہ پیغمبر صَدَقَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ وَنَصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہ کے مصداق بنے وہ کبھی دشمنوں کے ہاتھ سے مقتول نہیں ہوئے اس لیے کہ حق جل شانہ کا انکو جہاد کا حکم دینا پھر ان کی صیانت اور حفاظت نہ فرمانا بظاہر شان حکمت کے مناسب نہیں معلوم ہوتا ایسے ایسے حضرات ہمیشہ مظفر و منصور اور ان کے دشمن ہمیشہ خائب و خاسر ہوئے اور جن پیغمبروں کو جہاد و قتال کا حکم نہیں دیا گیا۔ اور نہ ان سے حق جل وعلا نے کوئی عصمت اور نصرت کا وعدہ فرمایا ان میں سے جس کو چاہا جام شہادت پلایا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

تا کہ ان کے مدارج اور مراتب میں عزت اور وجاہت میں اور قربت الٰہی اور رفعت شان میں اضافہ ہو۔ اور ان کے دشمنوں پر ذلت اور مسکنت خواری اور رسوائی گدائی اور بینوائی کی مہر لگے۔ کذا فی روح البیان ① وجامع الاحکام للامام القرطبی: ۱/ ۴۳۲۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ یہ یعنی آیات الٰہیہ کی تکذیب اور انبیاء اللہ کے قتل کی جرأت اور دلیری ان میں اس طرح پیدا ہوئی کہ وقتاً فوقتاً اللہ کی نافرمانیاں کی اور حدود الٰہیہ سے تجاوز کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ معصیت اور نافرمانی دلوں میں راسخ ہوگئی اور اس نے آیات الٰہیہ کی تکذیب اور انبیاء اللہ کے قتل پر آمادہ کر دیا لیکن اب بھی اگر تم صمیم قلب سے ایمان لے آؤ تو توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے توبہ کر لینے سے تمہارا ہر قسم کا کفر اور پیغمبروں کے قتل کرنے کا جرم بھی معاف ہوسکتا ہے اگر یہ چاہتے ہو کہ ذلت سے نکل کر عزت میں آجاؤ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کفر سے توبہ کرو اور ایمان اور عمل صالح اختیار کرو۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

بیشک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صائبین جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روز قیامت پر

یوں ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صائبین جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر

وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

اور کام کئے نیک تو انکے لئے ہے ان کا ثواب انکے رب کے پاس اور نہیں ان پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے ف۱

اور کام کیا نیک تو ان کو ہے ان کی مزدوری اپنے رب کے پاس اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھاویں۔

ذلت سے نکلنے اور عزت میں داخل ہونے کا طریقہ

قال تعالیٰ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا ... الی ... وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

تحقیق وہ لوگ کہ جو ایمان لائے پہلے انبیاء ② پر یا وہ لوگ جو محض زبان سے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے ایمان

ف۱ یعنی کسی فرقہ خاص پر موقوف نہیں یقین لانا شرط ہے اور عمل نیک سو جس کو یہ نصیب ہوا ثواب پایا۔ یہ اس واسطے فرمایا کہ بنی اسرائیل اس بات پر مغرور تھے کہ "ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں ہم ہر طرح اللہ کے نزدیک بہتر ہیں" فائدہ یہود کہتے ہیں حضرت موسیٰ کی امت کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی امت کو۔ صائبین ایک فرقہ ہے جس نے ہر ایک دین میں سے اچھا سمجھ کر کچھ اختیار کر لیا ہے اور حضرت ابراہیم کو مانتے ہیں اور فرشتوں کی بھی پرستش کرتے ہیں اور زبور پڑھتے ہیں اور کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔

① قال ابن عباس والحسن لم یقتل قط من الانبیاء الا من لم یومر بقتال وکل من أمر بقتال نصر فظهر انه لا تعارض بین قوله تعالیٰ: ﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ وقوله تعالیٰ: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا﴾ وقوله تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ﴾ ۱۲ روح البیان: ۱/ ۱۰۳، جامع الاحکام للقرطبی۔

② اور بعض مفسرین یہ فرماتے ہیں کہ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ظاہراً رسول اللہ ﷺ پر زبانی ایمان لائے عام اس سے کہ ایمان دل میں داخل ہوا یا نہیں اس تقدیر پر اس میں منافقین بھی داخل ہوں گے اور اخیر آیت میں "مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ" میں اخلاص کے ساتھ ایمان لانا مراد ہوگا لہٰذا ایمان کا ذکر آیت میں مکرر نہ ہوگا۔

کے مدعی بنے اوردل سے اس دین کو سچا نہیں سمجھتے اور وہ لوگ کہ جو یہودی ہوئے جن کی قباحتیں حد سے گزر چکی ہیں یہاں تک کہ جسم حیوانی میں خداوند قدوس کے حلول کے قائل ہوئے۔ اور خدا کے بعض نبیوں کو قتل کیا اور زنا اور جادو کی تہمت ان پر لگائی اور نصاریٰ جنہوں نے حضرت مسیح بن مریم کو خدا بنایا اور فرقہ صابئین بے دین لوگ جنہوں نے کواکب کی پرستش کی باوجود ان شنائع اور قبائح کے اور باوجود حق سے بعید ہوجانے کے جو شخص بھی ان میں سے اخلاص کے ساتھ اللہ پر بغیر تشبیہ اور بغیر تعطیل اور بغیر تشریک اور تجسیم کے اور روز آخرت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اس کے لیے خدا کے یہاں ثواب اور اجر ہے۔ اور نہ ان پر کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ڈر ہے یعنی اس سے نہ ڈریں کہ گزشتہ کفر نقصان اجر کا باعث ہوگا اس لیے کہ "الاسلام یھدم ما کان قبلہ"۔ اسلام لانا ان تمام گناہوں کو ڈھا دیتا ہے جو اسلام لانے سے پیشتر کیے جاچکے ہیں اور نہ وہ غم دکھاویں کہ افسوس ہماری تمام زندگی یوں ہی ضائع اور برباد ہوگئی۔ اعمال صالحہ سے گزشتہ کی تلافی ہوجائے گی۔

خلاصہ مطلب یہ کہ کسی فرقہ کی تخصیص نہیں جو بھی ایمان لے آئے وہ عذاب الٰہی سے نجات پا جائے گا۔

تنبیہ:...... آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فقط اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانا نجات کے لیے کافی ہے انبیاء اور ملائکہ وغیرہ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ قرآن کریم کی صدہا نصوص اس بات پر صراحۃً دال ہیں کہ جو شخص انبیاء اور ملائکہ کا انکار کرے وہ قطعاً کافر ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سلسلہ ایمان میں جن جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اول سے آخر تک سب پر ایمان لائے چونکہ سلسلہ ایمان کی ابتداء اللہ سے ہوتی ہے اور انتہا آخرت پر ہے اس لیے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے کی تخصیص کی گئی۔ جیسا کہ ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ میں ابتداء اور انتہا کو ذکر کر کے تمام سلسلہ مراد ہے، نیز اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانا اس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک انبیاء اور ملائکہ اور صحف سماویہ پر ایمان نہ لائے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور آخرت کے احوال کی معرفت کا ذریعہ انبیاء اور صحف الٰہیہ ہی ہیں اور وحی اور صحیفہ ربانی کا نزول فرشتہ کی وساطت سے ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایمان باللہ اور ایمان بیوم الآخرت موقوف ہے ایمان بالانبیاء اور ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب پر اس لیے ان تین چیزوں پر ایمان لانے کو علیحدہ بیان نہیں کیا گیا۔

ف:...... صابئین ایک فرقہ ہے کہ جو کسی آسمانی دین اور شریعت کا قائل نہیں خدا اور بندہ کے درمیان میں روحانیت کو واسطہ قرار دیتے ہیں کہ بندہ کو جو فیض بھی حاصل ہوتا ہے وہ روحانیت کے واسطہ سے ہوتا ہے نبوت ورسالت کے سرے سے قائل نہیں۔ کہتے ہیں کہ پیغمبروں کی کوئی حاجت نہیں تفصیل اگر درکار ہو تو تفسیر ابن کثیر وغیرہ کا مطالعہ فرمائیں۔

علامہ شہرستانی رحمہ اللہ نے اپنی ملل ونحل میں حنفاء اور صابئین کا ایک مناظرہ ذکر فرمایا ہے جو قابل دید ہے اس ناچیز نے اپنے علم الکلام میں اس کا ترجمہ بھی کیا ہے جو بحمدہ تعالیٰ شائع ہوچکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ صابئین کے بارہ میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کا مذہب کیا ہے۔

۱- قول اول مجاہد اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ صابئین ایک قوم اور فرقہ ہے جس کا دین یہودیت اور مجوسیت سے مل کر بنا ہے۔

۲- قول دوم: قتادہ کہتے ہیں کہ وہ ایک قوم ہے جو فرشتوں کی عبادت کرتی ہے اور سورج کی طرف منہ کر کے روزانہ

پانچ نمازیں پڑھتی ہے اور قتادہ سے یہ بھی منقول ہے کہ دین پانچ ہیں جس میں سے چار تو شیطان کے لیے ہیں اور ایک دین رحمان کے لیے سو صابئین جو فرشتوں کو پوجتے ہیں اور مجوس جو آتش پرست ہیں اور مشرکین جو بتوں کو پوجتے ہیں اور اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ۔ ان سب فرقوں کے دین شیطان کے لیے ہیں۔

۳- قول سوم: صابئین وہ گروہ ہے جو ستاروں کی عبادت کرتے ہیں امام رازی فرماتے ہیں کہ یہی قول اقرب الی الصواب ہے اور اس فرقہ کے دو عقیدے ہیں ایک تو یہ کہ خالق عالم تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اس نے حکم دیا ہے کہ ان ستاروں کی تعظیم کی جائے اور ان کو نماز اور دعا کا قبلہ ٹھہرایا جائے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے افلاک اور کواکب کو پیدا کیا پھر تمام عالم کے خیر و شر صحت و مرض کے مدبر یہی کواکب ہیں اور یہی ان سب چیزوں کے خالق ہیں اس لیے بشر پر ان کی تعظیم اور عبادت فرض ہے کیونکہ عالم کے الٰہ اور معبود یہی ہیں اور یہی عالم کے مدبر ہیں۔ پھر یہ کواکب اللہ کی عبادت کرتے ہیں کیدانیوں کا یہی مذہب تھا۔ جن کے رد اور ابطال کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ (تفسیر کبیر: ۱/ ۳۱۸) امام قرطبی فرماتے ہیں کہ صابئین کے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ یہ لوگ موحد تھے مگر تاثیر نجوم کے قائل تھے اور کواکب کو مدبر عالم سمجھتے تھے اسی وجہ سے جب خلیفہ قادر باللہ نے صابئین کے متعلق۔ ابوسعید اصطخری سے دریافت کیا تو ابوسعید نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا۔ (تفسیر قرطبی: ۱/ ۴۳۵)

اور اہل لغت اس شخص کو صابی کہتے ہیں جو ایک دین سے خارج ہو کر دوسرے دین میں داخل ہو گیا ہو اسی واسطے اہل عرب مسلمانوں کو صابی کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ آبائی دین چھوڑ کر ایک نئے دین یعنی دین اسلام میں داخل ہو گئے اور اس فرقہ کو صابئین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دین موسوی اور دین عیسوی سے نکل کر فرشتوں اور کواکب کی عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب تفسیر حقانی: ۱/ ۱۹۰ میں لکھتے ہیں صابی ایک قدیم فرقہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں اس فرقہ کا بڑا زور تھا۔ شہر بابل اور نینوی کے لوگ بھی یہی مذہب رکھتے تھے یہ معلوم نہیں کہ اس گروہ کی ابتداء کب سے ہوئی اس کا اعتقاد تھا کہ خدا تعالیٰ جو ہر مجرد ہے بندہ کی جو مادی ہے کسی طرح رسائی ممکن نہیں اس کی پرستش اس کے مظاہر کی پرستش ہے پھر اس کے دو گروہ ہو گئے ایک وہ جو ستاروں اور آفتاب اور ماہتاب اور عناصر کی پرستش کرتے تھے۔ دوم وہ جو اصنام کو رب کا مظہر سمجھ کر پوجتے تھے اس لیے یونان میں زہرہ وغیرہ ستاروں کے نام کے معبد بنے ہوئے تھے۔ پھر آگے چل کر اور بہت سی شاخیں ہو گئیں۔

ایران کے آتش پرست اور ہندوستان کے قدماء وید ماننے والے بھی اسی گروہ کی شاخ ہیں۔ پھر ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں اس مذہب نے ایک نیا رنگ بدلا اور نیا نام پیدا کیا۔ انتہی کلامہ۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْکُرُوْا مَا

اور جب لیا ہم نے تم سے قرار اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو کہ پکڑو جو کتاب ہم نے تم کو دی زور سے اور یاد رکھو جو کچھ

اور جب لیا ہم نے قرار تم سے اور اونچا کیا تم پر پہاڑ پکڑو جو ہم نے دیا تم کو زور سے اور یاد کرتے رہو جو

فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اس میں ہے تاکہ تم ڈرو ف۱ پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر

اس میں ہے شاید تم کو ڈر ہو پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا تم پر

وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴿۶۴﴾

اور اسکی مہربانی تو ضرور تم تباہ ہوتے ف۲

اور اس کی مہر تو تم خراب ہوتے۔

شناعت دوم

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ ... الی ... وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے اجر کا وعدہ فرمایا اب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رغبت اور خوشی سے احکام خداوندی پر عمل کرنا محبین اور مخلصین کا کام ہے۔ بنی اسرائیل کا حال تو یہ ہے کہ جب تک ان پر تشدد اور سختی نہ کیا جائے اس وقت تک وہ عمل نہیں کرتے۔ نیز گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کے جس استبدال کا ذکر تھا وہ نافرمانی کا آغاز تھا اب ان آیات میں ان کی اس نافرمانی کا ذکر ہے جو ان سے علانیہ طور پر ظاہر ہوئی۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ ہم کو کوئی کتاب عطاء کی جائے جس میں عبادت اور بندگی کے طریقے مذکور ہوں تو ہم ضرور اس پر عمل کریں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے توریت نازل فرمائی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ توریت کو قبول کریں اور اس کے احکام پر عمل کریں۔ بنی اسرائیل نے بعض احکام شاقہ کی وجہ سے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ ایک پہاڑ لا کر ان کے سروں پر قد آدم اونچا کھڑا کر دو جبرئیل نے حکم الٰہی کے مطابق پہاڑ ان کے سروں پر لا کھڑا کر دیا اور یہ کہا اگر تم تورات کو قبول نہ کرو گے تو یہ پہاڑ تم پر چھوڑ دیا جائے گا۔ (معالم التنزیل)

بنی اسرائیل فوراً سجدہ میں گر گئے اور توریت پر عمل کرنے کا اقرار کیا۔ اس آیت میں حق جل شانہ نے اسی واقعہ کو یاد دلایا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم اس وقت کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے توریت پر عمل کرنے کا پختہ عہد لیا۔ اور اٹھایا تم

ف۱ کہتے ہیں کہ توریت نازل ہوئی تو بنی اسرائیل شرارت سے کہنے لگے کہ "توریت کے حکم تو مشکل اور بھاری ہیں ہم سے نہیں ہو سکتے" تب خدائے تعالیٰ نے ایک پہاڑ کو حکم کیا جو ان سب کے سروں پر آن کر اترنے لگا اور سامنے آگ پیدا ہوئی گنجائش سرتابی اصلاً نہ رہی مجبوراً احکام توریت کو قبول کیا۔ باقی یہ شبہ کہ "پہاڑ سروں پر معلق کر کے تسلیم کرانا توریت کا یہ تو صریح اجبار و اکراہ ہے جو آیت ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ اور نیز قاعدہ تکلیف کے بالکل خلاف ہے کیونکہ بنائے تکلیف تو اختیار پر ہے اور اکراہ مناقض اختیار ہے" تو اس کا جواب یہ ہے کہ اکراہ در بارۂ قبول دین ہرگز نہیں۔" دین تو بنی اسرائیل پہلے سے قبول کئے ہوئے تھے" اور بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقاضا کرتے تھے کہ "کوئی کتاب متضمن احکام ہم کو لا کر دو کہ اس پر عمل کریں" اور اس پر معاہدہ کر چکے تھے۔ جب توریت ان کو دی گئی تو عہد شکنی پر کمر بستہ ہوئے تو اب پہاڑ کا معلق کرنا نقض عہد سے روکنے کے لئے تھا نہ کہ قبول دین کے لئے۔

ف۲ یعنی عہد و میثاق کر کے پھر پھر گئے۔ سو اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو بالکل تباہ ہو جاتے۔ یعنی اسی وقت ہلاک کر دیئے جاتے یا یہ کہ توبہ و استغفار بھی کرتے اور نبی آخر الزمان کی متابعت بھی کرتے تو بھی تمہاری تقصیرات معاف نہ کی جاتیں۔

پر کوہ طور کو تا کہ تم توریت کو قبول کر و یعنی مضبوط پکڑ و تم اس چیز کو جو ہم نے تم کو عطاء کی یعنی توریت اس کو مضبوطی اور قوت کے ساتھ پکڑ و اور فقط ظاہر توریت پر عمل کرنے پر اکتفاء مت کرو بلکہ جو توریت میں ہے اس کو بار بار کرو اور اس کے اسرار اور فوائد میں غور اور فکر کرو۔ شاید تم دنیا اور آخرت کے عذاب سے بچ جاؤ۔ اور مقام تقویٰ تم کو حاصل ہو جائے۔

ف:...... بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے بار بار اس کی درخواست کی کہ آپ اللہ سے استدعا کیجئے کہ ہم کو کوئی ایسی کتاب عطاء فرمائے جو احکام الٰہیہ کی جامع ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے اس کا پختہ عہد لیا کہ جب وہ کتاب عطاء ہو تو ضرور اس پر عمل کرنا اگرچہ اس کے احکام تمہاری نفسانی خواہشوں کے خلاف ہوں۔ بنی اسرائیل نے اقرار کیا کہ ہم ضرور اس پر عمل کریں گے جب اللہ تعالیٰ نے توریت عطاء فرمائی تو اس کے قبول کرنے سے اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے سے سرتابی کی اس عہد شکنی سے باز رکھنے کے لیے کوہ طور ان کے سروں پر لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ پہاڑ کا ان کے سروں پر لا کر کھڑ کر دینا ایمان لانے پر مجبور کرنے کے لیے نہ تھا اس لیے کہ ایمان تو وہ پہلے ہی سے لا چکے تھے۔ فقط نقض عہد سے روکنے کے لیے تھا جیسے مسلمانوں پر حدود اور قصاص اور تعزیرات کا قائم کرنا از قبیل اکراہ نہیں بلکہ زنا اور سرقہ اور شرب خمر، خونریزی اور رہزنی اور اس قسم کے تمام فواحش سے روکنے کے لیے ہے۔ ہاں اگر پہاڑ کا معلق کرنا دین قبول کرنے کے ہوتا تب آیۃ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ کے خلاف ہوتا۔ پہاڑ کا سر پر لا کھڑا کرنا محض عہد شکنی اور بدعہدی اور ایک ناشایستہ حرکت سے رُوکنے کے لیے تھا نہ کہ دین قبول کرنے کے لیے ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ تم نے پھر اس کے بعد بھی روگردانی کی۔ یعنی پھر تم ان تاکیدوں اور پختہ عہدوں کے بعد بھی احکام توریت سے منحرف ہو گئے پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔ تمہاری بدعہدی اور عہد شکنی کا اقتضا تو یہ تھا کہ تم کو فوراً عذاب سے ہلاک کر دیا جاتا مگر اس کے فضل اور رحمت نے تم کو عذاب سے بچا لیا اور تم کو توبہ اور استغفار کے لیے مزید مہلت دی اور اب تک توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے لہذا نبی آخر الزمان کی متابعت کی سعادت حاصل کرو اور اگر تم اس نبی آخر الزمان پر ایمان نہ لائے اور کفر پر مر گئے تو پھر اس خسران اور نقصان کی تلافی کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ توریت میں جو تم سے نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کا عہد لیا جا چکا ہے اس کو پورا کرو ورنہ تم بھی عہد شکنی کرنے والوں میں شامل سمجھے جاؤ گے۔ اور عہد شکنی کی سزا کے مستحق ہو گے۔ آئندہ آیت میں بطور نظیر حکم شریعت سے انحراف کے دنیوی زیان اور نقصان کو بیان فرماتے ہیں کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ پہلے لوگوں نے ہفتہ کے بارہ میں توریت کے حکم سے عدول کیا اور پیغمبر کی متابعت سے انحراف کیا سوائے مسخ اور لعنت کے کیا ملا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿٦٥﴾

اور تم خوب جان چکے ہو جنہوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان سے ہو جاؤ بندر ذلیل ف۱

اور جان چکے ہو جنہوں نے تم میں زیادتی کی ہفتے کے دن میں تو ہم نے کہا ہو جاؤ بندر پھٹکارے

ف۱ بنی اسرائیل کو توریت میں حکم ہوا تھا کہ "شنبہ کا دن خالص عبادت کے لئے مقرر ہے اس دن مچھلی کا شکار مت کرو" وہ لوگ فریب اور حیلہ سے ہفتہ کے دن شکار کرنے لگے تو اللہ نے ان کو مسخ کر کے ان کی صورت بندر کی سی کر دی۔ فہم و شعور انسانی موجود تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھتا تھا اور روتا تھا۔ مگر کلام نہیں کر سکتا تھا۔ =

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کے لئے جو وہاں تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے اور نصیحت ڈرنے والوں کے واسطے ف ۱

پھر ہم نے وہ دہشت رکھی اس شہر کے روبرو والوں کو پیچھے والوں کو اور نصیحت رکھی ڈر والوں کو۔

شناعت سوم

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ ... الی ... وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾

اور البتہ تحقیق تم خوب جان چکے ہو حال ان لوگوں کا کہ جنہوں نے ہفتہ کے دن حد سے تجاوز کیا پس کہا ہم نے ان سے کہ بن جاؤ بندر ذلیل یعنی دھتکارے ہوئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شہر دریا کے کنارہ آباد تھا جس میں بنی اسرائیل کو ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت تھی۔

بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے ہفتہ کے روز مچھلیاں دریا کے کنارہ پر بکثرت جمع ہو جاتیں اور ہفتہ گزرنے کے بعد یہ حالت ہوتی کہ ایک مچھلی بھی نظر نہ آتی، بنی اسرائیل نے جب یہ حالت دیکھی تو شکار کرنیکا ایک حیلہ نکالا کہ لب دریا چھوٹے چھوٹے حوض بنائے اور دریا سے پانی اور مچھلیاں آنے کے لیے نالیاں بھی بنائیں ہفتہ کے روز جب وہ حوض مچھلیوں سے بھر جاتے تو وہ نالیاں بند کر دیتے اور یکشنبہ کو ان کا شکار کرتے۔ عرصہ تک اسی طرح کرتے رہے اسی بستی میں ان کے علاوہ بنی اسرائیل کے اور دو فریق تھے ایک فریق ان کو اس حیلہ سے منع کرتا اور دوسرا فریق یہ سمجھ کر کہ ان کو نصیحت کرنا بے سود ہے اس لیے خاموش رہتا نصیحت کرنے والوں نے جب یہ دیکھا کہ کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو بستی کو تقسیم کر لیا۔ اور درمیان میں ایک لمبی دیوار کھینچ لی اس طرح سے شہر دو حصوں پر منقسم ہو گیا اور آمد و رفت کے لیے درمیان میں دروازہ رکھ لیا اور ہر فریق علیحدہ رہنے لگا جب وہ کسی طرح باز نہ آئے تو داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت فرمائی۔ نبی علیہ السلام کی بددعا سے بندر بنا دیئے گئے۔ مرد بندر اور عورتیں بندریاں بنا دی گئیں۔ جب صبح ہوئی اور کوئی چلتا پھرتا نظر نہ آیا تو وہ لوگ جن کو اللہ نے اس عذاب سے محفوظ رکھا تھا آپس میں کہنے لگے کہ کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے جو بنی اسرائیل نظر نہیں آتے اور سخت متردد ہوئے جا کر دیکھا تو مکانات کے دروازے بند تھے۔ کسی طرح دروازے کھول کر اندر داخل ہوئے دیکھا سب بندر بنے ہوئے ہیں جو شخص ان کو دیکھنے آتا تو بطور توبیخ اور ملامت یہ کہتا کہ کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا تو وہ کمال حسرت سے سر ہلاتا کہ بیشک تم نے منع کیا تھا۔ اور یہ لوگ آنکھوں سے پہچانے جاتے تھے کہ یہ فلاں ہے اور وہ فلاں تین دن تک اسی حالت میں رہے پھر سب مر گئے یہ تمام تفصیل امام ابن جریر طبری اور حافظ ابن کثیر نے اپنی اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے۔

امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ ظاہر قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ حقیقۃً بندر بنا دیئے گئے تھے یعنی صورتیں اور شکلیں بندروں کی بن گئیں۔ ﴿وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ﴾ اور یہ اللہ پر کچھ دشوار نہیں اور آثار صحابہ اور تابعین

= تین دن کے بعد سب مر گئے اور یہ واقعہ حضرت داؤد کے عہد میں ہوا۔ مفصل سورۂ اعراف میں آئے گا۔

ف ۱ یعنی اس واقعہ اور اس عقوبت کو ہم نے باعث خوف و عبرت بنا دیا اگلے اور پچھلے لوگوں کے واسطے" یعنی جنہوں نے اس عذاب کا مشاہدہ کیا اور جو آئندہ پیدا ہوں گے" یا جو بستیاں شہر کے آگے اور اس کے پیچھے آباد تھیں۔

بھی اس کی شہادت دے رہے ہیں اور اسی پر تمام امت کا اجماع ہے کہ وہ لوگ حقیقۃً بندر بنا دیئے گئے تھے۔ اور جس شخص نے یہ کہا کہ حقیقۃً بندر نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ان کے اخلاق اور عادات بندروں جیسے ہو گئے تھے تو یہ صریح خطا ہے۔ ظاہر قرآن اور ظاہر روایات اور اجماع سلف کے خلاف ہے۔ کافروں کے اخلاق تو ہر زمانہ میں بندروں سے بھی بڑھ چڑھ کر رہے اور اب تو ترقی کا دور ہے اور اس زمانہ کے کافر تو اخلاق میں بندر اور سور سے بھی بڑھ کر ہیں یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کی خصوصیت نہیں۔

ف:...... مسخ کی تین قسمیں ہیں۔

اول: مسخ حقیقی۔ یعنی حقیقت اور ماہیت کا بدل جانا جیسے گوشت کا پتھر ہو جانا جیسا کہ بعض حدیثوں میں آیا ہے۔

دوسرے: مسخ صوری۔ یعنی حقیقت انسانیہ تو باقی رہے اور فقط صورت اور شکل بدل جائے جیسے اس قصہ میں ہوا کہ بنی اسرائیل کی فقط صورتیں اور شکلیں مسخ کی گئیں کہ بجائے صورت انسانی کے بندر کی صورت بنا دیئے گئے مگر حقیقت انسانی جس کے ذریعہ سے انسان ادراک اور احساس کرتا ہے وہ بحالہ باقی تھی گویائی اور بولنے کی قوت سلب کر لی گئی تھی مگر عقل باقی تھی جس کے ذریعہ سے اپنی صورت بدلنے کا ادراک کرتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ ہماری نافرمانی کی سزا ہے مسخ سے فقط ان کی انسانی صورت زائل ہوئی اور فہم اور شعور انسانی سب باقی رہا۔ اسی لیے خاسئین ذوی العقول کی جمع لائی گئی تا کہ ادراک انسانی کی بقاء پر دلالت کرے۔

"قِرَدَةً" کے لفظ سے بندر کی صورت ہونا معلوم ہوا اور "كُوْنُوْا" کے خطاب اور "خٰسِـِٕيْنَ" سے عقل اور انسانی شعور کا باقی رہنا معلوم ہوا۔ اور جب ڈارون کی تحقیقات پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک بندر ترقی کر کے انسان بن سکتا ہے تو اگر انبیاء اللہ کے مقابلہ میں ترقی معکوس ہو کر انسان سے بندر بن جائے تو کیوں محال ہے حرکت کی مسافت ایک ہے حیوانیت سے انسانیت کی طرف ہو یا انسانیت سے حیوانیت کی طرف ہو۔ حیوان کو انسان بنتا تو کسی نے دیکھا نہیں اور ہزار ہا انسانوں کو بندر بنتے ہوئے لاکھوں انسانوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قرآن اور حدیث نے اس کی خبر دی۔

﴿فَمَنْ شَاۗءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاۗءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ "جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔"

عطاء خراسانی سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آواز دی گئی:

یا اهل القرية: ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ﴾ "اے بستی والو ہو جاؤ بندر ذلیل"۔

اس کے بعد لوگ اُن کے پاس آتے اور یہ کہتے کہ کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا تو سر سے اشارہ کرتے کہ بیشک۔

تیسرے: مسخ معنوی یعنی صفات نفسانیہ کا بدل جانا۔ مثلاً قناعت کا حرص اور طمع سے فہم و فراست کا سفاہت و بلادت سے بدل جانا کہ پہلے قانع تھا اب حریص بن گیا۔ پہلے متواضع تھا اب متکبر ہو گیا اس کو مسخ معنوی کہتے ہیں۔ جس کو حق تعالیٰ نے ختم اور طبع کے ساتھ تعبیر کیا ہے اور آیت ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ اور ﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ﴾ میں گدھے اور کتے کی مثال سے مسخ معنوی مراد ہے۔

بنی اسرائیل کا مسخ معنوی پہلے ہو چکا تھا اس وقت تو فقط مسخ صوری ہوا کہ بجائے شکل انسانی کے بندر کی شکل بنا دیئے گئے اس لیے کہ مسخ معنوی تو اسی وقت ہو چکا تھا کہ جب انبیاء اور علماء کی نصیحت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ﴾ اور ﴿كَمَثَلِ الْكَلْبِ﴾ کا مصداق بن چکے تھے۔

آئندہ آیت میں اس مسخ صوری کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے بندر بنائے گئے تا کہ نافرمانوں کو عبرت اور پرہیزگاروں کو نصیحت ہو۔ اور ظاہر ہے کہ نافرمانوں کو مسخ صوری ہی سے عبرت ہو سکتی ہے۔ مسخ معنوی میں تو دوسرے نافرمان بھی انہی کے شریک اور ہم پلہ ہیں۔

ف:..... ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بندر بنایا وہ تین دن سے زائد زندہ نہیں رہے اور نہ ان کی نسل چلی اور یہ بندر جو فی الحال موجود ہیں ان کی نسل سے نہیں بلکہ اصل بندر ہیں (ابن کثیر)

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ پس بنایا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان بستیوں کے لیے جو اس شہر کے سامنے اور پیچھے آباد تھیں اور نصیحت بنایا خدا سے ڈرنے والوں کے لیے یعنی تا کہ نافرمانوں کو اس واقعہ سے عبرت ہو اور فرمانبرداروں کو نصیحت ہو۔ مثل مشہور ہے۔

"العبد يقرع بالعصا والحر تكفيه الملامة" غلام کو لکڑی سے تنبیہ کی جاتی ہے اور شریف کو ملامت ہی کافی ہوتی ہے۔

(ربط) اب آئندہ آیات میں ان کی روگردانی کا ایک اور واقعہ ذکر فرماتے ہیں کہ وحی الٰہی پر اطمینان نہ کیا اور معاندانہ سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖٓ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اللہ فرماتا ہے تم کو ذبح کرو ایک گائے ف۱ وہ بولے کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے ف۲

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اللہ فرماتا ہے تم کو کہ ذبح کرو ایک گائے بولے کیا تو ہم کو پکڑتا ہے ٹھٹھے میں کہا

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ إِنَّهٗ

کہا پناہ خدا کی کہ ہوں میں جاہلوں میں ف۳ بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتا دے ہم کو کہ وہ گائے کیسی ہے ف۴ کہا

پناہ اللہ کی اس سے کہ میں ہوں نادانوں میں بولے پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ بیان کر دے ہم کو کہ وہ کیسی ہے کہا وہ

ف۱ یعنی یاد کرو اس وقت کو کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص عامیل نامی مارا گیا تھا۔ اور اس کا قاتل معلوم نہ ہوتا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "اللہ کا یہ حکم ہے کہ ایک گائے ذبح کر کے اس کا ایک ٹکڑا مردے پر مارو تو وہ جی اٹھے اور آپ اپنے قاتل کو بتا دے" اللہ تعالیٰ نے اس طرح اس مردے کو جلایا اور اس نے قاتل کو بتا دیا کہ اس کے وارثوں نے ہی بطمع مال قتل کیا تھا۔

ف۲ کیونکہ یہ تو دیکھا نہ سنا کہ گائے کے ٹکڑا مارنے سے مردہ زندہ ہو جائے۔

ف۳ یعنی ٹھٹھا کرنا احمق جاہل کا کام ہے اور وہ بھی احکام شرعیہ میں پیغمبر سے یہ ہرگز ممکن نہیں۔

ف۴ یعنی اس کی عمر کتنی ہے اور اس کے حالات کیا ہیں نو عمر ہے یا بوڑھی۔

يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۶۸

وہ فرماتا کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی درمیان میں ہے بڑھاپے اور جوانی کے اب کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے ف۱

فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے نہ بوڑھی اور نہ بن بیائی میانہ ہے ان کے بیچ اب کرو جو تم کو حکم ہے

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ

بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو کیسا ہے اس کا رنگ کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے زرد خوب گہری ہے

بولے پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ بیان کردے ہم کو کیسا ہے رنگ اس کا کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے زرد ڈہڈہا رنگ

لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۶۹ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ

اس کی زردی خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو بولے دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو کس قسم میں ہے وہ ف۲ کیونکہ اس گائے میں شبہ پڑا ہے

اس کا خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو بولے پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو بیان کردے ہم کو کس قسم میں ہے وہ گایوں میں شبہ

عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۷۰ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ

ہم کو، اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور راہ پالیں گے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے محنت کرنے والی نہیں کہ جوتتی ہو

پڑا ہے ہم کو اور ہم اللہ نے چاہا تو راہ پالیں گے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے محنت والی نہیں کہ باہتی ہو

الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ

زمین کو یا پانی دیتی ہو کھیتی کو بے عیب ہے کوئی داغ اس میں نہیں ف۳ بولے اب لایا تو ٹھیک بات

زمین کو یا پانی دیتی ہو کھیت کو بدن سے پوری ہے داغ کچھ نہیں اس میں بولے اب لایا تو ٹھیک بات

فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۷۱ ع ۸

پھر اس کو ذبح کیا اور وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کریں گے ف۴

پھر اس کو ذبح کیا اور لگتے نہ تھے کہ کریں گے۔

شناعت چہارم معاندانہ سوالات

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ ... الی ... وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾

ف۱ یعنی اس گائے کو ذبح کر ڈالو۔

ف۲ یعنی واضح کر کے بتادے کہ وہ گائے کس قسم اور کس کام کی ہے۔

ف۳ یعنی اس کے اعضاء میں کوئی نقصان نہیں اور اسکے رنگ میں دوسرے رنگ کا داغ و نشان نہیں بلکہ ساری زرد ہے۔

ف۴ وہ گائے ایک شخص کی تھی جو اپنی ماں کی خدمت بہت کرتا تھا اور نیک بخت تھا۔ اس شخص سے وہ گائے مول لی اتنے مال کو جتنا اس گائے کی کھال میں سونا بھر سکیں پھر اس کو ذبح کیا اور ایسے لگتے نہ تھے کہ اتنی بڑی قیمت کو لے کر ذبح کریں گے۔

اور یاد کرو اس وقت کو کہ بنی اسرائیل میں ایک متمول اور مالدار شخص جس کا نام عامیل کہا جاتا ہے سوائے بھتیجے کے اور کوئی اس کا وارث نہ تھا ایک مدت تک اس کے مرنے کا منتظر رہا جب دیکھا کہ وہ مرتا ہی نہیں تو ایک روز موقعہ پا کر قتل کر ڈالا اور شب میں اس کی نعش کو محلہ میں لا ڈالا جب صبح ہوئی تو اہل محلہ پر خون کا دعویٰ کیا۔ تاکہ ترکہ کے علاوہ اہل محلہ سے مقتول چچا کی دیت اور خون بہا بھی وصول کرے۔ جیسا کہ ہماری شریعت میں قسامت کا حکم ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اہل محلہ سے دریافت کیا تو اہل محلہ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ واللہ نہ ہم نے قتل کیا اور نہ ہم کو قاتل کا کوئی علم ہے۔ اے نبی اللہ اور اے کلیم اللہ آپ ہی بارگاہ خداوندی میں عرض معروض کیجئے تاکہ اس واقعہ کی حقیقت منکشف ہو (تفسیر ابن کثیر)

اس وقت اللہ کی یہ وحی نازل ہوئی کہ تحقیق اللہ سبحانہ وتعالیٰ تم کو یہ حکم دیتے ہیں کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس گائے کا ایک ٹکڑا اس مقتول پر لگا دو تھوڑی دیر کے لیے وہ مقتول زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام اور پتہ بتلا دے گا۔ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ انکار کی گنجائش نہ رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر بذریعہ وحی اس کا نام بتلا دیتے تو ممکن تھا کہ یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرتے اور ان کی بات کا یقین نہ کرتے اور کفر میں مبتلا ہوتے۔ اور جب ایک مردہ زندہ ہو کر خبر دے گا تو اس میں نہ تو کذب کا احتمال ہوگا اور نہ کسی کو چون وچرا کی گنجائش ہوگی۔ اس لیے کہ جو شخص ابھی عالم غیب سے آیا ہو وہ کیسے جھوٹ بول سکتا ہے نیز اس میں ایک حکمت یہ تھی کہ لوگ یہ سمجھ جائیں کہ گائے اور بچھڑا جس کو بنی اسرائیل نے معبود بنا لیا تھا وہ اس قابل نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے وہ تو ذبح ہونے کے قابل ہے۔

﴿قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ بنی اسرائیل یہ حکم سن کر بولے کیا آپ ہم سے تمسخر کرتے ہیں۔ بھلا گائے کے ذبح کرنے اور قاتل کے معلوم ہونے میں کیا مناسبت۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ بتلاؤ اور آپ فرماتے ہیں کہ ایک گائے ذبح کرو۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سے اس کی کہ میں نادانوں سے ہوں سوال کے مطابق جواب نہ دینا اور استہزاء اور تمسخر کرنا جاہلوں کا کام ہے معاذ اللہ انبیاء اللہ کا کام نہیں۔ اور پھر وہ بھی احکام الٰہیہ میں۔

بنی اسرائیل اپنے زعم میں اس سوال کو فلسفہ سمجھے مگر حقیقت میں سراسر جہل اور سفہ تھا۔ یہ نہ سمجھا کہ احکام الٰہیہ کے اسرار سوائے مقربین بارگاہ خداوندی کے کس کو معلوم ہو سکتے ہیں اور اسباب اور مسببات کے ارتباط اور مناسبت کو کون سمجھ سکتا ہے۔ گائے کے پارچہ لگا دینے سے مردہ بول اٹھنا گائے کا ذاتی اور طبعی خاصہ نہیں بلکہ قدرت الٰہیہ اور بارگاہ کلیم اللّٰہی کا معجزہ ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ کہنے کے بعد یہ سمجھے کہ یہ حکم تو اللہ کی طرف سے آ ہی چکا ہے جس کی تعمیل ناگزیر ہے اس لیے یہ خیال ہوا کہ جس گائے کے ذبح کا حکم ہوا ہے غالباً وہ کوئی عجیب وغریب گائے ہوگی اس لیے بار بار سوالات کیے کہ وہ کیسی گائے ہے اس کا رنگ کیسا ہے اس کی عمر کیا ہے وغیرہ ذلک۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کسی گائے کو بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا لیکن انہوں نے تشدد کیا تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی اس لیے کہ حق تعالیٰ نے کسی خاص اور معین گائے کے ذبح کا حکم نہیں دیا تھا اس لیے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ

﴿تَذۡبَحُوا بَقَرَةً﴾ میں لفظ "بَقَرَةً" نکرہ مستعمل ہوا ہے جس سے صاف ظاہر تھا کہ تعین مقصود نہیں بلکہ تعمیل مقصود ہے اگر تخصیص اور تعیین مطلوب ہوتی تو "اَنۡ تَذۡبَحُوا الۡبَقَرَةَ" الف لام کے ساتھ معرفہ لایا جاتا۔

آئندہ آیات میں بنی اسرائیل کے تعنت آمیز سوالات کا ذکر ہے ﴿قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكۡرٌ ۚ عَوَانٌۢ بَيۡنَ ذٰلِكَ ۚ فَافۡعَلُوۡا مَا تُؤۡمَرُوۡنَ﴾ کہا انہوں نے کہ آپ اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ بیان کرے کہ وہ گائے کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے کیونکہ یہ خاصیت نہ تو متعارف گائے کی ہے نہ نیل گائے کی معلوم ہوا کہ جس گائے کی یہ خاصیت ہے اس کی حقیقت ہی کچھ اور ہوگی اگرچہ نام اس کا گائے ہوگا مگر ماہیت نوعیہ اس کی بالکل جدا ہوگی۔ کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے یعنی اسی جنس کی ہے کسی دوسری جنس کی گائے نہیں اور نہ اس کی کوئی نئی حقیقت ہے اسی قسم کی ایک گائے ہے حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں البتہ سن اور عمر کے اعتبار سے کچھ فرق ہوگا وہ یہ کہ وہ نہ بوڑھی۔ نہ جوان بلکہ متوسط اور بین بین ہو یعنی میانہ سال ہو جس کو ادھیڑ کہتے ہیں۔ پس فوراً کر گزرو جو حکم دیئے گئے ہو۔ کوئی دشوار امر نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو خواب کے اشارہ پر بیٹے کو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے اور تم ایک گائے کے ذبح میں ہزار حجتیں کر رہے ہو۔ رہا خواص اور آثار کا پیدا ہونا سو وہ محض اللہ کے ارادہ اور مشیت پر ہے۔ حقیقت اور ماہیت کے اقتضاء پر موقوف نہیں۔ وہ جب چاہے اپنی قدرت سے یہ خواص پیدا کر سکتا ہے۔ مگر ان کو اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی اور مکرر سوال کیا۔ ﴿قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا لَوۡنُهَا ۚ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفۡرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ﴾ کہا انہوں نے کہ آپ اپنے پروردگار سے استدعا کیجئے کہ ہمارے لیے بیان فرمائے کہ اس کا رنگ کیا ہے۔ کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ تحقیق اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک گائے زرد رنگ والی ہے رنگ اس کا تیز اور کھلا ہوا ہے۔ دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کو اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی اور پھر سوال کیا: ﴿قَالُوا ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنۡ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الۡبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيۡنَا ۚ وَاِنَّآ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهۡتَدُوۡنَ ۞ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوۡلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوۡلٌ تُثِيۡرُ الۡاَرۡضَ وَلَا تَسۡقِى الۡحَرۡثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيۡهَا ۚ قَالُوا الۡـٰٔنَ جِئۡتَ بِالۡحَـقِّ ۚ فَذَبَحُوۡهَا وَمَا كَادُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ﴾ کہا انہوں نے کہ آپ دعا کیجئے اپنے رب سے کہ بیان فرمائے ہمارے لیے کہ اس گائے کی حقیقت شخصیہ کیا ہے جس کی یہ خاصیت ہے۔ اگرچہ اس کا سن اور سال رنگ اور جمال سب بتلا دیا گیا لیکن اب بھی آپ کو پورا انکشاف نہیں ہوا تحقیق گائیں ہم پر مشتبہ ہو گئیں ہیں۔ یہ اوصاف بہت سی گایوں میں پائے جا سکتے ہیں کوئی وجہ ترجیح بیان فرمائیے کہ یہ خاصیت اس گائے میں کس بناء پر ہے لہٰذا مزید توضیح کے لیے کچھ اوصاف بیان فرما دیئے جائیں۔

اور ان شاء اللہ تعالیٰ یعنی اگر خدا نے چاہا تو ہم ضرور پتہ چلا لیں گے کہ اس گائے میں یہ خاصیت عجیبہ کس بناء پر ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی پتہ نہ چلتا یعنی اس کلمہ کی برکت سے ان کا تحیر اور تردد رفع ہوا۔ جب تک اپنے عجز کا اقرار و اعتراف اور اس کی قدرت اور مشیت سے استعانت نہ ہو کوئی عقدہ حل نہیں ہو سکتا۔

ف ۱: مَا هِيَ...... یہ پہلے سوال کا اعادہ ہے۔ مزید توضیح اور مزید انکشاف کے لیے دوبارہ سوال کیا گیا کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ ایک گائے ہے محنت والی نہیں کہ جوتتی ہو زمین کو اور نہ پانی دیتی ہو کھیتی کو یعنی نہ ہل جوتنے کی محنت

اس سے لی گئی ہو اور نہ آب پاشی کی مشقت اس پر ڈالی گئی ہو۔ بے عیب اور اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ کہا انہوں نے کہ اب لائے آپ حق بات کو یعنی واضح اور مفصل بات آپ نے اب فرمائی جس سے ہمارا تردد رفع ہوا کہ ایسا حیوان تمام حیوانوں میں حیات کا مظہر اتم ہوگا۔ پس ممکن ہے کہ اس کی حیات کے اثر سے دوسرے میں بھی حیات کا اثر آ جائے پس ایسی گائے کو خرید کر ذبح کیا اور لگتے نہ تھے کہ وہ کریں گے۔ ان کے تعنت آمیز استفسارات سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ غالباً ذبح نہ کریں گے۔ مگر خیران شاء اللہ کہنے کی برکت سے کر گزرے۔

ف ۲:...... بنی اسرائیل چونکہ گوسالہ پرستی میں مبتلا ہوئے تھے اور یہ سمجھا تھا کہ معاذ اللہ یہ جانور خدا ہو سکتا ہے تو اس کے روکرنے کے لیے بھی گائے کے ذبح کا حکم دیا گیا۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا

اور جب مار ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر لگے ایک دوسرے پر دھرنے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے ف ۱ پھر ہم نے کہا

اور جب تم نے مار ڈالا تھا ایک شخص کو۔ پھر لگے ایک دوسرے پر دھرنے اور اللہ کو نکالنا ہے جو تم چھپاتے تھے پھر ہم نے کہا

اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

مارو اس مردہ پر اس گائے کا ایک ٹکڑا ف ۲ اسی طرح زندہ کرے گا اللہ مردوں کو اور دکھاتا ہے تم کو اپنی قدرت کے نمونے تاکہ تم غور کرو ف ۳

مارو اس مردے کو اس گائے کا ایک ٹکڑا اسی طرح جلاوے گا اللہ مردے اور دکھاتا ہے تم کو اپنے نمونے شاید تم بوجھو۔

شاعت پنجم (۵)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا... الی... وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ تم نے ایک محترم نفس کو قتل کر ڈالا پھر اس قتل کو ایک دوسرے کے سر تھوپنے لگے وہ کہتا ہے کہ اس نے مارا اور وہ کہتا ہے کہ اس نے مارا۔ اور جن چیزوں کو تم دلوں میں چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ انکو اندر سے باہر نکالنے والا ہے۔ جس سے تمہارے اندرونی خطرات اور دلی خیالات اس طرح عیاں اور آشکارا ہو جائیں جیسے کسی محسوس شئ کو کسی بند صندوق سے نکال کر مجمع میں لا کر سب کے سامنے رکھ دیا جائے۔ کہ سب اس کو اچھی طرح دیکھ لیں۔ پس کہا ہم نے کہ لگاؤ اس مردہ پر اس گائے کا کوئی ٹکڑا زبان یا دُم میت پر رکھ دو جی اٹھے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مقتول فوراً زندہ ہو گیا اور اپنے قاتل کا نام بتا کر گر پڑا اور مر گیا۔ قاتل کو پکڑا گیا اور قصاص لیا گیا اور میراث سے بھی محروم رکھا گیا۔ اور اسی وقت سے یہ

ف ۱ یعنی تمہارے اگلے بزرگوں نے عامیل کو مار ڈالا تھا۔ پھر ایک دوسرے پر دھرنے لگا اور تم جس چیز کو چھپاتے تھے (یعنی اپنے ضعف ایمانی یا قاتل کے حال کو) اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر فرمانا چاہتا ہے۔

ف ۲ یعنی جب ایک ٹکڑا اس گائے کا اس کے مارا تو وہ بحکم الٰہی زندہ ہو گیا اور لہو زخم سے بہنے لگا اور اپنے قاتل کا نام بتا دیا جو اسی مقتول کے بھتیجے تھے۔ بطمع مال چچا کو جنگل میں لے جا کر مار ڈالا تھا پھر وہ ان کا نام بتا کر گر پڑا اور مر گیا۔

ف ۳ یعنی اسی طرح زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مردوں کو اپنی قدرت کاملہ سے اور اپنی قدرت کی نشانیاں تم کو دکھلاتا ہے کہ شاید تم غور کرو اور سمجھ لو کہ خدائے تعالیٰ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔

حکم ہو گیا کہ قاتل ہمیشہ میراث سے محروم رہے گا اگرچہ قاتل مقتول کا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ف ۱:...... مقتول کا قول مر کر زندہ ہونے کے بعد اس وجہ سے معتبر مانا گیا کہ وہ عالم برزخ کو دیکھ چکا ہے لہذا اس کے قول میں اب کذب کا احتمال باقی نہیں رہا اور نہ وہم و خیال اور خطاء اور نسیان کا۔ جیسے شجر اور حجر کا گواہی دینا نبی علیہ السلام کا معجزہ ہے اسی طرح مردہ کا زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلانا موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ جس طرح اس واقعہ میں اللہ نے محض اپنی قدرت سے عدل اور قصاص جاری کرنے کے لیے عارضی طور پر تھوڑی دیر کے لیے ایک خاص ضرورت اور مصلحت کے لیے ایک مردہ کو تمہارے روبرو زندہ فرمایا اور اس مردہ کا کلام تم نے اپنے کانوں سے سنا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے دن محض جزاء دینے اور عدل قائم کرنے کے لیے دوبارہ اپنی قدرت کاملہ سے مردوں کو محض اپنی قدرت سے زندہ فرمائے گا اور سب کا انصاف کریگا اور مظلوم کا ظالم سے قصاص اور بدلہ لے گا اور وقتاً فوقتاً اپنی قدرت کے نمونے اور کرشمے دکھلاتا رہتا ہے تا کہ تم سمجھو کہ اس قسم کے خوارق اور عجائب وقتاً فوقتاً قدرت کا انکار بے عقلوں کا کام ہے۔

امام المتکلمین عبدالکریم شہرستانی ملل و نحل میں فرماتے ہیں کہ جس طرح بیل اور گدھے انسانوں کے عجیب و غریب افعال بنظر استعجاب تکتے ہیں فلاسفۂ دوران اور بڑے بڑے سائنسدان، انبیاء و مرسلین کے آیات بینات اور خوارق و معجزات کو اس سے کہیں زائد حیرت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اگر کسی فلسفی اور سائنسدان کا اپنی ناقص اور ہوا پرست عقل سے انبیاء و مرسلین کے معجزات کا انکار حجت ہے تو بیل اور گدھوں کا انسانی عجائب قدرت سے کیوں حجت نہیں خوب سمجھ لو کہ شعور انسانی کو شعور پیغمبری سے وہی نسبت ہے جو شعور حیوانی کو شعور انسانی سے ہے۔ عجب نہیں کہ یہ نسبت بھی نہ ہو۔ انتہی کلامہ مشرحاً۔

ف ۲:...... اس آیت میں جو مضمون مذکور ہے وہ قصہ مذکورہ بالا کا ابتدائی حصہ ہے۔ اس تقدیم و تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ اگر قصہ کو ترتیب سے بیان کیا جاتا تو یہ سمجھا جاتا کہ فقط ایک واقعہ کا بیان مقصود ہے۔ ترتیب کے بدلنے سے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا اول اس طرف کہ حکم الٰہی کا فوراً امتثال کیوں نہیں کیا۔ اور حکم خداوندی میں معاندانہ حجتیں کیوں نکالیں۔ ایک صریح اور واضح حکم سن لینے کے بعد اس قسم کے گستاخانہ اور تعنت آمیز سوالات کیوں کیے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کی کوئی عظمت اور وقعت تمہارے دلوں میں نہیں اور یہی سخت بیماری ہے جو تباہی اور بربادی کی نشانی ہے۔

اور ﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ الآیۃ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ تم نے اموال دنیا کے طمع میں ایسے محترم نفس کو قتل کیا کہ جو تمہارے لیے بمنزلہ باپ کے تھا اس لیے کہ چچا بھی بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:

"عم الرجل صنو ابیہ"۔ "انسان کا چچا اس کے باپ کی مانند ہے۔"

اور پھر اس کوشش میں پڑے کہ یہ خون دوسروں کے سر لگا دیا جائے۔

(ربط) یہاں تک بنی اسرائیل کی عادات شنیعہ کا بیان فرمایا کہ ہمیشہ احکام خداوندی میں حیلے اور بہانے کرتے رہے۔ آئندہ آیات میں اس کا منشاء بیان فرماتے ہیں کہ منشاء اس کا قساوت قلب ہے اور اس قساوت پر اظہار تعجب بھی فرماتے ہیں کہ لیل و نہار آیات قدرت اور معجزات نبوت کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو مگر پھر بھی دل نرم نہیں ہوتے کہ نصیحت قبول کریں۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد ف۱ سو وہ ہو گئے جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں

پھر تمہارے دل سخت ہوگئے اس سب کے بعد سو وہ ہیں جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت اور پتھروں میں تو وہ بھی ہیں

لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا

جن سے جاری ہوتی ہیں نہریں اور ان میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور نکلتا ہے ان سے پانی اور ان میں ایسے بھی ہیں

جن سے پھوٹتی ہیں نہریں اور ان میں تو وہ بھی ہیں جو پھٹتے ہیں اور نکلتا ہے ان سے پانی اور ان میں تو وہ بھی ہیں

يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۷۴

جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے ف۲

جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے۔

استعجاب بر قساوت بعد مشاہدۂ عجائب قدرت

قال تعالیٰ: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ... الی ... وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾

پھر تمہارے دل خدا کی ان عجیب نشانیوں کے دیکھنے کے بعد بھی سخت ہو گئے حالانکہ ہر ایک نشانی رقت قلب کے لیے ایک نسخہ جامعہ تھی خصوصاً مقتول کا زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتلانا ایک عجیب وغریب کرشمہ تھا۔ یہ نشانی دلیل قدرت بھی تھی اور دلیل نبوت ورسالت بھی تھی اور دلیل قیامت بھی تھی مگر پھر بھی دل نرم نہ ہوئے پس وہ مثل پتھروں کے سخت ہیں یا سختی میں پتھروں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ تشبیہ اور تمثیل میں لوہے اور تانبے کا اس لیے ذکر نہیں فرمایا کہ لوہا اور تانبا آگ پر رکھنے سے پگھل جاتا ہے مگر ان کے دل اس قدر سخت ہیں کہ تخویف اور ترہیب کی آگ سے بھی نہیں پگھلتے پتھر کی طرح ہیں کہ جو کسی حال میں بھی نرم نہیں ہوتا یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں اس لیے کہ بعض پتھر ایسے ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ اگر چہ اُن سے نہریں تو نہیں جاری ہو جاتیں لیکن پھٹ جاتے ہیں پھر ان سے پانی آہستہ آہستہ نکلتا رہتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح بعض قلوب ایسے ہیں کہ جن سے علوم ومعارف کی نہریں جاری ہو جاتی ہیں کہ جن سے دنیا سیراب ہوتی ہے، یہ علماء راسخین اور ائمہ ہادین کی شان ہے کہ جن کے کلمات طیبات نے مردہ دلوں کے حق میں آب حیات کا کام دیا اور بعض قلوب ایسے ہیں کہ ان سے نہریں تو نہیں مگر علم وحکمت کے چشمے رواں ہو گئے اور لاکھوں اور ہزاروں کو ان سے نفع ہوا، یہ علماء ربانیین کی شان ہے اور بعض قلوب ایسے ہیں کہ اللہ کی عظمت اور جلال کے سامنے

ف۱ یعنی "ماسبق کے جی اٹھنے کے بعد" مطلب یہ کہ ایسی نشانی قدرت دیکھ کر بھی تمہارے دل نرم نہ ہوئے۔

ف۲ یعنی بعض پتھروں سے بڑا نفع پہنچتا ہے کہ انہار اور پانی بکثرت ان سے جاری ہوتا ہے۔ اور بعض پتھروں سے پانی کم نکلتا ہے اور اول قسم کی نسبت نفع کم ہوتا ہے اور بعض پتھروں سے گو کسی کو نفع نہ پہنچے مگر خود ان میں ایک اثر اور تاثر تو موجود ہے مگر ان کے قلوب ان تینوں قسموں کے پتھر سے سخت تر ہیں نہ ان سے کسی کو نفع اور نہ ان میں کوئی مضمون خیر موجود۔ اور اللہ اے یہود یو تمہارے اعمال سے بے خبر ہرگز نہیں۔

پست ہیں۔ تکبر اور غرور سے پاک ہیں کبھی اس کے حکم کے خلاف سر نہیں اٹھاتے یہ عباد اور زہاد کی شان ہے۔

مگر ان کافروں کے دل پتھر سے بھی زائد سخت ہو گئے ہیں کہ غرور اور تکبر عناد اور سرکشی سے کبھی حق کے سامنے جھکتے بھی نہیں اللہ کی ہدایت کو قبول کرنا تو در کنار اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

بعض سلف سے منقول ہے کہ ﴿وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں جو خوف خداوندی سے بکثرت روتے ہیں اور ﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو کم روتے ہیں اور ﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دل سے تو روتے ہیں مگر آنکھوں سے آنسو جاری نہیں ہوتے ہم سب کو اللہ سے یہ دعا مانگنی چاہیے۔

چشم گریاں سینہ بریاں کر عطا یارب مجھے　　عیش و عشرت سے دو عالم کے نہیں مطلب مجھے (آمین)

ف:...... عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سوائے اللہ کے ذکر کے اور کثرت سے کلام نہ کیا کرو اس لیے کہ زیادہ کلام کرنا قلب میں قساوت (سختی) پیدا کرتا ہے اور سخت دل ہی خدا سے سب سے زائد دور ہے (ترمذی)

اس مقام پر بھی بنی اسرائیل کی جس قساوت کا ذکر ہے وہ بھی اسی سبب یعنی کثرت کلام کی وجہ سے ہے کہ جب گائے کے ذبح کا حکم ہوا تو معاندانہ سوالات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا، ان بیہودہ سوالات کا یہ نتیجہ نکلا کہ دل پتھر سے بھی زائد سخت ہو گئے۔

آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل اگر چہ تم اپنی ''قساوت قلبی کی وجہ سے خدا سے غافل ہو گئے ہو'' مگر خوب سمجھ لو۔ ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ کہ اللہ تمہارے اعمال و افعال سے غافل اور بے خبر نہیں۔

قساوت قلبی کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ خدا سے غافل بناتی ہے اس لیے حدیث میں آیا ہے: ''اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْقَسْوَةِ وَالْغَفْلَةِ''۔ ''اے اللہ میں دل کی سختی اور غفلت سے پناہ مانگتا ہوں۔''

ایک شبہ:...... پتھروں میں تو فہم اور ادراک ہی نہیں پھر خدا کے خوف سے پتھروں کے گرنے کا کیا مطلب؟

جواب:...... اہلسنت والجماعت کے نزدیک حیوانات اور جمادات میں بھی روح اور حیات ہے اور ان میں ایک خاص قسم کا شعور اور ادراک ہے جس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے جیسا کہ امام قرطبی اور علامہ بغوی اور حافظ ابن کثیر نے اس کی تصریح فرمائی ہے اسی وجہ سے قرآن کریم میں جا بجا حیوانات اور جمادات کی تسبیح و تحمید اور صلوۃ کا ذکر ہے۔ قال تعالیٰ:

(۱) ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ''ساتوں آسمان اور زمین اور ان میں جو کچھ بھی ہے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح و تحمید نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔''

(۲) ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ ''ہر شے کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے۔''

(۳) ﴿وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ﴾ ''گھاس اور درخت اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔''

(۴) ﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ ''کفار قیامت کے دن اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی، وہ جواب میں کہیں گی کہ ہم کو اس خدا نے گویائی دی

جس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے۔''

(۶) ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا﴾ ''اس روز بیان کرے گی (زمین) اپنی خبریں اس وجہ سے کہ اس کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہوگا!''

اور اسی طرح اشجار اور احجار حیوانات و جمادات کا انبیاء و مرسلین کی اطاعت اور فرمانبرداری اور ان سے کلام کرنا احادیث صحیحہ اور متواترہ سے ثابت ہے۔

(۱) ستون حنانہ کا واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری میں مذکور ہے جس میں کسی مؤول متفلسف کو تاویل کی ذرا برابر گنجائش نہیں۔

عارف رومی فرماتے ہیں:

استن حنانہ از ہجر رسول ۔۔۔ نالہ میزد ہمچو ارباب عقول
فلسفی کو منکر حنانہ است ۔۔۔ ازحواس انبیاء بے گانہ است

(۲) صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جبل احد کو دیکھ کر یہ فرمایا "هذا جبل يحبنا ونحبه" یہ پہاڑ ہم کو محبوب رکھتا ہے اور ہم اس کو محبوب رکھتے ہیں اور محبت بدون معرفت اور ادراک کے ممکن نہیں۔

(۳) صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اب بھی اس پتھر کو پہچانتا ہوں کہ جو نبوت سے پیشتر مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔

(۴) صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ جبل احد یا حرا پر چڑھے تو پہاڑ کو جنبش ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے اپنا قدم مبارک پہاڑ پر مارا اور یہ فرمایا کہ اے پہاڑ ٹھہر تجھ پر ایک نبی ہے اور ایک صدیق اور دو شہید۔

(۵) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ ہم جب کبھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ سے باہر جاتے تو جس درخت یا پہاڑ پر گزر ہوتا تو یہ آواز آتی: "السلام عليك يا رسول الله"۔ (اخرجہ البغوی باسنادہ فی المعالم)

اس قسم کے اور صدہا واقعات ہیں جو کتب حدیث اور سیر میں مذکور ہیں بطور نمونہ ہم نے چند واقعات ذکر کر دیئے ہیں۔

عارف رومی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:

بادو خاک و آب و آتش بندہ اند ۔۔۔ بامن و تو مردہ باحق زندہ اند
آب و باد و خاک و نار پرشرر ۔۔۔ بے خبر باما و باحق باخبر
مابعکس آں زغیر حق خبیر ۔۔۔ بے خبر از حق و از چندیں نظیر
پیش تو آں سنگریزہ ساکت ست ۔۔۔ پیش احمد او فصیح و ناطق است
پیش تو استون مسجد مردہ است ۔۔۔ پیش احمد عاشق دل بردہ است
جملہ اجزائے جہاں پیش عوام ۔۔۔ مردہ و پیش خدا دانا ورام

مردہ زیں سویندوز انسو زندہ اند خامش اینجا و انطرف گوینده اند

اور اسی پر تمام انبیاء و مرسلین کا اجماع ہے کہ جمادات میں ایک روح مجرد ہے جو حق تعالیٰ شانہ کو پہچانتی ہے اور اسی کے احکام کی تعمیل کرتی ہے ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے بے تعلق اور بے خبر ہونا عقلاً ممکن بلکہ واقع ہے۔

لیکن مخلوق کا خالق سے بے تعلق ہونا عقلاً ناممکن معلوم ہوتا ہے، عارف رومی فرماتے ہیں:

بے تعلق نیست مخلوقے ازو

اور بے شمار آیات اور احادیث اس کی شاہد ہیں جو اہل علم پر مخفی نہیں۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ

اب کیا تم اے مسلمانوں توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ان میں ایک فرقہ تھا کہ سنتا تھا اللہ کا کلام پھر بدل ڈالتے تھے اس کو

اب کیا تم مسلمان توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ایک لوگ تھے ان میں کہ سنتے تھے کلام اللہ کا پھر اس کو بدل ڈالتے

مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾

جان بوجھ کر اور وہ جانتے تھے ف۱

بوجھ لے کر اور ان کو معلوم ہے۔

شاعت ششم (۶)

متضمن بدفع کلفت ناصحین مشفقین از انتظار مطمع ایمان معاندین

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ ... الی ... وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ﴾

گزشتہ آیات میں یہود کی قساوت کو بیان فرمایا اب ان مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہیں کہ جو از راہ شفقت ان کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے اور ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ یہ کسی طرح ایمان لے آئیں مسلمانوں کو گمان یہ تھا کہ یہود توحید اور انبیاء کرام کی نبوت کے قائل ہیں شاید یہ لوگ ایمان لے آئیں اللہ تعالیٰ نے ان کی امید قطع کرنے کے لیے فرمایا کہ ان کی قساوت انتہا کو پہنچ چکی ان سے ایمان کی طمع مت رکھو۔ ﴿اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ﴾ اے مسلمانو کیا تم بنی اسرائیل کی اس شدید قساوت کے بعد بھی توقع رکھتے ہو کہ وہ شخص تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں ایک فرقہ بلا واسطہ اللہ کے کلام کو سنتا تھا" اور پھر خوب سمجھ لینے کے بعد اس میں تحریف و تبدیلی کر ڈالتا تھا اور وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اللہ کے کلام میں تحریف کر رہے ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ کلام خداوندی میں تحریف کرنا کس قدر جرم عظیم ہے۔ اس فریق سے وہ ستر لوگ

ف۱ فریق سے مراد وہ لوگ ہیں" جو کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام الٰہی سننے کے لئے گئے تھے"۔ انہوں نے وہاں سے آکر یہ تحریف کی کہ بنی اسرائیل سے کہہ دیا کہ تمام کلام کے آخر میں ہم نے یہ بھی سنا کہ (کر سکو تو ان احکام کو کر لینا ورنہ ان کے ترک کا بھی تم کو اختیار ہے) اور بعض نے فرمایا کہ کلام الٰہی سے مراد توریت ہے اور تحریف سے مراد یہ ہے کہ (اس کی آیات میں تحریف لفظی و معنوی کرتے تھے) کبھی آپ کی نعت کو بدلا کبھی آیت رجم کو اڑا دیا وغیرہ۔

مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے اور بلا واسطہ اللہ کے کلام اور اس کے اوامر و نواہی اور احکام کو سنا، جب واپس آئے تو یہ کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر میں یہ بھی فرمادیا تھا کہ اگر ہو سکے تو کرنا اور نہ ہو سکے تو نہ کرنا۔ کلام الٰہی میں سے کچھ گھٹانا یا اپنی جانب سے کچھ اضافہ کر دینا اسی کا نام تحریف ہے پس ان لوگوں نے کلام الٰہی میں اپنی طرف سے حروف اور الفاظ کا اضافہ کیا اور ایجاب اور لزوم کو تخییر سے بدل ڈالا۔

اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ کلام اللہ سے توریت مراد ہے اور ﴿يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ سے بواسطہ انبیاء کرام سننا مراد ہے اور تحریف سے آیات توریت میں لفظی اور معنوی تحریف کرنا مراد ہے۔ مثلاً توریت میں جو آپ کا حلیہ مبارک مذکور تھا اس میں ابیض کے بجائے آدم بنا دیا اور ربعة مائلا الی الطول کے بجائے طوالا بنا دیا اور بہت سی جگہ تاویل فاسد کر کے معنی میں تحریف کی اور پہلی تفسیر پر ﴿يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ سے ستر آدمیوں کا اللہ کے کلام کو بلا واسطہ سننا مراد تھا اور تحریف سے یہ مراد تھی کہ ان ستر آدمیوں نے جب قوم سے جا کر اللہ کا کلام نقل کیا تو اس میں یہ اضافہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"ان استطعتم ان تفعلوا هذه الاشياء فافعلوا وان لم تفعلوا فلا بأس"۔ "یعنی یہ چیزیں اگر تم سے ہو سکیں تو کر لینا اور اگر نہ کرو تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

ف: ...... جاننا چاہیے کہ توریت میں لفظی تحریف بھی ہوئی ہے اور معنوی تحریف بھی۔ اور یہی علماء محققین کا مسلک ہے اور اصل تحریف تو تحریف لفظی ہے اس لیے کہ تحریف کے معنی حروف اور الفاظ کے بدل ڈالنے کے ہیں اور تاویل فاسد کر کے معنی کو بدل ڈالنا مجازاً اس کو تحریف کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں جہاں کہیں توریت کی تحریف کا ذکر آیا ہے اس سے تحریف لفظی ہی مراد ہے کیونکہ تحریف معنوی تو قرآن میں بھی ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اور حق جل شانہ کا یہ ارشاد ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ اور ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ اس قسم کی آیتیں صراحۃً تحریف لفظی پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ تفسیر ابن کثیر اور تفسیر ابن جریر اور تفسیر درمنثور میں ان آیات کے شان نزول سے صاف ظاہر ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ

اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب تنہا ہوتے ہیں ایک دوسرے کے پاس تو کہتے ہیں تم کیوں کہہ دیتے ہو

اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب اکیلے ہوتے ہیں ایک دوسرے پاس کہتے ہیں تم کیوں کہہ دیتے ہو ان سے

بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾

ان سے جو ظاہر کیا ہے اللہ نے تم پر تاکہ جھٹلائیں تم کو اس سے تمہارے رب کے آگے کیا تم نہیں سمجھتے ف۱

جو کھولا ہے اللہ نے تم پر کہ جھٹلاویں تم کو اس سے تمہارے رب کے آگے کیا تم کو عقل نہیں۔

ف۱ یہود میں جو لوگ منافق تھے وہ بطور خوشامد اپنی کتاب میں سے پیغمبر آخر الزمان کی باتیں مسلمانوں سے بیان کرتے اور دوسرے لوگ ان میں سے ان کو =

شناعت ہفتم (۷)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا... الی... عِنْدَ رَبِّکُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾

اور جب منافقین یہود مسلمانوں سے ملتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تصدیق کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں جن کی بشارتیں توریت میں مذکور ہیں۔ اور جب تنہا ایک دوسرے کے پاس ہوتے ہیں تمام مجمع میں ان کے سوا مسلمانوں میں سے کوئی نہیں ہوتا تو پھر علماء یہود جو اعلانیہ طور پر کافر ہیں وہ ان منافقین سے یہ کہتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں سے خوشامد میں وہ چیزیں کہہ ڈالتے ہو جو کہ اللہ تعالی نے تم پر کھولی ہیں۔ اور وہ خزائن علمیہ جو توریت اور زبور اور دیگر صحف انبیاء میں مخزون ہیں کہ جن میں نبی کریم ﷺ اور آپ کی امامت کے اوصاف اور آپ کے اتباع اور اطاعت کی تاکید اکید مذکور ہے تم مسلمانوں کو ان خزائن علمیہ کا کیوں پتہ دیتے ہو۔ اس کا انجام یہ ہوگا کہ اس اقرار اور اعتراف کی وجہ سے مسلمان خدا کے نزدیک تم سے حجت کریں گے اور تم کو ملزم ٹھہرائیں گے۔ کہ باوجود اس اعتراف و اقرار کے پھر بھی ایمان نہ لائے کیا تم اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے کہ

"الانسان ماخوذ باقرارہ" "یعنی انسان اپنے اقرار میں پکڑا جاتا ہے۔"

یعنی تمہارا زبان سے اقرار کرنا اور پھر نہ ایمان لانا قیامت کے دن یہ زیادہ رسوائی کا باعث ہوگا مثلاً اگر کوئی شخص زبان سے اقرار یا دستاویز لکھ دینے کے بعد حاکم کے سامنے انکار کرے تو زیادہ رسوائی ہے اور اگر حاکم کو معلوم ہو اور گواہ بھی موجود ہوں مگر اس شخص نے اقرار نہ کیا ہو تو حاکم کے سامنے انکار کرنے سے رسوا تو ضرور ہوگا مگر اتنی رسوائی نہ ہوگی جتنی کہ اقرار کے بعد ہوتی۔

اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں ف۱

کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو چھپاتے ہیں اور جو کھولتے ہیں۔

تحمیق یہود بے بہبود

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ... الی... وَمَا یُعْلِنُوْنَ﴾

یعنی کیا ان کو یہ گمان ہے کہ اس چھپانے سے اللہ کے نزدیک ان پر کوئی حجت قائم نہ ہوگی اور کیا ان کی یہ ہاتھ کی لکھی ہوئی دستاویزیں (یعنی توریت اور زبور کی وہ آیتیں جس میں نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کی صریح صریح بشارتیں مذکور ہیں۔)

=اس بات پر ملامت کرتے کہ اپنی کتاب کی سند ان کے ہاتھ میں کیوں دیتے ہو کیا تم نہیں جانتے کہ مسلمان تمہارے پروردگار کے آگے تمہاری خبر دی ہوئی باتوں سے تم پر الزام قائم کریں گے کہ پیغمبر آخر الزمان ﷺ کو سچ جان کر بھی ایمان نہ لائے اور تم کو لاجواب ہونا پڑے گا۔

ف۱ یعنی اللہ کو تو ان کے سب امور ظاہر ہوں یا مخفی بالکل معلوم ہیں ان کی کتاب کی سب حجتوں کی خبر مسلمانوں کو دے سکتا ہے اور جا بجا مطلع فرما بھی دیا۔ آیت رجم کو انہوں نے چھپایا مگر اللہ نے ظاہر فرما کر ان کو فضیحت کیا یہ تو ان کے علماء کا حال ہوا جو عقلمندی اور کتاب دانی کے مدعی تھے۔

خداوند ذوالجلال کو قیامت کے دن بہم نہ پہنچ سکیں گی۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ تحقیق اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو خوب جانتا ہے جن کو وہ چھپاتے ہیں اور جن کو وہ ظاہر کرتے ہیں جو جلوت میں آپ کی نبوت ورسالت کا اقرار کرتے ہیں ان کو بھی جانتا ہے اور جو خلوت میں اعتراف کرتے ہیں ان کو بھی جانتا ہے، خلوت کا اقرار اگرچہ مسلمانوں کی نظر سے مخفی ہے مگر ہماری نظر سے تو مخفی اور پوشیدہ نہیں ہوسکتا تم نے اگرچہ بندوں کے سامنے اقرار نہ کیا مگر اس خداوند ذوالجلال کے سامنے تو اقرار کرلیا جو کہ ہر جلوت اور خلوت غیب اور شہادت کا حاضر وناظر ہے۔ یہ احمق اتنا نہیں سمجھتے کہ اصل معاملہ تو خدا کے ساتھ ہے جس کے یہاں ظاہر وباطن سر اور علن جلی اور خفی سب یکساں ہے۔

تنبیہ:...... توریت اور انجیل کی تحریف کے متعلق حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ کا رسالہ ''اعجاز عیسوی'' ملاحظہ فرماویں جو اس باب میں بے نظیر ہے۔

رسالہ موصوفہ میں اس امر کو نہایت بسط وشرح سے ثابت فرمایا ہے کہ توریت اور انجیل میں ہر قسم کی تحریف ہوئی ہے لفظی بھی اور معنوی بھی، کمی اور بیشی زیادتی اور نقصان۔ تغیر اور تبدیل غرض یہ کہ تحریف کی کوئی نوع ایسی نہیں کہ جس سے توریت وانجیل خالی ہو۔

یہ رسالہ اردو زبان میں ہے۔ مولانا موصوف کی دوسری کتاب اظہار الحق جو عربی زبان میں ہے اس میں بھی تحریف توریت وانجیل کی کافی اور شافی تحقیق فرمائی اور بہت سے علماء یہود ونصاریٰ بھی تحریف لفظی کے مقر اور معترف ہیں۔ حضرات اہل علم اس کی مراجعت فرمائیں۔

(ربط) ان آیات میں یہود کے خواندہ لوگوں کا ذکر تھا اب آئندہ آیات میں ان کے ناخواندوں کا ذکر کرتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾

اور بعض ان میں بے پڑھے ہیں کہ خبر نہیں رکھتے کتاب کی سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور انکے پاس کچھ نہیں مگر خیالات ف۱

اور ایک ان میں ان پڑھے ہیں خبر نہیں رکھتے کتاب کی مگر باندھ لی اپنی آرزوئیں اور ان پاس نہیں مگر اپنے خیال۔

شناعت ہشتم (۸)

قال تعالیٰ: ﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ۚ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا

سو خرابی ہے ان کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے پھر کہہ دیتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ لیویں

سو خرابی ہے ان کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے پھر کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے کہ لیویں

ف۱ اور جو جاہل ہیں ان کو تو کچھ بھی خبر نہیں کہ توریت میں کیا لکھا ہے مگر چند آرزوئیں جو اپنے عالموں سے جھوٹی باتیں سن رکھی ہیں (مثلاً بہشت میں یہودیوں کے سوا کوئی نہ جائے گا اور ہمارے باپ دادا ہم کو ضرور بخشوالیں گے) اور یہ ان کے خیالات بے اصل ہیں جن کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں۔

بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝

اس پر تھوڑا سا مول سو خرابی ہے ان کو اپنے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے ان کو اپنی اس کمائی سے ف۱

اس پر مول تھوڑا سو خرابی ہے ان کو اپنے ہاتھ کے لکھے سے اور خرابی ہے ان کو اپنی کمائی سے۔

شناعت نہم (۹)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ... الى ... وَوَيْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾

اور بعض ان میں سے ناخواندہ اور ان پڑھ ہیں۔ جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ویسے ہی ہیں اسی وجہ سے ان پڑھ کو اُمّی کہتے ہیں کہ اس کو صرف ام یعنی ماں سے نسبت ہے، باپ سے لکھنا اور پڑھنا کچھ نہیں سیکھا۔ کتاب کو جانتے ہی نہیں نہ الفاظ سے واقف نہ معنے سے آگاہ۔ سوائے آرزوؤں کے کچھ معلوم نہیں کہ جو تحریف کرنے والوں نے ان کی خواہش کے مطابق ان کے دلوں میں بٹھلا دی ہے مثلاً:

﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ ''کہ جنت میں سوائے یہود یا نصاریٰ کے اور کوئی نہ جائے گا۔''

اور اگر بالفرض جہنم میں گئے بھی تو ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ یعنی صرف چند روز جہنم میں رہیں گے یہ آرزوئیں ان جاہلوں کے علماء سوء نے ان کے دل خوش کرنے کے لیے دل نشین کر دی ہیں جس پر کوئی دلیل نہیں اور نہیں ہیں یہ لوگ مگر محض گمان اور خیال کی پیروی کرنے والے۔ خود بھی ان کو اس کا یقین نہیں کہ ہمارے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا اس لیے ان کو بہ نسبت علماء کے کم عذاب ہوگا ان پر عذاب فقط اپنی گمراہی کا ہوگا اور علماء پر اپنے گمراہ ہونے اور دوسرے کے گمراہ کرنے کا بھی عذاب ہوگا جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے پس خرابی اور بربادی ہے ان لوگوں کے لیے کہ جو کتاب کو خود اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا لکھا ہوا اللہ ہی کی طرف سے ہے خوب جانتے ہیں کہ یہ تحریف ہے نادان اور بے خبر نہیں اس لیے کہ خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

یہ محض اس لیے کرتے ہیں تا کہ اپنے رؤسا اور عوام سے اس ذریعہ سے کچھ قلیل معاوضہ حاصل کریں پس ایسے لوگوں کے لیے دو وجہ سے عذاب ہے ایک عذاب اس وجہ سے کہ ان کے ہاتھوں نے تحریف کی کتابت کی ہے اور دوسرا عذاب اس وجہ سے کہ اس تحریف کے ذریعہ سے لوگوں سے روپیہ کماتے ہیں۔ اول تو لوگوں کے خوش کرنے کے لیے کتاب الٰہی میں تحریف کی اور پھر چند پیسوں کی طمع میں آخرت کے اجر عظیم کو برباد کیا۔ ﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ سے دراہم معدودہ مراد نہیں بلکہ مال کثیر مراد ہے اس لیے اگر بالفرض حق اور ہدایت کی قیمت لگائی جائے تو روئے زمین کے خزانے اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

ف۱ یہ وہ لوگ ہیں جو ان عوام جاہلوں کے موافق باتیں اپنی طرف سے بنا کر لکھ دیتے تھے اور خدا کی طرف ان باتوں کو منسوب کرتے۔ مثلاً توریت میں لکھا تھا کہ ''پیغمبر آخر الزمان خوبصورت گھونگھریالے بال، سیاہ آنکھیں، میانہ قد، گندم رنگ پیدا ہوں گے'' انہوں نے پھیر کر یوں لکھا'' لمبا قد، نیلی آنکھیں، سیدھے بال'' تاکہ عوام آپ کی تصدیق نہ کریں اور ہمارے منافع دنیوی میں خلل نہ آجائے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ

اور کہتے ہیں ہم کو ہرگز آگ نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے ف۱ کہدو کیا تم لے چکے ہو اللہ کے یہاں سے قرار کہ اب ہرگز خلاف نہ کرے گا

اور کہتے ہیں ہم کو آگ نہ لگے گی مگر کئی دن گنتی کے تو کہہ کیا لے چکے ہو اللہ کے ہاں سے اقرار تو البتہ خلاف نہ کرے گا

اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ

اللہ اپنے قرار کے یا جوڑتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے کیوں نہیں ف۲ جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو

اللہ اپنا اقرار یا جوڑتے ہو اللہ پر جو معلوم نہیں رکھتے۔ کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو

خَطِیْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

اس کے گناہ نے ف۳ سو وہی ہیں دوزخ کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور جو ایمان لائے اور عمل کئے

اس کے گناہ نے سو وہی ہیں لوگ دوزخ کے وہ اسی میں رہ پڑے اور جو یقین لائے

الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۱۱

نیک وہی ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

اور عمل کیے نیک وہ لوگ ہیں جنت کے وہ اسی میں رہ پڑے۔

شناعت دہم (۱۰)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ... الی ... هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

اور یہود یہ بھی کہتے ہیں کہ دوزخ ہم کو ہرگز نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے۔ آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم نے اللہ سے اس بارہ میں کوئی عہد لیا ہے۔ کہ تم کو فقط اس قدر مدت عذاب ہوگا اس لیے کہ عذاب کی مدت دلیل عقلی سے معلوم نہیں ہوسکتی اس کے لیے دلیل سمعی چاہیے ایسا عقیدہ بغیر عہدہ خداوندی کے نہیں ہوسکتا تو بتلاؤ کہ کیا خدا نے تم سے کوئی ایسا عہد کیا ہے کہ اللہ اپنے اس عہد کے ہرگز خلاف نہ کرے گا۔ یا اللہ پر افترا کرتے ہو بے سند باتیں جن کی سند تم کو معلوم نہیں اور خود اپنی طرف سے ایسی من گھڑت باتیں کرتے ہو بتلاؤ کس کتاب میں اللہ نے یہ حکم نازل کیا ہے آئندہ آیت میں حق جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہود کا یہ عقیدہ کہ ہم جہنم میں صرف چند روز رہیں گے بالکل غلط ہے۔ جنت میں داخل ہونا اللہ اور پیغمبر آخر الزمان پر

ف۱ بعض نے کہا سات دن اور بعض نے چالیس دن (جتنے روز بچھڑے کو پوجا کی تھی) اور بعض نے چالیس سال (جتنی مدت تیہ میں سرگرداں رہے تھے) اور بعض نے کہا ہر ایک جتنی مدت دنیا میں زندہ رہا۔

ف۲ یعنی یہ بات غلط ہے کہ یہودی ہمیشہ کے لئے دوزخ میں نہ رہیں گے۔ کیونکہ خلود فی النار اور خلود فی الجنۃ کا جو قاعدہ کلیہ آگے بیان فرمایا ہے اسی کے مطابق سے معاملہ ہوگا۔ یہودی اس سے نکل نہیں سکتے۔

ف۳ گناہ کسی کا احاطہ کرلیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کرلیں کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو۔ حتی کہ دل میں ایمان و تصدیق باقی ہوگی تو بھی احاطہ مذکور محقق نہ ہوگا۔ تو اب کافر ہی پر یہ صورت صادق آسکتی ہے۔

ایمان لانے اور اعمال صالحہ کرنے پر موقوف ہے چنانچہ فرماتے ہیں ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ کیوں نہیں تم جیسے پیغمبر آخر الزمان سے سرکشی کرنے والے ضرور جہنم میں جائیں گے۔ اس لیے کہ جس شخص نے بھی گناہ کو کمایا اور گناہوں نے اس کا ہر طرف سے احاطہ کرلیا۔ اور کوئی جانب گناہ سے خالی نہیں رہی، جدھر دیکھے گناہ ہی گناہ ہے نیکی کا نام ونشان نہیں، گناہوں نے ہر طرف سے ایسا گھیرا کہ اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں رہی پس ایسے ہی لوگ دوزخ کے ہمیشہ کے ساتھی ہیں یہ دوزخ سے جدا نہ ہوں گے اور دوزخ ان سے جدا نہ ہوگی ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے یعنی ابدالآباد تک اسی میں رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل نور ایمان سے منور اور روشن ہوئے اور نیک عمل کیے جس سے اعضا اور جوارح روشن ہوئے ایسے لوگ جنت کے ساتھی ہیں کہ یہ جنت سے علیحدہ نہ ہوں گے اور جنت ان سے علیحدہ نہ ہوگی ہمیشہ جنت ہی میں رہیں گے۔ کبھی جنت سے نہ نکلیں گے۔

ف ۱:...... احاطہ کی جو تفسیر بیان کی گئی وہ کافر ہی پر صادق آسکتی ہے کہ کافر دولت ایمان سے تہی دست ہونے کی وجہ سے فقیر اور گدائے بے نوا ہے، اعمال صالحہ اگر کچھ ہیں تو وہ نہ ایمان لانے کی وجہ سے سب بیکار ہیں۔

کما قال تعالیٰ: ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ ''اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے یعنی ایمان کے بعد مرتد ہو جائے تو اس شخص کے تمام اعمال غارت اور برباد ہوئے اور وہ شخص آخرت میں زیاں کاروں میں سے ہوگا۔''

اور جو شخص ایمان نہیں لایا خواہ وہ کتنے ہی صدقات اور خیرات کرے اس کے صدقات وخیرات کو اعمال صالحہ نہ سمجھنا چاہیے بلکہ ان اعمال کو شیر قالین کی طرح اعمال صالحہ کی ہم شکل اور ہم صورت سمجھنا چاہیے حقیقتاً اعمال صالحہ نہیں، کما قال تعالیٰ:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ ۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً﴾ ''اور کافروں کے اعمال سراب کی طرح بے حقیقت ہیں، دیکھنے والا ان کو پانی کی طرح اعمال صالحہ سمجھتا ہے اور حقیقت کچھ بھی نہیں۔''

خلاصہ یہ کہ جس کے پاس ایمان نہیں اس کے پاس کچھ بھی نہیں گناہوں میں ہر طرف سے گھرا ہوا ہے بخلاف مومن کے کہ وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو، گناہوں میں گھرا ہوا نہیں بالفرض کوئی عمل صالح اس کا معین اور مددگار نہ ہو تو ایمان تو ضرور اس کا نگہبان اور پاسبان بنا ہوا ہے جو شیطان کے قاتلانہ وار کو روکے ہوئے ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں گناہ کے گھیر لینے کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کرتا ہے اور شرمندہ نہیں ہوتا اھ۔ اور ظاہر ہے یہ حال کافر ہی کا ہوسکتا ہے مومن کا نہیں ہوسکتا۔

ف ۲:...... اہل سنت والجماعت کے نزدیک جو فریق ایمان لایا اور اعمال صالحہ بھی کیے اس کا ثواب دائمی اور غیر متناہی ہے اور جو فریق نہ ایمان لایا اور نہ اعمال صالحہ کیے اس کا عذاب دائمی اور غیر متناہی ہے فریق اول میں ایمان اور عمل صالح دونوں موجود ہیں اور فریق ثانی میں دونوں نہیں اس لیے فریق اول کا ثواب دائمی ہے اور فریق ثانی کا عذاب دائمی ہے اور جو فریق ایمان تو لایا مگر اعمال صالحہ نہیں کیے اس کی جزا ثواب اور عقاب سے مرکب اور ملی جلی ہے لیکن اول عذاب دیں گے اور بعد

میں بہشت میں داخل کریں گے بہشت میں داخل کر کے پھر بہشت سے نکالنا اور دوزخ میں ڈالنا خلاف حکمت ہے، عزت دینے کے بعد ذلت کے گڑھے میں ڈالنا لطف اور عنایت کے خلاف ہے۔ یہ تین احتمال ہوئے چوتھا احتمال یہ ہے کہ اعمال صالحہ تو ہوں مگر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ صورت شرعاً محال ہے اس لیے کہ شریعت میں کوئی عمل صالح بدون ایمان کے معتبر نہیں، ہر عمل صالح کے لیے ایمان شرط ہے۔

"وَاِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ"۔ ''جب شرط فوت ہوئی تو مشروط بھی فوت ہوا۔''

اسی وجہ سے کفار کے صدقات کو صرف صورۃً اعمال صالحہ کہا جا سکتا ہے ورنہ حقیقت میں اعمال صالحہ نہیں کما قال تعالیٰ:

﴿وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً﴾ ''کافروں کے اعمال سراب کی مانند ہیں کہ دور سے پیاسا ان کو پانی گمان کرتا ہے۔''

جس طرح لکڑی کا گھوڑا اور شیر قالین اصلی گھوڑے اور اصلی شیر کی صورت میں مشابہ ہے اسی طرح کافر کا عمل ظاہر صورت میں عمل صالح کے مشابہ ہوتا ہے مگر حقیقتاً میں نیک نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ عمل صالح کی روح ایمان ہے اور وہ موجود نہیں۔

ف ۳:...... ہر شریعت میں یہ قاعدہ رہا ہے کہ کافر مخلد فی النار ہے ہمیشہ ہمیشہ اور ابد الآباد تک جہنم میں رہے گا اور مومن عاصی چندروز دوزخ میں عذاب پا کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا کما قال تعالیٰ:

﴿اِنَّ اللہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ ''بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جاوے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے۔''

اور یہود جو یہ روایت کرتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد کیا کہ تمہاری اولاد کو عذاب نہ دوں گا مگر تحلۃً للقسم یعنی محض قسم پورا کرنے کے لیے یہ فرمایا کہ فقط چندروز کے لیے جہنم میں رہیں گے یہ روایت بالفرض اگر صحیح ہو تو اس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے صلبی بیٹے مراد ہیں جنہوں نے یوسف علیہ السلام سے اپنا قصور معاف کرایا اور بارگاہ خداوندی میں بہ ہزار عجز و نیاز توبہ اور استغفار کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ یہ تائبین جہنم میں نہیں جائیں گے اور ان کی اولاد میں سے جو چند روز کے لیے جہنم میں جائے گا اس سے مومن عاصی مراد ہے جیسا کہ تمام شریعتوں کا قاعدہ ہے کہ جو شخص مومن ہو اور گناہ گار ہو اس پر دائمی عذاب نہیں۔

بنی اسرائیل یہ سمجھے کہ یہ حکم ذاتی طور پر ہمارے لیے مخصوص ہے اس لیے ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً﴾ کا دعویٰ کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا ازالہ فرمایا کہ یہ حکم بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں جو دین حق کا اتباع کرے اس کا یہی حکم ہے گزشتہ زمانہ میں چونکہ بنی اسرائیل ملت حقہ اور دین حق کے متبع تھے۔ اگرچہ گناہوں اور خطاؤں میں ملوث تھے اس لیے یہ حکم تھا کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کی طرح ہمیشہ جہنم میں نہ رہیں گے بلکہ صرف چندروز کے لیے جہنم میں جائیں گے جیسا کہ مومن عاصی کا حکم ہے اور اب وہ صورت باقی نہیں رہی اس وقت تم دین حق اور نبی برحق کے اتباع سے انحراف کیے ہوئے ہو اور نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے منکر ہو اور نبی کی نبوت کا انکار کفر ہے۔ اس لیے تمہارا عذاب دائمی ہوگا جیسا کہ کافر کا تمام شریعتوں میں یہی حکم ہے کہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہے گا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى

اور جب ہم نے لیا قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی اور ماں باپ سے سلوک نیک کرنا

اور جب ہم نے لیا اقرار بنی اسرائیل کا بندگی نہ کرو مگر اللہ کی اور ماں باپ سے سلوک نیک اور

الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

اور کنبہ والوں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے اور کہیو سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ

قرابت والے سے اور یتیموں سے اور محتاجوں سے اور کہو لوگوں سے نیک بات اور کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

پھر تم پھر گئے مگر تھوڑے سے تم میں اور تم ہو ہی پھرنے والے ف۱

پھر تم پھر گئے مگر تھوڑے تم میں اور تم کو دھیان نہیں۔

شناعت یازدہم (۱۱)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ... الی... وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں یہود کے اس زعم فاسد کا کہ ہم کو سوائے چند گنتی کے دنوں کے دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں اور فرمایا کہ یہ خیال خام ہے۔ نجات کا دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ خاندان نبوت سے تعلق پر نہیں۔ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرے خواہ وہ کسی خاندان اور کسی قوم کا ہو اس کی نجات ہوگی اور جو کفر کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا جیسے نوح علیہ السلام کا بیٹا۔ یہ آخرت کا معاملہ ہے۔

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

علاوہ ازیں تمہاری عہد شکنیوں کا مقتضی بھی اس کے خلاف ہے کہ تم کو صرف چند روزہ عذاب دیا جائے جس قوم نے خدا تعالیٰ سے پختہ عہد اور پیمان کر کے توڑے ہوں اس قوم کو چند روز عذاب دے کر چھوڑ دینا خلاف حکمت ہے۔ خصوصاً جبکہ عہد شکنی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو اور نیت بھی یہ ہو کہ ہمیشہ ان گناہوں پر قائم رہیں گے۔ اس لیے آئندہ آیات میں بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں کا ذکر فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ہم نے توریت میں بنی اسرائیل سے چند باتوں کا پختہ عہد لیا۔ اول یہ کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہیں کرو گے دوم یہ کہ والدین کے ساتھ خاص احسان کرو گے جو احسان کی تمام انواع و اقسام کو شامل ہو اور اس کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ ترک ایذاء، ۲۔ خدمت مالی، ۳۔ خدمت بدنی۔ سوم اہل قرابت کے ساتھ حسب قرابت احسان کرنا اور چہارم یتیموں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنا اور پنجم عام غرباء اور محتاجوں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنا اور ششم یہ کہ تمام لوگوں کے ساتھ خواہ مومن ہوں یا کافر اچھی طرح اور نرمی سے

ف۱ یعنی احکام الٰہی سے اعراض کرنا تو تمہاری عادت بلکہ طبیعت ہوگئی ہے۔

بات کرنا۔ حسن خلق اور مداراۃ میں کسی کی تخصیص نہیں اور ہفتم یہ کہ نماز کو قائم رکھنا اور ہشتم یہ کہ زکوٰۃ ادا کرتے رہنا۔ یہ وہ عہد تھے جو تم سے لیے گئے پھر تم نے ان مضبوط اور محکم عہدوں سے روگردانی کی۔ مگر تم میں سے بہت ہی تھوڑے افراد ان عہدوں پر قائم رہے اور تم احکام خداوندی سے اعراض اور انحراف کے عادی اور خوگر ہی ہو گئے اور یہ اعراض تمہاری عادت ثانیہ بن گئی ہے اور پھر اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم اللہ کے محب اور محبوب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں چند روز رکھنے کا تو تم سے کوئی عہد نہیں کیا تھا البتہ تم سے یہ عہد لیا تھا کہ تم سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ احسان کرنا اور یتیموں اور مسکینوں کی خبر گیری کرنا اور لوگوں کے ساتھ عمدہ اخلاق سے پیش آنا مگر تم نے یہ عہد بھی توڑ ڈالا اور بہت ہی قلیل لوگ تم میں سے اس عہد پر قائم رہے مثلاً عبداللہ بن سلام وغیرہ۔

فائدہ اولیٰ: ...... والدین کی تربیت تربیت خداوندی کا ایک نمونہ ہے۔ والدین عالم اسباب میں اس کے وجود کے ایک ظاہر سبب ہیں۔ ماں باپ اولاد کے ساتھ جو کچھ احسان کرتے ہیں وہ کسی غرض اور عوض کے لیے نہیں اولاد کی تربیت سے ماں باپ کسی وقت ملول نہیں ہوتے۔ اولاد کے لیے جو کمال ممکن ہو والدین دل و جان سے اس کی آرزو کرتے ہیں، اولاد کی ترقی اور عروج پر کبھی حسد نہیں کرتے ہمیشہ اپنے سے زیادہ اولاد کو ترقی اور عروج پر دیکھنے کے خواہش مند اور آرزومند رہتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد تعظیم والدین کا حکم دیا اور انہی وجوہ کی بناء پر والدین کی تعظیم تمام شریعتوں میں واجب رہی اور چونکہ یہ حق محض ماں باپ ہونے کی وجہ سے ہے اس لیے وَبِالْوَالِدَیْنِ میں ایمان کی قید نہیں لگائی گئی اشارہ اس طرف ہے کہ والدین کی تعظیم والدین ہونے کی حیثیت سے ہر حال میں واجب اور لازم ہے والدین خواہ کافر و فاجر ہوں یا منافق و فاسق ہوں۔ اسی وجہ سے ابراہیم علیہ السلام نے آزر کی دعوت و تلقین میں ہمیشہ تلطف اور نرمی کو ملحوظ رکھا جیسا کہ سورہ مریم میں مفصل قصہ مذکور ہے اور قرآن اور حدیث میں جابجا کافر اور مشرک ماں باپ کے ساتھ بھی سلوک اور احسان کا حکم دیا گیا ہے۔

فائدہ دوم: ...... محتاج تو یتیم اور مسکین دونوں ہی ہیں مگر یتیم کم سن ہونے کی وجہ سے کمانے کی طاقت نہیں رکھتا اس لیے یتیم کو مسکین پر مقدم فرمایا۔

فائدہ سوم: ...... مالی سلوک اور احسان زیادہ تر اقارب کے ساتھ ہوتا ہے مالی احسان ہر ایک کے ساتھ ممکن نہیں اس لیے ﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ میں اجانب کے ساتھ قولی احسان کا ذکر فرمایا اس لیے کہ تواضع اور حسن خلق کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ ممکن ہے۔

فائدہ چہارم: ...... دعوت اور تذکیر یعنی وعظ و نصیحت کے موقعہ پر نرمی اور ملاطفت معہود ہے، کما قال تعالیٰ: ﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ غرض یہ کہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ و مناظرہ میں تلطف اور لین مناسب ہے جیسا کہ ان آیات سے صاف ظاہر ہے۔ البتہ جہاد اور قتال میں غلظت اور شدت مناسب ہے کما قال تعالیٰ: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ جہاد اور نصیحت کے فرق کو خوب سمجھ لو۔

فائدہ پنجم

(دربیان فرق مدارات ومداہنت)

بہت سے لوگ مداراۃ اور مداہنت میں فرق نہیں سمجھتے حالانکہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اپنی دنیوی اور جسمانی راحت اور منفعت کو دوسرے کی دنیوی راحت اور منفعت کے خیال سے چھوڑ دینا اس کا نام مداراۃ ہے اور کسی دنیوی لحاظ کے خاطر اپنے دین کو چھوڑ دینا اور اس میں سستی کرنا اس کا نام مداہنت ہے۔ مداراۃ شریعت میں مستحسن اور پسندیدہ ہے اور مداہنت قبیح اور مذموم ہے کما قال تعالیٰ: ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾

خلاصہ یہ کہ دین میں سستی اور نرمی کا نام مداہنت ہے اور دنیوی امور میں نرمی اور سستی کا نام مدارات ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ

اور جب لیا ہم نے وعدہ تمہارا کہ نہ کرو گے خون آپس میں اور نہ نکال دو گے اپنوں کو اپنے وطن سے

اور جب لیا ہم نے اقرار تمہارا کہ نہ کرو گے خون آپس میں اور نہ نکال دو گے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر

اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا

پھر تم نے اقرار کرلیا اور تم مانتے ہو ف۱ پھر تم وہ لوگ ہو کہ ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقہ کو

تم نے اقرار کیا اور تم مانتے ہو پھر تم ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقے کو

مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى

ان کے وطن سے چڑھائی کرتے ہو ان پر گناہ اور ظلم سے ف۲ اور اگر وہی آویں تمہارے پاس کسی کے قیدی ہو کر

ان کے وطن سے چڑھائی کرتے ہو ان پر گناہ سے اور ظلم سے اور اگر وہی آویں تم پاس کسی کی قید

تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ

تو ان کا بدلا دیکر چھڑاتے ہو حالانکہ حرام ہے تم پر انکا نکال دینا بھی تو کیا مانتے ہو بعض کتاب کو اور نہیں مانتے

میں پڑے تو ان کو چھڑائی دیتے ہو اور وہ بھی حرام ہے تم پر ان کا نکال دینا پھر کیا مانتے ہو تھوڑی کتاب اور منکر ہوتے ہو

ف۱ یعنی نہ اپنی قوم کو قتل کرو اور نہ انکو جلاوطن کرو۔

ف۲ مدینہ میں دو فریق یہودیوں کے تھے ایک بنی قریظہ دوسرے بنی نضیر یہ دونوں آپس میں لڑا کرتے تھے اور مشرکوں کے بھی مدینے میں دو فرقے تھے ایک "اوس" دوسرے "خزرج" یہ دونوں بھی آپس میں دشمن تھے۔ بنی قریظہ تو اوس کے موافق ہوئے اور بنی نضیر نے خزرج سے دوستی کی تھی۔ لڑائی میں ہر کوئی اپنے موافقوں اور دوستوں کی حمایت کرتا۔ جب ایک کو دوسرے پر غلبہ ہوتا تو کمزوروں کو جلاوطن کرتے، ان کے گھر ڈھاتے اور اگر کوئی قید ہو کر پکڑا آتا تو سب رل مل کر مال جمع کر کے اس کا بدلہ دے کر قید سے اس کو چھڑاتے جیسا کہ آئندہ آیت میں آتا ہے۔

بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ

بعض کو ف۱ سو کوئی سزا نہیں اس کی جو تم میں یہ کام کرتا ہے مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں اور

تھوڑی سے پھر کچھ سزا نہیں اس کی جو کوئی تم میں یہ کام کرتا ہے مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں اور

الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

قیامت کے دن پہنچائے جاویں سخت سے سخت عذاب میں اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے ف۲ یہ وہی ہیں جنہوں نے

قیامت کے دن پہنچائے جاویں سخت سے سخت عذاب میں اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے وہی ہیں جنہوں نے

اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع

مول لی دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے سو نہ ہلکا ہو گا ان پر عذاب اور نہ ان کو مدد پہنچے گی ف۳

خرید کی دنیا کی زندگی آخرت دے کر سو نہ ہلکا ہو گا ان پر عذاب اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔

شناعت دوازدہم (۱۲)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ ... الی ... وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾

ربط:...... علاوہ ازیں تمہاری دوسری عہد شکنیوں کا بھی مقتضیٰ یہی ہے کہ تم کو چندروز عذاب نہیں بلکہ دائمی عذاب دیا جائے چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے تم سے اس امر کا پختہ عہد لیا آپس میں خونریزی نہ کرو گے اور نہ ایک دوسرے کو گھروں سے نکالو گے۔ اپنے ہم مذہبوں کو قتل کرنا اور ان کو جلاوطن کرنا درحقیقت اپنے ہی کو قتل کرنا اور جلاوطن کرنا ہے۔ اسی وجہ سے بجائے "اَقَارِبَكُمْ وَاَهْلَ مِلَّتِكُمْ" کے "اَنْفُسَكُمْ" کا لفظ استعمال فرمایا اور پھر تم نے اس کا اقرار بھی کرلیا کہ یہ عہد اور پیمان ہم کو منظور اور قبول ہے اور فقط اقرار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تم اس پر شہادت اور گواہی بھی دیتے ہو کہ بیشک ہمارے بزرگوں نے یہ عہد کیا تھا اور پھر اس صریح اقرار اور صریح شہادت کے بعد تم ہی وہ لوگ ہو کہ باہم ایک دوسرے کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنی قوم کے ایک فریق کو جلاوطن بھی کرتے ہو، اس طرح کہ تم ان کے مقابلہ میں اللہ کے گناہ اور معصیت اور بندوں پر ظلم اور تعدی کے ساتھ قتل کرنے اور جلاوطن کرنے میں ان کے مخالفین کی امداد کرتے ہو۔ توریت کے ان دو حکموں کو تم نے پس پشت ڈالا اور تیسرا حکم جو آسان تھا اس پر عمل کرنے کے لیے تیار رہتے ہو اور وہ یہ کہ اگر تمہارے ہم مذہب لوگ اسیر اور گرفتار ہو کر آتے ہیں تو ان کا فدیہ دے کر ان کو قید سے چھڑاتے ہو اور حالانکہ تم پر ان کا نکالنا اور جلاوطن

ف۱ یعنی اپنی قوم غیر کے ہاتھ میں پھنستی تو چھڑانے کو مستعد اور خود ان کے ستانے اور گلا کاٹنے تک کو موجود۔ اگر خدا کے حکم پر چلتے ہو تو دونوں جگہ پر چلو۔

ف۲ ایسا کرے" یعنی بعض احکام کو مانے اور بعض کا انکار کرے" اس لئے کہ ایمان کا تجزیہ تو ممکن نہیں تو اب بعض احکام کا انکار کرنے والا بھی کافر مطلق ہوگا۔ صرف بعض احکام پر ایمان لانے سے کچھ بھی ایمان نصیب نہ ہوگا۔ اس آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی شخص بعض احکام شرعیہ کی تو متابعت کرے اور جو حکم کہ اس کی طبیعت یا عادت یا غرض کے خلاف ہو اس کے قبول میں قصور کرے تو بعض احکام کی متابعت اس کو کچھ نفع نہیں دے سکتی۔

ف۳ یعنی مفاد دنیوی کو آخرت کے مقابلہ میں قبول کیا اس لئے کہ جن لوگوں سے عہد کیا تھا اس کو دنیا کے خیال سے نبھایا اور اللہ کے جو احکام تھے ان کی پرواہ نہ کی تو پھر اللہ کے ہاں ایسوں کی کون سفارش یا حمایت کر سکتا ہے۔

کرنا بھی قطعاً حرام تھا اور قتل کرنا تو اس سے بھی بڑھ کر جرم تھا مگر تعجب ہے کہ جو جرم شدید تھا اس کا تو ارتکاب کرتے رہے اور جو جرم ذرا خفیف تھا اس سے اجتناب کیا اور وہ اجتناب بھی اتباع شریعت کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس بنا پر تھا کہ وہ حکم غرض اور طبیعت کے موافق تھا لہٰذا ایسے شخص کے لیے چند روزہ عذاب کافی نہیں دائمی عذاب چاہیے۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو فریق تھے، ایک بنی قریظہ اور دوسرے بنی نضیر۔

اسی طرح مدینہ میں مشرکین کے بھی دو فریق تھے ایک اوس اور دوسرے خزرج اور ہر فریق دوسرے فریق کا دشمن تھا آپس میں لڑتے رہتے تھے، بنی قریظہ تو قبیلہ اوس کے حلیف اور دوست تھے اور بنی نضیر قبیلہ خزرج کے حلیف اور دوست تھے جب کبھی اوس اور خزرج میں لڑائی ہوتی تو حلف اور دوستی کی وجہ سے بنو قریظہ تو اوس کی حمایت اور مدد کرتا اور بنی نضیر قبیلہ خزرج کی حمایت اور امداد کرتا اور ہر قبیلہ اپنے حلفاء کے ساتھ مل کر اپنے دشمن کو مارتا اور جلاوطن کرتا اور اگر کوئی یہودی جنگ میں اسیر ہو جاتا تو سب مل کر روپیہ جمع کرتے اور زر فدیہ دے کر اس کو قید سے چھڑا کر لاتے اور اگر کوئی ان سے پوچھتا کہ تم آپس میں جنگ وجدال اور قتل وقتال کرتے ہو اور ایک دوسرے کو گھروں سے نکالتے ہو تو پھر انہی قیدیوں کو جن کو گھروں سے نکالا تھا زر فدیہ دے کر کیوں چھڑاتے ہو تو جواب میں یہ کہتے ہیں کہ توریت میں حق تعالیٰ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے کہ جس وقت تمہارے ہم مذہب بھائی کسی کے ہاتھ میں قید ہو جائیں تو ان کو قید سے چھڑانا ہم پر واجب ہے اور رہی آپس کی جنگ تو وہ دنیوی مصالح کی بناء پر ہے اس میں اگر اپنے حلفاء کا ساتھ نہ دیں تو موجب عار وننگ ہے۔ حق جل شانہ نے اس آیت میں یہود کی اس شناعت کو ذکر فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ تم کو توریت میں قتل کرنے اور جلاوطن کرنے کی اور ظلم اور تعدی میں مدد کرنے کی ممانعت کی گئی تھی اور قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے کا حکم دیا گیا تھا، ان تمام احکام میں سے تم نے فقط فداء اسیران کے حکم پر عمل کیا اس لیے کہ وہ تمہاری نفسانی خواہش کے موافق اور مطابق تھا۔ یہ درحقیقت خدا کی اطاعت نہیں بلکہ اپنے نفس کی اطاعت ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کی حماقت ہے کہ اپنے بھائیوں کے قتل کو اور گھروں سے نکالنے کو تو جائز سمجھتے ہیں اور اگر کسی غیر کے ہاتھ میں اسیر ہو جائیں تو فدیہ دے کر ان کے چھڑانے کو واجب سمجھتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ تم شریعت کے بعض عہدوں اور بعض حکموں کو بے دھڑک توڑتے ہو اور شریعت کا وہ حکم جو تمہاری خواہش نفس اور طبیعت کے موافق ہو اس پر عمل کرتے ہو پس کیا تم کتاب خداوندی یعنی توریت کے بعض حکموں پر تو ایمان لاتے ہو اور بعض احکام کا انکار کرتے ہو۔ حالانکہ ایمان میں تجزی اور تقسیم جاری نہیں ہوتی۔ سارے ہی حکموں کے ماننے کا نام ایمان ہے جو شخص ایک حکم کا بھی انکار کردے وہ کافر ہے اور کافر کی سزا دائمی ہے نہ کہ ایام معدودہ پس کیا جزاء ہے اس شخص کی جو ایسا شنیع کام کرے کہ اللہ کے بعض حکموں کو مانے اور بعض کو نہ مانے۔ خصوصاً تم میں سے جو اپنے کو اہل کتاب اور اہل علم بتلاتے ہیں مگر خواری اور رسوائی دنیاوی زندگانی میں جیسے قتل وغارت اور کمال ذلت واہانت کے ساتھ ان سے جزیہ اور خراج وصول کرنا اور ان کے جرم کے لحاظ سے یہ سزا کوئی بڑی سزا نہیں۔ البتہ قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف پہنچائے جائیں گے اور خوب سمجھ لو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ تو اس سے غافل اور بے خبر نہیں ہاں تم ہی غفلت اور بے خبری میں ہو۔ دیکھ لو بے عقل لوگوں کا گروہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ جنہوں نے اس دنیائے دنی اور فانی کی حقیر زندگی کو آخرت کے عوض میں بصد رغبت خرید لیا ہے پس یہ نادان آخرت کے منافع

سے تو کیا منقطع ہوتے۔ ان سے تو عذاب اخروی ہلکا بھی نہیں کیا جائے گا اور نہ ان کی کسی قسم کی مدد کی جائے گی کہ کوئی زور آور بزور اللہ کے عذاب کو ان سے دفع کر دے پس معلوم ہوا کہ یہ لوگ دائمی عذاب کے مستحق ہیں اس لیے کہ کفر نے ان کا ہر طرف سے احاطہ کیا ہے لہٰذا یہ لوگ اپنے قول ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ میں جھوٹے ہیں۔

فائدہ:...... معلوم ہوا کہ جو شخص شریعت کے اس حکم کو تو مانے جو اس کی طبیعت اور مزاج کے موافق ہو اور جو حکم مخالف طبیعت ہو اس کو قبول نہ کرے وہ کافر ہے مسلمان نہیں دنیاوی حکومتوں میں بھی ایک قانون کا انکار بغاوت ہے جو شخص حکومت کے کسی حکم کے ماننے سے انکار کر دے اس پر بغاوت کی دفعہ لگ جاتی ہے اور کفر اللہ کی بغاوت ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ

اور بیشک دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پے درپے بھیجے اس کے پیچھے رسول اور دیے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو

اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور پے در پے بھیجے اس کے پیچھے رسول اور دیئے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو

الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ

معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح پاک سے ف۱ پھر بھلا کیا جب تمہارے پاس لایا کوئی رسول وہ حکم جو نہ بھایا تمہارے جی کو

معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح پاک سے پھر بھلا جب تم پاس لایا کوئی رسول جو نہ چاہا تمہارے جی نے

اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

تو تم تکبر کرنے لگے پھر ایک جماعت کو جھٹلایا ف۲ اور ایک جماعت کو تم نے قتل کر دیا ف۳

تم تکبر کرنے لگے پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو مار ڈالتے۔

شناعت سیزدہم (۱۳)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ ... الی ... وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾

اور البتہ تحقیق ہم نے بنی اسرائیل کی ہدایت اور اصلاح کا بڑا اہتمام کیا چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو ایک روشن کتاب یعنی توریت عطاء کی اور پھر ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بنی اسرائیل کی اصلاح اور تربیت کے لیے مسلسل یکے بعد دیگرے پیغمبروں کو بھیجا کہ اللہ کے عہدوں کو یاد دلاتے رہیں اور شریعت موسویہ کی پیروی اور اس پر استقامت کی تلقین کرتے رہیں اور پھر خاندان بنی اسرائیل کے اخیر میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو نبوت و رسالت کے واضح اور روشن دلائل دے کر بھیجا اور خاص طور سے روح القدس یعنی جبرائیل امین سے ان کو قوت دی جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے اور دشمنوں سے ان کی

ف۱ مردوں کو زندہ کرنا۔ اکمہ و ابرص وغیرہ مریضوں کا صحت یاب ہونا۔ غیب کی خبریں بتانا یہ حضرت عیسیٰ کے کھلے معجزے ہیں اور روح القدس کہتے ہیں حضرت جبرئیل کو جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے یا اسم اعظم کہ جس کی برکت سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

ف۲ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کو جھوٹا کہا۔

ف۳ جیسا کہ حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کو قتل کیا۔

حفاظت کرتے تھے ولادت سے لے کر رفع الی السماء کے وقت تک جبرائیل آپ کے محافظ رہے اور اس کے آثار وثمرات و انوار وتجلیات اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے تو کیا اس کے بعد بھی تم نرم نہ پڑے اور جب بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسا حکم لے کر آیا کہ جس کو تمہارے نفس پسند نہ کرتے تھے تو تم نے تکبر اور سرکشی کی حالانکہ عقل کا مقتضی یہ تھا کہ اللہ کے نبی اور رسول کی دل وجان سے اطاعت کرتے اور نفس سرکش کی مخالفت کرتے۔ تم جیسے نادان یہ تو کیا کرتے پس تم نے الٹی ہی راہ اختیار کی اور پیغمبروں کے ایک گروہ کو جھٹلایا اور انبیاء کی ایک جماعت کو مار ڈالتے ہو اور ظاہر ہے کہ جو مریض بجائے اس کے کہ طبیب کی ہدایت پر چلے الٹا طبیب کی بے حرمتی کرے اور اس کو جھٹلائے بلکہ اس کو قتل کر ڈالے وہ کہاں شفایاب ہو سکتا ہے اور ایسے روحانی مریض کے لیے ایام معدودہ کی سزا کافی نہیں بلکہ دائمی اور ابدی سزا چاہیے۔

ف:...... یہود انبیاء کی تکذیب تو ایک مرتبہ کر چکے اور قتل کا سلسلہ جاری ہے۔ اب بھی نبی اکرم ﷺ کے درپے قتل ہیں اس لیے ﴿كَذَّبْتُمْ﴾ بصیغہ ماضی لائے اور ﴿تَقْتُلُوْنَ﴾ کو بصیغہ مضارع لائے جو ان کے فعل قتل کے حال اور استقبال میں جاری اور مستمر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ نیز قتل کا واقعہ اگرچہ گزشتہ زمانہ میں ہو چکا ہے مگر چونکہ انبیاء کا قتل نہایت ہی عظیم اور سخت ہے اس لیے اس کی عظمت اور شناعت کے ظاہر کرنے کے لیے صیغہ مضارع سے تعبیر کیا تاکہ وہ پیش نظر ہو جائے گویا کہ وہ اب ہو رہا ہے اور یہ ہولناک اور حیرت ناک واقعہ لوگوں کی نظروں کے سامنے ہے۔

(ربط) یہاں تک بنی اسرائیل کے اس معاملہ کا ذکر تھا جو انبیاء سابقین اور گزشتہ کتب منزلہ کے ساتھ تھا اب آئندہ آیات میں ان بدبختوں کے اس معاملہ کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے نبی آخر الزمان ﷺ اور قرآن کے ساتھ کیا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہے بلکہ لعنت کی ہے اللہ نے انکے کفر کے سبب سو بہت کم ایمان لاتے ہیں ف۱

وہ کہتے ہیں ہمارے دل پر غلاف ہے یوں نہیں لعنت کی ہے اللہ نے ان کے انکار سے سو کم یقین لاتے ہیں۔

شناعت چہاردہم (۱۴)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ... الی ... فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ﴾

اور ان کے غرور اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ خدا کے پیغمبروں سے بطور فخر یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں سوائے اپنے دین کے کسی نئی بات کا اثر ہمارے دلوں تک نہیں پہنچتا یعنی ہم اپنے دین پر نہایت پختہ اور مضبوط ہیں، اللہ تعالی فرماتے ہیں یہ وجہ نہیں بلکہ اللہ تعالی نے ان کے انکار اور تکذیب کی وجہ سے ان پر لعنت فرمائی ہے اور اپنی رحمت اور عنایت سے دور ڈال دیا ہے اس لیے حق بات ان پر اثر نہیں کرتی اور ان کے حق اور نصیحت کو قبول نہیں کرتے اور حق سے متنفر اور بیزار ہیں یہ غلاف نہیں بلکہ اللہ کی لعنت کی نشانی اور علامت ہے۔ کفر اور لعنت کے زنگ نے ان کے دلوں کو اس قدر سیاہ اور زنگ

ف۱ یہود اپنی تعریف میں کہتے تھے کہ "ہمارے دل غلاف کے اندر محفوظ ہیں بجز اپنے دین کے کسی کی بات ہم کو اثر نہیں کرتی۔ ہم کسی کی چاپلوسی، سحر بیانی یا کرشمے اور دھوکے کی وجہ سے ہرگز اس کی متابعت نہیں کر سکتے۔" حق تعالیٰ نے فرمایا "وہ بالکل جھوٹے ہیں بلکہ ان کے کفر کے باعث اللہ نے ان کو ملعون اور اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ اس لئے کسی طرح دین حق کو نہیں مانتے اور بہت کم دولت ایمان سے مشرف ہوتے ہیں"۔

آلود کر دیا ہے کہ آئینہ دل میں شاید ہی کوئی جز ایسا باقی رہا ہو کہ ایمان اور ہدایت کی روشنی کو قبول کر سکے۔ اس لیے یہ لوگ بہت ہی قلیل ایمان لاتے ہیں یعنی شریعت کے کسی حکم کو کبھی مان بھی لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ ایمان قلیل قبول نہیں مثلاً اگر توحید و رسالت کا اقرار بھی کر لیا۔ اور اجمالی طور پر جنت و جہنم پر بھی ایمان لے آیا اور شریعت کے دوسرے احکام کا انکار کر دیا تو ایسے ایمان سے کوئی فائدہ نہیں ایمان قلیل تو کیا معتبر ہوتا۔ نجات کے لیے تو ایمان کثیر بلکہ ایمان اکثر بھی کافی نہیں کہ دین کی کثیر اور اکثر باتوں کو مانے اور بعض کا انکار کر دے ایمان اللہ کے تمام احکام کے ماننے کا نام ہے محض قلیل و کثیر کے ماننے سے شریعت میں مومن نہیں کہلاتا۔

فائدہ:...... حضرات مفسرین نے ﴿غُلْفٌ﴾ کے دو معنی بیان کیے ہیں اول یہ کہ غلف اغلف کی جمع ہے جیسے احمر اور اصفر کی جمع حُمرٌ اور صُفرٌ آتی ہے اور اغلف اس شے کو کہتے ہیں جو کسی غلاف اور پردہ میں محفوظ اور مستور ہو۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے دلوں پر غلاف اور پردہ پڑا ہوا ہے اس لیے آپ کی بات ہمارے دلوں تک پہنچتی نہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ہے ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ﴾ (اور کہا کافروں نے ہمارے دل پردوں میں ہیں) مجاہد رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ سے یہی معنی منقول ہے۔

دوم یہ کہ ﴿غُلْفٌ﴾ غلاف کی جمع ہے دراصل ﴿غُلُفٌ﴾ بضم اللام تھا جیسے "کتابٌ" کی جمع "کُتُبٌ" آتی ہے مگر تخفیف کی وجہ سے لام کو ساکن کر دیا گیا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما "غُلُفٌ" بضم لام پڑھتے تھے۔ اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ ہمارے دل علم کے غلاف اور برتن ہیں جن میں ہر قسم کا علم بھرا ہوا ہے۔ تمہارے علم کی ضرورت نہیں۔ اللہ نے ان کے اس قول کا رد فرمایا کہ جھوٹ بولتے ہیں نہ ان کے دلوں پر پردہ ہے اور نہ ان کے دل علم کے غلاف اور ظرف ہیں بلکہ ان کے کفر اور عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور پھینک دیا ہے اور ان کے دلوں سے قبول حق کی استعداد کو سلب کر لیا ہے اس لیے ان کے دل حق کو قبول نہیں کرتے ﴿فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہرا اور اندھا بنا دیا ہے اور وہ مالک مطلق ہے جس کو چاہے ظاہر کا اندھا بنائے اور جس کو چاہے باطن کا اندھا بنائے کسی کی مجال کیا ہے جو یہ پوچھ سکے کہ اس کی ظاہر یا باطن کی آنکھ کیوں پھوڑی؟

"اخرج احمد بسند جيد عن ابى سعيد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم القلوب اربعة قلب اجرد فيه مثل السراج يزهر وقلب اغلف مربوط على غلافه وقلب منكوس وقلب مصفح۔ فاما القلب الاجرد فقلب المؤمن سراجه فيه نوره واما القلب الاغلف فقلب الكافر واما القلب المنكوس فقلب المنافق عرف ثم انكر واما القلب المصفح فقلب فيه ايمان ونفاق فمثل الايمان فيه كمثل البقلة يمدها الماء الطيب ومثل النفاق فيه كمثل القرحة يمدها القيح۔ فاىّ المادتين غلبت على الاخرى غلبت عليه۔" (درمنثور: ۸۷/۱)

"امام احمد رحمہ اللہ نے سند جید کے ساتھ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

کہ دل چار قسم کے ہیں ایک دل تو وہ ہے جو آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہے اور اس میں کوئی چراغ روشن ہے اور ایک دل وہ ہے جو غلاف میں بند ہے اور غلاف کا منہ دھاگے یا رسی سے بندھا ہوا ہے اور ایک دل الٹا اور اوندھا اور ایک دل وہ ہے جس کے دو صفحے یعنی دو جانبیں ہیں ایک سفید ہے اور ایک صفحہ سیاہ۔ پس صاف و شفاف دل تو مومن کا دل ہے جس میں ایمان کا چراغ روشن ہے اور غلاف میں بند کافر کا دل ہے اور الٹا اور اوندھا دل منافق کا ہے کہ جس نے حق کو پہچانا اور پھر اس کا انکار کیا اور دو رویہ دل وہ ہے کہ جس میں ایمان اور نفاق دونوں جمع ہیں پس ایمان اس دل میں مثل سبزہ کے ہے کہ پاکیزہ پانی اس کو بڑھاتا ہے اور اس کے دل میں نفاق مثل ناسور کے ہے کہ جو دم بدم پیپ اور خون کو بڑھاتا ہے پس ان دو مادوں سے سے جونسا مادہ غالب آجائے اسی کا اعتبار ہے۔"

اللّٰهم نور قلوبنا بانوار طاعتك ومعرفتك أمين يا ارحم الراحمين۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ

اور جب پہنچی انکے پاس کتاب اللہ کی طرف سے جو سچا بتاتی ہے اس کتاب کو جو انکے پاس ہے اور پہلے سے فتح مانگتے تھے

اور جب پہنچی ان کو کتاب اللہ کی طرف سے سچ بتاتی ان پاس والی کو اور پہلے سے فتح مانگتے تھے

عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

کافروں پر پھر جب پہنچا ان کو جسکو پہچان رکھا تھا تو اس سے منکر ہو گئے سو لعنت ہے اللہ کی منکروں پر ف۱

کافروں پر پھر جب پہنچا ان کو جو پہچان رکھا تھا اس سے منکر ہوئے سو لعنت ہے اللہ کی منکروں پر

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

بری چیز ہے وہ جسکے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپکو کہ منکر ہوئے اس چیز کے جو اتاری اللہ نے اس ضد پر کہ اتارے اللہ اپنے فضل سے

برے مول خرید کیا اپنی جان کو کہ منکر ہوئے اللہ کے اتارے کلام سے اس ضد پر کہ اتارے اللہ اپنے فضل سے

عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے ف۲ سو کما لائے غصہ پر غصہ ف۳ اور کافروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا ف۴

جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے سو کما لائے غصہ پر غصہ اور منکروں کو عذاب ہے ذلت کا۔

ف۱ ان کے پاس جو کتاب آئی وہ قرآن ہے اور جو کتاب ان کے پاس پہلے سے تھی وہ توریت ہوئی۔ قرآن کے اترنے سے پہلے جب یہودی کافروں سے مغلوب ہوتے تو خدا سے دعا مانگتے کہ "ہم کو نبی آخر الزمان اور جو کتاب ان پر نازل ہوگی ان کے طفیل سے کافروں پر غلبہ عطا فرما"۔ جب حضور ﷺ پیدا ہوئے اور سب نشانیاں بھی دیکھ چکے تو منکر ہو گئے اور ملعون ہوئے۔

ف۲ یعنی جس چیز کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچا وہ کفر اور انکار ہے قرآن کا اور انکار بھی محض ضد اور حسد کے سبب۔

ف۳ ایک غضب تو یہ کہ قرآن بلکہ اس کے ساتھ اپنی کتاب کے بھی منکر ہو کر کافر ہوئے، دوسرے محض حسد اور ضد سے پیغمبر وقت سے انحراف اور خلاف کیا۔

ف۴ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عذاب ذلت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ مسلمانوں کو جو ان کے معاصی پر عذاب ہوگا گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہوگا۔ ۞

شناعت پانزدہم (۱۵)

قال تعالیٰ: ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ... الی ... وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں قلب اغلف کا ذکر تھا اب آئندہ آیات میں قلب منکوس کا ذکر ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ یہود، آنحضرت ﷺ کو خوب پہچانتے تھے کہ یہی نبی آخر الزمان ﷺ ہیں مگر عناد اور حسد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایسی کتاب آئی یعنی قرآن شریف جس کے اعجاز کو دیکھ کر خود ان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے اور پھر مزید برآں وہ قرآن جو منجانب اللہ ان کے پاس آیا اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے یعنی توریت کی تصدیق اور موافقت کرتا ہے حالانکہ آپ امی ہیں۔ آپ تو عربی خط اور عبارت میں نہیں پڑھ سکتے تھے جو کتاب عبرانی خط میں ہو اس کے مضامین کی واقفیت کیسے ہو سکتی ہے سوائے وحی کے اور کوئی ذریعہ علم نہیں اور تعجب ہے کہ یہ لوگ آپ کی نبوت میں تردد کرتے ہیں حالانکہ نزول قرآن اور آپ کی بعثت سے پہلے ہی لوگ کافر اور بت پرستوں کے مقابلہ میں آپ کے نام اور برکت سے فتح ونصرت اللہ سے مانگا کرتے تھے چنانچہ یہود مدینہ اور یہود خیبر کی جب عرب کے بت پرستوں سے لڑائی ہوتی تو یہ دعا مانگتے:

"اللّٰهم ربنا انا نسألك بحق احمد النبي الامي الذي وعدتنا ان تخرجه لنا في اٰخر الزمان وبكتابك الذي تنزل عليه اٰخر ما تنزل ان تنصرنا علي اعدائنا۔ اخرجه ابو نعيم والحاكم والبيهقي وغيرهم عن ابن عباس وابن مسعود وغيرهم بالفاظ مختلفة۔" (درمنثور)

"اے اللہ ہم تجھ سے اس احمد مصطفی (ﷺ) نبی امی کے حق سے سوال کرتے ہیں جس کے ظاہر کرنے کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور اس کتاب کے واسطہ اور برکت سے سوال کرتے ہیں جس کو تو سب سے اخیر میں نازل کرے گا کہ ہم کو ہمارے دشمنوں پر فتح اور نصرت عطاء فرما یہ روایت ابن عباس اور ابن مسعود اور دیگر صحابہ سے بالفاظ مختلفہ مروی ہے۔"

غرض یہ کہ آپ ﷺ کے ظہور سے پہلے ہی یہود آپ کو خوب پہچانتے تھے اور آپ کے نام مبارک اور قرآن کریم کے واسطہ اور برکت سے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں فتح ونصرت کی دعا مانگتے تھے اور فتح پاتے تھے اور آپ ﷺ کے توسل کو موجب خیر و برکت سمجھتے تھے پس جب ان کے پاس وہ چیز خود بخود آ پہنچی یعنی نبی امی اور قرآن جس کو آنے سے پہلے ہی خوب پہچان چکے تھے اور اس کے ظہور کے منتظر تھے آتے ہی محض حسد اور عناد کی وجہ سے ان کا انکار کر بیٹھے ایسے لوگوں کے عذاب میں کیسے تخفیف ہو سکتی ہے یا ایسے لوگوں کا عذاب ایام معدودہ کیسے ہو سکتا ہے پس لعنت ہو اللہ کی ایسے کافروں پر جنہوں نے دیدہ و دانستہ حق کو محض حسد اور عناد کی وجہ سے چھپایا۔ حق تو یہ تھا کہ جن کے نام کی برکت سے فتح ونصرت کی دعائیں مانگتے تھے اور فتح یاب ہوتے تھے آج دل وجان سے اس نبی امی اور اس کے دین کی نصرت اور اعانت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے۔ اور

☆ بغرض تذلیل، البتہ کافروں کو بغرض تذلیل عذاب دیا جائے گا۔

سب سے پہلے اس نبی اور اس کتاب پر ایمان لاتے نیز جب یہ کتاب توریت کی مصدق تھی تو اس کی تصدیق عقلاً لازم تھی اس لیے کہ اس کی تکذیب توریت کی تکذیب کو مستلزم ہے بہت ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ⑪ ڈالا یا اپنے گمان میں ان کو خرید لیا اور اپنے خیال زعم فاسد کی بناء پر ان کو عذاب الٰہی سے چھڑا لیا وہ یہ کہ انکار کرنے لگے اس چیز کا جو اللہ نے اپنے نبی پر نازل کی محض اس حسد اور عناد کی بناء پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور عطاء یعنی وحی سے جس بندہ پر چاہے کچھ نازل فرمائے پس یہ لوگ غضب، پر غضب کے مستحق ہوئے کہ طرح طرح سے اسباب غضب کے مرتکب ہوئے۔

(۱) جس توریت پر ایمان کے مدعی تھے اس میں سے نبی آخر الزمان ﷺ کی بشارتوں کے چھپانے کی خاطر تحریف کی۔

(۲) باوجود یہ کہ اس نبی امی اور قرآن کے واسطہ سے بار بار فتح ونصرت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا پھر جب وہ نبی امی اور وہ کتاب معجز سامنے آئی تو اقرار اور اعتراف کے بعد اس سے انحراف کیا۔

(۳) نبی برحق پر حسد کیا اور در پردہ اللہ پر اعتراض کیا کہ یہ منصب رسالت کے اہل نہ تھے ان کو یہ منصب کیوں عطاء کیا ان وجوہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے قسما قسم کے غضب اور غصہ کے مورد بنے پس جو شخص غضب خداوندی کے پشتارہ کا حامل ہو نہ اس کے عذاب میں تخفیف ہوسکتی ہے اور نہ اس کا عذاب چند روز میں منقطع ہوسکتا ہے اور اگر ان تمام وجوہ غضب سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تو دائمی عذاب کے لیے فقط ایک کفر ہی کافی ہے جو ان میں موجود ہے اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے اور گنہگار مسلمانوں کو جو عذاب ہوگا وہ اہانت اور تذلیل کے لیے نہ ہوگا بلکہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوگا جیسا کہ میلا اور گندا کپڑا بھٹی پر میل کچیل صاف کرنے کے لیے چڑھایا جاتا ہے جلانے کے لیے نہیں دشمن کو مارنا تذلیل اور تحقیر کے لیے ہوتا ہے اور بیٹے اور شاگرد کو مارنا اصلاح اور تادیب کے لیے ہوتا ہے ایک مار تعذیب کے لیے ہے اور ایک تہذیب کیلئے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا

اور جب کہا جاتا ہے ان سے مانو اس کو جو اللہ نے بھیجا ہے تو کہتے ہیں ہم مانتے ہیں جو اترا ہے ہم پر اور نہیں مانتے اس کو

اور جب کہیے ان کو مانو اللہ کا اتارا کلام کہیں ہم مانتے ہیں جو اترا ہم پر اور وہ نہیں مانتے جو

وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ

جو اس کے سوا ہے حالانکہ وہ کتاب سچی ہے تصدیق کرتی ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے ف۱ کہہ دو پھر کیوں قتل کرتے رہے ہو اللہ کے پیغمبروں کو پہلے سے

۹۱ پیچھے آیا اس سے اور وہ اصل تحقیق ہے سچ بتاتا ان پاس والی کو کہہ پھر کیوں مارتے رہے ہو نبی اللہ کے پہلے سے

ف۱ جو اللہ نے بھیجا یعنی انجیل وقرآن اور جو اترا ہم پر یعنی توریت مطلب یہ ہوا کہ "بجز توریت اور کتابوں کا صاف انکار کرتے ہیں اور انجیل وقرآن کو نہیں مانتے" ۔حالانکہ وہ کتابیں بھی سچی اور توریت کی تصدیق کرنے والی ہیں۔

⑪ یعنی حسد اور طمع کی وجہ سے کفر کے بدلہ میں اپنی جانوں کو فروخت کر ڈالا گویا کہ دوزخ کے فرشتوں کے ہاتھ ہلاکت کے لیے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔ اس تفسیر میں اشتراء بمعنی بیع کے ہے اور ان کی جان بمنزلہ مبیع ہے اور کفر بمنزلہ ثمن ہے اور دوسری تفسیر میں اشتراء خریدنے کے معنی میں ہے، جمہور کے نزدیک مختار پہلا ہی قول ہے۔ ۱۲ منہ

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۱

اگر تم ایمان رکھتے تھے ف ۱

اگر تم ایمان رکھتے تھے۔

شناعت شانز دہم (۱۶)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا ... الی ... اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

اور دلیل اس امر کی کہ (یہود کا یہ معاملہ آپ کے ساتھ محض حسد کی بناء پر ہے) یہ ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ ہر اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے خواہ کسی پیغمبر پر اس کا نزول ہوا ہو جو چیز بھی خدا نے نازل کی اس پر ایمان لانا واجب ہے خواہ وہ توریت وانجیل ہو یا قرآن کریم ہو، وجوب ایمان کی علت حکم خداوندی ہوتا ہے جو تمام کتب الٰہیہ میں مشترک ہے وہ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہم تو فقط اس کتاب پر ایمان لائیں گے جو خاص ہم پر ہمارے نبی کے واسطہ سے نازل کی گئی۔ اس قید سے ان کا حسد صاف ظاہر ہے کہ جو کتاب بنی اسرائیل پر اتری اس پر تو ایمان لائیں گے اور جو کتاب بنی اسماعیل پر اتری اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور محض حسد کی بنا پر اپنی کتاب کے سوا تمام کتابوں کا انکار کرتے ہیں حالانکہ توریت کے سوا اور جو کتابیں خدا تعالیٰ نے نازل کیں وہ فی نفسہ حق ہیں یعنی سچی اور واقع کے مطابق ہیں اور ان کے تمام مضامین محقق اور مدلل ہیں اور فی نفسہٖ حق ہونے کے علاوہ اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہیں جو ان کے ساتھ ہے لہٰذا جو چیز فی حد ذاتہٖ حق اور واقع کے مطابق ہو اور پھر اس کے علاوہ اس چیز کے ساتھ مطابق ہو جس کو وہ سچا اور برحق سمجھتے ہیں تو ایسی چیز کو نہ ماننا سراسر خلاف عقل ہے اس لیے کہ مطابق کا مطابق بھی مطابق ہی ہوتا ہے لہٰذا ایک مطابق کو ماننا اور دوسرے مطابق کو نہ ماننا تناقض کو مستلزم ہے اور اگر اس پر بھی وہ توریت پر ایمان کے مدعی ہیں تو آپ ﷺ ان سے یہ کہیئے کہ اچھا تم یہ بتلاؤ کہ تم اللہ کے پیغمبروں کو کس لیے پہلے ہی سے قتل کرتے چلے آرہے ہو حالانکہ وہ پیغمبر توریت ہی کے مطابق حکم دیتے تھے اور شریعت موسویہ کی تائید اور تجدید کے لیے مبعوث ہوئے تھے جیسے حضرت شعیا اور حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام اگر تم حقیقۃً توریت پر ایمان رکھنے والے تھے۔ معلوم ہوا کہ تم توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ توریت اور شریعت موسویہ پر تمہارا ایمان کا دعویٰ غلط ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۹۲

اور آچکا تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لیکر پھر بنا لیا تم نے بچھڑا اس کے گئے پیچھے اور تم ظالم ہو ف ۲

اور آچکا تم پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر پھر تم نے بنا لیا بچھڑا اس کے پیچھے اور تم ظالم ہو۔

ف ۱ ان سے کہدو کہ "اگر تم توریت پر ایمان رکھتے ہو تو پھر تم نے انبیاء کو کیوں قتل کیا" کیونکہ توریت میں یہ حکم ہے کہ "جو نبی توریت کو سچا کہنے والا آئے اس کی نصرت کرنا اور اس پر ضرور ایمان لانا"۔ اور قتل بھی ان انبیاء کو کیا جو پہلے گذر چکے ہیں (جیسے حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ) جو احکام توریت پر عمل کرتے تھے اسی کی ترویج کے لئے مبعوث ہوئے تھے ان کے مصدق توریت ہونے میں تو بیوقوف کو بھی تامل نہیں ہو سکتا (یہ بات لفظ قبل سے مفہوم ہوئی)۔

ف ۲ یعنی حضرت موسیٰ کہ جن کی شریعت پر قائم ہو اور انکی شریعت کی وجہ سے اور شرائع حقہ کا انکار کرتے ہو۔ خود انہوں نے کھلے کھلے معجزے تم کو دکھائے (جیسے=

شناعت ہفدہم (۱۷)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ... الى... وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾

اور انبیاء کے قتل کا واقعہ تو موسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد کا ہے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس سے بڑھ کر کفر کر چکے ہو وہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس توحید و رسالت کی نہایت واضح اور روشن دلیلیں لے کر آئے جو اس بات پر صاف طور پر دلالت کرتی تھیں کہ عبادت اور بندگی اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں پھر بھی تم نے ان کے جانے کے بعد ہی ایک گوسالہ بے عقل کو اپنا معبود بنالیا اور جب خدا ہی ایک بے عقل حیوان ٹھہرا تو اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ بے عقل حیوان کے بندے کس درجہ بے عقل اور حیوان ہوں گے، ہندوستان کے ہندو جو گوسالہ پرستی کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سلسلۂ سند سامری سے ضرور ملتا ہوگا اور تم بڑے ہی ظالم ہو کہ اپنے ہاتھ سے ایک بے عقل حیوان کی بنائی ہوئی صورت کو تم نے خدا بنالیا۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہوسکتا ہے۔

ف:...... گوسالہ کو معبود بنانا اس لیے تھا کہ یہ لوگ غایت حماقت کی وجہ سے یا تو مجسمہ تھے یا حلولیہ تھے یعنی خدا تعالیٰ کا کسی جسم میں حلول کرنا جائز سمجھتے تھے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ

اور جب ہم نے لیا قرار تمہارا اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو پکڑو جو ہم نے تم کو دیا زور سے اور سنو

اور جب ہم نے لیا اقرار تمہارا اور اونچا کیا تم پر پہاڑ پکڑو جو ہم نے تم کو دیا زور سے اور سنو

قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا

بولے سنا ہم نے اور نہ مانا اور پلائی گئی انکے دلوں میں محبت اسی بچھڑے کی بسبب انکے کفر کے ف۱ کہدے کہ بری باتیں

بولے سنا ہم نے اور نہ مانا اور رچ رہا ان کے دلوں میں وہ بچھڑا مارے کفر کے تو کہہ برا

يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

سکھاتا ہے تم کو ایمان تمہارا اگر تم ایمان والے ہو۔

کچھ سکھاتا ہے تم کو ایمان تمہارا اگر تم ایمان والے ہو۔

= عصا، ید بیضا اور دریا کا پھاڑنا وغیرہ) مگر جب چند دن کے لئے کوہ طور پر گئے تو اتنے ہی میں بچھڑے کو تم نے خدا بنالیا۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اپنے درجہ نبوت پر قائم زندہ موجود تھے تو اس وقت تمہارا موسیٰ اور انکی شریعت پر ایمان کہاں جاتا رہا تھا اور رسول آخر الزمان کے بغض اور حسد میں آج شریعت موسوی کو ایسا پکڑ رکھا ہے کہ خدا کا حکم بھی نہیں سنتے۔ بے شک تم ظالم، تمہارے باپ دادا ظالم۔ یہ حال تو بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ کے ساتھ تھا۔ آگے توریت کی نسبت جو انکے ایمان کی حالت تھی اس کو بتاتے ہیں۔

ف۱ یعنی احکام توریت کی جو تکلیف دی گئی اس کو پوری ہمت و استقلال سے مضبوط پکڑو، چونکہ پہاڑ سر پر معلق تھا جان کے اندیشے سے زبان سے (یا اس وقت) تو کہہ لیا ﴿سَمِعْنَا﴾ یعنی احکام توریت ہم نے سن لئے اور دل سے (یا بعد میں) کہا ﴿عَصَيْنَا﴾ یعنی ہم نے قبول نہیں کیا احکام کو اور وجہ اس کی یہ تھی کہ صورت پرستی ان کے دل میں راسخ ہو چکی تھی ان کے کفر کے باعث وہ زنگ بالکل ان کے دل سے زائل نہیں ہوا بلکہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔

شناعت ہشتدہم (۱۸)

قال تعالیٰ: ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ ... الی ... إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾

اور ایک اور قصہ سنو جس سے توریت کے ساتھ یہود کے ایمان کا حال معلوم ہوگا۔ جب ہم نے تم سے اس بات کا عہد لیا کہ جب توریت تمہارے پاس پہنچے تو دل وجان سے اس کو قبول کرنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا مگر تم اپنے اس عہد سے پھر گئے اور توریت پر عمل کرنے میں حیلے اور بہانے شروع کیے۔ اس وقت ہم نے تمہارے سروں پر کوہ طور لا کھڑا کیا اور حکم دیا کہ جو احکام ہم نے تم کو دیئے ہیں ان کو نہایت مضبوطی اور پختگی کے ساتھ پکڑو اور گوشِ ہوش سے ان کو سنو مبادا کوئی حکم تم کو یاد نہ رہے اور پھر تمہاری یہ غفلت معصیت کا سبب بن جائے اس کے جواب میں انہوں نے یہ کہا کہ احکام توریت کو سن لیا ہے مگر مانا نہیں اور اگر ان کے تمرد اور عصیان کا سب سے بڑا نمونہ دیکھنا چاہو تو یہ ہے کہ ان کے کفر اور سرکشی کی وجہ سے ان کے دلوں میں گوسالہ کی محبت پلا دی گئی تھی۔ اس لیے ان کو گوسالہ پرستی لذیذ اور خدا پرستی تلخ اور ناگوار معلوم ہوتی تھی، ظاہر نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے اسی حالت میں بھی "سَمِعْنَا" اور "عَصَيْنَا" دونوں کلمے زبان سے کہے لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ ایسی خوفناک حالت میں زبان سے "عَصَيْنَا" کہنا بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ بالفرض والتقدیر اگر کسی حالت میں زبان سے "عَصَيْنَا" نکالتے تو اسی وقت کوہ طور گرا کر ان کو چور چور کر دیا جاتا اور سب کے سب ہلاک کر دیئے جاتے کیونکہ کوہ طور کو سروں پر لا کھڑا کرنا اس لیے تھا کہ وہ توریت کو قبول کریں ایسی حالت میں بھی اگر زبان سے "عَصَيْنَا" کہا تھا تو پھر کوہ طور کھڑا کرنے سے کیا فائدہ ہوا، اسی اشکال کی بناء پر بعض مفسرین نے توجیہ کی ہے کہ "سَمِعْنَا" کہنا بزبان قال تھا اور "عَصَيْنَا" کہنا بزبان حال تھا زبان سے تو فقط "سَمِعْنَا" ہی کہا تھا لیکن جب اقرار کے بعد فوراً ہی عصیان اور نافرمانی کرنے لگے تو ان کی حالت کے اعتبار سے "عَصَيْنَا" کہنا ان کی طرف منسوب کیا گیا گویا کہ وہ اسی حالت میں بزبان حال "عَصَيْنَا" کہہ رہے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ حقیقت امر یہ ہے کہ بنی اسرائیل باوجود یہ کہ کوہ طور کو اپنے سروں پر معلق دیکھ رہے تھے مگر یہ گمان کیا کہ یہ محض ڈرانے کے لیے ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی شفاعت سے اور بلاؤں کی طرح یہ بلا بھی ٹل جائے گی۔ اس لیے انہوں نے ابتداءً احکام توریت کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور صاف "عَصَيْنَا" کہہ دیا کہ کیوں توریت کے احکام شاقہ کی ذمہ داری اپنے سر پر لیں۔ اس گمان پر انہوں نے یہ کلمہ اپنی زبان سے کہا لیکن جب دیکھا کہ پہاڑ ان کے سروں کے نزدیک ہوتا جا رہا ہے تو سمجھے کہ یہ حیلے اور بہانے چلیں گے نہیں اس لیے چار و ناچار سجدہ میں گرے اور زبان سے الفاظ قبول کہے جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے: ﴿وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ﴾۔

جب یہ یقین ہو گیا کہ پہاڑ ٹلنے والا نہیں اس وقت مجبور ہو کر قبول کیا مگر کچھ مدت بعد پھر منحرف ہو گئے کما قال تعالیٰ: ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ﴾

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قبول کے ایک مدت بعد انحراف کیا اور اس مقام پر ان کے ابتدائی حال کا بیان ہے

کہ ابتداء میں انہوں نے قبول نہیں کیا اور "سَمِعْنَا" کے ساتھ "عَصَيْنَا" بھی کہا لیکن بعد میں مجبور ہو کر قبول کیا اور پھر ایک زمانہ کے بعد اس سے انحراف کیا بحمد اللہ اس تقریر پر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ انتهى كلامه مُحَصَّلًا وَمُوَضَّحًا۔

خلاصہ یہ کہ جس ایمان کے وہ مدعی ہیں اس ایمان کی حقیقت اور کیفیت یہ ہے جو بیان ہوئی اے ہمارے نبی آپ (ﷺ) ان سے مختصرا بس اتنا کہہ دیجئے کہ بہت ہی بری ہے وہ چیز جس کے کرنے کا تم کو تمہارا ایمان حکم دیتا ہے اگر حقیقۃً تم مومن ہو۔ اور دعوائے ایمان میں سچے ہو۔ یعنی یہ محض تمہارا ساختہ اور پرداختہ ایمان ہے جو ایسے افعال شنیعہ اور اقوال قبیحہ کا حکم دیتا ہے حقیقی ایمان کبھی ایسی قبیح اور شنیع باتوں کا حکم نہیں دے سکتا۔ اگر تمہارا ایمان تم کو ایسی ہی باتوں کا حکم دیتا ہے تو بہت برا ایمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا ایمان اگر تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ قادر مطلق کو چھوڑ کر ایک بے زبان اور لایعقل جانور کو خدا بنا لو اور محمد رسول اللہ ﷺ جیسے عظیم الشان رسول کی تکذیب کرو پس ایسا ایمان جو تمہیں کفر کا حکم کرتا ہے یہ تو بہت ہی برا ایمان ہے۔ ایسے لوگ تو دائمی سزا کے مستحق ہیں ایسوں کے لیے ایام معدودہ کا عذاب ہرگز کافی نہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

کہدے کہ اگر ہے تمہارے واسطے آخرت کا گھر اللہ کے ہاں تنہا سوا اور لوگوں کے تو تم مرنے کی آرزو کرو

تو کہہ اگر تم کو ملنا ہے گھر آخرت کا اللہ کے یہاں الگ سوائے اور لوگوں کے تو تم مرنے کی آرزو کرو

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

اگر تم سچ کہتے ہو ف۱ اور ہرگز آرزو نہ کریں گے موت کی کبھی بسبب ان گناہوں کے کہ بھیج چکے ہیں انکے ہاتھ، اور اللہ خوب جانتا ہے

اگر سچ کہتے ہو اور یہ آرزو کبھی نہ کریں گے جس واسطے آگے بھیج چکے ہیں ہاتھ ان کے اور اللہ خوب جانتا ہے

بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ

گنہگاروں کو، اور تو دیکھے گا ان کو سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر اور زیادہ حریص مشرکوں سے بھی چاہتا ہے

گنہگاروں کو اور تو دیکھے ان کو سب لوگوں سے زیادہ حرص جینے کی اور شریک پکڑنے والوں سے بھی

اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ ۢ

ایک ایک ان میں کا کہ عمر پاوے ہزار برس اور نہیں اس کو بچانے والا عذاب سے اس قدر جینا اور اللہ دیکھتا ہے

ایک ایک چاہتا ہے کہ عمر پاوے ہزار برس اور کچھ اس کو سرکا نہ دے گا عذاب سے اتنا جینا اور اللہ دیکھتا ہے

بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع ۱۱

جو کچھ وہ کرتے ہیں ف۲

جو کرتے ہیں۔

ف۱ یہود کہتے تھے کہ "جنت میں ہمارے سوا کوئی نہ جائے گا اور ہم کو عذاب نہ ہوگا" اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اگر یقینی بہشتی ہو تو مرنے سے کیوں ڈرتے ہو" =

شناعت نوزدہم (۱۹)

قال تعالیٰ: ﴿قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ... الی... وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ﴾

یہود باوجود ان شنائع اور قبائح کے یہ کہتے تھے کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں جائے گا اور آخرت کی نعمتیں ہمارے لیے مخصوص ہیں تو اے ہمارے نبی آپ ﷺ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ اگر دار آخرت فقط تمہارے ہی لیے اللہ کے یہاں خاص ہے اوروں کے لیے نہیں یعنی بہشت اور نعمائے آخرت میں تمہارا کوئی شریک اور سہیم نہیں تو پھر مرنے کی تمنا اور آرزو کر کے دکھلاؤ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو اس لیے کہ دار آخرت کی وہ لازوال اور بے مثال نعمتیں کہ جن میں تمہارا کوئی شریک اور سہیم نہیں ان تک پہنچنے کا راستہ سوائے موت کے اور کوئی نہیں لہٰذا اگر تم کو یہ یقین ہے کہ اس دار جاودانی کی نعمتیں تمہارے لیے مخصوص ہیں تو پھر اس دار فانی اور کلبۂ احزان و پریشانی سے خلاصی اور نجات کی تمنا کرو۔ قصر عالی شان اور اعزاز شاہی کے مقابلہ میں جیل خانہ کی ذلت اور مشقت کو ترجیح دینا کسی عاقل کا کام نہیں خصوصاً جبکہ جدال و قتال کا بازار گرم ہے اور یہود کے مرد مارے جارہے ہیں اور بچے اور عورتیں غلام بنائے جارہے ہیں۔ مال و اسباب لوٹا جارہا ہے اور جزیہ اور خراج ان پر قائم کیا جارہا ہے تو ایسی حیات سے بلاشبہ موت افضل اور بہتر ہے تم کو معلوم ہے کہ لذائذ دنیوی، نعم اخروی کا مقابلہ نہیں کرسکتیں اور تم اس وقت مسلمانوں سے جنگ و جدال کی وجہ سے تکلیف اٹھارہے ہو تو موت کی تمنا کرو تا کہ اس رنج و محن سے چھٹکارا ملے اور چونکہ اپنے دعوے کے موافق خاصان خدا سے ہو اس لیے تمہاری دعا بھی ضرور قبول ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ اور ہم موت اور حیات کے مالک ہیں۔ جس وقت بھی تم موت کی تمنا کرو گے اسی وقت موت واقع کردیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اگر یہودی موت کی تمنا کرتے تو پانی ہی کے گھونٹ سے گلا گھٹ کر مرجاتے وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شئ ممکن الوقوع ہو۔ تحدی اور اظہار معجزہ کے وقت اس کا وقوع اور تحقق واجب اور لازم ہوجاتا ہے لیکن یہ وجوب اور لزوم ان کی تمنا اور آرزو پر موقوف تھا لہٰذا جب انہوں نے تمنا نہ کی موت بھی متحقق نہ ہوئی اور چونکہ ان کو یقین تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کی تحدی کے بعد اگر ہم نے موت کی تمنا کی تو موت ضرور آجائے گی اس لیے ڈر کے مارے موت کی تمنا نہیں کی۔ خوب جانتے تھے کہ موت کی تمنا کرنے سے آنحضرت ﷺ کا معجزہ ظاہر ہوجائے گا اس لیے موت کی تمنا کرنے سے عاجز رہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں اور ہم ابھی سے خبر دیتے ہیں کہ یہ لوگ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے ان اعمال شنیعہ کے خوف کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ پہلے کرچکے ہیں یہ جملہ بطور پیشین گوئی اور غیب کی خبر کے ہے جو حضور ﷺ کا معجزہ اور یہود کے عجز کی دلیل ہے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے اگرچہ وہ موت کی تمنا نہ کریں اور موت سے کتنا ہی بھاگیں ایک نہ ایک دن ضرور موت آئے گی اور ان سب اعمال کفریہ کی ان کو سزا ملے گی۔

ف ۱: ...... جاننا چاہیے کہ یہ ایک قسم کا مباہلہ تھا۔ حق اور باطل کا فیصلہ اکثر مناظرہ اور مجادلہ سے ہوتا ہے اور کبھی مباہلہ سے۔ اس لیے کہ فیصلہ کے دو طریق ہیں، ایک طریقہ معتاد اور ایک طریقہ غیر معتاد، معتاد طریقہ یہ ہے کہ مناظرہ اور مباحثہ سے فیصلہ کیا

=ف ۲ یعنی یہودیوں نے ایسے برے کام کئے ہیں کہ موت سے نہایت سے بچتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ مرتے ہی خیر نظر نہیں آتی حتی کہ مشرکین سے بھی زیادہ جینے پر حریص ہیں۔ اس سے ان کے دعووں کی تغلیط خوب ہوگئی۔

جائے اور غیر معتاد طریقہ یہ ہے کہ فیصلہ ایسے طریقہ سے کیا جائے جو خارق للعادۃ اور اسباب ظاہری کے دائرہ سے بالا اور برتر ہو یعنی بطریق معجزہ اور کرامت اس کا فیصلہ کیا جائے چنانچہ اس مقام پر جب حجت اور دلیل اور نظر اور فکر کے تمام مراحل ختم ہو گئے تو خصم کے افحام اور الزام کے لیے ایک خارق عادت طریق اختیار کیا گیا وہ یہ کہ ایک مرتبہ زبان سے یہ کہہ دیں کہ اے اللہ ہم کو موت دے اسی وقت ان کا صدق و کذب ظاہر ہو جائے گا اور اگر یہود کو اس کا یقین نہ ہوتا تو جوش عداوت میں ضرور کہہ ڈالتے تا کہ حضور کا معجزہ ظاہر نہ ہو۔

ف ۲:...... یہ خطاب اور یہ تحدی ان یہودیوں کے ساتھ مخصوص تھی جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے اور خوب جانتے تھے کہ یہی وہ نبی ﷺ برحق ہیں جن کی پیشین گوئی توریت میں ہے اور ہر زمانہ کے یہود سے یہ خطاب نہیں جیسا کہ روح المعانی: ۱/۲۹۶، عبداللہ بن عمر ؓ سے منقول ہے اور ابداً کا لفظ انہی کے عمر کے لحاظ سے فرمایا گیا۔

ف ۳:...... یہود نے نہ زبان سے تمنا کی ورنہ ضرور منقول ہوتی اور نہ دل سے تمنا کی ورنہ اگر دل سے تمنا کرتے تو خجالت اور الزام کے دور کرنے کے لیے زبان سے ضرور اس کا اظہار کرتے۔

ایک شبہ:...... اگر یہ کہا جائے کہ یہ سوال تو یہود کی طرف سے مسلمانوں پر بھی وارد ہو سکتا ہے کہ تم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہو کہ سوائے مسلمانوں کے اور کوئی جنت میں نہیں جائے گا لہٰذا تم کو بھی چاہیے کہ موت کی تمنا کرو۔

ازالہ:...... جواب یہ ہے کہ یہود کا عقیدہ فقط یہی نہیں تھا کہ ہم اہل حق ہیں اور ہمارے سوا کوئی جنت میں نہیں جائے گا بلکہ ساتھ یہ بھی اعتقاد تھا کہ ہم اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں کما قال تعالیٰ حاکیا عنھم ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ ہمارے اعمال و افعال اور اقوال و احوال کیسے ہی ناشایستہ اور ناگفتہ ہوں ہم ضرور جنت میں جائیں گے جنت ہماری جدی اور خاندانی میراث ہے مرتے ہی ہم بہشت میں داخل ہو جائیں گے اور مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں کہ ہم اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اور جنت ہمارے لیے مخصوص ہے ہمارے اعمال اچھے ہوں یا برے ہر حال میں ہم جنت میں جائیں گے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے کا دارو مدار ایمان اور عمل صالح پر ہے اس لیے مسلمان ہمیشہ اپنی نازیبا افعال و اقوال سے ڈرتے رہتے ہیں بخلاف یہود کے کہ وہ بے دھڑک گناہ کرتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے ہیں۔ "سَیُغْفَرُ لَنَا" یعنی ہم کوئی گناہ کر لیں سب بخشے جائیں گے کسی قسم کی معصیت ہمارے لیے مضر نہیں اور نہ ہم سے کوئی حساب و کتاب ہوگا اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قیامت کے دن ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا اس لیے ہر وقت وہ اپنی کوتاہیوں سے ڈرتے رہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ زندگی اور بڑھ جائے تا کہ گزشتہ تقصیرات کی توبہ اور استغفار سے کچھ تلافی کر سکیں اور کچھ اعمال صالحہ کر کے سفر آخرت کے لیے زاد اور راحلہ تیار کر سکیں۔

موت کی تمنا کا حکم شرعی

احادیث میں بلاضرورت موت کی تمنا کرنے کی یا دنیاوی مصائب سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنے کی ممانعت آئی ہے عمر کا زیادہ ہونا اور توبہ اور اعمال صالحہ کے لیے وقت کا میسر آ جانا ایک نعمت عظمی اور غنیمت کبری ہے البتہ اگر قلب پر لقاء

خداوندی کا شوق غالب ہو تو پھر موت کی تمنا جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ فرطِ شوق سے اس درجہ مغلوب الحال ہو جائے کہ دنیاوی منافع اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور غلبۂ شوق میں اس کو اس کا بھی خیال نہ رہے کہ جس قدر عمر زیادہ ہوگی اسی قدر قرب خداوندی کے اسباب زیادہ حاصل کرسکوں گا اور حضرات صحابہ سے جو اس قسم کی آرزو منقول ہے سو وہ اس وقت میں تھی کہ جب اسباب موت کے سامنے آگئے اور دنیا کی زندگی سے مایوسی ہوگئی اس وقت موت کی فرحت اور مسرت میں کچھ کلمات زبان سے نکلے اور یہ وقت محل بحث سے خارج ہے۔ تفصیل کے لیے تفسیر عزیزی اور تفسیر مظہری کی مراجعت کی جائے اور یہ لوگ موت کی تمنا اور آرزو ہرگز نہیں کرسکتے اس لیے کہ البتہ تحقیق آپ ان کو سب لوگوں سے زیادہ اس فانی زندگی پر حریص پائیں گے حتیٰ کہ ان لوگوں سے بھی زیادہ حریص پائیں گے۔ جو لوگ مشرک اور بت پرست ہیں اور اخروی حیات کے بالکل قائل نہیں دنیوی ہی حیات کو حیات سمجھتے ہیں اور یہود باوجود یہ کہ حیات اخروی اور آخرت کے ثواب اور عقاب کے قائل ہیں ان کا سب سے زیادہ زندگی پر حریص ہونا اس امر کی بین دلیل ہے کہ ان کو اپنے مجرم ہونے کا یقین کامل ہے ہر ایک ان میں سے یہ چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی عمر دی جائے حالانکہ ہزار برس کی عمر دیا جانا بھی اللہ کے عذاب کو دفع نہیں کرسکتا ہزار برس کے بعد پھر موت ہی ہے اور ان لوگوں کو اگر ہزار برس سے بھی زیادہ عمر مل جائے تب بھی کوئی فائدہ نہیں جس قدر ان کی عمر زیادہ ہوگی اسی قدر ان کا کفر زیادہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے کہ دم بہ دم کفر اور معصیت میں اضافہ ہو رہا ہے ان کے حق میں تخفیف عذاب کی کوئی صورت نہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

تو کہدے جو کوئی ہووے دشمن جبریل کا سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے کہ سچا بتانے والا ہے اس کلام کو جو اسکے پہلے ہے

تو کہہ جو کوئی ہوگا دشمن جبریل کا سو اس نے اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے سچ بتاتا اس کلام کو جو اس کے آگے ہے

وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ

اور راہ دکھاتا ہے اور خوش خبری سناتا ہے ایمان والوں کو جو کوئی ہووے دشمن اللہ کا اور اسکے فرشتوں کا اور اسکے پیغمبروں کا اور جبریل

اور راہ دکھاتا اور خوشی سناتا ایمان والوں کو جو کوئی ہوگا دشمن اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل کا

وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا ف ۱

اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔

شانِ نزول

قَالَ تَعَالٰی: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ ... الی ... فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾

ف ۱ یہود کہتے تھے کہ "جبرئیل فرشتہ اس نبی کے پاس وحی لاتا ہے اور وہ ہمارا دشمن ہے۔ ہمارے اگلے بڑوں کو اس سے بہت تکلیفیں پہنچی۔ اگر جبرئیل کے بدلے اور فرشتہ وحی لائے تو ہم محمد ﷺ پر ایمان لائیں" اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرشتے جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے حکم سے کرتے ہیں اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتے جو ان کا دشمن ہے اللہ بے شک ان کا دشمن ہے۔

ان آیات میں یہود کے نہ ایمان لانے کے لیے ایک خاص بہانہ کو ذکر کر کے اس کا رد فرماتے ہیں وہ یہ کہ ہم قرآن پر اس لیے ایمان نہیں لاتے کہ اس کو جبریل لے کر آتے ہیں اور وہ ہمارے دشمن ہیں وہی ہم پر ہمیشہ اللہ کا عذاب لے کر آتے ہیں اس لیے ہم ان کی بات نہیں مانیں گے، البتہ میکائیل ہمارے دوست ہیں جو رحمت اور بارش کے فرشتہ ہیں وہ اگر وحی لے کر آتے تو ہم مان لیتے اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محمد ﷺ اگر یہودی یہ کہیں کہ ہم قرآن کو اس لیے نہیں مانتے کہ وہ جبریل کے واسطہ سے نازل ہوا ہے اور جبریل ہمارے دشمن ہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کو ہمارے پوشیدہ اسرار سے مطلع کرتے ہیں اور اس سے پہلے بھی جس قدر بلائیں اور مصیبتیں اور احکام شاقہ نازل ہوئے وہ سب جبریل ہی لے کر آئے اس لیے ہم قرآن کو نہیں مانتے بخلاف توریت کے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو بلاواسطہ عنایت ہوئی۔ تو آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہو وہ درحقیقت اللہ کا دشمن ہے اس لیے کہ جبریل نے اس قرآن کو آپ کے قلب پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے جس میں جبریل کا کوئی دخل اور اختیار نہیں وہ تو محض سفیر یعنی ایلچی ہیں تم تو اس پر نظر کرو کہ نازل کرنے والا کون ہے۔ حق جل شانہ اگر بجائے جبریل کے یہ کام میکائیل کے سپرد فرماتے تو وہ بھی یہی کرتے۔

او بجز نائی و ما جز نی نیم

نیز اس قرآن کے اوصاف پر نظر ڈالو کہ وہ کیسا ہے سو اس میں تین صفتیں ہیں، اول یہ کہ وہ تمام پچھلی کتابوں کا تصدیق کرنے والا ہے لہٰذا قرآن کریم کی تصدیق تمام کتب الٰہیہ کی تصدیق ہے اور اس کی تکذیب تمام کتب الٰہیہ کی تکذیب ہے۔ دوم یہ کہ وہ خدا تک پہنچنے کا سیدھا راستہ بتلاتی ہے اور سیدھا راستہ تو اگر دشمن بھی بتائے تو اسے فوراً قبول کرنا چاہیے۔ سوم یہ کہ یہ کتاب اہل ایمان کے لیے جو خداوند ذوالجلال کے لقاء کے مشتاق اور متمنی ہیں، ایک عظیم بشارت ہے۔ پس اب تم ہی بتلاؤ کہ جو فرشتہ تمہارے لیے خداوند ذوالجلال کی طرف سے ہدایت کے الوان نعمت کا خوان لے کر آیا ہو اور پھر محبین اور مشتاقین کے لیے ساتھ ساتھ خوشخبری بھی لے کر آیا ہو وہ کمال محبت اور غایت الفت کا مستحق ہے یا دشمنی اور عداوت کا، افسوس ان لوگوں نے نہ اللہ کے پیغام ہدایت کو قبول کیا اور نہ بشارت میں داخل ہوئے یہ نہ سمجھا کہ اللہ کے فضل کو لے کر آنے والے سے دشمنی کرنا اللہ سے دشمنی کرنا ہے اور جو شخص اللہ کا دشمن ہو اور اس کے فرشتوں اور پیغمبروں کا اور خاص کر جبریل اور میکائیل کا تو اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمام کافروں کا دشمن ہے لہٰذا جو شخص جبریل کا دشمن ہوگا وہ خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کا دوست کیسے ہو سکتا ہے سب اللہ کے حکم کے تابع ہیں، جو شخص بھی ان میں سے کسی سے عداوت رکھے وہ کافر ہے اور اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے دوستوں سے دشمنی کرنا اللہ سے لڑائی مول لینا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب یہودیوں نے یہ کہا کہ جبریل ہمارے دشمن ہیں اور میکائیل ہمارے دوست ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ سوال کیا کہ یہ بتلاؤ کہ جبریل علیہ السلام اور میکائیل کو بارگاہ خداوندی میں کیا مرتبہ اور کس درجہ کا قرب حاصل ہے یہود نے کہا کہ جبرئیل اللہ کے دائیں جانب ہیں اور میکائیل بائیں جانب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا پس خدا کی قسم یہ ناممکن ہے کہ جبریل، میکائیل کے دشمن ہوں اور یہ بھی ناممکن ہے کہ میکائیل جبرئیل کے دشمنوں سے دوستی اور صلح کریں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب ان دونوں کو خدا سے یہ قرب ہے تو یہ نا ممکن ہے کہ یہ دونوں آپس میں دشمن ہوں (کذا فی الدر المنثور: ۱؍۹۰)

نکتہ:...... کسی کلام کے نازل ہونے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کلام اول کان پر پہنچے اور پھر کان سے دل تک پہنچے یہ طریقہ عام اور متعارف ہے۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ اول دل پر اترے اور لفظ اور معنی سب سے پہلے دل میں اتریں اور پھر دل سے کان اور زبان پر پہنچیں۔ یہ طریقہ اہل اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن کریم کا نزول نبی اکرم ﷺ پر اسی طریق پر ہوتا تھا اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کو قرآن کے یاد کرنے اور بار بار پڑھنے کی حاجت نہ ہوتی تھی بلکہ ایک ہی مرتبہ سن کر آپ کو یاد ہو جاتا تھا۔ اس لیے ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ فرمایا۔ بخلاف امت کے کہ ان کو قرآن۔ معروف اور معتاد طریقے سے پہنچا ہے کہ اول کانوں سے سنا پھر دلوں تک پہنچا۔

نیز نزول وحی کی حالت میں حواس ظاہری بالکل معطل ہو جاتے ہیں اور بے خودی طاری ہو جانے کی وجہ سے حواس ظاہری اپنا کام نہیں کرتے اس لیے ایسی حالت میں الفاظ وحی کا تمام تر ورود اور نزول قلب ہی پر ہوتا ہے جس طرح انسان خواب میں الفاظ بھی سنتا ہے مگر ان الفاظ کا اصل مدرک قلب ہی ہوتا ہے اس لیے کہ خواب کی حالت میں حواس ظاہری ان کے معطل ہو جاتے ہیں یا قلب پر نازل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرآن آپ کے قلب میں ایسا محفوظ ہو جاتا ہے کہ پھر آپ اس کو بھولتے نہیں اور نہ آپ کو اس کی مراد اور معنی میں کوئی اشتباہ لاحق ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝۹۹ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا

اور ہم نے اتاریں تیری طرف آیتیں روشن اور انکار نہ کریں گے ان کا مگر وہی جو نافرمان ہیں، کیا جب کبھی باندھیں گے

اور ہم نے اتاریں تیری طرف آیتیں واضح اور منکر نہ ہوں گے ان سے مگر وہی جو بے حکم ہیں کیا اور جس بار باندھیں گے ایک اقرار

عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۰ وَلَمَّا جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ

کوئی قرار تو پھینک دے گی اس کو ایک جماعت ان میں سے بلکہ ان میں اکثر یقین نہیں کرتے ف۱ اور جب پہنچا انکے پاس رسول

پھینک دے گی اس کو ایک جماعت ان میں سے بلکہ وہ اکثر یقین نہیں کرتے اور جب پہنچا ان کو رسول

عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ

اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو انکے پاس ہے تو پھینک دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے کتاب اللہ کو

اللہ کی طرف سے سچ بتاتا ان پاس والی کو پھینک دی ایک جماعت نے کتاب پانے والوں میں کتاب اللہ کی اپنی پیٹھ

ف۱ یعنی ان کی عادت قدیم ہے کہ جب اللہ یا رسول یا کسی شخص سے کوئی عہد مقرر کرتے ہیں تو انہی میں کی ایک جماعت اس عہد کو پس پشت ڈال دیتی ہے بلکہ بہت یہودی ایسے ہیں جو توریت پر ایمان ہی نہیں رکھتے ایسوں کی عہد شکنی میں کیا باک ہو سکتا ہے۔

ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ

اپنی پیٹھ کے پیچھے گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ف۱ اور پیچھے ہو لئے اس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی بادشاہت کے وقت ف۲

کے پیچھے گویا کہ ان کو معلوم نہیں اور پیچھے لگے ہیں اس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان سلطنت میں سلیمان کی

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى

اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو اور اس علم کے پیچھے ہو لئے جو اترا دو

اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن شیطانوں نے کفر کیا لوگوں کو سکھاتے سحر اور اس علم کو جو اترا دو

الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ

فرشتوں پر شہر بابل میں جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے اور نہیں سکھاتے تھے وہ دونوں فرشتے کسی کو جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو

فرشتوں پر بابل میں ہاروت اور ماروت پر اور وہ نہ سکھاتے کسی کو جب تک نہ کہتے کہ ہم تو ہیں

فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ

آزمائش کے لئے ہیں سو تو کافر مت ہو پھر ان سے سیکھتے وہ جادو جس سے جدائی ڈالتے ہیں مرد میں اور اسکی عورت میں اور وہ اس سے

آزمانے کو سو تو مت کافر ہو پھر ان سے سیکھتے جس چیز سے جدائی ڈالتے مرد میں اور اس کی عورت میں اور وہ اس سے

بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ

نقصان نہیں کر سکتے کسی کا بغیر حکم اللہ کے اور سیکھتے ہیں وہ چیز جو نقصان کرے ان کا، اور فائدہ نہ کرے اور وہ

بگاڑ نہیں سکتے کسی کا بغیر اذن اللہ کے اور سیکھتے ہیں جس سے ان کو نقصان ہے اور نفع نہیں اور

عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۭ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ

خوب جان چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ اور بہت ہی بری چیز ہے جسکے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپکو اگر

جان چکے ہیں کہ جو کوئی اس کا خریدار ہو اس کو آخرت میں نہیں کچھ حصہ اور بہت بری چیز ہے جس پر بیچا اپنی جانوں کو اگر

كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا

ان کو سمجھ ہوتی، اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تو بدلہ پاتے اللہ کے ہاں سے بہتر اگر ان کو

ان کو سمجھ ہوتی اور اگر وہ یقین لاتے اور پرہیز رکھتے تو بدلہ تھا اللہ کے ہاں سے بہتر اگر ان کو

ف۱ رسول سے مراد حضرت محمد ﷺ اور ما معہم سے مراد توریت اور کتاب اللہ سے بھی توریت مراد ہے۔ یعنی جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ حالانکہ وہ توریت وغیرہ کتب کے مصدق تھے تو یہود کی ایک جماعت نے خود توریت کو پس پشت ایسا ڈال دیا کہ گویا جانتی ہی نہیں کہ یہ کیا کتاب ہے اور اس میں کیا کیا حکم ہیں۔ سو انکو جب اپنی ہی کتاب پر ایمان نہیں تو ان سے آگے کو کیا امید کی جائے۔

ف۲ یعنی ان احمقوں نے کتاب الٰہی تو پس پشت ڈالی اور شیطانوں سے جادو سیکھا اور اسکی متابعت کرنے لگے۔

يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۲

سمجھ ہوتی ف۱

سمجھ ہوتی۔

شناعت بست ویکم (۲۱)

قال تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ... الی... لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾

اور آپ کی نبوت فقط قرآن پر موقوف نہیں کہ جس کے متعلق یہ بہانہ کر دیا کہ قرآن تو جبریل لے کر آئے ہیں جو ہمارے دشمن ہیں بلکہ البتہ تحقیق ہم نے آپ کی نبوت ورسالت کے ثابت کرنے کے لیے نہایت واضح اور روشن دلائل نازل کیے جن میں کسی قسم کا اشتباہ اور التباس نہیں اور نہ ان میں جبریل کا توسط ہے پس اگر قرآن کو دلیل نبوت نہیں سمجھتے کہ جبریل سے دشمنی ہے تو ان آیات بینات کا تمہارے پاس کیا جواب ہے جن میں جبریل امین کا واسطہ نہیں اور ان کو خود بھی معلوم ہے مگر عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ ابن صوریا یہودی نے ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ سے کہا کہ تم اپنی نبوت ورسالت کی کوئی ایسی نشانی نہیں لاتے جسے ہم بھی پہچانیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی (رواہ ابن ابی حاتم) اور مطلب یہ ہے کہ آپ کی نبوت کی ایک نشانی نہیں بلکہ صدہا نشانیاں موجود ہیں اور ان آیات بینات کا نہیں انکار کرتے مگر وہ لوگ جو حد ہی سے گزر گئے ہیں اور مقتضاء عقل ونقل دونوں ہی کو خیر باد کہہ چکے ہیں کیا یہ لوگ اپنے فسق کے منکر ہیں حالانکہ ان کی عادت مستمرہ یہ رہی ہے کہ جب کبھی ان لوگوں نے کوئی عہد و پیمان کیا ہے تو ایک فریق نے تو اس کو بالکل پس پشت ہی ڈال دیا ہے حالانکہ نقض عہد عقلاً وشرعاً ہر طرح قبیح اور مذموم ہے اور فقط بدعہدی ہی نہیں بلکہ اکثر تو ان میں سے توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے اور توریت میں جو حضور ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا اس کو واجب العمل نہیں سمجھتے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ بدعہدی تو ادنیٰ درجہ کی چیز ہے بہت سے تو توریت ہی پر ایمان نہیں رکھتے اور جب توریت ہی کو واجب الایمان اور واجب العمل نہیں سمجھتے تو بدعہدی کرنے کو وہ کیا گناہ سمجھیں گے۔ اب آئندہ آیت میں ایک خاص عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں اور جب ان کے پاس ایک عظیم الشان رسول آیا یعنی محمد رسول اللہ ﷺ جس کو وہ پہچانتے تھے کہ یہ رسول اللہ کی طرف سے ہے انبیاء سابقین کی بشارتیں اور اس رسول کے معجزات اس کے صدق پر شاہد تھے اور پھر اس کے علاوہ وہ پیغمبر اس کتاب کی تصدیق بھی کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے مثلاً توریت اور زبور جس میں نبی آخر الزمان کی خبر دی گئی ہے مگر

ف۱ خلاصہ یہ کہ یہود اپنے دین اور کتاب کا علم چھوڑ کر علم سحر کے تابع ہو گئے اور سحر لوگوں میں دو طرف سے پھیلا۔ ایک حضرت سلیمانؑ کے عہد میں۔ چونکہ جنات اور آدمی ملے جلے رہتے تھے تو آدمیوں نے شیطانوں سے سحر سیکھا اور نسبت کر دیا حضرت سلیمانؑ کی طرف کہ "ہم کو انہی سے پہنچا ہے اور انکو حکم جن اور انس پر اسی کے زور سے تھا"۔ سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "یہ کام کفر کا ہے سلیمان کا نہیں"۔ دوسرے پھیلا ہاروت ماروت کی طرف سے وہ دو فرشتے تھے شہر بابل میں بصورت آدمی رہتے تھے ان کو علم سحر معلوم تھا۔ جو کوئی طالب اس کا جاتا اول اس کو روک دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا اس پر بھی باز نہ آتا تو اس کو سکھا دیتے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے ذریعے سے بندوں کی آزمائش منظور تھی سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے علموں سے آخرت کا کچھ نفع نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے اور دنیا میں بھی ضرر ہے اور بغیر حکم خدا کے کچھ نہیں کر سکتے اور علم دین اور علم کتاب سیکھتے تو اللہ کے ہاں ثواب پاتے۔

بادجوداس کے اہل کتاب کے ایک فریق نے کتاب اللہ یعنی توریت کو پس پشت ڈالا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ اللہ کی کتاب میں کیا لکھا ہوا ہے اور یا یہ معنی ہیں کہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے غرض یہ کہ یہود نے اللہ کی کتاب کو تو پس پشت ڈال دیا جس کی انبیاء کرام تلاوت کرتے تھے اور اُن منتروں کے پیچھے ہو لیے جن کی شیاطین الانس والجن حضرت سلیمان کے دور حکومت میں تلاوت کیا کرتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت چونکہ عام تھی جن اور انس چرند اور پرند سب ان کے زیر حکم تھے اس لیے شیاطین اور جنات اور آدمی سب ملے جلے رہتے تھے۔ شیطانوں نے آدمیوں کو جادو سکھا رکھا تھا اور معاذ اللہ یہ سلیمان علیہ السلام کے حکم سے ہرگز ہرگز نہ تھا اس لیے کہ یہ کام کفر کا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے کبھی کسی قسم کا کفر نہیں کیا نہ عملی اور نہ اعتقادی اور نہ قبل النبوۃ اور نہ بعد النبوۃ اس لیے کہ وہ تو اللہ کے پیغمبر تھے کفر کے مٹانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے سحر کو سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کرنا سراسر افتراء ہے۔ یہود چونکہ سحر کو سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کرتے تھے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی برات ظاہر فرمادی لیکن شیاطین نے از خود یہ کفر کا کام کیا کہ لوگوں کو سحر کی تعلیم دینے لگے۔ یہود یہ کہتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے نبی نہ تھے بلکہ ساحر اور جادوگر تھے۔ اس کے زور سے جنات اور آدمیوں اور ہوا پر حکومت کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ یہ کام کفر کا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے کبھی یہ کام نہیں کیا اس لیے کہ نبی معصوم ہوتا ہے اس سے کفر کا صادر ہونا ناممکن ہے نبی تو کفر اور شرک کے مٹانے کے لیے آتا ہے نہ کہ کرنے کے لیے اور علاوہ ازیں یہود اس سحر کا بھی اتباع اور پیروی کرتے تھے جو کہ شہر بابل میں دو فرشتوں پر ایک خاص حکمت کی بناء پر نازل کیا گیا تھا جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا وہ حکمت یہ تھی کہ لوگ سحر اور معجزہ اور کرامت میں فرق معلوم کریں تاکہ پیغمبر اور جادوگر میں کوئی التباس اور اشتباہ نہ ہو کیوں کہ ظاہراً معجزہ کی طرح سحر بھی خارق عادت ہے اس لیے حق تعالیٰ نے دو فرشتے بصورت انسان بابل میں اتارے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت سمجھائیں تاکہ لوگوں کو سحر اور معجزہ میں کوئی اشتباہ پیش نہ آئے اور چونکہ مقصود یہ تھا۔ اس لیے یہ دونوں فرشتے کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ جز ایں نیست کہ ہم تو مخلوق کے لیے فتنہ اور آزمائش ہیں کہ کون سحر سیکھ کر کفر اور معصیت میں مبتلا ہوتا ہے اور کون اس کی حقیقت اور قباحت کو معلوم کرنے اس سے احتیاط اور پرہیز کرتا ہے سو دیکھو اس کو سیکھ کر کفر کا کام نہ کرنا یعنی سحر نہ کرنا اس سے ایمان جاتا رہے گا لیکن اس کے بعد بھی بعض لوگ ان سے وہ باتیں سیکھتے جن سے میاں اور بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالتے اور یہ سمجھتے کہ یہ چیزیں بدون اللہ کی مشیت کے ضرر پہنچاتی ہیں اور یہ امر یقینی ہے کہ یہ جادوگر اس سحر کے ذریعہ سے کسی کو بھی بغیر اللہ کی مشیت اور ارادہ کے ذرہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے سحر میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے تو اعمال کی تاثیر کو بند کر دیتا ہے اور سحر کو بے اثر بنا دیتا ہے اور اگر بالفرض والتقدیر سحر میں کوئی کفر اور شرک بھی نہ ہوتا تب بھی عقل کا مقتضیٰ یہی تھا کہ سحر سے احتراز کرتے کیونکہ یہ ایسے علم کو سیکھ رہے ہیں جو دنیا اور آخرت میں ان کے لیے ضرر رساں ہے اور اگر بالفرض مضر نہ ہو تو نافع بھی نہیں اور عاقل کا کام یہ ہے کہ جو چیز نقصان دے اور نفع نہ دے اس سے احتراز کرے اور ان کا سحر میں یہ اشتغال اور انہماک لاعلمی اور نادانی کی بنا پر نہیں کہ اس کے ضرر سے بے خبر ہوں البتہ خدا کی قسم ان کو خوب معلوم ہے کہ جو کفریات کو خریدے گا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا البتہ بہت ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنی جانوں کو

فروخت کرڈالا کاش اس بات کو جانتے کہ ہم سعادت ابدیہ کو فروخت کر کے شقاوت ابدیہ کو خرید رہے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہود نے اپنے دین اور کتاب کے علم کو تو پس پشت ڈال دیا اور علم سحر کے پیچھے ہو لیے اور سحر کا علم لوگوں میں دو طرف سے پھیلا ایک تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں چونکہ جنات اور انسان آپس میں ملے جلے رہتے تھے اس لیے آدمیوں نے جنات اور شیاطین سے سحر سیکھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کر دیا کہ یہ سحر ہم کو انہی سے پہنچا اور اسی کے زور سے حضرت سلیمان علیہ السلام جنات اور ہوا پر حکومت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ یہ کام کفر کا ہے سلیمان علیہ السلام نے کبھی نہیں کیا۔ ان کے زمانہ میں شیطانوں نے آدمیوں کو سکھایا ہے۔ دوسرے ہاروت اور ماروت کی طرف سے پھیلا کہ وہ دو فرشتے تھے۔ انسان کی شکل میں شہر بابل میں رہتے تھے ان کو علم سحر معلوم تھا جو کوئی ان سے جادو سیکھنا چاہتا وہ پہلے ہی اس سے کہہ دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا لیکن جب وہ اصرار کرتا تو سکھا دیتے اور صاف کہہ دیتے کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے ایسے علم سے آخرت میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ دنیا اور آخرت دونوں ہی میں نقصان ہے بغیر اللہ کے حکم کے کچھ نہیں کر سکتے اگر علم دین سیکھتے تو اللہ کے یہاں ثواب پاتے اور اب بھی اللہ تعالیٰ نے ان پر توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا جیسا کہ آئندہ ارشاد فرماتے ہیں۔

اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور بجائے سحر کے اللہ کی کتاب کا اتباع کرتے اور علم سحر اور کتب سحر اور مضر اور بے فائدہ علوم سے پرہیز کرتے جیسے اس زمانہ میں ناول اور باتصویر رسالے جو تخریب اخلاق میں جادو کا اثر رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جو بدلا ملے اگرچہ وہ تھوڑا ہو دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے چہ جائیکہ سحر میں بطور مزدوری برائے نام کچھ مل جائے کاش ان کو اتنی عقل ہوتی تو سمجھتے کہ دنیا کے تمام منافع آخرت کے ایک نفع کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

فائدہ: ...... شیاطین جس سحر کی تعلیم دیتے تھے وہ صریح کفر اور شرک تھی۔ ارواح کو خدا تعالیٰ کے برابر جانتے تھے اور ان کے لیے وہ افعال اور تاثیرات ثابت کرتے تھے جو باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان کی مدح میں ایسے منتر پڑھتے تھے کہ جیسے خدا تعالیٰ کی عموم علم اور احاطہ قدرت اور غایت عظمت و جلال ظاہر کرنے کے لیے حمد و ثناء کے کلمات پڑھے جاتے ہیں اور فرشتوں کی تعلیم میں یہ بات نہ تھی، نہایت احتیاط کے ساتھ تعلیم دیتے تھے اور ساتھ ساتھ نصیحت کرتے تھے اور کفر کرنے سے منع کرتے تھے ان کا مقصد حقیقت سحر کو واضح کرنا تھا تاکہ نبی اور متنبی میں اشتباہ نہ ہو اور سحر اور معجزہ کا فرق معلوم ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مؤثر حقیقی سوائے باری تعالیٰ کے کوئی نہیں اور شیاطین کا مقصد اغواء اور اضلال تھا۔

قصۂ ہاروت و ماروت: ...... تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر اور در منثور میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور مجاہد اور قتادہ وغیرہم سے منقول ہے کہ جب ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں اولاد آدم کے برے اعمال کے دفتر کے دفتر آسمان پر جانے لگے تو فرشتوں نے بنی آدم کے حق میں تحقیر اور طعن آمیز کلمات کہے کہ یہ کیسے بندے ہیں کہ اپنے مالک حقیقی کی نافرمانی کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا میں نے بنی آدم کے خمیر میں غصہ اور شہوت رکھا ہے اس لیے ان سے گناہ ہوتے ہیں اگر تم میں بھی قوت شہویہ اور قوت غضبیہ رکھ دوں اور زمین پر اتار دوں تو بھی ایسے ہی گناہوں میں مبتلا ہو گے۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار ہم ہرگز تیرے گناہ کے پاس بھی نہ جائیں گے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا تم اپنے میں سے دو شخصوں کو منتخب کر لو۔ فرشتوں نے ہاروت اور ماروت کو جو فرشتوں میں کمال عبادت میں مشہور اور ممتاز تھے منتخب کیا۔ حق تعالیٰ نے قوت شہویہ اور

غضبیہ کو ان میں پیدا کر کے حکم دیا کہ زمین پر جاؤ اور لوگوں کے مقدمات میں عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔ اور شرک اور خون ناحق اور زنا اور شراب سے پرہیز کرنا۔ حسب ارشاد خداوندی دونوں فرشتے آسمان سے زمین پر اترے صبح سے لے کر شام تک قضاء کے کام میں مصروف رہتے اور جب شام ہوتی تو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلے جاتے ایک مہینہ اسی حالت میں گزرا کہ ایک امتحان خداوندی پیش آیا کہ ایک عورت مسماۃ زہرہ جو حسن و جمال میں شہرہ آفاق تھی اس کا مقدمہ ان کے اجلاس میں پیش ہوا یہ دونوں فرشتے اس عورت کے حسن و جمال کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گئے اور اس کو پھسلانا شروع کیا۔ اس عورت نے انکار کیا اور کہا کہ جب تک تم بت پرستی اختیار نہ کرو اور میرے خاوند کو قتل نہ کرو اور شراب نہ پیؤ میں تمہارے پاس نہیں آسکتی آپس میں دونوں نے مشورہ کیا کہ شرک اور قتل ناحق تو بہت بڑے گناہ ہیں اور شراب پینا اس درجہ کی معصیت نہیں اس لیے اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔ غرض یہ کہ اس عورت نے پہلے ان کو شراب پلائی اور پھر بت کو سجدہ کرایا اور پھر شوہر کو قتل کرایا اور ان سے اسم اعظم سیکھا اور پھر ان کے ساتھ ہم بستر ہوئی بعد ازاں وہ عورت اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی اور اس کی روح زہر ستارہ کی روح کے ساتھ جا ملی اور اس کی صورت زہرہ کی صورت ہو گئی اور وہ فرشتے اسم اعظم بھول گئے۔ اس لیے آسمان پر نہ جاسکے جب ہوش میں آئے نہایت نادم ہوئے اور ادریس علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا اور استغفار کی درخواست کی۔ اور بارگاہ خداوندی میں شفاعت کے خواستگار ہوئے۔ بارگاہ الٰہی سے یہ حکم آیا کہ عذاب تو تم کو ضرور ہوگا لیکن اس قدر تخفیف کی جاتی ہے کہ تم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ دنیوی اور اخروی عذاب سے جس کو چاہو اختیار کر لو فرشتوں نے دنیاوی عذاب کو سہل اور آسان سمجھا کہ یہاں کا عذاب تو عنقریب منقطع ہو جائے گا اس لیے اس کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ وہ اللہ کے حکم سے بابل کے کنویں میں الٹے لٹکا دیئے گئے اور وہیں ان کو آگ سے عذاب دیا جارہا ہے پھر جو کوئی ان کے پاس جادو سیکھنے جاتا ہے وہ اول تو اس کو سمجھا دیتے ہیں اور جب اصرار کرتا ہے تو اس کو سکھا دیتے ہیں۔ (قصہ ختم ہوا)

تحقیق:...... ہاروت ماروت کا جو قصہ نقل کیا گیا اس میں علماء کے دو فریق ہیں ایک فریق یہ کہتا ہے کہ یہ قصہ سرتاپا موضوع ہے اور یہود کا من گھڑت قصہ ہے اور انہی کی کتابوں سے ماخوذ ہے حضرات محدثین اس قصہ کو باعتبار روایت کے غیر معتبر قرار دیتے ہیں اور حضرات متکلمین باعتبار روایت کے اس کو غیر معتبر کہتے ہیں۔ قاضی عیاض اور امام رازی نے اس قصہ کا شدومد سے انکار کیا ہے اس لیے کہ یہ قصہ اصول دین کے خلاف ہے۔

(۱) اول یہ کہ فرشتے معصوم ہیں ان سے گناہ کا صدور عصمت کے منافی ہے۔

(۲) دوم یہ کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہیں تو ان کو فرصت کہاں سے ملی کہ لوگوں کو جادو سکھلائیں نیز تعلیم و تعلم کے لیے اختلاط شرط ہے جو محبوس ہونے کی وجہ سے مفقود ہے۔ ان کو لوگوں سے اختلاط کیسے میسر ہوا۔

(۳) سوم یہ کہ ایک فاحشہ اور بدکار عورت کا دھوکہ سے اسم اعظم سیکھ کر آسمان پر چڑھ جانا سراسر غیر معقول ہے۔ اسماء الٰہی کے لیے تقویٰ اور طہارت شرط ہے۔

(۴) چہارم یہ کہ مسخ اور تبدیل صورت عقوبت کے لیے ہوتا ہے اور عقوبت کے لیے تحقیر اور اہانت لازم ہے اور آسمان پر پہنچ کر ستارہ بن جانے میں نہ کوئی عقوبت ہے اور نہ کوئی تحقیر اور اہانت ہے۔

(۵) پنجم یہ کہ زہرہ تو ایک مشہور ستارہ ہے جو ابتداء آفرینش عالم سے موجود ہے اور اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کو مسخ کر کے زہرہ ستارہ بنا دیا گیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ستارہ اس واقعہ کے بعد میں وجود میں آیا اور اس واقعہ سے پہلے یہ ستارہ موجود نہ تھا اور یہ سراسر غیر معقول ہے ان وجوہ کی بناء پر ان علماء نے اس قصہ کا انکار کیا لیکن جلال الدین سیوطی اور ملا علی قاری وغیرہم فرماتے ہیں کہ اس بارے میں روایات مرفوعہ اور آثار صحابہ اسانید صحیحہ کے ساتھ اس قدر کثرت سے آئے ہیں کہ جن کا انکار ناممکن ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ بے اصل نہیں۔ انتہی۔ لہٰذا اس قصہ کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں توقف اور سکوت مناسب ہے اور جن حضرات مفسرین نے اس قصہ کو ذکر کیا ہے ان پر تشنیع اور نازیبا کلمات سے انکا ذکر کرنا سراسر خلاف ادب ہے بہت سے اکابر محدثین اور مفسرین نے بغرض تحقیق و تنقیح اپنی کتابوں میں رطب و یابس کو جمع کیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ اس قصہ کے بارے میں جس قدر روایتیں آئی ہیں اگر تتبع کر کے ان تمام روایات کو جمع کیا جائے تو ان کا قدر مشترک حد تواتر کو پہنچ جاتا ہے اگرچہ واقعہ کی خصوصیات میں اختلاف ہو لیکن جو قدر مشترک حد تواتر کو پہنچ چکا ہے اس کا انکار دشوار ہے انفرادی طور پر اگرچہ ہر طریق اور ہر سند ضعیف اور واہی ہو لیکن ضعیف روایتوں کا تواتر بھی ترجیح صدق کا موجب ہوتا ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ بجائے انکار اور تکذیب کے قصہ کی کوئی مناسب توجیہ کی جائے جس سے اصول دین کی مخالفت باقی نہ رہے۔

(۱) وہ توجیہ یہ ہے کہ فرشتوں کی عظمت اس وقت تک ہے جب تک فرشتے اپنی اصلی حالت اور اصلی حقیقت پر رہیں اور جب ان میں بھی کسی حکمت اور مصلحت سے شہوت اور غضب کی کیفیت پیدا کر دی گئی تو وہ خالص فرشتے نہ رہے اس لیے اب ان کے لیے عصمت بھی لازم اور ضروری نہ ہوگی۔

(۲) نیز عذاب اور گرفتاری کی حالت میں تعلیم سحر کا جاری رہنا محال تو کیا مستبعد بھی نہیں۔ کیا جیل خانہ میں رہ کر افادہ اور استفادہ ممکن نہیں۔ ایک حاذق طبیب اگر اس کے ہوش و حواس سالم ہوں تو ہماری بیماری کی حالت میں بھی علم کی تعلیم دے سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کی قوت ادراکیہ انسان کی قوت ادراکیہ سے کہیں اکمل اور اتم ہے عذاب اور گرفتاری کی حالت ان کے لیے تعلیم سے مانع نہیں ہو سکتی خصوصاً جبکہ غیب سے ان کو مدد بھی پہنچتی ہو کیونکہ آسمان سے اس تعلیم کے لیے اتارے گئے تھے، جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے کہ ہر سال ان کے پاس ایک شیطان جاتا ہے اور تازہ سحر سیکھ کر آتا ہے اور لوگوں میں پھیلاتا ہے جس شخص کو کسی علم کا ملکہ ہوتا ہے تو وہ بیماری اور لاچاری کی حالت میں اس علم کی تعلیم دے سکتا ہے اور بسبب مزاولت اور ممارست اور بوجہ ملکۂ مہارت اس کو تعلیم و تلقین میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

(۳) نیز وہ عورت اگرچہ بدکار تھی لیکن مقصود اس کا قرب الٰہی کو حاصل کرنا تھا اپنے حسن و جمال کو اسم اعظم کے معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا، خرابی جو کچھ تھی وہ ذریعہ اور وسیلہ میں تھی، اصل مقصد میں کوئی قبح نہ تھا حسن نیت کی برکت سے کامیاب ہوئی۔

(۴) اور جس طرح بغرض ابتلاء فرشتے بشکل بشر بنا کر آسمان سے زمین پر اتارے گئے اسی طرح ایک ستارہ کی

روح ایک حسین وجمیل عورت کی شکل میں ہاروت اور ماروت کی عصمت کے امتحان کے لیے نمودار ہوئی اور امتحان ہو جانے کے بعد اصلی صورت کی طرف لوٹ گئی، یعنی صورت بشریہ سے صورت کوکبیہ کی طرف واپس ہوگئی۔ جس طرح جنات مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور پھر اپنی اصلی صورت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔ لہٰذا جن روایات میں اس عورت کا زہرہ ستارہ کی صورت میں مسخ ہونے کا ذکر آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کی روح کا تعلق زہرہ کی روح کے ساتھ کر دیا گیا اور یہ مطلب نہیں کہ یہ ستارہ پہلے ہی سے موجود نہ تھا اور اب اس عورت کے مسخ ہونے کے بعد وجود میں آیا۔

(۵) اور صورت کوکبیہ اگرچہ کتنی ہی شرافت اور عظمت رکھتی ہو لیکن صورت انسانیہ کے اعتبار سے بہت حقیر اور ذلیل ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾

خلاصۂ کلام:...... بعض علماء نے اس قصہ کو اصول دین اور قواعد شریعت کے خلاف سمجھا اس لیے اس کو غیر معتبر قرار دیا اور بعض علماء نے کثرۃ طرق اور کثرۃ اسانید کی بناء پر اس قصہ کا بالکلیہ انکار مناسب نہیں سمجھا۔ بیس سندوں سے زیادہ اس قصہ کا مروی ہونا اس کی خبر دیتا ہے کہ اس قصہ کی اصل ضرور ہے بالکل بے اصل نہیں روایات مختلفہ کا جو قدر مشترک تھا یہ حضرات اس کے قائل ہوئے اور خصوصیات کے بارہ میں توقف اور سکوت کیا اور جو باتیں بظاہر اصول شریعت کے خلاف معلوم ہوتی تھیں ان کی مناسب توجیہ اور تاویل فرمائی اور یہ طریق نہایت اسلم اور معتدل ہے۔ روایت کا دارومدار طرق اور اسانید پر ہے اگرچہ وہ طرق اور اسانید ضعیف اور واہی کیوں نہ ہوں چند ضعفاء کے مل جانے سے بھی ایک گونہ قوت آجاتی ہے اس لیے جو ضعیف حدیث متعدد طرق سے مروی ہو اصطلاح محدثین میں اس کو حسن لغیرہ کہتے ہیں۔ لہٰذا کسی ضعیف روایت کے کثرت طرق اور کثرت اسانید سے یک لخت قطع نظر کر لینا اور اپنی مزعوم درایت کی بناء پر اس روایت کا بالکلیہ انکار کر دینا خود خلاف درایت ہے یہ کیا ضروری ہے کہ جو چیز آپ کے نزدیک خلاف درایت ہے وہ دوسرے عالم کے نزدیک بھی خلاف درایت ہو۔ ممکن ہے کہ آپ کی درایت نے غلطی کی ہو۔ ﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾ "فَوْقَ كُلِّ ذِي فَهْمٍ فَهِيمٌ" اور محض اسرائیلیات میں سے ہونا بھی تکذیب اور انکار کا سبب نہیں بن سکتا الا یہ کہ نصوص کتاب وسنت اور قواعد وشریعت اور اجماع امت کے خلاف ہو حدیث میں ہے "حَدِّثوا عن بني اسرائيل وَلا حرج" (اسرائیلی باتوں کے نقل میں کوئی حرج نہیں)۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ قصہ قطعاً صحیح ہے اور ناظرین بھی اس کو صحیح مانیں میرا مطلب فقط اس قدر ہے کہ بے دھڑک ہو کر روایات کا انکار نہ کریں باقی رہی آیات کی تفسیر تو وہ اس قصہ کے صحیح ہونے پر موقوف نہیں جیسا کہ ناظرین نے تفسیر کو پڑھ کر دیکھ لیا ہوگا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:...... حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ ایک وعظ میں فرماتے ہیں کہ اگر یہ شبہ کیا جائے کہ سحر تو حرام اور کفر ہے باقی اس کا جاننا اور بضرورت شرعی اس کا سیکھنا خصوصاً جبکہ اس پر عمل کرنے کی مخالفت بھی ساتھ ساتھ ہو تو حرام نہیں جیسے سور اور کتے کا گوشت کھانا حرام ہے مگر اس کی خاصیت معلوم کرنا اور اس کو بیان کرنا حرام نہیں۔ فقہاء نے کلمات کفریہ کے لیے ایک مستقل باب رکھا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کن باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے فلسفہ کے بہت سے مسائل کفر ہیں لیکن اس کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ اس کی حقیقت معلوم کر کے اس کا جواب دیا جا سکے۔

ایک اور اشکال اور اس کا جواب:...... رہا یہ اشکال کہ پھر اس کی تعلیم کے لیے فرشتے کیوں نازل کیے گئے۔ انبیاء علیہم السلام ہی سے یہ کام کیوں نہ لے لیا گیا، اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہدایت محضہ کے لیے مبعوث ہوتے ہیں ان کی تعلیم سحر میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص ان سے سیکھنے کے بعد اسی میں مشغول اور مبتلا ہو جائے تو اس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام گمراہی کا سبب بعید بن جاتے جو ان کی شان ہدایت محضہ کے منافی ہے اس لیے حق تعالیٰ نے ان کو ضلالت کا سبب بعید بھی بنانا گوارا نہیں فرمایا بخلاف فرشتوں کے کہ ان سے تشریع اور تکوین دونوں قسم کے کام لیے جاتے ہیں اور تکوین میں جس طرح وہ مسلمانوں کی پرورش اور حفاظت کرتے ہیں اسی طرح وہ کافروں کی بھی پرورش اور حفاظت کرتے ہیں حالانکہ ہمارے لیے شرعاً کافر کی اعانت اور امداد ناجائز ہے انبیاء کرام کے تشریعی نظام سپرد ہوتا ہے اور ملائکہ کے تکوینی نظام سپرد ہوتا ہے اس لیے تعلیم سحر کی خدمت ملائکہ کے سپرد ہوئی کہ اگر وہ اس میں ضلالت کا سبب بن جائیں تو ان کی شان کے خلاف نہ ہوگا اور حضرات انبیاء کے لیے گمراہی کا سبب بعید بننا بھی خلاف شان ہے۔ کذافی تعمیم التعلیم، ص: ۵۱، نمبر ۱۳، از تبلیغ۔

• جس طرح حضرات انبیاء کرام نے یہ بتلایا کہ رشوت حرام ہے مگر رشوت کی حقیقت نہیں بتلائی اسی طرح حضرات انبیاء نے یہ تو بتلا دیا کہ سحر حرام ہے مگر سحر کی حقیقت نہیں بتلائی۔

فائدہ:...... معلوم نہیں کہ بحالت عذاب وہ خود لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے ہیں یا جنات اور شیاطین کے واسطہ سے افادہ اور استفادہ ہوتا ہے واللہ اعلم (روح المعانی)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾

اے ایمان والو تم نہ کہو راعنا اور کہو انظرنا اور سنتے رہو اور کافروں کو عذاب ہے دردناک فـ۱

اے ایمان والو تم نہ کہو راعنا اور کہو انظرنا اور سنتے رہو اور منکروں کو دکھ کی مار ہے۔

شناعت بست و دوم (۲۲)- متضمن بتلقین احباب بآداب خطاب

قَالَ اللہُ تَعَالیٰ: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا... الی... وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں یہود کے اتباع سحر کا ذکر تھا آئندہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سحر کا اتباع یہودیوں کی طبیعتوں میں اس درجہ راسخ اور پختہ ہوگیا ہے کہ ان کی گفتگو اور مخاطب بھی سحر کے اثر سے خالی نہیں۔ جس طرح سحر ایک ملمع سازی اور حقیقت کی پردہ پوشی

فـ۱ یہودی آ کر آپ کی مجلس میں بیٹھتے اور حضرت کی باتیں سنتے۔ بعضی بات جو اچھی طرح نہ سنتے اس کو مکرر تحقیق کرنا چاہتے تو کہتے راعنا (یعنی ہماری طرف متوجہ ہو اور ہماری رعایت کرو) یہ کلمہ ان سے سن کر کبھی مسلمان بھی کہہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ یہ لفظ نہ کہو اگر کہنا ہو تو انظرنا کہو (اس کے معنی بھی یہی ہیں) اور ابتداء ہی سے متوجہ ہو کر سنتے رہو تو مکرر پوچھنا ہی نہ پڑے۔ یہود اس لفظ کو بدنیتی اور فریب سے کہتے تھے اس لفظ کو زبان دبا کر کہتے تو راعینا ہو جاتا (یعنی ہمارا چرواہا) اور یہود کی زبان میں راعنا احمق کو بھی کہتے ہیں۔

ہے اسی طرح ان کا کلام بھی بحر لسانی ہوتا ہے صورت اس کی تعظیم و تکریم ہے اور حقیقت اس کی اہانت اور تحقیر ہے، حقارت پر عظمت کی ملمع کاری کر کے بات کرتے ہیں۔ چنانچہ جب آنحضرت ﷺ سے ہم کلام ہوتے تو "رَاعِنَا" سے خطاب کرتے جس کے ظاہری معنی نہایت عمدہ ہیں کہ آپ ہماری رعایت کیجئے اور ہمارے حال پر توجہ فرمائیے۔ لیکن جن معنی کا وہ ارادہ کرتے وہ نہایت فاسد اور گندہ ہیں۔ یہود یہ لفظ بول کر احمق یا چرواہے کے معنی مراد لیتے۔ بہت سے مسلمانوں کو ان فاسد معنی کا علم نہ تھا انہوں نے یہ سمجھ کر کہ علماء اہل کتاب حضرات انبیاء کے آداب سے بخوبی واقف ہیں جب علماء یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ کلمۂ تعظیم ہے اس لیے مسلمانوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا اس پر آیت نازل ہوئی کہ اے ایمان والو ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تلبیس اور دھوکہ سے بچو اگرچہ تمہارا ارادہ دھوکہ کا نہ ہو تم آنحضرت ﷺ سے خطاب کے وقت رَاعِنَا کا لفظ نہ کہو جس میں فاسد معنی کا ایہام ہے بلکہ اس کے بجائے لفظ انظُرْنَا کہو یعنی ہم پر نظر عنایت فرمائیے اور ہم پر شفقت اور توجہ فرمائیے اور آپ جو ارشاد فرمائیں اس کو نہایت غور سے سنو کہ دوبارہ سوال اور ایسے موہم الفاظ کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئے اور کافروں کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے کہ جو اس قسم کے الفاظ سے رسول اور اہل ایمان کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور رسول کی ایذاء اور تحقیر بلاشبہ کفر ہے۔

ف ۱:...... قرآن کریم میں اٹھاسی جگہ اس امت کے مسلمانوں کو ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے خطاب کیا گیا ہے ان میں سے یہ پہلا موقعہ ہے کتب سابقہ میں صرف انبیاء کو خطاب ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ شرف عطاء فرمایا کہ قرآن کریم میں براہ راست اس امت کو مخاطب بنایا۔ ایک شخص نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ مجھ کو کچھ نصیحت فرمائیے فرمایا کہ جب تو قرآن پڑھے اور ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے خطاب کو سنے تو فوراً اپنے کانوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا اور قلب کو حاضر کرنا کہ اللہ تعالیٰ بلا واسطہ تجھ سے خطاب فرما رہا ہے اور کسی اچھی چیز کا حکم دیتا ہے یا کسی بری چیز سے منع کرتا ہے (رواہ عبداللہ بن احمد فی زوائد المسند والبیہقی فی شعب الایمان)

ف ۲:...... جس لفظ کے استعمال سے فاسد معنی کا ایہام ہوتا ہو اس کا استعمال نہ کرنا چاہیے اگرچہ متکلم کی نیت صحیح ہو۔

ف ۳:...... نبی کی اشارۃً اور کنایۃً تحقیر بھی کفر ہے اس لیے کہ یہود صراحۃً آپ کی تحقیر نہیں کرتے تھے۔ "رَاعِنَا" کہہ کر اشارۃً اور کنایۃً آپ کی تحقیر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو کافر فرمایا۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ

دل نہیں چاہتا ان لوگوں کا جو کافر ہیں اہل کتاب میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو کہ اترے تم پر کوئی نیک بات

دل نہیں چاہتا ان لوگوں کا جو منکر ہیں کتاب والوں میں اور شرک والوں میں یہ کہ اترے تم پر کچھ نیک

مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۱۰۵

تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے ف۱

بات تمہارے رب سے اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی مہر سے جس کو چاہے اور اللہ بڑا فضل رکھتا ہے۔

ف۱ یعنی کفار (یہود ہوں یا مشرکین مکہ) قرآن کے نزول کو تم پر ہرگز پسند نہیں کرتے بلکہ یہود تمنا کرتے ہیں کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل میں پیدا ہوں اور مشرکین

شناعت بست وسوم (۲۳)

قال تعالیٰ: ﴿مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا ... الی ... وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾

شان نزول:...... مسلمانوں نے یہود سے کہا کہ تم محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاؤ، یہودیوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہماری تو دلی خواہش تھی کہ اگر تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر ہوتا تو ضرور اس کو قبول کرتے لیکن تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر ثابت نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب میں یہ آیت نازل فرمائی کہ یہ سب غلط ہے اصل وجہ یہ ہے کہ یہ تم پر حسد کرتے ہیں۔ اور کافر خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین مکہ ذرہ برابر دل سے یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر کوئی خیر نازل کی جائے لیکن ان کے حسد سے کچھ نہیں ہوسکتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کا محکوم نہیں اور اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے جس کو چاہے اپنی رحمت سے مخصوص فرمائے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنی نبوت اور وحی سے سرفراز فرمایا اور اپنے فضل سے آپ کو افضل الانبیاء بنایا اور آپ کے دین کا تمام ادیان سے افضل اور اکمل ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے۔

ف:...... اس جگہ رحمت سے مراد نبوت ہے اور فضل اس احسان اور نکوئی کو کہتے ہیں جو ابتداءً بلا وجہ ہو۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ

جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اسکے برابر کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر

جو موقوف کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو پہنچاتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر

شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ

چیز پر قادر ہے ف۱ کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان اور زمین کی اور نہیں تمہارے واسطے

چیز پر قادر ہے کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کو سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور تم کو نہیں

اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار ف۲

اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مدد والا۔

= مشرکین مکہ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم میں سے ہو مگر یہ تو اللہ کے فضل کی بات ہے کہ امی لوگوں میں نبی آخر الزماں کو پیدا فرمایا۔

ف۱ یہ بھی یہود کا طعن تھا کہ "تمہاری کتاب میں بعض آیات منسوخ ہوتی ہیں، اگر یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہوتی تو جس عیب کی وجہ سے اب منسوخ ہوئی اس عیب کی خبر کیا خدا کو پہلے سے نہ تھی" اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "عیب نہ پہلی بات میں تھا نہ پچھلی میں لیکن حاکم مناسب وقت دیکھ کر جو چاہے حکم کرے اس وقت وہی مناسب تھا اور اب دوسرا حکم مناسب ہے"۔

ف۲ یعنی ادھر تو اللہ کی قدرت و ملکیت سب پر شامل ادھر اس کے اپنے بندوں پر اعلیٰ درجے کی عنایت، تو اب مصالح اور منافع بندوں کی اطلاع اور ان پر قدرت کس کو ہو سکتی ہے۔ اور اس کے برابر بندوں کی خیر خواہی کون کرسکتا ہے۔

شناعت بست و چہارم (۲۴)

قال تعالیٰ: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ ... الی ... مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ﴾

شانِ نزول:...... یہود اور مشرکین بطور طعن یہ کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) اپنے اصحاب کو ایک بات کا حکم دیتے ہیں اور پھر اسی بات سے منع کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ اپنی طرف سے کہتے ہیں اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔ اس قسم کی باتوں سے کافروں کا مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ شک اور شبہ ڈال دیں کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے جو ہم پر نازل ہوا وہ سب خیر ہی خیر ہے تو اس کے منسوخ ہونے کے کیا معنی۔ اگر پہلا حکم خیر تھا تو دوسرا شر ہوگا اور اگر دوسرا حکم خیر ہے تو پہلا حکم شر ہوگا اور وحی الٰہی اور حکم خداوندی کا شر ہونا ناممکن اور محال ہے اس شبہ کے ازالہ کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ نسخ کے معنی تبدیل خیر بالشر کے نہیں۔ یعنی خیر کو شر کے ساتھ بدل دینے کے نہیں تا کہ وحی الٰہی اور خیریت میں منافات لازم آئے بلکہ ناسخ اور منسوخ دونوں ہی خیر ہیں اس لیے کہ ہم جب کبھی کسی آیت کا حکم منسوخ کرتے ہیں کہ اس آیت کے حکم پر عمل نہ کیا جائے اگرچہ اس آیت کی تلاوت باقی رہے یا ہم اس آیت ہی کو ذہنوں سے بھلا دیتے ہیں کہ اس آیت کے الفاظ کو کسی حکمت اور مصلحت کی بناء پر قوت حافظہ سے فراموش کر دیں اگرچہ حکم اس آیت کا برقرار رکھیں کہ اس آیت کے ذہنوں سے نکل جانے کی وجہ سے تلاوت کی عبادت اور لذت تو حاصل نہ کر سکیں اس منسوخ التلاوۃ آیت کے حکم پر عمل کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ بہرحال ہم چاہے کسی آیت کے حکم کو منسوخ کریں یا آیت کو ذہنوں سے بھلائیں نسخ کے بعد اُس آیت منسوخہ یا منسیہ سے کوئی بہتر چیز لاتے ہیں یا اس آیت کے مثل لاتے ہیں یعنی حکم ناسخ حکم منسوخ سے سہولت عمل یا موافقت مصلحت یا کثرۃ ثواب کے اعتبار سے بہتر ہوتا ہے یا برابر۔ کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کو سب اختیار ہے ہر لمحہ اور ہر لحظہ تو اس کے عجائب قدرت اور غرائب مشیت کا مشاہدہ کرتا ہے جیسے مرض کا صحت سے بدلنا اور فقر کا تونگری سے بدلنا اور عزت کا ذلت سے بدلنا اور روشنی کا تاریکی سے بدلنا پس جو ذات ان تغیرات اور تبدلات پر قادر ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ وہ ایک حکم سے دوسرے حکم کو بدل دے اور جس طرح احکام تکوینیہ میں حسب اقتضاء مصلحت تغیر اور تبدل معاذ اللہ جہالت نہیں بلکہ عین حکمت ہے اسی طرح احکام شرعیہ میں بھی باقتضاء زمان ومکان اور باقتضاء طبع تغیر وتبدیل عین حکمت اور عین مصلحت ہے اور الہامی کتابوں میں بھی احکام بدلتے رہے ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو توریت کے بعد انجیل کے نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اس تغیر وتبدل سے اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ پہلے ہی سے یہ سب کچھ اس کے علم میں تھا۔ البتہ اس تغیر اور تبدل سے ہمارے علم میں تغیر ہوتا ہے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو قصور علم کی وجہ سے اس حکم کی مدت معلوم نہ تھی اور قصور فہم کی وجہ سے اس حکم کو دائم اور مستمر سمجھ بیٹھے۔ جب حکم ناسخ نازل ہوا اس وقت اپنے قصور علم کا علم ہوا اور قصور فہم کا فہم ہوا۔ قوانین حکومت میں بھی تغیر اور تبدل ہوتا ہے لیکن وہاں کسی فروگزاشت اور لاعلمی کی بناء پر پہلا حکم منسوخ ہوتا ہے، اور حق جل شانہ کے احکام میں تغیر وتبدل ہمیشہ حکمت ومصلحت کی بناء پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم غلطی سے پاک ہے۔

﴿لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی﴾ "میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔"

مریض کے حالات بدلنے کی وجہ سے طبیب دوا بدلتا رہتا ہے یہ طبیب کی جہالت نہیں بلکہ دلیل حذاقت ہے کہ ہر وقت کی مصلحت اس کی پیش نظر ہے اور اس قدرت کے علاوہ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمینوں کی اور حکومت اور بادشاہت کے لوازم میں سے ہے کہ احکام میں تغیر اور تبدل ہو لہٰذا جس وقت جو حکم دے اس کی تعمیل فرض اور لازم ہے اور اگر اس کے حکم اور فرمان کی تعمیل میں تامل کرو اور یہ کہو کہ ہم تو پہلے ہی حکم کو مانیں گے دوسرے حکم کو نہیں مانیں گے تو سمجھ لو کہ تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں کہ جو تمہیں اس کی گرفت اور باز پرس سے بچا سکے۔

فائدہ اولیٰ:...... لغت میں نسخ کے دو معنی آتے ہیں ایک نقل اور تحویل جیسے "نسخ الکتاب" (یعنی کتاب نقل کی)۔ دوسرے معنی رفع اور ازالہ کے جیسے "نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ" (آفتاب نے سایہ کو زائل کر دیا)۔ آیت میں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی حکم اول کو اٹھا دینا۔

فائدہ دوم:...... کتاب اللہ کا نسخ چند وجوہ پر آیا ہے: ۱۔ ایک تو یہ کہ تلاوت منسوخ ہو گئی اور حکم باقی رہا جیسے آیت رجم کہ تلاوت تو اس کی منسوخ ہو گئی اور حکم اس کا باقی ہے۔ ۲۔ اور ایک یہ کہ حکم منسوخ ہو جائے اور تلاوت باقی رہے جیسے اقارب کے لیے وصیت کرنے کی آیت میراث سے اس کا حکم منسوخ ہو گیا اور تلاوت علی حالہا باقی ہے اور مثلاً وہ آیت جس میں ایک سال کی عدت وفات کا حکم مذکور ہے تلاوت اور قرأت اس کی باقی ہے مگر ایک سال کی عدت کا حکم چار مہینے اور دس روز کی آیت سے منسوخ ہو گیا۔ ۳۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوں جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ احزاب بقدر سورۂ بقرہ طویل تھی مگر اس کے اکثر حصہ کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہو گئے۔

فائدہ سوم:...... نسخ کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ حکم منسوخ کی جگہ دوسرا حکم نازل کیا جائے جیسے ایک سال کی عدت منسوخ کر کے چار مہینہ اور دس دن کا حکم نازل کر دیا گیا۔ دوسری قسم یہ کہ پہلا حکم اٹھا لیا جائے اور کوئی جدید حکم اس کی جگہ نہ اتارا جائے جیسے ابتداء میں مہاجر عورتوں کے امتحان کا حکم تھا بعد میں اٹھا لیا گیا۔

فائدہ چہارم:...... نسخ احکام یعنی اوامر اور نواہی میں جاری ہوتا ہے، اخبار یعنی جو چیزیں خبر سے متعلق ہیں ان میں نسخ جاری نہیں ہوتا ہے اور اوامر و نواہی میں باقتضاء مصلحت تغیر و تبدل عقلاء عالم کے نزدیک مسلم ہے۔ بلکہ مصلحت کے بدلنے سے حکم کو نہ بدلنا عقلاً قبیح ہے۔

فائدہ پنجم:...... ناسخ کا منسوخ سے بہتر یا برابر ہونا باعتبار سہولت عمل یا باعتبار کثرت ثواب مراد ہے۔ نظم اور اعجاز کے اعتبار سے ناسخ اور منسوخ کا برابر ہونا ضروری نہیں لہٰذا کتاب اللہ کا حدیث سے منسوخ ہونا۔ ﴿نَأْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ﴾ (یعنی ہم اس سے بہتر حکم نازل فرماتے ہیں) کے منافی نہ ہوگا۔ خوب سمجھ لو۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ

کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہو چکے ہیں موسیٰ سے اس سے پہلے اور جو کوئی کفر لیوے

کیا تم مسلمان یہی چاہتے ہو کہ سوال شروع کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہو چکے موسیٰ سے پہلے اور جو کوئی انکار لیوے

بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿١٠٨﴾

بدلے ایمان کے تو وہ بہکا سیدھی راہ سے ف ۱

بدلے یقین کے وہ بھولا سیدھی راہ سے۔

شاعت بست و پنجم (۲۵)

قال تعالیٰ: ﴿أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ ... الی ... سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾

اے مسلمانو! کیا تم بھی یہی چاہتے ہو کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام سے سوالات کیے گئے اسی طرح تم اپنے رسول سے سوالات کرو۔ بنی اسرائیل کی طرح احکام خداوندی میں قیل وقال کرو اور حجتیں نکالو! جیسے بقرہ کے قصہ میں گزرا، مثلاً یہ سوال کرو کہ پہلا ہی حکم برقرار رکھا جائے یا ہم اس حکم سے خوش نہیں، اور جو شخص بجائے ایمان کے کفر کو اختیار کرے وہ سیدھے راستہ سے بہک گیا۔ منزل مقصود کو کیسے پہنچ سکے گا مطلب یہ ہے کہ احکام خداوندی میں حجتیں نکالنا اور اللہ کے نبی ﷺ سے الجھنا اور لایعنی سوالات کرنا یا اللہ کے کسی حکم کو غیر مناسب سمجھنا یہ سب کفر کی بات ہے تمہارا فریضہ تو یہ ہے۔

زبان تازہ کر دن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ

دل چاہتا ہے بہت سے اہل کتاب کا کہ کسی طرح تم کو پھیر کر مسلمان ہوئے پیچھے کافر بنا دیں بسبب اپنے دلی حسد کے

دل چاہتا ہے بہت کتاب والوں کا کسی طرح تم کو پھیر کر مسلمان ہوئے پیچھے کافر کر دیں حسد کر کے اپنے

أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ

بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکا ان پر حق ف ۲ سو تم درگزر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم ف ۳ بیشک

اندر سے بعد اس کے کہ کھل چکا ان پر حق سو تم درگزر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک بھیجے

اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم

اللہ ہر چیز پر قادر ہے ف ۴ اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور جو کچھ آگے بھیج دو گے اپنے واسطے

اللہ اپنا حکم اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور کھڑی رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور جو آگے بھیجو گے اپنے واسطے

ف ۱ یعنی یہودیوں کی باتوں پر ہرگز اعتماد نہ کرنا جس کسی کو یہودیوں کے شبہ ڈالنے سے شبہ پڑ گیا وہ کافر ہوا۔ اس کی احتیاط رکھو اور یہود کے کہنے سے تم اپنے نبی کے پاس شبہے نہ لاؤ جیسے وہ اپنے نبی کے پاس لاتے تھے۔

ف ۲ یعنی بہت سے یہودیوں کو آرزو ہے کہ اسی طرح تم کو اے مسلمانو پھیر کر پھر کافر بنا دیں حالانکہ ان کو واضح ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کا دین ان کی کتاب، ان کا نبی سب سچے ہیں۔

ف ۳ یعنی جب تک ہمارا حکم کوئی نہ آئے اس وقت تک یہود کی باتوں پر صبر کرو۔ سو آخر کو حکم آ گیا کہ یہود کو مدینہ کے گرد سے نکال دو۔

ف ۴ یعنی اپنے ضعف سے تردد مت کرو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے تم کو عزیز اور یہود کو ذلیل کرے گا یا یہ کہ تاخیر عجز کی وجہ سے نہیں کی جاتی۔

مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

بھلائی پاؤ گے اس کو اللہ کے پاس بیشک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے ف۱

بھلائی وہ پاؤ گے اللہ کے پاس اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

شناعت بست وششم (۲۶)

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ... الی... اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾

اے مسلمانو! یہ یہود قرآن اور دین میں طرح طرح کے شبہے نکالتے ہیں کبھی نسخ احکام پر اعتراض کرتے ہیں اصل وجہ یہ ہے کہ اکثر اہل کتاب کی دلی خواہش اور تمنا یہ ہے کہ کسی طرح تم کو ایمان سے پھیر کر کافر بنا دیں کہ اہل کتاب کی طرح تم بھی جدید حکم کا انکار کر دو اور اپنے نبی پر یہ اعتراض کرو کہ تم نے پہلے تو یہ حکم دیا تھا اور اب یہ دوسرا حکم اس کے خلاف کیسا؟ اور اس غرض فاسد کا کوئی محرک اور باعث تمہاری جانب سے وقوع میں نہیں آیا بلا وجہ محض حسد کی بناء پر کہ جو خود اُن کے ناپاک اور گندے نفسوں سے پیدا ہوا ہے اور پھر تعجب یہ ہے کہ ان کی یہ کوشش اور یہ حسد کسی شک اور شبہ کی بناء پر نہیں بلکہ بعد اس کے ہے کہ حق ان کو خوب واضح ہو چکا ہے۔ کہ مسلمانوں کا دین اور ان کی کتاب اور ان کا رسول سب سچے ہیں۔ نیز ان کو یہ بھی خوب معلوم ہے کہ ہر شریعت میں علیٰ اختلاف المصالح احکام بدلتے رہتے ہیں۔ بقرہ ہی کے قصہ میں دیکھ لو کہ کتنی مرتبہ نسخ ہوا۔ تم ان کی باتوں کا خیال مت کرو۔ یہ حسد میں مبتلا ہیں خدا کا شکر کرو کہ تم حاسد نہیں محسود ہو۔ پس تم ان حاسدوں سے معاف کرو اور درگزر کرو۔ یعنی زبان سے بھی ان کو کچھ برا بھلا نہ کہو اور فی الحال ان سے کوئی جنگ وجدال اور قتل وقتال نہ کرو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جہاد وقتال اور جزیہ کا حکم نازل فرمائے اور جہاد وقتال کے حکم میں تاخیر عاجز ہونے کی بناء پر نہیں بلکہ فی الحال بھی قادر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہے لیکن اس تاخیر میں کچھ حکمتیں ہیں وہ قادر وتوانا جب چاہے گا ضعیف کو قوی پر غالب کر دے گا اور اگر تم کو اپنے ان دشمنان ایمان سے جہاد کا شوق ہے تو جہاد بالسیف کا حکم آنے سے پہلے جہاد نفس میں مشغول رہو اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ کو دیتے رہو۔ یہ عبادت مالی اور بدنی نفس پر بہت شاق اور گراں ہے۔ بس اس جانی ومالی جہاد میں لگے رہو۔ اور نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ جو نیکی اور بھلائی بھی تم آگے بھیجو گے تمام جمع شدہ ذخیرہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پاؤ گے۔ یہ ناممکن ہے کہ تمہارا کوئی عمل ضائع ہو جائے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ تمہارے عمل کو خوب دیکھتا ہے۔ اس عمل کی کیت اور کیفیت اور تمہارا اخلاص اور شوق اور نیت سب اس کے نظروں کے سامنے ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا

اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ جاویں گے جنت میں مگر جو ہوں گے یہودی یا نصرانی ف۲ یہ آرزوئیں باندھ لی ہیں انہوں نے، کہدے لے آؤ

وہ کہتے ہیں ہرگز نہ جاویں گے جنت میں مگر جو ہوں گے یہود یا نصاریٰ یہ آرزوئیں باندھ لی ہیں انہوں نے تو کہہ

ف۱ یعنی ان کی ایذا پر صبر کرو اور عبادات میں مشغول رہو۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے غافل ہرگز نہیں۔ تمہاری کوئی نیک بات ضائع نہیں ہو سکتی۔

ف۲ یعنی یہودی تو کہتے ہیں کہ بجز ہمارے کوئی جنت میں نہ جائے گا اور نصاریٰ کہتے تھے کہ بجز ہمارے کوئی بہشت میں نہ جائے گا۔

بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ⑪ بَلٰى ق مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ أَجْرُهٗ

سند اپنی اگر تم سچے ہو کیوں نہیں جس نے تابع کر دیا منہ اپنا اللہ کے اور وہ نیک کام کرنے والا ہے تو اسی کے لئے ہے ثواب

لے آؤ سند اپنی اگر تم سچے ہو کیوں نہیں جس نے تابع کیا منہ اپنا اللہ کے اور وہ نیکی پر ہے اس کو ہے مزدوری

عِنْدَ رَبِّهٖ ص وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ⑫ ع ۱۳

اس کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے ف۱

اس کی اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ ان کو غم۔

شناعت بست و ہفتم (۲۷) - باشتراک نصاریٰ

قَالَ تَعَالٰى: ﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ ... الى ... وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

اے مسلمانو! یہ اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ تم کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ جنت میں سوائے یہود اور نصاریٰ کے ہرگز کوئی داخل نہ ہوگا تم کو فریب دے کر اور بہشت کا شوق دلا کر اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں تم ہرگز ان کی طرف مائل نہ ہونا اور نہ ان کی بات کی طرف التفات کرنا۔ یہ سب ان کی خالی آرزوئیں اور دل کے بہلانے کی باتیں ہیں جن پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں جائے گا تو اپنی کوئی دلیل پیش کرو بغیر دلیل کے کوئی دعویٰ مسموع نہیں البتہ جو امر دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے ثابت ہے اور تمام اہل حق کے نزدیک مسلم ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے وجہ یعنی اپنی ذات کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور اس کے حکموں کے سامنے گردن ڈال دے کہ اللہ کا جو حکم بھی جس وقت پہنچے اس کو سنے اور سر اور آنکھوں پر رکھے اور بیچون وچرا اس کو مانے اور اس اطاعت اور فرمانبرداری میں مخلص اور نیکوکار ہو یعنی جنب اللہ کی عبادت کرے تو اس طرح کرے گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے تو ایسے شخص کو اللہ کے یہاں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا اجر ملے گا اور نہ ان پر آئندہ کا کچھ خوف ہوگا اور نہ گزشتہ پر غمگین ہوں گے۔ حاصل کلام یہ کہ جنت میں وہ شخص داخل ہوگا جس میں یہ دو صفتیں پائی جائیں اول اسلام لوجہ اللہ اور دوسری احسان۔ اسلام سے تصحیح عقائد مراد ہے اور احسان سے اعمال حسنہ۔ اور ان لوگوں میں یہ دونوں صفتیں مفقود ہیں۔ پیغمبر وقت پر ایمان نہیں لائے اور جو احکام پہلے حکموں کے نسخ کے لیے نازل ہوتے ان کو قبول نہیں کیا اور ظاہر ہے کہ ناسخ آجانے کے بعد حکم منسوخ پر عمل کرنے والا مطیع اور فرمانبردار نہیں ہو سکتا اور نہ احسان عمل ان کو نصیب ہوا۔ اللہ کی شریعت میں تحریف کی اور اللہ پر جھوٹ بولا۔ ایسی حالت میں دخول جنت کی توقع خیال خام ہے البتہ مسلمانوں نے اللہ کی آخری شریعت کو اخلاص کے ساتھ قبول کیا وہ جنت کے مستحق ہیں۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ جو خاصان خدا کے انتساب ہی کو مدار نجات سمجھے ہوئے ہیں وہ آگاہ ہو جائیں کہ محض یہ تمنائیں ذریعہ نجات نہیں ہو سکتیں۔ ایمان اور اعمال صالحہ شرط نجات اور

ف۱ یعنی جس نے خدا کے احکام کو مانا اور اس کا اتباع کیا وہ احکام خواہ کسی نبی کے ذریعہ سے معلوم ہوں اور اپنی قومیت اور آئین پر تعصب نہ کیا جیسا کہ یہود کرتے ہیں تو ان کے لئے اجر نیک ہے اور نہ کوئی امر ان میں ایسا ہے جس کی وجہ سے خوف ہو اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

مغفرت ہیں اور یہ دونوں ان میں مفقود ہیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى

اور یہود تو کہتے ہیں کہ نصاریٰ نہیں کسی راہ پر اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود نہیں کسی راہ

اور یہود نے کہا نصاریٰ نہیں کچھ راہ پر اور نصاریٰ نے کہا یہود نہیں کچھ راہ

شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ

پر باوجودیکہ وہ سب پڑھتے ہیں کتاب ف۱ اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو جاہل ہیں ان ہی کی سی بات

پر اور وہ سب پڑھتے ہیں کتاب اسی طرح کہی ان لوگوں نے جن پاس علم نہیں انہیں کی سی بات۔ اب اللہ

يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اب اللہ حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں جھگڑتے تھے ف۲

حکم کرے گا ان میں دن قیامت کے جس بات میں جھگڑتے تھے۔

شناعت بست وہشتم (۲۸)- باشتراک نصاریٰ ومشرکین

قال تعالیٰ: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى ... الی ... فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾

ایک مرتبہ حضور ﷺ کی خدمت میں نجران کے نصاریٰ آئے۔ علماء یہود بھی ان کوسن کر آگئے دونوں فریق کی آپس میں بحث شروع ہوگئی۔ جوش میں آکر ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور جوش میں آکر یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ کسی صحیح اور قابل اعتبار چیز پر نہیں۔ بالکل بے بنیاد ہے سرے ہی سے کسی بنیاد پر قائم نہیں اور اسی طرح نصاریٰ یہ کہنے لگے کہ یہود کسی چیز پر نہیں یعنی انکا دین ہیچ اور بے بنیاد ہے اور حالانکہ دونوں فریق اللہ کی کتاب پڑھتے رہتے ہیں یعنی یہودی توریت کو اور عیسائی انجیل کو پڑھتے رہتے ہیں اور ہر کتاب میں دوسری کتاب اور اس کے رسول کی تصدیق موجود ہے۔ توریت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تصدیق کرتی ہے اور انجیل موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی تصدیق کرتی ہے اصل بنیاد دونوں کی صحیح ہے اگرچہ بعد میں نسخ اور تحریف کی وجہ سے غیر معتبر ہوگئے اور اسی طرح ان جیسی باتیں وہ لوگ کہتے ہیں کہ جن کے پاس علم نہیں یعنی مشرکین اور مجوس یہی کہتے کہ ہم ہی حق پر ہیں اور ہمارے سوا سب بے دین گمراہ ہیں۔ پس یہ دنیا

ف۱ یہودیوں نے توریت پڑھ کر سمجھ لیا کہ جب نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہا تو بیشک وہ کافر ہوگئے اور نصرانیوں نے انجیل میں صاف دیکھ لیا کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر کے کافر ہوگئے۔

ف۲ ان جاہلوں سے مشرکین عرب اور بت پرست مراد ہیں یعنی جیسے یہود ونصاریٰ ایک دوسرے کو گمراہ جانتے ہیں۔ اسی طرح بت پرست بھی اپنے سوا سب فرقوں کو گمراہ اور بے دین بتلاتے ہیں، سو دنیا میں کہتے جائیں قیامت کو فیصلہ ہو جائے گا۔ فائدہ یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب کذٰلک فرمادیا تو پھر مثل قولھم فرمانے کی کیا حاجت۔ بعض مفسرین نے جواب دیا کہ مثل قولھم توضیح اور تاکید ہے کذٰلک کے لئے اور بعض کہتے ہیں کہ یہاں دو تشبیہ جدا جدا ہیں اس لئے دو لفظ لائے ایک تشبیہ سے تو یہ غرض ہے کہ ان کا اور ان کا مقولہ باہم مشابہ ہے (یعنی جیسے وہ دوسروں کو گمراہ کہتے ہیں ایسا ہی یہ بھی) اور ایک تشبیہ سے یہ غرض ہے کہ جیسا اہل کتاب یہ دعویٰ بے دلیل اپنی ہوائے نفس اور عداوت سے کرتے تھے ایسے ہی بت پرست بھی بے دلیل محض خواہش نفسانی سے ایسا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہے یہاں جس کا جی چاہے بے دلیل ہانک لے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے درمیان ان تمام امور کا عملی طور پر فیصلہ فرما دیں گے جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ وہ فیصلہ یہ ہوگا کہ یہودیت اور نصرانیت اپنے اپنے وقت میں صحیح تھیں۔ خاتم الانبیاء کے دین اور کتاب سے تمام ادیان منسوخ ہوگئے اور اب قیامت تک سوائے دین اسلام کے اور کوئی دین مقبول اور معتبر نہیں اور عملی فیصلہ سے مراد یہ ہے کہ اہل حق اور اہل باطل کے لیے جزا اور سزا کا حکم سنا دیا جائے گا جس سے حق اور باطل کے امتیاز کا آنکھوں سے مشاہدہ ہو جائے گا اور ہر شخص دیکھ لے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہ۔ اور فیصلہ میں عملی کی قید اس لیے لگائی کہ علمی طور پر تو دنیا ہی میں دلائل اور براہین سے حق اور باطل کا فیصلہ ہو چکا ہے اگر طبائع میں تعصب اور عناد نہ ہوتا تو دنیا ہی میں نزاع اور اختلاف ختم ہو جاتا لیکن دنیا میں عملی طور پر حق اور باطل کے اختلاف کا فیصلہ کر دینا خلاف حکمت ہے۔ دنیا دار تکلیف اور دار ابتلاء و امتحان ہے۔ عملی فیصلہ یوم جزاء ہی میں مناسب ہے۔

ف:...... ﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ﴾ میں قول کے ساتھ تشبیہ دینا مقصود ہے اور "مِثْلَ قَوْلِهِمْ" میں مقولہ کے ساتھ تشبیہ دینا ہی مقصود ہے لہٰذا تشبیہ میں تکرار نہیں رہا۔ نیز تاکید کے لیے تکرار عین بلاغت ہے۔ فافهم ذلك واستقم۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا

اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا جاوے وہاں نام اس کا اور کوشش کی انکے اجاڑنے میں ف ۱ ایسوں کو

اور اس سے ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ پڑھیئے وہاں نام اس کا اور دوڑا ان کے اجاڑنے کو ایسوں کو

كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ

لائق نہیں کہ داخل ہوں ان میں مگر ڈرتے ہوئے ف ۲ انکے لئے دنیا میں ذلت ہے ف ۳ اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب

نہیں پہنچتا کہ پیٹھیں ان میں مگر ڈرتے ہوئے ان کو دنیا میں ذلت ہے اور ان کو آخرت میں

عَظِيْمٌ ۝۱۱۴ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۤ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ

ہے، اور اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ ف ۴ بیشک اللہ بے انتہا بخشش کرنے والا

بڑی مار ہے اور اللہ ہی کی ہے مشرق اور مغرب سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ برحق اللہ گنجائش والا ہے

ف ۱ اس کے شان نزول نصاریٰ ہیں کہ انہوں نے یہود سے مقاتلہ کر کے توریت کو جلایا اور بیت المقدس کو خراب کیا یا مشرکین مکہ کہ انہوں نے مسلمانوں کو محض تعصب و عناد سے حدیبیہ میں مسجد حرام (بیت اللہ) میں جانے سے روکا۔ باقی جو شخص کسی مسجد کو ویران یا خراب کرے وہ اسی حکم میں داخل ہے۔

ف ۲ یعنی ان کفار کو لائق یہی تھا کہ مساجد اللہ میں خوف و تواضع اور ادب و تعظیم کے ساتھ داخل ہوتے کفار نے جو وہاں کی بے حرمتی کی یہ صریح ظلم ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس ملک میں حکومت اور عزت کے ساتھ رہنے کے لائق نہیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ملک شام اور مکہ اللہ نے مسلمانوں کو دلوا دیا۔

ف ۳ یعنی دنیا میں مغلوب ہوئے، قید میں پڑے اور مسلمانوں کے باجگذار رہے۔

ف ۴ یہ بھی یہود و نصاریٰ کا جھگڑا تھا کہ ہر کوئی اپنے قبلہ کو بہتر بتاتا تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اللہ مخصوص کسی طرف نہیں بلکہ تمام مکان اور جہت سے منزہ۔ البتہ اس کے حکم سے جس طرف منہ کرو گے وہ متوجہ ہے۔ تمہاری عبادت قبول کرے گا"۔ بعض نے کہا سفر میں سواری پر نوافل پڑھنے کی بابت یہ آیت اتری۔ یا سفر میں قبلہ مشتبہ ہو گیا تھا جب اتری۔

عَلِيمٌ ﴿۱۱۵﴾

سب کچھ جاننے والا ہے ف ۱

خبر رکھتا۔

شناعت بست ونہم (۲۹)-باشتراک نصاریٰ ومشرکین

قال تعالیٰ: ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ ... الی ... إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾

یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب ہی اس امر کے مدعی ہیں کہ ہم حق پر ہیں لیکن اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہو جائے کہ حق سے کس قدر دور ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں کو اس بات سے روکتا ہے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے خواہ دل سے اور خواہ زبان سے اور خواہ اعضاء اور جوارح سے اور فقط اس پر کفایت نہ کرے بلکہ ان کے ویران اور برباد کرنے کی کوشش کرے مساجد کی بے حرمتی کرنا اور ان کو منہدم کرنا یہ مساجد کی ظاہری تخریب ہے اور عبادت اور ذکر اللہ کی بندش کر دینا یہ مساجد کی معنوی تخریب اور باطنی ویرانی ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد:

﴿إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ﴾ ''اللہ کی مساجد کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور نماز قائم کی''۔

میں عمارت سے ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی عمارت مراد ہے اسی طرح ﴿وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا﴾ میں ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی تخریب مراد ہے۔ غرض یہ کہ مساجد کو ویران کرنا سب کے نزدیک نہایت قبیح اور فعل شنیع ہے اور یہ تینوں گروہ اس بلا میں مبتلا ہیں۔ یہود اور نصاریٰ نے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کو ویران کیا اور مشرکین مکہ نے مسجد حرام کو ویران کیا اور اس میں خدا کا نام لینے سے مانع اور مزاحم بنے۔ ان ظالموں کو چاہیے تھا کہ مسجدوں میں اور خدا کے گھروں میں قدم بھی نہ رکھتے مگر ڈرتے ہوئے کہ مبادا خدا کے گھر کے ادب اور تعظیم میں ہم سے کوئی قصور نہ ہو جائے جس سے خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس گھر کا ادب یہی ہے کہ اس کو اللہ کے ذکر اور عبادت سے آباد کیا جائے۔ خدا کے دربار میں داخل ہونے کے بعد بیٹھنے سے پہلے ہی دو رکعت نماز پڑھ لینی چاہیے۔ افسوس کہ یہ لوگ نہ خدا سے ڈرے اور نہ اس کے گھر کا ادب کیا بلکہ ظلم ڈھانے لگے اور اللہ کے بندوں کو اس کے دربار میں حاضری سے روکنے لگے۔ اور ظاہر ہے کہ دربار شاہی کو ویران کرنے کی کوشش کرنا اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں اس لیے یہ لوگ دونوں جہان میں سزایاب ہونگے۔ ان کو دنیا میں بھی سخت رسوائی نصیب ہوگی کہ قتل اور قید کیے جائیں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے بڑا عذاب ہوگا اور اے مسلمانو! اگر کافر تم کو مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ میں جانے سے روکیں تو ملول نہ ہونا۔ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو تمہارے لیے مسجد بنا دیا ہے ہر جگہ تمہارے لیے نماز اور عبادت درست ہے۔ اللہ تعالیٰ کوئی جسم اور جسمانی نہیں

ف ۱ یعنی اس کی رحمت سب جگہ عام ہے ایک مکان کے ساتھ مخصوص نہیں اور بندوں کے مصالح اور ان کی نیتوں کو اور انکے اعمال کو سب کو خوب جانتا ہے کہ بندوں کے حق میں کون سی شے مفید ہے اور کون سی مضر، اسی کے موافق حکم دیتا ہے اور جو اس کی موافقت کرے گا اس کو جزا اور مخالف کو سزا دے گا۔

کہ جو کسی خاص مکان میں موجود ہو اور دوسرے مکان میں نہ ہو وہ تو وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے البتہ تم زمان اور مکان اور جہت کے ساتھ مقید ہو اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمہاری عبادت کے لیے ایک جہت مقرر فرمادی اور ایک قبلہ متعین کر دیا لیکن اگر تم فرائض میں کسی دشمن کے خوف کی وجہ سے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھ سکو یا اندھیری رات میں قبلہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے تم نے تحری کر کے نماز پڑھ لی اور بعد میں معلوم ہوا کہ نماز قبلہ رخ نہیں پڑھی گئی یا سفر میں سواری پر نوافل پڑھنا چاہتے تھے اور سواری کا منہ قبلہ کی طرف نہ تھا اور سواری سے اترنے میں دشواری تھی تو ان حالات میں نماز پڑھتے وقت جدھر بھی اپنا منہ کر لو گے تو ادھر ہی اللہ کا رخ ہے یعنی وہی جہت اور سمت قبلہ کی ہے اور تمہاری نماز ہر حال میں صحیح اور مقبول ہے اور ہر حال میں اللہ کا قرب اور حضور تم کو حاصل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانی نہیں کہ اگر ایک مکان میں موجود ہو تو دوسرے مکان میں موجود نہ ہو وہ کسی مکان اور جہت کے ساتھ مقید نہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ وسعت اور سہولت اس لیے عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ بڑے ہی وسیع رحمت والے ہیں۔ امام ربانی فرماتے ہیں کہ وَاسِعٌ سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی وسعت مراد ہے اس کی ذات کی طرح اس کی وسعت بھی بیچون وچگون ہے جس کی کیفیت حیطۂ ادراک سے باہر ہے اور بندہ کی حاجتوں اور مصلحتوں کے خوب جاننے والے ہیں، حسن بصری اور قتادہ سے مروی ہے کہ یہ حکم قبلہ متعین ہونے سے پہلے تھا ابتداء میں اختیار تھا کہ جس سمت میں چاہیں نماز پڑھیں بعد میں یہ حکم منسوخ ہوا مگر یہ قول ضعیف ہے اور روایات سے اس پر کوئی سند اور دلیل نہیں اور بعض کہتے ہیں کہ تحویل قبلہ کی تمہید ہے اور یہود اور نصاریٰ کا رد ہے کہ جو ہر ایک اپنے قبلہ کو بہتر بتاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشرق اور مغرب سب اسی کا ہے جس جہت اور جس سمت کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے وہی جہت قبلہ ہے اور آیت کریمہ اپنے عموم کی وجہ سے ان تمام صورتوں کو شامل ہے جو اس کے شانِ نزول میں مروی ہیں ابوبکر رازی رحمہ اللہ نے احکام القرآن میں اسی عموم کو اختیار فرمایا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور کہتے ہیں کہ اللہ رکھتا ہے اولاد، وہ تو سب باتوں سے پاک ہے بلکہ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں سب اسی کے تابعدار ہیں

اور کہتے ہیں اللہ رکھتا ہے اولاد وہ سب سے پاک ہے بلکہ اس کا مال ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں سب اس کے آگے ادب سے ہیں

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

نیا پیدا کرنے والا ہے آسمان اور زمین کا اور جب حکم کرتا ہے کسی کام کو تو یہی فرماتا ہے اس کو کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔ ف۱

نیا نکالنے والا آسمان اور زمین کا اور جب حکم کرتا ہے ایک کام کو تو یہی کہتا ہے اس کو ہو وہ ہوتا ہے۔

شناعت سی ام (۳۰) ایضاً - باشتراک نصاریٰ ومشرکین

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ... الی ... كُنْ فَيَكُوْنُ﴾

ف۱ یہود حضرت عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کی ذات سب باتوں سے پاک ہے بلکہ سب کے سب اس کے مملوک اور مطیع اور مخلوق ہیں۔

اللہ کی مسجدوں کو ویران کرنا بلاشبہ ظلم ہے مگر یہ ظالم اس سے بڑھ کر شرک کے ظلم عظیم میں مبتلا ہیں اور وہ ظلم عظیم یہ ہے کہ یہ ظالم یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے لیے اولاد بنائی ہے۔ یہود کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے تھے اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتاتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا احمقانہ اور گستاخانہ کلمہ ہے سب کو معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ توالد اور تناسل سے پاک اور منزہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ہونا عقلاً ناممکن ہے اس لیے کہ بیٹا باپ کے مماثل اور مشابہ اور ہم جنس ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ بے مثل اور بیچون وچگون ہے ورنہ اگر بیٹا باپ کے ہم جنس نہ ہو تو پھر وہ بیٹا اس باپ کا فرزند نہ ہوگا نیز بیٹے کا باپ کے ہم جنس نہ ہونا ایک عیب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ نیز باپ اولاد کا محتاج ہوتا ہے اور اولاد سے پہلے بیوی کا محتاج ہوتا ہے کہ اولاد بغیر زوجہ کے ممکن نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ صمد یعنی بے نیاز ہے کسی کا محتاج نہیں۔ نیز ولادت کے لیے تغیر اور تبدل اور تجزی اور انقسام لازمی ہے اور یہ خاصہ ممکن اور حادث کا ہے۔ قدیم میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا۔ نیز اگر بالفرض خدا تعالیٰ کے لیے فرزند ہو تو دو حال سے خالی نہیں یا وہ فرزند بھی خدا اور واجب لذاتہ ہوگا یا نہیں اگر وہ فرزند خدا ہوا تو لامحالہ مستقل ہوگا اور باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہوگا اس لیے کہ خدائی کے لیے بے نیازی لازم ہے حالانکہ بیٹے کا باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہونا عقلاً محال ہے بیٹے کا وجود ہی باپ سے ہوا ہے اور جب بیٹا خدا ہونے کی وجہ سے باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہوگا تو پھر اس کو باپ سے کوئی تعلق بھی نہ ہوگا اور بیٹے کا باپ سے بے تعلق ہونا ناممکن ہے اس لیے کہ فرع کا اصل سے بے تعلق ہونا عقلاً محال ہے۔ علاوہ ازیں جب بیٹا باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہوگا تو باپ خدا نہ رہے گا اس لیے کہ خدا سے کوئی مستغنی نہیں ہوسکتا وہ خدا ہی کیا ہوا جس سے کوئی مستغنی اور بے نیاز ہو سکے اور اگر یہ کہو کہ وہ بیٹا خدا اور واجب الوجود نہیں تو لامحالہ وہ خدا کا پیدا کیا ہوا ہوگا اور اس کا عبد اور مملوک ہوگا لہٰذا فرزند کا عبد اور مملوک ہونا لازم آئے گا اور بیٹا عبد اور مملوک نہیں ہوتا جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے ﴿بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ یعنی اس کے لیے کوئی اولاد نہیں بلکہ آسمان اور زمین کی تمام چیزیں خاص اسی کی مملوک ہیں اور ملکیت اور ابنیت جمع نہیں ہوسکتی اس لیے کہ یہ امر ظاہر ہے کہ مملوک اور مخلوق مالک اور خالق کے ہم جنس نہیں اور فرزند باپ کے ہم جنس ہوتا ہے اسی وجہ سے شریعت میں یہ مسئلہ ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے یا کسی قریبی رشتہ دار کا مالک بن جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتا ہے اس لیے کہ فرزندیت اور عبدیت میں تباین کلی اور منافات تامہ ہے پس جبکہ بندوں میں فرزندیت اور عبدیت جمع نہیں ہوسکتی تو بارگاہ الوہیت میں یہ دونوں چیزیں کیسے جمع ہوسکتی ہیں اور علاوہ مملوک ہونے کے آسمان وزمین کے رہنے والے تمام کے تمام جن میں فرشتے اور حضرت عزیر اور حضرت مسیح بھی داخل ہیں۔ سب اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ بعضے برضا ورغبت جیسے فرشتے اور انبیاء کرام اور مومنین صالحین اور بعضے جبراً وقہراً جیسے شیاطین اور کفار وفجار۔ یہ کسی کی مجال نہیں کہ اسکے ارادہ اور مشیت کو ٹال سکے اور اس کے حکم سے سرتابی کر سکے۔ اور کافر وفاجر جو ظاہراً اس کی معصیت کرتے ہیں وہ تکوینی اور باطنی طور پر اللہ ہی کے ارادہ اور مشیت سے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت سے ان کو معصیت کرنے کی قدرت دی ہے ورنہ اگر وہ قدرت نہ دیتا تو کوئی معصیت نہ کرسکتا۔ غرض یہ کہ تمام موجودات اسی کے قبضہ تصرف میں ہیں جس کو چاہے مارے اور جس کو چاہے جلائے کوئی اس کے تصرف سے باہر نہیں نکل سکتا اور جسکی یہ شان ہو اس کا کوئی ہم

جنس اور مماثل نہیں ہوسکتا۔ اور بیٹے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ باپ کے ہم جنس ہو۔ اور عجب نہیں کہ ﴿كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُوْنَ﴾ سے الزام مقصود ہو کہ جن کو تم خدا کا بیٹا اور اولاد کہتے ہو وہ سب اللہ کی عبودیت کے معترف اور مقر ہیں اور ہر وقت اسی کی تسبیح وتنزیہ میں لگے رہتے ہیں پھر تم ان کو خدا کی اولاد کس طرح بتلاتے ہو۔ نیز ولادت کے لیے مادہ اور مدت اور آلات اور اسباب کی ضرورت ہے اور خدا کی شان یہ ہے کہ وہ ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ یعنی بغیر مادہ کے آسمان اور زمین کا موجد ہے۔ محض اپنی قدرت سے تمام کائنات کو پردۂ عدم سے نکال کر مسند وجود پر لا بٹھلایا ہے پس اگر حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کر دے تو اس کے لیے مشکل نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی ایجاد میں کسی مادہ اور مدت اور کسی آلہ اور سبب کا محتاج نہیں اس لیے کہ وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کو کن کا حکم دیتا ہے یعنی موجود ہو جا! پس وہ شے فوراً موجود ہو جاتی ہے اور فرشتے اور حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب اسی طریقہ سے پیدا ہوئے اور ظاہر ہے کہ اس طریقہ سے پیدا ہونے کا نام کسی کے نزدیک ولادت نہیں پھر کیوں ان کو خدا کی اولاد بتاتے ہو۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام میں یہ قدرت نہ تھی کہ وہ کلمہ کن سے کسی کو پیدا کر سکیں اور بقول نصاریٰ وہ تو اپنی جان بھی یہود کے ہاتھ سے بچا نہ سکے اور نہ دشمنوں پر غلبہ پا سکے تو پھر وہ خدا کیسے ہوئے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہود اور نصاریٰ اور مشرکین خدا تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرتے تھے اول حق تعالیٰ نے ﴿سُبْحٰنَهٗ﴾ فرما کر اولاد سے اپنا پاک ہونا بیان فرمایا اور بعد ازاں چند وجوہ سے ان کا رد فرمایا اول یہ کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے وہ سب اس کی ملک ہے اور اولاد ملک نہیں ہوتی۔ دوم یہ کہ تمام کائنات اس کی تابعدار اور اس کے ارادہ اور مشیت کے مسخر ہے کائنات کے ہر ذرہ سے حدوث اور احتیاج کے آثار اور علامات نمایاں ہیں جو سراسر وجوب ذاتی کے منافی ہیں اور حادث اور ممکن واجب ذاتی کا بیٹا نہیں ہو سکتا لہٰذا کائنات میں سے کوئی شے بھی خدا کی اولاد نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اولاد اگرچہ باپ کے برابر نہ ہو لیکن ہم جنس ضرور ہوتی ہے اور کائنات کا کوئی ذرہ وجوب ذاتی میں باری تعالیٰ کا شریک اور سہیم نہیں۔

اور اگر چاہو تو جملہ ﴿كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُوْنَ﴾ کو جملہ ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کا تتمہ اور تکملہ بنا دو تو اب دونوں جملے مل کر ایک ہی دلیل بنیں گے۔ علیحدہ علیحدہ دلیل نہ بنیں گے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ہے یعنی اللہ تعالیٰ بغیر مادہ کے آسمان و زمین پیدا کرنے والے ہیں اور ولادت کے لیے مادہ اور مدت درکار ہے چوتھے یہ کہ حق تعالیٰ کی ایجاد کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو کن فرما دیتے ہیں وہ اسی وقت موجود ہو جاتی ہے اور اس کا نام ولادت نہیں یا یوں کہو کہ یہ تمام صفات کمال، خداوند ذوالجلال کے ساتھ مختص ہیں کسی فرشتہ اور نبی میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔ خدا کے سوا نہ کوئی آسمان اور زمین کے ذرہ کا مالک ہے اور نہ ایک مچھر کے پر کی ایجاد اور تخلیق پر قادر ہے پھر کس طرح خدا کے فرزند ہوئے۔

پانچویں یہ کہ بیٹا ہمیشہ باپ کا جزء ہوتا ہے اور جزء کسی مرکب کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ترکیب سے پاک ہے۔

فائدہ:...... نصاریٰ جب ان دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ کے جواب سے لاجواب ہوتے ہیں تو یہ جواب دیتے ہیں کہ ہماری مراد بیٹے سے حقیقی معنی نہیں بلکہ معنی مجازی مراد ہیں جیسے پیار اور محبت میں کسی کو بیٹا بول دیتے ہیں تو اس کے معنی حقیقی مراد نہیں ہوتے بلکہ محبوب اور برگزیدہ کے معنی مراد ہوتے ہیں اس معنی کر ہم حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔

جواب:...... اگر ابن اللہ سے خدا کے محبوب اور برگزیدہ کے معنی مراد ہیں تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے سارے ہی

انبیاء خدا کے محبوب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ ابن اللہ کا اطلاق محبوب اور برگزیدہ کے معنی میں اگرچہ کفر اور شرک نہیں لیکن کفر اور شرک کا ایہام اس میں ضرور ہے جیسے غیر اللہ کو سجدہ بہ نیت تعظیم وتحیت کفر نہیں بلکہ حرام ہے۔ اسی طرح شریعت محمدیہ میں سجدہ تحیت وتعظیم کی طرح اس لفظ کے اطلاق ہی کو ممنوع قرار دیا۔ بارگاہ خداوندی کے آداب کے خلاف ہے کہ زبان سے کوئی لفظ ایسا نکالا جائے جس میں خدا تعالیٰ کی تنزیہ وتقدیس کے خلاف کا ایہام بھی ہو پادری صاحبان جب بالکل ہی لاچار ہو جاتے ہیں تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ مسئلہ سرِ الٰہی اور رمز خداوندی ہے ہم اس کے سمجھانے سے قاصر ہیں۔ لیکن اب اس صریح خلاف عقل عقیدہ کے ماننے والے بہت ہی کم رہ گئے ہیں۔ سوائے ان پادریوں کے جن کو مشن سے تنخواہ ملتی ہے وہ حضرت مسیح کو خدا اور خدا کا بیٹا بتلاتے ہیں۔ باقی یورپ اور ایشیا کے اکثر عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بندہ اور رسول سمجھنے لگے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ قرآن کریم کی ساڑھے تیرہ سو برس کی مسلسل پکار کے بعد بنی اسرائیل کی بھیڑوں کی سمجھ میں آیا کہ ابنیت، تثلیث کا عقیدہ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔

عذر لنگ: ...... اور بعض سنجیدہ عیسائی جنہوں نے صوفیہ کرام کی کتابوں کا کچھ مطالعہ کیا ہے وہ اپنے اس عقیدہ ابنیت کی اس طرح تاویل کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی صفات صفات خداوندی کا عکس اور پرتو تھیں اور چونکہ اس قسم کا انعکاس سوائے حضرت مسیح کے کسی مخلوق میں نہیں ظاہر ہوا اور اس بارہ میں حضرت مسیح کا مرتبہ تمام مخلوق سے بالا اور برتر تھا اس لیے ان کو خدا تعالیٰ سے ایسی نسبت ہے جو اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں اسی نسبت کو ہم ابوت اور بنوت سے تعبیر کرتے ہیں اور مسیح کو ابن اللہ کہتے ہیں۔

جواب: ...... یہ محض ایک اصطلاحی تاویل ہے جس کے تسلیم کر لینے کے بعد عیسائیوں کے پاس مسیح علیہ السلام کی بالخصوص ابن اللہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں رہتی حق تعالیٰ نے اپنے بہت سے برگزیدہ بندوں کو اپنے جلال و جمال کا مظہر بنایا اور ان پر اپنی صفات کمال کا خاص عکس اور پرتو ڈالا جو اور کسی مخلوق پر نہیں ڈالا تو کیا ان حضرات کو بھی ابن اللہ کہنا جائز ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات بھی صفات خداوندی کا خاص مظہر اور آئینہ تھی اور سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات تو تمام اولین اور آخرین کے کمالات کی جامع تھی۔

نصاریٰ کی اگر یہ تاویل صحیح ہو تو کواکب پرست بھی یہی تاویل کر سکتے ہیں کہ ہم چاند اور سورج وغیرہ کو کامل ترین مخلوق الٰہی یا مظہر جلال خداوندی سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ صابئین چاند اور سورج کو خدا تعالیٰ کا مظہر اتم سمجھے اور نصاریٰ مسیح بن مریم علیہ السلام کو اور دونوں گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

شبہ: ...... بادی النظر میں یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز عدم محض ہو تو پھر اس کو وجود کا حکم کیونکر دیا جا سکتا ہے کیونکہ حکم تو موجود کو دیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ موجود کو وجود کا حکم دینا تحصیل حاصل ہے۔

جواب: ...... یہ ہے کہ یہ امر کن امر تکلیفی نہیں جس کے لیے وجود مخاطب اور فہم خطاب ضروری ہو بلکہ یہ امر تسخیری اور تکوینی ہے جس سے معدوم کو موجود کیا جاتا ہے۔ ذات انسانی میں اصل فاعل مختار اس کا اندرونی نفس ناطقہ ہے اور اعضاء اور جوارح اس کے حکم پر حرکت کرتے ہیں۔ نفس ناطقہ جب زبان کو بولنے کا حکم دیتا ہے تو زبان سے وہ کلمات ظہور اور وجود میں آنے لگتے ہیں کہ پہلے سے جن کا وجود خارجی میں کہیں نام ونشان نہ تھا اور نفس ناطقہ قدم کو چلنے کا حکم دیتا ہے جس سے وہ حرکات ظہور میں

آتی ہیں جو پہلے سے معدوم تھیں مگر نفس ناطقہ کے علم اور تصور میں تھیں۔

اسی طرح سمجھو کہ جو ممکنات خارج میں معدوم ہیں وہ سب علم الٰہی میں موجود ہیں جس معدوم کو حق تعالیٰ اپنے خزانہ علم سے نکال کر خارج میں موجود کرنا چاہتا ہے اس کو کن خطاب فرماتے ہیں اسی طرح وہ معدوم وجود علمی سے نکل کر وجود خارجی میں آجاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کو ہر شدنی امر کا اس کے ہونے سے پہلے علم ہوتا ہے اس لیے وہ چیزیں جو ابھی عدم سے وجود میں نہیں آئی ہیں وہ سب اس کے علم میں موجود ہیں اور اس کے نزدیک موجود کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لیے جب وہ ان کو عدم سے وجود کی طرف نکلنے کا حکم دیتا ہے اور کن کہتا ہے تو موجود ہو جاتی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس معدوم کی صورت علم الٰہی میں پہلے سے موجود ہوتی ہے وہ کن کا مخاطب اور محکوم ہوتی ہے متکلمین کے دو گروہ ہیں ایک اشاعرہ اور ایک ماتریدیہ۔ ماتریدیہ کے نزدیک یہ آیت اپنے ظاہر اور حقیقت پر ہے اور اشاعرہ کے نزدیک یہ آیت مجاز اور تمثیل پر محمول ہے قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار فرمایا کہ آیت میں حقیقۃً کسی شے کو کن کا خطاب کرنا مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کو حقیقۃً امر فرمایا ہو اور اس نے امتثال کیا ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت کی یہ ایک مثال دی ہے کہ جس طرح کوئی آمر کسی مامور کو حکم دے وہ فوراً مطیع ہو جائے۔ اسی طرح جب ہم کسی شے کو پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ شے فوراً موجود ہو جاتی ہے۔ ہمارے ارادہ اور پیدائش میں ذرا برابر فاصلہ نہیں ہوتا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ

اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی آیت ف۱ اسی طرح کہہ چکے ہیں وہ لوگ جو

اور کہنے لگے جن کو علم نہیں کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا ہم کو آوے کوئی آیت اسی طرح کہہ چکے ہیں ان سے

قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۱۱۸

ان سے پہلے تھے انہی کی سی بات ایک سے ہیں دل ان کے بیشک ہم نے بیان کر دیں نشانیاں ان لوگوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں ف۲

اگلے انہی کی سی بات ایک سے ہیں دل بھی ان کے ہم نے بیان کر دیں نشانیاں واسطے ان لوگوں کے جن کو یقین ہے۔

شناعت سی ودیکم (۳۱) ایضاً باشتراک نصاریٰ ومشرکین

قال تعالیٰ: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ... الى ... لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾

گزشتہ آیات میں ان کی توحید کا حال بیان فرمایا اب ان آیات میں نبوت کے بارے میں ان کے شبہ کو بیان فرماتے ہیں اور یہ نادان یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بلا واسطہ کلام کیوں نہیں فرماتا کہ یہ خود بالمشافہ ہم سے کہہ دے کہ یہ ہمارے نبی اور رسول ہیں تو ہم ان کی رسالت کے قائل ہو جائیں اور ان کی اطاعت کرنے لگیں یا اگر ہم سے کلام نہیں کرتے

ف۱ یعنی اہل کتاب اور بت پرستوں میں جو جاہل ہیں وہ سب کہتے ہیں کہ "اللہ ہم سے بلا واسطہ بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی کیوں نہیں بھیجتا کہ رسالت کی تصدیق کرلیں"۔

ف۲ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "پہلے لوگوں نے بھی ایسی ہی جہالت کی بات کہی تھی یہ نئی بات نہیں اور جو یقین لانے والے ہیں ان کے لئے ہم نے نبی کے برحق ہونے کی نشانیاں بیان کر دی ہیں۔ اور جو ضد اور عداوت پر اڑ رہے ہیں وہ انکار کریں تو یہ محض عناد ہے ان کا"۔

تو کم از کم من جانب اللہ ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی آ جائے کہ جسے دیکھ کر ہم کو بداہۃً آپ کی نبوت کا یقین آ جائے حق تعالی فرماتے ہیں یہ کوئی نیا جاہلانہ سوال نہیں جو جاہل ان سے پہلے گزرے وہ بھی ایسی باتیں کہتے رہے ہیں اور یہی ان کے جاہل اور نادان ہونے کی دلیل ہے کہ باوجود اپنے کمال نالائقی کے اپنے کو خدا تعالی کی ہم کلامی کا اہل سمجھتے ہیں۔ تم تو دنیاوی بادشاہوں اور امیروں کی ہم کلامی کا بھی رتبہ نہیں رکھتے اگر ہر شخص خدا کی ہم کلامی کا رتبہ رکھتا تو پھر انبیاء اور مرسلین کے بھیجنے کی ضرورت کیا تھی۔ کیا دنیا میں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں وزیر کے حکم کو نہیں مانوں گا جب تک کہ بادشاہ خود بالمشافہ مجھ سے آ کر یہ نہ کہہ دے کہ یہ میرا وزیر ہے تم اس کی اطاعت کرنا اور چونکہ ان کی یہ بات بالکل مہمل تھی اس لیے حق تعالی نے اس کا کوئی جواب نہیں ارشاد فرمایا: ع پس جواب احمق آمد سکوت

بلکہ اس جاہلانہ سوال کے منشاء کو بیان فرمایا وہ یہ کہ ان اگلے اور پچھلے کافروں کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لیے ان پچھلے نادانوں کے شبہات پہلے نادانوں کے شبہات کے مشابہ ہیں۔ یعنی اس زمانہ کے کافر اگرچہ پہلے زمانہ کے کافروں سے بہت بعد ہیں اور آپس میں کوئی سلسلہ وصیت بھی نہیں مگر قلوب سب کے ہم رنگ ہیں اسی وجہ سے شبہات میں بھی تشابہ اور ہم رنگی ہے اور آیات اور معجزات کے انکار میں ایک دوسرے کے قدم بقدم ہیں اور من مانے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ تم ”﴿أَوْ تَأْتِينَآ ءَايَةٌ﴾“ کہہ کر ایک نشانی مانگتے ہو۔ ایک نشانی نہیں تحقیق ہم آپ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کے لیے صدہا بلکہ ہزار واضح اور روشن نشانیاں ظاہر کر چکے ہیں مثلاً شجر اور حجر کا آپ کو سلام کرنا اور جانوروں کا آپ ﷺ کی نبوت کی شہادت دینا وغیرہ وغیرہ مگر افسوس ان نادانوں کو ان روشن اور واضح معجزات سے کوئی نفع نہ ہوا۔ یہ آیات بینات ان لوگوں کے لیے نافع ہیں جو یقین اور اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ضدی اور معاند نہیں۔

فائدہ:...... تشبیہ اور تشابہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ مختلف المراتب ہوتے ہیں اور تشابہ میں دونوں متشابہ مساوی اور برابر ہوتے ہیں اسی وجہ سے جہاں مساوات کا بیان مقصود ہوتا ہے وہاں بجائے تشبیہ کے تشابہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کما قال قائل ؎

رق الزجاج ورقت الخمر فتشابها وتشاکل الامر
فکانما خمر ولا قدح وکانما قدح ولا خمر

اسی طرح یہاں ﴿تَشَٰبَهَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ میں تشابہ کا لفظ اختیار فرمایا اس لیے کہ مقصود یہ بتلانا ہے کہ اگلے اور پچھلے کافروں کے دل یکساں ہیں کوئی فرق نہیں۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾ وَلَن تَرْضَىٰ

بیشک ہم نے تجھ کو بھیجا ہے سچا دین دیکر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور تجھ سے پوچھ نہیں دوزخ میں رہنے والوں کی ف۱ اور ہرگز راضی نہ ہوں گے

ہم نے تجھ کو بھیجا ہے ٹھیک بات لے کر خوشی اور ڈر سنانے کو اور تجھ سے پوچھ نہیں دوزخ والوں کی اور ہرگز راضی نہ ہوں گے

ف۱ یعنی تجھ پر الزام نہیں کہ ان کو مسلمان کیوں نہیں کیا۔

عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَىِٕنِ

تجھ سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تو تابع نہ ہو ان کے دین کا ف۱ تو کہہ دے جو راہ اللہ بتلاوے وہی راہ سیدھی ہے ف۲ اور اگر بالفرض

تجھ سے تو یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تابع نہ ہو تو ان کے دین کا تو کہہ جو راہ اللہ دکھاوے وہی راہ ہے اور کبھی

اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا

تو تابعداری کرے انکی خواہشوں کی بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنے والا اور نہ

تو چلا ان کی پسند پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنے والا اور نہ

نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ

مددگار ف۳ وہ لوگ جن کو دی ہم نے کتاب وہ اسکو پڑھتے ہیں جو حق ہے اسکے پڑھنے کا وہی اس پر یقین لاتے ہیں اور جو کوئی

مددگار جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے پڑھنے کا وہ اس پر یقین لاتے ہیں اور جو کوئی

يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع ۱۴

منکر ہوگا اس سے تو وہی لوگ نقصان پانے والے ہیں ف۴

منکر ہوگا اس سے سو انہیں کو نقصان ہے۔

خاتمہ کلام واتمام حجت والزام وتسلیہ سید انام علیہ افضل الصلوۃ والسلام

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ... الی ... فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾

ربط: ...... یہاں تک بنی اسرائیل کی قباحتوں اور شناعتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔ شنائع بنی اسرائیل کی تفصیل کی ابتداء کفران نعمت اور دناءت اور خست سے فرمائی۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ ''اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہ کریں گے۔''

• اور پھر درمیان میں ان کی قساوت قلب کو ذکر فرمایا:

ف۱ یعنی یہود اور نصاریٰ کو امر حق سے سروکار نہیں۔ اپنی ضد پر اڑ رہے ہیں وہ کبھی تمہارا دین قبول نہ کریں گے۔ بالفرض اگر تم ہی ان کے تابع ہو جاؤ تو خوش ہو جاویں گے اور یہ ممکن نہیں تو اب ان سے موافقت کی امید نہ رکھنی چاہیے۔

ف۲ یعنی ہر زمانہ میں معتبر وہی ہدایت ہے جو اس زمانہ کا نبی لائے سو اب وہ طریقہ اسلام ہے نہ طریقہ یہود و نصاریٰ۔

ف۳ یہ بات بطریق فرض ہے۔ یعنی بالفرض اگر آپ ایسا کریں تو قہر الٰہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ یا منظور تنبیہ ہے امت کو کہ اگر کوئی مسلمان ہو کر قرآن کو سمجھ کر دین سے پھرے گا تو اس کو عذاب سے کوئی نہ چھڑا سکے گا۔

ف۴ یہود میں تھوڑے آدمی منصف بھی تھے کہ اپنی کتاب کو پڑھتے تھے سمجھ کر وہ قرآن پر ایمان لائے (جیسے حضرت عبداللہ ابن سلامؓ اور ان کے ساتھی) یہ آیت انہی لوگوں کے بارہ میں ہے یعنی انہوں نے توریت کو غور سے پڑھا انہی کو ایمان نصیب ہوا اور جس نے انکار کیا کتاب کا یعنی اس میں تحریف کی وہ خائب و خاسر ہوئے۔

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ ''پھر سخت ہو گئے تمہارے دل اس کے بعد پس وہ پتھر کی مانند ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت۔''

اور اس قبائح اور شنائع کے سلسلہ کو ان کے کبر و نخوت پر ختم فرمایا کہ اس قدر مغرور اور متکبر ہیں کہ اپنے کو خداوند ذوالجلال کی ہم کلامی کا اہل سمجھتے ہیں اور احکم الحاکمین کے وزراء و نائبین یعنی انبیاء و مرسلین کے اتباع اور اطاعت کو اپنے لیے کسر شان سمجھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تکبر اور نخوت سے بڑھ کر کوئی مرض نہیں تکبر ہی تمام امراض کی جڑ ہے یہی مرض سب سے پہلے دنیا میں آیا اور یہی مرض ابلیس کی لعنت کا سبب بنا۔ اب ان قبائح اور شنائع کے بعد آنحضرت ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ اے ہمارے نبی آپ مغموم اور رنجیدہ نہ ہوں اور اب ان کے رشد و ہدایت کی طمع دل سے نکال دیجئے جن کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہوں اور کبر اور نخوت سے لبریز ہوں۔ ان سے اسلام اور ایمان کی توقع نہ رکھیے۔ حق ان پر واضح ہو چکا ہے۔ آپ کی نبوت و رسالت کے اتنے واضح اور روشن دلائل ہم نے واضح کر دیئے ہیں کہ جس کے بعد طالب حق کے لیے کسی قسم کے شک اور تردد کی گنجائش نہیں اور علاوہ ازیں ہم نے آپ کو دین حق دے کر بھیجا ہے جو آپ کی نبوت کی مستقل اور روشن دلیل ہے اور ایسا ثابت اور پختہ ہے کہ جو موجب طمانینت و یقین ہے اور شکوک اور شبہات سے اس میں تزلزل کا امکان نہیں بالفرض اگر آپ سے کوئی بھی معجزہ ظاہر نہ ہوتا تو فقط آپ کا دین حق اور آپ کی شریعت حقہ ہی آپ کی نبوت کے ثابت کرنے کے لیے کافی اور وافی تھی۔ نیز ہم نے آپ کو مخلوق کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے کہ ماننے والوں کو جنت کی بشارت سنائیں اور منکرین کو عذاب سے ڈرائیں اور پھر لوگ اپنے اختیار سے ایمان لائیں اگر ایسے معجزات ظاہر کر دیئے جائیں کہ جن سے مجبور اور لاچار ہو کر ایمان لانا پڑے تو وہ ایمان بے سود ہے مکلف بنانے کا جو مقصد ہے وہ جبری ایمان کی صورت میں باقی نہیں رہتا اور اگر یہ بدنصیب اب بھی ایمان نہ لائیں اور آپ کی دعوت حقہ کو قبول نہ کریں تو آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ آپ نے اپنا فرض منصبی یعنی دعوت و تبلیغ ادا کر دیا۔ آپ سے ان جہنمیوں کے بارے میں کوئی باز پرس نہ ہو گی از خود انہوں نے کفر اور جہنم کی راہ اختیار کی ہے۔ اگر آپ کا اختیار چلتا تو کبھی ان کو جہنم کی راہ نہ چلنے دیتے اور ان لوگوں کا آپ کی پیروی اور اتباع سے اعراض اس لیے نہیں کہ آپ کے دلائل نبوت میں کسی قسم کا قصور ہے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ یہود اور نصاریٰ ہرگز آپ سے راضی اور خوش نہ ہوں گے تاوقتیکہ آپ ان کی منسوخ ملت کا اتباع اور پیروی نہ کریں وہ اس غرہ میں ہیں کہ ہم کتب الٰہیہ کے علوم کے حامل اور علمبردار ہیں۔ ہم کسی کا کیوں اتباع کریں۔ ہم تو سب کے متبوع اور سردار ہیں لہٰذا جو شخص اپنے آپ کو متبوع سمجھتا ہو وہ تابع بننے پر کب راضی ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ ان کے اس خیال خام کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ تحقیق اللہ کی ہدایت ہر زمانہ میں وہی ہدایت ہے جو اس زمانہ کا نبی اور رسول لے کر آئے اور گزشتہ ہدایتیں اگرچہ اپنے اپنے وقت پر ہدایتیں تھیں مگر منسوخ ہو جانے کے بعد ہدیٰ۔ ہدیٰ نہیں رہتی بلکہ ہوائے نفس بن جاتی ہے اور نفسانی خواہشوں کا اتباع کبھی ہدایت نہیں ہو سکتا۔ وہ تو صریح ضلالت ہے اور اگر بالفرض محال آپ ان ہوا پرستوں کی نفسانی خواہشوں کا اتباع کریں بعد اس کے کہ آپ کے پاس اس بات کا علم قطعی آ چکا ہے کہ اب ہدایت اس میں منحصر ہے کہ جو اللہ نے آپ پر نازل فرمایا اور گزشتہ کی تمام ہدایتیں منسوخ ہو کر ہوائے نفس بن چکی ہیں۔ پس اگر آپ آخری حکم اور آخری ہدایت کو چھوڑ کر کسی پہلی ہدایت اور کسی

پہلے حکم کا اتباع کریں تو اللہ کے مقابلہ میں کوئی آپ کا حامی اور مددگار نہیں جو اللہ کے عذاب سے آپ کو بچائے۔ حتی کہ اگر آپ توریت اور انجیل پر عمل کریں تو موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام بھی آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ان بیچاروں کا تو ذکر ہی کیا۔

ف:...... یہ تہدیدی خطاب ظاہراً حضور ﷺ کو ہے لیکن سنانا معاندین کو ہے، عناد کی بناء پر ان کو مخاطب بھی نہیں بنایا اور ان کے خطاب سے اعراض فرمایا۔

یہاں تک ان اہل کتاب کا ذکر تھا کہ جو برائے نام اہل کتاب ہیں اور فی الحقیقت اپنی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے اور عناد اور تعصب کی وجہ سے حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے آئندہ آیت میں ان اہل کتاب کی مدح ہے جنہوں نے دل و جان سے حق کا اتباع کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب یعنی توریت اور انجیل عطاء کی اور ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس کتاب کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں جو اس کی تلاوت کا حق ہے یعنی نہ اس میں لفظی تحریف کرتے ہیں اور نہ معنوی تحریف اور نبی آخر الزمان کی جو بشارتیں ان کی کتاب میں ہیں ان کو چھپاتے نہیں ایسے ہی لوگ حقیقۃً اپنی کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور اپنی کتاب کی ہدایت اور بشارت کے مطابق نبی آخر الزمان ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں اور جو لوگ نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان نہیں لاتے وہ درحقیقت اپنی اپنی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ اور جائز ہے کہ ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ میں "بہ" کی ضمیر بجائے کتاب کے ہدیٰ یا قرآن کی طرف راجع کی جائے یعنی جو لوگ توریت اور انجیل کی کما حقہ تلاوت کرتے ہیں وہی اس ہدایت کو قبول کرتے ہیں جو نبی آخر الزمان ﷺ پر نازل ہوئی اور وہی اس آخری کتاب پر ایمان لاتے ہیں جس کی بشارت اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور فلاح دارین حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی کتاب کا انکار کرتے ہیں یعنی توریت اور انجیل میں تحریف کرتے ہیں اور حضور کے ظہور کی جو بشارتیں ان کی کتاب میں مذکور ہیں ان کا انکار کرتے ہیں۔ پس یہی لوگ خسارہ والے ہیں کہ اپنی کتاب پر جو ایمان رکھتے تھے وہ بھی ہاتھ سے گیا۔ اور جائز ہے کہ ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ﴾ میں "بہ" کی ضمیر ہدیٰ اور قرآن کی طرف راجع ہو یا حضور کی طرف راجع ہو یعنی جو لوگ حضور ﷺ کی نبوت یا آپ کی ہدایت یا آپ کے قرآن کے منکر ہیں وہ انتہائی خسارہ میں ہیں اس لیے کہ حضور ﷺ آخری نبی ہیں اور قرآن آخری کتاب ہے۔ جب اس پر بھی ایمان نہ لائے تو آخرت کی نجات کا ذریعہ آخر کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حبشہ سے آئے تو چالیس آدمی ان کے ہمراہ تھے بتیس ان میں حبشہ کے تھے اور آٹھ شام کے تھے اور بحیرا راہب بھی ان میں تھا ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ ﴿الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ﴾ سے صحابہ کرام مراد ہیں اور الکتاب سے قرآن مراد ہے اور ﴿حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تلاوت کے پورے حقوق ادا ہونے چاہئیں۔ فرض کرو کہ ایک بادشاہ اپنے فرمان کو اپنے سامنے پڑھنے کا حکم دے تو اس وقت یہ حالت ہوگی کہ ہر لفظ کو سنبھل سنبھل کر اور صاف صاف ادا کرو گے اور معنی اور مفہوم کی طرف بھی پوری توجہ ہوگی اور دل میں یہ پختہ ارادہ ہوگا کہ اس فرمان میں جس قدر بھی احکام ہیں حرف بحرف ان کی تعمیل کروں گا۔ اور پڑھتے وقت دربار شاہی کے آداب سے بھی ذرہ برابر غفلت نہ ہوگی۔ اسی طرح تلاوت قرآن کو سمجھو کہ ہم اللہ رب العالمین کے سامنے پڑھ رہے ہیں ایک ایک لفظ کو صاف صاف ادا کرو۔ یہ ترتیل اور تجوید ہے اور اس کے

اتباع اور تعمیل کے عزم بالجزم کا نام ایمان اور اطاعت ہے اسی وجہ سے ﴿اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ فرمایا اور حضرت عمر ؓ سے ﴿یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾ کی تفسیر میں منقول ہے کہ تلاوت کا حق یہ ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کرتے وقت جنت کے ذکر پر گزرے تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرے اور جب آگ کے ذکر پر گزرے تو خدا سے پناہ مانگے کہ اے اللہ اس سے محفوظ رکھنا (ابن ابی حاتم)

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی

اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان ہمارے جو ہم نے تم پر کئے اور اس کو کہ ہم نے تم کو بڑائی دی اہل

اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان میرا جو میں نے تم پر کیا اور وہ کہ بڑا کیا تم کو

الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا

عالم پر، اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کام آوے کوئی شخص کسی کی طرف سے ذرا بھی اور نہ قبول کیا جاوے گا

سارے جہان پر اور بچو اس دن سے کہ نہ کام آوے کوئی شخص کسی کے ایک ذرہ اور نہ قبول ہو اس

عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اس کی طرف سے بدلہ اور نہ کام آوے اس کو سفارش اور نہ ان کو مدد پہنچے [1]

کی طرف سے بدلا اور نہ کام آوے اس کو سفارش اور نہ ان کو مدد پہنچے۔

تکریر تذکیر و اعادۂ تحذیر

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ ... الی ... وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾

ربط:...... ابتداء سورت میں جب بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا تو اسی عنوان اور اسی آیت سے شروع فرمایا اور طویل تفصیل کے بعد پھر اسی عنوان اور اسی آیت پر خطاب کو ختم فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ اولاً حق تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو اجمالاً یاد دلایا تا کہ شکر کی راہ اختیار کریں اور کفران نعمت سے احتراز کریں۔ بعد ازاں حق تعالیٰ نے اپنے انعامات اور اپنی عنایات اور ان کی جنایات اور تقصیرات کی تفصیل فرمائی جو یہاں آ کر ختم ہوئی اخیر میں حق تعالیٰ نے پھر اسی مضمون کا اعادہ فرمایا جو ابتداء میں اجمالاً ان سے کہا گیا تھا تا کہ تفصیل کے بعد جب اجمال کا اعادہ کیا جائے تو تمام تفصیل بیک وقت نظروں کے سامنے آ جائے اور یہ طریقہ بلغاء کے نزدیک نہایت بلیغ ہے اور تعلیم و تفہیم میں غایت درجہ معین ہے اور ابو حیان فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو اس سورت میں تین مرتبہ "یا بنی اسرائیل" کے معزز خطاب سے مخاطب فرمایا اور اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنے خطاب سے مشرف اور سرفراز فرمایا اور اس نسبت کو یاد دلا کر شکر اور اطاعت کی دعوت دی لیکن بنی اسرائیل نے جب اس ندا اور خطاب کے شرف کو ملحوظ نہ رکھا تو حق تعالیٰ نے ان سے اعراض فرمایا اور تین مرتبہ کے بعد ان کو

[1] بنی اسرائیل کو جو باتیں شروع میں یاد دلائی گئی تھیں اب ان کے سب حالات ذکر کرنے کے بعد پھر وہی امور بغرض تاکید و تنبیہ یاد دلائے گئے کہ خوب ذہین ہو جائیں اور ہدایت قبول کریں اور معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود اس قصہ سے یہ ہے۔

مخاطب نہیں بنایا چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل پھر ایک بار تم کو خطاب کرتے ہیں اور یہ تیسری بار ہے اب اس کے بعد ہم تم کو مخاطب نہ بنائیں گے وہ آخری خطاب یہ ہے کہ میری نعمتوں کو اس حیثیت سے یاد کرو کہ وہ میرا عطیہ تھیں۔ میری نسبت کے شرف اور عزت کو دیکھو اور یاد کرو اور پھر اس حیثیت کو دیکھو کہ اس نعمت کا میں نے تم پر محض اپنی مہربانی سے انعام کیا تھا۔ ذرا برابر تمہارا استحقاق نہ تھا اور یاد کرو اس امر کو کہ میں نے تم کو محض اپنے فضل سے سارے جہانوں پر فضیلت اور بزرگی دی تھی۔ یہ بزرگی میرا عطیہ تھا تمہاری ذاتی شے نہ تھی کہ تم سے جدا نہ ہو سکے۔ تم اس غرہ میں نہ رہنا کہ یہ بزرگی تم سے چھینی نہیں جا سکتی۔ اگر اس فضیلت اور بزرگی کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو ہمارے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس دن سے ڈرو کہ جس میں کوئی کسی کی طرف سے کام نہ آئے گا اور ایک نفس کی دوسرے نفس کی طرف نسبت بدون ایمان کے کارآمد نہ ہوگی اور نہ اس کی طرف سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا کہ جو رہائی کا سبب بن سکے اور نہ بدون ایمان کے کوئی شفاعت اور سفارش نفع دے گی البتہ انبیاء اور اولیاء کی شفاعت سے اہل ایمان کو نفع ہوگا اور نہ ان لوگوں کی کوئی مدد کی جائے گی اس لیے کہ نصرت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے مرسلین اور اہل ایمان سے کیا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ کافروں سے وعدہ نہیں۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ

اور جب آزمایا ابراہیم کو اسکے رب نے کئی باتوں میں ف۱ پھر اسنے وہ پوری کیں تب فرمایا میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا پیشوا ف۲

اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں پھر اس نے وہ پوری کیں فرمایا میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا پیشوا

قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴿١٢٤﴾

بولا اور میری اولاد میں سے بھی فرمایا نہیں پہنچے گا میرا قرار ظالموں کو ف۳

بولا اور میری اولاد میں بھی کہا نہیں پہنچتا میرا اقرار بے انصافوں کو۔

ف۱ جیسے حج کے افعال اور ختنہ اور حجامت اور مسواک وغیرہ سو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان احکام کو اللہ کے ارشاد کے موافق اخلاص کے ساتھ بجالائے اور سب کو پوری طرح سے ادا کیا جس پر لوگوں کے پیشوا بنائے گئے۔

ف۲ یعنی تمام انبیاء تیری متابعت پر چلیں گے۔

ف۳ بنی اسرائیل اس پر بہت مغرور تھے کہ ہم اولاد ابراہیمؑ میں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے وعدہ کیا ہے کہ نبوت و بزرگی تیری اولاد میں رہے گی۔ اور ہم حضرت ابراہیمؑ کے دین پر ہیں۔ اور ان کے دین کو سب مانتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ ان کو سمجھاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ تھا وہ ان سے تھا جو نیک راہ پر چلیں اور حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے ایک مدت تک حضرت اسحٰقؑ کی اولاد میں پیغمبری اور بزرگی رہی اب حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں پہنچی (اور انہوں نے دونوں بیٹوں کے حق میں دعا کی تھی) اور فرماتا ہے کہ دین اسلام ہمیشہ ایک ہے سب پیغمبر اور سب امتیں اس پر گذریں (وہ یہ کہ جو حکم اللہ بھیجے پیغمبر کے ہاتھ اس کو قبول کرنا) اب یہ طریقہ مسلمانوں کا ہے اور تم اس سے پھرے ہوئے ہو۔ پہلی آیات میں اپنے انعامات بتلائے تھے اب ان کے اس شبہے کو دفع کیا کہ بنی اسرائیل اپنے آپ کو سارے عالم کا امام اور متبوع اور سب سے افضل سمجھ کر کسی کا اتباع نہ کرتے تھے۔ فائدہ۔ بنی اسرائیل کے واقعات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اور انکی منقبت مذکور ہوئی۔ اب ان کے ذکر کے ذیل میں خانہ کعبہ کی حالت اور فضیلت ان آیات میں ذکر فرمائی اور انکے ضمن میں یہود و نصاریٰ پر الزامات بھی ہیں جیسا کہ مفسرین نے ذکر کیا۔

قصہ کامیابی ابراہیم خلیل علیہ السلام در امتحان خداوند جلیل

وتحویلِ کلام از ذکر بنی اسرائیل بسوئے ذکرِ بنی اسمٰعیل علیہ السلام

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ ... الی... قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾

ربط:...... بنی اسرائیل اس بات پر مغرور تھے کہ ہم اہل کتاب اور اہل علم اور اولاد ابراہیم ہیں اس لیے ہم ہی سب کے متبوع اور مقتداء اور پیشوا اور امام ہیں۔ امامت اور سیادت ہمارے ہی گھر میں رہے گی۔ ہمیں کسی کے اتباع کی کیا ضرورت۔ اس کے جواب میں حق تعالیٰ شانہ نے حضرت ابراہیم کا قصہ ذکر فرمایا جس سے چند اُمور کا بیان کرنا مقصود ہے، اول یہ کہ امام اور مقتدا وہی ہوسکتا ہے جو ظالم اور فاسق نہ ہو۔ اور تمہارا کفر اور ظلم خوب واضح ہو چکا ہے۔ ظالم اور فاسق ہو کر امامت اور متبوعیت کا خیال سودائے خام ہے امامت اور متبوعیت کا مرتبہ جب ہی ملتا ہے کہ جب اللہ کے امتحان میں کامیاب اور درست نکلے۔ دوم یہ بتلانا ہے کہ خانہ کعبہ جو مسلمانوں کا قبلہ ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے اس کی فضیلت اور بزرگی میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا۔ تاکہ گزشتہ رکوع میں جو یہود کا بعض احکام کے نسخ خصوصاً تحویل قبلہ پر جو اعتراض تھا جس کا ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ﴾ میں کافی وشافی جواب گزر چکا۔ اُس اعتراض کا قلع قمع ہو جائے چونکہ تحویل قبلہ کے مسئلہ کا اعظم ارکان اسلام سے خاص تعلق ہے اس لیے اس بارے میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ مفصل کلام کیا اول بانی کعبہ کی فضیلت اور پھر ان کی امامت اور پھر خانہ کعبہ کی فضیلت اور پھر اس کی تحویل کی حکمتیں بیان کیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ نبی آخر الزمان ﷺ کی ملت اور قبلہ وہی ہے جو حضرت ابراہیم کا تھا۔ سوم یہ کہ ملت اسلام وہی ملت ابراہیمی ہے۔ چہارم یہ کہ امت مسلمہ اور نبی آخر الزمان ﷺ کے ظہور اور بعثت کی دعا سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔ لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر وہی شخص ہوسکتا ہے جو ملت اسلام کو قبول کرے اور نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لائے اور خانہ کعبہ کو اپنا قبلہ سمجھے۔ پنجم یہ کہ یہ خیال کرنا کہ نبی آخر الزمان ﷺ ہمارے خاندان سے نہیں اس لیے ہم ان پر ایمان نہیں لائیں یہ خیال غلط ہے اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے ایک اسحٰق علیہ السلام جن کے بیٹے اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام ہیں ایک مدت تک نبوت اور فضیلت حضرت اسحٰق علیہ السلام اور اسرائیل کی اولاد میں رہی اب وہ فضیلت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کو پہنچی اور وہ نعمت تفصیل جس سے بنی اسرائیل کو سرفراز فرمایا تھا اب وہ بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہوئی اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام نے دونوں ہی بیٹوں کے لیے برکت کی دعا کی تھی جس طرح اسحٰق علیہ السلام اور ان کی اولاد کے لیے برکت کی دعا مانگی تھی۔ اور اسی طرح اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے بھی برکت کی دعا مانگی تھی جیسا کہ توریت کے سفر پیدائش باب ۱۷ میں ہے:

''اور اسمٰعیل علیہ السلام کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا''۔ انتہیٰ۔

پس تم کو چاہیے کہ اب اس نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ جو ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے اور اس کا ظہور اور اس کی بعثت دعا ابراہیمی کی برکت اور ثمرہ ہے اور اس نبی پر ایمان لا کر امت مسلمہ میں داخل ہو جاؤ اور دل وجان سے اس

کی اطاعت کرو تا کہ تم کو بھی بقدر اطاعت اس برکت میں سے کچھ حصہ ملے۔ اور ابراہیم خلیل اللہ کی طرح اسلام اور اطاعت اور وفاداری اور محبت اور جانثاری کا داغ اپنے جسم پر لگاؤ یعنی ختنہ کراؤ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کرائی تھی۔ توریت میں ہے کہ ختنہ اللہ کا داغ ہے جس طرح شاہی گھوڑوں پر داغ ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل اور اس کی اولاد کے لیے ختنہ کا داغ تجویز فرمایا اور قوت شہویہ اور بہیمیہ کے محل پر ختنہ کے داغ سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ عضو سرکاری داغ سے داغی ہے بغیر سرکاری اجازت کے کسی مصرف میں اس کا استعمال جائز نہیں اور موئے لب کٹوانا اور ناخن کتروانا اور موئے بغل لینا اور مضمضہ اور استنشاق کرنا وغیر ذلک یہ بھی اسلام یعنی اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے داغ ہیں۔ لہٰذا اے بنی اسرائیل اگر تم نعمت تفضیل میں سے حصہ لینا چاہتے ہو تو اب اس نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ کہ جو بنی اسمٰعیل میں سے دعائے ابراہیمی کے مطابق مبعوث ہوا ہے بنی اسرائیل کی تفضیل کا دور دورہ ختم ہوگیا اب تا قیامت بنی اسمٰعیل کی تفضیل کا دور دورہ رہے گا چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ابراہیم کو اس کے پروردگار نے چند باتوں سے آزمایا۔ ابراہیم کی یہ آزمائش بھی رب کریم کی طرف سے تربیت تھی۔ ابراہیم کے پروردگار نے ابتداء ہی سے ابراہیم کی طرح طرح سے تربیت کی۔ طفولیت میں رشد عطاء کیا اور پھر مرتبہ نبوت وخلت تک پہنچایا۔ یہاں تک کہ بطور آزمائش ان کو چند باتوں کا حکم دیا تا کہ ملائکہ علوی اور سفلی کے سامنے ان کا فضل وکمال اور حسن استعداد اور کمال قابلیت اور اہلیت ظاہر ہوجائے اور یہ بات خوب واضح ہوجائے کہ جو مرتبہ ہم ان کو عطا کرنا چاہتے ہیں یہ اس مرتبہ کے لائق اور اہل ہیں حق تعالیٰ شانہ کی یہ سنت مستمرہ ہے کہ محض اپنے علم کی بناء پر کسی کو منصب اور مرتبہ نہیں عطا فرماتے جب تک کہ اس کی استعداد اور قابلیت اور اس کا استحقاق علی روس الاشہاد ظاہر نہ ہوجائے جیسا کہ آدم علیہ السلام کے قصہ میں پیش آیا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے فضل اور کمال اور استعداد قابلیت کے ظاہر کرنے کے لیے چند باتوں سے ان کا امتحان فرمایا پس ابراہیم دل وجان سے کمال مسرت وبشاشت کے ساتھ بلا کمی وبیشی کے ان تمام باتوں کو بتمام وکمال بجالائے۔ جس سے ان کی قوت علمیہ اور عملیہ کا کمال اور روح اور فطرت کی صفائی اور نورانیت اور ظاہر وباطن کی طہارت ونظافت خوب واضح ہوگئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم! میں تجھ کو اس کے صلہ میں تمام لوگوں کا امام اور پیشوا بناؤں گا کہ تمام لوگ تیری پیروی کریں اور تیرا اتباع حقانیت کی دلیل ہو اور تیری مخالفت گمراہی کی دلیل ہو اور تیری ملت تمام عالم کے لیے بمنزلہ دستور اساسی کے ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا یہود اور نصاریٰ اور مشرکین عرب اور مسلمان سب ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں۔ عرض کیا کہ اے پروردگار اور میری اولاد میں سے ہر زمانہ میں کوئی امام رہے زمین کسی وقت بھی میرے سلسلہ امامت سے خالی نہ رہے غرض یہ تھی کہ تو نے مجھ کو تمام لوگوں کا امام بنایا اور قیامت تک میری بقاء عادۃً ممکن نہیں اس لیے بقائے امامت کی صورت یہ ہے کہ یہ منصب عظیم قیامت تک میری نسل میں باقی رہے اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ میں نے تمہاری یہ دعا قبول کی اور تمہاری ہی اولاد میں پیغمبری اور کتاب رہے گی جیسا کہ سورۂ عنکبوت میں ہے: ﴿وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾. مگر یہ سنائے دیتا ہوں کہ یہ ہر زمانہ میں ممکن نہ ہوگا بعض زمانوں میں تمہاری تمام نسل اور اولاد ظالم ہوگی اور میرا یہ منصب امامت ظالموں اور فاسقوں کو نہیں دیا جاتا اس لیے کہ اس منصب کے لیے عدالت اور تقویٰ شرط ہے اور اس وقت کے یہود اور نصاریٰ اشد انواع ظلم کے مرتکب ہیں شرک اور گوسالہ پرستی اور تحریف توریت وانجیل اور قتل انبیاء اللہ وغیرہ میں مبتلاء ہیں۔ منصب امامت کی ان میں بالکل اہلیت نہیں اور جو ان کو باوجود ظالم

ہونے کے اپنا امام بنائے وہ خود ظالم ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ﴾۔

فائدہ:...... جاننا چاہیے کہ ظلم اور فسق کے مقابلہ میں عدالت اور تقویٰ ہے نہ کہ عصمت بمعنی عدم الخطاء فی الفہم وامتناع صدور معصیت اور امامت کے لیے عدالت اور تقویٰ شرط ہے نہ کہ عصمت۔ لہٰذا اس آیت سے فرقہ امامیہ کا عصمت ایمہ پر استدلال کرنا صحیح نہیں اور نہج البلاغۃ میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے نص صریح موجود ہے۔ لا بد للناس من امیر برا وفاجر یعمل فی امرته المومن ولیستمع الکافر ویامن فیه السبل۔ الخ

اقوال مفسرین در تفسیر کلمات ابتلاء

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جن کلمات سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا وہ حسب ذیل ہیں: ۱- اپنی قوم سے مفارقت کرنا اور برأت یعنی کفر کی وجہ سے ان سے برأت اور بیزاری اور قطع تعلق کرنا۔ ۲- خدا کے لیے مناظرہ۔ ۳- آگ میں ڈالے جانے پر صبر کرنا۔ ۴- وطن سے ہجرت کرنا اور مجمع عشائر واقارب کو چھوڑ کر نکل جانا۔ ۵- مہمان نوازی۔ ۶- ذبح ولد پر تیار ہو جانا اخرجہ ابن اسحٰق وابن ابی حاتم عن ابن عباس (درمنثور ص: ۱/۱۱۱) اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ کلمات جن سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو آزمایا وہ دس خصال فطرت ہیں پانچ تو ان میں سے سر میں ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ مونچھیں کتروانا۔ ۲۔ مضمضہ یعنی کلی کرنا۔ ۳۔ استنشاق یعنی ناک میں پانی ڈالنا۔ ۴۔ مسواک کرنا۔ ۵۔ سر میں مانگ نکالنا اور پانچ خصلتیں باقی بدن کے متعلق ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ ناخن ترشوانا۔ ۲۔ بغل کے بال لینا۔ ۳۔ موئے زیر ناف مونڈنا۔ ۴۔ ختنہ کرنا۔ ۵۔ بول وبراز کی جگہ کو پانی سے دھونا یعنی پانی سے استنجاء کرنا اور ایک روایت میں غسل جمعہ اور طواف بیت اللہ اور سعی مابین الصفاء والمروہ اور رمی جمار اور طواف افاضہ کا ذکر ہے اور صحیح مسلم میں عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دس چیزیں فطرت سے ہیں:

۱۔ مونچھوں کا کتروانا اور۔ ۲۔ داڑھی کا بڑھانا اور۔ ۳۔ مسواک کرنا اور۔ ۴۔ ناک میں پانی ڈالنا اور۔ ۵۔ ناخنوں کا کتروانا اور۔ ۶۔ براجم یعنی جوڑوں کا دھونا اور۔ ۷۔ بغل کے بال لینا اور۔ ۸۔ موئے زیر ناف کا حلق کرنا اور۔ ۹۔ پانی سے استنجاء کرنا راوی کہتے ہیں کہ دسویں خصلت میں بھول گیا شاید وہ مضمضہ ہو اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ کلمات سے وہ تیس (۳۰) خصلتیں مراد ہیں جو شرائع اسلام اور سہام اسلام کے نام سے موسوم ہیں دس ان میں سے سورہ برأت ① میں مذکور ہیں تو بہ۔ عبادت۔ حمد وثناء۔ سیاحت۔ رکوع۔ سجود۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ محافظہ۔ حدود ایمان اور دس ان میں سے سورہ احزاب ② میں مذکور ہیں۔ اسلام۔ ایمان۔ قنوت۔ صدق۔ صبر۔ خشوع۔ صدقہ و نیاز۔ روزہ

---

① سورۂ برأت کی آیتیں یہ ہیں: ﴿التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾

② سورۂ احزاب کی آیت یہ ہے: ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ =

رکھنا۔ شرم گاہ کی حفاظت۔ کثرۃ ذکر اللہ اور دس خصلتیں ان میں سے سورۂ مومنون ⑪ اور سال سائل ⑫ میں مذکور ہیں۔ ایمان بیوم الجزاء۔ خوف وخشیت از عذاب خداوندی۔ خشوع نماز۔ محافظت آداب وسنن نماز۔ لغویات سے اعراض واحتراز۔ اداء زکوۃ بطیب خاطر۔ غیر منکوحہ اور غیر مملوکہ سے شرم گاہ کی حفاظت۔ ایفاء عہد۔ اداء امانت اور ادائے شہادت۔ کلمات کی تفسیر میں اس کے علاوہ اور بھی کچھ اقوال ہیں۔ جو تفسیر درمنثور کی مراجعت سے معلوم ہو سکتے ہیں اور آیت قرآنیہ میں لفظ کلمات سب کو شامل ہے جائز ہے کہ سب مراد ہوں یا بعض مراد ہوں لیکن ایک ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مختلف روایات کا آنا اس سے عموم ہی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۖ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ

اور جب مقرر کیا ہم نے خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ امن کی ف۱ اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو

اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ اور کر رکھو جہاں کھڑا ہوا ابراہیم

مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ

نماز کی جگہ ف۲ اور حکم کیا ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ پاک کر رکھو میرے گھر کو ف۳ واسطے طواف کرنے والوں کے اور اعتکاف کرنے والوں کے

نماز کی جگہ اور کہہ دیا ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ پاک کر رکھو گھر میرا واسطے طواف والوں کے۔ اور اعتکاف والوں کے

وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿١٢٥﴾

اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے۔

اور رکوع اور سجدے والوں کے۔

ف۱ یعنی ہر سال بغرض حج وہاں لوگ مجتمع ہوتے ہیں اور جو وہاں جا کر ارکان حج بجالاتے ہیں وہ عذاب دوزخ سے مامون ہو جاتے ہیں یا وہاں کوئی کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔

ف۲ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کو تعمیر کیا تھا اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کا نشان ہے اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر حج کی دعوت دی تھی اور وہ جنت سے لایا گیا تھا جیسے حجر اسود۔ اب اس پتھر کے پاس نماز پڑھنے کا حکم ہے اور یہ حکم استحبابی ہے۔

ف۳ یعنی وہاں برا کام نہ کرے اور ناپاک اس کا طواف نہ کرے اور تمام آلودگیوں سے صاف رکھا جاوے۔

﴿وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ﴾

⑪ اور سورۂ مومنون کی آیت یہ ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ الآیات.

⑫ اور سال سائل کی آیتیں یہ ہیں: ﴿الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝۲۳ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝۲۴ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۲۵ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۲۶ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝۲۷ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝۲۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۲۹ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۳۰ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۳۱ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۳۲ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝۳۳ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ ۱۲ منہ۔

قصہ بنائے خانہ تجلی آشیانہ وفضائل قبلہ اسلام وتلقین آداب بیت حرام

قال تعالیٰ: ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ... الی... وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾

گزشتہ آیات میں ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور فضیلت کو بیان فرمایا اور ظاہر ہے کہ منصب امامت اور امامت کا لقب۔ صاحب قبلہ ہونے کی طرف مشیر ہے اس لیے آئندہ آیات میں قبلہ ابراہیمی کا ذکر فرماتے ہیں کہ یہ خانہ تجلی آشیانہ وہی گھر ہے جس کو ابراہیم علیہ السلام نے اسمٰعیل علیہ السلام کی شرکت اور معیت میں بنایا تھا اور اسی معبد کے اردگرد اسمٰعیل اور اس کی ذریت کو آباد کیا اور طرح طرح کی دعائیں کیں اور مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل متنبہ ہو جائیں کہ یہ نبی اُمی خاندان ابراہیم علیہ السلام و اسمٰعیل علیہ السلام سے ہے اور یہ خانہ کعبہ جو مسلمانوں کا قبلہ ہے یہ وہی معبد معظم اور سجدہ گاہ محترم ہے جس کے بانی اور معمار امام امم اور فخر عالم ابراہیم علیہ السلام ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام ذبیح اللہ ان کے معین ومددگار اور شریک کار رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس علم کے بعد بنی اسرائیل کو بنی اسماعیل کی تفضیل اور قبلہ اسلام کی فضیلت میں کوئی شبہ نہ رہے گا اور اب آئندہ تحویل قبلہ کے بارے میں زبان طعن نہ کھولیں گے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل یہ تو تم کو معلوم ہو گیا کہ منصب امامت ظالم اور فاسق کو نہیں ملتا۔ دینی منصب اسی کو ملتا ہے جو ابراہیم کے طریقہ پر چلے اور اگر تم کو خانہ کعبہ کی فضیلت اور اس کے حج مقرر کرنے میں شبہ ہے کہ حج بالکل ایک لغو حرکت ہے جو عرب کے جاہلوں کا طریقہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ نہیں تو اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو مرجع خلائق بنایا کہ لوگ اطراف عالم سے بصد احترام احرام باندھ کر اس گھر کی زیارت اور طواف کے لیے رجوع کریں تا کہ اہل ایمان کے عظیم اجتماع سے ایک خاص نورانیت پیدا ہو جس سے ہر ایک مستفید ہو جس طرح بہت سے چراغوں کے جمع ہو جانے سے بہ ہیئت اجتماعیہ ہر ایک کا نور اضعافا مضاعفہ ہو جاتا ہے جمعہ اور پنجگانہ نماز جماعت میں ایک شہر اور ایک محلہ کے انوار و برکات کا اجتماع ہوتا ہے اور حج کے اجتماع میں اقطار عالم کے انوار و برکات کا اجتماع ہوتا ہے۔

ف:...... اور جائز ہے کہ مثابۃ کو بجائے ثوب بمعنی رجوع کے ثواب سے مشتق مانیں یعنی لوگوں کے لیے ثواب حاصل کرنے کی جگہ بنائی کہ حج اور عمرہ کر کے ثواب حاصل کریں۔ ایک نماز پڑھیں تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب پائیں اور جماعت سے پڑھیں تو ستائیس لاکھ کا ثواب پائیں اور ہمیشہ کے لیے اس گھر کو خاص طور پر مقام امن بنایا کہ جو وہاں داخل ہو وہ امن سے ہو جائے اور ہم نے یہ حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور اس جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو تا کہ برکت حاصل ہو۔

ف:...... مقام ابراہیم ایک خاص پتھر کا نام ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو بنایا اس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشان تھے لوگوں کے ہاتھ پھیرنے کی وجہ سے وہ نشان اب معلوم نہیں ہوتے اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج کی اذان دی کما قال تعالیٰ: ﴿وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ﴾ الآیۃ۔ اور یہ پتھر عہد نبوی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خانہ کعبہ سے متصل تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب سیلاب آیا تو یہ پتھر بہہ گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو وہاں سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا اور اس کے گرد پتھروں کی دیوار چن دی چنانچہ وہ پتھر اب تک اسی جگہ میں محفوظ ہے اور اس کے اردگرد جالیاں بنی ہوئی ہیں اور بنائے کعبہ کے وقت ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام کو

حکم دیا جو مشابہ عہد کے تھا کہ میرے اس مبارک گھر کو ہر قسم کی ناپاکیوں سے پاک رکھنا طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں کے لیے اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لئے۔ یعنی نماز پڑھنے والوں کے لیے اس کو پاک وصاف رکھنا۔

نکتہ:..... طواف اور اعتکاف چونکہ دو عمل جداگانہ ہیں ایک دوسرے پر موقوف نہیں اس لیے طواف اور اعتکاف کو بذریعہ واؤ عاطفہ ذکر فرمایا اور رکوع اور سجود دونوں مل کر ایک عبادت ہیں الگ الگ عبادت نہیں اس لیے رکوع اور سجود کو بدون عطف ذکر فرمایا۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ

اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بنا اس کو شہر امن کا ف۱ اور روزی دے اسکے رہنے والوں کو میوے جو

اور جب کہا ابراہیم نے اے رب کر اس کو شہر امن کا اور روزی دے اس کے لوگوں کو میوے جو

اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ

کوئی ان میں سے ایمان لاوے اللہ پر اور قیامت کے دن پر ف۲ فرمایا اور جو کفر کریں اس کو بھی نفع پہنچاؤں گا تھوڑے دنوں پھر اسکو جبرًا بلاؤں گا

کوئی ان میں یقین لاوے اللہ پر اور پچھلے دن پر فرمایا اور جو کوئی منکر ہے اس کو بھی فائدہ دوں گا تھوڑے دنوں پھر اس کو قید کر بلاؤں گا

اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

دوزخ کے عذاب میں اور وہ بری جگہ ہے رہنے کی ف۳

دوزخ کے عذاب میں اور بری جگہ پہنچ ہے۔

دعا ابراہیم علیہ السلام برائے حرم وساکنان حرم

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا ... الی ... وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾

ربط:..... جب خانہ کعبہ کی فضیلت اور اس کا مکان تعظیم اور معبد ابراہیم علیہ السلام ہونا بتلا چکے تو آئندہ اس شہر اور اس کے ساکنین کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں ذکر فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے خانہ کعبہ بنانے کا پختہ ارادہ فرمایا تو یہ دعا کی کہ اے پروردگار اس لق ودق صحرا کو آباد شہر اور پر امن بنادے کیونکہ رسم حج کی بقاء بدون شہر کی آبادی کے ممکن نہیں اور شہر کی آبادی بدون امن کے باقی نہیں رہ سکتی۔ بدامنی سے شہر ویران ہو جاتا ہے اور اس شہر کے ساکنین کو قسم قسم کے پھل اور میوے عطاء فرما اس لیے کہ ساکنان شہر کی آبادی رزق پر موقوف ہے بغیر رزق کے کوئی باقی اور زندہ نہیں رہ سکتا اور رزق کی درخواست میں ظالموں اور نافرمانوں کے لیے نہیں کرتا بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے رزق طلب کرتا ہوں جو اس شہر کے رہنے والوں میں سے اللہ تعالی اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو اللہ تعالی نے فرمایا کہ رزق کو امامت پر قیاس مت کرو۔ امامت ایک دینی منصب ہے ظالم اس کا مستحق اور اہل نہیں اور رزق دنیوی۔ ایسی شے ہے جو

ف۱ حضرت ابراہیمؑ نے بوقت بنائے کعبہ یہ دعا کی کہ یہ میدان ایک شہر آباد اور باامن ہو سو ایسا ہی ہوا۔
ف۲ یعنی اس کے رہنے والے جو اہل ایمان ہوں ان کو روزی دے میووں کی اور کفار کے لئے دعا نہ کی تا کہ وہ مقام لوث کفر سے پاک رہے۔
ف۳ حق تعالی نے فرمایا کہ دنیا میں کفار کو بھی رزق دیا جائے گا اور رزق کا حال امامت جیسا نہیں کہ اہل ایمان کے سوا کسی کو مل ہی نہ سکے۔

عام ہے میں رب العالمین ہوں سب کا رازق ہوں، مومن کو بھی ثمرات سے رزق دوں گا اور کافر کو بھی دنیا میں رزق دوں گا۔ اور چونکہ یہ کافر ہے اس لیے چندروز یعنی زندگی تک اس کو دنیاوی منافع سے خوب متمتع اور بہرہ مند کرتا رہوں گا اور پھر اس کو لاچار اور بے بس بنا کر کشاں کشاں عذاب نار تک پہنچاؤں گا اور بے شک دوزخ بہت ہی بری جگہ ہے دنیا میں کوئی مکان اگر ایک طرف سے برا ہوتا ہے تو دوسری طرف سے اچھا بھی ہوتا ہے لیکن وہ دوزخ ایسا مکان ہے جو کسی اعتبار سے بھی اچھا نہیں ہر طرح سے برا ہی برا ہے۔

وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ

اور یاد کرو جب اٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسمٰعیل اور دعا کرتے تھے اے پروردگار ہمارے قبول کر ہم سے بیشک

اور جب اٹھانے لگا ابراہیم بنیادیں اس گھر کی اور اسمٰعیل اے رب ہمارے قبول کر ہم سے

اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۱۲۷﴾

تو ہی ہے سننے والا جاننے والا ف۱

تو ہی ہے سنتا جانتا۔

دعا ابراہیم علیہ السلام و اسمٰعیل علیہ السلام برائے قبولیت خدمت تعمیر بیت اللہ

قال تعالیٰ: ﴿وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ ... الی ... اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ﴾

اور اس وقت کو بھی یاد کرو کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام خود اپنے ہاتھ سے اس گھر کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے یعنی اس پر تعمیر کرتے تھے اور دیواریں چنتے جاتے تھے اور اسی طرح اسمٰعیل بھی ان کے ساتھ بلند کرنے میں مشغول تھے اور یہ دونوں بزرگ اس وقت نہایت عجز اور انکساری کے ساتھ یہ کہتے جاتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار اپنے فضل سے ہماری اس محنت اور خدمت کو قبول فرما تحقیق تو ہی ہماری دعاؤں کو سننے والا ہے اور تو ہی ہماری نیت اور ہمارے ذوق وشوق کو جاننے والا ہے محض اپنے لطف وعنایت سے اپنے عاشقان جان نثار کی اس سعی کو مشکور فرما۔

ف ۱:...... قبول اور تقبل میں یہ فرق ہے کہ جو چیز لائق پذیرائی ہو۔ وہاں لفظ قبول استعمال کرتے ہیں اور جو چیز ناقص ہو اور قابل پذیرائی نہ ہو وہاں لفظ تقبل استعمال کرتے ہیں اس لیے کہ لفظ تقبل باب تفعل سے ہونے کی وجہ سے تکلف پر دلالت کرتا ہے اور تکلف قبول اس بات کو مقتضی ہے کہ وہ چیز لائق قبول نہ ہو۔ پس اس مقام پر لفظ تقبل کا استعمال۔ غایت عجز اور کمال تواضع پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی ہمارا عمل اس قابل نہیں کہ مقبول ہو لیکن اگر تیرے لطف وعنایت اور فضل ورحمت سے قبول ہو جائے تو یہ تیرا محض جود وکرم ہے۔

گرچہ یہ ہدیہ نہ میرا قابل منظور ہے — پر جو ہو مقبول کیا رحمت سے تیری دور ہے

اور اگر بالفرض کوئی عمل قابل قبول بھی ہو تب بھی حق تعالیٰ کے ذمہ اس کا قبول کرنا واجب نہیں اس لیے کہ قبولیت

ف۱ قبول کر ہم سے اس کام کو (کہ تعمیر خانہ کعبہ ہے) تو سب کی دعا سنتا ہے اور نیت کو جانتا ہے۔

کے لیے مستقل درخواست چاہئے۔ اہل سنت والجماعت کا یہی مذہب ہے۔ معتزلہ کے نزدیک ایسے عمل کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ واجب ہے۔ معتزلہ نے جب بندہ کے افعال اختیاریہ کو بندہ کا مخلوق اور مملوک قرار دیا تو خالق کے ذمہ ان کا قبول کرنا اور ان پر ثواب دینا واجب گردانا اور اپنی نادانی سے یہ نہ سمجھا کہ اس واجب الوجود پر کسی کا وجوب نہیں چلتا اور نہ اس پر کسی کا حق ہے اور خدا تعالی کے سوا کون ہے جو اس پر کوئی شے لازم اور واجب کر سکے۔

ف ۲:...... جاننا چاہیے کہ بارگاہ خداوندی میں وہی عبادت اور خدمت مقبول ہے کہ جس کو کرنے والا دل وجان سے قابل قبول نہ سمجھے اور کرنے والے کی نظر اپنے عمل پر نہ ہو بلکہ اس کے لطف اور فضل پر ہو۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا

اے پروردگار ہمارے اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرمانبردار اپنی اور بتلا ہم کو قاعدے حج کرنے کے

اے رب ہمارے اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی ایک امت حکم بردار اپنی اور جتا ہم کو دستور حج کرنے کے

وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا

اور ہم کو معاف کر بیشک تو ہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان اے پروردگار ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول

اور ہم کو معاف کر تو ہی ہے اصل معاف کرنے والا مہربان اے رب ہمارے اور اٹھا ان میں ایک رسول

مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ

انہی میں کا کہ پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھلاوے ان کو کتاب اور تہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو بیشک

انہیں میں کا پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھا دے ان کو کتاب اور پکی باتیں اور ان کو سنوارے

اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵/۸

تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا ف ۱

تو ہی ہے اصل زبردست حکمت والا۔

دعا ابراہیمی برائے وجود امت مسلمہ وقوم مسلمانان وظہور رسول محترم از ساکنان حرم کہ صاحب قرآن وخاتم پیغمبراں باشد

قَالَ تَعَالٰی: ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ... الی ... اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

ربط:...... ان دونوں بزرگوں نے اپنی فراست صادقہ اور نور نبوت سے یہ سمجھا کہ جب ہم کو ایسے خانہ تجلی آشیانہ کی تعمیر کا حکم

ف ۱ یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور انکے بیٹے حضرت اسمعیل علیہ السلام دونوں نے مانگی کہ ہماری جماعت میں ایک جماعت فرمانبردار اپنی پیدا کر اور ایک رسول ان میں بھیج جو ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ایسا نبی جو ان دونوں کی اولاد میں ہو بجز سرور کائنات ﷺ کوئی نہیں آیا اس کی وجہ سے یہود کے گذشتہ خیال کا پورا رد ہوگیا علم کتاب سے مراد معانی ومطالب ضروریہ ہیں جو عبارت سے واضح ہوتے ہیں اور حکمت سے مراد اسرار مخفیہ اور رموز لطیفہ ہیں۔

ہوا ہے تو لامحالہ اس کے ہم رنگ کسی ایسی عبادت کا بھی حکم ہونے والا ہے جو عشق اور محبت کا رنگ لیے ہوئے ہو۔ اور ان عبادتوں کا بجالانے والا صورۃً اگرچہ انسان ہوگا مگر معنیً ہم رنگ ملائک ہوگا گویا کہ دربار خداوندی کا معائنہ اور مشاہدہ کر رہا ہے اور جس امت کے لیے اس گھر کو قبلہ بنایا جائے گا اس کو ایسے جدید وضع کے کچھ احکام دیئے جائیں گے جن کے اسرار و حکم ظاہر نظر میں جلوہ گر نہ ہوں گے ظاہر پرست ان کو صورت پرستی پر محمول کریں گے اس لیے ان دونوں بزرگوں کو اندیشہ ہوا کہ مبادا ہماری ذریت اور اولاد ان جدید وضع کے احکام کے نزول پر ان کے قبول میں کسی قسم کا توقف اور تردد کرے اس لیے جناب الٰہی میں تین دعائیں فرمائیں اول یہ کہ "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ" (اے اللہ ہم کو اپنا مسلم اور حکم بردار بندہ بنا)۔ دوسری دعا یہ فرمائی کہ اے اللہ ہماری ذریت میں ایک امت مسلمہ پیدا فرما یعنی ایسی امت اور ایسی قوم پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو اور نام بھی اس قوم کا مسلم اور مسلمان ہو یعنی صفت بھی اس کی اسلام یعنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ہو اور اسی نام یعنی اسلام سے پکاری جاتی ہو۔

تیسری دعا یہ فرمائی کہ اس امت مسلمہ میں ایک عظیم الشان رسول بھیج اور اس پر ایک عظیم الشان کتاب نازل فرما یعنی قرآن کریم اور پھر وہ رسول اس امت کو کتاب وسنت کی تعلیم دے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دعاؤں میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ یہ خانہ تجلی آشیانہ جس امت کا قبلہ ہوگا اس امت کا نام امت مسلمہ ہوگا جیسا کہ سورہ حج میں ہے: ﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾۔ اور ملت اسلام اس امت کا مذہب ہوگا اور وہ عظیم الشان رسول جو ان میں مبعوث ہوگا وہ ساکنان حرم اور اسمٰعیل کی ذریت سے ہوگا اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں اور بذریعہ وحی کے بتلادیا کہ جس اولوالعزم رسول کے پیدا ہونے کی تم دعا کر رہے ہو وہ آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا اور خاتم الانبیاء والمرسلین ہوگا اور ملت ابراہیمی کا متبع ہوگا اور اس کی امت کا نام امت مسلمہ ہوگا۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے بارگاہ خداوندی میں بصد عجز و نیاز یہ عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم دونوں کو اپنا خاص اطاعت شعار اور فرمانبردار بنا کہ ہمارا ظاہر و باطن تیرے لیے مخصوص ہو جائے کہ اس میں تیرے سوا کسی اور کی گنجائش نہ رہے اور ہماری ذریت میں ایک امت مسلمہ یعنی ایک ایسی جماعت پیدا فرما کہ جو دل و جان سے تیری حکم بردار ہو اور قلب اس کا تسلیم ہو اور مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے سالم اور محفوظ رہیں اور جب تو ان کو اپنے دربار کی حاضری کا حکم دے تو مجنونانہ اور عاشقانہ وضع کے ساتھ برہنہ سر لبیک کہتے ہوئے تیرے در دولت پر حاضر ہو جائیں اور اے پروردگار ہم کو ہماری عبادات اور دربار کی حاضری یعنی حج اور طواف کے مواقع بھی دکھلا دیجئے اور ان کے احکام اور آداب بھی ہم کو بتلا دیجئے تاکہ آداب عبودیت اور آداب دربار میں ہم سے کوئی تقصیر نہ ہو جائے اور اے پروردگار آخر ہم بشر ہیں سہو اور نسیان سے مرکب ہیں۔ ہم سے اگر آداب دربار میں کوئی سہو اور تقصیر ہو جائے تو ہم پر توجہ اور عنایت فرمانا اور ہماری تقصیر سے درگزر فرمانا بے شک آپ ہی بڑی توجہ اور عنایت فرمانے والے اور مہربانی کرنے والے ہیں اور چونکہ ایک عظیم امت کا باوجود اختلاف آراء و عقول کے ایک مسلک اور ایک طریق پر بدون کسی مربی کے قائم رہنا عادۃً محال ہے اس لیے جناب الٰہی میں یہ عرض معروض کی کہ اے ہمارے پروردگار ان ساکنان حرم میں ایک عظیم الشان رسول بھیج جو اس امت مسلمہ کو اسلام کا طریقہ بتلائے اور وہ رسول ہم دونوں کی ذریت اور اولاد سے خارج نہ ہو بلکہ انہی میں سے ہو تاکہ دنیا اور آخرت میں ہمارے لیے عزت اور شرف کا موجب ہو اور اس طرح قیامت تک میری امامت باقی رہے اس لیے کہ میری اولاد کی امامت میری ہی امامت ہے۔ علاوہ ازیں جب وہ

رسول انہی میں سے ہوگا تو لوگ اس کے مولد اور منشاء سے اور اس کے حسب اور نسب اور اس کی امانت اور دیانت اور اخلاق اور اس کی صورت اور سیرت سے بخوبی واقف ہوں گے اور اس کے اتباع سے عار نہ کریں گے اور جب حق نبوت و رسالت کے ساتھ قرابت کی محبت اور شفقت بھی مل جائے گی تو اس رسول کی اعانت اور نصرت و حمایت اور اس کی شریعت کی ترویج اور اشاعت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے اس نبی کو اپنا سمجھ کر معاملہ کریں گے۔ اجنبی اور غیر کا معاملہ نہ کریں گے۔ اور رسول ایسا ہو کہ اس پر ایسی جامع کتاب نازل ہو کہ اولین اور آخرین میں اس کی نظیر نہ ہو اور پھر وہ رسول تیری اس کتاب کی آیتیں پڑھ کر ان کو سنائے اس لیے کہ آیات کا پڑھ کر سنانا بغیر نزول کتاب کے ناممکن ہے۔ اور بعد ازاں وہ رسول ان کو اس کتاب کے معانی سکھائے اور اس کے اسرار و حکم سے بھی آگاہ کرے تا کہ علم ظاہر اور علم باطن دونوں جمع ہو جائیں۔ تلاوت سے کتاب کے الفاظ اور کلمات کا علم ہوگا اور تعلیم و تفہیم سے اس کتاب کے معانی اور حقائق اور معارف معلوم ہوں گے۔ حفاظ قرآن اور قراء اور مجودین کے سینے اور زبانیں اس کتاب الٰہی کے الفاظ کی حفاظت کریں گی اور علماء ربانیین اور راسخین فی العلم کی زبانیں اور قلم اس کتاب کے معانی کی حفاظت کریں گے کہ کوئی ملحد اور زندیق اس میں کسی قسم کی معنوی تحریف بھی نہ کر سکے۔ اور وہ رسول اپنی ظاہری تعلیم و تربیت اور باطنی فیض صحبت سے اُن کے دلوں کو گناہوں کے زنگ اور کدورت سے پاک وصاف کر کے مثل آئینہ کے مجلّٰی اور مصفّٰی بنا دے کہ انوار و تجلیات کا عکس قبول کرنے لگیں اور حدیث میں العلماء ورثۃ الانبیاء آیا ہے اس کا صحیح مصداق وہی علماء ربانیین ہیں جو کتاب و سنت کی تعلیم کے ساتھ زنگ آلود نفوس کو صیقل کر کے مثل آئینہ کے بنا دیتے ہوں۔ بے شک تو ہی نہایت عزت والا اور نہایت حکمت والا ہے۔ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ تو ہماری اولاد میں ایسا عظیم الشان رسول بھیج کر لوگوں پر احسان فرمائے اور اس کو ایسی جامع کتاب اور جامع شریعت اور کامل دین عطا فرمائے کہ اس کے بعد تا قیامت کسی نبی اور رسول کی ضرورت باقی نہ رہے۔ فقط گاہ بگاہ اس کی تجدید کافی ہو جایا کرے۔ تفسیر ابن کثیر میں ابو العالیہ سے منقول ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب آیا:

"قد استجیب لك هو كائن في أخر الزمان۔" (تفسیر ابن کثیر)۔ "تمہاری دعا قبول ہوئی اس شان کا نبی آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا اور یہی قتادہ اور سدی سے منقول ہے۔"

اور اس آیت میں جو سید القراء ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ نبی خاتم الانبیاء ہوگا۔

"وقرأ أُبيٌّ وَابْعَثْ فِيْ اٰخِرِهِمْ رَسُوْلًا"۔ (روح المعانی: ۳۴۶/۱) "یعنی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے وابعث فی آخرہم رسولا۔"

یعنی ان کے آخر میں ایک رسول بھیج۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم نے جس رسول کی دعا مانگی تھی ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نبی آخر نبی ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

"اخرج احمد والطبرانی والبیهقی عن ابی امامة قال قلت یا رسول الله ما بدء امرك قال دعوة ابی ابراهیم وبشری عیسیٰ ورأت امی انه یخرج منها نور اضاءت له قصور الشام۔" (در منثور: ۱۲۹/۱) (مبشرا برسول یأتی من بعده اسمه أحمد)

''مسند احمد اور معجم طبرانی وغیرہ میں ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی نبوت کی ابتداء کس طرح سے ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا (رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا الآیۃ) کا مصداق ہوں سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے میری بعثت کی دعا کی۔ اور پھر میں اپنے بھائی عیسیٰ بن مریم کی بشارت ہوں کہ انہوں نے میری آمد کی بشارت دی۔ اور پھر میں اپنی ماں کا خواب ہوں کہ انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔''

اور عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انی عند الله فی ام الکتاب لخاتم النبین وان أدم لمنجدل فی طینة وسانبئکم باول ذلك دعوة ابراهیم"۔ (الحدیث)

''میں اللہ تعالیٰ کے یہاں لوح محفوظ میں خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور آدم ہنوز مٹی اور گارے کے پتلے ہی میں تھے اور میری نبوت کی ابتداء ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے۔ (مسند احمد وغیرہ در منثور، ص: ۱۲۹)

معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس نبی اور رسول کے ظہور کی دعا کی تھی اس دعا کا مصداق خاتم النبیین سرور عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ جن کے بعد کوئی نبی نہیں اور آپ پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں خاتم النبیین لکھے ہوئے تھے یہاں تک کہ ابراہیم علیہ السلام نے آپ کی بعثت کی دعا کی اور حضرت عیسیٰ نے خاتم الانبیاء کی آمد کی بشارت دی۔

پیغام خدا نخست آدم آورد انجام بشارت ابن مریم آورد
باجملہ رسل نامۂ بے خاتم بود احمد برما نامہ و خاتم آورد

لطائف ومعارف

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اگرچہ کبائر اور صغائر سے سب سے معصوم ہوتے ہیں مگر خداوند ذوالجلال کی عظمت اور جلال سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حق ربوبیت اور حق عبودیت کسی سے ادا نہیں ہو سکتا اور جانتے ہیں کہ جو حق واجب تھا وہ ہم سے ادا نہ ہو سکا اس لیے بصد خشوع وخضوع خدا تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بار الٰہا تو ہمارے عجز اور قصور کو جانتا ہے ہمیں معاف کر اور تیرے حقوق میں ہم سے جو تقصیریں ہوئیں ان سے درگزر کر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ﴿وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ کہنا اسی قبیل سے تھا دنیا کے بادشاہوں اور ان کے خواص اور مقربین کے تعلقات پر نظر کرو عام رعایا کے لیے ایک عام قانون ہوتا ہے اور اس کی پابندی ان کے لیے کافی ہوتی ہے مگر خواص مقربین کے لیے ایک خاص قانون اور خاص بندشیں اور خاص ہدایتیں ہوتی ہیں۔

ع موسیا آداب دانا دیگراند

خواص اور مقربین ہر وقت اپنے آقا اور ولی نعمت کی خوش رکھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

ع جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔

یہی حال بلکہ اس سے ہزار درجہ بڑھ کر انبیاء علیہم السلام کا خداوند ذوالجلال کے ساتھ ہے اگرچہ خدا تعالیٰ کے یہ سچے

عاشقان باوفا اور محبان باصفا اپنے محبوب حقیقی کے خوش رکھنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن اللہ جیسے محبوب برحق کے حقوق کوئی عاشق کیا ادا کرسکتا ہے اس لیے حضرات انبیاء بصد عجز وزاری، بارگاہ خداوندی میں یہ عرض کرتے ہیں ﴿وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ بارِ خدایا ہم سے تیرے حقوق اور واجبات کے ادا کرنے میں تقصیر ہوئی ہم اپنے عجز اور ناتوانی کی وجہ سے تیرا حق ادا نہیں کرسکے تو ہم پر رحم فرما اور ہماری تقصیروں سے درگزر کر۔

یہ تو حضرات انبیاء کرام کی توبہ اور انابت کی عام وجہ تھی جو بیان ہوئی لیکن ابراہیم علیہ السلام کی زیر بحث دعا تب علینا کی ایک خاص وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ آپ نے یہ دعا صرف اپنے لیے اور اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام ہی کے لیے نہیں فرمائی تھی بلکہ اپنی تمام ذریت کو جو ہونے والی تھی اس کو بھی اس دعا میں شامل کرلیا تھا اس لیے یہ دعا مجموعی حیثیت سے سب کے حق میں ہوئی جیسا کہ آیت کے سیاق اور لحاق سے ظاہر ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي

اور کون ہے جو پھرے ابراہیم کے مذہب سے مگر وہی کہ جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو اور بیشک ہم نے انکو منتخب کیا

اور کون پسند نہ رکھے دین ابراہیم کا مگر جو بیوقوف ہوا اپنے جی سے اور ہم نے اس کو خاص کیا

الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۱۳۰ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ

دنیا میں اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہیں یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رب نے کہ حکم برداری کر تو بولا

دنیا میں اور وہ آخرت میں نیک ہے جب اس کو کہا اس کے رب نے حکم بردار ہو بولا

اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۳۱ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ

کہ میں حکم بردار ہوں تمام عالم کے پروردگار کا، اور یہی وصیت کرگیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی کہ اے بیٹو بیشک اللہ نے

میں حکم میں آیا جہاں کے صاحب کے اور یہی وصیت کرگیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب اے بیٹو اللہ نے

اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۱۳۲ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ

چن کر دیا ہے تم کو دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ف۱ کیا تم موجود تھے جس وقت

چن کر دیا ہے تم کو دین پھر نہ مریو مگر مسلمانی پر کیا تم حاضر تھے جس وقت

حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ

قریب آئی یعقوب کے موت جب کہا اپنے بیٹوں کو تم کس کی عبادت کرو گے میرے بعد بولے ہم بندگی کریں گے

پہنچی یعقوب کو موت جب کہا اپنے بیٹوں کو تم کیا پوجو گے میرے بعد بولے ہم بندگی کریں گے

ف۱ جس ملت ومذہب کا شرف مذکور ہوچکا اسی ملت کی وصیت حضرت ابراہیمؑ وحضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو فرمائی تو جو اس کو نہ مانے گا وہ ان کا بھی مخالف ہوا۔ اور یہود کہتے تھے کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو یہودیت کی وصیت فرمائی سو وہ جھوٹے ہیں جیسا اگلی آیت میں آتا ہے۔

اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ

تیرے رب کی اور تیرے باپ دادوں کے رب کی جو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق ہیں وہی ایک معبود ہے اور ہم سب اسی کے

تیرے رب اور تیرے باپ دادوں کے رب کو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق وہی ایک رب ہے اور ہم اسی کے

مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۳ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا

فرمانبردار ہیں ف۱ وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی انکے واسطے ہے جو انہوں نے کیا اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور

حکم پر ہیں یہ ایک جماعت تھی گزر گئی ان کا ہے جو کما گئے اور تمہارا ہے جو تم کماؤ اور

تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۴

تم سے پوچھ نہیں ان کے کاموں کی ف۲

تم سے پوچھ نہیں ان کے کام کی۔

ترغیب وتاکید اتباع ملۃ ابراہیمی کہ عین توحید وعین ملت اسلام است وفضائل ملت اسلام

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ ... الی ... وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

گزشتہ آیات میں اجمالاً حضرت ابراہیم کی ملت کی طرف اشارہ تھا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا ﴿وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ اور ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طریقہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے پسند کیا اور اس کی دعا کی وہ طریقہ۔ طریقۂ اسلام ہے اب آئندہ آیات میں اس کی تفصیل فرماتے ہیں کہ وہ ملت ابراہیم عین توحید اور عین اسلام ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ احکام خداوندی کی دل وجان سے بے چون و چرا اطاعت کرنا اپنے آپ کو خدا کے حوالے اور سپرد کر دینا آخیر پارہ تک اسی ملت اسلام کے فضائل اور اسی کے اتباع کی ترغیب میں کلام چلا گیا ہے جس سے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب کا رد کرنا مقصود ہے کہ یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں اور پھر ان کے خلاف طریقہ پر چل رہے ہیں حالانکہ اسی ملت اسلام پر قائم رہنے کی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے لیے دعا مانگی اور اسی کی وصیت کی اور اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ وہ کون شخص ہے کہ جو ابراہیم کی ملت سے عدول اور انحراف کرے۔ حالانکہ وہ ملت تمام ملتوں سے افضل اور بہتر ہے اور صاحب ملت لوگوں کا امام اور پیشوا ہے اور سب سے پہلے اسی نے نہایت تضرع اور زاری سے امت مسلمہ کے وجود اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ظہور کی دعا مانگی کہ جو امت مسلمہ کو اسلام کا طریقہ

ف۱ یعنی تم حضرت یعقوبؑ کی وصیت کے وقت تو موجود بھی نہ تھے۔ انہوں نے تو ملت انبیائے موصوفین کا ارشاد فرمایا تھا تم نے یہ کیا کہ یہود اپنے سوا سب کو اور نصاریٰ اپنے سوا سب کو بے دین بتلانے لگے (اور مذہب حق یعنی اسلام کے دونوں کے مخالف ہو گئے) تمہارا افتراء ہے۔

ف۲ یہودیوں کو اور نصرانیوں کو یقین تھا کہ ماں باپ کے گناہوں میں اولاد گرفتار ہو گی اور ان کے ثواب میں بھی اولاد شریک ہو گی۔ سو یہ غلط ہے، اپنا کیا اپنے آگے آئے گا بھلا یا برا۔

بتلائے تو ایسی بہتر ملت کے اتباع سے کون اعراض اور انحراف کرسکتا ہے مگر وہی شخص کہ جو اپنے ہی نفس سے جاہل اور نادان ہو کہ یہ نہ سمجھتا ہو کہ کون سی ملت فطرت سلیمہ کے مناسب ہے اور کون سی غیر مناسب اور کون سی ملت روح اور قلب کے لیے نافع ہے اور کون سی مضر۔ اور کس ملت کے قبول کرنے سے نفس کے لیے کمالات کا دروازہ کھلتا ہے اور کس ملت سے کمالات کا دروازہ بند ہوتا ہے اگر یہ سفیہ اپنے نفس سے بے خبر نہ ہوتا تو ملت ابراہیمی سے اعراض نہ کرتا اور البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم کو دنیا میں برگزیدہ بنایا اور اپنے مقبول بندوں میں سے اس کو منتخب کیا اور تمام کمالات روحانیہ سے اس کو مکمل کیا یعنی نبوت و رسالت اور ولایت و امامت ان کو عطاء کی اور خلت کا خلعت ان کو پہنایا اور جو معبد انہوں نے تعمیر کیا اس کو قبلہ عالم بنایا اور تحقیق آخرت میں وہ صالحین اور نیکو کاروں سے ہیں صلاح۔ فساد اور خلل کی ضد ہے۔ اور فساد اور خلل، معصیت اور غفلت سے پیدا ہوتا ہے اس بناء پر صلاح کے یہ معنی ہوں گے کہ ان کا ظاہر و باطن ہر قسم کے فساد اور خلل سے بالکل پاک ہے اور اس جگہ صلاح سے صلاح کامل مراد ہے اور یہ آیت ماقبل کی دلیل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص خدا کا برگزیدہ اور منتخب بندہ ہو اور صلاح کامل کے ساتھ موصوف ہو اس کے طریقہ سے سوائے نادان کے کون اعراض کرے گا۔ آئندہ آیت میں اس ملت کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ کیا ہے یعنی اسلام ہے بلکہ یہی اسلام ان کے برگزیدہ اور امام ہونے کا سبب ہے جبکہ ان کے پروردگار نے کہا کہ اے ابراہیم اسلام اختیار کر اور مسلم بن جا یعنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے اور سپرد کردے اور اپنی خواہش اور ارادہ کو اس کی رضا اور خوشنودی میں فنا کردے ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا کہ میں نے اسلام اختیار کیا اور میں نے اپنے تمام کام رب العالمین کے سپرد کردیئے اور اپنے نفس کو درمیان سے بالکل نکال لیا۔

سپردم بتو مایہ خویش را — تو دانی حساب کم و بیش را

اب اس میں تعیین ہوگئی کہ وہ ملت کیا ہے یعنی اسلام ہے جو تمام کمالات کا تخم اور تمام فضائل کی اصل ہے اخیر پارہ تک اسی اسلام کی فضیلت میں کلام چلا گیا۔

اور جب تک ابراہیم علیہ السلام زندہ رہے اسی ملت پر قائم رہے اور جب وصال کا وقت آیا تو ابراہیم علیہ السلام نے سب بیٹوں کو جمع کر کے اسی ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی جن میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام بھی تھے۔ اور پھر اسی طرح اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے کہا اے میرے بیٹو! تحقیق اللہ تعالی نے تمہارے لیے یہ دین اسلام پسند کیا ہے اس کے سوا کوئی دین مقبول نہیں پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم اسلام پر پختہ اور قائم ہو۔ یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت یہودیت اور نصرانیت کی وصیت نہیں کی بلکہ ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی۔ پس اے اہل کتاب تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت یہودیت کی وصیت کی تھی اس کی نہ کوئی سند ہے اور نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی مشاہدہ۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے کہا کہ بتلاؤ میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے۔ سب نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ ہم صرف اس ایک خدا کی عبادت کریں گے جس کی آپ اور آپ کے آباؤ اجداد ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق عبادت کرتے آئے یعنی ایک خدا کی عبادت کریں گے اور ہم سب اسی ایک خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری پر قائم رہیں گے۔ غرض یہ کہ یہود کا یہ دعویٰ کہ یعقوب علیہ السلام نے یہودیت کی

وصیت کی تھی محض افتراء ہے نہ اس کی کوئی سند ہے اور نہ تمہارا مشاہدہ۔

اور اے اہل کتاب اگر چہ تم ان بزرگوں کی اولاد ہو اور تم اس نسبت پر فخر اور ناز کرتے ہو لیکن یہ خدا کے برگزیدہ بندوں کی ایک جماعت تھی جو گزر گئی اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت تم کو وصیت کر گئی اس جماعت کے لیے وہ اعمال کام آئیں گے جو اس نے کیے اور تمہارے لیے تمہارے اعمال کام آئیں گے اور بدون اتباع کے محض بزرگوں کا انتساب تم کو نفع نہیں دے گا اور اگر بالفرض وہ برے عمل کرتے تھے تو تم سے ان کے اعمال کے متعلق کوئی سوال نہ ہو گا ہر شخص سے اپنے اعمال کے متعلق سوال ہو گا غرض یہ کہ انہوں نے اگر کوئی گناہ کیا ہے تو تم سے اس کی باز پرس نہ ہو گی اور اگر انہوں نے نیک عمل کیے ہیں تو تم کو کوئی نفع نہیں باپ کا کھانا اور پینا بیٹے کی بھوک اور پیاس کو دفع نہیں کر سکتا جب تک بیٹا خود نہ کھائے اور نہ پیئے۔

بندگی باید پیمبر زادگی در کار نیست

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ

اور کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہودی یا نصرانی تو تم پا لو گے راہ راست ف۱ کہہ دے کہ ہرگز نہیں بلکہ ہم نے اختیار کی راہ ابراہیم کی جو ایک ہی طرف کا تھا اور نہ تھا

اور کہتے ہیں ہو جاؤ یہود یا نصاریٰ تو راہ پر آؤ تو کہہ نہیں بلکہ ہم نے پکڑی راہ ابراہیم کی جو ایک طرف کا تھا اور نہ تھا

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

شرک کرنے والوں میں ف۲

شریک والوں میں۔

یہودیت اور نصرانیت کی طرف دعوت دینے والوں کو جواب

قال تعالیٰ: ﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا... الی... وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾

اور تعجب ہے کہ یہ اہل کتاب حضرت ابراہیم کو اپنا امام اور پیشوا بھی کہتے ہیں مگر ان کے اتباع اور ان کے طریقہ پر چلنے کو موجب ہدایت نہیں سمجھتے بلکہ باعث ضلالت جانتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ نصرانی بن جاؤ یا ہدایت پا جاؤ گے اے محمد ﷺ آپ ان کے جواب میں کہہ دیجئے کہ ہم یہودی یا نصرانی نہیں بنیں گے بلکہ ہم تو ملت ابراہیمی پر قائم رہیں

ف۱ مطلب یہ ہے کہ یہودی مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ، اور نصرانی کہتے ہیں کہ نصرانی ہو جاؤ تو تم کو ہدایت نصیب ہو۔

ف۲ یعنی کہہ دو اے محمد ﷺ کہ تمہارا کہنا ہرگز منظور نہیں بلکہ ہم موافق ہیں ملت ابراہیم علیہ السلام کے جو سب برے مذہبوں سے علیحدہ ہے۔ نہیں تھا وہ شرک کرنے والوں میں اشارہ ہے کہ تم دونوں فریق شرک میں مبتلا ہو۔ بلکہ مشرکین عرب بھی مذہب ابراہیمی کے مدعی تھے مگر وہ بھی مشرک تھے تو اس میں ان پر بھی رد ہو گیا۔ اب ان فرقوں میں بروئے انصاف کوئی بھی ملت ابراہیمی پر نہ رہا صرف اہل اسلام ملت ابراہیمی میں ہیں۔ فائدہ ہر شریعت میں تین باتیں ہوتی ہیں، اول عقائد (جیسے توحید و نبوت وغیرہ) سو اس میں تو سب دین والے شریک اور موافق ہیں اختلاف ممکن ہی نہیں دوسرے قواعد کلیہ شریعت کہ جن سے جزئیات و فروع مسائل حاصل ہوتے ہیں اور تمام جزئیات میں وہ کلیات ملحوظ رہتے ہیں اور ملت فی الحقیقت انہی اصول اور کلیات کا نام ہے اور ملت محمدی اور ملت ابراہیمی کا توافق و اتحاد انہی کلیات میں ہے۔ تیسرے مجموعہ کلیات و جزئیات و جمیع اصول و فروع (جس کو شریعت کہتے ہیں) جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ایک ہے اور شریعت جدا جدا۔

گے اور ابراہیم ہی کے طریقہ اور مسلک پر چلیں گے جن میں ذرہ برابر کجی نہ تھی وہ تو ماسوی اللہ کو چھوڑ کر اللہ کی طرف مائل تھے اور کبھی بھی مشرکین میں سے نہیں ہوئے نہ قبل نبوت اور نہ بعد نبوت اور تم باوجودیکہ اتباع ابراہیمی کے مدعی ہونے کے کج راہی اور شرک میں مبتلا ہو۔

سلسلۂ کلام نہایت خوبی کے ساتھ چل رہا ہے یہودیوں کو جو اپنے حسب ونسب پر ناز تھا اس کی تردید فرمائی ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور تعمیر کعبہ اور دعا کا ذکر فرمایا اللہ تعالی نے ان کو دعا قبول کی اور ان کی دعا کے مطابق محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا جن کا قبلہ اور جن کی ملت اور جن کا دین وہی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا تھا اور ان سب نے اپنی اولاد کو اسی کی وصیت کی تھی کہ دین اسلام ہی پر مرنا۔ پھر تعجب ہے (کہ محمد رسول اللہ ﷺ) جب تمہارے سامنے اسی ملت ابراہیم اور دین اسلام کو پیش کرتے ہیں تو تم اسے قبول نہیں کرتے اس کے سوا اور کیا وجہ ہے کہ تمہاری عقلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

فائدہ جلیلہ:...... حق جل شانہ نے اس سلسلہ میں سات جگہ اسلام کا ذکر فرمایا۔ پہلا ﴿وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ﴾ میں دوسرا ﴿اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ تیسرا ﴿قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ﴾ چوتھے ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں۔ پانچویں ﴿فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ میں۔ چھٹے ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ میں۔ ساتویں ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کرام کا مذہب اسلام ہے امم سابقہ میں جو لوگ اطاعت کرنے والے تھے ان کی صفت بھی یہی اسلام تھی مگر امت مسلمہ کا نام اور لقب حضور ﷺ ہی کی امت کو عطا کیا گیا پچھلی امتوں میں بھی اسلام لانے والے گزرے ہیں مگر اسلام ان کا لقب نہ تھا صرف صفت تھی۔ یہ لقب صرف امت محمدیہ کو عطاء کیا گیا ایک زمانہ میں دین حق کا لقب یہودیت رہا اور ایک زمانہ میں عیسائیت اور نصرانیت رہا۔ صفت اسلام سب میں مشترک رہی سب اللہ کے مطیع اور فرمانبردار تھے مگر امت مسلمہ کا لقب خاص آپ ہی کی امت کو عطا کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ کے غلام تو سب ہی ہیں مگر غلام کا نام ہی غلام رکھ دیا جائے تو صفت اور لقب دونوں جمع ہو جائیں گے۔ صفت بھی غلام۔ اور لقب اور نام بھی غلام۔ اور مثلاً جیسے سب اللہ کے بندے ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ اپنا نام ہی عبداللہ اور اللہ بندہ رکھے تاکہ ہر وقت اس کی عبدیت اور غلامیت سے لذت حاصل کرتا رہے تو اس کی شان ہی دوسری ہے۔

اور یہ مبارک لقب سب سے پہلے ہمارے لیے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تجویز فرمایا جیسا کو سورۂ حج میں ہے ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾۔ پس اس عظیم الشان لقب کا حق یہ ہے کہ ہم دل وجان سے اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بن جائیں محض لفظ مسلم اور لفظ مومن پر قناعت نہ کریں۔

لفظ مومن جز پئے تعریف نیست　　میم واؤ میم ونون تشریف نیست

فائدۂ دیگر:...... جاننا چاہیے کہ ہر شریعت میں تین باتیں ہوتی ہیں (اول) اصول اور عقائد جیسے توحید ورسالت اور قیامت یہ چیزیں تمام انبیاء کرام میں متفق علیہ ہیں ان میں اختلاف ممکن نہیں اور نہ ان میں نسخ جاری ہوتا ہے (قسم دوم) قواعد کلیہ شریعت کہ جن کی طرف جزئیات اور فروع راجع ہوتے ہیں اور حکم میں ان کلیات کا لحاظ رہتا ہے اور انہی قواعد کلیہ کا نام ملت

ہے جس میں اختلاف بہت کم ہوتا ہے ملت محمدی اور ملت ابراہیمی انہی اصول اور قواعد کلیہ کے لحاظ سے موافق اور متحد ہیں۔

(قسم سوم) احکام جزئیہ اور فروع۔ جس کو شریعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں زمان اور مکان اور امم کے اختلاف سے شریعت کے احکام جزئیہ بدلتے رہے کما قال تعالیٰ: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾۔ پس خلاصہ یہ نکلا کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت تو ایک مگر شریعت ہر ایک کی جدا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ تمام حنفیہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو اپنا امام جانتے ہیں مگر باوجود اس کے امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ اور امام زفر رحمہ اللہ کبھی کبھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا خلاف بھی کرتے ہیں مگر قانون حنفی سے کسی حال میں خارج نہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے قواعد مقررہ سے باہر نہیں جاتے مثلاً قیاس جلی یا قیاس استحسان اور عموم بلوی کسی نہ کسی قاعدہ کے تحت میں اس جزئیہ کو درج کرتے ہیں۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ

تم کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو اترا ہم پر اور جو اترا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق

تم کہو ہم نے یقین کیا اللہ کو اور جو اترا ہم پر اور جو اترا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق

وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ

اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا دوسرے پیغمبروں کو

اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو

رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ

انکے رب کی طرف سے ہم فرق نہیں کرتے ان سب میں سے ایک میں بھی اور ہم اسی پروردگار کے فرمانبردار ہیں ف ۱ سو اگر وہ بھی ایمان لاویں جس طرح

اپنے رب سے ہم فرق نہیں کرتے ایک میں ان سب سے اور ہم اسی کے حکم پر ہیں۔ پھر اگر وہ بھی یقین لاویں جس طرح

اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ

پر تم ایمان لائے ہدایت پائی انہوں نے بھی اور اگر پھر جاویں تو پھر وہی ہیں ضد پر سو اب کافی ہے تیری طرف سے ان کو

پر تم یقین لائے تو راہ پاویں اور اگر پھر جاویں تو اب وہی ہیں ضد پر سو اب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو

اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ

اللہ اور وہی ہے سننے والا جاننے والا ف ۲ ہم نے قبول کر لیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے اور ہم

اللہ اور وہی ہے سنتا جانتا ہم نے لیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ ہے اللہ سے بہتر اور ہم

ف ۱ یعنی ہم سب رسولوں اور سب کتابوں پر ایمان لاتے ہیں۔ اور سب کو حق سمجھتے ہیں اور اپنے اپنے زمانہ میں سب واجب الاتباع ہیں اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں جس وقت جو نبی ہوگا اس کے ذریعے سے جو احکام خداوندی پہنچیں گے اس کا اتباع ضروری ہے۔ بخلاف اہل کتاب کے کہ اپنے دین کے سوا سب کی تکذیب کرتے ہیں، چاہے ان کا دین منسوخ ہی ہو چکا ہو اور انبیاء کے احکام کو جھٹلاتے ہیں جو خدا کے احکام ہیں۔

ف ۲ یعنی ان کی دشمنی اور ضد سے خوف مت کرو۔ اور ان کے شر اور مضرت سے تمہارا حافظ ہے۔ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ خدا سب کی باتوں کو سنتا اور سب =

لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اسی کی بندگی کرتے ہیں ف۱

اسی کی بندگی پر ہیں۔

تعلیم طریقۂ ایمان

قَالَ تَعَالٰی: ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ... الی ... وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ﴾

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ یہ کہہ دو کہ ہم یہودی اور نصرانی نہیں بلکہ ملت ابراہیمی کے متبع ہیں۔ آئندہ آیت میں طریقۂ ایمان کی تعلیم وتلقین فرماتے ہیں کہ اس طور پر اپنے ایمان کو ظاہر کرو کہ شریعت موسویہ اور شریعت عیسویہ کے کفر اور انکار کا ایہام نہ ہو لہٰذا جب تم اپنے ایمان کا اعلان کرو تو اس طرح کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر یعنی اس کے تمام اسماء وصفات پر اور اس کے تمام احکام پر اور اس کتاب اور شریعت پر ایمان لائے جو ہماری طرف بھیجی گئی اور ان تمام صحیفوں پر ایمان لائے کہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد کی طرف بھیجے گئے جو ان میں نبی ہوئے جیسے عزیر اور اشعیاہ اور یرمیاہ اور سمویل اور حزقیل علیہم السلام اور اس چیز پر بھی ایمان لائے کہ جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو دی گئی اور اجمالاً ہم ایمان لائے ان تمام صحیفوں پر اور شریعتوں اور احکام پر جو کہ تمام پیغمبروں کو پروردگار کی جانب سے دیئے گئے۔ اگرچہ ان میں بعض بعض سے افضل ہیں لیکن ہم ایمان لانے میں کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر نہ لائیں اور ہم تو خاص اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ سب انبیاء پر بلا تفریق ایمان رکھتے ہیں البتہ منسوخ شریعت کا اتباع نہیں کرتے صرف خاتم الانبیاء کا اتباع کرتے ہیں کہ جن کی شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ ہے۔

تفریع بر مضمون سابق مع توبیخ وتقریع

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی حقیقت یہ ہے اور ایمان کا طریقہ یہ ہے پس اگر یہ لوگ اسی طرح ایمان لائیں کہ جس طرح تم ایمان لائے ہو یعنی بلا تفریق تمام انبیاء ورسل کی تصدیق کریں پس تحقیق یہ بھی ہدایت پا جائیں گے اور اگر روگردانی کرتے ہیں تو سمجھ لو یہ لوگ صرف مخالفت اور عداوت میں غرق ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عداوت اور مخالفت سے پریشان نہ ہوں عنقریب ہی اللہ تعالیٰ ان کے شر سے آپ کی کفایت کرے گا اور خود ہی اللہ تعالیٰ ان سے نمٹ لے گا تم فکر نہ کرو یہ مومنین سے حمایت وحفاظت بلکہ غلبہ اور نصرت کا وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا بنو قریظہ کو قتل کرایا، بنو نضیر کو جلاوطن کرایا اور

= کے حال اور نیت کو جانتا ہے۔

ف۱ یہودی ان آیتوں سے پھر گئے اور اسلام قبول نہ کیا۔ اور نصرانیوں نے بھی انکار کر دیا اور شیخی میں آ کر کہنے لگے کہ ہمارے یہاں ایک رنگ ہے جو مسلمانوں کے پاس نہیں ہے۔ نصرانیوں نے ایک زرد رنگ بنا رکھا تھا اور یہ دستور تھا کہ جب ان کے بچہ پیدا ہوتا یا کوئی ان کے دین میں آتا تو اس کو اس رنگ میں غوطہ دے کر کہتے کہ خاصہ پاکیزہ نصرانی ہو گیا۔ سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مسلمانو کہو کہ ہم نے خدا کا رنگ یعنی (دین حق) قبول کیا کہ اس دین میں آ کر سب طرح کی ناپاکی سے پاک ہوتا ہے۔

نصاریٰ پر جزیہ لگایا۔ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ﴾ اللہ کا وعدہ ہے اور آئندہ کی خبر ہے جو پورے طور پر ثابت ہوئی کہ چند ہی روز میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سر سے یہود اور نصاریٰ کے شر کو دفع کیا اور دین اسلام کے مقابلہ میں یہود و نصاریٰ مغلوب ہوئے اور اللہ کی پیشن گوئی پوری ہوئی اور اللہ تعالیٰ تو سب کی باتوں کو سنتا ہے اور سب کی نیتوں کو جانتا ہے۔ دشمنوں کا کوئی کید اور مکر اس سے پوشیدہ نہیں اور یہود اور نصاریٰ دن رات اس کوشش اور سازش میں ہیں کہ تم کو اپنے رنگ میں رنگ لیں۔ اے مسلمانو تم ان سے یہ کہہ دو کہ ہم کو تو اللہ نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا رنگ ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے اور اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے رنگ سے کون سا رنگ بہتر ہے جو اس کی طرف نظر کی جائے اور یہ رنگ ہم سے زائل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ہم خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں عبادت کی وجہ سے وہ رنگ اور پختہ ہو جاتا ہے اور اخلاص کی وجہ سے دوسرے رنگ کا اس پر کوئی دھبہ بھی نہیں آنے پاتا۔ عبادت اور اخلاص کی وجہ سے وہ زیادہ چمکتا جاتا ہے۔

جب آفتاب اسلام دنیا میں طلوع ہوا تو اس وقت یہود و نصاریٰ میں ایک رسم اصطباغ کی جاری تھی پہلے اس رسم کا رواج یہود میں ہوا اور پھر عیسائیوں نے بھی اس رسم کو جاری رکھا اور اب تک عیسائیوں میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے یا کوئی عیسائی بنتا ہے تو اس کو زرد پانی کے حوض میں غوطہ دیتے ہیں یا اس کے سر پر اس میں سے کچھ پانی ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب سچا عیسائی ہو گیا اسی رسم کا نام اصطباغ ہے جس کو آج کل بپتسمہ دینا کہتے ہیں چونکہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے یہ کہتے تھے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ اس لیے گویا وہ انہیں اصطباغ کی دعوت دیتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ نازل فرمائی اور مسلمانوں کو یہود اور نصاریٰ کی دعوت اصطباغ کا یوں جواب بتایا کہ ان سے کہہ دو کہ ہم تمہارا اصطباغ لے کر کیا کریں گے ہمیں تو اللہ کے دین کا رنگ کافی ہے اس سے بڑھ کر اور بہتر اور کون سا رنگ ہو سکتا ہے اور تم لوگ حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ اور اپنا خداوند سمجھنے کی وجہ سے شرک کے ناپاک رنگ سے ملوث ہو تم اہل توحید اور اہل اخلاص کو کس رنگ کی دعوت دیتے ہو۔

فائدہ:...... صبغۃ اللہ کے اعراب میں مفسرین کا اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے اور تقدیر کلام اس طرح ہے "صبغنا اللہ صبغۃ" جیسے ﴿وَعْدَ اللّٰهِ﴾ اور ﴿صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ فعل مقدر کا مفعول مطلق ہونے کی بنا پر منصوب ہیں اور معنی یہ ہیں "وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ" اور "صَنَعَ اللّٰهُ صُنْعَهٗ" علامہ زمخشری اور بیضاوی اور ابوحیان اور علامہ سیوطی نے اسی اعراب کو اختیار فرمایا اور ہمارا ترجمہ اور تفسیر اسی اعراب پر مبنی ہے دوسرا قول یہ ہے کہ منصوب علی الاغراء ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے "الزموا صبغۃ اللہ" یعنی اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو۔ اس تقدیر پر بھی آیت کے معنی نہایت لطیف ہوں گے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ اے مسلمانو فقط تصدیق اور شہادت پر کفایت اور قناعت نہ کرو بلکہ اس سے ترقی کرو اور اپنے ظاہر و باطن کو اللہ کے رنگ سے رنگو اور وہ رنگ خداوند ذوالجلال کی اطاعت اور محبت اور رضاء و تسلیم کا رنگ ہے جس سے بہتر کوئی رنگ نہیں۔ جب کوئی شخص کسی کی مرضی کے اس درجہ تابع ہو جائے کہ اس کا کوئی حکم اس کو گراں نہ گزرے بلکہ کمال نشاط اور غایت رغبت و محبت سے اس کی تعمیل کی طرف شاداں و فرحاں دل و جان سے دوڑنے لگے تو محاورہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص تو فلاں کے رنگ میں رنگا ہوا ہے پس اے مسلمانو تم اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو اور بطور تحدیث

بالنعمہ یا بطور لذت ومسرت یا بطور تعریض اور اتمام محبت یہ کہتے رہو کہ ہم تو خالص اللہ ہی کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تمہاری طرح شرک میں مبتلا نہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿صِبْغَةَ اللهِ﴾، ﴿مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا﴾ سے بدل ہے اور بالفاظ دیگر ﴿مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ﴾ کی تفسیر ہے یعنی ملت ابراہیم اور ملت اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عجیب وغریب رنگ ہے جس کے مشاہدہ کے لیے آنکھ چاہیے اور ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ صبغۃ اللہ سے مراد ختنہ ہے جو ملت ابراہیمی کا خاص شعار اور خاص رنگ ہے۔

قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ

کہدے کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہم سے اللہ کی نسبت حالانکہ وہی ہے رب ہمارا اور رب تمہارا اور ہمارے لئے ہیں عمل ہمارے اور تمہارے لئے ہیں عمل تمہارے اور ہم

کہہ اب کیا تم جھگڑتے ہو ہم سے اللہ میں اور وہی ہے رب ہمارا اور رب تمہارا اور ہم کو عمل ہمارے اور تم کو عمل تمہارے اور ہم

مُخْلِصُونَ ﴿۱۳۹﴾ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا

تو خالص اسی کے ہیں ف۱ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد تو

اسی کے ہیں نرے کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد

هُودًا أَوْ نَصٰرٰى ۗ قُلْ ءَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ

یہودی تھے یا نصرانی کہدے کہ تم کو زیادہ خبر ہے یا اللہ کو اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے چھپائی وہ گواہی جو ثابت ہو چکی

یہود تھے یا نصارے کہہ تم کو خبر زیادہ ہے یا اللہ کو اور اس سے ظالم کون جس نے چھپائی گواہی جو تھی

مِنَ اللهِ ۗ وَمَا اللهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ

اس کو اللہ کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے ف۲ وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی ان کے واسطے ہے جو انہوں نے کیا اور تمہارے واسطے ہے

اس پاس اللہ کی، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے وہ ایک جماعت تھی گزر گئی ان کا ہوا جو کما گئے اور تمہارا ہے

مَا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶ ۱۲ ۱۶

جو تم نے کیا اور تم سے کچھ پوچھ نہیں ان کے کاموں کی ف۳

جو تم کماؤ اور تم سے پوچھ نہیں ان کے کام کی

ف۱ یعنی اللہ تعالیٰ کی نسبت تمہارا نزاع کرنا اور تمہارا یہ سمجھنا کہ اس کی عنایت ورحمت کا ہمارے سوا کوئی مستحق نہیں لغو بات ہے۔ وہ جیسا تمہارا رب ہے ہمارا بھی رب ہے اور ہم جو کچھ اعمال کرتے ہیں خالص اسی کے لئے کرتے ہیں۔ تمہاری طرح زعم آباؤ اجداد اور تعصب ونفسانیت سے نہیں کرتے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے اعمال وہ مقبول نہ فرمائے اور تمہارے اعمال مقبول ہوں۔

ف۲ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی بابت یہود ونصاریٰ کا یہ دعویٰ کہ وہ یہودی یا نصرانی تھے دروغ صریح ہے علاوہ ازیں حق تعالیٰ تو فرماتا ہے ﴿مَا كَانَ إِبْرٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا﴾ تو اب بتلاؤ تم کو علم زیادہ ہے یا اللہ تعالیٰ کو۔

ف۳ یہی آیت عنقریب گذر چکی ہے مگر چونکہ اہل کتاب کے دل میں اپنی بزرگ زادگی کی وجہ سے خوب جم رہا تھا کہ ہمارے اعمال کیسے ہی برے ہوں بالآخر=

تلقین جواب از مجادلۂ اہل کتاب

قال تعالیٰ: ﴿قُلْ اَتُحَاۗجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ... الی... وَلَا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

اور اگر اہل کتاب آپ سے اس بارہ میں مجادلہ کریں کہ ہم خدا کے رنگ کے ساتھ رنگین ہیں ہمارا دین اور ہماری کتاب تمہارے دین اور تمہاری کتاب سے مقدم ہے نبوت و رسالت ہمیشہ ہمارے ہی خاندان میں رہی اور ہم اللہ کے محبوب ہیں تو آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارہ میں مجادلہ کیے چلے جاتے ہو۔ حالانکہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اس کی ربوبیت کسی کے ساتھ مخصوص نہیں سب کو عام ہے جو اس کے حکم کے مطابق طاعت اور عبادت کرے گا وہ قبول ہو گی ورنہ رد۔ اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں کہ سراسر اس کے حکم کے مطابق ہیں آخری نبی ﷺ کی زبانی جو آخری حکم نازل ہوا اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں کہ ناسخ کے نازل ہونے کے بعد منسوخ حکم اور محرف شریعت پر چل رہے ہو اور تازہ اور محفوظ شریعت سے اعراض و انحراف کر رہے ہو اور علاوہ ازیں ہمارے اور تمہارے درمیان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ہم خالص اللہ ہی کے لیے عبادت کرنے والے ہیں اور تم جو کچھ کرتے ہو وہ تعصب اور نفسانیت اور دنیوی اغراض اور اپنی آبائی رسم کے باقی رکھنے کے لیے کرتے ہو بلکہ صریح شرک میں مبتلا ہو، حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بتلاتے ہو۔ توحید اور اخلاص کا تم پر کوئی ہلکا سا نشان بھی نہیں۔ لہٰذا تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ سراسر غلط ہے تم تو سر تا پا شرک کے رنگ میں رنگے ہوئے ہو تمہارا رنگ تمہارے اعمال سے ظاہر ہے اور ہمارا رنگ ہمارے اعمال سے ظاہر ہے اور کیا تم اس آخری پیغام کی ضد اور اپنی منسوخ اور محرف شریعت کی پچ میں یہ کہتے ہو کہ تحقیق ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور ان کی اولاد یہودی اور نصرانی تھے حالانکہ یہ لوگ نزول توریت و انجیل اور یہودیت اور نصرانیت کے ظہور سے پہلے گزر چکے ہیں اور گزشتہ آیات میں ان حضرات کا ملت اسلام پر ہونا بخوبی واضح ہو چکا ہے آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے کہ جس نے یہ خبر دی ہے ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اب بتلاؤ تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ اور ظاہر ہے کہ اللہ سے زیادہ جاننے والا اور کون ہو سکتا ہے بلکہ نصوص توریت و انجیل اس پر شاہد ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کی ملت حنفیت تھی۔ ختنہ اور حج بیت اللہ ان کا شعار تھا یہودیت اور نصرانیت کے خواص مثلاً ہفتہ اور اتوار کی تعظیم ان کی شریعت میں نہ تھی اور یہ سب کچھ ان کو معلوم ہے مگر چھپاتے ہیں اور ایسے شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے کہ جو ایسی شہادت کو چھپائے اور مخفی رکھے جو اس کے پاس محفوظ ہو اور اس کو خوب یاد ہو اور وہ شہادت اس کو من جانب اللہ پہنچی ہو اور اس کے اعلان اور اظہار کا وہ مامور ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں رسول آخر الزمان کے متعلق جو شہادتیں تمہاری کتابوں میں مذکور ہیں تمہارا ان واضح شہادتوں کو چھپانا اور نصوص توریت

= ہمارے باپ دادا ہم کو ضرور بخشوائیں گے۔ اس لئے اس بیہودہ خیال کے روکنے کے لئے تاکیداً اس آیت کو مکرر بیان فرمایا، یا یوں کہو کہ پہلی آیت میں اہل کتاب کو خطاب تھا اور اس آیت میں آپ کی امت کو ہے کہ اس بیہودہ خیال میں ان کا اتباع نہ کریں کیونکہ ایسی توقع اپنے بزرگوں سے ہر کسی کے دل میں آہی جاتی ہے جو سراسر بے وقوفی ہے اب اس کے بعد یہود وغیرہ کی دوسری بے وقوفی کی اطلاع دی جاتی ہے جو بہ نسبت تحویل قبلہ عنقریب ظاہر ہونے والی ہے۔

انجیل میں تحریف اور تغیر وتبدل کرنا سب اللہ کی نظروں کے سامنے ہے اور تم اس پر غرہ نہ کرنا کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں یہ یک جماعت تھی جو گزر گئی اور اپنے اعمال اپنے ساتھ لے گئی اور مال ومتاع کی طرح تمہارے لیے اپنے اعمال صالحہ کا ذخیرہ چھوڑ کر نہیں گئی کہ جو بوقت ضرورت تمہارے کام آئے اس جماعت کے لیے اس کا کیا ہوا کام آئے گا اور تمہارے لیے تمہارا کیا ہوا کام آئے گا اور تم سے ان کے اعمال کے متعلق کوئی سوال نہ ہوگا لہٰذا جب تم کو ان کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں تو پھر ان کے اعمال سے نفع کی امید رکھنا سفاہت اور نادانی ہے۔

فائدہ:...... یہ آیت قریب ہی گزر چکی ہے تاکید اور مبالغہ کے لیے اس کو مکرر لائے کہ پھر کہہ دیتے ہیں کہ عمل کرو آباؤ اجداد کے بھروسہ پر نہ رہو۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی   کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

الحمد للہ الذی بنعمتہٖ تتم الصالحات والصلاۃ والسلام علیٰ سید البریات وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہ وازواجہ الطاہرات۔ مسلسلات ومتواترات ۴ شوال المکرم یوم دوشنبہ ۱۳۶۹ ھ مقام بہاولپور۔

❁❁❁

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے ف۱ تو کہہ اللہ ہی کا ہے

اب کہیں گے بے وقوف لوگ کاہے پر پھر گئے مسلمان اپنے قبلہ سے جس پر تھے تو کہہ اللہ کی ہے

الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

مشرق اور مغرب چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ ف۲

مشرق اور مغرب چلاوے جس کو چاہے سیدھی راہ۔

اثبات فضیلت قبلۂ ابراہیمی واسرار تحویل قبلہ

قَالَ تَعَالٰی: ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ ... الی ... اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں ملت ابراہیمی اور ملت اسلام کا افضل اور اکمل ہونا اور سرور عالم سیدنا محمد ﷺ کا افضل الرسل ہونا بیان فرمایا۔ اب قبلۂ ابراہیمی اور کعبۂ اسلامی کا تمام قبلوں سے افضل ہونا بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح اس امت کی ملت تمام ملتوں سے افضل اور اکمل ہے۔ اسی طرح اس امت کا قبلہ بھی تمام قبلوں سے افضل اور بہتر ہے اور جس طرح ملت ابراہیمی سے اعراض سفاہت اور جہالت ہے اسی طرح قبلۂ ابراہیمی سے بھی اعراض سفاہت اور جہالت ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہود ونصاریٰ نے ملت ابراہیمی سے بھی اعراض کیا اور حق کو چھپایا اور اپنے آباؤ اجداد کے انتساب پر اعتماد کر کے اعمال صالحہ سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھا اور اپنی سفاہت اور بے وقوفی ظاہر کی۔ اب عنقریب ایک سفاہت اور ظاہر ہوگی۔ وہ یہ کہ جب بیت المقدس کا استقبال منسوخ ہو کر خانہ کعبہ قبلۂ نماز مقرر ہوگا تو یہ نادان اور بے وقوف جو محض صورت کے اعتبار سے انسانوں کی جنس سے ہیں عنقریب یہ کہیں گے کہ کس چیز نے ان کو اس قبلہ سے پھیر دیا کہ جس پر اب تک قائم تھے۔ امام رازی رحمہ اللہ

ف۱ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے مدینہ میں تشریف لائے تو سولہ سترہ مہینے بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے اس کے بعد کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آگیا تو یہود اور مشرکین اور منافقین اور بعضے کچے مسلمان ان کے بہکانے سے شبہے ڈالنے لگے کہ یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے جو قبلہ تھا پہلے انبیاء کا اب انہیں کیا ہوا جو اس کو چھوڑ کر کعبہ کو منہ کرنے لگے کسی نے کہا کہ یہود کی عداوت وحسد سے ایسا کیا کسی نے کہا کہ یہ اپنے دین میں متردد اور متحیر ہیں جن سے ان کا نبی اللہ ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ مخالفوں کے اس اعتراض اور اسکے جواب کی جو آگے ہے اللہ نے اطلاع فرمادی کہ کسی کو اس وقت کوئی تردد نہ ہو اور جواب میں تامل نہ ہو۔

ف۲ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دو کہ نہ ہم نے یہود کے حسد سے اور نہ کسی نفسانی تعصب اور اپنی رائے کے اتباع سے قبلہ کو بدلا بلکہ محض اتباع فرمان خداوندی سے جو کہ ہمارا اصل دین ہے ہم نے ایسا کیا پہلے بیت المقدس کو منہ کرنے کا حکم تھا اس کو ہم نے تسلیم کیا اب کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آیا اس کو دل سے قبول کیا ہم سے اس کی وجہ پوچھنا اور ہم پر اعتراض کرنا سخت حماقت ہے۔ غلام تابعدار پر یہ اعتراض کرنا کہ تو پہلے وہ کام کرتا تھا اب یہ کام کیوں کرنے لگا عاقل کا کام نہیں اور اگر ان احکام مختلفہ کے اسرار دریافت کرتے ہو تو اس کے تمام اسرار کون سمجھے اور تم بیوقوفوں کو کون سمجھائے البتہ اتنی بات ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور ہر ایک کو سمجھا سکتا ہے کہ قبلہ کا معین فرمانا تو طریقۂ عبادت کو بتلانے کی غرض سے ہے اصل عبادت ہرگز نہیں اور اس بارہ میں حق تعالیٰ کا معاملہ جدا جدا ہے کسی کو اپنی حکمت ورحمت کے مطابق ایک خاص رستہ بتلایا جاتا ہے کسی کو دوسرا، تمام مواقع اور جملہ جہات کا وہ مالک ہے جس کو جس وقت چاہتا ہے اس کو ایسا راستہ بتلا دیتا ہے جو نہایت سیدھا اور سب رستوں سے مختصر اور قریب تر ہو۔ چنانچہ ہم کو اس وقت اس قبلہ کی ہدایت فرمائی جو سب قبلوں میں افضل اور بہتر ہے۔

فرماتے ہیں کہ آیت ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ﴾ کے بارہ میں علماء کے دو قول ہیں:

قول اول:...... قفال مروزی یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت تحویل قبلہ کے بعد نازل ہوئی اور یہ لفظ اگرچہ بظاہر استقبال کے لئے ہے لیکن اس جگہ ماضی کے معنی مراد ہیں۔

قول ثانی:...... یہ آیت تحویل قبلہ کے حکم نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے یہود کے آئندہ پیش آنے والے طعن اور اعتراض کی پہلے ہی سے خبر دے دی، اس آیت کے نزول کے وقت تک قبلہ تبدیل نہیں ہوا تھا البتہ ہونے والا تھا اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کی خبر دے دی تا کہ مسلمان یہود کے اعتراض کو سن کر گھبرائیں نہیں اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور اس قول پر آیت کے ربط کی تقریر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ گزشتہ آیات اور رکوعات میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ان اعتراضات کے جواب دیئے گئے جو وہ کر رہے تھے اب اس آیت میں اس اعتراض کا جواب بتلاتے ہیں جو آئندہ چل کر وہ کرنے والے تھے اور مطلب یہ ہے کہ اب تک تو یہود اور نصاریٰ اور مشرکین تم پر وہی اعتراض کرتے تھے جو بیان ہو چکے۔ اور جن کا جواب بھی ہم دے چکے۔ اب عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ جب تم کو تحویل قبلہ کا حکم دیا جائے گا تو یہ بیوقوف اور سفیہ یہ اعتراض کریں گے کہ یہ کیا دین ہے کہ جس کا قبلہ بدلتا رہتا ہے اور کہیں گے کہ مسلمانوں نے اپنے سابقہ قبلہ کو کیوں چھوڑ دیا۔

شانِ نزول:...... آنحضرت جب تک مکہ مکرمہ میں رہے تو خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو بحکم خداوندی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے لگے، سولہ یا سترہ مہینہ تک اسی طرف نماز پڑھتے رہے اس کے بعد خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا تو یہود اور مشرکین اور منافقین طرح طرح کے طعن کرنے لگے یہود کہنے لگے کہ پہلے تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے جو انبیاء کا قبلہ تھا اب اس کو کیوں چھوڑ دیا اور جب آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو اس وقت بعض یہودی یہ کہتے کہ ہمارے دین کو تو مانتے نہیں ہمارے قبلہ کی طرف کیوں نماز پڑھتے ہیں۔ بعض یہودی کہتے کہ محمد (ﷺ) قبلہ سے واقف نہیں اس لئے ہمیں دیکھ کر بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ مشرکین کہنے لگے محمد ﷺ اب سمجھ گئے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنے آبائی دین کی طرف آ رہے ہیں، کوئی کہتا کہ آپ ﷺ اپنے دین کے بارے میں متحیر ہیں آنحضرت ﷺ ان باتوں سے ملول ہوتے اور دل سے یہ چاہتے کہ خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں طعن کرنے والوں کے حال سے خبر دی کہ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوگا تو یہ بے وقوف لوگ یہ کہیں گے کہ مسلمانوں کو اس قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا کہ جس کی طرف وہ نماز پڑھا کرتے تھے یعنی یہ جو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے اب کیا ہوا کہ وہ اسے چھوڑ کر کعبہ کی طرف نماز پڑھنے لگے۔ آپ ان کے جواب میں کہہ دیجئے کہ اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب وہی تمام جہات اور مکانات کا مالک ہے اس کو اختیار ہے کہ جس جہت اور جس سمت کو چاہے قبلہ مقرر کرے اور جس کو چاہے منسوخ کرے۔ غلام کو یہ پوچھنے کا حق حاصل نہیں کہ پہلے یہ حکم دیا تھا اور اب یہ حکم کیوں دیا۔ غلام کا آقا سے اس قسم کا سوال بھی اس کی بے عقلی کی دلیل ہے۔ مریض کا طبیب سے پوچھنا کہ نسخہ کیوں بدلا اس کی کمال سفاہت اور غایت حماقت کی دلیل ہے۔ غلام تو مولیٰ کے حکم کا تابع ہے، اسے تو حکم اتباع چاہیئے سِرّ اور حکمت سے اس کو کیا بحث۔ خیر اگر تم حکمت ہی معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو! اصل مقصود عبادت ہے اور قبلہ عبادت کی ایک راہ ہے خدا کو اختیار ہے کہ جس

راہ سے چاہے اپنے بندوں کی منزل طے کرائے کسی کو کسی راہ سے اور کسی کو کسی راہ سے اور جس کو چاہتا ہے اپنی عبادت کا سیدھا اور قریب راستہ بتاتا ہے کہ جلد منزل مقصود طے ہو جائے اس لئے تم کو بہترین قبلہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا جو عبادت اور معرفت کا سب سے قریب اور سیدھا راستہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام جو کہ تمام بنی نوع انسان کے باپ ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ جو شجرۃ الانبیاء ہیں اور تمام مذاہب اور ملتیں ان کی ملت کے تابع ہیں ان کے لئے بھی یہی راستہ تجویز ہوا اور خانہ کعبہ ہی ان کے لئے قبلہ بنایا گیا کیونکہ خانہ کعبہ زمین کا مرکزی نقطہ ہے۔ سب سے پہلے یہی مرکزی نقطہ پیدا کیا گیا اور یہیں سے زمین بچھائی گئی اور یہی جگہ انسان کا مبداء ترابی ہے اور یہی جگہ عرش عظیم اور بیت المعمور کے محاذات میں ہونے کی وجہ سے حق جل شانہ کے انوار و تجلیات کا مرکز ہے اور انسان چونکہ مٹی سے پیدا ہوا ہے تو حسب قاعدہ "کل شئی یرجع الی اصلہ" اس کا اصلی میلان اسی مرکزی نقطہ یعنی خانہ کعبہ کی طرف ہوگا اگرچہ ظاہراً محسوس نہ ہو۔ اس لئے خانہ کعبہ قبلہ عالم مقرر ہوا۔ نیز روایات سے ثابت ہے کہ جب آسمان اور زمین کو یہ خطاب ہوا۔ ﴿ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا﴾ کہ تم خوشی سے آؤ یا لاچاری سے تو زمین کے اجزاء اور قطعات میں سے سب سے پہلے اسی جگہ نے اطاعت خداوندی کے قبول میں سبقت کی اس لئے از راہ قدردانی حق جل شانہ نے اس جگہ کو قبلہ مقرر فرمایا۔ البتہ چند روز کے لئے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک بنی اسرائیل کے لئے مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنایا گیا کہ جو انبیاء بنی اسرائیل کا موطن اور مسکن اور مقام بعثت اور مقام دعوت ہونے کی وجہ سے مبارک اور مقدس جگہ ہے۔ اسی وجہ سے شب معراج میں حضور کو براق پر سوار کر کے بیت المقدس لایا گیا اور حضرت انبیاء کرام علیہم السلام کی ارواح طیبہ سے ملاقات کرائی گئی اور وہیں سے آپ ﷺ آسمان پر گئے تاکہ حضور ﷺ کے ذاتی انوار اور تجلیات کے ساتھ انبیاء سابقین کے انوار و برکات بھی مل کر نور علیٰ نور کا فائدہ دیں اور نبی القبلتین کے لقب سے ملقب ہوں اور توریت اور انجیل کی بشارت پوری ہو کہ وہ نبی آخر الزمان صاحب قبلتین ہوگا لہٰذا اس شکر میں کہ حضور ﷺ کو معراج بیت المقدس سے ہوئی چند روز کے لئے نماز میں بیت المقدس کے استقبال کا حکم ہوا کہ یہ مقدس جگہ جو حضور ﷺ کی معراج اور ترقی کا زینہ بھی اس کا حق یہ ہے کہ چند روز اس کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرمائیں تاکہ سینہ مبارک اس مبارک اور مقدس جگہ کے انوار و تجلیات کو اپنے اندر جذب کر لے اور پھر یہ کمالات آپ کے سینہ مبارک سے آپ کی امت کے علماء کے سینوں کی طرف منتقل ہوں تاکہ آپ کی امت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کے وارث کہلا سکیں۔

غرض یہ کہ اس وجہ سے چند روز کے لئے بیت المقدس کے استقبال کا حکم ہوا پھر ہمیشہ کے لئے اصل قبلہ کے استقبال کا حکم نازل ہوا۔ اس لئے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل قبلہ خانہ کعبہ ہے اور یہی جگہ تمام روئے زمین پر سب سے افضل اور اکمل ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل کہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل کہ تم ہو بتانے والے لوگوں پر اور رسول ہو تم

عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

تم پر گواہی دینے والا ف ۱

پر بتانے والا۔

تمام امتوں پر امت محمدیہ کی فضیلت

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ... الی ... وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

اور جس طرح ہم نے تمہارے لئے بہتر قبلہ تجویز کیا کہ وسط زمین میں ہے اور تمہارا مبداء ترابی ہے اور حق تعالی شانہ کے انوار وتجلیات کا مرکز ہے اسی طرح ہم نے تم کو امت متوسط بنایا کہ جو اخلاق اور اعمال اور عقائد کے اعتبار سے متوسط اور معتدل ہے افراط اور تفریط کے درمیان میں واقع ہے گویا کہ یہ امت اپنے کمال توسط اور کمال اعتدال کے اعتبار سے حلقۂ امم کے درمیان عین مسند پر بیٹھی ہوئی ہے اور تمام امتیں اطراف وجوانب سے اس کی جانب متوجہ ہیں اور ہم نے تم کو اس توسط اور اعتدال کی فضیلت اس لئے عطا کی تاکہ تمہاری عدالت علی وجہ الکمال ثابت ہو جائے اور قیامت کے دن تم لوگوں پر گواہ بن سکو اس لئے کہ شہادت کے لئے عدالت شرط ہے اور جب تم کامل العدالت ہو گئے تو ٹھیک شہادت دے سکو گے۔ کمال اعتدال کی وجہ سے کسی ایک جانب تمہارا میلان نہ ہوگا اور تمہاری شہادت حق ہوگی اور طرفداری کے شائبہ سے پاک ہوگی۔ قیامت کے دن حق تعالی اولین وآخرین کو جمع کرے گا اور گزشتہ امتوں کے کافروں سے خطاب فرمائے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی نذیر یعنی ڈرانے والا نہیں آیا وہ صاف انکار کر دیں گے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا جس سے ہم کو تیرے احکام کی اطلاع ہوتی اللہ تعالی انبیاء علیہم السلام سے دریافت فرمائیں گے، تمام انبیاء متفق اللفظ یہ عرض کریں گے کہ اے اللہ ہم تیرے احکام کو پہنچا چکے یہ جھوٹ بولتے ہیں، اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہیں ان کو سب معلوم ہے مگر تمام حجت کے لئے انبیاء سے گواہ طلب کریں گے۔ حضرات انبیاء اپنی گواہی میں امت محمدیہ کو پیش کریں گے۔ امم سابقہ کے کفار کہیں گے کہ ان کو کیا معلوم یہ تو ہم سے قرنہا قرن بعد میں آئے۔ امت محمدیہ یہ جواب دے گی کہ اگرچہ ہم ان کے بعد آئے مگر ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ تمام انبیاء نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ کے احکام پہنچا دیئے اور شہادت کے لئے علم قطعی اور یقینی کافی ہے۔ خاص مشاہدہ ضروری نہیں اور نبی کی خبر مشاہدہ سے ہزار درجہ زیادہ قطعی اور یقینی ہے۔ مشاہدہ میں غلطی کا امکان ہے۔ نبی کی خبر میں غلطی کا امکان نہیں اس لئے کہ نبی "نَبَاء" سے مشتق ہے اور نبا لغت میں اس خبر کو کہتے

ف ۱ یعنی جیسا تمہارا قبلہ کعبہ ہے جو حضرت ابراہیم کا قبلہ اور تمام قبلوں سے افضل ہے ایسا ہی ہم نے تم کو سب امتوں سے افضل اور تمہارے پیغمبر کو سب پیغمبروں سے کامل اور برگزیدہ کیا تاکہ اس فضیلت اور کمال کی وجہ سے تم تمام امتوں کے مقابلہ میں گواہ مقبول الشہادۃ قرار دیئے جاؤ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری عدالت وصداقت کی گواہی دیں جیسا کہ احادیث میں وارد ہے کہ جب پہلی امتوں کے کافر اپنے پیغمبروں کے دعوے کی تکذیب کرینگے اور کہیں گے کہ ہم کو تو کسی نے بھی دنیا میں ہدایت نہیں کی اس وقت آپ کی امت انبیاء کے دعوے کی صداقت پر گواہی دے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اپنے امتیوں کے حالات سے پورے واقف ہیں ان کی صداقت وعدالت پر گواہ ہونگے اسوقت وہ امتیں کہیں گی کہ انہوں نے تو نہ ہمارا زمانہ پایا نہ ہم کو دیکھا پھر گواہی کیسے مقبول ہو سکتی ہے اس وقت آپ کی امت جواب دیگی کہ ہم کو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کے بتلانے سے اس امر کا علم یقینی ہوا اس کی وجہ سے ہم گواہی دیتے ہیں۔

فائدہ: وسط یعنی معتدل کا یہ مطلب ہے کہ یہ امت ٹھیک سیدھی راہ پر ہے جس میں کچھ بھی کجی کا شائبہ نہیں اور افراط وتفریط سے بالکل بری ہے۔

ہیں جو بالکل صحیح اور واقع کے مطابق ہو۔ وہ مہتم بالشان بھی ہو اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کو بلایا جائے گا اور آپ سے آپ کی امت کی اس شہادت کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ تو اے اس امت کے مسلمانو اس وقت رسول اللہ ﷺ تم پر گواہ ہوں گے اور تمہاری عدالت اور صداقت کی شہادت دیں گے اور پھر تمہاری شہادت کے مطابق حضرات انبیاء کے حق میں فیصلہ ہوگا اور کفار مجرم قرار دیئے جائیں گے۔

فائدہ:...... اس امت کو متوسط اس معنی کر فرمایا کہ یہ امت عقائد اور اعمال اور اخلاق کے اعتبار سے معتدل ہے افراط اور تفریط کے درمیان ہے۔ برخلاف یہود کے وہ تفریط میں مبتلا ہیں، حضرات انبیاء کی تنقیص کرتے ہیں ان کو معصوم نہیں سمجھتے جو کہ نبوت کا خاصہ لازمہ ہے اور نصاریٰ افراط میں مبتلا ہیں کہ اپنے نبی کو مرتبہ بندگی سے درجہ فرزندی پر پہنچایا اور توسط اور اعتدال ہی باجماع عقلاء اعلیٰ درجہ کا کمال ہے۔ اسی لئے علماء نے اس آیت سے امت محمدیہ کے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے کیونکہ اس امت کے اجماع کو نہ قبول کرنا اس کی عدالت سے عدول کرنا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ کے وسط (درمیان) میں ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ امت انبیاء و اولیاء کے درمیان ہے انبیاء سے نیچے اور اولیاء سے اوپر۔ چونکہ اس خطاب کے بالذات مخاطب صحابہ کرام ہیں اس لئے اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کرام کا مقام انبیاء کرام سے نیچے ہے اور تمام اولیاء سے بلند اور اونچا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَآ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کون تابع رہیگا رسول کا اور کون پھر جائے گا

اور وہ جو ہم نے ٹھہرایا قبلہ جس پر تو تھا نہیں مگر اسی واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع رہے گا رسول کا اور کون پھر جاوے گا

عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ

الٹے پاؤں ف۱ اور بیشک یہ بات بھاری ہوئی مگر ان پر جن کو راہ دکھائی اللہ نے ف۲ اور اللہ ایسا نہیں

الٹے پاؤں اور یہ بات بھاری ہوئی مگر ان پر جن کو راہ دی اللہ نے اور اللہ ایسا نہیں کہ

ف۱ یعنی اصلی قبلہ تمہارا تو کعبہ ہی تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلا آتا ہے اور چند روز کے لئے جو بیت المقدس مقرر کر دیا تھا وہ تو صرف امتحان کے لئے تھا کہ کون تابعداری پر قائم رہتا ہے اور کون دین سے پھر جاتا ہے سو اس میں جو لوگ ایمان پر قائم رہے ان کا بڑا درجہ ہے۔

فائدہ: اس آیت میں لنعلم جو صیغہ استقبال ہے اور دیگر آیات میں جو حتی نعلم اور فلیعلمن اور لما یعلم اللہ اور لنبلونکم اور الا لنعلم وغیرہ کلمات موجود ہیں ان سب سے بظاہر یوں سمجھ میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ کو نعوذ باللہ ان اشیاء کا علم بعد کو ہوا ان چیزوں کے وجود سے پہلے علم نہ تھا، حالانکہ اس کا علم ہر چیز کے ساتھ قدیم ہے ﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ علماء نے کئی طرح سے اس کا جواب دیا ہے بعض نے علم سے تمیز اور جدا جدا کر دینا مراد لیا ہے بعض نے امتحان کے معنی لئے کسی نے علم کو بمعنی رویت لیا کسی نے مستقبل کو بمعنی ماضی فرمایا بعض نے حدوث علم کو نبی اور مومنین کی طرف رجوع کیا یا مخاطبین کی طرف لوٹایا بعض اکابر محققین نے علم حالی جو بعد وجود معلوم متحقق ہوتا ہے جس پر جزا و سزا و مدح و ذم مترتب ہوتی ہے مراد لیا اور اسی کو پسند فرمایا بعض راسخین مدققین نے اس کے متعلق دو باتیں نہایت دقیق و انیق بیان فرمائیں۔ اول کا خلاصہ یہ ہے کہ حسب ارشاد ان اللّٰہ قد احاط بکل شیء علماً تمام چیزیں اول سے آخر تک حقیر و عظیم قلیل و کثیر خدا کے سامنے ہیں اور سب کا علم اس کو ایک ساتھ ہے اس کے علم میں تقدم و تاخر ہرگز نہیں مگر آپس میں ایک دوسرے کی نسبت بیشک مقدم اور موخر گنی جاتی ہیں سو علم خداوندی کے حساب سے تو سب کی سب بمنزلہ شئی واحد موجود ہیں اس لئے وہاں ماضی حال استقبال نکالنا بالکل غلط ہوگا البتہ =

=تقدم وتاخر باہمی کی وجہ سے یہ تینوں زمانے بالبداہت جدا جدا نکلیں گے سو جناب باری تعالیٰ کبھی تو حسب موقع وحکمت اپنے معلوم ہونے کے لحاظ سے کلام فرماتا ہے اور کبھی ان وقائع کے تقدم وتاخر کا لحاظ ہوتا ہے پہلی صورت میں تو ہمیشہ بلحاظ ایک فرق دقیق کے ہمیشہ ماضی کا صیغہ یا حال کا صیغہ مستعمل ہوتا ہے استقبال کا صیغہ مستعمل نہیں ہوسکتا اور دوسری صورت میں ماضی کے موقع میں ماضی اور حال کے موقع میں حال اور استقبال کی جگہ استقبال لایا جاتا ہے سو جہاں کہیں وقائع آئندہ کو ماضی کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے جیسا ﴿وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ﴾ وغیرہ تو وہاں اس کا لحاظ ہے کہ حق تعالیٰ کو سب مستحضر اور پیش نظر ہے اور جہاں امور گزشتہ کو صیغہ استقبال سے بیان فرمایا ہے جیسا اسی آیت میں الا لنعلم ہے یا اور اس کے سوا تو وہاں یہ مدنظر ہے کہ بہ نسبت اپنے ماقبل کے مستقبل ہے علم الٰہی کے لحاظ سے استقبال نہیں جو اس کے علم میں حدوث کا وہم ہو۔ دوسری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو علم اشیاء دو طریق سے حاصل ہوتا ہے ایک تو بلاواسطہ دوسرا بواسطہ مثلاً آگ کو کبھی تو آنکھ سے مشاہدہ کرتے ہیں اور کبھی آگ تو ہم سے کسی آڑ میں ہوتی ہے مگر دھوئیں کو دیکھ کر آگ کا یقین ہوجاتا ہے اور بسا اوقات یہ دونوں علم ایک جگہ ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں مثلاً آگ کو پاس سے دیکھئے تو دھواں بھی اس کے ساتھ نظر آئیگا۔ سو اس صورت میں آگ کا علم دونوں طرح حاصل ہوگا ایک تو بلاواسطہ کیونکہ آنکھ سے آگ کو دیکھ رہے ہیں دوسرا بواسطہ یعنی آگ کا علم دھوئیں کے واسطہ سے اور یہ دونوں علم ہرچند ایک ساتھ ہیں آگے پیچھے پیدا نہیں ہوئے مگر علم بواسطہ علم بلاواسطہ میں ایسا محو ہوتا ہے کہ اس کا دھیان بھی نہیں گزرتا۔ علیٰ ہذا القیاس کبھی دو چیزوں کا علم بلاواسطہ بھی ایک ساتھ حاصل ہوتا ہے مثلاً آگ اور دھوئیں کو ایک ساتھ دیکھئے اسی طرح کبھی ایک شئی کا علم بلاواسطہ اور دوسری شئی کا علم پہلی شئی کے واسطہ سے ایک ساتھ حاصل ہوتے ہیں مثلاً دھوئیں کا علم بلاواسطہ اور آگ کا علم دھوئیں کے واسطہ سے، یا آگ کا علم بلاواسطہ اور دھوئیں کا علم آگ کے واسطہ سے دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں مگر جیسا قلم کو ہاتھ میں لے کر لکھیں تو ہر چند ہاتھ اور قلم ساتھ ہی ہلتے ہیں لیکن پھر یوں کہتے ہیں کہ ہاتھ پہلے ہلا تو قلم ہلا اسی طرح پر عقل سلیم باوجود ایک ساتھ ہونے کے ایک شے کے علم بلاواسطہ کو دوسری شے کے علم بالواسطہ سے جو بواسطہ پہلی شے کے حاصل ہوا ہے ایک طرح پر ضرور مقدم سمجھتی ہے جب یہ باتیں معلوم ہوچکیں تو اب سنیئے کہ خداوند علیم کو بھی تمام اشیاء کا علم دونوں طرح پر ہے بلاواسطہ اور بواسطہ یکدگر یعنی لوازم کا ملزومات سے اور ملزومات کا لوازم سے اور دونوں علم ازل سے برابر ساتھ ہیں گو علم بواسطہ کسی چیز کا اس کے علم بلاواسطہ میں محو اور مضمحل ہو اور ایسا ہی ایک چیز کا علم بلاواسطہ اور دوسری چیز کا علم بالواسطہ برابر ساتھ ہے اور دونوں قدیم ہیں گو علم بلاواسطہ کو بطریق مذکور مقدم اور علم بالواسطہ کو مؤخر کہیں سو جہاں کہیں علم خداوندی کے ذکر میں صیغہ استقبال کا یا معنی استقبال کے پائے جاتے ہیں وہ علم بالواسطہ کے لحاظ سے ہے زمانہ کے اعتبار سے کچھ تفاوت نہیں اور جہاں کہیں ماضی یا حال مستعمل ہے وہاں علم بلاواسطہ مراد ہے اور علم بالواسطہ کے اعتبار سے کلام فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ کلام الٰہی کے مخاطب آدمی ہیں اور ان کو اکثر اشیاء کا علم بالواسطہ ہوتا ہے اور جہاں کہیں جناب باری تعالیٰ نے اپنے علم میں صیغہ استقبال استعمال فرمایا ہے وہ وہی امور ہیں جو بنی آدم کو بلاواسطہ معلوم نہیں ہوسکتے۔ اگر ایسے مواقع میں بنی آدم سے باعتبار علم بلاواسطہ کلام کیا جاتا تو ان پر پورا الزام نہ ہوتا اور جہاں یہ مصلحت نہیں وہاں باعتبار علم بلاواسطہ صیغہ ماضی یا حال کا استعمال کیا جاتا ہے مگر بنی آدم کو چونکہ ان اشیاء کا علم بلاواسطہ ہو ہی نہیں سکتا اور ان واسطوں کا علم قبل ان کے وجود کے بنی آدم کو ممکن نہیں اور اس وجہ سے ان کے تمام علوم برابر حاصل نہیں ہوتے تو وہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کر کے صیغہ استقبال سے حدوث سمجھ جاتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ علم الٰہی میں تو حدوث ثابت ہوگیا مگر فہمیدہ اشخاص جو نکتہ مذکورہ سے واقف ہیں سب کو مطابق یکدگر سمجھتے ہیں والحمد للہ۔

ف ۲ ازل سے آپ کے لئے خانہ کعبہ قبلہ مقرر ہوا تھا بیچ میں چند عرصہ کے لئے امتحاناً بیت المقدس کو قبلہ مقرر فرمایا اور سب جانتے ہیں کہ امتحان اسی چیز میں ہوتا ہے جو نفس پر دشوار ہو سو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیشک بجائے کعبہ بیت المقدس کو قبلہ بنانا لوگوں کو بھاری معلوم ہوا عوام مسلمین کو تو اس وجہ سے کہ وہ عموماً عرب اور قریش تھے اور کعبہ کی افضلیت کے معتقد تھے ان کو اپنے خیال اور رسم وعادت کے خلاف کرنا پڑا، اور خواص کے گھبرانے کی یہ وجہ تھی کہ ملت ابراہیمی کے خلاف تھا جس کی موافقت کے مامور تھے اور اخص الخواص جن کو ذوق سلیم اور تمیز مراتب کی لیاقت عطاء ہوئی تھی وہ کعبہ کے بعد بیت المقدس کی طرف متوجہ ہونے کو ترقی معکوس خیال کرتے تھے مگر جن حضرات کو حکمت واسرار تک رسائی تھی اور حقیقت کعبہ اور حقیقت بیت المقدس کو بنور فراست جدا جدا معہ فرق مراتب سمجھتے تھے وہ جانتے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے کمالات کے جامع اور آپ کی رسالت جملہ عالم اور تمام امتوں کے لئے شامل ہے اس لئے ضرور ہے کہ استقبال بیت المقدس کی بھی نوبت آئے یہی وجہ ہے کہ شب معراج میں تمام انبیاء سابقین سے ملاقات بھی ہوئی اور اس کے بعد استقبال بیت المقدس کا بھی حکم ہوا واللہ اعلم۔

لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤٣﴾

کہ ضائع کرے تمہارا ایمان بیشک اللہ لوگوں پر بہت شفیق نہایت مہربان ہے ف۱

ضائع کرے تمہارا یقین لانا البتہ اللہ لوگوں پر شفقت رکھتا ہے مہربان۔

تحویل قبلہ پر ایک شبہ مع الجواب

قال تعالیٰ: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا ... الی ... إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾

آگے ایک شبہ کا ازالہ فرماتے ہیں کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ اس امت متوسطہ اور کاملہ کے لئے مناسب یہی قبلۂ کاملہ ہے کہ جو وسط ارض میں ہے تو پھر اس میں کیا مصلحت تھی کہ چند روز کے لئے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا اور پھر اس کو منسوخ کیا، آئندہ آیت میں اس کا جواب دیتے ہیں کہ ہمارے علم میں تمہارا اصلی قبلہ تو کعبہ ہی تھا جو حضرت ابراہیم کے وقت سے چلا آرہا تھا۔ اور جس قبلہ کی طرف چند روز آپ نماز ادا کرتے رہے یعنی بیت المقدس اس کو ہم نے آپ کا اصلی قبلہ نہیں بنایا تھا مگر محض اس مصلحت کے لئے چند روز اس کے استقبال کا حکم دیا تھا کہ اعلانیہ اور ظاہر طور پر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں رسول کی تصدیق اور اطاعت سے تکذیب اور نافرمانی کی طرف پھرتا ہے۔ یعنی بجائے کعبہ کے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں مسلمانان قریش کا امتحان مقصود تھا کہ کون رسول اللہ کا سچا تابعدار ہے کہ جس قبلہ کی طرف بھی نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں اسی طرف نماز ادا کرتا ہے اور کون قومی حمیت کی رعایت کرتا ہے اس لئے کہ قریش کعبۃ اللہ کی تعظیم پر فخر کرتے تھے اور قبلۂ ابراہیمی کی مجاورت اور خدمت پر ناز کرتے تھے۔ اور بیت المقدس سے قبلۂ بنی اسرائیل ہونے کی وجہ سے نفرت کرتے تھے۔ اللہ تعالی نے اس قوم حمیت کے امتحان کے لئے بجائے خانہ کعبہ کے بیت المقدس کے استقبال کا حکم دیا۔ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں مسلمانانِ قریش کا امتحان تھا اور پھر جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو اس میں مسلمانانِ یہود کا امتحان تھا اور چونکہ بیت المقدس محض چند روز کے لئے امتحاناً قبلہ بنایا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ امتحان اسی چیز میں ہوتا ہے جو نفس پر شاق اور گراں ہو اس لئے ارشاد فرماتے ہیں اور بے شک بیت المقدس کا قبلہ ہونا قریش اور عرب پر بہت شاق اور گراں تھا، اولاد اسماعیل ہونے کی وجہ سے قبلۂ ابراہیمی کو پسند کرتے تھے مگر ان لوگوں پر شاق نہیں کہ جن کو اللہ نے ہدایت اور توفیق دی اہل ہدایت کی نظر ہمیشہ اطاعت پر رہتی ہے کہ جس وقت جو حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے جس جانب چہرہ کرنے کا حکم ہوگا اسی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ نیز اخص الخواص اپنے ذوق سلیم سے یہ خیال کرتے تھے کہ اگرچہ خانہ کعبہ بیت المقدس سے افضل ہے۔ مگر چونکہ آنحضرت ﷺ تمام انبیاء کے کمالات کے جامع ہیں اور آپ کی رسالت تمام عالم اور امم کے لئے ہے۔ اس لئے یہ لوگ اپنی نور فراست سے سمجھتے تھے کہ ضروری ہے کہ کسی وقت استقبال بیت المقدس کی نوبت آئے گی۔ اور بعد چندے اصل قبلہ یعنی کعبہ کی طرف رجوع کا حکم

ف۱ یہود نے کہا کہ کعبہ قبلہ اصلی ہے تو اتنی مدت کی نماز جو بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی ضائع ہوئی بعض مسلمانوں کو شبہ ہوا کہ بیت المقدس جب قبلہ اصلی نہ تھا تو جو مسلمان اسی حالت پر مرگئے ان کے ثواب میں نقصان رہا، باقی زندہ رہنے والے تو آئندہ کو مکافات اور اس کا تدارک کرلیں گے اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جب تم نے بیت المقدس کی طرف نماز محض مقتضائے ایمانی اور اطاعت حکم خداوندی کے سبب پڑھی تو تمہارے اجر و ثواب میں کسی طرح کا نقصان نہ ڈالا جائے گا۔

ہوگا مگر یہ جو افضل الرسل کے مناسب ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:...... ﴿اِلَّا لِنَعْلَمَ﴾ سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کو پہلے سے علم نہ تھا بعد میں علم ہوا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم اور ازلی ہے حاشا وکلا اللہ کا علم حادث نہیں۔

جواب:...... بعض علماء نے یہ جواب دیا کہ علم سے تمیز کے معنی مراد ہیں یعنی ممتاز اور جدا جدا کر دینا بعض کہتے ہیں کہ علم سے مراد امتحان اور آزمائش ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم مطیع کو نافرمان سے ممتاز اور جدا کر دیں یا یہ معنی ہیں کہ ہم امتحان کرتے ہیں کہ کون اطاعت کرتا ہے اور کون انحراف کرتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مضاف محذوف ہے اور اللہ کے جاننے سے اللہ کے رسول ﷺ کا اور عباد مومنین کا جاننا مراد ہے یعنی تا کہ ہمارا رسول ﷺ اور اہل ایمان بھی جان لیں۔

اور بیت المقدس اگرچہ اصلی قبلہ نہ تھا مگر تم نے اس مدت میں جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں ان کو ضائع نہ سمجھنا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ جو تمہارے ایمان اور اطاعت کو ضائع کر دے اس لئے کہ تم نے جو نمازیں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہیں وہ اللہ ہی کے حکم سے پڑھی ہیں اور تحقیق اللہ تعالیٰ تو تمام آدمیوں پر۔ نیک ہوں یا بد مومن ہوں یا کافر سب ہی پر بہت ہی شفیق اور مہربان ہیں وہ اپنے حکم کے اتباع کرنے والوں کی نماز اور بندگی کب ضائع کر سکتے ہیں۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ

بیشک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا تیرے منہ کا آسمان کی طرف، سو البتہ پھیریں گے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے ف۱ اب پھیر منہ اپنا طرف

ہم دیکھتے ہیں پھر پھر جانا تیرا منہ آسمان میں سو البتہ پھیریں گے تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے اب پھیر منہ اپنا طرف

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

مسجد الحرام کے ف۲ اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منہ اسی کی طرف ف۳ اور جن کو ملی ہے

مسجد حرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منہ اسی کی طرف اور جن کو ملی ہے

الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۴

کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے ان کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں ف۴

کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے ان کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو کرتے ہیں۔

ف۱ چونکہ آپ کا اصلی قبلہ اور آپ کے کمالات کے مناسب خانہ کعبہ تھا اور سب قبلوں سے افضل اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی قبلہ وہی تھا ادھر یہود طعن کرتے تھے کہ یہ نبی شریعت میں ہمارے مخالف اور ملت ابراہیمی کے موافق ہو کر ہمارا قبلہ کیوں اختیار کرتے ہیں ان وجوہ سے جس زمانہ میں آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو دل یہی چاہتا تھا کہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آجائے اور اس شوق میں آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ہر طرف کو دیکھتے تھے کہ شاید فرشتہ حکم لاتا ہو اس پر یہ آیت اتری اور استقبال کعبہ کا حکم آگیا۔

ف۲ یعنی کعبہ کی طرف اور اسکو مسجد الحرام اس لئے کہتے ہیں کہ وہاں مقاتلہ کرنا اور شکار کرنا جانوروں کا اور درخت اور گھاس کا کاٹنا وغیرہ امور حرام ہیں اور کسی مسجد کی اتنی حرمت و عزت نہیں جس قدر مسجد الحرام کی حرمت ہے جب تحویل قبلہ کا یہ حکم نازل ہوا تو آپ باجماعت مسجد بنی سلمہ میں ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے دو رکعت بیت المقدس کی طرف پڑھ چکے تھے نماز ہی میں آپ نے اور سب مقتدیوں نے کعبہ کی طرف منہ پھیر لیا اور باقی دو رکعتیں پوری کیں اس مسجد کا نام مسجد القبلتین اور ذو القبلتین ہو گیا یعنی دو قبلہ والی۔

ف۳ یعنی حضر میں یا سفر میں مدینہ میں یا دوسرے شہر میں جنگل میں یا دریا میں یا خود بیت المقدس میں جہاں کہیں ہو کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔ =

تحویل قبلہ کا حکیمانہ جواب

قال تعالیٰ: ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ ... الی ... وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ﴾

گزشتہ آیات میں تحویل قبلہ پر شبہ کا حاکمانہ جواب تھا۔ اب حکیمانہ جواب ارشاد فرماتے ہیں اور تحویل قبلہ کی حکمتوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

حکمت اول:...... رافت اور رحمت کی وجہ سے اگرچہ استقبال بیت المقدس میں بھی اجر کامل مل جائے مگر قبلہ کاملہ درحقیقت کعبہ معظمہ ہے اور کامل کا میلان طبعی کامل ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے کہ شاید فرشتہ کامل قبلہ کے استقبال کا حکم لے کر نازل ہو۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تحقیق ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے چہرہ کا بار بار وحی کے انتظار میں آسمان کی طرف اٹھنا کہ کب خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم نازل ہو اور چونکہ ہم کو آپ کی آرزو اور خواہش کا پورا کرنا منظور ہے پس اس لئے ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح میری ملت ابراہیمی ہے اسی طرح میرا قبلہ عبادت بھی قبلہ ابراہیمی بنا دیا جائے اور پھر حکم دے ہی دیتے ہیں پس آپ اپنا منہ بجائے بیت المقدس کے مسجد حرام کی طرف کر لیجئے کہ اب ہمیشہ کے لئے وہی آپ کا قبلہ ہے اور یہ حکم آپ کے لئے مخصوص نہیں اگرچہ درخواست آپ کی تھی مگر حکم تمام امت کے لئے ہے۔ امت سے کہہ دیجئے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اسی جانب اپنے چہروں کو متوجہ کرو حتی کہ اگر بیت المقدس میں بھی ہو تب بھی مسجد حرام ہی کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرو اور تحقیق اہل کتاب بخوبی یہ جانتے ہیں کہ یہ قبلہ حق ہے۔ خود اُن کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان ملت ابراہیمی پر ہوں گے اور ان کا قبلہ قبلہ ابراہیمی ہوگا اور اہل کتاب یہ بھی بالیقین جانتے ہیں کہ اس نبی اور اس امت نے یہ قبلہ اپنی رائے سے نہیں ٹھہرایا بلکہ ان کے پروردگار کی جانب سے یہی حکم آیا ہے مگر اس کو چھپاتے ہیں ظاہر نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کی ان کارروائیوں سے غافل نہیں وہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کے حکم پر چلتا ہے اور کون اپنی رائے اور خیال پر چلتا ہے حاصل اس حکمت کا یہ ہے کہ ہم نے آپ کی خواہش اور خوشی کے موافق قبلہ تبدیل کر دیا تا کہ لوگوں پر آپ کا شرف اور آپ کی عظمت ظاہر ہو جائے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ

اور اگر تو لائے اہل کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں کے تیرے قبلہ کو اور نہ تو مانے

اور اگر تو لادے کتاب والوں پاس ساری نشانیاں نہ چلیں گے تیرے قبلہ پر اور نہ تو مانے ان کا

قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

ان کا قبلہ اور نہ ان میں ایک مانتا ہے دوسرے کا قبلہ ف۱ اور اگر تو چلا ان کی خواہشوں پر بعد اس

قبلہ اور نہ ان میں ایک مانتا ہے دوسرے کا قبلہ اور کبھی تو چلا ان کی پسند پر بعد اس

= ف۱ یعنی اہل کتاب جو تحویل قبلہ کی نسبت اعتراض کریں اس کی ہرگز پرواہ نہ کرنا کیونکہ انکو کتاب سے معلوم ہے کہ پیغمبر آخر الزماں بیت المقدس کی طرف =

جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ

علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہوا بے انصافوں میں ف۲ جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں اس کو

علم کے جو تجھ تک پہنچا تو بے شک تو بھی ہے بے انصافوں میں جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں یہ بات

كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اَلْحَقُّ

جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور بیشک ایک فرقہ ان میں سے البتہ چھپاتے ہیں حق کو جان کر حق وہی ہے

جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور ایک فرقہ ان میں چھپاتے ہیں حق کو جان کر حق

مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ

جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا ف۳ اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہے یعنی قبلہ کہ وہ منہ کرتا ہے اس طرف سو تم سبقت کرو نیکیوں میں

وہی جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا اور ہر کسی کو ایک طرف ہے کہ منہ کرتا ہے اس طرف سو تم سبقت چاہو

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ

جہاں کہیں تم ہو گے کر لائے گا تم کو اللہ اکٹھا بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے ف۴ اور جس جگہ سے تو

نیکیوں میں جس جگہ تم ہو گے کر لاوے گا اللہ اکٹھا بے شک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے اور جس جگہ سے

= کچھ دنوں نماز پڑھیں گے اور آخر کو کعبہ کی طرف پڑھیں گے اور یہ بھی انکو معلوم ہے کہ اصلی اور دائمی قبلہ ان کا ملت ابراہیمی کے موافق ہو گا اس لئے اس تحویل قبلہ کو وہ بھی حق سمجھتے ہیں محض حسد سے جو چاہیں کہیں سو حق تعالیٰ ان کی باتوں کو خوب جانتا ہے جس کا نتیجہ ان کو ایک دن معلوم ہو جائے گا۔

ف۱ یعنی جب یہ بات ہے کہ اہل کتاب استقبال کعبہ کو حق جان کر بوجہ حسد وعناد حق پوشی کرتے ہیں تو ان سے اپنے قبلہ کی موافقت کی ہرگز توقع مت رکھو وہ تو ایسے متعصب ہیں کہ اگر ان کو تمام نشانیاں جو ممکن الوقوع ہیں دکھلا دو گے جب بھی تمہارے قبلہ کو نہ مانیں گے وہ تو اس ہوس میں ہیں کہ کسی طرح تم کو اپنا تابع بنالیں اسی وجہ سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے قبلہ پر قائم رہتے تو ہم سمجھتے کہ تم نبی موعود ہو کہ شاید پھر ہمارے قبلہ کی طرف رجوع کرلیں سو یہ ان کا خیال باطل اور طمع خام ہے تم کسی وقت میں بھی ان کے قبلہ کا اتباع نہیں کر سکتے اب استقبال کعبہ کا حکم قیامت تک منسوخ نہیں ہو سکتا اور دوسروں کے تابع بنانے کا ارادہ تو بعد میں کریں پہلے اہل کتاب تو آپس میں در بارہ امر قبلہ موافق ہو جائیں یہود کا قبلہ صخرہ بیت المقدس ہے اور نصاریٰ کا قبلہ بیت المقدس کی شرقی جانب ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نفخ روح ہوا تھا جب وہ ہی باہم موافق نہیں ہو سکتے تو پھر مسلمانوں سے اس متابعت متعصبین کی توقع کرنی محض حماقت ہے۔

ف۲ یعنی ان دلائل سے قطع نظر کر کے تھوڑی دیر کے لئے اگر مان بھی لیا جائے کہ آپ نعوذ باللہ اہل کتاب کے قبلہ کی متابعت نزول وحی اور علم یقینی کے خلاف کر بھی لیویں تو اس تقدیر محال پر بیشک آپ بھی بے انصافوں میں شمار ہوں اور نبی سے یہ امر شنیع کسی طرح ممکن نہیں تو معلوم ہو گیا کہ قبلہ اہل کتاب کی متابعت آپ سے ہرگز ممکن نہیں کہ سراسر علم کے خلاف یعنی جہل اور گمراہی ہے۔

ف۳ یعنی اگر تم کو یہ خیال ہو کہ کاش کعبہ کا مسلمانوں کے لئے قبلہ ہونا اہل کتاب بھی کسی طرح تسلیم کرلیں اور دوسرے لوگوں کو شبہ میں ڈالتے نہ پھریں تو میرے نبی موعود ہونے میں خلجان باقی نہ رہے تو جان لو کہ اہل کتاب کو تمہارا بہت پورا علم ہے آپ کے نسب وقبیلہ ومولد ومسکن وصورت وشکل واوصاف واحوال سب کو جانتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو آپ کا علم اور آپ کے نبی موعود ہونے کا ایسا یقین ہے جیسا بہت سے لڑکوں میں اپنے بیٹوں کو بلا تامل وتردد پہچانتے ہیں مگر اس امر کو بعض تو ظاہر کرتے ہیں اور بعض دیدہ ودانستہ امر حق کو چھپاتے ہیں لیکن ان کے چھپانے سے کیا ہوتا ہے حق بات تو وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہو اہل کتاب مانیں یا نہ مانیں ان کی مخالفت سے کسی قسم کا تردد مت کرو۔

ف۴ یعنی اللہ نے ہر ایک امت کے لئے ایک ایک قبلہ کا حکم فرمایا جس کی طرف بوقت عبادت اپنا منہ کیا کریں یا ہر ایک [تم مسلمان کعبہ سے جدا ہو] امت =

خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ

نکلے سو منہ کر اپنا مسجد الحرام کی طرف اور بیشک یہی حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں

نکلے منہ کر طرف مسجد حرام کے اور یہی تحقیق ہے تیرے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں

عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ

تمہارے کاموں سے اور جہاں سے تو نکلے منہ کر اپنا مسجد الحرام کی طرف بلادر جس جگہ

تمہارے کام سے اور جہاں سے تو نکلے منہ کر طرف مسجد حرام کے اور جس جگہ

مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِينَ

تم ہوا کرو منہ کرو اسی کی طرف ف۱ تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع مگر جو ان میں

تم ہوا کرو منہ کرو اسی کی طرف کہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کی جگہ مگر جو ان میں

ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ

بے انصاف ہیں سو ان سے (یعنی ان کے اعتراضوں سے) مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو ف۲ اور اس واسطے کہ کامل کروں تم پر فضل اپنا تاکہ تم پاؤ

بے انصاف ہیں سو ان سے مت ڈر اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ پورا کروں تم پر فضل اپنا اور شاید تم

تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۰﴾

راہ سیدھی ف۳

راہ پاؤ۔

= میں واقع ہے کوئی مشرق میں کوئی مغرب میں سو اس میں جھگڑنا فضول اور اپنے قبلہ یا اپنی سمت پر ضد کرنا عبث ہے جو نیکیاں مقصود و مطلوب ہیں ان کی طرف البتہ پیش قدمی کرو اور اس بحث کو چھوڑو جس جگہ اور جس قبلہ اور جس سمت کعبہ کی طرف تم ہو گے لائے گا تم سب کو اللہ میدان حشر میں اور تمہاری نمازیں ایسی بھی جائیں گی گویا ایک ہی جہت کی طرف ہوئی ہیں پھر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو۔

ف۱ تحویل قبلہ کا حکم مکرر سہ مکرر یا تو اس واسطے بیان فرمایا کہ اس کی علل متعدد تھیں تو ہر علت کو بتلانے کے لئے اس حکم کا اعادہ فرمایا ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ﴾ الخ سے معلوم ہوا کہ اپنے رسول کی رضا جوئی اور اظہار تکریم کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا اور ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ سے معلوم ہوا کہ عادت اللہ یہی ہے کہ ہر ملت اور ہر ایک رسول صاحب شریعت مستقل کے لئے اس کے مناسب ایک قبلہ مقرر ہونا چاہیے اور ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ سے معلوم ہوا کہ حکم مذکور کی علت یہ ہے کہ مخالف کا الزام عائد نہ ہو سکے یا اس تکرار کی یہ وجہ ہے کہ اول تو قبلہ قابل اہتمام دوسرے احکام الٰہیہ میں نسخ ہونا یہود وغیرہم کی سمجھ سے باہر پھر تحویل قبلہ اول نسخ ہے جو شریعت محمدی میں ظاہر ہوا اس لئے اسکی کی تاکید در تاکید عین حکمت و بلاغت ہے یا یہ وجہ ہے کہ اول آیت میں تعمیم احوال اور دوسری آیت میں تعمیم امکنہ اور تیسری میں تعمیم ازمنہ مراد ہے۔

ف۲ یعنی کعبہ کو منہ کرنے کا حکم اس واسطے ہوا کہ توریت میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم کا قبلہ خانہ کعبہ ہے اور نبی آخر الزماں کو بھی اسی کی طرف منہ پھیرنے کا حکم ہو جائیگا تو آپ کو تحویل الی الکعبہ کا حکم نہ ہوتا تو یہود ضرور الزام لاتے ادھر مشرکین مکہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کا قبلہ تو کعبہ تھا یہ نبی ملت ابراہیمی کا دعویٰ کر کے پھر قبلہ میں خلاف کیوں کرتے ہیں تو اب دونوں کو حجت کرنے کا حق نہ رہا مگر بے انصاف اب بھی کچھ نہ کچھ الزام لگاتے ہی جائینگے مثلاً قریش کہیں گے کہ ان کو ہمارے قبلہ کا حق ہونا اب معلوم ہوا تو اس کو اختیار کیا اسی طرح پر ہمارے اور احکام بھی رفتہ رفتہ منظور کر لیں گے اور یہود کہیں گے کہ ہمارے قبلہ کی حقانیت ظاہر =

عناد اہل کتاب درباره قبلہ

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ... الی... وَلَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیت میں یہ بیان فرمایا کہ اہل کتاب کو اس قبلہ کا حق ہونا بخوبی معلوم ہے اور خود ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان کچھ روز بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں گے اور آخر کو کعبہ کی طرف اور یہی ان کا اصل اور دائمی قبلہ ہے جو ملت ابراہیمی کے موافق ہے مگر حسد اور عناد کی وجہ سے چھپاتے ہیں آئندہ آیت میں یہ بتاتے ہیں کہ ان کا عناد کس درجہ پر پہنچا ہوا ہے چنانچہ فرماتے ہیں اور اگر آپ اس قبلہ کی حقیقت اور فضیلت پر ہر قسم کے دلائل اور نشانات بھی لے آئیں تب بھی یہ لوگ آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں گے اور نہ آپ کبھی بھی ان کے قبلہ کا اتباع اور پیروی کریں گے ان کا مقصد تو یہ ہے کہ آپ ان کے تابع بن جائیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کبھی بھی ان کے قبلہ کا اتباع اور پیروی نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ان کا قبلہ منسوخ ہو چکا ہے اور جس قبلہ کا آپ کو حکم ہوا ہے وہ آئندہ چل کر کبھی منسوخ نہ ہوگا اور بیت المقدس کے استقبال کا اب کبھی حکم نہ آئے گا اور عقلاً بھی اہل کتاب کے قبلہ کا اتباع ممکن نہیں اس لئے کہ وہ خود ہی آپس میں قبلہ کے بارہ میں ایسے مختلف ہیں کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے قبلہ کے متبع نہیں ہر ایک نے اپنی نفسانی خواہش سے علیحدہ قبلہ کا اتباع کر رکھا ہے اور اے نبی کریم ﷺ بالفرض اگر آپ ان کی نفسانی خواہشوں کا اتباع کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس قبلہ کے بارے میں علم صحیح اور قطعی آچکا تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں شمار ہوں گے اس لئے کہ ناسخ کو چھوڑ کر منسوخ کا اتباع کرنا ہوائے نفس ہے اور ہوائے نفسانی کا اتباع آپ سے بوجہ معصوم ہونے کے محال ہے لہذا آپ سے ان کے قبلہ کا اتباع بھی محال ہوگا۔

عناد اہل کتاب دربارۂ صاحب قبلتین و رسول ثقلین ﷺ و حکمت اول در تحویل قبلہ

گزشتہ آیت میں قبلہ کے بارے میں اہل کتاب کے عناد کا ذکر تھا اب صاحب قبلہ کے بارہ میں ان کے عناد کا ذکر ہے کہ اہل کتاب اسی نبی موعود کو جانتے اور پہچانتے ہیں مگر مانتے نہیں چنانچہ فرماتے ہیں جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ آپ کو خوب پہچانتے ہیں کہ یہ وہی نبی ہیں کہ جن کی توریت اور انجیل میں بشارت دی گئی ہے۔ اہل کتاب آپ کی صورت اور شکل کو دیکھ کر اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو صورت و شکل اور قد و قامت سے پہچانتے ہیں۔ جیسے بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا اسی طرح نبی کریم ﷺ کی صورت کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہی نبی برحق ہے اور یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں اس لئے کہ توریت اور انجیل میں آپ کا حلیہ اور صورت و شکل اور قد و قامت لون وغیرہ سب مذکور تھا اور تحقیق ان میں کا ایک فریق حق کو چھپاتا ہے حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ توریت میں آپ کا نبی قبلتین ہونا بھی مذکور ہے پس یہی امر حق ہے جو تیرے رب کے پاس سے آیا ہے پس تو ان کی تلبیس کی وجہ سے ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ

= ہونے اور تسلیم کر لینے کے بعد محض حسد اور نفسانیت کے باعث اپنی رائے سے اس کو چھوڑ دیا تو ایسے بے انصافوں کے اعتراض کی کچھ پرواہ مت کرو اور ہمارے حکم کے تابع رہو۔

ف ۳ یعنی یہ قبلہ ہم نے تمہارے لئے اس واسطے مقرر فرمایا کہ دشمنوں کے طعن سے بچو اور اس کے سبب سے ہمارے انعام و اکرام و برکات و انوار اور ہدایت کے پورے مستحق ہو۔

ہونا۔ خطاب آپ کو ہے مگر سنانا دوسروں کو ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر ؓ نے عبداللہ بن سلام ؓ سے دریافت کیا کہ کیا تم رسول اللہ ﷺ کو بیٹوں کی طرح پہچانتے ہو۔ تو جواب دیا کہ ہاں بیٹوں سے زیادہ پہچانتے ہیں، بیٹے میں شک ہوسکتا ہے کہ شاید بیوی نے خیانت کی ہو مگر حضور ﷺ کے بارے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا آپ کی صفات اور علامات ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی ہم نے پہچان لیا کہ آپ نبی برحق ہیں۔ حضرت عمر ؓ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے سچ کہا اور اللہ نے تم کو خیر کی توفیق دی۔

حکمت دوم در تحویل قبلہ: ...... اور دوسری حکمت تحویل قبلہ میں یہ ہے کہ ہر امت کے لئے ایک جداگانہ قبلہ ہے جس کی طرف وہ امت متوجہ ہوتی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں نماز کا قبلہ خانہ کعبہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں نماز کا قبلہ بیت المقدس تھا اسی طرح تمہارے لئے بھی ایک مستقل قبلہ تجویز ہوا۔ جس طرح تمہارا دین مستقل اور جداگانہ ہے اسی طرح تمہارے لئے قبلہ بھی مستقل ہونا چاہیے کوئی جہت اور کوئی سمت اپنی ذات سے قبلہ نہیں خدا تعالیٰ نے جس جہت کو قبلہ بنادیا وہ قبلہ ہوگئی اسی طرح خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک جہت کو قبلہ مقرر کردیا۔ پس اے مسلمانو تم اس قبلہ کے مسئلہ میں کنج وکاؤ نہ کرو۔ اصل نیکیوں کی طرف دوڑ و جو مقصود بالذات ہیں یعنی نماز اور روزہ وغیرہ۔ نہ کہ قبلہ کہ وہ اصل عبادت نہیں بلکہ ذریعہ عبادت ہے اور اصل عبادت تو حکم خداوندی کا امتثال ہے اس کی طرف دوڑ۔ جس وقت وہ خداوند ذوالجلال بیت المقدس کے استقبال کا حکم دے بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوجاؤ اور جس وقت خانہ کعبہ اور مسجد حرام کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے اس طرف متوجہ ہوجاؤ کسی سے منازعت کی ضرورت نہیں۔ تمام خیرات اور نیکیوں کی جڑ، امر خداوندی کے امتثال میں مبادرت اور سبقت کرنا ہے۔ اصل بھلائی حکم کی پیروی میں ہے جس وقت جو حکم ہو اس کی تعمیل کرو اور آخرت کی فکر کرو۔ جہاں سب عبادتوں پر اجر ملے گا اور اصل عبادت تعمیل حکم ہے وہ احکم الحاکمین ہے جو چاہے حکم دے تم مشرق اور مغرب میں جہاں کہیں بھی ہوگے تم سب کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حساب کے لئے حاضر کرے گا اور تمہارے اعمال کے مطابق تم کو جزا دے گا یعنی اختلاف جہات صرف دنیا میں ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب کو جہات مختلفہ سے ایک مکان میں جمع کرے گا اور اور سب کو بھلائی اور برائی کی جزا دے گا اور سب نمازوں کو بمنزلہ ایک نماز کے بنادے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اب آپ آئندہ نماز میں بیت المقدس کا استقبال نہ کریں بلکہ جس جگہ سے بھی نکلیں اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور یہی حق ہے کہ ہر حال میں خانہ کعبہ کا استقبال کرو اور تیرے رب کی طرف سے یہ حکم آیا ہے جس سے مقصود تیری تربیت ہے اور تکمیل عبادت ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل نہیں کہ کون اس کے حکم کے موافق نماز ادا کرتا ہے اور کون اس کے خلاف کرتا ہے۔

حکمت سوم در تحویل قبلہ: ...... اور تیسری حکمت اتمام حجت اور دفع الزام ہے۔ اوّلاً تحویل قبلہ کے حکم کا اعادہ فرمایا اور ثانیاً ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ سے اس حکم کی ایک جدید علت بیان فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور پھر ہم تم کو مکرر کہتے ہیں۔ اے محمد (ﷺ) آپ جس جگہ سے بھی باہر نکلیں تو اپنا منہ نماز میں مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور اے مسلمانو، تم بھی جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کرلیا کرو تا کہ لوگوں کا تم پر کوئی الزام نہ رہے کیونکہ اگر تحویل قبلہ کا حکم نہ نازل ہوتا تو یہود تم کو یہ الزام دیتے کہ توریت میں یہ صاف لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان ﷺ کا قبلہ بالآخر قبلۂ ابراہیمی ہوگا۔ اور خانہ کعبہ

کی طرف متوجہ ہوجانے کا ان کو حکم آئے گا۔ پس یہود یہ الزام دیتے کہ توریت میں جو نبی آخر الزمان کی علامت لکھی ہوئی ہے وہ آپ میں موجود نہیں اور مشرکین یہ الزام دیتے کہ محمد دعویٰ تو کرتے ہیں ملت ابراہیمی کے اتباع کا مگر قبلہ ابراہیمی سے روگردانی کرتے ہیں۔ اب تحویل قبلہ کے حکم نازل ہونے سے یہود اور مشرکین کسی کا کوئی الزام نہیں رہا اور ہر دو فریق کی زبان بند ہوگئی مگر جو ان میں ظالم ہیں وہ اعتراض اور طعن سے باز نہ آئیں گے۔ یہود یہ کہیں گے کہ محض حسد کی وجہ سے ہمارے قبلہ کو چھوڑا جو کہ انبیاء کا قبلہ تھا اور ظالم بت پرست یہ کہیں گے کہ محمد رفتہ رفتہ اپنے آبائی دین کی طرف آرہے ہیں۔ پس تم ان ظالموں اور ان کے طعن سے نہ ڈرو۔ بلکہ فقط مجھ سے ڈرتے رہو اور ان کے طعن کی وجہ سے میرے حکم کو نہ چھوڑ۔ خالق کے حکم کو مخلوق کے طعن سے چھوڑنا موجب خسران و عذاب ہے اور خالق حکم کی برداری کے لئے مخلوق کے طعن پر صبر کرنا موجب فلاح و ثواب ہے مخلوق کا طعن مضر نہیں خالق کی خلاف حکمی مضر ہے۔

حکمت چہارم در تحویل قبلہ:...... اور چوتھی حکمت یہ ہے کہ تم پر اپنی نعمت پوری کروں کہ نماز میں (جو کہ سب سے افضل اور اعلیٰ عبادت ہے) تمہاری توجہ سب سے افضل اور اکمل قبلہ اور بہترین جہت کی طرف ہو، تاکہ اس جہت کے انوار و برکات بھی تمہاری نماز کو خوب روشن اور منور بنادیں۔ قبلہ کے باب میں اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ عبادت میں افضل جہات کے استقبال کا حکم دیا جائے جیسا کہ دین کے بارے میں اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ دین کامل عطاء کیا جائے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾

حکمت پنجم در تحویل قبلہ:...... اور پانچویں حکمت یہ ہے کہ تم کو سیدھا راستہ معلوم ہو اور افضل جہات کے استقبال سے تم کو ہدایت کاملہ حاصل ہو اور قریب ہی راستہ سے جلد منزل مقصود تک پہنچ جاؤ (جیسا کہ ﴿یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ کی تفسیر میں گزرا)

تحویل قبلہ کے حکم کو مکرر لانے کی حکمت:...... وجہ اول۔ تحویل قبلہ کے حکم ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کو تین بار اس لئے مکرر لایا گیا کہ حق تعالیٰ نے تحویل قبلہ کی تین علت غائیہ ذکر فرمائیں۔ اول یہ کہ آنحضرت ﷺ کی تمنا اور خواہش یہی تھی۔ وحی کے انتظار میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے آپ کی دل جوئی اور اظہار تکریم کیلئے یہ حکم دیا گیا۔ دوم یہ کہ ہر امت کے لئے مستقل قبلہ ہوتا ہے اور امت محمد یہ بھی ایک مستقل امت ہے لہٰذا اس کے لئے بھی ایک مستقل قبلہ ہونا چاہیے۔ سوم یہ کہ مخالفین کا الزام دفع کرنے کے لئے یہ حکم دیا گیا کما اشار الیہ بقولہ: ﴿لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّةٌ﴾ اس لئے ہر علت کے ساتھ معلول کی اور ہر دلیل کے ساتھ دعویٰ کی تجدید کردی گئی کیونکہ کلام کی خوبی یہ ہے کہ علت اور معلول اور دعویٰ دونوں ساتھ ذکر کیے جائیں۔

وجہ دوم:...... بعض اہل علم نے تکرار کی وجہ بیان کی ہے کہ پہلی آیت خاص ساکنان حرم کے حق میں ہے اور دوسری آیت ساکنان جزیرۃ العرب کے حق میں ہے اور تیسری آیت تمام روئے زمین کے باشندوں کے حق میں ہے۔

وجہ سوم:...... پہلی آیت تعمیم احوال کے لئے ہے اور دوسری آیت تعمیم امکنہ کے لئے ہے اور تیسری آیت تعمیم ازمنہ کے لئے ہے۔ یعنی تمام احوال اور تمام مکانات اور تمام اوقات میں یہی قبلہ ہے اس کا استقبال ضروری ہے۔

وجہ چہارم:...... چونکہ شریعت میں سب سے پہلے یہی حکم منسوخ ہوا اس لئے اس کے بیان میں زیادہ اہتمام کیا گیا اور تاکیداً تین بار اس حکم کا اعادہ کیا گیا۔

وجہ پنجم:...... کسی حکم کا منسوخ ہونا محل فتنہ اور محل شبہ ہے اور احکام خداوندی میں نسخ جاری ہونا بے وقوفوں کی عقل سے باہر ہے اس لئے اس حکم کا تکرار مناسب ہوا۔

كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھلاتا ہے تم کو

جیسا بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا تمہارے پاس ہماری آیتیں اور تم کو سنوارتا اور سکھاتا

الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾

کتاب اور اس کے اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے ف۱

کتاب اور تحقیق بات اور سکھاتا تم کو جو تم نہ جانتے تھے۔

بیان وظائف رسول اعظم ﷺ کہ از قبلہ ابراہیمی وحرم محترم مبعوث باشد

قَالَ تَعَالٰی: ﴿كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ... الی... وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ﴾

ربط:...... ابتداء قصہ میں بناء کعبہ کا ذکر فرمایا اور بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ذکر فرمائی ﴿رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ﴾ الآیۃ۔ کہ اے اللہ اس حرم کعبہ کی سرزمین سے ایسا نبی مبعوث فرما کہ جو تیری آیات کی تلاوت کرے اور لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔ الیٰ آخرہ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں خانہ کعبہ کو مرجع خلائق اور قبلۂ عالم بنایا اور قبلۂ ابراہیمی کے بارے میں جو سفہاء کے شبہات تھے تفصیل کے ساتھ ان کا جواب دیا اور خانہ کعبہ کا افضل قبلہ ہونا بیان فرمایا اب آگے اس بحث کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری دعا یعنی افضل الرسل کی بعثت کے ذکر پر ختم فرماتے ہیں کہ جس طرح ہم نے قبلہ کے بارہ میں تم پر اتمام ① نعمت کیا کہ سب سے افضل قبلہ تمہارے لئے مقرر کیا اسی طرح ہم نے نبوت ورسالت اور ہدایت کے بارہ میں تم پر اس طرح اتمام نعمت کیا کہ سب سے افضل اور اکمل اور عظیم الشان رسول تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا اور پھر اس پر مزید انعام یہ کہ تمہاری قوم میں سے یا تمہاری جنس میں سے بھیجا۔ جو تمہارے لئے دین ودنیا میں باعث عزت وشرف ہوا اور اس طرح تم پر اللہ کی نعمت پوری ہوئی، غور تو کرو کہ کس قدر عظیم الشان نعمت ہے اور وہ رسول فقط ہمارے احکام ہی نہیں پہنچائے گا بلکہ تم پر ہماری آیتوں کی تلاوت بھی کرے گا۔ جس سے تم کو کلام الٰہی کے سننے کی نعمت حاصل ہوگی۔ اور اسرار بلاغت اور دلائل اعجاز تم پر منکشف ہوں گے اور

ف۱ یعنی یہ اتمام نعمت اور تکمیل ہدایت تم پر ایسی ہوئی جیسی ابتداء میں تم پر یہ اتمام نعمت وہدایت ہو چکی ہے کہ تم میں ہی سے ایک رسول ایسا بھیجا جو تم کو احکام خداوندی سکھاوے اور تم کو بری باتوں سے پاک کرے یعنی علماً اور عملاً تم کو کامل بنا دے۔

① گزشتہ آیت میں ﴿وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِيۡ عَلَيۡكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ﴾ تھا۔ اس اتمام نعمت کے لفظ سے ﴿وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِيۡ﴾ کی طرف اشارہ ہے اور آئندہ سطر میں یہ لفظ۔ تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا۔ ﴿وَلَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ﴾ کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ۔

چونکہ کلام متکلم کے کمالات کا آئینہ اور مظہر ہوتا ہے اس لئے اس نور السموات والارض کے انوار وتجلیات بواسطہ اس کلام کے بقدر تمہاری استعداد کے تمہارے قلوب پر منعکس ہوں گے اور جو قلوب اور صدور اپنے رب غفور کے اس کلام سراپا نور کی حفاظت کریں گے وہ کوہ طور کا ایک نمونہ ہوں گے اور پھر تم اس کلام کے ذریعہ سے اپنے رب اکرم سے قبلہ رو ہو کر مناجات کر سکو گے اور اس کی تلاوت اور استماع سے جو اجر اور لذت تم کو حاصل ہوگی وہ حیطۂ بیان سے باہر ہے اور علاوہ ازیں وہ رسول تم کو اپنی ایک ہی نظر کیمیا اثر میں گناہوں کے زنگ سے آئینہ کی طرح صاف وشفاف بنا دے گا مگر شرط یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اس رسول کی نظروں اور قدموں پر تولا کر ڈالو اور اگر تم اس کی نظر ہی سے بھاگ جاؤ تو پھر نظر کیا کام کرے آئینہ جب تک آفتاب کے سامنے نہ ہو تو آفتاب کا عکس اس میں کہاں آئے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آئینۂ دل کو آفتاب نبوت کے سامنے کر دیا نور ہدایت سے جگمگا اٹھا۔ ابوجہل اور ابولہب نے آفتاب نبوت سے منہ پھیر لیا نور ہدایت سے محروم رہے۔ اور وہ رسول تم کو کتاب الٰہی کے معانی اور اسرار وحکم بھی سکھائے گا اور علاوہ ازیں وہ رسول تم کو ایسی عجیب وغریب باتوں کی بھی تعلیم دے گا کہ جن کو تم اپنی عقل سے نہیں جان سکتے تھے جیسے نماز کی کیفیت اور زکوٰۃ کی کمیت اور حج کا طریقہ نماز اور زکوٰۃ کی کیفیت حضور ﷺ کے بتانے سے معلوم ہوئی قرآن میں اجمال تھا حدیث نے اس کی تفصیل کی۔ اور جس عظیم الشان رسول کے مبعوث ہونے کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی اس کا ظہور ہو گیا۔

گر نہ ہوتی ذات پاک انبیاء حق سے باطل کس طرح ہوتا جدا

اور اس طرح اللہ کی نعمت تم پر پوری ہوئی لہٰذا تم اس نعمت عظمیٰ کا شکر کرو چنانچہ فرماتے ہیں۔

ع ۱۸ فَاذْكُرُوْنِىٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِىْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

سو تم یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو ف۱

تو تم یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو۔

تلقین ذکر وشکر

قَالَ تَعَالٰی: ﴿فَاذْكُرُوْنِىٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِىْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴾

پس جب کہ میں نے تم کو ایسی عظیم نعمتوں سے سرفراز کیا اور تم میں ایسا عظیم الشان رسول ﷺ بھیج کر تم کو یاد کیا تو اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تم بھی مجھ کو ہمیشہ یاد رکھو کسی وقت میری یاد سے غافل نہ ہو میں تم کو اپنے لطف وعنایت سے یاد کروں گا اور ملاء اعلیٰ میں تمہارے ذکر کا ذکر کروں گا کہ یہ میرے یاد کرنے والے بندے ہیں جس سے ملاء اعلیٰ اور ملائکہ مقربین کی عنایات تم پر مبذول ہوں گی۔

ف:...... قلب سے حجابات غفلت دور کرنے کے لئے ذکر الٰہی سے بہتر کوئی شے نہیں۔ جس طرح قلب سے حرص اور طمع کا

ف۱ جب ہماری طرف سے تم پر اتمام نعمت مکرر ہو چکا تو اب تم کو لازم ہے کہ ہم کو زبان سے دل سے ذکر سے فکر سے ہر طرح سے یاد کرو اور اطاعت کرو ہم تم کو یاد کریں گے یعنی نئی نئی رحمتیں اور عنایتیں تم پر ہوتی رہیں گی اور ہماری نعمتوں کا شکر خوب ادا کرتے رہو اور ہماری ناشکری اور معصیت سے بچتے رہو۔

فاسد مادہ دور کرنے کے لئے انفاق فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی نسخہ نہیں۔ اور میرا احسان مانو اور شکر کرو کہ تمہاری ہدایت کے لئے ایسا عظیم الشان رسول بھیجا۔ شکر سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے۔ ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ لہٰذا اگر تم نے ہماری نعمت کا شکر کیا تو تمہاری ہدایت اور کتاب وسنت کے علم اور معرفت میں زیادتی ہوگی اور جتنا ذکر اور شکر کروگے اسی قدر تمہارے تزکیۂ باطن اور علوم ومعارف میں زیادتی ہوگی۔ اور میری ناشکری مت کرو کہ اس رسول کا انکار کر بیٹھو اور دل وجان سے اس کی اطاعت نہ کرو۔ اور اگر من جانب اللہ علوم ومعارف منکشف ہوں تو دعوے مت کرو دعویٰ بھی ناشکری میں داخل ہے۔

نکتہ:...... دعا ابراہیمی جو پہلے گزر چکی ہے اس میں تعلیم الکتاب والحکمۃ کا ذکر مقدم تھا اور تزکیہ کا ذکر موخر تھا اور اس آیت یعنی ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ﴾ الخ میں تزکیہ کا ذکر مقدم ہے اور تعلیم الکتاب والحکمۃ کا ذکر موخر ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اصل مقصود تو تزکیہ نفس ہے اور تعلیم الکتاب والحکمۃ اس کا وسیلہ اور ذریعہ ہے اگر تعلیم ہو اور تزکیہ حاصل نہ ہو تعلیم بے فائدہ ہے اور عموماً تزکیہ نفس تعلیم کتاب اور حکمت ہی کے بعد حاصل ہوتا ہے اور تعلیم تزکیہ کے مبادی اور مقدمات میں سے ہے اس لئے دعائے ابراہیمی میں ترتیب وقوعی کے لحاظ سے تزکیہ کے مبادی اور وسائل کو پہلے ذکر کیا اور مقصود کو اخیر میں ذکر کیا۔ اور حق جل شانہ نے جب دعا ابراہیمی علیہ السلام کی اجابت اور قبولیت کا ذکر فرمایا تو اصل مقصود کو پہلے ذکر فرمایا تاکہ سامعین کو ابتداء ہی سے یہ معلوم ہوجائے کہ اصل مقصود تزکیہ ہے اور وہ بارگاہ خداوندی سے منظور ہوچکا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ١٥٣

اے مسلمانو مدد لو صبر اور نماز سے بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ف۱

اے مسلمانو قوت پکڑو ثابت رہنے سے اور نماز سے بیشک اللہ ساتھ ہے ثابت رہنے والوں کے۔

طریقۂ تحصیل ذکر وشکر وبیان فضیلت صبر

قال اللہ تعالیٰ: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیت میں ذکر وشکر کا حکم تھا اور کفران نعمت کی ممانعت تھی اور ذکر وشکر میں تمام احکام خداوندی کا بجالانا داخل تھا اور کفران نعمت کی ممانعت میں تمام منہیات اور ممنوعات سے بچنا داخل تھا اور تمام احکام کا بجالانا اور تمام ممنوعات سے بچنا بظاہر بہت دشوار ہے۔ اس لئے آئندہ آیت میں مسلمانوں کو ذکر اور شکر کے حاصل کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اے ایمان والو اگر ذکر اور شکر اور درجات قرب اور معرفت کے حاصل کرنے میں دشواری معلوم ہو تو صبر اور نماز کی مدد اور سہارے سے اس کو حاصل کرو۔ صبر من جانب اللہ ایک خاص ہتھیار ہے کہ جو خاص انسان کو عطاء کیا گیا ہے تاکہ مشکلات میں اس کا معین اور مددگار ہو۔ صبر کی خاصیت یہ ہے کہ رنج وغم کو ہلکا کردیتا ہے۔ حیوانات میں صرف شہوت ہے عقل نہیں۔ ملائکہ میں صرف عقل ہے شہوت نہیں۔ انسان میں عقل کے ساتھ شہوت اور غضب بھی ہے۔ اس لئے انسان کو شہوت

ف۱ چونکہ ذکر اور شکر اور ترک کفران جو پہلے مذکور ہوئے تمام طاعات اور منہیات شرعیہ کو محیط ہیں جن کا انجام دینا دشوار امر ہے اس کی سہولت کیلئے یہ طریقہ بتلایا گیا کہ صبر اور صلوٰۃ سے مدد لو کہ ان کی مداومت سے تمام امور تم پر سہل کردیئے جائیں گے اور اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جہاد میں محنت اٹھاؤ جس کا ذکر آگے آتا ہے کہ اس میں صبر اعلیٰ درجہ کا ہے۔

اور غضب کا وار روکنے کے لئے صبر کا ہتھیار دیا گیا اور فرشتہ اور حیوان کو نہیں دیا گیا۔ عقل اور شہوت میں جب کشمکش ہو تو عقل کے اشارہ پر چلنا اور نفسانی خواہشوں پر نہ چلنا اس کا نام صبر ہے اخلاق جمیلہ میں صبر کا مقام نہایت بلند ہے۔ حق جل شانہ نے قرآن کریم میں صبر کو ستر یا کچھ اوپر جگہ ذکر فرمایا ہے۔ آیات قرآنیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عمل صالح کا اجر مقرر ہے مگر صبر کا اجر بے حساب ہے۔ پس اگر نفس پر احکام شرعیہ شاق اور گراں ہوں تو ان کے آسان ہونے کا ایک علاج تو صبر ہے اور دوسرا علاج نماز ہے۔ اس لئے کہ نماز ایک تریاق مجرب ہے جو ذکر اور شکر اور خشوع اور خضوع اور اس قسم کے مختلف اجزاء سے مرکب ہے جو ہر بیماری کی دوا اور ہر مشکل کا علاج ہے۔ جیسے بارش کے لئے صلوٰۃ استسقاء ہے اور ہر دینی اور دنیوی مطلب کے لئے صلوٰۃ الحاجت ہے۔ حضرات انبیاء کرام کو جب مشکل پیش آتی تو نماز میں مشغول ہوتے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو کوئی پریشانی آتی تو حضور ﷺ نماز میں مشغول ہو جاتے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب ظالم بادشاہ نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو پکڑوایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز میں مشغول ہو گئے اور جریج راہب پر جب لوگوں نے زنا کی تہمت لگائی تو جریج نماز میں مشغول ہو گئے۔ (بخاری و مسلم)

غرض یہ کہ نماز ام العبادات ہے اور دین کا ستون ہے اور مومن کی معراج ہے جس کی کثرت سے مومن کے درجات میں ترقی ہوتی ہے۔ نماز اگرچہ مختلف اجزاء سے ایک معجون مرکب اور تریاق مجرب ہے لیکن اس کی روح دعا ہے جو ہر مرض کی دوا ہے۔ اہل ایمان کی کو چاہیے کہ صبر اور نماز سے غافل نہ ہوں اس لئے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اس لئے کہ صبور اور حلیم اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں اور جو اخلاق خداوندی کا خوگیر اور عادت پذیر ہو اس کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوگی۔

خداوندِ ذوالجلال کی بے چون وچگون معیت کی حقیقت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ جن اولیاء اور عارفین کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت اور قرب خاص سے سرفراز فرمایا وہ حضرات کچھ قرب اور معیت کے مزہ سے واقف ہوتے ہیں مگر کسی دوسرے کو سمجھا نہیں سکتے۔ بغیر چکھے کسی شے کا بھی ذائقہ نہیں معلوم ہو سکتا۔ اور جس نے کوئی پھل نہ چکھا ہو اس کو یہ حق نہیں کہ وہ اس پھل کا یا اس کے مزہ کا انکار کرے۔

غرض یہ کہ معیت۔ صبر کے ذریعہ حاصل ہے اور معیت کی علامت یہ ہے کہ توفیق خداوندی اس کو کار خیر کی طرف لے جاتی ہے۔ رہی نماز سو وہ مومنوں کی معراج ہے اس کے عروج کے کیا پوچھنا اس لئے معیت کے بیان میں صبر کا ذکر کیا اور نماز کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ﴿١٥٤﴾

اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مردے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں ف۱

اور نہ کہو جو کوئی مارا جائے اللہ کی راہ میں کہ مردے ہیں بلکہ وہ زندے ہیں لیکن تم کو خبر نہیں۔

ف۱ یعنی جس نے اللہ کے لئے جان دی وہ اس جہان میں جیتے ہیں مگر تم کو ان کی زندگی کی خبر اور اس کی کیفیت معلوم نہیں اور یہ سب صبر کا نتیجہ ہے۔

بیان حیات شہداء کہ از ثمرات صبر است

قال تعالیٰ: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیت میں صبر کی فضیلت کا بیان تھا کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ جو مقام صبر میں انتہاء کو پہنچ جائے کہ خدا کی راہ میں جان دے دینا بھی اس کو شیریں اور لذیذ معلوم ہو تو اس پر خداوند حی و قیوم کی بے چون و چگون حیات کا ایک عکس اور پرتو پڑتا ہے جس سے اس کو ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جن صابرین نے خدا کی راہ میں جان نثاری کی ہوان کی حیات میں تردد نہ کرو اور جو صابر خدا کی راہ میں مارے گئے اور ان کی اس میں کسی قسم کی دنیوی اور نفسانی غرض نہ تھی ان کو یہ نہ کہو کہ عام مردوں کی طرح وہ مردہ ہیں بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں لیکن تم جانتے نہیں کہ وہ کس طرح کی زندگی ہے۔ وہاں کی زندگی تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس حیات کے ادراک کے لئے یہ حواس کافی نہیں۔

ف ۱:...... شہید اگرچہ ظاہراً مر گیا لیکن اس کی موت عام لوگوں کی موت نہیں۔ مرنے کے بعد انسان کی ترقی رک جاتی ہے اس لئے کہ روح کی ترقی کا ذریعہ بدن ہے جب روح کا بدن سے تعلق ختم ہوا تو ترقی مراتب بھی ختم ہوئی۔ مگر شہید کی ترقی برابر جاری رہتی ہے جس عمل میں اس نے جان دی ہے اس کا اجر برابر جاری رہتا ہے گویا کہ اب بھی وہ عمل کر رہا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہوجاتا ہے مگر مجاہد فی سبیل اللہ کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے (بخاری و مسلم)

ف ۲:...... احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ شہداء کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹ میں رکھ دی جاتی ہیں اور جنت میں اڑتی پھرتی ہیں اور جنت کے میوے کھاتی ہیں اور عرش کی قندیلوں میں آرام کرتی ہیں۔

بظاہر وجہ یہ ہے کہ شہید نے اپنے بدن کو خدا کی راہ میں قربان کیا خدا تعالیٰ نے اس عنصری بدن کے بدلہ میں ایک دوسرا غیر عنصری بدن اس کی روح کی سیر و تفریح کے لئے عطاء فرمایا۔ یہ جسم طیوری اس روح کے لئے بمنزلہ ایک طیارہ کے ہے جس کے ذریعہ سے روح جنت میں اڑ کر سیر و تفریح کر سکے۔ اور یہ روح اس نئے جسم میں مدبر اور متصرف نہیں۔ تاکہ تناسخ کا شبہ ہو۔ اس لئے کہ تناسخ کی حقیقت یہ ہے کہ روح ایک جسم سے جدا ہونے کے بعد دوسرے جسم سے اس طرح متعلق ہو کہ دوسرے جسم میں کوئی اور روح نہ ہو اور یہی روح اس جسم کی نشو و نما کا سبب ہو اور یہی روح اس جسم میں مدبر اور متصرف ہو۔ اور ارواح شہداء میں یہ بات نہیں اس لئے کہ جسم طیوری کے ساتھ شہید کی روح کا تعلق ہوا ہے اس جسم طیوری کی روح علیحدہ ہے اور شہید کی روح علیحدہ ہے اور جسم طیوری کے نشو و نما اور تدبیر و تصرف کا کوئی تعلق شہید کی روح سے نہیں۔ اس کا تعلق پرندہ کی اصل روح سے ہے۔ پرندہ کا جسم اور روح علیحدہ ہے اور شہید کی روح علیحدہ ہے اور وہ اس میں سوار ہے اور وہ سبز پرندہ مع اپنے جسم اور اپنی روح کے شہید کی روح کے لئے سواری ہے۔ خوب سمجھ لو۔

ف ۳:...... جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ شہداء کی حیات جسمانی ہے اس لئے کہ موت اور قتل کا تعلق جسم سے ہے اور یہی ظاہر

آیت کا مفہوم ہے اس لئے کہ سیاق آیت، شہداء کی خصوصیت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اور حیات روحانی شہداء کے ساتھ مخصوص نہیں وہ تو عامۂ مسلمین بلکہ کفار کو بھی حاصل ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ

اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصان سے مالوں کے اور جانوں کے اور میووں کے ف۱

اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو کچھ ایک ڈر سے اور بھوک سے اور نقصان سے مالوں کے اور جانوں کے اور میووں کے

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

اور خوشخبری دے ان صبر کرنیوالوں کو کہ جب پہنچے ان کو کچھ مصیبت تو کہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں

اور خوشی سنا ثابت رہنے والوں کو کہ جب ان کو پہنچے کچھ مصیبت کہیں ہم اللہ کا مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھر جانا

أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

ایسے ہی لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر ف۲

ایسے لوگ انہی پر شاباشیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں راہ پر۔

بیان امتحان صبر وبشارت صابرین وجزاء صبر

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ... الی ... وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیت میں صبر کے سب سے بڑے امتحان کا ذکر فرمایا۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ کا۔ اب آئندہ آیت میں صبر کے کم درجہ کے امتحان کا ذکر فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس امتحان کے علاوہ اور بھی کچھ ہم تمہارے صبر کا امتحان لیں گے اور تم پر زائد شاق اور گراں نہ ہوگا اور خدا کی راہ میں جان دینے کی طرح مشکل نہ ہوگا۔ کبھی تمہارا امتحان کسی قدر دشمنوں کے خوف سے لیں گے کہ تم دشمنوں سے خوف زدہ ہو کر پریشانیوں میں مبتلا ہو گے اور کبھی فقر وفاقہ کے ذریعے سے اور کبھی مالوں کے نقصان سے مثلاً مال ضائع ہو جائے اور کبھی جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔ مثلاً عزیز واقارب مر جائیں یا مثلاً کھیتی اور باغ کے پھل کسی آفت سے تلف ہو جائیں۔ تو اے مسلمانو ان مصائب اور آفات میں صبر کرنا اور ذکر کرنا اور شکر سے غافل نہ ہونا اور جو لوگ اس امتحان اور آزمائش میں پورے اتریں تو اے نبی کریم ﷺ آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو صبر کرتے ہیں اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے بلکہ اپنی اور احباب کی تسلی کے لئے یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ کے مملوک اور غلام ہیں۔ ہماری جان اور ہمارا مال سب اسی کی ملک ہے جو چاہے لے اور جو چاہے چھوڑے۔ غلام کو آقا کے سامنے مجال دم زدن نہیں وہ ارحم الراحمین ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے وہ اگر کسی وقت بھوکا

ف۱ پہلے تو ان کا ذکر تھا جنہوں نے صبر کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا یعنی شہداء اب فرماتے ہیں کہ تمہارا علی العموم تھوڑی تھوڑی تکلیف اور مصیبت میں وقتاً فوقتاً امتحان لیا جائیگا اور تمہارے صبر کو دیکھا جائیگا صابرین میں داخل ہونا کچھ سہل نہیں اسی واسطے پہلے سے متنبہ فرما دیا۔

ف۲ یعنی جن لوگوں نے ان مصائب پر صبر کیا اور کفران نعمت نہ کیا بلکہ ان مصائب کو وسیلۂ ذکر وشکر بنایا تو ان کو اے پیغمبر ہماری طرف سے بشارت سنا دو۔

رکھے تو اس کی حکمت اور مصلحت ہے۔ طبیب مشفق اگر بدہضمی اور فساد معدہ کی وجہ سے ایک دو وقت کھانے کی ممانعت کر دے۔ یہ اس طبیب کے مشفق ہونے کی دلیل ہے اور ہم سب اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ہم کو یہ بھی مل جائے گا جو ہم سے لیا گیا ہے اور وہم وگمان سے زائد ہم کو اس کا اجر بھی ملے گا۔

ف:...... حدیث میں ہے کہ یہ کلمہ خاص اسی امت کو ملا ہے دوسری امتوں کو عنایت نہیں ہوا۔ چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے غم میں "یَا اَسَفٰی" کہا اور "اِنَّا لِلّٰہِ" نہیں کہا۔ ایسے صابرین پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات اور خاص توجہات ہیں جو حضرات انبیاء کی عنایات کے ہم رنگ ہیں جو اُن کے پروردگار کے پاس سے اترتی ہیں اور ان پر خدا کی مہربانی بھی ہے۔ کتاب وسنت میں صلوٰۃ کا لفظ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ صابرین کی بشارت میں صلوٰت کا اس لئے استعمال فرمایا کہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کو ان عنایات خاصہ سے سرفراز فرماتے ہیں جو حضرات انبیاء کی صلوٰت وعنایات کی ہم رنگ ہوتی ہیں اس لئے کہ مصائب اور حوادث میں صبر وتحمل سے کام لینا اور کوئی کلمۂ شکایت زبان سے نہ نکالنا اور خداوند ذوالجلال کی طرف رجوع کرنا انبیاء کرام کا طریقہ ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ "سو تو ٹھہرا رہ جیسے ٹھہرے رہے ہیں ہمت والے رسول۔"

اس لئے صابرین کو صلوٰت وعنایات خاصہ سے سرفراز فرمایا اور جان ومال کا جو نقصان ہوا اس کے عوض میں عنایات عامہ یعنی طرح طرح کی رحمتوں اور مہربانیوں سے نوازا۔

ہمارے اس بیان سے صلوٰۃ اور رحمت میں فرق واضح ہو گیا، صلوات سے عنایات خاصہ مراد ہیں جو دینی اور دنیوی اور ظاہر اور باطنی برکات کا موجب ہیں اور رحمت سے عنایات عامہ مراد ہیں۔ جو دنیا میں فوت شدہ جان ومال کا عوض اور نعم البدل ہیں۔ خوب سمجھ لو۔ اور ایسے ہی لوگ علاوہ اس کے کہ وہ عنایات خاصہ اور عنایات عامہ کے مورد ہیں۔ ہدایت یافتہ بھی ہیں کہ عین مصیبت کے وقت میں جب کہ یہ اندیشہ تھا کہ کوئی کلمہ شکایت کا زبان سے نکل جائے اور خداوند ذوالجلال کی ناراضگی اور دوری اور مہجوری کا سبب بن جائے ایسے وقت میں قرب خداوندی اور اس کی خوشنودی کا راستہ نکال لیا کہ اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کمال ہدایت یہی ہے کہ ہر طرف سے اپنے مطلب کا کھوج لگائے۔

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾

"کوئی مصیبت بغیر اللہ کے حکم کے نہیں پہنچتی اور جو بمقتضائے ایمان مصیبت میں ثابت قدم رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر ہدایت اور معرفت کی راہ کھول دیتے ہیں۔"

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے "نعم العدلان ونعم العلاوۃ" یعنی اس آیت میں حق تعالیٰ نے صابرین کے لئے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا۔ ایک صلوات اور دوسرے رحمت اور تیسرے ہدایت۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صلوات اور رحمت جو ایک دوسرے کے قرین اور عدیل ہیں۔ یہ دونوں کیا اچھے عدیل ہیں اور ہدایت ان عدلین کے علاوہ ہے یعنی ایک زیادتی ہے جو صلوٰۃ اور رحمت پر زیادہ ہے۔

فائدہ ۱:...... اس آیت میں حق تعالیٰ نے مصیبت کے وقت تسلی کے دو طریقے ارشاد فرمائے۔ ایک عقلی اور ایک طبعی عقلی تو یہ ہے "اِنَّا لِلّٰہِ" ہم سب اللہ کی ملک ہیں جس کو چاہے دنیا میں رہنے دے اور جس کو چاہے آخرت میں بلائے، عقل سلیم تسلیم کرتی ہے کہ مالک کو اختیار ہے کہ اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے لہٰذا کسی عزیز کے مرنے پر شکایت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کی ملک میں دو گھوڑے ہوں ایک کو یہاں باندھ دے اور دوسرے کو دوسری جگہ باندھ دے تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ یا مالک کسی چیز کو اوپر کی منزل میں رکھ دے اور کسی کو نیچے کی منزل میں رکھ دے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے جس کو چاہیں دنیا میں رکھیں اور جس کو چاہیں آخرت میں رکھیں۔

اور طبعی یہ ہے "وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ"۔ یعنی ہم سب کو وہیں جانا ہے اور وہی ہمارا وطن اصلی ہے اور یہ دنیا تو ایک جیل خانہ ہے اب اگر کسی کو جیل خانہ اور چاہ زندان سے نکال کر گلستان اور بوستان میں لے جا کر ٹھہرا دیں تو حقیقت میں خوشی کا مقام ہے کہ بجائے غم کدہ کے عشرت کدہ مل گیا۔ غرض یہ کہ ایک جملہ یعنی "اِنَّا لِلّٰہِ" میں عقل کی تسلی ہے اور دوسرے جملہ "وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" میں طبیعت کی تسلی ہے یہ تو تسلی ہوئی۔ مگر بااین ہمہ شریعت نے حزن وملال اور رونے اور آنسو بہانے کی ممانعت نہیں کی کہ وہ غیر اختیاری امر ہے بلکہ اس میں ایک قسم کی فضیلت بھی رکھ دی اور یہ فرمایا کہ "ھو رحمة" یعنی آنسو بہانا بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے۔ سبحان اللہ شریعت کی خوبی کو دیکھئے کہ عقل کی اور طبیعت کی اور جذبات کی سب ہی کی رعایت ہے۔
(ملخص از وعظ الصلوۃ، وعظ دوم از سلسلۃ البشریٰ از مواعظ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ)

فائدہ ۲:...... اگر کسی آنے والی مصیبت کی پہلے ہی سے خبر دے دی جائے تو صبر آسان ہو جاتا ہے دفعۃً مصیبت آنے سے آدمی گھبرا جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان مصائب کی پہلے ہی خبر دے دی تا کہ صبر آسان ہو جائے۔

فائدہ ۳:...... امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ آیت میں خوف سے خوف خداوندی مراد ہے اور بھوک سے رمضان کے روزے اور مالوں کی کمی سے زکوۃ اور صدقات مراد ہیں اور اَنفُس یعنی جانوں کے نقصان سے امراض اور بیماریاں مراد ہیں اور ثمرات کے نقصان سے اولاد کا مرنا مراد ہے کیونکہ اولاد انسان کی زندگی کا پھل ہے۔

جامع ترمذی میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب فرشتے کسی مرد مومن کے بچہ کی روح قبض کر کے لے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں:

> "اقبضتم ولد عبدی فیقولون نعم فیقول اقبضتم ثمرة قلبه فیقولون نعم۔"
> "کیا تم نے میرے بندہ کے بچہ کو روح قبض کر لی۔ کیا تم نے میرے بندہ کے ثمرۂ قلب کو لے لیا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں جی ہاں۔"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بتلاؤ میرے بندہ نے اس مصیبت پر کیا کہا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کے بندہ نے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" پڑھی۔ اور آپ کی حمد وثناء کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندہ کے لئے جنت میں ایک محل تیار کر دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن

بیشک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی ف ۱ سو جو کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ

صفا اور مروہ جو ہیں نشان ہیں اللہ کے پھر جو کوئی حج کرلے اس گھر کا یا زیارت تو گناہ نہیں اس کو کہ

يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾

طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قدرداں ہے سب کچھ جاننے والا ف ۲

طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی شوق سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قدر دان ہے سب جانتا ہے۔

استشہاد بر فضیلت صبر

قَالَ تَعَالٰی: ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللَّهِ... الی... فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں صابرین کے لئے اپنی معیت اور صلوات اور رحمت اور ہدایت کا ذکر فرمایا اب آئندہ آیات میں اس کی ایک دلیل اور ایک شاہد ذکر فرماتے ہیں۔ یعنی حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صبر جمیل کی ایک یادگار ذکر فرماتے ہیں کہ صفا اور مروہ کی سعی اسی صبر کی یادگار ہے جن کو صبر کی برکت سے معیت خاصہ سے سرفراز فرمایا اور اپنی صلوات اور رحمتیں ان پر نازل کیں اور اس یادگار صبر کے بیان سے بحث قبلہ اور مناسک حج و عمرہ کی بھی تکمیل ہو جائے گی اور ﴿وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ﴾ الخ سے بھی سلسلۂ کلام مربوط ہو جائے گا۔ ابتلاء اور امتحان ہی سے سلسلۂ کلام کا آغاز ہوا اور ابتلاء اور امتحان ہی پر اس کا اختتام ہوا، نیز ابتداء قصہ میں امامت کا ذکر تھا۔

﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ ''میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا پیشوا۔''

اور منصب امامت کے لئے صبر کامل اور ایقان تام ضروری ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾ ''اور کیے ہم نے ان

ف ۱ پہلے ذکر تھا تحویل الی الکعبہ کا اور کعبہ کے سب قبلوں سے افضل ہونے کا، اب اس کے محل ادائے حج و عمرہ ہونے کو بیان فرماتے ہیں تاکہ (ولاتم نعمتی علیکم) کی تصدیق اور تکمیل خوب ہو جائے یا یوں کہیے کہ اس سے پہلے صبر کی فضیلت مذکور تھی اب یہ فرمایا گیا کہ دیکھو صفا و مروہ جو شعائر اللہ میں داخل ہوئیں اور ان میں سعی کرنا حج و عمرہ میں ضروری ہوا اس کی وجہ یہی تو ہے کہ یہ فعل صابرین یعنی حضرت ہاجرہ اور ان کے صاحبزادہ حضرت اسماعیل کے آثار میں سے ہے حدیث و تفسیر و تاریخ میں یہ قصہ مصرح مذکور و مشہور ہے جس کے دیکھنے سے ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ کی تصدیق ہوتی ہے۔

ف ۲ صفا اور مروہ دو پہاڑیاں ہیں مکہ میں اہل عرب حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے ہمیشہ حج کرتے رہے اور حج کرتے تو ان دو پہاڑیوں کا بھی طواف کرتے کفر کے زمانہ میں ان دو پہاڑیوں پر کفار نے دو بت رکھے تھے ان کی تعظیم کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ طواف ان دو بتوں کی تعظیم کے لئے ہے جب لوگ مسلمان ہوئے اور بت پرستی سے تائب ہوئے تو خیال ہوا کہ صفا اور مروہ کا طواف تو ان بتوں کی تعظیم کے لئے تھا جب بتوں کی تعظیم حرام ہوئی تو صفا اور مروہ کا طواف بھی ممنوع ہونا چاہیے یہ ان کو معلوم نہ تھا کہ صفا اور مروہ کا طواف تو اصل میں حج کے لئے تھا کفار نے اپنی جہالت سے بت رکھ چھوڑے تھے وہ دور ہو گئے اور انصار مدینہ چونکہ کفر کے زمانہ میں صفا اور مروہ کے طواف کو برا جانتے تھے تو اسلام کے بعد بھی ان کو اس طواف میں خلجان ہوا اور آپ سے عرض کیا کہ ہم پہلے سے اس کو مذموم جانتے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور فریق اول اور ثانی دونوں کو جتلا دیا گیا کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کوئی گناہ اور خرابی نہیں، یہ تو اصل سے اللہ کی نشانیاں ہیں ان کا طواف کرنا چاہیے۔

میں سردار جو راہ چلاتے ہمارے حکم سے جب وہ ٹھہرے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے۔''

اس لئے سلسلۂ کلام کو صبر کے فضائل اور برکات اور اس کے شواہد اور ثمرات پر ختم فرمایا۔

شانِ نزول:...... صفا اور مروہ مکہ میں دو پہاڑیاں ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے لوگ ان دو پہاڑیوں کے درمیان طواف کرتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں کافروں نے ان پر دو بت رکھ دیئے اور ان کی تعظیم کرتے اور ان کا استلام کرتے اور یہ سمجھتے کہ یہ طواف ان دو بتوں کی تعظیم کے لئے ہے۔ جب زمانہ اسلام کا آیا اور مسلمانوں کو سعی بین الصفا والمروہ کا حکم ہوا تو مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ صفا اور مروہ کا طواف ان بتوں کی تعظیم کے لئے ہے اور بتوں کی تعظیم اسلام میں ممنوع ہے اس لئے صفا اور مروہ کا طواف بھی ممنوع ہونا چاہیے اس پر یہ آیت نازل ہوئی چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تحقیق کوہ صفا اور کوہ مروہ اور پہاڑوں کی طرح معمولی پہاڑ تھے مگر حضرت ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کے رضا بالقضاء کی برکت سے خدا کی یادگاروں میں سے ہوگئے۔ اور ان کا طواف مناسک حج سے بنایا گیا سو جو شخص حج بیت اللہ یا عمرہ کا ارادہ کرے اس پر صفا اور مروہ کی سعی اور طواف میں ذرا برابر گناہ نہیں تم کافروں کی مشابہت سے شبہ میں مت پڑو، صفا اور مروہ دراصل شعائر الٰہیہ میں سے ہیں اور ان کا طواف سراسر خیر اور عبادت ہے۔ اور جو شخص کوئی خیر اور نیکی شوق اور رغبت سے کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی قدر دانی فرماتے ہیں اور اس کی نیت اور اخلاص کو خوب جانتے ہیں اور بقدر اخلاص کے اس کو ثواب عطا فرمائیں گے۔

ف ۱:...... شعائر۔ شعیرۃ یا شعارۃ کی جمع ہے جس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں شعائر اللہ ان چیزوں کو کہتے ہیں جن سے عام طور پر کفر اور اسلام میں امتیاز پیدا ہوا اور ان کو شعائر اسلام بھی کہتے ہیں۔

ف ۲:...... آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی کے حکم سے بت پرستوں کی مشابہت کا خیال ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی جس کا حاصل یہ ہے کہ صفا اور مروہ اصل میں اللہ کی یادگاریں ہیں۔ اور کافروں کی مشابہت امر عارضی ہے وہ اس میں موثر نہ ہوگی جب کہ نیت خالص اللہ کی ہو۔ جیسے خانہ کعبہ چند روز غلبۂ کفار کی وجہ سے بیت الاصنام یعنی بت خانہ بن گیا لیکن اس کا قبلہ اور مطاف ہونا ساقط نہ ہوا۔ اس لئے کہ جو شے بالذات ہوتی ہے وہ عوارض کی وجہ سے زائل اور ساقط نہیں ہوتی اس لئے مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی میں کوئی تردد اور تامل نہ ہونا چاہیے۔ مشابہت کفار اس وقت موجب حرمت ہوتی ہے کہ جب کسی شے کا شعائر اللہ میں سے ہونا کسی دلیل سے ثابت نہ ہو جیسے تعظیم نوروز اور ہولی اور دوالی اور دسہرہ اور نصاریٰ کی کرسمس اور جو افعال اللہ کے نزدیک مشروع اور پسندیدہ ہیں ان میں کفار کی مشابہت موثر نہیں جیسے حج اور عمرہ اور ختنہ اور عقیقہ اور قربانی اور کسوف کے وقت صدقہ اور غلاموں کا آزاد کرنا۔ مشرکین عرب میں رائج تھا۔

ف ۳:...... سعی بین الصفا والمروۃ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فرض ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مستحب ہے جیسا کہ ''فلا جناح'' کے لفظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل ضروری اور واجب نہیں۔ بخاری اور مسلم میں ہے کہ عروۃ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (کوئی گناہ نہیں کہ صفا اور مروہ کا طواف کرے) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی واجب نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اے میرے بھانجے آیت کا یہ مطلب نہیں جو تو نے سمجھا۔ اگر آیت کا وہ مطلب ہوتا جو تو نے

بیان کیا تو عبارت قرآنی اس طرح ہوتی ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ یعنی اس شخص پر کوئی گناہ نہیں جو صفا اور مروہ کا طواف نہ کرے اور یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی جن کا قصہ یہ ہے کہ انصار قبل اسلام منات کی عبادت کرتے تھے اور جب مسلمان ہوئے اور سعی بین الصفا والمروہ کا حکم ہوا تو کفار کی مشابہت کی وجہ سے دل تنگ ہوئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی (بخاری ومسلم)

چونکہ انصار پر کفار کی مشابہت کی وجہ سے بین الصفا والمروہ کا کرنا گراں گزر رہا تھا اس لئے اس گرانی کے رفع کرنے کے لئے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ﴾ فرمایا اور یہ بتلا دیا کہ کرنے میں کوئی گناہ نہیں جس سے ترک کی اجازت دینا مقصود نہیں ورنہ اگر ترک سعی کی اجازت دینا مقصود ہوتی تو ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ﴾ فرماتے یعنی کوئی حرج نہیں کہ سعی بین الصفا والمروہ نہ کرے۔ غرض یہ کہ آیت میں لاجناح کا لفظ طواف بین الصفا والمروہ کرنے کے متعلق آیا ہے یعنی کرنے کی اجازت ہے ترک طواف اور ترک سعی کے مطابق لاجناح نہیں فرمایا کہ جس سے ترک سعی کی اجازت مفہوم ہوتی۔ علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ لاجناح کا لفظ محض اباحت پر دلالت کرتا ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ لفظ محض طواف بین الصفا والمروہ کی اباحت اور جواز پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اساف اور نائلہ یعنی بتوں کے ہوتے ہوئے بھی صفا والمروہ کا طواف جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ مسئلہ دریافت کرے کہ جس کپڑے پر قدر درہم سے کم نجاست لگی ہوئی تو اس کپڑے میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ تو یہ جواب دیا جائے گا "لا جناح علیك ان تصلی فیه" یعنی ایسے کپڑے میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج اور گناہ نہیں۔ تو اس عبارت سے نفس نماز کی اباحت اور اجازت نہیں سمجھی جاتی بلکہ قلیل نجاست کی حالت میں نماز پڑھنے کی اجازت مفہوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اصل سعی واجب ہے اور بحالت موجودہ جس کی وجہ سے انصار کو گرانی تھی وہ جائز اور مباح ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي

بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اتارے صاف حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے

جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اتارا صاف حکم اور راہ کے نشان بعد اس کے کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے

الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا

کتاب میں ف۱ ان پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے ف۲ مگر جنہوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کام کو

کتاب میں ان کو لعنت دیتا ہے اللہ اور لعنت دیتے ہیں سب لعنت دینے والے مگر جنہوں نے توبہ کی اور سنوارا

ف۱ اس سے مراد ہیں یہود کہ توراۃ میں جو آپ کی تصدیق تھی اس کو اور تحویل قبلہ وغیرہ امور کو چھپاتے تھے اور جس نے غرض دنیا کے واسطے اللہ کے حکم کو چھپایا وہ سب اس میں داخل ہیں۔

ف۲ لعنت کرنے والے یعنی جن وانس وملائکہ بلکہ اور سب حیوانات کیونکہ ان کی حق پوشی کے وبال میں جب عالم کے اندر قحط، وباء اور طرح طرح کی بلائیں پھیلتی ہیں تو حیوانات بلکہ جمادات تک کو تکلیف ہوتی ہے اور سب ان پر لعنت کرتے ہیں۔

وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۶۰﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا

اور بیان کر دیا حق بات کو تو ان کو معاف کرتا ہوں ف۱ اور میں ہوں بڑا معاف کرنیوالا نہایت مہربان بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے

اور بیان کردیا تو ان کو معاف کرتا ہوں اور میں ہوں معاف کرنے والا مہربان جو لوگ منکر ہوئے اور مر گئے

وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۶۱﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ

کافر ہی انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی سب کی ف۲ ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں

منکر ہی انہیں پر ہے لعنت اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی رہ پڑے اس میں

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿۱۶۲﴾

نہ ہلکا ہوگا ان پر سے عذاب اور نہ ان کو مہلت ملے گی ف۳

نہ ہلکا ہوگا ان پر عذاب اور نہ ان کو فرصت ملے گی۔

رجوع بخطاب یہود و وعید بر کتمانِ حق و جحود

قال تعالیٰ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ ... الی ... وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں یہ ذکر فرمایا تھا کہ یہود حق کو جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں مگر باوجود جاننے اور پہچاننے کے حق کو چھپاتے ہیں کما قال تعالیٰ: ﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ اب اس آیت میں اس کتمان حق پر وعید ذکر فرماتے ہیں اور توبہ کرنے والوں کے لئے عفو اور رحمت کا ذکر فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تحقیق جو لوگ خوب جانتے ہیں کہ صفا اور مروہ کی سعی شعائر اللہ میں سے ہے اور حضرت حاجرہ علیہا السلام کے وقت سے برابر چلی آرہی ہے مگر باوجود اس کے یہ لوگ ان مضامین کو چھپاتے ہیں جن کو ہم نے نازل کیا اور جو اپنی ذات سے واضح اور روشن ہیں اور شعائر اللہ کی ہدایت اور رہنمائی کرتے ہیں بعد اس کے کہ ہم نے اس کو تمام لوگوں کے لئے عام اور خاص سب کے لئے شعائر اسلام اور کفر کے فرق کو خوب واضح کر دیا ہے اور خبر واحد کی طرح نہیں بنایا کسی کو پہنچے اور کسی کو نہ پہنچے اس کتاب الٰہی میں داخل کر دیا ہے تاکہ متواتر ہو جائے اور اس کا اخفاء اور پوشیدہ رکھنا ناممکن ہو جائے۔ لیکن یہ لوگ کمال عداوت کی وجہ سے اس کے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ اللہ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت اور رفع جہالت چاہتا ہے اور

ف۱ یعنی اگرچہ ان کی حق پوشی کے باعث بعض آدمی گمراہی میں پڑ گئے لیکن جب انہوں نے حق پوشی سے توبہ کر کے اظہار حق پوری طرح کر دیا تو اب بجائے لعنت ہم ان پر رحمت نازل فرماتے ہیں کیونکہ ہم تواب و رحیم ہیں۔

ف۲ یعنی جس نے خود حق پوشی کی یا کسی دوسرے کی حق پوشی کے باعث گمراہ ہوا اور اخیر تک کافر ہی رہا اور توبہ نصیب نہ ہوئی تو وہ ہمیشہ کو ملعون اور جہنمی ہوا، مرنے کے بعد توبہ مقبول نہیں بخلاف اول فریق مذکور سابق کے کہ توبہ نے ان کی لعنت کو منقطع کر دیا کہ زندگی ہی میں تائب ہو گئے۔

ف۳ یعنی ان پر عذاب یکساں اور مسلسل رہیگا یہ نہ ہوگا کہ عذاب میں کسی قسم کی کمی ہو جائے یا کسی وقت ان کو عذاب سے مہلت مل جائے۔

یہ لوگ گمراہی اور جہالت کا بقاء چاہتے ہیں اور نیز لعنت کرتے ہیں ان پر سب لعنت کرنے والے۔ ملائکہ اور ارواح انبیاء وصلحاء تو اس لئے لعنت کرتے ہیں کہ ان کی کوشش تو یہ ہے کہ اللہ کے احکام کو بیان کیا جائے اور ان کی خوب نشر واشاعت کی جائے اور یہ لوگ ان حضرات کی کوشش کو ضائع کرنا چاہتے ہیں اور عوام اور فساق وفجار اور کفار نا ہنجار اس لئے لعنت کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے ان کو حق معلوم نہ ہونے دیا اور چونکہ کتمانِ حق کی وجہ سے طرح طرح کی بلائیں اور مصیبتیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں اس لئے تمام حیوانات اور جمادات ان پر لعنت بھیجتے ہیں کہ ان کی وجہ سے مصیبت اور بلا میں گرفتار ہوئے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب قحط پڑتا ہے اور بارش بند ہوجاتی ہے تو جانور گناہ کرنے والوں پر لعنت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کم بختوں کی وجہ سے نحوست آئی مگر جن لوگوں نے محض اللہ کی ناراضی کے ڈر سے حق پوشی سے توبہ کرلی۔ اور حق پوشی کی وجہ سے جو خرابی آئی تھی اس کی اصلاح کرلی یعنی جو عقائد اور اعمال اور حقوق اور اموال لوگوں کے حق پوشی کی وجہ سے خراب اور برباد ہوئے تھے ان کی اصلاح کردی اور گزشتہ غلطیوں کا تدارک کردیا اور جس حق کو چھپایا تھا اس کو لوگوں کے سامنے بیان کردیا تو ایسے لوگوں کو میں معاف کردیتا ہوں اور بجائے لعنت کے ان پر رحمت نازل کرتا ہوں اور میں تو بڑا ہی توبہ کا قبول کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہوں کہ توبہ کرنے سے لعنت کو رحمت سے اور سزا کو انعام سے بدل دیتا ہوں۔ تحقیق جو لوگ حق پوشی کی وجہ سے کفر کی حد تک پہنچ گئے اور بدون توبہ کے کفر کی حالت میں مرگئے ایسے لوگوں پر اللہ کی اور تمام فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی مستمر لعنت ہے۔ حتیٰ کہ خود اس کی بھی اس پر لعنت ہے اس لئے کہ یہ کافر خود یہ کہتا ہے کہ جو دیدہ دانستہ حق کو چھپائے اس پر اللہ کی لعنت اور یہ نہیں سمجھتا کہ میں بھی خود اس عموم میں داخل ہوں۔ اور یہ لوگ ہمیشہ اس لعنت میں رہیں گے۔ یہ لعنت کبھی ان سے منقطع نہ ہوگی کیونکہ بغیر توبہ کے مرے ہیں، ذرا برابر ان کے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی بلکہ دم بدم زیادتی ہوتی رہے گی۔ دنیا میں دن بدن ان کا کفر اور تمرد بڑھتا تھا۔ آخرت میں عذاب بڑھتا رہے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی کہ کچھ دیر آرام کرلیں اور آئندہ کے لئے عذاب سہنے کی کچھ قوت آجائے اس لئے کہ عذاب میں تخفیف اور مہلت یہ بھی ایک قسم کا لعنت سے نکالنا ہے جو ان کے حق میں ناممکن اور محال ہے۔

وَاِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ‌ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۶۳﴾ ع

اور معبود تم سب کا ایک ہی معبود ہے کوئی معبود نہیں اس کے سوا بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا ف۱

اور تمہارا رب اکیلا رب ہے کسی کو پوجنا نہیں اس کے سوا بڑا مہربان ہے رحم والا۔

اعلانِ توحید

قال تعالیٰ: ﴿وَاِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ‌ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں اللہ کے احکام چھپانے والوں پر لعنت اور عذاب کا ذکر فرمایا آئندہ آیت میں حق تعالیٰ کی وحدت

ف۱ یعنی معبود حقیقی تم سب کا ایک ہی ہے اس میں تعدد کا احتمال بھی نہیں سو اب جس نے اس کی نافرمانی کی بالکل مردود اور غارت ہوا دوسرا معبود ہوتا تو ممکن تھا کہ اس سے نفع کی توقع باندھی جاتی یا آقائی اور بادشاہی اور استادی اور پیری نہیں کہ ایک جگہ موافقت نہ آئی تو دوسری جگہ چلے گئے یہ تو معبودی اور خدائی ہے نہ اس کے سوا کسی کو معبود بنا سکتے ہو اور نہ کسی سے اس کے علاوہ خیر کی توقع کرسکتے ہو۔ جب آیت والہکم الہ واحد نازل ہوئی تو کفار مکہ نے تعجب کیا کہ تمام عالم کا معبود اور سب کا کام بنانے والا ایک کیسے ہوسکتا ہے اور اس کی دلیل کیا ہے اس پر آیت ﴿اِنَّ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ﴾ نازل =

اور رحمت کا ذکر فرماتے ہیں کہ وہی ایک معبود ہے اس کے سوا کہیں پناہ نہیں جو اس کی لعنت سے تم کو چھڑا سکے اور اس کے سوا کوئی رحمان اور رحیم نہیں جو خدا کی لعنت اور نقمت کو رحمت اور عنایت سے بدل دے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور وہی رحمن اور رحیم ہے۔ رحمت عامہ اور خاصہ سب اسی کے ہاتھ میں ہے اس لئے بدون اس کی رحمت کے لعنت سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں اگر خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ تم کو اس کی لعنت سے نکال لیتا اور تم پر رحمت کرتا لیکن اس کے سوا کوئی خدا نہیں جو رحمت عامہ اور خاصہ کا مالک ہو اور عجب نہیں کہ اس خطاب میں اہل کتاب کو تہدید اور عتاب ہو کہ باوجود یہ کہ توریت اور انجیل میں اللہ کی توحید کی صریح آیتیں مذکور ہیں اور پھر بھی تم حضرت عزیر ؑ اور حضرت مسیح ؑ کو خدا کا بیٹا بتلاتے ہو اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو اور اس توحید کو جو تم کو معلوم ہے چھپاتے ہو، غرض یہ کہ تم آنحضرت ﷺ کی نبوت کو چھپانے کی وجہ سے بھی مستحق لعنت ہوئے اور توحید خداوندی کے اخفاء اور کتمان کی وجہ سے بھی مورد لعنت بنے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي

بیشک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو کہ لے کر چلتی ہیں

آسمان اور زمین کا بنانا اور رات اور دن کا بدلتے آنا اور کشتی جو لے کر چلتی ہے

الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ

دریا میں لوگوں کے کام کی چیزیں اور پانی میں جس کو کہ اتارا اللہ نے آسمان سے پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مرگئے

دریا میں جو چیزیں کام آویں لوگوں کو اور وہ جو اللہ نے اتارا آسمان سے پانی پھر جلایا اس سے زمین کو

مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ

پیچھے اور پھیلائے اس میں سب قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو کہ تابعدار ہے اس کے حکم کا درمیان آسمان

مر گئے پیچھے اور بکھیرے اس میں سب قسم کے جانور اور پھیرنا باؤں کا اور ابر جو حکم کا تابع ہے درمیان آسمان

وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۱۶۴

و زمین کے بیشک ان سب چیزوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے ف۱

اور زمین کے ان میں نمونے ہیں عقلمند لوگوں کو۔

= ہوئی اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائیں۔

ف۱ یعنی آسمان کے اس قدر وسیع اور اونچا اور بے ستون پیدا کرنے میں اور زمین کے اتنی وسیع اور مضبوط پیدا کرنے اور اس کے پانی پر پھیلانے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے اور ان کے گھٹانے اور بڑھانے میں اور کشتیوں کے دریا میں چلنے اور آسمان سے پانی برسانے اور اس سے زمین کو سرسبز و تر و تازہ کرنے میں جملہ حیوانات میں اس سے توالد و تناسل نشو و نما ہونے میں اور جہات مختلفہ سے ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں کو آسمان اور زمین میں معلق کرنے میں دلائل عظیمہ اور کثیرہ ہیں حق تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت اور حکمت اور رحمت پر ان کے لئے جو صاحب عقل اور فکر ہیں۔

فائدہ: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں توحید ذات کا اور الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ میں توحید صفات کا ثبوت تھا اور اِنَّ فِيْ خَلْقِ الخ میں توحید الافعال کا ثبوت ہوا جس سے مشرکین کے شبہات بالکلیہ مندفع ہو گئے۔

دلائل توحید

قال تعالیٰ: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ... الی... لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾

ربط:...... جب آیۃ ﴿وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ نازل ہوئی تو مشرکین نے تعجب سے کہا کہ کیا سارے جہان کا ایک ہی خدا ہے اگر ایسا ہے تو اس پر کیا دلیل ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں جن میں توحید کے دلائل بیان فرمائے کہ علویات اور سفلیات اور متوسطات اور ان کے احوال وصفات سب دعوائے وحدانیت اور رحمانیت کی دلیل ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق ① آسمانوں اور ② زمین کی پیدائش میں ③ اور دن ورات کی آمد ورفت اور ان کے مختلف ہونے میں ④ اور ان جہازوں اور کشتیوں میں کہ جو دریا میں لوگوں کی منافع کی چیزوں کو لے کر چلتی ہیں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو آدمی اور سامان پہنچاتی ہیں جہاں آدمیوں اور جانوروں کا پہنچنا ممکن نہیں ⑤ اور اس پانی میں کہ جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل کیا اور پھر اس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا یعنی خشکی اور قحط سالی کے بعد قسم قسم کے پھول اور پھل اس میں اگائے ⑥ اور ہر قسم کے جانور اس میں پھیلائے ⑦ اور ہواؤں کے پھیرنے میں کبھی مشرق کا چکر لگاتی ہیں اور کبھی مغرب کا اور کبھی شمال کا اور کبھی جنوب کا ⑧ اور اس ابر میں کہ جو آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہے حالانکہ ہزار من پانی سے بھرا ہوا ہے باوجود اس عظیم ثقل کے زمین پر گرنہیں جاتا۔ ان تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی وحدت اور رحمت کے عجیب وغریب دلائل اور براہین ہیں ان لوگوں کے لئے جو اپنی عقل کو نظر اور فکر میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی کمال قدرت اور کمال حکمت اور اس کی وحدانیت اور رحمت پر مختلف طرح سے دلالت کرتی ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) آسمانوں میں غور کیجئے کہ تمام آسمان حقیقت اور طبیعت جرمیہ کے اعتبار سے ایک ہیں مگر کوئی چھوٹا ہے اور کوئی بڑا۔ اور پھر کواکب اور نجوم، ثوابت اور سیارات، شمس اور قمر اور زہرہ اور مریخ اور مشتری میں غور کیجئے۔ ہر ایک کی شان جدا ہر ایک کا رنگ جدا، ہر ایک کی حرکت جدا اور حرکت کی سمت اور جہت جدا ہر ایک کا برج جدا۔ ہر ایک کا طلوع اور غروب جدا۔ اس عجیب نظام کو دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کارخانہ خود بخود تو نہیں چل رہا ہے بلکہ کسی علیم وقدیر اور مدبر حکیم کے ہاتھ میں اس کی باگ ہے کہ وہ محض اپنے ارادہ اور مشیت سے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں اور افلاک اور شمس وقمر کی حرکات سے منافع عالم کا مربوط ہونا یہ اس کی کمال رحمت کی دلیل ہے۔

(۲) اور علی ہذا زمین کی پیدائش بھی اس کی وحدانیت اور رحمت کی دلیل ہے۔ زمین کے قطعات کا مختلف اللون اور مختلف الخاصیت ہونا کہ کسی زمین سے گھانس پیدا اور کسی سے انناس۔ اور کسی سے بادام پیدا ہو اور کسی سے آدم، کسی زمین کے بسنے والے عاقل اور کسی جگہ کے بسنے والے ایسے کودن اور نادان کہ بعض چیزوں میں حیوان بھی ان سے بہتر نکلے یہ اختلافات کہاں سے آئے اور کس طرح آئے۔ زمین کا مادہ اور طبیعت تو ایک ہی ہے وہ کون ذات ہے کہ جس نے زمین کے ایک ٹکڑے کو شور اور بنجر بنایا اور دوسرے کو سبزہ زار اور مرغزار بنایا یہ سب اسی علیم وقدیر کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ جس کی قدرت اور حکمت کے سمجھنے سے تمام عالم قاصر اور عاجز ہے یہ دلیل تو وحدانیت کی ہوئی اور زمین رحمت خداوندی کی دلیل اس طرح سے ہے کہ

تمام عالم کے بسنے والے اسی زمین پر چل کر اپنی حاجتیں پوری کرتے ہیں اسی سے پیدا شدہ غذاؤں اور پھلوں اور چشموں اور نہروں سے نفع اٹھاتے ہیں اور تمام سونا اور چاندی وغیرہ وغیرہ سب اسی زمین میں اللہ کی قدرت سے پیدا ہوتا ہے، کانوں کا مختلف ہونا اس کی وحدانیت کی دلیل ہے اور ان کا نافع اور مفید ہونا اس کی رحمت کی دلیل ہے، آسمان اور زمین علیحدہ علیحدہ بھی رحمت ہیں اور دونوں مل کر بھی رحمت ہیں اس لئے آسمان اور زمین کے اختلاط اور تقابل سے جو منافع اور فوائد پیدا ہوتے ہیں، ان کے ادراک سے عقل قاصر ہے۔

(۳) اور اسی طرح لیل و نہار کا مختلف ہونا کہ کبھی دن ہے کبھی رات۔ کبھی دن بڑا اور رات چھوٹی اور کبھی اس کا برعکس، کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے یا کسی قادر مطلق کے ہاتھ میں اس کی ڈور ہے اگر دن نہ ہوتا اور فقط رات ہوتی تو تمام عالم مستمر اور دائم ظلمت اور تاریکی کی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا اور چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا۔ اور اگر رات نہ ہوتی فقط دن ہی دن ہوتا تو تمام عالم گرمی سے بلبلا اٹھتا اور کھیتیاں جل کر خاک ہو جاتیں اور اس راحت اور آرام سے کہ جو رات کی نیند سے اسے حاصل ہوتا ہے تمام جہان یک لخت محروم ہو جاتا معلوم ہوا کہ لیل و نہار کا اختلاف جس طرح اس کی وحدانیت کی دلیل ہے اسی طرح اس کی رحمانیت کی بھی دلیل ہے۔

(۴) اور علیٰ ہذا جہاز اور کشتی بھی اس کی قدرت اور رحمت کی دلیل ہے، ایک تولہ لوہا یا تانبا ایک منٹ کے لئے پانی پر نہیں ٹھہرتا مگر جہاز اور کشتی کی جس میں ہزارہا من لوہا اور تانبا لدا ہوا ہوتا ہے ایک ملک سے دوسرے ملک تک ہزارہا میل طے کر کے صحیح و سالم پہنچتے ہیں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رحمانیت کی دلیل ہے۔

(۵، ۶) اور علیٰ ہذا آسمان سے باران رحمت کا نازل ہونا اور زمین کا اس سے سرسبز اور شاداب ہو جانا اور قسم قسم کے اشجار اور نباتات اور فواکہ اور ثمرات کا اس سے پیدا ہونا اور علیٰ ہذا اس سے حیوانات کا ایسا مختلف اللون پیدا ہونا کہ ایک کی شکل اور صورت دوسرے کی شکل اور صورت سے نہ ملے یہ بھی اس کی وحدانیت اور رحمانیت کی دلیل ہے اس لئے کہ یہ اختلاف بے شمار فوائد اور منافع پر مشتمل ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت سے حیوانات دو قسم کے بنائے ایک تو وہ جو بطریق توالد اور تناسل پیدا ہوتے ہیں جیسے انسان اور اونٹ اور بیل اور بکری۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو بطریق تولید پیدا ہوتے ہیں جیسے ہزارہا حشرات الارض مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور ہزارہا مچھر اور جھینگر برسات کے پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی صورت اور شکل الگ اور ہر ایک کا رنگ الگ جس سے باہمی فرق اور امتیاز کا نفع اور فائدہ ہوتا ہے اور یہ حق تعالیٰ کی عظیم رحمت اور مہربانی ہے ورنہ اگر سب ایک رنگ اور ایک شکل کے ہوتے تو پہچاننا ممکن نہ تھا، اگر آدمی اور حیوانات باہم ممتاز نہ ہوتے تو کارخانہ معاش معطل اور درہم برہم ہو جاتا ایک انسان کے چہرہ میں غور کرو کہ آنکھ بھی ہے اور کان بھی اور ناک بھی ہے اور زبان بھی، سر بھی ہے اور دماغ بھی۔ ایک عجیب و غریب تصویر ہے قویٰ عقلیہ اور حسیہ کا مجموعہ اور خداوند ذوالجلال کی قدرت اور کمال کا بے مثال آئینہ ہے اور آنکھ، کان اور زبان کے جو بے شمار فوائد اور منافع ہیں وہ اس رحمٰن و رحیم کی رحمت کاملہ کے دلائل اور براہین ہیں۔

حکایت: ...... کسی نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ شطرنج بھی عجیب کھیل ہے کہ باوجود مختصر سا طول و عرض ہونے کے ہزار مرتبہ بھی کھیلا جائے تو ایک بازی دوسری بازی کے موافق نہ پڑے گی۔ تو جواب میں فرمایا کہ انسان کا چہرہ اس سے بھی عجیب ہے کہ باوجود آنکھ اور ابرو اور کان اور زبان وغیرہ کبھی اپنی معین جگہ سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے مگر با ایں ہمہ ہر فرد بشر ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہے، خداوند ذوالجلال کی اس تقدیر اور تدبیر بے نظیر سے کارخانۂ عالم چل رہا ہے ورنہ اگر سب ہم شکل ہوتے تو باپ بیٹے کو بھائی بھائی کو نہ پہچانتا۔ (تفسیر کبیر)

(۷) اور علیٰ ہذا ہواؤں کا بدلنا اور گرمی سے سردی کی طرف اور سردی سے گرمی کی طرف ان کا پھیرنا اور کبھی مشرق سے مغرب کی طرف اور کبھی شمال سے جنوب کی طرف ان کا چلانا یہ سب اس کی قدرت اور وحدانیت کی دلیل ہے۔ اور ہوا کا وجود عالم کے لئے عجیب رحمت ہے، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ اگر تین دن تک ہوا بند رہے تو سارا عالم متعفن اور بدبودار ہو جائے۔

(۸) اور علیٰ ہذا بادل کا آسمان اور زمین کے درمیان معلق رکھنا یہ بھی اس کے کمال قدرت کی دلیل ہے کہ باوجود یہ کہ بادل ہزار ہا ٹن پانی سے بھرا ہوا ہے مگر نیچے نہیں گرتا، بادل سر سے گزر رہا ہے مگر کسی کی مجال نہیں کہ اس میں سے ایک گلاس پانی ہی نکال لے، جہاں حکم ہوگا وہیں جا کر برسے گا۔ یہ آٹھ دلیلیں ہیں جو حق تعالیٰ کی وحدانیت اور رحمانیت پر دلالت کرتی ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ف۱ ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی ف۲ اور

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو پکڑتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ان کی محبت رکھتے ہیں جیسے محبت اللہ کی اور

اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ

ایمان والوں کو اس سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی ف۳ اور اگر دیکھ لیں یہ ظالم اس وقت کو جب کہ دیکھیں گے عذاب کہ قوت ساری اللہ ہی

ایمان والوں کو اس سے زیادہ محبت ہے اللہ کی اور کبھی دیکھیں بے انصاف اس وقت کو جب دیکھیں گے عذاب کہ زور سارا اللہ

ف۱ یعنی آدمیوں میں جو کہ شعور و عقل میں جمیع مخلوقات سے افضل ہیں، بعضے ایسے بھی ہیں کہ باوجود دلائل ظاہرہ سابقہ کے پھر غیر اللہ کو حق تعالیٰ کا شریک اور اس کے برابر بناتے ہیں۔

ف۲ یعنی صرف اقوال و اعمال جزئیہ ہی میں ان کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں مانتے بلکہ محبت قلبی جو کہ صدور اعمال کی اصل ہے اس تک شرک اور مساوات کی نوبت پہنچا رکھی ہے جو شرک کا اعلیٰ درجہ ہے اور شرک فی الاعمال اس کا خادم اور تابع ہے۔

ف۳ یعنی مشرکین کو جو اپنے معبودوں سے محبت ہے مؤمنین کو اپنے اللہ سے اس سے بھی بہت زیادہ اور مستحکم محبت ہے کیونکہ مصائب دنیا میں مشرکین کی محبت بسا اوقات زائل ہو جاتی ہے اور عذاب آخرت دیکھ کر تو بالکل تبری اور بیزاری ظاہر کریں گے جیسا اگلی آیت میں آتا ہے بخلاف مؤمنین کے کہ ان کی محبت اپنے اللہ کے ساتھ ہر ایک رنج و راحت، مرض و صحت دنیا و آخرت میں برابر باقی اور پائیدار رہنے والی ہے اور نیز اہل ایمان کو جو اللہ سے محبت ہے وہ اس محبت سے بھی بہت زیادہ ہے جو محبت کہ اہل ایمان ماسوی اللہ یعنی انبیاء و اولیاء و ملائکہ و عباد و علماء یا اپنے آباء و اجداد اور اولاد و مال وغیرہ سے رکھتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تو اس کی عظمت شان کے موافق بالاصالت اور بالاستقلال محبت رکھتے ہیں اور اوروں سے بالواسطہ اور حق تعالیٰ کے حکم کے موافق ہر ایک کے اندازہ کے مطابق محبت رکھتے ہیں "گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی" خدا اور غیر خدا کو محبت میں برابر کر دینا خواہ وہ کوئی ہو یہ مشرکین کا کام ہے۔

جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾

کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب سخت ہے ف ا

کو ہے اور اللہ کی مار سخت ہے۔

استعجاب واستبعاد بر اتخاذ انداد بعد واضح شدن وحدانیت رب عباد

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ... الی... وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ﴾

ربط: ...گزشتہ آیات میں اہل عقل اور اہل نظر کا بیان تھا۔ اب اس آیت میں بدعقلوں کا بیان ہے کہ جب اللہ کی وحدانیت اور اس کی رحمانیت کے دلائل اظہر من الشمس ہیں تو عقل کا مقتضی یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت اور محبت کے ساتھ مخصوص کرتے۔ اور لیکن بعضے آدمی ظاہراً انسانی عقل وشعور رکھتے ہیں اللہ کی نعمت کو خوب پہچانتے ہیں مگر حد آدمیت اور دائرہ انسانیت سے باہر ہیں کہ اللہ کے سوا جو کہ منعم حقیقی ہے ایسے ہم سر اور شریک بناتے ہیں جو خداوند ذو الجلال سے اس درجہ فروتر اور کمتر ہیں کہ خدا سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ دلائل اور براہین سے تو یہ ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ کا ایک بھی شریک اور ہمسر نہیں ہوسکتا اور یہ لوگ اس درجہ بے عقل ہیں کہ ایک شریک اور ایک ہم سر پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ خدا کے لیے بہت سے شرکاء اور ہم سر بناتے ہیں اور خدا کے مثل اور برابر ان کو محبوب رکھتے ہیں اور خدا کی طرح ان کی تعظیم اور اطاعت کرتے ہیں اور خدا کے حکم کی طرح ان کے حکموں کو بے چون وچرا واجب الاطاعت سمجھتے ہیں اور ایمان کا مقتضی یہ ہے کہ خالق اور مخلوق کی محبت اور اطاعت میں فرق ہونا چاہیے۔ اس لیے اہل ایمان اگرچہ بعض چیزوں کو شرعاً اور طبعاً محبوب رکھتے ہیں مگر اس درجہ محبوب نہیں رکھتے کہ ان کو خدا کے برابر کردیں بلکہ وہ اللہ کی محبت میں بہت سے سخت اور محکم ہیں اس لیے کہ دنیا میں جو بھی فضل وکمال یا جود ونوال ہے اس کا منبع اور سرچشمہ خداوند ذو الجلال ہے اور مخلوق اس کا عکس اور پرتو ہے اس لیے اہل ایمان خالق کو بالذات محبوب اور مخلوق کو بالعرض محبوب رکھتے ہیں اس لیے کہ محبت، محبوب کی عزت اور کمال کے مطابق ہوتی ہے اور عزت اور کمال اور جود ونوال میں سے خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں وہی منعم حقیقی ہے اس لیے راحت اور شدت، بیماری اور تندرستی، شادی اور غمی کسی حال میں بھی اہل ایمان کی محبت اللہ سے کم نہیں ہوتی۔ بخلاف مشرکین کے کہ جب اپنے معبودوں سے ناامید ہوجاتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لیتے ہیں اور اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ ﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾۔

اور اگر یہ ظالم کہ جنہوں نے خدا کا شریک اور ہمسر بنا کر اپنی جانوں پر ظلم وستم کیا اس آنے والے ① وقت کو دیکھ

ف ا یعنی جن ظالموں نے خدا کے لئے شریک بنائے اگر وہ اس آنے والے وقت کو دیکھ لیں کہ جس وقت ان کو عذاب الٰہی کا مشاہدہ ہوگا کہ زور سارا اللہ ہی کے لئے ہے عذاب خداوندی سے کوئی نہیں بچا سکتا اور اللہ کا عذاب سخت ہے تو ہرگز اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ نہ ہوں اور نہ ان سے امید منفعت رکھیں۔

① اشارہ اس طرف ہے کہ آیت ﴿اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ میں عذاب سے عذاب اخروی مراد ہے اور "اِذْ" معنی میں "اِذَا" کے ہے اس لیے کہ ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ﴾ الخ ﴿اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ سے بھی عذاب اخروی ہی مراد ہوگا۔ اور بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ عذاب سے دنیوی عذاب اور دنیوی مصائب اور تکالیف مراد ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت یہ لوگ دنیاوی مصائب اور فقر وفاقہ اور دکھ اور بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس وقت غور وفکر سے کام لیں تو ان پر یہ امر خوب واضح ہوجائے کہ سارا زور اللہ ہی کے لیے ہے اور یہ سب عاجز اور درماندہ ہیں اس لیے کہ یہ بت مصیبت اور بلا کو=

پس کہ جس وقت ان کو عذاب الٰہی کا مشاہدہ ہوگا تو ① ان کو خوب معلوم ہوجائے کہ سارا زور اللہ ہی کے لیے ہے اور تمام کائنات ضعیف اور عاجز ہے اور سب اللہ کے قہر اور غلبہ کے نیچے دبے ہوئے ہیں سوائے اس کے کوئی بھی نفع اور ضرر کا مالک نہیں اور یہ بھی معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔ کوئی بت اور کوئی معبود کسی کو اللہ کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتا۔

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ

جبکہ بیزار ہوجاویں گے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی ان سے کہ جو ان کے پیرو ہوئے تھے اور دیکھیں گے عذاب اور منقطع ہوجائیں گے ان کے

جب الگ ہوجاویں جن کے ساتھ ہوئے تھے اپنے ساتھ والوں سے اور دیکھیں عذاب اور ٹوٹ جاویں ان کے

الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا

سب علاقے ف۱ اور کہیں گے پیرو کیا اچھا ہوتا جو ہم کو دنیا کی طرف لوٹ جانا مل جاتا تو پھر ہم بھی بیزار ہوجاتے ان سے جیسے یہ ہم سے ف۲ بیزار

سب طرف کے علاقے اور کہیں گے ساتھ پکڑنے والے کاش کہ ہم کو دوسری بار زندگی ہو تو ہم الگ ہوجاویں ان سے

مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ

ہوگئے اسی طرح پر دکھلائے گا اللہ ان کو ان کے کام حسرت دلانے کو اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں نار سے ف۳

جیسے یہ الگ ہوگئے ہم سے اسی طرح دکھاتا ہے اللہ انکو کام ان کے افسوس دلانے کو اور ان کو نکلنا نہیں

ع ۲۰　　النَّارِ ﴿١٦٧﴾

آگ سے۔

انجام شرک

قَالَ تَعَالَىٰ: ﴿إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا... الی... وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ﴾

اور اس شدید ② عذاب کے وقت۔ وہ وقت ہوگا کہ جب پیشوا اپنے پیرووں سے الگ اور بے زار ہوجائیں گے

ف۱ یعنی وہ وقت ایسا ہوگا کہ بیزار ہوجائیں گے متبوع اپنے تابعداروں سے اور بت پرست اور بتوں میں کوئی علاقہ باقی نہ رہیگا ایک دوسرے کا دشمن ہوجائے گا عذاب الٰہی دیکھ کر۔

ف۲ اور مشرکین اس وقت کہیں گے کہ اگر کسی طرح ہم کو پھر دنیا میں لوٹ جانا نصیب ہو تو ہم بھی ان سے اپنا انتقام لیں اور جیسا یہ آج ہم سے جدا ہوگئے ہم بھی ان کو جواب دے کر جدا ہوجائیں لیکن اس آرزو محال سے بجز افسوس کچھ نفع نہ ہوگا۔

ف۳ یعنی جیسے مشرکین کو عذاب الٰہی اور اپنے معبودوں کی بیزاری دیکھ کر سخت حسرت ہوگی اسی طرح پر ان کے جملہ اعمال کو حق تعالیٰ ان کے لئے موجب حسرت بنادے گا کیونکہ حج و عمرہ اور صدقات و خیرات جو اچھی باتیں کی ہونگی وہ سب تو بسبب شرک مردود ہوجائیں گی اور شرک و گناہ جس قدر کئے ہونگے ان کا بدلہ عذاب ملے گا تو اب ان کے بھلے اور برے اعمال سب کے سب موجب حسرت ہونگے کسی عمل سے کچھ نفع نہ ہوگا اور ہمیشہ دوزخ میں رہینگے بخلاف مؤمنین اور اہل ایمان کے کہ اگر بسبب معاصی دوزخ میں جائیں گے تو انجام کار نجات پائیں گے۔

= ٹال نہیں سکتے اور جب یہ امر ان پر واضح ہوجائے تو پھر کسی کو خدا کے برابر محبوب نہ رکھیں۔ ۱۲ منہ

① اشارۃ الی تقدیر الجزاء وھو یعلموا ان القوۃ للہ الخ ۱۲

② اشارۃ الی ان اذ تبرأ الذین اتبعوا؟؟ من اذ یرون العذاب۔ ۱۲

اور تابع اور متبوع، گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے دونوں فریق عذاب خداوندی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں گے۔ اور دنیا میں جو باہمی تعلقات تھے وہ اس روز سب منقطع ہوجائیں گے نہ کوئی تابع رہے گا اور نہ کوئی متبوع ہر ایک جرم میں شریک ہوگا سب پر فرد جرم لگ چکی ہوگی۔ ہر ایک کو اپنی فکر ہوگی لیکن اس وقت یہ تبری اور بیزاری ذرہ برابر بھی مفید نہ ہوگی۔ سب کفِ افسوس ملیں گے۔ اور جن لوگوں نے دوسروں کی پیروی کی تھی اور دوسروں کے بہکانے سے کفر اور شرک کیا تھا وہ اس وقت جھنجھلا کر کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک دفعہ دنیا میں لوٹنے کا موقع ملے تو ہم بھی ان سے اپنا بدلہ لیں اور ہم بھی ان سے اسی طرح بے زار ہوجائیں جس طرح یہ لوگ ہم سے بیزار ہوئے۔ مگر اس بے زاری سے ان کو سوائے حسرت کے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور قیامت کے دن فقط یہی ایک حسرت نہ ہوگی بلکہ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال کو ان پر حسرتیں بنا کر دکھلائے گا۔ قیامت کے دن ان کے تمام صدقات اور قربات ایک ایک کر کے ضائع اور رائیگاں ہوں گے اور حسرتوں کی کوئی انتہاء نہ ہوگی۔ اور یہ لوگ تو کبھی دوزخ سے نکلیں گے ہی نہیں کیونکہ شرک کی سزا دائمی عذاب ہے البتہ گنہ گار مسلمان انبیاء اور صلحاء کی شفاعت سے بعد چندے جہنم سے نکال لیے جائیں گے۔

فائدہ:...... چونکہ مسند الیہ کی تقدیم مفید حصر ہوتی ہے اس لیے آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ عدم خروج من النار۔ کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ معلوم ہوا کہ کفار کے علاوہ کوئی فریق ایسا بھی ہے جو کہ بعد چندے دوزخ سے نکالا جائے گا وہ گناہ گار مسلمانوں کا فریق ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے لوگوں کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور پیروی نہ کرو

اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے جو حلال ہے اور نہ چلو قدموں پر

الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ

شیطان کی ف۱ بیشک وہ تمہارا دشمن ہے صریح وہ تو یہی حکم کرے گا تم کو کہ برے کام اور بے حیائی کرو اور

شیطان کے وہ تمہارا دشمن ہے صریح وہ تو یہی حکم کرے گا تم کو برے کام اور بےحیائی اور یہ کہ

تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۶۹ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ

جھوٹ لگاؤ اللہ پر وہ باتیں جن کو تم نہیں جانتے ف۲ اور جب کوئی ان سے کہے کہ تابعداری کرو اس حکم کی جو کہ نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں ہرگز

جھوٹ بولو اللہ پر جو تم کو معلوم نہیں اور جو ان کو کہیے چلو اس پر جو نازل کیا اللہ نے کہیں نہیں

ف۱ اہل عرب بت پرستی کرتے تھے اور بتوں کے نام پر سانڈ بھی چھوڑتے تھے اور ان جانوروں سے نفع اٹھانا حرام سمجھتے تھے اور یہ بھی ایک طرح کا شرک ہے کیونکہ تحلیل و تحریم کا منصب اللہ کے سوا کسی کو نہیں اس بارہ میں کسی کی بات ماننی گویا اس کو اللہ کا شریک بنانا ہے اس لئے پہلی آیات میں شرک کی خرابی بیان فرما کر اب تحریم حلال سے ممانعت کی جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ زمین میں پیدا ہوتا ہے اس میں سے کھاؤ بشرطیکہ وہ شرعاً حلال و طیب ہو تو نہ فی نفسہ حرام ہو جیسے مردار اور خنزیر اور ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ (جن جانوروں پر اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا جائے اور اسکی قربت مقصود ان جانوروں کے ذبح سے ہو) اور نہ کسی امر عارضی سے اس میں حرمت آگئی ہو جیسے غصب، چوری، رشوت سود کا مال کہ ان سب سے اجتناب ضروری ہے اور شیطان کی پیروی ہرگز نہ کرو کہ جس کو چاہا حرام کر لیا جیسے بتوں کے نام کے سانڈ وغیرہ اور جس کو چاہا حلال کر لیا جیسے ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ وغیرہ۔

نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا

نہیں ہم تو تابعداری کریں گے اس کی جس پر دیکھا ہم نے اپنے باپ دادوں کو، بھلا اگرچہ ان کے باپ دادے نہ سمجھتے ہوں کچھ بھی اور نہ

ہم چلیں گے اس پر جس پر دیکھا اپنے باپ دادا کو بھلا اگرچہ ان کے باپ دادے نہ عقل رکھتے ہوں کچھ نہ

يَهْتَدُوْنَ ۝ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً

جانتے ہوں سیدھی راہ ف۱ اور مثال ان کافروں کی ایسی ہے جیسے پکارے کوئی شخص ایک چیز کو جو کچھ نہ سنے سوا پکارنے

راہ کی خبر اور مثال ان منکروں کی جیسے مثال ایک شخص کی کہ چلاتا ہے ایک چیز کو جو سنتی نہیں مگر پکارنا

وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

اور چلانے کے ف۲ بہرے گونگے اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے ف۳

اور چلانا بہرے، گونگے اندھے ہیں سو اُن کو عقل نہیں۔

خطاب عام وتذکیر انعام وابطال رسوم شرکیہ وتفصیل حلال وحرام

قَالَ تَعَالٰی: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ... الی ... فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں عقیدۂ شرک کی قباحت اور مشرکین کی تقبیح وتجہیل فرمائی۔ اب آئندہ آیات میں رسوم شرکیہ اور اعمال کفریہ کا ابطال اور حلال وحرام کی تفصیل فرماتے ہیں۔

ربط دیگر: ...... گزشتہ آیات میں حق تعالیٰ کا معبود برحق اور رحمن ورحیم ہونا بیان فرمایا۔ ان آیات میں حق تعالیٰ کا رازق ہونا بیان فرماتے ہیں کہ وہی رازق ہے اور وہی تمام اَرزاق کا خالق ہے جس چیز کو وہ حلال کرے وہ حلال ہے اور جس چیز کے استعمال کو منع فرمائے وہ حرام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اے لوگو! جب تم کو معلوم ہوگیا کہ گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں کا انجام سوائے حسرت کے کچھ نہیں تو اپنے پیشواؤں کی رائے پر مت چلو اور ان کے کہنے سے کسی چیز کو اپنے اوپر حلال اور حرام نہ کرو۔ کیونکہ یہ بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کی ہمسری ہے حلال وحرام ہونا محض اللہ کے حکم کے تابع ہے اس لیے کہ سب چیزیں اللہ ہی کی ملک ہیں کسی کو اللہ کی ملک میں تصرف کا حق حاصل نہیں کہ حلت وحرمت کا حکم لگائے۔ لہٰذا تم اس فعل قبیح سے توبہ کرو

= ف۲ یعنی مسئلے اور احکام شرعیہ اپنی طرف سے بنالو جیسا کہ بہت سے مواقع میں دیکھا جاتا ہے کہ مسائل جزئیہ سے گزر کر امور اعتقادیہ تک نصوص شرعیہ کو چھوڑ کر اپنی طرف سے احکام تراشے جاتے ہیں اور نصوص قطعیہ اور اقوال سلف کی تحریف اور تغلیط کرتے ہیں۔

ف۱ یعنی حق تعالیٰ کے احکام کے مقابلہ میں اپنے باپ دادا کا اتباع کرتے ہیں اور یہ بھی شرک ہے چنانچہ بعض جہال مسلمان بھی ترک نکاح بیوگاں وغیرہ رسوم باطلہ میں ایسی بات کہہ گزرتے ہیں اور بعض زبان سے گو نہ کہیں مگر عمل ودرآمد سے ان کے ایسا ہی مترشح ہوتا ہے سو یہ بات اسلام کے خلاف ہے۔

ف۲ یعنی ان کافروں کو راہ ہدایت کی طرف بلانا ایسا ہے جیسا کوئی جنگل کے جانوروں کو بلائے کہ وہ سوائے آواز کے کچھ نہیں سمجھتے یہی حال ان لوگوں کا ہے جو خود علم نہ رکھیں اور نہ علم والوں کی بات قبول کریں۔

ف۳ یعنی یہ کفار گویا بہرے ہیں جو حق بات بالکل نہیں سنتے گونگے ہیں جو حق بات نہیں کہتے اندھے ہیں جو راہ مستقیم نہیں دیکھتے سو وہ کچھ نہیں سمجھتے کیونکہ جب ان کے ہر سہ قویٰ مذکورہ فاسد ہو گئے تو تحصیل علم وفہم کی اب کیا صورت ہو سکتی ہے۔

اور کھاؤ اس چیز سے جو اللہ کی زمین میں پیدا ہوئی بشرطیکہ وہ حلال بھی ہو اور پاکیزہ بھی ہو۔ اور حلال وہ ہے کہ جس کی شریعت نے ممانعت نہ کی ہو اور طیب وہ ہے جو بالکل پاک اور صاف ہو کسی غیر کا حق اس سے متعلق نہ ہو۔ مثلاً غصب اور خیانت اور رشوت اور سود یا کسی اور ناجائز طریقہ سے اس کو حاصل نہ کیا گیا ہو اس لیے کہ جو چیز فی ذاتہ حلال ہو مگر دوسرے کا حق اس کے ساتھ متعلق ہو تو اس کا کھانا بھی جائز نہیں جیسے کوئی شے اصل میں تو پاک ہو اور بعد میں نجاست آلود ہو جائے تو اس کا کھانا جائز نہیں رہتا۔ اور حلت اور حرمت میں اللہ کے حکم کا اتباع کرو اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے شیطانی وسوسوں کی بناء پر اس کے کھانے سے پرہیز نہ کرو تحقیق وہ شیطان تمہارا قدیمی اور کھلا دشمن ہے اس کے کہنے میں نہ آنا دشمنی میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتلاتا ہے جز ایں نیست کہ وہ تم کو برائی کا حکم دیتا ہے تاکہ عذاب آخرت کے مستحق ہو جاؤ اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے تاکہ مخلوق کی نظر میں بھی حقیر ہو جاؤ۔

ف ١:...... سوء کا تعلق افعال سے ہے اور فحشاء کا تعلق اخلاق سے ہے۔ اور نیز شیطان تم کو اس بات کا بھی حکم دیتا ہے کہ تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کا تم کو علم نہیں۔ ایسے عقائد اور اعمال کی تم کو تلقین کرتا ہے جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

ف ٢:...... بدعت کی بھی یہی حقیقت ہے کہ جس کام کو اللہ نے موجب ثواب قرار نہیں دیا اس کام کو بلا دلیل شرعی موجب ثواب قرار دے۔

ف ٣:......شیطان کبھی نیک کام کا بھی حکم کرتا ہے جیسا کہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ شیطان ان کو تہجد یا صبح کی نماز کے لیے جگانے آیا سو وہ اس آیت کے معارض نہیں اس لیے کہ شیطان اگرچہ ظاہر میں نیکی کا حکم کرتا ہے لیکن مقصود اس کا بدی ہوتا ہے کہ یہ شخص اگر گناہ نہیں کرتا تو کم از کم اس کو چھوٹی طاعت میں لگا دیا جائے تاکہ بڑی عبادت کر کے اجر عظیم حاصل نہ کر سکے۔

ہر چہ گیر علتی علت شود

اور یہ لوگ دام شیطانی میں اس درجہ گرفتار ہیں کہ آبائی رسوم کو حکم خداوندی سے بڑھ کر سمجھتے ہیں حتی کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ حکم کا اتباع کرو اور اپنے باپ دادا کے طریقہ کو چھوڑ دو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے حکم کو نہیں جانتے بلکہ ہم اس رسم کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ اپنے آباء واجداد کا اتباع کریں گے اگرچہ وہ نہ عقل رکھتے ہیں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔ دنیاوی امور میں اگرچہ بڑے عاقل اور ہوشیار ہیں لیکن دین اور آخرت کی عقل سے کورے ہیں۔ شجر اور حجر کو خدا بنائے ہوئے ہیں۔ دانایان فرنگ کو دیکھو جن کی عقل کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا ہے وہ تین میں ایک اور ایک میں تین کے قائل ہیں۔

ف ٤:......اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے روحانی یا جسمانی آباء واجداد عقل بھی رکھتے ہوں اور ہدایت یافتہ بھی ہوں اور ما انزل اللہ کے اشارات اور کنایات کو خوب سمجھتے ہوں تو ایسے آباء واجداد کا اتباع اور تقلید عین عقل اور عین ہدایت بلکہ عین ما انزل اللہ کا اتباع ہے۔ حکم خداوندی کے خلاف کسی کا اتباع بلاشبہ گمراہی ہے لیکن حکم خداوندی کے سمجھنے کے لیے اگر کم عقل والا اپنے سے زیادہ عقل والے کا اتباع کرے تو عین ہدایت اور مقتضی عقل ہے آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ لوگ فقط بے عقل ہی نہیں، بلکہ فی الحقیقت حدود انسانیت سے خارج ہیں جانوروں کی طرح ہیں اشیاء کے حسن وقبح اور نفع اور

ضرر کو نہیں سمجھتے۔ البتہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ کون سا گھانس اچھا ہے اور کون سا گھانس کڑوا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ داعیِ حق کے اعتبار سے ان کافروں کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بھیڑ بکریوں اور جانوروں کو چلا چلا کر پکار رہا ہو اور وہ جانور سوائے بلانے اور پکارنے کے کچھ نہ سنتا ہو۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے کہ واعظ اور ناصح کی آواز تو سنتے ہیں مگر اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے یہ لوگ اگرچہ ظاہر میں سنتے ہیں مگر حقیقت میں بہرے ہیں کلمۂ حق سن نہیں سکتے باطل کے حق میں بڑے مقرر ہیں لیکن حق کے حق میں گونگے ہیں۔ حق بات زبان سے نہیں نکل سکتی۔ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں مگر دل کے اندھے ہیں حق اور باطل کا فرق نظر نہیں آتا۔ پس اس لیے کہ ان کے تمام حواس جو عقل کے مبادی اور مقدمات ہیں وہ سب مختل بلکہ گم ہیں۔ اس لیے یہ لوگ حق اور ہدایت کو کچھ نہیں سمجھتے۔ پس یہ لوگ جانوروں کی طرح عقلِ معاش رکھتے ہیں آخرت کی عقل سے عاری اور کورے ہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ

اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اسی کے

اے ایمان والو ! کھاؤ ستھری چیزیں جو تم کو روزی دی ہم نے اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اسی کے

تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ

بندے ہو ف۱ اس نے تو تم پر یہی حرام کیا ہے مردہ جانور ف۲ اور لہو ف۳ اور گوشت سور کا ف۴ اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور

بندے ہو یہی حرام کیا ہے تم پر مردہ اور لہو اور گوشت سور کا اور جس پر نام پکارا

اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

کا ف۵ پھر جو کوئی بے اختیار ہو جائے نہ تو نافرمانی کرے اور نہ زیادتی تو اس پر کچھ گناہ نہیں ف۶ بیشک اللہ ہے بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ف۷

اللہ کے سوا کا پھر جو کوئی پھنسا ہو نہ بے حکمی کرتا ہے نہ زیادتی تو اس پر نہیں گناہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ف۱ اکل طیبات کا حکم اوپر گزر چکا تھا لیکن مشرکین چونکہ شیطان کی پیروی سے باز نہیں آتے اور احکام اپنی طرف سے بنا کر اللہ کے اوپر لگاتے ہیں اور اپنے رسوم باطلہ آبائی کو نہیں چھوڑتے اور حق بات سمجھنے کی ان میں گنجائش ہی نہیں تو اب ان سے اعراض فرما کر خاص مسلمانوں کو اکل طیبات کا حکم فرمایا گیا اور اپنا انعام ظاہر کر کے ادائے شکر کا امر کیا گیا اس میں اہل ایمان کے مقبول اور مطیع ہونے کی جانب اور مشرکین کے مردود معتوب و نافرمان ہونے کی طرف اشارہ ہو گیا۔

ف۲ مردار وہ ہے کہ خود بخود مر جائے اور ذبح کی نوبت نہ آئے یا خلاف طریقۂ شرعیہ اس کو ذبح یا شکار کیا جائے مثلاً گلا گھونٹا جائے یا زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے یا لکڑی اور پتھر اور غلیل و بندوق سے مارا جائے یا اوپر سے گر کر یا کسی جانور کے سینگ مارنے سے مر جائے یا درندہ پھاڑ ڈالے یا ذبح کے وقت قصداً تکبیر کو ترک کیا جائے کہ یہ سب مردار اور حرام ہیں البتہ دو جانور مردار بحکم حدیث شریف اس حرمت سے مستثنیٰ اور ہم کو حلال ہیں مچھلی اور ٹڈی۔

ف۳ اور خون سے مراد وہ خون ہے جو رگوں سے بہتا ہے اور ذبح کے وقت نکلتا ہے اور جو خون کہ گوشت پر لگا رہتا ہے وہ حلال اور پاک ہے اگر گوشت کو بغیر دھوئے ہوئے پکا لیا جائے تو اس کا کھانا درست ہے۔ البتہ نظافت کے خلاف ہے اور کلیجی اور تلی کہ خون منجمد ہیں بحکم حدیث شریف حلال ہیں۔

ف۴ اور خنزیر زندہ ہو یا مردہ یا قاعدۂ شریعت کے موافق ذبح کر لیا جائے ہر حال میں حرام ہے اور اس کے تمام اجزاء گوشت پوست چربی ناخن بال ہڈی پٹھا ناپاک اور ان سے نفع اٹھانا اور کسی کام میں لانا حرام ہے۔ اس موقع پر چونکہ کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے اس لئے فقط گوشت کا حکم بتلایا گیا مگر اس پر سب کا اجماع ہے کہ خنزیر جو کہ بے غیرتی اور بے حیائی اور حرص اور رغبت الی النجاسات میں سب جانوروں میں بڑھا ہوا ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت ﴿فَاِنَّهٗ﴾ =

= رجس" فرمایا بلاشک نجس العین ہے نہ اس کا کوئی جزو پاک اور نہ کسی قسم کا انتفاع اس سے جائز جو لوگ کثرت سے اس کو کھاتے ہیں اور اس کے اجزاء سے نفع اٹھاتے ہیں ان تک میں اوصاف مذکورہ واضح طور پر مشاہدہ ہوتے ہیں۔

ف۵ ﴿وَمَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ ان جانوروں پر اللہ کے سوا بت وغیرہ کا نام پکارا جائے یعنی اللہ کے سوا کسی بت یا جن یا کسی روح خبیث یا پیر یا پیغمبر کے نامزد کر کے اور اس جانور کی جان ان کی نذر کر کے ان کے تقرب یا رضا جوئی کی نیت سے ذبح کیا جائے اور محض ان کی خوشنودی کی غرض سے اس کی جان نکالنی مقصود ہو کہ ان سب جانوروں کا کھانا حرام ہے گو بوقت ذبح تکبیر پڑھی ہو اور اللہ کا نام لیا ہو کیونکہ جان کو جان آفریں کے سوا کسی دوسرے کے لئے نذر و نیاز کرنا ہرگز درست نہیں اس لئے جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر کی جائے تو اس کی خباثت مردار کی خباثت سے بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ مردار میں تو یہی خرابی تھی کہ اس کی جان اللہ کے نام پر نہیں نکلی اور اس کی تو جان غیر اللہ کے نامزد کر دی گئی جو عین شرک ہے سو جیسے خنزیر اور کتے پر بوقت ذبح تکبیر کہنے سے حلت نہیں آسکتی اور مردار پر اللہ کا نام لینے سے کوئی نفع نہیں ہوسکتا ایسے ہی جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر اور ان کے نامزد کر دی ہو اس پر ذبح کے وقت نام الٰہی لینے سے ہرگز ہرگز کوئی نفع اور حلت اس میں نہیں آسکتی البتہ اگر غیر اللہ کے نامزد کرنے کے بعد اپنی نیت سے ہی تو بہ اور رجوع کر کے ذبح کریگا تو اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں علماء نے تصریح فرمادی ہے کہ اگر کسی بادشاہ کے آنے پر اس کی تعظیم کی نیت سے جانور ذبح کیا جائے یا کسی جن کی اذیت سے بچنے کے لئے اس کے نام کا جانور ذبح کیا جائے یا توپ چلنے یا اینٹوں کے پزاوہ کے پکنے کے لئے بطور بھینٹ جانور ذبح کیا جائے تو وہ جانور بالکل مردار اور حرام اور کرنے والا مشرک ہے اگرچہ ذبح کے وقت خدا کا نام لیا جائے۔ حدیث شریف میں آیا ہے ﴿لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ یعنی جو غیر اللہ کے تقرب اور تعظیم کی نیت سے جانور کو ذبح کرے اس پر اللہ کی لعنت ہے ذبح کے وقت اللہ کا نام پاک لے یا نہ لے البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کر کے فقراء کو کھلائے اور اس کا ثواب کسی قریب یا پیر اور بزرگ کو پہنچا دے یا کسی مردہ کی طرف سے قربانی کر کے اس کا ثواب اسکو دینا چاہے کیونکہ یہ ذبح غیر اللہ کے لئے ہرگز نہیں بعضے اپنی کجروی سے یہ حیلہ ایسے مواقع میں بیان کرتے ہیں کہ پیروں کی نیاز وغیرہ میں ہم کو تو یہی مقصود ہوتا ہے کہ کھانا پکا کر مردہ کے نام سے صدقہ کر دیا جائے تو اول تو خوب سمجھ لیں کہ اللہ کے سامنے جھوٹے حیلوں سے بجز مضرت کوئی نفع حاصل نہیں ہوسکتا، دوسرے ان سے پوچھا جائے کہ جس جانور کی تم نے غیر خدا کے لئے نذر مانی ہے اگر اسی قدر گوشت اس جانور کے عوض خرید کر اور پکا کر فقیروں کو کھلا دو تو تمہارے نزدیک بے کھٹکے وہ نذر ادا ہو جاتی ہے یا نہیں اگر بلا تامل تم اس کو کر سکتے ہو اور اپنی نذر میں کسی قسم کا خلل تمہارے دل میں نہیں رہتا تو تم سچے ورنہ تم جھوٹے اور تمہارا یہ فعل شرک اور وہ جانور مردار اور حرام۔

فائدہ: یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ آیت میں حکم حرمت کو اشیاء مذکورہ میں منحصر کر کے بیان فرمایا ہے جس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ اشیائے مذکورہ کے سوا کوئی جانور حرام نہیں حالانکہ جملہ درندے اور گدھا اور کتا وغیرہ سب کا کھانا حرام ہے اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ اس حصر سے حکم حرمت کو اشیائے مذکورہ میں منحصر کرنا ہرگز مراد نہیں کہ کسی کو اعتراض کی گنجائش ہو بلکہ حکم حرمت کو صحت وصداقت کے ساتھ مخصوص فرما کر اس حکم کی جانب مخالف کا بطلان منظور ہے یعنی بس بات یہی ہے کہ یہ چیزیں اللہ پاک نے تم پر حرام فرمادیں اس میں دوسرا احتمال ہی نہیں یعنی ان کا حلال سمجھنا بالکل باطل اور غلط ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حکم حرمت کو اشیائے مذکورہ ہی میں منحصر مانا جائے مگر اس حصر کو اضافی یعنی خاص انہی چیزوں کے لحاظ سے تسلیم کیا جائے جن کو مشرکین نے اپنی طرف سے حرام کر لیا تھا جیسے بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جن کا ذکر آئندہ آئیگا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تو تم پر فقط میتہ اور خنزیر وغیرہ کو حرام کیا تھا تم جو سانڈ وغیرہ کی تحریم اور تعظیم کے قائل ہو یہ محض تمہارا افتراء ہے باقی رہے درندے اور خبیث جانور ان کے حرام ہونے میں مشرکین بھی نزاع نہ کرتے تھے۔ سو یہ حصر انہی جانوروں کے لحاظ سے ہے جن کو مشرکین نے خلاف حکم الٰہی اپنی طرف سے حرام ٹھہرا لیا تھا تمام جہان کے جانوروں سے اس کو کیا تعلق جو اعتراض مذکور کی نوبت آئے۔

ف۶ یعنی اشیائے مذکورہ حرام ہیں لیکن جب کوئی بھوک سے مرنے لگے تو اس کو لاچاری کی حالت میں کھا لینے کی اجازت ہے بشرطیکہ نافرمانی اور زیادتی نہ کرے نافرمانی یہ کہ مثلاً نوبت اضطرار کی نہ پہنچے اور کھانے لگے اور زیادتی یہ کہ قدر ضرورت سے زائد خوب پیٹ بھر کر کھالے بس اتنا ہی کھائے جس سے مرے نہیں۔

ف۷ یعنی اللہ پاک تو بڑا بخشنے والا ہے بندوں کے ہر قسم کے گناہوں کو بخش دیتا ہے پھر ایسے لاچار اور مضطر کی بخشش کیسے نہ فرمائے گا اور اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے کہ مجبوری کی حالت میں صاف اجازت دے دی کہ جس طرح بن پڑے اپنی جان بچالو اصلی حکم ممانعت کا لاچاری کی حالت میں تم پر سے اٹھا لیا گیا ورنہ اس مالک الملک کا حق تھا کہ فرما دیتا تمہاری جان جائے یا رہے مگر ہمارے حکم کے خلاف ہرگز نہ کرنا۔ ایک خلجان یہاں یہ بھی ہوتا تھا کہ بھوک سے مرتے ہوئے مضطر بد حواس کو یہ اندازہ کرنا کہ اتنے لقموں سے سدرمق ہو جائیگا اور اس سے زائد ایک لقمہ نہ کھائے محال نہیں تو دشوار تو بہت ہے اس لئے إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ فرما کر اس میں سہولت کر دی۔

خطاب خاص بہ اہل اختصاص

قال اللہ تعالیٰ: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ... الی... اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں خطاب عام تھا۔ اور اس آیت میں خاص اہل ایمان کو خطاب ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ ایمان اور محبت خداوندی کا اقتضاء یہ ہے کہ خدا کے رزق کو کھاؤ اور شکر کرو۔ ﴿كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ﴾. الآیۃ نعمت کے استعمال سے منعم کی محبت پیدا ہوتی ہے اور شکر کرنے سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے۔ نیز احادیث سے ثابت ہے کہ اکل حلال سے دعا اور عبادت قبول ہوتی ہے۔ اور اکل حرام سے دعا اور عبادت قبول نہیں ہوتی۔ اکل حلال سے مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! ایمان اور محبت کا یہ مقتضی نہیں کہ تم اپنے خیال سے لذیذ اور پاکیزہ چیزوں کو ترک کر دو اور اس کو عبادت سمجھنے لگو بلکہ مقتضائے ایمان اور محبت یہ ہے کہ جو حلال اور پاک چیزیں ہم نے تم کو عطاء کی ہیں ان کو رغبت سے کھاؤ۔ عاشق تو معشوق کے ہاتھ کی دی ہوئی تلخ چیز کو بھی شیریں سمجھ کر کھاتا ہے تو ہمارے رزق کو اس خیال سے کھاؤ کہ ہم نے تم کو یہ رزق دیا ہے۔ اسباب اور وسائط کو محض پردہ سمجھو اصل مالک اور معطی ہم ہیں۔ عطیہ کے ساتھ بے رغبتی معطی کے ساتھ بے رغبتی کو موہم ہے لہذا منعم حقیقی کی طرف سے جو نعمت آئے اس کو بصد شوق و رغبت استعمال کرو۔ تا کہ منعم تم سے راضی ہو۔ اور یہ مت سمجھو کہ پاکیزہ چیزوں کے استعمال سے حظ نفس میں گرفتار ہو جائیں گے جو عبادت سے غفلت کا سبب بنے گا۔ اس کی تدبیر یہ کرو کہ تم اللہ کا شکر کرو تا کہ تمہاری یہ لذت عین عبادت بن جائے کیونکہ پاکیزہ رزق کھانے سے اللہ کی محبت پیدا ہوگی اور محبت سے شکر نکلے گا اور شکر ایک عظیم عبادت ہے جس سے اللہ کی نعمت اور عنایت میں زیادتی ہوتی ہے اور اس طرح تم لذت کو عبادت بنا سکتے ہو اور اگر تم خالص اللہ کی عبادت کرتے ہو تو اپنے خیال کو اس میں دخل نہ دو اس لیے کہ عبادت سے مقصود رضاء حق ہے وہ جس طرح بھی حاصل ہو۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں   خاک برفرق قناعت بعد ازیں

الغرض پاکیزہ چیزوں کا کھانا ایمان اور محبت کے منافی نہیں۔ البتہ حرام چیزوں کا استعمال اللہ کی ناراضی اور اس سے دوری کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں جز ایں نیست کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف ایسی چیزوں کو حرام فرمایا جو جسمانی اور روحانی حیثیت سے تمہارے لیے مضر ہیں۔ ایک مردار کو جو خود بخود مر گیا ہو یا شرعی طریقہ سے ذبح نہ کیا گیا ہو اور بہتے ہوئے خون کو اور خنزیر کے گوشت کو کیونکہ یہ جانور حرص اور بے حیائی اور بے غیرتی اور نجاست خوری میں مشہور ہے جو قومیں خنزیر کھاتی ہیں ان سے حیا اور عزت و ناموس رخصت ہو جاتی ہے۔ نیز یہ جانور انسان کے فضلہ کو بہت رغبت کے ساتھ کھاتا ہے اور فضلۂ انسانی خنزیر کی خاص خوراک ہے اور اس کا گوشت پوست زیادہ تر فضلۂ انسانی سے پیدا ہوتا ہے لہذا خنزیر کا گوشت کھانا گویا کہ اپنا ہی فضلہ کھانا ہے اور اس لیے حق تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا ﴿فَاِنَّهٗ رِجْسٌ﴾ یعنی یہ نجس العین ہے۔

اور حرام کیا اللہ نے اس جانور کو جو بقصد تقرب غیر اللہ کے نام زد کر دیا گیا ہو جس جانور کی جان کو اللہ کے سوا کسی بت یا کسی نبی یا ولی کی روح کے لیے نذر کر دیا جائے اور ان کی رضا اور خوشنودی کے لیے اس کو ذبح کیا جائے تو اس جانور کا

کھانا حرام ہے اگرچہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو اس لیے کہ جانور کی جان صرف اللہ کی ملک ہے آدمی کی ملک نہیں کہ دوسرے کو بخش دے اس لیے جانور کی جان کو غیر اللہ کے نامزد کر دینا صریح شرک ہے اور ظاہر ہے کہ شرک کی نجاست اور گندگی تمام نجاستوں سے زیادہ سخت ہے لہٰذا جو جانور غیر اللہ کے نام زد کر دیا جائے تو اس شرک کی نجاست اور خباثت اس جانور میں اس درجہ سرایت کر جاتی ہے کہ اگر ذبح کے وقت اللہ کا نام بھی لیا جائے تب بھی وہ جانور حلال نہیں ہوتا جیسے کتا اور سُور خدا کا نام لے کر ذبح کرنے سے بھی حلال نہیں ہوتا۔ آخر مردار اسی وجہ سے تو حرام ہے کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ لہٰذا جو جانور غیر اللہ کے نام زد کر دیا جائے وہ بدرجۂ اولیٰ حرام ہوگا۔ البتہ اگر غیر اللہ کے نامزد کرنے کے بعد ذبح سے پہلے ہی اپنی اس فاسد نیت سے توبہ کر لے اور اس ارادۂ فاسد سے رجوع کر لے تو پھر وہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کرنے سے حلال ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

"لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ"، "اللہ کی لعنت ہے اس شخص پر جو غیر اللہ کی تعظیم اور تقریب کی نیت سے جانور ذبح کرے۔"

لغیر اللہ کے معنی یہ ہیں کہ نیت غیر اللہ کی ہو۔ خواہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لے یا نہ لے۔ اسی طرح ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ جو جانور غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو جس سے مقصود غیر اللہ کی تعظیم ہو وہ حرام ہے خواہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔ یہ لفظ قرآن کریم میں چار جگہ آیا ہے اور سب جگہ ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ فرمایا اور کسی جگہ یہ نہیں فرمایا "مَا ذُبِحَ بِاسْمِ غَيْرِ اللّٰهِ" کہ غیر اللہ کا نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا اور ہے اور غیر اللہ کے تقرب اور رضا حاصل کرنے کے لیے ذبح کرنا اور ہے۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے لغیر اللہ اور باسم غیر اللہ کا فرق معمولی استعداد والوں پر بھی مخفی نہیں۔ "اِهلال" کے لغوی معنی عربی زبان میں شہرت اور آواز دینے کے ہیں۔ لفظ اہلال لغت عرب میں ذبح کے معنی میں نہیں آتا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کے بعد ﴿مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ کو علیحدہ ذکر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ اہلال لغیر اللہ اور شے ہے اور ذبح لغیر اللہ اور شے ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ نے آیت ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر میں ۴۵ صفحہ کا ایک طویل مکتوب تحریر فرمایا ہے جو فارسی میں ہے اور عجیب وغریب حقائق ومعارف پر مشتمل ہے اس وقت ہم اس کا خاص اور اہم اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ وھو ھذا۔

حلت اور حرمت کا دارومدار نیت پر ہے اور ذکر لسانی اس نیتِ قلبی کا ترجمان ہے اس لیے بغیر ذکر لسانی نیت قلبی کی اطلاع ناممکن ہے۔ حدیث میں ہے: "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ"۔ عمل کی حقیقت یہی نیت قلبی ہے اور حرکات خاصہ صورتِ عمل ہیں اگر عمل ہے اور نیت نہیں تو جسم بے جان ہے اور ﴿كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً﴾ کا مصداق ہے۔ معلوم ہوا کہ حلت اور حرمت کی علت ذبح کے وقت فقط زبان سے اللہ یا غیر اللہ کا نام لینا نہیں بلکہ حلت کی اصل علت خاص اللہ کی نیت ہے اور حرمت کی اصل علت غیر اللہ کی نیت ہے اور یہ آیۂ ﴿فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ﴾ میں فقط ذکر لسانی مراد نہیں اس لیے کہ اصل ذکر اور ذکر حقیقی وہ ذکر قلبی ہے اور ذکر لسانی کو اس لیے ذکر کہا

جاتا ہے کہ وہ ذکرِ قلبی کا ترجمان ہے اس لیے کہ اگر کوئی شخص دل سے کسی کی یاد میں محو ہو اور زبان سے ساکت ہو تو وہ ذاکر سمجھا جاتا ہے لیکن اگر زبان سے کسی کا نام لے اور دل میں کوئی اور بسا ہوا ہو تو حقیقت شناس لوگوں کے نزدیک یاد کرنے والوں میں اس کا شمار نہیں ہو سکتا نیت قلبی ایمان کی طرح باطنی ہے اور ذکر لسانی کلمۂ شہادت کی طرح اس کا ترجمان ہے۔ کلمۂ شہادت کو ایمان کی حقیقت نہیں کہا جا سکتا ورنہ لازم آئے گا کہ مؤمن کلمۂ اسلام کے تلفظ کے وقت مومن ہوا اور اس تلفظ سے پہلے مؤمن نہ ہوا اسی طرح جس شخص نے کسی جانور کے متعلق نیت تو غیر اللہ کی کی اور اس جانور کو غیر خدا کے لیے تجویز کر دیا مگر ذبح کے وقت زبان سے نام اللہ کا لیا تو اس کا اعتبار نہ ہوگا اس لیے کہ تقرب غیر اللہ کی نیت کے بعد ذبح کے وقت محض زبان سے اللہ کا نام لینا عمل بے روح ہے۔

مشرکین عرب، نیت بھی غیر اللہ ہی کی کرتے تھے اور ذبح کے وقت بھی نام غیر اللہ کا ہی لیتے تھے اور مؤمنین مخلصین نیت بھی خاص اللہ ہی کی کرتے تھے اور نام بھی خاص اللہ ہی کا لیتے تھے۔ اور مبتدعین نیت تو کرتے ہیں غیر اللہ کی اور ذبح کے وقت نام لیتے ہیں اللہ کا۔ یہ بین بین صورت شرک بھی ہے اور نفاق بھی ہے کہ صورت توحید کی ہے اور معنی شرک کے ہیں۔ اس تیسری قسم کا مصداق اس امت کے مشرک ہیں۔ ﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ﴾.

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر — ایں چنیں تسبیح کے کے دارد اثر

اول کی دو صورتوں میں ظاہر اور باطن میں کوئی تخالف نہیں اس لیے اس کا حکم ظاہر ہے اور اس تیسری صورت میں ظاہر اور باطن میں تخالف ہے اس لیے کہ باطن میں نیت تو ہے غیر اللہ کی اور ظاہر میں ذبح کے وقت نام ہے اللہ کا۔ اس لیے اعتبار ظاہر کا نہ ہوگا۔ ایسا جانور اگرچہ ظاہر میں ﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ﴾ کی قسم سے معلوم ہوتا ہے لیکن باطن اور حقیقت میں ﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ﴾ کے قبیل سے ہے جس کا مقتضی صریح ممانعت اور حرمت ہے ذکر لسانی کو اگر حلت اور حرمت میں دخل ہے تو باعتبار صورت کے ہے اور مرتبۂ ثانیہ میں ہے۔ اور ذکر پنہانی اور نیت اندرونی کو باعتبار حقیقت کے مرتبۂ اولیٰ میں دخل ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ حلت وحرمت میں ذکر لسانی کو تو دخل ہو اور ذکر پنہانی کو اس میں دخل نہ ہو۔ پس جس جانور میں نیت تو غیر اللہ کی ہو اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے تو اس کی حقیقت تو دوسری قسم کی ہوگی اور صورت دوسری قسم کی ہوگی۔ اور جب صورت اور حقیقت میں تعارض اور تخالف ہو تو ترجیح حقیقت کو ہوگی۔

نیز جان کی نذر اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے غیر اللہ کے لیے جان کی نذر جائز نہیں۔ اور اگر بالفرض جان کی نذر غیر اللہ کے لیے جائز ہوتی تو قربانی من جملہ عبادات کے نہ ہوتی اور قربانی اور غیر قربانی کے احکام نیت کے فرق پر مبنی ہیں۔

بطور احتمال عقلی یہاں ایک چوتھی قسم اور بھی نکل سکتی ہے جو اس قسم ثالث کا بالکل عکس ہے وہ یہ کہ نیت تو ہے خاص اللہ کے لیے نذر کی مگر ذبح کے وقت نام لیا جائے غیر اللہ کا یہ قسم آج تک کبھی وجود میں نہیں آئی محض احتمال عقلی کا درجہ ہے وجود نفس الامری سے اس کو کوئی حصہ نہیں ملا۔ نیز جاننا چاہیے کہ آیت شریفہ ﴿وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ﴾ میں اہلال باعتبار زمانہ کے عام ہے وقت ذبح کے ساتھ مخصوص اور مقید نہیں اور جن حضرات مفسرین نے عند الذبح زیادہ فرمایا ہے ان کی مراد تقیید اور تخصیص نہیں بلکہ یہ لفظ اس لیے زیادہ کیا ہے کہ نیت سابقہ کا علم اور ظہور ذبح کے وقت ہوتا ہے۔ اگر اللہ کے تقرب کی نیت ہے

تو ذبح کے وقت اللہ کا نام لے گا۔ اور اگر غیر اللہ کی نیت کی ہے تو ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لے گا۔ نزولِ آیت کے زمانہ میں اللہ کی نذر اور غیر اللہ کی نذر میں امتیاز اور فرق اسی طرح ہوتا تھا کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا تو معلوم ہوا کہ یہ اللہ کی نذر ہے اور غیر اللہ کا نام لیا تو معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی نذر ہے اور مشرکین امت کی یہ تیسری قسم کہ نیت تو ہو غیر اللہ کی اور ذبح کے وقت نام ہو اللہ کا یہ قسم اس زمانہ میں موجود نہ تھی۔ یہ شرک اور توحید کا معجونِ مرکب بعد میں نمودار ہوا۔ یہ بین بین قسم اگر ظاہر اور صورت کے اعتبار سے جائز ہوگی تو باطن اور حقیقت کے اعتبار سے ناجائز ہوگی۔ حاصل یہ کہ عند الذبح کی قید اس زمانے کے دستور کی طرف اشارہ کے لیے ہے احترازی قید نہیں عند الذبح کی قید اس لیے ذکر فرمائی ہے کہ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کسی نے حیوان کو غیر اللہ کے نام زد کیا اور غیر خدا کے تقرب کی نیت کی تو اس جانور کی حرمت اس شرط پر موقوف ہے کہ اس کی یہ نیت ذبح کے وقت تک باقی رہے اور اگر ذبح سے پہلے اس نیت فاسدہ سے توبہ کر لے اور اللہ کے نام پر ذبح کرے تو پھر یہ جانور حرام نہ رہے گا بلکہ حلال ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ عند الذبح کی قید نیت اور فعل ذبح میں مقارنت اور اتصال کے بیان کرنے کے لیے ہے اور تبدل نیت اور تغیر ارادہ سے احتراز کے لیے ہے کہ اگر غیر اللہ کی نیت فعل ذبح کے ساتھ متصل اور مقرون ہے تب تو وہ جانور حرام ہے اور اگر ذبح سے پہلے نیت بدل جائے تو حرمت بھی مبدل بہ حلت ہو جائے گی۔

نیز عند الذبح میں لفظ عند ظرف زمان ہے جو محض اقتران پر دلالت کرتا ہے۔ علیت پر دلالت نہیں کرتا اور حکم حلت و حرمت کا دار و مدار علت پر ہے۔ ظرفیت زمانیہ اور مکانیہ پر اس کا مدار نہیں اور یہاں حرمت کی علت اِھلال لغیر اللہ ہے اور عند الذبح کی قید اھلال اور ذبح میں اقتران بیان کرنے کے لیے ہے یعنی درمیان میں کوئی دوسری نیت فاصل اور متخلل نہیں۔ پس اگر علت یعنی نیت غیر اللہ ابتداء سے اخیر تک یعنی وقت ذبح تک مستمر ہے تو حرمت بھی مستمر ہے اور اگر علت یعنی نیت بدل جائے تو معلول یعنی حرمت بھی بدل جائے گی۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ سے صرف وہی جانور مراد ہیں کہ ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے اور تشہیرِ سابق اور نیت متقدمہ کو حرمت میں کوئی دخل نہیں تب بھی اثبات حلت کے لیے کافی نہیں اس لیے کہ حرمت فقط ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں منحصر نہیں۔ سرقہ اور غصب کا گوشت اور مردار خور جانور کا گوشت بھی حلال نہیں حالانکہ وہ ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں داخل نہیں اسی طرح یہ جانور اگرچہ ﴿مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں داخل نہ ہو تب بھی حلال نہ ہوگا اس لیے کہ فقط غیر اللہ کے تقرب کے نیت حرمت کے لیے کافی ہے۔ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ اَتَمُّ وَاَحْكَمُ۔ (ماخوذ از مکتوب سویم از مکاتب قاسم العلوم)۔

الغرض حق جل شانہٗ نے ان چیزوں کو حرام فرمایا کہ یہ چیزیں گندی اور ناپاک ہیں ان چیزوں کے استعمال سے انسان کا قلب اور اس کی روح گندی اور ناپاک ہو جاتی ہے۔ حلال چیزوں کے کھانے سے قلب میں اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے اور حرام چیزوں کے استعمال سے دل سے اللہ کی محبت رخصت ہو جاتی ہے اور قلب میں بجائے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے معصیت کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ گندگی اور نجاست کا کیڑا گندگی ہی سے زندہ رہتا ہے۔ عطر سونگھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن حق تعالیٰ نے شدید مجبوری کی حالت میں ان چیزوں کی حرمت میں کچھ سہولت اور رخصت عطا فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں پس

جو شخص بھوک سے بہت ہی مجبور اور لاچار ہو۔ اور دل اس کا ان چیزوں کے کھانے سے متنفر اور بیزار ہو پس اگر ایسا شخص ان میں سے کسی چیز کو کھائے بشرطیکہ وہ طالب لذت نہ ہو اور مقدار حاجت سے تجاوز نہ کرنے والا ہو یعنی سدرمق سے زیادہ نہ کھائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اس لیے کہ خبیث اور گندی چیز کا بقدر ضرورت استعمال بحالت مجبوری، کراہت قلب اور دلی نفرت کے ساتھ روح اور قلب کو گندہ نہیں کرتا۔ لیکن آخر گندی چیز تو گندی ہی ہے اس کا کچھ نہ کچھ اثر اور رنگ ضرور آئے گا مگر چونکہ یہ فعل بحالت مجبوری صادر ہوا ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ اس سے مؤاخذہ نہ فرمائیں گے اس لیے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں کہ اس ناچاری کی حالت میں جو گندی چیز استعمال کی ہے اس پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔ اور بڑے مہربان ہیں کہ اس پر بڑا رحم فرمایا کہ اس بے چارگی کی حالت میں کھانے کی اجازت عطا فرمائی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۙ

بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب ف۱ اور لیتے ہیں اس پر تھوڑا سا مول ف۲

جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لیتے ہیں اس پر مول تھوڑا

اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا

وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ ف۳ اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن ف۴ اور نہ

وہ نہیں کھاتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ

ف۱ یعنی اللہ نے جو کتاب آسمانی میں حلال و حرام کا حکم بھیجا یہود نے اس کو چھپایا اور اپنی طرف سے بڑھایا گھٹایا جیسا کہ پہلی آیت میں مذکور ہو چکا ایسے ہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات جو اس میں لکھی تھیں ان کو بھی چھپاتے اور بدلتے تھے اور یہ دونوں سخت گناہ ہیں کیونکہ ان کا مطلب اور نتیجہ یہ ہے کہ ہدایت اور طریقۂ حق کسی کو نصیب نہ ہو، سب گمراہ رہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے تو کتاب اور رسول کو ہدایت خلق کے لئے بھیجا تھا سو انہوں نے خدا کے بھی خلاف کیا اور خلق اللہ کو بھی جاہل اور گمراہ بنانا چاہا۔

ف۲ یعنی اللہ کی نافرمانی اور خلق اللہ کی گمراہی پر بس نہیں کی بلکہ اس حق پوشی کے عوض میں جن کو گمراہ کرتے تھے ان سے الٹا رشوت میں مال بھی لیتے۔ تھے جس کا نام ہدیہ اور نذرانہ اور شکرانہ رکھ چھوڑا تھا حالانکہ یہ حرام خوری مردار اور خنزیر کے کھانے سے بھی بدتر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی حرکات شنیعہ کی سزا بھی سخت ہوگی جس کو آگے بتلایا جاتا ہے۔

ف۳ یعنی گو ظاہر نظر میں ان کو وہ مال لذیذ اور نفیس معلوم ہو رہا ہے مگر حقیقت میں وہ آگ ہے جس کو خوش ہو کر اپنے پیٹ میں بھر رہے ہیں جیسا طعام لذیذ میں زہر قاتل ملا ہوا ہو کر کھاتے وقت لذت معلوم ہوتی ہے اور پیٹ میں جا کر آگ لگا دے۔

ف۴ اس میں یہ شبہ کسی کو ہو سکتا ہے کہ دیگر آیات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جناب باری تعالیٰ قیامت کو ان سے خطاب فرمائے گا سو کلام نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ لطف و رحمت کے ساتھ ان سے کلام نہ کیا جائے گا اور بطور تخویف و تذلیل و تہدید وہ وعید جناب باری تعالیٰ ان سے کلام کریگا جس سے ان کو سخت صدمہ اور غم ہوگا یا یوں کہیے کہ بلاواسطہ ان سے کلام نہ کیا جائیگا اور کلام کرنے کا جو ذکر ہے وہ ملائکۂ عذاب کی وساطت سے ہوگا۔

فائدہ: ﴿وَلَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾ کی دھمکی سے یہ امر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر کسی کے دل میں محبت الٰہی خوب راسخ ہے اگر سردست محسوس نہ ہو تو اس کو بوجہ اکثر بزرگ عالم سمجھنا چاہیے قیامت کو جب کل موانع دور ہو جائیں گے تو اس کا ظہور کامل ہوگا کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر کفار کو یہ دھمکی ایسی ہوگی کہ کوئی اپنے دشمن کو ناخوشی اور اعراض سے ڈرانے لگے جو بالکل بے سود ہے بحان جاں نثار اعراض محبوب کو درد جانگداز کہتے ہیں مدا اداہ بس معلوم ہوا کہ قیامت کو ہر سینہ اللہ کی محبت سے ایسا لبریز ہوگا کہ یہ بے التفاتی عذاب دوزخ سے بھی بدرجہا زیادہ ان کو جانکاہ معلوم ہوگی۔

يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ

پاک کریگا ان کو ف۱ اور ان کے لئے ہے عذاب دردناک ف۲ یہی ہیں جنہوں نے خریدا گمراہی کو بدلے ہدایت کے

سنوارے گا ان کو اور ان کو دکھ کی مار ہے۔ وہی ہیں جنہوں نے خرید کی گمراہی بدلے راہ کے اور مار

وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ

اور عذاب بدلے بخشش کے ف۳ سو کس قدر صبر کرنے والے ہیں وہ دوزخ پر ف۴ یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمائی کتاب

بدلے مہر کے سو کیا سہار ہے اُن کو آگ کی یہ اس واسطے کہ اللہ نے اتاری کتاب

ع ۲۱ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾

سچی اور جنہوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں وہ بیشک ضد میں دور جا پڑے ف۵

سچی اور جنہوں نے کئی راہیں نکالیں کتاب میں وہ ضد میں دور پڑے گیا۔

ذکر محرمات معنویہ مثل دین فروشی وحق پوشی

قَالَ تَعَالَىٰ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ ... الی ... لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں محرمات حسیہ کا بیان تھا۔ اِن آیات میں محرمات معنویہ کو بیان کرتے ہیں جو حرمت میں محرمات حسیہ سے بڑھ کر ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق جو اہل کتاب میتہ اور خنزیر کی حرمت پر اعتراض کرتے ہیں تعجب ہے کہ یہ لوگ اس علم کو چھپاتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لیے اتارا یہ اس علم کو چھپا کر مخلوق کو گمراہ کر رہے ہیں اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اس امانت کی خیانت کے معاوضہ میں دنیا کا معمولی اور حقیر معاوضہ حاصل کر رہے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ جو مال دین کو فروخت کر کے اور حق کو چھپا کر حاصل کیا جائے وہ مردار اور خنزیر سے زیادہ ناپاک ہے ایسے لوگ

ف۱ یعنی اہل ایمان کو کتنے ہی گنہگار ہوں مگر دوزخ میں زمانہ معین تک رہ کر اور گناہوں سے پاک ہو کر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے بخلاف کفار کے کہ وہ ہمیشہ نار میں رہیں گے اور کبھی پاک ہو کر جنت میں جانے کے قابل نہ ہونگے امور شرکیہ نے ان کو بمنزلہ نجس العین کے بنا دیا ہے کہ نجاست ان کی کسی طرح دور نہیں ہو سکتی اور مسلمان عاصی کا حال ایسا سمجھیے کہ پاک چیز پر نجاست واقع ہو گئی نجاست زائل ہو کر پھر پاک ہو گیا۔

ف۲ واقعی اس سے زیادہ اور کیا عذاب الیم ہوگا کہ ظاہر بدن سے بڑھ کر ان کے باطن میں بھی آگ ہوگی اور محبوب حقیقی ان سے ناخوش ہوگا پھر اس مصیبت جانکاہ سے کبھی نجات نہ ملے گی نعوذ باللہ۔

ف۳ یعنی وہ لوگ بیشک اسی قابل ہیں کیونکہ انہوں نے خود سرمایہ نجات کو غارت کیا اور گمراہی کو ہدایت کے مقابلہ میں پسند اور اختیار کیا اور اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو منظور کیا۔

ف۴ یعنی اپنی خوشی سے موجبات دخول نار کو اختیار کرتے ہیں گویا آگ ان کو نہایت مرغوب اور محبوب ہے کہ اپنی جان و مال کے بدلے اس کو خرید رہے ہیں ورنہ سب جانتے ہیں کہ عذاب نار پر صبر کرنا کیسا ہے۔

ف۵ یعنی ضلالت کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے خریدنے کی دلیل یا ان پر عذابات مذکورہ سابقہ کے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل فرمائی انہوں نے اس کے خلاف کیا اور طرح طرح کے اختلاف اس میں ڈالے اور خلاف اور دشمنی میں دور جا پڑے یعنی بڑا خلاف کیا، یا طریقۂ حق سے دور ہو گئے ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان کا صابر علی النار ہونا چونکہ بدیہی البطلان نظر آتا تھا اس لئے لفظ ذٰلک سے اخیر تک اسکے جواب کی طرف اشارہ فرما دیا فافہم۔

اپنے شکموں میں سوائے آگ کے کچھ نہیں بھر رہے ہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بلاواسطہ کلام بھی نہیں کریں گے۔ حالانکہ قیامت کے دن دربارِ عام ہوگا۔ مومن اور کافر، فاسق اور فاجر سب جمع ہوں گے اس دن ہم کلامی کوئی رتبہ اور شرف نہیں رکھتی۔ وہ دن تو عدالت اور فیصلہ کا ہوگا مجرم اور قصوروار بھی اس کا کلام سنیں گے اور لیکن یہ لوگ اس دن بھی کلام الٰہی سے محروم رہیں گے۔ غصہ اور سرزنش بھی بواسطہ فرشتوں کے ہوگی اور نہ اس دن ان کو اللہ تعالیٰ پاک وصاف کرے گا جیسے گنہ گار مسلمانوں کو اس لیے عذاب دیا جائے گا کہ وہ پاک وصاف ہوکر دخول بہشت کے قابل ہوجائیں لیکن ان لوگوں کو اس لیے عذاب دیا جائے گا کہ ہمیشہ تکلیف اور درد اٹھاتے رہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ اور ان کے لیے ہمیشہ کا دردناک عذاب ہوگا۔ یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں اور عذاب کو مغفرت کے بدلہ میں بہ ہزار رضاء ورغبت خرید لیا ہے یہ اس قابل نہیں کہ ان کو پاک کیا جائے اور اللہ کے کلام سے ان کو عزت بخشی جائے یا کم از کم ان کو دردناک عذاب سے نجات ہی دی جائے۔ ان لوگوں نے خود ہی اپنے لیے آگ کو پسند کیا ہے پس شاباش ہو انکی ہمت وجرات پر۔ یہ لوگ آگ پر بڑے ہی صبر کرنے والے ہیں اور تمام سزائیں اس لیے ہیں کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا تاکہ لوگوں پر حق واضح ہو اور تحقیق جن لوگوں نے ایسی کتاب میں بے راہی اختیار کی کہ اس کے مقصود ہی کو بدل دیا۔ اظہارِ حق کی بجائے کتمانِ حق کرنے لگے، تحقیقِ حق کے بجائے تلبیس حق کرنے لگے تو بلاشبہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی کھلی مخالفت میں ہیں کہ جس کتاب کو ہدایت کے لیے نازل فرمایا تھا اس کو گمراہی کا ذریعہ بنالیا۔ اور ظاہر ہے کہ جو منشاء خداوندی کی کھلم کھلا مخالفت کرے وہ ایسی ہی سزاؤں کا مستحق ہوگا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ

نیکی کچھ یہی نہیں کہ منہ کرو اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی ف۱ لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے جو کوئی ایمان لائے

نیکی یہی نہیں کہ منہ کرو اپنے مشرق یا مغرب کی طرف لیکن نیکی وہ ہے جو کوئی ایمان لاوے

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ

اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور دے مال اس کی محبت پر

اللہ پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور دیوے مال اس کی محبت پر

ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ

رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں

ناتے والوں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور راہ کے مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں

ف۱ جب آیات سابقہ اپنی برائی میں سنیں تو یہود ونصاریٰ کہنے لگے کہ ہم میں تو بہت سے اسباب وآثار ہدایت ومغفرت موجود ہیں ایک کھلی بات یہی ہے کہ ہم جس قبلہ کی طرف منہ کرنے کے مامور ہیں اس کی طرف متوجہ ہوکر نماز جو افضل عبادت ہے اس کو اللہ کے حکم کے موافق ادا کرتے ہیں پھر ان خرابیوں اور عذاب کے ہم کیسے مستحق ہو سکتے ہیں اس خیال کی تردید میں فرمایا جاتا ہے کہ بڑی نیکی جو مغفرت وہدایت کے لئے کافی ہو یہ نہیں کہ تم صرف اپنا منہ نماز میں مشرق یا مغرب کی طرف کرلیا کرو اور عقائد واعمال ضروریہ کی پروا بھی نہ کرو۔

وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي

اور قائم رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں اور صبر کرنے والے

اور کھڑی رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب قول کریں اور ٹھہرنے والے

الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت ف۱ یہی لوگ ہیں سچے اور یہی ہیں

سختی میں اور تکلیف میں اور وقت لڑائی کے وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی

الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

پرہیزگار ف۲

بچاؤ میں آئے۔

ابواب البر والصلہ

قَالَ تَعَالٰی: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ... الی... وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

یہاں پہنچ کر سورۂ بقرہ نصف ہوجاتی ہے۔ ابتداء سورت سے یہاں تک کے نصف میں امتِ دعوت کو خطاب تھا۔ یعنی ان لوگوں کو خطاب اور عتاب تھا جو آنحضرت ﷺ کے منکر تھے اور اس میں بھی زیادہ تر خطاب بنی اسرائیل کو رہا جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو خوب جانتے اور پہچانتے تھے مگر چھپاتے تھے اور اقرار نہیں کرتے تھے۔ اور اس اخیر نصف میں امتِ اجابت کو خطاب ہے اور مختلف قسم کے احکام کی تعلیم اور تلقین ہے جو عبادات اور معاملات اور معاشرات وغیرہ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اس طرح سے یہ تفصیل اخیر سورت تک چلی گئی ہے۔

نیز سورۃ کے نصف اول میں زیادہ تر اصول دین اور ایمانیت کا بیان تھا اور اس خیر نصف میں زیادہ تر احکامِ عملیہ کا

ف۱ یعنی نیکی اور بھلائی جو اقرب ہدایت اور سبب مغفرت ہو یہ ہے کہ اللہ اور روز قیامت اور جملہ ملائکہ اور کتب آسمانی اور انبیاء پر دل سے ایمان لائے اور ان پر یقین کرے اور باوجود محبت اور رغبت کے اپنے مال کو علاوہ زکوٰۃ کے قریبوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں اور سائلوں کو جو کہ محتاج ہوں دے اور گردنیں چھڑانے میں یعنی مسلمان جس کو کفار نے ظلماً قید کرلیا ہو اس کی رہائی میں یا مقروض کو قرض خواہ سے چھڑانے میں یا غلام کو آزاد کرانے میں یا غلام مکاتب کو غلامی دلانے میں مال دیوے اور نماز کو خوب درستی کے ساتھ پڑھے اور چاندی اور سونے اور جملہ اموال تجارت میں سے زکوٰۃ دے اور اپنے عہد و اقرار کو پورا کرے اور فقر و فاقہ اور بیماری اور تکلیف اور خوف کی حالت میں صبر و استقلال سے رہے اور یہود و نصاریٰ چونکہ ان عقائد اور اعمال و اخلاق میں قاصر اور ناقص تھے اور طرح طرح سے ان میں خلل اندازی کرتے تھے جیسا کہ آیات قرآنی میں اس کا ذکر ہے تو اب یہود یا نصاریٰ کا صرف اپنے استقبال قبلہ پر ناز کرنا اور اپنے آپ کو طریق ہدایت پر مستقیم سمجھنا اور مستحق مغفرت کہنا بیہودہ خیال ہے تاوقتیکہ ان اعتقادات اور اخلاق و اعمال پر قائم نہ ہوں گے جو اس آیۂ کریمہ میں بالتفصیل مذکور ہیں صرف استقبال قبلہ سے نہ ہدایت نصیب ہوسکتی ہے نہ عذاب الٰہی سے نجات مل سکتی ہے۔

ف۲ یعنی جو لوگ اعتقادات و اخلاق و اعمال مذکورہ کے ساتھ متصف ہیں وہی لوگ سچے ہیں اعتقادات اور ایمان اور دین میں اپنے قول و قرار میں اور وہی لوگ پرہیزگار اور متقی ہیں اپنے اخلاق اور اعمال میں یا بچنے والے ہیں گناہ اور بری باتوں سے یا عذاب الٰہی سے اہل کتاب کہ جن کو ان خوبیوں میں ایک بھی میسر نہیں ان کا اپنی نسبت ایسا خیال کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔

بیان ہے۔ پھر جب ان احکامِ عملیہ کا آغاز فرمایا تو مجملاً ان تمام احکام کو لفظِ بر سے تعبیر فرمایا جو بر بمعنی وسعت سے ماخوذ ہے یعنی احکام عملیہ کا ایک وسیع اور طویل وعریض سلسلہ جو نصف سورت سے شروع ہو کر اخیر سورت تک چلا گیا۔ پھر ان احکام عملیہ کے بیان میں عجیب ترتیب کو ملحوظ رکھا کہ پہلے اصولِ بر کو بیان فرمایا یعنی ایمانیات اور مکارم اخلاق کو بیان کیا جن کا شروع سورت میں یعنی ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ الخ میں اجمالاً ذکر تھا اور پھر فروعِ بر کو بیان فرمایا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام عملیہ کے مجموعہ کو ''ابواب البر والصلہ'' سے موسوم اور ملقب کی جائے جیسا کہ صحیح بخاری میں اس عنوان سے ایک مستقل کتاب اور باب ہے۔ واللہ الهادی الی سواء الطریق وبیدہ ازمۃ التوفیق والتحقیق۔

اصولِ برّ

ربط:...... گزشتہ آیات میں اہل کتاب کی حق پوشی اور رشوت ستانی اور ہدایت کے بدلہ میں ضلالت کو خریدنے کا بیان تھا اب آئندہ آیات میں اس طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب باوجود ان قبائح اور شنائع کے اپنے کو اہل برّ اور ابرار میں سمجھتے اور اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ نجات کے لیے فقط استقبال قبلہ کافی ہے اور یہ سب غلط ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نیکی اور خوبی فقط اس کا نام نہیں کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو لیکن اصل نیکی یہ ہے کہ اپنے دلوں کو اللہ کی طرف پھیر دو اور اس کی رضا اور اطاعت کو اپنا قبلۂ توجہ بناؤ۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک نیک وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے یعنی ذات وصفات میں اس کو یکتا اور یگانہ سمجھے اور آخری دن پر بھی یعنی قیامت کے آنے پر اور فرشتوں پر بھی ایمان لائے۔ فرشتوں پر۔ ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ سمجھے کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں بغیر اس کی مرضی کے کچھ نہیں کرتے تو نور سے پیدا ہوئے کسی کے دو بازو اور کسی کے تین اور کسی کے چار اور کسی کے زیادہ ہیں۔ معصوم ہیں کھانے اور پینے سے پاک ہیں۔ اور تمام آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر بغیر تفریق کے ایمان لائے کہ جن کے واسطہ سے اللہ کے صحیفے اور اس کے احکام ہم تک پہنچے جن میں بعض احکام، گزشتہ احکام کے ناسخ ہیں۔ ان تمام چیزوں کے اعتقاد میں برّ ہے اور اخلاق واعمال میں برّ یہ ہے کہ مال کو باوجود محبوب اور ضرورت مند ہونے کے بلا تخصیص قرابت داروں کو محض حق قرابت کی وجہ سے دے تاکہ صدقہ اور صلہ رحمی دونوں کو جمع کر سکے اور یتیموں کو دے کہ جو بوجہ خردسالی کے کسب معاش نہیں کر سکتے اور بوجہ بے پدری کے کوئی ان کا خبر گیراں نہیں اور ان غریب محتاجوں کو دے کہ جن کی آمدنی اُن کے ضروری خرچ سے کم ہے اور صبر وسکون ① کی وجہ سے نہ وہ کسی سے سوال کرتے ہیں اور نہ اظہار حاجت کرتے ہیں۔ اور مسافروں کو دے جن کے پاس سفر میں خرچ نہ رہا ہو اگرچہ وطن میں مال ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ ابن السبیل سے مسافر مراد ہے اور ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ ابن سبیل سے مہمان مراد ہے۔ اور سوال کرنے والوں کو دے خواہ مسلمان ہو یا کافر۔ اگرچہ ہمیں ان کی حاجت اور ضرورت کا علم نہ ہو۔ اس لیے کہ ظاہر یہی ہے کہ بلا ضرورت کوئی عاقل سوال اور گدائی کی ذلت گوارا نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے حدیث میں ہے

① سکون کے لفظ میں مسکین کے مادہ کی طرف اشارہ ہے اور عدم سوال میں ﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ کی طرف اشارہ ہے۔ نیز حدیث میں ہے: ''لیس المسکین الذی تودہ التمرۃ والتمرتان واللقمۃ واللقمتان ولکن المسکین الذی لا یجد غنی یغنیہ ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سوال کرنے والے کا حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر ہو۔ اور مال دے، گردنوں کے چھڑانے میں۔ یعنی غلاموں کے آزاد کرانے یا مسلمان قیدیوں کے چھڑانے میں جو کافروں کے ہاتھ میں گرفتار ہوں۔ یا قرض داروں کو قرض کی قید سے چھڑانے میں یا قیدیوں کے فدیہ دینے میں اپنا مال خرچ کرے۔

یہ تو حقوق العباد میں بر یعنی نیکی کا بیان ہوا۔ اور حقوق اللہ میں بر اور نیکی یہ ہے کہ نماز کو قائم کرے اور تمام اعضاء سے اللہ کا حق ادا کرے اور زکوٰۃ دے جو کہ مال میں اللہ کا حق ہے۔ یہ وہ خصال بر ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر لازم کی ہیں۔ اب آئندہ آیات میں ان خصال بر کا ذکر فرماتے ہیں کہ جن کو آدمی خود اپنے اوپر لازم کر لے۔ چنانچہ فرماتے اور وہ لوگ بھی نیک ہیں جو اپنے عہد کو وفا کریں جو اللہ سے یا مخلوق سے کیا ہے۔ اللہ سے جو نذر مانی ہے یا کسی سے کوئی عہد کیا ہے اس کا ایفاء لازم ہے لیکن یہ واجب ہے کہ جس وقت عہد کیا ہے اسی وقت نیت وفا کی رکھیں۔ جو شخص عہد کرتے وقت نیت وفا کی رکھے وہ عند اللہ وفا کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ اگرچہ بعد میں کسی مجبوری سے وفاء عہد نہ کر سکے اور جس شخص نے عہد کرتے وقت وفاء کی نیت نہیں کی لیکن بعد میں لوگوں کی ملامت کی وجہ سے اپنے عہد کو پورا کیا تو یہ وفا معتبر نہیں۔ "انما الاعمال بالنیات"۔ اور اہل بر میں ان لوگوں کا خاص طور شمار ہے جو صبر اور تحمل کرنے والے ہیں تنگ دستی اور شدتِ فقر میں اور حالت مرض میں اور لڑائی کے وقت میں۔ انسان پر تین قسم کی مصیبتیں آتی ہیں: مالی اور بدنی اور روحانی۔ فقر مالی مصیبت ہے اور مرض بدنی مصیبت ہے اور لڑائی چونکہ جان کا خطرہ ہے تو وہ روحانی مصیبت ہے اور صابر کامل وہ ہے جو تینوں مصیبتوں میں صبر کرے اور اگر بعض مصیبتوں پر صبر کرے اور بعض پر نہ کرے تو وہ صابر کامل نہیں۔ ایسے ہی لوگ اعتقادات میں سچے ہیں اور ایسے ہی لوگ متقی اور پرہیزگار ہیں جن کے اخلاق اور اعمال درست ہیں ابرار اور اہل بر وہی لوگ ہیں جن میں یہ تمام اوصاف جمع ہوں۔ یہود اور نصاریٰ کو نیکوکاری کا دعویٰ زیبا نہیں اس لیے کہ ان لوگوں کا نہ ایمان درست ہے اور نہ اخلاق و اعمال درست ہیں۔ ایمان باللہ میں تو یہ قصور کیا کہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ نیز یہود نے ﴿يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ کہا اور گوسالہ کو معبود بنایا اور ﴿اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾ کہا۔ اور نصاریٰ اتحاد اور حلول کے قائل ہوئے۔ اور ایمان معاد میں یہ قصور کیا کہ جنت کو اپنے لیے مخصوص کیا ﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ کہا اور ایمان بالملائکہ میں یہ قصور کیا کہ جبرائیل امین علیہ السلام کو اپنا دشمن جانا اور فرشتوں کی عصمت کے منکر ہوئے۔ اور ایمانِ کتب میں یہ قصور کیا کہ دنیاوی منافع کے لیے اللہ کی کتابوں میں تحریف کی اور حق کو چھپایا۔ اور ایمان انبیاء میں یہ قصور کیا کہ دنیاوی منافع کے لیے اللہ کی کتابوں میں تحریف کی اور حق کو چھپایا۔ اور ایمان انبیاء میں یہ قصور کیا کہ انبیاء میں تفریق کی اور بہت سے نبیوں کو قتل کیا اور ان پر اطمینان نہ کیا۔ بات بات میں حضرات انبیاء سے حجتیں اور بحثیں کیں، اور دنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہوئے کہ احکام الٰہی کو رشوت لے کر بدل ڈالا اور دین کو دنیا کے بدلہ میں فروخت کیا اور گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں خریدا۔ اور بدعہدی تو ان کی معروف اور مشہور ہے اور بے صبری یہاں تک پہنچی کہ ﴿لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ کہہ دیا اور بزدلی اس حد تک پہنچی کہ باوجود وعدۂ فتح کے ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ کہہ کر بیٹھ گئے۔ پھر کس بناء پر نیکوکاری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ صحابہ

کو دیکھو کہ ہر چیز میں کامل اور صادق ہیں۔ ایمان میں اور اخلاق میں اور اعمال میں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

ف:...... اس آیت میں برّ کی چھ قسمیں بیان ہوئیں: اول، ایمان کے اصول خمسیہ۔ دوم، ایتاء مال محبوب۔ سوم، اقامۃ صلوۃ۔ چہارم، ایتاء زکوۃ، پنجم۔ وفاء عہد، ششم۔ صبر علی الباساء والضراء وحین الباس۔ پس جس نے ان چھ چیزوں کو مکمل کرلیا اس نے برّ کو مکمل کرلیا اور ابرار کے زمرہ میں داخل ہوگیا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ

اے ایمان والو فرض ہوا تم پر (قصاص) برابری کرنا مقتولوں میں ف۱ آزاد کے بدلے آزاد ف۲ اور غلام کے بدلے

اے ایمان والو! حکم ہوا تم پر بدلا برابر مارے گیوں میں صاحب کے بدلے صاحب اور غلام

بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ

غلام ف۳ اور عورت کے بدلے عورت ف۴ پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی تو تابعداری کرنی چاہیے موافق دستور کے

کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت پھر جس کو معاف ہوا اس کے بھائی کی طرف سے کچھ ایک تو چاہیئے مرضی پر چلنا موافق دستور کے

ف۱ زمانہ جاہلیت میں یہود اور اہل عرب نے یہ دستور کر رکھا تھا کہ شریف النسب لوگوں کے غلام کے بدلے رذیل لوگوں کے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو اور ایک آزاد کے بدلے دو کو قصاص میں قتل کرتے تھے حق تعالیٰ نے اس آیہ میں حکم دیا کہ اے ایمان والو ہم نے تم پر مقتولین میں برابری اور مساوات کو فرض کر دیا۔ قصاص کے معنی لغت میں برابری اور مساوات کے ہیں تم نے جو یہ دستور نکالا ہے کہ شریف اور رذیل میں امتیاز کرتے ہو یہ لغو ہے جانیں سب کی برابر ہیں غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا رذیل، عالم و فاضل ہو یا جاہل، جوان ہو یا بوڑھا اور بچہ تندرست ہو یا بیمار، قریب المرگ صحیح الاعضا ہو یا اندھا لنگڑا۔

فائدہ: پہلی آیہ میں نیکی اور برّ کے اصول مذکور تھے جن پر مدار ہدایت و مغفرت تھا اور اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اہل کتاب ان خوبیوں سے بے بہرہ ہیں اور بالتصریح فرما دیا تھا کہ دین میں سچا اور متقی بدون ان خوبیوں کے کوئی نہیں ہوسکتا تو اب اہل اسلام کے سوا نہ اہل کتاب اس کے مصداق بن سکتے ہیں نہ جہال عرب، اس لئے اب سب سے اعراض فرما کر خاص اہل ایمان کو مخاطب بنایا جاتا ہے اور نیکی اور برّ کے مختلف فروع عبادات جانی و مالی اور معاملات مختلفہ ان کو بتلاتے ہیں کہ ان فروع کو وہی کر سکتا ہے جو اصول مذکورہ سابقہ پر پختہ ہو گویا اور لوگ اس خطاب کے قابل بھی نہ سمجھے گئے جو ان کو سخت عار کا باعث ہونا چاہیئے اب جو احکام فرعی بالتفصیل بیان کئے جاتے ہیں درحقیقت تو ان سے اہل ایمان کی ہدایت اور تعلیم مقصود ہے مگر ضمناً کہیں صاف کہیں تعریضاً دوسروں کی خرابی پر بھی متنبہ کیا جائیگا مثلاً ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى﴾ میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہود وغیرہ نے جو قصاص میں دستور کر لیا ہے یہ ان کا ایجاد بے بنیاد خلاف حکم الٰہی ہے جس سے ظاہر ہوگیا کہ اصول فرمودہ سابقہ میں سے نہ ان کو ایمان بالکتاب صحیح طور پر حاصل ہے نہ ایمان بالانبیاء نہ عہد خداوندی کو انہوں نے وفا کیا اور نہ سختی اور مصیبت کی حالت میں انہوں نے صبر سے کام لیا ورنہ اپنے کسی عزیز و قریب کے مقتول ہو جانے پر اس قدر بے صبری اور نفسانیت نہ کرتے کہ فرمان خداوندی اور ارشاد انبیاء اور حکم کتاب سب کو چھوڑ کر بے گناہوں کو قتل کرنے کا حکم دیتے۔

ف۲ یہ توضیح ہے اس برابری کی جس کا حکم ہوا مطلب یہ ہے کہ ہر مرد آزاد کے قصاص میں صرف وہی ایک آزاد مرد قتل کیا جاسکتا ہے جو اس کا قاتل ہے یہ نہیں کہ ایک کے عوض قاتل کے قبیلہ سے کیف ما اتفق دو کو یا زیادہ کو قتل کرنے لگو۔

ف۳ یعنی ہر غلام کے بدلے میں وہی غلام قتل کیا جائیگا جو قاتل ہے یہ نہ ہوگا کہ کسی شریف کے غلام کے قصاص میں قاتل کو جو کہ غلام ہے اس کو چھوڑ کر ان رذیل لوگوں میں سے کہ جن کے غلام نے قتل کیا ہے کسی آزاد کو قتل کیا جائے۔

ف۴ یعنی ہر ایک عورت کے قصاص میں صرف وہی عورت قتل کی جاسکتی ہے جس نے اس کو قتل کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ شریف النسب عورت کے قصاص میں رذیل عورت کو چھوڑ کر جو کہ قاتلہ ہے کسی مرد کو ان میں سے قتل کرنے لگیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہر آزاد دوسرے آزاد کے اور ہر غلام دوسرے غلام کے برابر ہے سو حکم قصاص میں مساوات چاہیئے اور تعدی جو اہل کتاب اور جہال عرب کرتے تھے ممنوع ہے۔

فائدہ: اب باقی رہا یہ امر کہ آزاد کسی غلام کو یا مرد کسی عورت کو قتل کر دے تو قصاص لیا جائیگا یا نہیں سو یہ آیت کریمہ اس سے ساکت ہے اور آئمہ کا اس میں اختلاف ہے =

وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ

اور ادا کرنا چاہیے اس کو خوبی کے ساتھ ف۱ یہ آسانی ہوئی تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی ف۲ پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد

اور پہنچانا اس کو نیکی سے یہ آسانی ہوئی تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی پھر جو کوئی زیادتی کرے بعد اس کے

ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ

تو اس کے لئے ہے عذاب دردناک ف۳ اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو ف۴ تاکہ

تو اس کو دکھ کی مار ہے اور تم کو قصاص میں زندگی ہے اے عقلمندو ! شاید

تَتَّقُوْنَ ۝

تم بچتے رہو ف۵

تم بچتے رہو۔

فروع بر یعنی احکام عملیہ و فرعیہ کا بیان

قَالَ تَعَالٰی : ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ ... الی ... لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

= امام ابوحنیفہ آیہ ﴿اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ اور حدیث "المسلمون تتکافؤ دماؤھم" سے اس کے قائل ہیں۔ کہ ہر دو صورت مذکورہ میں قصاص ہوگا اور جیسے قوی اور ضعیف صحیح اور مریض معذور اور غیر معذور وغیرہ حکم قصاص میں برابر ہیں ایسے ہی آزاد اور غلام مرد اور عورت کو امام ابوحنیفہ قصاص میں برابر فرماتے ہیں بشرطیکہ غلام مقتول قاتل کا غلام نہ ہو کہ وہ حکم قصاص سے ان کے نزدیک مستثنیٰ ہے اور اگر کوئی مسلمان کافر ذمی کو قتل کر ڈالے تو اس پر بھی قصاص ہوگا امام ابوحنیفہ کے نزدیک البتہ مسلمان اور کافر حربی میں کوئی قصاص کا قائل نہیں۔

ف۱ یعنی مقتول کے وارثوں میں سے اگر بعض بھی خون کو معاف کر دیں تو اب قاتل کو قصاص میں قتل تو نہیں کر سکتے بلکہ دیکھیں گے کہ ان وارثوں نے معاف کس طرح پر کیا۔ ہے بلا معاوضہ مالی محض ثواب کی غرض سے معاف کیا ہے یا دیت شرعی اور بطور مصالحت کسی مقدار مال پر راضی ہو کر صرف قصاص سے دستبرداری کی۔ ہے اول صورت میں قاتل ان وارثوں کے مطالبہ سے بالکل سبکدوش ہو جائیگا اور دوسری صورت میں قاتل کو چاہیے کہ وہ معاوضہ اچھی طرح ممنونیت اور خوشدلی کے ساتھ ادا کرے۔

ف۲ یہ اجازت کہ قتل عمد میں چاہو قصاص لو چاہو دیت لو چاہو معاف کر دو اللہ کی طرف سے سہولت اور مہربانی ہے قاتل اور وارثان مقتول دونوں پر جو پہلے لوگوں پر نہ ہوئی تھی کہ یہود پر خاص قصاص اور نصاریٰ پر دیت یا عفو مقرر تھا۔

ف۳ یعنی اس تخفیف اور رحمت کے بعد بھی اگر کوئی خلاف ورزی کریگا اور دستور جاہلیت پر چلے گا یا معافی اور دیت قبول کر لینے کے بعد قاتل کو قتل کرے گا تو اس کے لئے سخت عذاب ہے آخرت میں یا ابھی اس کو قتل کیا جائے گا۔

ف۴ یعنی حکم قصاص بظاہر نظر اگرچہ بھاری معلوم ہو لیکن عقلمند سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حکم بڑی زندگانی کا سبب ہے کیونکہ قصاص کے خوف سے ہر کوئی کسی کو قتل کرنے سے رکے گا تو دونوں کی جان محفوظ رہے گی اور قصاص کے سبب قاتل اور مقتول دونوں کی جماعتیں بھی قتل سے محفوظ اور مطمئن رہیں گی عرب میں ایسا ہوتا تھا کہ قاتل اور غیر قاتل کا لحاظ نہیں کرتے تھے جو ہاتھ آجاتا مقتول کے وارث اس کو قتل کر ڈالتے تھے اور فریقین میں اس کے باعث ایک خون کی وجہ سے ہزاروں جانیں ضائع ہونے کی نوبت آتی تھی جب خاص قاتل ہی سے قصاص لیا گیا تو یہ تمام جانیں بچ گئیں اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قصاص قاتل کے حق میں باعث حیات اخروی ہے۔

ف۵ یعنی بچتے رہو قصاص کے خوف سے کسی کو قتل کرنے سے یا بچو قصاص کے سبب عذاب آخرت سے یا اس لئے کہ تم کو حکم قصاص کی حکمت معلوم ہو گئی ہے تو اس کی مخالفت یعنی ترک قصاص سے بچتے رہو۔

گزشتہ آیات میں اصولِ برّ کا بیان تھا۔ اب اس کے بعد فروعِ برّ یعنی احکامِ علیہ وفرعیہ کا بیان شروع ہوتی ہے۔ جس میں زیادہ تر احکام جزئیہ کا بیان ہے۔

حکم اول دربارۂ قصاص: ...... اے ایمان والو! ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ کے جو احکام تمہارے لیے لکھ دیے گئے ہیں اُن سے سرمو تجاوز نہ کرو خصوصاً خون کے معاملہ میں خاص صبر سے کام لو اور جوشِ انتقام میں حدودِ شرع سے تجاوز نہ کرو۔ مقتولین بقتل عمد کے بارے میں تم پر مساوات اور برابری فرض کر دی گئی ہے۔ ایک مقتول کو دوسرے مقتول کے برابر سمجھو۔ حسب اور نسب اور علم وفضل وغیرہ وغیرہ کی وجہ سے قصاص میں تامل نہ کرو۔ جاہلیت کے دستور پر نہ چلو۔ جاہلیت کا دستور یہ تھا کہ شریف النسب لوگوں کے غلام کے بدلہ میں رذیل لوگوں کے آزاد قتل کرتے تھے اور ایک عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کرتے اور ایک مرد کے بدلہ میں کئی کئی آدمیوں کو قتل کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امتیاز کو ختم فرمادیا اور حکم دے دیا کہ جانیں سب کی برابر ہیں۔ قصاص کے بارے میں امیر اور غریب، شریف اور رذیل کا کوئی فرق نہیں ورنہ اگر قصاص میں اس قسم کے امتیازات کا لحاظ کیا جائے تو قصاص کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ آزاد برابر ہے آزاد کے۔ اگرچہ ایک امیر یا شریف ہو اور دوسرا فقیر یا رذیل ہو اور غلام برابر ہے غلام کے۔ اگرچہ ایک غلام معمولی آدمی کا ہو اور دوسرا غلام بادشاہ کا ہو۔ اور عورت برابر ہے عورت کے اگرچہ ایک بیگم ہو اور دوسری مزدورنی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ضروری ہے اور جاہلیت کا یہ طریقہ کہ اشراف اپنے غلام کے عوض میں آزاد کو قتل کریں اور اپنی عورتوں کے عوض میں مردوں کو قتل کریں اور ایک مرد کے عوض میں کئی کئی مردوں کو قتل کریں یہ ہرگز درست نہیں۔ جانیں سب برابر ہیں۔

یہ اس آیت کا ظاہری مدلول اور منطوق ہے۔ اور مفہومِ مخالف اس آیت کا یہ ہے کہ غلام آزاد کے برابر نہیں اور عورت مرد کے برابر نہیں سو آیت کریمہ اس کے حکم سے ساکت ہے۔ ائمہ دین کا اس میں اختلاف ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جس طرح غلام بدلہ میں آزاد کے اور عورت بدلہ میں مرد کے قتل کی جائے گی اسی طرح آزاد بدلہ میں غلام کے اور مرد بدلہ عورت کے قتل کیا جائے گا۔ شوافع یہ کہتے ہیں کہ آزاد کو بمقابلۂ غلام اور مرد کو بمقابلۂ عورت قتل نہ کیا جائے گا بلکہ دیت لے لی جائے گی۔ حنفیہ کہتے ہیں ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ سے زمانۂ جاہلیت کی رسم کو باطل کرنا مقصود ہے اور یہ مقصود نہیں کہ غلام آزاد کے برابر نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ باندی اور آزاد عورت میں بھی فرق ہو اور آزاد مرد اور آزاد عورت میں بھی فرق ہو۔ حالانکہ باندی اور آزاد عورت میں بالاجماع کوئی فرق نہیں اور اسی طرح آزاد مرد اور آزاد عورت میں بالاتفاق کوئی فرق نہیں پس جس طرح باندی کا آزاد عورت سے قصاص لیا جاتا ہے اور آزاد عورت کا آزاد مرد سے قصاص لیا جاتا ہے اسی طرح غلام کا آزاد مرد سے بھی قصاص لیا جائے گا۔

نیز شوافع کا یہ استدلال، آیت کے مخالف سے ہے اور مفہوم مخالف کی دلالت اول تو ظنی ہے اور دوم یہ کہ مفہوم مخالف کا اعتبار اسی حد تک درست ہے کہ جب تک وہ مفہوم کسی دوسری نص صریح کے منطوق اور عموم کے منافی نہ ہو اور اس آیت کا مفہوم آیت ﴿اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ اور حدیث المسلمون [1] "تتکافأ دماھم" کے منافی ہے اس لیے جگہ مفہوم مخالف کا اعتبار نہ ہوگا اور ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ الخ سے جو بظاہر قصر مفہوم ہوتا ہے وہ قصر اضافی پر محمول ہوگا۔ رسمِ جاہلیت کے مقابلہ

[1] تمام مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔ ۱۲

میں قصر مراد ہے قصرِ حقیقی مراد نہیں۔

فائدہ:...... جاننا چاہیے کہ مقتولین میں فقط قصاص یعنی فقط جان لینے کے اعتبار سے برابری اور مساوات ہے قتل کی کیفیت میں مساوات اور برابری نہیں۔ مثلاً یہ جائز نہیں کہ آگ سے جلانے والے کو آگ میں جلایا جائے اور پانی میں غرق کرنے والے کو پانی میں غرق کر کے مارا جائے اور اگر کسی نے جادو سے مارا ہے تو اس کو جادو سے مارا جائے۔ اس لیے ﴿فِي الْقَتْلَى﴾ فرمایا "فِي الْقَتْلِ" نہیں فرمایا۔ مقتولین میں برابری ہے۔ کیفیت قتل میں برابری نہیں خوب سمجھ لو۔

اب قصاص کے بعد مسئلۂ عفو کا بیان فرماتے ہیں پس جو شخص کہ اس کے لیے اس کے بھائی کی جانب سے اگر پوری معافی نہ ہو بلکہ کچھ تھوڑی سی بھی معافی ہو جائے بایں طور کہ بعض وارث معاف کر دیں اور بعض نہ کریں تو قاتل سے قصاص ساقط ہو جائے گا اور دیت بذمۂ قاتل واجب ہو جائے گی اس لیے کہ خون کی کوئی شئ منقسم نہیں کہ اس کا بعض حصہ تو لیا جائے اور بعض حصہ کو چھوڑا جائے اس لیے قصاص تو ساقط ہو جائے گا اور جن وارثوں نے خون معاف نہیں کیا ہے۔ ان کو بقدر ان کے حصہ کے دیت دلائی جائے گی۔ ایسی صورت میں قاتل قصاص سے تو بری الذمہ ہو جائے گا البتہ اس کے ذمہ یہ واجب ہوگا کہ معاف کرنے والے کی مرضی کا اتباع کرے جو اس کی مرضی ہو اس کو قبول کرے بشرطیکہ وہ معمول شرع کے مطابق ہو ایسی شرط نہ ہو جو شریعت کے خلاف ہو مثلاً ولیِ مقتول، قاتل سے یہ کہے کہ اس شرط سے معاف کرتا ہوں کہ اپنے لڑکے کو میرا غلام بنائے یا اپنی دختر سے زنا کی اجازت دے۔ پس اس قسم کی غیر معقول شرطیں غیر مقبول ہیں اس میں اتباع ہرگز جائز نہیں اور نیز قاتل کے ذمہ یہ واجب ہے کہ جس چیز کا دینا قبول کیا ہے اس کو نیکی اور سلوک کے ساتھ معاف کرنے والے کی طرف ادا کردے بلا تاخیر کے وقتِ مقررہ پر دیت کی پوری رقم ادا کر دے نہ ٹلائے اور نہ اس کو پریشان کرے اور نہ کوئی دغل وفصل کرے یہ دیت اور عفو کی اجازت تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف ہے اور رحمت اور مہربانی ہے ورنہ جرم کے لحاظ سے تو سوائے سزائے قتل کے اور کوئی گنجائش نہ تھی۔ تخفیف یہ کہ یہود کی طرح قصاص کو واجب اور نصاریٰ کی طرح عفو کو لازم نہیں قرار دیا گیا مہربانی یہ ہے کہ قاتل، اولیاء مقتول کی خوشامد کر کے معاف کرالینے اور ان کو راضی کر لینے سے زندہ رہ سکتا ہے اور وارثانِ مقتول کو اگر حاجت ہو تو مال لے لیں اور اگر ثواب آخرت کے طالب ہوں تو حسبۃً للہ خون معاف کر دیں پس جو شخص اس تخفیف اور رحمت کے بعد حد سے تجاوز کرے مثلاً معاف کرنے اور دیت لینے کے بعد جب قاتل مطمئن ہو جائے تو اس کو قتل کر دے یا قاتل دیت کا وعدہ کر کے فرار ہو جائے تو ایسے شخص کے لیے دردناک عذاب ہے اور قصاص میں اگرچہ بظاہر ایک جان جاتی ہے لیکن اس میں تمہاری بہت سی جانوں کی زندگی ہے۔ ایک جان لینے سے بہت سی جانیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یعنی قصاص میں اگرچہ بظاہر ایک جان جاتی ہے لیکن بہت سی جانیں اس سے محفوظ رہتی ہیں۔ قاتل گناہ سے پاک ہوا اور عذاب سے رہائی پائی اور حیاتِ ابدی اس کو حاصل ہوئی اور مقتول اگرچہ مارا گیا لیکن جب اس کا عوض اور بدلہ لے لیا گیا تو اس کا مرنا رائیگاں نہیں گیا۔ وارثانِ مقتول کے لیے باعثِ عز وجاہ ہوا اور قصاص لے لینے سے وارثوں کا دل ٹھنڈا ہوا غصہ کی آگ بجھ گئی اور آئندہ کے لیے کشت وخون کا سلسلہ بند ہوا فریقین ایک دوسرے سے مطمئن ہو گئے پس اس حکم کا مشروع ہونا خلائق کے لیے موجب رحمت اور سرمایۂ زندگی ہوا اے عقل وفہم والو اگر تم مغز سخن کو دریافت کرنا چاہو اور پوست پر قناعت نہ کرو تو سمجھ لو کہ قصاص سراسر زندگی ہے

البتہ جن لوگوں کی عقل خالص نہیں وہ بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے فقط ظاہر پر اکتفا کرتے ہیں اور قصاص کو اتلاف جان سمجھتے ہیں اور یہ حکم اس لیے مشروع ہوا کہ شاید تم افراطِ غضب سے پرہیز کرو تاکہ غضب خداوندی سے بچ جاؤ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ

فرض کر دیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال وصیت کرنا ماں باپ کے واسطے

حکم ہوا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت اگر کچھ مال چھوڑے کہ دلوا مرے ماں باپ کو

وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ

اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ یہ حکم لازم ہے پرہیزگاروں پر ف۱ پھر جو کوئی بدل ڈالے وصیت کو بعد اس کے جبکہ سن چکا تو

اور ناتے والوں کو دستور سے ضرور ہے پرہیزگاروں کو پھر جو کوئی اس کو بدلے بعد اس کے کہ سن چکا تو اس کا

اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ

اس کا گناہ انہی پر ہے جنہوں نے اس کو بدلا بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے ف۲ پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے والے سے

گناہ انہیں ہی پر جنہوں نے بدلا بیشک اللہ ہے سنتا جانتا پھر جو کوئی ڈرا دلوانے والے کی

جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲/۶

طرف داری کا یا گناہ کا پھر ان میں صلح کرادے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ف۳ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے ف۴

طرفداری سے یا گناہ سے پھر ان میں صلح کروا دے تو اس پر گناہ نہیں البتہ اللہ بخشنے والا ہے مہربان۔

حکم دوم وصیت

قال تعالیٰ: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ... الی... اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

ف۱ پہلا حکم قصاص یعنی مردہ کی جان کے متعلق تھا یہ دوسرا حکم اس کے مال کے متعلق ہے اور کلیات مذکورہ سابقہ میں جو ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى﴾ ارشاد ہوا تھا اس کی تشریح ہے لوگوں میں دستور تھا کہ مردہ کا تمام مال اس کی بیوی اور اولاد بلکہ خاص بیٹوں کو ملتا تھا ماں باپ اور سب اقارب محروم رہتے تھے اس آیہ میں ارشاد ہوا کہ ماں باپ اور جملہ اقارب کو انصاف کے ساتھ دینا چاہیے مرنے والے پر اسی کے موافق وصیت فرض ہوئی اور یہ وصیت اس وقت فرض تھی جس وقت تک آیہ میراث نہیں اتری تھی جب سورۂ نساء میں احکام میراث نازل ہوئے سب کا حصہ خدا تعالیٰ نے آپ معین فرما دیا اب ترکہ میت میں وصیت فرض نہ رہی اس کی حاجت ہی جاتی رہی البتہ مستحب ہے مگر وارث کے لئے وصیت جائز نہیں اور تہائی ترکہ سے زائد نہ ہو ہاں اگر کسی شخص کے متعلق دیون اور ودائع وغیرہ داد و ستد کا جھگڑا ہو اس پر وصیت اب بھی فرض ہے۔

ف۲ یعنی مردہ تو وصیت انصاف کے ساتھ کر مرا تھا مگر دینے والوں نے اس کی تعمیل نہ کی تو مردہ پر کوئی گناہ نہیں وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوا وہی لوگ گنہگار ہو گئے بیشک حق تعالیٰ سب کی باتیں سنتا ہے اور سب کی نیتوں کو جانتا ہے۔

ف۳ یعنی اگر کسی کو مردہ کی طرف سے یہ اندیشہ یا علم ہوا کہ اس نے کسی وجہ سے غلطی کھائی اور کسی کی بے جا رعایت کی یا دیدہ و دانستہ خلاف حکم الٰہی دے گیا۔ پس اس شخص نے اہل وصیت اور وارثوں میں حکم شریعت کے موافق صلح کرادی تو اس کو کچھ گناہ نہ ہوگا وصیت میں یہ تغیر اور ردو بدل جائز اور بہتر ہے۔

ف۴ یعنی حق تعالیٰ تو گنہگاروں کی بھی مغفرت فرماتا ہے تو جس نے اصلاح کی غرض سے ایک برائی سے سب کو ہٹایا اس کی مغفرت تو ضرور فرمائے گا یا یوں کہو کہ بخشنے والا ہے وصیت کرنے والے کو جس نے وصیت ناجائز کی تھی مگر پھر سمجھ کر اس وصیت سے اپنی زندگی ہی میں پھر گیا۔

گزشتہ آیات میں قصاص کو حیات فرمایا۔ آئندہ آیات میں وصیت کا ذکر فرماتے ہیں کہ جو خاندان کی حیات اور زندگی کا سامان ہے۔ شروع اسلام میں جب تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا تو والدین اور اقارب کے لیے وصیت فرض تھی مقدار کی کوئی تعیین نہ تھی۔ وصیت کرنے والے کی صواب دید پر تھا کہ جتنی مقدار مناسب سمجھے اتنی مقدار کی وصیت کر دے اس کے بعد جو باقی بچے وہ سب اولاد کا ہے اس آیت میں اسی حکم کا ذکر ہے اور چونکہ وصیت اور اقارب کی اعانت امر فطری اور جبلی ہے اور ہر ملت و مذہب میں رائج ہے اس لیے اس آیت کو پچھلی آیت کی طرح ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے شروع نہیں فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے موت کسی کے سامنے آجائے بشرطیکہ وہ اتنا مال چھوڑے کہ تجہیز و تکفین کے بعد بچ رہے تو اس پر لازم ہے وصیت کرنا والدین اور دیگر اقارب کے لیے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ وہ وصیت شریعت کے مطابق ہو۔ مثلاً یہ نہ کرے کہ والدین کو نظر انداز کر دے اور دور کے رشتہ داروں کو مقدم کر دے یا فقیر رشتہ دار کو محروم کر دے اور دولت مند کے لیے وصیت کرے غرض یہ کہ جو وصیت شریعت کے مطابق ہو جاتی ہے اس کا پورا کرنا خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ضروری ہے کسی کو اس میں تغیر اور تبدل کا اختیار نہیں پس جو شخص حق لازم کی وصیت سن لینے کے بعد وصیت کے مضمون میں کچھ تغیر اور تبدل کرے اس تغیر و تبدل سے جو حق تلفی ہوگی اس کا گناہ تبدیل کرنے والوں پر ہوگا۔ حاکم اور مفتی نے اگر ظاہر اور قواعد شریعت کی بناء پر فیصلہ کیا ہے اور فتویٰ دیا ہے تو حاکم اور مفتی گناہ گار نہ ہوگا کیونکہ تحقیق اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں تبدیل کرنے والوں کے اقوال کو سنتے ہیں اور اُن کی نیتوں اور ارادوں کو جانتے ہیں اور حاکم اور مفتی کی معذوری کو بھی جانتے ہیں۔ البتہ ایک صورت میں وصیت میں تغیر و تبدل جائز ہے وہ یہ کہ وصیت کرنے والے سے کسی غلطی یا دیدہ دانستہ صریح گناہ کا اندیشہ ہو کہ غیر مستحق کو دے اور مستحق کو محروم کرے یا کسی کو کم اور کسی کو زیادہ دے۔ پس یہ شخص اگر اس وصیت کو درست کر دے یعنی اس وصیت کو شریعت کے مطابق کر دے تو ایسے تغیر و تبدل میں اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑی رحمت فرمانے والے ہیں۔ نیت فاسدہ سے گناہ کرنے والوں کو بھی بخش دیتے ہیں اور جو شخص نیک نیتی سے کوئی تغیر اور تبدل کرے اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی؟

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ

اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے

اے ایمان والو ! حکم ہوا تم پر روزے کا جیسے حکم ہوا تھا تم سے

قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى

اگلوں پر ف ۱ تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ ف ۲ چند روز ہیں گنتی کے ف ۳ پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا

اگلوں پر شاید تم پرہیزگار ہو جاؤ کئی دن ہیں گنتی کے پھر جو کوئی تم میں بیمار ہو یا

ف ۱ یہ حکم روزہ کے متعلق ہے جو ارکان اسلام میں داخل ہے اور نفس کے بندوں اور پرستوں کو نہایت ہی شاق ہوتا ہے اس لئے تاکید اور اہتمام کے الفاظ سے بیان کیا گیا اور یہ حکم حضرت آدمؑ کے زمانہ سے اب تک برابر جاری رہا ہے گو تعیین ایام میں اختلاف ہوا اور اصول مذکورہ سابقہ میں جو صبر کا حکم تھا روزہ اس کا ایک ۲ ارکن ہے حدیث میں روزہ کو نصف صبر فرمایا ہے۔

ف ۲ یعنی روزہ سے نفس کو اس کی مرغوبات سے روکنے کی عادت پڑے گی تو پھر اس کو ان مرغوبات سے جو شرعاً حرام ہیں روک سکو گے اور روزہ سے نفس کی قوت =

سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ

مسافر تو اس پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے ف۱ اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلا ہے ایک فقیر کا کھانا ف۲

سفر میں تو گنتی چاہیئے اور دنوں سے اور جن کو طاقت ہے تو بدلا ایک فقیر کا کھانا

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

پھر جو کوئی خوشی سے کرے نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے ف۳ اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم سمجھ رکھتے ہو ف۴

پھر جو کوئی شوق سے کرے نیکی تو اس کو بہتر ہے اور روزہ رکھو تو تمہارا بھلا ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

حکم سوم صوم

قال تعالیٰ: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ... الی... اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

اے ایمان والو! ایمان کا مقتضی یہ ہے کہ بجائے اہل ایمان کے اپنے نفس موذی کو مارو کہ جو ہر وقت تمہاری تاک میں ہے اور تمہارے خدا کے درمیان سد راہ ہے تمہارا دشمن ہے اور تمہارے جانی اور ایمانی دشمن یعنی شیطان کا دوست بلکہ حقیقی اور جڑواں بھائی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ شیطان اور نفس دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ ساتھ پیدا ہوئے اس لیے ایمان کا مقتضی یہ ہے کہ اس دشمن کو مارو اور روح کو زندہ کرو جو تمہارے پاس فرشتوں کی جنس کی ایک چیز ہے۔ نفس کے مارنے اور روح کے زندہ کرنے کا بہترین طریقہ صبر ہے اور صبر حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ چند روز روزے رکھو قوت شہویہ اور قوت غضبیہ جو تمام

= شہوت میں ضعف بھی آئے گا تو اب تم متقی ہو جاؤ گے بڑی حکمت روزہ میں یہی ہے کہ نفس سرکش کی اصلاح ہو اور شریعت کے احکام جو نفس کو بھاری معلوم ہوتے ہیں ان کا کرنا سہل ہو جائے اور متقی بن جاؤ، جاننا چاہیئے کہ یہود و نصاریٰ پر بھی رمضان کے روزے فرض ہوئے تھے مگر انہوں نے اپنی خواہشات کے موافق ان میں اپنی رائے سے تغیر و تبدل کیا تو ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ میں ان پر تعریض ہے معنی یہ ہونگے کہ اے مسلمانو تم نافرمانی سے بچو یعنی مثل یہود اور نصاریٰ کے اس حکم میں خلل نہ ڈالو۔

ف۳ یعنی چند روز گنتی کے جو زیادہ نہیں روزہ رکھو اور اس سے رمضان کا مہینہ مراد ہے جیسا اگلی آیت میں آتا ہے۔

ف۱ پھر اس مدت قلیل میں بھی اتنی سہولت اور فرما دی گئی کہ جو بیمار ایسا ہو کہ روزہ رکھنا دشوار ہو یا مسافر ہو تو اس کو اختیار ہے کہ روزے نہ رکھے اور جتنے روزے کھائے اتنے ہی رمضان کے سوا اور دنوں میں روزے رکھ لے خواہ ایک ساتھ یا متفرق کر کے۔

ف۲ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی تو طاقت رکھتے ہیں مگر ابتداء میں چونکہ روزہ کی بالکل عادت نہ تھی اس لئے ایک ماہ کامل پے در پے روزے رکھنا ان کو نہایت شاق تھا تو ان کے لئے یہ سہولت فرما دی گئی تھی کہ اگر چہ تم کو کوئی عذر مثل مرض یا سفر کے پیش نہ ہو مگر صرف عادت نہ ہونے کے سبب روزہ تم کو دشوار ہو تو اب تم کو اختیار ہے چاہو روزہ رکھو چاہو روزہ کا بدلا دو ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤ کیونکہ جب اس نے ایک دن کا کھانا دوسرے کو دیدیا تو گویا اپنے نفس کو ایک روز کے کھانے سے روک لیا اور فی الجملہ روزہ کی مشابہت ہو گئی پھر جب وہ لوگ روزہ کے عادی ہو گئے تو یہ اجازت باقی نہ رہی جس کا بیان اس سے اگلی آیت میں آتا ہے اور بعض اکابر نے طعام مسکین سے صدقۃ الفطر بھی مراد لیا ہے معنی یہ ہونگے کہ جو لوگ فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں وہ ایک مسکین کے کھانے کی مقدار اس کو دے دیں جس کی مقدار شرع میں گیہوں کا آدھا صاع اور جو کا پورا صاع ہے تو اب یہ آیت منسوخ نہ ہوگی اور جو لوگ اب بھی یہ کہتے ہیں کہ جس کا جی چاہے روزہ رمضان میں رکھ لے اور جس کا جی چاہے فدیہ پر قناعت کرے خاص روزہ ہی ضرور رکھے یہ حکم نہیں وہ یا جاہل ہیں یا بے دین۔

ف۳ یعنی اگر ایک دن کے کھانے سے زیادہ ایک مسکین کو دے یا کئی مسکینوں کا پیٹ بھر دے تو سبحان اللہ بہت ہی بہتر ہے۔

ف۴ یعنی اگر تم کو روزہ کی فضیلت اور حکمت اور منافع معلوم ہوں تو جان لو کہ روزہ رکھنا فدیہ مذکورہ کے دینے سے بہتر ہے اور روزہ رکھنے میں کوتاہی نہ کرو۔

معاصی کا منبع ہے اس کے کچلنے کے لیے روزہ تریاق اور اکسیر کا حکم رکھتا ہے لیکن یہ روزہ ہنود اور صابئین کی طرح نہ رکھو کہ دن میں تو خود دَر و اشیاء [۱] اور پھل اور میوے کھاتے رہو اور بوقت شب کھانے سے رکو۔ یہ طریقہ شریعت الٰہی کے خلاف ہے بلکہ تم پر روزہ اس طرح فرض کیا گیا جیسے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا کہ مطلقاً کھانے اور پینے اور عورتوں کی صحبت سے دن میں کامل پرہیز رکھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک یہی طریقہ رہا البتہ تعیین ایام میں اختلاف رہا حضرت آدم علیہ السلام پر ہر مہینہ میں تین دن کے روزے یعنی ایام بیض کے فرض تھے۔ یہود پر یوم عاشوراء اور ہفتہ اور اس کے سوا اور چند روز کے روزے فرض تھے۔ نصاریٰ پر ماہ رمضان کے روزے فرض تھے۔

معاذ بن جبل اور ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اور عطاء اور ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ عاشورہ اور ہر مہینہ میں تین دن کے روزے حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک مقرر رہے رمضان کے روزوں کے حکم سے یہ حکم منسوخ ہوا۔ حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ واللہ ہر گزشتہ امت پر پورے ایک ماہ کے روزے فرض رہے جس طرح ہم پر فرض ہیں اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کا روزہ اگلی امتوں پر فرض کیا تھا (رواہ ابن ابی حاتم) الغرض روزہ کی فرضیت قدیم ہے کوئی شریعت اس کی فرضیت سے خالی نہ رہی اس لیے یہ مبارک عبادت تم پر فرض کی گئی تا کہ تم متقی اور پرہیزگار بن جاؤ کیونکہ روزہ کی خاصیت ہی یہ ہے کہ روزہ کی عادت اور کثرت آدمی کو پرہیزگار بنا دیتی ہے اور یہ روزے تم پر شمار کیے ہوئے دنوں کے لیے فرض کیے گئے ہیں جو ایک مہینہ کی مدت ہے نہ بہت کم اور نہ بہت زیادہ اگر بہت کم ہوتی تو تھوڑی مدت کی عبادت سے نفس عبادت کے رنگ سے رنگین نہ ہوتا۔ اور اگر روزہ کی مدت بہت زیادہ ہوتی تو مشقت میں پڑ جاتے اس لیے تھوڑے ہی دنوں کا روزہ تم پر فرض کیا گیا مگر اس میں تمہاری سہولت کی رعایت کی گئی۔ پس ایک سہولت تو یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو جس کی وجہ سے روزہ رکھنا دشوار ہو تو اس کو اجازت ہے کہ روزہ افطار کر لے مگر اتنے دنوں کو شمار کر کے بجائے رمضان کے دوسرے دنوں میں روزہ رکھ لے خواہ مسلسل یا فاصلہ سے اور دوسری سہولت یہ ہے (جو بعد میں منسوخ ہوگئی) کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں مگر باوجود اس کے روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو تو اس کے ذمے اس کا فدیہ یعنی روزہ کا بدلہ دینا ہے اور وہ فدیہ ایک مسکین کی خوراک ہے اس لیے یہ شخص خدا کے لیے خود ترکِ طعام و شراب نہیں کر سکتا تو کسی مسکین ہی کو کھلا دے کہ جب وہ کھا کر عبادت کرے گا تو ثواب میں اس کا بھی حصہ ہو جائے گا اور یہ بدلہ بہت ہی کم ہے۔ ﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ﴾ لیکن جو شخص خوشی سے خیر اور نیکی میں زیادتی کرے یعنی بجائے ایک مسکین کے کئی مسکینوں کو کھانا دے دے تو وہ بھی بہتر ہے جتنی نیکی زیادہ کرو گے اتنا ہی اجر زیادہ ملے گا لیکن تمہارا خود روزہ رکھنا فدیہ سے کہیں بہتر ہے اگرچہ فدیہ مقدار واجب سے کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اگر تم روزہ کے فضائل اور فوائد کو جانتے ہو اور کہ روزہ کس درجہ کی عبادت ہے روح کے زندہ کرنے اور نفس اور شہوات کے کچلنے میں کوئی اس کا بدل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عمل کا اجر محدود ہے مگر صبر اور روزہ کا اجر غیر محدود ہے۔ نماز اور زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی ایک محسوس

[۱] جیسے گاندھی کا طریقہ تھا کہ برت رکھتا تھا۔ روٹی تو نہ کھاتا تھا مگر انار اور انگور اور سیب کا عرق پیتا تھا گویا کہ پوری کھوری سے تو برت ٹوٹ جاتا تھا مگر عرق انار اور انگور سے برت نہ ٹوٹتا تھا۔ ۱۲ ہندوؤں کی برت کو فاقہ کہنا تو جائز ہے مگر اس کو روزہ کہنا ناجائز ہے۔

صورت ہے جو ریاء وغیرہ کے ذریعے سے توڑی جاسکتی ہے مگر روزہ کی کوئی صورت محسوسہ نہیں کہ جس کو توڑا جاسکے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى

مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن راہ پانے کی

مہینہ رمضان کا جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت واسطے لوگوں کے اور کھلی نشانیاں راہ کی

وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى

اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی ف١ سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو ضرور روزے رکھے اسکے ف٢ اور جو کوئی ہو بیمار یا

اور فیصلہ پھر جو کوئی پاوے تم میں یہ مہینہ تو اس کو روزہ رکھے اور جو کوئی ہو بیمار یا

سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ

مسافر تو اس کو گنتی پوری کرنی چاہیے اور دنوں سے ف٣ اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پہ

سفر میں تو گنتی چاہیے اور دنوں سے اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر

الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ

دشواری اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی اور تاکہ

مشکل اور اس واسطے کہ پوری کرو گنتی اور بڑائی کرو اللہ کی اس پر کہ تم کو راہ بتائی اور شاید

تَشْكُرُوْنَ ﴿١٨٥﴾

تم احسان مانو ف٤

تم احسان مانو۔

ف١ حدیث میں آیا ہے کہ صحف ابراہیمی اور توریت اور انجیل سب کا نزول رمضان ہی میں ہوا ہے اور قرآن شریف بھی رمضان کی چوبیسویں رات میں لوح محفوظ سے اول آسمان پر سب ایک ساتھ بھیجا گیا پھر تھوڑا تھوڑا کر کے مناسب احوال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا اور ہر رمضان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام قرآن نازل شدہ آپ کو مکرر سنا جاتے تھے ان سب حالات سے مہینے رمضان کی فضیلت اور قرآن مجید کے ساتھ اس کی مناسبت اور خصوصیت خوب ظاہر ہوگئی اس لئے اس مہینے میں تراویح مقرر ہوئی پس قرآن کی خدمت اسی مہینے میں خوب اہتمام سے کرنی چاہیے کہ اسی واسطے مقرر اور متعین ہوا ہے۔

ف٢ یعنی جب اس ماہ مبارک کے فضائل مخصوصہ عظیمہ تم کو معلوم ہو چکے تو اب جس کسی کو یہ مہینہ ملے اس کو روزہ ضرور رکھنا چاہیے اور بغرض سہولت ابتداء میں جو فدیہ کی اجازت برائے چندے دی گئی تھی وہ موقوف ہوگئی۔

ف٣ اس حکم عام سے یہ سمجھ میں آتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کو بھی افطار وقضا کی اجازت باقی نہیں رہی اور جیسے روزہ کی طاقت رکھنے والوں کو اب افطار کی ممانعت کر دی گئی ایسے ہی مسافر اور مریض کو بھی ممانعت ہوگئی ہو اس لئے مریض اور مسافر کی نسبت پھر صاف فرما دیا کہ ان کو رمضان میں افطار کرنے اور اور دنوں میں اس کے قضا کر دینے کی اجازت اسی طرح باقی ہے جیسے تھی۔

ف٤ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اول رمضان میں روزہ کا حکم فرمایا اور بوجہ عذر پھر مریض اور مسافر کو افطار کرنے کی اجازت دی اور دیگر اوقات میں ان دنوں کی شمار کے برابر روزوں کا قضا کرنا تم پر پھر واجب فرمایا ایک ساتھ ہونے یا متفرق ہونے کی ضرورت نہیں تو اس میں اس کا لحاظ ہے کہ تم پر سہولت رہے دشواری نہ ہو اور یہ بھی منظور ہے کہ تم اپنے روزوں کی شمار پوری کر لیا کرو۔ ثواب میں کمی نہ آجائے اور یہ بھی مد نظر ہے کہ تم اس طریقہ سراسر خیر کی ہدایت پر اپنے =

تعیین ایام معدود

قَالَ تَعَالیٰ: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ... الی... وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

گزشتہ آیات میں بلاتعیین چند دنوں کے روزہ رکھنے کا حکم مذکور تھا اب ان آیات میں حق تعالیٰ شانہ اُن ایام معدودات کی تعیین فرماتے ہیں یعنی وہ شمار کیے ہوئے دن جن میں روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے وہ ماہ رمضان المبارک ہے جس میں قرآن کریم اتارا گیا جو تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور جس میں ہدایت اور امتیاز حق و باطل کی صاف صاف اور نہایت واضح اور روشن دلیلیں اور نشانیاں ہیں جو سوائے قرآن کے اور کسی کتاب میں نہیں۔ توریت اور انجیل بھی نور اور ہدایت تھی اور حق اور باطل میں فرق کرتی تھی مگر قرآن کی طرح واضح اور روشن نہ تھی۔ قرآن کریم کا ہر ہر حرف ہدایت اور امتیاز حق اور باطل کی واضح اور روشن دلیل ہے اسی وجہ سے بینات کو جمع لایا گیا اور ہدیٰ کو مفرد لایا گیا۔ ہدایت کبھی خفی ہوتی ہے اور کبھی جلی اور کبھی آفتاب کی طرح اجلی اور روشن ہوتی ہے۔ ﴿بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کریم ہدایت اور امتیاز حق و باطل میں آفتاب کی طرح روشن ہے توریت و انجیل اس درجہ روشن نہ تھی پس تم میں سے جو شخص یہ مہینہ پائے تو اس کو چاہیے کہ اس کے روزے رکھے جتنا مہینہ پاوے اتنے کے روزے رکھے اگر پورا مہینہ پائے تو پورے مہینے کے روزے رکھے اور اگر کچھ دن پائے تو اتنے دن روزے رکھے غرض یہ کہ جو شخص اس مہینہ کو پائے اس کے ذمہ یہ لازم اور فرض ہے کہ اس مہینہ کے روزے رکھے اور ابتداء میں جو فدیہ کی اجازت دی گئی وہ منسوخ ہوئی اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہے اب ان کو افطار کی اجازت نہیں رہی اس آیت سے فدیہ کا حکم منسوخ ہو گیا اور البتہ مریض اور مسافر کے لیے جو سفر اور مرض کی وجہ سے افطار کی رخصت اور اجازت دی گئی تھی وہ ہنوز اسی طرح باقی ہے کہ جو شخص ایسا بیمار ہو کہ جس کو روزہ رکھنا دشوار ہو یا شرعی سفر پر ہو یعنی سفر میں جتنی مسافت شریعت میں معتبر ہے اتنی مسافت کے سفر کا ارادہ ہو تو ایسے شخص کو رمضان میں افطار کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان کے دوسرے دنوں میں فوت شدہ روزوں کے شمار کے مطابق روزے رکھنا اس پر لازم ہے۔ مریض اور مسافر کے حکم کو اس لیے مکرر بیان کیا گیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ فقط فدیہ کا حکم منسوخ ہوا ہے۔ معذور کے لیے افطار اور قضاء کا حکم منسوخ نہیں ہوا اور قضاء کے حکم میں ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ فرمایا یعنی اور دنوں میں گنتی شمار کے مطابق روزے رکھنے چاہئیں اور دنوں کی قید اس لیے لگائی کہ رمضان کے فوت شدہ روزوں کی قضاء آئندہ رمضان میں جائز نہیں۔ رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں قضاء کے روزے رکھنے چاہیں اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت اور آسانی کرنا چاہتے ہیں اور تم پر سختی اور دشواری نہیں چاہیے اس لیے تم کو مرض اور سفر کی حالت میں افطار کی اجازت دی اور دوسرے دنوں میں فوت شدہ روزوں کے شمار کے مطابق قضاء کا حکم اس لیے دیا کہ تم اپنے روزوں کے شمار کو پورا کرو تا کہ تمہارے ثواب میں کمی نہ رہ جائے اور تم اس شمار کو پورا کر کے متقی اور پرہیزگار بن جاؤ اور اس میں بھی یہ سہولت ہے کہ فوت شدہ روزوں کی قضا خواہ ایک ہی مرتبہ کر لو یا متفرق کر کے رکھ لو دونوں اختیار ہیں اور تا کہ تم اللہ کی کبریائی اور بزرگی بیان کرو کہ اس نے تم کو ایسے

= اللہ کی بڑائی بیان کرو اور اس کو بزرگی سے یاد کرو اور یہ بھی مطلوب ہے کہ ان نعمتوں پر تم شکر کرو اور شکر کرنیوالوں کی جماعت میں داخل ہو جاؤ سبحان اللہ روزہ جیسی مفید عبادت ہم پر واجب فرمائی اور مشقت اور تکلیف کی حالت میں سہولت بھی فرمادی اور فراغت کے وقت میں اس نقصان کے جبر کا طریقہ بھی بتلا دیا۔

طریقہ کی ہدایت کی کہ جس سے تم رمضان المبارک کی فوت شدہ خیرات و برکات کی قضاء سے کچھ تلافی کر سکو۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ سے رمضان کے تیس دن پورے کرنا مراد ہے اور ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ﴾ سے ختم رمضان کے بعد عید کا چاند دیکھ کر اور عید میں جاتے وقت اور عید کی نماز میں تکبیر کہنا مراد ہے جس طرح نماز ● اور حج سے فارغ ہونے کے بعد ذکر خدا مسنون ہے اسی طرح رمضان کے روزوں سے فارغ ہونے کے بعد تکبیر و تحمید مسنون ہے اور تا کہ تم اللہ کا شکر کرو کہ اس نے تم پر ایک مہینہ کے روزے فرض کیے کہ جو درجات عالیہ کے ملنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے اور اس پر بھی شکر کرو کہ اس نے حالتِ مرض اور سفر میں تمہیں افطار کی اجازت دی کہ جس میں تمہارے لیے تخفیف اور سہولت ہے۔ غرض یہ کہ عزیمت بھی نعمت ہے اور رخصت بھی نعمت ہے سب نعمتوں کا شکر کرو تا کہ کامل متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔

نزولِ قرآن اور صیامِ رمضان میں مناسبت:...... نزول قرآن اور صیام رمضان میں مناسبت یہ ہے کہ حق جل شانہ نے اس مہینہ کو قرآن کریم کے نازل کرنے کے لیے پسند کیا اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام معجز نظام کے انوار و تجلیات اور خیرات و برکات کی کوئی حد اور نہایت نہیں۔ محبین اور عاشقین دنیا میں اللہ کے دیدار سے محروم ہیں لیکن اس کے کلام سے دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ کلام کے پردہ سے کچھ اس کا جلوہ نظر آ جاتا ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

چیست قرآں اے کلام حق شناس   رونمائے رب ناس آمد بناس
حرف حرفش راست در بر معنیے   معنیے در معنیے در معنیے

چنانچہ حدیث میں ہے کہ اللہ نے توریت اور انجیل اور زبور اسی مہینہ میں اتاری۔ یکم رمضان المبارک کو حضرت ابراہیم پر صحیفے اور چھ رمضان کو توریت نازل ہوئی اور بارہ رمضان کو زبور اتری اور اٹھارہ رمضان کو انجیل نازل ہوئی اور چوبیس رمضان کی شب کو قرآن کریم نازل ہوا۔

غرض یہ کہ ماہ رمضان عجیب مبارک مہینہ ہے جس میں اللہ کا کلام نازل ہوا اور اللہ کی کتاب اتری جو ایک نعمتِ کبریٰ اور منتِ عظمیٰ ہے۔ لہٰذا اس عظیم الشان نعمت کے شکریہ میں کوئی خاص عبادت اس مہینہ میں مقرر ہونی چاہیے جو کلامِ الٰہی کے مناسب ہو سو وہ روزہ ہے جو روزہ دار کو ترک طعام و شراب اور ترک لذت کی وجہ سے فرشتوں کے قریب بنا دیتا ہے اور قلب میں کلام خداوندی کے اسرار و تجلیات کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کیونکہ بشری اور نفسانی کدورتوں اور ظلمتوں کے دور کرنے اور قلب کے جلا اور صیقل کرنے میں روزہ ایک بے مثال تریاق اور بے نظیر اکسیر ہے انوار و تجلیات کے دسترخوان سے وہی شخص کما حقہ بہرہ اندوز ہو سکتا ہے جس نے اس حسی اور مادی دسترخوان کو کم از کم کچھ دنوں کے لیے لپیٹ کر رکھ دیا ہو۔

● کما قال تعالیٰ: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾۔ پہلی آیت سے نماز جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد ذکر خداوندی کا حکم ہے اور دوسری آیت میں حج سے فارغ ہونے کے بعد ذکر الٰہی کا حکم ہے۔ ۱۲

یہی وجہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر توریت لینے کے لیے گئے تو چالیس دن کے روزے رکھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بیابان میں چالیس روزے رکھے اس وقت اللہ نے ان کو انجیل عطاء کی۔ آنحضرت ﷺ نے غار حراء میں اعتکاف فرمایا اور روزے رکھے۔ اسی غار میں آپ ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوا اور آپ ﷺ کو نبوت و رسالت کا خلعت عطاء ہوا۔ معلوم ہوا کہ روزہ کو کلامِ خداوندی کے ساتھ خاص مناسبت ہے اس لیے اس مبارک مہینہ میں دن میں تو روزہ اور رات میں تراویح مسنون ہوئی اور عشرۂ اخیرہ میں اعتکاف سنت ہوا اور دن اور رات میں قرآن کریم کی تلاوت اور دور کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا۔

حدیث میں ہے جبریل امین رمضان المبارک میں حضور پر نور ﷺ سے قرآن کریم کا دَور کرتے اور جس سال حضور ﷺ کا وصال ہوا اس سال جبریل امین نے پورے قرآن کا حضور ﷺ کے ساتھ دو مرتبہ دور کیا۔ ایک مرتبہ آپ پڑھتے اور جبریل امین سنتے اور دوسری مرتبہ جبریل پڑھتے اور حضور ﷺ سنتے اس طرح دو قرآن کریم کا دو مرتبہ دور ہوا۔ اور یہ مہینہ تمام کا تمام ہی مبارک ہے مگر شب قدر اس مہینہ کا خلاصہ اور لب لباب ہے۔ اسی شب میں قرآن اترا۔ اور اسی میں فرشتوں کا خاص طور سے نزول ہوتا ہے۔ ﴿سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾۔

امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رمضان کا پورا مہینہ نہایت مبارک ہے مگر وہ انوار و برکات جو اس مہینہ کے دنوں سے وابستہ ہیں وہ اور ہیں اور جو خیرات و برکات اس مہینہ کی راتوں سے متعلق ہیں وہ اور ہیں اور ممکن ہے کہ اسی وجہ سے یہ حکم ہوا کہ افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کریں۔ تاکہ دونوں وقتوں میں پورا امتیاز حاصل ہو جائے اور جس طرح قرآن مجید خداوند ذوالجلال کے کمالاتِ ذاتیہ اور شئون صفاتیہ کا مظہر اتم ہے اسی طرح ماہِ رمضان حق تعالیٰ کی خیرات و برکاتِ ذاتیہ کا مظہر اتم ہے اس مہینہ میں جو خیر و برکت بھی نازل ہوتی ہے وہ براہِ راست بارگاہ ذات سے فائض ہوتی ہے قرآن کریم کی طرح یہ مہینہ بھی اپنی نوع میں حقیقتِ جامعہ ہے اسی مناسبت سے اس مہینہ میں قرآن مجید نازل ہوا اور چونکہ درختوں میں کھجور کا درخت شجرۂ طیبہ ہے اور کھجور اس کا ثمرۂ طیبہ اور حقیقتِ جامعہ ہے اور حضرت آدم کے خمیر کا بقیہ ہے اس لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اذا افطر احد کم فلیفطر علی تمر فانه برکة۔" "جو کوئی روزہ افطار کرے تو کھجور سے افطار کرے کیونکہ کھجور سراسر خیر و برکت ہے۔"

اور خلوِ معدہ میں جب یہ مبارک پھل پہنچے گا تو یہی جامع اور مبارک غذا جزو بدن بنے گی جس سے روزہ کی برکتوں میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح روزہ اور غذائے جامع کی برکتوں کے مل جانے سے قلب نورٌ علیٰ نور کا مصداق بن جائے گا اور اسی وجہ سے کہ کھجور ایک نہایت مبارک اور جامع غذا ہے حضور پُرنور ﷺ نے سحری میں بھی کھجور کھانے کی ترغیب دی اور ارشاد فرمایا:

"نعم سحور المؤمن التمر"۔ "کھجور مؤمن کی کیا اچھی سحری ہے۔"

قرآن کریم میں ایمان کو شجرۂ طیبہ یعنی کھجور کے درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور رمضان کا روزہ ایمان کا ایک شعبہ ہے اس لیے رمضان کا افطار اور سحری مرد مؤمن کے لیے کھجور سے مسنون ہوئی۔ اور شب قدر اس مہینہ کا خلاصہ اور زبدہ ہے

گویا کہ شب قدر بمنزلہ مغز کے ہے اور یہ مہینہ پوست کے ہے۔ پس جس کا یہ مہینہ جمعیت خاطر کے ساتھ گذر جائے اور اس مبارک مہینہ کی خیرات و برکات سے بہرہ اندوز ہو جائے تو اس کا تمام سال جمعیت اور خیر و برکت کے ساتھ گزرتا ہے۔ وفقنا الله تعالیٰ للخیرات والبرکات فی هذا الشهر المبارك ورزقنا الله سبحانه النصیب الاعظم منه امین۔ (مکتوب ۱۶۲ دفتر اول)۔

فائدہ جلیلہ: ...... رمضان کی فرضیت سے پہلے عاشورہ کے دن اور ہر مہینہ میں تین دن کے روزے رکھے جاتے تھے اس میں اختلاف ہے کہ وہ روزے فرض تھے یا نفل۔ عبداللہ بن عباس اور معاذ بن جبل اور عطاء رضی اللہ عنہم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روزے فرض تھے اور ابن ابی لیلی رحمہ اللہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نہ تھے بلکہ محض بطور تطوع اور نفل رکھے جاتے تھے۔ اکثر احادیث سے وجوب ہی معلوم ہوتا ہے بہرحال جب رمضان کے روزوں کا حکم آیا تو صوم عاشورہ اور ہر مہینے میں تین روزوں کی فرضیت تو باقی نہ رہی البتہ استحباب باقی رہ گیا اور اس میں بھی ویسا اہتمام نہ رہا جیسا کہ پہلے تھا۔

اسی وجہ سے علماء کا ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ کی تفسیر میں اختلاف ہے بعض صحابہ اور تابعین ادھر گئے ہیں کہ ان گنتی کے دنوں سے عاشورہ اور ہر مہینے کے تین دن روزے مراد ہیں۔ جب رمضان کے روزوں کا حکم آیا تو یہ روزے منسوخ ہو گئے اور جمہور صحابہ و تابعین کا مسلک یہ ہے کہ ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ سے رمضان کے روزے مراد ہیں اور یہ آیت منسوخ نہیں۔ اور صوم عاشورہ اور ایام بیض کا حکم من جانب اللہ نہ تھا بلکہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اجتہاد سے ان دنوں کے روزوں کو پسند فرمایا۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کو دیکھا کہ وہ عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یہ دن بہت مبارک ہے اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دشمن سے نجات دی اور فرعون کو غرق کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بطور شکر یہ اس دن روزہ رکھا۔ اس لیے ہم بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کا حق دار ہوں اس لیے حضور ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (بخاری و مسلم)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد اور ابوداود اور حاکم رحمہم اللہ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے عاشورہ کا روزہ اور ہر مہینہ کے تین روزوں کا واجب ہونا روایت کیا لیکن یہ وجوب اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تھا اور اس آیت سے منسوخ ہو گیا۔

پس معلوم ہوا کہ راجح اور صحیح قول یہی ہے کہ ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ سے رمضان کے روزے مراد ہیں۔ عاشوراء اور ہر مہینہ کے تین روزے مراد نہیں اس لیے کہ افطار کر کے فدیہ دے دینے کی اجازت احادیث اور روایات میں رمضان المبارک کے روزوں کے متعلق آئی ہے۔ عاشورا اور ہر مہینہ کے تین دن کے روزوں کے متعلق فدیہ کا حکم کہیں ثابت نہیں۔

سنن ابوداؤد کی ایک روایت سے یہ ایہام ہوتا ہے کہ ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ﴾ کا حکم عاشورہ اور ہر مہینہ کے تین روزوں کے متعلق ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ روایت مختصر ہے۔ دوسری مفصل روایت میں رمضان کے روزوں کا مفصل ذکر ہے اور ﴿عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کا حکم رمضان ہی کے روزوں سے متعلق ہے اس روایت میں رمضان کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایہام ہوا۔ واللہ اعلم

اقوال علماء کرام در بارہ تفسیر آیت فدیہ صیام

قال تعالیٰ: ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾

اس آیت کی تاویل اور حکم میں علماء کا اختلاف ہے آیت مذکورہ کے متعلق علماء تفسیر کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں اس آیت کا حکم اب بھی باقی ہے اس فریق سے آیت کی مختلف توجیہات منقول ہیں جن کو ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

گروہ اول:...... اکثر علماء محققین کی رائے یہی ہے کہ آیت میں نسخ ضرور واقع ہے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے یہی منقول ہے اور بخاری اور مسلم اور ابوداؤد و بیہقی وغیرہم کی احادیث اور روایات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ابتداء اسلام میں لوگوں کو اختیار تھا کہ اگر روزوں کی ہمت ہو تو روزے رکھیں ورنہ روزہ افطار کر لیں اور روزہ کے بدلہ میں فدیہ دے دیں۔ وجہ یہ تھی کہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہ تھے اگر ابتداء ہی سے روزہ کا قطعی حکم ہو جاتا تو شاق ہوتا بعد چندے یہ اختیار منسوخ ہو گیا اور ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ﴾ سے روزہ رکھنے کا حکم قطعی ہو گیا۔ چنانچہ حافظ بدرالدین عینی شرح بخاری میں آیاتِ صیام کی ترتیب نزولی اور ناسخ و منسوخ کی تعیین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کانَ فی بدء الاسلام فرض علیهم الصوم فاشتد علیهم فرخص لهم فی الافطار والفدیة وقال معاذ کان فی ابتداء الامر من شاء صام ومن شاء افطر واطعم عن کل یوم مسکینا حتی نزلت الأیة التی بعدها فنسختها"۔ (عینی شرح بخاری: ۱/۲۷۴)

"شروع اسلام میں روزے فرض ہوئے لیکن (عادت نہ ہونے کی وجہ سے) لوگوں پر گراں گزرے تو افطار کر کے فدیہ دے دینے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ شروع اسلام میں جو چاہتا روزہ رکھتا اور جو چاہتا افطار کرتا اور اس کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا۔ یہاں تک کہ اس کے بعد کی آیت نازل ہوئی اور یہ حکم منسوخ ہو گیا۔"

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ بروایت ابن ابی لیلیٰ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

"ان رسول الله صلی الله علیه وسلم لما قدم علیهم امرهم بصیام ثلثة ایام من کل شهر تطوعا غیر فریضة قال ثم نزل صیام رمضان قال وکانوا قوما لم یتعودوا الصیام قال وکان یشتد علیهم الصوم قال فکان من لم یصم اطعم مسکینا ثم نزلت هذه الأیة ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ فکانت الرخصة للمریض والمسافر وامرنا بالصیام۔"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ آئے تو اپنے صحابہ کو ہر مہینہ میں تین دن کے روزوں کا حکم دیا مگر بطور فرض نہیں بلکہ بطور نفل حکم دیا۔ اس کے بعد رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا مگر چونکہ لوگ روزہ رکھنے کے

عادی نہ تھے اس وجہ سے ان کو روزہ رکھنا گراں ہوا تو یہ سہولت کردی گئی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک فقیر کو کھانا کھلادے چنانچہ کچھ عرصہ تک لوگ ایسا ہی کرتے رہے کہ جو شخص روزہ نہ رکھتا وہ ایک فقیر کو کھانا کھلا دیتا چند روز کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ الی آخرہٖ۔ اس وقت سے صرف مریض اور مسافر کو تو روزہ مؤخر کرنے کی اجازت ہوگئی باقی ہم سب کو روزہ ہی رکھنے کا حکم ہوگیا اور افطار کرکے فدیہ کی اجازت نہ رہی۔"

یہی مضمون بخاری شریف اور اکثر کتب تفاسیر میں موجود ہے۔ اس مضمون کے ذہن نشین ہوجانے کے بعد تمام روایتیں بے تکلف منطبق ہوجاتی ہیں اور آیت کا صحیح مطلب واضح ہوجاتا ہے کہ سب سے پہلے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ﴾ کا حکم نازل ہوا اور اس سے رمضان کے روزے فرض ہوئے مگر مریض اور مسافر کو اجازت ہوئی کہ اگر مرض اور سفر کی وجہ سے افطار کریں تو بعد میں اتنے ہی دن روزے رکھ لیں۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم چونکہ روزوں کے عادی نہیں اگر مشقت کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکیں تو اس کی مکافات کی کیا صورت ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ﴾ کہ جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہوں مگر مشقت کی وجہ سے افطار کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اس کی اجازت ہے کہ افطار کرلیں اور ایک فقیر کا کھانا دے دیں لیکن بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھیں۔ ﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾۔ اس کے بعد جب حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روزہ کے خوگر ہوگئے اور روزہ رکھنا ان پر شاق اور گراں نہ رہا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ﴾۔ یعنی جب رمضان المبارک کا مہینہ آئے تو ہر شخص پر روزہ رکھنا فرض اور لازم ہے اب کسی کو اس کی اجازت نہیں رہی کہ مشقت کی وجہ سے روزہ افطار کرلے اور ایک مسکین کو کھانا کھلادے البتہ مریض اور مسافر کو اجازت دی گئی کہ مرض اور سفر کی وجہ سے روزہ افطار کرے اور بعد میں اس کی قضاء کرلے وہ اجازت اسی طرح اب بھی باقی ہے فقط افطار اور فدیہ کی رخصت منسوخ ہوئی ہے مریض اور مسافر کی رخصت منسوخ نہیں ہوئی۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک یہی حکم اور اسی پر عمل درآمد رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین سے لے کر اب تک تمام علماء اور فقہاء کا فتویٰ اور تمام روئے زمین کے مسلمانوں کا یہی عمل رہا۔

ایک شبہ: ...... یہاں پہنچ کر شاید کسی کو یہ خیال آئے ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ کا عطف پہلے جملہ پر ہے اور یہ جملہ پہلے کے ساتھ غایت درجہ مربوط اور متعلق ہے لہٰذا یہ کہنا کہ اول ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ کا حکم نازل ہوا اور جب صحابہ نے شدت اور مشقت کی شکایت کی اور تو یہ دوسرا جملہ ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾۔ نازل ہوا اس جملہ کو پہلے کلام سے جدا کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

جواب: ...... یہ ایسا ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی ﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ الخ تو حضرت عبداللہ بن ام

مکتوم ؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں تو نابینا ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہوسکتا۔ ان کے شکوہ کے جواب میں ﴿غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ﴾ کے الفاظ اور نازل ہوگئے۔ اور جس طرح ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ﴾ کے نازل ہونے کے بعد بعض لوگوں نے ظاہری معنی سمجھ کر تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھنے شروع کر دیے تو اس اشتباہ کے زائل کرنے کے لیے ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا نزول ہوا۔

پس جس طرح ﴿غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ﴾ اور ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا باوجود ماقبل کے ساتھ شدید تعلق ہونے کے جداگانہ نزول ہوسکتا ہے اسی طرح ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ﴾ کا بھی باوجود ماقبل سے مربوط ہونے کے علیحدہ نزول ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ اور ﴿غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ﴾ نہ مسند ہے اور نہ مسند الیہ بلکہ متعلقات میں سے ہے ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾ تو یہ پورا جملہ ہے پس جب کہ الفاظ مفردہ کا علیحدہ نزول جائز اور واقع ہے تو پورے جملہ کے علیحدہ نزول میں کیوں اشکال ہے۔ حق تعالیٰ ہی آیات کے نزول فرمانے والے ہیں آیات کو متفرقاً نازل فرماتے ہیں اور پھر مطلع فرمادیتے ہیں کہ اس آیت کو فلاں جگہ رکھا جائے اور اس آیت کو فلاں جگہ۔ اور اس مفرد اور اس جملہ کا فلاں مفرد اور فلاں جملہ سے تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نزول کی ترتیب اور ہے اور موجودہ مصحف کی ترتیب اور ہے اور اس وقت جس ترتیب سے قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے یہ بعینہ وہی ترتیب ہے کہ جس ترتیب سے جبریل امین حضور پرنور ﷺ سے ہر رمضان میں دور فرماتے تھے۔

حق تعالیٰ شانہ نے اپنی حکمت بالغہ اور رحمت کاملہ سے بہت سے احکام میں بندوں کو بتدریج سہولت کے ساتھ احکام کا مکلف بنایا۔ جس طرح ابتداء اسلام میں نماز میں سہولتیں تھیں، سلام وکلام بھی نماز میں جائز تھا بعد میں شریک ہونے والا اپنے قریبی نمازی سے پوچھ لیا کرتا تھا کہ کتنی رکعتیں ہوچکی ہیں۔ مگر بعد میں یہ تمام سہولتیں اور رخصتیں یک لخت منسوخ ہوگئیں۔

اسی طرح روزے کے احکام میں بتدریج اور سہولت کو مرعی رکھا گیا بالآخر جب صحابہ کرام کے نفوس قدسیہ حق جل وعلا کے انوار وتجلیات سے روشن ہوگئے اور روزہ کی طبعی مشقت اور گرانی بھی دل سے بالکل نکل گئی تو اب ہمشہ کے لیے یہ حکم قطعی آگیا کہ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ اور اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرام کی یہ کیفیت ہوئی کہ روزہ کی شدت اور مشقت مبدل بہ فرحت ولذت ہوگئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضور پرنور ﷺ تو مسلسل روزہ رکھنے کی ممانعت فرماتے ہیں۔ اور صحابہ کرام ؓ صوم وصال اور صائم الدہر ہونے پر اصرار کرتے تھے۔

رفع تعارض:...... اس مقام پر صحیح بخاری کی روایات میں بظاہر کچھ تعارض کا شبہ ہوتا ہے کہ بعض روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت فدیہ کا ناسخ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ ہے اور بعض روایات سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آیت فدیہ کا ناسخ ﴿وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ﴾ کی آیت ہے۔

جواب:...... یہ ہے کہ حضرات محدثین بسا اوقات اپنے مدعا کے ثابت کرنے کے لیے آیت کا ابتدائی حصہ نقل کر کے چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ آیت کے ابتدائی حصہ کو مدعا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن درحقیقت اس سے پوری آیت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ تم اس آیت کو اخیر تک پڑھ جاؤ محل استشہاد خود تمہارے سامنے آجائے گا۔ اور تم خود ہی اسکو متعین کرلو گے۔ جیسا کہ امام

ترمذی نے ''باب ان فی المال لحقا سوی الزکوۃ'' میں یہی حدیث لانے کے بعد استشہاد میں آیت ﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ﴾ الخ لکھ کر چھوڑ دی۔ حالانکہ آیت کے اس ابتدائی جملہ کو باب سے کوئی تعلق نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس آیت کو اخیر تک پڑھ لو۔ اور جب تم ﴿وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ﴾ پر پہنچو گے تو موقعۂ استدلال خود تمہارے سامنے آجائے گا اسی طرح ﴿وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ﴾ سے فقط یہی الفاظ مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ تم اس آیت کو اخیر تک پڑھتے چلے جاؤ اور جب تم ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ پر پہنچو تو مکمل استدلال کو سمجھ لو اور متعین کر لو کہ فدیہ کا اصل نسخ اس آیت سے ہوا ہے۔ ﴿وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ﴾ اس کی تمہید تھی۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ دونوں ہی آیتیں حکم فدیہ کی ناسخ ہیں۔ یعنی ہر آیت سے فدیہ کا نسخ معلوم اور مفہوم ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ ﴿وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ﴾ میں لفظ ''خیر'' واقع ہوا ہے جو استحباب اور فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔ وجوب اور لزوم پر دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ گزشتہ تخییر کے لیے کیسے ناسخ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ خیر کا لفظ کبھی وجوب اور لزوم کے موقعہ پر بھی مستعمل ہوتا ہے جیسے ''وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ انْتَهُوا خَيْرًا لَكُمْ'' تثلیث سے باز آجانے کو خیر فرمایا حالانکہ یہ کسی کا مذہب نہیں کہ جائز تو تثلیث بھی ہے مگر ترک تثلیث، تثلیث سے افضل اور بہتر ہے اس آیت میں خیر کا لفظ شر کے مقابلہ میں ہے فرض اور واجب کے مقابلہ میں نہیں۔ خوب سمجھ لو۔

دوسرا گروہ:...... اور علماء کی ایک جماعت کا یہ مسلک ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ اس گروہ نے آیت کی مختلف توجیہات کی ہیں۔

توجیہ اول:...... پہلی توجیہ یہ ہے کہ ''يُطِيقُونَ'' کا مادہ طاقت ہے جس کے معنی کسی پر نہایت مشقت اور محنت کے ساتھ قادر ہونے کے ہیں۔ اور سہولت قادر ہونے کو ''وُسع'' کہتے ہیں تو اب آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ جو لوگ روزہ رکھنے پر بدقّتِ تمام قادر ہوں جیسا کہ شیخ کبیر اور عجوز یعنی بہت بوڑھا مرد اور بہت بوڑھی عورت۔ ان کے لیے اجازت ہے کہ روزہ افطار کر لیں اور اس کے بدلہ میں فدیہ ادا کر دیں اور اس معنی کی تائید ایک قرأت سے بھی ہوتی ہے جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ وہ یہ کہ بجائے ''يطيقونه'' کے ''يُطَوَّقُونَهُ'' پڑھتے تھے جس کے معنی ''بہ تکلف'' اور بہ مشقت روزہ رکھنے کے ہیں اس لیے مناسب ہے کہ ''يطيقونه'' کی قراءت کے بھی یہی معنی لیے جائیں تاکہ دونوں قراءتوں مطابق اور ہم معنی ہو جائیں۔ رہا یہ سوال کہ ''يطيقونه'' کا لفظ باعتبار لغت کے بھی اس معنی کا متحمل ہو سکتا ہے یا نہیں سو اس کے لیے علامہ زمخشری کا کلام پیش کر دینا کافی ہے کہ جو لغت عربیت میں عرب اور عجم کا مسلّم شیخ اور امام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''ويجوزان يكون هذا معنى يطيقونه اى يصومونه جهدهم وطاقتهم ومبلغ وسعهم''۔ (کشاف: ۱/۲۴۸) ''اور ہو سکتا ہے کہ ''یطیقونہ'' کے معنی لیے جائیں کہ جو لوگ نہایت مشقت اور انتہائی محنت کے ساتھ روزہ رکھ سکیں۔''

اس کے بعد غایت سے غایت کوئی یہ کہے گا کہ یہ معنی مجازی ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں حقیقی معنی مراد لینا اگر متعذر ہوں تو بالاجماع مجازی معنی مراد لینا ضروری ہو جاتے ہیں۔ جس کے شواہد قرآن کریم اور حدیث نبوی اور کلام عرب میں بے شمار ہیں اور قرینۂ مجاز اس مقام پر یہ ہے کہ تمام امتِ محمدیہ کے علماء اور فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ ایک صحیح سالم تندرست آدمی کے

لیے ہرگز اجازت نہیں کہ وہ فی یوم ایک مسکین کو کھانا دے کر روزہ سے رستگاری حاصل کرے ورنہ روزہ کا حکم فقط غرباء و فقراء کی حد تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور امراء اور اغنیاء تمام کے تمام فدیہ دے کر روزہ کی فرضیت سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

دوسری توجیہ:...... شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یطیقون سے پہلے ایک لا مقدر ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے جیسا کہ ﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ میں بالاتفاق "لا تضلوا" کے معنی مراد ہیں اور "لا" مقدر ماننے کی تائید ایک قراءت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے "لَا يُطِيْقُوْنَهٗ" پڑھا ہے۔ حضرات اہل علم کشف الاسرار [11] بزدوی: ۱۵۱/۱ کی مراجعت کریں۔

تیسری توجیہ:...... حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ نے اس آیت کی ایک لطیف توجیہ فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک یطیقونہ کی ضمیر مفعول، صوم کی طرف راجع نہیں۔ بلکہ یہ ضمیر طعام کی طرف راجع ہے۔ جو کہ لفظوں میں مؤخر ہے مگر رتبۃً مقدم ہے کیونکہ ﴿عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ خبر مقدم ہے اور فدیہ مبتداء مؤخر ہے اور طعام مسکین مبتداء سے بدل ہے۔ پس جس طرح مبتداء رتبۃً مقدم ہے اگرچہ لفظوں میں مؤخر ہے۔ اسی طرح مبتداء کا بدل بھی رتبۃً مقدم ہوگا۔ اور فدیہ سے مراد صدقۃ الفطر ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے روزوں کی فرضیت بیان فرمائی اور اس آیت میں روزوں کے بعد صدقۃ الفطر کا ذکر فرمایا۔ اور اس سے اگلی آیت میں روزوں کے بعد تکبیرات عید کی طرف اشارہ فرمایا، ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ اب آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جو روزہ دار کھانا دینے کی طاقت رکھتے ہیں رمضان گزرنے کے بعد وہ صدقۃ الفطر بھی ادا کریں۔"

خلاصہ کلام:...... یہ کہ اگر یہ آیت صحیح اور تندرست کے بارے میں ہے تو منسوخ ہے اور اگر شیخ فانی اور عاجز کے حق میں ہے تو آیت محکم ہے اور شیخ فانی اور عاجز کے لیے اب بھی یہی حکم ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ

اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے

اور جب تجھ سے پوچھیں بندے میرے مجھ کو تو میں نزدیک ہوں پہنچتا ہوں پکارتے کی پکار کو جس وقت مجھ کو پکارتا ہے

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

تو چاہیے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آئیں ف ۱

تو چاہیے کہ حکم مانیں میرا اور یقین لاویں مجھ پر شاید نیک راہ پر آویں۔

ف ۱ شروع میں یہ حکم تھا کہ رمضان میں اول شب میں کھانے پینے اور عورتوں کے پاس جانے کی اجازت تھی مگر سو رہنے کے بعد ان چیزوں کی ممانعت تھی۔ بعض لوگوں نے اسکے خلاف کیا اور سونے کے بعد عورتوں سے قربت کی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر عرض کیا اور اپنے قصور کا اقرار اور ندامت کا اظہار کیا اور توبہ کی نسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو اس پر یہ آیت اتری کہ تمہاری توبہ قبول کی گئی اور احکام خداوندی کی اطاعت کی تاکید فرمادی گئی اور حکم سابق منسوخ فرما کر آئندہ کو اجازت دیدی گئی کہ تمام شب رمضان میں صبح صادق سے پہلے کھانا وغیرہ تم کو حلال ہے جس کا ذکر اس کے بعد کی آیت میں آتا ہے اور آیت سابقہ=

[11] کشف الاسرار کی عبارت یہ ہے: قال تعالیٰ: ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ كان ذلك في بذا الاسلام فرض عليهم=

ترغیب دعا بعد تلقین تکبیر وثناء

قَالَ اللهُ تَعَالٰی: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ... الی... لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾

گزشتہ آیات میں اللہ کی تکبیر اور ثناء کا بیان تھا اب اس آیت میں دعا کا بیان ہے کہ دعا سے حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور دعا سے پہلے تکبیر اور ثناء کا بیان اس طرف مشیر ہے کہ دعا کا ادب اور طریقہ یہ ہے کہ پہلے خدا تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے اور پھر اپنی حاجت کی درخواست کی جائے انبیاء کرام کا یہی طریقہ رہا ہے اور عجب نہیں کہ اس طرف بھی اشارہ ہو کہ ماہ رمضان قبولیت دعا کا مہینہ ہے اس کو غنیمت سمجھو دعا کو روزہ کے ساتھ خاص مناسبت اور خاص تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ دار کی دعا بہ نسبت غیر روزہ دار کے زیادہ قبول ہوتی ہے جیسا کہ احادیث میں بکثرت آیا ہے۔ اس لیے احکام صیام کے دوران میں دعا کا ذکر نہایت مناسب ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور جب استفسار کریں آپ سے میرے بندے میرے متعلق کہ ہمارا پروردگار ہم سے قریب ہے یا بعید اگر قریب ہے تو اس سے مناجات کریں اور اگر دور ہے تو ہم اس کو پکاریں تو آپ ان کے جواب میں میری طرف سے یہ کہہ دیجئے کہ تحقیق میں تو تم سے بہت ہی نزدیک ہوں تمہاری جان اور وجود سے بھی زیادہ قریب ہوں تم کو دیکھتا ہوں اور تمہاری آواز بلا تشویش علیحدہ علیحدہ سنتا ہوں تم مجھ کو نہیں دیکھتے اس لیے تم مجھ کو دور سمجھتے ہو ورنہ حقیقت میں میں تم سے بہت قریب ہوں۔ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جس وقت بھی وہ مجھ سے درخواست کرے بشرطیکہ وہ مناسب بھی ہو اور کسی حکمت اور مصلحت کے خلاف بھی نہ ہو جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ﴾ اگر خدا تعالیٰ چاہتا ہے تو دعا کو منظور کرتا ہے ورنہ نہیں۔ پس گزشتہ آیت کو جو اجابت دعا کے حق میں مطلق ہے اس دوسری آیت پر جو مقید ہے محمول کرنا چاہیے۔ پس بندوں کو بھی چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین لائیں تاکہ رشد اور ہدایت پائیں اور میں بے نیاز اور غنی مطلق ہوں اور پھر بندوں کی درخواست سنتا ہوں اور اے بندو! تم میرے من کل الوجوہ محتاج ہو تم کو چاہیے کہ میرا قرب اور رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی ہر حاجت میرے سامنے پیش کرو اور میری باتوں کا یقین رکھو اور میرے احکام کو قبول کرو۔ اللہ سے مانگنا یہی ہدایت اور رشد کا راستہ ہے۔

ف ۱:...... جس طرح حق تعالیٰ کی ذات اور صفت بے چون وچگون ہے اور حیطۂ عقل سے بالاتر ہے اسی طرح اس کا قرب بھی

= میں جو بندوں پر سہولت اور عنایت کا ذکر تھا اس قرب واجابت واباحت سے اس کی بھی خوب تاکید ہوگئی۔ اور ایک تعلق کی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی آیت میں تکبیر اور اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا حکم تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض نے پوچھا کہ ہمارا رب دور ہے تو ہم اسکو پکاریں یا نزدیک ہے تو آہستہ بات کریں اس پر یہ آیت اتری یعنی وہ قریب ہے ہر ایک بات سنتا ہے آہستہ ہو یا پکار کر اور جن موقعوں میں پکار کر تکبیر کہنے کا حکم ہے وہ دوسری وجہ سے ہے یہ نہیں کہ وہ آہستہ بات کو نہیں سنتا۔

= الصوم ولم یعودوه فاشتد علیهم فرخص لهم فی الافطار والفدیة وقرأ ابن عباس یطوقونه ای یكلفونه علی جهد منهم وعسر وهم الشیوخ والعجائز وحكم هؤلاء الافطار والفدیة وهو علی هذا الوجه غیر منسوخ ویجوز ان یكون هذا معنی یطیقونه ای یصومونه جهدهم وطاقتهم ومبلغ وسعهم كذا فی الكشاف وذكر فی التیسیر وفی قراءة ابن عباس وعلی الذین یطوقونه ای یكلفونه فلا یطیقونه وفی قراءة حفصة ﴿وَعَلَی الَّذِیْنَ لَا یُطِیْقُوْنَهٗ﴾ وقیل هو الشیخ الفانی فعلی هذا لا یكون منسوخا فانه حكم ثابت مجمع علیه. كذا فی كشف الاسرار: ۱/۱۵۱۔

بے چون وچگون ہے۔

جاں بتو نزدیک تو دوری ازو   قرب حق را چوں بدانی اے عمو

ف ۲:...... دعا کا مقتضیٰ تو یہی ہے کہ قبول ہو کیونکہ حق تعالیٰ جواد اور کریم ہیں اور ہر شے پر قادر ہیں، ابوداؤد اور ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تمہارا پروردگار بڑا حیاء والا اور کرم والا ہے جب بندہ اس کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کو شرم آتی ہے کہ اس کو خالی ہاتھ واپس کردے۔ انتہیٰ۔ لیکن اگر بندہ ہی آداب دعا اور شرائط قبولیت کو ملحوظ نہ رکھے تو مستحق قبولیت نہیں ہوتا۔ مثلاً دعا مانگنے میں حدود سے تجاوز کرجائے یا جوش میں آکر قطع رحمی یا کسی کی ہلاکت اور بربادی ہی دعا مانگنے لگے اور اللہ کے علم میں مقدر ہوچکا ہے کہ یہ شخص آئندہ چل کر اس کا دوست بن جائے گا اور اس بددعا کرنے والے کو طرح طرح کے فائدے پہنچائے گا تو اس دعا کا قبول نہ کرنا اسی کے حق میں مفید ہوگا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ ''اپنے پروردگار سے عاجزی اور پوشیدگی کے ساتھ دعا مانگو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ جو سفر میں ہے اور پراگندہ بال اور آشفتہ حال ہے اور آسمان کی طرف دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے (یعنی قبولیت دعا کے اسباب مجتمع ہیں) لیکن حالت یہ ہے کہ کھانا بھی اس کا حرام ہے اور پینا بھی حرام کا اور لباس بھی حرام کا اور غذا بھی حرام کی پھر کہاں دعا قبول ہو۔ (مسلم) حاصل یہ لکلا کہ اگر یہ موانع نہ ہوتے تو دعا ضرور قبول ہوتی کسی شے کے وجود کے لیے فقط اسباب کا مجتمع ہوجانا کافی نہیں بلکہ ارتفاع موانع بھی لازم ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ قبولیت دعا کے معنی یہ ہیں کہ دعا کبھی بھی ضائع نہیں ہوتی یا تو اللہ تعالیٰ اس کی مانگی ہوئی چیز عطاء فرمادیتے ہیں یا دنیا میں کوئی آنے والی بلا اور مصیبت دور ہوجاتی ہے یا آخرت کے لیے ذخیرہ کرکے رکھتے ہیں تاکہ وہاں اس کو اس سے ہزار ہا درجہ بڑھ کر عطاء فرمائیں جیسا کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ آیت کے الفاظ اگرچہ عام ہیں مگر مراد خاص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دعا مانگنے والے کی دعا ہم قبول کرتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

﴿فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ﴾ ''اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو دور فرمادیتے ہیں جس کے زائل ہونے کی تم دعا مانگتے ہو۔ اگر چاہیں'' یعنی اگر منشا نہ ہو تو پھر مصائب کو دفع نہ کریں گے۔

ف ۳:...... یا آیت کے یہ معنی ہیں کہ میں دعا مانگنے والوں کی آواز اور پکار کو سنتا ہوں۔ بتوں کی طرح غائب نہیں بلکہ بندہ جو مجھ کو پکارتا ہے تو میں جواب دیتا ہوں اور لبیک یا عبدی کہتا ہوں۔ غرض یہ کہ آیت میں اجابت کے معنی قبولیت کے نہیں بلکہ پکار سننے اور جواب دینے کے معنی ہیں۔ رہا یہ امر کہ تمہاری آرزو پوری کروں گا یا نہیں۔ آیت میں اس سے کوئی تعرض نہیں ہے۔

ف ۴:...... دعا مانگنا اور خدا تعالیٰ سے درخواست کرنا اور شئے ہے اور محض زبان سے الفاظ دعا کا پڑھ لینا اور شئے ہے۔ دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ خوب سمجھ لو۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ

حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے ف۱ وہ پوشاک ہیں

حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے وہ پوشاک ہیں تمہاری اور تم پوشاک ہو

لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ

تمہاری اور تم پوشاک ہو انکی ف۲ اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے ف۳ سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی تم سے

ان کی اللہ نے معلوم کیا کہ تم اپنی چوری کرتے تھے سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی تم سے

فَالْـَٔانَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ

پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے ف۴ اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو

پھر اب ملو ان سے اور چاہو جو لکھ دیا اللہ نے تم کو اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ صاف نظر آوے تم کو

الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ

دھاری سفید صبح کی جدا دھاری سیاہ سے ف۵ پھر پورا کرو روزہ کو رات تک ف۶

دھاری سفید جدا دھاری سیاہ سے فجر کی پھر پورا کرو روزہ رات تک

حکم چہارم متعلق بہ سحور و افطار

قَالَ تَعَالٰی: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ... الی... ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾

ابتداء اسلام میں سونے سے پہلے کھانے اور پینے اور عورتوں سے جماع کرنے کی تو اجازت تھی لیکن اگر سو جانے کے بعد آنکھ کھلے تو پھر اجازت نہ تھی۔ بعض صحابہ بغیر کھائے پیئے سو رہے اور اسی طرح روزہ رکھ لیا۔ بھوک اور پیاس کی شدت کی وجہ سے غشی طاری ہوئی اور بعض سونے کے بعد عورتوں سے صحبت کر بیٹھے اور بعد میں سخت نادم اور پشیمان ہوئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوئے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور یہ حکم منسوخ ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں

ف۱ رمضان کی رات میں جو نیند کے بعد کھانا پینا عورت کے پاس جانا حرام تھا اس میں بھی سہولت کر دی گئی اب تمام رات میں جب چاہو عورتوں کے ساتھ اختلاط کرو۔

ف۲ لباس اور پوشاک سے غرض غایت اتصال و اختلاط ہے یعنی جس طرح بدن سے کپڑے لگے اور ملے ہوتے ہیں اسی طرح مرد و عورت آپس میں ملتے ہیں۔

ف۳ اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سونے کے بعد عورتوں کے پاس جا کر بوجہ مخالفت حکم الٰہی تم اپنے آپ کو گنہگار بناتے ہو جس سے تمہارے نفس مستحق عقاب ہوتے ہیں اور ان کے ثواب میں نقصان پڑتا ہے سو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تم کو معاف فرمایا اور آئندہ کو اجازت فرما دی۔

ف۴ یعنی لوح محفوظ میں جو اولاد تمہارے لئے اللہ نے مقدر فرما دی ہے عورتوں کی مباشرت سے وہ مطلوب ہونی چاہیے محض شہوت رانی مقصود نہ ہو اور اس میں عزل کی کراہت اور لواطت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے۔

ف۵ یعنی جیسے رات بھر میں مجامعت کی اجازت دی گئی اسی طرح رمضان کی رات میں تم کو کھانے اور پینے کی بھی اجازت ہے صبح صادق تک۔

ف۶ یعنی طلوع صبح صادق سے رات تک روزہ کو پورا کرو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کئی روزے متصل رکھنے اس طرح پر کہ رات کو بھی افطار کی نوبت نہ آئے مکروہ ہے۔

جائز اور حلال کر دیا گیا تمہارے لیے روزے کی رات میں اپنی عورتوں سے مشغول ہونا جیسے روزہ دار کے لیے شب میں کھانا اور پینا جائز کر دیا گیا اسی طرح اپنی عورتوں سے مخالطت بھی جائز کر دی گئی۔ طبعی میلان کی وجہ سے صبر دشوار ہے کیوں کہ عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں اور تم اُن کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو اس لیے احتراز مشکل ہے اس لیے روزوں کی رات میں مخالطت کو حلال کر دیا اور گزشتہ ممانعت تم سے ختم کر دی گئی۔ اللہ نے جان لیا کہ تم اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے یعنی حکم خداوندی میں تقصیر اور کوتاہی کرتے تھے۔ مگر جب تم اپنی اس خیانت پر نادم اور پشیمان ہوئے اور معذرت کی تو اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تمہارا قصور معاف کیا اور تمہاری خیانت سے درگزر کیا۔ پس اب تم کو اجازت ہے بوقت شب کہ ہم بستر ہو تم ان سے اور جو اولاد اللہ نے تمہارے لیے مقدر کی ہے اس کو طلب کرو کہ یہ مبارک مہینہ ہے۔ اس نیت سے اگر صحبت کرو گے تو اس مہینہ کی برکت سے اولاد بھی مبارک ہوگی اور جس طرح تم کو رمضان کی راتوں میں ہم بستری کی اجازت دی گئی اسی طرح تم کو یہ بھی اجازت ہے کہ کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ سفید خط یعنی صبح صادق کا نورانی خط، رات کے سیاہ خط سے ممتاز اور جدا ہو جائے یعنی تم کو صبح صادق تک کھانے اور پینے اور عورتوں سے جماع کرنے کی اجازت ہے سابق ممانعت منسوخ کر دی گئی پھر صبح صادق سے لے کر رات کے آنے تک روزہ کو پورا کرو یعنی غروب آفتاب تک پورا کرو۔

ف ۱:...... ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ میں "مِنْ" یا تو تبعیض کے لیے ہے یا تبیین کے لیے ہے۔ اگر تبعیض کے لیے ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ خیط ابیض جو فجر کا ایک حصہ ہے اور اگر "مِنْ" بیانیہ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ خیط ابیض کہ جو بعینہٖ خود فجر ہے اور لفظ خیط کے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ فجر کا اگر ادنیٰ حصہ مثل تاگے کے بھی ظاہر ہو جائے تو کھانا اور پینا حرام ہو جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ "مِنْ" سببیہ ہے یعنی فجر کے طلوع ہونے کی وجہ سے خیط ابیض ظاہر ہو جائے۔

ف ۲:...... خیط ابیض اور خیط اسود کا استعمال صبح کی روشنی اور رات کی تاریکی میں شائع اور ذائع تھا کسی تفسیر اور بیان کا محتاج نہ تھا۔ لیکن جب لوگوں کو محض ظاہری لفظ کی بناء پر آیت کے مطلب میں اشتباہ ہوا تو مزید توضیح کے لیے ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا لفظ نازل ہوا۔

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ﴾ نازل ہوئی تو میں نے ایک سیاہ دھاگہ اور ایک سفید دھاگہ لیا اور دونوں کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیا اور دونوں کو دیکھتا رہا۔ رات کی تاریکی میں دونوں میں کچھ فرق نہ معلوم ہوا۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ واقعہ سُن کر ہنس پڑے اور یہ فرمایا: "انك لعريض القفا"۔ "یعنی تو کم عقل ہے۔"

یہ تو دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے اور ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا لفظ نازل ہوا۔ تاکہ ظاہر بین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں یعنی خیط ابیض اور خیط اسود سے ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ معنی مجازی اور کنائی مراد ہیں اور اسی پر تمام امت کا اجماع ہے کہ خیط ابیض سے صبح صادق مراد ہے۔

ف ۳:...... فجر تک جماع کی اجازت ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر جنبی صبح صادق کے بعد غسل جنابت کرے تو اس کا روزہ صحیح ہے۔ جنابت روزہ کے منافی نہیں۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ

اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں ف۱ یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی، سو ان کے نزدیک نہ جاؤ،

اور نہ لگو ان سے جب اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں یہ حدیں باندھیں اللہ کی سو ان کے نزدیک نہ جاؤ

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ بچتے رہیں ف۲

اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کو شاید وہ بچتے رہیں۔

حکم پنجم در بارۂ اعتکاف

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ ... الی ... لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾

روزہ کے بعد اعتکاف کے مسائل بیان فرماتے ہیں۔ اسی وجہ سے فقہاء کرام کتاب الصوم کے بعد کتاب الاعتکاف لاتے ہیں اقتداءً بالقرآن الحکیم۔ اور مت ہاتھ لگاؤ اپنی بیبیوں کو اس حالت میں کہ جب تم مسجد میں اعتکاف میں بیٹھے ہو۔ اگرچہ تم کسی ضرورت سے مسجد سے باہر نکلے ہو اور خواہ دن ہو یا رات ہو بہرحال اعتکاف کی حالت میں بیوی کے پاس جانا حرام ہے۔ روزہ اگرچہ غروب آفتاب پر ختم ہوجاتا ہے لیکن اعتکاف دن کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اعتکاف رات اور دن دونوں ہی کا ہوتا ہے۔ اور معتکف اگرچہ کسی ضرورت، استنجاء وغیرہ کی بناء پر مسجد سے باہر آجائے لیکن حکماً وہ مسجد ہی میں معتکف اور مقیم ہے اس لیے معتکف کو مسجد سے باہر جاکر بھی صحبت کی اجازت نہیں۔ یہ تمام احکام اللہ کے حدود ہیں جو حلال وحرام میں حدفاصل ہیں پس ذرہ برابر ان سے تجاوز نہ کرو بلکہ ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔ قریب جانے سے اندیشہ ہے کہ کہیں حدودِ ممنوعہ میں داخل نہ ہوجاؤ دین کی براءت اور نزاہت اگر چاہتے ہو تو شبہات سے بھی بچو۔ اسی وجہ سے ارشاد ہے ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ﴾ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ چہ جائیکہ اس کو ہضم کرجاؤ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام کو لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ اللہ کی حدود ممنوعہ میں داخل ہونے سے بچتے رہیں۔ اپنے قدم کو معصیت کی حدود سے بچائے رکھنے ہی کا نام تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

ف ۱:...... حالتِ اعتکاف میں بیوی سے مباشرت حرام ہے۔ مباشرت سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔

ف ۲:...... ﴿وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف سوائے مسجد کے کسی اور جگہ صحیح نہیں۔

ف ۳:...... اعتکاف ہر مسجد جماعت میں درست ہے کسی مسجد کی خصوصیت نہیں اس لیے کہ آیت میں لفظ مساجد عام ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ سوائے مسجد جمعہ کے کسی اور مسجد میں اعتکاف درست نہیں۔

ف۱ یعنی روزہ میں تو رات کو مباشرت کی اجازت ہے مگر اعتکاف میں رات دن کسی وقت عورت کے پاس نہ جائے۔

ف۲ روزہ اور اعتکاف کے متعلق جو حکم دوبارۂ حلت وحرمت مذکور ہوئے یہ قاعدے اللہ کے مقرر فرمائے ہوئے ہیں ان سے ہرگز باہر نہ ہونا بلکہ ان کے قریب بھی نہ جانا یعنی مطلب ہے کہ اپنی رائے یا کسی حجت سے ان میں سر متفاوت نہ کرنا۔

ف ۴:...... اعتکاف رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں سنت مؤکدہ ہے مگر سنت کفایہ ہے محلہ یا شہر میں بعض کے اعتکاف کرنے سے سنت ادا ہو جاتی ہے سب پر لازم نہیں۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق ف ۱ اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک، کہ کھا جاؤ کاٹ کر

مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۱۸۸ ع

لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے ف ۲

لوگوں کے مال میں سے مارے گناہ کے اور تم کو معلوم ہے۔

حکم ششم منع از مال حرام

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ ... الی ... وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

گزشتہ آیات میں روزہ اور دعا کا ذکر تھا اس آیت میں حرام مال کے کھانے کی ممانعت ہے اشارہ اس طرف ہے کہ روزہ اور دعا کی قبولیت کے لیے اکلِ حلال شرط ہے۔ نیز پہلے افطار اور سحری کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ افطار اور سحری حلال روزی سے ہونا چاہیے نیز اصلی مقصود روزہ سے طہارت نفس ہے تو جب طہارت نفس کے لیے روزہ میں حلال مال کے استعمال کی اجازت نہ رہی تو حرام مال کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟ حلال مال سے روزہ تو صرف تیس دن کا ہے اور حرام مال سے روزہ مدت العمر کے لیے ہے یعنی ساری عمر کا صوم وصال ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور مت کھاؤ ایک دوسرے کے مال ناحق طریقہ سے ہر ایک کو چاہیے کہ دوسرے کے مال کو اپنا مال سمجھ کر حفاظت کرے اور مت لے جاؤ مال کے جھوٹے مقدمے حکام کی طرف اس غرض سے کہ کھا جاؤ لوگوں کے مال کا ایک حصہ ظلم اور ستم اور فریب کے ذریعہ سے اور حالانکہ تم جانتے ہو کہ تم اس معاملہ میں حق پر نہیں رشوت دے کر اپنے موافق فیصلہ کرا لینے سے وہ مال تمہارا نہیں ہو جاتا وہ مال لوگوں ہی کا مال رہتا ہے۔ جیسا کہ لفظ اموال الناس سے مفہوم ہوتا ہے یعنی باطل فیصلہ سے وہ مال لوگوں کی ملک سے نہیں نکلتا جو اس کے اصل مالک ہیں۔ البتہ حکام چونکہ حقیقت حال سے واقف نہیں ظاہر حال کے موافق فیصلہ کر دیتے ہیں۔ وہ معذور ہیں ان پر کوئی گناہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر حاکم ظاہراً شریعت کے موافق فیصلہ کر دے اور دل سے کسی جانب اس کا میلان نہ ہو تو اس کو عند اللہ اجر ملے گا اگرچہ وہ فیصلہ فی نفسہ ناحق اور گناہ ہو۔

ف ۱ روزہ سے طہارت نفس مقصود تھی اب تطہیر اموال کا ارشاد ہے اور معلوم ہو گیا کہ مال حلال تو صرف روزہ میں اس کا کھانا منع ہے اور مال حرام سے روزہ مدت العمر کے لئے ہے اس کے لئے کوئی حد نہیں جیسے چوری یا خیانت یا دغا بازی یا رشوت یا زبردستی یا قمار یا بیع ناجائز یا سود وغیرہ ان ذریعوں سے مال کمانا بالکل حرام اور ناجائز ہے۔

ف ۲ نہ پہنچاؤ حاکموں تک یعنی کسی کے مال کی خبر نہ دو ظالم حاکموں کو یا اپنا مال بطریق رشوت حاکم تک نہ پہنچاؤ کہ حاکم کو موافق بنا کر کسی کا مال کھا لو یا جھوٹی گواہی دیکر یا جھوٹی قسم کھا کر یا جھوٹا دعویٰ کر کے کسی کا مال نہ کھاؤ اور تم کو اپنے ناحق پر ہونے کا علم بھی ہو۔

مسئلہ:...... اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ قضاء قاضی سے کوئی حرام شے حلال نہیں ہوجاتی جیسا کہ بخاری و مسلم میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے لوگو! میں تمہاری طرح بشر ہوں اور تم میرے پاس اپنے جھگڑے اور مقدمے فیصلہ کرانے کے لیے لاتے ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم میں سے بعض لوگ اظہار مدعا میں دوسرے سے زیادہ لسّان اور فصیح اللسان ہوں اور میں اس کے ظاہری بیان اور برہان پر اس کے موافق فیصلہ کردوں تو تم کو چاہیے کہ اگر میں شہادت کے اعتبار سے اس کو دوسرے مسلمان بھائی کا حق ولا دوں تو اس کو ہرگز نہ لو کیونکہ حقیقت میں میں نے اس کو آگ کا انگارہ دے دیا ہے۔

اور یہی تمام علماء کا مذہب ہے کہ یہ مال اس پر حرام ہے اور قضاء قاضی فقط ظاہراً نافذ ہوتی ہے باطناً نافذ نہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ املاکِ مُرسلہ میں قضاء قاضی فقط ظاہراً نافذ ہوتی ہے باطناً نہیں یعنی جس صورت میں مالک کی پہلے سے ملک ثابت ہو۔ وہاں اگر کوئی جھوٹا دعویٰ اور جھوٹی شہادت کے ذریعہ سے اپنے موافق فیصلہ کرالے تو وہ شے اس کے لیے حلال نہ ہوگی لیکن اگر عقود اور فسوخ میں قاضی نے کوئی فیصلہ کردیا تو قاضی کا حکم ظاہراً (یعنی دنیوی احکام) اور باطناً یعنی عنداللہ یکساں طور پر نافذ اور جاری ہوگا۔ عقود سے معاملات مثل بیع وشراء واجارہ ونکاح مراد ہیں۔ اور فسوخ سے معاملات کا فسخ کرنا اور توڑنا مراد ہے۔ جمہور علماء اس صورت میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خلاف ہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو گواہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے گواہی دی کہ فلاں شخص کا فلاں عورت سے نکاح ہوگیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ عورت اس مرد کو دلا دی جائے۔ اس عورت نے کہا اے امیر المؤمنین! میرا اس شخص سے نکاح نہیں ہوا اگر آپ کو یہی منظور ہے تو میرا نکاح اس کے ساتھ پڑھا دیجئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان گواہوں نے تیرا نکاح کردیا۔ واللہ اعلم۔ یہ عورت پہلے سے کسی کی منکوحہ نہ تھی اس لیے یہ شہادت زور نکاح کے لیے کافی سمجھی گئی۔ اور اگر کسی کی منکوحہ ہوتی تو بالاجماع اس کے لیے حلال نہ ہوتی۔ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک عقود و فسوخ سے اس قسم کی صورت مراد ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ

تجھ سے پوچھتے ہیں حال نئے چاند کا ف۱ کہہ دے کہ یہ اوقات مقررہ ہیں لوگوں کے واسطے اور حج کے واسطے ف۲

تجھ سے پوچھتے ہیں چاند کا نیا نکلنا تو کہہ یہ وقت ٹھہرے ہیں واسطے لوگوں کے اور واسطے حج کے

ف۱ آفتاب ہمیشہ ایک صورت ایک حالت پر رہتا ہے اور چاند کی صورت بدلتی اور اس کی مقدار بڑھتی رہتی ہے اس لئے لوگوں نے چاند کے کم زیادہ ہونے کی وجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی پہلی آیات میں شہر رمضان اور روزہ کا ذکر تھا اس آیت میں ہلال کا ذکر ہے اور روزہ اور رویت ہلال میں تعلق ظاہر ہے کہ ایک دوسرے پر موقوف ہے اور آگے چل کر حج اور اسکے احکام کا ذکر ہے ذکر ہلال اس کے بھی مناسب ہے۔

ف۲ یعنی ان سے کہہ دو کہ چاند کا اس طرح پر نکلنا اس سے لوگوں کے معاملات اور عبادات مثل قرض اجارہ عدت مدت حمل و رضاعت روزہ زکوٰۃ وغیرہ کے اوقات ہر ایک کو بے تکلف معلوم ہوجاتے ہیں بالخصوص حج کہ روزہ وغیرہ کی قضا تو ان کے غیر ایام میں ہوتی ہے حج کی تو قضا بھی ایام مقررہ حج کے سوا دوسرے ایام میں نہیں کرسکتے اور حج کے خاص بیان فرمانے کی یہ بھی وجہ ہے کہ ذیقعدہ ذی الحج محرم رجب یہ چار مہینے اشہر حرام تھے ان میں لڑائی کرنا کسی کو قتل کرنا حرام تھا اہل عرب کو اگر ان مہینوں میں لڑائی پیش آتی تو مہینوں کو مقدم موخر کرکے لڑائی کرتے مثلاً ذی الحج یا محرم میں لڑائی پیش آتی تو اسکو تو صفر بنالیتے اور جب صفر آتا تو اس کو ذی الحج یا محرم ٹھہرا لیتے ان کے اس خیال کے ابطال کی غرض سے یہاں حج کی تصریح فرمائی کہ جو ایام حج کے لئے اللہ نے مقرر فرمائے ان میں تقدم تاخر ہرگز جائز نہیں اب یہاں سے حج کے متعلقات اور اسکے احکام دور تک ذکر ہو گئے۔

حکم ہفتم اعتبار حساب قمری

قَالَ تَعَالٰی: ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَہِلَّۃِ ؕ قُلۡ ہِیَ مَوَاقِیۡتُ لِلنَّاسِ وَ الۡحَجِّ﴾

گزشتہ آیات میں روزہ اور افطار اور سحر کا ذکر تھا جس کا تمام تر تعلق رؤیت ہلال سے ہے اس لیے ان آیات میں رؤیت ہلال کے مسائل کو ذکر فرماتے ہیں لوگ آپ سے چاندوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ ہلال اول باریک ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتا بڑھتا بدر کامل ہو جاتا ہے۔ آپ اس سوال کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ یہ تغیر اور تبدل لوگوں کے دینی معاملات میں اوقات مخصوصہ اور مدت معینہ معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں اور خصوصا حج اور روزہ اور زکوۃ وغیرہ کے لیے۔ یعنی اس سے حج اور روزہ اور عدت کے ختم ہونے اور قرض وغیرہ کے معاملات کی مدت اور وقت کا علم ہوتا ہے قمری حساب کا جاننا نہایت آسان ہے ہر شخص چاند کے حساب سے تاریخ شمار کر سکتا ہے شمسی حساب کے لیے جنتری درکار ہے ہر کس وناکس شمسی حساب کو نہیں سمجھتا۔ علم ریاضی میں بغیر کمال حاصل کیے شمسی حساب کا سمجھنا ممکن نہیں اور چاند کا حساب قدرتی اور آسان ہے جو سہولت قمری حساب میں ہے وہ شمسی حساب میں نہیں اس لیے شریعت نے حج اور روزہ اور زکوۃ اور عدت وغیرہ کا مدار قمری حساب پر رکھا ہے۔ حج اور زکوۃ میں قمری حساب کا اعتبار ہے شمسی حساب کا اعتبار نہیں۔ شریعت میں مہینہ اور سال قمری ہی معتبر ہے اور اس کا استعمال مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ ہے۔ اگرچہ دنیوی معاملات میں شمسی حساب کا استعمال جائز ہے لیکن اگر سب کے سب قمری حساب کو ترک کر دیں تو گنہ گار ہوں گے جیسا کہ فرض علی الکفایہ کا حکم ہے۔

وَلَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُہُوۡرِہَا وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاۡتُوا

اور نیکی یہ نہیں کہ آؤ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے اور

اور نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں آؤ چھت پر سے، لیکن نیکی وہی جو کوئی بچتا رہے۔ اور

الۡبُیُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِہَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۸۹﴾

گھروں میں آؤ دروازوں سے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو ف۱

آؤ گھروں میں دروازوں سے، اور اللہ سے ڈرتے رہو شاید تم مراد کو پہنچو۔

حکم ہشتم اصلاح بعض رسوم جاہلیت

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُہُوۡرِہَا ... الی ... لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ﴾

ف۱ زمانہ جاہلیت کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب گھر سے نکل کر حج کا احرام باندھتے پھر کوئی ضرورت گھر میں جانے کی پیش آتی تو دروازہ سے نہ جاتے چھت پر چڑھ کر گھر کے اندر اترتے یا گھر کی پشت کی جانب نقب دیکر گھستے اور اس کو نیکی کی بات سمجھتے اللہ نے اس کو غلط فرمادیا۔

فائدہ: پہلے جملہ میں حج کا ذکر تھا اور یہ حکم بھی حج کے متعلق تھا اس مناسبت سے اس حکم کو یہاں بیان فرمایا اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ آیت میں اہلہ سے مراد اشہر حج یعنی شوال اور ذیقعدہ، اور دس راتیں ذی الحجہ کی ہیں کہ احرام حج ان میں ہونا چاہیے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ حج کے بعض ایام میں یا اور ایام میں بھی حج ہو سکتا ہے اللہ نے جواب دیا کہ حج کے لئے اشہر حج مقرر اور معین ہیں اور اسی کی مناسبت سے احرام کے اندر گھر میں جانے کی =

گزشتہ آیت میں حج کا ذکر تھا آئندہ آیت میں حج کے متعلق جاہلیت کی ایک غلط رسم کی اصلاح فرماتے ہیں بخاری میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کی یہ عادت تھی کہ جب احرام باندھ لیتے تو گھروں میں دروازوں سے نہ داخل ہوتے بلکہ مکان کی پشت کی طرف سے داخل ہوتے (نقب لگا کر یا سیڑھی لگا کر) اور اس کو فضیلت اور قربت سمجھتے۔ اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور اس میں کوئی فضیلت اور پرہیزگاری نہیں کہ تم حالت احرام میں گھروں میں پشت کی جانب سے آیا کرو لیکن نیکی اور بزرگی یہ ہے کہ حالت احرام میں خاص طور پر اللہ کے محرمات سے بچے اور جب تم کو گھروں میں آنے کی ضرورت ہو تو دروازوں کی طرف سے آؤ اور احکام خداوندی میں تغیر اور تبدل سے بچتے رہو کسی شے کو اپنی رائے سے طاعت اور معصیت سمجھ لینا تقویٰ کے خلاف ہے۔ امید ہے کہ تم اپنی مراد کو پہنچو گے۔

ف:...... مکان میں پشت کی جانب سے داخل ہونا جائز اور مباح ہے لیکن اس کو عبادت اور نیکی سمجھنا بدعت ہے۔ شریعت کی نظر میں وہ برائی اور تقویٰ کے خلاف ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی مباح کو نیکی اور بزرگی سمجھ لینا یہ بدعت ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ہر کام کو اپنے طریقہ سے کیا کرو۔

أُطْلُبُوا الْأَرْزَاقَ مِنْ أَسْبَابِهَا   وَادْخُلُوا الْأَبْيَاتَ مِنْ أَبْوَابِهَا

اور اس معنی پر آیت کا ماقبل سے ایک لطیف ربط ہوجاتا ہے کہ بے محل اور لایعنی سوال (جیسا کہ تم نے ہلال کے گھٹنے اور بڑھنے کے متعلق کیا) اس کی مثال ایسی ہے جیسے مکان میں پشت کی جانب سے داخل ہونا۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لوتے ہیں تم سے ف ۱ اور کسی پر زیادتی مت کرو ف ۲ بیشک اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو لڑتے ہیں تم سے ، اور زیادتی مت کرو ، اللہ نہیں چاہتا

= کیفیت ذکر فرمادی اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اپنی طرف سے کسی جائز اور مباح امر کو نیکی بنالینا اور دین میں داخل کرلینا مذموم اور ممنوع ہے۔ جس سے بہت سی باتوں کا بدعت اور مذموم ہونا معلوم ہوگیا۔

ف ۱ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے مکہ دارالامن تھا، کوئی اپنے دشمن کو بھی مکہ میں پاتا تو کچھ نہ کہتا اور اشہر حرام یعنی ذی القعدہ اور ذی الحجہ اور محرم اور رجب یہ چاروں مہینے بھی امن کے تھے ان میں تمام ملک عرب میں لڑائی موقوف ہوجاتی اور کوئی کسی کو کچھ نہ کہتا۔ ذی القعدہ ۶ ہجری میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جماعت صحابہ کے ہمراہ عمرہ کے قصد سے مکہ کی زیارت کو تشریف لائے جب آپ مکہ کے نزدیک پہنچے تو مشرکین جمع ہو کر لڑنے کو تیار ہوگئے اور مسلمانوں کو روک دیا آخر کو اس پر صلح ہوئی کہ اب تو بدون زیارت واپس ہوجائیں اور اگلے برس آ کر عمرہ کریں اور تین روز اطمینان سے مکہ میں رہیں۔ جب دوسرے برس ذی القعدہ ۷ ہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کا قصد فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو یہ اندیشہ تھا کہ اہل مکہ اگر اب بھی وعدہ خلافی کر کے لڑنے بھڑنے کو تیار ہو گئے تو پھر ہم کیا کریں گے لڑیں تو شہر حرام اور حرم مکہ میں کیونکر لڑیں اور نہ لڑیں تو عمرہ کیسے کریں اس پر حکم الٰہی آیا کہ اگر وہ اس مہینہ حرام میں خلاف عہد تم سے لڑیں تو تم بھی بے تامل ان سے لڑو ہاں تمہاری طرف سے ابتداء اور زیادتی نہ ہونی چاہیے حج کے ذیل میں عمرہ حدیبیہ کی مناسبت سے قتال کفار کا آیا اس لئے جہاد کے بعض احکام و آداب مناسب مقام مذکور فرمائے جاتے ہیں اسکے بعد پھر حج کے احکام بیان ہوں گے۔

ف ۲ زیادتی مت کرو اس کے معنی یہ کہ لڑائی میں لڑکے اور عورتیں اور بوڑھے قصداً نہ مارے جائیں اور حرم کے اندر اپنی طرف سے لڑائی شروع نہ کی جائے۔

الْمُعْتَدِيْنَ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ

زیادتی کرنے والوں کو اور مار ڈالو ان کو جس جگہ پاؤ

زیادتی والوں کو ۔ اور مارو ان کو جس جگہ پاؤ، اور نکال دو ان کو جہاں سے

اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ف۱ اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے ف۲ اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس

انہوں نے تم کو نکالا ، اور دین سے بچلانا مارنے سے زیادہ ہے ، اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام پاس ،

حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ﴿۱۹۱﴾

جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر اگر وہ خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مارو یہی ہے سزا کافروں کی ف۳

جب تک وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ۔ پھر اگر وہ لڑیں تو ان کو مارو۔ یہی سزا ہے منکروں کی

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ

پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے ف۴ اور لڑو ان سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے

پھر اگر وہ باز آئیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور لڑو ان سے جب تک نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے

الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَي الظّٰلِمِيْنَ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ

خدا تعالیٰ ہی کا پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر ظالموں پر ف۵ حرمت والا مہینہ بدلہ (مقابل) ہے

اللہ کا۔ پھر اگر وہ باز آئیں تو زیادتی نہیں مگر بے انصافوں پر۔ حرمت کا مہینہ مقابل حرمت کے مہینے کے

بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ

حرمت والے مہینہ کا اور ادب رکھنے میں بدلہ ہے پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو

اور ادب رکھنے میں بدلا ہے۔ پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر

ف۱ جس جگہ پاؤ یعنی حرم میں ہوں خواہ غیر حرم میں جہاں سے تم کو نکالا یعنی مکہ سے۔

ف۲ یعنی دین سے پھر جانا یا دوسرے کو پھرانا مہینہ حرام کے اندر مار ڈالنے سے بہت بڑا گناہ ہے مطلب یہ کہ حرم مکہ میں کفار کا شرک کرنا اور کرانا زیادہ قبیح ہے حرم میں مقاتلہ کرنے سے تو اب اے مسلمانو تم کچھ اندیشہ نہ کرو اور جواب ترکی بہ ترکی دو۔

ف۳ یعنی مکہ ضرور جائے امن ہے لیکن جب انہوں نے ابتداء کی اور تم پر ظلم کیا اور ایمان لانے پر دشمنی کرنے لگے کہ یہ بات مار ڈالنے سے بھی سخت ہے تو اب انکو امان نہ رہی جہاں پاؤ مارو آخر جب مکہ فتح ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرما دیا کہ جو ہتھیار سامنے کرے اسی کو مارو اور باقی سب کو امن دیا۔

ف۴ یعنی باوجود ان سب باتوں کے اگر اب بھی مسلمان ہوں اور شرک سے باز آئیں تو توبہ قبول ہے۔

ف۵ یعنی کافروں سے لڑائی اسی واسطے ہے کہ ظلم موقوف ہو اور کسی کو دین سے گمراہ نہ کر سکیں اور خاص اللہ ہی کا حکم جاری رہے سو وہ جب شرک سے باز آجائیں تو زیادتی سوائے ظالموں کے اور کسی پر نہیں یعنی جو بدی سے باز آگئے وہ اب ظالم نہ رہے تو اب ان پر زیادتی بھی مت کرو ہاں جو فتنہ سے باز نہ رہیں ان کو شوق سے قتل کرو۔

بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

جیسی اس نے زیادتی کی تم پر اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیزگاروں کے ف۱

زیادتی کرو، جیسے اس نے زیادتی کی۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیزگاروں کے

حکم نہم متعلق بہ قتال کفار

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ... الی ... وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾

گزشتہ آیات میں حج اور روزہ کے لیے خاص مہینہ کا ہونا بیان فرمایا کہ سوائے ان ایام مقررہ کے دوسرے ایام میں حج نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ملت ابراہیمی میں یہ حکم تھا کہ چار مہینوں میں قتل وقتال حرام ہے، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب۔ یہ چار مہینے اشہر حرام کہلاتے تھے اور یہ چاروں مہینے امن کے کہلاتے تھے ان دنوں میں تمام ملک عرب میں لڑائی موقوف ہوجاتی تھی اور کوئی کسی سے تعرض نہ کرتا تھا اس بناء پر آنحضرت ﷺ نے ذی قعدۃ الحرام ۶ھ میں صحابہ کی ایک کثیر جماعت کے ہمراہ عمرہ کا قصد فرمایا جب مکہ مکرمہ پہنچے تو مشرکین مکہ لڑنے کے لیے تیار ہوگئے اور مسلمانوں کو عمرہ کرنے اور مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا بالآخر اس پر صلح ہوئی کہ آپ ﷺ اس وقت بدون عمرہ کیے ہوئے واپس ہوجائیں اور آئندہ سال آکر عمرہ کریں چنانچہ آپ ﷺ سال آئندہ ماہ ذی قعدۃ الحرام ۷ ہجری میں مع اصحاب، عمرۃ القضاء کے لیے مکہ تشریف لائے تو اندیشہ ہوا کہ اگر مشرکین مکہ اس ماہ حرام میں خلاف عہد ہم سے لڑنے پر تیار ہوجائیں تو ہم کیا کریں اور شہر حرام اور بلد حرام میں کیوں کر لڑیں اس پر آیت نازل ہوئی کہ اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو مگر ابتداء اور زیادتی تمہاری طرف سے نہ ہونی چاہیے۔

چونکہ گزشتہ آیات میں حج کا ذکر تھا۔ حج کی مناسبت سے عمرہ حدیبیہ اور زمانہ حج اور عمرہ میں قتال کا حکم بیان فرمایا اس کے بعد پھر دور تک احکام حج کے بیان کا سلسلہ چلا گیا۔ اصل مقصود عمرۂ حدیبیہ کے متعلق حکم بتلانا تھا۔ شہر حرام اور حالتِ احرام میں جہاد وقتال کا حکم عمرہ اور احرام کی معیت میں ذکر فرمایا اس لیے اس حکم کے بعد پھر حج کے احکام بیان فرمائے اور بے تکلف لڑو تم خدا کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑیں اور حدود شریعت سے تجاوز نہ کرو۔ یعنی ماہ حرام اور سرزمین حرام میں اپنی طرف سے لڑائی کی ابتداء نہ کرو اور بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں کو نہ قتل کرو اور نہ کسی کا مثلہ کرو یعنی ناک، کان وغیرہ نہ کاٹو اور نہ کسی کی آنکھ پھوڑو یہ سب حد سے تجاوز کرنا ہے بیشک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے اور اگر وہ خود حد سے تجاوز کریں اور عہد شکنی کریں اور تم سے لڑیں تو پھر تم ان کو مارو جہاں کہیں بھی پاؤ حل میں یا حرم میں اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو تنگ کر کے نکالا ہے یعنی مکہ سے یعنی تم کو اتنا ستایا کہ تم نکلنے پر مجبور ہوگئے ایسے لوگوں کو جہاں کہیں

ف۱ حرمت کا مہینہ یعنی ذیقعدہ کہ جس میں عمرہ کی قضا کرنے جا رہے ہو بدلہ ہے اس حرمت کے مہینہ یعنی ذیقعدہ کا کہ سال گزشتہ میں اسی مہینہ کے اندر کفار مکہ نے تم کو عمرہ سے روک دیا تھا اور مکہ میں جانے نہ دیا تھا یعنی اب تم شوق سے ان سے بدلہ لو کیونکہ ادب اور حرمت رکھنے میں تو برابری ہے یعنی اگر کوئی کافر ماہ حرام کی حرمت کرے اور اس مہینہ میں تم سے نہ لڑے تو تم بھی ایسا ہی کرو مکہ والے جو سال گزشتہ میں تم پر ظلم کر چکے اور نہ ماہ حرام کی حرمت کی نہ حرم مکہ کی نہ تمہارے احرام کا لحاظ کیا اور تم نے اس پر بھی صبر کیا اگر اس دفعہ بھی سب حرمتوں سے قطع نظر کر کے آمادہ جنگ ہوں تو تم بھی کسی حرمت کا خیال مت کرو بلکہ اگلی پچھلی سب کسر مٹا لو مگر جو کرو خدا سے ڈر کر کرو اس کے خلاف اجازت ہرگز نہ ہو اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کا بیشک ناصر و مددگار ہے۔

بھی پاؤ مارو اور یہ خیال نہ کرو کہ ماہ حرام اور سرزمین حرم میں کیسے قتل وقتال کریں۔ اس لیے کہ کفر وشرک کا فتنہ اور اعداء اللہ کا غلبہ اور انکی شوکت کا فتنہ اور مفسدہ سرزمین حرم میں قتل وقتال اور اخراج کے فتنہ سے کہیں زیادہ سخت ہے ماہ محترم میں مارڈالنا اتنا گناہ نہیں جتنا کہ خود علی الاعلان کفر وشرک کرنا اور دوسروں کو دین حق سے بچلانا اور گمراہ کرنا گناہ ہے قتل میں تو مصلحتیں اور منفعتیں ہوسکتی ہیں لیکن کفر اور شرک سراسر شر محض ہے۔ اس میں کسی مصلحت اور منفعت کا امکان نہیں لہٰذا تم اس کفر کے شر اور فتنہ کے ازالہ کے لیے کمربستہ رہو۔ اور اس کا خاص طور پر لحاظ رکھو کہ مسجد حرام کے قریب ان سے نہ لڑو تاوقتیکہ وہ اس جگہ خود تم سے نہ لڑیں۔ اس لیے کہ مسجد حرام غایت درجہ محترم ہے ﴿وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا﴾ جو مسجد حرام میں داخل ہوا وہ امن والا ہوگیا۔ لہٰذا مسجد حرام اور حرم کا احترام بہت ضروری ہے پس اگر وہ کفار ناہنجار مسجد حرام کی حرمت اور احترام کو ملحوظ نہ رکھیں اور تم سے اس مسجد میں قتل وقتال کریں تو پھر تم کو اجازت ہے کہ تم بے کھٹکے ان کو مارو ایسے کافروں کی کہ جو حرم کی حرمت کو ملحوظ نہ رکھیں یہی سزا ہے یعنی بلاشبہ مکہ جائے امن ہے لیکن جب انہوں نے ابتداء کی اور تم پر ظلم کیا اور محض اللہ پر ایمان لانے کی وجہ سے تمہاری ایذاء رسانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو اب مستحق امن کے نہ رہے جہاں پاؤ مارو پس اگر یہ لوگ اب بھی کفر اور شرک سے باز آجائیں یعنی تمہارے قتل کے بعد کفر سے توبہ کرلیں اور مسلمان ہوجائیں تو ان کی توبہ قبول ہے اور گزشتہ کیا ہوا سب معاف ہے اسلام اور توبہ کے بعد کسی گزشتہ خون کا مؤاخذہ اور مطالبہ نہ ہوگا اور فقط معافی پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ انعام و احسان اور مہربانی بھی فرماتے ہیں اس لیے کہ تحقیق اللہ بہت بخشنے والے اور معاف کرنے والے اور بڑے مہربان ہیں۔

اسلام اور توبہ کے بعد تمام گزشتہ گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں لیکن حالت کفر میں رحمت نہیں فرماتے کیونکہ کفر وشرک محل رحمت نہیں بلکہ مورد غضب ولعنت ہے۔ اور اے مسلمانو! جب تم کو یہ معلوم ہوگیا کہ کفر محل رحمت نہیں تو ان کافروں سے لڑو اور ان اعداء اللہ سے اس وقت تک جنگ کا سلسلہ جاری رکھو جب تک کہ کفر اور شرک کا فتنہ اور فساد ختم نہ ہوجائے اور خالص حکم اللہ ہی کا چلنے لگے یعنی کفر مغلوب ہوجائے اور اسلام غالب آجائے کہ کفر کو اسلام کے مقابلہ میں سر اٹھانے کی مجال باقی نہ رہے اور کفر اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور کفر میں اتنی طاقت نہ رہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے کسی دینی یا دنیوی امر میں مزاحمت کرسکے۔ شروع آیت میں اصل قتال کا وجوب بیان فرمایا تھا اور اس آیت میں جہاد وقتال کی غرض وغایت بیان فرمائی کہ جہاد سے مقصد کفر کے فتنہ کو ختم کرنا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی زمین پر کفر سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں پس اگر یہ کافر شرک اور کفر کے فتنہ اور فساد سے باز آجائیں تو پھر ان سے کوئی زیادتی اور دست درازی نہ کی جائے اس لیے کہ دست درازی سوائے ظالموں اور ستم گاروں کے اور کسی پر روا نہیں اور شر اور فساد سے باز آجانے کے بعد ظالم نہیں رہے۔ عمرۂ حدیبیہ میں صحابہ کو یہ تردد تھا کہ اگر کفار سے لڑائی کی نوبت آئی جیسا کہ بظاہر غالب گمان ہے تو اگر خاموش رہیں تو مشکل اور اگر اُن سے جنگ کریں تو ایک تو سرزمین حرم کی بے حرمتی اور دوسرے ماہ محترم یعنی ذی قعدہ کی بے حرمتی ذی قعدہ اور ذی الحجہ اور محرم اور رجب یہ مہینے اشہر حرم اور اشہر حرام کہلاتے تھے ان میں قتل وقتال ممنوع تھا۔ مکان محترم یعنی ارض حرم کے متعلق جو تردد تھا اس کا گزشتہ آیات میں جواب دیا۔ اب ان آیات میں زمان محترم یعنی شہر حرام کی بے حرمتی کا جو تردد تھا اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ اور اے مسلمانو! تم کو مکان محترم میں جنگ وجدال کے متعلق جو تردد تھا وہ زائل کردیا گیا۔ رہا زمانِ محترم یعنی

شہر حرام میں جنگ کے متعلق جو تردد تھا سو اس کا جواب یہ ہے کہ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے بدلہ اور عوض میں ہے اگر وہ اس مہینہ کی حرمت کا لحاظ اور ادب رکھیں اور تم سے نہ لڑیں تو تم بھی اس مہینہ کی حرمت کا ادب اور لحاظ کر کے اُن سے نہ لڑو اور وجہ یہ ہے کہ حرمت کی چیزوں میں عوض اور بدلہ ہے یعنی برابری ہے پس اگر وہ اس شہر حرام کا احترام ملحوظ رکھیں تو تم بھی اس کا احترام ملحوظ رکھو اور اگر وہ اس محترم مہینہ کا احترام نہ کریں تو جیسے تم پر کوئی زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اسی قدر زیادتی کرو جس قدر کہ اس نے تم پر زیادتی اور دست درازی کی ہے اور زیادتی کا بدلہ لینے میں اللہ سے ڈرتے رہو کہ کہیں زیادتی کا بدلہ لینے میں تم سے زیادتی نہ ہو جائے کہ اپنے حق سے زائد بدلہ لے لو اور مستقبل میں کافروں کے غلبہ کے خطرہ کو خاطر ہی میں نہ لاؤ۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے تم یقین رکھو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے اور فتح اور کامیابی کا تمام دارومدار اللہ کی معیت اور اس کی نصرت وحمایت پر ہے اور بغیر تقویٰ اور پرہیزگاری اللہ کی معیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ حاصل ان آیات شریفہ کا یہ ہے کہ حدود حرم اور اشہر حرام میں تم ابتداء بالقتال نہ کرو اور اگر کفار ابتداء بالقتال کریں تو تم قتال سے دریغ نہ کرو۔ یہ تمہارا قتل و قتال بلد حرام اور اشہر حرام کی حرمت کے منافی نہیں جیسے ابتداءً کسی مسلمان کو قتل کرنا روا نہیں لیکن قصاص میں کسی مسلمان کو قتل کرنا خون ناحق نہیں کہلاتا۔

ف ۱:...... ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ جہاد کے بارے میں جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی وہ یہ آیت ہے یعنی ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا﴾ ابتداء میں یہی حکم تھا کہ جو لوگ آپ سے قتال کریں آپ ان سے قتال کریں اور جو آپ سے قتال نہ کریں آپ بھی ان سے قتال نہ کریں۔ بعد میں یہ حکم "اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً" سے منسوخ ہو گیا یعنی تمام مشرکین سے قتال کرو خواہ وہ تم سے قتال کریں یا نہ کریں۔

اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور زہری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ سب سے پہلی آیت جو جہاد وقتال کے بارے میں نازل ہوئی وہ سورۂ حج کی یہ آیت ہے: ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ﴾ الآیۃ۔

امام ابوبکر رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جائز ہے کہ ابتداء بالقتال کرنے والوں سے قتال کی اجازت میں سب سے پہلی آیت ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ اور عام کافروں سے جہاد وقتال کی اجازت کے بارے میں خواہ وہ ابتداء بالقتال کریں یا نہ کریں، سورۂ حج کی آیت پہلی آیت ہو یعنی تمام کفار سے جہاد وقتال کی اجازت میں پہلی آیت ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ﴾ الآیۃ ہو۔ کذا فی احکام القرآن: ۱/۲۵۷)

ف ۲:...... فی سبیل اللہ کا مطلب یہ ہے کہ محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جہاد وقتال ہو۔ قومیت اور وطنیت کی بناء پر نہ ہو۔ حدیث میں ہے کہ جو قتال حمیت اور قومیت اور اظہار شجاعت کے لیے ہو وہ فی سبیل اللہ نہیں جو قتال محض اس لیے ہو کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو وہ فی سبیل اللہ ہے۔

ف ۳:...... جمہور ائمہ دین کا مسلک یہ ہے کہ اشہر حرم میں قتل وقتال ابتداء میں ممنوع تھا بعد میں اجازت ہو گئی مگر بہتر اب بھی یہی ہے کہ اشہر حرم میں ابتداء بالقتال نہ کی جائے۔ اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ آیت کا حکم اب بھی باقی ہے منسوخ نہیں ہوا اور اب بھی حرم اور اشہر حرم میں ابتداء بالقتال حرام ہے اور یہی مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم کی روایت سے بھی

اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ شہر یعنی مکہ ہمیشہ کے لیے حرام ہے صرف میرے لیے ایک ساعت کے واسطے حلال کر دیا گیا باقی قیامت تک حرام ہے یہاں کا گھاس اور تنکا بھی نہ کاٹا جاوے اور نہ یہاں کا شکار بدکا یا جاوے۔ اور جو لوگ نسخ کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ابن خطل مسجد حرام میں قتل کیا گیا حالانکہ وہ خانہ کعبہ کے پردہ سے لٹکا ہوا تھا۔ جواب یہ ہے کہ یہ قتل اس ساعت میں ہوا کہ جس ساعت میں مکہ میں قتل وقتال آپ ﷺ کے لیے حلال کر دیا گیا تھا۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ ۚ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں ف۱ اور نیکی کرو بیشک اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں۔ اور نیکی کرو۔ اللہ چاہتا ہے نیکی والوں کو۔

حکم دہم انفاق فی الجہاد

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ... الی... اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾

گزشتہ آیات میں بدنی جہاد کا ذکر تھا ان آیات میں مالی جہاد کا ذکر ہے یعنی جو جان سے کفر و شرک کے فتنہ و فساد کا مقابلہ کر سکے وہ اپنی جان سے کرے اور جو مال سے مقابلہ کر سکتا ہے وہ مال سے مقابلہ کرے۔ خدا کی راہ میں جان کی ضرورت ہو تو جان پیش کرو، مال کی ضرورت ہو تو مال پیش کرو اور خدا کی راہ میں جو خرچ کر سکتے ہو وہ خرچ کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت اور تباہی میں نہ ڈالو یعنی خدا کی راہ میں جان اور مال خرچ کرنے سے دریغ نہ کرو۔ خدا کی راہ میں جان اور مال سے بخل کرنا اپنے کو تباہی میں ڈالنا ہے۔ اگر تم جہاد کو چھوڑ بیٹھو تو تمہارا دشمن تم پر غالب آجائے گا۔ اور پھر تم ہلاک اور تباہ ہو جاؤ گے معلوم ہوا کہ جہاد میں جانا ہلاکت اور تباہی نہیں بلکہ جہاد کو چھوڑ بیٹھنا ہلاکت اور تباہی ہے۔ اور نیکی کرو یعنی اپنے اعمال و اقوال و احوال کو خوب صورت بناؤ۔ یا یہ معنی کہ اپنی جانوں پر احسان کرو کہ خدا کی راہ میں خرچ کرو خدا کی راہ میں خرچ کرنا اپنے ہی اوپر احسان کرنا ہے یا یہ معنی ہیں کہ ہر عبادت اور ہر عمل اس طرح کرو کہ گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو۔

﴿اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی﴾ ''کیا انسان کو یہ علم نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔'' بے شک اللہ نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے۔

ف:...... ﴿بِاَیْدِیْکُمْ﴾ اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی حکم عدولی نہ کرو جو تمہاری ہلاکت کا باعث بنے، البتہ اگر بے مقصد اور بے اختیار کوئی غلطی ہو جائے تو معاف ہے۔ (روح المعانی)

ابوداؤد اور ترمذی میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ

ف۱ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت میں یعنی جہاد وغیرہ میں اپنے مال کو صرف کرو اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو یعنی جہاد کو چھوڑ بیٹھو یا اپنے مال کو جہاد میں صرف نہ کرو کہ اس سے تم ضعیف اور دشمن قوی ہوگا۔

نے جب اسلام کو فتح دی تو ہم آپس میں سرگوشی کرنے لگے کہ اب تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دے دیا (یعنی اب چنداں جہاد کی ضرورت نہیں) لہٰذا ہمارے جو مال لڑائیوں میں پہلے تباہ ہو چکے ہیں ان کی کچھ دیکھ بھال کر لیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ہمیشہ جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ قسطنطنیہ کے جہاد میں شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کی شہر پناہ کے نیچے مدفون ہوئے۔

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۖ وَلَا

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے ف۱ پھر اگر تم روک دیئے جاؤ تو تم پر ہے جو کچھ کہ میسر ہو قربانی سے اور

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے، پھر اگر تم روکے گئے تو جو میسر ہو قربانی بھیجو اور

تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى

حجامت نہ کرو اپنے سروں کی جب تک پہنچ نہ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر ف۲ پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کو تکلیف ہو

حجامت نہ کرو سر کی، جب تک پہنچ نہ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر۔ پھر جو کوئی تم میں مریض ہو، یا اس کو

مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۚ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ

سر کی تو بدلا دیوے روزے یا خیرات یا قربانی ف۳ پھر جب تمہاری خاطر جمع ہو تو جو کوئی فائدہ اٹھائے

دکھ دیا اس کے سر نے، تو بدلا دے روزے یا خیرات یا ذبح کرنا۔ پھر جب تم کو خاطر جمع ہو، تو جو کوئی فائدہ لیوے

بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي

عمرہ کو ملا کر حج کے ساتھ تو اس پر ہے جو کچھ میسر ہو قربانی سے ف۴ پھر جس کو قربانی نہ ملے تو روزے رکھے تین

عمرہ ملا کر حج کے ساتھ، تو جو میسر ہو قربانی پہنچائے۔ پھر جس کو پیدا نہ ہو تو روزہ تین دن کا

ف۱ حج کے ضمن میں جہاد کا ذکر جو مناسب تھا اس کو بیان فرما کر اب احکام حج و عمرہ بتلائے جاتے ہیں۔

ف۲ مطلب یہ ہے کہ جب کسی نے حج یا عمرہ شروع کیا یعنی اس کا احرام باندھا تو اس کو پورا کرنا لازم ہو گیا۔ بیچ میں چھوڑ بیٹھے اور احرام سے نکل جائے یہ نہیں ہو سکتا لیکن اگر کوئی دشمن یا مرض کی وجہ سے بیچ ہی میں رک گیا اور حج و عمرہ نہیں کر سکتا تو اس کے ذمہ پر ہے قربانی جو اس کو میسر آئے جس کا ادنیٰ مرتبہ ایک بکری ہے اس قربانی کو کسی کے ہاتھ مکہ کو بھیجے اور یہ مقرر کر دے کہ فلاں روز اس کو حرم مکہ میں پہنچ کر ذبح کر دینا اور جب اطمینان ہو جائے کہ اب اپنے ٹھکانے یعنی حرم میں پہنچ کر اس کی قربانی ہو چکی ہو گی اس وقت سر کی حجامت کرا دے اس سے پہلے ہر گز نہ کرائے اس کو دم احصار کہتے ہیں کہ حج یا عمرہ سے رکنے کی وجہ سے لازم ہوتا ہے۔

ف۳ یعنی اگر حالت احرام میں کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں درد یا سر میں زخم ہو تو اس کو بضرورت حالت احرام میں حجامت کرنا سر کا جائز ہے مگر بدلا دینا پڑے گا۔ تین روزے یا چھ محتاجوں کو کھانا کھلانا یا ایک دنبے یا بکرے کی قربانی کرنا۔ یہ دم جنایت ہے کہ حالت احرام میں بضرورت مرض لاچار ہو کر امور مخالف احرام کرنے پڑے۔

ف۴ یعنی جو محرم کہ دشمن کی طرف سے اور مرض سے مطمئن ہو خواہ اس کو کسی قسم کا اندیشہ پیش ہی نہ آیا یا دشمن کا خوف یا بیماری کا کھٹکا پیش تو آیا مگر جلد زائل ہو گیا احرام حج و عمرہ میں اس سے خلل نہ آنے پایا تو اس کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے حج اور عمرہ دونوں ادا کیے یعنی قران یا تمتع کیا افراد نہیں کیا تو اس پر قربانی ایک بکرا یا ساتواں حصہ اونٹ کا یا گائے کا لازم ہے اس کو دم قران اور دم تمتع کہتے ہیں امام ابو حنیفہ اس کو دم شکر کہتے ہیں اور اس کو اس میں سے کھانے کی اجازت دیتے ہیں اور امام شافعی اس کو دم جبر کہتے ہیں اور قربانی کرنے والے کو اس میں سے کھانے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔

الۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ؕ تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ

حج کے دنوں میں اور سات روزے جب لوٹو یہ دس روزے ہوئے پورے ف۱ یہ حکم اس کے لئے ہے جس کے گھر والے نہ

حج کے وقت میں ، اور سات دن جب پھر کر جاؤ۔ یہ دس ہوئے پورے۔ یہ اس کو ہے جس کے گھر والے

ع ۲۴ ۸ حَاضِرِی الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

رہتے ہوں مسجد الحرام کے پاس ف۲ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے

نہ ہوں رہتے مسجد الحرام پاس۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

حکم یازدہم متعلق حج وعمرہ

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ... الی... اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ﴾

ماہ صیام کے بعد حج کے مہینے شروع ہوتے ہیں اس لیے روزوں کے بعد حج کا ذکر فرمایا اور پھر حج کی مناسبت سے حج کے مہینوں میں قتل وقتال کا حکم ذکر فرمایا اب پھر حج اور عمرہ کے بقیہ احکام کو بیان فرماتے ہیں۔ نیز حج مبرور وعمرہ مبرورہ اعلیٰ ترین اعمال بر میں سے ہے اور انفاق فی سبیل اللہ تو احسان الی العباد کا بہترین محل ہے جس کا پہلی آیت میں ذکر ہو چکا ہے۔ ﴿وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۛ وَاَحۡسِنُوۡا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴾۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور حج اور عمرہ کو خاص اللہ کے لیے پورا کرو نہ تو شروع کر کے درمیان میں چھوڑ دو اور نہ حج کا احرام باندھ کر اس کو فسخ کر کے عمرہ بناؤ جو شروع کیا ہے اسی کو پورا کرو اور حج اور عمرہ کے آداب وسنن کو پورا پورا ملحوظ رکھو بغیر اس کے حج اور عمرہ ناتمام رہے گا اور حج اور عمرہ کا تمام سفر خالص اللہ کے لیے ہو۔ بغیر اخلاص کے عبادت میں حسن ❶ پیدا نہیں ہوتا اور سفر حج میں انفاق فی سبیل اللہ اور احسان سے دریغ نہ کرو سفر حج وعمرہ میں خیرات سے اَضۡعَافًا مُّضَاعَفَةً اجر ملتا ہے۔ پس اگر احرام باندھنے کے بعد تم اس حج اور عمرہ کے پورا کرنے سے روک دیئے جاؤ کہ جس کے تمام کرنے کا تم کو حکم دیا گیا ہے اور کسی دشمن یا مرض یا خرچ کے ختم ہو جانے کی وجہ سے یا کسی اور عذر کے پیش آجانے کی وجہ سے تم بیت اللہ تک نہ پہنچ سکو، تو ایسی حالت میں حکم یہ ہے کہ فی الحال حج اور عمرہ کو ملتوی کر دو اور احرام سے حلال ہونے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرو کہ جو قربانی تم کو میسر آئے اونٹ یا گائے یا بکری اور بکری ادنیٰ درجہ ہے اس کو سرزمین حرم کی طرف بھیجو تا کہ وہ قربانی حرم میں ذبح کر دی جائے اور سر منڈا کر اس وقت تک احرام کھول کے حلال نہ ہو جب تک کہ وہ قربانی کا جانور اپنے خاص موقع محل پر پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے اور ہدی کے ذبح کا محل اور موقع حرم ہے کما قال تعالی: ﴿ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ﴾ وقال تعالی: ﴿هَدۡيًاۢ بٰلِغَ

ف۱ یعنی جس نے قران یا تمتع کیا اور اس کو قربانی میسر نہ ہوئی تو اس کو چاہیے کہ تین روزے رکھے حج کے دنوں میں جو کہ یوم عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ پر ختم ہوتے ہیں اور سات روزے جب رکھے کہ حج سے بالکل فارغ ہو جائے دونوں کا مجموعہ دس روزے ہو گیا۔

ف۲ یعنی قران وتمتع اسی کے لئے ہے جو مسجد حرام یعنی حرم مکہ کے اندر یا اس کے قریب نہ رہتا ہو بلکہ حل یعنی خارج از میقات کا رہنے والا ہو اور جو حرم مکہ کے رہنے والے ہیں وہ صرف افراد کریں۔

❶ اس لفظ سے گزشتہ آیت ﴿وَاَحۡسِنُوۡا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴾ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

الْکَعْبَۃِ﴾۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خون بہانا اس وقت تک عبادت نہیں جب تک کہ کسی خاص مکان یا خاص زمان میں نہ ہو۔ چونکہ یہ زمانہ قربانی کا نہیں اس لیے مکان میں بھیجنا ضروری ہوا۔ اس بناء پر محصر کے لیے یہ واجب ہوا کہ اپنی ہدی کو حرم میں بھیجے اور ذبح کے لیے کوئی دن مقرر کر لے تا کہ جب وہ دن آئے تو اس دن سر منڈا کر حلال ہو جائے اور اس فوت شدہ حج اور عمرہ کی بعد میں قضا کرے۔ پھر اگر تم میں سے کوئی مریض ہو جائے یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بیماری اور تکلیف کی وجہ سے قبل از وقت ہی سر منڈانا چاہے تو اس کے لیے اجازت ہے مگر اس پر اس جنایت اور تقصیر کا فدیہ اور بدلہ واجب ہے اس طرح سے کہ یا تو تین دن کے روزے رکھے یا چھ مسکینوں کو صدقہ اور خیرات دے اور فی مسکین نصف صاع گیہوں یعنی جو صدقۂ فطر کی مقدار ہے وہ دے یا کسی جانور کی قربانی دے جس کا اعلیٰ درجہ اونٹ ہے اور اوسط درجہ گائے اور ادنیٰ درجہ بکری ہے پس جب تم خاطر جمع ہو جاؤ یعنی احصار سے تم کو امن حاصل ہو جائے یا یہ کہ شروع ہی سے تم مامون اور بے خوف ہو تو جو شخص ایام حج میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر نفع حاصل کرنا چاہے یعنی یہ چاہے کہ حج کے زمانہ میں حج بھی کرلوں اور عمرہ بھی کرلوں خواہ دونوں کا احرام ساتھ باندھے یا یکے بعد دیگرے تو بیک وقت ان دو عبادتوں سے متمتع اور منتفع ہونے کے شکر میں اس کے ذمہ قربانی واجب ہے جو بھی میسر ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطاء فرمائی کہ حج اور عمرہ دونوں سے بہرہ مند ہوا اس نعمت کے شکر میں ایک ہدی واجب ہے جیسی بھی میسر ہو اور جس شخص نے فقط حج یا فقط عمرہ کیا تو اس پر یہ ہدی واجب نہیں پس جو شخص ان ایام میں حج اور عمرہ دونوں سے بہرہ مند ہو لیکن ناداری کی وجہ سے اس کو ہدی میسر نہ آئے تو اس کے ذمہ تین روزے تو زمانۂ حج میں واجب ہیں۔ جن کا آخری دن نویں تاریخ ذی الحجہ ہے اور اگر اس سے پہلے ہی تین روزے رکھ لے تو وہ بھی بالاجماع جائز ہیں اور ان تین کے علاوہ سات روزے جب رکھو کہ جب تم حج سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس ہونے لگو پس یہ پورے دس دن کے روزے ہوئے اور زمانۂ حج میں عمرہ اور حج کو ملا کر متمتع اور منتفع ہونے کی یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو مسجد حرام کے قرب و جوار اور اس کے آس پاس رہنے والے نہ ہوں یعنی حدود حرم اور حدود مواقیت سے باہر کے رہنے والے ہوں اور جو لوگ حدود حرم کے رہنے والے ہیں وہ صرف افراد کریں یعنی فقط حج کا احرام باندھیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو مبادا کہ حالت احرام میں کوئی خیانت کر بیٹھو۔ اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والے ہیں۔ اور احرام کی حالت، دربار کی حاضری کی علامت ہے اور دربار میں حاضر ہو کر جنایت اور معصیت کا مرتکب ہونا سخت جرم ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا

حج کے چند مہینے ہیں معلوم ف۱ پھر جس نے لازم کرلیا ان میں حج تو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ

حج کے کئی مہینے ہیں معلوم۔ پھر جس نے لازم کرلیا ان میں حج، تو بے پردہ ہونا نہیں عورت سے اور نہ

ف۱ شوال کے غرہ سے لے کر بقرعید کی صبح یعنی ذی الحجہ کی دسویں رات تک ان کا نام اشہر حج ہے اس لئے کہ احرام حج ان کے اندر ہوتا ہے اگر اس سے پہلے کوئی احرام حج کا باندھے گا تو وہ ناجائز یا مکروہ ہوگا یعنی حج کے لئے چند مہینے مقرر ہیں اور سب کو معلوم ہیں۔ مشرکین عرب جو اپنی ضرورت میں ان میں تغیر و تبدل کرتے تھے جس کو دوسری آیت میں ﴿اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ﴾ فرمایا گیا ہے۔ یہ بالکل بے اصل اور باطل ہے۔

جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ

جھگڑا کرنا حج کے زمانہ میں اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے ف۱ اور زادراہ لے لیا کرو کہ بیشک بہتر فائدہ زادراہ

گناہ کرنا نہ جھگڑا کرنا حج میں۔ اور جو کچھ تم کرو گے نیکی، اللہ کو معلوم ہوگی۔ اور خرچ راہ لیا کرو، کہ خرچ راہ میں بہتر ہے

التَّقْوٰى ؗ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا

کا بچنا ہے سوال سے اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقلمندو ف۲ کچھ گناہ نہیں تم پر کہ تلاش کرو فضل اپنے

گناہ سے بچنا۔ اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقلمندو۔ کچھ گناہ نہیں تم پر کہ تلاش کرو فضل

مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪

رب کا ف۳ پھر جب طواف کے لئے لوٹو عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو نزدیک مشعرالحرام کے ف۴

اپنے رب کا۔ پھر جب طواف کو چلو عرفات سے، تو یاد کرو اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے۔

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا

اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھلایا اور بیشک تم تھے اس سے پہلے ناواقف ف۵ پھر طواف کے لئے

اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھایا۔ اور تم تھے اس سے پہلے راہ بھولے۔ پھر طواف کو چلو

مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا

پھرو جہاں سے سب لوگ پھریں اور مغفرت چاہو اللہ سے بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے مہربان ف۶ پھر جب

جہاں سے سب لوگ چلیں، اور گناہ بخشواؤ اللہ سے۔ اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔ پھر جب

قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ

پورے کر چکو اپنے حج کے کام کو تو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو ف۷

پورے کر چکو اپنے حج کے کام تو یاد کرو اللہ کو جیسے یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو، بلکہ اس سے زیادہ یاد۔

ف۱ حج لازم کیا یعنی احرام حج کا باندھا اس طرح پر کہ دل سے نیت کی اور زبان سے تلبیہ پڑھا۔

ف۲ ایک طائفہ دستور کفر میں یہ بھی تھا کہ بغیر زادراہ خالی ہاتھ حج کو جانا ثواب سمجھتے اور اس کو توکل کہتے اور وہاں جا کر ہر ایک سے مانگتے پھرتے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن کو مقدور ہو وہ خرچ ہمراہ لے کر جائیں تا کہ خود تو سوال سے بچیں اور لوگوں کو حیران نہ کریں۔

ف۳ حج کے سفر میں اگر سوداگری بھی کرو تو گناہ نہیں بلکہ مباح ہے لوگوں کو اس میں شبہ ہوا تھا کہ شاید تجارت کر لینے سے حج میں نقصان آئے اب جس کا مقصود اصلی حج ہو اور اس کے ذیل میں تجارت بھی کر لے تو اس کے ثواب میں نقصان نہ آئے گا۔

ف۴ مشعرالحرام ایک پہاڑ کا نام ہے جو مزدلفہ میں واقع ہے جس پر امام وقوف کرتا ہے اس پہاڑ پر قیام کرنا افضل ہے اور تمام مزدلفہ میں جہاں قیام کرے جائز ہے سوائے وادی محسر کے۔

ف۵ یعنی کفار بھی اللہ کا ذکر کرتے تھے مگر شرک کے ساتھ، ذکر وہ چاہیے بلکہ توحید کے ساتھ جس کی تم کو ہدایت فرمائی۔

○

تتمہ احکام حج

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ... الی ... اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾

ربط:......گزشتہ آیات میں حج اور عمرہ کے اتمام کا ذکر تھا مگر چونکہ عمرہ کے لیے کوئی وقت معین نہیں اور حج کے لیے وقت معین ہے۔ نیز حج وعمرہ سے افضل ہے۔ اس لیے آئندہ آیات میں اشہر حج اور آداب حج کو ذکر فرماتے ہیں (بحر محیط)۔ حج کے احرام اور افعال کا وقت چند مہینے معلوم ہیں۔ شوال اور ذی قعدہ اور دس دن ذی الحجہ کے باقی اصل ارکان کا وقت یوم عرفہ اور یوم نحر ہے۔ شوال اور ذی قعدہ اور ذی الحجہ یہ خاص فضیلتوں اور برکتوں کے مہینے ہیں اور عشرہ ذی الحجہ تو اس قدر فضیلت اور برکت والا ہے کہ ایک عشرہ ہی قائم مقام پورے مہینے کے ہوگیا پس جس شخص نے ان مہینوں میں احرام ① باندھ کر اپنے اوپر حج لازم کرلیا تو اس کو چاہیے کہ احرام اور اشہر حج کا پورا احترام کرے لہٰذا اُس کو چاہیے کہ نہ کوئی فحش بات زبان سے نکالے اور نہ کوئی گناہ کا کام کرے اور نہ رفقاء سفر سے کوئی لڑائی اور جھگڑا کرے۔ جب تک حج میں رہے ان باتوں کا خاص طور پر خیال رکھے یہ تو ادنیٰ درجہ ہے کہ رفث اور فسوق اور جدال سے بچا رہے۔ اعلیٰ مرتبہ تو یہ ہے کہ نیک کاموں میں لگے رہو۔ حج کے زمانہ میں نیکی کی تاثیر اور بھی قوی ہوجاتی ہے اور کسی خیر کو معمولی سمجھ کر نہ چھوڑو کوئی معمولی سے معمولی بھی نیکی کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو جان لے گا کہ کس درجہ اخلاص اس کی تہ میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے مطابق تم کو اس کی جزاء عطا فرمائے گا اور خیر کے سمجھنے میں غلطی نہ کرنا جیسا کہ یمن کے لوگ حج کو بغیر زادِ راہ لیے آتے ہیں اور اس کو توکل سمجھتے ہیں اور پھر لوگوں سے بھیک مانگتے ہیں تم کو چاہیے کہ حج کے لیے زادِ راہ لے کر چلو۔ اپنے آپ کو بھیک اور سوال سے بچانا اس خیال توکل سے کہیں بہتر ہے۔ اور خوب سمجھ لو کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ اور اپنے آپ کو سوال سے بچانا یہ تقویٰ میں داخل ہے سفر آخرت میں اعمال صالحہ اور طاعات نافلہ کا توشہ اس درجہ مفید نہیں جتنا کہ تقویٰ کا توشہ مفید ہے اور ہر وقت مجھ سے ڈرتے رہو اے خالص عقل والو۔ عقلِ سلیم کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تقویٰ سے غافل نہ ہو اور بغیر توشہ لیے سفر نہ کرو۔

اباحت تجارت در زمانہ عبادت:......توشہ لینا تو کیا توکل کے منافی ہوتا زمانہ حج میں تجارت بھی توکل کے منافی نہیں اس لیے تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم زمانہ حج میں تجارت کرو اور اللہ کے فضل کو طلب کرو تا کہ وہ تجارت تمہارے لیے موجب سہولت و

ف ۶ زمانہ کفر کی ایک غلطی یہ بھی تھی کہ مکہ کے لوگ عرفات تک نہ جاتے کہ عرفات حرم سے باہر ہے بلکہ حرم کی حد یعنی مزدلفہ میں ٹھہر جاتے اور قریش مکہ کے سوا اور سب عرفات تک پہنچتے اور پھر وہاں سے طواف کے لئے مکہ کو واپس آتے سو اس لئے فرما دیا کہ جہاں سے سب لوگ طواف کو آئیں تم بھی وہیں سے جا کر لوٹو یعنی عرفات سے اور اگلی تقصیر پر نادم ہو۔

ف ۷ یعنی دسویں ذی الحجہ کو جب افعال حج رمی جمرہ اور ذبح قربانی اور سر منڈوانے اور طواف کعبہ اور سعی صفا مروہ سے فراغت پا چکو تو زمانہ قیام منیٰ میں اللہ کا ذکر کرو جیسے کفر کے زمانہ میں اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرنا چاہیے۔ ان کا قدیم دستور تھا کہ حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں تین روز قیام کرتے اور بازار لگاتے اور اپنے باپ دادا کی بڑائی اور فضائل بیان کیا کرتے سو اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا اور فرما دیا کہ ان دنوں میں خدا تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو۔

---

① امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک احرام کے لیے نیت کے ساتھ تلبیہ بھی ضروری ہے جیسے نماز میں تکبیر تحریمہ اور امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک فقط قلب سے نیت کرنے کا نام احرام ہے تلبیہ شرط نہیں۔ امام اعظم فرماتے ہیں کہ احادیث میں احرام کو لفظ اہلال سے تعبیر کیا ہے اور اہلال کے معنی تلبیہ کے ہیں۔

راحت ہو اور تمہاری عبادت میں موجب اعانت ہو پھر جب تم میدان عرفات سے لوٹو تو مزدلفہ میں مشعر حرام کے قریب اللہ کو دل اور زبان سے یاد کرو اور اللہ کا ذکر اس طرح کرو جس طرح تم کو ہدایت کی ہے یعنی کفار کی طرح اللہ کے ذکر میں کوئی کلمہ شرک کا نہ ملاؤ۔ خالص اللہ کا ذکر کرو اور تحقیق تم اللہ کی ہدایت اور رہ نمائی سے پہلے گمراہوں میں تھے صحیح راستہ ہمارے بتلانے سے تم کو معلوم ہوا پھر ہم تم کو یہ ہدایت کرتے ہیں کہ حج کے بارے میں گمراہوں کے طریقہ پر نہ چلنا صحیح راستہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے اسی طریقہ پر حج کرنا چونکہ عرفات حدودِ حرم سے باہر ہے اور مزدلفہ حدودِ حرم میں ہے۔ اس لیے قریش مکہ نے اپنے لیے یہ طریقہ نکال رکھا تھا کہ مزدلفہ میں ٹھہر جاتے اور عام لوگوں کی طرح عرفات میں نہ جاتے اور یہ کہتے کہ ہم اہل اللہ ہیں اور اللہ والے ہیں۔ اور اس کے حرم کے رہنے والے ہیں اس لیے حرم سے باہر نہ جائیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور یہ حکم ہوا کہ سب لوگوں کو چاہیے خواہ وہ قریش ہوں یا غیر قریش سب اسی جگہ سے واپس ہوں جہاں سے تمام لوگ واپس آتے ہیں اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی قرات میں ہے ﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسِى﴾ تم سب اسی جگہ سے لوٹو جہاں سے تمہارے باپ آدم علیہ السلام بھولنے والے واپس ہوئے تھے یعنی حضرت آدم علیہ السلام بھی عرفات سے واپس ہوئے تھے اور پھر مزدلفہ آئے اور پھر وہاں سے منیٰ آئے اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کا طریقہ بھی یہی ہے کہ واپسی عرفات سے ہو اور جب عرفات سے واپس ہو تو توبہ اور استغفار کرتے ہوئے واپس ہو اگرچہ اللہ نے اہل عرفات کی مغفرت کا فرشتوں میں اعلان فرما دیا ہے مگر تم کو چاہیے کہ توبہ اور استغفار سے غافل نہ ہو جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا سلام پھیر کر تین مرتبہ استغفار فرماتے اسی طرح تم کو چاہیے کہ عرفات سے واپسی پر توبہ اور استغفار کرو سابق مغفرت پر مغرور نہ ہو جاؤ عبادت کتنی ہی کامل کیوں نہ ہو مگر ہر حال میں لائق توبہ اور استغفار ہے بے شک اللہ بڑے بخشنے والے مہربان ہیں۔ عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب حج سے فارغ ہو جاتے تو تین روز منیٰ میں قیام کرتے اور بازار لگاتے اور اپنے آباء واجداد کے مفاخر اور مآثر بیان کرتے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور بجائے اس کے اپنے ذکر کا حکم دیا چنانچہ فرماتے ہیں پس جب تم اپنے افعال حج سے فارغ ہو جاؤ رمی جمرہ اور قربانی اور سر منڈا چکو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر ایسے ذوق وشوق سے کیا کرو جیسا کہ تم اپنے آباء واجداد کا کرتے ہو بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ باپ دادا کا احسان فقط اتنا ہے کہ انہوں نے تم کو پالا اور پرورش کیا مگر وہ تمہارے خالق نہیں اور اللہ تمہارا خالق اور مربی بھی ہے جس کی نعمتوں کا شمار ممکن نہیں ایسے متبرک مقامات میں اللہ کو یاد کرنا چاہیے آباء واجداد کا ذکر بے سود ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

پھر کوئی آدمی تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔

پھر کوئی آدمی کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں، اور اس کو آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا

اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو

اور کوئی ان میں کہتا ہے، اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی، اور بچا ہم کو

عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

دوزخ کے عذاب سے انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے اپنی کمائی سے ف۱ اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے ف۲

دوزخ کے عذاب سے۔ یہ لوگ انہی کو ہے کچھ حِصّہ اپنی کمائی سے۔ اور اللہ جلد لیتا ہے حساب۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ

اور یاد کرو اللہ کو گنتی کے چند دنوں میں ف۳ پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو ہی دن میں تو اس پر گناہ نہیں اس پر اور جو کوئی

اور یاد کرو اللہ کو کئی دن گنتی کے۔ پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو دن میں، اس پر نہیں گناہ اور جو کوئی

تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

رہ گیا تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہ ڈرتا ہے ف۴ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو بیشک تم سب اسی کے پاس جمع ہو گے ف۵

رہ گیا اس پر نہیں گناہ، جو کوئی ڈرتا ہے۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے، اور جان رکھو کہ تم اسی پاس جمع ہو گے۔

اہل ذکر اور اہل دعا کی اقسام

قَالَ تَعَالٰی: ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا ... الی ... وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں اللہ کے ذکر اور یاد کا حکم تھا اب اہل ذکر کی اقسام کا بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والے اور اس سے دعا مانگنے والے دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جو فقط دنیا کے طالب ہیں۔ یہ لوگ فقط دنیاوی عزت اور وجاہت اور فقط مال و دولت کی دعا مانگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے آخرت کی نعمتوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں کی خوبی اور بھلائی خدا تعالیٰ سے مانگتے ہیں ان کو تمام حسنات سے پورا حصہ ملے گا ایک تیسری قسم اور بھی ہے وہ یہ کہ سوائے آخرت کے کچھ نہ مانگے۔ سو اول تو ایسی قسم بہت ہی قلیل اور نادر بلکہ تقریباً معدوم ہے۔ نیز یہ صورت شرعاً بھی پسندیدہ نہیں۔ انسان ضعیف

ف۱ پہلے یہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، اور دوں کا مت کرو اب یہ بتلایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اور اس سے دعا مانگنے والے بھی دو قسم کے ہیں ایک وہ کہ جن کو مطلوب صرف دنیا ہے ان کی دعا یہی ہے کہ ہم کو جو کچھ دولت عزت وغیرہ دی جائے دنیا ہی میں دے دی جائے سو یہ لوگ تو آخرت کی نعمتوں سے بے بہرہ ہیں دوسرے وہ کہ طالب آخرت ہیں جو دنیا کی خوبی یعنی توفیق بندگی وغیرہ اور آخرت کی خوبی یعنی ثواب اور رحمت و جنت دونوں کو طلب کرتے ہیں سو ایسوں کو آخرت میں ان کے حج اور دعا جملہ حسنات سے پورا حصہ ملے گا۔

ف۲ یعنی قیامت کو سب سے ایک دم میں حساب لے گا یاں کہو کہ قیامت کو دور نہ سمجھو بلکہ جلد آنے والی ہے اس سے کسی طرح بچاؤ ممکن نہیں اس کی فکر سے غافل مت ہو۔

ف۳ ایام معدودات سے مراد ذی الحجہ کی گیارھویں، بارھویں، تیرھویں، تاریخیں ہیں جن میں حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں قیام کا حکم ہے ان دنوں میں رمی جمار یعنی کنکریوں کے مارنے کے وقت اور ہر نماز کے بعد تکبیر کہنے کا حکم ہے اور دیگر اوقات میں بھی ان دنوں میں چاہیے کہ تکبیر اور ذکر الٰہی کثرت سے کرے۔

ف۴ یعنی گناہ تو یہ ہے کہ ممنوعات شرعیہ سے پرہیز نہ کرے اور جو کوئی اللہ سے ڈرے اور زمانہ حج میں پرہیزگاری کرے تو پھر اس بات میں کچھ گناہ نہیں کہ منیٰ میں دو دن قیام کیا یا تین دن کہ اللہ نے دونوں باتیں جائز رکھیں گو افضل یہی ہے کہ تین روز قیام کرے۔

ف۵ یعنی حج کی خصوصیت نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے ہر کام میں اور ہر وقت ڈرتے رہو کہ تم سب کو قبروں سے اٹھ کر اس کے پاس جمع ہونا ہے حساب دینے کو اب حج کا ذکر تو تمام ہو چکا مگر حج کے ذیل میں جو لوگوں کی دو قسموں کا ذکر آ گیا تھا فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اور وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ یعنی کافر اور مومن کا تو اب اس کی مناسبت سے تیسری قسم یعنی منافق کا حال بھی بیان کیا جاتا ہے۔

اور ناتواں ہے دنیاوی ضرورتوں سے مستغنی نہیں عبدیت کا مقتضی یہ ہے کہ جوتی کا تسمہ بھی خدا سے مانگے۔ انسان کو پیدا ہی مانگنے کے لیے کیا ہے۔ نیز انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت بھی یہی ہے کہ تمام دینی اور دنیوی آفتوں سے پناہ مانگے تاکہ سکون اور اطمینان کے ساتھ اللہ کی عبادت کر سکے۔ نیز اللہ سے مانگنا عزت ہے اور مخلوق سے مانگنا ذلت ہے اللہ سے جتنا مانگو گے اتنا ہی زیادہ خدا کے مقرب بنو گے۔ بخلاف مخلوق کے کہ اس سے جتنا مانگو گے اتنا ہی زیادہ اس سے دور ہو گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ پس بعضے لوگ کوتاہ نظر جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ایسے متبرک اور مقدس مقامات میں فقط دنیا ہی کی دعا مانگتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو جو کچھ دینا ہے وہ دنیا ہی میں دے دے اس شخص نے اگرچہ ہم کو پکارا اور ہم کو یاد کیا لیکن ہمارے گھر میں آکر ہم سے ہم کو نہ مانگا بلکہ دنیائے دوں کو مانگا اس لیے کہ اس شخص کو جو کچھ دینا ہو گا وہ ہم دنیا ہی میں دے دیں گے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہ ہو گا اور بعضے آخرت کے شیدائی اور فدائی ایسے ہوشیار ہیں کہ دنیا ہی میں آخرت کے طلبگار ہیں اور اپنی دعا میں یہ کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو دنیا میں رہتے ہوئے ایسی بھلائی اور نیکی عطا فرما جو ہمارے ① وہم گمان سے بالاتر ہو اور برتر ہو اور تیری خوشنودی اور رضامندی کا ذریعہ ہو اور آخرت میں بھی ہم کو نیکی اور بھلائی عطا فرما یعنی ثواب اور رحمت سے سرفراز فرما اور عفو اور مغفرت کے ذریعہ ہم کو عذاب دوزخ سے محفوظ فرما ایسے لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت میں بہت بڑا حصہ ہے اس چیز سے جو انہوں نے اپنی دعا اور استدعاء اور اعمال صالحہ سے کمایا ہے اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والے ہیں۔ یعنی قیامت قریب ہے تم اس سے غافل نہ ہو اور ایام تشریق میں اللہ کو یاد کرو جو گنتی کے دن ہیں۔ ایام معدودات سے ذی الحجہ کی گیارھویں، بارھویں، تیرھویں تاریخیں مراد ہیں جن میں تینوں جمروں کی رمی ہوتی ہے بخلاف دسویں تاریخ کے کہ اس میں فقط جمرۂ عقبہ کی رمی ہوتی ہے اس دسویں تاریخ کے علاوہ تین دن مراد ہیں ان دنوں میں منیٰ میں قیام کا حکم ہے اور یہ بھی حکم ہے کہ نمازوں کے بعد تکبیر کہو اور رمی جمار کے وقت بھی تکبیر کہو اور قربانی کے وقت بھی تکبیر کہو اور دیگر اوقات میں بھی کثرت سے اللہ کا ذکر کرو اور تکبیر پڑھو پس جو شخص منیٰ سے کوچ کرنے میں جلدی کرے اور کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد صرف دو دن منیٰ میں ٹھہر کر بارھویں کو مکہ میں واپس آجائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اس کا حج پورا ہو گیا حج کے ثواب میں کوئی کمی نہ رہے گی اور جو شخص منیٰ میں ٹھہرا رہا اور تیرھویں تاریخ کی رمی کر کے مکہ واپس آیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ آیت اہل جاہلیت کے رد کے لیے نازل ہوئی بعض لوگ جلدی چلے جانے والے کو گنہگار سمجھتے تھے اور بعضے تاخیر کرنے والوں کو گنہگار سمجھتے تھے اللہ نے فرمایا کہ نہ تعجیل میں گناہ ہے اور نہ تاخیر میں اگرچہ اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ تین دن قیام کر کے واپس ہو۔ بہرحال تعجیل اور تاخیر ہر صورت میں حج مکمل ہو گیا اس کو حج کا پورا ثواب ملے گا اور تمام گناہ اس کے معاف ہو جائیں گے مگر یہ فضیلت اور یہ رعایت اس شخص کے لیے ہے جو اپنے حج میں رفث اور فسوق اور جدال اور دیگر افعال ممنوعہ سے بچتا رہا۔ اور تقویٰ کے لیے حج کی کوئی خصوصیت نہیں ہر کام میں ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع کیے جاؤ گے اور تمام اعمال کا حساب دینا ہو گا۔

فائدہ:...... جاننا چاہیے کہ آیت شریفہ میں ایام معدودات سے علاوہ یوم النحر (یعنی دسویں تاریخ ذی الحجہ کے علاوہ) تین دن مراد ہیں جن کو ایام تشریق بھی کہتے ہیں یعنی گیارھویں اور بارھویں اور تیرھویں تاریخ مراد ہیں اور ﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ﴾

① یہ ترجمہ حسنۃ کی تنوین تنکیر کا ہے۔ نکرہ وہ ہے جو معلوم نہ ہو معرفہ اس کی ضد ہے۔

میں دسویں تاریخ کے علاوہ دو دن یعنی گیارھویں اور بارھویں تاریخ ذی الحجہ مراد ہیں۔ حضرات اہل علم کے لیے امام قرطبی کی عبارت پیش کرتے ہیں:

" امر اللہ سبحانہ وتعالی عبادہ بذکرہ فی الایام المعدودات وھی الثلاثہ التی بعد یوم النحر ولیس یوم النحر منھا لاجماع الناس انہ لاینفر احد یوم النفر وھو ثانی یوم النحر ولو کان یوم النحر فی المعدودات لساغ ان ینفر من شاء متعجلا یوم النفر لانہ قد اخذ یومین من المعدودات خرج الدار قطنی والترمذی وغیرھما عن عبدالرحمن بن یعمر الدیلی ان ناسا من اھل نجدا توا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وھو بعرفۃ فسألوہ فامر منادیا فنادی الحج عرفۃ فمن جاء لیلۃ جمع قبل طلوع الفجر فقد ادرك ایام منی الثلاثۃ فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ ومن تاخر فلا اثم علیہ ای من تعجل من الحاج فی یومین من ایام منی صار مقامہ بمنی ثلاثۃ بیوم النحر ویسقط عنہ رمی الیوم الثالث ومن لم ینفر منھا الا فی آخر الیوم الثالث حصل لہ بمنی مقام اربعۃ ایام من اجل یوم النحر۔ الخ۔ (کذا فی احکام القرآن للقرطبی: ۲/۳)۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ

اور بعضا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہے تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگانی کے کاموں میں اور گواہ کرتا ہے اللہ کو اپنے دل کی بات پر

اور بعضا آدمی ہے کہ خوش آئے تجھ کو بات اس کی دنیا کی زندگی میں، اور گواہ پکڑتا ہے اللہ کو اپنے دل کی بات پر

وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ

اور وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں

اور وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور جب پیٹھ پھیرے دوڑتا پھرے ملک میں کہ اس میں ویرانی کرے اور ہلاک کرے کھیتیاں

وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ

اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آمادہ کرے اس کو غرور

اور جانیں۔ اور اللہ خوش نہیں رکھتا فساد کرنا۔ اور جو کہے اس کو اللہ سے ڈر، تو کھینچ لائے اس کو غرور

بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ

گناہ پر سو کافی ہے اس کو دوزخ اور وہ بیشک برا ٹھکانا ہے ف۱ اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے کہ بیچتا ہے اپنی جان کو

گناہ پر، پھر بس ہے اس کو دوزخ۔ اور بری تیاری ہے۔ اور کوئی آدمی ہے جو بیچتا ہے اپنی جان

ف۱ یہ حال ہے منافق کا کہ ظاہر میں خوشامد کرے اور اللہ کو گواہ کرے کہ میں سچا ہوں اور میرے دل میں اسلام کی محبت ہے اور جھگڑے کے وقت کمی نہ کرے اور قابو پاوے تو لوٹ مار مچاوے اور منع کرنے سے اس کو زیادہ ضد چڑھے اور گناہ میں ترقی کرے، کہتے ہیں ایک شخص اخنس ابن شریق تھا منافق فصیح و بلیغ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتا تو نہایت اخلاص اور محبت اسلام ظاہر کرتا اور جب چلا جاتا تو کسی کی کھیتی جلا دیتا کسی کے جانوروں کے پیر کاٹ ڈالتا اس پر =

ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ⑳

اللہ کی رضاجوئی میں ف۱ اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر ف۲

تلاش کرتا خوشی اللہ کی۔ اور اللہ شفقت رکھتا ہے بندوں پر۔

تقسیم دیگر

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ... الی ... وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں اغراض دعا کے اعتبار سے تقسیم کا ذکر تھا اب ان آیات میں اخلاص اور نفاق کے اعتبار سے لوگوں کی تقسیم بیان فرماتے ہیں۔ پہلے ایک منافق کا حال بیان کرتے ہیں جس کا نام اخنس بن شریق تھا۔ یہ شخص بڑا فصیح اللسان اور شیریں بیان اور حسین اور خوبصورت تھا۔ جب حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بڑی باتیں بناتا اور قسمیں کھاتا کہ مجھ کو حضور ﷺ سے محبت ہے اور جب آپ ﷺ کے پاس سے جاتا تو فساد پھیلاتا، لوگوں کی کھیتیوں کو جلاتا اور مویشیوں کو ہلاک کرتا۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور بعضا آدمی ایسا چرب لساں ہے کہ جب وہ دنیاوی اغراض اور مقاصد کے بارے میں کچھ کہتا ہے تو آپ ﷺ کو بھی اس کی بات حیرت اور تعجب میں ڈال دیتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو اپنے دل کی بات پر گواہ بناتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرا دل اسلام اور آپ کی محبت سے لبریز ہے اور حالانکہ دل اس کا عداوت سے لبریز ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے ایسی شدید عداوت اور شدید خصومت رکھتا ہے کہ جھگڑے میں کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ ایسی شدید خصومت سے صاف ظاہر ہے کہ دل میں محبت کا نام ونشان بھی نہیں یہ حال تو دلی عداوت اور خصومت کا ہوا اور شرارت کا یہ حال ہے کہ جب آپ ﷺ کی مجلس سے پشت پھیر کر جاتا ہے تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے کہ زمین میں فساد اور تباہی پھیلائے اور کھیتوں اور مویشیوں کو ہلاک کرے اگر حقیقۃً اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا محب ہوتا تو ہرگز ایسے کام نہ کرتا معلوم ہوا کہ محب نہیں۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کا مفسد ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے اور ایسا شخص تو اللہ کا محب ہو ہی نہیں سکتا اس لیے کہ اس مغرور کو خدا تعالیٰ کی کوئی پرواہ نہیں اس کا حال تو یہ ہے کہ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر اور فساد نہ مچا اور لوگوں کی کھیتیوں اور مویشیوں کو مت برباد کر تو نخوت اور بڑائی اس کو اور گناہ پر آمادہ کرتی ہے اور ضد میں آکر اور زیادہ فساد برپا کرنے لگتا ہے پس سمجھ لو کہ جس کو تقویٰ اور خدا کے خوف کی نصیحت کافی نہ ہو تو اس کو جہنم ہی کفایت کرے گی۔ اور اس عزت اور نخوت کے بدلہ میں ہمیشہ کی ذلت میں مبتلا رہے گا اور جہنم کا یہ ذلت آمیز فرش بہت ہی برا فرش ہے اب آئندہ آیت میں ایک کامل

=منافقین کی برائی میں یہ آیت نازل ہوئی۔

ف۱ پہلی آیت میں اس منافق کا ذکر تھا جو دین کے بدلے دنیا لیتا تھا اس کے مقابلہ میں اب اس آیت میں اس مخلص کامل الایمان کا ذکر ہے۔ جو دنیا اور جان و مال کو طلب دین میں صرف کرتا ہے۔ کہتے ہیں حضرت صہیب رومی بارادۂ ہجرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے رستہ میں مشرکین نے ان کو گھیر لیا صہیب نے کہا کہ میں اپنا گھر اور تمام مال تم کو اس شرط پر دیتا ہوں کہ مجھ کو مدینہ جانے دو اور ہجرت سے نہ روکو اس پر وہ راضی ہو گئے اور صہیب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلے گئے اس پر یہ آیت مخلصین کی تعریف میں نازل ہوئی۔

ف۲ اس کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ اپنے بندوں کو توفیق دی جو اسکی خوشی میں اپنی جان اور مال حاضر کر دیتے ہیں اور نیز ہر ایک کی جان و مال تو اللہ کی ملک ہے پھر جنت کے بدلے اس کو خریدنا یہ محض اس کا احسان ہے۔

الایمان مخلص کا ذکر فرماتے ہیں یعنی صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو قریش نے آکر گھیر لیا حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تم کو اپنا تمام مال دے دیتا ہوں تم مجھ کو مدینہ جانے دو۔ قریش نے اس کو منظور کر لیا اس طرح حضرت صہیب رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام واقعہ بیان کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اور یہ فرمایا:

"رَبِحَ بَيْعُكَ يَا اَبَا يَحْيٰى"، "اے ابو یحیٰ تیری بیع بہت فائدہ مند ہوئی۔"

اور اس کے بعد فرمایا کہ تیرے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ﴾ الخ یعنی اور بعض لوگ ایسے عاقل اور دانا ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ عزت اللہ کی راہ میں جانبازی اور سرفروشی اور تذلل اور خاکساری سے ہی حاصل ہوتی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی جان کو خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور یہ محض اللہ کی خوشنودی کی طلب اور تلاش میں کرتے ہیں اس کے سوا اور کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اور اللہ ایسے بندوں پر جو اس کی راہ میں جان بھی دے ڈالیں بڑے ہی مہربان ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے سچے محب اور مخلص ہیں ان کو اگر خدا تعالیٰ کے تقوی کی نصیحت کرے تو ان کا عجب حال ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ کسی نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا "اِتَّقِ اللهَ" (اللہ سے ڈرو) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً تواضع سے اپنا رخسار زمین پر رکھ دیا۔

ہارون رشید رحمہ اللہ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک یہودی ایک سال تک اپنی ضرورت لے کر ہارون رشید رحمہ اللہ کے دروازہ پر حاضر ہوتا رہا۔ حاجت براری نہ ہوئی۔ ایک دن ہارون رشید رحمہ اللہ محل سے برآمد ہوئے کہیں جا رہے تھے کہ یہودی نے سامنے سے آکر کھڑا ہو گیا اور یہ کہا اتق اللہ یا امیر المومنین "اے امیر المومنین اللہ سے ڈرو" ہارون رشید رحمہ اللہ یہ سنتے ہی فوراً سواری سے اتر پڑے اور وہیں زمین پر سجدہ کیا۔ سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد حکم دیا کہ اس یہودی کی حاجت پوری کی جائے۔ چنانچہ اسی وقت اس کی حاجت پوری کر دی گئی جب محل واپس ہوئے تو کسی نے کہا اے امیر المومنین آپ ایک یہودی کے کہنے سے فوراً زمین پر اتر پڑے۔ فرمایا کہ یہودی کے کہنے کی وجہ سے نہیں اترا بلکہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد یاد آیا: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ اس لیے سواری سے اترا اور سجدہ کیا۔ (تفسیر قرطبی: ۱۹/۳)

فائدہ:...... ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ﴾ میں علماء کے دو قول ہیں ایک یہ کہ یشری سے یبیع یعنی فروخت کرنے کے معنی مراد ہیں اس تفسیر پر ترجمہ ہوگا کہ بعضے لوگ اپنی جان کو خدا کے ہاتھ بمعاوضۂ جنت فروخت کر دیتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یشری بمعنی یشتری یعنی خریدنے کے معنی میں ہے اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض لوگ اعمال صالحہ کر کے اپنی جان کو خرید لیتے ہیں یعنی خطرات اور خوفناک چیزوں سے اپنی جان کو بچا لیتے ہیں۔ راجح قول یہی ہے کہ یشری سے یبیع کے معنی مراد ہیں۔ بعضے لوگ ایسے ہیں کہ اپنی جان خدا تعالیٰ کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے وہ جان پھر انہی کے قبضہ میں رہنے دیتے ہیں اور جان کی حفاظت انہی کے سپرد کر دیتے ہیں کہ یہ ہماری امانت ہے بغیر ہماری اجازت کے اس میں کوئی تصرف نہ کرنا۔ نیز بندہ کا اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کرنا اور اللہ تعالیٰ کا اس کو خریدنا محض ظاہر کے اعتبار سے ہے کہ ظاہراً بندہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی جان کا مالک ہوں ورنہ فی الحقیقت سب چیزوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ابن

عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ کو سن کر عوام تو خوش ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے بمعاوضہ جنت ہماری جانیں خرید لیں اب ہم کو اس کے عوض جنت ملے گی مگر خواص شرم کے مارے زمین میں گڑ گئے کہ ہم میں دعویٰ مالکیت کا تھا جب ہی تو اشتری فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ

اے ایمان والو داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے ف۱ اور مت چلو قدموں پر شیطان کے

اے ایمان والو ! داخل ہو مسلمانی میں پورے پورے، اور مت چلو قدموں پر شیطان کے۔

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا

بیشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے ف۲ پھر اگر تم بچلنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے تم کو صاف حکم تو جان رکھو کہ

وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ پھر اگر ڈگنے لگو ، بعد اس کے کہ پہنچے تم کو صاف حکم ، تو جان رکھو

اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ

بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا ف۳ کیا وہ اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں

کہ اللہ زبردست ہے حکمت والا۔ کیا لوگ یہی انتظار رکھتے ہیں ؟ کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں

وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع ۲۵/۱۴

اور فرشتے اور طے ہو جاوے قصہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام ف۴

اور فرشتے اور فیصل ہووے کام۔ اور اللہ کی طرف رجوع ہیں سب کام۔

ف۱ پہلی آیت میں مومن مخلص کی مدح فرمائی تھی جس سے نفاق کا ابطال منظور تھا، اب فرماتے ہیں کہ اسلام کو پورا پورا قبول کرو یعنی ظاہر اور باطن اور عقیدہ اور عمل میں صرف احکام اسلام کا اتباع کرو یہ نہ ہو کہ اپنی عقل یا کسی دوسرے کے کہنے سے کوئی حکم تسلیم کر لو یا کوئی عمل کرنے لگو سو اس سے بدعت کا قلع قمع مقصود ہے کیونکہ بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ کسی عقیدہ یا کسی عمل کو کسی وجہ سے مستحسن سمجھ کر اپنی طرف سے دین میں شمار کر لیا جائے مثلاً نماز اور روزہ جو کہ افضل عبادات ہیں اگر بدون حکم شریعت کوئی اپنی طرف سے مقرر کرنے لگے جیسے عید کے دن عیدگاہ میں نوافل کا پڑھنا یا ہزارہ روزہ رکھنا یہ بدعت ہوگا، خلاصہ ان آیات کا یہ ہوا کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور بدعات سے بچتے رہو چند حضرات یہود سے مشرف بہ اسلام ہوئے مگر احکام اسلام کے ساتھ احکام تورات کی بھی رعایت کرنی چاہتے تھے مثلاً ہفتہ کے دن کو معظم سمجھنا اور اونٹ کے گوشت اور دودھ کو حرام ماننا اور تورات کی تلاوت کرنا اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس سے بدعت کا انسداد کامل فرمایا گیا۔

ف۲ کہ اپنے وسوسہ سے بے اصل چیزوں کو تمہارے دلنشین کر دیتا ہے اور دین میں بدعات کو شامل کرا کر تمہارے دین کو خراب کرتا ہے اور تم اس کو پسند کرتے ہو۔

ف۳ یعنی شریعت محمدی کے صاف صاف احکام معلوم ہونے کے بعد بھی اگر کوئی اس پر قائم نہ ہو بلکہ دوسری طرف بھی نظر رکھے تو خوب سمجھ لو کہ اللہ سب پر غالب ہے جس کو چاہے سزا دے کوئی اس کے عذاب کو روک نہیں سکتا بڑا حکمت والا ہے جو کرتا ہے حق اور مصلحت کے موافق کرتا ہے خواہ عذاب دے یا کچھ ڈھیل دے یعنی نہ جلد باز ہے نہ بھولنے والا نہ خلاف انصاف اور غیر مناسب امر کو کرنے والا۔

ف۴ یعنی جو لوگ حق تعالیٰ کے صاف صاف احکام کے بعد بھی اپنی کجروی سے باز نہیں آتے تو ان کو رسول اور قرآن پر تو یقین اور اعتماد نہ ہوا اب صرف اس کی کسر ہے کہ خدائے پاک خود اور اس کے فرشتے ان پر آئیں اور جزا اور سزا کا قصہ جو قیامت کو ہونے والا ہے آج ہی فیصل کیا جائے سو آخر کار سب امور حساب اور عذاب وغیرہ کا مرجع اللہ ہی کی طرف ہے تمام حکم اسی کے حضور سے صادر ہوں گے اس میں کوئی تردد کی بات نہیں گھبراتے کیوں ہو۔

حکم دوازدہم، استسلام تام وقبول جمیع احکام اسلام

قال تعالیٰ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا ... الی ... وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں ایمان اور اخلاص کا ذکر تھا اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان اور اخلاص کا مقتضی یہ ہے کہ دین اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور اسلام میں داخل ہونے کے بعد دین سابق یعنی یہودیت اور نصرانیت کی رعایت سے کوئی کام نہ کرو ایک دین میں داخل ہونے کے بعد دوسرے دین کی طرف بھی نظر رکھنا یہ اخلاص کے منافی ہے نیز جو شخص ① اپنے نفس کو اللہ کے ہاتھ فروخت کرے اور اس کی رضا اور خوشنودی کا طلب گار ہو اور اس کی اُس خاص رحمت ورأفت کا امیدوار ہو جو عباد مخلصین پر نازل ہوتی ہے تو اس کو چاہیے کہ اپنے اعمال میں قرآن کے بعد توریت اور انجیل کی رعایت نہ کرے ناسخ کے ہوتے ہوئے منسوخ کی رعایت، بدعت اور ضلالت ہے جو باعث عقوبت ہے۔ یہ آیت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دیگر علماء یہود کے بارے میں نازل ہوئی کہ اسلام لانے کے بعد آنحضرت ﷺ سے یہ درخواست کی کہ ہم کو احکام کی تعمیل کے ساتھ اس کی بھی اجازت دے دی جائے کہ شریعتِ موسویہ کے مطابق ہفتہ کی تعظیم اور اونٹ کے گوشت اور دودھ سے پرہیز کرتے رہیں اور توریت کی بھی تلاوت کرتے رہیں۔ اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی اے ایمان والو ایمان کا مقتضی یہ ہے کہ اسلام میں ظاہراً اور باطناً، اعتقاداً اور عملاً پورے پورے داخل ہو جاؤ اور اسلام میں کسی اور چیز کو ہرگز نہ ملاؤ مبادا یہودیت اور نصرانیت کی آمیزش سے اسلام کے آب طہور کے رنگ یا بو یا مزہ میں کہیں فرق آجائے اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو ناسخ کے بعد منسوخ کی رعایت کرنا شیطان کے نشان قدم پر چلنا ہے۔ تحقیق وہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے کہ جو چیز دین نہیں اس کو دین بتا کر تم سے کرانا چاہتا ہے اور بدعت کی حقیقت بھی یہی ہے کہ جو چیز دین نہ ہو اس کو دین سمجھ لیا جائے ان مومنین اہل کتاب کے دل میں شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ شریعتِ موسویہ میں ہفتہ کی تعظیم واجب ہے اور شریعت محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں اور اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت اور دودھ حرام ہے اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں۔ اس لیے اگر ہم بدستور عملاً ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اعتقاداً اس کو واجب نہ سمجھیں اور اونٹ کے گوشت اور دودھ کو عملاً ترک کر دیں اور اعتقاداً اس کو حلال سمجھتے رہیں تو اس میں شریعتِ محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا اور شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے گی اور وہ عمل زیادہ موجب ثواب ہوگا۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں اس خیال کی اصلاح فرمائی کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد صرف اسلام ہی کی رعایت سے عمل کرنا فرض اور لازم ہے اور جو امر اسلام میں قابل رعایت نہیں۔ دین سمجھ کر اس کی رعایت کرنا بدعت ہے جو شیطان کا وسوسہ ہے اور ایک دین میں داخل ہونے کے بعد گزشتہ دین کی طرف نظر رکھنا اخلاص کے منافی ہے پس اگر تم واضح اور روشن احکام آنے کے بعد بھی پھسلے اور شیطان کے قدموں پر چلے اور شریعت محمدیہ کے احکام کے اتباع اور تعمیل میں اعتقادی اور باطنی طور پر یہودیت اور نصرانیت کی رعایت کی تو خوب جان لو کہ اللہ غالب اور زبردست ہے ایسے لوگوں کو سخت سزا دے گا جو ظاہر تو یہ کریں کہ ہم شریعت محمدیہ پر عامل ہیں اور باطن میں یہودیت اور نصرانیت ملحوظ رہے اور بڑی

① اس عبارت میں ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ﴾ اور ﴿ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

حکمت والا ہے کہ ایسے لوگوں سے انتقام میں جلدی نہیں فرماتا کسی حکمت سے مہلت دے رکھی ہے کیا یہ لوگ جو اپنے باطنی انکار کو ظاہری اقرار کے پردہ میں چھپاتے ہیں اب صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ قیامت قائم ہو۔ اور اولین اور آخرین جمع ہوں اور اللہ تعالیٰ ان کے حساب و کتاب اور جزاء اور سزا کے لیے خود سفید ابر کے سائبانوں میں نزول اجلال فرمائیں اور فرشتے بھی ساتھ آئیں اور ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا اور سزا دے دی جائے اور اس میں شک اور تردد کیا ہے تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں نے اپنے باطنی انکار کو ظاہری اقرار کے پردہ میں چھپایا اس لیے قیامت کے دن اللہ کا قہر، مہر کے پردہ یعنی سفید بادل کی شکل میں نمودار ہوگا۔

فائدہ اول:...... حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ اور فرشتے کے آنے کا واقعہ قیامت کے دن پیش آئے گا جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے: ﴿كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ وَجِاْىٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۚ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأْتِيَهُمُ الْمَلَٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِىَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِىَ بَعْضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ﴾۔

"وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمِ قَالَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ قِيَامًا شَاخِصَةً اَبْصَارُهُمْ اِلَى السَّمَاءِ يَنْتَظِرُوْنَ فَصْلَ الْقَضَاءِ وَيَنْزِلُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ مِنَ الْعَرْشِ اِلَى الْكُرْسِيِّ۔ اخرجه ابن مردويه (تفسير ابن كثير)

"ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اولین اور آخرین کو جمع کریں گے تمام لوگ آسمان کی طرف کھڑے دیکھتے ہوں گے اور فیصلہ کے منتظر ہوں گے اتنے میں اللہ تعالیٰ ابر کے سائبانوں میں عرش سے کرسی کی طرف نزول فرمائیں گے۔" (ابن مردویہ)

اور اسی قسم کا مضمون ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام شفاعت کرنے سے عذر فرما دیں گے اور شفاعت کی نوبت مجھ تک پہنچے گی تو میں کہوں گا کہ ہاں ہاں میں شفاعت کے لیے ہوں تمہاری شفاعت کروں گا اور جا کر عرش کے نیچے سجدہ میں گروں گا اور درخواست کروں گا کہ حق تعالیٰ بندوں کے درمیان فصل قضاء کے لیے تشریف لائیں۔

"فَيُشَفِّعُهُ اللّٰهُ وَيَأْتِيْ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ بَعْدَ مَا تَشَقَّقَ السَّمَاءُ الدُّنْيَا وَيَنْزِلُ مِنْ فِيْهَا مِنَ الْمَلَائِكَةِ"۔

"پس اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی درخواست منظور فرمائیں گے اور آسمان کے پھٹنے کے بعد ابر کے سائبانوں میں نزول اجلال فرمائیں گے اور فرشتے بھی اتریں گے۔"

اور عرش بھی اترے گا اور فرشتے یہ تسبیح پڑھتے ہوں گے: "سُبْحَانَ ذِى الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ سُبْحَانَ ذِى الْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوْتِ سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ سُبْحَانَ الَّذِيْ يُمِيْتُ الْخَلَائِقَ وَلَا يَمُوْتُ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ سُبْحَانَ رَبِّنَا الْاَعْلٰى سُبْحَانَ ذِى السُّلْطَانِ

وَالْعَظَمَةِ سُبْحَانَهٗ سُبْحَانَهٗ اَبَدًا اَبَدًا"۔ (تفسیر ابن کثیر)

فائدۂ دوم:...... جن آیات اور احادیث میں حق جل شانہ کا آنا اور اترنا اس قسم کے امور کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں علماء سلف رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ ان کی تحقیق اور تفتیش میں نہ پڑے اور بلا تشبیہ اور بلا تمثیل کے ان پر ایمان لائے جس طرح اس کی ذات بے چون وچگون ہے۔ اسی طرح اس کے افعال بھی بے چون وچگون ہیں۔ اور علماء خلف رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ وہ عوام کے عقائد کی حفاظت کے لیے کوئی مناسب تاویل کر لیتے ہیں۔ تاکہ ظاہر الفاظ سے عوام کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مثلاً ﴿اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ﴾ میں یہ تاویل کرتے ہیں اللہ کے حکم یا قہر کا آنا مراد ہے وغیر ذالک اور حضرات صوفیۂ کرام رحمہم اللہ یہ فرماتے ہیں کہ ﴿يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ سے حق سبحانہ وتعالیٰ کی تجلیات مراد ہیں۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ﴿ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ میں متجلی ہوگا۔ جس طرح کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کی تجلی (کما قال تعالیٰ: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ﴾) بے چون وچگون تھی اسی طرح قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی تجلی ابر کے سائبانوں میں ہوگی اور جس طرح آنکھ کی پتلی میں آسمانوں کا جلوہ۔ اور الفاظ کے پردہ میں معانی کا جلوہ دیکھا جاسکتا ہے اس طرح ابر کے سائبانوں میں حق سبحانہ وتعالیٰ کا بے چون وچگون حلیہ دیکھا جاسکتا ہے کہا جاتا ہے کہ زید آ گیا۔ اور یہ بات میرے خیال میں آ گئی کہ اور صبح آ گئی۔ آنا سب جگہ پایا جاتا ہے مگر حقیقت ہر جگہ مختلف ہے آنا آنے والے کے تابع ہے۔ زید کا آنا اور قسم کا ہے اور کسی بات کا دل میں آنا اور قسم کا ہے۔ ایسا ہی خدا تعالیٰ کے آنے کو سمجھو کہ اس کا آنا اور اس کی شان اور عظمت کے مطابق ہوگا جیسے حق تعالیٰ شانہ کی ذات بے چون وچگون ہے اسی طرح اُس کا آنا بھی بے چون وچگون ہوگا۔

فائدۂ سوم:...... جب کہ دین موسوی کی رعایت سے اونٹ کے گوشت کا ترک کرنا اتباع شیطانی ہوا تو سامریانِ ہند کی رعایت سے ذبیحۂ بقر کا ترک کرنا جو اعظم شعائر اسلام میں سے ہے، بدرجہ اولیٰ اغواء شیطانی ہوگا، خوب سمجھ لو۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا

پوچھ بنی اسرائیل سے کس قدر عنایت کیں ہم نے ان کو نشانیاں کھلی ہوئی ف۱ اور جو کوئی بدل ڈالے اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ

پوچھ بنی اسرائیل سے، کتنی دیں ہم نے ان کو آیتیں واضح۔ اور جو کوئی بدل ڈالے اللہ کی نعمت، بعد اس کے کہ

جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ

پہنچ چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے ف۲ فریفتہ کیا ہے کافروں کو دنیا کی زندگی پر اور ہنستے ہیں

پہنچ چکی اس کو، تو اللہ کی مار سخت ہے۔ رجھایا ہے منکروں کو دنیا کی زندگی پر، اور ہنستے ہیں

ف۱ اس سے پہلے فرمایا تھا کہ حق تعالیٰ کے صاف حکم کے بعد اس کی مخالفت کرنا موجب عذاب ہے اب اسی کی تائید میں فرماتے ہیں کہ خود بنی اسرائیل ہی سے پوچھ لو کہ ہم نے ان پر کتنی آیات واضحات اور صریح احکام بھیجے جب ان سے انحراف کیا تو مبتلائے عذاب ہوئے یہ نہیں کہ ہم نے اول ہی ان کو عذاب دیا ہو۔

ف۲ یعنی یہ قاعدہ البتہ محقق ہے کہ جو کوئی اللہ کے احکام سراپا ہدایت کو بدلے اور اس کے انعامات اور احسانات کا کفران کرے تو پھر اس کا عذاب سخت ہے آیات کے بدلنے والے پر کہ دنیا میں مارا جائے اور لوٹا جائے یا جزیہ دے اور ذلیل ہو۔ اور قیامت کو دوزخ میں جائے ہمیشہ کے لئے۔

فائدہ نعمت کے پہنچ چکنے کا یہ مطلب کہ اس کا علم حاصل ہو جائے یا بے تکلف حاصل ہو سکے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ

ایمان والوں کو ف۱ اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں سے بالا تر ہوں گے قیامت کے دن اور اللہ روزی دیتا ہے جس کو چاہے بے

ایمان والوں سے ! اور پرہیزگار ان سے اوپر ہوں گے قیامت کے دن۔ اور اللہ روزی دیوے جس کو چاہے بے

حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۚ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪

شمار ف۲ تھے سب لوگ ایک دین پر پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے

شمار۔ تھا لوگوں کا دین ایک، پھر بھیجے اللہ نے نبی، خوشی اور ڈر سناتے۔

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ

اور اتاری ان کے ساتھ کتاب سچی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس بات میں وہ جھگڑا کریں اور نہیں جھگڑا ڈالا

اور اتاری ان کے ساتھ کتاب سچی، کہ فیصل کرے لوگوں میں، جس بات میں جھگڑا کریں۔ اور کتاب میں جھگڑا

فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ

کتاب میں مگر انہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس کے بعد کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم آپس کی ضد سے پھر اب ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو

ڈالا نہیں مگر انہوں نے جن کو ملی تھی بعد اس کے کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم، آپس کی ضد سے۔ پھر اب راہ دی اللہ نے

اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ

اس سچی بات کی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ بتلاتا ہے جس کو چاہے سیدھا

ایمان والوں کو اس سچی بات کی، جس میں وہ جھگڑ رہے تھے اپنے حکم سے۔ اور اللہ چلائے جس کو چاہے سیدھی

مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ

راستہ ف۳ کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات ان لوگوں جیسے جو ہو چکے تم سے

راہ۔ کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے، اور ابھی تم پر آئے نہیں احوال ان کے جو آگے ہو چکے

ف۱ یعنی کافر جو اللہ کے صاف احکام اور اس کے پیغمبروں کی مخالفت کرتے ہیں جو اوپر مذکور ہو چکا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نظروں میں دنیا کی خوبی اور اس کی محبت ایسی سما گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں آخرت کے رنج اور راحت کو خیال ہی میں نہیں لاتے بلکہ مسلمان جو فکر آخرت میں مصروف اور اللہ کے احکام کی تعمیل میں مشغول ہیں الٹا ان کو احمق اور ذلیل سمجھتے ہیں سو ایسے احمق نفس کے بندوں سے تعمیل احکام الٰہی ہو تو کیونکر ہو۔ روسائے مشرکین حضرت بلال اور عمار اور صہیب اور فقرائے مہاجرین کو دیکھ کر تمسخر کرتے کہ ان نادانوں نے آخرت کے خیال پر دنیا کی تکالیف اور مصائب کو اپنے سر لیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو دیکھو کہ ان فقیروں محتاجوں کی امداد سے عرب کے سرداروں پر غالب آنا اور دنیا بھر کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

ف۲ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے کہ یہ ان کی جہالت اور خام خیالی ہے کہ دنیا پر ایسے مفتوں ہیں وہ نہیں جانتے کہ یہی غرباء اور فقراء قیامت کو ان سے اعلیٰ اور برتر ہوں گے اور اللہ دنیا و آخرت میں جس کو چاہے بیشمار روزی عطا فرمائے چنانچہ انہی غریبوں کو جن پر کافر ہنستے تھے اموال بنی قریظہ اور نضیر اور سلطنت فارس اور روم وغیرہ پر اللہ نے مسلط کر دیا۔

ف۳ حضرت آدمؑ کے وقت سے ایک ہی سچا دین رہا ایک مدت تک اس کے بعد دین میں لوگوں نے اختلاف ڈالا تو خدا تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا جو اہل ایمان ◘

قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان

تم سے۔ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور جھڑ جھڑائے گئے، یہاں تک کہ کہنے لگا رسول، اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے،

مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝۲۱۴

لائے کب آوے گی اللہ کی مدد سن رکھو اللہ کی مدد قریب ہے ف ۱

کب آوے گی مدد اللہ کی؟ سن رکھو! مدد اللہ کی قریب ہے۔

تنبیہات وتہدیدات

قال تعالیٰ: ﴿سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍ... الی... اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں دلائل واضحہ آجانے کے بعد حق کی مخالفت پر تنبیہ اور تہدید تھی۔ آئندہ آیات میں اور چند تنبیہات اور تہدیدات کو ذکر فرماتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کے صریح اور واضح حکم کے بعد عدول حکمی موجب عذاب ہے اگر تم کو اس میں کچھ تردد ہے تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ ہم نے ان کو کتنی واضح اور روشن دلیلیں عطا کی تھیں تا کہ حق واضح اور روشن ہو جائے۔

= وطاعت کو ثواب کی بشارت دیتے تھے اور اہل کفر ومعصیت کو عذاب سے ڈراتے تھے اور ان کے ساتھ سچی کتاب بھی بھیجی تا کہ لوگوں کا اختلاف اور نزاع دور ہو اور دین حق ان کے اختلافات سے محفوظ اور قائم رہے اور احکام الٰہی میں انہی لوگوں نے اختلاف ڈالا جن کو وہ کتاب ملی تھی جیسے یہود ونصاریٰ تورات وانجیل میں اختلاف وتحریف کرتے تھے اور یہ نزاع بے سمجھی سے نہیں کرتے تھے بلکہ خوب سمجھ کر محض حب دنیا اور ضد اور حسد سے ایسا کرتے تھے سو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اہل ایمان کو طریقہ حق کی ہدایت فرمائی اور گمراہوں کے اختلافات سے بچالیا جیسے آپ کی امت کو ہر عقیدہ اور ہر عمل میں امر حق کی تعلیم فرمائی اور یہود ونصاریٰ کے اختلاف اور افراط وتفریط سے ان کو محفوظ رکھا۔

فائدہ: اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ اللہ نے جو کتابیں اور نبی متعدد بھیجے تو اس واسطے نہیں کہ ہر فرقہ کو جدا طریقہ بتلایا ہو بلکہ سب کے لیے اللہ نے اصل میں ایک ہی رستہ مقرر کیا جس وقت اس راہ سے بہکے تو اللہ نے نبی کو بھیجا اور کتاب اتاری کہ اس کے موافق چلیں اس کے بعد پھر بہکے تو دوسرا نبی اور کتاب اللہ پاک نے اسی ایک راہ کے قائم کرنے کو بھیجا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ تندرستی ایک ہے اور بیماریاں بیشمار جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور پرہیز فرمایا جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا اور پرہیز اس کے موافق فرمایا اب آخر میں ایسا طریقہ اور قاعدہ فرمادیا جو سب بیماریوں سے بچاوے اور سب کے بدلے کفایت کرے اور وہ طریقہ اسلام ہے جس کے لیے پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف بھیجے گئے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوگئی کہ سنت اللہ یہی جاری ہے کہ برے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف ہر کتاب الٰہی میں اختلاف کو پسند کرتے رہے اور اس میں ساعی رہے تو اب اہل ایمان کو کفار کی بدسلوکی اور فساد سے تنگدل ہونا نہ چاہیے۔

ف ۱ پہلے مذکور ہوا کہ دشمنوں کے ہاتھ سے انبیاء اور ان کی امتوں کو ہمیشہ ایذائیں ہوئیں تو اب اہل اسلام کو ارشاد ہے کہ کیا تم کو اس بات کی طمع ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ حالانکہ اگلی امتوں کو جو ایذائیں پیش آئیں وہ تم کو پیش نہیں آئیں کہ ان کو فقر وفاقہ اور مرض اور خوف کفار اس درجہ کو پیش آئے کہ مجبور اور عاجز ہو کر نبی اور ان کی امت بول اٹھی کہ دیکھئے اللہ نے جس مدد اور اعانت کا وعدہ فرمایا تھا وہ کب آئے گی یعنی بمقتضائے بشریت پریشانی کی حالت میں مایوسانہ کلمات سرزد ہونے لگے۔ انبیاء اور مومنین کا یہ کہنا کچھ شک کی وجہ سے نہ تھا حضرت مولانا اسی کی بابت مثنوی میں فرماتے ہیں:

در گماں افتادجان انبیاء   زاتفاق منکری اشقیاء

بلکہ بحالت اضطرار بمقتضائے بشریت اس کی نوبت آئی جس میں کوئی ان پر الزام نہیں جب نوبت یہاں تک پہنچی تو رحمت الٰہی متوجہ ہوئی اور ارشاد ہوا کہ ہوشیار ہو جاؤ اللہ کی مدد آگئی گھبراؤ نہیں سوائے مسلمانوں تکالیف دنیوی سے اور دشمنوں کے غلبہ سے گھبراؤ نہیں تحمل کرو اور ثابت قدم رہو۔

یہ حق جل شانہ کی ایک نعمت کبریٰ تھی اس نعمت کا شکر اور حق یہ تھا کہ دل وجان سے حق کو قبول کرتے۔ لیکن دیدہ ودانستہ حق سے انحراف کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عذاب میں مبتلا ہوئے اور طرح طرح کی ذلتیں دیکھنی پڑیں جیسا کہ پہلے پارہ میں ان کی شناعتوں اور عقوبتوں کا بیان ہوا اور ہمارا قانون یہی ہے کہ جو شخص اللہ کی نعمت کو بعد اسکے کہ وہ نعمت خود اس کے پاس پہنچ چکی ہے یعنی وہ نعمت بلا مشقت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملی ہے پس جو شخص ایسی نعمت کو کفر اور معصیت سے بدلے اور اس کے انعامات اور احسانات کی ناشکری کرے تو اللہ تعالیٰ بھی نعمت کو نقمت سے اور انعام کو انتقام سے بدل دیتے ہیں۔ پس تحقیق اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والے ہیں اور ایسے ناشکرے اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو سخت سزا دی جائے اصل وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا پر ایسے شیدا اور فریفتہ ہوئے ہیں کہ دنیاوی زندگانی ان کی نظروں میں اس درجہ مزین اور خوب صورت کر دی گئی ہے کہ آخرت ان کو بدصورت معلوم ہونے لگی اس لیے اپنی ظاہری عیش وعشرت کے نشہ میں ان لوگوں کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں جو آخرت پر شیدا اور فریفتہ ہیں اور ان لوگوں سے تمسخر کرتے ہیں جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان اور تقویٰ کے لباس فاخرہ سے آراستہ ہیں قیامت کے دن یہی لوگ ان کافروں سے بالا اور بلند ہوں گے۔ جن کو یہ کافر دنیا میں ذلیل اور حقیر سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے کہ بے شمار رزق دے دیتا ہے۔ دیکھ لو انہیں فقراء مہاجرین کو جن کو تم حقیر وذلیل سمجھتے تھے کس طرح روم اور فارس کی سلطنت کا مالک بنا دیا معلوم ہوا کہ چندروز کے فانی عیش پر مغرور اور مست ہو کر حق کا انکار کرنا اور اہل حق کو حقیر سمجھنا حماقت ہے۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت نوح کے زمانہ کے قریب تک تمام لوگ ایک ہی جماعت تھے سب ایک ہی دین حق پر متفق تھے۔ اور احکام خداوندی پر عمل کرتے تھے۔ دس قرن اسی طرح گذرے اس کے بعد جب لوگ دنیا پر فریفتہ ہوئے اور دنیا ان کو خوبصورت معلوم ہوئی تو دنیاوی اور نفسانی اغراض کی بناء پر حق میں اختلاف ڈالا۔ پس حق تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے انبیاء کرام کو بھیجا تا کہ حق میں کوئی اختلاف نہ ڈالے۔ بلا اختلاف سب مل کر حق پر چلیں اس لیے اللہ نے انبیاء کرام کو بھیجا کہ ایمان لانے والوں اور حق قبول کرنے والوں کو خوش خبری سنائیں اور حق میں اختلاف ڈالنے والوں کو اللہ کے قہر سے ڈرائیں اور ان کے ساتھ حق تعالیٰ نے حق اور سچی کتابیں بھی اتاریں تا کہ وہ کتاب الٰہی لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے جس حق کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ کتاب الٰہی کے فیصلہ کو دل وجان سے قبول کرتے اور اس کے حکم کے مطابق اپنے تمام اختلافات اور نزاعات کو ختم کر دیتے مگر افسوس کہ ان لوگوں نے اسی کتاب میں اختلاف شروع کر دیا کہ جو انکو اختلاف کے مٹانے اور ختم کرنے لیے دی گئی تھی اور یہ اختلاف کسی اشتباہ اور التباس کی بناء پر نہ تھا بلکہ صریح اور واضح احکام اور دلائل آجانے کے بعد آپس کی ضد اضدی کی بناء پر تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان خودغرضوں اور ہوا پرستوں کو تو اس باہمی اختلاف اور نزاع میں چھوڑ دیا جس کا منشاء سوائے حب دنیا کے اور کچھ نہ تھا۔ اور اُن اہل ایمان کو جن کے قلوب حب دنیا اور حسد وغیرہ سے پاک تھے حق کی راہ دکھلائی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے اور یہ ہدایت محض اس کے لطف اور عنایت سے تھی اور اللہ تعالیٰ مالک اور مختار ہے۔ جس کو چاہے اور جس طرح چاہے سیدھا راستہ بتاتا ہے کسی کو بغیر آیات بینات اور بغیر کسی دلیل وبرہان اور بغیر کسی استاد اور معلم کے سیدھا راستہ بتلا دیتے ہیں اور کسی کو صاف نشانوں کے بعد بھی گمراہ کر دیتے ہیں۔ ہدایت اس کی ملک ہے جس کو چاہے دے اور جس کو

چاہے نہ دے لیکن اللہ کی عادت اور سنت یہ ہے کہ حق کی ہدایت سے اسی کو سرفراز فرماتے ہیں جو شخص دنیا پر فریفتہ نہ ہو اور دنیا کی زینت نے اس کو اپنا گرویدہ اور شیدائی نہ بنالیا ہو کیونکہ جن کے دل دنیا کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں وہ کبھی حق کو قبول نہیں کرتے اور انبیاء کرام کی ہدایت اور نصیحت کی طرف کان نہیں لگاتے بلکہ ایسے لوگ ہمیشہ اہل حق کو ستاتے ہیں اور طرح طرح کی ایذائیں ان کو پہنچاتے ہیں اس لیے آئندہ آیت میں مسلمانوں کی تسلی فرماتے ہیں کہ تم اہل باطل اور اہل دنیا کی ایذاؤں سے ہرگز نہ گھبرانا یہ کوئی نئی بات نہیں ہمیشہ سے اہل باطل، حضرات انبیاء اور اہل ایمان کو ایذاء پہنچاتے چلے آئے ہیں۔ یہ دنیا دار ابتلاء اور دار امتحان ہے۔ یہاں کے چند روزہ مصائب پر نظر نہ کرو صبر پر جو دار آخرت میں راحتیں اور نعمتیں ملیں گی ان پر نظر رکھو کیا تم کو یہ گمان ہے کہ جنت میں بلا محنت اور بلا مشقت داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر ابھی تک وہ احوال اور اہوال نہیں گزرے جو تم سے پہلے حضرات انبیاء اور اہل ایمان پر گزرے دشمنوں کے ہاتھ سے ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور طرح طرح سے جھڑ جھڑائے گئے اور قسم قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے ہلائے گئے حتی کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدد الٰہی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے اس زمانہ کے نبی ﷺ اور ان کے ساتھی شدائد اور مصائب سے مجبور اور لاچار اور بے تاب اور بے قرار ہو کر یہ بول اٹھے کہ اللہ کی وہ مدد کب آئے گی جس کا اس نے انبیاء اور اہل ایمان سے وعدہ فرمایا ہے۔ بمقتضائے بشریت انتہائی پریشانی کی حالت میں یہ مایوسانہ کلمات زبان سے نکلے اور حق تعالیٰ کا منشاء بھی یہی تھا کہ ہمارے ماسوا سے بالکل مایوس اور ناامید ہو جائیں۔ چنانچہ اس وقت اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور ارشاد ہوا کہ گھبراؤ نہیں ثابت قدم رہو۔ آگاہ ہو جاؤ اور سن لو کہ اللہ کی مدد بہت نزدیک ہے۔ اے مسلمانو! اسی طرح تمہارا ابھی امتحان ہو رہا ہے گھبراؤ نہیں۔ عنقریب اللہ کی مدد تم کو پہنچے گی اور تمام مصائب اور تکالیف کا خاتمہ کر دے گی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں ف۱ کہہ دو کہ جو کچھ تم خرچ کرو مال سو ماں باپ کے لئے اور قرابت والوں کے اور یتیموں کے

تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟ تو کہہ، جو چیز خرچ کرو فائدے کی، سو ماں باپ کو اور نزدیک ناطے والوں کو اور یتیموں کو

وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

اور محتاجوں کے اور مسافروں کے اور جو کچھ کرو گے تم بھلائی سو وہ بیشک اللہ کو خوب معلوم ہے ف۲

اور محتاجوں کو اور راہ کے مسافر کو۔ اور جو کرو گے بھلائی سو وہ اللہ کو معلوم ہے۔

ف۱ آیات سابقہ میں کلیۃً یہ مضمون بہت تاکید سے بیان ہوا کہ کفر و نفاق کو چھوڑ دو اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو حکم الٰہی کے مقابل کسی کی مت سنو اللہ کی خوشی میں جان و مال خرچ کرو اور ہر طرح کی شدت اور تکلیف پر تحمل کرو اب یہاں سے اسی کلیہ کے متعلق جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے جو کہ مال اور جان اور دیگر معاملات مثل نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں تاکہ اس کلیہ کی تحقیق و تاکید خوب ذہن نشین ہو جائے۔

ف۲ بعض اصحاب جو مالدار تھے انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ مال میں سے کیا خرچ کریں اور کس پر خرچ کریں اس پر یہ حکم ہوا کہ قلیل خواہ کثیر جو کچھ خدا کے لیے خرچ کرو وہ والدین اور اقارب اور یتیم محتاج اور مسافروں کے لیے ہے یعنی حصول ثواب کے لیے خرچ کرنا چاہو تو جتنا چاہو کرو اس کی کوئی تعیین و تحدید نہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ جو مواقع ہم نے بتلائے ان میں صرف کرو۔

حکم سیزدہم متعلق بمصارف انفاق

قَالَ تَعَالٰی: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ... الی... فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾

شروع سے احکام علیہ کا بیان چلا آرہا تھا، درمیان میں ضمناً ایمان اور اخلاص کی ترغیب اور دنیا کی محبت کی مذمت کا ذکر آیا اب آگے پھر احکام علیہ کی طرف رجوع فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! اگر تم اپنی جانوں کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے ہو تو خدا تعالیٰ کی راہ میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جان و مال سے کسی قسم کا دریغ نہ کرو اور اس کی راہ میں جو تکلیف پیش آئے اس کا تحمل کرو۔ اب اس کلیہ کے تحت کچھ مصارف انفاق اور جہاد اور نکاح اور طلاق اور خلع اور ایلاء کے احکام بیان فرماتے ہیں جو باہمی معاشرت سے متعلق ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔ اے ہمارے نبی! یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ خدا کی خوشنودی اور ثواب کے لیے کیا خرچ کریں۔ آپ فرما دیجئے کہ یہ سوال مت کرو کہ کیا خرچ کریں یہ چیز تو بالکل واضح ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کوئی خاص شے اور خاص مقدار معین نہیں جو میسر ہو وہ خرچ کرو ہاں یہ سوال کرو کہ کہاں خرچ کریں سو آپ فرما دیجئے کہ جو مال بھی خرچ کرنا چاہو تو سب سے پہلے ماں باپ کی خدمت میں صرف کرو جو تمہارے وجود ظاہری کا سبب بنے اور جس شفقت اور محبت سے تم کو پالا ہے تم اس کا عشر عشیر بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اولاد اگرچہ والدین کی مالی اور بدنی خدمت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے لیکن والدین کی شفقت اور عنایت اور نظر محبت کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں کر سکتی اور والدین کے قرابت داروں میں خرچ کرو تا کہ صدقہ اور صلہ رحمی دونوں جمع ہو جائیں اور رشتہ داروں کے بعد یتیموں پر خرچ کرو کہ باپ نہ ہونے کی وجہ سے خود کمانے کے قابل نہیں اور ان کے بعد عام محتاجوں پر خرچ کرو اور عام محتاجوں کے بعد مسافروں پر خرچ کرو جو وطن اور عزیز و اقارب سے دور ہونے کی وجہ سے بمنزلہ محتاج اور فقیر کے ہو گئے۔ اور اس کے علاوہ جو بھی تم خیر اور نیکی کا کام کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں تمہارے خرچ کی مقدار اور کیست اور تمہاری نیت کو خوب جانتا ہے۔

فائدہ:...... یہ آیت نفل صدقات اور خیرات کے بارے میں ہے زکوٰۃ اور صدقات واجبہ، مثل صدقہ فطر کے بارے میں نہیں اس لیے کہ والدین کو زکوٰۃ دینا درست نہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ

فرض ہوئی تم پر لڑائی ف۱ اور وہ بری لگتی ہے تم کو ف۲ اور شاید کہ تم کو بری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں

حکم ہوا تم پر لڑائی کا، اور وہ بری لگتی ہے تم کو۔ اور شاید تم کو بری لگے ایک چیز، اور وہ بہتر ہو تم کو

ف۱ یعنی دین کے دشمنوں سے لڑنا فرض ہوا۔

فائدہ: جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقاتلہ کی اجازت نہ ہوئی جب مدینہ کو ہجرت فرمائی تو مقاتلہ کی اجازت ہوئی مگر صرف ان کفار سے کہ جو خود اہل اسلام سے مقاتلہ کریں اس کے بعد علی العموم کفار سے مقاتلہ کی اجازت ہوگئی اور جہاد فرض ہوا اگر دشمنان دین مسلمانوں پر چڑھائی کریں تو مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہے ورنہ فرض کفایہ بشرطیکہ جملہ شرائط جہاد جو کتب فقہ میں مذکور ہیں پائی جائیں البتہ جن لوگوں سے مسلمان مصالحت اور معاہدہ کرلیں یا ان کی امن اور حفاظت میں آجائیں تو ان سے لڑائی کرنا یا ان کے مقابلہ میں ان کے کسی مخالف کو مدد دینا ہرگز مسلمانوں کو جائز نہیں۔

ف۲ برے لگنے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو دشوار اور گراں معلوم ہوتا ہے یہ نہیں کہ قابل رد و انکار نظر آئے اور مخالف حکمت و مصلحت سمجھا جائے اور موجب ناخوشی اور تنفر ہو سو اتنی بات میں کوئی الزام نہیں جب انسان کو بالطبع زندگی سے زیادہ کوئی چیز مرغوب نہیں تو ضرور مقاتلہ سے زیادہ دشوار کوئی شے نہ ہونی چاہیے۔

وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ یَسْـَٔلُوْنَكَ ع

اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ف۱ تجھ سے پوچھتے ہیں

اور شاید تم کو خوش لگے ایک چیز، اور وہ بری ہو تم کو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ تجھ سے پوچھتے ہیں

عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ

مہینہ حرام کو کہ اس میں لڑنا کیسا ف۲ کہہ دے لڑائی اس میں بڑا گناہ ہے ف۳ اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کو نہ

مہینے حرام کو، اس میں لڑائی کرنا۔ تو کہہ، لڑائی اس میں بڑا گناہ ہے۔ اور روکنا اللہ کی راہ سے، اور اس کو

بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ

ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک ف۴ اور لوگوں کو دین سے بچلانا

نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا، اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے، اس سے زیادہ گناہ ہے اللہ کے ہاں۔ اور دین سے بچلانا

الْقَتْلِ ؕ وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى یَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِیْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ

قتل سے بھی بڑھ کر ہے ف۵ اور کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمہارے دین سے اگر قابو پاویں ف۶ اور جو

مار ڈالنے سے زیادہ۔ اور وہ تو لگے ہی رہتے ہیں تم سے لڑنے کو یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمہارے دین سے اگر مقدور پاویں اور جو کوئی

ف۱ یعنی یہ بات ضروری نہیں کہ جس چیز کو تم اپنے حق میں نافع یا مضر سمجھو، واقعہ میں بھی تمہارے حق میں ویسی ہی ہوا کرے بلکہ ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اپنے لیے مضر سمجھو اور وہ مفید ہو اور کسی چیز کو مفید خیال کرلو اور وہ مضر ہو تم نے تو سمجھ لیا کہ جہاد میں جان و مال سب کا نقصان ہے اور ترک جہاد میں دونوں کی حفاظت اور یہ نہ جانا کہ جہاد میں دنیا اور آخرت کے کیا کیا منافع ہیں اور اس کے ترک میں کیا کیا نقصان ہیں تمہارے نفع نقصان کو خدا ہی خوب جانتا ہے تم اسے نہیں جانتے اس لیے وہ جو حکم دے اس کو حق سمجھو اور اپنے اس خیال کو چھوڑ دو۔

ف۲ حضرت فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک جماعت کافروں کے مقابلہ کو بھیجی انہوں نے کافروں کو مارا اور مال لوٹ لائے۔ مسلمان تو جانتے تھے کہ وہ اخیر دن جمادی الثانی کا ہے اور وہ رجب کا غرہ تھا جو کہ اشہر حرم میں داخل ہے کافروں نے اس پر بہت طعن کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام مہینہ کو بھی حلال کر دیا اور اپنے لوگوں کو حرام مہینہ میں لوٹ مار کی اجازت دے دی مسلمانوں نے حاضر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ہم سے شبہ میں یہ کام ہوا اس کا کیا حکم ہے تب یہ آیت اتری۔

ف۳ یعنی شہر حرام میں قتال کرنا بیشک گناہ کی بات ہے لیکن حضرات صحابہ نے تو اپنے علم کے موافق جمادی الثانی میں جہاد کیا تھا شہر حرام یعنی رجب میں نہیں کیا اس لیے مستحق عفو ہیں ان پر الزام لگانا بے انصافی ہے۔

ف۴ یعنی لوگوں کو اسلام لانے سے روکنا اور خود دین اسلام کو تسلیم نہ کرنا اور زیارت بیت اللہ سے لوگوں کو روکنا اور مکہ کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا یہ باتیں شہر حرام میں مقاتلہ کرنے سے بھی زیادہ گناہ ہیں اور کفار برابر یہ حرکات کرتے تھے خلاصہ یہ کہ شہر حرام میں بلا وجہ اور ناحق لڑنا بیشک اشد گناہ ہے مگر جو لوگ کہ حرم میں بھی کفر پھیلائیں اور بڑے بڑے فساد کریں اور اشہر حرم میں بھی مسلمانوں کے ستانے میں قصور نہ کریں ان سے لڑنا منع نہیں علاوہ ازیں جب مشرکین ایسے امور شنیعہ میں سرگرم ہیں تو ایک تھوڑے قصور پر مسلمانوں کی نسبت طعن کرنا جو ان سے بوجہ لاعلمی صادر ہوا بڑی شرم کی بات ہے۔

ف۵ یعنی دین میں فتنہ اور فساد ڈالنا تاکہ لوگ دین حق کو قبول نہ کریں اس قتل سے بدرجہا مذموم ہے جو مسلمانوں سے شہر حرام میں واقع ہوا مشرکین کی عادت تھی کہ دین اسلام کی باتوں میں طرح طرح سے خدشات کیا کرتے تھے تاکہ لوگ شبہ میں پڑ جائیں اور اسلام کو قبول نہ کریں چنانچہ اسی قصہ میں کہ مسلمانوں سے شہر حرام میں بوجہ لاعلمی قتل واقع ہوا اس پر مشرکین نے جو زبان درازی کی تو اس سے مقصود یہی تھا کہ لوگ قبول اسلام سے متنفر ہو جائیں تو خلاصہ یہ ہوا کہ مسلمانوں سے جو قتل صادر ہوا اس پر مشرکین کا طعن کرنا اس وجہ سے کہ لوگ دین حق سے بچل جائیں قتل مذکور سے بدرجہا مذموم وشنیع ہے۔ =

يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا

کوئی پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مرجاوے حالت کفر ہی میں تو ایسوں کے ضائع ہوئے عمل دنیا

پھرے گا تم میں اپنے دین سے پھر مر جاوے گا کفر ہی پر تو ایسوں کے ضائع ہوئے عمل دنیا میں

وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ

اور آخرت میں اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ف۱ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے

اور آخرت میں۔ اور وہ آگ والے ہیں۔ وہ اس میں رہ پڑے۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے

هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں وہ امیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ف۲

ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں وہ امیدوار ہیں اللہ کی مہر (رحمت) کے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

حکم چہاردہم، متعلق بہ فرضیت جہاد وقتال در شہر حرام

قَالَ تَعَالٰی: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ... الی ... وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

گزشتہ آیات میں حضرات انبیاء کرام کے ابتلاء اور مصائب کا ذکر فرمایا اور یہ بتلایا کہ جنت میں داخل ہونا ابتلاء کے وقت صبر اور تحمل پر موقوف ہے۔ اس سلسلہ میں اولاً جہادِ مالی یعنی انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر فرمایا اب اس کے بعد جہادِ جانی کا ذکر فرماتے ہیں کہ جہادِ مالی اور جانی سے مل کر دین قائم ہوتا ہے۔ (کذا فی البحر المحیط) چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں، اے مسلمانو! تم پر جہاد فرض کر دیا گیا اور تمہیں طبعاً ناگوار ہے۔ کیونکہ اس میں جان پر مشقت اور مال کا خرچ ہے اور شاید کہ کوئی شے تم کو طبعاً ناگوار ہو اور فی الواقع وہی تمہارے حق میں بہتر ہو اور جہاد فی سبیل اللہ بھی اسی قسم میں داخل ہے اس لیے کہ جہاد سے اسلام کو فتح وغلبہ حاصل ہوتا ہے۔ احکام خداوندی کی بجا آوری میں کوئی حارج اور مزاحم باقی نہیں رہتا اور دنیاوی فائدہ حکومت

=ف۱ یعنی جب تک تم دین حق پر قائم رہو گے یہ مشرکین کسی حالت میں اور کسی موقع پر بھی تمہارے مقاتلہ اور مخالفت میں کمی نہیں کریں گے۔ حرم مکہ اور شہر حرام ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ عمرہ حدیبیہ میں پیش آیا نہ حرم مکہ کی حرمت کی اور نہ شہر حرام کی بلا وجہ محض عناد سے مارنے مرنے کو مستعد ہو گئے اور مسلمانوں کے مکہ میں جانے اور عمرہ کرنے کے روادار نہ ہوئے پھر ایسے معاندین کے طعن تشنیع کی کیا پرواہ کی جائے اور ان سے مقاتلہ کرنے میں شہر حرام کی وجہ سے کیوں رکا جائے۔

ف۱ یعنی دین اسلام سے پھر جانا اور اسی حالت پر اخیر تک قائم رہنا ایسی سخت بلا ہے کہ عمر بھر کے نیک کام ان کے ضائع ہو جاتے ہیں کہ کسی بھلائی کے مستحق نہیں رہتے دنیا میں نہ ان کی جان و مال محفوظ رہے نہ نکاح قائم رہے نہ انکو میراث ملے نہ آخرت میں ثواب ملے اور نہ کبھی جہنم سے نجات نصیب ہو، ہاں اگر پھر اسلام قبول کرلیا تو صرف اس اسلام کے بعد کے اعمال حسنہ کی جزا پوری ملے گی۔

ف۲ آیت سابقہ سے جماعت اصحاب مذکورہ بالا کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہمارے اوپر اس بارے میں کوئی مواخذہ نہیں مگر یہ تردد ان کو تھا کہ دیکھئے اس جہاد کا ثواب بھی ملتا ہے یا نہیں اس پر یہ آیت اتری کہ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کے واسطے اس کے دشمنوں سے لڑے اپنی کوئی غرض اس لڑائی میں نہ تھی وہ بیشک اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اس کے مستحق ہیں، اور اللہ اپنے بندوں کی خطائیں بخشنے والا اور ان پر انعام فرمانے والا ہے وہ ایسے تابعداروں کو محروم نہ کرے گا۔

کا حاصل ہونا اور مالِ غنیمت کا ملنا ہے اور اُخروی فائدہ شہادت کی نعمت سے بہرہ یاب ہونا اور شاید تم کو کوئی چیز طبعاً بھلی معلوم ہو اور فی الواقع تمہارے حق میں وہ بری ہو جیسے جہاد میں سُستی اور کاہلی جو ظاہر میں راحت معلوم ہوتی ہے مگر ترک کا انجام سوائے ذلت اور مالِ غنیمت اور ثواب سے محرومی کے اور کچھ نہیں اور تمہاری بھلائی اور برائی کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور تم اپنی مصلحتوں اور مضرتوں کو نہیں جانتے لہٰذا تم اپنی طبعی رغبت اور کراہت کا اتباع مت کرو بلکہ احکامِ خداوندی کا اتباع کرو اسی میں تمہارے لیے خیر اور بہتری ہے احادیث میں جہاد کو افضل الاعمال اور سنام الاسلام یعنی اسلام کا کوہان قرار دیا ہے اس لیے کہ جہاد اسلام کی اشاعت اور خلق اللہ کی ہدایت اور دین کی عزت اور رفعت کا سبب ہے اور مجاہد کی کوشش سے جو لوگ اسلام میں داخل ہوں گے ان کی حسنات اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

شانِ نزول

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے عرب میں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ چار مہینوں یعنی ذی قعدہ اور ذی الحجہ اور محرم الحرام اور رجب میں باہمی قتل وقتال اور جنگ وجدال کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور ان مہینوں میں کسی پر چڑھائی کرنے کو معیوب جانتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر سے دو ماہ پیشتر ماہ جمادی الاخری ۲ ھ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں آٹھ یا بارہ مہاجرین کی ایک جماعت کو جس میں سوائے مہاجرین کے اور کوئی نہ تھا کافروں کے مقابلہ میں جانے کا حکم دیا اور عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو ایک والا نامہ لکھ کر دیا اور یہ فرمایا کہ جب دو دن کا سفر طے کر لو اس وقت خط کو کھولنا۔ اور اپنے ساتھیوں کو سنا دینا اور کسی پر زبردستی نہ کرنا عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کس طرف جاؤں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نجد کی طرف جاؤ۔ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ وہاں سے روانہ ہوئے اور دو دن کا سفر طے کرنے کے بعد ایک منزل پر پڑاؤ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ کھولا تو اس میں یہ مضمون تھا:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اَمَّا بَعْدُ فَسِرْ عَلٰی بَرَکَۃِ اللّٰہِ بِمَنْ تَبِعَکَ مِنْ اَصْحَابِکَ حَتّٰی تَنْزِلَ بَطْنَ نَخْلَۃَ فَتَرَصَّدَ بِھَا عِیْرَ قُرَیْشٍ لَعَلَّکَ اَنْ تَاْتِیَنَا مِنْہُ بِخَیْرٍ۔"

"اما بعد اللہ کی برکتوں اور رحمتوں کے ساتھ اپنے رفقاء کو لے کر چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ جب مقام نخلہ پر پہنچو تو قریش کے تجارتی قافلہ کا انتظار کرو امید ہے کہ اللہ ان کا مال تم کو عطا کرے اور پھر وہ مال تم ہمارے پاس لے آؤ"

عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اس حکم نامہ کو پڑھتے ہی سمعاً وطاعۃً کہا اور اپنے ساتھیوں کو سنایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ فرمایا تھا کہ کسی پر زبردستی نہ کروں۔ اب جس کو شہادت کا شوق اور رغبت ہو وہ میرے ساتھ چلے اور جس کا جی چاہے وہ لوٹ جائے۔ یہ سن کر سب دل وجان سے تعمیل ارشاد پر راضی ہو گئے اور ایک شخص بھی واپس ہونے کے لیے راضی نہ ہوا۔ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان جب مقام نخلہ میں جا کر اترے تو ابھی ٹھہرنے بھی نہ پائے تھے کہ اتنے میں قریش کا قافلہ دکھلائی دیا جو طائف کی تجارت کا مال زیتون کا تیل اور کشمش اور چمڑے وغیرہ لے کر آرہا تھا۔ مسلمانوں نے

ان پر حملہ کیا۔ عمرو بن الحضرمی کو قتل کیا اور حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ کو گرفتار کیا۔ باقی لوگ بھاگ گئے۔ صحابہ کرام ؓ قیدیوں اور سامان کے اونٹوں کو لے کر حضور پرنور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

یہ تاریخ یکم رجب الحرام تھی اور صحابہ کرام ؓ اس کو جمادی الثانیہ کی تیسویں تاریخ سمجھے ہوئے تھے مگر چاند انتیس کا ہو چکا تھا جس کا صحابہ کو علم نہ تھا اس لیے کفار نے مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا کہ یہ لوگ شہر حرام میں بھی لڑتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی (تفسیر ابن کثیر)۔ لوگ آپ سے شہر حرام کے بارے میں قتال کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ ﷺ ان کے جواب میں کہہ دیجیے کہ بے شک خاص طور پر ماہ حرام کا ارادہ کر کے قتال کرنا بیشک ایک امر عظیم ہے مگر مسلمانوں نے قصداً اور ارادۃً ایسا نہیں کیا بلکہ صحیح تاریخ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے یہ لغزش ہوئی مگر مشرکین کو اس اعتراض کا حق نہیں اس لیے کہ شہر حرام میں قتل و قتال بہت سے بہت گناہ کبیرہ ہے اور تم تو کفر اور شرک میں مبتلا ہو جو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکنا یعنی دین حق اور اسلام میں داخل ہونے سے ان کو روکنا اور خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر اور شرک کرنا اور لوگوں کو مسجد حرام سے روکنا کہ وہاں جا کر کوئی بیت اللہ کا طواف نہ کر سکے اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور بندگی نہ کر سکے اور جو لوگ مسجد حرام کے واقعی اور حقیقی اہل اور مستحق تھے یعنی رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان ان کو حرم اور مسجد حرام سے تنگ کر کے نکالنا سو یہ تمام حرکتیں شناعت اور قباحت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہر حرام میں بلا قصد قتال سرزد ہو جانے سے کہیں بڑھ کر ہیں اور فقط کفر اور شرک کا فتنہ اور فساد ہی قتل سے بڑھ کر ہے۔ پھر یہ کفار مسلمانوں کی ایک غلطی پر کیوں اعتراض کرتے ہیں۔ غلطی سے درگزر کیا جا سکتا ہے مگر کفر و شرک کا جرم کسی طرح اور کسی وقت بھی قابل معافی نہیں اور یہ لوگ دین حق کی عداوت اور دشمنی میں اس درجہ پختہ ہیں کہ حق کو مٹانے کے لیے ہمیشہ تم سے برسر پیکار رہیں گے یہاں تک کہ خدانخواستہ تم کو تمہارے اس پاک دین سے پھیر دیں اگر کچھ قابو پائیں اور دین اسلام سے کسی کو مرتد بنا دینا یہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس آیت میں دو اشارے ہیں ایک تو یہ کفار دین اسلام کے مٹانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ لہٰذا مسلمانوں کو متنبہ رہنا چاہیے دوسرا اشارہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر اُن کا قابو چلے گا نہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مرتد نہیں بنا سکیں گے۔ آئندہ آیت میں ارتداد کا انجام بیان فرماتے ہیں۔

انجام ارتداد

اور اے مسلمانو! تم پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ جو شخص تم میں سے دین اسلام سے پھر جائے گا اور اسی کفر کی حالت میں مر جائے گا تو ایسے لوگوں کے تمام عمل دنیا اور آخرت میں حبط (ضائع) اور ضبط ہو جائیں گے۔ دنیا میں اعمال کے حبط ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی وجہ سے جو جان و مال محفوظ تھے وہ محفوظ نہ رہیں گے اور نہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہو سکیں گے۔ اور آخرت میں حبط ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی نیک عمل پر کوئی ثواب نہیں ملے گا اور یہ لوگ دوزخی ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے کبھی بھی دوزخ سے نہیں نکلیں گے۔

مسئلہ ۱:...... امام شافعی ؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دین اسلام سے مرتد ہو جائے اور پھر کفر ہی کی حالت میں

مرجائے تب تو اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے اور اگر مرتد ہونے کے بعد وہ مرنے سے پہلے تائب ہو گیا اور پھر مسلمان ہو گیا تو اس کے اعمال ضائع نہ ہوں گے کیونکہ اس آیت میں حبط اعمال کے لیے دو چیزوں کا ذکر ہے ایک ارتداد یعنی ﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ﴾ اور دوسرے موت علی الکفر یعنی ﴿فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ﴾ حبط اعمال کے لیے ان دونوں باتوں کا پایا جانا شرط ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محض ارتداد سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ موت علی الکفر شرط نہیں لقولہ تعالیٰ: ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ﴾ وقولہ تعالیٰ: ﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ اور اس آیت میں جس طرح شرط کی جانب میں دو چیزیں مذکور ہیں ایک ارتداد اور دوسرے موت علی الکفر اسی طرح جزاء کی جانب میں بھی دو چیزیں مذکور ہیں ایک حبط اعمال ﴿فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ اور دوسرے دخول نار ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ الخ۔ اعمال تو محض مرتد ہونے سے حبط ہو جاتے ہیں۔ اور جہنم میں جانے کے لیے موت علی الکفر شرط ہے۔ جس طرح شرط کے دو جز ہیں اسی طرح جزاء کے دو جز ہیں۔ جزاء کا پہلا جز شرط کے پہلے جز سے متعلق ہے اور جزاء کا دوسرا جز شرط کے دوسرے جز سے متعلق ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ ہماری اس غلطی پر کوئی مؤاخذہ نہیں تو یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہمارا یہ سفر جہاد میں شمار ہوگا اور کیا ہم کو اس پر کچھ ثواب بھی ملے گا؟ اس پر یہ آئندہ آیت نازل ہوئی ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ الخ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی اور جہاد کیا ایسے لوگ اللہ کی رحمت اور عنایت کے امیدوار ہو سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور مہربان ہیں۔ غلطی سے درگذر فرماتے ہیں اور ایسے مخلصین کو اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھتے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد وہ مال غنیمت جو عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ لے کر آئے تھے ابھی تک وہ اسی طرح وحی کے انتظار میں رکھا ہوا تھا آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس نکال کر غانمین پر تقسیم کر دیا۔

مسئلہ ۲:..... اشہر حرام میں قتل وقتال ابتداء میں ممنوع تھا۔ جمہور علماء کے نزدیک بعد میں وہ ممانعت منسوخ ہو گئی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم شراب کا اور جوئے کا ف۱ کہہ دے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم شراب اور جوئے کا تو کہہ ان میں گناہ بڑا ہے، اور فائدے بھی ہیں

لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ

لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدہ سے ف۲

لوگوں کو اور ان کا گناہ فائدے سے بڑا ہے۔

ف۱ شراب اور جوئے کے حق میں کئی آیتیں اتریں ہر ایک میں ان کی برائی ظاہر کی گئی آخر سورۂ مائدہ کی آیت میں صاف ممانعت کر دی گئی اب جو چیز بھی نشہ لاوے وہ سب حرام ہیں اور جو شرط باندھی جائے کسی چیز پر جس میں ہار اور جیت ہو وہ محض حرام ہے اور ایک طرف کی شرط حرام نہیں۔

ف۲ شراب پینے سے عقل جاتی رہتی ہے جو تمام امور شنیعہ سے بچاتی ہے اور لڑائی اور قتل وغیرہ طرح طرح کی خرابیوں کی نوبت آتی ہے اور مختلف قسم کے امراض روحانی اور جسمانی پیدا ہوتے ہیں جو بسا اوقات باعث ہلاکت ہوتے ہیں اور جوا کھیلنے میں حرام مال کا کھانا اور سرقہ اور تضییع مال اور عیال اور باہم دشمنی وغیرہ طرح طرح کے مفاسد ظاہری وباطنی پیش آتے ہیں ہاں ان میں سرسری نفع بھی ہے مثلاً شراب پی کر لذت وسرور ہو گیا اور جوا کھیل کر بلا مشقت مال ہاتھ آ گیا۔

حکم پانزدہم۔ متعلق بہ شراب وقمار

قَالَ تَعَالٰی: ﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ۔ الی ۔ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾

ربط:...... جس طرح خدا کی راہ میں جان ومال کا خرچ کرنا دین اور دنیا کی عزتوں کا سبب ہے (جیسا کہ پہلی آیتوں میں اس کا ذکر ہوا ہے) اسی طرح شراب وکباب اور قمار یعنی جوئے میں مال کا خرچ کرنا دینی اور دنیاوی تباہی کا موجب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور یہ لوگ آپ ﷺ سے شراب اور قمار یعنی جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں چیزوں کے استعمال میں فقط ایک گناہ نہیں بلکہ ان کے اندر بہت سے بڑے بڑے گناہ مضمر اور پوشیدہ ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ معمولی فائدے بھی ہیں۔ اس لیے لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کہ ان دونوں چیزوں کا استعمال کیا جائے یا نہ کیا جائے فوائد اور منافع کا اقتضاء یہ ہے کہ استعمال جائز ہو اور مفاسد کا اقتضاء یہ ہے کہ استعمال ممنوع ہو آپ ﷺ ان سے یہ اور فرمادیں کہ شراب اور قمار کا گناہ اور ضرر ان کے نفع اور فائدہ سے کہیں زیادہ ہے شراب اور قمار سے اول تو دنیا ہی میں بہت مضرتیں لاحق ہوتی ہیں۔ شراب پی کر عقل جیسی بے مثال نعمت ہاتھ سے کھو دینا اور بدمستیوں اور گالیوں میں مبتلا ہو جانا اور بغض وعداوت میں پڑ جانا ہے۔ غرض یہ کہ شراب عقل کو برباد کردیتی ہے اور قمار مال کو برباد کرتا ہے۔ اور اگر بالفرض ان چیزوں سے دنیا میں کوئی نقصان نہ ہوتا تو گناہ کی مضرت اُخروی مضرت ہے اور آخرت کی مضرت کے مقابلہ میں دنیا کے چند روزہ منافع ہیچ ہیں اس آیت سے شراب اور قمار کی حرمت بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ ان دونوں چیزوں کے ترک کا مشورہ دینا مقصود ہے کہ بہتر یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو چھوڑ دو اس لیے کہ ان کا ضرر نفع سے زائد ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دفع ضرر کو حصول نفع سے مقدم سمجھے۔

فائدہ:...... شراب کے بارے میں چار آیتیں نازل ہوئیں۔ سب سے پہلی آیت جو مکہ میں نازل ہوئی وہ یہ آیت ہے: ﴿وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا﴾ اس آیت میں کھجور اور انگور سے فقط شراب بنانے کا ذکر ہے ممانعت کا ذکر نہیں البتہ شراب کی کراہت اور ناپسندیدگی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ "سَكَرًا" کو "رِزْقًا حَسَنًا" کے مقابلہ میں ذکر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ جو چیز مُسکر ہو وہ رزقِ حَسَن نہیں۔ غرض یہ کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کی ممانعت نہیں تھی اس لیے مسلمان شراب پیتے رہے۔ بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمیں شراب اور جوئے کے بارے میں فتویٰ دیجئے کیونکہ یہ دونوں چیزیں عقل اور مال کو تباہ کرنے والی ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ﴾ الخ یہ دوسری آیت ہے جو اس سلسلہ میں نازل ہوئی۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض لوگوں نے اثم کبیر کا خیال کر کے شراب کو چھوڑ دیا اور بعض منافع للناس کی بناء پر پیتے رہے۔ ایک روز عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاں مہمان آگئے انہوں نے اُن کو شراب پلائی اور خود بھی پی جس سے نشہ ہوا اور مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ کسی نے اسی حالت میں عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو امامت کے لیے آگے کر دیا۔ نماز میں ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ شروع کی اور "اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ" پڑھا اور اخیر تک اسی طرح بغیر "لا" پڑھتے چلے گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾۔ یہ تیسری

آیت تھی اس آیت سے فقط نماز کے وقتوں میں نشہ حرام کر دیا گیا۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض لوگوں نے تو شراب کو بالکل چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ ایسی چیز میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں جو نماز سے روک دے اور بعض لوگ اوقات صلوۃ کے علاوہ دوسرے وقتوں میں شراب پیتے رہے۔ کوئی عشاء کی نماز کے بعد شراب پی لیتا تو صبح کی نماز تک اس کا نشہ اتر جاتا اور کوئی صبح کی نماز کے بعد پی لیتا تو ظہر کی نماز تک اس کا نشہ اتر جاتا۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک روز عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ نے بہت سے آدمیوں کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد اس قدر شراب پی گئی کہ لوگ مست ہو گئے اور نشہ کی حالت میں ایک دوسرے کو مارنے اور گالیاں دینے لگے اور ایک دوسرے کی مذمت میں اشعار پڑھنے لگے یہاں تک کہ ایک انصاری نے اونٹ کا جبڑا لے کر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سر پر مارا جس سے سعد رضی اللہ عنہ کا سر پھٹ گیا اس حال کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ شراب کے بارے میں کوئی صاف اور واضح حکم نازل فرما۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی یہ آیت نازل فرمائی ﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ﴾ الآیات یہ چوتھی آیت تھی جس میں صراحۃً شراب کی حرمت اور ممانعت نازل ہوئی۔ اس آیت کے نازل ہوتے ہی یک لخت شراب کے تمام مٹکے توڑ دیے گئے اور مدینہ کی گلیوں اور کوچوں میں شراب بہنے لگی اور تمام مسلمان شراب سے فقط تائب ہی نہیں ہوئے بلکہ بیزار ہو گئے حدیث میں ہے کہ شراب تمام بے حیائیوں کی جڑ ہے۔ چوری اور زنا پر آمادہ کرتی ہے سورۂ مائدہ کی آیت میں جو حکم نازل ہوا وہ آخری حکم تھا۔ اس سے پہلے جس قدر احکام نازل ہوئے وہ سب منسوخ ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے شراب حرام ہو گئی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دے جو بچے اپنے خرچ سے ف۱ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے حکم

اور پوچھتے ہیں تجھ سے کیا خرچ کریں؟ تو کہہ جو افزود ہو اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے حکم

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ

تاکہ تم فکر کرو دنیا و آخرت کی باتوں میں ف۲

شاید تم دھیان کرو۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

حکم شانزدھم۔ متعلق بمقدار انفاق

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ... الی... فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾

ربط:...... گزشتہ آیت میں خمر اور میسر کی حرمت کا ذکر تھا۔ اب ارشاد فرماتے ہیں کہ عقل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ سوچ سمجھ کر خرچ

ف۱ لوگوں نے پوچھا تھا کہ مال اللہ کے واسطے کس قدر خرچ کریں۔ حکم ہوا کہ جو اپنے اخراجات ضروری سے افزود (زائد) ہو کیونکہ جیسا آخرت کا فکر ضرور ہے دنیا کا فکر بھی ضرور ہے اگر سارا مال اٹھا دو گے تو اپنی ضروریات کیونکر پوری کرو اور جو حقوق تم پر لازم ہیں ان کو کیونکر ادا کرو معلوم نہیں کس کس خرابی دینی اور دنیوی میں پھنسو۔

ف۲ یعنی دنیا فانی مگر محل حوائج ہے اور آخرت باقی اور دار ثواب ہے اس لیے سوچ سمجھ کر ہر ایک امر میں اس کے مناسب حال خرچ کرنا چاہیے اور مصلحت دنیا اور آخرت دونوں کو پیش نظر رکھنا مناسب ہے اور احکام کو واضح طور پر بیان فرمانے سے یہی مطلوب ہے کہ تم کو فکر کرنے کا موقع ملے۔

کرے دنیاوی حاجتوں کو پیش نظر رکھے۔ بندہ محتاج ہے بغیر دنیاوی ضرورتوں کے آخرت کا کام بھی نہیں کر سکتا۔ نیز بہت سی دینی حاجتیں یکا یک پیش آجاتی ہیں ان کا بھی خیال رکھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور آپ ﷺ سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ خدا کی راہ میں ہم کیا اور کتنا خرچ کریں آپ ﷺ جواب میں کہہ دیجئے کہ آخرت کی اہمیت اور اس کے لازوال منافع کی عظمت کا اقتضاء تو یہ ہے کہ سب کچھ خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالو مگر وہ ارحم الراحمین تم کو یہ حکم نہیں دیتا کہ تم سارا مال خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالو۔ بلکہ یہ حکم دیتا ہے کہ اپنی دنیوی ضرورتوں اور حاجتوں سے جس قدر مال زائد اور فاضل ہو اتنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ تاکہ تم سارا مال دے کر پریشانی میں نہ پڑ جاؤ البتہ جو خدا کے ایسے عاشق ہیں کہ ان کو سارا ہی مال فضول اور زائد نظر آتا ہے بلکہ مال کے نہ خرچ کرنے سے ان کو پریشانی ہوتی ہے جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو ایسے لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یا یوں کہو کہ ایسے عاشق اس حکم میں داخل ہی نہیں۔

موسیا آداب دانا دیگر اند　　　سوختہ جاناں رواناں دیگر اند

ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصحاب صُفّہ میں سے ایک شخص کا انتقال ہو گیا اس کے پاس سے ایک اشرفی نکلی۔ حضور ﷺ نے سن کر یہ فرمایا کہ دوزخ کی آگ کا ایک داغ ہے۔ بعد ازاں ایک اور شخص کا انتقال ہو گیا اس کے پاس سے دو اشرفیاں نکلیں حضور ﷺ نے فرمایا یہ دو داغ ہیں (رواہ احمد والبیہقی)۔ شرعاً ایک اشرفی اور دو اشرفی کا جمع کرنا حرام نہیں لیکن یہ دونوں حضرات اصحاب صفہ میں تھے یعنی حضور پر نور ﷺ کی خانقاہ کے رہنے والے تھے جنہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی طرح زاہدانہ اور درویشانہ زندگی گزاریں گے اور قُوت لایموت سے زائد کچھ نہ رکھیں گے اس لیے اصحاب صفہ کے لیے اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی درہم دینار اپنے پاس رکھ سکیں۔ اس بناء پر یہ دونوں معتوب ہوئے۔ مسجد نبوی حضور پرنور ﷺ کی درس گاہ تھی اور مسجد نبوی کے متصل جو ایک صفہ (چبوترہ) اصحاب صفہ کے لیے حضور ﷺ نے بنوایا تھا وہ حضور پرنور ﷺ کی خانقاہ تھی جس میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے زاہد اور درویش رہتے تھے جن کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ کتنا ہی فقر وفاقہ گذرے مگر حضور ﷺ کی صحبت اور مجلس کی حاضری سے محروم نہ رہیں۔

یک لحظہ زکوئے یار دوری　　　درمذہب عاشقاں حرام است

اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے صاف صاف احکام کو بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا کے بارے میں اور آخرت کے بارے میں خوب غور وفکر کرلو دنیوی اور اخروی حقوق اور مصالح کو دیکھ لو اور اپنے احوال کو بھی دیکھ لو اور پھر شریعت جیسا حکم دے اس کے موافق خرچ کرو۔ تاکہ بعد میں پریشان اور پشیمان نہ ہو۔ اور یہ امر پیش نظر رکھو کہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی ہے۔ فانی لذتوں کی بناء پر دائمی اور باقی لذتوں اور راحتوں کو نہ چھوڑ دینا۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں یتیموں کا حکم فـ۱ کہہ دے سنوارنا ان کے کام کا بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ ملا لو

اور پوچھتے ہیں تجھ سے یتیموں کا حکم۔ تو کہہ سنوارنا ان کا بہتر ہے۔ اور اگر خرچ ملا رکھو ان کا

فـ۱ بعض لوگ یتیم کے مال میں احتیاط نہ کرتے تھے تو اس پر حکم ہوا تھا ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ اور ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ﴾۔

فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ

تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ جانتا ہے خرابی کرنے والے اور سنوارنے والے کو ف۱ اور اگر اللہ چاہتا تو تم پر مشقت ڈالتا ف۲

تو تمہارے بھائی ہیں۔ اور اللہ کو معلوم ہے خرابی کرنے والا اور سنوارنے والا۔ اور اگر چاہتا اللہ تم پر مشکل ڈالتا۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

بیشک اللہ زبردست ہے تدبیر والا ف۳

اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

حکم ہفدہم - مخالطت یتیم

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ... الی ... اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾

گزشتہ آیات میں جو احکام تھے یعنی ترک خمر اور میسر اور انفاق حسب مصلحت۔ وہ خود ان کے اموال اور احوال کی اصلاح کے لیے تھے اب اس آیت میں دوسروں کی اصلاح کے احکام ذکر فرماتے ہیں یعنی یتیم جو کہ خود اپنی مصالح سے قاصر اور عاجز ہے تم اس کے مال میں جو بھی تصرف کرو اس میں یتیم کی صلاح اور مصلحت کو پیش نظر رکھو اور آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ یتیموں کا خرچ علیحدہ رکھیں یا اپنے ساتھ رکھیں اگر یتیم کا کھانا علیحدہ پکائیں تو بسا اوقات یتیم کا کھانا بچ جاتا ہے اور اس طرح یتیم کا نقصان ہوتا ہے اور اگر ساتھ ملا کر پکاتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہم زائد کھائیں اور یتیم کم۔ اور یتیم کا مال کھانا آگ کا کھانا ہے اس لیے آپ ﷺ سے دریافت کرتے ہیں کہ یتیموں کے مال کا کس طرح انتظام کریں تو آپ ﷺ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ یتیموں کی مصلحت اور خیر اخواہی کو ملحوظ رکھنا بہتر ہے جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان کے مال کو بالکل علیحدہ رکھو اور نہایت احتیاط سے اس کا انتظام کرو۔ اور اگر خرچ میں ان کو شریک کرو اور شریک رکھنے ہی میں ان کی بہتری اور خیر خواہی سمجھو تو کوئی حرج نہیں وہ تمہارے دینی اور نسبتی بھائی ہیں اور ایک بھائی دوسرے بھائی کی خیر خواہی اور امداد سے دریغ نہیں کرتا اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے مال سے کچھ نفع اٹھا لے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اور اکثر و بیشتر بھائی بھائی ملے جلے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تباہ کار و صلاح کار سے خوب جانتے ہیں کہ کس نے خیانت اور

﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ﴾ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا﴾ الخ اس پر جو لوگ یتیموں کی پرورش کرتے تھے وہ ڈر گئے اور یتیموں کے کھانے اور خرچ کو بالکل جدا کر دیا کیونکہ شرکت کی حالت میں یتیم کا مال کھانا پڑتا تھا اس میں یہ دشواری ہوئی کہ ایک چیز یتیم کے واسطے تیار کی اب جو کچھ بچتی وہ خراب جاتی اور پھینکنی پڑتی اس احتیاط میں یتیموں کا نقصان ہونے لگا تو آپ سے عرض کیا تو اس پر اب یہ آیت نازل ہوئی۔

ف۱ یعنی مقصود تو صرف یہ بات ہے کہ یتیم کے مال کی درستی اور اصلاح ہو سو جس موقع میں علیحدگی میں یتیم کا نفع ہو تو اس کو اختیار کرنا چاہیے اور جہاں شرکت میں بہتری نظر آئے تو ان کا خرچ شامل کر لو تو کچھ مضائقہ نہیں کہ ایک وقت ان کی چیز کھالی تو دوسرے وقت اپنی چیز ان کو کھلا دی کیونکہ وہ یتیم بچے تمہارے دینی یا نسبی بھائی ہیں اور بھائیوں میں شرکت اور کھانا کھلانا عیب نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ یتیموں کی اصلاح کی رعایت پوری رہے اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اس شرکت سے کس کو خیانت اور افساد مال یتیم مقصود ہے اور کس کو یتیموں کی اصلاح اور ان کی نفع رسانی منظور ہے۔

ف۲ مشقت ڈالتا یعنی کھانا پینے میں یتیموں کی شرکت کی وجہ اصلاح بھی مباح نہ فرماتا بلکہ بلا علم و بلا قصد مجبوراً بھی اگر کچھ کمی یا بیشی ہو جاتی تو اس پر بھی مواخذہ کرتا۔

ف۳ یعنی بھاری سے بھاری حکم دے سکتا ہے اس لیے کہ وہ زبردست ہے لیکن ایسا نہ کیا بلکہ سہولت کا حکم دیا اس لیے کہ وہ حکمت اور مصلحت کے موافق کرنے والا ہے۔

یتیم کا مال خراب کرنے کی نیت سے شرکت کی ہے اور کس نے یتیم کی مصلحت اور خیر خواہی کا قصد کیا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا اور خرچ کو ملا جلا کر رکھنے کی اجازت نہ دیتا اور اگر بلا علم اور بلا قصد تم سے کوئی کمی بیشی ہو جاتی تو اس پر مواخذہ کرتا۔ لیکن اس نے تم پر آسانی کی کہ شرکت اور مخالطت کی اجازت دے دی اور اللہ غالب ہے جو چاہے حکم دے خواہ وہ حکم بندوں پر آسان ہو یا گراں اور بڑی حکمت والا ہے کہ اس کا کوئی حکم حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں اور کوئی حکم بندوں کو ایسا نہیں دیا جو ان کے لیے مشقت اور دشواری کا باعث ہو۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ

اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لے آئیں اور البتہ لونڈی مسلمان بہتر ہے مشرک بی بی سے اگرچہ وہ

اور نکاح میں نہ لاؤ شرک والی عورتیں، جب تک ایمان نہ لاویں اور البتہ لونڈی مسلمان بہتر ہے کسی شرک والی سے اگرچہ

اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ

تم کو بھلی لگے اور نکاح نہ کردو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آویں اور البتہ غلام مسلمان بہتر ہے

تم کو خوش آوے اور نکاح نہ کردو شرک والوں کو جب تک ایمان نہ لاویں اور البتہ غلام مسلمان بہتر ہے کسی

مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ

مشرک سے اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے ف ۱ وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف ف ۲ اور اللہ بلاتا ہے جنت کی

شرک والے سے اگرچہ تم کو خوش آوے۔ وہ لوگ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف، اور اللہ بلاتا ہے جنت کی طرف

وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۲۲۱ ع

اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بتلاتا ہے اپنے حکم لوگوں کو تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔

اور بخشش کی طرف، اپنے حکم سے اور بتاتا ہے اپنے حکم لوگوں کو، شاید وہ چوکس ہو جائیں۔

ف ۱ پہلے مسلمان مرد اور کافر عورت اور اس کے برعکس دونوں صورتوں میں نکاح کی اجازت تھی اس آیت سے اس کو منسوخ کر دیا گیا اگر مرد یا عورت مشرک ہو تو اس کا نکاح مسلمان سے درست نہیں یا نکاح کے بعد ایک مشرک ہو گیا تو نکاح سابق ٹوٹ جائے گا اور شرک یہ کہ علم یا قدرت یا کسی اور صفت خداوندی میں کسی کو خدا کا مماثل سمجھے یا خدا کے مثل کسی کی تعظیم کرنے لگے مثلاً کسی کو سجدہ کرے یا کسی کو مختار سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے۔ باقی اتنی بات دیگر آیات سے معلوم ہوئی کہ یہود اور نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح درست ہے وہ ان مشرکین میں داخل نہیں بشرطیکہ وہ اپنے دین پر قائم ہوں دہریہ اور ملحد ہوں جیسے اکثر نصاریٰ آجکل کے نظر آتے ہیں۔ خلاصہ تمام آیت کا یہ ہے کہ مسلمان مرد کو مشرک عورت سے نکاح کرنا درست نہیں تاوقتیکہ مسلمان نہ ہو جائے بیشک لونڈی مسلمان کافر عورت سے بہتر ہے گو وہ آزاد بی بی کیوں نہ ہو اگرچہ مشرک بی بی بسبب مال اور جمال اور شرافت کے تم کو پسند آئے اور ایسے ہی مسلمان عورت کا نکاح مشرک مرد سے نہ کرو مسلمان غلام بھی مشرک سے بہت بہتر ہے گو وہ آزاد ہی کیوں نہ ہو اگرچہ مشرک مرد بسبب صورت اور دولت کے تم کو پسند ہوں یعنی مسلمان ادنیٰ سے ادنیٰ بھی مشرک سے بہت افضل ہے گو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو۔

ف ۲ یعنی مشرکین اور مشرکات جن کا ذکر ہوا ان کے اقوال ان کے افعال ان کی محبت کے ساتھ اختلاط کرنا شرک کی نفرت اور اس کی برائی کو دل سے کم کرتا ہے اور شرک کی طرف رغبت کا باعث ہوتا ہے جس کا انجام دوزخ ہے اس لیے ایسوں کے ساتھ نکاح کرنے سے اجتناب کلی لازم ہے۔

حکم ہشتدہم مناکحت کفار

قَالَ تَعَالیٰ: ﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ... الی... لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں یتیموں کی مخالطت کا حکم بیان فرمایا۔ اس آیت میں مشرکین اور مشرکات کے ازدواجی اختلاط کا حکم بیان فرماتے ہیں کہ ازدواجی تعلق کے لیے دینی اخوت ضروری ہے اور وہ ان میں مفقود ہے لہٰذا اہلِ شرک سے ازدواجی تعلق جائز نہیں۔ کافروں سے نکاحی اختلاط اور ازدواجی تعلقات خمر اور میسر سے زیادہ مضر اور مہلک ہیں کافروں سے ازدواجی اور معاشرتی تعلق کے بعد نہ تو دین باقی رہتا ہے اور نہ اسلامی تمدن۔ چند روز کے بعد نہ اسلامی خصلتیں باقی رہتی ہیں اور نہ عادتیں۔ اپنی قومیت فنا کر کے دوسری قوم کا فرد بن جاتا ہے اور اسلامی تمدن کو حقیر سمجھنے لگتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور البتہ ایک مسلمان کنیز یعنی لونڈی اور باندی ایک مشرک عورت سے بدرجہا بہتر ہے اگرچہ وہ مشرک عورت آزاد بھی ہو اور حسین و جمیل بھی ہو اور مال دار بھی ہو۔ اللہ کے نزدیک ایمان کی لازوال دولت کے مقابلہ میں کسی مال اور جمال کی کوئی حقیقت نہیں اگرچہ وہ مشرک عورت اپنے مال یا حسن و جمال یا حسن عادت کی بناء پر تم کو اچھی معلوم ہو اور علی ہذا مسلمان عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں اور البتہ ایک غلام مسلمان ایک آزاد کافر سے کہیں بہتر ہے اگرچہ وہ کافر مال و دولت یا عزت و وجاہت کی وجہ سے تم کو اچھا معلوم ہو۔ یہ مشرک لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں۔ یعنی ایسے اقوال و افعال شرکیہ کی طرف بلاتے ہیں جو دوزخ میں لے جا کر ڈال دیں اور زن و شوئی کا تعلق اُن کی دعوت کی تاثیر کو قوی کرنے کا بہت بڑا سبب ہے اندیشہ ہے کہ اس تعلق کی بناء پر عقائد شرکیہ تم میں سرایت کر جائیں اور اسلام کی طرف سے تم کو شبہات میں ڈال دیں اور رفتہ رفتہ تم ہدایت اور گمراہی کو برابر سمجھنے لگو۔ اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی دعوت دیتا ہے اپنے حکم سے اور لوگوں کے لیے اپنے احکام کو صاف اور واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اور سمجھ لیں کہ غلام اور باندی کا تعلق جو جنت اور مغفرت کی طرف لے جائے اُس آزاد اور معزز کے تعلق سے کہیں بہتر ہے کہ جس کا تعلق جہنم کی طرف لے جائے۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ کی دعوت اور کافروں کی دعوت میں تضاد اور عداوت ہے خدا تعالیٰ سے اگر تعلق مقصود ہے تو اس کے دشمنوں سے ازدواجی تعلق نہ قائم کرو۔ اور اجتماع ضدین عقلاً بھی محال ہے۔ نیز مناکحت اور زوجیت کے لیے باہمی محبت اور موانست ضروری ہے اور اختلاف دین کی وجہ سے اگر محبت نہ ہوئی تو زوجیت کا کچھ فائدہ نہ ہوا اور اگر محبت ہوئی اور کفر اور کافری اور شرک سے چشم پوشی کی گئی تو آخرت تباہ اور برباد ہوئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے مناکحت کی قطعاً ممانعت کر دی۔

فوائد:...... اس آیت میں دو حکم ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان عورت کا کسی کافر مرد سے نکاح نہ کیا جائے یہ حکم اب بھی ہے۔ دوسرا حکم یہ کہ مسلمان مرد کو کافر عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں سو اس حکم میں ایک تخصیص ہے وہ یہ کہ اہلِ کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے بشرطیکہ وہ اہل کتاب حقیقۃً اہل کتاب ہوں۔ ملحدانہ اور دہریانہ عقائد نہ رکھتے ہوں اور بشرطیکہ اُس یہودی اور نصرانی عورت کے نکاح سے اس مسلمان مرد کے دین میں خلل آنے کا اندیشہ نہ ہو اس

حکم کی تفصیل اور دلیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں حکم حیض کا کہہ دے وہ گندگی ہے سو تم الگ رہو عورتوں سے حیض کے وقت ف۱

اور پوچھتے ہیں تم سے حکم حیض کا۔ تو کہہ وہ گندگی ہے سو تم پرے رہو عورتوں سے حیض کے وقت

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ

اور نزدیک نہ ہو ان کے جب تک پاک نہ ہوویں ف۲ پھر جب خوب پاک ہو جاویں تو جاؤ ان کے پاس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے ف۳

اور نزدیک نہ ہو ان سے جب تک کہ پاک نہ ہوویں پھر جب ستھرائی کر لیں تو جاؤ ان پاس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا

بیشک اللہ کو پسند آتے ہیں توبہ کرنیوالے اور پسند آتے ہیں گندگی سے بچنے والے ف۴ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں سو جاؤ

اللہ کو خوش آتے ہیں توبہ کرنے والے، اور خوش آتے ہیں ستھرائی والے۔ عورتیں تمہاری، کھیتی ہیں تمہاری، سو جاؤ اپنی

حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ

اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو ف۵ اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے ف۶ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو

کھیتی میں جہاں سے چاہو اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے، اور جان رکھو کہ تم کو

ف۱ حیض کہتے ہیں اس خون کو جو عورتوں کی عادت ہے اس حالت میں مجامعت کرنا نماز روزہ سب حرام ہیں اور خلاف عادت جو خون آئے وہ بیماری ہے اس میں مجامعت، نماز، روزہ سب درست ہیں اس کا حال ایسا ہے جیسا زخم یا فصد سے خون نکلنے کا۔ یہود اور مجوس حالت حیض میں عورت کے ساتھ کھانے اور ایک گھر میں رہنے کو بھی جائز نہ سمجھتے تھے اور نصاریٰ مجامعت سے بھی پرہیز نہ کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو اس پر یہ آیت اتری آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر صاف فرما دیا کہ مجامعت اس حالت میں حرام ہے اور ان کے ساتھ کھانا پینا رہنا سہنا سب درست ہیں یہود کا افراط اور نصاریٰ کی تفریط دونوں مردود ہو گئیں۔

ف۲ پاک ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر حیض اپنی پوری مدت یعنی دس دن پر موقوف ہو تو اسی وقت سے مجامعت درست ہے اور اگر دس دن سے پہلے ختم ہو گیا مثلاً چھ روز کے بعد اور عورت کی عادت بھی چھ روز کی تھی تو مجامعت خون کے موقوف ہوتے ہی درست نہیں، بلکہ جب عورت غسل کر لے یا نماز کا وقت ختم ہو جائے اس کے بعد مجامعت درست ہوگی اور اگر عورت کی عادت سات یا آٹھ دن کی تھی تو ان دنوں کے پورا کرنے کے بعد مجامعت درست ہوگی۔

ف۳ جس موقع سے مجامعت کی اجازت دی ہے یعنی آگے کی راہ کہ جہاں سے بچہ پیدا ہوتا ہے دوسرا موقع یعنی لواطت حرام ہے۔

ف۴ یعنی جو توبہ کرتے ہیں گناہ سے جو ان سے اتفاقیہ صادر ہوا، مثلاً حالت حیض میں وطی کا مرتکب ہوا اور ناپاکی یعنی گناہوں اور وطی حالت حیض اور وطی موقع نجس سے احتراز کرتے ہیں۔

ف۵ یہود عورت کی پشت کی طرف ہو کر وطی کرنے کو ممنوع کہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس سے بچہ احول پیدا ہوتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو اس پر یہ آیت اتری یعنی تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی کے ہیں جس میں نطفہ بجائے تخم اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے یعنی اس سے مقصود اصلی صرف نسل کا باقی رکھنا اور اولاد کا پیدا ہونا ہے سو تم کو اختیار ہے آگے سے یا کروٹ سے یا پس پشت سے پڑ کر یا بیٹھ کر جس طرح چاہو مجامعت کرو مگر یہ ضرور ہے کہ تخم ریزی اسی خاص موقع میں ہو جہاں پیداواری کی امید ہو یعنی مجامعت خاص فرج ہی میں ہو لواطت ہرگز ہرگز نہ ہو یہود کا خیال غلط ہے کہ اس سے بچہ احول پیدا ہوتا ہے۔

ف۶ یعنی اعمال صالحہ اپنے لیے کرتے رہو یا یہ کہ وطی سے اولاد صالحہ مطلوب ہونی چاہیے محض حظ نفس مقصود نہ ہو۔

مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲۲۳﴾

اس سے ملنا ہے اور خوشخبری سنا ایمان والوں کو۔

اس سے ملنا ہے۔اور خوشخبری سنا ایمان والوں کو۔

حکم نوزدھم حرمت جماع در حالت حیض

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ... الی... وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیت میں نکاح کا حکم مذکور تھا۔اس آیت میں حالتِ حیض میں جماع اور قربان کا حکم بیان کرتے ہیں۔یہود میں یہ دستور تھا کہ ایام حیض میں عورت سے بالکل علیحدہ رہتے نہ اس کے ساتھ کھاتے اور نہ پیتے بلکہ اس کو علیحدہ مکان میں رکھتے۔اور اس کے برعکس نصاریٰ میں یہ دستور تھا کہ ایام حیض میں مخالطت تو درکنار مجامعت سے بھی پرہیز نہ کرتے۔مدینہ منورہ میں ہر قسم کے لوگ رہتے تھے اس لیے صحابہ کرام ؓ کو اس مسئلہ میں خلجان پیش آیا اور حضور پرنور ﷺ سے سوال کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور لوگ آپ سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ حالت حیض میں عورت کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے آپ کہہ دیجئے کہ حیض ایک گندگی اور ناپاکی ہے لہذا تم ان سے اس حالت میں علیحدہ رہو یعنی ان سے صحبت اور مجامعت نہ کرو باقی کھانے اور پینے اور ساتھ بیٹھنے میں کوئی پرہیز نہیں مقصود فقط گندگی سے علیحدہ رہنا ہے اور جب تک وہ حیض سے پاک نہ ہو جائیں اس وقت تک ان سے قربان یعنی صحبت اور مجامعت نہ کرو پس جب وہ عورتیں اچھی طرح پاک ہو جائیں کہ ناپاکی کا شبہ بھی باقی نہ رہے تو پھر ان سے مجامعت کرو مگر اس مقام سے جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تم کو صحبت کرنے کی اجازت دی ہے یعنی آگے کی جانب سے پیچھے کی جانب سے نہیں اور اگر غلطی سے ایام حیض میں صحبت کر لی تو توبہ کر لو تحقیق اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو گناہ کر گزرنے کے بعد توبہ کر لیتے ہیں اور جو لوگ سرے ہی سے گندگی سے پاک رہتے ہیں۔ان سے بھی محبت رکھتے ہیں۔ یعنی جو لوگ سرے سے ہی ناپاکیوں سے بچتے ہیں مثلاً ایام حیض میں صحبت سے پرہیز کرتے ہیں اور جس جگہ سے صحبت کی ممانعت ہے اس جگہ سے صحبت نہیں کرتے ایسے لوگوں سے بھی اللہ تعالیٰ محبت رکھتا ہے اور آگے کی جانب سے تم کو صحبت کا حکم اس لیے دیا گیا کہ تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتیوں کے ہیں۔اُن کے رحم میں جو نطفہ ڈالا جاتا ہے وہ بمنزلہ تخم کے ہے اور بچہ بمنزلہ پیداوار کے ہے سو تم کو اختیار ہے کہ اپنی کھیتی میں جس طرح اور جس طرف سے چاہو آؤ بیٹھ کر یا لیٹ کر مگر شرط یہ ہے کہ کھیتی سے باہر نہ جاؤ فقط حرث اور زرع (کھیتی) میں آنے کی تم کو اجازت دی گئی ہے۔ اور جو جگہ حرث (کھیتی) کے قابل نہیں یعنی پیچھے کی جانب اس جگہ میں تم کو جانے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں پیچھے کی جانب سے آنا یہ قوم لوط کا عمل ہے جس پر قہر خداوندی نازل ہوا۔حدیث میں ہے:

"مَلْعُوْنٌ مَّنْ اَتَی امْرَاَۃً فِیْ دُبُرِھَا"۔(رواہ احمد وابوداؤد) "ملعون ہے وہ شخص کہ جو عورت کی دبر میں وطی کرے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس نے حالت حیض میں وطی کی یا دبر کی جانب میں صحبت کی یا کسی کاہن اور نجومی کے

پاس گیا اور اس کی تصدیق کی تو اُس شخص نے محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ احکام کا کفر کیا۔ (رواہ الترمذی) شیعوں کے نزدیک بیوی سے اغلام درست ہے جو صریح قرآن کریم کے اس لفظ ﴿نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ﴾ کے خلاف ہے اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ نکاح سے مقصود اولاد ہے جیسے کھیت سے مطلوب پیداوار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اغلام سے اولاد کا تولد ناممکن ہے چنانچہ ترغیب نکاح کے بارے میں جو حدیث نبوی مشہور ہے اس میں یہ جملہ ہے کہ "مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ" یعنی میں امت کی کثرت پر فخر کروں گا۔ معلوم ہوا کہ ترغیب نکاح سے اولاد کی کثرت مطلوب ہے جس سے حضور پرنور ﷺ کو قیامت کے دن سامان افتخار ہاتھ آئے اور یہ یاد رکھو کہ تم کو صحبت کی اجازت محض لذت کے لیے نہیں دی گئی بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس لذت کو ذریعۂ آخرت بناؤ اور اپنے لیے آگے کی کچھ تدبیر کرو یعنی صحبت کے وقت اللہ کا نام لو تاکہ اولاد شیطان کے اثر سے محفوظ رہے اور نیک اولاد کی نیت کرو تاکہ آخرت کی کھیتی بنے اور تمہارے لیے دعا اور استغفار کرے اور قیامت کے دن تمہارے کام آئے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ یعنی حالت حیض یا بے محل صحبت کرنے سے پرہیز کرو اور یقین رکھو کہ تم کو اللہ سے ملنا ہے ایک دن اس کے سامنے پیش ہونا ہے اور تمام اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس روز تخم کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ بے وقت اور بے محل تو اس کو ضائع نہیں کر دیا تھا اور اہل ایمان کو خوش خبری سنا دیجئے کہ جنہوں نے اپنے تخم کو بروقت اور برمحل استعمال کیا ان کو اس تخم کے ثمرات وہاں مل جائیں گے مطمئن رہیں۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری سے اور لوگوں میں صلح کرانے سے بچ جاؤ ف ۱

اور نہ ٹھہراؤ اللہ کو ہتھ کنڈا اپنی قسمیں کھانے کا کہ سلوک نہ کرو اور پرہیزگاری اور صلح درمیان لوگوں کے

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ

اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے ف ۲ نہیں پکڑتا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری ف ۳ لیکن پکڑتا ہے تم کو ان قسموں پر کہ

اور اللہ سنتا ہے جانتا۔ نہیں پکڑتا تم کو اللہ ناکاری قسموں پر تمہاری لیکن پکڑتا ہے اس کام پر

بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

جن کا قصد کیا تمہارے دلوں نے ف ۴ اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے ف ۵

جو کرتے ہیں دل تمہارے۔ اور اللہ بخشتا ہے تحمل والا۔

ف ۱ یعنی کسی اچھے کام نہ کرنے پر خدا کی قسم کھا بیٹھے مثلاً ماں باپ سے نہ بولوں گا یا فقیر کو کچھ نہ دوں گا یا باہم کسی میں مصالحت نہ کراؤں گا۔ ایسی قسموں میں خدا کے نام کو برے کاموں کے لیے ذریعہ بنانا ہوا سو ایسا ہرگز مت کرو اور اگر کسی نے ایسی قسم کھائی تو اس کا توڑنا اور کفارہ دینا واجب ہے۔

ف ۲ یعنی اگر کوئی قسم کھاتا ہے تو اللہ اس کو سنتا ہے اور اگر کوئی عظمت و جلال خداوندی کی وجہ سے قسم کھانے سے رکتا ہے تو اللہ اس کی نیت کو خوب جانتا ہے تمہاری کوئی بات ظاہری اور باطنی اس سے مخفی نہیں اس لیے نیت قلبی اور قول لسانی دونوں میں احتیاط لازم ہے۔

ف ۳ لغو اور بیہودہ قسم وہ ہے کہ منہ سے عادت اور عرف کے موافق بے ساختہ اور ناخواستہ نکل جائے اور دل کو خبر تک نہ ہو ایسی قسم کا نہ کفارہ ہے نہ اس میں گناہ ہے البتہ اگر کوئی بالقصد الفاظ قسم مثل واللہ اور باللہ کہے اور اس سے محض تاکید مقصود ہو قسم کا قصد نہ ہو تو اس پر ضرور کفارہ لازم ہوگا اور کفارہ کا بیان آگے آجائے گا۔ =

حکم بستم متعلق بہ احترام نام پاک خداوند انام

قَالَ تَعَالیٰ: ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ... الى... وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾

ربط:...... گزشتہ آیت میں تقویٰ کا حکم مذکور تھا۔ اب اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تقویٰ کا مقتضی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے نام پاک کا ادب اور احترام ملحوظ رکھو اور بات بات میں اللہ تعالیٰ کی قسم نہ کھاؤ اور نہ دنیاوی اغراض اور منافع کے لیے اللہ تعالیٰ کے نام پاک کو استعمال کرو۔ یہ سب ادب کے خلاف ہے۔

شان نزول:...... عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ اور ان کے داماد بشیر بن نعمان رضی اللہ عنہ میں کسی بات پر کچھ تکرار ہوا۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ میں نہ تم سے ملوں گا اور نہ تم سے کلام کروں گا اور نہ تمہاری کسی بھلائی اور برائی میں دخل دوں گا۔ اس کے بعد عبداللہ رضی اللہ عنہ سے جب کوئی اس بارے میں کوئی بات کرتا اور کچھ کہنا چاہتا تو یہ کہہ دیتے کہ میں نے اللہ کی قسم کھالی ہے اس لیے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے نام کو اپنی قسموں کے لیے آڑ نہ بناؤ یعنی رشتہ داروں میں سلوک اور احسان کرنے کے لیے اور تقوی اور پرہیزگاری کا کام کرنے کے لیے اور لوگوں میں صلح کرانے کے لیے قسم کو بہانہ نہ بناؤ اور یہ نہ کہو کہ میں نے قسم کھالی ہے اس لیے میں یہ کام نہیں کرسکتا۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص نیک عمل کے چھوڑنے اور نہ کرنے پر قسم کھالے تو اس پر واجب ہے کہ وہ نیک کام کرے اور اس کا کفارہ دے۔ لوگوں کا گمان یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز پر قسم کھالے خواہ وہ اچھی ہو یا بری اس پر قائم رہنا چاہیے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور بتلا دیا کہ قسم کی وجہ سے نیک کام کو نہ چھوڑو اور ایسی حالت میں قسم کو توڑ کر کفارہ دے دو اور نیک کام کرو۔ تاکہ تم کو کار خیر کا اجر حاصل ہو اور ایسی قسم کے توڑنے میں اللہ تعالیٰ تمہارے عذر کو سننے والا ہے اور تمہاری نیتوں کا جاننے والا ہے کہ تمہاری نیت اللہ کے نام کی بے حرمتی نہ تھی محض تعمیل حکم اور نیکی کرنے کے لیے قسم کو توڑا ہے اور بصد ہزار ندامت و پشیمانی اس کی تلافی کے لیے کفارہ ادا کیا ہے یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں کو سنتا ہے اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے کہ کس نیت سے قسم کھائی ہے۔ تمہارا لفظ اور قصد کوئی بھی اس سے مخفی نہیں لہٰذا قسم کھاتے وقت لفظوں میں احتیاط رکھو اور نیت اور ارادہ کرنے میں بھی احتیاط رکھو اور قسم کے متعلق ہمارا یہ ضابطہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں تم سے ان قسموں پر مواخذہ اور گرفت نہ کریں گے جو بلا قصد و ارادہ تمہاری زبان سے نکل گئی ہیں یا قصد[1] اور ارادہ تو تھا مگر تم اس کو اپنے گمان میں راست اور صحیح سمجھتے تھے۔ ایسی قسم میں نہ کفارہ ہے اور نہ گناہ لیکن اللہ تم سے ان قسموں پر آخرت میں مواخذہ فرمائیں گے کہ جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے اور معصیت کرنے کا قصد اور ارادہ کیا ہے یا اُس قسم کو کسی بر اور تقوی سے علیحدہ رہنے کا ذریعہ اور بہانہ بنایا ہے اور اللہ بخشنے والا ہے کہ یمین لغو پر مواخذہ نہیں فرماتا اور بڑا حلیم اور بردبار ہے کہ باوجود بالقصد والارادہ جھوٹی قسم کھانے کے مواخذہ میں جلدی نہیں فرماتا شاید توبہ کرلے۔ توبہ کے لیے مہلت دیتے ہیں۔

=ف ۴ یعنی جو قسم جان بوجھ کر کھائے کہ جس میں دل بھی زبان کے موافق ہو اس قسم کے توڑنے پر کفارہ لازم ہوگا۔

ف ۵ غفور ہے کہ لغو اور بیہودہ قسموں پر مواخذہ نہ فرمایا۔ حلیم ہے کہ مواخذہ میں جلدی نہیں فرماتا۔ شاید بندہ توبہ کرلے۔

[1] شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ یمین لغو کی تفسیر میں فرماتے ہیں "یعنی لا واللہ و بلیٰ واللہ بغیر قصد گوید یا غلط دانستہ سوگند خورد علی اختلاف المذہبین"۔ واللہ اعلم

فائدہ ۱: ...... یمین یعنی قسم کی تین قسمیں ہیں ایک قسم یمین لغو ہے۔ اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یمین لغو کے معنی یہ ہیں کہ جو قسم انسان کی زبان سے بلا قصد اور ارادہ نکل جائے جیسے عرب میں "لا واللہ"، اور "بلی واللہ" تکیہ کلام تھا۔ ایسی قسم میں نہ گناہ ہے نہ کفارہ۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یمین لغو وہ ہے کہ کسی گزشتہ چیز کو سچ سمجھ کر قسم کھالے اور واقع میں اس کے خلاف ہو لیکن اس نے اپنے گمان میں اس کو سچ سمجھ کر قسم کھائی ہو ایسی قسم میں نہ کفارہ ہے اور نہ کوئی گناہ۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس میں ارادہ ہو اگر وہ نفس الامر کے خلاف ہو تو اس میں کفارہ واجب ہوگا۔ اگرچہ قسم کھانے والے کے گمان میں وہ واقع اور نفس الامر کے مطابق ہو۔

دوسری قسم: ...... یمین غموس ہے وہ یہ کہ کسی گزری ہوئی بات پر قصداً جھوٹی قسم کھائے۔ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک اس قسم کی قسم پر حسب ارشاد باری ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ گناہ ہے جس کا علاج توبہ اور استغفار ہے۔ دنیا میں اس پر کوئی کفارہ نہیں اس لیے کہ کسی گزشتہ امر پر دیدہ و دانستہ قسم کھانا جھوٹ ہے اور جھوٹ بولنے پر گناہ ہوتا ہے کفارہ نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یمین غموس میں کفارہ واجب ہے کیونکہ سورۂ مائدہ میں بجائے "بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ" کے ﴿بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾ کا لفظ آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ "مَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ" اور "مَا عَقَّدْتُّمْ" سے ایک ہی معنی مراد ہیں اور سورۂ مائدہ میں کفارہ صراحۃً مذکور ہے معلوم ہوا کہ مواخذہ سے مراد کفارہ دینا ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ﴾ میں اخروی مواخذہ مراد ہے یعنی دیدہ و دانستہ جھوٹ بولنے پر عذاب دینا مراد ہے کفارہ مراد نہیں۔

تیسری قسم: ...... یمین منعقدہ ہے یعنی آئندہ فعل کے متعلق قصداً قسم کھائے کہ کروں گا یا نہیں کروں گا ایسی قسم کے توڑنے پر بالاتفاق کفارہ واجب ہوتا ہے اور سورۂ مائدہ میں ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ﴾ الخ سے یہی یمین منعقدہ مراد ہے کہ جو آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق قسم کھائی جائے اور اس زیر تفسیر آیت یعنی ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ میں اسی قسم یعنی فعل آئندہ پر قسم کھانے کا حکم مذکور ہے اگر تم آئندہ کے متعلق کسی گناہ اور خلاف بر اور خلاف تقوی کام کی قسم کھا بیٹھے ہو کہ واللہ اپنے باپ سے یا رشتہ دار سے بات نہ کروں گا تو تم کو لازم ہے کہ ایسی قسم کو توڑ دو اور کفارہ دو جیسا کہ اس آیت کا شان نزول اس معنی کا شاہد عدل ہے لیکن اس آیت میں فقط اُخروی مواخذہ کا ذکر ہے دنیاوی مواخذہ (یعنی کفارہ) کا ذکر سورۂ مائدہ میں آئے گا۔

اور سورۂ نور کی اس آیت ﴿وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِی الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ میں بھی اسی قسم کی قسم کا ذکر ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی تھی کہ میں مسطح کو خرچ نہ دوں گا اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابوبکر نے مسطح کا وظیفہ دوچند کر دیا۔

ف ۲: ...... اس آیت میں ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ میں فقط لغو اور یمین منعقدہ کا ذکر ہے یمین غموس کا ذکر نہیں۔ یمین غموس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ الآیۃ اس آیت میں یمین غموس پر اُخروی مواخذہ کا ذکر ہے دنیوی مواخذہ یعنی کفارہ کا ذکر نہیں اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یمین غموس کی حقیقت جھوٹ اور افتراء ہے جو اعلی درجہ کا

گناہ کبیرہ ہے جس میں توبہ اور استغفار واجب ہے مگر کفارہ نہیں۔ اور علیٰ ہذا ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ میں بھی یمین غموس کی طرف اشارہ ہے۔

ف ۳:...... اس آیت میں اللہ نے ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ کو ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ کے مقابلہ میں ذکر فرمایا ہے اور کسب قلب سے بالا جماع کذب اور معصیت کا ارادہ مراد ہے معلوم ہوا کہ یمین لغو جو ﴿بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ کے مقابلہ میں مذکور ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس یمین میں کذب اور جھوٹ کا ارادہ نہ ہو بلکہ اپنے گمان میں سچ سمجھ کر قسم کھائی ہو وہ یمین لغو ہے جس میں کوئی مواخذہ نہیں نہ گناہ اور نہ کفارہ۔ اور عبداللہ بن عباس ؓ اور مجاہد اور ابراہیم نخعی ؒ سے یمین لغو کی یہی تفسیر منقول ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ ؒ کا قول ہے۔ تفصیل کے لیے احکام القرآن للجصاص، ص: ۳۵۵ کی مراجعت کی جائے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

جو لوگ قسم کھا لیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے ان کے لئے مہلت ہے چار مہینے کی پھر اگر باہم مل گئے تو اللہ بخشنے والا

جو لوگ قسم کھا رہتے ہیں اپنی عورتوں سے ان کو فرصت ہے چار مہینے۔ پھر اگر مل گئے تو اللہ بخشنے والا

رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

مہربان ہے اور اگر ٹھہرا لیا چھوڑ دینے کو تو بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے ف ۱

مہربان ہے۔ اور اگر ٹھہرایا رخصت کرنا تو اللہ سنتا ہے جانتا۔

حکم بست ودیم - ایلاء

قَالَ تَعَالٰی: ﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ... الی... فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں کچھ احکام عورتوں کے متعلق مذکور ہوئے اور کچھ احکام یمین یعنی قسم کے متعلق مذکور ہوئے۔ آئندہ آیت میں ایک خاص قسم کی یمین یعنی خاص قسم کی قسم کا ذکر فرماتے ہیں جو عورتوں سے متعلق ہے یعنی ''ایلاء'' اس میں دونوں باتیں جمع ہیں۔ یا یوں کہو کہ ایلاء ایک خاص قسم کی یمین ہے جس کے احکام علیحدہ ہیں۔ اس لیے ایلاء کا حکم علیحدہ بیان فرمایا۔ یا یوں کہو کہ گزشتہ آیات میں یہ بیان فرمایا کہ اگر برّ اور تقویٰ اور اصلاح کرنے کے لیے قسم کو توڑا جائے اور کفارہ ادا کر دیا جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں۔ اس آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ اسی طرح ایلاء کو سمجھو کہ اگر کسی نے

ف ۱ یعنی اگر کوئی قسم کھائے کہ میں اپنی عورت کے پاس نہ جاؤں گا تو اگر چار مہینے کے اندر عورت کے پاس گیا تو قسم کا کفارہ دے گا اور عورت اس کے نکاح میں رہے گی اور اگر چار مہینے گزر گئے اور اس کے پاس نہ گیا تو عورت پر طلاق بائن ہو جائے گی۔

فائدہ: ایلاء شرع میں اس کو کہتے ہیں کہ عورت کے پاس جانے سے چار مہینے یا زائد کے لیے یا بلا قید مدت قسم کھالے اور چار مہینے سے کم ایلاء نہ ہوگا، ایلاء کی تینوں صورتوں میں چار مہینے کے اندر عورت کے پاس جائے گا تو کفارہ قسم کا دینا پڑے گا ورنہ چار ماہ کے ختم پر بلا طلاق دیئے عورت مطلقہ بائنہ ہو جائے گی اور اگر چار مہینے سے کم پر قسم کھائے مثلاً قسم کھائی کہ تین مہینے عورت کے پاس نہ جاؤں گا تو یہ ایلاء شرعی نہیں، اس کا یہ حکم ہے کہ اگر قسم کو توڑا مثلاً صورت مذکورہ میں تین مہینے کے اندر عورت کے پاس گیا تو قسم کا کفارہ لازم ہوگا اور اگر قسم کو پورا کیا یعنی تین مہینے تک مثلاً اس کے پاس نہ گیا تو نہ عورت پر طلاق پڑے گی نہ کفارہ لازم ہوگا۔

اپنی بیوی سے ایلاء کیا یعنی یہ قسم کھائی کہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا تو اگر اس قسم کو توڑ دے اور کفارہ دے دے تو نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے سے قسم کھا بیٹھتے ہیں یعنی قسم کھا لیتے ہیں کہ ہم ان سے صحبت نہ کریں گے ایسے لوگوں کے لیے چار مہینے کا انتظار لازم ہے بس اگر ان چار مہینے کے اندر اپنی قسم کو توڑ کر یہ لوگ اپنی عورت کی طرف رجوع کریں یعنی ان سے صحبت اور مجامعت کریں اور اس طرح اپنی قسم کو توڑ کر کفارہ دیدیں تو ان کا نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ قسم کے توڑنے اور عورت کو تکلیف پہنچانے کے قصور کو معاف کر دیں گے اور آئندہ کے لیے حقوق زوجیت ادا کرنے کی نیت کر لینے کی وجہ سے اس پر رحمت اور مہربانی فرمائیں گے اور اگر ان لوگوں نے قطع تعلق ہی کی ٹھان لی ہے اس لیے اس نے چار مہینے کے اندر رجوع نہیں کیا اور اسی طرح اپنی قسم پر قائم رہا تو چار ماہ گزرتے ہی اس پر طلاق پڑ جائے گی اور اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو سننے والے اور اس کی نیت کو جاننے والے ہیں اور اس لیے اس کے مناسب یہ حکم دیا۔

ف ۱:...... عرب کا یہ دستور تھا کہ جب بیوی سے خفا ہوتے تو یہ قسم کھا لیتے کہ میں اب تیرے پاس نہ آؤں گا جاہلیت میں عورت کے ستانے کا یہ ایک طریق تھا اس سے نہ عورت بیوہ ہوتی اور نہ خاوند والی شریعت اسلامیہ نے اس کی ایک حد اور مدت معین کر دی۔ یعنی چار ماہ۔ اگر اس مدت میں رجوع کر لیا تو نکاح باقی رہے گا۔ اور اگر اس نے اس مدت میں رجوع نہ کیا تو طلاق بائن پڑ جائے گی۔

ف ۲:...... امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اگر ایلاء کرنے والا چار ماہ گذرنے کے بعد فوراً رجوع کرے تو وہ رجوع معتبر ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر چار مہینے کے اندر اندر رجوع کرے تو معتبر ہے چار ماہ گزر جانے کے بعد رجوع کا اعتبار نہیں۔ اس لیے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ﴿فَإِنْ فَاءُوْا فِيْهِنَّ﴾ آیا ہے یعنی ان چار مہینوں کے اندر رجوع کریں۔ اور یہ قراءۃ اگرچہ متواتر نہیں لیکن امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک اگر قرأت شاذہ قرات متواترہ کے معارض نہ ہو بلکہ اس کی مفسر اور شارح ہو تو وہ بھی حجت اور واجب العمل ہے۔ اور تعارض اس کو کہتے ہیں کہ جہاں دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو اور ظاہر ہے کہ ﴿فَإِنْ فَاءُوْا فِيْهِنَّ﴾ کی قرات ﴿فَإِنْ فَاءُوْا﴾ کے منافی نہیں بلکہ اس کی تفسیر اور بیان ہے۔

ف ۳:...... امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک محض چار مہینے گزر جانے سے طلاق نہیں پڑتی۔ چار ماہ گزر جانے کے بعد قسم کھانے والا یا تو طلاق دے یا رجوع کرے طلاق کا پڑنا اس کے طلاق دینے پر موقوف ہے اور اگر نہ طلاق دے اور نہ رجوع کرے بلکہ سکوت کرے تو حاکم اس سے زبردستی طلاق دلائے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر چار مہینے بلا رجوع کے گزر گئے تو اس پر طلاق پڑ جائے گی۔

ف ۴:...... شریعت میں ایلاء اس قسم کو کہتے ہیں کہ جو شخص یہ قسم کھائے کہ چار مہینے یا چار ماہ سے زائد یا بلا تعین مدت اپنی عورتوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اور اگر چار مہینے سے کم کے لیے قسم کھائی تو وہ ایلاء شرعی نہ ہوگا۔ اول کی تین صورتوں کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر رجوع کر لیا تو نکاح باقی رہے گا اور کفارۂ قسم دینا پڑے گا۔ اور اگر چار مہینے بلا رجوع کے گزر گئے تو طلاق بائن ہو جائے گی اب رجوع درست نہیں۔ البتہ جدید نکاح بدون حلالہ کے جائز ہے اور ایلاء کی آخری صورت یعنی چار

مہینے سے کم کے لیے اگر قسم کھائی ہے مثلاً تین مہینہ کے لیے قسم کھائی تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر تین مہینہ کے اندر عورت کے پاس گیا تو کفارہ قسم دینا ہوگا اور نکاح باقی رہے گا اور اگر اپنی قسم کو پورا کیا یعنی تین ماہ کے اندر عورت کے پاس نہیں گیا تو تب بھی نکاح باقی رہے گا اور نہ طلاق واقع ہوگی اور نہ کفارہ لازم ہوگا۔

ف۵:...... امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رجوع کے لیے فقط اتنا کافی ہے کہ میں نے رجوع کرلیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلا وطی کے رجوع نہیں ہوتا۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال نہیں کہ چھپا رکھیں جو

اور طلاق والی عورتیں انتظار کروائیں اپنے تیئں تین حیض تک۔ اور ان کو حلال نہیں کہ چھپا رکھیں

خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ

پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور پچھلے دن پر ف۱ اور ان کے خاوند حق رکھتے ہیں

جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں، اگر ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور پچھلے دن پر اور ان کے خاوندوں کو پہنچتا ہے

بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

ان کے لوٹا لینے کا اس مدت میں اگر چاہیں سلوک سے رہنا ف۲ اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق

پھیر لینا ان کا اتنی دیر میں اگر چاہیں صلح کرنی اور عورتوں کو بھی حق ہے جیسا کہ ان پر حق ہے موافق دستور کے

ع ۲۸ ۱۲ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۲۸

اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے ف۳ اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا

اور مردوں کو ان پر درجہ ہے اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

ف۱ جب مرد نے عورت کو طلاق دی تو ابھی اس عورت کو کسی دوسرے سے نکاح روا نہیں جب تک تین حیض پورے نہ ہو جائیں تاکہ حمل ہو تو معلوم ہو جائے اور کسی کی اولاد کسی کو نہ مل جائے اس لیے عورت پر فرض ہے کہ جو ان کے پیٹ میں ہو اس کو ظاہر کر دیں خواہ حمل ہو یا حیض آتا ہو، اور اس مدت کو عدت کہتے ہیں۔

فائدہ: معلوم کرنا چاہیے کہ یہاں مطلقات سے خاص وہ عورتیں مراد ہیں کہ ان سے نکاح کے بعد صحبت یا خلوت شرعیہ کی نوبت خاوند کو آچکی ہو اور ان عورتوں کو حیض بھی آتا ہو اور آزاد بھی ہوں کسی کی لونڈی نہ ہوں کیونکہ جس عورت سے صحبت یا خلوت کی نوبت نہ آئے اس کے اوپر طلاق کے بعد عدت بالکل نہیں اور جس عورت کو حیض نہ آئے مثلاً صغیر سن ہے یا بہت بوڑھی ہوگئی یا اس کو حمل ہے تو پہلی دونوں صورتوں میں اس کی عدت تین مہینے ہیں اور حاملہ کی عدت وضع حمل ہے اور جو عورت آزاد نہ ہو بلکہ کسی کی شرعی قاعدہ کے موافق لونڈی ہو اگر اس کو حیض آتا ہو تو اس کی عدت دو حیض اور حیض نہ آئے تو اگر وہ صغیرہ یا بڑھیا ہے تو اس کی عدت ڈیڑھ مہینہ ہے اور حاملہ ہے تو وہی وضع حمل ہے دوسری آیتوں اور حدیثوں سے یہ تفصیل ثابت ہے۔

ف۲ یعنی عدت کے اندر مرد چاہے تو عورت کو پھر رکھ لے اگرچہ عورت کی خوشی نہ ہو مگر اس لوٹانے سے مقصود سلوک اور اصلاح ہو۔ عورت کو ستانا یا اس دباؤ میں اس سے مہر کا معاف کرانا منظور نہ ہو یہ ظلم ہے اگر ایسا کرے گا گنہگار ہوگا گو رجعت بھی صحیح ہو جائے گی۔

ف۳ یعنی یہ امر تو حق ہے کہ جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ایسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں جن کا قاعدہ کے موافق ادا کرنا ہر ایک پر ضروری ہے تو اب مرد کو عورت کے ساتھ بدسلوکی اور اس کی ہر قسم کی حق تلفی ممنوع ہوگی مگر یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت اور فوقیت ہے تو اس لیے رجعت میں اختیار مرد کو ہی دیا گیا۔

حکم بست ودوم وسوم۔ عدت طلاق ومدت رجعت

قال تعالیٰ: ﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ... الی... وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾

ربط: ...... ایلاء میں ایک محدود مدت یعنی چار مہینے کے لیے عورت سے علیحدگی ہوتی ہے اور طلاق میں غیر محدود مدت کے لیے علیحدگی ہوتی ہے اس لیے محدود اور محصور (یعنی ایلاء) کے بعد غیر محدود اور غیر محصور (یعنی طلاق) کا ذکر مناسب ہوا۔ نیز ایلاء میں بعض مرتبہ عزم یعنی ارادہ رجوع کا ہوتا ہے۔ اس لیے ان آیات میں طلاق کے ساتھ رجعت کے احکام بھی بیان فرمائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ اور طلاق والی عورتیں جن پر کسی طرح سے طلاق پڑ چکی ہے خواہ بذریعہ ایلاء کے یا کسی اور طریقہ سے ان کو چاہیے کہ تین حیض کے گزرنے کا انتظار کریں یعنی جب تک یہ تین حیض نہ گزر جائیں اس وقت تک کسی دوسری جگہ نکاح نہ کریں تاکہ اگر حمل ہو تو معلوم ہو جائے اور دوسرے کی اولاد اس کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان طلاق والی عورتوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس چیز کو پوشیدہ رکھیں جو اللہ نے اُن کے رحموں میں پیدا کیا ہے یعنی عورتوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے حیض یا حمل کو چھپائیں کہ کسی طرح عدت جلدی پوری ہو جائے یا شوہر کو طلاق رجعی میں رجعت کا حق باقی نہ رہے۔ غرض یہ کہ عورتوں کے لیے اپنے حمل یا حیض کو چھپانا جائز نہیں اگر وہ حقیقۃً اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ایمان خیانت کی اجازت نہیں دیتا اور طلاق رجعی کی صورت میں ان کے شوہر ان کو اپنی زوجیت میں واپس لانے کے پورا حق رکھتے ہیں۔ خواہ یہ عورتیں رضامند ہوں یا ناراض۔ مگر یہ یاد رہے کہ شوہروں کو طلاق دینے کے بعد رجعت کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی گئی ہے کہ ان کا مقصود اس رجعت سے اصلاح اور خیر خواہی ہو جاہلیت کی طرح عورتوں کو ستانا اور پریشان کرنا مقصود نہ ہو یا اس طریق سے مہر کا معاف کرانا منظور نہ ہو۔ ستانے کی نیت سے رجعت اگرچہ صحیح ہے لیکن اس نیت سے رجعت کرنا گناہ ہے اور باعث سزا ہے۔ ﴿اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ کی قید اور شرط اجازت خداوندی کی شرط ہے صحت رجعت کی شرط نہیں۔ رجعت ہر حال میں صحیح ہے مگر من جانب اللہ رجعت کی اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ نیت خیر خواہی اور اصلاح کی ہو اور اصلاح اور خیر خواہی اس وقت مکمل ہوگی کہ جب ہر ایک دوسرے کا حق ادا کرے کیونکہ عورتوں کا بھی مردوں پر حق ہے جیسا کہ اُن پر مردوں کا حق ہے۔ دستور کے مطابق لیکن حقوق میں مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے اس لیے رجعت کا حق اور اختیار مردوں کو عطا کیا ہے عورتوں کو نہیں دیا اور اللہ غالب ہے مظلوم کا ظالم سے بدلہ لینے پر قادر ہے پس اگر کوئی عورت پر ظلم کرے گا تو اس سے بدلہ لے گا۔ اور بڑی حکمتوں والا ہے اس کا کوئی حکم حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں۔ حکمت اور مصلحت اسی میں ہے کہ طلاق اور رجعت کا اختیار مردوں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ عورتیں کچھ تو کم عقل ہیں اور کچھ جلد باز اور بے صبری ہیں ان کے ہاتھ میں اگر طلاق اور رجعت کا اختیار دے دیا جاتا تو ہر شہر میں روزانہ ہزار طلاقیں پڑا کرتیں۔ اور پھر جب طلاق دینے کے بعد کچھ ہوش آتا اور اپنا اور اپنے بچوں کا انجام نظروں کے سامنے آتا تو سر پیٹتیں اور روتیں۔ عورتوں کو اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ اختیار نہیں دیا کیونکہ یہ اختیار اُن کی تباہی کا باعث ہوتا۔ بچوں اور عورتوں کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ ان کو اختیار نہ دیا جائے۔

ف ۱:...... آیت میں لفظ مطلقات اگرچہ عام ہے مگر یہاں مطلقات سے وہ خاص عورتیں مراد ہیں جو آزاد ہوں۔ لونڈی اور باندی نہ ہوں اور ان کو حیض بھی آتا ہو۔ نابالغ یا حاملہ نہ ہوں۔ اور ان سے صحبت یا خلوتِ صحیحہ بھی ہو چکی ہو جن عورتوں میں یہ صفات پائی جائیں ان کی عدت تین حیض ہے اور اگر آزاد نہ ہوں بلکہ لونڈی اور باندی ہوں تو اُن کی عدت دو حیض ہے اور انکی طلاقیں بھی دو ہیں۔ اگر مطلقہ صغیر السن ہو یا بہت بوڑھی ہوگئی کہ حیض نہ آتا ہو تو اس کی عدت تین ماہ ہے اور اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے اور اگر صحبت یا خلوتِ صحیحہ سے پہلے ہی اس کو طلاق دے دی گئی تو اس پر عدت نہیں۔

ف ۲:...... لفظ ﴿قُرُوْءٍ﴾ اضداد میں سے ہے باتفاق ائمہ لغت حیض اور طہر دونوں پر بولا جاتا ہے امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں ﴿قُرُوْءٍ﴾ سے طہر کے معنی مراد ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں ﴿قُرُوْءٍ﴾ سے حیض کے معنی مراد ہیں۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے بھی یہی منقول ہے کہ ﴿قُرُوْءٍ﴾ سے حیض کے معنی مراد ہیں (تفسیر ابن کثیر) نیز عدت کی مشروعیت سے غرض یہ ہے کہ رحم کا بچہ سے خالی ہونا معلوم ہو جائے اور یہ بات حیض ہی سے معلوم ہو سکتی ہے طہر سے معلوم نہیں ہو سکتی۔

ف ۳:...... ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ سے صاف ظاہر ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے اور جو لوگ مرد اور عورت کی مساوات پر تقریریں کرتے ہیں وہ بے علم ہیں اور بے عقل بھی۔ اور جن پر نفسانی شہوتوں کا غلبہ ہے اُن کے نزدیک عورت کا درجہ مرد سے بڑھا ہوا ہے اللہ تعالیٰ عقل اور ہدایت دے۔ آمین

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

طلاق رجعی ہے دو بار تک اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلی طرح سے ف۱

طلاق ہے دو بار تک پھر رکھنا موافق دستور کے یا رخصت کرنا نیکی سے

حکم بست و چہارم، عدد طلاق رجعی

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ... الی... اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾

ربط:...... گزشتہ آیت میں مرد کے لیے حق رجعت کا بیان تھا۔ اب اس آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ رجعت کا حق کب تک رہتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جس طلاق کے بعد رجعت ہو سکتی ہے وہ دو مرتبہ ہے۔ پھر دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد تم کو دو اختیار ہیں یا تو دستور اور حسن اسلوب کے ساتھ روک لو یعنی رجعت کر کے اُس کو اپنے نکاح میں رہنے دو اور یا حسن اسلوب

ف۱ اسلام سے پہلے دستور تھا کہ دس بیس جتنی بار چاہتے زوجہ کو طلاق دیتے مگر عدت کے ختم ہونے سے پہلے رجعت کر لیتے پھر جب چاہتے طلاق دیتے اور رجعت کر لیتے اور اس صورت سے بعض شخص عورتوں کو اسی طرح بہت ستاتے اس واسطے یہ آیت اتری کہ طلاق جس میں رجعت ہو سکے کل دو بار ہے ایک یا دو طلاق تک تو اختیار دیا گیا کہ عدت کے اندر مرد چاہے تو عورت کو پھر دستور کے موافق رکھ لے یا بھلی طرح سے چھوڑ دے پھر بعد عدت کے رجعت باقی نہیں رہتی ہاں اگر دونوں راضی ہوں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں اور اگر تیسری بار طلاق دے گا تو پھر ان میں نکاح بھی درست نہیں ہوگا جب تک دوسرا خاوند اس سے نکاح کر کے صحبت نہ کر لیوے۔

فائدہ: امساک بمعروف اور تسریح باحسان سے غرض یہ ہے کہ رجعت کرے تو موافقت اور حسن معاشرت کے ساتھ رہے عورت کو قید میں رکھنا اور ستانا مقصود نہ ہو جیسا کہ ان میں دستور تھا ورنہ سہولت اور عمدگی کے ساتھ اس کو رخصت کرے۔

کے ساتھ اس کو چھوڑ دو کہ اس کی عدت گذر جائے اور جہاں چاہے وہ نکاح کرلے تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالو۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ

اور تم کو روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جب کہ خاوند عورت دونوں ڈریں اس بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں گے حکم

اور تم کو روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں کو مگر کہ وہ دونوں ڈریں، کہ نہ ٹھیک رکھیں گے قاعدے

اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ

اللہ ف۱ پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دیکر چھوٹ جاوے ف۲

اللہ کے۔ پھر اگر تم لوگ ڈرو کہ وہ نہ ٹھیک رکھیں گے قاعدے اللہ کے، تو نہیں گناہ دونوں پر جو بدلہ دے کر چھوٹے عورت

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں سو ان سے آگے مت بڑھو۔ اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی

یہ دستور باندھے ہیں اللہ کے، سو اُن سے آگے نہ بڑھو اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کے قاعدوں سے، سو وہی

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

لوگ ہیں ظالم ف۳

لوگ ہیں گنہگار۔

حکم بست و پنجم۔ خلع

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا ... الی ... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیت میں طلاق کا ذکر فرمایا۔ اب اس آیت میں خلع کا ذکر فرماتے ہیں جو ایک قسم کی طلاق ہے یا طلاق کی طرح ایک قسم کا فسخ نکاح ہے۔ نیز گزشتہ آیت میں تسریح باحسان کا حکم تھا اب اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر بیوی

ف۱ یعنی مردوں کو یہ روا نہیں کہ عورتوں کو جو مہر دیا ہے اس کو طلاق کے بدلہ میں واپس لینے لگیں البتہ یہ جب روا ہے کہ ناچاری ہو اور کسی طرح دونوں میں موافقت نہ آئے اور ان کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ بوجہ شدت مخالفت ہم احکام خداوندی کی پابندی معاشرت باہمی میں نہ کر سکیں گے اور مرد کی طرف سے ادائے حقوق زوجہ میں قصور بھی نہ ہو ورنہ مال لینا زوج کو حرام ہے۔

ف۲ یعنی اے مسلمانو اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ خاوند اور بیوی میں ایسی بیزاری ہے کہ ان کی گزران موافقت سے نہ ہوگی تو پھر ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں کہ عورت مال دے کر اپنے آپ کو نکاح سے چھڑا لے اور مرد وہ مال لے لے اس کو خلع کہتے ہیں اور جب اس ضرورت کی حالت میں زوجین کو خلع کرنا درست ہوا تو سب مسلمانوں کو اس میں سعی کرنی ضرور درست ہوگی۔

فائدہ: ایک عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور عرض کیا کہ میں اپنے خاوند سے ناخوش ہوں اس کے یہاں رہنا نہیں چاہتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحقیق کیا تو عورت نے کہا کہ وہ میرے حقوق میں کوتاہی نہیں کرتا اور نہ اس کے اخلاق و تدین پر مجھ کو اعتراض ہے لیکن مجھ کو اس سے منافرت طبعی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے مہر واپس کرا دیا اور زوج سے طلاق دلوا دی اس پر یہ آیت اتری۔

ف۳ یہ سب احکام مذکورہ یعنی طلاق اور رجعت اور خلع حدود اور احکام مقرر فرمودہ حق تعالیٰ ہیں ان کی پوری پابندی لازم ہے کسی قسم کا خلاف اور تغیر اور کوتاہی ان میں نہ کرنی چاہیے۔

سے خلع کی نوبت آئے تو اس کو حسن سلوک اور خوبصورتی کے ساتھ رخصت کرو۔ یعنی مہر وغیرہ جو کچھ اُس کو دے چکے ہو وہ اس سے واپس نہ لو۔ دیئے ہوئے کو واپس لینا تسریح باحسان کے خلاف ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ اور تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ بیبیوں سے چھوڑنے کے وقت اُن سے اس مال میں سے کوئی شے واپس لو جو تم اُن کو نکاح کی حالت میں دے چکے ہو مگر جب کہ میاں بیوی دونوں کو یہ خوف ہو کہ ہم اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے یعنی آپس میں حقوق زوجیت نہ ادا کر سکیں گے تو ایسی صورت میں اگر مرد عورت سے کچھ مال لے کر اس کو چھوڑ دے اور عورت مال دے کر اپنے آپ کو اس کے نکاح سے چھڑا لے تو کوئی گناہ نہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں اُس کو خلع کہتے ہیں۔ سو اگر تم کو اندیشہ ہو کہ میاں اور بیوی باہمی منافرت اور کدورت کے باعث حقوق زوجیت کے بارے میں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ عورت کچھ فدیہ یعنی بدلہ دے کر نکاح سے اپنا پیچھا چھڑا لے تاکہ دونوں گناہ سے بچ جائیں ایسی صورت میں عورت کے لیے مال کا دینا اور مرد کے لیے مال کا لینا جائز ہے بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں پس اُن سے آگے نہ بڑھنا اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ سراسر ظالم ہیں اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے دین اور اخلاق اور عادات پر کوئی عیب نہیں لگاتی مگر میں اور وہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ میں نے برقع اٹھا کر بہت سے لوگوں میں اُن کو آتے ہوئے دیکھا تو سب سے زیادہ سیاہ فام اور پست قد اور بدصورت ثابت رضی اللہ عنہ ہی نظر آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اُس کو وہ باغیچہ واپس دے سکتی ہو جو اُس نے تم کو دیا ہے کہا ہاں وہ بھی اور کچھ زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا کہ تم اس سے وہ باغیچہ واپس لے لو اور اس کو طلاق دے دو اس پر یہ آیت نازل ہوئی یہ اسلام میں پہلا خلع تھا۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا

پھر اگر اس عورت کو طلاق دی یعنی تیسری بار تو اب حلال نہیں اسکو وہ عورت اسکے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا پھر اگر طلاق دیدے

پھر اگر اس کو طلاق دے تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا پھر اگر وہ شخص اس کو طلاق دے

جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ

دوسرا خاوند تو کچھ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم اور یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی

تب گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر مل جاویں اگر خیال رکھیں کہ ٹھیک رکھیں گے قاعدے اللہ کے اور یہ دستور باندھے ہیں اللہ کے،

يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾

بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے ف۱

بیان کرتا ہے واسطے جاننے والوں کے۔

ف۱ یعنی اگر زوج اپنی عورت کو تیسری بار طلاق دیگا تو پھر وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ وہ عورت دوسرے شخص سے نکاح نہ کرلے اور دوسرا خاوند=

حکم بست وششم، حلالہ در طلاق ثالث

قَالَ تَعَالٰی: ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ... الی... لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں دو طلاق کا حکم بیان فرمایا یعنی دو طلاق کے بعد تم کو امساک بمعروف اور تسریح باحسان کا اختیار ہے۔ اب اس آیت میں تیسری طلاق کا حکم بیان فرماتے ہیں کہ تیسری طلاق کے بعد تم کو رجعت وغیرہ کا کوئی حق اور اختیار باقی نہیں رہتا بدون حلالہ کے تمہاری طرف واپس نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں پس اگر دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق بھی دے دے تو اس عورت کا تعلق اس سے بالکلیہ منقطع ہوجائے گا اس لیے کہ دو طلاق کے بعد تو رجعت کا امکان تھا اور جب تیسری طلاق بھی دے دی تو اب رجعت کا کوئی موقع نہیں رہا طلاق کی وضع ہی مفارقت اور انقطاع کے لیے ہے تیسری طلاق سے نکاح کی حلت بالکلیہ ختم ہوگئی اور یہ عورت اس کے لیے بالکل حلال نہ رہے گی۔ اب اس عورت سے نہ رجعت صحیح ہے اور نہ نکاح ① جدید یہاں تک کہ یہ عورت عدت کے بعد پہلے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے پھر اگر یہ دوسرا شوہر ہم بستری کے بعد اُس کو طلاق دے دے اور عدت بھی گزر جائے تو پھر کوئی گناہ نہیں کہ یہ عورت اور پہلا شوہر جدید نکاح کرکے بدستور سابقہ حالت کی طرف لوٹ جائیں اور زن وشوئی کے تعلقات قائم کرلیں۔ بشرطیکہ دونوں کو گمان غالب ہو کہ ہم اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے اس لیے کہ آئندہ امور کے متعلق جزم اور یقین کا حاصل ہونا نہایت مشکل ہے اس لیے کہ غیب کا علم کسی کو نہیں کہ آئندہ کیا ہوگا اور یہ یعنی تیسری طلاق کے بعد دوسرے شوہر سے نکاح کرنا اور پھر اس کا ہم بستری کے بعد طلاق دینا اور پھر شوہر اول اور عورت کا یہ گمان غالب ہونا کہ ہم دوبارہ نکاح کے بعد ایک دوسرے کے حقوق زوجیت میں کمی کرنے کے گناہ میں مبتلا نہ ہوں گے۔ غرض یہ کہ یہ امور اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں جن سے تجاوز اور انحراف جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حدود اور احکام کو ایسے لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو علم اور فہم رکھتے ہیں اور اس بات کو سمجھتے ہیں کہ تیسری طلاق سے زوجیت اور محبت کا تعلق بالکل منقطع ہوجاتا ہے اور محبت اور موانست مبدل بکراہت ومنافرت ہوجاتی ہے اس لیے کہ اس کراہت ومنافرت کے ازالہ کے لیے یہ ضروری ہوا کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرے اور اس کی لذت چکھنے کے بعد اگر طلاق ہوجائے تو پھر شوہر اول سے تعلق کی تجدید ہوسکتی ہے۔

فائدہ:...... آیت قرآنیہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تین طلاق کے بعد رجعت کا حق باقی نہیں رہتا خواہ وہ تین طلاقیں علیحدہ علیحدہ دی ہوں یا اکٹھی دی ہوں۔ تمام صحابہ ﷺ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہے کہ تین طلاقیں جس طرح بھی دی جائیں خواہ مجتمعاً اور خواہ متفرقاً وہ واقع اور لازم سمجھی جائیں گی۔ صرف بعض اہل ظاہر اور بعض حنبلیوں کا قول ہے کہ تین

= اس سے صحبت کرکے اپنی خوشی سے طلاق نہ دیوے اس کی عدت پوری کرکے پھر زوج اول سے نکاح جدید ہوسکتا ہے اس کو حلالہ کہتے ہیں اور حلالہ کے بعد زوج اول کے ساتھ نکاح ہونا جب ہی ہے کہ ان کو حکم خداوندی کے قائم رکھنے یعنی ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کا خیال اور اس پر اعتماد ہو ورنہ ضرور نزاع باہمی اور اتلاف حقوق کی نوبت آئے گی اور گناہ میں مبتلا ہوں گے۔

① طلاق رجعی میں رجعت ہوسکتی ہے اور طلاق بائن میں اسی شوہر سے تجدید نکاح ہوسکتا ہے اور تیسری طلاق کے بعد اسی شوہر سے تجدید نکاح بھی جائز نہیں جب تک کہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے اور وہ اس کو طلاق دے تب شوہر اول سے تجدید نکاح ہوسکتا ہے۔ ۱۲

طلاق دینے سے ایک طلاق پڑتی ہے اور شیعوں کے نزدیک تین طلاق دینے سے ایک طلاق بھی نہیں پڑتی۔ اور داود ظاہری رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح منقول ہے کہ دفعۃً تین طلاق دینے سے ایک طلاق بھی نہیں پڑتی۔

(کما سیاتی فی کلام القرطبی) امام ابوحنیفہ اور امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کہ جن کی تقلید اور اتباع پر (سوائے چند ظاہر بین اور خود رائے لوگوں کے) امت محمدیہ کے علماء اور فقہاء اور محدثین اور مفسرین متفق ہیں اُن کا متفقہ اور اجماعی فتوی یہ ہے کہ تین طلاقیں دینے سے تین ہی طلاق واقع ہوتی ہیں۔ اور اسی کو امام بخاری علیہ الرحمہ نے اختیار فرمایا جس کے لیے صحیح بخاری میں ایک خاص باب منعقد فرمایا۔

"بَابُ مَنْ أَجَازَ الطَّلَاقَ الثَّلَاثَ" بِقَوْلِهٖ تَعَالٰی: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ الآیۃ۔

قال الامام القرطبی اتفق ایمة الفتوی علی لزوم ایقاع الطلاق فی کلمة واحدة وهو قول جمهور السلف وشذ طاؤس وبعض اهل الظاهر الی ان طلاق الثلاث فی کلمة واحدة یقع واحدة ویروی هذا عن محمد بن اسحاق وحجاج بن ارطاة وقیل عنهما لایلزم منه شئ وهو قول مقاتل۔ ویُحکی عن داؤد انه لایقع وجمهور السلف والائمة انه لازم واقع ثلاثا ولا فرق بین ان یوقع ثلاثا مجتمعة فی کلمة او متفرقة فی کلمات الخ۔ ۱۲۹/۳، وقال فی: ۱۲۸/۳ وترجم البخاری علی هذه الآیة باب من اجاز الطلاق الثلاث بقوله تعالی: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾۔ وهذا اشارة منه الی ان هذا التعدید انما هو فسحة لهم فمن ضیق علی نفسه لزمه۔ اھ۔

بعد ازاں امام قرطبی رحمہ اللہ نے ان تمام شبہات کا جواب دیا کہ جو لوگ تین طلاق کو ایک طلاق بنانے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ حضرات اہل علم اصل کی مراجعت فرمائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں تمام فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ اور اتفاق سے یہ حکم دیا گیا کہ جو شخص اپنی عورت کو تین طلاق دے گا وہ تین ہی شمار ہوں گی اور جو اس کے خلاف کرے گا اُس پر دُرّے پڑیں گے اور سخت سزا کا مستوجب ہوگا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی فتوی ہے تفصیل کے لیے بخاری شریف اور ہدایہ کی شروح کی مراجعت کی جائے۔

نصیحت:...... مسلمانوں کو چاہیے کہ تین طلاق کے بارہ میں کتاب وسنت اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اور اجماع ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اتباع کریں اس زمانہ کے چند مدعیان عمل بالحدیث کے کہنے سے حرام کے مرتکب نہ ہوں اور اپنے نسب کو خراب نہ کریں جو شخص اجماع صحابہ کو حجت نہ سمجھے وہ اہل سنت والجماعت سے نہیں۔

حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما:...... ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اور عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں دو سال تک تین طلاقیں ایک ہی شمار کی جاتی تھیں پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاقیں جاری کر دیں بعض ظاہر پرست اس روایت کو دیکھ کر اس طرف چلے گئے کہ تین طلاق دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے اور حضرت

عمر رضی اللہ عنہ نے کسی مصلحت سے تین طلاق کو تین طلاق قرار دے دیا تھا اور ابن تیمیہ حنبلی رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد ابن قیم حنبلی رحمہ اللہ اپنے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے برخلاف اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ کے اجماع کے برخلاف اور ائمہ مجتہدین کے برخلاف اور تمام اہل سنت والجماعت کے برخلاف شذوذ اور تفرد میں مبتلا ہوئے اور شیعوں کی طرح تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کے قائل ہوئے۔ اہل سنت والجماعت کا اجماعی مسلک یہ ہے کہ تین طلاق دینے سے تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں اور تین طلاق سے عورت مغلظہ بائنہ ہوجاتی ہے۔ سب سے پہلے شیخ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ اور عزبن جماعہ رحمہ اللہ وغیرہما نے ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا رد کیا جو ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ہم عصر اور ہم شہر تھے اور یہ واضح کر دیا کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا مسئلہ طلاق میں تفرد اور شذوذ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اُن مسائل میں سے ہے جن میں ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اجماع صحابہ اور اجماع ائمہ اربعہ کے خلاف کیا ہے اور مذاہب اربعہ میں سے کوئی اس کا قائل نہیں ہوا اور ہر زمانہ میں علماء نے اس مسلک کی تردید میں کتابیں اور رسالے لکھے اور بخاری اور مسلم کے شارحین نے خاص طور پر شرح حدیث میں اس مسلک کا بطلان اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تردید کی ہے۔

اہل سنت والجماعت کے دلائل

(۱) تمام صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ سے ﴿الطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ اور ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ کی تفسیر اسی طرح منقول ہے کہ دو طلاق کے بعد خواہ مجتمعاً ہوں یا متفرقاً زوج کو رجعت کا حق رہتا ہے اور تین طلاق کے بعد خواہ وہ مجتمعاً ہوں یا متفرقاً رجعت کا حق باقی نہیں رہتا بیشمار روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ شروع اسلام میں لوگوں کی یہ حالت تھی کہ بے حد وحساب طلاقیں دے دیتے تھے حتی کہ سو سو اور ہزار ہزار طلاقیں دیدیتے تھے جب عدت گزرنے کے قریب ہوتی تو اس سے رجعت کر لیتے پھر اسی طرح ستانے کے لیے اس کو طلاق دیدی اور پھر رجعت کر لی اس پر یہ حکم نازل ہوا۔ ﴿الطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ الخ۔ اللہ تعالیٰ نے طلاق کی حد مقرر کر دی کہ آخری حد تین ہے ایک اور دو طلاق کے بعد تو رجعت کا حق ہے اور تین یعنی تیسری طلاق کے بعد رجوع کا اختیار نہیں رہتا۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۷۷)

(۲) صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ہے کہ عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی کو لفظ واحد میں تین طلاقیں دیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔

(۳) صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور نسائی میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں بعد ازاں اُس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا اور اُس دوسرے شوہر نے اس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا یہ عورت اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نہیں جب تک دوسرا شوہر پہلے شوہر کی طرح صحبت اور مباشرت نہ کر لے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۷۸)

(۴) حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا در قصہ رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ جس کا مضمون گزشتہ روایت کے قریب قریب ہے امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں آیت مذکورہ کو اور ان تینوں حدیثوں کو ذکر فرمایا اور ائمہ اربعہ کے مطابق طلاق ثلاث کے جواز کے لیے ایک ترجمہ منعقد فرمایا (بَابُ مَنْ اَجَازَ الطَّلَاقَ الثَّلَاثَ) دیکھو فتح الباری: ۹/۳۱۵۔ بعد ازاں امام

بخاری رحمہ اللہ نے ایک اور باب منعقد فرمایا وہ یہ ہے بَابُ اِذَا طَلَّقَهَا ثَلَاثًا ثُمَّ تَزَوَّجَ بَعْدَ الْعِدَّةِ زَوْجًا غَيْرَهُ فَلَمْ يَمَسَّهَا۔ اور اس باب میں رفاعہ قرظی کی حدیث نقل فرمائی دیکھو فتح الباری: ۹/ ۴۰۸۔

(۵) امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ایک باب "قِصَّةُ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ" کے عنوان سے منعقد کیا۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو اس کے شوہر نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے زمانہ میں تین طلاقیں دے دی تھیں چونکہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے مزاج میں کچھ حدت تھی اس لیے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اُس کو دوسرے گھر میں عدت گزارنے کی اجازت دے دی تھی دیکھو فتح الباری: ۹/ ۴۲۳۔

(۶) معجم طبرانی اور سنن بیہقی میں سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عائشہ خثعمیہ رضی اللہ عنہا امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں جب علی کرم اللہ وجہہ شہید ہوئے تو خثعمیہ نے امام حسن کو مبارک باد دی اور یہ کہا "لتهنك الخلافة"۔ خلافت آپ کو مبارک ہو امام حسن رضی اللہ عنہ کو سخت ناگوار گزرا اور کہا کیا تجھ کو علی رضی اللہ عنہ کے قتل سے خوشی ہوئی، "اذهبي فانت طالق ثلاثا"۔ جا تجھے تین طلاق۔

اور امام حسن رضی اللہ عنہ نے بقیہ مہر اس کا بھیج دیا اور مزید برآں دس ہزار درہم اور بھیج دیے عائشہ خثعمیہ رضی اللہ عنہا کو بہت صدمہ ہوا اور اس پر امام حسن رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ اگر میں اپنے جد امجد یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نہ سنے ہوئے ہوتا تو رجوع کر لیتا وہ قول یہ ہے:

"أَيُّمَا رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا عِنْدَ الْأَقْرَاءِ أَوْ ثَلَاثَةً مُبْهَمَةً لَمْ تَحِلَّ لَهُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ"

"جو شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دے حیض کے وقت یا اور کسی طرح تو وہ اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔"

(۷) مسند امام احمد میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں پھر اُس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا اور اس نے اس کو طلاق قبل الدخول دے دی تو کیا یہ عورت اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ جب تک شوہر ثانی شوہر اول کی طرح مباشرت نہ کرے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۷۷)

(۸) اور اسی طرح کے مضمون کی ایک حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس کو ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۷۷)

حضرت عمر و حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہم: ...... محلّٰی بن حزم اور زاد المعاد اور اغاثۃ اللھفان لابن القیم میں۔ اور سنن بیہقی میں حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا باسانید صحیحہ یہ قول نقل کیا ہے کہ تین طلاق دینے سے عورت مغلظہ بائنہ ہو جاتی ہے بدون حلالہ کے اُس سے نکاح صحیح نہیں شیخ ابن الہمام رحمہ اللہ فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ خلفاء اور عبادلہ سے صراحۃً یہ ثابت ہے کہ تین طلاق دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں۔

اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم:...... اور اسی پر صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ تین طلاق دینے سے تین طلاق واقع ہوجاتی ہیں جیسا کہ علامہ زرقانی نے ''شرح موطا'' میں حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ سے اجماع نقل کیا ہے اور قاضی ابوالولید باجی رحمۃ اللہ علیہ نے ''منتقی'' میں اور امام ابوبکر رازی جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے ''احکام القرآن'' میں اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''شرح معانی الآثار'' میں اس پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے اور حافظ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتح الباری'' میں لکھا ہے:

''فالراجع في الموضعين تحريم المتعة وايقاع الثلاث للاجماع الذى انعقد فى عهد عمر رضى الله عنه على ذلك ولا يحفظ ان احدا فى عهد عمر رضى الله عنه خالفه فى واحدة منهما وقد دل اجماعهم على وجود ناسخ وان كان خفى على بعضهم قبل ذلك حتى ظهر لجميعهم فى عهد عمر رضى الله عنه فالمخالف بعد هذا الاجماع منابذله والجمهور على عدم اعتبار من احدث الاختلاف بعد الاتفاق والله اعلم۔ (فتح الباری: ۹/۳۱۹)

اور حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ جو بچپن سے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے جب ان پر یہ منکشف ہوا کہ ہمارے استاذ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ بہت سے مسائل میں سلف صالحین کے خلاف ہیں تو اپنی تصانیف میں انکار دکیا اور اس مسئلہ یعنی طلاق ثلاث کے بارہ میں ایک خاص کتاب ان کے رد میں لکھی جس کا نام ''بیان مشکل الاحادیث الواردۃ فی ان الطلاق الثلث واحدۃ'' رکھا۔ اس کتاب مذکور میں حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اعلم انه لم يثبت عن احد من الصحابة ولا من التابعين ولا من ائمة السلف المعتد بقولهم فى الفتاوى فى الحلال والحرام شئى صريح فى ان الطلاق الثلاث بعد الدخول يحسب واحدة اذا سبق بلفظ واحدا، كذا فى الاشفاق على احكام الطلاق للعلامة الكوثرى ص ۳۵۔ وقال ابن رجب لا نعلم من الامة احدا خالف فى هذه المسألة مخالفة ظاهرة ولا حكما ... ولا قضاء ولا علما ولا افتاء ولم يقع ذلك الا من نفر يسير جدا وقد انكره عليهم من عاصرهم غاية الانكار وكان اكثرهم يستخفى بذلك ولا يظهر فكيف يكون اجماع الامة على اخفاء دين الله الذى شرعه على لسان رسوله واتباع اجتهاد من خالفه برأيه فى ذلك هذا لا يحل اعتقاده البتة۔ اهـ ولعله ظهر بهذا البيان ان امضاء عمر رضى الله عنه للثلاث حكم شرعى مستمد من الكتاب والسنة مقارنا لاجماع فقهاء الصحابة رضى الله عنهم فضلا عن التابعين ومن بعدهم وليس بعقوبة سياسية ضد حكم شرعى فالخارج على امضاء عمر رضى الله عنه خارج على ذلك كله والله اعلم۔ كذا فى الاشفاق على احكام الطلاق للعلامة الكوثرى، ص: ۵۳۔''

حدیث ابن عباس کا جواب

حافظ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری: ۹/۳۱۷ میں جمہور کی طرف سے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کے آٹھ جواب دیئے

ہیں جن میں سے چند ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

جواب اول: ...... ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت جس کو طاؤس رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے شاذ ہے آیت قرآنیہ اور احادیث صحیحہ مشہورہ اور اجماع صحابہ اور خلفاء راشدین کے فیصلہ کے خلاف ہے امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سعید بن جبیر اور مجاہد اور عطاء اور عمرو بن دینار اور مالک بن حویرث اور محمد بن ایاس اور نعمان بن ابی عیاش رحمہم اللہ تمام اکابر ثقات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص اپنی عورت کو تین طلاق دے دے تو اس کے بارہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ یہ تھا کہ اس شخص نے خدا کی نافرمانی کی کہ یکدم تین طلاق دے دی۔ اس کی بیوی اس سے بائنہ ہوگئی بغیر دوسرے شخص سے نکاح کیے اور طلاق حاصل کیے بغیر شوہر سے نکاح نہیں کرسکتی ان ائمہ اکابر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو کچھ روایت کیا ہے وہ جماعت صحابہ و تابعین کے مطابق ہے اور اس امر کی دلیل ہے کہ طاؤس وغیرہ رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت نقل کی ہے (تین طلاق ایک سمجھی جاتی تھی) وہ بالکل ضعیف اور کمزور ہے یہ ممکن نہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف کریں۔ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طاؤس رحمہ اللہ کی روایت وہم اور غلط ہے۔ حجاز اور شام اور مصر اور مشرق اور مغرب کے علماء میں سے کوئی بھی اس طرف نہیں گیا کہ تین طلاق کو ایک قرار دیا جائے (تفسیر قرطبی: ۳/۱۲۹)۔

نیز یہ امر تواتر کو پہنچا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ فتویٰ دیا کرتے تھے کہ تین طلاق دینے سے تین ہی طلاقیں پڑتی ہیں اور تین طلاق کے بعد عورت مغلظہ بائنہ ہوجاتی ہے۔ امام ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ نبی کریم ﷺ کی حدیث ان کے پاس محفوظ ہو اور وہ ہمیشہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے رہیں پس اولیٰ اور مقتضائے احتیاط یہی ہے کہ ایک قول کے مقابلہ میں جماعت کے قول کو ترجیح دی جائے۔ (فتح الباری: ۹/۳۱۷)

قاضی ابوبکر بن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی صحت میں اختلاف ہے پس اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں اس کو کیسے مقدم رکھا جاسکتا ہے۔ (فتح الباری: ۹/۳۱۷)

جواب دوم: ...... یہ کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما منسوخ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صحابہ کے مشورہ اور اتفاق سے تین طلاقوں کو جاری کرنا اور صحابہ میں سے کسی کا اختلاف نہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک اس حکم کا ناسخ ثابت ہوا ہے جس کی بناء پر یہ حکم جاری کیا امام بیہقی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ سے یہی روایت کیا ہے کہ غالباً یہ حکم پہلے تھا بعد میں منسوخ ہوگیا اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ سنن ابی داؤد میں باسناد صحیح ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ اپنی اس روایت مذکورہ کے خلاف فتویٰ دیا کرتے تھے معلوم ہوا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کسی ذریعہ سے اس روایت کا منسوخ ہونا معلوم ہوا جب ہی تو فتویٰ اس کے خلاف دیا کرتے تھے (فتح الباری: ۹/۳۱۷) عقلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ صحابہ کو حدیث نبوی کے خلاف آمادہ کریں۔ اور صحابہ کرام بالاتفاق بلاچون وچرا حدیث کے حکم کے خلاف ان کے حکم کو قبول کرلیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما (جو تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کے راوی ہیں) وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ بھی عرض نہ کریں کہ اے امیر المومنین آپ کا تین طلاقوں کو تین بنادینا ارشاد نبوی کے خلاف ہے آنحضرت ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں تو تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی رہیں۔ آپ نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف کیسے حکم جاری کیا اور یہ کہنا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی مصلحت

سے یہ حکم جاری کیا یہ کمال الٰہی اور بے باکی ہے یہ ناممکن اور محال ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کسی سیاست اور مصلحت کی بناء پر حکم نبوی کے خلاف کوئی حکم جاری کریں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی متنفس زبان نہ ہلائے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ان کو یاد نہ دلائے۔

جواب سوم: ...... مان لو کہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما در بارۂ وحدت طلاق صحیح ہے لیکن آیت قرآنی ﴿الطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ...الی... فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ﴾ کے صحیح اور صریح ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہوسکتا اور علیٰ ہذا دیگر روایات صریحہ میں سے تین طلاق ہونا ثابت ہے ان کے صحیح ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تو حاصل یہ نکلا کہ طلاق ثلاث کے مسئلہ میں ایک مختلف فیہ روایت تو ایک ہونے پر دلالت کرتی ہے اور باقی تمام احادیث صحیحہ وصریحہ اور آیت قرآنیہ تین طلاق کے تین ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں یہ مسئلہ پیش ہوا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بمشورہ عثمان وعلی ودیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اُن روایتوں کو ترجیح دی جو تین طلاق کے تین ہونے پر دلالت کرتی تھیں تو امت کا فریضہ یہ ہے کہ احادیث مختلفہ میں جس جانب کو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلا اختلاف اختیار کرلیں اگرچہ وہ حدیث باعتبار سند کے ضعیف ہو اسی جانب کا اتباع ضروری ہوگا اور جس چیز پر خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متفق ہوگئے ہوں اس کی مخالفت ناجائز ہوگی اور یہی ائمہ اربعہ اور تمام محدثین کا مسلک ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تین طلاق دینے سے تین طلاق کا واقع ہونا کتاب اللہ، اور سنت رسول اللہ اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم، اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم اور عثمان وعلی اور فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم کے اتفاق سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم سے آنکھ بند کرلینا اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کی پروانہ کرنا نرغۂ رافضیہ اور شیوۂ شیعیت ہے اللہ تعالیٰ ہم کو اس سے پناہ میں رکھے۔ آمین ثم آمین۔

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی عدت تک ف۱ تو رکھ لو ان کو موافق دستور کے یا چھوڑ دو ان کو

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو، پھر پہنچیں اپنی عدت تک، تو رکھ لو ان کو دستور سے یا رخصت کرو

بِمَعۡرُوۡفٍ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ

بھلی طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کے لئے تاکہ ان پر زیادتی کرو ف۲ اور جو ایسا کرے گا وہ بیشک اپنا ہی نقصان

دستور سے۔ اور مت بند کرو ان کے ستانے کو تا زیادتی کرو۔ اور جو کوئی یہ کام کرے، اس نے برا کیا

ف۱ یعنی عدت ختم ہونے کو آئی۔

ف۲ یعنی عدت کے ختم ہونے تک خاوند کو اختیار ہے کہ اس عورت کو موافقت اور اتحاد کے ساتھ پھر ملالے یا خوبی اور رضامندی کے ساتھ بالکل چھوڑ دے یہ ہرگز جائز نہیں کہ قید میں رکھ کر اس کو ستانے کے قصد سے رجعت کرے جیسا کہ بعض اشخاص کیا کرتے تھے۔

فائدہ: آیت سابقہ یعنی ﴿الطلاق مرتان﴾ الخ میں یہ بتلایا تھا کہ دو طلاق تک زوج کو اختیار ہے کہ عورت کو عمدگی سے پھر ملالے یا بالکل چھوڑ دے اب اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ یہ اختیار صرف عدت تک ہے عدت کے بعد زوج کو اختیار مذکور حاصل نہ ہوگا اس لئے کوئی تکرار کا شبہ نہ کرے۔

نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ

کرے گا اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنسی اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اسکو کہ جو اتاری

اپنا۔ اور مت ٹھہراؤ حکم اللہ کے ہنسی، اور یاد کرو احسان اللہ کا جو تم پر ہے اور وہ جو اتاری

عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ

تم پر کتاب اور علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا ہے اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ

تم پر کتاب اور کام کی باتیں کہ تم کو سمجھاوے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ

ع ۲۹ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

جانتا ہے ف۱

سب چیز جانتا ہے۔

حکم بست وہفتم - منع از اضرار نساء وزجر از لعب با حکام خداوندی

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ... الی ... وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

ربط:...... گزشتہ آیت میں یعنی ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ﴾ میں یہ بیان فرمایا تھا کہ طلاق رجعی میں تم کو دو اختیار ہیں یا تو حسن اسلوب کے ساتھ اس کو روک لو یا خوبصورتی کے ساتھ اس کو رخصت کردو۔ اب اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو کچھ بھی کرو تمہیں اختیار ہے لیکن عورتوں کو تکلیف اور ضرر پہنچانے کے ارادہ سے نہ کرو۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق رجعی دو اور پھر وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب ہوجائیں یعنی ان کی عدت اور میعاد قریب الختم ہو مگر ابھی ختم نہ ہوئی ہو۔ پس اگر ان کو اپنے نکاح میں رکھنا منظور ہے تو اچھے طریق سے اُن سے رجعت کرکے ان کو اپنے نکاح میں روک لو یا اُن کو اپنی زوجیت میں رکھنا مقصود نہ ہو تو پھر خوبصورتی کے ساتھ ان کو رخصت کردو کہ وہ اپنی عدت گزار کر جہاں چاہیں نکاح کریں اور ستانے اور ایذاء دینے کے لیے ان کو نہ روکو یعنی ایذاء پہنچانے کی غرض سے ان سے رجعت نہ کرو تاکہ روک کر اُن پر کچھ ظلم اور زیادتی کرو جیسا کہ جاہلیت کا طریقہ تھا کہ بیوی کو ستانے کی غرض سے طلاق دیتے اور پھر جب عدت پوری ہونے کے قریب ہوتی تو رجعت کرلیتے اور پھر طلاق دیتے اور پھر اسی طرح کرتے رہتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ایسا مت کرو اور جو شخص ایسا کام کرے گا پس بلاشبہ اس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا اور اے مسلمانو! تم ان جاہلوں کی طرح اللہ کے احکام کو تمسخر اور ٹھٹھا نہ بناؤ۔

ف۱ نکاح طلاق ایلاء خلع رجعت حلالہ وغیرہ میں بڑی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں ان میں حیلے کرنے اور بیہودہ اغراض کو دخل دینا مثلاً کوئی رجعت کرلے اور اس سے مقصود عورت کو تنگ کرنا ہے تو گویا اللہ کے احکام کے ساتھ ٹھٹھے بازی ٹھہری نعوذ باللہ من ذلک اللہ کو سب کچھ روشن ہے ایسے حیلوں سے بجز مضرت اور کیا حاصل ہوسکتا ہے۔

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پہلے لوگوں کی حالت یہ تھی کہ اول طلاق دے دیتے اور پھر یہ کہتے کہ ہم نے تو مذاق کیا تھا۔ اور اسی طرح غلام اور لونڈی کو آزاد کر دیتے اور پھر کہتے کہ ہم نے تو مذاق کیا تھا۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کا جد یعنی حقیقت تو حقیقت ہی ہے۔ مگر ان کا ہزل یعنی انکا ہنسی اور مذاق کے طور پر کہنا بھی حقیقت ہی کا حکم رکھتا ہے وہ تین چیزیں یہ ہیں: نکاح، طلاق، اور رجعت۔ یعنی ان چیزوں میں تمہارے الفاظ کا اعتبار ہے نیت کا اعتبار نہیں۔ بندہ کے جن اعمال کا تعلق فقط حق تعالیٰ سے ہو وہاں شریعت نے نیت کا اعتبار کیا ہے اور جو اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے وہاں الفاظ کی لفظی دلالت کا اعتبار ہے نیت کا اعتبار نہیں۔ طلاق اور رجعت بھی اسی قبیل سے ہیں۔ طلاق اور رجعت میں الفاظ کا اعتبار ہوگا نیت کا اعتبار نہ ہوگا اس لیے کہ اگر معاملات اور معاشرات میں ظاہر الفاظ کے خلاف نیت کا اعتبار کیا جائے تو دوسروں کے حقوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ معاشرات اور معاملات میں اگر الفاظ کی دلالت کا اعتبار نہ ہو اور لوگوں کی نیت کے مطابق فیصلے ہونے لگیں تو کارخانۂ عالم درہم برہم ہو جائے۔ خود غرض لوگ طلاقیں دیں گے اور پھر عورتوں کو روکنے کے لیے اپنی نیتوں کا بہانہ بنائیں گے اور اسی طرح عورتوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنائیں گے۔ اور اللہ کی نعمت کی یاد کرو کہ اس نے تم پر احسان کیا کہ تم کو عورتوں پر حاکم بنایا اور اگر وہ چاہتا تو تم کو عورتوں کے ہاتھ تلے کر دیتا اور پھر وہ بھی اسی طرح تمہارے ستانے پر قادر ہوتیں اس لیے تم کو چاہیے کہ اللہ کی نعمت کا شکر کرو اور اس کی نعمت کو یاد کرو کہ اُس نے تم پر کتاب اور حکمت کو اتارا یعنی قرآن کریم اور سنت نبوی تم کو عطا کی تا کہ تم اپنے علم اور عمل کی اصلاح کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ کتاب وسنت کے مقتضیٰ پر چلو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے طلاق اور رجعت سے جو نیت بھی کرو گے وہ اس سے مخفی نہیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو اب نہ روکو ان کو اس سے کہ نکاح کریں اپنے انہی خاوندوں سے

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچ چکیں اپنی عدت کو تو اب نہ روکو ان کو کہ نکاح کرلیں اپنے خاوندوں سے

اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ

جب کہ راضی ہو جاویں آپس میں موافق دستور کے ف۱ یہ نصیحت اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر

جب راضی ہو جاویں آپس میں، موافق دستور کے۔ یہ نصیحت ملتی ہے اس کو، جو کوئی تم میں یقین رکھتا ہے اللہ پر،

ف۱ ایک عورت کو اس کے خاوند نے ایک یا دو طلاق دی اور پھر عدت میں رجعت بھی نہ کی جب عدت ختم ہو چکی تو دوسرے لوگوں کے ساتھ زوج اول نے بھی نکاح کا پیغام دیا عورت بھی اس پر راضی تھی مگر عورت کے بھائی کو غصہ آیا اور نکاح کو روک دیا اس پر یہ حکم اترا کہ عورت کی خوشنودی اور بہبودی کو ملحوظ رکھو اسی کے موافق نکاح ہونا چاہیے اپنے کسی خیال اور ناخوشی کو دخل مت دو اور یہ خطاب عام ہے نکاح سے روکنے والوں کو سب کو خواہ زوج اول جس نے کہ طلاق دی ہے وہ دوسری جگہ عورت کو نکاح کرنے سے روکے یا عورت کے ولی اور وارث عورت کو پہلے خاوند سے یا کسی دوسری جگہ نکاح کرنے سے مانع ہوں سب کو روکنے سے ممانعت آگئی، ہاں اگر خلاف قاعدہ کوئی بات ہو مثلاً غیر کفو میں عورت نکاح کرنے لگے یا پہلے خاوند کی عدت کے اندر کسی دوسرے سے نکاح کرنا چاہے تو بیشک ایسے نکاح سے روکنے کا حق ہے بالمعروف فرمانے کا یہی مطلب ہے۔

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

اور قیامت کے دن پر ف۱ اس میں تمہارے واسطے بڑی ستھرائی ہے اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ف۲

اور پچھلے دن پر۔ اسی میں سنوار زیادہ ہے تم کو اور ستھرائی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حکم بست وہشتم - منع از اضرار نساء بعد از عدت

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ ... الی ... وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں اندرون عدت ضرر پہنچانے کی ممانعت کا بیان تھا۔ اس آیت میں عدت گزرنے کے بعد ضرر پہنچانے کی ممانعت کا بیان ہے کہ عدت گزرنے کے بعد عورتوں کو نکاح سے نہ روکو چنانچہ فرماتے ہیں اور جب تم یعنی تمہارا کوئی عزیز عورتوں کو طلاق دے دے اور پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں یعنی ان کی عدت پوری ہو جائے اور پھر وہ اپنے سابق شوہر سے یا کسی دوسری جگہ نکاح کرنا چاہیں تو تم ان کو اپنے پہلے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ شریعت اور مروت کے دستور کے مطابق نکاح کرنے پر باہم رضامند ہو جائیں۔ البتہ اگر عورت غیر کفو میں نکاح کرنے لگے یا عدت کے اندر کسی دوسرے سے نکاح کرنے لگے تو پھر خویش اور اقارب کو ایسے نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے۔

یہ آیت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ معقل رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کا ایک شخص سے نکاح کر دیا تھا۔ بعد چندے اس شخص نے ان کی بہن کو طلاق دے دی عدت گزرنے پر پھر اسی شخص نے پیغام دیا۔ معقل رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے پہلے تم سے اپنی بہن کا نکاح کیا اور تمہارا گھر بسایا مگر تم نے اس کو طلاق دے دی اور اب پھر پیغام لے کر آئے ہو۔ خدا کی قسم اب وہ تمہارے گھر ہرگز نہیں جا سکتی معقل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ آدمی کچھ برا نہ تھا اور میری بہن بھی اس کے یہاں جانا چاہتی تھی۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ الآیۃ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ خدا کی قسم میں ضرور اس سے نکاح کر دوں گا۔ اور پھر میں نے اسی شخص سے اپنی بہن کا نکاح کر دیا۔ یہ نصیحت اس شخص کو کی جاتی ہے کہ جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ نصیحت اسی کو فائدہ دیتی ہے جسے خدا کا خوف ہو اور آخرت کا یقین ہو۔ اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو کچھ تم کو نصیحت اور ہدایت کی گئی یہی تمہارے لیے خیر اور برکت اور طہارت اور نزاہت کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ عورتوں کو نکاح سے روکنے میں کیا مضرتیں اور کیا خرابیاں ہیں اور تم پیش آنے والے مفاسد کو نہیں جانتے اگر باوجود باہمی رضامندی اور رغبت کے تم نے عورتوں کو

ف۱ یعنی حکم جو مذکور ہوئے ان سے اہل ایمان کو نصیحت دی جاتی ہے کیونکہ اس نصیحت سے وہی منتفع ہوتے ہیں اور یوں تو نصیحت بھی کے لئے ہے کسی کی خصوصیت نہیں اور مومنین کے خاص کرنے سے دوسروں پر تہدید اور ان کی تحقیر بھی مفہوم ہوتی ہے یعنی جو لوگ ان حکموں پر عمل نہیں کرتے گویا ان کو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہی نہیں۔

ف۲ یعنی عورت کو نکاح سے نہ روکنے اور اس کے نکاح ہو جانے میں وہ پاکیزگی ہے جو نکاح سے روکنے میں ہرگز نہیں اور عورت جب کہ پہلے خاوند کی طرف راغب ہو تو اسی کے ساتھ نکاح ہو جانے میں وہ پاکیزگی ہے کہ دوسرے کے ساتھ نکاح کرنے میں ہرگز نہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی باتوں کو اور نفع نقصان آئندہ کو خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

نکاح سے روکا تو شیطان طرفین کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈالے گا اور اسی طرح سے دلوں کی طہارت اور نزاہت کو مکدر کرے گا اور عجب نہیں کہ نکاح سے روکنا خود اہل خانہ سے ناجائز تعلقات کا ذریعہ نہ بن جائے۔ ﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ﴾ کے یہ معنی ہیں خوب سمجھ لو۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ

اور بچے والی عورتیں دودھ پلاویں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہیے کہ پوری کرے دودھ کی مدت ف۱

اور لڑکے والیاں دودھ پلاویں اپنے لڑکوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری کرے دودھ کی مدت

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا

اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا ان عورتوں کا موافق دستور کے تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر

اور لڑکے والے پر ہے کھانا اور پہننا ان کا موافق دستور کے۔ تکلیف نہیں کسی شخص کو، مگر

وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ

اس کی گنجائش کے موافق نہ نقصان دیا جاوے ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ اس کو کہ جس کا وہ بچہ ہے یعنی باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے ف۲ اور وارثوں پر بھی

جو اس کی گنجائش ہے نہ ضرر چاہیے ماں اپنی اولاد کا، اور نہ لڑکے والا اپنی اولاد کا۔ اور وارث پر بھی یہی

ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ

یہی لازم ہے ف۳ پھر اگر ماں باپ چاہیں کہ دودھ چھڑا لیں یعنی دو برس کے اندر ہی اپنی رضا اور مشورہ سے تو ان پر کچھ گناہ نہیں ف۴ اور اگر

ذمہ ہے۔ پھر اگر دونوں چاہیں دودھ چھڑانا آپس کی رضا سے اور مشورت سے تو ان کو نہیں گناہ۔ اور اگر

ف۱ یعنی ماں کو حکم ہے کہ اپنے بچہ کو دو برس تک دودھ پلائے اور یہ مدت اس کے لئے ہے جو ماں باپ بچہ کے دودھ پینے کی مدت کو پورا کرنا چاہیں ورنہ اس میں کمی بھی جائز ہے جیسا آیت کے اخیر میں آتا ہے اور اس حکم میں وہ مائیں بھی داخل ہیں جن کا نکاح باقی ہے اور وہ بھی جن کو طلاق مل چکی ہو یا ان کی عدت بھی گزر چکی ہو ہاں اتنا فرق ہوگا کہ کھانا کپڑا منکوحہ اور معتدہ کو تو دینا زوج کو ہر حال میں لازم ہے دودھ پلائے یا نہ پلائے اور عدت ختم ہو چکے گی تو پھر صرف دودھ پلانے کی وجہ سے دینا ہوگا اور اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ دودھ کی مدت کو جس ماں سے پورا کرانا چاہیں یا جس صورت میں باپ سے دودھ پلانے کی اجرت ماں کو دلوانا چاہیں تو اس کی انتہاء، دو برس کامل ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہوا کہ علی العموم دودھ پلانے کی مدت دو برس سے زیادہ نہیں۔

ف۲ یعنی باپ کو بچہ کی ماں کو کھانا کپڑا ہر حال میں دینا پڑے گا۔ اول صورت میں تو اس لئے کہ وہ اس کے نکاح میں ہے، دوسری صورت میں عدت میں ہے اور تیسری صورت میں دودھ پلانے کی اجرت دینی ہوگی اور بچہ کے ماں باپ بچہ کی وجہ سے ایک دوسرے کو تکلیف نہ دیں مثلاً ماں بلا وجہ دودھ پلانے سے انکار کرے یا باپ بلا سبب ماں سے بچہ جدا کر کے کسی اور سے دودھ پلوائے یا کھانے کپڑے میں تنگی کرے۔

ف۳ یعنی اگر باپ مر جاوے تو بچہ کے وارثوں پر بھی یہی لازم ہے کہ دودھ پلانے کی مدت میں اس کی ماں کے کھانے کپڑے کا خرچ اٹھائیں اور تکلیف نہ پہنچائیں اور وارث سے مراد وہ وارث ہے جو محرم بھی ہو۔

ف۴ یعنی اگر ماں باپ کسی مصلحت کی وجہ سے دو سال کے اندر ہی بچہ کی مصلحت کا لحاظ کر کے باہمی مشورہ اور رضامندی سے دودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں گناہ نہیں، مثلاً ماں کا دودھ اچھا نہ ہو۔

اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ

تم لوگ چاہو کہ دودھ پلواؤ کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں جب کہ حوالہ کردو جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا

تم مرد چاہو کہ دودھ پلوا لو اپنی اولاد کو تو تم پر نہیں گناہ جب حوالہ کردیا جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا

بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

موافق دستور کے ف۱ اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

موافق دستور کے۔ اور ڈرو اللہ سے، اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

حکم بست ونہم۔ متعلق بہ رضاع

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ... الی... وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں عورتوں کے احکام کا بیان تھا یعنی طلاق اور عدت اور رجعت کے احکام کا ذکر تھا۔ اب ان آیات میں بچوں کے احکام بیان فرماتے ہیں یعنی رضاعت کی مدت اور اس کی اُجرت کے احکام بیان فرماتے ہیں کہ بچہ والی عورتوں کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو کامل دو سال تک دودھ پلائیں۔ اگرچہ اُن کے شوہروں نے ان کو طلاق دے دی ہو اور یہ مدت اس کے لیے ہے جو شیر خوارگی کو مکمل کرنا چاہے اور جو مدت رضاعت کو پورا کرنا نہ چاہے تو اس کو اختیار ہے کہ دو سال سے پہلے ہی دودھ چھڑا دے اور باپ پر جس کے لیے دراصل یہ بچہ پیدا کیا گیا کیونکہ بچہ باعتبار نسب کے باپ ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اُن دودھ پلانے والیوں کا کھانا اور پہنانا دستور کے مطابق واجب ہے حق تعالیٰ کی طرف سے کسی نفس کو کسی حکم کا مکلف نہیں بنایا جاتا مگر اس کی طاقت اور گنجائش کے موافق لہٰذا ماں کو بچہ کی وجہ سے کوئی ضرر اور نقصان نہ پہنچایا جائے اور علیٰ ہٰذا نہ باپ کو لڑکے کی وجہ سے کوئی تکلیف دی جائے یعنی طلاق ہو جانے کے بعد ماں کو یہ نہ چاہیے کہ دودھ پلانے میں نخرے کرے اور شوہر سے نفقہ اور اجرت دستور سے زیادہ مانگے یا بچہ کی خبر گیری میں کمی کرے اور علیٰ ہٰذا باپ کو یہ نہ چاہیے کہ ضد میں بجائے ماں کے کسی انا سے دودھ پلوائے اور اس کو تو اجرت دے مگر ماں کو دودھ پلانے کی اجرت نہ دے یا ماں کی اجرت میں کمی کرے۔

غرض یہ کہ دودھ پلانے کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے اور اگر باپ زندہ نہ ہوں تو پھر اسی طرح کا خرچ وارث کے ذمہ ہے۔ وارث کی تفسیر میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وارث سے ذی رحم محرم مراد ہے اس لیے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں "وَعَلَى الْوَارِثِ ذِي الرَّحِمِ الْمَحْرَمِ مِثْلُ ذٰلِكَ" آیا ہے۔ اور ایک قراءت دوسری قرات کی مفسر ہوتی ہے یعنی وارث سے وہ ذی الرحم محرم مراد ہے کہ اگر بچہ مر جائے تو یہ اس کا وارث بنے بقدر میراث کے سب پر خرچ لازم ہوگا۔ مثلاً اگر ذی رحم محرم دو بھائی یا دو بہنیں ہیں تو دونوں سے نصف نصف لیا جائے گا اور اگر ایک بھائی اور ایک

ف۱ یعنی اے مردو اگر تم کسی ضرورت و مصلحت سے ماں کے سوا کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں بھی گناہ نہیں مگر اس کی وجہ سے ماں کا کچھ حق نہ کاٹ رکھے بلکہ دستور کے موافق جو ماں کو دینا ٹھہرایا تھا وہ دے دے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دودھ پلانے والی کا حق نہ کاٹے۔

بہن ہے تو بھائی سے دو ثلث اور بہن سے ایک ثلث لیا جائے گا اور وارثوں پر خرچ اس صورت میں ہے کہ خود بچہ کے پاس مال نہ ہو ورنہ اگر بچہ کے پاس مال ہے تو پھر تمام خرچ اسی کے مال میں سے دیا جائے گا اور امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وارث سے خود وہ لڑکا ہی مراد ہے جو اپنے متوفی باپ کا وارث ہے اس کے دودھ پلانے کی اجرت اسی کے مال میں سے لی جائے گی اور اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو پھر ماں کے ذمہ ہے اور بچہ کے خرچہ کے لیے سوائے والدین کے کسی پر جبر نہیں کیا جاسکتا پس اگر ماں باپ باہمی رضامندی اور مشورہ سے دو برس سے پہلے ہی دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر اس بارہ میں کوئی گناہ نہیں اور اگر تم کسی ضرورت یا مصلحت کی وجہ سے یہ ارادہ کرو کہ اپنے بچوں کو بجائے ماں کے کسی دایہ کا دودھ پلوانا چاہو بشرطیکہ تم حوالہ اور سپرد کردو جو کچھ تم نے دینا مقرر کیا تھا دستور کے موافق یعنی دودھ پلانے والی کا حق پورا دے دینا اس میں سے کچھ کمی نہ کرنا کسی کا حق مارنا کاٹنا بہت بری بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ جو احکام ماؤں اور دودھ پلانے والیوں کے متعلق دیے گئے ہیں اس کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس بات کو پیش نظر رکھو کہ تحقیق اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے کہ طلاق دے کر دینے کے بعد ماں سے دودھ پلوانے میں یا ماں کے ہوتے ہوئے کسی انا سے بچہ کو دودھ پلوانے میں کوئی نفسانی غرض تو شامل نہیں کوئی دیکھے یا نہ دیکھے مگر حق تعالیٰ تمہارے دل کے خیالات اور نفس کے خطرات کو بھی دیکھتا ہے۔

ف ۱:...... طلاق کے بعد اکثر و بیشتر میاں اور بیوی کے درمیان ایک قسم کی عداوت اور منافرت پیدا ہو جاتی ہے۔ خاص کر جب کہ طلاق ایسی حالت میں ہو کہ گود میں شیر خوار بچہ بھی ہو تو یہ باہمی منافرت اور کدورت ایک قسم کی مخاصمت اور منازعت کا سبب بن جاتی ہے۔ اور پہلے شوہر کو بچہ کی پرورش میں عجب دشواری پیش آتی ہے کبھی مرد یہ چاہتا ہے کہ بچہ کو ماں سے چھین کر کسی اور عورت سے دودھ پلوائے اور اس طرح بیچاری ماں کو فراق میں تڑپائے اور کبھی عورت بچہ کو دودھ پلانے سے اس لیے انکار کرتی ہے کہ ظاہر میں کوئی اور دودھ پلانے والی موجود نہیں۔ پہلا شوہر مجبور ہو کر میری خوشامد کرے گا اور جو معاوضہ مانگوں گی وہ مجبوراً دے گا اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں فیصلہ فرما دیا کہ مائیں دو برس تک بچہ کو دودھ پلائیں اور باپ کے ذمہ اس کے معاوضہ میں اس کا کھانا اور پہنانا واجب ہو گا ایک دوسرے کو ضرر اور نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ کرے اور نہ کسی کا حق کاٹے۔

ف ۲:...... مدت رضاعت جمہور کے نزدیک دو سال ہیں اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک ڈھائی سال یعنی تیس مہینے ہیں جیسا کہ ﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ میں مذکور ہے۔ تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھی جائے۔

ف ۳:...... یہ آیت اگرچہ مطلقہ عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی مگر بیوی بھی اس حکم میں داخل ہے اور اگر بچہ کو دودھ پلانے کی وجہ سے بیوی کو کچھ دیا جائے تو حق زوجیت اس کے لیے مانع نہیں۔

ف ۴:...... ماں اگر معذور نہ ہو تو دیانۃً اس کے ذمہ بچہ کو دودھ پلانا واجب ہے اور منکوحہ کے لیے یا اُس مطلقہ کے لیے جو ابھی عدت میں ہو اُجرت لینا جائز نہیں۔ البتہ عدت گزرنے کے بعد اجرت دینا واجب ہو گی۔

ف ۵:...... ماں کا دودھ اگر بچہ کے لیے مضر ہو تو ایسی صورت میں کسی اور عورت سے دودھ پلوانے میں کوئی حرج نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ

اور جو لوگ مرجاویں تم میں سے اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو چاہیے کہ وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے

اور جو لوگ مر جائیں تم میں اور چھوڑ جائیں عورتیں وہ انتظار کروادیں اپنے تئیں چار مہینے

وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ

اور دس دن ف۱ پھر جب پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس بات میں کہ کریں وہ اپنے حق میں قاعدہ کے

اور دس دن پھر جب پہنچ چکیں اپنی عدت کو تو تم پر نہیں گناہ جو وہ اپنے حق میں کریں

بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۲۳۴

موافق ف۲ اور اللہ کو تمہارے تمام کاموں کی خبر ہے۔

موافق دستور کے اور اللہ کو تمہارے کام کی خبر ہے۔

حکم سی ام - عدت وفات زوج

قال تعالیٰ: ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ... الی ... وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں عدت حیات یعنی عدت طلاق کو بیان فرمایا اور اسی کے ساتھ اثناء عدت میں مدت رضاعت اور اجرت رضاعت کا حکم بیان فرمایا۔ اب ان آیات میں عدت حیات کے بعد عدت وفات کو بیان فرماتے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ عدت وفات اور عدت حیات الگ الگ ہیں اور جو لوگ تم میں سے اپنی عمر کو پوری کر کے دنیا سے چلے جائیں اور بیبیوں کو دنیا میں چھوڑ جائیں تو ان کو چاہیے کہ چار مہینے اور دس دن اپنے آپ کو نکاح سے روکے رکھیں جب تک یہ مدت نہ گزر جائے کہیں نکاح نہ کریں پس جبکہ وہ اپنی مدت اور عدت پوری کرلیں تو اے وارثان میت تم پر اب کوئی گناہ نہیں اس کام میں جو وہ اپنی ذات کے لیے دستور کے مطابق کریں اب ان کو زینت کرنے کی اور نکاح کرنے کی اجازت ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے اگر تم نے کسی امر مشروع پر اُن کو ملامت کی یا ان کی کسی بات میں حارج اور مزاحم ہوئے تو اللہ تعالیٰ تم کو اس کی سزا دے گا۔

ف ۱:...... یہ عدت اس بیوہ کی ہے جو حاملہ نہ ہو اس لیے کہ حاملہ کی عدت وضع حمل یعنی ولادت ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾۔

ف۱ پہلے گزر چکا ہے کہ طلاق کی عدت میں تین حیض انتظار کرے اب فرمایا کہ موت کی عدت میں چار مہینے دس دن انتظار کرے سو اس مدت میں اگر معلوم ہوگیا کہ عورت کو حمل نہیں تو عورت کو نکاح کی اجازت ہوگی ورنہ وضع حمل کے بعد اجازت ہوگی اس کی تشریح سورۂ طلاق میں آئے گی حقیقت میں تین حیض یا چار مہینے دس دن حمل کے انتظار اور اس کے دریافت کرنے کے لئے مقرر فرمائے۔

ف۲ جب بیوہ عورتیں اپنی عدت پوری کرلیں یعنی غیر حاملہ چار ماہ دس روز اور حاملہ مدت حمل تو ان کو دستور شریعت کے موافق نکاح کر لینے میں کچھ گناہ نہیں اور زینت اور خوشبو سب حلال ہیں۔

ف ۲:...... آئندہ ایک آیت میں آئے گا کہ عدتِ وفات ایک سال ہے وہ حکم پہلے تھا جو اس آیت سے منسوخ ہوگیا۔ یہ آیت اگر چہ تلاوت کے اعتبار سے مقدم ہے مگر نزول کے اعتبار سے مؤخر ہے۔

ف ۳:...... شریعت نے عدت کا حکم پہلے نکاح کی عزت وحرمت اور نسب اور حمل کی حفاظت کے لیے دیا ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي

اور کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ اشارہ میں کہو پیغام نکاح ان عورتوں کا یا پوشیدہ رکھو اپنے

اور گناہ نہیں تم پر جو پردے میں کہو پیغام نکاح عورت کو یا چھپا رکھو

أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن

دل میں اللہ کو معلوم ہے کہ تم البتہ ان عورتوں کا ذکر کرو گے لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چھپ کر مگر یہی کہ

اپنے دل میں معلوم ہے اللہ کو کہ تم البتہ دھیان کرو گے لیکن وعدہ نہ کرو ان سے چھپ کر، مگر یہی کہ

تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ

کہہ دو کوئی بات رواج شریعت کے موافق اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جاوے عدت مقررہ اپنی انتہا کو ف۱

کہہ دو ایک بات جس کا رواج ہے اور نہ باندھو گرہ نکاح کی جب تک پہنچ چکے حکم اللہ کا اپنی مدت کو

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ

اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ تمہارے دل میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا

اور جان رکھو، کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دل میں ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشتا ہے

حَلِيمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع ۱۴

اور تحمل کرنیوالا ہے ف۲

تحمل والا۔

حکم سی ویکم- متعلق پیغام نکاح دراثنا عدت

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ ... الی ... أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾

ف۱ خلاصہ آیت کا یہ ہوا کہ عورت خاوند کے نکاح سے جدا ہوئی تو جب تک عدت میں ہے تو کسی دوسرے کو جائز نہیں کہ اس سے نکاح کر لے یا صاف وعدہ کرا لے یا صاف پیام بھیجے لیکن اگر دل میں نیت رکھے کہ بعد عدت میں اس سے نکاح کروں گا یا اشارۃً اپنے مطلب کو اسے سنا دے تاکہ کوئی دوسرا اس سے پہلے پیام نہ دے بیٹھے مثلاً عورت کو سنا دے کہ تجھ کو ہر کوئی عزیز رکھے گا یا کہے کہ میرا ارادہ کہیں نکاح کرنے کا ہے تو کچھ گناہ نہیں مگر صاف پیغام ہرگز نہ دے۔

ف۲ یعنی حق تعالیٰ تمہارے جی کی باتیں جانتا ہے سو ناجائز ارادہ سے بچتے رہو اور ناجائز ارادہ ہوگیا تو اس سے توبہ کرو، اللہ بخشنے والا ہے اور گنہگار پر عذاب نہ ہوا تو اس سے مطمئن نہ ہو جائے کیونکہ وہ حلیم ہے عقوبت میں جلدی نہیں فرماتا۔

ربط:...... گزشتہ آیات میں عدت کے بعد نکاح کی اجازت مذکور تھی۔ اس آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ عدت کے اندر اندر نکاح اور نکاح کا وعدہ اور نکاح کا صریح پیغام تو جائز نہیں البتہ نکاح کا اشارہ اور کنایہ جائز ہے اس لیے کہ کسی کے مرتے ہی اس کی بیوہ سے نکاح کا پیغام دینا بے مروتی ہے گویا کہ پیغام دینے والا اس کی موت کا منتظر ہی تھا خصوصاً جب کہ بیوہ صاحب کمال اور صاحب جمال بھی ہو تو پیغام والے اور بھی جلدی کرتے ہیں۔ اور علی ہذا عدت کے اندر عورت کا نکاح کے متعلق گفتگو کرنا بے وفائی پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے شوہر کے مرتے ہی اس کے حق رفاقت کو بھول گئی اور سابق نکاح کی عزت اور حرمت کا کوئی لحاظ نہ کیا کہ جس کے گھر میں عدت گذار رہی ہے اور جس کی میراث تقسیم کرا رہی ہے اس کے مرتے ہی نکاح کی بات چیت کر رہی ہے۔ گویا کہ یہ بے وفا عورت اپنے شوہر کے مرنے کی ہی منتظر تھی۔ اس لیے ان آیات میں اس کی بابت حکم فرمایا۔ اور جس طرح عدت کے بعد نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں اسی طرح تم پر اس بارے میں بھی کوئی گناہ نہیں کہ عدت وفات کے اندر عورتوں کے پیغام کے متعلق بطور تعریض اور کنایہ کچھ اشارہ کرو۔ مثلاً یہ کہو کہ مجھے ایک نیک عورت کی ضرورت ہے یا نکاح کے خیال کو بالکل دل میں مضمر رکھو اور کسی طرح اس کا ذکر نہ کرو نہ صراحۃً اور نہ تعریضاً اور نہ کنایۃً اس کی طرف کوئی اشارہ کرو اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ تم عدت کے بعد ان سے صراحۃً اس کا ذکر کرو گے اور بغیر ذکر کے تم صبر نہ کر سکو گے اس لیے تم کو تعریض اور کنایہ کی اجازت دے دی۔ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر یہ بھی نہ ہو تو بہتر ہے یہ بھی ایک قسم کا عتاب ہے لیکن تم کو چاہیے کہ اجازت سے آگے نہ بڑھو یعنی عدت کے اندر ایک دوسرے سے مخفی طور پر نکاح کا صریح وعدہ نہ کرلو کہ عدت کے بعد ضرور نکاح کرلیں گے مگر اتنی بات کہو کہ جو قانون شرعی کے مطابق ہو یعنی بطور تعریض اور کنایہ کچھ کہہ سکتے ہو صراحۃً کہنے کی اجازت نہیں اور جب تک عدت اپنی پوری مدت تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک عقد نکاح کا عزم مصمم بھی نہ کرو۔ یعنی یہ ارادہ اور عزم کہ عدت گزرنے کے بعد ضرور نکاح کریں گے یہ بھی ممنوع ہے بسا اوقات عزم کر لینے کے بعد صبر نہیں ہوتا اور عدت کے اندر ہی نکاح کر بیٹھتا ہے اور اسلیے بطور سدِّ ذرائع اس ارادہ کی بھی ممانعت کر دی گئی اگرچہ یہ ممانعت تحریم کے درجہ میں نہیں بلکہ تنزیہ کے درجہ میں ہے جیسے ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى﴾ میں زنا کے قریب جانے کی ممانعت فرمائی اور حدیث میں ہے کہ جو چراگاہ کے گرد گھومتا ہے عجب نہیں کہ وہ کسی وقت چراگاہ کے اندر گھس بھی جائے اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں عدت کے اندر نکاح کا میلان چھپا ہوا ہے بس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جانو کہ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا ہے کہ میلان اور رغبت پر مواخذہ نہیں فرماتا اور جو قصداً ارادہ کے بعد اللہ کے خوف کی وجہ سے نہ کرے اس کو معاف کر دیتا ہے اور بڑا تحمل والا ہے کہ خلاف حکم کرنے والوں پر مواخذہ میں جلدی نہیں کرتا۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ

کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو ان کے لئے

گناہ نہیں تم پر، اگر طلاق دو عورتوں کو، جب تک یہ نہیں کہ ان کو ہاتھ لگایا ہو یا مقرر کیا ہو ان کا

فَرِيضَةً ۚ وَّمَتِّعُوهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا

کچھ مہر اور ان کو کچھ خرچ دو مقدور والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق جو خرچ کہ

کچھ حق اور ان کو خرچ دو وسعت والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق جو خرچ

بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۳۶﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ

قاعدہ کے موافق ہے لازم ہے نیکی کرنے والوں پر ف۱ اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے

دستور ہے لازم ہے نیکی والوں کو۔ اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے

وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي

اور ٹھہرا چکے تھے تم ان کے لئے مہر تو لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم مقرر کر چکے تھے مگر یہ کہ درگزر کریں عورتیں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اس کے

اور ٹھہرا چکے ہو ان کا حق تو لازم ہوا آدھا جو کچھ ٹھہرایا تھا۔ مگر یہ کہ درگذر کریں عورتیں، یا درگذر کرے جس کے

بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ

اختیار میں ہے گرہ نکاح کی یعنی خاوند اور تم مرد درگزر کرو تو قریب ہے پرہیزگاری سے اور نہ بھلا دو احسان کرنا

ہاتھ گرہ ہے نکاح کی۔ اور تم مرد درگذر کرو تو قریب ہے پرہیزگاری سے۔ اور نہ بھلا دو بھلائی رکھنی

بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۷﴾

آپس میں بیشک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے ف۲

آپس میں۔ تحقیق اللہ جو کرتے ہو سو دیکھتا ہے۔

ف۱ اگر نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ آیا اور بلا مہر ہی نکاح کر لیا تو بھی نکاح درست ہے مہر بعد میں مقرر ہو رہے گا لیکن اس صورت میں اگر ہاتھ لگانے سے پہلے یعنی مجامعت اور خلوت صحیحہ سے پہلے ہی طلاق دے دی تو مہر کچھ لازم نہ ہوگا لیکن زوج کو لازم ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دے دے کم سے کم یہی کہ تین کپڑے کرتہ، سربند، چادر اپنی حالت کے موافق اور خوشی سے دے دے۔

ف۲ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا تھا اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی تو آدھا مہر دینا لازم ہے مگر عورت یا مرد کہ جس کے اختیار میں ہے نکاح کا قائم رکھنا اور توڑنا اپنے حق سے درگزر کریں تو بہتر ہے عورت کی تو درگزر یہ کہ آدھا بھی معاف کر دے اور مرد کی درگزر یہ کہ جو مہر مقرر ہوا تھا پورا حوالہ کر دے یا تمام مہر ادا کر چکا تھا تو آدھا نہ لوٹا وے بلکہ سب مہر چھوڑ دے پھر فرمایا کہ مرد درگزر کرے تو تقویٰ کے زیادہ مناسب ہے کیونکہ اللہ نے اس کو بڑائی دی اور مختار کیا نکاح باقی رکھنے کا اور طلاق دینے کا اور نفس نکاح سے تمام مہر لازم ہو جاتا ہے اور بدون ہاتھ لگائے طلاق دے کر زوج نصف مہر کو اپنے ذمہ سے ٹلاتا ہے یہ تقویٰ کے مناسب نہیں اور زوجہ کی طرف سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی جو کچھ کیا زوج نے کیا ان وجوہ سے زوج کو زیادہ مناسب ہے کہ درگزر کرے۔

فائدہ: طلاق کی مہر اور وطی کے لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ نہ مہر ہو نہ وطی۔ دوسری یہ کہ مہر تو مقرر ہو مگر وطی کی نوبت نہ آئے ان دونوں صورتوں کا حکم دونوں آیتوں میں معلوم ہو چکا ہے۔ تیسری یہ کہ مہر مقرر ہوا اور وطی کی نوبت آوے اس میں جو مہر مقرر کیا ہے پورا دینا ہوگا یہ صورت کلام اللہ میں دوسرے موقع پر مذکور ہے۔ چوتھی یہ کہ مہر نہ ٹھہرایا تھا اور ہاتھ لگانے کے بعد طلاق دی اس میں مہر مثل پورا دینا پڑیگا یعنی جو اس عورت کی قوم میں رواج ہے اور یہی چاروں صورتیں موت زوج میں نکلیں گی مگر موت کا حکم طلاق کے حکم سے جدا ہے اگر مہر مقرر نہ کیا تھا اور ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا کہ زوج مر گیا یا ہاتھ لگانے کے بعد مرا ان دونوں صورتوں میں مہر مثل پورا لازم ہوگا اور اگر مہر مقرر کیا اور ہاتھ لگایا یا ہاتھ نہ لگایا تو ان دونوں صورتوں میں جو مہر مقرر ہوا تھا وہ پورا دینا ہوگا۔

حکم سی و دوم - بابت مہر

قال تعالیٰ: ﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ ... الی ... إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں عدت کے اعتبار سے مطلقہ کے احکام مذکور ہوئے اب اس آیت میں مطلقہ کے احکام باعتبار لزوم مہر کے ذکر کرتے ہیں اس لیے کہ جن عورتوں کو طلاق دی جاتی ہے ان کی چار قسمیں ہیں: ایک یہ کہ نکاح کے وقت مہر معین ہوا تھا اور پھر خلوت کے بعد ان کو طلاق دی گئی تو اس صورت میں شوہر کو تمام مہر دینا ہوگا جو نکاح کے وقت مقرر ہوا تھا۔ دوم یہ کہ مہر تو معین ہوا تھا مگر خلوت سے پہلے ہی طلاق دے دی تو اس صورت میں شوہر کو آدھا مہر دینا لازم ہوگا۔ سوم یہ کہ نہ مہر معین ہوا تھا اور نہ خلوت کی نوبت آئی تھی خلوت سے پہلے ہی طلاق دے دی اس صورت میں مہر نہیں بلکہ دستور کے مطابق خرچہ اور جوڑا دینا پڑے گا۔ چہارم یہ کہ مہر تو مقرر نہ ہوا تھا مگر خلوت یا صحبت کے بعد طلاق دی ایسی صورت میں مہر مثل دینا پڑے گا یعنی اس خاندان کی عورتوں کا جو مہر رائج ہے وہ دینا پڑے گا۔ چنانچہ فرماتے ہیں تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم عورتوں کو ایسے وقت میں طلاق دے دو کہ ابھی تک تم نے ان کو چھوا اور ہاتھ تک نہیں لگایا اور نہ ان کے لیے تم نے نکاح کے وقت کوئی مہر مقرر کیا ایسی حالت میں اگر تم ان کو طلاق دے دو تو نہ تو کوئی گناہ ہے اور نہ تم سے کوئی مہر کا مطالبہ ہے اور البتہ اس سے جدائی اور مفارقت کے وقت ان کو کچھ نفع اور فائدہ پہنچا دو یعنی پہننے کا کوئی جوڑا اور کچھ خرچہ دے دو۔ وسعت والے پر اس کی حیثیت کے مطابق ہے اور تنگ دست پر اس کی حالت کے بقدر واجب ہے اور یہ فائدہ پہنچانا خوش خوئی اور خوبصورتی کے ساتھ چاہیے حاکم کی زبردستی سے نہ ہو فائدہ پہنچانا نیکوکاروں پر حق واجب ہے جن کی نظر اللہ پر رہتی ہے وہ خلق خدا کی نفع پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ جوڑا دینا واجب ہے اور قائم مقام مہر کے ہے جیسا کہ صیغۂ امر اور لفظ ''علی'' اور ''حقا'' سے وجوب ظاہر ہوتا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک یہ امر استحبابی ہے واجب نہیں اور اگر تم عورتوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دو۔ دراں حالیکہ تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے تھے تو ایسی صورت میں تم کو اس مہر کا نصف دینا پڑے گا جو تم نے نکاح کے وقت ٹھہرایا تھا اور نصف تم سے معاف ہو جائے گا۔ مگر دو صورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ایک یہ عورتیں اپنا حق (نصف مہر) معاف کر دیں اور شوہر سے کچھ نہ لیں۔ یا یہ کہ مرد جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ اپنا حق معاف کر دے یعنی بجائے نصف مہر دینے کے پورا مہر دے دے اور اگر شوہر پورا مہر دے چکا ہے تو نصف مہر عورت سے واپس نہ لے اور تمہارا اپنے اپنے حق کو معاف کر دینا تقویٰ اور پرہیزگاری کے بہت ہی قریب ہے۔ یہ خطاب مردوں اور عورتوں دونوں کو ہے اور تم باہمی احسان اور نیکوئی کو نہ بھولو۔ ہر ایک کو چاہیے کہ اس کی کوشش کرے کہ فضل اور احسان میرے ہاتھ سے سرزد ہو دوسرے کے احسان پر نظر کرنا فضل اور فضیلت کے خلاف ہے تحقیق اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والے ہیں وہ اس کو بھی دیکھتے ہیں کہ کون احسان کی طرف سبقت کرتا ہے اور کون دوسروں کے احسان کی طرف نظر کرتا ہے۔

فائدہ: ...... چار صورتیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ان آیات میں صرف دو کا حکم مذکور ہے ایک یہ کہ مہر نہیں ٹھہرا تھا اور ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ دوسرے یہ کہ مہر تو ٹھہرا تھا مگر طلاق ہاتھ لگانے سے پہلے ہی دے دی اور دو صورتیں باقی

رہ گئیں جن کا حکم ان آیات میں ذکر نہیں کیا گیا۔ ایک یہ کہ مہر مقرر ہوا تھا اور ہاتھ لگانے کے بعد طلاق دی تو پورا مہر لازم ہوگا۔ یہ حکم سورۂ نساء میں مذکور ہے۔ دوسرے یہ کہ مہر نہیں ٹھہرا تھا اور ہاتھ لگانے کے بعد طلاق دی تو اس صورت میں مہر مثل دینا پڑے گا یعنی اس عورت کے خاندان میں جو رواج ہے اس کے مطابق مہر دینا ہوگا۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝۲۳۸ فَاِنْ خِفْتُمْ

خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے ف۱ پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا

خبردار رہو نمازوں سے، اور بیچ والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے۔ پھر اگر تم کو ڈر ہو

فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا

تو پیادہ پڑھ لو یا سوار پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ

تو پیادہ پڑھ لو یا سوار۔ پھر جس وقت چین پاؤ تو یاد کرو اللہ کو، جیسا تم کو سکھایا ہے جو تم نہ

تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۹

جانتے تھے ف۲

جانتے تھے۔

حکم سی وسوم - محافظت صلوات عموماً وصلوۃ وسطیٰ خصوصاً

قَالَ تَعَالٰی: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ... الی... كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾

ربط: ...... دُور سے سلسلۂ کلام، احکام معاشرت کے بارے میں چل رہا ہے اس کے ضمن میں محافظتِ صلوٰۃ کا حکم اس لیے ذکر کیا کہ اکثر وبیشتر اہل وعیال میں مشغولی نماز اور نیاز سے غفلت کا باعث ہوتی ہے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! مال اور اہل وعیال کا تعلق تم کو خدا کی عبادت اور بندگی سے غافل نہ کرے۔ اور جو ایسا کریں گے وہ خاسرین میں سے ہوں گے۔

ف۱ بیچ والی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے کہ دن اور رات کے بیچ میں ہے اس کی تاکید زیادہ فرمائی کہ اس وقت دنیا کا مشغلہ زیادہ ہوتا ہے اور فرمایا کھڑے رہو ادب سے یعنی نماز میں ایسی حرکت نہ کرو کہ جس سے معلوم ہو جائے کہ نماز نہیں پڑھتے ایسی باتوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے جیسے کھانا پینا یا کسی سے بات کرنا یا ہنسنا۔

فائدہ: طلاق کے حکموں میں نماز کے حکم کو بیان فرمانے کی یا یہ وجہ ہے کہ دنیا کے معاملات اور باہمی نزاعات میں پڑ کر کہیں خدا کی عبادت کو نہ بھلا دو اور یا یہ وجہ ہے کہ ہوا وہوس کے بندوں کو بوجہ غلبہ حرص وبخل عدل کو پورا کرنا اور انصاف سے کام لینا اور وہ بھی رنج اور طلاق کی حالت میں بہت دشوار ہے پھر ﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا﴾ اور ﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ﴾ پر اور اس حالت میں ان سے عمل کرنے کی توقع بیشک مستبعد نظر آتی تھی سو اس کا علاج فرما دیا گیا کہ نماز کی محافظت اور اس کی پابندی اور اس کے حقوق کی رعایت عمدہ علاج ہے کہ نماز کو ازالہ رذائل اور تحصیل فواضل میں بڑا اثر ہے۔

ف۲ یعنی لڑائی اور دشمن سے خوف کا وقت ہو تو ناچاری کو سواری پر اور پیادہ بھی اشارہ سے نماز درست ہے گو قبلہ کی طرف بھی منہ نہ ہوا۔

وقال تعالیٰ: ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ ''انما اموالکم را یاد گیر مال وملک ایں جہاں برباد گیر۔''

یا یوں کہو کہ گزشتہ آیات میں حقوق العباد کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اللہ کے حق کا ذکر ہے۔

یا یوں کہو کہ گزشتہ آیت میں یعنی ﴿وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ﴾ میں یہ حکم تھا کہ باہمی سلوک اور احسان کو فراموش نہ کرو اور اس آیت میں اشارۂ یہ حکم ہے کہ اپنے نفس کو سلوک اور احسان سے نہ بھولو جس نے نماز ادا کی اس نے اپنے نفس پر احسان کیا اور جس نے نماز سے غفلت برتی اس نے اپنے نفس کو فراموش کیا کہ آخرت کے منافع سے اس کو محروم کیا۔

یا یوں کہو کہ گزشتہ آیات میں طلاق کی اجازت مذکور تھی اور احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ طلاق اگرچہ بوجہ ضرورت شرعاً جائز ہے مگر حق تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے اور ایک ناپسندیدہ امر کے ضمن میں کتنے ناپسندیدہ امور کا ارتکاب ہوجاتا ہے وہ اللہ ہی کے علم میں ہے اس لیے آئندہ آیت میں نماز کا حکم نازل کیا تاکہ نماز کی محافظت ناپسندیدہ امور کے ارتکاب کا کفارہ بن سکے۔ کما قال تعالیٰ:

﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ ''بیشک نیک کام (نامۂ اعمال سے) مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو۔''

نماز دین کا ستون ہے۔ گناہوں کو مٹاتی ہے۔ اور دلوں کے زنگ کو کھرچتی ہے اہل وعیال کی ملابست سے جو دلوں پر میل کچیل آجاتا ہے وہ نماز کی محافظت سے صاف ہوجاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ دن میں پانچ نمازوں کا ادا کرنا ایسا ہے جیسا کہ کسی کے دروازہ کے آگے نہر بہتی ہو اور وہ ہر روز اس میں پانچ مرتبہ غسل کرے کیا اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہے گا؟ یعنی سر اور بدن پر پانی بہالینے سے بھی غسل ہوجاتا ہے لیکن غسل کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بجائے اپنے اوپر پانی بہانے کے خود نہر کے اندر گھس جائے کہ جس کا پانی تیزی سے بہہ رہا ہو۔ ایسی نہر میں جس کا پانی نہایت تیزی کے ساتھ چل رہا ہو غسل کرلینے سے میل باقی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ اور تمام نمازوں کی محافظت کرو اور خصوصاً درمیانی نماز یعنی عصر کی۔ نمازوں کی حفاظت اور نگرانی کے معنی یہ ہیں کہ نمازوں کو اپنے وقتوں پر ادا کرو اور نماز کے ارکان اور واجبات اور سنن اور آداب کا پورا پورا لحاظ رکھو۔ تم نماز کی حفاظت کرو نماز تمہاری حفاظت کرے گی۔ اسی وجہ سے ﴿حَافِظُوا﴾ باب مفاعلہ کا صیغہ لایا گیا جو مشارکت پر دلالت کرتا ہے۔ جس درجہ تم نماز کی حفاظت اور خبر گیری کرو گے اسی درجہ نماز تمہاری حفاظت کرے گی اور کھڑے رہو اللہ کے سامنے نہایت ادب اور احترام کے ساتھ نماز میں نہایت خاموشی کے ساتھ کھڑے رہو کسی سے کوئی بات نہ کرو۔ نگاہ نیچی رکھو۔ ادھر ادھر نہ دیکھو۔ دنیاوی خیالات سے قلب کو محفوظ رکھو۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم (ابتداء میں) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے پیچھے نماز میں بات چیت بھی کرلیتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾ تو ہم کو خاموش رہنے کا حکم ہوگیا۔ اور نماز میں باتیں کرنے سے ہم کو منع کردیا گیا (بخاری ومسلم وغیرہ) اس لیے کہ نماز کی حقیقت مناجاتِ خداوندی ہے آپس میں باتیں کرنے سے اللہ تعالیٰ سے مناجات باقی نہیں رہ سکتی۔

حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میری طرح وضو کرے اور پھر دو رکعت نماز اس طرح ادا کرے کہ اس نماز میں اپنے دل سے باتیں نہ کرے تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کردیے جائیں گے۔ (بخاری شریف)

معلوم ہوا کہ نماز تو وہ ہے کہ جس میں دل سے بھی باتیں نہ ہوں چہ جائیکہ زبان سے باتیں اور آنکھوں سے اشارے ہوں پس اگر تم کو کسی دشمن وغیرہ کا خوف ہو جس کی وجہ سے تم نماز کے آداب اور سنن کی پوری حفاظت نہ کر سکو تو پھر جس طرح بھی ممکن ہو۔ پیادہ یا سوار نماز پڑھ لو اور اس طرح اصل نماز کی حفاظت کر لو۔ اگر چہ اس خوف کی حالت میں رکوع اور سجود اور خشوع اور خضوع اور استقبال قبلہ کی پوری رعایت اور حفاظت نہ کر سکو تو پھر جب تم کو امن اور سکون حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کو پورے سکون اور اطمینان اور آداب کے ساتھ یاد کرو جس طرح اس نے تم کو اپنی بندگی اور یاد کے طریقے سکھلائے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ خوف کی حالت مجبوری کی حالت ہے اس لیے حق تعالیٰ نے اس حالت میں بغیر رکوع و سجود کے اشارہ سے نماز کی اجازت دے دی اگر چہ تمہارا منہ بھی قبلہ کی طرف نہ ہو۔

ف ۱:...... صلوٰۃ وسطیٰ کی تعیین میں اقوال مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نماز صبح مراد ہے۔ جو رات کی نماز یعنی عشاء اور دن کی نماز یعنی ظہر کے درمیان ہے ابوقبیصہ بن زویب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مغرب کی نماز مراد ہے کیونکہ یہ نماز ثلاثی ہے (تین رکعت والی ہے) ثنائی اور رباعی کے درمیان ہے یعنی دو رکعت والی سے زائد اور چار رکعت والی نماز سے کم ہے۔ اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ پانچ نمازوں میں سے ایک نماز بلا تعیین کے صلوٰۃ وسطیٰ ہے۔ اسم اعظم اور شب قدر اور ساعت جمعہ کی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو پوشیدہ رکھا ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک صلوٰۃ وسطیٰ سے عصر کی نماز مراد ہے اور بہت کی احادیث صحیحہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مختار ہے۔

ف ۲:...... عصر کی تخصیص، تاکید اور اہتمام کے لیے کی گئی کیونکہ یہ وقت لوگوں کے بازاروں میں مشغول رہنے کا ہے۔ اس لیے اندیشہ ہے کہ یہ نماز فوت نہ ہو جائے یا بغیر جماعت کے ادا کی جائے یا تاخیر سے پڑھی جائے۔

ف ۳:...... امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک خوف کی حالت میں نماز پیروں پر کھڑے ہو کر یا سواری پر جائز ہے مگر چلتے چلتے نماز جائز نہیں اس لیے کہ "رجالًا"، "راجل" کی جمع ہے اور "راجل" کے معنی لغت میں چلنے والے کے نہیں بلکہ لغت میں "راجل" پیروں پر کھڑے ہونے والے کو کہتے ہیں اور اس آیت میں "راجل" کو مقابلہ میں "راکب" کے ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "راجل" سے مراد وہ شخص ہے کہ جو سوار نہ ہو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر دشمن کا خوف شدید ہو تو چلتے چلتے بھی نماز درست ہے۔ جس طرح بن پڑے نماز پڑھ لے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر خوف اتنا شدید ہے کہ ایک جگہ کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو پھر نماز کو مؤخر کرے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے غزوۂ خندق میں نمازوں کو مؤخر فرمایا اور چلتے چلتے نمازیں نہیں پڑھیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى

اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ یہ بھی وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے واسطے خرچ دینا

اور جو لوگ تم میں مر جاویں اور چھوڑ جاویں عورتیں۔ وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے واسطے خرچ دینا

الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ

ایک برس تک بغیر نکالنے کے گھر سے ف۱ پھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ کریں وہ عورتیں اپنے حق میں

ایک برس، نہ نکال دینا پھر اگر وہ نکل جاویں تو گناہ نہیں تم پر، جو کچھ کریں اپنے حق میں

مِنْ مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۴۰﴾

بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ف۲

دستور کی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

حکم سی و چہارم - وصیت برائے سکونت بیوہ

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ... الی ... وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾

ربط:...... احکام معاشرت کے ضمن میں محافظت صلوات پر متنبہ فرمایا۔ اب اس تنبیہ کے بعد پھر کچھ احکام بیان فرماتے ہیں۔ گزشتہ آیات میں مطلقات کے متعہ کا ذکر فرمایا اب اس آیت میں بیوہ کے متعہ کے ذکر فرماتے ہیں۔ اور جو لوگ تم میں سے اپنی عمر پوری کر کے دارِ دنیا سے دارِ آخرت کی طرف انتقال کر جائیں اور عورتوں کو دنیا میں چھوڑ جائیں تو ان پر یہ شرعاً واجب ہے کہ وہ بیبیوں کے لیے ایک سال تک خرچ دینے کی وصیت کر جائیں اس طرح پر کہ وہ عورتیں انہیں کے مکان میں رہیں اور ایک سال تک ان کو نان ونفقہ ملتا رہے بغیر اس کے کہ ان کو ایک سال کے اندر گھر سے نکال دیا جائے۔ شوہر کو چاہیے کہ وصیت نامہ میں اس کی بھی تصریح کر دے کہ ان عورتوں کو ایک سال تک گھر سے نہ نکالا جائے۔ پھر اگر وہ عورتیں ایک سال پورا کیے بغیر ہی چارہ ماہ اور دس دن کے بعد یا وضع حمل کے بعد خود بخود ہی کسی ضرورت کی وجہ سے بغیر وارثوں کے نکالے ہوئے نکل جائیں تو اے وارثو اس چیز پر کہ جو یہ عورتیں شریعت کے دستور کے مطابق اپنے بارے میں کریں۔ مثلاً زیب وزینت کریں یا نکاح کریں تو تم کو منع کرنے کا کوئی حق نہیں۔ البتہ ورثا کو یہ حق ہے کہ گھر سے چلے جانے کے بعد عورت کا خرچ اگر بند کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں اور اللہ غالب ہے خلاف حکم کرنے والوں سے بدلہ لینے پر قادر ہے۔ حکمت والا ہے مروت اور مصلحت کے مطابق حکم دیتا ہے۔

فائدہ:......عورتوں کے لیے ایک سال کی وصیت کا حکم ابتداء اسلام میں تھا کہ جب وارثوں کے حصے مقرر نہ تھے اور آیت میراث ابھی نازل نہ ہوئی تھی بلکہ مردہ کے اختیار پر تھا کہ وہ جس قدر وارثوں کو دلوانا چاہے اس کے مطابق وصیت کر جائے۔ شروع اسلام میں والدین اور اقارب کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا۔ مرنے والے پر وصیت واجب تھی۔ کما قال تعالی: ﴿كُتِبَ

ف۱ یہ حکم اول تھا اس کے بعد جب آیت میراث نازل ہوئی اور عورتوں کا حصہ بھی مقرر ہو چکا ادھر عورت کی عدت چار مہینے دس دن کی ٹھہرا دی گئی تب سے اس آیت کا حکم موقوف ہوا۔

ف۲ یعنی اگر وہ عورتیں اپنی خوشی سے سال کے ختم ہونے سے پہلے گھر سے نکلیں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اے وارثو اس کام میں کہ کریں وہ عورتیں اپنے حق میں شریعت کے موافق یعنی چاہیں خاوند کریں یا اچھی پوشاک اور خوشبو کا استعمال کریں کچھ حرج نہیں۔

عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا، الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ الآیۃ اسی طرح مرنے والوں پر اپنی بیویوں کے لیے وصیت کرنا واجب تھا کہ وہ ایک سال تک اُن کے مال میں سے کھانے پہننے کا فائدہ اٹھاتی رہیں اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا اس لیے اُس کو اختیار تھا کہ چاہے سال بھر شوہر کے گھر میں رہ کر ورثا سے اپنا حق وصول کرے یا چار مہینہ اور دس دن پورے کر کے چلی جائے اور اپنا حق چھوڑ جائے عورت کے لیے اپنے اختیار سے چلا جانا جائز تھا مگر وارثوں کو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا۔ غرض یہ کہ اس آیت کی رو سے مرنے والوں پر اپنی بیویوں کے لیے ایک سال کے نفقہ اور سکنی کی وصیت واجب تھی بعد میں جب آیت میراث نازل ہوئی اور والدین اور اقارب اور بیوی کا حصہ میراث میں مقرر ہو گیا تو بیوی وغیرہ کے لیے وصیت کرنے کا حکم منسوخ ہو گیا اور آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا:

"الالا وصیۃ لوارث"۔ "آگاہ ہو جاؤ وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔"

غرض یہ کہ شروع اسلام میں عورت کی عدت ایک سال تھی اور عورت کے لیے کوئی میراث نہ تھی صرف ہی ایک سال کا نان نفقہ تھا۔ آیتِ میراث کے نازل ہونے کے بعد نان ونفقہ کی وصیت کا حکم منسوخ ہو گیا اور آیت ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ سے جو پہلے گزر چکی ہے ایک سالہ عدت کا حکم منسوخ ہو گیا اور یہ آیت اگرچہ تلاوت میں مقدم ہے مگر نزول میں مؤخر ہے جیسا کہ آیت ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَاۗءُ﴾ الخ تلاوت میں مقدم ہے اور آیت ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ﴾ نزول میں مقدم ہے اور تلاوت میں مؤخر ہے۔

مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت یعنی ﴿مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ﴾ محکم ہے منسوخ نہیں۔ اصل عدت تو چار مہینے اور دس دن ہے۔ اس عدت کا پورا کرنا واجب ہے اور لازم ہے اور ایک سال کی عدت کا حکم استحبابی اور اختیاری ہے۔ چار ماہ اور دس دن کے بعد عورت کو اختیار ہے کہ چاہے سال بھر پورا کرے یا نہ کرے اس لیے کہ اس آیت سے عورت پر ایک سال کی عدت کا واجب ہونا مفہوم نہیں ہوتا بلکہ شوہروں پر ایک سال کی وصیت کا وجوب مفہوم ہوتا ہے کیونکہ اس آیت میں تربص (عدت نشینی) کا ذکر نہیں جیسا کہ آیت عدت میں ہے اس آیت میں تو صرف وصیت کا ذکر ہے اور شوہروں کو حکم ہے کہ تم مرتے وقت بیویوں کے لیے ایک سال کی وصیت کر جاؤ اب ان کو اختیار ہے کہ چاہے اس وصیت کے موافق ایک سال تک رہیں اور چاہیں تو چار مہینہ اور دس دن پورے کر کے چلی جائیں پس مجاہد رحمہ اللہ کے اس قول پر عدت کی دو میعادیں ہو گئیں ایک ضروری اور حتمی جو اقل میعاد ہے یعنی چار مہینہ اور دس دن۔ اور دوسری اختیاری میعاد جو زائد اور اکثر ہے یعنی ایک سال لہٰذا اس صورت میں نہ اس آیت کو منسوخ ماننے کی ضرورت ہے اور نہ اس آیت کو ﴿أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ والی آیت سے نزول میں مقدم ماننے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ جب دو آیتوں کو دو حالتوں پر محمول کر لیا تو تعارض ہی نہ رہا تو پھر نسخ کی کیا ضرورت رہی۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں عدت ایک سال تھی جو بعد میں چار مہینہ اور دس دن کی آیت سے منسوخ ہوئی۔ اور احادیث صحیحہ سے بھی یہی ثابت ہے اور اسی پر تمام علماء اسلام کا اجماع ہے اور کسی امام اور فقیہ نے مجاہد رحمہ اللہ

کی موافقت نہیں کی اور صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین میں سے کسی سے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے موافق منقول نہیں بلکہ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے جمہور کے مطابق ایک قول نقل کیا ہے۔ پس الحمد للہ کہ اجماع مکمل ہوا اور خلاف مرتفع ہوا۔ (احکام القرآن للامام القرطبی: ۳/ ۲۲۷)

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۴۱ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ہے قاعدہ کے موافق لازم ہے پرہیزگاروں پر ف ۱ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تمہارے واسطے

اور طلاق والیوں کو خرچ دینا ہے موافق دستور کے لازم پرہیزگاروں کو۔ اس طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے

اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲۴۲　ع ۳۱/ ۱۵

اپنے حکم تاکہ تم سمجھ لو ف ۲

اپنی آیتیں شاید تم بُوجھ (سمجھ) رکھو۔

حکم سی و پنجم - متعہ برائے مطلقات

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ... الی ... لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں ان مطلقات کے متعہ کے (جوڑا) کا ذکر تھا جن کا مہر نہ مقرر ہوا ہو اور ہاتھ لگانے سے پہلے ان کو طلاق دے دی ہو۔ اب اس آیت میں عام طلاق والی عورتوں کے متعہ کا ذکر فرماتے ہیں اور تمام طلاق والیوں کے لیے دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ نفع پہنچانا ہے من جانب اللہ یہ حق گردانا گیا ہے۔ پرہیزگاروں پر یعنی تمام مسلمانوں پر جو کفر اور شرک سے پرہیز کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے احکام کو بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو اور اس کے احکام کی حکمتوں میں غور و فکر کرو کہ اس کے احکام کیسی کیسی حکمتوں اور مصلحتوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں تک نکاح اور طلاق کے احکام تمام ہوئے۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

ف ۱: ...... جس عورت کا کوئی مہر نہ ٹھہرا اور ہاتھ لگانے سے پہلے اس کو طلاق دے دی گئی ہو اس کو جوڑا دینا واجب ہے جیسا کہ گزشتہ آیات میں گزرا۔ باقی اور طلاق والی عورتوں کو جوڑا دینا واجب نہیں صرف مستحب ہے اس لیے کہ جو عورت مستحق مہر کی ہے وہ مستحق متعہ کی نہیں جس کے لیے پورا مہر یا آدھا مہر واجب ہے اس کے لیے متعہ واجب نہیں۔

ف ۲: ...... اس آیت میں تمام مطلقات کے متعہ کا ذکر ہے جو واجب اور غیر واجب سب کو شامل ہے اور بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ﴾ میں ''الف لام'' عہد کا ہے اس سے وہی مطلقات مراد ہیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے یعنی جن کا مہر

ف ۱ پہلے خرچ یعنی جوڑا دینے کا حکم اس طلاق پر آچکا ہے کہ نہ مہر ٹھہرا ہو نہ زوج نے ہاتھ لگایا ہو اب اس آیت میں وہ حکم سب کے لئے آ گیا مگر اتنا فرق ہے کہ سب طلاق والیوں کو جوڑا دینا مستحب ہے ضروری نہیں اور پہلی صورت میں ضروری ہے۔

ف ۲ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں نکاح طلاق عدت کے احکام بیان فرمائے ایسے ہی اپنے احکام و آیات کو واضح فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو اور عمل کرسکو۔ یہاں نکاح و طلاق کے احکام ختم ہو چکے۔

نہ مقرر ہوا ہو اور خلوت سے پہلے ان کو طلاق دے دی گئی ہو ان کے لیے متعہ واجب ہے۔ اب یہ آیت عام نہ ہوگی بلکہ پہلی ہی آیت کے حکم کی تاکید ہوگی اس لیے کہ پہلی آیت کے اخیر میں یہ تھا ﴿مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ﴾ جس سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ شبہ ہوا کہ یہ متعہ دینا محض احسان اور تبرع ہے واجب اور لازم نہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾ جس میں حق لازم ہونے کی عام مومنین پر تصریح فرمادی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ

کیا نہ دیکھا تو نے ان لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے پھر فرمایا ان کو

تو نے نہ دیکھے وہ لوگ جو نکلے اپنے گھروں سے، اور وہ ہزاروں تھے، موت کے ڈر سے۔ پھر کہا ان کو

اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ

اللہ نے کہ مرجاؤ پھر ان کو زندہ کردیا بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے لوگوں پر لیکن اکثر

اللہ نے مر جاؤ پیچھے ان کو جلایا۔ اللہ تو فضل رکھتا ہے لوگوں پر، اور لیکن اکثر

النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

لوگ شکر نہیں کرتے ف ۱

لوگ شکر نہیں کرتے۔

خاتمہ احکام معاشرت بر تذکیر آخرت

حکایت قصہ گریزندگاں از موت دوبا برائے تنبیہ شیفتگان حیات دنیا وتمہید تشجیع بر جہاد وقتال وترغیب انفاق مال

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ ... الی ... وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾

ربط: ...... یہاں تک ابواب البر والصلہ کے متعلق مختلف الانواع اور مختلف الاقسام احکام مذکور ہوئے مگر ان احکام میں سب سے زیادہ اہم اور مہتم بالشان اور نفس پر شاق اور گراں دو حکم ہیں ایک جہاد وقتال کا اور دوسرا انفاق مال کا۔ چنانچہ اصول بر کے بیان میں ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ اور ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ﴾ کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اس

ف ۱ یہ پہلی امت کا قصہ ہے کہ کئی ہزار شخص گھر بار کو ساتھ لیکر وطن سے بھاگے۔ ان کو ڈر ہوا تھا غنیمت کا اور لڑنے سے جی چھپایا یا ڈر ہوا تھا وباء کا اور تقدیر پر توکل اور یقین نہ کیا پھر ایک منزل پر پہنچ کر بحکم الٰہی سب مر گئے پھر سات دن کے بعد پیغمبر کی دعا سے زندہ ہوئے کہ آگے کو توبہ کریں۔ اس حال کو یہاں اس واسطے ذکر فرمایا کہ کافروں سے لڑنے یا فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے میں جان اور مال کی محبت کے باعث دریغ نہ کریں اور جان لیویں کہ اللہ موت بھیجے تو چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں اور زندگی چاہے تو مردہ کو دم کے دم میں زندہ کردے زندہ کو موت سے بچالینا تو کوئی چیز ہی نہیں پھر اس کی تعمیل حکم میں موت سے ڈر کر جہاد سے بچنا یا افلاس سے بچ کر صدقہ اور دوسروں پر احسان یا عفو اور فضل سے رکنا بددینی کے ساتھ حماقت بھی پوری ہے۔

لیے کہ انسان کو خداوند ذوالجلال کی اطاعت سے روکنے والی زیادہ تر دو ہی چیزیں ہوتی ہیں ایک حب دنیا اور ایک کراہیت موت بلکہ یہی دو چیزیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں مخل اور مزاحم ہوتی ہیں اس لیے حق جل شانہٗ نے اولاً بنی اسرائیل کا ایک قصہ ذکر فرمایا جو موت اور وباء کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے اور غضب خداوندی سے سب ہلاک ہوئے اور پھر حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے دوبارہ زندہ ہوئے تا کہ اس بلاسبب موت اور بلاسبب حیات کے مشاہدہ سے یہ یقین کرلیں کہ موت اور حیات کسی ظاہری سبب پر موقوف نہیں۔ موت اور حیات کا خالق اور مالک صرف خدا تعالیٰ ہے وہ بغیر وباء اور طاعون کے اور بغیر میدانِ کارزار کے بھی موت دے سکتا ہے لہٰذا موت کے خوف سے بھاگنا بے سود ہے۔ نیز اس بلاسبب موت اور بلاسبب دوبارہ زندگی کے مشاہدہ سے گویا کہ آخرت اور حشر اور نشر اور قیامت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا جس سے آخرت کے بارے میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی اور اب تک آخرت اور قیامت کے بارے میں جو ایمان استدلالی اور برہانی تھا اب وہ اس دوبارہ زندگی کے مشاہدہ کے بعد بمنزلہ شہودی اور عیانی کے ہوگیا جس میں ارتداد کا احتمال نہیں۔ استدلال میں احتمال کی گنجائش ہے مشاہدہ اور معاینہ میں شبہ کی گنجائش نہیں۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

پس یہ قصہ اُن دو حکموں کی تمہید ہے جو آئندہ آیات میں مذکور ہوں گے۔ ایک جہاد و قتال کا حکم جو اس قصہ کے متصل مذکور ہے یعنی ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ دوسرا حکم انفاق مال کا ہے جس کو ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ الخ سے بیان فرمایا پھر ان دو حکموں کے بعد اولاً جہاد و قتال کی ترغیب اور تاکید کے لیے قصہ طالوت و جالوت ذکر فرمایا اور ثانیاً خدا کی راہ میں صدقہ اور خیرات کے احکام اور فضائل بیان فرمائے جو دور تک چلے گئے اور پھر احکام صدقات سے فراغت کے بعد ربا اور سود کے احکام بیان فرمائے اور اس لیے کہ ربا اور سود صدقہ اور خیرات کی ضد اور نقیض ہے اور پھر اس سورت کو ایمان اور اطاعت اور دعاء رحمت و مغفرت پر ختم فرمایا۔

اس سورت کا آغاز بھی ایمان اور ہدایت اور تقویٰ اور فلاح سے ہوا تھا ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ... الی ... وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ اور خاتمہ بھی ایمان اور اطاعت اور دعاء رحمت پر ہوا جو کہ عین فلاح اور عین سعادت ہے۔

بیانِ ربط بطریق دیگر:...... دور سے نکاح اور طلاق کے احکام کا سلسلہ چلا آرہا تھا یہاں آکر احکام معاشرت پورے ہوئے۔ اس لیے اب احکام معاشرت کے بعد ایک قصہ تذکیر آخرت کے لیے ذکر فرمایا جس کو عدت وفات کے احکام سے خاص مناسبت ہے یعنی اگر تم بے کس عورتوں کا عرصۂ حیات تنگ کرو گے اور ان کے مہر اور متعہ کے دینے میں کوتاہی کرو گے تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس عدول حکمی کی سزا میں تمہارے اموال اور ذخائر کو اور تمہاری مستعار حیات کو تم سے واپس لے لے جیسا کہ پہلی امتوں میں اس قسم کے واقعات پیش آچکے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کیا اے دیکھنے والے اور اے سننے والے تو نے بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سنا مگر کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل گئے تھے پس اللہ تعالیٰ نے بطور سزا اور تنبیہ یہ حکم دیا کہ مرجاؤ یہ حکم تکوینی تھا اسی وقت سب مرگئے اور جس

موت کے ڈر سے بھاگے تھے اسی میں اچانک پکڑے گئے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک نبی کی درخواست اور استدعاء پر دوبارہ زندہ کر دیا۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ یہ لوگ طاعون سے بھاگ کر نکلے تھے۔ ایک بیابان میں جا کر اترے اور یہ گمان کیا کہ اب ہم سلامتی اور تندرستی کی جگہ پہنچ گئے تب بحکم خداوندی سب کے سب وہیں مر گئے۔ اور ایک ہفتہ یا کچھ عرصہ بعد حزقیل علیہ السلام جو انبیاء بنی اسرائیل میں سے تھے وہاں سے گذرے اور یہ منظر دیکھا کہ ہزاراں ہزار آدمی مرا پڑا ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان سب کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح منقول ہے۔

ضحاک اور مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ سے یہ منقول ہے کہ یہ لوگ جہاد سے بھاگے تھے کہ غنیم سے لڑنا نہ پڑے موت کے ڈر سے وطن چھوڑ کر نکل گئے۔ بھاگ کر جہاں پہنچے اللہ کے حکم سے موت بھی وہیں پہنچ گئی اور سب کا کام تمام کیا۔ پھر بعد چندے اُس زمانہ کے پیغمبر علیہ السلام کی دعا سے دوبارہ زندہ ہوئے۔

نکتہ:...... قاضی ابو بکر بن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ موت موتِ عقوبت تھی یعنی بطور سزا اور تنبیہ تھی۔ موت اجل نہ تھی جو کہ عمر پوری ہونے کے بعد آتی ہے اس لیے سزا اور تنبیہ کے بعد دوبارہ حیات عطا کر دی گئی تا کہ اپنی عمروں کو پورا کر لیں اور اگر یہ موت موتِ اجل ہوتی یعنی عمریں پوری کر چکے ہوتے تو پھر حیات واپس نہ ہوتی اس لیے کہ موتِ اجل کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کیا جاتا۔ (تفسیر قرطبی: ۲۳۱/۳)

فائدہ:...... اللہ کے یہاں عام قاعدہ تو یہی ہے کہ کوئی مرنے کے بعد قیامت سے پہلے دنیا میں نہیں آتا لیکن بطور خرق عادت کبھی احیاناً اللہ تعالیٰ مردہ کو دنیا میں زندہ کرتے ہیں تا کہ اس کی قدرت کا کرشمہ ظاہر ہو اور منکرین قیامت پر حجت تمام ہو۔

اور تحقیق بلاشبہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے کہ اس طرح دوبارہ زندہ کر کے اپنی قدرت کا کرشمہ اور قیامت کا نمونہ ایک نبی کی نبوت کی دلیل اور معجزہ لوگوں کو دکھلا دیا تا کہ ملاحدہ اور منکرینِ قیامت اور مکذبینِ نبوت و رسالت عبرت حاصل کریں اور سمجھ جائیں کہ نہ تو مردوں کا دوبارہ زندہ ہونا محال ہے اور نہ خدا تعالیٰ کے کسی برگزیدہ بندے کے ہاتھ پر کسی خارق عادت کرشمہ کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔ اور ایمان کے اصل اصول بھی یہی تین امر ہیں۔ یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت جو اس واقعہ سے ثابت ہوئے اور ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً﴾ میں جو قصہ ذکر کیا گیا وہ بھی اسی طرح ان تین امور کی دلیل تھا اور آئندہ پارہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو قصہ آنے والا ہے وہ بھی ان ہی تین باتوں کی دلیل واضح ہے اب دیکھ لو کہ کس طرح سے سورۃ کا اول اور آخر اور اوسط باہم متناسب اور مرتبط ہیں۔ ملاحدہ کو چاہیے تھا کہ اس واقعہ کو سامانِ ہدایت سمجھتے اور اس کو خدا کی نعمت جان کر شکر ادا کرتے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور ایسے واقعات سے عبرت اور ہدایت حاصل کرنے والے بہت کم ہیں۔ یہ واقعہ کوئی معمولی نعمت نہ تھا کہ ایمان بالغیب کو شہودی اور عیانی بنا دیا۔ اور ارتداد کے خطرہ سے نکال دیا اس نعمت پر تو اگر لاکھوں اور کروڑوں جانیں بھی قربان ہو جائیں تو بہت کم ہیں۔ اور ان نبی پر بھی اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں جن کی توجہ اور دعا سے یہ نعمت ظہور میں آئی۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلی جمیع الانبیاء والمرسلین وعلی سیدنا ومولانا محمد خاتم النبیین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وعلینا معہم یا ارحم الراحمین۔

ف ا:...... ﴿أَلَمْ تَرَ﴾ کے معنی "کیا تو نے نہیں دیکھا" مگر محاورہ میں اس کے معنی ﴿أَلَمْ تَعْلَمْ﴾ کے ہیں "کیا تم کو معلوم

نہیں''۔ ظاہراً چونکہ رؤیت بصری علم کا ذریعہ ہے اس لیے لفظ ''رؤیت'' بول کر علم کے معنی مراد لیے گئے۔ فصحاء اور بلغاء کے نزدیک یہ لفظ تنبیہ اور تشویق کے لیے مستعمل ہوتا ہے یعنی متنبہ کرنے اور شوق دلانے کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے سیبویہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ﴿اَلَمۡ تَرَ﴾ کے معنی ''تَنَبَّهْ إِلى امر الذين'' کے ہیں (تفسیر القرطبی: ۲۳۰/۳) یعنی یہ واقعہ عجیب وغریب ہے اس قابل ہے کہ اس کو شوق اور رغبت کے ساتھ سنا جائے یہ چیز قابل دید تھی۔

اور چونکہ یہ واقعہ شہرت اور تواتر کی وجہ سے بمنزلہ محسوس اور مشاہد کے تھا اس لیے بجائے ﴿اَلَمۡ تَعۡلَمۡ﴾ کے لفظ ﴿اَلَمۡ تَرَ﴾ لایا گیا۔ جیسا کہ حضرات فقہاء اور محدثین رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ خبر متواتر سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بمنزلہ مشاہدہ اور رؤیت بصری کے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جو امور خبر متواتر سے ثابت تھے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں جابجا اُن کو ﴿اَلَمۡ تَرَ﴾ سے تعبیر کیا ہے۔

ف ۲:...... یہ بھاگنے والے بنی اسرائیل میں سے ایک قوم تھی جو واسط کے قریب قصبہ دَاوَرْدَان میں رہتی تھی۔

ف ۳:...... ﴿وَهُمۡ اُلُوۡفٌ﴾۔ اور یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ چالیس ہزار تھے بعض کہتے ہیں کہ تیس ہزار تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آٹھ ہزار تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ چار ہزار اور بعض کہتے ہیں کہ تین ہزار تھے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں:

> ''والصحيح انهم زادوا عشرة آلاف لقوله تعالىٰ ﴿وَهُمۡ اُلُوۡفٌ﴾ وهو جمع الكثرة ولا يقال في عشرة فما دونها الوف۔''
>
> ''صحیح یہ ہے کہ دس ہزار سے زیادہ تھے۔ اس لیے کہ الوف جمع کثرت ہے۔ اس کا اطلاق دس اور دس سے کم پر نہیں آتا۔'' (تفسیر قرطبی: ۲۳۱/۳)

ف ۴:...... حدیث میں ہے کہ جب تم یہ سنو کہ فلاں زمین میں وباء اور طاعون ہے تو تم اس زمین میں داخل نہ ہونا اور اگر وباء اور طاعون اس زمین میں پھیل جائے جس میں تم رہتے ہو تم اس سے بھاگ کر نہ نکلنا۔ (بخاری ومسلم وغیرہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ملک شام تشریف لے گئے تو مقام سرغ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شام میں طاعون اور وباء پھیلی ہوئی ہے۔ اس وقت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ حدیث سن کر سرغ سے واپس آ گئے۔

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

> ''افراراً من قدر الله''۔ ''اے امیر المومنین! کیا اللہ قضا وقدر سے بھاگتے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> ''لو غيرك قالها يا ابا عبيدة، نعم نفر من قدر الله الى قدر الله۔''
>
> ''کاش! تیرے سوا کوئی یہ شبہ کرتا۔ (یعنی یہ کلمہ تیری شان کے مناسب نہیں) ہاں ہم اللہ کی قضا وقدر سے خدا کی دوسری قضاء وقدر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔''

جس طرح بیماری میں علاج کرنا ایک قضا وقدر سے دوسری قضا وقدر کی طرف بھاگنا ہے اس لیے کہ بیماری بھی اللہ

کی قضا و قدر سے ہے اور علاج اور دوا بھی اللہ کی قضا و قدر ہے اسی طرح ہمارا وبائی زمین میں داخل ہونا اور وطن کی طرف لوٹ جانا ایک قدر سے دوسری قدر کی طرف جانا ہے۔

ف ۵:...... یہ آیت معاد جسمانی کے ثبوت کے لیے قطعی دلیل ہے۔ معاد جسمانی کا اقرار اصول ایمان میں سے ہے اور معاد جسمانی کا منکر باجماع امت بلاشبہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور لڑو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ اللہ بیشک خوب سنتا جانتا ہے۔

اور لڑو اللہ کی راہ میں، اور جان لو کہ اللہ سنتا ہے جانتا۔

تشجیع شاکرین بر جہاد وقتال کافرین

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾

گزشتہ آیت میں حکم جہاد کی تمہید تھی۔ اس آیت میں اصل مقصود کو بیان کرتے ہیں۔ نیز گزشتہ آیت شاکرین اور غیر شاکرین کے بیان پر مشتمل تھی اب اس آیت میں شکر گزاروں کو ناشکروں سے جہاد وقتال کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اب تو تم نے دیکھ لیا کہ موت سے بھاگنا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ لہٰذا خدا کی راہ میں خوب دل کھول کر لڑو۔ خدا کی راہ میں اگر موت بھی آتی ہے تو حقیقت اس کی حیات ہوتی ہے اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔ جہاد میں جانے اور نہ جانے کی بابت جو باتیں کرتے ہو وہ سب سنتا ہے اور جو نیت دل میں چھپائے ہو اس کو جانتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ

کون شخص ہے ایسا جو کہ قرض دے اللہ کو اچھا قرض پھر دو گنا کر دے اللہ اس کو کئی گنا اور اللہ ہی

کون شخص ہے ایسا؟ کہ قرض دے اللہ کو اچھا قرض، کہ وہ اس کو دونا کر دے کتنے برابر؟ اور اللہ

یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

تنگی کر دیتا ہے اور وہی کشائش کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ف ۱

تنگی کرتا ہے اور کشائش اور اسی پاس الٹے جاؤ گے۔

ترغیب انفاق مال در راہ خداوند ذو الجلال

قَالَ تَعَالٰی: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ... الی... وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾

ف ۱ یعنی جب معلوم ہو چکا کہ اللہ کے حکم میں تمہاری جان اور مال ہے تو اب تم کو چاہیے کہ لڑو کافروں سے اللہ کے واسطے دین کے لئے اور جان لو کہ خدا تعالیٰ سنتا ہے بہانہ کرنیوالوں کی باتیں اور جانتا ہے ان کے منصوبوں کو اور چاہیے کہ خرچ کرو اللہ کے رستہ میں مال اور تنگی سے مت ڈرو کہ کشائش اور تنگی سب اس کے اختیار میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر سب کو جانا ہے۔ قرض حسنہ اسے کہتے ہیں جو قرض دیکر تقاضا نہ کرے اور اپنا احسان نہ رکھے اور بدلہ نہ چاہے اور اسے حقیر نہ سمجھے۔ اور خدا کو دینے سے جہاد میں خرچ کرنا مراد ہے یا محتاجوں کو دینا۔

گزشتہ آیت میں خدا کی راہ میں جان دینے کا بیان تھا اب اس آیت میں مال دینے کا بیان ہے کون شخص ہے جو اللہ کو نہایت عمدہ اور اچھا قرض دے یعنی حلال مال سے اخلاص اور خوش دلی کے ساتھ دے پس اللہ تعالیٰ اس کو گونا گوں بڑھا دیں گے۔ دنیا کی طرح برابر سرابر نہیں دیا جائے گا۔ خداوند ذوالجلال معاذ اللہ حاجت کی بناء پر قرض نہیں مانگتا بلکہ تم سے اس لیے قرض مانگتا ہے کہ تم سے ایک لے کر بیشمار اس کے عوض عطا کرے۔ باپ کبھی اپنے خوردسال بچے کو ایک پیسہ دیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ بیٹا یہ پیسہ ہم کو قرض دے دو۔ جب وہ بچہ باپ کے ہاتھ پر وہ رکھ دیتا ہے تو باپ بصد ہزار محبت و پیار اس کے ہاتھ پر ایک دینار رکھ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ غنی مطلق اور مالک مطلق ہے اس کو کسی کے قرض کی ذرہ برابر حاجت نہیں وہ اپنے خزانہ سے جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے وسعت اور کشائش کے ساتھ دیتا ہے اور جس طرح تم دنیا میں خالی ہاتھ آئے تھے اسی طرح تم خالی ہاتھ اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ اگر خدا تعالیٰ تم سے قرض کے نام سے بھی نہ مانگتا اور نہ کسی معاوضہ کا وعدہ فرماتا تب بھی تم کو تمام مال اس کے لیے حاضر کر دینا تھا۔ یہ مال اور جان اور یہ وجود سب اسی کا عطیہ ہے۔



ف ا:...... خدا کی راہ میں دینے کو مجازاً قرض کہا گیا اس لیے کہ قرض دینے کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اپنا مال اس شرط پر دے کہ پھر وہ برابر سرابر اس کے پاس واپس آ جائے اور بندہ حقیقۃً کسی چیز کا مالک نہیں سب چیز اللہ کی ہے۔ آقا کو غلام سے قرض مانگنے کی کیا ضرورت۔ خود غلام اس کا مملوک ہے۔

محض تلطف اور اظہار عنایت کے لیے اس کا نام قرض رکھ دیا کہ خدا کی راہ میں جو خرچ کرو گے من جانب اللہ اس کا معاوضہ ملے گا جیسا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ میں نفوس اور اموال کے عوض میں جنت دینے کا نام بیع و شراء رکھا۔ حالانکہ جان اور مال اور جنت سب کے وہی مالک ہیں۔ بیع و شراء کے لیے یہ ضروری ہے کہ بائع اور مشتری کی ملک علیحدہ علیحدہ ہو۔ پس جس طرح اس آیت میں درحقیقت وہی بائع اور وہی مشتری ہیں محض ظاہر کے اعتبار سے بندہ کو بائع اور اپنے کو مشتری مجازاً قرار دیا اسی طرح اس آیت میں سمجھو کہ لینے والے اور دینے والے سب وہی ہیں مجازاً اس کو قرض سے تعبیر کر دیا تا کہ اس ظلوم وجہول کا دل خوش ہو جائے اور اگر کچھ عقل ہے تو غیرت سے زمین میں گڑ جائے کہ اللہ اکبر خود اپنے فضل و کرم سے مال و دولت ہم کو دیتے ہیں اور پھر ہمارے ہاتھ میں دے کر یہ فرماتے ہیں کہ لاؤ اس میں سے کچھ ہم کو قرض دے دو اور حکم بھی بصورتِ امر نہیں بلکہ استفہام کی صورت میں ہے کہ کون ہے جو خدا تعالیٰ کو قرض دے یہود بے بہود بڑے ہی نادان تھے کہ اس تلطف اور عنایت کو تو نہ سمجھے بلکہ الٹا یہ سمجھے کہ معاذ اللہ خدا حاجت مند ہے۔ اس لیے ہم سے قرض مانگتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ الآیہ۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ آیت میں مضاف مقدر ہے، "ای من ذالذی یقرض عباد اللہ" یعنی کون ہے جو اللہ کے بندوں کو قرضہ دے اللہ کو قرض دینے سے اس کے بندوں کو قرض دینا مراد ہے جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

"یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی واستطعمتك فلم تطعمنی واستسقیتك فلم تسقنی قال یا رب کیف اسقیك وانت رب العالمین قال استسقاك عبدی فلان فلم تسقه اما انك لو سقیته وجدت ذلك عندی الحدیث اخرجه مسلم والبخاری کذا فی تفسیر

القرطبی: ۳/۲۴۰۔"

''اے آدم علیہ السلام کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہ کی۔ میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھ کو کھانا نہ دیا۔ میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھ کو پانی نہ دیا۔ بندہ عرض کرے گا اے پروردگار! آپ کو کیسے پلاتا آپ تو تمام عالم کے مربی اور کھلانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے اسے کھانا نہیں دیا اگر تو اس کو کھانا دیتا تو اس کو ضرور میرے پاس پاتا۔'' الی آخر الحدیث۔

ف ۲:......حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ نازل ہوئی تو ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے (بطور مسرت اور لذت) عرض کیا:

"یا رسول اللہ او ان اللہ تعالیٰ یرید منا القرض قال نعم یا ابا الدحداح۔"

''یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اے ابوالدحداح۔''

ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے پاس دو باغ ہیں ایک عالیہ میں اور ایک سافلہ میں اور خدا کی قسم ان دو باغوں کے سوا اور کسی چیز کا مالک نہیں۔ دونوں باغوں کو خدا تعالیٰ کے لیے قرض دیتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک باغ خدا کے لیے دیدے اور ایک باغ اپنے اہل وعیال کے گذران معاش کے لیے رہنے دے۔ ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ ان دو باغوں میں جو سب سے بہتر باغ ہے جس میں چھ سو کھجور کے درخت ہیں وہ اللہ کے لیے دیتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِذًا یَجْزِیْكَ اللّٰهُ بِهِ الْجَنَّةَ"۔ ''اللہ تعالیٰ تجھ کو اس کے عوض جنت میں باغ دے گا۔''

ابوالدحداح رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھ کر اپنے اس بڑے عمدہ باغ میں پہنچے جسے خدا تعالیٰ کی نذر کر آئے تھے۔ ابوالدحداح رضی اللہ عنہ کی بیوی ام دحداح اور بچے اسی باغ میں تھے اور پھل کھا رہے تھے اور درختوں کے سایہ میں کھیل رہے تھے ابوالدحداح رضی اللہ عنہ باغ میں داخل ہوئے اور بیوی (ام دحداح رضی اللہ عنہا) سامنے آئیں۔ ابولدحداح رضی اللہ عنہ نے یہ شعر پڑھنے شروع کیے:

هَدَاكِ رَبِّیْ سُبُلَ الرَّشَادِ اِلٰی سَبِیْلِ الْخَیْرِ وَالسَّدَادِ

''اللہ تعالیٰ تجھ کو رشد اور ہدایت اور خیر اور صواب کے راستے پر چلائے۔''

وَبِیْنِیْ مِنَ الْحَائِطِ بِالْوِدَادِ فَقَدْ مَضٰی قَرْضًا اِلَی التَّنَادِ

''اس باغ سے فرحت اور مسرت کے ساتھ ابھی علیحدہ ہو جاؤ اور باہر چلی جاؤ۔ یہ باغ اللہ تعالیٰ کو قیامت تک کے لیے قرض دیدیا ہے۔''

اَقْرَضْتُهُ اللّٰهَ عَلٰی اعْتِمَادِیْ بِالطَّوْعِ مِنِّیْ وَلَا ارْتِدَادِ
اِلَّا رَجَاءَ الضِّعْفِ فِی الْمَعَادِ فَارْتَحِلِیْ بِالنَّفْسِ وَالْاَوْلَادِ

''یہ باغ میں نے اللہ کو نہایت شوق اور رغبت کے ساتھ قرض دیا ہے جس کا نہ کوئی احسان ہے اور نہ جس کو واپس لینا ہے صرف اضعافا مضاعفہ اجر اور ثواب کی امید پر قرض دیا ہے لہٰذا اسی وقت تو خود مع بچوں کے باغ سے باہر نکل جا اب یہ باغ

خدا تعالیٰ کا ہو چکا ہے ہمارا نہیں رہا۔''

وَالْبِرُّ لَا شَكَّ فَخَيْرُ زَادٍ　قَدَّمَهُ الْمَرْءُ اِلَى الْمَعَادِ

''اور آخرت کا بہترین توشہ وہ خدا کی راہ میں نیکوئی ہے یعنی اپنی محبوب چیز کو خدا کی راہ میں دے دینا ہے کما قال تعالیٰ: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾۔

ام دحداح رضی اللہ عنہا نے شوہر کا یہ کلام سنتے ہی اول تو مبارک باد دی اور یہ کہا:

''رَبِحَ بَيْعُكَ بَارَكَ اللهُ لَكَ فِيْمَا اشْتَرَيْتَ''۔ ''تیری تجارت نفع مند ہوئی اللہ تعالیٰ برکت دے اس میں جو تو نے خریدا ہے۔''

بعد ازاں شوہر کی نظم کا جواب نظم میں دیا اور یہ شعر پڑھنے شروع کیے:

بَشَّرَكَ اللهُ بِخَيْرٍ وَفَرَحْ　مِثْلُكَ اَدّٰى مَالَدَيْهِ وَنَصَحْ

''تجھ کو خیر اور فرحت کی بشارت ہو تجھ جیسا ہی ایسے حوصلے کے کام کرتا ہے۔''

قَدْ مَتَّعَ اللهُ عِيَالِيْ وَمَنَحْ　بِالْعَجْوَةِ السَّوْدَاءِ وَالزَّهْوِ الْبَلَحْ

''اللہ تعالیٰ نے میرے بچوں کو قسم قسم کی کھجوریں دی ہیں۔ اگر ایک باغ خدا کو دے دیا تو کیا ہوا۔''

وَالْعَبْدُ يَسْعٰى وَلَهُ مَا قَدْ كَدَحْ　طُوْلَ اللَّيَالِيْ وَعَلَيْهِ مَا اجْتَرَحْ

بندہ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ اپنی ہی منفعت اور آخرت کی درستی کے لیے کرتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کو کوئی حاجت نہیں نیکی سے بندہ کو ثواب ملتا ہے اور گناہ کا وبال اس پر پڑتا ہے۔''

بعد ازاں ام دحداح رضی اللہ عنہا بچوں کی طرف متوجہ ہوئیں بچے جو پھل دامنوں میں لے رہے تھے وہ دامن جھٹک دیے اور جو کھجوریں بچوں کے منہ میں تھیں وہ انگلی ڈال کر نکال دیں اور بچوں سے کہا کہ اس باغ سے نکلو اور اسی وقت دوسرے باغ میں منتقل ہو گئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا:

''كَمْ مِنْ عِذْقٍ رَدَاحٍ وَدَارٍ فَيَاحٍ لِاَبِي الدَّحْدَاحِ۔''(تفسیر قرطبی: ۲۳۸/۳)

''نہ معلوم ابوالدحداح رضی اللہ عنہ کے لیے آخرت میں کتنے بیشمار کھجور کے لمبے لمبے درخت ہیں اور کتنے وسیع اور کشادہ مکان ہیں۔''

ف ۳:...... قرض دینے میں بڑا اجر عظیم ہے مسلمان کی پریشانی اس سے دور ہوتی ہے۔ سنن ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے شب معراج میں جنت کے دروازہ پر لکھا ہوا دیکھا:

''الصدقة بعشر امثالها والقرض بثمانية عشر۔'' ''صدقہ کا اجر دس گونہ ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔''

میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے قرض کو صدقہ سے افضل قرار دیا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا سائل سوال کرتا ہے اور اس کے پاس کچھ ہوتا ہے اور قرض مانگنے والا بغیر حاجت کے قرض نہیں مانگتا۔ (تفسیر قرطبی: ۲۴۰/۳)

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ

کیا نہ دیکھا تو نے ایک جماعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے بعد ف۱ جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے مقرر کردو

تو نے نہ دیکھی ایک جماعت بنی اسرائیل میں، موسیٰ کے بعد ؟ جب کہا اپنے نبی کو، کھڑا کر دے

لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ

ہمارے لئے ایک بادشاہ تاکہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں پیغمبر نے کہا کیا تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر حکم ہو تم کو لڑائی کا

ہم کو ایک بادشاہ، کہ ہم لڑائی کریں اللہ کی راہ میں، وہ بولا کہ یہ بھی توقع ہے تم سے، کہ اگر حکم ہو تم کو لڑائی کا

اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِیَارِنَا

تو تم اس وقت نہ لڑو وہ بولے ہم کو کیا ہوا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے

تب نہ لڑو۔ بولے ہم کو کیا ہوا ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں، اور ہم کو نکال دیا ہے ہمارے گھر سے،

وَاَبۡنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ

اور بیٹوں سے پھر جب حکم ہوا ان کو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے مگر تھوڑے سے ان میں کے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے

اور بیٹوں سے۔ پھر جب حکم ہوا ان کو لڑائی کا، پھر گئے، مگر تھوڑے ان میں سے۔ اور اللہ کو معلوم ہیں

بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمۡ نَبِیُّهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا

گناہ گاروں کو ف۲ اور فرمایا ان سے ان کے نبی نے بیشک اللہ نے مقرر فرما دیا تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ کہنے لگے

گنہ گار۔ اور کہا ان کو ان کے نبی نے، اللہ نے کھڑا کردیا تم کو طالوت بادشاہ۔ بولے

اَنّٰی یَکُوۡنُ لَهُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَنَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡهُ وَلَمۡ یُؤۡتَ سَعَةً مِّنَ

کیونکر ہوسکتی ہے اس کو حکومت ہم پر اور ہم زیادہ مستحق ہیں سلطنت کے اس سے اور اس کو نہیں ملی کشائش

کہاں ہوگی اس کو سلطنت ہمارے اوپر اور ہمارا حق زیادہ ہے سلطنت میں اس سے اور اس کو ملی نہیں کشایش

الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰىهُ عَلَیۡکُمۡ وَزَادَهٗ بَسۡطَةً فِی الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ؕ

مال میں پیغمبر نے کہا بیشک اللہ نے پسند فرمایا اس کو تم پر اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں

مال کی کہا اللہ نے اس نے اس کو پسند کیا تم سے اور زیادہ کشایش دی عقل میں اور بدن میں

ف۱ اس قصہ سے حق تعالیٰ کا بسط وقبض جو ابھی مذکور ہوا خوب ثابت ہوتا ہے یعنی فقیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا اور ضعیف کو قوی اور قوی کو ضعیف کر دینا۔

ف۲ حضرت موسیٰ کے بعد کچھ عرصہ تک بنی اسرائیل کا کام درست رہا پھر جب ان کی نیت بگڑی تب ان پر ایک غنیم کافر بادشاہ جالوت نام مسلط ہوا ان کو شہر سے نکال دیا اور لوٹا اور ان کو پکڑ کر بندہ بنایا۔ بنی اسرائیل بھاگ کر بیت المقدس میں جمع ہوئے اس وقت حضرت شمویئل علیہ السلام پیغمبر تھے ان سے درخواست کی کہ کوئی =

وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ

اور اللہ دیتا ہے ملک اپنا جس کو چاہے اور اللہ ہے فضل کرنے والا سب کچھ جاننے والا ف۱ اور کہا بنی اسرائیل سے ان کے نبی نے کہ طالوت کی سلطنت

اور اللہ دیتا ہے اپنی سلطنت جس کو چاہے اور اللہ کشایش والا ہے سب جانتا۔ اور کہا ان کو اُن کے نبی نے نشان ان

مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ

کی نشانی یہ ہے کہ آوے تمہارے پاس ایک صندوق کہ جس میں تسلی خاطر ہے تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جو چھوڑ گئی تھی

کی سلطنت کا یہ کہ آوے تم کو صندوق جس میں ہے دل جمعی تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی چیزیں جو چھوڑ گئے

مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

موسیٰ اور ہارون کی اولاد اٹھا لادیں گے اس صندوق کو فرشتے بیشک اس میں پوری نشانی ہے تمہارے واسطے اگر تم

موسیٰ اور ہارون کی اولاد، اٹھا لادیں اس کو فرشتے اس میں نشانی پوری ہے تم کو اگر

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ ع ۳۲ ۶ ۱۶

یقین رکھتے ہو ف۲ پھر جب باہر نکلا طالوت فوجیں لے کر کہا بیشک اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے ایک نہر سے سو جس نے

یقین رکھتے ہو۔ پھر جب باہر ہوا طالوت فوجیں لے کر کہا اللہ تم کو آزماتا ہے ایک نہر سے۔ پھر جس نے

شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً

پانی پیا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے مگر جو کوئی بھرے ایک چلو

پانی پیا اس کا، وہ میرا نہیں۔ اور جس نے اسکو نہ چکھا وہ ہے میرا، پھر جو کوئی بھر لے ایک چُلو

بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ

اپنے ہاتھ سے پھر پی لیا سب نے اس کا پانی مگر تھوڑوں نے ان میں سے پھر جب پار ہوا طالوت اور ایمان والے ساتھ اس کے

اپنے ہاتھ سے پھر پی گئے اس کا پانی مگر تھوڑے ان میں۔ پھر جب پار ہوا وہ اور ایمان والے اس کے ساتھ

= بادشاہ ہم پر مقرر کرو کہ اس کے ساتھ ہو کر ہم جہاد کریں فی سبیل اللہ۔

ف۱ طالوت کی قوم میں آگے سے سلطنت نہ تھی غریب محنتی آدمی تھے ان (بنی اسرائیل) کی نظر میں سلطنت کے قابل نظر نہ آئے، اور بوجہ مال و دولت اپنے آپ کو سلطنت کے لائق خیال کیا۔ نبی نے فرمایا کہ سلطنت کسی کا حق نہیں اور سلطنت کی بڑی لیاقت ہے عقل اور بدن میں زیادتی اور وسعت ہوئی جس میں طالوت تم سے افضل ہے۔

فائدہ: بنی اسرائیل نے جب یہ سنا تو پھر کہا پیغمبر سے کہ اس کے سوا کوئی اور دلیل بھی ان کی بادشاہت پر دکھلا دو تاکہ ہمارے دل میں کوئی اشتباہ نہ رہے۔ نبی نے دعا کی جناب الٰہی میں اور طالوت کی سلطنت کی دوسری نشانی بیان فرمادی گئی۔

ف۲ بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا اس میں تبرکات تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کے۔ بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے اللہ اس کی برکت سے فتح دیتا جب جالوت غالب آیا ان پر تو یہ صندوق بھی وہ لے گیا تھا جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ وہ کافر جہاں صندوق رکھتے وہیں =

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ

تو کہنے لگے طاقت نہیں ہم کو آج جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی کہنے لگے وہ لوگ جن کو خیال تھا کہ ان کو

کہنے لگے توت نہیں ہم کو آج جالوت کی اور اس کے لشکروں کی بولے جن کو خیال تھا کہ ان کو

مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ

اللہ سے ملنا ہے بارہا تھوڑی جماعت غالب ہوئی ہے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے

ملنا ہے اللہ سے بہت جگہ جماعت تھوڑی غالب ہوئی ہے جماعت بہت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ ساتھ ہے

الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا

ساتھ ہے ف۱ اور جب سامنے ہوئے جالوت کے اور اس کی فوجوں کے تو بولے اے رب ہمارے ڈال دے ہمارے دلوں میں صبر

ٹھہرنے والوں کے۔ اور جب سامنے ہوئے جالوت کے اور اس کی فوجوں کے بولے اے رب ہمارے ڈال دے ہم میں جتنی مضبوطی ہے

وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣ

اور جمائے رکھ ہمارے پاؤں اور مدد کر ہماری اس کافر قوم پر پھر شکست دی مومنوں نے جالوت کے لشکر کو اللہ کے حکم سے

اور ٹھہرا ہمارے پاؤں اور مدد کر ہماری اس کافر قوم پر پھر شکست دی ان کو اللہ کے حکم سے

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ

اور مار ڈالا داؤد نے جالوت کو اور دی داؤد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا ان کو جو چاہا اور اگر نہ ہوتا دفع کرا دینا

اور مارا داؤد نے جالوت کو اور دی اس کو اللہ نے سلطنت اور تدبیر اور سکھایا اس کو جو چاہا۔ اور اگر دفع نہ کروا دے

اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى

اللہ کا ایک کو دوسرے سے تو خراب ہوجاتا ملک لیکن اللہ بہت مہربان ہے

اللہ لوگوں کو ایک کو ایک سے تو خراب ہوجاوے ملک لیکن اللہ فضل رکھتا ہے

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

جہان کے لوگوں پر ف۲ یہ آیتیں اللہ کی ہیں ہم تجھ کو سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک اور تو بیشک ہمارے رسولوں میں ہے ف۳

جہان کے لوگوں پر۔ یہ آیتیں اللہ کی ہیں ہم تجھ کو سناتے ہیں تحقیق۔ اور تو بے شک رسولوں میں ہے۔

▪ وبا اور بلا آئی پانچ شہر ویران ہوگئے ناچار ہو کر دو بیلوں پر اس کو لاد کر ہانک دیا فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طالوت کی بادشاہت پر یقین لائے اور طالوت نے جالوت پر لوج کشی کی اور موسم نہایت گرم تھا۔

ف۱ ہوس سے طالوت کے ساتھ چلنے کو سب تیار ہوگئے طالوت نے کہہ دیا کہ جو کوئی جوان زور آور اور بے فکر ہو، چلے ایسے بھی اسی (۸۰) ہزار نکلے پھر طالوت نے ان کو آزمانا چاہا ایک منزل میں پانی نہ ملا دوسری منزل میں ایک نہر ملی طالوت نے حکم کر دیا جو ایک چلو سے زیادہ پانی پیوے وہ میرے ساتھ نہ چلے صرف ▪

قصہ طالوت وجالوت

برائے ترغیب جہاد وقتال ورعایت آداب جہاد

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی... الی... وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾

ربط:...... حق جل شانہ ان آیات میں بنی اسرائیل کا دوسرا قصہ بیان فرماتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تخمیناً اور اندازاً گیارہ ❶ سو سال پہلے گذرا ہے۔ اس قصہ سے جہاد وقتال کی ترغیب اور آداب جہاد کی تعلیم اور صبر وتحمل کی تلقین مقصود ہے۔ نیز گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کا قابض اور باسط ہونا مذکور ہوا ﴿وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾۔ اب ان آیات اور اس قصہ میں جو یہاں مذکور ہوا اس کے قبض اور بسط کی دلیل ہے کہ وہ مالک الملک ایسا قابض اور باسط ہے کہ جب چاہتا ہے فقیر کو بادشاہ اور بادشاہ کو فقیر بنا دیتا ہے۔ بادشاہت کا دینا اور چھیننا سب اس کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کیا اے مخاطب! تو نے بنی اسرائیل کے سر برآوردہ ❷ اور اشراف لوگوں کی جماعت کو نہیں دیکھا جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ایک زمانہ بعد اپنے زمانہ کے ایک نبی جن کا نام شمویل ❸ تھا یہ کہا آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے جس کے ساتھ ہو کر ہم راہ خداوندی میں جہاد وقتال کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ایک مدت تک بنی اسرائیل کا حال درست رہا اور ان کا کام بنا رہا۔ رفتہ رفتہ جب وہ احکام تورات سے دور ہو گئے تب اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط کیا اور عمالقہ ان پر غالب آ گئے اور جالوت جو کافر بادشاہ تھا اس نے بنی اسرائیل کے بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا اور سینکڑوں بچوں کو پکڑ کر لے گیا اور ان کو غلام اور لونڈی

= تین سو تیرہ ان کے ساتھ رہ گئے اور سب جدا ہو گئے جنہوں نے ایک چلو سے زیادہ نہ پیا ان کی پیاس بجھی اور جنہوں نے زیادہ پیا ان کو اور پیاس زیادہ لگی اور آگے نہ چل سکے۔

ف ۲ جب سامنے ہوئے جالوت کے یعنی وہی تین سو تیرہ آدمی اور انہی تین سو تیرہ میں حضرت داؤد کے والد اور ان کے چھ بھائی اور خود حضرت داؤد بھی تھے حضرت داؤد کو راہ میں تین پتھر ملے اور بولے کہ اٹھا لے ہم کو ہم جالوت کو قتل کریں گے جب مقابلہ ہوا جالوت خود باہر نکلا اور کہا میں اکیلا تم سب کو کافی ہوں میرے سامنے آتے جاؤ حضرت شمویل نے حضرت داؤد کے باپ کو بلایا کہ اپنے بیٹے مجھ کو دکھلا اس نے چھ بیٹے دکھائے جو قد آور تھے حضرت داؤد کو نہیں دکھایا ان کا قد چھوٹا تھا اور بکریاں چراتے تھے پیغمبر نے ان کو بلوایا اور پوچھا کہ تو جالوت کو مارے گا انہوں نے کہا ماروں گا پھر جالوت کے سامنے گئے اور انہی تینوں پتھروں کو فلاخن میں رکھ کر مارا جالوت کا صرف ماتھا کھلا تھا اور تمام بدن لوہے میں غرق تھا تینوں پتھر اس کے ماتھے پر لگے اور پیچھے کو نکل گئے۔ جالوت کا لشکر بھاگا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی پھر طالوت نے حضرت داؤد سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا اور طالوت کے بعد یہ بادشاہ ہوئے اس سے معلوم ہو گیا کہ حکم جہاد ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور اس میں اللہ کی بڑی رحمت اور احسان ہے۔ نادان کہتے ہیں کہ لڑائی نبیوں کا کام نہیں۔

ف ۳ یہ قصہ جو بنی اسرائیل کا گزرا یعنی ہزاروں کا نکلنا اور ان کا دفعۃً مرنا اور جینا اور طالوت کا بادشاہ ہونا یہ سب اللہ کی آیتیں ہیں جو تجھ کو سنائی جاتی ہیں اور تم بیشک اللہ کے رسولوں میں ہو یعنی جیسے پہلے پیغمبر ہو چکے ہیں ویسے ہی تم بھی یقیناً رسول ہو کہ ان قصص قرون ماضیہ کو ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہو حالانکہ نہ کسی کتاب میں آپ نے دیکھا اور نہ کسی آدمی سے سنا۔

---

❶ کمافی التفسیر الحقانی ۱۲

❷ یہ ترجمہ لفظ ملأ کا ہے اس لیے کہ ملأ لغت میں اشراف اور سرداروں کی جماعت کو کہتے ہیں جو اپنی عظمت اور ہیبت سے مجلس کو بھر دے۔

❸ جمہور کا قول یہی ہے کہ ان کا نام شمویل علیہ السلام تھا بعض کہتے ہیں کہ وہ نبی شمعون علیہ السلام تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام یوشع بن نون علیہ السلام تھا اور یہ صحیح نہیں اس لیے کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے قریب زمانہ کا ہے اور یوشع بن نون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے تھے۔ ۱۲

بنالیا۔ اور بنی اسرائیل سے توریت بھی چھین کر لے گئے جب ذلت اور رسوائی یہاں تک پہنچ گئی تو بنی اسرائیل کے اشراف اور سرداروں کو خیال پیدا ہوا کہ اس ذلت کا کوئی مداوی ہو اس لیے اس اپنے نبی سے جن کا نام شمویل علیہ السلام تھا بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی حضرت شمویل علیہ السلام نے ان کو یہ جواب دیا کہ کیا تم سے اس کی توقع ہے کہ اگر تم کو جہاد وقتال کا حکم ہو جائے تو نہ لڑو یعنی تمہاری حالت سے مجھے توقع نہیں کہ اگر تم پر جہاد وقتال فرض ہو جائے تو تم بادشاہ کے ساتھ ہو کر جہاد وقتال کرو۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ ہمیں کیا ہوا کہ خدا کی راہ میں جہاد وقتال نہ کریں اور حالانکہ جہاد کے لیے اس وقت ایک خاص داعیہ اور سبب بھی موجود ہے وہ یہ کہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں سے جدا کر دیے گئے۔ غرض یہ کہ اس طرح لوگوں نے جہاد پر اپنی پختگی اور آمادگی کو ظاہر کیا پس جب انکے اصرار اور اظہار پختگی کے بعد ان پر جہاد وقتال فرض کیا گیا تو سوائے چند آدمیوں کے سب پھر گئے اور وہ چند آدمی وہ تھے کہ جو نہر سے پار اُترے جس کا بیان عنقریب آئے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں اور ستم گاروں کو خوب جانتا ہے ظلم اور معصیت آدمی کو بزدل بنا دیتی ہے۔ اور ظلم وستم کی اصل جڑ نبی پر اعتراض کرنا ہے جس نے نبی کی بات کو بے چون وچرا قبول کیا اس نے اپنی جان پر رحم کیا اور جس نے نبی کی بات پر اعتراض کیا اس نے اپنی جان پر ظلم عظیم کیا۔ چنانچہ جس وقت ان کے نبی نے ان کے جواب میں کہا کہ (اول) تو یہ ہے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یعنی تمہاری عزت اور سرداری کے حصول کے لیے طالوت بادشاہ مقرر کیا ہے سنتے ہی نبی پر اعتراضات شروع کیے اور یہ کہا کہ طالوت کو ہم پر حکومت اور سلطنت کا کیا حق حاصل ہے۔ طالوت ایک فقیر آدمی ہے قوم کا سقاء یا رنگریز ہے۔ شاہی خاندان سے نہیں اور ہم سلطنت کے اُس سے زیادہ مستحق ہیں۔ کیونکہ ہم شاہی خاندان سے ہیں اس لیے کہ ہم یہودا کی اولاد ہیں جس میں بادشاہت چلی آرہی ہے اور علاوہ ازیں طالوت کو مال دولت کی فراخی اور فراوانی بھی حاصل نہیں اور ہم دولت مند اور اصحابِ ثروت ہیں۔ لہٰذا ایسے شخص کو کہ جس کو نہ خاندانی وجاہت حاصل ہو اور نہ مالی عزت حاصل ہو بادشاہ بنانا کسی طرح مناسب نہیں۔ اللہ کے نبی نے ان کے اعتراض کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تمہارے یہ اعتراض سب مہمل اور لایعنی ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے طالوت کو محض تمہارے نفع اور فائدہ کے لیے پسند کیا ہے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جس کو سلطنت کے لیے پسند فرمائیں گے اس سے بڑھ کر کوئی شخص سلطنت اور حکمرانی کا اہل نہیں ہو سکتا اور خصوصاً جب کہ ارادۂ خداوندی تمہارے نفع اور خیر کا ہے جیسا کہ لفظ "لَكُمْ" سے صاف ظاہر ہے تو ایسی صورت میں تو کسی شر اور فساد کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ معلوم ہوا کہ طالوت کی سلطنت تمہارے لیے سراپا خیر و برکت ہوگی اور دینی اور دنیوی ہر اعتبار سے تمہارے لیے باعثِ عزت ہوگی۔

حق جل شانہ جب کسی قوم کی تباہی اور بربادی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس پر ظالموں اور ستم گاروں کو حاکم بناتے ہیں اور جب کسی قوم کی فلاح اور بہبودی کا ارادہ فرماتے ہیں تو پاکیزہ اور پسندیدہ حکمراں ان کے لیے مقرر فرماتے ہیں۔ غرض یہ کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری خیر اور نفع اور مصلحت کے لیے پسند کیا ہے اور تم اپنی مصلحتوں کو کماحقہ نہیں سمجھ سکتے اس لیے اس انتخاب خداوندی میں تم کو خدشہ اور وسوسہ نہ کرنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ سلطنت اور بادشاہت کا اصل دارومدار عقلِ سلیم اور جسم سلیم پر ہے اور حسب ونسب اور مال ودولت پر نہیں جس شخص کے قوائے عقلیہ اور اکیہ اور قوائے جسمانیہ صحیح اور تندرست

ہوں وہی بادشاہ بنائے جانے کا مستحق ہے اور یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ نے طالوت کو عطا کی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو علم وفہم اور عقل و دانش میں وسعت اور فراخی عطاء کی ہے اور قوت جسمانیہ اور بدنیہ میں بھی اس کو زیادتی عطا فرمائی ہے اور بادشاہ ہونے کے لیے انہی دو صفتوں کی ضرورت ہے علم اور فہم سے ملکی انتظام پر قدرت ہوگی اور بدنی قوت اور جسامت شجاعت اور بہادری کی علامت ہے اور ظاہر ہے کہ جب فہم و فراست کے ساتھ شجاعت بھی مل جائے گی تو کارخانہ سلطنت نہایت خیر وخوبی کے ساتھ چلے گا۔ اس لیے کہ سلطنت چلانے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ بادشاہ کی عظمت اور ہیبت لوگوں کے قلوب میں راسخ ہو۔ اگر دلوں میں بادشاہ کی عظمت اور ہیبت نہ ہو تو لوگ اطاعت اور فرمانبرداری نہ کریں گے اور کارخانہ سلطنت نہ چلے گا اور حقیقی عظمت اور ہیبت کا مدار فہم و فراست اور قوت و شجاعت پر ہے اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ نے طالوت کو عطاء کی ہیں بالیقین علم اور فہم میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور قوتِ جسمانیہ کا یہ حال تھا کہ طالوت تمام بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ خوبصورت اور قد آور اور بہادر تھے اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طالوت "مُلْهَمٌ مِنَ اللّٰهِ" بھی تھے یعنی صاحب الہام بھی تھے اس لیے کہ قرآن کریم میں جس کسی کو شانِ اصطفاء سے حصہ ملا ہے وہ ضرور صاحب الہام اور صاحب کشف و کرامت ہوا ہے اور "فِي الْعِلْمِ" کا لفظ اپنے عموم اور اطلاق کی بناء پر علم ظاہری اور علم باطنی اور علم شریعت اور علم سلطنت اور علم سیاست سب کو شامل ہے کیونکہ ایسی سلطنت جس سے دین اور دنیا دونوں ہی درست ہوں وہ جب ہو سکتی ہے کہ جب بادشاہ اوصافِ مذکورہ کا حامل ہو۔ اور تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہیں اس کی عطاء اور بخشش کے لیے کسی اہلیت اور قابلیت کی شرط نہیں بلکہ اہلیت قابلیت کے لیے اس کی عطاء شرط ہے کسی کی مجال کیا ہے جو اس خداوند ذوالجلال سے سوال کر سکے وہ مالک مطلق ہیں۔ جس کو چاہتے ہیں بادشاہی عطا کرتے ہیں اور اگر وہ شخص بادشاہت کی ذرہ برابر لیاقت بھی نہ رکھتا ہو تو اس کو سلطنت کی لیاقت اور قابلیت عطا فرما دیتے ہیں اور غیب سے اس کی مدد فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت اور کشائش والے ہیں اس کے خزائن کی کوئی حد اور نہایت نہیں انہیں کسی فقری کو امیر بنا دینا کیا مشکل ہے اور سب کچھ جاننے والے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ کون بادشاہت کے لائق ہے اور کون اس کے لائق نہیں حق تعالیٰ نے اس آیت میں طالوت کی بادشاہی کے چار سبب بیان کیے: اولؔ اس کی خداداد صلاحیتیں جس کو اصطفاء سے تعبیر کیا۔ دومؔ وسعت علم جس پر حکمرانی اور تدبیر ملکی کا دارومدار ہے۔ سومؔ توانائی جسم جو شجاعت اور ہیبت اور قدرت علی المدافعت کا موجب ہے۔ چہارمؔ تائید غیبی جس کو ﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور ﴿اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖ﴾ الخ سے ظاہر فرمایا۔

چونکہ بنی اسرائیل کے سرداروں نے طالوت کے بادشاہ بنانے کو بہت بعید سمجھا اس لیے ان کے رد میں قدرے تفصیل فرمائی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) کہ بادشاہت کا اصلی اور حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی عطاء اور بخشش اور اس کا اصطفاء اور پسندیدگی ہے خدا تعالیٰ جس کو بادشاہت کے لیے پسند فرما لے وہی بادشاہ ہے اور خدا تعالیٰ جس کو پسند فرمائے وہ کبھی ناپسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

(۲) اور اگر تمہاری نظر ظاہری اسباب پر ہے تو سمجھ لو کہ سلطنت کا مدار حسب ونسب اور مال و دولت پر نہیں اس لیے کہ مال آنے جانے والی چیز ہے صبح آتا ہے اور شام جاتا ہے۔ بلکہ سلطنت کا ظاہری سبب یہ ہے کہ علم اور فہم ہو اور اس کے

ساتھ قوت بدنیہ ہوتا کہ اس قوت جسمانیہ سے علم اور فہم کے موافق عمل کرنے کی قدرت حاصل ہو سکے ورنہ علم بغیر قدرت اور قوت کے بے کار ہے خصوصاً کارخانۂ سلطنت محض علم سے بدون قدرت کے نہیں چلتا۔ اور تیسرے یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے بعد کسی کو مجال دم زدنی نہیں۔ وہ تمام مصلحتوں کو تم سے زیادہ جانتا ہے اور وہ ارحم الراحمین ہے وہ تم پر تم سے زیادہ مہربان ہے۔ اس لیے اب تم کو طالوت کی بادشاہت میں کوئی حجت نکالنا روا اور زیبا نہیں۔ مگر یہ ظالم ① کب خاموش ہونے والے تھے اللہ کے نبی نے ان ظالموں کے اعتراض کا نہایت شافی اور کافی جواب دے دیا لیکن یہ لوگ اپنے وسوسوں کی وادی تیہ میں بھٹکتے رہے اور بالآخر ان لوگوں نے حضرت شمویل علیہ السلام سے یہ کہا کہ اچھا ہمیں طالوت کی بادشاہت اور اُن کے برگزیدہ ہونے کی کوئی ظاہری نشانی بتلایئے جسے دیکھ کر ہمیں ان کے بادشاہ ہونے کا بالبداہت یقین آ جائے اور قلب مطمئن ہو جائے اس وقت ان کے پیغمبر نے یہ فرمایا کہ تحقیق طالوت کے من جانب اللہ بادشاہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس بلا کسی ظاہری سبب کے وہ صندوق آ جائے گا جو تم سے چھن گیا تھا۔ اس صندوق کے اس طرح آنے میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری دل جمعی اور سکونِ قلب اور آرام دل کا سامان ہوگا اور اس صندوق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان کے کچھ تبرکات بھی ہوں گے جن کو وہ چھوڑ گئے ہیں، ان تبرکات کا تمہیں مل جانا صد ہزار خیرات و برکات کا موجب ہوگا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ اور سدی اور عکرمہ اور ربیع بن انس اور ابو صالح رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ اس تابوت میں توریت کی دو تختیاں اور کچھ ان تختیوں کے ٹکڑے تھے جو ٹوٹ گئی تھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے عصا اور ان کے عمامے اور جوتے وغیرہ تھے۔ اور اس صندوق کی آمد بھی عجیب شان سے ہوگی۔ اور وہ یہ کہ فرشتے اس تابوت کو اٹھا کر لائیں گے اور طالوت کے سامنے لا کر رکھ دیں گے تحقیق اس صندوق کے اس طرح آنے میں تمہارے لیے ایک نشانی ہوگی جو طالوت کی بادشاہت اور میری نبوت کی صداقت کی دلیل ہوگی۔ اگر تم باور کرو۔ صندوق کا اس خارقِ عادت طریق پر آنا جس طرح طالوت کی بادشاہت کی دلیل ہوگا، اسی طرح حضرت شمویل علیہ السلام کی نبوت اور صداقت کی دلیل ہوگا کہ اللہ کے نبی نے جس طرح خبر دی تھی اسی طرح ظہور ہوا اور فرشتوں نے وہ تابوت لا کر طالوت کے سامنے رکھ دیا۔ بنی اسرائیل خوش ہو گئے اور ان کو بادشاہ مان لیا اور سب کے سب جہاد کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ پس جب طالوت ان فوجوں کو لے کر شہر سے باہر نکلا تو فوجوں سے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ ایک نہر سے تمہارے صبر اور تحمل کی آزمائش فرمائیں گے ان لوگوں نے اللہ کے نبی علیہ السلام پر اعتراضات کیے اور طالوت کی بادشاہت کی نشانی طلب کی اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک آزمائش میں مبتلا کیا۔ بظاہر یہ ابتلاء اور آزمائش کا حکم بذریعہ وحی حضرت شمویل علیہ السلام پر نازل ہوا اور پھر حضرت شمویل علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق طالوت نے اس حکم کا اعلان کیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت طالوت کو اس کا الہام ہوا ہو اس لیے کہ حضرت طالوت خدا کے پسندیدہ تھے اگرچہ نبی نہ تھے، مگر ولی ضرور تھے۔ الہام یا خواب کے ذریعہ سے اس کا القاء ہونا کوئی مستبعد نہیں اور ولی کا الہام اگرچہ فی حد ذاتہ ظنی ہے مگر جب نبی اس کی تصدیق کر دے تو وہ قطعی ہو جاتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ایسے عظیم الشان امر کے متعلق طالوت کو کوئی الہام ہوا اور اپنے اس الہام کا بغیر حضرت شمویل علیہ السلام کی تصویب اور اجازت کے اعلان کریں۔ نبی کی

① اس لفظ ظالم میں گزشتہ آیت ﴿وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ﴾ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

تصدیق اور تصویب تو بہت بڑی چیز ہے کسی چیز کو ہوتے دیکھ کر نبی کا انکار نہ کرنا یہ بھی اس امر کے جائز ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ اصطلاح شریعت میں اس کو تقریر نبوی کہتے ہیں۔ یعنی نبی کے سکوت اور عدم انکار نے اس امر کو جائز اور درست قرار دیا جو باجماع امت حجت ہے۔ اب آئندہ آیت میں اس امتحان کی تفصیل ہے۔ پس جو شخص اس نہر سے سیر ہو کر پانی پی لے گا اس کا میرے سے کوئی تعلق نہیں یعنی میرے گروہ سے نہیں رہا اور جس شخص نے اس کا مزہ بھی نہ چکھا یعنی پینا تو درکنار منہ سے بھی نہ لگایا تو وہ بلاشبہ میرے سے وابستہ ہے اور میرے خاص رفقاء اور ساتھیوں میں سے ہے مگر وہ شخص جو اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے سو میرے گروہ سے خارج نہ ہوگا۔ عزیمت اور اصل حکم تو یہی تھا کہ پانی کو بالکل نہ چکھتا۔ بمقدار ایک چلو کے رخصت ہے یعنی جس نے سیر ہو کر تو پانی نہیں پیا اور صرف جان بچانے کے لیے ہی برائے نام پی لیا تو وہ بھی فی الجملہ مقبول ہے اور غنیمت ہے پس جب اُس نہر پر پہنچے تو سب نے بے تحاشا اس نہر سے منہ لگا کر پانی پی لیا مگر تھوڑے آدمیوں نے جن کی تعداد تین سو تیرہ تھی انہوں نے عزیمت اور رخصت پر عمل کیا اور اجازت سے تجاوز نہ کیا۔ جن لوگوں نے چلو سے پانی پیا ان کی پیاس بجھ گئی اور ان کا دل قوی ہوگیا اور جن لوگوں نے زیادہ پیا وہ بزدل اور نامرد ہوگئے اور نہ ان کی پیاس بجھی اور نہ وہ اس قابل رہے کہ نہر سے پار ہوسکیں پس جب طالوت اور ان کے رفقاء مومنین نہر سے پار ہوگئے اور دیکھا کہ ہم ایک مٹھی بھر جماعت ہیں اور جالوت کا لشکر ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہے اس لیے بعض ضعیف القلب یہ کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ کی تاب نہیں۔ دشمن کی طاقت بہت ہے اور ہم بہت تھوڑے ہیں البتہ ان میں جو لوگ اولوالعزم اور اہل ہمت تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک دن خدا سے ملنا ہے اور اس کو منہ دکھانا ہے اور خدا تعالیٰ نے جو فتح اور نصرت کا وعدہ کیا ہے وہ بالکل حق ہے۔ ان لوگوں نے کمزوروں کو ہمت دلائی اور یہ کہا کہ گھبراؤ نہیں فتح و نصرت کا دارومدار قلت و کثرت پر نہیں بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ بہت تھوڑی اور چھوٹی سی جماعت بڑی سے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے غالب آئی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور خدا تعالیٰ جس کے ساتھ ہو وہ کبھی مغلوب نہیں ہوسکتا۔ اور جب جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلے کے لیے میدان میں نکلے تو اپنی ہمت اور شجاعت پر نظر نہیں بلکہ خداوند ذوالجلال کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ دعا مانگنی شروع کی اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کو پانی ● کی طرح بہادے کہ سر سے پیر تک صبر کے پانی میں نہا جائیں اور صبر کی برودت اور سکینت ہمارے ظاہر اور باطن میں سرایت کر جائے اور کافروں کے مقابلے میں ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما اور ہم کو فتح دے۔ پس اس صبر اور تحمل اور اللہ پر اعتماد اور توکل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تھوڑے آدمیوں نے جالوت کی فوجوں اور لشکروں کو اللہ کی تائید سے شکست دی اور داود علیہ السلام نے جو اس وقت اپنے والد اور چھ بھائیوں کے لشکر میں تھے اور ابھی تک اُن کو نبوت نہیں ملی تھی جالوت کو قتل کر ڈالا۔ داود علیہ السلام اپنے سب بھائیوں میں چھوٹے تھے جب میدان کارزار سامنے آیا اور جالوت نہایت کروفر کے ساتھ زرہ اور خود پہن کر میدان میں آیا اور بنی اسرائیل سے مبارز اور مقابل طلب کیا۔ حضرت داود علیہ السلام بغیر تلوار اور بغیر ہتھیار کے صرف تین پتھر لے کر اس کے مقابلہ کو نکلے۔ جب

● اشارہ اس طرف ہے کہ ﴿اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا﴾ میں استعارہ ہے۔ افراغ اصل میں پانی بہا دینے کو کہتے ہیں اور کلمہ "علی علینا" میں استعلاء کے لیے ہے یعنی وہ صبر ہماری کمزوری پر غالب آجائے۔ ۱۲

سامنے آئے توان پتھروں کوفلاخن میں رکھ کر جالوت کی پیشانی پر مارا۔ وہ پتھر جالوت کی گدی کی جانب سے نکل گئے۔ اور جالوت منہ کے بل زمین پر گر پڑا فوراً اُس کی تلوار نکال کر اس کا سر قلم کیا۔

کہا جاتا ہے کہ راستہ میں داود علیہ السلام کو ایک پتھر نے آواز دی۔

"یاداوٗد خذنی فبی تقتل جالوت۔" "اے داؤد! مجھ کو اٹھالو۔ میرے ذریعہ سے تم جالوت کو مارو گے۔"

پھر اسی طرح ایک اور پتھر نے آواز دی۔ اور پھر ایک اور پتھر نے آواز دی داؤد علیہ السلام نے تینوں پتھروں کو اپنے تھیلے میں ڈال لیا اور روانہ ہوئے۔ جب جالوت گھوڑے پر سوار ہو کر اور زرہ اور تلوار لگا کر میدان میں نکلا تو داود علیہ السلام فقط یہ تین پتھر لے کر آگے بڑھے اور یہ کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ مدد نہ کرے تو تلوار اور گھوڑا اور ہتھیار بھی بے کار ہے۔ جالوت نے داود علیہ السلام سے کہا کہ تم تو فقط پتھر لے کر میرے سامنے آرہے ہو جیسے کوئی کتے کو مارنے کے لیے نکلتا ہے۔ فرمایا تو کتے سے بھی بدتر ہے اور اللہ کا نام لے کر وہ تینوں پتھر جالوت کے مارے جو ماتھے میں لگے اور گدی کے پیچھے سے نکل گئے۔ (تفسیر قرطبی: ۳/۲۵۷)

طالوت نے اس خوشی میں اپنی بیٹی حضرت داؤد علیہ السلام کے نکاح میں دے دی اور پھر اللہ تعالیٰ نے طالوت کے مرنے کے بعد داؤد علیہ السلام کو سلطنت عطا کی اور طالوت کے مرنے کے بعد باتفاقِ بنی اسرائیل، داؤد علیہ السلام بادشاہ مقرر ہوئے۔ داود علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل کسی کی بادشاہت پر اتنے مجتمع نہیں ہوئے جتنا کہ داود علیہ السلام کی بادشاہت پر ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو سلطنت اور بادشاہت کے علم اور حکمت یعنی نبوت عطا کی اور داود علیہ السلام سے پہلے کبھی کسی آدمی میں سلطنت اور نبوت جمع نہیں ہوئیں۔ سلطنت شاہی خاندان میں رہتی تھی اور نبوت نبی کے خاندان میں رہتی تھی اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام کو جو امور چاہے سکھائے۔ جیسے بغیر آلات کے زرہیں بنانا سکھایا اور لوہے کو مثل موم کے اُن کے لیے نرم کردیا پس اپنے ہاتھ سے کام کرتے اور اس کی مزدوری کھاتے اور پرندوں اور چیونٹیوں کی بولی اور زبان سکھائی اور خوش آوازی عطا کی۔

ف:...... نبی اگرچہ نبی ہونے سے پہلے نبی نہیں ہوتا مگر ولی ضرور ہوتا ہے اور اولیاء کی کرامتیں حق ہیں جیسا کہ کتاب اللہ اور سنتِ متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ محض تین پتھروں سے جالوت کو مارنا یہ داود علیہ السلام کی کرامت تھی اور آئندہ نبوت کا ارہاص یعنی پیش خیمہ تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ کرامت نبی اکرم ﷺ کے اس معجزہ کا نمونہ تھی جو حضور ﷺ سے جنگِ حنین میں ظاہر ہوا کہ ایک مشتِ خاک سے ہوازن سراسیمہ ہو گئے۔ (تفسیر قرطبی: ۳/۲۵۸)

اور اسی صبر واستقلال کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک عظیم الشان سلطنت عطا کی جو داود علیہ السلام کی سلطنت کا نمونہ تھی۔

بیان حکمت مشروعیتِ جہاد

اب اس واقعۂ جہاد کے ذکر کے بعد جہاد کی عام حکمت اور مصلحت کو بیان فرماتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں یعنی کافروں کے شر اور فساد کو اپنے بعض خاص بندوں یعنی مومنین کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جائے اور کفر اور شرک غالب آجائے اور مسجدیں ویران ہو جائیں اور کوئی خدا کا نام لینے والا باقی نہ رہے لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں

تمام لوگوں پر۔ اس لیے اس نے تم پر جہاد فرض کیا تا کہ کفر کا فتنہ اور فساد دفع ہو اس لیے کہ کفر اور شرک سے بڑھ کر کوئی فتنہ اور فساد نہیں جہاد سے اسی فساد کا دفع کرنا اور اسی شر اور فتنہ کا ازالہ مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر مسلمانوں کو کافروں سے جہاد کا حکم نہ دیتے تو بڑا فساد پھیل جاتا۔ جہاد اسی فساد کی اصطلاح اور انسداد کے لیے مقرر ہوا ہے۔ اس لیے جہاد کو اللہ کا بڑا فضل سمجھو۔

اثباتِ رسالتِ محمدیہ

یہ واقعات جن کا ذکر کیا اللہ کی آیتیں ہیں جن کو سچائی کے ساتھ پڑھ کر ہم آپ کو سناتے ہیں جس میں ذرہ برابر شک نہیں۔ یہ واقعات جس طرح ہم نے بیان کیے اسی طرح حق اور صدق ہیں اہل کتاب جس طرح بیان کرتے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں۔ اور یہ تمام واقعات اللہ کی قدرت اور پھر آپ ﷺ کی نبوت کے دلائل ہیں کیونکہ ایسے قدیم زمانہ کے واقعات کا بغیر کسی سے پڑھے اور بغیر کسی سے سنے صحیح صحیح بیان کرنا بغیر وحی خداوندی کے ممکن نہیں۔ اور آپ بلاشبہ اللہ کے رسولوں میں سے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اپنے دشمنوں سے جہاد کا حکم دیا اور باوجود بے سروسامانی کے کافروں کے بڑے بڑے لشکروں کو اُن کے خدام اور غلاموں کے ہاتھ سے تہ وبالا کرایا۔ جہاد انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور وہ لوگ نادان ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جہاد و قتال نبیوں کا کام نہیں۔ جہاد ہمیشہ رہا ہے اگر جہاد نہ ہو تو مفسد لوگ ملک کو ویران کر دیں۔

الحمدللہ الذی بنعمته تتم الصالحات، والصلوة والسلام علی سید الموجودات وخلاصه الکائنات وعلی آله واصحابه وازواجه الطاهرات المطهرات۔

۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ بعد صلاۃ المغرب، جامعہ اشرفیہ لاہور۔

❁❁❁

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ

یہ سب رسول فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے کوئی تو وہ ہے کہ کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کیے بعضوں کے

یہ سب رسول بڑائی دی ہم نے ان میں ایک کو ایک سے کوئی ہے کہ کلام کیا اس سے اللہ نے اور بلند کیے بعضوں کے درجے

دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ

درجے اور دیئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح القدس یعنی جبرائیل سے ف۱ اور اگر اللہ چاہتا

اور دی ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو نشانیاں صریح اور زور دیا اس کو روح پاک سے۔ اور اگر چاہتا اللہ،

مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ

تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اسکے کہ پہنچ چکے ان کے پاس صاف حکم لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا پھر کوئی تو

نہ لڑتے ان کے پچھلے بعد اس کے کہ پہنچے ان کو صاف حکم، لیکن وہ پھٹ گئے پھر

ع مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا اور اگر چاہتا اللہ تو وہ باہم نہ لڑتے لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہے ف۲

کوئی ان میں یقین لایا، اور کوئی منکر ہوا۔ اور اگر چاہتا اللہ، نہ لڑتے، لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہے۔

ذکر فضائل رسل و بیان حال امم

قَالَ تَعَالٰی: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ... الی ... وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیت ﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ میں انبیاء ومرسلین علیہم السلام کا اور اُن کی امتوں کے معاملات کا ذکر فرمایا اور کافروں سے ان کے جہاد اور قتال کے واقعے اور ان کی بے مثال اور خارقِ عادت فتح ونصرت اور تائید غیبی کا ذکر کیا۔ اسی طرح اب آئندہ آیات میں رسل کے فضائل ودرجات اور ان کے کمالات اور معجزات کے ساتھ ان کی امتوں کے احوال اور انبیاء ورسل کے ساتھ ان کے اختلاف کو بیان فرماتے ہیں کہ باوجود آیات بینات اور دلائل واضحات کے دیکھ لینے کے پھر بھی ایمان نہ لائے اور حق سے اختلاف کیا اور انبیاء ورسل کی مخالفت کی اور حق کی دعوت اور تبلیغ میں مزاحم ہوئے اور اس لیے حق تعالیٰ نے ان کا شر اور فساد دفع کرنے کے لیے حضرات مرسلین علیہم السلام کو جہاد کا حکم دیا۔ اہل باطل کی طرف سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی مخالفت جہاد وقتال کی مشروعیت کا سبب بنی۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اُن کے اصحاب نے دین حق اور ہدایت کی

ف۱ یہ پیغمبر جن کا ذکر ہوا ان میں فضیلت دی ہم نے بعض کو بعض پر بعضے ان میں ایسے ہیں کہ ان سے بات کی خدا تعالیٰ نے جیسے آدم اور موسیٰ علیہما السلام اور بلند کیا بعضوں کا درجہ جیسے کوئی ایک قوم کا نبی کوئی ایک گاؤں کا کوئی ایک شہر کا کوئی تمام جہان کا جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عنایت ہوئے حضرت عیسیٰ کو کھلے معجزے جیسے احیائے موتی اور ابراء اکمہ اور ابرص وغیرہ اور قوت دی ان کو روح پاک یعنی حضرت جبرائیل کو ان کی مدد کو بھیج کر۔

ف۲ جو لوگ ان انبیاء پر ایمان لے آئے اور صاف حکم اور روشن نشانیاں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی دیکھ سن چکے اگر خدا چاہتا تو یہ باہم نہ لڑتے اور مخالفت نہ کرتے اور کوئی ان میں مومن اور کوئی کافر نہ ہوتا لیکن حق تعالیٰ مختار ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے کوئی فعل اس کا حکمت سے خالی نہیں۔

بقاء اور حفاظت کے لیے اور متقی اور پرہیزگاروں اور خدا کے پرستاروں کے تحفظ کے لیے جہاد کیا تا کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور اس کی نازل فرمودہ ہدی یعنی ہدایت اور اسکی ہدایت پر چلنے والے متقی اور پرہیزگار اور نمازگزار بندے کفار نابکار کی مزاحمت سے محفوظ اور مامون ہو جاویں اور کفر کی یہ مجال نہ رہے کہ وہ دین حق کی طرف نظر اٹھا سکے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ گزشتہ آیات میں کافروں سے جہاد وقتال کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں کافروں سے جہاد وقتال کا سبب بیان کیا گیا ہے وہ یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی مخالفت اور ان کی بے چون و چرا اطاعت سے سرتابی اور گردن کشی کی وجہ سے کافروں کی سرکوبی اور گردن کشی کا حکم نازل ہوا۔ اس تقریر سے ان شاء اللہ تعالیٰ ان آیات کا سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ کے ساتھ بھی ربط ظاہر ہو جائے گا۔ جو مزید غور و فکر کا بھی محتاج نہیں۔ اور آئندہ آیات یعنی ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ میں چونکہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر ہے جس میں جہاد میں مالی امداد کرنا بھی داخل ہے اس لیے ان آئندہ آیات کو بھی جس طرح گزشتہ آیات جہاد وقتال سے ربط ہے۔ اسی طرح ان آیات کو سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ سے بھی ربط ہے۔

اور ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ سے دور تک صدقات اور راہِ خداوندی میں خرچ کرنے کی ترغیبات کا سلسلہ چلا گیا ہے اور اسکے بعد حق تعالیٰ نے ربا (سود) کے احکام ذکر فرمائے چونکہ سود صدقہ اور خیرات کی ضد ہے اس لیے صدقات اور خیرات کے بعد سود کے احکام بیان فرمائے اور سودی کاروبار کرنے کو خدا اور اس کے رسول سے اعلانِ جنگ قرار دیا۔ اس لیے عجب نہیں کہ سودخواری کا انجام دلوں پر مہر لگ جانا ہو کہ جس سے حق اور باطل اور حلال اور حرام کا فرق اس کو نظر نہ آئے پس جس طرح آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ سورۂ بقرہ کی اس ابتدائی آیت یعنی ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ سے مرتبط ہے اسی طرح عجب نہیں کہ ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ الخ کی آیتوں کو ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ﴾ کے ساتھ کوئی خاص ربط ہو اور تجربہ اور مشاہدہ بھی کچھ اسی کا شاہد ہے اس لیے دیکھا یہ گیا ہے کہ سودخواروں کو کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی ان کی حالت ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ کا نمونہ ہوتی ہے۔

ع بدوز د طمع دیدۂ ہوشمند

نیز اول پارہ میں زیادہ تر یہود بے بہبود کی شناعتوں کا بیان تھا۔ اور قرآن کریم میں ہے کہ یہود کے ملعون اور مغضوب ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب ان کی سودخواری بھی ہے کما قال تعالیٰ: ﴿وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا﴾ اور ﴿اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾۔ اور حرام مال آدمی کو قسی القلب، سنگ دل اور بے رحم بنا دیتا ہے اور قساوتِ قلب سے بڑھ کر دین دنیا کو تباہ کرنے والی کوئی چیز نہیں۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اس امت کو سود سے نہایت سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ خدانخواستہ یہود کی طرح قسی القلب اور سنگ دل نہ ہو جائیں اور اس اعتبار سے آیات ربا کا تعلق ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ سے بھی کوئی بعید نہیں۔ الحمد للہ کہ ان آیات کا ربط گزشتہ آیات سے بھی ظاہر ہو گیا اور سورۂ بقرہ کی

ابتدائی آیتوں سے بھی مرتبط ہونا معلوم ہوگیا۔

ربط دیگر:...... گزشتہ آیت ﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ میں حضور پرنور ﷺ کی رسالت کا بیان تھا کہ آپ ﷺ اللہ کے بلاشبہ رسول ہیں۔ مگر معاندین باوجود دلائل نبوت اور شواہد رسالت کے مشاہدہ کے آپ ﷺ کی رسالت کو نہیں مانتے۔ ان آیات میں آپ ﷺ کی تسلی کا مضمون مذکور ہے کہ آپ ﷺ ان معاندین کی تکذیب سے رنجیدہ نہ ہوں۔ پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کو قسم قسم کے دلائل نبوت اور شواہد رسالت دیے گئے مگر پھر بھی سب ایمان نہیں لائے۔ آپ کا انکار کوئی نئی بات اور کوئی قابل تعجب امر نہیں کوئی۔ پیغمبر ایسا نہیں گزرا کہ جس پر سب ایمان لے آئے ہوں لہٰذا آپ معاندین کی تکذیب اور کفر سے رنجیدہ نہ ہوں۔ یہ آپ ﷺ کی رسالت کا قصور نہیں۔ یہ تقدیرِ خداوندی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی اسی طرح ہے کہ کوئی ایمان لائے اور کوئی کفر کرے۔

درکار خانۂ عشق از کفر ناگزیر است — دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

باقی رہا یہ امر کہ اس میں حکمت اور مصلحت کیا ہے سو وہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ یہ قضاء وقدر کا سربستہ راز ہے جو آج تک کسی پر منکشف نہیں ہوا۔ وہ مالکِ مطلق ہے جس کو چاہے بینائی (ہدایت) دے اور جس کو چاہے نابینا (گمراہ) بنائے، ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾

کر ازہرہ آں کہ از بیم تو — کشاید زبان جزبہ تسلیم تو
زبان تازہ کردن باقرار تو — نینگیختن علت از کار تو

یہ سوال کرنا کہ اس کو مؤمن اور اس کو کافر کیوں بنایا یہ ایسا ہی سوال ہے کہ اس کو بینا اور اس کو نابینا کیوں بنایا جو جواب اس کا ہے وہی اس کا ہے۔

اب آئندہ آیت میں خبر دیتے ہیں کہ ہم نے بعض رسل کو بعض پر فضیلت دی تا کہ خدا کی قدرت کا کرشمہ اور ہر رسول کی شان اعجاز کا ایک نیا نمونہ دنیا کو نظر آئے۔

ع ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است

یہ پیغمبروں کی جماعت ① جن کا ہم نے ابھی ﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ میں ذکر کیا جن میں آپ ﷺ بھی داخل ہیں اگرچہ وصف نبوت ورسالت میں سب مشترک ہیں لیکن ہم نے علاوہ نبوت ورسالت بعض کو بعض پر ایک خاص فضیلت دی ہے یعنی ہر رسول کو کسی خاص خصوصیت اور خاص فضیلت کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ جو دوسرے میں نہ پائی جائے تا کہ ہر ایک کا فضل وکمال الگ الگ نظر آئے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا﴾ اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج میں آسمانوں پر انبیاء کرام ﷺ کو درجہ بدرجہ دیکھا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام ﷺ اگرچہ نفسِ نبوت کی حیثیت سے برابر ہیں مگر مدارج اور مراتب کے اعتبار سے مختلف ہیں اور ان کے درجات جدا جدا ہیں۔ فضائل وکمالات میں تمام انبیاء ﷺ برابر نہیں چنانچہ بعض ان میں سے ایسے ہیں جن سے اللہ نے

① یعنی ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ﴾ کا اشارہ تانیث جماعت رسل کی طرف ہے۔

بلاواسطہ فرشتہ کے کلام فرمایا جیسے موسیٰ علیہ السلام اور ابتداء میں حضرت آدم علیہ السلام سے بلاواسطہ فرشتوں کے کلام فرمایا جیسا کہ ﴿یٰاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ﴾ میں گزرا اور اخیر میں خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ سے شب معراج میں بلاواسطہ کلام فرمایا اور بعضوں کو اپنی ہم کلامی کا شرف تو نہیں عطا کیا لیکن ان کو دوسرا شرف عطا کیا کہ اور طرح طرح سے اُن کے درجے بلند کیے جیسے داود علیہ السلام کو نبوت و رسالت کے ساتھ بے مثال بادشاہت بھی عطا کی۔

ف ا:......بعض علماء کا قول ہے کہ ﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ﴾ میں۔ بعض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں کہ اللہ نے اُن کو اپنا خلیل بنایا اور مقام خلت سے ان کو سرفراز فرمایا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ادریس علیہ السلام مراد ہیں کما قال تعالی: ﴿وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما اور شعبی اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے کہ "بَعْضَهُمْ" سے سرور عالم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام پر ایک درجہ میں نہیں تمام درجات اور فضائل و کمالات میں بلند اور برتر کیا۔ ا۔ آپ ﷺ کو تمام انبیاء علیہم السلام کا امام اور خطیب اور سردار بنایا۔ ۲۔ اور تمام امتوں کا شفاعت کرنے والا۔ ۳۔ اور تمام نبیوں کا خاتم اور آخر بنایا۔ ۴۔ اور آپ ﷺ کو سب سے افضل اور اکمل کتاب عطا کی۔ ۵۔ اور آپ ﷺ کی شریعت کو سب شریعتوں سے زیادہ جامع بنایا۔ ۶۔ اور تمام انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر آپ کو معجزات عطا کیے۔ ۷۔ اور آپ ﷺ کو تمام عالم جن اور انس کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا۔ ۸۔ اور آپ ﷺ کے پیرو تمام انبیاء کے پیرووں سے زیادہ ہوں گے۔ ۹۔ اور سب سے پہلے آپ ﷺ اپنی امت کو لے کر پل صراط سے گزریں گے۔ ۱۰۔ اور سب سے پہلے آپ ﷺ اپنی امت کو لے کر جنت میں داخل ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور ہم نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو اُن کی نبوت اور رسالت کی صریح اور واضح نشانیاں عطا کیں تا کہ ان کی نبوت و رسالت میں کسی کو شبہ نہ رہے اور روح القدس یعنی جبریل امین علیہ السلام کو ان کی تائید اور تقویت کے لیے مقرر کیا کہ ہر وقت یہود سے ان کی حفاظت کریں تا کہ مردوں کے زندہ کرنے اور مادرزاد نابینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے سے کسی کو اُن کی الوہیت (خدائی) کا شبہ نہ ہو اس لیے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہوتے تو اول تو دشمنوں سے کیوں ڈرتے؟ دوم یہ کہ ان کو جبریل امین علیہ السلام کی حفاظت کی کیا ضرورت ہوتی معاذ اللہ کیا خدا بھی کسی کی حفاظت کا محتاج ہوتا ہے؟ چونکہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے قائل نہ تھے اور نصاری اُن کی الوہیت کے قائل تھے اس لیے پہلے جملہ ﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ﴾ میں یہود کے رد کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کو بیان کیا اور دوسرے جملہ ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ میں ان کی الوہیت کا رد کیا جس کے نصاری قائل تھے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو دین حق پر متفق کر دیتا اور پھر لوگ پیغمبروں کے بعد دین میں اختلاف نہ کرتے اور نہ آپس میں لڑتے خصوصاً دلائل واضحہ کے بعد تو اختلاف کا نام و نشان بھی نہ رہتا اس لیے کہ دلائل واضحہ کا اقتضاء یہ تھا کہ سب حق پر متفق ہو جاتے۔ لیکن باوجود دلائل واضحہ کے پھر حق کے قبول کرنے میں اختلاف کیا سو بعض ان میں سے ایمان لائے اور بعضوں نے کفر اختیار کیا اور نوبت قتل و قتال اور جنگ و جدال تک پہنچی اور اگر اللہ چاہتا تو باوجود ایمان اور کفر کے اختلاف کے پھر بھی یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے کیونکہ یہ ممکن تھا کہ باوجود اختلاف مذہب کے ایک دوسرے سے تعرض نہ کریں لیکن اللہ کی حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ یہ دنیا حق اور

باطل کا میدان کارزار بنی رہے وہ حکیم مطلق ہے حاکم مطلق ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے کسی کی مجال نہیں کہ کوئی اس پر اعتراض کر سکے کہ یہ کیوں کیا اور یہ کیوں نہ کیا؟

اس تمام کلام سے مقصود آنحضرت ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ انبیاء سابقین ﷩ کی طرح آپ ﷺ کی نبوت و رسالت بھی دلائل اور براہین اور آیات بینات سے ثابت ہے اور جس طرح بہت سے لوگ انبیاء سابقین ﷩ پر باوجود آیات بینات ایمان نہیں لائے اسی طرح اگر بہت سے معاندین آپ ﷺ کی نبوت اور رسالت کی تصدیق نہ کریں تو تعجب نہ کیجئے ایمان عام کسی امت میں نہیں ہوا۔ کسی نے تصدیق کی اور کسی نے تکذیب اور اس میں اللہ کی حکمتیں ہیں جس کا علم سوائے اس کے کسی کو نہیں۔ ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا﴾ (تفسیر ❶ غرائب البیان للنیسابوری: ۳/۴)

ف ۲:...... شروع آیت ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ﴾ الخ اور پھر اخیر آیت میں ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا﴾ فرمایا مفسرین کی ایک جماعت کے نزدیک یہ آیت تاکید کے لیے مکرر لائی گئی ہے اور شیخ الاسلام ابو السعود ﷫ فرماتے ہیں کہ یہ تکرار تاکید کے لیے نہیں بلکہ اس تنبیہ کے لیے اس آیت کو مکرر لایا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ لوگوں کا اختلاف اور باہمی قتل و قتال سب اللہ کے ارادہ اور مشیت سے ہے کوئی شئ بغیر اللہ کی مشیت کے نہیں ہو سکتی۔

ف ۳:...... اور جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ پیغمبروں کے درمیان تفضیل اور مفاضلہ نہ کرو اس سے مراد اس تفضیل کی ممانعت ہے جو محض عصبیت اور قومی حمیت کی بناء پر ہو یا ایسی تفضیل کی ممانعت مراد ہے جو دوسرے نبی کی تنقیص اور تحقیر کا سبب بنے اور اسطرح بحمدہ تعالیٰ آیت اور حدیث میں کوئی تعارض نہ رہے گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ

اے ایمان والو خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو روزی دی پہلے اس دن کے آنے سے کہ جس میں نہ خرید و فروخت ہے اور نہ آشنائی

اے ایمان والو! خرچ کرو کچھ ہمارا دیا پہلے اس دن کے آنے سے جس میں نہ بکنا ہے اور نہ آشنائی ہے

وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۵۴﴾

اور نہ سفارش ف ۱ اور جو کافر ہیں وہی ہیں ظالم ف ۲

اور نہ سفارش۔ اور جو منکر ہیں وہی ہیں گنہگار۔

ف ۱ اس سورت میں عبادات و معاملات کے متعلق احکام کثیرہ بیان فرمائے جن سب کی تعمیل نفس کو ناگوار اور بھاری ہے اور تمام اعمال میں زیادہ دشوار انسان کو جان اور مال کا خرچ کرنا ہوتا ہے اور احکام الٰہی اکثر جو دیکھے جاتے ہیں یا جان کے متعلق ہیں یا مال کے اور گناہ میں بندہ کو جان یا مال کی محبت اور رعایت ہی اکثر مبتلا کرتی ہے گویا ان دونوں کی محبت گناہوں کی جڑ اور اس سے نجات جملہ طاعات کی سہولت کا منشاء ہے اس لئے ان احکامات کو بیان فرما کر قتال اور انفاق کو بیان فرمانا مناسب ہوا ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ اول کا بیان تھا تو ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ﴾ دوسرے کا ذکر ہے اسکے بعد قصہ طالوت سے =

❶ والمعنى على ما قال النيسابوری تلك الرسل۔ الی۔ وايدناه بروح القدس۔ ومع ذلك قدرنا لهم من قومهم ما ذكرنا ذلك بعد مشاهدة المعجزات وانت رسول مثلهم فلا تحزن على ماترى من قومك ولو شاء الله لم يختلف امم اولئك ولكن ما قضاه الله فهو كائن وما قدره فهو واقع۔ تفسیر نیسابوری: ۳/۴۔

ترغیبات وترہیبات درباره صدقات ونفقات

قَالَ تَعَالٰی: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا... الی... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

ربط:...... دورکوع پیشتر حق تعالیٰ شانہ نے دوحکم دیئے تھے ایک جہاد ● اور دوسرا اللہ تعالیٰ کو قرض ● دینے کا۔ پہلے حکم کی تائید اور تقویت کے لیے طالوت اور جالوت کا قصہ ذکر فرمایا۔ اب دوسرے حکم کی تائید اور تقویت کے لیے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیبات اور ترہیبات کو بیان فرماتے ہیں۔ یہ بیان دور تک چلا گیا ہے۔

نیز گزشتہ آیت ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ﴾ میں مکلفین کو دو قسموں پر منقسم فرمایا۔ مومن اور کافر۔ اب اس آیت میں اہل ایمان کو اپنے خطاب سے عزت دی اور ان کو اہل ایمان کے لقب سے مخاطب فرمایا اے ایمان والو! اس رزق میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے۔ کچھ ہماری راہ میں بھی خرچ کرلو قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں قصور کے تلافی کی کوئی سبیل نہیں یعنی مرنے سے پہلے اس لیے کہ قیامت میں نہ کوئی خرید فروخت ہے اور نہ کوئی دوستی کارآمد ہے۔ اور نہ کوئی سفارش کارگر ہے اور کافر ہی ظالم ہیں کہ جان اور مال سب بے موقع صرف کررہے ہیں۔ پس اے ایمان والو! تم ان کافروں کی طرح اپنی جانوں اور مالوں پر ظلم نہ کرنا۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا

اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں زندہ ہے سب کا تھامنے والا ف۱ نہیں پکڑ سکتی اس کو اونگھ اور نہ نیند اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور

اللہ! اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔ جیتا ہے سب کا تھامنے والا ہے نہیں پکڑتی اس کو اونگھ اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمان اور

= اول کی تاکید ہوئی تو اب ﴿اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ الخ سے دوسرے کی تاکید منظور ہے اور چونکہ انفاق مال پر بہت سے امور عبادات ومعاملات کے موقوف ہیں تو اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا چنانچہ اب جو رکوع آتے ہیں ان میں اکثروں میں امر ثانی یعنی انفاق مال کا ذکر ہے۔ خلاصہ معنی یہ ہوا کہ عمل کا وقت ابھی ہے آخرت میں تو نہ عمل بکتے ہیں نہ کوئی آشنائی سے دیتا ہے نہ کوئی سفارش سے چھڑا سکتا ہے جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔

ف۲ یعنی کفار نے آپ اپنے اوپر ظلم کیا جس کی شامت سے ایسے ہوگئے کہ آخرت میں نہ کسی کی دوستی سے ان کو نفع ہوسکے اور نہ سفارش سے۔

ف۱ پہلی آیت سے حق سبحانہ کی عظمت شان بھی مفہوم ہوتی ہے اب اس کے بعد اس آیت کو جس میں توحید ذات اور اس کا تقدس وجلال غایت عظمت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے نازل فرمائی اور اسی کا لقب آیۃ الکرسی ہے اسی کو حدیث میں اعظم آیات کتاب اللہ فرمایا ہے اور بہت فضیلت اور ثواب منقول ہے اور اصل بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں رلا ملا کر تین قسم کے مضمون کو جگہ جگہ بیان فرمایا ہے علم توحید وصفات، علم احکام، علم قصص وحکایات سے بھی توحید وصفات کی تقریر وتائید مقصود ہوتی ہے یا علم احکام کی تاکید وضرورت اور علم توحید وصفات اور علم احکام بھی باہم ایسے مربوط ہیں کہ ایک دوسرے کے لئے علت اور علامت ہے صفات حق تعالیٰ احکام شرعیہ کے حق میں منشا اور اصل ہیں تو احکام شرعیہ صفات کے لئے بمنزلہ ثمرات اور فروع ہیں تو اب ظاہر ہے کہ علم قصص اور علم احکام سے علم توحید کو ضرور اعانت اور تقویت پہنچے گی اور علم قصص اور علم توحید وصفات سے ضرور علم احکام کی تاکید اور اسکی ضرورت بلکہ حقیقت اور اصلیت ثابت ہوگی اور یہ طریقہ جو تین طریقوں سے مرکب ہے بغایت احسن اور اسہل اور قابل قبول ہے۔ اول تو اس وجہ سے کہ ایک طریقہ کی پابندی وجب ملال ہوتی ہے اور ایک علم سے دوسرے کی طرف منتقل ہوجانا ایسا ہوجاتا ہے جیسا ایک باغ کی سیر کرکے دوسرے باغ کی سیر کرنے لگے دوسرے تینوں طریقوں سے مل کر حقیقت منشا ثمرہ نتیجہ سب ہی معلوم ہوجائے گا اور اس میں تعمیل احکام نہایت شوق ومستعدی اور رغبت وبصیرت کے ساتھ ہوگی اس لئے طریقہ =

● ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ۱۲

● ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ۱۲

تلك الرسل

فِي الْأَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا

زمین میں ہے ایسا کون ہے جو سفارش کرے اسکے پاس مگر اجازت سے جانتا ہے جو کچھ خلقت کے رو برو ہے اور جو کچھ

زمین میں ہے۔ کون ایسا ہے کہ سفارش کرے اس کے پاس مگر اس کے اذن سے جانتا ہے جو خلق کے روبرو ہے اور

خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ

جوان کے پیچھے ہے اور وہ سب احاطہ نہیں کرسکتے کسی چیز کا اسکی معلومات میں سے مگر جتنا کہ وہی چاہے گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں

پیٹھ پیچھے اور یہ نہیں گھیر سکتے اس کے علم میں سے کچھ مگر جو وہ چاہے گنجائش ہے اس کی کرسی میں آسمان

وَالْأَرْضَ ۖ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۲۵۵﴾

اور زمین کو اور گراں نہیں اس کو تھامنا ان کا اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا ف۱

اور زمین کو اور تھکتا نہیں ان کے تھامنے سے اور وہی ہے اوپر سب سے بڑا۔

اثبات توحید ذات وکمال صفات

(آیت الکرسی)

قَالَ تَعَالیٰ: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ... الی... وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾

گزشتہ رکوع کی آیت ﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ میں اثبات رسالت کا ذکر تھا اور اس آیت میں اثبات توحید کا بیان ہے نیز ﴿وَلَوْ شَاۤءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾ میں حق تعالیٰ کی قدرت اور مشیت کا ذکر تھا اور اس کا بیان تھا کہ قیامت کے دن کوئی سفارش اور کوئی دوستی کام نہ آئے گی جس سے خدا تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت مفہوم ہوتی ہے

= مذکورہ بغایت عمدہ اور مفید اور قرآن مجید میں کثیر الاستعمال ہے اسی جگہ دیکھ لیجئے کہ اول احکام کو کس کثرت وتفصیل سے بیان فرمایا اس کے بعد بقدر مصلحت قصص کو بیان کر کے تمام احکامات مذکورہ کے فوائد ونتائج گویا ہم کو آنکھوں سے دکھلا دیے ان سب کے بعد آیۃ الکرسی جو کہ در بارہ توحید وصفات ممتاز آیت ہے اس کو بیان فرما کر جملہ احکامات کی جڑ کو دلوں میں ایسا مستحکم فرما دیا کہ اکھاڑے نہ اکھڑے۔

ف۱ اس آیت میں توحید ذات اور عظمت صفات حق تعالیٰ کو بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ موجود ہے ہمیشہ سے اور کوئی اس کا شریک نہیں تمام مخلوقات کا موجد وہی ہے تمام نقصان اور ہر طرح کے تبدل اور فتور سے منزہ ہے سب چیزوں کا مالک ہے تمام چیزوں کا کامل علم اور سب پر پوری قدرت اور اعلیٰ درجہ کی عظمت اسکو حاصل ہے کسی کو نہ اتنا استحقاق نہ اتنی مجال کہ بغیر اسکے حکم کے کسی کی سفارش بھی اس سے کر سکے کوئی امر ایسا نہیں جس کے کرنے میں اسکو دشواری اور گرانی ہو سکے۔ تمام چیزوں اور سب کی عقلوں سے برتر ہے اس کے مقابلہ میں سب حقیر ہیں اس سے دو مضمون اور خوب ذہن نشین ہو گئے ایک تو حق تعالیٰ کی ربوبیت اور حکومت اور اپنی محکومیت اور عبدیت جس سے حق تعالیٰ کے تمام احکامات مذکورہ اور غیر مذکورہ کا بلا چون و چرا واجب التصدیق اور واجب التعمیل ہونا اور اس کے احکام میں کسی قسم کے شک وشبہ کا معتبر نہ ہونا معلوم ہو گیا دوسرے عبادات ومعاملات کثیرہ مذکورہ سابقہ کو اور ان کے ساتھ تعمیم وتعذیب کو دیکھ کر کسی کو خلجان ہو سکتا تھا کہ ہر ہر فرد کے اس قدر معاملات وعبادات کثیرہ ہیں کہ جن کا مجموعہ اتنا ہوا جاتا ہے کہ ان کا ضبط اور حساب کتاب محال معلوم ہوتا ہے پھر اسکے مقابلہ میں ثواب وعقاب یہ بھی عقل سے باہر غیر ممکن معلوم ہوتا ہے سو اس آیت میں حق سبحانہ نے چند صفات مقدسہ اپنی ایسی ذکر فرمائیں کہ وہ تمام خیالات بسہولت دور ہو گئے یعنی اس کا علم وقدرت ایسا کامل ہے کہ ایک چیز بھی ایسی نہیں جو اس سے باہر ہو جس کا علم اور قدرت ایسا غیر متناہی اور ہمیشہ یکساں رہنے والا ہو اس کو تمام جزئیات عالم کے منضبط رکھنے اور ان کا عوض عطا فرمانے میں کیا دقت ہو سکتی ہے۔

کہ اس کے سامنے کسی کو مجالِ دم زدن نہیں۔ اس لیے اس آیت میں حق تعالیٰ کی توحید ذات اور کمال صفات بیان فرماتے ہیں۔ نیز گزشتہ آیت ﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ میں کافروں کو ظالم بتلایا تھا۔ اب اس آیت میں ان کے ظلم کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ کافر اور مشرک اس لیے ظالم ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ شریک گردانتے ہیں۔ اور صحیح عقیدۂ توحید کو بیان فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! تم کافروں کی طرح شرک کر کے ظالم نہ بنو بلکہ عقیدۂ توحید کو حرز جان بناؤ۔ چنانچہ فرماتے ہیں اللہ وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں صرف وہی عبادت کا مستحق ہے استحقاق عبادت میں کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں اس لیے کہ صرف خدا تعالیٰ اپنی ذات سے خود بخود زندہ اور موجود ہے اس کی حیات اور بقاء ذاتی اور ابدی ہے اس کی حیات کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ انتہاء اور اس کے سوا ہر چیز اپنی ذات سے مردہ اور معدوم ہے اور اس کی حیات مستعار کی ابتداء بھی ہے اور انتہاء بھی۔ اس لیے کہ کوئی شے اپنی ذات سے قائم نہیں خدا تعالیٰ ہی ہر شے کا قائم رکھنے والا ہے۔ ہر شے اپنی حیات اور بقاء اور وجود میں اس کی محتاج ہے جیسے سایہ اپنی اصل کا محتاج ہوتا ہے ممکنات اپنے وجود اور بقاء میں اس سے کہیں زائد خدا کے محتاج ہیں۔ ممکنات کی حیات اور وجود اسی واجب الوجود کی حیات کا ایک ادنیٰ سا عکس اور پرتو ہے۔

کل ما فی الکون وهم اوخیال   او عکوس فی المرایا اوظلال

غرض یہ کہ حق تعالیٰ تمام عالم کا قائم رکھنے والا اور اس کی تدبیر کرنے والا ہے ایک لحہ بھی تدبیر سے غافل نہیں اس لیے کہ اُس کو اونگھ اور نیند نہیں پکڑتی اس لیے کہ نیند ایک قسم کا تغیر ہے جو وجوب کے منافی ہے اور حیات کو ضعیف اور کمزور بناتا ہے پس جس کو اونگھ اور نیند آئے گی اس کی حیات بھی ناقص اور کمزور ہوگی اور دوسروں کی تدبیر بھی نہیں کر سکے گا کیونکہ نیند موت کی بہن ہے لہٰذا نیند کی وجہ سے اس کی حیات بھی ناقص ٹھہرے گی اور اس کی شان قیومیت میں بھی قصور اور نقصان لازم آئے گا اور چونکہ وہی سب کے وجود اور حیات کا قائم رکھنے والا ہے اس لیے ثابت ہوا کہ آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اسی کی ملک ہے اوپر سے لے کر نیچے تک اسی کی حکومت اور بادشاہی ہے اس لیے کہ اصل مالک وہ ہے جو وجود اور حیات کا مالک ہو اور اس کی عظمت اور جلال اور شان کبریائی کا یہ عالم ہے کہ اس کی بارگاہ عالی میں کسی کی مجال نہیں کہ بغیر اس کی اجازت کے کوئی سفارش کر سکے۔ چہ جائیکہ کوئی اس کے حکم کو ہٹا سکے یا ٹلا سکے۔ یہ تو اس کی عظمت اور جلال کا حال ہوا اور اس کے علم کی یہ شان ہے کہ وہی مخلوقات کے تمام اگلے اور پچھلے احوال کو خوب جانتا ہے تمام عقلاء عالم مل کر بھی معلومات خداوندی میں سے کسی ایک معمولی چیز کی علم اور ادراک کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنی مقدار وہ تم کو علم دینا چاہے۔ فقط اتنی مقدار تم اس چیز کو جان لیتے ہو اصل کنہ اور حقیقت کا علم اور اس کا علمی احاطہ وہ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

﴿وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ ''اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔''

غرض یہ کہ خداوند ذوالجلال کا علم ذاتی اور تام ہے اور مخلوق کے تمام احوال کو محیط ہے جو اس کی وحدانیت اور قیومیت اور کمال عظمت پر دال ہے اور بندوں کا علم نہایت قلیل اور ناتمام بلکہ برائے نام ہے بندہ بدون اس کی تعلیم کے ایک ذرہ کو بھی نہیں جان سکتا اور ایک ذرہ کے بھی تمام احوال اور کیفیات اور جہات اور حیثیات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اگر ایک حال کو جان لیتا ہے تو سو حال سے جاہل اور بے خبر رہتا ہے اور اس علم ناتمام کے ساتھ اس بارگاہ میں شفاعت کرنا جس کا علم ذاتی اور تام ہو اور تمام اشیاء کی

حقیقت اور کنہ اور تمام احوال کو محیط ہو بغیر اس کی اجازت کے ممکن نہیں اس لیے کہ شفاعت وہاں ہوتی ہے جہاں شفاعت کرنے والا بادشاہ کو ایسی چیز سے آگاہ کرے جس کی بادشاہ کو خبر نہ ہو یا اس کو عفو کی مصلحت کی خبر نہ ہو اور بارگاہ خداوندی میں یہ ناممکن ہے کہ اس کو کسی شی کا علم نہ ہو اور اس کی مالکیت تمام کائنات کو محیط ہے اس لیے کہ اس کی کرسی جو اس کے عرش سے کم ہے وہی تمام آسمانوں اور زمینوں کو گھیرے ہوئے اور اپنے اندر سمائے ہوئے ہے جس طرح چاہے زمین اور آسمان میں تصرف کرتا ہے کسی کی مجال کیا ہے کہ بغیر اس کی اجازت کے کوئی سفارش کا کلمہ زبان سے نکال سکے شافع اور مشفوع لہ سب اسی کی ملک ہیں اور اس کی قدرت اور قیومیت کا یہ حال ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کی حفاظت اور نگہبانی اس پر ذرہ برابر شاق اور گراں نہیں اور کیسے اس پر گراں ہوسکتی ہے۔ وہ بڑا عالی شان اور بلند مرتبہ ہے۔ ذات اور صفات میں کوئی بھی کسی طرح اس کے برابر نہیں وہ اتنا بلند مرتبہ ہے کہ اس کی شان کے مطابق کوئی حمد وثنا بھی نہیں کرسکتا۔ بڑی عظمت والا ہے کہ ہر چیز اس کے سوا حقیر اور قبیح ہے۔ وہ اپنے افعال میں کسی کا محتاج نہیں عظمت وجلال کی وجہ سے سب سے مستغنی اور بے نیاز ہے پس جس ذات پاک کی یہ صفات ہوں کیا اس کا انکار کرنا یا اس کے ساتھ کسی کو شریک گردانا ظلم عظیم نہ ہوگا کما قال تعالیٰ فی الآیۃ الاولیٰ: ﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

فوائد ولطائف

اس آیت کو آیت الکرسی کہتے ہیں جس میں حق تعالیٰ شانہ کی توحید ذاتی اور صفاتی کا ذکر ہے۔ توریت اور انجیل اور کتب سابقہ کے دیکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی کمال ذات اور کمال صفات کے متعلق جیسا اس آیت میں ذکر ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی کتاب میں مذکور نہیں۔

اس آیت میں سب سے پہلے حق تعالیٰ نے اپنی توحید ذاتی کو بیان فرمایا ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ بعد ازاں ان صفات کو بیان فرمایا۔

(۱) ﴿اَلْحَيُّ﴾

کمالات وجودیہ میں سب سے پہلا حیات ہے۔ "حَيُّ" لغت میں اس زندہ شے کو کہتے ہیں جو واقف ہو اور سنتا اور دیکھتا اور قادر ہو پس صفت حیات تمام صفات کمال کا مبدء ہے۔

(۲) ﴿اَلْقَيُّوْمُ﴾

یعنی کائنات کو قائم اور باقی رکھنے والا "حَيٌّ" سے خدا کا واجب الوجود ہونا بیان کیا اور "قَيُّوْمٌ" سے خدا کا واہب الوجود ہونا بیان کیا یعنی بذاتہ اور بنفسہٖ وہ واجب الوجود ہے اور دوسروں کو وجود اور حیات ہبہ اور عطا کرنے والا ہے ممکن میں جو وجود بھی ہے وہ اسی واجب الوجود کا ہبہ اور عطیہ ہے۔ صفت حیات کو ذکر کر کے کمال وجود کو بیان فرمایا۔ اور صفت قیومیت کو ذکر کر کے کمال ایجاد کو بیان فرمایا۔

(۳) ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ﴾

اس کو نہ اونگھ پکڑتی ہے اور نہ نیند۔ اس سے حق تعالیٰ کا تغیرات اور حوادث اور خصائص ممکنات سے پاک اور بری

ہونا بیان فرمایا۔ یہ جملہ ﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ کی تاکید ہے کیونکہ اونگھ اور نیند سے حیات میں نقصان آتا ہے اس لیے کہ نیند موت کی بہن ہے اور خدا تعالیٰ موت کے شائبہ سے بھی پاک اور منزہ ہے۔ علاوہ ازیں جس کی حیات ناقص ہوگی اس کی قیومیت یعنی حفاظت اور نگرانی بھی ناقص اور کمزور ہوگی لہذا ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ایسا قیوم اور مدبر ہے کہ ایک لمحہ بھی تدبیر سے غافل نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنی قیومت میں سہو اور نسیان اور غفلت اور سستی سے پاک اور منزہ ہے۔

(۴) ﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾

اس جملہ سے صفت مالکیت کو ثابت کرنا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے اس لیے کہ مالک حقیقی وہ ہے جو وجود عطا کرے پس جس نے آسمانوں اور زمینوں کو وجود عطا کیا اور جو ان کے وجود کا قائم رکھنے والا اور تھامنے والا ہے وہی ان کا مالک حقیقی ہے۔

(۵) ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾

اس جملہ سے اس کی حاکمیت اور جلال اور کبریائی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ اس کی بارگاہِ عالی میں کسی کی مجال نہیں کہ بغیر اس کی اجازت کے لب کشائی کر سکے۔

(۶) ﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾

اس جملہ میں اس کے علم محیط کو بیان فرمایا کہ اس کا علم مخلوقات کے تمام احوال کو محیط ہے۔

(۷) ﴿وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾

اس جملہ میں یہ بتلایا گیا کہ جس طرح مخلوقات کا وجود عطیۂ خداوندی ہے اسی طرح مخلوقات کا علم بھی عطیہ خداوندی ہے۔ بندے فقط اتنی مقدار جان سکتے ہیں۔ جتنا وہ چاہے بندوں کا علم اس کی مشیت کے تابع ہے۔ بندہ کا علم نہایت ہی قلیل اور محدود ہے۔ اور اس کا جہل بالفعل غیر محدود اور غیر متناہی ہے۔

(۸) ﴿وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾

اس جملہ میں یہ بتلایا گیا کہ حق تعالیٰ کی حاکمیت اور مالکیت آسمانوں اور زمینوں سے بھی متجاوز ہے۔ جہاں تک بندوں کا وہم و خیال بھی نہیں۔

فائدہ ا: ...... احادیثِ نبویہ اور اقوال صحابہ و تابعین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرسی ایک جسم ہے جو آسمانوں اور زمینوں سے بڑا ہے اور عرش سے چھوٹا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ساتوں آسمان کرسی کے اندر ایسے ہیں جیسے کسی ڈھال میں سات درہم ڈال دیے جائیں کرسی کی اضافت اور نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی ہے جیسے عرش اللہ اور بیت اللہ کی نسبت ہے بظاہر یہ کوئی خاص قسم کی تجلی ہے اور جس طرح تجلیات کی انواع اور اقسام میں ہر شے کی تجلی علیحدہ ہے اسی طرح عجب نہیں کہ کرسی اور عرش کی تجلیات علیحدہ علیحدہ ہوں اور ایک دوسرے سے ممتاز ہوں۔

جمہور سلف کے نزدیک آیت میں کرسی سے ظاہری اور متبادر معنی مراد ہیں۔ اور بعض علماء ادھر گئے ہیں کہ کرسی اس کی عظمت اور سلطنت کی تصویر اور محض ایک مثال ہے ورنہ درحقیقت نہ کوئی کرسی ہے اور نہ وہاں کوئی بیٹھنے والا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ لفظ سے حقیقی معنی ہی مراد لیے جائیں قرآن کریم میں صدہا جگہ مجازی اور کنائی معنی مراد لیے گئے ہیں۔

(۹) ﴿وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا﴾

اور اللہ تعالیٰ کو آسمان اور زمین کی حفاظت ذرہ برابر گراں نہیں۔ اس جملہ سے یہ بتلانا ہے کہ اس کی صفت قدرت اور قیومیت ضعف اور نقصان سے پاک اور منزہ ہے۔

(۱۰) ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾

اس جملہ میں اللہ کی صفت علو اور عظمت کو بیان فرمایا۔

ف ۲:...... مستدرک حاکم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"سورة البقرة فيها اية سيد آى القرآن لا تقرأ في بيت فيه شيطان الا اخرج منها۔" (آية الكرسي) ''سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے جو تمام آیات قرآن کی سردار ہے وہ آیت الکرسی ہے جس گھر میں وہ پڑھی جاتی ہے شیطان اس سے نکل جاتا ہے۔''

صحیح مسلم وغیرہ میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ اے ابوالمنذر! قرآن میں سب سے اعظم یعنی سب سے بڑی آیت کون سی ہے؟ میں نے کہا ﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ آنحضرت ﷺ نے یہ سنتے ہی میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا[1] اے ابوالمنذر! علم تمہیں مبارک ہو۔

اور اسی طرح حضرت عمر اور حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ تمام آیتوں کی سردار اور سب سے بڑی آیت، آیت الکرسی ہے۔ (درمنثور: ۱/ ۳۲۵)

اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ اسم اعظم ﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب مُردوں کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو "يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ" پڑھ کر دعا فرماتے۔ اور آصف بن برخیا رحمہ اللہ نے جب بلقیس کے عرش کو لانے کا ارادہ کیا تو "يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ" پڑھ کر دعا مانگی۔ (تفسیر قرطبی: ۳/ ۲۷۱)

ف ۳:...... حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ آیت الکرسی سورۂ بقرہ کا قلب ہے اور ﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ بمنزلہ روح اور جان کے ہے اور باقی آیات بمنزلہ اعضاء اور جوارح کے ہیں اور اس سورت کے تمام مطالب اسی آیت کے گرد گھومتے ہیں۔ جس طرح اعضاء اور جوارح جان کے شئون اور مظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس سورت کی تمام آیتیں ﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ کے شئون اور مظاہر ہیں۔ سورہ بقرہ کے کل چالیس رکوع ہیں۔ کوئی ایسا نہیں کہ جس میں حیات اور قیومیت اور ہمیشہ کی زندگانی کا مضمون مذکور نہ ہو۔ گویا کہ یہ تمام سورت ﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ ہی کی شرح اور بسط اور حیات اور

---

[1] حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں: "ليهنك العلم يا ابا المنذر۔" ۱۲

قیومیت ہی کی توضیح اور تلویح ہے۔ ابتداء سورت میں ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ سے قرآن کریم کا آب حیات ہونا بیان فرمایا اور یہ بتلایا کہ ایمان اور تقوی سے حیات ابدی حاصل ہوتی ہے اور کفر اور نفاق سے دائمی ہلاکت۔ پھر تیسرے رکوع میں افراد انسانی کی فرداً فرداً حیات کا ذکر فرمایا ﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ﴾ اور زمین وآسمان کی پیدائش اور دنیا کی نعمتوں کی پیدائش کا ذکر فرمایا جو دنیوی حیات کا ذریعہ ہیں اور پھر اپنی عبادت کا حکم دیا جو انسان کی حیات اخروی اور قیام ابدی کا ذریعہ ہے۔ بعد ازاں ابوالبشر علیہ السلام کی حیات اور منصب خلافت اور ملائکہ علیہم السلام پر اُن کی فضیلت کو ذکر فرمایا۔ ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ بعد ازاں پانچویں رکوع سے ایک خاص خاندان کی حیات کا ذکر شروع فرمایا یعنی بنی اسرائیل کی حیات اور ان پر اپنے ظاہری اور باطنی انعامات کا بیان شروع کیا جو تقریباً اخیر پارے تک چلا گیا جس میں ان کو جہانوں پر فضیلت دینا اور من سلویٰ کا ان کے لیے نازل کرنا اور ان کی ہدایت کے لیے توریت کا عطا کرنا اور اس خاندان میں ہزاروں پیغمبروں کو ہدایت کے لیے مبعوث کرنا بیان فرمایا۔ چودھویں رکوع تک جب اس خاندان کی حیات کا قصہ تمام ہوا تو پندرھویں رکوع سے ایک دوسرے خاندان کی حیات کا ذکر شروع فرمایا۔ یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کا کہ ان کی اقامت اور توطن کے لیے خانہ کعبہ کی تعمیر ہوئی یہ جگہ نبی آخر الزمان ﷺ کی پیدائش کی جگہ اور یہ قبلہ آخری قبلہ ہے۔ دور تک یہ سلسلہ کلام چلا گیا جب ان دونوں خاندانوں کی حیات اور قائی سے فارغ ہوئے تو پھر اس کے بعد چند اقسام حیات کو ذکر فرمایا کہ جو بظاہر حیات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں من جملہ اُن کے شہادت فی سبیل اللہ اور مصائب پر صبر کرنا اور قصاص کو جاری کرنا اور وصیت کو بغیر تغیر وتبدل کے جاری کرنا اور روح کو زندہ رکھنے کے لیے روزہ رکھنا اور دین کی بقاء کے لیے جہاد کرنا اور شعائر ملت کو زندہ اور قائم رکھنے کے لیے حج اور عمرہ کرنا اور مال اور آبرو کی حیات قائم رکھنے کے لیے شراب اور جوئے سے پرہیز کرنا اور حقوق نکاح اور زوجیت کے زندہ اور قائم رکھنے کے لیے ایلاء اور خلع اور طلاق اور عدت اور حالتِ حیض میں مباشرت اور اجرتِ رضاعت وغیرہ کی حدود کی پوری پوری رعایت رکھنا تا کہ خاندانی اور معاشرتی حیات قائم رہے اور اس کا شیرازہ منتشر نہ ہو۔

پھر جب ان اقسام حیات کے بیان سے فراغت ہوئی تو ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ﴾ سے چند عجیب وغریب قصے بیان فرمائے جن میں خدائے "حَيٌّ قَيُّوْمٌ" کی طرف سے بلا اسباب ظاہری حیاتِ غیبیہ کا عطا ہونا بیان فرمایا، تا کہ خوب واضح ہو جائے کہ اس کے سوا کوئی "حَيٌّ" اور "قَيُّوْمٌ" نہیں۔ جو بھی زندہ اور قائم ہے وہ اس کی دی ہوئی حیات سے قائم ہے حق تعالیٰ نے دو قصے اس کلمۂ حی وقیوم سے پہلے ذکر فرمائے اور تین قصے اسی مدعا کے اثبات کے لیے آیت الکرسی کے بعد ذکر فرمائے۔

پہلا قصہ حیات بنی اسرائیل کی اس جماعت کا ذکر فرمایا کہ جو وبا سے ڈر کر بھاگے اور پھر ایک نبی کی دعا سے زندہ ہوئے۔

دوسرا قصہ طالوت اور جالوت اور تابوتِ سکینہ کا ذکر فرمایا جس سے اس خاندان کی گم شدہ حیات پھر واپس آئی۔

اس کے بعد آیت الکرسی کو ذکر فرمایا جس میں حق جل شانہ کی حیات اور قیومت اور مالکیت اور عظمت اور ہیبت اور قدرتِ کاملہ اور علم محیط کا ذکر فرمایا۔ اور یہ بتلا دیا کہ اسلام اور سیدھا راستہ یہ ہے کہ خدا کو وحدہٗ لاشریک مانا جائے۔ حق واضح

ہے جس کا جی چاہے قبول کرے کسی پر زبردستی نہیں۔

اس کے بعد پھر اپنی حیات اور قیومیت کے اثبات کے لیے تین قصے ذکر فرمائے جس سے حیات اُخروی کا نمونہ معلوم ہو اور یہ واضح ہو جائے کہ وہ حی وقیوم مُردوں کے زندہ کرنے پر قادر ہے تاکہ لوگ قیامت کے بارے میں شک نہ کریں۔ پھر اس کے بعد صدقات اور خیرات کے احکام بیان فرمائے جو انسان کی دینی اور دنیوی زندگی کے قیام کا سبب ہیں اور سود سے ممانعت فرمائی کہ جو انسان کی دینی اور دنیوی حیات کی تباہی اور بربادی کا سبب ہے۔ پھر اس سورت کو ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ الآیات سے ایمانیات اور اعتقادیات اور دعا اور استغفار کے مضمون پر ختم فرمایا۔ اس لیے کہ ایمان اور توبہ اور استغفار ہی سے مردہ دلوں کو حیاتِ جاودانی حاصل ہوتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ یہ تمام سورت حق تعالیٰ کے اسم حی وقیوم کی شرح اور تفصیل ہے اور آیت الکرسی اس سورت کے لیے بمنزلہ دل کے ہے اور یہ اسم حی وقیوم بمنزلہ جان کے ہے باقی آیتیں بمنزلہ اعضاء اور جوارح کے ہیں۔ واللہ اعلم۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙۗ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ

زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے ف۱ اب جو کوئی نہ مانے گمراہ کرنے والوں کو

زور نہیں دین کی بات میں، کھل چکی ہے صلاحیت اور بےراہی اب جو کوئی منکر ہو مفسد سے

وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ

اور یقین لاوے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سنتا

اور یقین لاوے اللہ پر اس نے پکڑی گہہ مضبوط جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سنتا ہے

عَلِيْمٌ ۝۲۵۶ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ

جانتا ہے ف۲ اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف اور جو لوگ

جانتا۔ اللہ کام بنانے والا ہے ایمان والوں کا، نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے اجالے میں اور وہ جو

كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗــــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ

کافر ہوئے ان کے رفیق ہیں شیطان نکالتے ہیں ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف یہی لوگ ہیں

منکر ہیں ان کے رفیق ہیں شیطان نکالتے ہیں ان کو اجالے سے اندھیروں میں وہ ہیں

ف۱ جب دلائل توحید بخوبی بیان فرما دی گئیں جس سے کافر کا کوئی عذر باقی نہ رہا تو اب زور سے کسی کو مسلمان کرنے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہیے اور نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ خود نص موجود ہے اور جو جزیہ کو قبول کرے گا اسکا جان و مال محفوظ ہو جائے گا۔

ف۲ یعنی جب ہدایت و گمراہی میں تمیز ہو گئی تو اب جو کوئی گمراہی کو چھوڑ کر ہدایت کو منظور کرے گا تو اس نے ایسی مضبوط چیز کو پکڑ لیا جس میں ٹوٹنے چھوٹنے کا ڈر نہیں اور حق تعالیٰ اقوال ظاہرہ کو خوب سنتا ہے اور نیت و حالت قلبی کو خوب جانتا ہے اس سے کسی کی خیانت اور فساد نیت چھپا نہیں رہ سکتا۔

ع

أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿۲۵۷﴾

دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوزخ والے، وہ اسی میں رہ پڑے۔

حق اور باطل نور اور ظلمت کا فرق واضح ہے
کسی پر کوئی زبردستی نہیں جو چاہے اختیار کرے

قَالَ تَعَالٰی: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ... الى... هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیت ﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ میں اثبات رسالت کا ذکر تھا اور آیت الکرسی میں اثبات توحید کا ذکر تھا اور یہی دو باتیں دین اسلام کا اصل الاصول ہیں جو دلائلِ واضحہ سے ثابت ہیں جس سے کافروں کے لیے کوئی عذر اور گنجائش باقی نہیں جس کا جی چاہے حق کو قبول کرے دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں۔ تحقیق ہدایت گمراہی سے بالکل جدا اور ممتاز ہو چکی ہے۔ حق کا حسن و جمال اور باطل کا قبح خوب ظاہر اور نمایاں ہو چکا ہے اور زبردستی اس امر پر ہوتی ہے جو ناپسندیدہ ہو اور کرنے والے کا دل اس سے خوش نہ ہو اور اسلام کا حسن و جمال ایسا بے مثال ہے کہ عقل سلیم اس پر عاشق اور فریفتہ ہے البتہ نفس پر اسلام کے احکام شاق اور گراں ہیں نفس تو نجاست خور اور شہوت پرست ہے اس کی گرانی اور ناگواری کا اعتبار نہیں کتے کو تے اور گندا پانی ہی لذیذ معلوم ہوتا ہے مگر سلیم الطبع کو اس تصور سے بھی تکدر اور انقباض ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اسلام میں اکراہ اور زبردستی ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اسلام کے لیے تصدیق قلبی اور دلی اذعان کا اعتبار ہے اور دل پر کسی کی زبردستی چل نہیں سکتی۔

یا آیت کے یہ معنی ہیں کہ دین کے بارے میں تم کسی پر زبردستی نہ کرو کیونکہ یہ دنیا دار ابتلاء اور دار امتحان ہے۔ مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنے اختیار سے ایمان لائیں۔ اس لیے کہ جزا و سزا کا مدار اختیاری افعال پر ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ خبریہ انشائیہ کے معنی میں ہوگا یعنی ﴿لَآ اِكْرَاهَ﴾ کی نفی معنی میں نہی کے ہوگی اور ﴿لَآ اِكْرَاهَ﴾ معنی میں "لَا تُكْرِهُوْا" کے ہوگا۔ جیسا کہ آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت حصین انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی حصین انصاری رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے عیسائی تھے۔ ایک روز حصین انصاری رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ پر ان کا نصرانی ہونا بہت گراں ہے اگر حضور اجازت دیں تو میں ان کو اسلام پر مجبور کروں اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ یعنی کسی پر اسلام میں داخل ہونے کے لئے جبر اور زبردستی نہ کرو ہم نے ہدایت اور ضلالت کا فرق واضح کر دیا ہے اب لوگوں کو اختیار ہے جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس قسم کی آیات اُن آیات کے معارض نہیں جن میں کافروں سے جہاد و قتال کا حکم آیا ہے اس لیے کہ جہاد شر اور

فساد کے رفع اور دفع کرنے کے لیے ہے۔ کفار چونکہ خدا کی زمین میں فساد مچاتے ہیں اور خدا کی نازل فرمودہ ہدایت اور شریعت کے اجراء اور نفاذ میں حارج اور مزاحم ہوتے ہیں اور بندگانِ خدا کو عبادت سے روکتے ہیں اس لیے جہاد کا حکم نازل ہوا۔ جہاد سے مقصود احکم الحاکمین کے دین متین کی حکومت قائم کرنا ہے بجبر کسی کو مسلمان بنانا مقصود نہیں۔ کافر اگر اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہے تو جزیہ دے کر بھی اپنے مذہب پر رہ سکتا ہے اور چونکہ جہاد دفع فساد کے لیے ہے اس لیے بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں اور راہبوں کو قتل کرنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا اس لیے کہ ان لوگوں سے فتنہ اور فساد کی امید نہیں اور جس طرح موذی جانوروں سانپ اور بچھو کا ایذا رسانی کے بعد قتل کرنا جائز ہے اسی طرح سانپ اور بچھو کو ڈنگ مارنے سے پہلے ہی ختم کر دینا عقل اور دانائی ہے اسی طرح اگر مسلمانوں کو کسی کافر حکومت سے کوئی خطرہ ہو تو پہلے ہی سے اس کا خاتمہ کر دینا عین تدبر اور عین سیاست ہے اصطلاح شریعت میں اس کا نام جہاد اقدامی ہے۔

علاوہ ازیں جس طرح انسان ایمان اور کفر کے قبول کرنے میں مختار ہے مجبور نہیں اسی طرح تمام اعمال خیر اور اعمال شر کرنے اور نہ کرنے میں بھی مختار ہے مجبور نہیں لیکن اچھے اور برے افعال پر ان کے مناسب جزا اور سزا کا مرتب ہونا جبر و اکراہ کو مستلزم نہیں۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹا جانا اور زانی محصن کا سنگسار کیا جانا اور خون ناحق کا قصاص لیا جانا یہ تمام تر اس کے افعال اختیاریہ کی سزا ہے جبر اور اکراہ نہیں۔ اس شخص نے اپنے اختیار سے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا اس لیے یہ سزا بھگتنی پڑی۔ پس اسی طرح جو مسلمان مرتد اور سزائے ارتداد میں قتل کیا گیا تو یہ جبر اور اکراہ نہیں بلکہ اس کے فعل اختیاری (ارتداد) کی سزا ہے اور کافروں سے جہاد و قتال ان کے فعل اختیاری یعنی کفر کی جزاء ہے۔

حیرت کا مقام ہے کہ قانونی سزائیں تو عینِ مصلحت اور عینِ تدبر اور عین سیاست بن جائیں اور شرعی حدود، قتل مرتد اور رجم زانی وغیرہ وغیرہ یہ سزائیں جبر اور اکراہ قرار دی جائیں اور وحشیانہ سزائیں کہلائیں قتل مرتد کے مسئلہ میں اشکال ہے اور مارشل لا میں کوئی اشکال نہیں۔ کیا قانونِ مارشل لا میں ووٹ کی قائم شدہ حکومت کے مرتدین کا قتل نہیں؟ کیا افسوس کا مقام نہیں کہ مجازی اور جعلی حاکم کے مرتدین کا قتل تو عین تہذیب اور عین تمدن ہو اور خدائے احکم الحاکمین کے مرتدین کے قتل پر ناک بھوں چڑھائیں اور اس کو وحشیانہ فعل قرار دیں۔ اس کا صاف مطلب تو یہ ہوا کہ ہماری بغاوت تو جرم ہے اور خدا تعالیٰ کی بغاوت جرم نہیں۔ خدا تعالیٰ ان لوگوں کو عقل دے جو بندوں پر اپنا حق خدا تعالیٰ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔

پس حق اور ہدایت کے روز روشن کی طرح واضح ہو جانے کے بعد جو شخص طغیان اور ضلال کی طرف بلانے والی چیزوں سے تعلق قطع کرے اور ایمان لا کر خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق قائم کرے تو اس نے نہایت مضبوط حلقہ کو پکڑ لیا اور اپنے آپ کو گمراہی اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا اور وہ ایمان باللہ کا حلقہ ایسا مضبوط ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا البتہ غفلت کی وجہ سے ہاتھ سے چھوٹ سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایمان اور کفر کے دعووں کو سننے والا ہے اور نیتوں کا جاننے والا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لائے اور خدا سے وابستہ ہوئے ان کو وہ اپنی خاص ہدایت اور توفیق کے ذریعہ شکوک اور شبہات اور وساوس اور خطرات کی تاریکیوں اور اندھیریوں سے نکال کر نور ہدایت کی طرف لے جاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور خدا تعالیٰ سے تعلق قطع کر لیا ان کے دوست اور رفیق جن اور انس کے شیاطین ہیں جو ان کو نور ہدایت اور نور دلائل سے نکال کر

شبہات اور نفسانی خواہشات کی تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ جو انبیاء اور علماء اور صلحاء اور دلائل عقل سے بھاگتے ہیں اور نفسانی خواہشوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ دوزخ کے باشندے ہیں یہ لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

ف:...... حق تعالیٰ نے کافروں کے حق میں دوزخ کی وعید کو ذکر فرمایا اور اس کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کے لیے کسی خاص وعدہ اور بشارت کا ذکر نہیں فرمایا اس لیے کہ اللہ کی ولایت اور محبت اور کارسازی ہر وعدہ اور بشارت کو متضمن ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کی بابت اسی وجہ سے کہ دی تھی اللہ نے اس کو سلطنت جب کہا ابراہیم نے میرا رب

تو نے نہ دیکھا وہ شخص جو جھگڑا ابراہیم سے اس کے رب پر؟ واسطہ یہ کہ دی تھی اس کو اللہ نے سلطنت، جب کہا ابراہیم نے میرا رب

الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ

وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے وہ بولا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں کہا ابراہیم نے کہ بیشک اللہ تو لاتا ہے

وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، بولا میں ہوں جلاتا اور مارتا، کہا ابراہیم نے، اللہ تو لاتا ہے

بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ

سورج کو مشرق سے اب تُو لے آ اس کو مغرب کی طرف سے تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ سیدھی

سورج کو مشرق سے پھر تو لے آ اس کو مغرب سے، تب حیران رہ گیا وہ منکر اور اللہ نہیں

لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵۸﴾

راہ نہیں دکھاتا بے انصافوں کو ف۱

راہ دیتا بے انصاف لوگوں کو۔

ذکر مبداء ومعاد

گزشتہ آیات میں حق تعالیٰ کی ذات وصفات کو بیان فرمایا اس کے بعد تین قصے اس کے مناسب ذکر فرمائے ہیں اول قصہ وجود باری کے اثبات کے لیے ہے اور دوسرا اور تیسرا قصہ اثبات حشر ونشر یعنی اثباتِ قیامت کے لیے ہے تاکہ مبداء اور معاد کی معرفت مکمل ہوجائے اور خدائے ذوالجلال کی حیات اور قیومیت خوب واضح ہوجائے اور نورِ ہدایت اور ظلمتِ

ف۱ پہلی آیت میں اہل ایمان واہل کفر اور ان کے نور ہدایت اور ظلمت کفر کا ذکر تھا اب اس کی تائید میں چند نظائر بیان فرماتے ہیں۔ نظیر اول میں نمرود بادشاہ کا ذکر ہے وہ اپنے آپ کو سلطنت کے غرور سے سجدہ کرواتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے سامنے آئے تو سجدہ نہ کیا نمرود نے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا اس نے کہا رب تو میں ہوں، انہوں نے جواب دیا کہ میں حاکم کو رب نہیں کہتا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ نمرود نے دو قیدی منگا کر بے قصور کو مار ڈالا اور قصوروار کو چھوڑ دیا اور کہا کہ دیکھا میں جس کو چاہوں مارتا ہوں جسے چاہوں نہیں مارتا، اس پر حضرت ابراہیم نے آفتاب کی دلیل پیش فرما کر اس مغرور احمق کو لاجواب کیا اور اس کو ہدایت نہ ہوئی یعنی لاجواب ہو کر بھی ارشاد ابراہیم علیہ السلام پر ایمان نہ لایا۔ یا یوں کہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بات کا کچھ جواب نہ دے سکا حالانکہ جیسا جواب پہلے ارشاد کا دیا تھا ویسا جواب دینے کی یہاں بھی گنجائش تھی۔

ضلالت کا نمونہ نظر آ جائے کہ خدا تعالیٰ کس طرح ہدایت دیتا ہے۔ اور کس طرح گمراہ کرتا ہے۔ اور جہاد و قتال کی مشروعیت کی وجہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ کفار نابکار خدائے کردگار کی صحیح معرفت کو مٹانا چاہتے ہیں اور لوگوں کو خدا تعالیٰ سے باغی بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان سے جہاد و قتال کا حکم دیا گیا اور اگر خود جہاد میں شریک نہ ہو سکیں تو مالی امداد کریں۔

قصہ اول

(در بارہ اثبات وجود باری عز اسمہ)

قَالَ تَعَالیٰ: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ ... الی ... وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾

ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کا نمرود بن کنعان سے مناظرہ اور مکالمہ بیان کرتے ہیں۔ نمرود دھری تھا یعنی وجود باری تعالیٰ کا منکر تھا اور اپنے آپ کو ملک کا رب اور خدا اور مالک بتاتا تھا۔ (اے مخاطب!) کیا تو نے اس طاغوت کو نہیں دیکھا جس نے خدا کے ولی ابراہیم سے اپنے پروردگار کے وجود کے بارے میں مباحثہ اور مجادلہ کیا۔ یہ جھگڑنے والا شخص نمرود تھا جس نے سب سے پہلے سر پر تاج رکھا اور بادشاہت کے گھمنڈ میں خدائی کا دعوی کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نمرود کا خدا کے بارے میں یہ مجادلہ محض اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت اور بادشاہی عطا کی۔ اس نعمتِ عظیمہ کے شکر کا ادنیٰ درجہ یہ تھا کہ جس خدا نے یہ سلطنت بخشی تھی اس کے وجود کا تو اقرار کرتا۔ مگر اس نے برعکس اُس مُنعِم کے وجود ہی کا انکار کر دیا۔ شکر تو در کنار جس وقت کہ ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے کہا کہ خدائے پروردگار پر ایمان لا۔ نمرود نے کہا وہ کون سا خدا ہے جس کی طرف میں تم ہمیں بلاتے ہو اس کا وصف بیان کرو؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میرا پروردگار جس کی طرف تم کو بلاتا ہوں اس کی شان یہ ہے کہ وہ موت اور حیات کا مالک ہے جس کو چاہتا ہے زندہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے مارتا ہے اور تو زندہ کرنے اور موت دینے سے عاجز ہے۔ لہٰذا تو مستحق ربوبیت کا نہیں ہو سکتا۔ نمرود نے اسی وقت دو آدمیوں کو بلایا اور ایک کو قتل کیا اور ایک کو چھوڑ دیا اور بولا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں یعنی مارنے اور زندہ کرنے سے عاجز نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو بڑا ہی کوڑ مغز ہے کہ احیاء اور اماتت کے معنی بھی نہیں سمجھتا احیاء اور اماتت کے معنی جسم میں جان ڈالنے اور جان نکالنے کے ہیں اور یہ سوائے خدا کے کسی کی قدرت میں نہیں۔ اس نادان نے فقط گردن اڑا دینے اور چھوڑ دینے اور حلق پر چھری چلانے اور نہ چلانے کا نام احیاء اور اماتت رکھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تو احیاء اور اماتت یعنی جسم میں جان ڈالنے اور نکالنے پر تو کیا قادر ہوتا تُو تو احیاء اور اماتت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا اچھا ایک بات اور سن اللہ تعالیٰ تو آفتاب کو اپنے ارادہ اور اختیار سے مشرق سے نکالتا ہے، حالانکہ وہ اگر چاہے تو مغرب اور شمال اور جنوب سے بھی نکال سکتا ہے ہر افق اور ہر نقطہ اس کی قدرت کے اعتبار سے یکساں ہے بس اگر تجھ کو دعوائے ربوبیت ہے تو آفتاب کو مغرب سے نکال کر دکھا تاکہ تیری قوت اور قدرت کا اندازہ ہو تو احیاء اور اماتت مارنے اور جلانے پر تو کیا قادر ہوتا۔ تیرے عجز اور درماندگی کا تو یہ عالم ہے کہ تو ایک جسم کی حرکت کے تغیر پر بھی قادر نہیں۔ حالانکہ حرکت، حیات کا ایک نہایت معمولی سا اثر ہے پس جو شخص ایک جسم کی حرکت میں تغیر کرنے سے عاجز ہو گا وہ احیاء اور اماتت سے بدرجۂ اولیٰ عاجز ہو گا۔ پس خدا کا منکر اس روشن اور نورانی دلیل کو سن کر حیران اور

بھونچکاں رہ گیا اور کسی قسم کی کوئی تاویل اور تلبیس بھی نہ کر سکا اور ایسا مدہوش ہوا کہ کچھ بھی نہ بول سکا مطلب یہ کہ نمرود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس روشن دلیل کو سن کر ہکا بکا رہ گیا اور بطور معارضہ یہ نہ کہہ سکا کہ اگر تیرا معبود ایسا زبردست ہے تو اس سے کہو کہ وہ آفتاب کو کسی دن بجائے مشرق کے مغرب سے نکال دے اس لیے کہ اس نے خوب سمجھ لیا کہ اگر ابراہیم علیہ السلام اپنے خدا سے یہ دعا مانگیں کہ اے خدا اس آفتاب کو بجائے مشرق سے مغرب سے نکال دیجئے تو یقیناً ایسا ہی ہو جائے گا۔ ابراہیم علیہ السلام کا خدا جس طرح آگ کو برد اور سلام بنا سکتا ہے اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کا خدا سورج کو بجائے مشرق کے مغرب سے بھی نکال سکتا ہے لیکن نمرود باوجود اس نورانی اور روشن دلیل کے کفر کی ظلمت اور تاریکی سے نہ نکلا اس لیے اپنے عناد پر قائم رہا اور ایمان نہ لایا اور اللہ تعالیٰ بے انصافوں کو گمراہی کی ظلمتوں ● سے نکال کر نور ہدایت کی طرف نہیں لے جاتے معاند کتنے ہی معجزات اور نشانات دیکھے وہ ظلمت سے نور ہدایت کی طرف نہیں آتا چنانچہ نمرود کا جو انجام ہوا وہ سب کو معلوم ہے

ع پشۂ کارش کفایت ساختہ

فائدہ:...... بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ قصہ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے بعد کا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ بتوں کے توڑنے کے بعد کا ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ایک بادشاہ تھا۔ وہ اپنے تئیں سجدہ کرواتا تھا سلطنت کے غرور سے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سجدہ نہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ انہوں نے کہا میں اپنے رب ہی کو سجدہ کرتا ہوں۔ اس نے کہا رب تو میں ہوں۔ انہوں نے کہا میں رب حاکم کو نہیں کہتا رب وہ جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اس نے دو قیدی بلائے جس کو جلانا پہنچتا تھا مار ڈالا اور جس کو مار ڈالنا پہنچتا تھا چھوڑ دیا تب انہوں نے آفتاب کی دلیل سے اس کو لاجواب کیا (۱۲منہ) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر سن کر بے اختیار نمرود کے دل میں یہ بات آ گئی کہ خدا ضرور ہے اور آفتاب کا مشرق سے نکالنا اس کا فعل ہے اور وہ خدا مغرب سے بھی نکال سکتا ہے اور یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ شخص اسی خدا کا پیغمبر ہے اور اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائے گا اور اگر ایسا ہو گیا تو عالم میں انقلاب برپا ہو جائے گا اور ساری دنیا اسی کی راہ پر ہو لے گی اور میرے ہاتھ سے سلطنت جاتی رہے گی۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا ۚ قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ

یا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گزرا وہ ایک شہر پر اور وہ گرا پڑا تھا اپنی چھتوں پر بولا کیونکر زندہ کرے گا اس کو اللہ

یا جیسے وہ شخص، کہ گزرا ایک شہر پر اور وہ گرا پڑا تھا اپنی چھتوں پر، بولا کہاں جلاوے گا اس کو اللہ مر گئے

مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا

مرگئے پیچھے پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے سو برس پھر اٹھایا اس کو ف۱ کہا تو کتنی دیر یہاں رہا بولا میں رہا ایک دن

پیچھے؟ پھر مار رکھا اس شخص کو اللہ نے سو برس، پھر اٹھایا۔ کہا، تو کتنی دیر رہا؟ بولا میں رہا ایک دن

ف۱ وہ شخص حضرت عزیر پیغمبر تھے اور تمام تورات ان کو یاد تھی۔ بخت نصر کافر بادشاہ تھا اس نے بیت المقدس کو ویران کیا اور بنی اسرائیل سے بہت لوگوں کو قید کر کے =

● اس عبارت میں اس آیت کا گزشتہ آیت ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ

یا ایک دن سے کچھ کم ف۱ کہا نہیں بلکہ تُو رہا سو برس اب دیکھ اپنا کھانا اور پینا

یا دن سے کچھ کم۔ کہا، نہیں بلکہ تو رہا سو برس اب دیکھ کھانا اپنا اور پینا،

يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ

سڑ نہیں گیا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کے واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم ان کو کس طرح

سڑ نہیں گیا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور تجھ کو ہم نمونہ کیا چاہیں لوگوں کے واسطے، اور دیکھو ہڈیاں کس طرح ان کو

نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

ابھار کر جوڑ دیتے ہیں پھر ان پر پہناتے ہیں گوشت ف۲ پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بیشک اللہ ہر چیز پر

ابھارتے ہیں پھر ان پر پہناتے ہیں گوشت۔ پھر جب اس پر ظاہر ہوا، بولا، میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر

قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾

قادر ہے ف۳

قادر ہے۔

قصہ دوم

برائے اثبات معاد یعنی برائے اثبات حشر ونشر

قَالَ تَعَالَىٰ: ﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ... الی... أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

= لے گیا ان میں حضرت عزیر بھی تھے جب قید سے چھوٹ آئے تب حضرت عزیر نے راہ میں ایک شہر دیکھا ویران اس کی عمارت گری ہوئی دیکھ کر اپنے جی میں کہا کہ یہاں کے ساکن سب مرگئے کیونکر حق تعالیٰ ان کو جلا دے اور یہ شہر پھر آباد ہو۔ اسی جگہ ان کی روح قبض ہوئی اور ان کی سواری کا گدھا بھی مرگیا سو برس تک اسی حال میں رہے اور کسی نے نہ ان کو وہاں آ کر دیکھا نہ ان کی خبر ہوئی اس مدت میں بخت نصر بھی مرگیا اور کسی بادشاہ نے اس مدت میں بیت المقدس کو آباد کیا اور اس شہر کو بھی خوب آباد کیا۔ پھر سو برس کے بعد حضرت عزیر زندہ کئے گئے ان کا کھانا اور پینا اسی طرح پاس دھرا ہوا تھا ان کا گدھا جو مرچکا تھا اور اس کی بوسیدہ ہڈیاں اپنی حالت پر دھری تھیں وہ ان کے روبرو زندہ کیا گیا اور اس سو برس میں بنی اسرائیل قید سے خلاص ہو کر شہر میں آباد بھی ہوچکے تھے حضرت عزیر نے زندہ ہو کر آبادی دیکھا۔

ف۱ جب حضرت عزیر مرے تھے اس وقت کچھ دن چڑھا تھا اور جب زندہ ہوئے تو ابھی شام نہ ہوئی تھی تو یہ سمجھے کہ اگر میں یہاں کل آیا تھا تو ایک دن ہوا اور اگر آج ہی آیا تھا تو دن سے بھی کم رہا۔

ف۲ حضرت عزیر علیہ السلام کے سامنے وہ سب ہڈیاں موافق ترکیب بدن کے جمع کی گئیں پھر ان پر گوشت پھیلایا گیا اور چمڑا درست ہوا پھر خدا کی قدرت سے ایکبارگی اس میں جان آئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بولی بولا۔

ف۳ حضرت عزیرؑ نے اس تمام کیفیت کو ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا کہ مجھ کو خوب یقین ہوا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے یعنی میں جو جانتا تھا کہ مردہ کو جلانا خدا تعالیٰ کو آسان ہے سو اب اپنی آنکھ سے دیکھ لیا یہ مطلب نہیں کہ پہلے یقین میں کچھ کمی تھی ہاں مشاہدہ نہ ہوا تھا پھر حضرت عزیر یہاں سے اٹھ کر بیت المقدس میں پہنچ کسی =

یا اے مخاطب کیا تو نے اس جیسے شخص کی طرف نظر نہیں کی کہ جن کا ایک بستی پر گذر ہوا۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ گذرنے والے حضرت ارمیاء علیہ السلام نبی تھے اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ عزیر علیہ السلام تھے۔ اور مجاہد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ نمرود کے ساتھ ذکر کرنے سے مفہوم ہوتا ہے کہ وہ گذرنے والا شخص کافر تھا۔ جس کو بعث میں شک اور تردد تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں اس لیے کہ کافر ایسی عزت اور کرامت کا مستحق نہیں جس کا آیت میں ذکر ہے اور قریہ سے بیت المقدس مراد ہے جس کو بخت نصر نے ویران اور برباد کیا اور بنی اسرائیل کو قتل کیا اور بہت سوں کو قید کر کے لے گیا۔ ان میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی تھے حضرت عزیر علیہ السلام جب قید سے چھوٹ آئے اور اس ویران بستی پر گذر ہوا جس کے تمام آدمی مرے پڑے ہیں اور عمارت بھی سب گری ہوئی ہے۔ اور اس وقت وہ بستی ایسی حالت میں تھی کہ وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی پڑی تھی یعنی اس کی چھتیں گر کر پھر اُن پر دیواریں گر گئی تھیں اس ویرانی کو دیکھ کر بطور حسرت اور تعجب یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو مرے پیچھے کس طرح زندہ کرے گا۔ مقصود اس کہنے سے بستی کے دوبارہ زندہ اور آباد ہونے کی طلب اور تمنا تھی مگر چونکہ عادۃً ایسا ہونا بعید تھا اس لیے یہ خیال گذرا کہ کیا میری یہ دعا قبول ہوگی۔ معاذ اللہ خدا کی قدرت میں کوئی شبہ اور تردد نہ تھا بعث کا یقین کامل تھا۔ لیکن تمنا یہ تھی کہ کاش میں بھی اس کا نمونہ دیکھ لوں۔ پس حق تعالیٰ نے اسی جگہ ان کی روح قبض کر کے ان کو سو برس تک مردہ رکھا۔ اور اس عرصہ میں بخت نصر بھی مر گیا اور بنی اسرائیل کو اس کے ظلم وستم سے رہائی ملی اور شہر بیت المقدس از سر نو آباد ہو گیا۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور پھر سو برس کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا تاکہ واضح ہو جائے کہ جو خدا سو برس کے مردہ کو زندہ کر سکتا ہے وہ سو ہزار برس کے مردہ کو بھی زندہ کر سکتا ہے اس کی قدرت کے لیے کوئی خاص مدت شرط نہیں جس وقت اٹھے سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود یا بذریعہ فرشتہ کے پوچھا کہ کتنی دیر ٹھہرا؟ اور اس حالت میں کتنی مدت تک رہا۔ بولے کہ میں اس حالت میں ایک دن رہا یا ایک دن سے کچھ کم اگر یہاں کل اسی وقت آیا تھا تو ایک دن ہوا اگر آج ہی آیا تھا تو ایک دن سے بھی کم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بلکہ تم اس حالت میں سو سال ٹھہرے ہو یعنی تم حقیقۃً میں مر چکے تھے۔ سو سال کی موت کے بعد ہم نے تم کو اپنی قدرت سے زندہ کیا یہ طویل مدت خواب میں نہیں گذری اور تم خواب سے بیدار نہیں ہوئے بلکہ موت سے دوبارہ زندہ ہوئے ہو پس اگر تم کو یہ شبہ ہو کہ باوجود اتنی طویل مدت گزرنے کے میرے جسم میں کوئی تغیر نہیں ہوا تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ لو کہ باوجود اتنی طویل مدت گذرنے کے اس میں ذرہ برابر تغیر نہیں آیا حالانکہ کھانے پینے کی چیز میں بہت جلد تغیر آ جاتا ہے اور موسم گرما میں تو صبح کا کھانا شام ہی تک خراب ہو جاتا ہے پس جو خدا کھانے پینے کی چیز کو اتنی مدت تغیر سے محفوظ رکھ سکتا ہے وہی خدا تمہارے جسم کو بھی اتنی مدت تغیر سے محفوظ رکھ سکتا ہے اور اس کے مقابل اپنی سواری کے گدھے کی طرف نظر کیجیے کہ وہ گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے اور اس کی ہڈیاں اس قدر بوسیدہ ہو چکی ہیں کہ ہاتھ لگانے کی بھی تاب نہیں رکھتیں۔ گدھے کی یہ حالت ایک دن میں نہیں ہو سکتی۔ ہڈیوں کے بوسیدہ ہونے کے لیے ایک مدت مدید چاہیے اور اب ہم عنقریب تمہارے سامنے ہی اس

= نے ان کو نہ پہچانا کیونکہ یہ تو جوان رہے اور ان کے آگے کے بچے بوڑھے ہو گئے جب انہوں نے تورات حفظ سنائی تب لوگوں کو ان کا یقین آیا بخت نصر بنی اسرائیل کی تمام کتابیں جلا گیا تھا جن میں تورات بھی تھی۔

مردہ گدھے کو زندہ کریں گے۔ اور دوبارہ اس کو گوشت اور پوست عطا کریں گے تا کہ تم اپنی آنکھوں سے مردہ کو زندہ ہوتا ہوا دیکھ لو اور ہم نے تم کو سو برس کی موت کے بعد اس لیے زندہ کیا تا کہ ہم تم کو تمہارے طعام اور شراب میں اور تمہاری سواری (حمار) میں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلائیں اور تمہارے تعجب اور استبعاد ظاہری ﴿اَنّٰی یُحۡیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِھَا﴾ کو دور کریں اور تا کہ ہم تم کو لوگوں کے لیے قیامت کی ایک نشانی بنائیں کہ قیامت کے دن بھی اسی طرح اللہ کی قدرت سے مردے قبروں سے زندہ ہو کر اٹھیں گے اور لوگ جب تم کو دیکھیں تو قیامت کی ایک مجسم دلیل اور برہان سمجھیں اور یقین کریں کہ قیامت میں بھی مردے اسی طرح جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اپنی ذات کے علاوہ احیاء موتی کی کیفیت کا مشاہدہ کرو تو اس مرے ہوئے گدھے کی ہڈیوں کی طرف نظر کرو کہ کس طرح ہم ان کو جوڑتے ہیں اور پھر کس طرح ان پر گوشت چڑھاتے ہیں اور پھر کس طرح ان میں جان ڈالتے ہیں اور اسی طرح وہ گدھا زندہ ہو کر ان کے روبرو کھڑا ہو گیا اور گدھوں کی طرح بولنے لگا۔ پس جب مردہ کا زندہ ہونا مشاہدہ سے ظاہر اور واضح ہو گیا تو بے اختیار جوشِ مسرت میں یہ بولے کہ یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ مردہ کے زندہ ہونے کا علم الیقین تو پہلے بھی تھا لیکن اس مشاہدہ اور معاینہ کے بعد عین الیقین کا درجہ حاصل ہو گیا یعنی مجھ کو پہلے ہی سے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے پس جس چیز کو پہلے سے جانتا تھا اب اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ اور جو چیز پہلے سے یقینی تھی اب وہ مشاہدۂ عینی بن کر سامنے آ گئی حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنی قدرت کا کرشمہ مجھ کو میری آنکھوں سے دکھلایا۔

ف:...... اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر کو چار نشانیاں دکھلائیں۔ دو اُن کی ذات میں اور دو خارجی۔ ۱۔ سو سال مردہ رکھ کر ان کو دوبارہ زندہ کرنا۔ ۲۔ سو سال تک ان کے جسم کا صحیح سالم محفوظ رہنا۔ حدیث میں ہے:

> "ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیاء"۔ "اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے بدن کا کھانا حرام کر دیا ہے۔"

اور خارجی دو نشانیاں یہ تھیں کہ ایک طعام و شراب کی کہ سو سال میں تغیر نہ آیا جس طرح حضرت عزیر علیہ السلام کے جسم مبارک پر کوئی تغیر نہ آیا اور دوسری نشانی حمار (گدھے) کی کہ مر کر ہڈیوں کا ڈھیر ہو گیا اس کو دوبارہ زندہ کر کے دکھایا تا کہ کیفیت احیاء موتی کی معلوم ہو جائے راکب اور مرکوب دونوں سو سال کے بعد زندہ ہوئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام یہاں سے اٹھ کر اسی حمار پر سوار ہو کر بیت المقدس واپس ہوئے اور شہر کو آباد پایا اور اپنے محلہ اور گھر پہنچے تو کسی نے نہ پہچانا اس لیے کہ بچے تو بوڑھے ہو چکے تھے اور حضرت عزیر علیہ السلام جوان رہے اللہ تعالیٰ نے ان کی حیات اور جوانی کو محفوظ رکھا۔ پھر علامتیں دیکھ کر سب نے پہچانا اور یقین کیا کہ یہ عزیر علیہ السلام ہمارے باپ ہیں تفصیل کے لیے امام قرطبی رحمہ اللہ کی تفسیر: ۳/ ۲۹۴ کو دیکھئے۔

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰی

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اے پروردگار میرے دکھلا دے مجھ کو کہ کیونکر زندہ کرے گا تو مردے فرمایا کیا تو نے یقین نہیں کیا، کہا کیوں نہیں

اور جب کہا ابراہیم نے اے رب! دکھا مجھ کو کیوں کر جلائے گا تو مردے؟ فرمایا کیا تو نے یقین نہیں کیا؟ کہا کیوں نہیں!

وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ

لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جاوے میرے دل کو ف۱ فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اڑنے والے پھر ان کو ملا لے اپنے ساتھ پھر رکھ دے

لیکن اس واسطے کہ تسکین ہو میرے دل کو۔ فرمایا تو پکڑ چار جانور اڑتے پھر ان کو ہلا اپنے ساتھ سے، پھر ڈال

عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ

ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو بلا چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے ف۲ اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست ہے

ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا، پھر ان کو پکار، کہ آویں تیرے پاس دوڑتے، اور جان لے کہ اللہ زبردست ہے

حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع ۳۵

حکمت والا ف۳

حکمت والا۔

قصہ سوم

نیز برائے اثبات حشر ونشر

قال تعالیٰ: ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ ... الی ... عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾

اور اسی گزرنے والے شخص کے قصہ کے مانند حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیجئے جس وقت کہ ابراہیم نے کہا اے پروردگار آپ مجھ کو یہ دکھلا دیجئے کہ آپ کس طرح مردوں کو زندہ کرتے ہیں تا کہ مجھ کو معلوم ہو جائے کہ آپ قیامت کے دن کس طرح اور کس کیفیت کے ساتھ مُردوں کو زندہ فرمائیں گے۔ آپ کی قدرت کی کوئی نہایت نہیں آپ جس کیفیت کے ساتھ چاہیں مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں۔ آپ کے زندہ کرنے کی عقلاً بیشمار کیفیتیں ممکن ہیں معلوم نہیں کہ قیامت کے دن

ف۱ خلاصہ یہ ہوا کہ یقین پورا تھا صرف عین الیقین کے خواستگار تھے جو مشاہدہ پر موقوف ہے۔

ف۲ حضرت ابراہیم حسب ارشاد الٰہی چار جانور لائے ایک مور ایک مرغ ایک کوا ایک کبوتر اور چاروں کو اپنے ساتھ ہلایا تا کہ پہچان رہے اور بلانے سے آنے لگیں پھر چاروں کو ذبح کیا پھر ایک پہاڑ پر چاروں کے سر رکھے ایک پر پَر رکھے ایک پر سب کے دھڑ رکھے ایک پر پاؤں رکھے پہلے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک کو پکارا اس کا سر اٹھ کر ہوا میں کھڑا ہوا پھر دھڑ ملا پھر پَر لگے پھر پاؤں وہ دوڑتا چلا آیا پھر اسی طرح چاروں آ گئے۔

ف۳ یہاں دو خلجان گزرنے کا قوی احتمال ہے اول تو جسم بے جان متفرق الاجزاء کا زندہ ہونا قابل انکار دوسرے ان خصوصیات کو کہ وہ پرندے ہوں اور چار بھی ہوں اور چار بھی فلاں فلاں ہوں اور اس طرح انکے اجزاء کو متفرق کر کے بلایا جائے تو زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے اسکو کوئی دخل اور ان قیود کا کوئی نفع معلوم نہیں ہوتا اس لئے اول خلجان کے جواب میں عزیز اور دوسرے کے جواب میں حکیم فرما کر دونوں شبہوں کا قلع قمع فرما دیا یعنی اسکو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست قدرت والا ہے جو چاہے کر سکتا ہے اور اس کے ہر حکم میں اس قدر حکمتیں ہوتی ہیں کہ جن کا ادراک اور احاطہ اگر ہم کو نہ ہو تو یہ ہمارے نقصان علم کی بات ہے اسکی حکمت کا انکار ایسے امور سے ہرگز ممکن نہیں واللہ اعلم آیۃ الکرسی میں علم و قدرت وغیرہ صفات الٰہی کو ذکر فرمایا اس کے بعد یہ تین قصے بیان فرمائے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت کر سکتا ہے اور جس کو چاہے گمراہ کر سکتا ہے اور مارنا جلانا سب اس کے اختیار میں ہے اب جہاد اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت اور اسکے متعلق قیود و شرائط بیان فرماتے ہیں جس کا ذکر کسی قدر گزر بھی چکا ہے کیونکہ جہاد و انفاق مال میں جو موانع نظر آتے ہیں حق تعالیٰ کے علم و قدرت کے تعین کر لینے کے بعد اور اس کی عجائب قدرت کے حالات معلوم ہونے کے بعد ان کا ازالہ ہو گا ورنہ نقصان تو ان میں ضرور آنا چاہیے۔

مردوں کے زندہ کرنے کی کیا کیفیت ہوگی اس لیے اس کی تعیین چاہتا ہوں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ کس کیفیت کے ساتھ مردے زندہ ہوں گے۔ کیونکہ کیف کے ذریعہ سے جو سوال کیا جاتا ہے اگرچہ اکثر اور بیشتر وہ کیفیت دریافت کرنے کے لیے ہوتا ہے اصل شی تو یقینی ہوتی ہے فقط کیفیت کی تعیین مطلوب ہوتی ہے لیکن بعض مرتبہ کیف کا استعمال انکار اور تعجب کے موقعہ پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں یہ بوجھ اور وزن اٹھا سکتا ہوں اور تمہارا گمان یہ ہو کہ یہ شخص اس وزن کے اٹھانے سے قاصر ہے تو ایسے موقعہ پر اس سے یہ کہتے ہو:

"ارنی کیف تحمل هذا"۔ "مجھ کو دکھلاؤ کہ تم اس بوجھ کو کس طرح اٹھاؤ گے۔"

اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ تم نہیں اٹھا سکو گے۔ اور اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کا قلب سلیم اس احتمال کے شائبہ سے بھی پاک اور منزہ ہے اس لیے سوال فرمایا ﴿اَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ اے ابراہیم کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے تا کہ ابراہیم علیہ السلام جب اس سوال کا جواب دیں تو ان کی مراد اور ان کا مقام اور مرتبہ معلوم ہو جائے اور کسی کم عقل کو خلیل اللہ علیہ السلام کی مراد کے سمجھنے میں کوئی غلطی نہ پیش آئے چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا کہ اے پروردگار کیوں نہیں مجھے آپ کے کمال قدرت کا یقین کامل ہے آخر مجھ کو بھی تو آپ نے اپنی قدرت سے زندہ کیا ہے ولیکن یہ درخواست یقین حاصل کرنے کے لیے نہیں کی بلکہ اس لیے کی ہے تا کہ میرے قلب کو سکون اور اطمینان ہو جائے اس لیے کہ جب یہ مشاہدہ، گزشتہ اذعان اور ایقان کے ساتھ مل جائے گا تو مزید اطمینان کا موجب ہوگا اور مشاہدہ سے احیاء کی کیفیت بھی متعین ہو جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ خبر مشاہدہ اور معاینہ کے برابر نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر خبر دی کہ آپ کی قوم گوسالہ پرستی میں مبتلا ہوگئی تو اس اطلاع پانے پر الواح توراۃ یعنی توریت کی تختیوں کو ہاتھ سے نہیں پھینکا اور جب شہر میں واپس آکر ان کی گوسالہ پرستی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا تو غصہ میں آکر تختیاں ہاتھ سے پھینک دیں۔ کما رواہ احمد والطبرانی بسند صحیح۔

وقال تعالیٰ: ﴿وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ﴾

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال شک اور تردد کی بنا پر نہ تھا بلکہ مشاہدہ اور معاینہ کے ساتھ خاص اطمینان اور سکون کا حاصل کرنا مقصود تھا کیونکہ جو سکون اور اطمینان مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے وہ خبر اور استدلال سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں یعنی "عین الیقین می خواہم" واللہ اعلم۔ یعنی برأی العین مجھ کو احیاء موتی کی کیفیت دکھلا دے اور کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ولکن للعیان لطیف معنی   له سأل المشاهدة الخلیل

یاد رہے کہ بارگاہِ خداوندی میں اس قسم کا سوال وہی کر سکتا ہے کہ جس کو اس بارگاہ میں خاص تقرب حاصل ہو جوش محبت اور مقام انس اور مقام ناز اس کو اس عرض و نیاز پر آمادہ کرے۔ باقی جس شخص کو خدا کی قدرت ہی میں شک اور شبہ ہو اس کا اس بارگاہِ عالی میں گزر ہی ممکن نہیں "سوال را چہ مجال۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا پس چار پرندے لے لو اور پھر ان کو اپنے نزدیک ① کر لو یعنی ان کی صورت پہچان کر اپنے پاس کر لو اور اپنے سے ہلا لو تا کہ ان کی خوب شناخت ہو جائے اور وہ بھی زندہ ہونے کے بعد تم کو پہچان لیں اور تمہاری آواز پر تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں۔ بعد ازاں ان کو ذبح کر کے اور ان کے گوشت اور پوست کو خلط ملط کر کے ہر پہاڑ پر ایک ایک ٹکڑا رکھ دو پھر ان کو بلاؤ سب زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے تیرے پاس چلے آئیں گے۔ اس طرح سے تم اپنا اطمینان کر لو اور یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ بڑا غالب اور زبردست ہے کوئی اس کی مشیت اور ارادہ کو روک نہیں سکتا یعنی جس طرح خدا تعالیٰ ان جانوروں کے متفرق اجزاء کو دوبارہ جوڑ کر اور گوشت اور پوست چڑھا کر زندہ کر سکتا ہے اسی طرح قیامت کے دن مردوں کے جسموں کے متفرق ریزوں کو جمع کر کے ان میں روح ڈال سکتا ہے اور بڑی حکمت والا ہے۔ کوئی اس کے افعال کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی حکمت کہ اس نے چار پرندوں کے ذبح کر کے پہاڑوں پر رکھنے کا کیوں حکم دیا اسی کو معلوم ہے کہ اس میں کیا حکمت ہے۔

فوائد و لطائف

(۱) یہ قصہ اور گزشتہ قصہ قریب قریب ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس قصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کی تصریح فرمائی اور پہلے قصہ میں گذرنے والے کا نام نہیں ذکر فرمایا۔ بظاہر وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال میں ادب کو خاص طور پر ملحوظ رکھا۔ اور گزشتہ سوال ﴿أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ میں ایہام اور شبہ انکار اور تعجب کا ہوتا تھا۔ اس لیے ان کا نام نہیں ذکر فرمایا۔ نیز جواب میں امتحان اور تجربہ خود ان پر ہوا۔ اور سو سال مردہ رکھنے کے بعد سوال کا جواب دیا گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فوری جواب دیا گیا۔

(۲) یہ دونوں ② واقعے یعنی حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ قیامت کے دن احیاء موتیٰ اس طرح سے ہوگا کہ اجسام کے متفرق اجزاء کو جمع کر کے ان میں ان کی روح ڈال دی جائے گی۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ معاد جسمانی ہوگی نہ کہ فقط روحانی۔ اور جو لوگ معاد جسمانی کے منکر ہیں وہ صریح نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے منکر ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔

(۳) نیز ان دونوں قصوں سے یہ امر بخوبی ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کبھی کبھی بطور خرق عادت اور بطور معجزہ دنیا میں بھی مردوں کو زندہ فرما دیتے ہیں اور اس کے علاوہ قرآن کریم کی متعدد آیات سے صراحۃً دنیا میں مردوں کا زندہ کرنا بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کو ایک مرتبہ ہلاک کر کے دوبارہ زندہ کرنا ﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ میں ذکر فرمایا۔

---

① یہ ترجمہ ﴿فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ﴾ کا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "پس بہم آور ہمہ را نزدیک خود"

② وفی الآیۃ دلیل لمن ذھب الی ان احیاء الموتی یوم القیامۃ بجمع الاجزاء المتفرقۃ وارسال الروح الیھا بعد ترکیبھا ولیس ھو من باب اعادۃ المعدوم الصرف لانہ سبحانہ وتعالیٰ بین الکیفیۃ بالتفریق ثم الجمع واعادۃ الروح ولم یعدم ھنالک سوی الجزء الصوری والھیئۃ الترکیبیۃ دون الاجزاء المادیۃ ۱۲ روح المعانی: ۲۶/۳۔

اور علیٰ ہذا بنی اسرائیل کے ان ہزاروں آدمیوں کو جو موت سے ڈر کر بھاگے تھے مار کر دوبارہ زندہ کرنا ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ﴾ میں صراحۃً مذکور ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا "وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ" قرآن کریم میں متعدد جگہ صراحۃً مذکور ہے۔

مرزا قادیانی نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور دیکھا کہ مسیح بن مریم علیہ السلام کی طرح میں تو مردوں کو زندہ کر کے دکھانے سے عاجز ہوں اس لیے اس نے اپنی فرضی نبوت کے قائم رکھنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے اس قسم کے تمام معجزات کا انکار کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو ایک دفعہ مار کر دوبارہ دنیا میں بھیجے۔ اگر یہ اللہ کی عام عادت ہوتی تو لوگ قیامت کے منکر نہ ہوتے۔ بیشک اللہ کا یہ عام قانون ہے مگر ناممکن اور محال نہیں۔ حق تعالیٰ بطور اعجاز اور اکرام کبھی کبھی دنیا میں بھی کسی مردہ کو کسی برگزیدہ بندہ کی دعا سے دوبارہ زندہ فرما دیتے ہیں تاکہ خدا کی قدرت اور اس نبی کی نبوت اور قیامت کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

ملحد اور بے دین لوگ جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور خوارق عادات کے منکر ہیں وہ اس قسم کے واقعات میں طرح طرح کی تحریفات کیا کرتے ہیں خوب سمجھ لو۔

(۴) ان چار پرندوں کے نام اگرچہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما اور علماء تابعین سے منقول ہے کہ ان کے نام یہ تھے: مور اور کبوتر اور مرغ اور کوا اور بعض نے بجائے کوے کے غرنوق کو ذکر کیا ہے۔

انسان چونکہ عناصر اربعہ سے مرکب ہے اس لیے عجب نہیں کہ اس کے مناسب چار پرند مختلف الطبائع لینے کا حکم دیا گیا ہو تاکہ معلوم ہو جائے کہ قیامت کے دن بھی اسی طرح اجزاء عنصریہ متفرق اور جدا ہونے کے بعد پھر آپس میں مل جائیں گے اور روح ڈال کر زندہ کر دیے جائیں گے۔ واللہ اعلم

(۵) ﴿فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ﴾ کی جو تفسیر ہم نے ذکر کی ہے چار پرندے لے کر ان کو ذبح کرو اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرو اور چار مختلف پہاڑوں پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو اور پھر ان کو آواز دو بحکم خداوندی سب زندہ ہو کر تمہاری آواز پر تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے یہی تفسیر علماء صحابہ اور تابعین سے منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر اور عکرمہ اور ابو مالک اور ابو الاسود دؤلی اور وہب بن منبہ اور حسن بصری اور سدی وغیرہم رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۵۸) اور یہی معنی مجاہد اور ابو عبیدہ اور ابن الانباری اور زجاج رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۳/ ۳۰۱) امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس تفسیر کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اسی تفسیر پر تمام مفسرین کا اجماع ہے اور یہی ظاہر قرآن کا مدلول ہے۔ صرف ایک ابو مسلم اصبہانی سے منقول ہے کہ وہ اس قصہ کا منکر تھا اور یہ کہتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قصہ کوئی حقیقت اور واقعہ نہیں بلکہ محض تشبیہ اور تمثیل ہے اور مراد یہ ہے کہ چار پرندے لے کر پال لو اور ان کو اپنے سے مانوس کر لو اور دانہ ڈال کر ان کو اپنے سے ایسا ہلا لو کہ اگر وہ پہاڑ پر بھی بیٹھے ہوں اور تم ان کو آواز دو تو وہ فوراً تمہاری آواز پر دوڑے چلے آئیں۔ اسی طرح اے ابراہیم! تم لوگوں کو اپنے سے اتنا مانوس بناؤ کہ جب تم ان کو حق کی طرف بلاؤ تو سب دوڑے چلے آئیں۔ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو مسلم کا یہ قول، مفسرین کی اجماعی تفسیر کے خلاف ہے اس لیے کہ اس پر سب کا اجماع ہے کہ وہ

پرندے ذبح کیے گئے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے لہٰذا ذبح اور قطع سے انکار کرنا اجماع سے انکار کرنا ہے۔ علاوہ ازیں اگر آیت کا یہ مطلب ہو جو ابو مسلم نے بیان کیا ہے تو پھر احیاء موتی کا کیا معجزہ ظاہر ہوا۔ پرندوں کو دانہ ڈال کر اپنے سے ہلا لینا یہ کام تو وہ لوگ بہت زیادہ آسانی سے کر سکتے ہیں جو مرغ اور بٹیر پالتے ہیں اس میں ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہوئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کیا کیفیت ظاہر ہوئی چند جانوروں کو پال لینا اور ہلا لینا اور ان کو بلا لینا اس کا نام احیاء موتی کیسے ہو سکتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ﴿رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی﴾ درخواست کی تھی کہ مجھ کو یہ امر دکھلا دیا جائے کہ مردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں۔ ابو مسلم کے قول پر وہ درخواست منظور نہیں ہوئی حالانکہ ظاہر آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا درجۂ اجابت کو پہنچی اور ابو مسلم کے قول پر دعا کا اجابت کو پہنچنا نہیں پایا جاتا۔ نیز اس آیت میں ﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ کا جو لفظ آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان پرندوں کے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے تھے۔ زندہ پرندوں کا بلا لینا مراد نہیں۔ (تفسیر کبیر: ۲/ ۴۹۴، تفسیر نیسابوری: ۳/ ۳۸)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ ابو مسلم کے اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

"ولا یخفی ان ھذا خلاف اجماع المسلمین وضرب من الھذیان لا یرکن الیہ ارباب الدین وعدول عما یقتضیہ ظاھر الآیۃ المؤید بالاخبار الصحیحۃ والآثار الراجحۃ الیٰ ما تمجہ الاسماع ولا یدعو الیہ داع فالحق اتباع الجماعۃ وید اللہ تعالیٰ معھم۔" (روح المعانی: ۳/ ۲۶)

"اہل علم پر پوشیدہ نہیں کہ ابو مسلم کا یہ قول اجماع مسلمین کے خلاف ہے اور ایک قسم کا ہذیان اور بکواس ہے جس کی طرف اہل دین کبھی مائل نہ ہوں گے۔ نیز اس معنی پر آیت کے ظاہری مدلول سے بے وجہ عدول اور انحراف کرنا ہے اور اخبار صحیحہ اور آثار معتبرہ اس ظاہر کی مؤید ہیں۔ لہٰذا ایسے ظاہر اور صریح کو چھوڑ کر ایسے معنی کی طرف مائل ہونا جس کے سننے سے بھی کانوں کو گرانی ہوتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ بلا کسی وجہ اور بلا کسی داعی کے اس معنی کی طرف رجوع کیا جائے۔ لہٰذا حق یہ ہے کہ جماعت مفسرین نے آیت کے جو معنی بیان کیے ہیں اسی کا اتباع کیا جائے اور اللہ کا ہاتھ جماعت کے سر پر ہوتا ہے۔"

حکایت:...... بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قصہ کو ﴿وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ﴾ پر ختم فرمایا۔ اشارہ اس طرف تھا کہ اے ابراہیم! تم نے ہم سے ﴿رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی﴾ کی درخواست کی ہم نے اس کو منظور کیا۔ ایک وقت آنے والا ہے کہ ہم تم سے یہ کہیں گے کہ "عَبْدِیْ اَرِنِیْ کَیْفَ تُمِیْتُ الْاَحْیَاءَ" اے میرے بندے تو مجھ کو یہ دکھلا کہ تو میرے لیے زندہ کو کس طرح موت دیتا ہے یعنی زندہ بیٹے کو کس طرح میرے لیے قربان کرتا ہے۔ (روح المعانی: ۳/ ۲۷)

رجوع باحکام صدقات

ابتداء پارہ میں اہل ایمان [1] کو حکم دیا تھا کہ وقت کو غنیمت سمجھیں اور موت اور قیامت کے آنے سے پیشتر جو

[1] قال تعالیٰ: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ﴾ الخ۔

کچھ خدا کی راہ میں خرچ کر سکیں اس سے دریغ نہ کریں۔ بعد ازاں اس کے مناسب مبداء اور معاد کے اثبات کے لیے تین قصے ذکر فرمائے اب پھر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر فرماتے ہیں کہ اے اہل ایمان جب قیامت کا حق ہونا معلوم ہوگیا تو پھر آخرت کے لیے کوئی توشہ بھی تیار کرو جو قیامت کے دن تمہیں کام آئے۔ نیز نفس پر آخرت کے لیے خرچ کرنا بہت شاق اور گراں ہوتا ہے۔ اور جب قیامت اور آخرت کا یقین ہو جائے تو پھر خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے اس لیے اثبات قیامت اور آخرت کے بعد عالم آخرت کے لیے ساز و سامان تیار کرنے کی ترغیب دی جس کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ

مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ اس سے اگیں سات

مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں جیسے ایک دانہ اس سے اگیں سات

سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

بالیں ہر بال میں سو سو دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے اور اللہ نہایت بخشش کرنے والا ہے

بالیں ہر بال میں سو سو دانے۔ اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے

عَلِيْمٌ ۝۲۶۱ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا

سب کچھ جانتا ہے ف۱ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان

سب جانتا جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں، پھر پیچھے خرچ کر کر نہ احسان

مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ

رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انہی کے لئے ہے ثواب ان کا اپنے رب کے یہاں اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ

رکھتے ہیں نہ ستاتے ہیں انہیں کو ہے ثواب ان کا اپنے رب کے ہاں اور نہ ڈر ہے ان پر، اور نہ وہ

يَحْزَنُوْنَ ۝۲۶۲ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ

غمگین ہوں گے ف۲ جواب دینا نرم اور درگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے پیچھے ہو ستانا اور اللہ بے پرواہ ہے

غم کھاویں گے۔ بات کہنی معقول اور در گذر کرنی بہتر اس خیرات سے جس کے پیچھے ستانا اور اللہ بے پرواہ ہے

ف۱ یعنی اللہ کی راہ میں تھوڑے مال کا بھی ثواب بہت ہے جیسا ایک دانہ سے سات سو دانے پیدا ہوں اور اللہ تعالیٰ بڑھائے جس کے واسطے چاہے اور سات سو سے سات ہزار اور اس سے بھی زیادہ کر دے اور اللہ بہت بخشش کرنے والا اور ہر ایک خرچ کرنے والے کی نیت اور اس کے خرچ کی مقدار اور مال کی کیفیت کو خوب جانتا ہے یعنی ہر ایک سے اسکے مناسب معاملہ فرماتا ہے۔

ف۲ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کئے پر نہ زبان سے احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں طعن سے اور نہ خدمت لینے سے اور نہ تحقیر کرنے سے انہی کے لئے ہے ثواب کامل اور نہ ڈر ہے ان کو ثواب کم ہونے کا اور نہ غمگین ہوں گے ثواب کے نقصان سے۔

حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ

نہایت تحمل والا ف۱ اے ایمان والو مت ضائع کرو اپنی خیرات احسان رکھ کر اور ایذاء دے کر اس شخص کی طرح

تحمل والا اے ایمان والو! مت ضائع کرو اپنی خیرات، احسان رکھ کر اور ستا کر، جیسے وہ

يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ

جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو اور یقین نہیں رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر ف۲ سو اس کی مثال ایسی ہے جیسے

جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور پچھلے دن پر۔ سو اس کی مثال جیسے

صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا

صاف پتھر کہ اس پر پڑی ہے کچھ مٹی پھر برسا اس پر زور کا مینہ تو کر چھوڑا اس کو بالکل صاف کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے

صاف پتھر، اس پر پڑی ہے مٹی، پھر اس پر برسا زور کا مینہ تو اس کو کر رکھا سخت کچھ ہاتھ نہیں لگتی ان کو

كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

ثواب اس چیز کا جو انہوں نے کمایا اور اللہ نہیں دکھاتا سیدھی راہ کافروں کو ف۳

اپنی کمائی اور اللہ راہ نہیں دیتا منکر لوگوں کو۔

فضیلت انفاق فی سبیل اللہ وذکر بعض شرائط قبول

قَالَ تَعَالٰى: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ... الى... وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾

ان آیات میں عالم آخرت کے لیے ساز وسامان تیار کرنے کی ترغیب کے لیے ایک مثال بیان فرماتے ہیں جو ضمناً اثبات قیامت کی بھی دلیل ہے۔ اس لیے کہ جو ذات پاک زمین میں ایک دانہ ڈالنے اور سات سو دانے اُگانے پر قادر ہے، وہ مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ جو لوگ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے کہ ایک دانہ زمین میں ڈالا جائے جو کہ سات بالیں اگائے اور ہر بال میں سو دانے ہوں اسی طرح صدقہ دینے والا

ف۱ یعنی مانگنے والے کو نرمی سے جواب دینا اور اس کے اصرار اور بدخوئی پر درگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے کہ بار بار اسکو شرمائے یا احسان رکھے یا طعنہ دے اور اللہ غنی ہے کسی کے مال کی اس کو حاجت نہیں جو صدقہ اس کی راہ میں کرتا ہے اپنے واسطے کرتا ہے اور حلیم ہے کہ ستانے پر عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں فرماتا۔

ف۲ یعنی صدقہ دے کر محتاج کو ستانے اور اس پر احسان رکھنے سے صدقہ کا ثواب جاتا رہتا ہے یا اوروں کو دکھا کر اس لئے صدقہ دیتا ہے کہ لوگ سخی جانیں اس طرح کی بھی خیرات کا ثواب کچھ نہیں ہوتا باقی یہ فرمانا کہ وہ یقین نہیں رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر یہ ابطال صدقہ کے لئے قید و شرط نہیں ہیں کیونکہ صدقہ تو صرف ریا سے ہی باطل ہو سکتا ہے اگرچہ خرچ کرنیوالا مومن ہی کیوں نہ ہو مگر اس قید کو صرف اس نفع کی غرض سے بڑھایا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ریاکاری مومن کی شان سے بعید ہے بلکہ یہ امر منافقین کے مناسب حال ہے۔

ف۳ اوپر مثال بیان فرمائی تھی خیرات کی کہ ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا اور اس سے سات سو دانے پیدا ہو گئے اب فرماتے ہیں کہ نیت شرط ہے اگر کسی نے ریا اور دکھاوے کی نیت سے صدقہ کیا تو اس کی مثال ایسی سمجھو کہ کسی نے دانہ بویا ایسے پتھر پر کہ جس پر تھوڑی سی مٹی نظر آتی تھی جب مینہ برسا تو بالکل صاف رہ گیا اب اس پر دانہ کیا اگے گا ایسے ہی صدقات میں ریاکاروں کو کیا ثواب ملے گا۔

بمنزلہ مزارع کے ہے اور مال بمنزلہ تخم اور دانہ کے ہے اور سبیل اللہ بمنزلہ زمین زراعت کے ہے جو خدا کی راہ میں مال خرچ کرے گا۔ اور سات سو گونہ کی کوئی تحدید نہیں۔ اللہ تعالیٰ بقدر اخلاص اور بقدر نیت اور مشقت کے جس کے لیے جس قدر چاہتا ہے اور بڑھا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی کشائش والا ہے اس کی عطا اور بخشش کی کوئی حد اور نہایت نہیں۔ دینے سے اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اور اخلاص اور نیت اور اس کی مقدار اور کیفیت کو بھی خوب جاننے والے ہیں اس کے مطابق بڑھاتے ہیں اور جس طرح پیداوار کے لیے یہ شرط ہے کہ تخم اور دانہ خراب نہ ہو اور زمین تخم ریزی کے قابل ہو اور آئندہ چل کر بھی کھیتی آفتوں سے محفوظ اور مامون رہے تب پیداوار ہوگی اسی طرح صدقہ کے لیے یہ شرط ہے کہ مال حلال ہو اور جس راہ میں خرچ کیا جا رہا ہے وہ بھی خیر اور نیکی کی راہ ہو یعنی صحیح ہو اور آئندہ چل کر وہ صدقہ احسان جتلانے اور ایذا رسانی کی آفت سے بھی محفوظ اور مامون رہے تب اس صدقہ کا سات سو گونہ بدلہ ملے گا۔ چنانچہ آئندہ آیات میں ارشاد فرماتے ہیں۔ جو لوگ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو زبان سے احسان جتلاتے ہیں اور نہ کسی اپنے عمل اور برتاؤ سے اس کو ایذاء پہنچاتے ہیں تو ایسے ہی لوگوں کو ان کے پروردگار کے یہاں صدقہ کا اجر اضعافا مضاعفہ ملے گا اور نہ ان کو آئندہ ڈر ہے کہ ہمارا صدقہ کسی آفت سماویہ سے ہلاک ہو جائے اور نہ قیامت کے دن غمگین ہوں گے کہ ہمارا صدقہ بے کار گیا اس لیے کہ صدقہ کی کھیتی سماوی آفتوں سے تباہ اور برباد نہیں ہوتی۔ بلکہ خرچ کرنے والے کے نفس کی طرف سے جو "مَنّ" اور "اذیٰ" اور "ریاء" کی آفتیں آتی ہیں ان سے تباہ اور برباد ہوتی ہے۔ اور صدقہ دینے کے بعد "مَن" اور "اذیٰ" یعنی احسان جتلانے اور ستانے سے اس لیے منع کیا گیا کہ سائل کو معقول اور مناسب طریقہ سے جواب دے دینا اور نرمی کے ساتھ اپنی ناداری اور نہ دینے کا عذر کر دینا اور اگر سائل اصرار کرے اور کچھ سخت اور سست کہے تو اس سے درگذر کرنا اس خیرات سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کے بعد ستایا جاوے۔ اس لیے کہ صدقہ اور خیرات سے محتاج اور سائل کی تکلیف کو دور کرنا تھا۔ پس جب وہ مقصد حاصل نہ ہوا تو وہ صدقہ بے کار ہی گیا۔ ایسی سخاوت سے تو بخل بہتر ہے کہ جس کے بعد اس کو ذلیل اور حقیر کیا جائے سائل کی ایک تکلیف دور کی اور پھر دوسری تکلیف اس کو پہنچائی۔ یہ ایسا ہے کہ ایک کانٹا نکالا اور دوسرا کانٹا چبھو دیا اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں ان کو کسی کے مال اور خیرات کی ذرہ برابر حاجت نہیں۔ جو خیرات کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے اور بردبار اور تحمل والے ہیں۔ احسان جتلانے والے اور ستانے والے کو جلدی سزا نہیں دیتے۔ ان آیات میں "مَنّ" اور "اذیٰ" کا بیان تھا۔ اب آئندہ آیات میں "ریاء" کا بیان فرماتے ہیں کہ صدقہ کی قبولیت کے لیے اخلاص اور نیت شرط ہے اگر دکھاوے کی نیت سے خرچ کیا تو بے کار ہے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے اس پتھر پر دانہ ڈالے جس پر کچھ مٹی نظر آتی ہو اور ظاہر نظر میں یہ گمان ہو کہ یہ جگہ قابل زراعت ہے اور جب اس پر بارش ہو تو سب بہہ گیا اور کوئی چیز بھی اس کے قبضہ میں نہ رہی۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتلانے اور ایذاء پہنچانے سے ضائع مت کرو۔ احسان جتلانا احسان کرنے کے منافی ہے اور نیکی کرنا اور تکلیف پہنچانا ایک دوسرے کی ضد ہیں دونوں جمع نہیں ہو سکتیں۔ خیرات کر کے احسان جتلانے والا اور ایذاء پہنچانے والا اس شخص کے مشابہ ہے۔ جو اپنا مال لوگوں کو دکھلانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ یعنی اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ذخیرہ کے لیے خیرات نہیں کرتا

بلکہ محض لوگوں کے دکھاوے کے لیے خیرات کرتا ہے جو مومن کی شان نہیں بلکہ منافق کی خصلت ہے۔ پس ریا اور نمود کے لیے خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہے کہ صاف پتھر ہو۔ جس پر کوئی چیز نہیں اگتی اور اس پر کچھ مٹی پڑی ہو۔ اس کو دیکھ کر اس میں دانہ ڈالے اور یہ گمان کرے کہ اس میں سات دانے پیدا ہوں گے۔ پھر اس پر ایک سخت بارش پڑی جس نے اس پتھر کو بالکل صاف کر دیا۔ اور مٹی اور دانہ کا نام ونشان نہ چھوڑا۔ ظاہر ہے کہ اب اس میں کیا اُگے گا۔ اسی طرح نفاق اور ریاء صدقہ اور خیرات کو بہا کر لے جاتا ہے پس قیامت کے دن ریاء اور نفاق سے خرچ کرنے والے اور خرچ کر کے احسان جتلانے والے اور ستانے والے اپنی کمائی میں سے کسی چیز کا ثواب حاصل کرنے پر ذرہ برابر قادر نہ ہوں گے۔ کوئی چیز ان کے ہاتھ نہ لگے گی۔ اس لیے کہ ثواب ملنے کی شرط یہ ہے کہ ایمان اور اخلاص کے ساتھ دیا ہو۔ پس جس نے ریاء اور نفاق سے کچھ خیرات کیا اس کی مثال تو ایسی ہے جس نے پتھر پر دانہ ڈال دیا اور بارش اس کو بہا کر لے گئی اور جس نے اخلاص سے دیا اور بعد میں احسان جتلایا اور ایذاء پہنچائی اس کی مثال ایسی ہے کہ پودا لگایا اور پھر خود ہی اس کو اپنے ہاتھ سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور اللہ تعالیٰ کافروں کو اپنی توفیق اور عنایت سے سرفراز نہیں فرماتے اشارہ اس طرف ہے کہ ریا اور دکھلاوے کے لیے خرچ کرنا اور احسان جتانا اور ستانا یہ کافروں کی صفات ہیں۔ مومن کی شان نہیں کہ ایسا کرے۔

فائدہ:...... جس طرح نماز کے لیے دو قسم کی شرائط ہیں: ایک شرائط صحت، جیسے وضو اور طہارت اور دوسرے شرائط بقاء جیسے نماز میں کسی سے باتیں نہ کرنا اور کھانے اور پینے سے پرہیز کرنا۔ پس اگر وضو ہی نہ کرے تو سرے ہی سے نماز صحیح نہ ہوگی اور اگر وضو اور طہارت کے بعد نماز شروع کی، مگر ایک رکعت یا دو رکعت کے بعد نماز میں کھانا اور پینا اور بولنا شروع کر دیا تو اس کی نماز باقی نہ رہے گی۔

اسی طرح صدقات اور خیرات کے لیے بھی دو قسم کی شرطیں ہیں: ایک شرائط صحت، اور دوسری شرائط بقاء۔ اخلاص شرط صحت ہے۔ بغیر اخلاص کے صدقہ کے صحیح ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو صدقہ ریاء اور نفاق کے ساتھ دیا جائے وہ شریعت میں معتبر نہیں اور "مَنّ" اور "اذیٰ" سے پرہیز شرط بقاء ہے یعنی صدقہ اور خیرات اس وقت تک محفوظ اور باقی رہیں گے جب تک صدقہ دینے کے بعد نہ تو احسان جتایا جائے اور نہ سائل کو کسی قسم کی ایذاء پہنچائی جائے۔ اگر صدقہ دینے کے بعد احسان جتایا یا ستایا تو وہ صدقہ ضائع اور باطل ہو جاتا ہے اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں صدقہ اور خیرات کے مفسدات میں سے ہیں جیسے کھانے اور پینے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اسی طرح "مَنّ" اور "اذیٰ" سے صدقہ باطل ہو جاتا ہے۔

اور چونکہ جو صدقہ نفاق اور ریاء سے دیا جائے اس کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہے۔ اس لیے اس صدقہ کو جو "مَنّ" اور "اذیٰ" کی وجہ سے باطل ہو اس کو اس صدقہ کے ساتھ تشبیہ دی جو کہ ریاء اور نفاق کی وجہ سے باطل ہو۔ اس لیے کہ صدقہ ریاء اور نفاق ابتداء ہی سے باطل ہے کیونکہ شرط صحت مفقود ہے اور صدقہ "مَنّ" اور "اذیٰ" اصل سے صحیح تھا۔ بعد میں "مَنّ" اور "اذیٰ" کی وجہ سے باطل ہوا اس لیے کہ شرط بقاء کی منتفی ہوئی اب اس تقریر کے بعد معتزلہ کا یہ شبہ کافور ہو گیا کہ جس طرح کفر اور ارتداد سے تمام اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر سیئہ اور ہر ہر معصیت کے ارتکاب سے گزشتہ تمام طاعات حبط ہو جاتی ہیں۔

اس لیے کہ صدقہ "مَنّ" اور "اذیٰ" سے اس لیے باطل ہوا کہ صدقہ جو کہ ایک طاعت تھا اس کی شرط بقاء نہیں پائی گئی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً ہر سیئہ کے ارتکاب سے گزشتہ حسنات بھی حبط ہو جائیں۔

اور جن آیات اور احادیث سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ معاصی اور سیئات سے گزشتہ طاعات اور حسنات حبط ہو جاتے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں کہ معاصی اور سیئات کے ارتکاب سے گزشتہ طاعات باطل ہو جاتی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے انوار و برکات جاتے رہتے ہیں۔ جیسے حدیث میں ہے "اذا زنی العبد خرج منه الایمان"۔ یعنی جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان کا نور زائل ہو جاتا ہے اور یہ مطلب نہیں کہ زنا کرنے سے کافر ہو جاتا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ

اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دلوں کو ثابت کر

اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں مال اپنے اللہ کی خوشی چاہ کر۔ اور اپنا دل ثابت کر

اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ

کر ایسی ہے جیسے ایک باغ ہے بلند زمین پر اس پر پڑا زور کا مینہ تو لایا وہ باغ اپنا پھل دو چند اور اگر نہ

کر جیسے ایک باغ ہے بلندی پر اس پر پڑا مینہ تو لایا اپنا پھل دونا پھر اگر نہ

يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

پڑا اس پر مینہ تو پھوار ہی کافی ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے ف۱

پڑا اس پر مینہ تو اوس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

مثال نفقات مقبولہ

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ... الی ... وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیات میں صدقات غیر مقبولہ کی مثال بیان فرمائی۔ اب ان آیات میں صدقات مقبولہ کی مثال بیان فرماتے ہیں۔ اور مثال ان لوگوں کی جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں محض خدا تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی طلب کرنے کے لیے اور دلی تصدیق [1] اور یقین کی بناء پر یعنی ان کو یقین کامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صدقات پر جزاء اور ثواب کا وعدہ کیا ہے وہ

ف۱ زور کے مینہ سے مراد بہت مال خرچ کرنا اور پھوار سے مراد تھوڑا مال خرچ کرنا اور دلوں کو ثابت کرنے سے مراد یہ ہے کہ ثابت کریں دلوں کو ثواب پانے میں یعنی ان کو یقین ہے کہ خیرات کا ثواب ضرور ملے گا سو اگر نیت درست ہے تو بہت خرچ کرنے میں بہت ثواب ملے گا اور تھوڑی خیرات میں بھی فائدہ ہوگا جیسے خالص زمین پر باغ ہے تو جتنا مینہ برسے گا اتنا ہی باغ کو فائدہ پہنچے گا اور نیت درست نہیں تو جس قدر زیادہ خرچ کرے اتنا ہی مال ضائع ہوگا اور نقصان پہنچے گا کیونکہ زیادہ مال دینے میں ریا اور دکھاوا بھی زیادہ ہوگا جیسا پتھر پر دانہ اگے گا تو جتنا زور کا مینہ برسے گا اتنا ہی ضرر زیادہ ہوگا۔

[1] یہ ترجمہ ﴿وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ کا ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ اور شعبی اور سدی رحمہم اللہ سے منقول ہے اور اسی کو زجاج رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "قیل معناه تصدیقاً ویقیناً قاله ابن عباس وقال ابن عباس ایضاً وقتادة معناه واحتسابا من انفسهم" (تفسیر قرطبی: ۳/۳۱۴) وقال الزجاج تصدیقاً للاسلام وتحقیقاً للجزاء من اصل انفسهم جازمین بان الله لا یضیع =

حق ہے اور ان کے دلوں کو یقین اور اطمینان ہے، کہ قیامت کے دن ان کو پورا بدلہ ملے گا۔ جیسے حدیث میں آیا ہے: "من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفر لہ ماتقدم من ذنبہ۔"

پس ان لوگوں کے صدقات اور خیرات کی مثال اس باغ کی مانند ہے جو بلندی پر واقع ہو۔ جو دیکھنے میں نہایت خوبصورت معلوم ہو بلند جگہ پر جو درخت ہوتے ہیں وہ دیکھنے میں نہایت اچھے معلوم ہوتے ہیں اور بلند جگہ کی آب وہوا بھی بہت لطیف ہوتی ہے اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو۔ پس لایا ہو وہ باغ اپنا دونا پھل اور اگر اس باغ کو زور کی بارش نہ پہنچے تو شبنم اور اوس ہی اس کو کفایت کرتی ہے۔ کیونکہ زمین عمدہ ہے۔ اور آب وہوا نہایت لطیف ہے۔ اس لیے تھوڑا پانی بھی اس کے لیے کافی ہوتا ہے، بہرحال وہ باغ ایسی عمدہ جگہ پر ہے کہ اس کو تھوڑا پانی پہنچے یا زیادہ وہ باغ خراب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح مومن مخلص کی خیرات بمنزلہ باغ کے ہے کہ وہ ضائع اور برباد نہیں ہوتی۔ بقدر اخلاص اور بقدر نیت اور بقدر اس کے خرچ کے اس کو ثواب ملے گا زور کی بارش سے بہت مال خرچ کرنا مراد ہے اور شبنم اور اوس سے تھوڑا مال خرچ کرنا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والے ہیں کہ کون اخلاص کے ساتھ خدا تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے دیتا ہے اور کون ریاء اور نفاق سے دیتا ہے اور کون دینے کے بعد احسان جتلاتا ہے۔ اور حاصل ⓫ مثال یہ ہے کہ اہل اخلاص کا عمل ضرور نافع اور مفید ہوتا ہے۔ خواہ اہل اخلاص سابقین اور مقربین میں سے ہوں یا اصحاب یمین میں سے۔

ف ۱:...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور شعبی اور قتادہ اور ابو صالح اور ابن زید رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ ﴿وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ﴾ کے معنی تصدیق اور یقین کے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ مثال ان مومنین کی ہے جو اپنا مال خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں تاکہ ان کو اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو اور ﴿وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کو دل سے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خیرات کی کامل جزاء عطا فرمائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: "من صام رمضان ایمانا واحتسابا"۔ یعنی جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور وہ اس بات پر ایمان رکھے کہ اللہ نے یہ روزے فرض کیے ہیں اور "احتسابا" کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے ثواب کی توقع اور امید رکھے اور اسی معنی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۶۲)

اس تفسیر میں ﴿مِّنْ أَنفُسِهِمْ﴾ کا "من" ابتدائیہ ہے۔ "ای تثبیتا ناشا من نفوسھم" یعنی ایسی تصدیق اور ایسا یقین کہ جو ان کے دلوں سے نکلا ہو۔ اس بناء پر ہم نے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی کہ (دلی تصدیق اور یقین کی بناء پر) شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ﴿وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ﴾ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"وبسبب اعتقاد ناشی از دل خویش"۔

ف ۲:...... مجاہد اور حسن بصری رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ تثبیت سے احتیاط کے معنی مراد ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں "معناہ انھم =ثوابھم فمن علی ھذا اللابتداء وجزمھم بالثواب ھو المراد بالتثبیت۔ تفسیر نیسابوری: ۳/ ۵۲۔ وتفسیر کبیر: ۲/ ۳۵۳۔ اور اسی معنی کو ابن جریر رحمہ اللہ اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا ہے دیکھو تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۱۶۲ مزید تفصیل آئندہ فوائد کے ذیل میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

⓫ شاہ ولی اللہ قدس سرہ لکھتے ہیں: "حاصل ایں مثل آنست کہ عمل اہل اخلاص۔ فائدہ می دہد از سابقین باشد یا از اصحاب یمین۔"

یثبتون این یضعون صدقاتھم"۔ یعنی وہ احتیاط کرتے ہیں کہ اپنا صدقہ اور خیرات کس جگہ خرچ کریں۔ (تفسیر قرطبی: ۳/۳۱۴ وتفسیر ابن کثیر: ۲/۱۶۳)

ف ۳:...... اور بعض ائمہ تفسیر اس طرف گئے ہیں کہ ﴿تَثْبِيْتًا﴾ کے معنی نفس کو مقام عبودیت اور منزل ایمان میں ایسا ثابت قدم بنا دینا کہ اس کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہ آئے اور حرص اور طمع اور مال کی محبت اس کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے اور "مِنْ" اس تفسیر پر تبعیضیہ ہے اور ﴿تَثْبِيْتًا﴾ کا مفعول ہے یعنی "تثبیتا بعض انفسھم" اور معنی یہ ہیں کہ جس نے اپنا مال خدا کے لیے خرچ کیا اس نے اپنے بعض نفس کو ایمان پر جمالیا۔ اور جس نے جان اور مال دونوں خدا کے لیے خرچ کیے اس نے اپنے سارے نفس کو ایمان پر ثابت اور قائم کر دیا اور اس آیت شریفہ یعنی ﴿تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ﴾ میں یہی مراد ہے یعنی کل نفس کو ایمان پر ثابت اور قائم کر دینا مراد ہے امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس وجہ کو ذکر کر کے فرماتے ہیں:

"ھذا الوجہ ذکرہ صاحب الکشاف وھو کلام حسن وتفسیر لطیف۔" (تفسیر کبیر: ۲/۳۵۳) "اس وجہ کو صاحب کشاف یعنی علامہ زمخشری نے ذکر کیا ہے اور یہ کلام بہت خوب ہے اور نہایت لطیف تفسیر ہے۔"

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّأَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ۙ

کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہووے اس کا ایک باغ کھجور اور انگور کا بہتی ہوں نیچے اسکے نہریں

بھلا خوش لگتا ہے تم میں کسی کو؟ کہ ہووے اس کا ایک باغ کھجور اور انگور کا، نیچے اس کے بہتی ہیں ندیاں،

لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَأَصَابَهَآ

اس کو اس باغ میں اور بھی سب طرح کا میوہ حاصل ہو اور آگیا اس پر بڑھاپا اور اس کی اولاد ہیں ضعیف تب آپڑا

اس کو وہاں حاصل سب طرح کا میوہ، اور اس پر بڑھاپا پڑا اور اس کے اولاد ہیں ضعیف، تب پڑا

إِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ

اس باغ پر ایک بگولا جس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل گیا یوں سمجھاتا ہے تم کو اللہ آیتیں تاکہ

اس باغ پر بگولہ، جس میں آگ تھی، تو وہ جل گیا۔ یوں سمجھاتا ہے اللہ تم کو آیتیں، شاید

تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ ع

تم غور کرو ف۱

تم دھیان کرو۔

ف۱ یہ مثال ان کی ہے جو لوگوں کو دکھانے کو صدقہ خیرات کرتے ہیں یا خیرات کر کے احسان رکھتے ہیں اور ایذاء پہنچاتے ہیں یعنی جیسے کسی شخص نے جوانی اور قوت کے وقت باغ تیار کیا تاکہ ضعیفی اور بڑھاپے میں اس سے میوہ کھائے اور ضرورت کے وقت کام آئے۔ پھر جب بڑھاپا آیا اور میوے کی پوری حاجت =

مثال نفقات وطاعات غیر مقبولہ

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ... الی... لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ﴾

کیا تم میں سے کوئی یہ بات پسند کرتا ہے کہ اس کا ایک ایسا باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا کہ اس کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں اور اس باغ میں علاوہ کھجوروں اور انگوروں کے اس کے لیے ہر قسم کے پھل اور میوے ہوں اور اس کو بڑھاپا آپہنچا کہ جس وقت میں چل پھر کر کمانے پر قدرت نہیں رہی اور بڑھاپے کی وجہ سے ضرورت اور لاچارگی بڑھ گئی اور اس کی اولاد ہیں ضعیف اور ناتواں۔ جو کمانے پر قادر نہیں اور بجائے اس کے کہ وہ بوڑھے باپ کی خدمت کریں خود محتاج خدمت ہیں۔ یہ وقت باپ کے لیے بڑی پریشانی کا ہے کہ خود بھی عاجز اور مجبور اور بچے بھی کمزور اور ناتواں۔ پس اچانک ایسی حالت میں اس باغ کو ایک بگولہ آلگا، جس میں آگ تھی۔ پس وہ باغ جل کر خاک ہوگیا۔ اسی طرح قیامت کے دن جو انتہائی ضرورت اور پریشانی کا وقت ہوگا صدقات اور خیرات کے وہ تمام باغات جن کو "مَنّ" اور "اذیٰ" کا بگولہ پہنچا۔ جس میں غضب خداوندی کی آگ پنہاں تھی جل کر خاک ہوجائیں گے اور کف افسوس ملتا رہ جائے گا۔ اور تمام امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیتوں کو واضح فرماتا ہے تاکہ تم فکر کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔

شاہ ولی اللہ قدس سرہ اللہ لکھتے ہیں:

"حاصل ایں مثل آنست کہ عمل منان ومرائی در وقت شدت احتیاج حبط شود۔ چنانچہ بوستان ایں شخص در وقت شدتِ احتیاج بسوخت۔"

"حاصل مثال کا یہ ہے کہ احسان جتلانے والے اور ریاء سے صدقہ دینے والے کے اعمال شدید احتیاج کے وقت حبط ہوجائیں گے جیسے اس شخص کا باغ شدید احتیاج کے وقت جل کر خاک ہوگیا۔"

یعنی یہ مثال ہے ان لوگوں کی جو احسان رکھ کر اپنی خیرات کو ضائع کرتے ہیں۔ جیسے کہ کسی نے جوانی کے وقت باغ تیار کیا تاکہ ضعیفی اور بڑھاپے میں کام آئے اور اس سے میوہ کھائے۔ پس جب بڑھاپا اور ضرورت کا وقت آیا تو عین ضرورت کے وقت وہ باغ جل گیا۔

اسی طرح صدقہ اور خیرات مثل میوہ دار باغ کے ہیں کہ ان کا میوہ آخرت میں کام آتا ہے جب کسی کی نیت بری ہو یا احسان جتائے یا ستائے تو وہ باغ جل کر خاک ہوجاتا ہے پھر اس کا میوہ جو کہ ثواب ہے وہ کیونکر نصیب ہو؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ

اے ایمان والو خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے

اے ایمان والو! خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے، اور جو ہم نے نکال دیا تم کو

= ہوئی تب وہ باغ عین حالت احتیاج میں جل گیا یعنی صدقہ مثل باغ میوہ دار کے ہے کہ اس کا میوہ آخرت میں کام آئے۔ جب کسی کی نیت بری ہے تو وہ باغ جل گیا پھر اس کا میوہ جو ثواب ہے کیونکر نصیب ہو حق سبحانہ اسی طرح کھول کر بتاتا ہے تم کو آیتیں تاکہ غور کرو اور سمجھو۔

الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ

زمین سے اور قصد نہ کرو گندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو حالانکہ تم اس کو کبھی نہ لوگے مگر یہ کہ

زمین میں سے، اور نیت نہ رکھو گندی چیز پر کہ خرچ کرو، اور تم آپ وہ نہ لو گے، مگر جو

تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۲۶۷ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ

چشم پوشی کر جاؤ اور جان رکھو کہ اللہ بے پرواہ ہے خوبیوں والا ف۱ شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگ دستی کا

آنکھیں موند لو۔ اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا ہے خوبیوں والا۔ شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگی کا

وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

اور حکم کرتا ہے بےحیائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ بہت کشائش والا ہے

اور حکم کرتا ہے بےحیائی کا۔ اور اللہ وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا اور اللہ کشائش والا ہے

عَلِيْمٌ ۝۲۶۸ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ

سب کچھ جانتا ہے ف۲ عنایت کرتا ہے سمجھ جس کو چاہے اور جس کو سمجھ ملی اس کو بڑی خوبی ملی

سب جانتا۔ دیتا ہے سمجھ جس کو چاہے اور جس کو سمجھ ملی بہت خوبی ملی

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۶۹ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ

اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں ف۳ اور جو خرچ کرو گے تم خیرات یا قبول کرو گے کوئی منت

اور وہی سمجھیں جن کو عقل ہے۔ اور جو خرچ کرو گے کوئی خیرات یا قبول کرو گے کوئی منت،

فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۲۷۰ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا

تو بیشک اللہ کو سب معلوم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ف۴ اگر ظاہر کر کے دو خیرات تو کیا اچھی

سو اللہ کو معلوم ہے اور گنہگاروں کا کوئی نہیں مددگار۔ اگر کھلی دو خیرات تو کیا اچھی

ف۱ یعنی عند اللہ صدقہ کے مقبول ہونے کی یہ بھی شرط ہے کہ مال حلال کمائی کا ہو، حرام کا مال اور شبہ کا مال نہ ہو اور اچھی سے اچھی چیز اللہ کی راہ میں دے بری چیز خیرات میں نہ لگائے کہ اگر کوئی ایسی ویسی چیز دے تو جی نہ چاہے لینے کو مگر شرما شرمائی۔ بےخوشی سے ہرگز نہ لے اور جان لو کہ اللہ بے پرواہ ہے تمہارا محتاج نہیں اور خوبیوں والا ہے اگر بہتر سے بہتر چیز دل کے شوق اور محبت سے دے تو پسند فرماتا ہے۔

ف۲ جب کسی کے دل میں خیال آئے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس رہ جاؤں گا اور حق تعالیٰ کی تاکید سن کر بھی یہی ہمت ہو اور دل چاہے کہ اپنا مال خرچ نہ کرے اور وعدہ الٰہی سے اعراض کر کے وعدہ شیطانی پر طبیعت کو میلان اور اعتماد ہو تو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ یہ مضمون شیطان کی طرف سے ہے یہ نہ کہے کہ "شیطان کی تو ہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی حکم کرنا تو درکنار رہا" اور اگر یہ خیال آوے کہ صدقہ خیرات سے گناہ بخشے جائیں گے اور مال میں بھی ترقی اور برکت ہوگی تو جان لیوے کہ یہ مضمون اللہ کی طرف سے آیا ہے اور خدا کا شکر کرے اور اللہ کے خزانہ میں کمی نہیں سب کے ظاہر و باطن نیت عمل کو خوب جانتا ہے۔

ف۳ یعنی جس کو چاہتا ہے دین کی باتوں میں دانائی اور خیرات کرنے میں سمجھ عنایت کرتا ہے کہ کس نیت سے اور کس مال سے اور کس کو اور کس طرح محتاج کو دینا=

هِيَ ۚ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن
بات ہے اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ بہتر ہے تمہارے حق میں اور دور کرے گا کچھ
بات، اور اگر چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو تم کو بہتر ہے۔ اور اتارتا ہے کچھ

سَيِّئَاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَّيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي
گناہ تمہارے اور اللہ تمہارے کاموں سے خوب خبردار ہے ف۱ تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لاوے
گناہ تمہارے اور اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔ تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لانا لیکن اللہ راہ پر لاوے

مَن يَشَاءُ ۗ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ
جس کو چاہے اور جو کچھ خرچ کرو گے تم مال سو اپنے ہی واسطے جب تک کہ خرچ کرو گے اللہ ہی کی رضا جوئی
جس کو چاہے اور مال جو خرچ کرو گے سو اپنے واسطے جب تک خرچ کرو گے مگر اللہ کی خوشی چاہ

اللَّهِ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ
میں اور جو کچھ خرچ کرو گے خیرات سو پوری ملے گی تم کو اور تمہارا حق نہ رہے گا ف۲ خیرات ان فقیروں کے لئے ہے جو
کر اور جو خرچ کرو گے خیرات پوری ملے گی تم کو اور تمہارا حق نہ رہے گا۔ دنیا ہے ان

أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ
رکے ہوئے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے ملک میں سمجھے ان کو ناواقف
مفلسوں کو، جو اٹک رہے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے ملک میں سمجھے ان کو بے خبر

أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۗ وَمَا
مالدار ان کے سوال نہ کرنے سے تو پہچانتا ہے ان کو ان کے چہرہ سے نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر ف۳ اور جو کچھ
محظوظ ان کے نہ مانگنے سے تو پہچانتا ہے ان کو ان کے سچہرے سے نہیں مانگتے لوگوں سے لپٹ کر، اور جو

= چاہیے اور جس کو سمجھ عنایت ہوئی اس کو بڑی نعمت اور بڑی خوبی ملی۔

ف۴ یعنی جو کچھ خیرات کی جائے تھوڑی یا بہت بھلی نیت سے یا بری نیت سے چھپا کر یا لوگوں کو دکھا کر یا منت مانی جائے کسی طرح کی تو بیشک خدا تعالیٰ کو پورا علم ہے سب کا اور جو لوگ انفاق مال اور نذر میں حکم الٰہی کے خلاف کرتے ہیں ان کا کوئی مددگار نہیں اللہ جو چاہے ان پر عذاب کرے منت قبول کرنے سے واجب ہو جاتی ہے اب اگر ادا نہ کی تو گنہگار ہوگا اور نذر اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں مگر یہ کہے کہ اللہ کے واسطے فلانے شخص کو دونگا یا اس نذر کا ثواب فلاں کو پہنچے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

ف۱ اگر لوگوں کے دکھانے کی نیت نہ ہو تو خیرات کرنا لوگوں کے روبرو بھی بہتر ہے تاکہ اوروں کو بھی شوق اور رغبت ہو اور چھپا کر خیرات کرنا بھی بہتر ہے تاکہ لینے والا نہ شرمائے۔ خلاصہ یہ کہ اظہار و اخفاء دونوں بہتر ہیں مگر ہر موقع اور مصلحت کا لحاظ ضروری بات ہے۔

ف۲ جب آپ نے صحابہ کو مسلمانوں کے سوا اوروں پر صدقہ کرنے سے روکا اور اس میں یہ مصلحت تھی کہ مال ہی کی غرض سے دین حق کی طرف راغب ہوں آگے یہ فرما دیا کہ یہ ثواب جب ہی تک ملے گا کہ اللہ کی خوشی مطلوب ہوگی تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں عام حکم آ گیا کہ اللہ کی راہ میں جس کو مال دو گے تم کو =

ع تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝۲۷۳ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ

خرچ کرو گے کام کی چیز وہ بیشک اللہ کو معلوم ہے ف۱ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو

خرچ کرو گے کام کی چیز وہ اللہ کو معلوم ہے۔ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات

وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

اور دن کو چھپا کر اور ظاہر میں تو ان کے لئے ہے ثواب ان کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ

اور دن چھپے اور کھلے، تو ان کو ہے مزدوری ان کی اپنے رب کے پاس، اور نہ ڈر ہے ان پر نہ

هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۷۴

وہ غمگین ہوں گے ف۲

وہ غم کھاویں گے۔

بیان بقیہ آداب صدقات وذکر مصارف خیر

قَالَ تَعَالٰى: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ... الى ... وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

ربط:...... اب ان آیات میں ان امور کو بیان فرماتے ہیں کہ جن کی صدقہ اور خیرات میں رعایت ضروری ہے اور بعد ازاں یہ بیان فرمائیں گے کہ کن لوگوں کو صدقہ دینا جائز ہے اور صدقہ اور خیرات کے اصل مستحق کون لوگ ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اے ایمان والو! ایمان کا مقتضی یہ ہے کہ جو چیز تم نے اپنی تجارت یا صنعت وحرفت سے کمائی ہے اس میں سے پاکیزہ یعنی حلال اور عمدہ چیز خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ اور علی ہذا ہم نے جو چیز تمہارے لیے زمین سے نکالی ہے اس میں سے بھی پاکیزہ اور عمدہ ہی چیز خرچ کرو۔ اور خراب اور گندی چیز کا ارادہ بھی نہ کرو کہ اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ خدا

= اس کا ثواب دیا جائے گا مسلم غیر مسلم کسی کی تخصیص نہیں یعنی جس پر صدقہ کرو اس میں مسلم کی تخصیص نہیں البتہ صدقہ میں یہ ضرور ہے کہ محض لوجہ اللہ ہو۔

ف۳ یعنی ایسوں کا دینا بڑا ثواب ہے جو اللہ کی راہ اور اس کے دین کے کام میں مقید ہو کر چلنے پھرنے کھانے کمانے سے رک رہے ہیں اور کسی پر اپنی حاجت ظاہر نہیں کرتے جیسے حضرت کے اصحاب تھے۔ اہل صفہ نے گھربار چھوڑ کر حضرت کی صحبت اختیار کی تھی علم دین سیکھنے کو اور مفسدین فتنہ پردازوں پر جہاد کرنے کو اسی طرح اب بھی جو کوئی قرآن کو حفظ کرے یا علم دین میں مشغول ہو تو لوگوں پر لازم ہے کہ ان کی مدد کریں۔ اور چہرہ سے ان کو پہچاننا اس کا مطلب یہ ہے کہ انکے چہرے زرد اور بدن دبلے ہو رہے ہیں اور آثار جد وجہد ان کی صورت سے نمودار ہیں۔

ف۱ علی العموم اور خاص کر ایسے لوگوں پر جن کا ذکر ہوا۔

ف۲ یہاں تک خیرات کا بیان اور اس کی فضیلت اور اسکی قیود وشرائط کا مذکور تھا اور چونکہ خیرات کرنے سے ادھر تو معاملات میں سہولت وتسہیل کی عادت ہوتی ہے اور بے مروتی وسخت گیری کی برائی دلنشین ہوتی ہے اور ادھر یہ ہوتا ہے کہ معاملات واعمال میں جو گناہ ہو جاتا ہے خیرات سے اس کا کفارہ کر دیا جاتا ہے اور نیز خیرات کرنے سے اخلاق ومروت وخیر اندیشی ونفع رسانی خلق اللہ میں ترقی ہوتی ہے تو ان وجوہ سے ان آیات متعددہ میں اس کا ذکر فرمایا گیا تھا اب سود لینا چونکہ خیرات کی ضد ہے وہاں مروت ونفع رسانی تھی تو سود میں محض بے مروتی اور ضرر رسانی اور ظلم ہے۔ اس لئے خیرات کی فضیلت کے بعد سود کی مذمت اور اسکی ممانعت کا ذکر بہت مناسب ہے، اور جس قدر خیرات میں بھلائی ہے اتنی ہی سود میں برائی ہونی ضروری بات ہے۔

کی راہ میں خبیث اور ناپاک مال خرچ کا ارادہ اور نیت بھی گستاخی ہے البتہ بلا قصد اور بلا ارادہ تمہاری خیرات میں کوئی خراب چیز مل جائے تو اس پر مواخذہ نہیں۔ حالانکہ تمہارا حال یہ ہے کہ اگر تمہارا حق کسی کے ذمہ چاہتا ہو اور وہ تم کو کوئی خراب چیز دینے لگے تو اس خراب کو لینے والے نہیں مگر یہ کہ تم اس کے لینے میں چشم پوشی کرو۔ پس جب کہ تم اپنے حقوق میں خراب چیز لینا پسند نہیں کرتے، تو خدا کی راہ میں خراب چیز دینے کو کیسے پسند کرتے ہو اور تم اس بات کو خوب جان لو کہ تمہارا یہ چشم پوشی کرنا حاجت اور ضرورت کی بناء پر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو بے نیاز اور بے پروا ہے۔ اسے تو پسندیدہ اور پاکیزہ کی بھی ضرورت نہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی خوبیوں والا ہے۔ خوب سے خوب کو پسند کرتا ہے اور پاکیزہ ہی چیز کو قبول کرتا ہے۔

شیطان کبھی تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے کہ اگر تم خدا کی راہ میں خرچ کرو گے یا عمدہ مال خیرات کرو گے تو تنگ دست ہو جاؤ گے۔ اگر دینا ہی ہے تو خراب اور ردی چیزیں خیرات کر دو اور کبھی شیطان تم کو بے حیائی کا حکم دیتا ہے کہ ناجائز کاموں میں خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے یا ریاء اور دکھلاوے کے ساتھ خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے خرچ کرنے پر اور خصوصاً پاکیزہ کمائی سے خرچ کرنے پر اپنی جانب سے بخشش اور فضل اور احسان کا وعدہ کرتا ہے۔ یعنی جو شے ہماری راہ میں خرچ کرو گے اس پر ہم تمہاری مغفرت کریں گے اور دنیا اور آخرت میں اس سے کہیں زائد اضعافاً مضاعفہ تم کو عطا کریں گے جو تمہارے وہم و گمان سے بھی کہیں بالا اور برتر ہوگا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑا کشائش والا ہے۔ اس کے خزانہ میں کوئی کمی اور تنگی نہیں۔ اور بڑا دانا ہے۔ تمہارے اخلاص اور نیت کے بمقدار انعام دے گا۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس کو حکمت اور دانائی یعنی صحیح فہم عطا فرماتے ہیں۔ جس سے وہ القاء رحمانی اور خیالِ شیطانی میں فرق کرنے لگتا ہے۔ مثلاً جب اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس رہ جاؤں گا۔ تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ وسوسہ شیطانی ہے۔ شیطان مجھ کو خیرات سے روکنا چاہتا ہے اور جب یہ خیال آتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے گناہوں کی مغفرت ہوگی اور دنیا میں خرچ کیا ہوا آخرت میں کام آئے گا اور خدا کی راہ میں دینے سے کمی نہیں آتی تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ القاء رحمانی ہے باقی ایسا صدقہ اور خیرات کہ جس سے ظاہر اسباب میں یقیناً یا بظن غالب مفلس ہو جانے کا اندیشہ ہو تو شریعت نے خود ایسے صدقات اور تبرعات کو ممنوع قرار دیا ہے۔ البتہ بخیلانہ خیالات اور وسوسوں کے اتباع سے منع کیا ہے آج کل کے متمدن بخیلوں نے اپنے بخل کا نام ''اقتصاد'' رکھ لیا ہے تاکہ خدا کی راہ میں نہ دینے کا بہانہ بن جائے اور جس کو من جانب اللہ حکمت اور دانائی عنایت ہوگئی۔ بلاشبہ اس کو بڑی خیر اور بھلائی مل گئی۔ اس لیے کہ دنیا اور آخرت کے سب کام حکمت اور دانائی سے درست اور ٹھیک ہوتے ہیں اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر وہی لوگ جو خالص عقل والے ہیں۔ یعنی جن کی عقلیں وہموں اور شیطانی وسوسوں اور نفسانی خطرات سے محفوظ اور مامون ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنی خواہشوں کو اللہ کی اطاعت اور رضامندی میں فنا کر چکے ہیں اور جو کچھ تم خرچ کرو گے تھوڑا ہو یا بہت، پوشیدہ ہو یا ظاہر، حق میں یا باطل میں۔ یا کوئی منت اور نذر مانو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے اس کے موافق تم کو جزا دے گا۔ اور ظالم اور ستم گاروں کے لیے جو اپنا مال نہ تو راہ مولیٰ میں خرچ کرتے ہیں اور نہ اپنی منتیں پوری کرتے ہیں یا دکھلاوے اور معصیت کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ظالموں کے لیے کوئی مددگار کہ نہیں جو قیامت کے دن ان کو عذاب الٰہی سے بچا سکے۔

ف :...... یہاں تک صدقہ کے آداب اور شرائط کا بیان تھا۔ اب آئندہ آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ صدقہ علانیہ بہتر ہے یا پوشیدہ۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ اگر تم اپنے صدقات اور خیرات کو ظاہر کرو یعنی سب کے سامنے دو لیکن قصد دکھلانے کا نہ ہو تو کیا ہی اچھی بات ہے۔ تمہارا یہ نیک عمل دیکھ کر دوسرے بھی اتباع کریں گے۔ اور نیک دل لوگ تمہاری اس سخاوت کو دیکھ کر تمہارے لیے دعا کریں گے کہ اے اللہ ایسے سخی کو زندہ رکھ جو تیری راہ میں خرچ کرتا ہے۔ نیز دوسرے مستحقین کو جب تمہاری اعانت اور امداد کا علم ہو تو وہ بھی تمہارے وجود اور جود کو اپنے لیے سہارا سمجھیں گے اور تمہارے لیے دعا کریں گے۔ اور اگر تم اپنے صدقات کو چھپاؤ اور پوشیدہ طور پر فقیروں کو دے دو تو وہ تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے۔ تمہارا صدقہ ریاء اور نمود سے محفوظ رہا۔ اور فقیر ندامت اور شرمندگی سے محفوظ رہا اور چونکہ تم نے پوشیدہ دے کر فقیر کی پردہ پوشی کی اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے اس پوشیدہ صدقہ کے صلہ میں تمہارے کچھ گناہوں اور برائیوں کی پردہ پوشی کرے گا اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خوب آگاہ اور واقف ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ صدقہ کا اظہار اور اخفاء دونوں ہی بہتر ہیں مگر صدقہ کا اخفاء بہت بہتر ہے۔ البتہ بعض حالات میں صدقہ کا اظہار زیادہ نافع ہوتا ہے یہ عارضی امر ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صحابہ نے اپنے مشرکین رشتہ داروں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنے کو مکروہ سمجھ کر آنحضرت ﷺ سے فتویٰ پوچھا تو آپ ﷺ نے ان کو اجازت دی اور اس بارہ میں یہ آئندہ آیت نازل ہوئی یعنی ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ﴾ نازل ہوئی (نسائی، طبرانی و بزار وغیرہ) اور مصنف ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں ہے کہ حضور پرنور ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا تھا کہ تم اپنے ہی دین کے لوگوں کو صدقہ دیا کرو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اے محمد ﷺ ان لوگوں کا راہ راست پر لانا آپ کے ذمہ نہیں۔ جس کے لیے آپ اتنا اہتمام کریں اور یہ خیال کریں کہ شاید اس تدبیر سے یہ لوگ مسلمان ہو جائیں اور لیکن اللہ ہی راہ راست پر لاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے تو وہ تمہارے ہی نفع کے لیے ہے۔ تم اس فکر میں نہ پڑو کہ تمہارا صدقہ مسلمان کو ملے یا کافر کو صلہ رحمی اور انسانی ہمدردی کے لیے مسلمان ہونا شرط نہیں۔

اور تم تو خدا کے ایسے مخلص ہو کہ کوئی چیز بھی خرچ نہیں کرتے مگر محض اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے اور جو مال بھی تم خدا کی رضامندی کے لیے خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تم تک پہنچا دیا جائے گا اور تمہارے اجر میں ذرہ برابر کمی نہ کی جائے گی۔ لہٰذا اس فکر میں نہ پڑو کہ تمہارا صدقہ اور خیرات مسلمان ہی کو ملے اور کافر کو نہ ملے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے ۔

گرادمی بروبیش آتش سجود تو واپس چرامی کشی دست جود

حکایت :...... ایک عالم بڑی خیرات کیا کرتے تھے اور کوئی پوچھتا تو قسم کھاتے کہ خدا کی قسم میں نے کسی کے ساتھ کوئی خیر نہیں کی۔ کسی نے اس عالم سے دریافت کیا کہ آپ خیرات کرتے ہیں اور پھر یہ قسم کھاتے ہیں تو یہ فرمایا کہ خدا کی قسم میں کسی کے ساتھ خیر نہیں کرتا۔ جو خیر کرتا ہوں وہ اپنے ہی لیے کرتا ہوں اور اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ﴾ یعنی تم جو بھی خیر کرتے ہو وہ اپنے ہی نفس کے لیے کرتے ہو۔

فائدہ:...... ان آیات میں صدقات نافلہ اور عام خیرات کا بیان ہے اور نفلی صدقہ اور خیرات دینا کافر کو بھی جائز ہے۔ البتہ زکوٰۃ سوائے مسلمان کے کسی اور کو دینا جائز نہیں۔ حضور پرنور ﷺ نے جب معاذ بن جبل ؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو یہ فرمایا کہ وہاں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا اور جب اسلام قبول کرلیں تو ان کو یہ بتلا دینا کہ اللہ نے تم پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو انہی مسلمان امیروں سے لے جائے گی اور انہی کے غریبوں کو دی جائے گی۔ پس جس طرح زکوٰۃ مسلمانوں ہی کے امیروں پر فرض ہے اسی طرح ان سے لے کر مسلمان فقیروں ہی پر تقسیم کی جائے گی۔ کافر فقیروں پر اس کا تقسیم کرنا جائز نہ ہوگا۔

ربط:...... گزشتہ آیت میں یہ فرمایا کہ صدقہ اور خیرات مومن کے ساتھ مخصوص نہیں کافر کو بھی خیرات دینا جائز ہے اب آئندہ آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ صدقات اور خیرات کے کون لوگ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ صدقات کا اصل استحقاق۔ ان حاجت مندوں کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں مقید اور پابند ہیں۔ یعنی دین کی خدمت اور علوم ظاہری اور باطنی کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔ قرآن کریم حفظ کرتے ہیں اور علم دین سیکھتے ہیں اور ظاہری اور باطنی دشمنوں کے جہاد میں لگے ہوئے ہیں۔ ظاہری دشمن سے کفار مراد ہیں اور باطنی دشمن سے نفس امارہ مراد ہے جس طرح کافروں کی گردن کشی کے لیے جہاد وقتال بزرگ ترین عبادت ہے اسی طرح نفس کشی کے لیے مجاہدات اور ریاضات بھی عظیم ترین عبادت ہے۔ حدیث میں ہے "المجاهد من جاهد نفسه" اور ایک ضعیف روایت میں جہاد نفس کو جہاد اکبر فرمایا ہے جیسے اصحاب صفہ تجارت اور زراعت کو چھوڑ حضور پرنور ﷺ کی مسجد کے قریب جو ایک صفہ (چبوترہ اور سائبان تھا) وہاں لیل ونہار بسر کرتے تھے تاکہ حضور ﷺ کی صحبت میں علم سیکھیں اور جب جہاد کا موقعہ آئے تو جہاد میں جائیں۔ غرض یہ کہ صدقات کے اصل مستحق وہ فقراء اور حاجت مند لوگ ہیں جو علوم دینیہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور علم اور جہاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے ملک میں تجارت اور مزدوری کے لیے چل پھر نہیں سکتے اس لیے کہ ایک آدمی سے دو کام نہیں ہو سکتے۔

ف:...... مسلمانوں کو چاہیے کہ صدقات اور خیرات میں ان حاجت مند طالب علموں کا خاص طور پر خیال رکھیں جو علم دین کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں اگر دنیا میں یہ گروہ نہ رہے تو دنیا سے علم دین اور دین سب رخصت ہو جائے اور لوگ بے دین اور گمراہ ہو جائیں اس لیے کہ کسی چیز کا باقی رہنا اس شے کے علم کے باقی رہنے پر موقوف ہے۔ طب جسمانی کی اگر تعلیم نہ ہو اور نہ اس کی کوئی درس گاہ ہو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا بیماروں سے پر ہوگی اور کوئی طبیب اور معالج نہ ملے گا۔ اسی طرح اگر طب روحانی یعنی علم دین کی کوئی درسگارہ نہ ہو تو دنیا روحانی مریضوں یعنی کفر اور الحاد اور معصیت کے روحانی بیماروں سے بھری ہوگی اور کوئی طبیب اور معالج نہ ہوگا یعنی ایمان اور کفر اور اطاعت اور معصیت کا فرق بتلانے والا کوئی نہ ملے گا۔ باقی جو شخص کفر اور معصیت کو بیماری ہی نہ سمجھتا ہو اس سے ہمارا خطاب نہیں اور انجان آدمی جوان کے حال سے ناواقف اور بے خبر ہے وہ ان کو نہ مانگنے کی وجہ سے مالدار اور دولت مند سمجھتا ہے۔ قناعت کی وجہ سے یہ لوگ کسی سے سوال نہیں کرتے۔ اس لیے عام طور پر ان کی حاجت مندی کا علم نہیں ہوتا البتہ تم ان کی حاجت اور تنگی کو کسی وقت ان کے چہرے کی حالت اور قیافہ سے پہچان سکتے ہو اس لیے کہ بعض مرتبہ بھوک اور تنگی کے باعث چہرہ پر پژمردگی اور بدن پر لباس شکستہ ہوتا ہے اس لیے ان کی تنگی کا علم ہو جاتا ہے۔ قناعت کی وجہ سے اول تو یہ لوگ کسی سے سوال نہیں کرتے اور اگر شاذ و نادر کبھی مجبور ہو کر سوال کرتے ہیں تو

لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے یعنی کسی کے سر نہیں ہوتے اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے خواہ وہ لوگ سوالی ہوں یا بے سوالی، ان کی حاجت اور تنگی کم ہو یا زیادہ، تو اللہ تعالیٰ تم کو بقدر استحقاق کے اس کی جزا دے گا۔ اور اس لیے کہ اس کو تمہاری نیت خوب معلوم ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ خدا کی راہ میں کرچ کرنے کے لیے کسی زمان اور مکان اور وقت اور حال کی قید نہیں۔ جو لوگ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں جس میں مستحق کا پورا پتہ نہیں چل سکتا یا دن میں جس میں ریاء کا اندیشہ ہے اور علیٰ ھذا نہ کسی حال کی تخصیص ہے ظاہراً خرچ کریں یا تو پوشیدہ پس ان کے لیے ان کا ثواب ہے ان کے پروردگار کے یہاں۔ جس پروردگار نے ان کے صدقات کی تربیت کی ہے اور ان کو بڑھایا ہے اور نہ ان پر کوئی خوف وخطر ہے اور نہ یہ لوگ رنجیدہ ہوں گے بلکہ صدقات کے انعامات کو دیکھ کر یہ تمنا کریں گے کہ کاش خدا کی راہ میں سارا ہی گھر لٹا دیا ہوتا۔

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس کھو دیئے ہوں جن نے

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہ اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے جس کے حواس کھو دیئے جن نے

الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ

لپٹ کر یہ حالت ان کی اس واسطے ہوگی کہ انہوں نے کہا کہ سوداگری بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے سوداگری کو اور حرام کیا ہے

لپٹ کر یہ اس واسطے کہ انہوں نے کہا سودا کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا سود لینا، اور اللہ نے حلال کیا سودا اور حرام کیا

الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ

سود کو ف۱ پھر جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی طرف سے اور وہ باز آ گیا تو اس کے واسطے ہے جو پہلے ہو چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالہ ہے

سود۔ پھر جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی اور باز آیا، تو اس کا ہے جو آگے ہو چکا اور اس کا حکم اللہ کے اختیار۔

ف۱ یعنی ربٰوا کھانے والے قیامت کو قبروں سے ایسے اٹھیں گے جیسے آسیب زدہ اور مجنون اور یہ حالت اس واسطے ہوگی کہ انہوں نے حلال و حرام کو یکساں کر دیا اور صرف اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے دونوں کو حلال کہا حالانکہ بیع اور ربوا میں بڑا فرق ہے کہ بیع کو حق تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

فائدہ: بیع میں جو نفع ہوتا ہے وہ مال کے مقابلہ میں ہوتا ہے جیسا کسی نے ایک درہم کی قیمت کا کپڑا دو درہم کو فروخت کیا اور سود وہ ہوتا ہے جس میں نفع بلا عوض ہو جیسے ایک درہم سے دو درہم خرید لیوے اول صورت میں چونکہ کپڑا اور درہم دو جدا جدا قسم کی چیزیں ہیں اور نفع اور غرض ہر ایک کی دوسرے سے علیحدہ ہے اس لئے ان میں فی نفسہٖ موازنہ اور مساوات غیر ممکن ہے بضرورت خرید و فروخت موازنہ کرنے کی کوئی صورت اپنی اپنی ضرورت اور حاجت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی اور ضرورت اور رغبت ہر ایک کی از حد مختلف ہوتی ہے کسی کو ایک درہم کی اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس روپیہ کی قیمت کے کپڑے کی بھی اس قدر نہیں ہوتی اور کسی کو ایک کپڑے کی جو کہ بازار میں ایک درہم کا شمار ہوتا ہے اتنی حاجت ہو سکتی ہے کہ دس درہم کی بھی اتنی احتیاج اور رغبت نہیں ہوتی تو اب ایک کپڑے کو ایک درہم میں کوئی خریدے گا تو اس میں سود یعنی نفع خالی عن العوض نہیں اور اگر بالفرض اسی کپڑے کو ایک ہزار درہم کو خریدے گا تو سود نہیں ہو سکتا کیونکہ فی حد ذاتہٖ تو ان میں موازنہ اور مساوات ہو ہی نہیں سکتی اس کے لئے اگر پیمانہ ہے تو اپنی اپنی رغبت اور ضرورت اور اس میں اتنا تفاوت ہے کہ خدا کی پناہ تو سود متعین ہو تو کیونکر ہو اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض فروخت کرے گا تو یہاں فی نفسہٖ مساوات ہو سکتی ہے جس کے باعث ایک درہم ایک درہم کے مقابلہ میں معین ہو گا اور دوسرا درہم خالی عن العوض ہو کر سود ہو گا اور شرعاً یہ معاملہ حرام ہو گا۔

وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي

اور جو کوئی پھر سود لیوے تو وہی لوگ ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ف۱ مٹاتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے

اور جو کوئی پھر کرے وہی ہیں دوزخ کے لوگ وہ اسی میں رہ پڑے۔ مٹاتا ہے اللہ سود اور بڑھاتا ہے

الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٧٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

خیرات کو ف۲ اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گناہ گار سے ف۳ جو لوگ ایمان لائے اور عمل

خیرات اور اللہ نہیں چاہتا کسی ناشکر گنہگار کو جو لوگ ایمان لائے اور عمل

الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا

نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور دیتے رہے زکوٰۃ ان کے لئے ہے ثواب ان کا اپنے رب کے پاس اور نہ

نیک کئے، اور قائم رکھی نماز اور دی زکوٰۃ ان کو ہے بدلہ ان کا اپنے رب کے پاس اور

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٧﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ

ان کو خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ف۴ اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ باقی رہ گیا ہے

نہ ان پر ڈر ہے نہ وہ غم کھائیں گے۔ اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو رہ گیا

مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ

سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا ف۵ پھر اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہوجاؤ لڑنے کو اللہ سے

سود، اگر تم کو یقین ہے۔ پھر اگر نہیں کرتے، تو خبردار ہوجاؤ لڑنے کو اللہ سے

وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٩﴾

اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارے واسطے ہے اصل مال تمہارا نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ف۶

اور اس کے رسول سے، اور اگر توبہ کرتے ہو، تو تم کو پہنچتے ہیں اصل مال تمہارے، نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ کوئی تم پر۔

ف۱ یعنی سود کی حرمت سے پہلے جو تم نے سود لیا دنیا میں اسکو مالک کی طرف واپس کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا یعنی تم کو اس سے مطالبہ کا حق نہیں اور آخرت میں حق تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے اپنی رحمت سے اسکو بخش دے لیکن حرمت کے بعد بھی اگر کوئی باز نہ آیا بلکہ برابر سود لیے گیا تو وہ دوزخی ہے اور خدا تعالیٰ کے حکم کے سامنے اپنی عقلی دلیلوں کو پیش کرنے کی سزا دہی سزا ہے جو فرمائی۔

ف۲ اللہ سود کے مال کو مٹاتا ہے یعنی اس میں برکت نہیں ہوتی بلکہ اصل مال بھی ضائع ہو جاتا ہے چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے کہ سود کا مال کتنا ہی بڑھ جائے انجام اسکا افلاس ہے اور خیرات کے مال کو بڑھانے سے یہ مطلب ہے کہ اس مال میں زیادتی ہوتی ہے اور اللہ برکت دیتا ہے اور اس کا ثواب بڑھایا جاتا ہے چنانچہ احادیث میں وارد ہے۔

ف۳ مطلب یہ کہ سود لینے والے نے مالدار ہو کر اتنا بھی نہ کیا کہ محتاج کو قرض ہی بلا سود دے دیتا چاہیے تو یہ تھا کہ بطریق خیرات حاجت مند کو دیتا تو اب اس سے زیادہ اللہ کی نعمت کی ناشکری کیا ہوگی۔

ف۴ اس آیت میں سود لینے والے کے مقابلہ میں اہل ایمان کے اوصاف اور ان کا انعام ذکر کر دیا جو سود خوار کے اوصاف و حالات اور اس کے حکم کے خلاف =

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

اور اگر ہے تنگ دست تو مہلت دینی چاہیئے کشائش ہونے تک اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو

اور اگر ایک شخص ہے تنگی والا، تو فرصت دینی چاہیئے جب تک کشائش پاوے، اور اگر خیرات کردو تو تمہارا بھلا ہے، اگر تم کو

تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۟ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا

سمجھ ہو ف۱ اور ڈرتے رہو اس دن سے کہ جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائیگا ہر شخص کو جو کچھ

سمجھ ہو۔ اور ڈرتے رہو اس دن سے جس میں الٹے جاؤ گے اللہ کے پاس، پھر پورا ملے گا ہر شخص کو جو

كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع ۳۸ ۸

اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا ف۲

اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

احکام ربا (سود)

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا... الی... وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں خیرات اور صدقات کا بیان تھا، اب آئندہ آیات میں سود کے احکام ذکر فرماتے ہیں جو کہ صدقات اور خیرات کی ضد اور نقیض ہے اس لیے کہ صدقہ اور خیرات سے اخلاق اور مروت اور خلق اللہ کی نفع رسانی میں ترقی ہوتی ہے اور سود میں سراسر بے مروتی اور ضرر رسانی ہے۔ صدقہ اور خیرات میں صلہ رحمی اور غریبوں کی امداد ہوتی ہے اور سود میں سخت دلی اور غریبوں پر زیادتی ہوتی ہے۔ اس لیے صدقہ کی فضیلت کے بعد سود کی مذمت اور حرمت کا بیان نہایت مناسب ہوا تاکہ سود کی مذمت اور حرمت سے صدقہ کی فضیلت اور پختہ ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ جس درجہ سود میں برائی ہے اسی درجہ خیرات میں بھلائی ہے ایک ضد کی قباحت سے دوسری ضد کا حسن و جمال واضح ہوتا ہے۔ نیز صدقہ سے مال ظاہر میں گھٹتا ہے اور حقیقت میں بڑھتا ہے اور سود میں مال ظاہر میں تو بڑھتا ہے اور حقیقت میں گھٹتا ہے۔ نیز گزشتہ آیات میں صدقہ کرنے والوں کا حال بیان فرمایا کہ دنیا اور آخرت میں ان کو خیرات کا عوض اور ثواب ملے گا اور آخرت میں ان کو کسی قسم کا رنج و غم نہ ہوگا۔ اب آئندہ آیات میں سود خواروں کا حال بیان فرماتے ہیں کہ وہ قبروں سے مدہوش اور وحشت زدہ اٹھیں گے۔ اس

= اور ضد ہیں جس سے سود خوار کی پوری تہدید و تشنیع بھی ظاہر ہوگئی۔

ف۵ یعنی ممانعت سے پہلے جو سود لے چکے سو لے چکے لیکن ممانعت کے بعد جو چڑھا اس کو ہرگز نہ مانگو۔

ف۶ یعنی پہلے سود جو تم لے چکے ہو اس کو اگر تمہارے اصل مال میں محسوب کریں اور اس میں سے کاٹ لیویں تو تم پر ظلم ہے اور ممانعت کے بعد کا سود چڑھا ہوا اگر تم مانگو تو یہ تمہارا ظلم ہے۔

ف۱ یعنی جب سود کی ممانعت آگئی اور اس کا لینا دینا موقوف ہوگیا تو اب تم مدیون مفلس سے تقاضا کرنے لگو یہ ہرگز نہ چاہیے بلکہ مفلس کو مہلت دو اور توفیق ہو تو بخش دو۔

ف۲ یعنی قیامت کو تمام اعمال کی جزاء اور سزا ملے گی تو اب ہر کوئی اپنا فکر کرلے اچھے کام کرے یا برے سود لے یا خیرات کرے۔

لیے کہ ان لوگوں نے حلال اور حرام کو یکساں کر دیا اور سود اور خرید وفروخت کو برابر سمجھا اور ظاہر ہے کہ حلال اور حرام اور جائز اور ناجائز کو یکساں کر دینا مخبوط الحواس آدمی کا کام ہے اس لیے سود خواروں کی سزا یہ تجویز ہوئی کہ قیامت کے دن قبروں سے آسیب زدہ اور مجنوں کی طرح اٹھیں گے۔

چنانچہ فرماتے ہیں جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن اپنی قبروں سے نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جس کو جنات نے خبطی اور بدحواس بنا دیا ہو لپٹ کر سود خوار مال کے عشق اور خبط میں گرفتار رہا اور اسی خبط اور خیال میں مرا اور اسی خبط کی حالت میں اس کا حشر ہوگا یہ سزا اس لیے تجویز ہوئی کہ یہ سود خوار حلال اور حرام کو ایک کرنا چاہتے ہیں اور سود کو حلال کرنے کے لیے استدلال میں یہ کہتے ہیں کہ بیع یعنی خرید وفروخت اور سوداگری بھی تو مثل سود کے ہے جس طرح بیع میں زیادتی اور نفع ہوتا ہے اسی طرح سود میں بھی زیادتی اور نفع ہوتا ہے دونوں میں فرق نہیں۔ پھر کیا وجہ کہ بیع تو جائز اور سود حرام ہو۔

ف:...... اصل کلام اس طرح تھا کہ "انما الربا مثل البیع" یعنی سود مثل سوداگری کے ہے لیکن کفار نے حرمت ربوا کی نفی میں مبالغہ کرنے کے لیے اصل کلام کا عکس کر دیا۔ اور یہ کہا کہ ﴿اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ یعنی بیع حلال ہونے میں مثل سود کے ہے گویا کہ حلت یعنی حلال ہونے میں سود اصل ہے اور بیع حلال ہونے میں مثل سود کے ہے گویا کہ حلت یعنی حلال ہونے میں سود کے مشابہ ہے۔ غرض یہ کہ ان لوگوں نے فقط اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے۔ دونوں کو حلال سمجھ لیا حالانکہ بیع اور ربوا میں بڑا فرق ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں۔ اور اگر بالفرض والتقدیر کوئی فرق بھی نہ ہوتا تو فرق کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اللہ تعالیٰ جو کہ مالک مطلق اور حاکم مطلق ہے اس نے بیع اور تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے اور جب حق تعالیٰ مالک مطلق ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جس چیز کو چاہیں حرام کریں۔ کسی کو دریافت کرنے کا بھی حق نہیں ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾ ع۔ اوست سلطاں آں چہ خواہد آں کند۔

بیع ① اور سود میں فرق

بیع میں جو نفع اور زیادتی ہوتی ہے وہ مال کے مقابلہ اور عوض میں ہوتی ہے۔ اور سود میں جو نفع اور زیادتی ہوتی ہے وہ بلا عوض کے ہوتی ہے۔ مثلاً کسی نے ایک درہم کی قیمت کا کپڑا دو درہم میں فروخت کیا تو یہ دونوں درہم کپڑے کے عوض اور مقابل سمجھے جائیں گے۔ اور اگر ایک درہم کو دو درہم کے مقابلہ میں فروخت کیا تو ایک درہم تو ایک درہم کے مقابلہ میں ہو جائے گا اور دوسرا درہم بلا عوض اور کسی مقابلہ کے ہوگا کیونکہ سب دراہم ایک جنس ہیں اور کپڑا اور درہم علیحدہ علیحدہ قسم ہیں۔ ہر ایک کا نفع اور ہر ایک کی غرض بھی علیحدہ علیحدہ ہے۔ اس لیے کپڑے اور درہم میں فی نفسہٖ موازنہ اور مقابلہ ناممکن اور محال ہے۔ خرید وفروخت میں مقابلہ حاجت اور ضرورت اور رغبت کا ہوتا ہے۔ کسی کی ضرورت اور رغبت کچھ ہے اور کسی کی کچھ۔ کسی کو ایک درہم کی اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس روپیہ کا کپڑا اس کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا، اور کسی کو ایک کپڑے کی جس کی قیمت بازار میں ایک درہم ہے اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس درہم کی اس کو اتنی حاجت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر ایسی صورت میں کوئی ایک

① یہ تمام تر قفال مروزی رحمہ اللہ کے کلام کی تشریح ہے جس کو امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر ص: ۳۰۷ جلد دوم میں ذکر کیا ہے۔

درہم کے کپڑے کو ایک ہزار درہم میں بھی خریدے تو وہ سود نہ ہوگا یعنی یہ نفع خالی از عوض نہ ہوگا کیونکہ کپڑے اور روپیہ میں فی نفسہ تو موازانہ اور مساوات ممکن نہیں اس لیے کہ جنس مختلف ہے لہذا معیار اور پیمانہ اپنی اپنی ضرورت اور رغبت ہوگی۔ اور ضرورتوں اور رغبتوں میں بے انتہا تفاوت ہے پس اگر ایک روپیہ کی قیمت کا کپڑا دس روپیہ میں فروخت کیا تو مجموع قیمت کا مجموع مال سے مقابلہ کیا جائے گا اجزاء کا اجزاء سے مقابلہ نہ ہوگا۔ اور اگر ایک درہم کو دو درہم کے مقابلہ میں فروخت کیا تو یہاں مقابلہ مجموعہ کا مجموعہ سے نہ ہوگا بلکہ اجزاء کا اجزاء سے مقابلہ ہوگا۔ ہم جنس ہونے کی وجہ سے اجزاء میں مساوات اور موازنہ ممکن ہے۔ لہٰذا ایک درہم ایک درہم کے مقابلہ میں ہوگا اور دوسرا درہم خالی از عوض ہوکر سود ہو جائے گا جس کو شریعت نے حرام کیا ہے۔ بیع میں، قابل معاوضہ چیزوں کا مبادلہ ہوتا ہے اور ربا اصل قرض پر کچھ زیادہ لینے کو کہتے ہیں کہ جو مہلت اور تاخیر وقت کے عوض میں زیادتی کی جاتی ہے اور تاخیر وقت اور مہلت نہ عقلاً کوئی مال ہے اور نہ عرفاً کوئی ایسی چیز ہے کہ جس پر قبضہ کیا جا سکے اور عوض اور مقابل بن سکے اور جو چیز بلا عوض و بدل حاصل کی جائے وہ باطل اور ناحق ہے۔ پس جس شخص نے بیع اور سود کو برابر قرار دیا اور اس نے مقابلہ اور معاوضہ میں خبط اور بدحواسی سے کام لیا اس لیے کہ اس کا انجام یہ ہوا کہ سود خوار قبر سے دیوانہ اور مخبوط الحواس بنا کر اٹھایا جائے گا ہر عمل کی جزاء اس کے مناسب ہوتی ہے۔

سود خوار کے استدلال کی ایک مثال: ...... سود خوار کا اپنے استدلال میں یہ کہنا کہ جس طرح بیع میں نفع اور زیادتی ہوتی ہے اسی طرح سود میں بھی نفع اور زیادتی ہوتی ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں اس استدلال کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی یہ کہے کہ جیسے بیوی عورت ہے اسی طرح ماں بھی عورت ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بیوی تو حلال ہے اور ماں حرام ہے۔

یا یوں کہے کہ کتا بھی بکری کی طرح ایک جانور ہے کیا وجہ ہے کہ ایک حلال ہے اور ایک حرام ہے؟

ربا کی اقسام: ...... ربا کی دو قسمیں ہیں: ایک ربا نسیئہ۔ اور ایک ربا الفضل۔ ربا نسیئہ تو وہ سود ہے جو قرض اور ادھار میں ہو زمانہ جاہلیت میں اسی قسم کا ربوا شائع تھا۔ وہ یہ تھا کہ کوئی شخص کسی کو معین میعاد پر قرض دیتا اور اس پر کچھ ماہوار مقرر کر لیتا۔ پھر جب میعاد معین پر وہ روپیہ ادا نہ ہوتا تو قرض خواہ اصل میں کچھ اور بڑھا کر اس کو مہلت دے دیتا ہے اور کبھی سود کو اصل میں جمع کر کے اس پر سود لگاتا یہاں تک کہ سود اصل قرض سے اضعافا مضاعفہ دو چند اور سہ چند اور چہار چند ہو جاتا۔ اور ربا فضل وہ سود ہے کہ جو ایک جنس کی چیزوں میں کمی اور زیادتی کے ساتھ مبادلہ کرنے میں ہو۔

مثلاً ایک سیر گیہوں کو ڈیڑھ سیر گیہوں کے معاوضہ میں فروخت کیا جائے، یہ ربا فضل ہے۔

آیت قرآنی کا اصل نزول باجماع مفسرین ربا کی قسم اول میں ہوا۔ مگر آیت اپنے عموم کی وجہ سے ربا کی قسم ثانی کو بھی بلاشبہ شامل ہے۔ جس کی تفصیل احادیث متواترہ سے معلوم ہوئی۔ اور مزید تفصیل اقوال صحابہ ﷺ اور تابعین سے معلوم ہوئی۔ اور احادیث میں ربا کی جس قدر صورتیں مذکور ہیں آیت قرآنی اپنے عموم کی وجہ سے سب کو شامل ہے۔

سود کے حرام ہونے کی وجہ: ...... تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ضرورت مند کی اعانت اور امداد عین مروت اور کمال انسانیت ہے اور غریب اور فقیر کی ضرورت اور حاجت کو تحصیل زر اور حصول منفعت کا ذریعہ بنانا کمال دنائت اور غایت خست ہے۔ سوائے بخیلوں اور خود غرضوں کے کسی کا اس مسئلہ میں خلاف نہیں۔

(۱) سودخوار بلا کسی عوض کے اپنے روپیہ سے نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جب اصل روپیہ بعینہ اور بتمامہ واپس آ گیا تو یہ زائد روپیہ کس چیز کا معاوضہ ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ یہ معاوضہ اس مہلت اور تاخیر کا ہے جو قرض خواہ کی طرف سے مقروض کو ملی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زمانہ اور مدت کوئی مال نہیں کہ جس کے معاوضہ میں روپیہ لیا جا سکے۔

(۲) نیز سود آدمی کو بے رحم بنا دیتا ہے اور بے ایمانی اور فریب وہی کے عجیب عجیب طریقے اس کے نفس میں القاء کرتا ہے حتی کہ آدمی کو آدمیت سے خارج کر دیتا ہے۔

(۳) نیز سود سے ملک کی ترقی پر اثر پڑتا ہے اس لیے کہ جب مال دار سود کے ذریعہ سے اپنا مال بڑھائیں گے تو تجارت اور زراعت اور صنعت اور حرفت پر روپیہ نہیں لگائیں گے جس پر ملک کی ترقی کا مدار ہے اس شخص کو بلا مشقت اور بلا محنت اگرچہ فائدہ ہو جائے گا مگر یہ فائدہ انفرادی اور شخصی ہوگا اجتماعی نہ ہوگا۔

(۴) سودخواری سے صلہ رحمی اور انسانی ہمدردی اور مروت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

(۵) سودخواری کی وجہ سے مال اور دنیا کی محبت قلب میں اس درجہ راسخ ہو جاتی ہے کہ طمع اور حرص اس کو ہر عیب اور معصیت سے اندھا بنا دیتی ہے۔

(۶) نیز تجارت کا دارومدار باہمی رضامندی پر ہے کما قال تعالی: ﴿إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾ اور اسی رضامندی کی تکمیل کے لیے شریعت نے خرید و فروخت میں خیار عیب اور خیار شرط اور خیار رویت کو مشروع کیا۔

تجارت میں جو شخص مثلاً غلہ خریدتا ہے تو وہ اپنے کھانے کے لیے یا کاشت کے لیے یا فروخت کرنے کے لیے خریدتا ہے اور یہ سب حقیقی منافع اور واقعی فوائد ہیں جن کے حصول کے لیے روپیہ خرچ کیا جاتا اور بائع اور مشتری کے اختیار اور ان کی رضاء و رغبت سے یہ معاملہ ہوتا ہے اور سود کا جو بھی معاملہ ہوتا ہے وہ مجبوری اور ناگواری کے ساتھ ہوتا ہے جو شخص بھی سو روپیہ لے کر ایک سو دس دینے کا معاملہ کرتا ہے وہ ہرگز ہرگز خوشی سے نہیں کرتا بلکہ مجبوراً اور لاچار ہو کر بصد تلخی اور ناگواری کرتا ہے اور دل سے یقین رکھتا ہے کہ اس سودی معاملہ سے مجھ کو حقیقی اور واقعی فوائد حاصل نہیں ہوئے آئندہ کے موہوم منافع کی امید پر سودی قرض لیتا ہے غرض یہ کہ سودخواری انسانی ہمدردی اور ترحم کے بھی خلاف ہے اور مصلحت عامہ کے بھی خلاف ہے اور اصول تجارت کے بھی خلاف ہے کہ معاملہ کی بنا مجبوری اور لاچاری اور تلخی اور ناگواری پر ہے اس معاملہ میں دل بجائے شادمانی کے پریشانی محسوس کرتا ہے اور اس سودی قرض کو اپنی گردن پر ایک بوجھ سمجھتا ہے اور اس کے اظہار سے شرماتا ہے اور اخیر میں پچھتاتا ہے اور اجتماع اور تمدن کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور روحانی اور اخلاقی مفاسد کا ذریعہ ہے جو شریعت کی نگاہ میں نہایت سخت اور بالکل ہی ناقابل درگذر ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ربا کو حرام کیا جو کمال ترحم اور کمال مصلحت پر مبنی ہے۔

(۷) نیز سودی کاروبار حکمت کے خلاف ہے اور درہم و دینار کے اصل وضع کے منافی ہے اس بارہ میں ہم امام غزالی قدس اللہ سرہ کے کلام معرفت التیام کا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جو غایت درجہ لطیف اور لذیذ ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم کی کتاب الشکر: ۴/۹۷ میں فرماتے ہیں کہ ربا کی حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی روپیہ سے تجارت

کر کے نفع اٹھایا ئے اور روپیہ کی روپیہ سے تجارت کرنا اس کی اصل وضع کے خلاف ہے اس لیے کہ درہم ودینار (سونا و چاندی) مقصود بالذات نہیں بلکہ ضروریات زندگی کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ اور وسیلہ اور غیر مقصود کو اس کی حد سے نکال کر اس کو مقصود بالذات تک پہنچانا یہ سراسر اس کی وضع کے خلاف ہے جب روپیہ کی روپیہ سے تجارت ہونے لگے تو وسیلہ وسیلہ نہ رہا بلکہ مقصود بن گیا سونا اور چاندی مقصود بالذات نہیں فقط سونے اور چاندی سے انسان کی زندگی نہیں گذر سکتی جب تک سونے اور چاندی کو کھانے اور پینے اور رہنے سہنے کا ذریعہ نہ بنائے محض سونے اور چاندی سے دنیا کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی۔ سونا اور چاندی اپنی ذات سے ایک قسم کے پتھر ہیں حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے سونے اور چاندی کو ایک میزان (ترازو) بنایا ہے۔ جس سے اشیاء عالم کی قیمتوں کا وزن ہوتا ہے اور یہ سونا چاندی خدا کی پیدا کردہ عجیب ترازو ہے جو شخص اس کا مالک ہوگیا وہ دراصل سب چیزوں کا مالک ہوگیا جو چاہے وہ سونے اور چاندی کے ذریعہ خرید سکتا ہے کپڑے سے کھانے کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی اور کھانے سے کپڑے کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی مگر روپیہ سے ہر قسم کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے مگر بایں ہمہ محض سونے اور چاندی کی ذات سے نہ بھوک اور پیاس رفع ہوسکتی ہے اور نہ سردی گرمی دور ہوسکتی ہے، معلوم ہوا کہ سونا اور چاندی مقصود بالذات نہیں بلکہ ضروریات مقصودہ کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں درہم ودینار۔ نحویوں کے حرف کی طرح ہیں کہ معنی فی نفسہ کے لیے وضع نہیں ہوتے بلکہ معنی فی غیرہ کے لیے وضع ہوئے ہیں۔ آئینہ کی طرح ہیں کہ جس طرح آئینہ دوسری اشیاء کے الوان (رنگتوں) کے دیکھنے کا آلہ ہے خود مقصود نہیں اسی طرح درہم ودینار اشیاء عالم کی قیمتوں اور رتبوں کے اندازہ کرنے کا ایک آلہ ہے خود مقصود نہیں سونا اور چاندی ظاہر میں سب کچھ ہے مگر حقیقت میں کچھ بھی نہیں ضرورت کے وقت سوکھی روٹی کا ٹکڑا اور پھٹے ہوئے کپڑے کا چیتھڑا کام دے جاتا ہے مگر سونے کا ٹکڑا کام نہیں دیتا تندرستی میں غذا مقصود ہے اور بیماری میں دوا مقصود ہے اور سونا اور چاندی اس مقصود کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنی ضروریات زندگی کو حاصل کرو پس جس شخص نے روپیہ کی روپیہ سے تجارت کر کے نفع اٹھایا اس نے اس کی اصل وضع کے بالکل خلاف کیا اور بڑا ہی ظلم کیا۔ اور کسی شی کو بے محل رکھنا اور خلاف وضع استعمال کرنے ہی کا نام ظلم ہے دیکھو احیاء العلوم کتاب الشکر: ۴/ ۹۷ اور دیکھو اتحاف شرح احیاء للعلامۃ الزبیدی: ۹/ ۶۳ تا ۶۶)

سود تمام شریعتوں میں حرام رہا ہے

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سود تمام شریعتوں اور آسمانی دینوں میں حرام رہا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہود کی مذمت میں یہ فرمایا ہے ﴿وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ﴾ کہ یہود سود لیتے ہیں حالانکہ توریت میں ان کو سود سے منع کیا گیا تھا۔ (تفسیر قرطبی: ۳/ ۳۶۶)

توریت سفر خروج باب ۲۲، درس: ۲۵ میں ہے۔

''اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو کچھ قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔''

اور علی ھذا انجیل لوقا باب ششم درس ۳۵ میں بغیر سود کے قرض دینے کی ترغیب مذکور ہے۔

سود ترقی کا ذریعہ نہیں بلکہ تنزل کا ذریعہ ہے

لوگوں کی زبان پر ہے کہ مسلمان مٹتے جاتے ہیں حالانکہ سود خواری مسلمانوں میں بڑھ رہی ہے اور دن بدن تنزل ہے۔ مسلمانوں کا جو ترقی کا زمانہ گذرا ہے اس میں سود کا نام ونشان نہ تھا باقی مغربی اقوام کی ترقی ان کی صنعت اور حرفت کی وجہ سے ہے نہ کہ سود کی وجہ سے بارہ سو سال تک مسلمانوں کی سلطنت عروج اور ترقی پر رہی اور کبھی سود کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی جب سے مسلمان امیروں اور وزیروں نے دین سے منہ موڑا اور عیش ونشاط اور رقص وسرور میں مبتلا ہوئے تب سے زوال شروع ہوا اور پھر ہوا جو ہوا۔

رہا یہ سوال کہ اس زمانہ میں بغیر سود کے کام کیسے چلے؟ جواب یہ ہے کہ جیسے پہلے چلتا تھا اور خوب چلتا تھا رشوت خوار بھی رشوت کے جواز کے لیے یہی دلیل پیش کر دیتے ہیں کہ بغیر رشوت کے کام نہیں چلتا۔

پس جس کو پہنچ گئی نصیحت اس کے پروردگار کی جانب سے یعنی ربوا کی حرمت اور اس کی ممنوعیت اس کو پہنچ گئی پس باز آ گیا اس فعل حرام اور قول کفر سے یعنی سود لینا بھی چھوڑ دیا اور ﴿اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ کہنا بھی چھوڑ دیا، تو اس کے لیے ہے جو کچھ اس حکم کے آنے سے پہلے لے چکا ہے۔ یعنی سود حرام ہونے سے پہلے جس قدر لے چکا ہے وہ اس سے واپس نہ لیا جائے گا وہ اس کی ملک ہے اور نہ اس پر عند اللہ کوئی مواخذہ ہوگا۔ اور دل کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اگر صدق نیت سے باز آیا ہے تو اللہ اس کی جزا دے گا۔ اور اگر کسی دنیاوی مصلحت اور ظاہر داری کی بنا پر توبہ کی ہے تو اس کے مطابق معاملہ ہوگا۔

اور جو شخص اس نصیحت کے بعد پھر اسی فعل حرام اور قول کفر کی طرف رجوع کرے یعنی حکم تحریم کے بعد سود سے باز نہ آئے بلکہ سود لیتا رہے اور حسب سابق ﴿اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ کہتا رہے یعنی سود کے حلال ثابت کرنے کے لیے تقریر کرتا رہے یا مضمون لکھتا رہے تو ایسے لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ کیونکہ حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے جو دوزخ میں ہمیشہ رہنے کا باعث ہے۔

اور سود میں اگرچہ فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے لیکن مآل اور انجام اس کا تباہی اور بربادی ہے۔ اس لیے کہ اللہ سبحانہ کی عادت یہ ہے کہ سود کو مٹاتے ہیں اس میں برکت نہیں ہوتی۔ سود خوار پر کبھی تو دنیا ہی میں بربادی آ جاتی ہے۔ اور اگر دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ڈھیل دی تو آخرت میں تو تباہی اور بربادی یقینی ہے۔

ابن عباس ﷠ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا﴾ کے معنی یہ ہیں کہ سود کے مال میں سے نہ کوئی صدقہ اور خیرات مقبول ہے اور نہ حج اور جہاد اور کوئی صلہ رحمی مقبول ہے۔ یہ دنیا کی بربادی ہوئی کہ سود کے روپیہ کا کوئی عمل مقبول نہ ہوا اور اہل عقل کی نظر میں بھی حرام مال کے ہدیہ کی کوئی وقعت اور قیمت نہیں۔ اور خداوند قدوس کے یہاں اگر پاک اور حلال بھی قبول ہو جائے تو اس کا فضل اور احسان ہے۔

اور صدقہ اور خیرات میں اگرچہ مال گھٹتا ہے۔ لیکن حقیقت میں مال بڑھتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ صدقات اور خیرات کو بڑھاتا ہے صدقہ اور خیرات سے جس قدر نکلتا ہے اس سے کہیں زائد اللہ اس میں برکت دے دیتا ہے۔ غافل مال

کی ظاہری کثرت کو دیکھتا ہے۔ اور عاقل اور دانا مال کی باطنی طہارت اور نظافت کو دیکھتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ﴾ ''آپ کہہ دیجئے کہ پاک اور ناپاک برابر نہیں ہوتے اگرچہ (اے نادان) تجھ کو ناپاک کی کثرت اچھی معلوم ہو۔''

ایک پرہیزگار ملازم اپنے سو روپیہ پر قناعت کرتا ہے۔ اور دوسرا سو روپیہ کا رشوت خوار ملازم ایک مہینہ میں سو کے ایک ہزار کر لیتا ہے۔ اول کے سو عطر اور گلاب ہیں اور وہ دوسرے کے ایک ہزار پیشاب ہیں۔

صدقہ اور خیرات کی مثال مسہل کی سی ہے کہ مسہل سے بدن دبلا اور پتلا تو ہو جاتا ہے مگر طبیب اور ڈاکٹر جانتا ہے کہ یہ تندرستی ہے۔ بدن سے فاسد مادہ نکل گیا۔ اور سود اور رشوت کو مثال ورم کی سی ہے اگر کسی کے منہ اور ہاتھ اور پیروں پر ورم آ جائے تو نادان اس کو موٹاپا سمجھتا ہے اور طبیب اور ڈاکٹر اس ورم کو دیکھ کر پیغام موت سمجھتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے اور گناہ گار سے راضی نہیں جو گناہوں میں منہمک ہو۔ اس سود خوار کی اس سے بڑھ کر کیا ناشکری ہوگی کہ خدا نے اس کو مال دیا اور مال دار ہونے کے باوجود اس سے اتنا نہ ہوا کہ اس نعمت کے شکر میں کسی محتاج کو کچھ صدقہ اور خیرات دے دیتا۔ اور اگر صدقہ اور خیرات پر اس کا دل آمادہ نہ ہوا تھا تو کم از کم بلا سود کے اس کو قرض ہی دے دیتا بھلا اس سے بڑھ کر خدا کی نعمت کی کیا ناشکری ہوگی۔ ایسے ناسپاسوں اور ناشکروں کے مال میں اللہ برکت نہیں دیتا۔ اور صدقات اور خیرات میں جو برکت ہوتی ہے وہ ایمان اور اعمال صالحہ کا ثمرہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق جو لوگ ایمان لائے یعنی اللہ کے تمام احکام کو مانا اور جس چیز کو خدا نے حلال اور حرام کیا اسی کے مطابق اس کو حلال اور حرام کیا اور نیک عمل کیے اور نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ ادا کی ایسے لوگوں کے مال میں اللہ تعالیٰ برکت دیتا ہے ان کو اپنے اعمال اور خیرات کا بدلہ اور ثواب ملے گا اپنے پروردگار کے پاس یعنی آخرت میں اور قیامت کے دن ان پر، نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ یہ لوگ غمگین ہوں گے۔ بخلاف ان لوگوں کے کہ جنہوں نے حلال اور حرام میں فرق نہ کیا تھا وہ طرح طرح کی مصیبتوں اور بلاؤں میں گرفتار ہوں گے۔ اے ایمان والو! ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور حلال اور حرام اور جائز اور ناجائز کو ایک نہ بناؤ اور جو سود تمہارا لوگوں کے ذمہ بقایا رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہو۔ یعنی ممانعت سے پہلے جو سود لے چکے وہ لے چکے اب ممانعت کے بعد جو سود بقایا رہ گیا ہے اس کے لینے اور مانگنے کی اجازت نہیں۔ ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جس چیز کی ممانعت کردی جائے اس کو چھوڑ دیا جائے۔ پس اگر تم اس حکم کے بعد ایسا نہ کرو یعنی بقایا سود کو نہ چھوڑو تو خبردار ہو جاؤ تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑنے کو یعنی اگر تم اس حکم پر عمل نہ کرو تو سمجھ لو کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے وفاداروں کی فہرست سے تمہارا نام کٹ گیا اور خدا اور اس کے رسول ﷺ سے تمہاری گرفتاری کے احکام جاری ہوں گے اور گرفتاری کے بعد تم کو حسب قواعد شریعت اور حسب احکام قتل کیا جائے گا یا قید میں رکھا جائے گا اور اسلامی عدالت ان احکام کو تم پر جاری کرے گی۔ اور اگر تم توبہ کرتے ہو تو تمہارے اصل مال اور اصل رقم تم کو مل جائے گی اس حکم کے بعد نہ تم کسی پر ظلم اور زیادتی کرو اور نہ تم پر کوئی ظلم اور زیادتی کی جائے۔ یعنی جو سود تم پہلے لے چکے ہو اگر ان کو تمہارے اصل مال میں محسوب کر لیا جائے تو وہ تم پر ظلم ہے۔ اور ممانعت کے بعد جو سود چڑھا ہے وہ اگر تم مانگو تو یہ تمہارا ظلم ہے

اور تمہارا قرض دار اگر مفلس اور تنگ دست ہے تو اس کو فراخی کے زمانہ تک مہلت دینی چاہیے اور اگر تم اس کو بالکل معاف کر دو تو تمہارا یہ صدقہ کرنا تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہوگا کہ سود تو کیا لیتے اصل ہی معاف کر دیا۔ اگر تم جانتے ہو کہ مہلت دینے اور صدقہ کر دینے اور معاف کر دینے میں کیا فضیلت ہے۔ جس فضیلت کو تم حاصل کر سکو اس میں دریغ نہ کرو اور اس دن کی پیشی سے ڈرتے رہو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی پوری پوری جزاء ملے گی اور ان پر کسی قسم کا ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ لہٰذا جو شخص دنیا میں مقروض کے ساتھ چشم پوشی اور نرمی کا معاملہ کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے ساتھ اپنے حقوق میں چشم پوشی اور نرمی فرمائیں گے۔

فوائد ولطائف

(۱) جو شخص سود کو حلال سمجھے وہ باجماع امت کافر اور مرتد ہے اور اگر سود کو حلال تو نہیں سمجھتا مگر چھوڑتا بھی نہیں تو بادشاہ اسلام کے ذمہ ایسے شخص کا قید کرنا واجب ہے۔ یہاں تک کہ توبہ کرے اور اگر کوئی اس قسم کی جماعت اور جتھا ہے جن کا قید کرنا مشکل ہے تو بادشاہ اسلام کے ذمہ ایسی جماعت سے جہاد اور قتال واجب ہے۔ اور یہی حکم ہے ہر اس شخص کا جو فرائض کو چھوڑ دے۔ مثلاً نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کو یا علی الاعلان گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا اور اس پر اڑا رہے۔ تفصیل کے لیے ابوبکر رازی جصاص کی احکام القرآن: ۱/ ۴۷۳ کی مراجعت کریں یا تفسیر مظہری دیکھیں۔

(۲) قال جعفر الصادق حرم اللہ الربا لیتقارض الناس۔"

"امام جعفر صادق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سود کو اس لیے حرام فرمایا تا کہ قرض سے ایک دوسرے کی مدد کریں۔

"وعن ابن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرضٌ مرّتین یعدل صدقه مرة اخرجه البزار"۔ (تفسیر القرطبی: ۳/ ۳۵۹)

"عبداللہ بن مسعود راوی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کسی کو دو مرتبہ قرض دینا ایک مرتبہ صدقہ دینے کے برابر ہے۔"

(۳) حرام مال سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ سود اور رشوت کا جو پیسہ اس کے پاس ہے وہ صاحب حق کو واپس کرے یا اس سے معاف کرائے۔ اور اگر اس شخص کو نہ تلاش کر سکے اور نہ کہیں اس کو پا سکے تو اس کی طرف سے خیرات کرے اور ایسے مصرف میں اس کو خرچ کرے جس میں اسلام اور مسلمانوں کا نفع اور فائدہ ہو۔ اور اگر کسی کی کل آمدنی حرام ہو تو سب کا خیرات کرنا واجب اور فرض ہے۔ سوائے ستر عورت کے کپڑے کے کسی شے کا اپنی ملک میں رکھنا جائز نہیں۔ جو کیا ہے اس کو بھگتنا پڑے گا۔ تفصیل کے لیے تفسیر قرطبی: ۳/ ۳۶۶ کی مراجعت کریں۔

(۴) فقہاء نے تصریح کی ہے کہ حرام مال پر زکوٰۃ نہیں۔ لہٰذا جس شخص کے پاس سود یا رشوت کا کروڑ روپیہ بھی جمع ہو اس پر زکوٰۃ نہیں۔ زکوٰۃ حلال مال پر واجب ہوتی ہے۔ جو مال سود یا رشوت یا خیانت یا چوری سے حاصل کیا جائے تو وہ دوسروں کا حق ہے اس پر زکوٰۃ کیسے واجب ہو؟

جو شخص حرام مال کا صدقہ کرے اور اللہ سے ثواب کی امید رکھے تو اندیشہ کفر کا ہے۔ بارگاہ خداوندی میں ناپاک اور گندی چیز پیش کرنا اور پھر اس پر اس کی رضا اور خوشنودی کی امید رکھنا کمال بے ادبی اور گستاخی ہے۔

(۵) احکام ربٰو کو ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ﴾ پر ختم فرمایا تاکہ دنیا اور مافیہا کا فناء اور زوال اور آخرت کی طرف سب کا رجوع کرنا اور ذرہ ذرہ کا حساب ہونا نظروں میں گھوم جائے اور دنیا کے حریص اور دلدادہ ہوش میں آ جائیں۔ دنیا کے مخبوط الحواس کا علاج سوائے آخرت کی یاد کے کچھ نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ

اے ایمان والو جب تم آپس میں معاملہ کرو ادھار کا کسی وقت مقرر تک تو اس کو لکھ لیا کرو اور چاہیئے کہ لکھ دے

اے ایمان والو! جس وقت معاملت کرو ادھار کی کسی وعدہ مقررہ تک تو اس کو لکھو۔ اور چاہیئے لکھ دے

بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ

تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف سے اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ لکھ دیوے جیسا سکھایا اس کو اللہ نے

تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف سے، اور نہ کنارہ کرے لکھنے والا اس سے کہ لکھ دیوے جیسا سکھایا اس کو اللہ نے

فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ

سو اس کو چاہیئے کہ لکھ دے اور بتلاتا جاوے وہ شخص کہ جس پر قرض ہے اور ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ ف۱

سو وہ لکھے۔ اور بتادے جس پر حق دینا ہے اور ڈرے اللہ سے جو رب ہے اس کا، اور ناقص نہ کرے

شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ

پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا آپ نہیں بتلا سکتا

اس میں سے کچھ۔ پھر اگر جس شخص پر دینا آیا، بے عقل ہے، یا ضعیف ہے، یا آپ نہیں بتا سکتا، تو بتادے

هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ

تو بتلاوے کارگزار اس کا انصاف سے ف۲ اور گواہ کرو دو شاہد اپنے مردوں میں سے پھر اگر نہ

اس کا اختیار والا انصاف سے۔ اور شاہد کرو دو شاہد اپنے مردوں میں سے۔ پھر اگر نہ

ف۱ پہلے صدقہ خیرات کی فضیلت اور اس کے احکام بیان فرمائے اس کے بعد ربوا اور اس کی حرمت اور برائی مذکور ہوئی اب اس معاملہ کا ذکر ہے جس میں قرض ہو اور آئندہ کسی مدت کا وعدہ ہو اسکی نسبت یہ معلوم ہوا کہ ایسا معاملہ جائز ہے مگر چونکہ یہ معاملہ آئندہ مدت کے لئے ہوا ہے بھول چوک خلاف نزاع کا احتمال ہے اس لئے یہ ضرور ہے کہ اس کا تعین اور اہتمام ایسا کیا جائے کہ آئندہ کوئی قضیہ اور خلاف نہ ہو۔ اس کی صورت یہی ہے کہ ایک کاغذ لکھو جس میں مدت کا تقرر ہو اور دونوں معاملہ والوں کا نام اور معاملہ کی تفصیل سب باتیں صاف صاف کھول کر لکھی جاویں کاتب کو چاہیے بلا انکار جس طرح شرع کا حکم ہے اسکے موافق انصاف میں کوتاہی نہ کرے اور چاہیے کہ مدیون اپنے ہاتھ سے لکھے یا کاتب کو اپنی زبان سے بتلائے اور دوسرے کے حق میں ذرا نقصان نہ ڈالے۔

ف۲ یعنی جو دیندار اور مدیون ہے وہ اگر بے عقل بھولا یا سست اور ضعیف ہے مثلاً بچہ ہے یا بہت بڑھا ہے کہ معاملہ کے سمجھنے کی سمجھ ہی نہیں ہے یا معاملہ=

لَمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا

ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے

ہوں دو مرد، تو ایک مرد اور دو عورتیں، جن کو پسند رکھتے ہو شاہدوں میں، کہ بھول جاوے ایک عورت

فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ

تو یاد دلاوے اس کو وہ دوسری ف۱ اور انکار نہ کریں گواہ جس وقت بلائے جاویں اور کاہلی نہ کرو اس کے

تو یاد دلا دے اس کو وہ دوسری۔ اور کنارہ نہ کریں شاہد جس وقت بلائے جاویں، اور کاہلی نہ کرو اس کے

تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ

لکھنے سے چھوٹا ہو معاملہ یا بڑا اس کی معیاد تک اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا ہے گواہی کو

لکھنے سے، چھوٹا ہو یا بڑا، اس کے وعدہ تک۔ اس میں خوب انصاف ہے اللہ کے ہاں، اور درست رہتی ہے گواہی،

وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ

اور نزدیک ہے کہ شبہ میں نہ پڑو ف۲ مگر یہ کہ سودا ہو ہاتھوں ہاتھ لیتے دیتے ہو اس کو آپس میں تو تم پر

اور لگتا کہ تم کو شبہ نہ پڑے، مگر ایسا کہ سودا ہو روبرو کا، پھر بدل کرتے ہو آپس میں، تو

عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ

کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو اور گواہ کرلیا کرو جب تم سودا کرو اور نقصان نہ کرے لکھنے والا

گناہ نہیں تم پر، کہ نہ لکھو اس کو، اور شاہد کرلو جب سودا کرو، اور نقصان نہ کیا جاوے لکھنے والا،

وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ

اور نہ گواہ ف۳ اور اگر ایسا کرو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر اور ڈرتے رہو اللہ سے اور اللہ تم کو سکھلاتا ہے

نہ شاہد، اور اگر ایسا کرو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے، اور اللہ تم کو سکھاتا ہے،

=کو کاتب کو بتلا نہیں سکتا تو ایسی صورتوں میں مدیون کے مختار اور وارث اور کارگزار کو چاہیے کہ معاملہ کو انصاف سے بلا کم و کاست لکھوا دے۔

ف۱ اور تم کو چاہیے کہ اس معاملہ پر کم سے کم دو گواہ مردوں میں سے یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں اور گواہ قابل پسند یعنی لائق اعتبار اور اعتماد ہوں۔

ف۲ یعنی گواہ کو جس وقت گواہ بنانے کے لئے یا ادائے شہادت کے لئے بلائیں تو اس کو کنارہ یا انکار نہ چاہیے اور کاہلی اور سستی نہ کرو اس کے لکھنے لکھانے میں معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا کہ انصاف پورا اسمیں ہے اور گواہی پر بھی کامل اعتماد اسے لکھ لینے میں ہے اور بھول چوک اور کسی کے حق ضائع ہونے سے اطمینان بھی اس میں ہے۔

ف۳ یعنی اگر سوداگری کا معاملہ دست بدست ہو جنس کے بدلے جنس یا نقد کی طرح معاملہ ہو مگر ادھار کا قصہ نہ ہو تو اب نہ لکھنے میں گناہ نہیں مگر گواہ بنالینا اس وقت بھی چاہیے کہ اس معاملہ کے متعلق کوئی نزاع آئندہ پیش آئے تو کام آئے اور لکھنے والا اور گواہ نقصان نہ کرے یعنی مدعی اور مدعی علیہ میں سے کسی کا بھی نقصان نہ کرے بلکہ جو حق واجبی ہو وہی ادا کریں۔

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝٢٨٢ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰی سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ

اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گرو

اور اللہ سب چیز سے واقف ہے۔ اور اگر تم سفر میں ہو، اور نہ پاؤ لکھنے والا، تو گرد ہاتھ میں رکھنی پھر

مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ

ہاتھ میں رکھنی چاہیے پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے کا تو چاہیئے کہ پورا ادا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور ڈرتا رہے اللہ سے

اگر اعتبار کرے ایک دوسرے کا، تو چاہیئے پورا کرے جس پر اعتبار کیا اپنے اعتبار کو، اور ڈرتا رہے اللہ سے

رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ یَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا

جو رب ہے اس کا اور مت چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپادے تو بیشک گناہ گار ہے دل اس کا اور اللہ تمہارے

جو رب ہے اس کا، اور نہ چھپاؤ گواہی کو۔ اور جو کوئی وہ چھپادے تو گنہگار ہے دل اس کا۔ اور اللہ تمہارے

تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ۝٢٨٣ ع ۳۹

کاموں کو خوب جانتا ہے ف ۱

کام سے واقف ہے۔

احکام قرض ورہن

قَالَ تَعَالٰی: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ... الی... وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ﴾

ربط:...... حق تعالیٰ نے صدقہ اور خیرات کے فضائل کے بعد سود کی مذمت بیان فرمائی اور چونکہ سود کی ضرورت اکثر قرض اور ادھار کی حالت میں پیش آتی ہے۔ اس لیے کہ سود کے بعد قرض اور ادھار کے احکام بیان فرماتے ہیں تا کہ سود سے بچ جائیں اور مال بھی محفوظ رہے۔ نیز صدقہ اور ربا اور دَین تینوں مالی معاملات میں پہلا محض رحمت ہے اور مقتضائے شفقت ہے اور دوسرا محض ظلم ہے اور مقتضائے حرص وہوا ہے اور تیسرا محض عدل اور انصاف ہے اور مقتضائے مروت ہے اس لیے آئندہ آیات میں دَین کے احکام بیان کیے تا کہ حاجت مند کی ضرورت پوری ہوجائے اور قرض دینے والے کا مال ضائع اور تلف ہوجانے سے محفوظ ہوجائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اے ایمان والو! جب تم کسی سے ایک معین مدت تک ادھار کا معاملہ کیا کرو۔ خواہ قیمت ادھار ہو یا وہ چیز ادھار ہو، جس کا خریدنا مقصود ہے۔ جیسے بیع سلم میں تو اس کو لکھ لیا کرو، تا کہ آئندہ کسی قسم کا جھگڑا پیش نہ آئے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ امر استحباب کے لیے ہے۔ لہٰذا اگر نہ لکھے تو کوئی حرج نہیں۔ بعض علماء اس طرف گئے

ف ۱ یعنی اگر سفر میں قرض اور ادھار کا معاملہ کرو اور دستاویز کے لئے کوئی کاتب نہ ملے تو قرض کے عوض کوئی چیز مدیون کو رہن رکھ دینی چاہیئے۔ فائدہ سفر میں رہن کی حاجت بہ نسبت حضر زیادہ ہوگی کیونکہ حضر میں کتابت وشہادت سے بھی بسہولت صاحب دین کا اطمینان ممکن ہے اس لئے سفر میں رہن کا حکم ہوا اور نہ حضر میں اور کاتب کی موجودگی میں بھی رہن درست ہے جیسا کہ حدیث میں موجود ہے اور اگر صاحب دین کو مدیون پر اعتماد اور اس کا اعتبار ہو اور اس لئے رہن کا طالب نہ ہو تو مدیون کو لازم ہے کہ صاحب دین کا حق تمام وکامل ادا کردے اور خدا سے ڈرتا رہے صاحب حق کے حق میں امانت سے معاملہ کرے۔

کہ یہ امر وجوبی ہے۔

فائدہ:...... بیع کی چار قسمیں ہیں: ۱- بیع الدین بالدین یعنی مبیع اور قیمت دونوں ادھار ہوں۔ یعنی ادھار کو ادھار کے بدلہ میں فروخت کرنا یہ بیع بالاجماع باطل ہے۔ ۲- بیع العین بالدین یعنی مبیع نقد ہو اور قیمت ادھار ہو۔ یہ صورت بالاجماع جائز ہے۔ ۳- بیع الدین بالعین یعنی قیمت نقد ہو اور مبیع ادھار ہو اسی کو بیع سلم کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما[1] فرماتے ہیں کہ یہ آیت خاص طور پر بیع سلم کی اجازت کے لیے نازل ہوئی۔ مگر بیع سلم کے لیے یہ شرط ہے کہ معاملہ کے وقت مدت اور مبیع کی نوع اور قسم اور اس کی مقدار اور نرخ سب مقرر کرلیا جائے تاکہ بعد میں کوئی نزاع پیش نہ آئے۔

(۴) بیع العین بالعین یعنی مبیع اور قیمت دونوں نقد ہوں۔ حق جل شانہ نے بیع کی اس قسم کو آئندہ آیت میں تجارت حاضرہ سے تعبیر فرمایا ہے کما قال تعالیٰ: ﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا﴾ جس کا حکم یہ فرمایا کہ تجارۃ حاضرہ میں بیع سلم کی طرح دستاویز لکھنے کی ضرورت نہیں، البتہ دو گواہوں کی گواہی کر لینی چاہیے کہ کوئی لکھنے والا تمہارے درمیان یہ دستاویز نہایت انصاف سے لکھے کہ نہ اس میں کوئی کمی کرے اور نہ زیادتی اور نہ کسی کی رعایت کرے۔ اور جو شخص لکھنا جانتا ہو اس کو چاہیے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو لکھنا سکھایا۔ پس اس نعمت کے شکریہ میں چاہیے کہ دوسروں کو اپنی کتابت سے نفع پہنچائے۔ احسن کما احسن اللہ الیک۔ لہٰذا اور جو شخص اس سے وثیقہ اور دستاویز لکھوانا چاہے، تو اس کاتب کو چاہیے کہ لکھ دے۔ اور اس دستاویز اور وثیقہ کا املاء وہ شخص کرائے کہ جس کے ذمہ حق واجب ہے۔ یعنی جس کے ذمہ دَین اور قرض ہے وہ خود لکھوائے تاکہ اس کا اقرار آئندہ خود اس پر حجت ہو۔ بخلاف قرض خواہ کے کہ اس کے قول کا اعتبار نہیں، جب تک خود قرض دار یعنی مقروض اور مدیون اقرار نہ کرے یا ثبوت شرعی کے بعد حاکم حکم نہ کرے۔ اور چاہیے کہ لکھوانے والا یا لکھنے والا اپنے پروردگار سے ڈرے اور لکھوانے اور لکھنے میں حق سے ذرہ برابر بھی کمی نہ کرے یعنی ٹھیک ٹھیک لکھے پس اگر وہ شخص جس پر حق واجب ہے۔ یعنی جس کے ذمہ دینا آتا ہے وہ کم عقل ہو۔ یعنی دیوانہ یا دل چلا ہو کہ اندھا دھند خرچ کرتا ہو اور انجام نہ سوچتا ہو، جیسے مبذر (بے جا صرف کرنے والا) یا ضعیف البدن ہو۔ یعنی کم عمر ہو یا بہت بوڑھا ہو کہ اس کی عقل میں فتور آ گیا ہو یا کسی اور وجہ سے خود نہ لکھوا سکتا ہو مثلاً گونگا ہو یا زبان نہ جانتا ہو یا قید میں ہو یا بیمار زیادہ ہو یا ایسی جگہ ہو کہ جہاں کاتب نہ ہو یا پردہ نشین عورت ہو کہ وہ کاتب کے سامنے نہیں آ سکتی، تو ایسے حالات میں اس کا مختار اور کارگذار ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوا دے۔ اور لکھوانے اور معاملہ کے قلمبند ہو جانے کے بعد احتیاطاً اپنے مردوں میں سے دو گواہ بھی بنالو یعنی دو آزاد مسلمان بالغوں کو گواہ بناؤ۔ غلام اور کافر اور بچہ کو گواہ نہ بناؤ۔ کیونکہ جب کتابت کے ساتھ شہادت بھی مل جائے گی تو نزاع اور مخاصمت کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے گا اور اگر گواہی کے لیے دو مرد میسر نہ آئیں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہی کے لیے کافی ہیں۔ بشرطیکہ یہ سب ان لوگوں میں سے ہوں جن کو تم گواہ بنانے کے لیے پسند کرتے ہو۔ یعنی ثقہ اور امین ہوں۔ فسق و فجور اور بے مروتی سے متہم نہ ہوں اور نہ دونوں میں کوئی ایسی قرابت ہو جو کہ شبہ اور تہمت کا باعث ہو۔ اور ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کا ہونا اس لیے شرط کیا گیا کہ شاید ایک

[1] قال ابن عباس هذه الآية نزلت في السلم خاصه كذا في تفسير القرطبي: ۳/۳۷۷

عورت اپنی فطری غفلت اور ذاتی قصور عقلی کی وجہ سے واقعۂ شہادت کے کسی جزء کو بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلائے۔ اور اس طرح شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے۔

حضرت مولانا قاسم صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں عجب نہیں کہ مجموعہ بنی آدم میں من اولھم الی آخرھم دو تہائی عورتیں اور ایک تہائی مرد ہوں اور حکم ازلی نے باعتبار جہت تقابل کے بھی وہی حساب للذکر مثل حظ الانثیین بٹھا کر ایک مرد کو دو عورتوں کے مقابل رکھا ہو اور گواہوں ❶ کو جب گواہی دینے کے لیے یا گواہ بنانے کے لیے بلایا جائے تو ان کو چاہیے کہ انکار نہ کریں۔ کیونکہ گواہ بننے میں اپنے بھائی کے حق کی حفاظت اور اعانت ہے اور گواہ بننے کے بعد گواہی نہ دینے میں اپنے بھائی کی حق تلفی ہے۔ اور حق کے لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔ خواہ وہ حق چھوٹا ہو یا بڑا۔ شروع وقت سے لے کر اخیر میعاد تک اس کو لکھ لیا کرو۔ یہی بات اللہ کے نزدیک نہایت منصفانہ اور عادلانہ ہے۔ اور نیز شہادت کے قائم اور محفوظ رکھنے میں نہایت معین اور مددگار ہے نیز اس بات کے بہت قریب ہے کہ تم گواہی دینے کے وقت کسی شک اور شبہ میں نہ پڑو۔ نہ قرض کی مقدار میں اور نہ اس کی جنس اور نوع میں اور نہ اس کی مدت وغیرہ میں۔ ان وجوہ کی بناء پر ہر حالت میں لکھ لینا نہایت بہتر ہے۔ مگر اس وقت کہ جب معاملہ دست بدست ہو جس کا تم آپس میں نقد لین دین کر رہے ہو۔ مبیع بھی نقد ہو اور دام بھی نقد ہو۔ تو ایسی صورت میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اس معاملہ کو نہ لکھو کیونکہ جب معاملہ نقد ہے اور مبیع اور قیمت کوئی شے ادھار نہیں، تو ایسی صورت میں بظاہر کسی نزاع اور خصومت کا احتمال بعید ہے اس لیے لکھنے کی ضرورت نہیں ولیکن مستحب یہ ہے کہ جب کبھی تم کوئی خرید و فروخت کیا کرو احتیاطاً گواہ بنا لیا کرو۔ اگرچہ عوضین نقد ہوں، یعنی اگرچہ سودا دست بدست ہو۔ تب بھی یہی بہتر ہے کہ اس پر گواہ بنا لیے جائیں تاکہ نزاع اور خصومت کا بالکلیہ سد باب ہو جائے۔ اور جس طرح ہم نے کاتب اور شاہد کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ کتابت اور شہادت سے انکار نہ کرے، اسی طرح تم کو یہ حکم دیا کہ لکھنے والے اور گواہ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ مثلاً کاتب اور شاہد اپنے کسی ضروری کام میں مشغول ہوں یا بیمار اور ناطاقت ہوں ایسی حالت میں ان کو لکھنے اور گواہی دینے کی تکلیف نہ دی جائے۔ اور اگر تم ایسا کرو گے تو سمجھ لو کہ یہ تمہارے لیے اللہ کی اطاعت سے خروج کرنا ہوگا، جو کسی طرح تمہارے لائق نہیں اور تم کو چاہیے کہ ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہو کہ کہیں اطاعت سے نکلنے پر پکڑ نہ ہو جائے۔ اور تم اللہ کی اطاعت سے کیسے خارج ہوتے ہو اور اللہ تو تم کو دین اور دنیا کی مصلحتیں سکھاتا اور بتاتا رہتا ہے۔ لہٰذا تم کو اللہ کی اطاعت سے خارج نہ ہونا چاہیے اور اگر کسی حکم کی مصلحت تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے، جو حکم دے اس کی اطاعت کرو خواہ تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ پہلے جملہ میں تقویٰ کی ترغیب دی اور دوسرے جملہ میں اپنی نعمتِ تعلیم کو ذکر فرمایا اور اس تیسرے جملہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمتِ شان کو بیان فرمایا۔ اور اگر سفر کی حالت میں قرض اور ادھار کا معاملہ کرو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی لکھنے والا تم کو میسر نہ آئے۔ تو تم کو لازم ہے کہ جس کا تم نے قرض اور ادھار لیا ہے، قرض کے عوض میں کوئی شے اس کے پاس رہن رکھ دو جو اس کے قبضہ میں دے دی جائے۔

❶ قال الحسن جمعت ھذہ الآیۃ (ای ولا یاب الشھداء اذا ما دعوا) امرین وھما ان لا تابی اذا دعیت الی تحصیل الشھادۃ ولا اذا دعیت الی اداءھا قال ابن عباس۔ ۱۲۔ تفسیر قرطبی: ۳/۳۹۸۔

ف ۱:...... سفر کی قید احترازی نہیں کہ قیام کی حالت میں رہن جائز نہ ہو بلکہ اس وجہ سے ہے کہ بہ نسبت حضر کے سفر میں رہن کی زیادہ حاجت پیش آتی ہے اس لیے آیت میں سفر کا خاص طور پر ذکر فرمایا، ورنہ رہن سفر اور حضرت دونوں حالتوں میں بالاجماع جائز ہے اور یہ رہن رکھنے کا حکم اس وقت ہے کہ جب ایک کو دوسرے پر اطمینان نہ ہو۔ اور اگر ایک کو دوسرے پر اطمینان ہو اور ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو۔ اور رہن اور لکھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتا ہو۔ پس اس شخص کو چاہیے کہ جس کا اعتبار کیا گیا اور بلا رہن اور بلا لکھے اس کو قرض دے دیا گیا وہ اپنی امانت یعنی اپنے قرضہ کو پورا پورا ادا کردے۔ یعنی جس نے اس کا اعتبار کیا ہے، اس کا حق پورا پورا ادا کردے۔

ف ۲:...... امانت سے قرضہ مراد ہے۔ قرضہ کو امانت سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ مامون ہونے کی وجہ سے بغیر تحریر اور بغیر رہن کے اس کو قرض دے دیا۔ اور اس کو چاہیے کہ اللہ سے ڈرے کہ نہ خیانت کرے اور نہ حق کا انکار کرے اور اے گواہو! جس وقت تمہاری شہادت کی ضرورت ہو اور بغیر تمہاری شہادت دیئے کسی کے حق کے ضائع اور تلف ہونے کا اندیشہ ہو، خصوصاً جس وقت بغیر کسی رہن اور بغیر کسی تحریر کے کسی کو کوئی قرض دیا گیا ہو، تو اس وقت تم اپنی شہادت کو مت چھپانا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شہادت کو دل میں چھپا کر رکھتا ہے اور ضرورت کے وقت زبان سے اس کو ظاہر نہیں کرتا تو بلا شبہ اس کا قلب بالذات اور بلا واسطہ گنہ گار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کتمانِ شہادت بلا واسطہ قلب کا فعل ہے جس میں کسی عضو اور جارحہ کو بالکل دخل نہیں۔ اور قلب چونکہ رئیس الاعضاء ہے، اس لیے اس کی معصیت بھی راس المعاصی ہوگی۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اولادِ آدم کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جس وقت تک وہ درست رہتا ہے، تو سارا بدن درست رہتا ہے۔ اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ اور یاد رکھو کہ وہ ٹکڑا ''دل'' ہے۔ (بخاری و مسلم)

اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے آگاہ اور واقف ہے۔ تمہارے گواہی دینے اور نہ دینے اور شہادت کے چھپانے اور ظاہر کرنے کو بھی بخوبی جانتا ہے۔ جو شہادت تم نے دل میں چھپائی ہے اگرچہ لوگوں کو اس کا علم نہ ہو، مگر اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے۔

مسئلہ ۱:...... ﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ میں گواہ بنانے کا حکم استحبابی ہے۔

مسئلہ ۲:...... سوائے شہادت زنا کے ہر امر کی شہادت کے لیے دو ثقہ آدمیوں کی گواہی کافی ہے۔ البتہ زنا کی شہادت کے لیے چار مردوں کی گواہی ضروری ہے کیونکہ زنا کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے اس لیے چار آدمیوں کی گواہی ضروری ہوئی کہ گویا دو گواہ مرد کے زنا کے لیے اور دو گواہ عورت کے زنا کے لیے۔ نیز شریعت کا مقصود پردہ پوشی بھی مطلوب ہے۔

مسئلہ ۳:...... پھر سوائے زنا کے حدود اور قصاص میں دو مردوں کی گواہی کافی ہے مگر شرط یہ ہے کہ کوئی گواہ عورت نہ ہو۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں زہری رحمہ اللہ سے منقول ہے: ''مضت السنة من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين بعده ان لا شهادة للنساء فى الحدود'' یعنی نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ سے یہ سنت جاری ہے کہ حدود اور قصاص میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔

مسئلہ ۴:...... باقی ان کے سوا اور تمام معاملات میں خواہ مالی ہوں یا غیر مالی دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں و زمین میں ہے اور اگر ظاہر کرو گے اپنے جی کی بات یا چھپاؤ گے

اللہ کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ اور اگر کھولو گے اپنے جی کی بات یا چھپاؤ گے۔

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

اس کو حساب لے گا اس کا تم سے اللہ پھر بخشے گا جس کو چاہے اور عذاب کرے گا جس کو چاہے اور اللہ ہر چیز پر

حساب لے گا تم سے اللہ۔ پھر بخشے گا جس کو چاہے اور عذاب کرے گا جس کو چاہے، اور اللہ سب چیز پر

قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

قادر ہے ف۱ مان لیا رسول نے جو کچھ اترا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی سب نے مانا اللہ کو

قادر ہے۔ مانا رسول نے جو کچھ اترا اس کو اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے۔ سب نے مانا اللہ کو

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا

اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو کہتے ہیں کہ ہم جدا نہیں کرتے کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا

اور اس کے فرشتوں کو اور کتابوں کو اور رسولوں کو، ہم جدا نہیں کرتے کسی کو اس کے رسولوں میں، اور بولے ہم نے سنا

وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ

اور قبول کیا تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے ف۲ اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے

اور قبول کیا، تیری بخشش چاہیے، اے رب ہمارے! اور تجھی تک رجوع ہے۔ اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی شخص کو مگر جو اس کی گنجائش ہے۔

ف۱ اس سورت میں اصول و فروع عبادات و معاملات جانی و مالی ہر قسم کے احکامات بہت کثرت سے مذکور فرمائے اور شاید اس سورت کے سنام القرآن فرمانے کی یہی وجہ ہو اس لئے مناسب ہے، کہ بندوں کو پوری تاکید و تہدید بھی ہر طرح سے فرما دی جائے تاکہ تعمیل احکام مذکورہ میں کوتاہی سے اجتناب کریں سو اسی غرض کے لئے آخر سورت میں احکام کو بیان فرما کر اس آیت کو بطور تہدید و تنبیہ ارشاد فرما کر تمام احکام مذکورہ سابقہ کی پابندی پر سب کو مجبور کر دیا اور طلاق و نکاح قصاص و زکوٰۃ بیع و ربوا وغیرہ میں جو اکثر صاحب حیلوں اور اپنی ایجاد کردہ تدبیروں سے کام لیتے ہیں اور ناجائز امور کو جائز بنانے میں خود رائی اور سینہ زوری سے کام لیتے ہیں انکو بھی اس میں پوری تنبیہ ہو گئی دیکھئے جس کو ہم پر استحقاق عبادت حاصل ہو گا اس کو مالک ہونا چاہیے اور جو ہماری ظاہری اور مخفی تمام اشیاء کا محاسبہ کر سکے اسکو تمام امور کا علم ہونا ضروری ہے اور جو ہماری تمام چیزوں کا حساب لے سکے اور ہر ایک کے مقابلہ میں جزاء و سزا دے سکے اس کو تمام چیزوں پر قدرت ہونی ضروری ہے سو انہی تین کمالات یعنی ملک اور علم اور قدرت کو یہاں بیان فرمایا اور انہی کا آیۃ الکرسی میں ارشاد ہو چکا ہے مطلب یہی ہے کہ ذات پاک سبحانہ، تمام چیزوں کی مالک اور خالق اس کا علم سب کو محیط اسکی قدرت سب پر شامل ہے تو پھر اسکی نافرمانی کسی امر ظاہر یا مخفی میں کر کے بندہ کیونکر نجات پا سکتا ہے۔

ف۲ پہلی آیت سے جب یہ معلوم ہوا کہ دل کے خیالات پر بھی حساب اور گرفت ہے تو اس پر حضرات صحابہ گھبرائے اور ڈرے اور ان کو اتنا صدمہ ہوا کہ کسی آیت پر نہ ہوا تھا آپ سے شکایت کی تو آپ نے فرمایا قُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا یعنی اشکال نظر آئے یا دقت مگر حق تعالیٰ کے ارشاد کی تسلیم میں ادنیٰ توقف بھی مت کرو اور سینہ ٹھوک کر سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا عرض کرو آپ کے ارشاد کی تعمیل کی تو انشراح کے ساتھ یہ کلمات زبان پر بے ساختہ جاری ہو گئے مطلب ان کا یہ ہے کہ ہم ایمان لائے اور اللہ کے حکم کی اطاعت کی یعنی اپنی دقت اور خلجان سب کو چھوڑ کر ارشاد کی تعمیل میں مستعدی اور آمادگی ظاہر کی حق تعالیٰ کو یہ بات پسند ہوئی تب یہ =

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ

اسی کو ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا اے رب ہمارے نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا

اسی کو ملتا ہے جو کمایا، اور اسی پر پڑتا ہے جو کیا، اے رب ہمارے نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا

أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا

چوکیں اے رب ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر اے رب ہمارے

چوکیں، اے رب ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری، جیسا رکھا تھا تو نے اگلوں پر، اے رب ہمارے

وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ أَنْتَ

اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس کی ہم کو طاقت نہیں اور درگزر کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر تو ہی

اور نہ اٹھوا ہم سے جس کی طاقت نہیں ہم کو، اور درگذر کر ہم سے، اور بخش ہم کو، اور رحم کر ہم پر، تو

مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ ﴿۲۸۶﴾　ع ۸

ہمارا رب ہے مدد کر ہماری کافروں پر ف۱

ہمارا صاحب ہے، مدد کر ہماری قوم کافروں پر۔

خاتمہ سورۃ

مشتمل بر تذکیر جلال خدواندی وعظمت وتحذیر از محاسبہ آخرت وتلقین ایمان وسمع وطاعت وتعلیم دعاء فلاح دارین، در آخرت عفو ومغفرت ودر دنیا فتح ونصرت

قال تعالیٰ: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ... الی ... فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ﴾

ربط:...... یہ رکوع، سورۂ بقرہ کا آخری رکوع ہے جس پر سورۂ بقرہ ختم ہورہی ہے۔ یہ عجیب خاتمہ ہے جس کو اول سورت سے بھی خاص ربط ہے اور آخر سورت سے بھی اور درمیان سورت سے بھی اور مجموعہ سورت سے بھی۔

= دونوں آیتیں اتریں اول یعنی اٰمَنَ الرَّسُوْلُ الخ اس میں رسول کریم اور انکے بعد صحابہ کہ جن کو اشکال مذکور پیش آیا تھا انکے ایمان کی حق سبحانہ نے تفصیل کے ساتھ مدح فرمائی جس سے انکے دلوں میں اطمینان ترقی پا دے اور خلجان سابق زائل ہو اسکے بعد دوسری آیت ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا﴾ الخ میں فرما دیا کہ مقدور سے باہر کسی کو تکلیف نہیں دی جاتی اب اگر کوئی دل میں گناہ کا خیال اور خطرہ پاوے اور اس پر عمل نہ کرے تو کچھ گناہ نہیں اور بھول چوک بھی معاف ہے غرض صاف فرما دیا کہ جن باتوں سے بچنا طاقت سے باہر ہے جیسے برے کام کا خیال وخطرہ یا بھول چوک ان پر مواخذہ نہیں ہاں جو باتیں بندہ کے ارادے اور اختیار میں ہیں ان پر مواخذہ ہوگا اب آیت سابقہ کو سن کر جو صدمہ ہوا تھا اس کے معنی بھی اسی پچھلے قاعدہ کے موافق لینے چاہئیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور خلجان مذکور کا اب ایسا قلع قمع ہوگیا کہ سبحان اللہ۔

فائدہ: جدا نہیں کرتے کسی کو اسکے پیغمبروں میں سے یعنی یہود اور نصاریٰ کی طرح نہیں کہ کسی پیغمبر کو مانا اور کسی پیغمبر کو نہ مانا۔

ف۱ اول آیت پر حضرات صحابہ کو بڑی پریشانی ہوئی تھی ان کی تسلی کے لئے یہ دو آیتیں اٰمن الرسول الخ اور لا یکلف اللہ نفسا الخ نازل ہوئیں اب =

ان آیات سے پہلے جو آیتیں گذریں ان میں کتمان شہادت کو دل کا گناہ بتلایا تھا۔ اب ان آیات میں اس امر کو بیان فرماتے ہیں کہ قلب کے کن افعال پر مواخذہ ہے اور کن پر نہیں۔ نیز گزشتہ آیات میں یہ حکم دیا تھا کہ امانت میں خیانت نہ کرو اور اللہ کا خوف دل میں رکھو اور اس کے عذاب اور مواخذہ سے ڈرتے رہو۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور اس کی قدرت اور اس کے محاسبہ اور مواخذہ کو بیان فرماتے ہیں۔ اور ابتداء سورت سے یہ مناسبت ہے کہ ابتداء سورت میں متقین کی صفات کا ذکر تھا کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور ﴿مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ اور ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ سب کی بلاتفریق کے تصدیق کرتے ہیں اور آخرت کا خاص طور پر یقین رکھتے ہیں اور عبادات بدنیہ اور مالیہ کو دل و جان سے بجالاتے ہیں۔ اب اس سورت کے آخری رکوع میں پھر انہی متقین کی مدح ہے۔ اور ان کی سمع و طاعت اور بارگاہ خداوندی میں ان کی والہانہ دعا اور مناجات کا تذکرہ ہے۔ نیز ابتداء سورت میں ایمان بالغیب کا ذکر تھا کہ یہ پرہیزگاروں کا گروہ محض خدا اور رسول ﷺ کے اعتماد پر بے دیکھی چیزوں پر ایمان رکھتا ہے مگر اس غیب کی تفسیر مذکور نہ تھی کہ غیب سے کون کون سی چیزیں مراد تھیں۔ اب اس آخری رکوع میں اس غیب کی تفسیر کی طرف اشارہ فرمایا کہ غیب سے اللہ تعالیٰ اور اسکے فرشتے اور اس کے نازل فرمودہ صحیفے اور کتابیں اور تمام پیغمبر مراد ہیں۔ گویا کہ ﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾ الخ ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ کی تفسیر ہے۔ یعنی ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ میں لفظ غیب سے ان چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں اس کی توضیح گذر چکی ہے دوبارہ وہاں دیکھ لیا جائے اور ﴿قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ یہ لفظ ﴿يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ کی تفسیر ہے اور ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ اور ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ﴾ الخ یعنی معافی اور مغفرت اور رحمت کی درخواست یہ سب ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ کی تفسیر ہے۔ اور ایمان اور تقوی کے ساتھ قوم کافرین پر فتح اور نصرت۔ یہ ہدایت بھی ہے اور دینی اور دنیوی فلاح اور کامیابی بھی ہے گویا کہ یہ مضمون ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ کی تفسیر ہے۔ اور یہی مضمون درمیان سورت بیان کیا گیا تھا۔ یعنی ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ﴾ الخ میں یہی مضمون تھا جو اس آخری رکوع میں مذکور ہے۔ غرض یہ کہ سورت کی ابتداء بھی مسئلۂ ایمان کی تحقیق اور متقین کی مدح سے ہوئی اور اس کی انتہا بھی اسی مضمون پر ہوئی اور وسط میں بھی ایک عجیب عنوان سے اسی مسئلہ کو بیان فرمایا اور یہ بلاغت کی انتہاء ہے کہ ابتداء سے لے کر انتہاء تک کلام یکساں ہو۔ اول اور آخر اور اوسط سب ایک

= اس کے بعد ربنا لا تؤاخذنا آخر سورت تک نازل فرما کر ایسا اطمینان دیا گیا کہ کسی صعوبت اور دشواری کا اندیشہ بھی باقی نہ چھوڑا کیونکہ جن دعاؤں کا ہم کو حکم ہوا ہے ان کا مقصود یہ ہے کہ بیشک ہر طرح کا حق حکومت اور استحقاق عبادت تجھ کو ہم پر ثابت ہے مگر اے ہمارے رب اپنی رحمت و کرم سے ہمارے لئے ایسے حکم بھیجے جائیں جن کے بجالانے میں ہم پر صعوبت اور بھاری مشقت نہ ہو نہ بھول چوک میں ہم پکڑے جائیں نہ مثل پہلی امتوں کے ہم پر شدید حکم اتارے جائیں نہ ہماری طاقت سے باہر کوئی حکم ہم پر مقرر ہو اس سہولت پر بھی ہم سے جو قصور ہو جائے اس سے درگزر اور معافی اور ہم پر رحم فرمایا جائے۔ حدیث میں ہے کہ یہ سب دعائیں مقبول ہوئیں۔ اور جب اس دشواری کے بعد جو حضرات صحابہ کو پیش آ چکی تھی اللہ کی رحمت سے اب ہر ایک دشواری سے ہم کو امن مل گیا تو اب استادہ بھی ہونا چاہیے کہ کفار پر ہم کو غلبہ عنایت ہو ورنہ ان کی طرف سے مختلف دقتیں دینی اور دنیوی ہر طرح کی مزاحمتیں پیش آ کر جس صعوبت سے اللہ اللہ کر کے اللہ کے فضل سے جان بچی تھی کفار کے غلبہ کی حالت میں پھر وہی کھٹکا موجب بے اطمینانی ہوگا۔

دوسرے سے مربوط اور متناسب ہوں۔

اور اسی سورت کا دل آیت الکرسی ہے جس میں حق جل شانہ کی صفت حیات اور قیومیت کا بیان تھا اور مومن کی باطنی اور روحانی حیات اور قیومیت کا دارومدار ایمان اور اطاعت پر ہے جس کا اس رکوع میں تفصیل کے ساتھ بیان ہے۔

اور مجموعۂ سورت کے ساتھ یہ ربط ہے کہ یہ سورت معاش اور معاد کے متعلق ہمیشہ ہر قسم کے احکام پر مشتمل ہے اس لیے مناسب ہوا کہ خاتمہ احکام پر حق جل شانہ کی مالکیت اور اس کے احاطۂ علم وقدرت اور اس کے محاسبہ اور مواخذہ کو ذکر کیا جائے تاکہ احکام خداوندی کی تعمیل میں کوتاہی نہ کریں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ الی آخر السورۃ۔ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے جس میں تمہارا دل اور اس کے خطرات بھی داخل ہیں۔ وہی ان سب کائنات کا مالک ہے کیونکہ اسی نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کا علم نہ ہو۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ اور جب تم یہ سمجھ گئے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خالقیت تمام کائنات کو محیط ہے، اسی طرح اس کا علم قدیم بھی تمام کائنات کو ہر اعتبار سے محیط ہے۔ تو اب یہ سمجھو کہ جو اخلاق اور اعمال تمہارے دل اور ضمیر میں مضمر اور پوشیدہ ہیں، ان کو زبان یا اعضاء اور جوارح سے ظاہر کرو یا دل ہی میں چھپائے رکھو، ان سب پر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تم سے حساب لے گا اور پھر محاسبہ کے بعد جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ جس ظاہر اور پوشیدہ کو چاہے گا معاف کرے گا اور جس پر چاہے گا سزا دے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔ اگر چاہیں تو صغیرہ پر بھی عذاب دے سکتے ہیں اور چاہیں تو کبیرہ کو بھی بلا توبہ ہی معاف فرمادیں۔ تمام اہل سنت والجماعت کا اس پر اجماع ہے کہ اعمال قلبیہ اور قالبیہ اور افعال نفسانیہ اور جسمانیہ خواہ صغائر ہوں یا کبائر سب پر محاسبہ حق ہے اور جزاء اور سزا سب اللہ کے اختیار میں۔ کوئی شی اس پر واجب نہیں۔

جب یہ آیت یعنی ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ نازل ہوئی تو صحابہ کرام الفاظ کے ظاہری عموم کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ اس لیے کہ ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ دل کے خیالات پر بھی حساب ہوگا۔ اس لیے صحابہ ؓ نے حضور پر نور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! یہ حکم سخت مشکل ہے اختیاری امور سے تو بچ سکتے ہیں مگر خطرات قلبیہ اور غیر اختیاری وسوسوں سے بچنا مشکل ہے۔

حضور پر نور ﷺ نے ان کے اس قول کو سن کر یہ فرمایا کہ تم بنی اسرائیل کی طرح انکار مت کرو اور دل وجان سے اس کے حکم کو قبول کرو۔ یعنی اہل کتاب کی طرح ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ نہ کہو بلکہ ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ پڑھو۔ اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ حضور پر نور ﷺ نے انتظار وحی میں از خود آیت کی تفسیر نہیں فرمائی بلکہ صحابہ ؓ کو ادب کی تعلیم اور تلقین فرمائی۔ صحابہ ؓ نے فوراً ہی "سَمِعْنَا" اور "اَطَعْنَا" کہا اور کلمات ایمان دل وجان سے کہے۔ اللہ تعالیٰ کو صحابہ ؓ کی یہ بات پسند آئی۔ اس پر آئندہ آیتیں یعنی ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ الخ نازل ہوئیں جس میں اول کی دو آیتوں میں صحابہ ؓ کی مدح تری اور تفصیل کے ساتھ ان کے ایمان اور ان کی اطاعت کو بیان فرمایا تاکہ ان کے دلوں کو اطمینان ہو جائے اور عشاق اور محبین کے دلوں میں جو پریشانی اور اضطراب تھا وہ دور ہو جائے اور پھر ان کی اس مدح کے بعد ان

کے اس خلجان اور اشکال کا جواب جوان کو پیش آیا تھا ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ الخ سے ذکر فرمایا کہ جو چیز بندہ کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے بندہ اس کا مکلف نہیں۔ لہٰذا دل میں جو گناہ کا خیال اور خطرہ آ جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں جب تک خود اپنے اختیار اور ارادہ سے اس پر عمل نہ کرے یا زبان سے اس کا تکلم اور تلفظ نہ کرے۔ اور علی ہذا بھول چوک پر بھی کوئی مواخذہ نہیں، البتہ جو باتیں بندہ کی قدرت اور اختیار میں ہیں ان پر مواخذہ ہوگا۔

مدح اہل ایمان

ایمان لائے پیغمبر تمام اس چیز پر جو ان کے رب کی طرف سے ان کی جانب اتاری گئی اور آپ کے ارشاد کے مطابق اس زمانہ کے تمام مسلمان بھی اس پر ایمان لائے سب کے سب یعنی رسول اور تمام مومنین ایمان لائے اللہ پر اور اس کے تمام فرشتوں پر اور اس کی تمام کتابوں پر اور اس کے تمام پیغمبروں پر جن کے واسطہ سے ہم تک اللہ کے احکام پہنچے۔ اللہ کی کتابیں اور اس کے پیغمبروں کی شریعتیں اگرچہ فروعی اور وقتی مسائل میں کچھ مختلف ہیں لیکن ہم ایمان لانے میں پیغمبروں کے درمیان تفریق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں۔ جیسا کہ یہود کا شیوہ رہا کہ بعض کو نہ مانا۔ اور جو احکام خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں ان کو دل وجان سے قبول کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تیرے احکام کو سنا اور دل وجان سے اُن کو قبول کیا۔ اور اے پروردگار چونکہ ہم سراپا تقصیر ہیں سہو ونسیان ہمارے خمیر میں پڑا ہے اس لیے اے پروردگار تیری مغفرت اور بخشش کے طلب گار ہیں۔ ہمارا کوئی عمل بھی کوتاہی سے خالی نہیں۔ اور کیسے تجھ سے مغفرت کی درخواست نہ کریں کیونکہ مرنے کے بعد آپ ہی کی طرف لوٹنا اور آپ ہی کے سامنے پیش ہونا ہے۔

بیان مدار تکلیف بعد از بیان مدح وتوصیف

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾

صحابہ ؓ کی مدح اور توصیف کے بعد تکلیفِ شرعی کے دار ومدار کو بیان فرماتے ہیں تا کہ ان کا شبہ اور خلجان دور ہو۔ صحابہ ؓ کو شبہ یہ تھا کہ کیا نفوس اور قلوب کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہوگا اس کا جواب ارشاد فرمایا کہ ﴿مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ سے نفوس کے اختیاری افعال مراد ہیں غیر اختیاری افعال مراد نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام کا کسی کو مکلف اور پابند نہیں بناتے مگر بقدر اس کی طاقت اور گنجائش کے اس لیے کہ جس چیز کا مادہ ہی مکلف میں نہ ہو اس کی تکلیف خدا تعالیٰ کی طرف سے متصور نہیں ورنہ پھر انسان معذور تھا کون نہیں جانتا کہ کان سے آنکھ کا کام نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ہر نفس کو ثواب اور عذاب، نفع اور ضرر اس کے مطابق ہوگا جو اس نے اپنی قدرت اور اختیار سے کیا اور کمایا ہے۔ لہٰذا جو باتیں تمہارے دلوں میں بے اختیار گزرتی ہیں ان پر مواخذہ اور محاسبہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جس چیز کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس پر نہ ثواب ہے اور نہ عذاب۔

البتہ وہ امور رذیلہ جو تم نے اپنے دلوں میں اپنے اختیار سے چھپائے رکھے ہیں جیسے تکبر اور حسد اور کینہ اور حرص اور طمع اور ریاء اور نفاق ان پر محاسبہ اور مواخذہ ہوگا۔ اور جو اخلاق پسندیدہ ہیں مثلاً اخلاص اور صبر اور توکل اور شکر اور قناعت وغیرہ

وغیرہ قیامت کے دن ان پر اجر ملے گا۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ ؓ کی تشفی ہوگئی اور پہلی آیت سن کر جو صدمہ ہوا تھا وہ دور ہوگیا اور خلجان مذکور کافور ہوگیا۔

تعلیم دعاء جامع متضمن بفلاح دارین

گزشتہ آیات میں حق جل شانہ نے یہ ارشاد فرمایا کہ مومن کی شان سمع وطاعت ہے اور اپنی تقصیرات پر طلب مغفرت ہے اور بعد ازاں یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ طاقت اور مقدور سے زیادہ کسی کو اپنے احکام کا مکلف اور پابند نہیں بناتے اور قیامت کے دن محاسبہ اور مواخذہ انہی افعال پر ہوگا جو اختیاری ہیں غیر اختیاری امور پر محاسبہ اور مواخذہ نہ ہوگا۔

اب آئندہ آیت میں ایک جامع دعا کی تعلیم فرماتے ہیں۔ جس میں خطا اور نسیان کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے اس لیے کہ خطا اور نسیان اگرچہ بظاہر غیر اختیاری ہیں اور داخل تکلیف نہیں لیکن من وجہ اختیاری بھی ہیں، اس لیے کہ بسا اوقات خطاء اور نسیان غفلت اور کوتاہی اور بے توجہی اور بے احتیاطی کی بناء پر پیش آتا ہے اور بے توجہی اور لاپرواہی انسان کا اختیاری فعل ہے۔ اس لیے عقلاً اور شرعاً خطاء اور نسیان پر بھی مواخذہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اگر خادم سے کسی غفلت اور بے توجہی کی بناء پر کوئی بھول چوک ہوجائے تو اس پر مواخذہ اور باز پرس ہوتی ہے کہ یہ غلطی کیوں ہوئی اور حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں حق جل شانہ کا یہ ارشاد ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ بھی اس کا مؤید ہے۔ اور اسی وجہ سے شریعت نے بہت سے مواضع خطاء میں دیت اور ضمان کو واجب قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ خطاء انسان کے تساہل اور عدم احتیاط کی بناء پر پیش آئی ہے جو انسان کا فعل اختیاری ہے اور داخل تکلیف ہے اور قابل مواخذہ ہے۔ اس لیے حق جل شانہ نے ہم کو یہ دعا سکھلائی کہ اپنی تقصیرات کو پیش نظر رکھ کر اس طرح دعا مانگا کرو۔ اے ہمارے پروردگار تیرا حق عبودیت اور حق ربوبیت ہم سے کہاں ادا ہوسکتا ہے۔ بھول چوک ساتھ لگی ہوئی ہے اس لیے تجھ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ اگر ہم تیرے کسی حکم یعنی امر و نہی کو بھول جائیں اور بھولے سے اس کی تعمیل نہ کرسکیں یا کسی غفلت اور کوتاہی کی بناء پر چوک جائیں کہ امر کو نہی اور نہی کو امر سمجھ جائیں یا ٹھیک عمل کرنے میں غلطی کر جائیں تو ہم پر مواخذہ اور دارو گیر نہ فرمانا۔

فائدہ: ...... اس آیت سے مفہوم ہوتا ہے کہ خطاء اور نسیان پر مواخذہ عقلاً و شرعاً ممتنع نہیں۔ نشہ آور چیزوں کے استعمال سے غیر اختیاری طور پر افعال کا صدور ہوتا ہے۔ مگر عقلاً و شرعاً شراب پینے والا مواخذہ سے بری نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ یہ افعال اگرچہ غیر اختیاری ہیں مگر ان غیر اختیاری افعال کا سبب تو فعل اختیاری ہے یعنی نشہ آور چیز کا استعمال۔ اس شخص نے اپنے اختیار کے بے محل استعمال سے حفاظت کیوں نہیں کی اس لیے قابل مواخذہ ہے۔ نسیان اگرچہ بالذات غیر اختیاری ہے مگر اس کا سبب عموماً اختیاری ہوتا ہے اسی وجہ سے بسا اوقات بھولنے والے پر لاابالیت اور بے پروائی کا الزام عائد کرتے ہیں اور خطا کار پر سہل انگاری اور بے احتیاطی اور بے توجہی کا الزام رکھتے ہیں۔

عارف رومی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں ؎

لاتؤاخذ ان نسینا شد گواہ   کہ بود نسیاں بوجھے ہم گناہ

زانکہ استکمال تعظیم او نکرد   ورنہ نسیاں درنیا در دے نبرد

گرچہ نسیاں لابدونا چار بود — در سبب ورزیدن او مختار بود
چوں تہاون کرد در تعظیمہا — تا کہ نسیاں زاد یا سہو وخطا
ہمچو مستے کو جنایتہا کند — گوید او معذور بودم من زخود
گویدش لیکن سبب اے زشت کار — از تو بد در رفتن آں اختیار
بےخودی نامد بخودتش خوانده — اختیار از خود نشدتش رانده

(مثنوی دفتر پنجم ص ۲۱۷)

اے پروردگار اور مت رکھ ہمارے سروں پر احکام شاقہ کا بارگراں جیسا کہ آپ نے رکھا تھا ہم سے پہلے لوگوں پر۔ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت سے پہلی امتوں کے متکبرین اور سرکشوں پر شدید اور سخت احکام اتارے تھے۔ ایسے سخت احکام کے متعلق درخواست ہے کہ اے اللہ ہم پر پہلی امتوں کی طرح سخت احکام نہ نازل فرما کہ بجالانا ہم کو دشوار ہو۔

اے پروردگار اور مت رکھ کر ہمارے سر پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ یعنی ہماری طاقت اور قوت سے بڑھ کر ہم کو مصیبتوں اور بلاؤں میں مبتلا نہ فرما۔

ف ۱:...... پہلی دعا یعنی ﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا﴾ تشریعیات کے متعلق تھی ہم کو تکالیف شاقہ کا مکلف نہ بنا۔ اور پہلی امتوں کی طرح ہم پر سخت احکام نازل نہ فرما اور یہ دوسری دعا یعنی ﴿وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ یہ دعا تکوینیات کے متعلق ہے یعنی تکوینی اور تقدیری طور پر ہم پر ایسی مصیبتیں اور بلائیں نازل نہ فرما جو کہ ہماری طاقت اور تحمل سے باہر ہوں۔

تشریعیات اور تکوینیات میں فرق یہ ہے کہ انسان تشریعیات کا مکلف ہے اور تکوینیات کا مکلف نہیں مگر دعا کی تعلیم دونوں کے لیے کی گئی۔ اور اے پروردگار چونکہ احکام شاقہ اور نا قابل برداشت مصائب کے نزول کا سبب بھی ہمارے ہی گناہ ہیں۔ اس لیے تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہماری پردہ پوشی فرما۔ دنیا اور آخرت کی ذلت سے ہم کو بچا اور عفو اور مغفرت کے بعد آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم پر مہربانی اور احسان بھی فرما آپ ہی ہمارے آقا اور ولی نعمت اور دوست ہیں۔ اور ہم آپ کے غلام اور نام لیوا اور محب اور عاشق ہیں۔ وقال تعالیٰ: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ في الحديث الشريف الله مولانا ولا مولىٰ لكم۔

پس آپ ہماری اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں خاص مدد کیجئے یعنی کافر قوم کے مقابلہ میں ہم کو فتح ونصرت عطا فرمائیے۔ کافروں کی قوم آپ کی اور آپ کے دین کی اور آپ کے پیغمبروں کی اور آپ کے دوستوں کی دشمن ہے اور مولیٰ اور آقا اپنے غلاموں کا اور محبوب اپنے عاشقوں کا حامی اور مددگار ہوتا ہے لہٰذا آپ سے یہ درخواست ہے کہ اپنے دوستوں کی دشمنوں کے مقابلہ میں مدد فرمائیے۔ تا کہ بے کھٹکے تیری عبادت کر سکیں اور بلا کسی دغدغہ کے تیرے قانون کو جاری کر سکیں۔

ف ۲:...... حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب دعائیں قبول فرمائیں۔

لولم ترد نيل مانرجو ونطلبه — من فيض جودك ماعلمنا الطلبا

اگر ہماری اس درخواست کے منظور کرنے کا ارادہ نہ ہوتا تو ہم کو درخواست کرنا ہی نہ سکھاتے اور نہ درخواست کرنے

کا حکم دیتے۔

این دعا از تو اجابت ہم زتو لطف تو برما نوشتہ صدنکو

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب سورۂ بقرہ ختم کرتے تو آمین کہتے۔

الحمدللہ آج ۱۰ جمادی الاول ۱۳۷۵ھ یوم دوشنبہ بوقت چاشت مقام لاہور میں سورۂ بقرہ کی تفسیر ختم ہوئی۔ اے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرما اور باقی تفسیر کی تتمیم اور تکمیل کی توفیق عطا فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ اٰمِيْن يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

الحمدللہ آج ۱۱ محرم الحرام یوم سہ شنبہ ۱۳۸۳ھ کو نظر ثانی سے فراغت ہوئی۔

فللہ الحمد والمنۃ۔

تفسیر سورۃ آل عمران

یہ سورت مدنیہ ہے جس میں دو سو آیتیں اور بیس رکوع ہیں۔ چونکہ اس سورت میں آل عمران کا ذکر ہے اس لیے اس سورت کا نام سورۂ آل عمران ہے اور اس سورت کا نام مجادلہ بھی ہے اس لیے کہ یہ سورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے مجادلہ اور مباحثہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ عنقریب شانِ نزول سے واضح ہوگا۔

ربط:...... اس سورت کو سورۂ بقرہ کے ساتھ متعدد وجوہ سے ربط ہے۔

وجہ اول

سورۂ بقرہ کی ابتداء کتاب الٰہی کے ذکر سے ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا کہ کس نے کتاب الٰہی سے ہدایت حاصل کی اور کس نے اس سے اعراض کیا۔ اسی طرح اس سورت کا آغاز بھی کتاب الٰہی کے ذکر سے ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بیان کیا گیا کہ سلیم الطبع لوگوں نے اس کی ہدایت کو قبول کیا اور زائغین اور کج طبیعتوں نے بجائے محکمات کے متشابہات کی پیروی کی اور اپنے مطلب اور خواہش اور غرض کے مطابق آیات الٰہیہ کی تاویلیں کیں اور لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کیا ایسے لوگ اصطلاح شریعت میں ملحد اور زندیق کہلاتے ہیں اور ملحد اور زندیق شریعت میں منافق کے حکم میں ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں منافقین کا ذکر تھا اور اس سورت میں ملحدین اور زندیقین کا ذکر ہے جس کو اللہ جل شانہ نے زائغین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

زیغ کے معنی میلان اور انحراف کے ہیں اور ملحد وہ شخص ہے جو دین میں ٹیڑھی راہ چلتا ہو۔ صراط مستقیم یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی راہ سے ہٹا ہو اور صحابہ اور تابعین کے خلاف آیات کے نئے نئے معنی بیان کرتا ہو جو شخص آیات قرآنیہ کے ایسے معانی بیان کرے جو ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ﴾ یعنی صحابہ کرام و تابعین کے سمجھے ہوئے کے خلاف ہوں اور اس زمانہ کے ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ اور ﴿ضَآلِّيْنَ﴾ یعنی یہود اور نصاریٰ کے تہذیب اور تمدن کے مطابق ہوں تو یقین کرلو

کہ یہ شخص بلاشبہ صراط مستقیم سے ہٹا ہوا ہے اور حسب ارشاد باری ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ﴾ میں داخل ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایسے لوگوں سے بچتے رہنا چاہیے یعنی ان کی کتابوں کے دیکھنے سے پرہیز کرو۔

وجہ دوم

ربط کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں زیادہ تر محاجہ اور مباحثہ یہود سے تھا اور سورۂ آل عمران میں محاجہ اور مباحثہ زیادہ تر نصاریٰ سے ہے اور یہود چونکہ نصاریٰ سے مقدم ہیں اس لیے سورۂ بقرہ کو سورۂ آل عمران سے پہلے لایا گیا۔

وجہ سوم

سورۂ بقرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر تھا اس سورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر ہے۔ وقال تعالیٰ: ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ﴾۔

وجہ چہارم

ہر سورۃ کا خاتمہ ایک خاص دعا پر ہوا سورۂ بقرہ کا خاتمہ کفار کے مقابلہ میں فتح ونصرت کی دعا پر ہوا جو دین کی ابتدائی حالت کے مناسب ہے اور سورۂ آل عمران کا خاتمہ۔ دعاء حسن ثواب اور جزاء اعمال اور ایفاء مواعید کی درخواست پر ہوا جو مومنین متقین کے مناسب ہے جن کا ذکر سورۂ بقرہ کے شروع میں تھا۔

وجہ پنجم

سورۂ بقرہ کی ابتداء متقین اور مفلحین کے ذکر سے ہوئی اور اس سورت کا خاتمہ متقین اور مفلحین کے ذکر پر ہوا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾۔ اسی طرح اس سورت کی نہایت پہلی سورت کی بدایت میں مندرج ہوگئی اور سورۂ آل عمران کا اختتام سورۂ بقرہ کے افتتاح میں مندمج ہوگیا قرآن کریم جس طرح علوم ومعارف اور فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے حد اعجاز کو پہنچا ہوا ہے اسی طرح باعتبار ربط کے بھی حد اعجاز کو پہنچا ہوا ہے۔

نکتہ

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا نام احادیث میں زَهْرَاوَيْن آیا ہے جس کے معنی دو روشن سورتوں کے ہیں۔ سورتیں تو ساری ہی روشن ہیں مگر گمان یہ ہے کہ شاید سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے انوار اور تجلیات باہم ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں اور اس لیے ان دونوں سورتوں کا نام زہراوین رکھا گیا ہو اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سورۂ بقرہ اور آل عمران کے قراءت اور تلاوت پر ہی قاری کو ایک نور تام عطا کیا جائے گا۔ نیز سنن ابی داؤد وغیرہ میں اسماء بنت یزید سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے سورۂ بقرہ کی یہ آیت ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ اور سورۂ آل عمران کی یہ آیت ﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ

اِلَّا ھُوَ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ﴾ اور یہ حدیث سنن ابن ماجہ میں بھی ہے۔ نیز اس سورت کا آغاز آیت الکرسی سے ملتا جلتا ہے جو قرآن کا دل ہے پس عجب نہیں کہ اس اشتراک کی وجہ سے بھی ان دونوں سورتوں کو زہراوین کہا گیا ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

۳ سُورۃ آل عمران مدنیۃ ۸۹ | بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ | ایاتھا ۲۰۰ رکوعاتھا ۲۰

الٓمّٓ ① اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ② نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا

الم اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں زندہ ہے سب کا تھامنے والا ف۱ اتاری تجھ پر کتاب سچی ف۲ تصدیق کرتی ہے

اللہ ! اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، جیتا ہے۔ سب کا تھامنے والا۔ اتاری تجھ پر کتاب تحقیق، ثابت کرتی

لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَاَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ ③ مِنۡ قَبۡلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنۡزَلَ

اگلی کتابوں کی اور اتارا توارت اور انجیل کو اس کتاب سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے ف۳ اور اتارے

اگلی کتاب کو اور اتاری تھی توریت اور انجیل۔ اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کو، اور اتارا

ف۱ نجران کے ساٹھ عیسائیوں کا ایک موقر ومعزز وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس میں تین شخص عبدالمسیح عاقب بحیثیت امارت وسیادت کے، ایہم السید بلحاظ رائے وتدبیر کے، اور ابو حارثہ بن علقمہ باعتبار سب سے بڑے مذہبی عالم اور لاٹ پادری ہونے کے عام شہرت اور امتیاز رکھتے تھے۔ یہ تیسرا شخص اصل میں عرب کے مشہور قبیلہ" بنی بکر بن وائل" سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر پکا نصرانی بن گیا۔ سلاطین روم نے اسکی مذہبی صلابت اور مجد وشرف کو دیکھتے ہوئے بڑی تعظیم وتکریم کی۔ علاوہ بیش قرار مالی امداد کے اسکے لئے گرجے تعمیر کئے اور امور مذہبی کے اعلیٰ منصب پر مامور کیا۔ یہ وفد بارگاہ رسالت میں بڑی آن بان سے حاضر ہوا اور متنازع فیہ مسائل میں حضور سے گفتگو کی جس کی پوری تفصیل محمد بن اسحاق کی سیرۃ میں منقول ہے۔ سورۃ" آل عمران" کا ابتدائی حصہ تقریباً اسّی نوے آیات تک اسی واقعہ میں نازل ہوا عیسائیوں کا پہلا اور بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام بعینہٖ خدا یا خدا کے بیٹے یا تین خداؤں میں سے ایک ہیں۔ سورۃ ہٰذا کی پہلی آیت میں توحید خالص کا دعویٰ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کی جو صفات" حیی قیوم" بیان کی گئیں وہ عیسائیوں کے اس دعوے کو صاف طور پر باطل ٹھہراتی ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران مناظرہ میں ان سے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ حییّ (زندہ) ہے۔ جس پر کبھی موت طاری نہیں ہوسکتی۔ اسی نے تمام مخلوقات کو وجود عطا کیا اور سامان بقا پیدا کر کے انکو اپنی قدرت کاملہ سے تھام رکھا ہے۔ برخلاف اسکے عیسیٰ علیہ السلام پر یقیناً موت وفنا آ کر رہے گی۔ اور ظاہر ہے جو شخص خود اپنی ہستی کو برقرار نہ رکھ سکے دوسری مخلوقات کی ہستی کیا برقرار رکھ سکتا ہے۔" نصاریٰ" نے سن کر اقرار کیا (کہ بیشک صحیح ہے) شاید انہوں نے غنیمت سمجھا ہوگا کہ آپ اپنے اعتقاد کے موافق" عیسیٰ یاتی علیہ الفناء" کا سوال کر رہے ہیں یعنی عیسیٰ پر فنا ضرور آئیگی، اگر جواب نفی میں دیا تو آپ ہمارے عقیدہ کے موافق کہ حضرت عیسیٰ کو عرصہ ہوا موت آچکی ہے۔ ہم کو اور زیادہ صریح طور پر ملزم اور مفحم کرسکیں گے۔ اس لئے لفظی مناقشہ میں پڑنا مصلحت نہ سمجھا۔ اور ممکن ہے یہ لوگ ان فرقوں میں سے ہوں جو عقیدہ اسلام کے موافق مسیح علیہ السلام کے قتل وصلب کا قطعاً انکار کرتے تھے اور رفع جسمانی کے قائل تھے جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے" الجواب الصحیح" میں اور" الفارق بین المخلوق والخالق" کے مصنف نے تصریح کی ہے کہ شام ومصر کے نصاریٰ عموماً اسی عقیدہ پر تھے مدت کے بعد پولس نے عقیدہ صلب کی اشاعت کی۔ پھر یہ خیال یورپ سے مصر وشام وغیرہ پہنچا بہرحال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان عیسیٰ اتی علیہ الفناء کے بجائے یاتی علیہ الفناء فرمانا، درآں حالیکہ پہلے الفاظ تردید الوہیت مسیح کے موقع پر زیادہ صاف اور مسکت ہوتے۔ ظاہر کرتا ہے کہ موقع الزام میں بھی مسیح علیہ السلام پر موت سے پہلے لفظ کا اطلاق آپ نے پسند نہیں کیا۔

ف۲ یعنی قرآن کریم جو عین حکمت کے موافق نہایت بروقت سچائی اور انصاف کو اپنی آغوش میں لے کر اترا۔

ف۳ یعنی قرآن اگلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اگلی کتابیں (توارت وانجیل وغیرہ) پہلے سے قرآن اور اسکے لانے والے کی طرف لوگوں کی راہنمائی کر رہی تھیں اور اپنے اپنے وقت میں مناسب احکام وہدایات دیتی تھیں۔ گویا بتلا دیا کہ" الوہیت" یا" ابنیت مسیح" کا عقیدہ کسی آسمانی کتاب میں موجود نہ تھا۔ کیونکہ اصول دین کے اعتبار سے تمام کتب سماویہ متفق ومتحد ہیں۔ مشرکانہ عقائد کی تعلیم کبھی نہیں دی گئی۔

الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ

فیصلے ف۱ بیشک جو منکر ہوئے اللہ کی آیتوں سے ان کے واسطے سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست ہے

انصاف۔ جو لوگ منکر ہیں اللہ کی آیتوں سے ان کو سخت عذاب ہے۔ اور اللہ زبردست ہے

ذُوانْتِقَامٍ ④ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ؕ ⑤ هُوَ الَّذِیْ

بدلہ لینے والا ف۲ اللہ پر چھپی نہیں کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں ف۳ وہی تمہارا

بدلہ لینے والا۔ اللہ اس پر چھپی نہیں کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں۔ وہی تمہارا

یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ⑥

نقشہ بناتا ہے ماں کے پیٹ میں جس طرح چاہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا زبردست ہے حکمت والا ف۴

نقشہ بناتا ہے ماں کے پیٹ میں، جس طرح چاہے۔ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، زبردست ہے حکمت والا۔

اثبات توحید و بیان محکم در ابطال الوہیت عیسیٰ بن مریم

و مناظرہ نبی اکرم ﷺ با نصارائے نجران

قَالَ تَعَالٰی: ﴿الٓمّٓ ① اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ؕ ②... الی... هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾

محمد بن اسحاق وغیرہ سے منقول ہے کہ سورۂ آل عمران کے شروع کی تراسی آیتیں نصارائے نجران کے بارے میں نازل ہوئیں۔ نجران، علاقۂ یمن میں ایک شہر کا نام ہے جو اس زمانہ میں عیسائیوں کا علمی مرکز تھا۔ آنحضرت ﷺ کی نبوت و

ف۱ یعنی ہر زمانہ کے مناسب ایسی چیزیں اتاریں جو حق و باطل، حلال و حرام اور جھوٹ سچ کے درمیان فیصلہ کرنے والی ہوں۔ اس میں قرآن کریم، کتب سماویہ، معجزات انبیاء سب داخل ہو گئے اور ادھر بھی اشارہ ہو گیا کہ جن مسائل میں یہود و نصاریٰ جھگڑتے چلے آ رہے ہیں ان اختلافات کا فیصلہ بھی قرآن کے ذریعہ سے کر دیا گیا۔

ف۲ یعنی ایسے مجرموں کو نہ سزا دیئے بغیر چھوڑے گا نہ وہ اسکے زبردست اقتدار سے چھوٹ کر بھاگ سکیں گے۔ اسمیں بھی الوہیت مسیح کے ابطال کی طرف لطیف اشارہ ہو گیا۔ کیونکہ جو اختیار و اقتدار کلی خدا کے لئے ثابت کیا گیا، ظاہر ہے وہ مسیح میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ نصاریٰ کے نزدیک حضرت مسیح کسی کو سزا تو کیا دے سکتے خود اپنے کو باوجود سخت تضرع و الحاح کے ظالموں کے پنجہ سے نہ چھڑا سکے۔ پھر خدا یا خدا کا بیٹا کیسے بن سکتے ہیں؟ بیٹا وہی کہلاتا ہے جو باپ کی نوع سے ہو۔ لہٰذا خدا کا بیٹا خدا ہی ہونا چاہیئے۔ ایک عاجز مخلوق کو حقیقۃً قادر مطلق کا بیٹا کہنا، باپ اور بیٹے دونوں پر سخت عیب لگاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

ف۳ یعنی جس طرح اسکا اقتدار و اختیار کامل ہے، علم بھی محیط ہے، عالم کی کوئی چھوٹی بڑی چیز ایک سیکنڈ کے لئے اس سے غائب نہیں سب مجرم و بری، اور تمام جرموں کی نوعیت و مقدار اس کے علم میں ہے۔ مجرم بھاگ کر روپوش ہونا چاہے تو کہاں ہو سکتا ہے؟ یہیں سے تنبیہ کر دی گئی کہ مسیح علیہ السلام خدا نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ایسا علم محیط ان کو حاصل نہ تھا۔ وہ اسی قدر جانتے تھے جتنا حق تعالیٰ ان کو بتلا دیتا تھا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں خود نصاریٰ نجران نے اقرار کیا اور آج بھی اناجیل مروجہ سے ثابت ہے۔

ف۴ یعنی اپنے علم و حکمت کے مطابق کمال قدرت سے جیسا اور جس طرح چاہا ماں کے پیٹ میں تمہارا نقشہ بنایا مذکر، مونث، خوبصورت، بدصورت، جیسا پیدا کرنا تھا کر دیا۔ ایک پانی کے قطرہ کو کتنی پلٹیاں دے کر آدمی کی صورت عطا فرمائی۔ جس کی قدرت و صنعت کا یہ حال ہے کیا اس کے علم میں کمی ہو سکتی ہے۔ یا کوئی انسان جو خود بھی بطن مادر کی تاریکیوں میں رہ کر آیا ہو اور عام بچوں کی طرح کھاتا پیتا، پیشاب پاخانہ کرتا ہو، اس خداوند قدوس کا بیٹا یا پوتا کہلایا جا سکتا ہے؟ ۔

رسالت کی خبر جب اطراف اور اکناف میں پہنچی تو یہ خبر سن کر نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد، مناظرہ اور مباحثہ کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوا اس وفد میں ساٹھ سوار تھے جن میں سے چودہ آدمی خاص طور پر بڑے شریف اور معزز تھے اور ان چودہ آدمیوں میں تین شخص ایسے تھے جو ان کا مرجع الامر تھے یعنی سب کا ماویٰ اور ملجا تھے تمام کام انہیں تین کے مشورہ سے ہوتے تھے۔

ایک ان کا امیر اور سردار تھا جس کا نام عبدالمسیح تھا جو بڑا زیرک اور ہوشیار اور ذی الرائے تھا۔ اور دوسرا اس کا وزیر ومشیر جس کا نام ایہم تھا اور تیسرا ان میں کا سب سے بڑا عالم اور پادری تھا، جس کو وہ حبر اور سقف کہتے تھے اس کا نام ابوحارثہ بن علقمہ تھا۔ شاہان روم اس پادری کی اس کے علم وفضل کی وجہ سے بڑی توقیر وتعظیم کرتے تھے۔ اور عیسائی بادشاہوں اور امیروں کی طرف سے اسکو بڑی جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور ابنیت کے قائل تھے ان کو خدا اور خدا کا بیٹا کہتے تھے اور جب مدینہ منورہ میں حضور پرنور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں گفتگو شروع ہوئی گفتگو کرنے والے یہی تین آدمی تھے۔ عبدالمسیح، ایہم، ابوحارثہ۔ ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے استدلال میں یہ کہا کہ

۱۔ عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

۲۔ عیسیٰ علیہ السلام بیماروں کو اچھا کرتے تھے۔

۳۔ عیسیٰ علیہ السلام غیب کی باتیں بتاتے تھے۔

۴۔ عیسیٰ علیہ السلام مٹی کی مورتیں بناتے اور پھر ان میں پھونک مارتے اور زندہ ہو کر وہ پرند بن جاتے۔

اور ان تمام چیزوں کا قرآن کریم نے اقرار کیا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ خدا تھے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے پر اس طرح استدلال کیا کہ

۱۔ وہ بلا باپ کے پیدا ہوئے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے بیٹے تھے۔

۲۔ نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارہ میں کلام کیا ان سے پیشتر کسی نے گہوارہ میں کلام نہیں کیا۔ یہ بھی خدا کے بیٹا ہونے کی دلیل ہے۔

اور مسئلہ تثلیث یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ثالث ثلاثہ ہونے پر یہ استدلال کیا کہ حق تعالیٰ جابجا یہ فرماتے ہیں کہ "فَعَلْنَا وَاَمَرْنَا وَخَلَقْنَا وَقَضَيْنَا" ہم نے یہ کام کیا۔ ہم نے یہ حکم دیا ہم نے یہ پیدا کیا ہم نے یہ مقدر کیا یہ تمام صیغے جمع کے ہیں اور جمع کا اول درجہ تین ہے پس اگر خدا تعالیٰ ایک ہوتا تو صیغہ جمع کا استعمال نہ ہوتا بلکہ بجائے صیغہ جمع کے مفرد کا صیغہ

۔ ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا﴾۔ عیسائیوں کا سوال تھا کہ جب مسیح کا ظاہری باپ کوئی نہیں تو بجز خدا کے کس کو باپ کہیں۔ ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ﴾ میں اس کا جواب بھی ہو گیا۔ یعنی خدا کو قدرت ہے رحم میں جس طرح چاہے آدمی کا نقشہ تیار کر دے۔ خواہ ماں باپ کے ملنے سے یا صرف ماں کی قوت منفعلہ سے۔ اسی لئے آگے فرمایا "هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" یعنی زبردست ہے جس کی قدرت کو کوئی محدود نہیں کر سکتا۔ اور حکیم ہے جہاں جیسا مناسب جانتا ہے کرتا ہے۔ "حواء" کو بدون ماں کے "مسیح" کو بدون باپ کے، "آدم" کو بدون ماں باپ دونوں کے پیدا کر دیا۔ اسکی حکمتوں کا احاطہ کون کر سکے۔

استعمال ہوتا اور یوں کہا جاتا "فَعَلْتُ وَاَمَرْتُ وَخَلَقْتُ وَقَضَيْتُ" "میں نے کیا، میں نے حکم دیا، میں نے پیدا کیا، میں نے مقدر کیا۔" یہ اس مایہ ناز وفد کے استدلالات تھے جس کو اپنے علم پر فخر اور ناز تھا جن کی حقیقت اہل عقل اور اہل فہم کی نظر میں اوہام اور خیالات سے زیادہ نہیں اب آپ آنحضرت ﷺ کے جوابات اور ارشادات کو سنیے:

۱- "فقال لهم النبی صلی اللہ علیه وسلم الستم تعلمون انه لا یکون ولد الا وهو یشبه اباه قالوا بلی"۔ "آنحضرت ﷺ نے وفد سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے وفد نے کہا کہ کیوں نہیں۔ اور یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ خدا تعالیٰ بے مثل اور بے چون و چگون ہے کوئی شے اس کے مشابہ نہیں۔

۲- "قال الستم تعلمون ان ربنا حی لا یموت وان عیسیٰ یاتی علیه الفناء قالوا بلیٰ"، "بعد ازاں آپ ﷺ نے وفد سے کہا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ زندہ ہے کبھی بھی اس کو موت نہیں آ سکتی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کو ضرورت موت اور فنا آنے والی ہے یعنی قیامت سے پہلے۔

وفد نے اقرار کیا کہ بیشک یہ صحیح ہے ایک نہ ایک وقت ان پر موت اور فنا ضرور آئے گی اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ پر موت اور فنا کا طاری ہونا ناممکن اور محال ہے۔

تنبیہ

نصاریٰ کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب و مقتول ہو کر مر چکے ہیں لیکن حضور پر نور ﷺ نے ان کے الزامات کے لیے یہ نہیں کہا کہ تمہارے عقیدہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو موت آ چکی ہے اس لیے کہ یہ امر خلاف واقعہ ہے عیسیٰ علیہ السلام نہ مقتول ہوئے اور نہ مصلوب ہوئے بلکہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے۔ اور قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے اور چند روز کے بعد وفات پائیں گے۔ جیسا کہ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے واضح ہے اس لیے نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے وہ کلمہ نکلا جو واقع کے موافق تھا۔ خلاف واقع چیز کا نبی برحق کی زبان سے نکلنا مناسب نہیں اگرچہ اس چیز کا ذکر محض بطور الزام ہو اور عجب نہیں کہ نصاریٰ نے اس کا اقرار اس لیے کیا ہو کہ وہ اتنی بات کو غنیمت سمجھے اور یہ خیال کیا ہو کہ ہمارے عقیدہ کے مطابق ہم پر الزام اور حجت اور بھی پوری ہو جائے گی۔ نیز نصاریٰ میں مختلف فرقے ہیں ایک فرقہ کا عقیدہ یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے۔ اور قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہونے کے بعد وفات پائیں گے۔ پس ممکن ہے کہ اس وفد کے لوگ اسی عقیدہ کے ہوں جو اسلام کے مطابق ہے۔

۳- "قال الستم تعلمون ان ربنا قیم علی کل شیٔ یکلؤه ویحفظه ویرزقه قالوا بلیٰ قال فهل یملك عیسیٰ من ذلك شیئا قالوا لا"، "پھر آپ نے فرمایا۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہی ہر چیز کے وجود کو تھامنے والے اور اس کے محافظ اور نگہبان اور رزق رساں ہیں انہوں نے کہا بیشک۔ آپ نے فرمایا کہ بتلاؤ کیا عیسیٰ علیہ السلام بھی ان میں سے کسی چیز کے مالک اور قادر ہیں یعنی کیا عیسیٰ علیہ السلام نے بھی مخلوقات کو وجود عطا کیا

ہے اور اپنی قدرت سے ان کے لیے سامان بقاء پیدا کیا ہے انہوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام تو ان چیزوں پر قادر نہیں۔"

۴- "قال افلستم تعلمون ان الله لا يخفى عليه شيء في الارض ولا في السماء قالوا بلى قال فهل يعلم عيسى من ذلك شيئاً الا ما علم قالوا لا" "پھر آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر زمین اور آسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں انہوں نے کہا بیشک آپ نے فرمایا کہ کیا عیسیٰ علیہ السلام کو ان میں سے بجز اس چیز کے جس کا خدا تعالیٰ نے ان کو علم دیا تھا کوئی اور شے بھی جانتے تھے انہوں نے کہا نہیں۔"

۵- "قال فان ربنا صوّر عيسى في الرحم كيف شاء"، "پھر آپ نے فرمایا کہ پروردگار عالم نے عیسیٰ علیہ السلام کی مریم کے رحم میں اپنی مرضی کے موافق صورت بنائی۔"

۶- "الستم تعلمون ان ربنا لا يأكل الطعام ولا يشرب الشراب ولا يحدث الحدث قالوا بلى"، "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے اور نہ پاخانہ اور پیشاب کرتا ہے انہوں نے کہا بے شک۔"

۷- "قال الستم تعلمون ان عيسى حملته امه كما تحمل المرأة ثم وضعته كما تضع المرأة ولدها ثم غذي كما تغذي المرأة الصبي ثم كان يأكل الطعام ويشرب الشراب ويحدث الحدث قالوا بلى"، "پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اسی طرح حاملہ ہوئیں جس طرح ایک عورت اپنے بچہ کو پیٹ میں رکھتی ہے اور پھر اس کو جنتی ہے اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور بچوں کی طرح ان کو غذا دی گئی اور پھر بڑے ہوئے اور وہ کھاتے تھے اور پیتے تھے اور پیشاب اور پاخانہ کرتے تھے انہوں نے کہا بیشک ایسے ہی تھے۔"

۸- "قال فكيف يكون هذا كما زعمتم فعرفوا ثم ابوا الا جحودا فانزل الله ﴿الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾" اخرجه ابن جرير وابن ابي حاتم عن الربيع (تفسير در منثور: ۲/۳) "آپ نے فرمایا کہ جب تم کو ان سب باتوں کا اقرار ہے تو بتاؤ کہ ایسا ہو کر عیسیٰ علیہ السلام خدا کیسے ہوئے جیسا تمہارا گمان ہے پس آپ کے اس ارشاد سے ان لوگوں نے حق کو خوب پہچان لیا۔ مگر جان بوجھ کر انکار کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں ﴿الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾"۔

﴿الٓمّٓ﴾ اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں۔ اللہ وہ ذات ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ الوہیت اور خدائی اسی کے لیے مخصوص ہے اس لیے کہ (۱) وہ بذاتہ زندہ ہے اور اس کی حیات ازلی اور ابدی ہے موت اور فناء کا اس کی ذات اور صفات میں کہیں امکان نہیں۔ (۲) اور وہی تمام کائنات کے وجود اور حیات کو تھامنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔

پناہ بلندی و پستی توئی همه نیستند آنچه هستی توئی
قرار همه هست برنیستی توئی آنکه یک برقرار استی

اور عیسیٰ علیہ السلام کی حیات نہ ذاتی ہے اور نہ ازلی اور ابدی۔ اللہ تعالیٰ کے زندہ کرنے سے وہ زندہ ہوئے ان کی حیات اور ان کی زندگی بلاشبہ حادث اور فانی ہے اور جس کا وجود اور جس کی حیات حادث اور فانی ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا اور علی ہذا

عیسیٰ علیہ السلام نے نہ تو مخلوقات کو کوئی وجود اور حیات عطا کی اور نہ ان کے لیے کوئی سامان حیات پیدا کیا اور نہ وہ کائنات کے وجود کے تھامنے اور قائم رکھنے پر قادر ہیں لہٰذا خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔ (۳) نیز حق تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں۔ جس نے بندوں کی ہدایت کے لیے آپ پر ایک کتاب اتاری جو حق اور سچائی کو اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ جو اس کی صفت کلام کا آئینہ ہے اور اس کے احکام اور قوانین کا ایک مجموعہ ہے۔ جس کی شان یہ ہے کہ وہ گزشتہ آسمانی کتابوں کی تصدیق وتوثیق کرنے والی ہے اور اسی طرح حق تعالیٰ نے اس قرآن سے پہلے توریت اور انجیل کو لوگوں کی ہدایت کے لیے اتارا اور اللہ کی طرف سے پیغمبروں پر کتابوں کا اترنا یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اللہ رب العالمین، احکم الحاکمین ہے اور انبیاء ومرسلین خدا نہیں بلکہ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں جو احکامِ خداوندی کے پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اگر خدا ہوتے تو ان پر اللہ کی وحی اور اس کی کتاب نازل نہ ہوتی۔ وحی کا نزول بندہ پر ہوتا ہے خدا پر وحی نازل نہیں ہوتی۔

نیز کتب الٰہیہ اور صحف سماویہ سب کی سب توحید پر متفق ہیں کما قال تعالی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾۔ لہٰذا تثلیث اور ابنیت کا عقیدہ تمام کتب الٰہیہ کے خلاف ہے۔ (۴) اور اتارے اللہ تعالیٰ نے معجزات تا کہ حق اور باطل کا خوب فرق ظاہر ہو اور دشمنانِ حق اس کے مقابلہ سے عاجز ہو کر حق تعالیٰ کی قدرت اور انبیاء کرام کی نبوت ورسالت کا یقین کریں معجزات اور خوارق عادات ایک طرف خداوند یکتا کی وحدانیت اور قدرت کی دلیل ہیں اور ایک طرف انبیاء کرام کی نبوت ورسالت کی برھان ہیں۔

لہٰذا تحقیق جن لوگوں نے خدا تعالیٰ کی نشانیوں کا انکار کیا اور خوارق عادات کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور انبیاء کرام کی نبوت کے قائل نہ ہوئے یعنی ان کو خدا کا برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ اور فرستادہ خداوندی نہ مانا ان کے لیے نہایت سخت عذاب ہے۔ (۵) اور اللہ تعالیٰ عزت والا اور زبردست اور صاحب انتقام ہے۔ جو شخص اس کے مقابلہ کے لیے سر اٹھاتا ہے اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس عزیز مقتدر کے پنجہ قدرت سے نکل نہیں سکتا اور نہ اس عزیز منتقم کے انتقام سے بچ کر بھاگ سکتا ہے۔ اس جملہ میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابطال الوہیت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ نصاریٰ کے نزدیک حضرت مسیح صلیب پر لٹکائے گئے اور ایلی ایلی کہتے جان دے دی اور اپنے آپ کو دشمنوں کے پنجہ ظلم سے نہ چھڑا سکے اور نہ ان سے کوئی انتقام لے سکے پس ایک عاجز اور مظلوم اور مغلوب کو جس پر اس کے دشمن غالب آ گئے ہوں خدا کہنا یا خداوند قادر مطلق کا بیٹا کہنا کیا کھلی ہوئی نادانی نہیں عقلاء عالم کے نزدیک خدائی اور ذلت کا جمع ہونا ناممکن اور محال ہے۔ خدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عزیز مقتدر ہو البتہ نصاریٰ کے نزدیک خدا کا دشمنوں کے ہاتھ سے ذلیل ہونا ممکن ہے۔ (۶) تحقیق اللہ تعالیٰ پر زمین اور آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ گزشتہ آیت میں حق تعالیٰ کی اقتدار کامل اور اختیار کامل کو بیان فرمایا اب اس آیت میں اس کے علم کامل کو بیان فرماتے ہیں یعنی جس طرح اس کی قدرت ازلیہ تمام ممکنات کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم بھی محیط ہے کوئی چھوٹی اور بڑی چیز اس کے علم سے غائب اور پوشیدہ نہیں اور ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ایسا علم محیط حاصل نہ تھا صرف اسی قدر جانتے تھے جتنا حق تعالیٰ نے ان کو بتلا دیا تھا اور نصاریٰ نجران نے خود اس کا اقرار کیا اور موجودہ اناجیل سے بھی یہی ثابت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام عالم الغیب نہ تھے بہت سی چیزیں ان پر مخفی رہتی تھیں۔ اللہ کی وحی اور روح القدس کے

رہنمائی سے معلوم ہوتی تھیں۔ (۷) وہی خدا رحموں میں تمہاری صورتیں اور نقشے جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے۔ کسی کو مرد اور کسی کو عورت کسی کو خوبصورت اور کسی کو بدصورت پس کیا جس کی صورت اور نقشہ رحم مادر میں بنا ہو اور بطن مادر کی تاریکیوں سے نکل کر وہ اس دار فانی میں آیا ہو اور عام بچوں کی طرح کھاتا اور پیتا اور پاخانہ اور پیشاب کرتا ہو معاذ اللہ وہ کس طرح خدائے قدوس اور خدا کا بیٹا ہوسکتا ہے خدا وہ ہے کہ جو اپنے ارادہ اور مشیت سے رحم مادر میں صورتیں اور نقشے بنائے اور جو نقشہ اور صورت رحم مادر میں بنا ہے وہ خدا نہیں ہوسکتا کیونکہ جو صورت بنتی ہے وہ مخلوق ہے اور خالق کی محتاج ہے اور خدا محتاج نہیں ہوتا اس لیے کہ ان صفات میں کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں لہٰذا وہی سزاوار ربوبیت اور شایان عبودیت ہے۔

خلاصہ کلام

یہ کہ خداوند قدوس ایک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی سب پر غالب ہے اور بڑی حکمت والا ہے جس کی قدرت اور حکمت کی کوئی انتہاء نہیں اس نے کسی حکمت اور مصلحت سے حضرت مسیح کو بدون باپ کے اور حضرت حواء کو بدون ماں کے اور حضرت آدم کو بدون باپ اور ماں کے پیدا کیا۔ جس مخلوق کو جس طرح چاہا پیدا فرمایا۔ اس کی حکمتوں کا کون احاطہ کرسکتا ہے۔

کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

فوائد ولطائف

۱- امام رازی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کا آغاز نہایت عجیب وغریب ہے جو اثبات توحید اور اثبات رسالت دونوں پر مشتمل ہے۔

اثبات توحید تو اس اعتبار سے ہیں کہ صفات خداوندی کے بیان پر مشتمل ہے خدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ حی اور قیوم اور عالم الغیب اور عزیز منتقم ہو۔ اور رحم مادر میں اولاد کی تصویر بنانے پر قادر ہو اور عیسیٰ علیہ السلام میں یہ صفات موجود نہ تھیں لہٰذا ثابت ہوگیا کہ وہ خدا نہ تھے۔ (جیسا کہ تفصیل پہلے گذر چکی ہے)

اور اثبات رسالت کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا نبی اور رسول ہونا اور توریت اور انجیل کا ان پر نازل ہونا تم کو بھی تسلیم ہے اب بتلاؤ کہ توریت اور انجیل کے کتاب الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے جو دلیل ان کے لیے ہے۔ قرآن کے لیے اس سے ہزار درجہ بڑھ کر دلائل موجود ہیں اور جس دلیل سے تم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو نبی مانتے ہو اسی طرح کی دلیل سے محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور رسالت بھی ثابت ہوسکتی ہے۔

یہ ناچیز کہتا ہے کہ اثبات توحید اور اثبات رسالت کے علاوہ اثبات قیامت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ اثبات قیامت کی دلیل ہے کہ جو خدا اپنی قدرت کاملہ سے پہلی مرتبہ زندہ کرنے پر قادر ہے وہ دوسری مرتبہ بھی زندہ کرنے پر قادر ہے اس طرح اس سورت کے مطلع میں اسلام کے اصول ثلاثہ توحید اور رسالت اور قیامت کے اثبات کے دلائل کی طرف اجمالی اشارہ ہوگیا۔

۲- ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسانوں کی صورتوں اور

شکلوں کا مختلف ہونا مادہ اور طبیعت کا اقتضاء نہیں اور نہ محض اتفاق سے ہے بلکہ یہ اختلاف حق تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے بلکہ یہ تمام قادر علیم اور عزیز حکیم کی کاری گری ہے۔

۳- ﴿وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ میں ''فرقان'' کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرقان سے معجزات مراد لیے ہیں اور بعضوں نے زبور مراد لی ہے اور بعض نے قرآن کریم مراد لیا ہے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ اس آیت میں فرقان سے معجزات مراد لیے جائیں جیسا کہ ہم نے تفسیر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ

وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب اس میں بعض آیتیں ہیں محکم یعنی ان کے معنی واضح ہیں وہ اصل ہیں کتاب کی اور دوسری ہیں

وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب، اس میں بعض آیتیں پکی ہیں، سو جڑ ہیں کتاب کی، اور دوسری ہیں

مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ

مشابہ یعنی جن کے معنی معلوم یا معین نہیں سو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی

کئی طرف ملتی، سو جن کے دل پھرے ہوئے ہیں، وہ لگتے ہیں ان کی ڈھب والیوں سے، تلاش

الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘؔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ

گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوا اللہ کے اور مضبوط علم والے

کرتے ہیں گمراہی، اور تلاش کرتے ہیں ان کی کل بیٹھانی، اور ان کی کل کوئی نہیں جانتا سوا اللہ کے، اور جو مضبوط علم والے ہیں،

يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ⑦ رَبَّنَا

کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے سب ہمارے رب کی طرف سے اتری ہیں اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے ف۱ اے رب

سو کہتے ہیں، ہم اس پر یقین لائے، سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور سمجھائے، وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے۔ اے رب!

ف۱ نصاریٰ نجران نے تمام دلائل سے عاجز ہو کر بطور معارضہ کہا تھا کہ آخر آپ حضرت مسیح کو ''کلمۃ اللہ'' اور ''روح اللہ'' مانتے ہیں۔ بس ہمارے اثبات مدعا کیلئے یہ الفاظ کافی ہیں۔ یہاں اسکا تحقیقی جواب ایک عام اصول اور ضابطہ کی صورت میں دیا جس کے سمجھ لینے کے بعد ہزاروں نزاعات و مناقشات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اسکو یوں سمجھو کہ قرآن کریم بلکہ تمام کتب الٰہیہ میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں ایک وہ جن کی مراد معلوم و متعین ہو، خواہ اس لئے کہ لغت و ترکیب وغیرہ کے لحاظ سے الفاظ میں کوئی ابہام و اجمال نہیں نہ عبارت کئی معنیٰ کا احتمال رکھتی ہے نہ جو مدلول سمجھا گیا وہ عام قواعد مسلمہ کے مخالف ہے۔ اور یا اس لئے کہ عبارت و الفاظ میں گو لغۃً کئی معنیٰ کا احتمال ہو سکتا تھا لیکن شارع کی نصوص مستفیضہ یا اجماع معصوم یا مذہب کے عام اصول مسلمہ سے قطعاً متعین ہو چکا کہ متکلم کی مراد وہ معنیٰ نہیں، یہ ہے۔ ایسی آیات کو محکمات کہتے ہیں اور فی الحقیقت کتاب کی ساری تعلیمات کی جڑ اور اصل اصول یہ ہی آیات ہوتی ہیں۔ دوسری قسم آیات کی ''متشابہات'' کہلاتی ہے۔ یعنی جنکی مراد معلوم و متعین کرنے میں کچھ اشتباہ و التباس واقع ہو جائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس دوسری قسم کی آیات کو پہلی قسم کی طرف راجع کر کے دیکھنا چاہیے جو معنیٰ اسکے خلاف پڑیں ان کی قطعاً نفی کی جائے اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو ''آیات محکمات'' کے مخالف نہ ہو۔ اگر باوجود اجتہاد وسعی بلیغ کے متکلم کی مراد کی پوری پوری تعیین نہ کر سکیں تو دعویٰ ہمہ دانی کر کے ہم کو حد سے گزرنا نہیں چاہیئے۔ جہاں قلت علم اور قصور استعداد کی وجہ سے بہت سے حقائق پر ہم دسترس نہیں پا سکتے اسکو بھی اسی فہرست میں شامل کر لیں۔ مگر زنہار ایسی تاویلات اور ہیر پھیر نہ کریں جو مذہب کے اصول مسلمہ اور آیات محکمہ کے خلاف ہوں مثلاً قرآن حکیم نے مسیح علیہ السلام کی نسبت تصریح کر دی ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ یا ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ

لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ

نہ پھیر ہمارے دلوں کو جب تو ہم کو ہدایت کر چکا اور عنایت کر ہم کو اپنے پاس سے رحمت تو ہی ہے

ہمارے دل نہ پھیر، جب ہم کو ہدایت دے چکا، اور دے ہم کو اپنے ہاں سے مہربانی، تو ہی ہے

الْوَهَّابُ ⑧ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ

سب کچھ دینے والا ف۱ اے رب تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن جس میں کچھ شبہ نہیں بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا اپنا

سب دینے والا۔ اے رب! تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن، جس میں شبہ نہیں۔ بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا

الْمِيْعَادَ ⑨ ع

وعدہ ف۲

وعدہ۔

تقسیم آیات بسوئے محکمات ومتشابہات مع تقسیم سامعین بسوئے زائغین فہم وراسخین علم

قَالَ تَعَالٰی: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ... الی... اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾

جب دلائل واضحہ سے توحید کا اثبات اور تثلیث اور ابنیت کا رد اور ابطال ہو گیا تو نصاریٰ نے عاجز ہو کر بطور معارضہ یہ کہا کہ آخر آپ ﷺ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ مانتے ہیں۔ پس یہی الفاظ ہمارے مدعا کے اثبات

-اَنَّہٗ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ یا ﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ○ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ﴾ اور جا بجا ان کی الوہیت وابنیت کا رد کیا۔ اب ایک شخص ان سب محکمات سے آنکھیں بند کر کے "كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ" وغیرہ متشابہات کو لے دوڑے اور اسکے وہ معنیٰ چھوڑ کر جو محکمات کے موافق ہوں ایسے سطحی معنیٰ لینے لگے جو کتاب کی عام تصریحات اور متواتر بیانات کے منافی ہوں، یہ کجروی اور ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہوگی بعض قاسی القلب تو چاہتے ہیں کہ اس طرح مغالطہ دے کر لوگوں کو گمراہی میں پھنسا دیں اور بعض کمزور عقیدہ والے ڈھلمل یقین ایسے متشابہات سے اپنی رائے وہوا کے مطابق کھینچ تان کر مطلب نکالنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا صحیح مطلب صرف اللہ ہی کو معلوم ہے وہی اپنے کرم سے جس کو جس قدر حصہ پر آگاہ کرنا چاہے کر دیتا ہے جو لوگ مضبوط علم رکھتے ہیں وہ محکمات ومتشابہات سب کو حق جانتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ دونوں قسم کی آیات ایک ہی سرچشمہ سے آئی ہیں جن میں تناقض وتہافت کا امکان نہیں۔ اسی لئے وہ متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹا کر مطلب سمجھتے ہیں۔ اور جو حصہ انکے دائرہ فہم سے باہر ہوتا ہے اسے اللہ پر چھوڑتے ہیں کہ وہی بہتر جانے ہم کو ایمان سے کام ہے (تنبیہ) بندہ کے نزدیک اس آیت کا مضمون "سورہ حج" کی آیت ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ کے مضمون سے بہت مشابہ ہے جسے انشاء اللہ اسکے موقع پر بیان کیا جائے گا۔

ف۱ یعنی راسخین فی العلم اپنے کمال علمی اور قوت ایمانی پر مغرور ومطمئن نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے استقامت اور مزید فضل وعنایت کے طلبگار رہتے ہیں تا کہ کمائی ہوئی پونجی ضائع نہ ہو جائے اور خدا نکردہ دل سیدھے ہونے کے بعد کج نہ کر دیئے جائیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (امت کو سنانے کے لئے) اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے۔ "يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ"

ف۲ وہ دن ضرور آ کر رہے گا اور "زائغین" (کجرو) جن مسائل میں جھگڑتے تھے سب کا دوٹوک فیصلہ ہو جائے گا۔ پھر ہر ایک مجرم کو اپنی کجروی اور ہٹ دھرمی کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اسی خوف سے ہم انکے راستہ سے بیزار اور آپ کی رحمت واستقامت کے طالب ہوتے ہیں۔ ہمارا زائغین کے خلاف راستہ اختیار کرنا کسی بدنیتی اور نفسانیت کی بنا پر نہیں محض اخروی فلاح مقصود ہے۔

کے لیے کافی ہیں۔

حق جل شانہ نے ان آیات میں ان کے اس شبہ کا جواب ایک عام ضابطہ اور قاعدہ کے شکل میں دیا جس کے سمجھ لینے کے بعد صدہا اور ہزارہا شبہات اور اشکالات اور نزاعات اور مناقشات کا خاتمہ ہوجاتا ہے وہ یہ کہ قرآن کریم بلکہ تمام کتب الٰہیہ میں آیات خداوندی کی دو قسمیں ہیں ایک محکمات کہ جن کی مراد واضح اور متعین ہو اور بدنیت ان کے مفہوم اور معانی میں الٹ پھیر کرکے اور ان آیات کے ظاہری الفاظ کو اپنی غرض پر نہ ڈھال سکتا ہو یہ آیتیں ام الکتاب اور اصل کتاب کہلاتی ہیں جو کتاب الٰہی اور شریعت اور تمام تعلیمات کی جڑ ہوتی ہیں انہی پر دین اور شریعت کا دارومدار ہوتا ہے جیسے آیات توحید وتنزیہ وغیرہ۔

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن میں ایک گونہ خفا اور ابہام ہوتا ہے اور مراد پوری واضح اور متعین نہیں ہوتی دوسرے معنی کا بھی ان میں احتمال ہوتا ہے ان آیات کا حکم یہ ہے کہ ان کو پہلی قسم کی طرف راجع کرکے دیکھنا چاہیے جو معنی محکمات کے مطابق ہوں ان کو لیا جائے اور جو معنی آیات محکمات کے خلاف ہوں ان کو نہ لیا جائے۔

بعض آیات کو حق جل شانہ نے قصداً مجمل اور متشابہ نازل فرمایا ہے تاکہ بندوں کا امتحان کریں کہ کون صریح اور واضح المراد یعنی آیات محکمات کا اتباع کرتا ہے اور کون کج رو ان مجملات اور متشابہات کو اپنی غرض پر ڈھالتا ہے اور محکمات اور آیات واضحات سے پہلوتہی کرتا ہے اور ایک حکمت آیات متشابہات کے نازل کرنے میں یہ ہے کہ جب باوجود جدوجہد کے متکلم کی مراد متعین نہ کرسکیں تو اپنے قصور علم کا اقرار کریں اور بزبان حال جو ہمہ دانی کے دعوے دار بنے ہوئے تھے اس سے توبہ کریں اور جس طرح قصور علم اور قصور فہم کی وجہ سے اور دیگر بیشمار حقائق پر دسترس نہیں اسی طرح آیات متشابہات کو بھی ان کی فہرست میں شامل کرلیں مگر ایسی تاویلات سے پرہیز کریں کہ جو آیات بینات اور محکمات اور اسلام کے اصول مسلمہ کے خلاف ہوں۔

پس جن آیات اور عبارات سے نصارائے نجران نے استدلال کیا ہے مثلاً روح اللہ اور کلمۃ اللہ کے الفاظ سے وہ سب کے سب اقسام متشابہات سے ہیں اور جن آیات میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بندہ اور بشر ہونا صاف اور واضح طور پر بیان کیا ہے وہ آیات محکمات ہیں مثلاً قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تصریح کردی۔ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ یا مثلاً ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ یا مثلاً ﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ﴾ یا مثلاً جن بیشمار آیات میں حق تعالیٰ نے یہ امر واضح طور پر بیان فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ اس کے کوئی بیٹا ہے ﴿مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ﴾ ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾۔

پس آیات محکمات میں صاف طور پر غیر اللہ کی الوہیت اور ابنیت کا رد کیا گیا ہے ان سے تو آنکھیں بند کرلینا اور ﴿كَلِمَتُهٗ اَلْقٰىهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ جیسی آیات متشابہات کو لے دوڑنا۔ اور ان کی ایسی تاویل کرنا جو صریح بینات اور آیات محکمات کے منافی ہوں یہ کج رو اور گمراہ لوگوں کا طریق ہے جو لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرنے اور سیدھے راستہ سے

ہٹانے کے لیے ایسا کیا کرتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ عزیز وحکیم وہی ذات ہے کہ جس نے اپنی حکمت بالغہ سے آپ پر ایک جامع اور کامل کتاب اتاری جس کی کچھ آیتیں محکم ہیں یعنی ظاہر المراد اور واضح المعنی ہیں جن کے معنی اور مفہوم میں کسی قسم کا اشتباہ اور التباس نہیں جو شخص ان کو سنے اور زبان سے اور اصطلاحات شریعت سے واقف ہو اس پر ان کا مفہوم مشتبہ نہیں رہتا۔ یہی آیتیں کتاب الٰہی کی اصل اور جڑ ہیں۔ انہی پر ساری تعلیم کا دارومدار ہے اور یہی آیتیں قرآن کا مغز ہیں۔

اور کچھ آیتیں اس کی متشابہ ہیں۔ جن کی مراد میں کچھ خفاء اور اشتباہ ہے سامع کو باوجود زبان دان ہونے کے اور باوجود غور و تامل کے اور باوجود اصول شریعت سے واقف ہونے کے ان کی پوری پوری مراد واضح نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے بندوں کو جتنا بتلانا چاہتے ہیں اتنی مقدار واضح فرما دیتے ہیں اور جس قدر نہیں بتلانا چاہتے اتنی مقدار اس میں خفا اور ابہام رکھ دیتے ہیں اور اس عزیز حکیم کا حکم یہ ہے کہ جس چیز کو ہم نے ظاہر اور واضح کر دیا اس کا اتباع کرو اور کتاب الٰہی کی جو چیز تم پر مخفی اور مشتبہ رہے اس پر بے چون و چرا ایمان لاؤ اور اس قسم کی آیات کی تفسیر میں اس کا پورا پورا لحاظ رکھو کہ ان آیات کے کوئی معنی ایسے ہرگز ہرگز نہ بیان کیے جائیں جو آیات محکمات اور شریعت کے اصول مسلمہ کے خلاف ہوں۔ متشابہات کو محکمات کی طرف راجع کرو۔ امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت محکم کی مراد عقل سے معلوم ہوتی ہے اور آیت متشابہ میں بدون نقل اور روایت کی مدد کے دخل دینا ممکن نہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے۔ طبعی طور پر کسی کفر اور بدعت کی طرف مائل ہیں نام کے مسلمان ہیں دل میں اپنے خیالات اور مزعومات چھپائے ہوئے ہیں سو یہ لوگ کتاب الٰہی میں سے صرف آیات متشابہات کی پیروی کرتے ہیں۔ تاکہ حق اور باطل کو مشتبہ بنا سکیں اتباع متشابہات سے کبھی تو ان لوگوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو الحاد اور بدعت کے فتنہ میں مبتلا کریں اور لوگوں کے دلوں میں دین کی طرف سے شکوک اور شبہات ڈالیں اور اس طرح مغالطہ دے کر لوگوں کو گمراہی میں پھنسائیں اور کبھی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان آیات متشابہات کی کوئی ایسی تاویل تلاش کی جائے جو ان کی خواہش اور غرض کے مطابق ہو اور کھینچ تان کر کے آیت کا ایسا مطلب بیان کیا جائے جو ان کی رائے اور ہوائے نفسانی کے موافق ہو ایسے لوگ اپنی مطلب برآری کے لیے آیت محکمات اور احادیث واضحات کی طرف نظر نہیں کرتے اور ہوائے نفسانی کی وجہ سے آیات متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں تاکہ ان کے خفاء اور ابہام کی وجہ سے ان میں کھینچ تان کر کے اپنا مطلب نکال سکیں اور عوام کو دھوکہ دے سکیں۔ حالانکہ ان متشابہات کی صحیح حقیقت اور یقینی مراد سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔ اس نے اپنے لطف و کرم سے جس قدر حصہ پر آگاہ کرنا چاہا کر دیا اور جتنا حصہ اپنی حکمت سے مخفی رکھنا چاہا وہ مخفی اور مشتبہ رکھا اور جو لوگ علم میں پختہ اور ثابت قدم ہیں۔ جب وہ آیات متشابہات کو دیکھتے ہیں کہ ان میں متعدد معانی کا احتمال ہے تو اپنی نفسانی خواہش اور طبعی میلان کا ذرہ برابر بھی لحاظ نہیں کرتے بلکہ متشابہات کو محکمات کے ساتھ ملا کر معنی بیان کرتے ہیں جتنا سمجھ میں آ گیا اس کو سمجھ گئے اور جو نہ سمجھ میں آیا اس کو اللہ پر چھوڑ دیا واللہ اعلم اللہ ہی بہتر جاننے والا۔ ہم کو تو ایمان سے مطلب ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ہم ان متشابہات پر اللہ کی مراد کے مطابق ایمان لائے سب کچھ یعنی محکم اور متشابہ اور ناسخ اور منسوخ جس کی مراد ہم کو معلوم ہے

اور جس کی مراد ہم کو معلوم نہیں یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں محکم اور متشابہ سب سے ہماری تربیت مقصود ہے محکمات کو اس لیے نازل فرمایا کہ اس کے مطابق اعتقاد رکھیں اور عمل کریں۔ اور متشابہات کو اس لیے اتارا کہ اپنی قصور استعداد اور قصور علم کا اعتراف کریں اور ایسے موقع پر آیات اور محکمات کا اتباع کریں۔ نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کریں۔ اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر وہی لوگ کہ جن کی عقل سلیم اور خالص ہے نفسانی خواہشوں کے زنگ سے پاک اور صاف ہے جس بات کا مطلب ان کی سمجھ میں نہیں آتا اس کو متکلم علیم وحکیم کے حوالہ کرتے ہیں اور "لا ادری" اور "لا اعلم" کہہ کر نصف علم حاصل کر لیتے ہیں اور باوجود اس کے وہ خائف رہتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ مبادا کسی پوشیدہ نفسانی خواہش کے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں اس لیے یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار بعد اس کے کہ تو نے کتاب نازل فرما کر ہم کو ہدایت دی اور اس کتاب کے محکم اور متشابہ پر ایمان لانے کی توفیق عطا کی اب اس لطف وعنایت اور اس توفیق اور ہدایت کے بعد ہمارے دلوں کو حق اور ہدایت سے کج اور منحرف مت فرما ہمیں اپنے دلوں پر اطمینان نہیں۔ دلوں کا ہدایت پانا اور حق کو قبول کرنا سب آپ کی توفیق سے ہے اور دے ڈال ہم کو اپنے پاس سے ہم کو خاص الخاص رحمت اور مہربانی یعنی توفیق اور فہم صحیح بے شک تو ہی سب کچھ عطا کرنے والا ہے اور دے ڈالنے والا ہے۔ جس طرح ظاہری نعمتیں تیری بارگاہ سے ملتی ہیں اسی طرح علم صحیح اور فہم صحیح اور تاویل صحیح کی نعمت بھی تیری ہی بارگاہ سے ملتی ہے اور یہ سب تیری رحمت اور مہربانی ہے۔ تجھ پر کوئی شے واجب نہیں اور اے پروردگار چند علوم اور معارف اور متفرق تاویلات کا کسی کے سینہ میں جمع کر دینا تیرے لیے کوئی دشوار نہیں اس لیے کہ تحقیق تو تمام لوگوں کو اکناف عالم سے اس دن کے لیے جمع کرنے والا ہے۔ جس میں کسی قسم کا کوئی شک اور شبہ ہی نہیں۔ پس اگر آپ اپنی رحمت سے ہم نابکاروں کے سینہ میں صحیح علوم اور صحیح تاویلات کو جمع فرما دیں تو بعید از رحمت نہیں ہم اگرچہ اس کے اہل اور لائق نہیں مگر آپ کا اہل انابت اور اہل مجاہدہ سے یہ وعدہ ہے کہ جو ہماری طرف رجوع کرتا ہے اس کو اپنی خاص ہدایت اور توفیق سے سرفراز کرتے ہیں۔ کما قال تعالی: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ﴿وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾۔ تحقیق اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں یا یہ معنی ہیں کہ اے اللہ تعالیٰ تو نے وعدہ فرمایا ہے کہ قیامت کے دن سب کو جمع کر کے نزاعی مسائل کا دوٹوک فیصلہ فرمائے گا۔ جس میں زائغین اور راسخین فی العلم کے اختلاف کا فیصلہ بھی داخل ہے۔ اس لیے ہمیں ڈر ہے کہ ہم زائغین اور مجرمین کا راستہ نہ اختیار کر لیں۔ کیونکہ ہمیں اپنے دلوں پر اطمینان نہیں اس لیے آپ ہی سے استقامت اور کجی سے محفوظ رہنے کی درخواست کرتے ہیں باوجود راسخین فی العلم ہونے کے اپنے علم پر مغرور نہ ہونا یہ بھی ان کے راسخ فی العلم ہونے کی ایک علامت ہے۔

لطائف ومعارف

۱۔ محکم اور متشابہ کی تفسیر میں سلف سے مختلف تعبیرات منقول ہیں۔ سب کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ محکمات وہ آیتیں ہیں کہ جن کے معنی ظاہر ہوں اور ان کی مراد معلوم اور متعین ہو خواہ نفس لغت کے اعتبار سے ان کے معنی ظاہر ہوں یا شریعت کے بیان کر دینے سے ان کی مراد متعین ہو یعنی ان کی مراد یا تو اس لیے متعین ہے کہ لغت اور ترکیب اور سیاق وسباق

کے اعتبار سے نظم قرآنی میں کوئی ابہام اور اجمال نہیں اور یا شریعت کے اعتبار سے اس کی مراد متعین ہے مثلاً لفظ صلوٰۃ اور لفظ زکوٰۃ اگرچہ لغت کے اعتبار سے دعا اور پاکیزگی کے معنی میں ہیں جس کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں لیکن شریعت کے بیان اور نصوص قطعیہ اور اسلام کے اصول مسلمہ اور اجماع امت سے یہ قطعاً متعین ہو چکا ہے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ سے متکلم کی مراد مخصوص طریقہ پر بدنی اور مالی عبادت بجالانا ہے شریعت کے بیان سے ان آیات کی مراد اس قدر صاف اور واضح ہے کہ کوئی بدنیت سے بدنیت بھی ان کے مفہوم اور معنی میں الٹ پھیر نہیں کر سکتا ایسی آیات کو محکمات کہتے ہیں۔

اور متشابہات ان آیات کو کہتے ہیں جن کی مراد اور معنی کے معلوم اور متعین کرنے میں کسی قسم کا اشتباہ اور التباس واقع ہو جائے اور چونکہ اشتباہ اور تشابہ ایک امر اضافی ہے جس کے درجات اور مراتب ہیں اس لیے متشابہ کی دو قسمیں ہیں ایک متشابہ تو وہ ہے جس کی مراد معلوم ہونے کی نہ تو امید ہی باقی رہی اور نہ اس کی مراد معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ اور امکان ہو جیسے مقطعات قرآنیہ الم، المر، طسم وغیرہ وغیرہ نہ لغت سے ان کے معنی معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ شریعت نے ان کے معنی بیان کیے ہیں اور دوسری قسم متشابہ کی یہ ہے کہ آیت میں اجمال اور ابہام یا اشتراک لفظی کی وجہ سے اس کی مراد میں اشتباہ پیش آ گیا ہو۔ متشابہ کے یہ اصطلاحی معنی مجمل اور مؤول کو بھی شامل ہیں۔ پس اگر آیت میں متشابہات سے پہلے معنی مراد لیے جائیں تو اس معنی کر متشابہ کی مراد سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔

اور اگر متشابہات کے دوسرے معنی مراد لیے جائیں تو اس معنی کر متشابہات کے معنی اور تاویل۔ راسخین فی العلم کو بھی بقدر اپنے علم اور فہم کے معلوم ہو جاتے ہیں اگرچہ اصل کُنہ اور حقیقت اور پوری کیفیت اللہ ہی کو معلوم ہوتی ہے لیکن راسخین فی العلم جب محکمات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور خداداد علم اور فہم سے ان میں غور و فکر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جتنی تاویل اور معنی ان پر واضح کرنا چاہتے ہیں اتنی تاویل اور معنی ان پر واضح فرما دیتے ہیں اور متشابہ کی قسم اول کو اصطلاح میں متشابہ حقیقی کہتے ہیں اور متشابہ کی قسم ثانی کو متشابہ اضافی کہتے ہیں۔

۲۔ سلف صالحین سے آیات متشابہات کی تاویل میں دو قول منقول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں جیسا کہ ابی بن کعب ؓ اور عائشہ صدیقہ ؓ سے مروی ہے۔ اور اکثر سلف سے یہی منقول ہے اور ابن عباس ؓ سے بھی ایک روایت ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں جیسا کہ ابن عباس ؓ اور مجاہد ؒ اور ربیع بن انس ؓ وغیرہم سے منقول ہے۔

ان دونوں قولوں میں کوئی تعارض نہیں جن سلف کا یہ قول ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں ان کی مراد متشابہ کی قسم اول ہے جیسے مقطعات قرآنیہ اور جن سلف سے یہ منقول ہے کہ متشابہات کی تاویل راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں ان کی مراد متشابہ کی قسم ثانی ہے۔ جو مجمل اور مؤول اور محتمل سب کو شامل ہے۔

۳۔ ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ الخ میں قراء اور مفسرین کا اختلاف ہے۔

بعض کا قول ہے کہ ﴿إِلَّا اللهُ﴾ پر وقف ضروری ہے اور لازم ہے اور ﴿وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ جملہ مستانفہ یعنی

کلام جدید ہے ماقبل پر عطف نہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔ اور راسخین فی العلم متشابہات کی تاویل اور حقیقت کو محض اللہ پر چھوڑتے ہیں اور جو کچھ اللہ کی مراد ہے اس پر ایمان لاتے ہیں ان کا مسلک محض تفویض و تسلیم ہے۔

اور بعض کا قول یہ ہے کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف جائز ہے ضروری اور لازم نہیں یعنی یہ بھی جائز ہے کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف کیا جائے اور ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ کو کلام جدید قرار دیا جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف نہ کیا جائے بلکہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ﴾ کا لفظ ﴿اللّٰهُ﴾ پر عطف کیا جائے اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد راسخین فی العلم بھی متشابہات کی تاویل اور معنی کو جانتے ہیں۔ سلف صالحین کی ایک کثیر جماعت کا یہی مسلک ہے۔ ابن عباس ؓ فرمایا کرتے تھے:

"انا من الراسخین فی العلم انا اعلم تاویله"، ''میں راسخین فی العلم سے ہوں اور میں متشابہ کی تاویل کو جانتا ہوں۔''

غرض یہ کہ وقف اور عطف کے بارے میں سلف کے یہ دو قول ہیں اور سلف کا یہ اختلاف اور نزاع حقیقی نہیں بلکہ لفظی اور صوری ہے جن لوگوں نے متشابہ کے پہلے معنی مراد لیے ہیں ان کے نزدیک ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف ضروری اور لازم ہے اس لیے کہ مقطعات قرآنیہ جیسے متشابہات کی تاویل سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔

اور جن لوگوں نے متشابہ کے دوسرے معنی مراد لیے جو مجمل اور محتمل اور مؤول کو بھی شامل ہیں ان کے نزدیک ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ﴾ کا عطف لفظ اللہ پر جائز ہے اس لیے کہ ایسے متشابہات کی تاویل اور معنی غور و خوض کرنے اور محکمات کی طرف رجوع کرنے سے راسخین فی العلم کو بھی بقدر ان کے علم اور فہم ان پر منکشف ہو جاتے ہیں اگرچہ اصل حقیقت اور اصل کُنہ اللہ ہی کو معلوم ہوتی ہے مگر بقدر علم راسخین فی العلم بھی اس کی تاویل کو جانتے اور سمجھتے ہیں اور متشابہ کے دوسرے معنی لے کر یہ بھی جائز ہے کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف کیا جائے اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ متشابہات کی اصل تاویل اور صحیح کُنہ اور پوری حقیقت سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر متشابہات کے اول معنی مراد لیے جائیں تو ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف ضروری اور لازم ہوگا اور اگر آیت میں متشابہات کے دوسرے معنی مراد لیے جائیں تو آیت میں وقف اور عطف دونوں جائز ہیں جس نے وقف کو ضروری قرار دیا اس نے متشابہ کے پہلے معنی مراد لیے اور آیت میں وقت اور عطف کی جو قرأتیں آئی ہیں وہ دونوں حق اور صحیح ہیں جس قراءت میں غیر اللہ سے متشابہ کی تاویل کی نفی کی گئی ہے وہاں متشابہ کے اول معنی مراد ہیں اور جس قراءت میں غیر اللہ یعنی راسخین کے لیے متشابہات کی تاویل کے علم کو ثابت کیا گیا ہے وہاں متشابہ کے دوسرے معنی مراد ہیں (خوب سمجھ لو) اور جس نے عطف جائز قرار دیا اس نے متشابہ کے دوسرے معنی مراد لیے اس لیے عرض کیا گیا کہ یہ اختلاف اور نزاع حقیقی نہیں بلکہ لفظی اور صوری ہے۔

۴- لفظ تاویل متقدمین کی اصطلاح میں تفسیر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے تفسیر ابن جریر میں جابجا تاویل کا لفظ تفسیر

کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اور متاخرین کی اصطلاح میں کسی قرینۂ دلیل کی بناء پر ظاہر سے غیر ظاہر کی طرف پھیرنے کا نام تاویل ہے اور بلا کسی دلیل اور کسی قرینہ کے ظاہر سے پھیرنے کا نام تحریف ہے، لیکن تاویل کے یہ دونوں معنی اصطلاحی ہیں اور قرآن کریم میں جہاں کہیں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے وہاں تاویل سے مخفی حقیقت اور مصداق اور مآل اور انجام اور نتیجہ اور حکمت اور کلام کی غرض اور غایت کے معنی مراد لیے گئے ہیں لفظ تاویل اصل میں اَوّل سے مشتق ہے جس کے معنی اصل کی طرف رجوع کرنے کے ہیں مثلاً ﴿هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ﴾ سے یوم آخرت مراد ہے جس دن وعدہ اور وعید کا مصداق ظاہر ہوگا اور جزاء اور سزا کی حقیقت واضح ہوگی۔

اور ﴿بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ﴾ میں تاویل سے خبر خداوندی کے مصداق کا ظہور مراد ہے یا عاقبت اور انجام کے معنی مراد ہیں ہر خبر کا ایک لفظی مفہوم اور مدلول ہوتا ہے اور ایک اس کا خارجی اور واقعی مصداق ہوتا ہے جو وقوع کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿لِكُلِّ نَبَإٍ مُّسْتَقَرٌّ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ قرآن کریم نے خبر کے اس خارجی اور وقوعی مصداق کو تاویل سے تعبیر کیا ہے۔ بسا اوقات خبر کا لفظی مدلول اور مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور اس کا خارجی مصداق مخفی اور پوشیدہ ہوتا ہے۔ راسخین فی العلم اس خبر کے لفظی اور ظاہری مفہوم کو جانتے ہیں اور اس کے خارجی مصداق کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں اور هذا تاويل رؤياى میں تاویل سے تعبیر مراد ہے جو خواب کا مآل اور انجام اور خارجی مصداق ہے اور ﴿وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ میں تاویل سے مآل اور انجام کا مراد ہونا بالکل ظاہر ہے۔

اور ﴿ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾ میں تاویل سے مصداق اور خارجی حقیقت اور حکمت کے معنی مراد ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں یہ دعا فرمائی:

”اللهم فقهه فی الدین وعلمه التاویل“، ”اے اللہ اس کو دین کی سمجھ دے اور تاویل کا علم عطا فرما۔“

ظاہر ہے کہ یہاں تاویل سے مخفی حقیقت اور پوشیدہ حکمت کا منکشف کرنا اور مآل اور انجام کا ظاہر کرنا مراد ہے۔

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

”كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول فی رکوعه وسجوده سبحانك اللّٰهم ربنا وبحمدك اللّٰهم اغفرلی يتأول القرآن“،

آنحضرت ﷺ رکوع اور سجود میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے: سبحانك اللّٰهم ربنا وبحمدك اللّٰهم اغفرلی" گویا کہ آپ اس دعا کے ذریعہ سے فسبح بحمد ربك واستغفره کی تاویل ظاہر فرماتے یعنی اس آیت کا عملی مصداق بیان فرماتے ہیں کہ آیت قرآنی میں تسبیح وتحمید اور استغفار کی تاویل یہ ہے کہ رکوع میں اس طرح تسبیح اور استغفار پڑھی جائے۔

معلوم ہوا کہ حدیث میں تاویل سے کلام کا ظاہر سے پھیرنا مراد نہیں بلکہ اس کے خارجی مصداق کا تعیین مراد ہے۔

۵- اس سورت میں آیات قرآنی کی دو قسمیں بیان کی گئیں ایک محکم اور ایک متشابہ۔ اور سورۂ ہود کے شروع میں

یعنی ﴿ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ﴾ میں قرآن کریم کی تمام آیات کو محکم بتلایا گیا۔ اور سورۂ زمر کی اس آیت ﴿ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا ﴾ میں سارے قرآن کو متشابہ بتایا گیا۔

سوان آیات میں محکم اور متشابہ کے دوسرے معنی مراد ہیں محکم کے معنی لغت میں مضبوط اور مستحکم کے ہیں۔ چونکہ قرآن کریم نظم اور معنی کے اعتبار سے نہایت مستحکم اور سراسر حق اور سراپا حکمت ہے کہیں جائے انگشت نہیں اس لیے سارے قرآن کو محکم کہا گیا۔ اور متشابہ کے معنی لغت میں مشابہ اور ملتے جلتے کے ہیں اور چونکہ قرآن کی تمام آیتیں حسن اور خوبی۔ اور ہدایت اور فصاحت اور بلاغت میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ اختلاف اور تناقض سے پاک ہونے میں ایک دوسرے کے متشابہ ہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾۔ اس لیے تمام قرآن کو کتابا متشابھا فرمایا۔

پس جس جگہ قرآن کی بعض آیتوں کو محکم اور بعض کو متشابہ کہا گیا وہاں محکم اور متشابہ کے اور معنی مراد ہیں اور جہاں سارے قرآن کو محکم یا متشابہ کہا گیا وہاں اور معنی مراد ہیں۔ پس جب ہر جگہ معنی جدا جدا ہوئے تو آیات میں کوئی تعارض اور تناقض نہ رہا۔

٦- آیت کو راسخین فی العلم سے شروع فرمایا اور ﴿ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ پر ختم فرمایا۔ معلوم ہوا کہ راسخین فی العلم وہ لوگ ہیں جن کی عقل نفسانی خواہشوں سے کج اور خراب نہ ہوگئی ہو جب تک عقل سے نفسانی خواہشوں کا زنگ دور نہ ہو وہ اللہ کے نزدیک راسخین فی العلم میں سے نہیں۔

"قال ابن ابی حاتم ثنا محمد بن عوف الحمصی ثنا نعیم بن حماد ثنا فیاض الرقی ثنا عبید اللہ بن یزید وکان قد ادرك اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم انساً وابا امامۃ وابا الدرداء ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن الراسخین فی العلم فقال من برت یمینه وصدق لسانه واستقام قلبه ومن عف بطنه وفرجه فذلك من الراسخین فی العلم۔" (تفسیر ابن کثیر: ۲/۲۰۲)

''ابن ابی حاتم نے اپنی سند سے بیان کیا کہ عبید اللہ بن یزید (کہ جنہوں نے صحابہ کرام کو پایا اور انس بن مالک اور ابوامامہ اور ابوالدرداء کو دیکھا) وہ راوی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ راسخین فی العلم جن کا آیت میں ذکر ہے وہ کون لوگ ہیں آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنی قسم اور نذر میں پورا ہو اور زبان کا سچا ہو اور دل اس کا جادۂ محبت و وفا پر قائم اور مستقیم ہو اور اس کا شکم اور اس کی شرمگاہ حرام اور مشتبہ سے عفیف اور پاک ہو پس ایسا شخص راسخین فی العلم میں سے ہے۔''

یعنی علم میں پختہ اور ثابت قدم وہی شخص ہے جس کا حال اور قال یہ ہو جو بیان کیا گیا اور ظاہر ہے کہ یہ حال اور یہ قال انہیں لوگوں کا ہو سکتا ہے جن کے دل نفسانی خواہشوں کے زنگ سے صیقل ہو چکے ہوں۔ اور انوار و تجلیات کے عکس قبول کرنے کے لیے صاف و شفاف آئینہ بن چکے ہوں۔

اور راسخین فی العلم کے مقابل زائغین کا گروہ ہے جو نفسانی خواہشوں کی وجہ سے کج اور خراب ہو چکے ہیں۔ حق بات

ان کے دل میں نہیں اترتی۔

ملحد اور زندیق رافضی اور خارجی اور تمام بدعتی فرقے اس میں داخل ہیں جس طرح تمام اہل حق راسخین فی العلم میں داخل ہیں جس کا صحیح مصداق اہل سنت والجماعت ہیں جو کتاب وسنت کے محکمات کو مضبوط پکڑتے ہیں اور متشابہات کو محکمات کے ساتھ ملا کر آیات کے معنی بیان کرتے ہیں۔ اپنی نفسانی خواہشوں کا اتباع نہیں کرتے بلکہ صحابہ وتابعین کے نقش قدم پر چلتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا اور خوشنودی کا اعلان فرمایا پس جس شخص کا علم اور فہم خلفاء راشدین اور صحابہ اور تابعین کے اجماع سے ٹکراتا ہو تو سمجھ لو کہ ایسا شخص زائغین میں سے ہے اس سے بچتے رہو۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ

بیشک جو لوگ کافر ہیں ہرگز کام نہ آویں گے ان کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ کے سامنے کچھ

جو لوگ منکر ہیں، ہرگز کام نہ آویں گے ان کے مال اور نہ اولاد، اللہ کے آگے کچھ۔

وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ⑩ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ

اور وہی ہیں ایندھن دوزخ کے ف۱ جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے

وہی ہیں چھپٹیاں (ایندھن) دوزخ کی۔ جیسے دستور فرعون والوں کا، اور جو ان سے پہلے تھے،

كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ⑪ قُل

جھٹلایا انہوں نے ہماری آیتوں کو پھر پکڑا ان کو اللہ نے ان کے گناہوں پر اور اللہ کا عذاب سخت ہے ف۲ کہہ دے

جھٹلاتے ہماری آیتیں، پھر پکڑا ان کو اللہ نے ان کے گناہوں پر، اور اللہ کی مار سخت ہے۔ کہہ دے

ف۱ قیامت کے ذکر کے ساتھ کافروں کا انجام بھی بتلا دیا کہ ان کو کوئی چیز دنیا وآخرت میں خدائی سزا سے نہیں بچا سکتی۔ جیسا کہ میں ابتداء سورۃ میں لکھ چکا ہوں۔ ان آیات میں اصلی خطاب وفد "نجران" کو تھا جسے عیسائی مذہب وقوم کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت کہنا چاہیے۔ امام فخر الدین رازی نے محمد بن اسحاق کی سیرت سے نقل کیا ہے کہ جس وقت یہ وفد "نجران" سے بقصد مدینہ روانہ ہوا تو ان کا بڑا پادری ابوحارثہ بن علقمہ خچر پر سوار تھا۔ خچر نے ٹھوکر کھائی تو اس کے بھائی کرز بن علقمہ کی زبان سے نکلا "تعس الابعد" (ابعد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ العیاذ باللہ) ابوحارثہ نے کہا "تعست امك" کرز نے حیران ہو کر اس کلمہ کا سبب پوچھا۔ ابوحارثہ نے کہا واللہ ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) وہی نبی منتظر ہیں جن کی بشارت ہماری کتابوں میں دی گئی تھی۔ کرز نے کہا پھر مانتے کیوں نہیں؟ بولا "لان هؤلاء الملوك اعطونا اموالا كثيرة واكرمونا فلو امنا بمحمد (صلى الله عليه وسلم) لاخذوا منا كل هذه الاشياء" (اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو یہ بادشاہ جو بیشمار دولت ہم کو دے رہے ہیں اور اعزاز واکرام کر رہے ہیں سب واپس کر لیں گے) کرز نے اس کلمہ کو اپنے دل میں رکھا اور آخرکار یہی کلمہ ان کے اسلام کا سبب ہوا رضی اللہ عنہ وارضاہ میرے نزدیک ان آیات میں ابوحارثہ کے ان ہی کلمات کا جواب ہے گویا دلائل عقلیہ ونقلیہ سے ان کے فاسد عقیدہ کا رد کر کے متنبہ فرما دیا کہ وضوح حق کے بعد جو لوگ محض دنیاوی متاع (اموال واولاد وغیرہ) کی خاطر ایمان نہیں لاتے وہ خوب سمجھ لیں کہ مال ودولت اور جتھے نہ ان کو دنیا میں خدائی سزا سے بچا سکتے ہیں نہ آخرت میں عذاب عظیم سے۔ چنانچہ اس کی تازہ مثال ابھی "بدر" کے موقع پر مسلمان اور مشرکین کی لڑائی میں دیکھ چکے ہو۔ دنیا کی بہار محض چند روزہ ہے مستقبل کی کامیابی ان ہی کے لئے ہے۔ جو خدا سے ڈرتے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ دور تک یہ مضمون چلا گیا ہے اور عموم الفاظ کے اعتبار سے یہود مشرکین وغیرہ دوسرے کفار کو بھی خطاب میں لپیٹ لیا گیا گو اصلی مخاطب نصاریٰ نجران تھے۔ واللہ اعلم۔

ف۲ یعنی کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا اور جس طرح وہ پکڑے گئے تم بھی خدا کی پکڑ میں آنے والے ہو۔

لِّلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٢﴾ قَدْ كَانَ

کافروں کو کہ اب تم مغلوب ہو گے اور ہانکے جاؤ گے دوزخ کی طرف اور کیا برا ٹھکانا ہے ف۱ ابھی گزر چکا ہے

منکروں کو کہ اب تم مغلوب ہو گے اور ہانکے جاؤ گے دوزخ کو۔ اور کیا بری تیاری ہے۔ ابھی ہو چکا ہے

لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ

تمہارے سامنے ایک نمونہ دو فوجوں میں جن میں مقابلہ ہوا ایک فوج ہے کہ لڑتی ہے اللہ کی راہ میں اور دوسری فوج کافروں کی ہے

تم کو ایک نمونہ، دو فوجوں میں جو بھڑی تھیں۔ ایک فوج ہے کہ لڑتی ہے اللہ کی راہ میں، اور دوسری منکر ہے،

يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ

دیکھتے ہیں یہ ان کو اپنے سے دو چند صریح آنکھوں سے اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا جس کو چاہے اسی میں

یہ ان کو دیکھتے ہیں اپنے دو برابر، صریح آنکھوں سے، اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا جس کو چاہے۔ اسی میں

لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿١٣﴾

عبرت ہے دیکھنے والوں کو ف۲

خبردار ہو جائیں جن کو آنکھ ہے۔

مال و اولاد کے نشہ میں حق سے استغنا پر وعید اور تہدید

قَالَ تَعَالَىٰ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ ... الی ... لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ﴾

ربط:...... یہ آیتیں بھی نصارائے نجران کے بارہ میں نازل ہوئیں دلائل اور براہین سے حق ان پر واضح ہو چکا تھا مگر مال و دولت کے غرور اور نشہ نے ان کو قبول حق اور قبول ہدایت سے باز رکھا اس لیے ان ارباب غرور کی وعید اور تہدید کے لیے یہ

ف۱ یعنی وقت آ گیا ہے کہ تم سب کیا یہود، کیا نصاریٰ اور کیا مشرکین عنقریب خدائی لشکر کے سامنے مغلوب ہو کر ہتھیار ڈالو گے، یہ تو دنیا کی ذلت ہوئی اور آخرت میں جو گرم مکان تیار ہے وہ الگ رہا بعض روایات میں ہے کہ "بدر" سے فاتحانہ واپسی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو فرمایا کہ تم حق کو قبول کر لو، ورنہ جو حال قریش کا ہوا تمہارا ہو گا۔ کہنے لگے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دھوکہ میں نہ رہیئے کہ تم نے قریش کے چند ناتجربہ کاروں پر فتح حاصل کر لی۔ ہم سے مقابلہ ہوا تو پتہ لگ جائے گا کہ ہم (جنگ آزمودہ سپاہی اور بہادر) آدمی ہیں اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ بعض کہتے ہیں کہ "بدر" کی فتح دیکھ کر "یہود" کچھ تصدیق کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ پھر کہا کہ جلدی مت کرو، دیکھو آئندہ کیا ہوتا ہے۔ دوسرے سال "احد" کی عارضی پسپائی دیکھ کر ان کے دل سخت ہو گئے اور حوصلے بڑھ گئے۔ حتیٰ کہ عہد شکنی کر کے مسلمانوں سے لڑائی کا سامان کیا کعب بن اشرف ساٹھ سواروں کے ساتھ مکہ معظمہ جا کر ابوسفیان وغیرہ سرداران قریش سے ملا اور کہا ہم تم ایک ہیں۔ متحد و محاذ قائم کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ واللہ اعلم بہر حال تھوڑے ہی دنوں بعد خدا نے دکھلا دیا کہ جزیرۃ العرب میں مشرک کا نام نہ رہا۔ "قریظہ" کے بدعہد یہود تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ "بنی نضیر" جلاوطن ہوئے، نجران کے عیسائیوں نے ذلیل ہو کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا۔ اور تقریباً ایک ہزار سال تک دنیا کی بڑی بڑی مغرور و متکبر قومیں مسلمانوں کی بلندی و برتری کا اعتراف کرتی رہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلك۔

ف۲ جنگ بدر میں کفار تقریباً ایک ہزار تھے جن کے پاس سات سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے۔ دوسری طرف مسلمان مجاہدین تین سو سے کچھ اوپر تھے جن کے پاس کل ستر اونٹ، دو گھوڑے، چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔ اور تماشہ یہ تھا کہ ایک فریق کو حریف مقابل اپنے سے دوگنا نظر آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ=

آیتیں نازل ہوئیں کہ آخرت میں مال اور اولاد کچھ کام نہ آئیں گے اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ اب ان کافروں سے یہ کہہ دیں کہ یہ لوگ عنقریب دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مغلوب ہوں گے اور قیامت کے دن جہنم میں ڈال دیے جائیں گے اور پھر واقعہ بدر کو ان کی عبرت کے لیے ذکر فرمایا۔ محمد بن اسحاق کی سیرت میں ہے کہ نصارائے نجران کا وفد جب بغرض مناظرہ مدینہ منورہ روانہ ہوا تو راستہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ان کا بڑا عالم ابو حارثہ بن علقمہ خچر پر سوار تھا یک خچر کو ٹھوکر لگی اور وہ عالم سواری سے گرا تو اس کے بھائی کرز بن علقمہ کی زبان سے نکلا "تعِسَ الْاَبْعَدُ" یعنی ہلاک ہو وہ شخص جس کے ہم پاس جا رہے ہیں اس نے اَلْاَبْعَدُ سے آنحضرت ﷺ کو مراد لیا۔ العیاذ باللہ۔

ابو حارثہ نے کہا:

"بَلْ تعِسْتَ اَنْتَ اَتَشْتم رجلا من المرسلين انه الذى بشر به عيسىٰ وانه لفى التوراة ووالله انه النبى الذى ننتظره"، "بلکہ تو ہلاک ہو۔ کیا تو ایسے شخص کی شان میں نازیبا الفاظ کہتا ہے جو رسولوں میں سے ہے تحقیق بلاشبہ آپ وہی نبی ہیں جن کی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے بشارت دی ہے اور جن کا تذکرہ توریت میں ہے اور خدا کی قسم یہ وہی نبی ہیں جن کے اخیر زمانہ میں ظہور کے ہم سب منتظر ہیں۔"

اس پر ابو حارثہ کے بھائی کرز نے کہا:

"فما يمنعك منه وانت تعلم هذا"، "کہ جب تم کو ان کی نبوت اور رسالت کا اس درجہ علم اور یقین ہے تو پھر ایمان لانے سے کیا چیز مانع ہے۔"

ابو حارثہ نے جواب دیا:

"لان هؤلاء الملوك اعطونا اموالا كثيرة واكرمونا فلو امنا به لاخذوا منا كل هذه الاشياء"، "کہ ہم ایمان اس لیے نہیں لاتے کہ ان عیسائی بادشاہوں نے جو بے شمار اموال ہم کو دے رکھے ہیں اور ہمارا اعزاز و اکرام کرتے ہیں اگر ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو یہ سب ہم سے چھین لیں گے۔"

یہ کلمہ کرز کے دل میں اتر گیا اور یہ کہا کہ خدا کی قسم جب تک مدینہ پہنچ کر ایمان نہ لے آؤں گا اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھوں گا۔ اور کُرز اونٹنی پر سوار ہو کر مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوا اونٹنی کو تیز کیا اور بطور رجز یہ پڑھتا جاتا تھا:

اِلَيْكَ تَغْدُوْ قَلِقًا وَضِيْنُهَا مُعْتَرِضًا فِيْ بَطْنِهَا جَنِيْنُهَا

"آپ ﷺ ہی کی طرف یہ اونٹنی چل رہی ہے دراں حالیکہ اس کا تنگ حرکت کر رہا ہے اور اس کے پیٹ میں اس کا جنین حرکت کر رہا ہے۔"

= کفار کے دل مسلمانوں کی کثرت کا تصور کر کے مرعوب ہوتے تھے اور مسلمان اپنے سے دوگنی تعداد دیکھ کر اور زیادہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور کامل تحمل و استقلال سے خدا کے وعدہ ﴿فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ پر اعتماد کر کے فتح و نصرت کی امید رکھتے تھے۔ اگر ان کی پوری تعداد جو تگنی تھی منکشف ہوتی تو ممکن تھا خوف طاری ہو جاتا۔ اور یہ فریقین کا دوگنی تعداد دیکھنا بعض احوال میں تھا۔ ورنہ بعض احوال وہ تھے جب ہر ایک کو دوسرے فریق کی جمعیت کم محسوس ہوتی۔ جیسا کہ سورۂ انفال میں آئے گا۔ بہرحال ایک قلیل اور بے سروسامان جماعت کو ایسی مضبوط جمعیت کے مقابلہ میں ان پیشین گوئیوں کے موافق جو مکہ میں کی گئی تھیں۔ اس طرح مظفر و منصور کرنا، آنکھیں رکھنے والوں کے لئے بہت بڑا عبرتناک واقعہ ہے۔

مُخَالِفًا دِيْنَ النَّصَارىٰ دِيْنُهَا

اب اس اونٹنی کا (یعنی اس کے سوار کا) دین۔ نصاریٰ کے دین کے خلاف ہے۔

یہاں تک کہ کرز وفد سے پہلے مدینہ منورہ پہنچ گیا اور مشرف باسلام ہوا اور وفد بعد میں پہنچا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۱۰۸، وروض الانف: ۴/۴۵، واصابہ ۳/۲۹۳ ترجمۂ کرز بن علقمہ رضی اللہ عنہ)۔ اور مشرف باسلام ہونے کے بعد کرز نے حج بھی کیا۔

خلاصۂ کلام

یہ کہ یہ آیتیں اسی وفد کے بارہ میں نازل ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں انہی لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس مال کے لالچ میں تم نے ایمان سے روگردانی کی ہے وہ قیامت کے دن کچھ کام نہ آئے گا اور جن سلاطین اور امراء پر تم کو بھروسہ ہے وہ عنقریب مسلمانوں کے ہاتھ سے مقہور اور مغلوب ہوں گے اور تمہارا تو ذکر ہی کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں تحقیق جن لوگوں نے کفر اور انکار کی راہ اختیار کی اللہ کے مقابلہ میں ان کے مال اور ان کی اولاد جس پر ان کو ناز اور فخر ہے۔ ہرگز کچھ بھی کام نہ آئیں گے۔ البتہ مسلمانوں کے مال اور اولاد آخرت میں کام آئیں گے اس لیے کہ مسلمانوں نے اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کیے اور اولاد کو اللہ کی عبادت اور دین کی تعلیم میں لگایا۔ اور ایسے کافر تو مع مال اور اولاد کے دوزخ کا ایندھن ہوں گے اور ان کا حال اور مآل تو فرعونیوں جیسا ہے کہ جس طرح دنیا میں فرعونیوں کو ان کے مال اور اولاد ان کو اللہ کے قہر سے نہ بچا سکے ان کی بھی ایسی گت بنے گی اور کچھ کام نہ آئے گا۔ اور جس طرح ان سے پہلے لوگوں نے یعنی قوم عاد اور ثمود اور قوم لوط نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا پس اللہ نے ان کو ان کے جرائم کی بناء پر پکڑا اور ہلاک کیا ان کا سارا مال ومتاع اور اولاد دھری رہ گئی اگر تم نے حق کو قبول نہ کیا تو سمجھ لو کہ تمہارا بھی یہی انجام ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔ جس کے مقابلہ میں مال اور اولاد کچھ کام نہیں دیتا۔ اے نبی کریم! آپ ان کافروں سے جو اپنے مال ودولت اور قوت اور کثرت پر نازاں ہیں یہ کہہ دیجئے کہ تم عنقریب اسی دار دنیا میں ہمارے دوستوں کے ہاتھ سے مغلوب اور مقہور ہوؤ گے اشارہ اس طرف ہے کہ بنو قریظہ اور بنو نضیر جلاوطن کیے جائیں گے اور خیبر اور مکہ فتح ہوگا یہ ذلتیں تو ان منکرین کو دنیا میں پہنچیں گی اور آخرت کی بابت یہ فرما دیجئے کہ تم جہنم کی طرف جانوروں کی طرح ہانکے جاؤ گے اور دوزخ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ چونکہ کفار اپنے مال اور اولاد یعنی قوت اور کثرت اور ثروت پر نازاں تھے اور یہ کہتے تھے کہ ﴿نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ﴾ اور یہ خیال کرتے تھے کہ دنیا کی طرح آخرت میں بھی مال اور اولاد کام آئیں گے کما قال تعالیٰ حکایۃ عنہم: ﴿اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا﴾۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان آیات میں متنبہ فرمایا کہ مال ودولت صرف آخرت ہی میں بے سود نہ ہوگی بلکہ بسا اوقات وہ دنیا میں بھی سودمند اور کارآمد نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ جس کو غلبہ دینا چاہتے ہیں اس کے مقابلہ میں ساری قوت اور ثروت اور کثرت دھری رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو پیشن گوئی فرمائی تھی چند روز کے بعد وہ حرف بحرف پوری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ سے بنو قریظہ اور بنو نضیر کو مقہور اور مغلوب کیا اور خیبر اور مکہ انہی

فقراء مسلمین کے ہاتھوں پر فتح ہوا جن کو یہ حقیر سمجھتے تھے۔

ذکر استشہاد برائے دفع استبعاد

حق جل شانہ نے جب گزشتہ آیت ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ﴾ الخ میں مسلمانوں کے غلبہ کی خبر دی تو منافقین نے اس کو مستبعد سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے استبعاد دفع کرنے کے لیے بطور استشہاد واقعہ بدر کو ذکر فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق تمہارے لیے دو جماعتوں کے بارہ میں ایک عبرت اور عجیب نمونہ قدرت ہے کہ جو باہم ایک دوسرے سے لڑیں اس معرکہ اور لڑائی میں ایک جماعت تو وہ تھی کہ جو خدا کی راہ میں لڑتی تھی یعنی مسلمانوں کی جماعت تھی جن کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور بے سروسامان تھی اور دوسری جماعت کافروں کی تھی جن کی تعداد نو سو پچاس تھی جو جنگی ساز و سامان سے لیس تھی اور جس کو اپنی قوت اور شوکت اور کثرت اور ثروت پر ناز تھا بدر کے میدان میں دونوں جماعتوں کا مقابلہ ہوا عین مقابلہ اور مقاتلہ کے وقت یہ کافر کھلی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے سے دو چند دیکھتے تھے۔ یعنی مسلمان کافروں کو دو چند (تقریباً دو ہزار) دکھائی دیتے تھے جس سے کافروں کے دل مرعوب اور خوف زدہ ہو گئے اور یہ اس طرح کا دیکھنا صریح اور کھلی آنکھوں سے تھا کوئی خواب و خیال نہ تھا اور اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ قلیل کو کثیر اور کثیر کو قلیل کر کے دکھلائے حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے احْوَل (بھینگے) کو ایک کے دو دکھلاتا ہے یہ کوئی کذب اور دروغ نہیں بلکہ اس کی قدرت کا کرشمہ ہے جس طرح خورد بین اور دور بین سے چھوٹی چیز بڑی نظر آنے لگتی ہے تو یہ جھوٹ نہیں بلکہ کاری گری اور صنعت کا کمال ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ جو بعد میں مشرف باسلام ہوئے انہوں نے یہ بیان کیا کہ مسلمان ہم کو تعداد میں بہت نظر آئے اسی طرح سمجھو کہ اگر حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اپنے دشمنوں کو وقتی طور پر دو درجہ کا بھینگا بنا دے کہ بجائے ایک کے تین نظر آنے لگیں تو یہ کوئی کذب اور دروغ نہیں بلکہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔

فائدہ

لڑائی شروع ہونے سے پہلے مسلمان، کافروں کی نظر میں تھوڑے دکھائی دیتے تھے جیسا کہ سورۂ انفال میں ہے ﴿وَيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ﴾ یعنی اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تم کو کافروں کی نظر میں تھوڑا کر کے دکھلاتا تھا۔ لیکن جب اس کے بعد گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو کافر، مسلمانوں کو خود اپنے سے بھی دو چند دیکھنے لگے پس اس آیت میں عین جنگ کے وقت کا ذکر ہے اور سورۂ انفال میں جنگ چھڑنے سے پہلے کا ذکر تھا۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی تعارض اور تناقض نہیں رہا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی امداد سے جس کو چاہتے ہیں قوت دیتے ہیں اور فتح اور غلبہ کا اصل مدار تائید خداوندی پر ہے تائید خداوندی کے مقابلہ میں کوئی طاقت اور قوت غالب نہیں آ سکتی جیسا کہ تم نے بدر کے معرکے میں اس کا مشاہدہ کر لیا تحقیق اس بدر کے واقعہ میں آنکھ والوں کے لیے بڑی عبرت اور نصیحت ہے کہ کس طرح ایک کمزور اور بے سروسامان گروہ ایک پوری قوت اور شوکت والے گروہ پر غالب آ گیا وجہ اس کی یہ تھی کہ تائید خداوندی اور امداد غیبی مسلمانوں کے ساتھ تھی اور خدا کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اس لیے تم کو چاہیے کہ تم اپنے مال و دولت کے غرور سے تائب ہو کر اس جماعت میں داخل ہو جاؤ کہ جن کے ساتھ تائید

فائدہ

آیت ﴿یَرَوْنَھُمْ مِّثْلَیْھِمْ﴾ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں پہلا قول یہ ہے کہ "یرون" کی ضمیر فاعل فِئَۃٌ کافرۃٌ کی طرف راجع ہے جو قریب ہے اور "ھُمْ" کی ضمیر مفعول مسلمانوں کی طرف راجع ہے اور ﴿مِّثْلَیْھِمْ﴾ کی ضمیر مجرور کافروں کی طرف راجع ہے یعنی کافروں کا گروہ مسلمانوں کو اپنے سے دوچند دیکھتا تھا۔ تفسیر میں ہم نے اسی قول کو اختیار کیا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ یرون کی ضمیر تو حسب سابق "فئۃ کافرۃ" کی طرف راجع ہو اور "ھم" کی ضمیر مفعول بھی مسلمانوں کی طرف راجع ہو لیکن ﴿مِّثْلَیْھِمْ﴾ کی ضمیر مجرور بجائے کافروں کے مسلمان کی طرف راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ کافر مسلمانوں کو مسلمانوں کے اعتبار سے دوچند دیکھتے تھے یعنی مسلمان کافروں کی نظر میں بجائے تین سو تیرہ کے چھ سو چھبیس دکھائی دیتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ کافر جب مسلمانوں کی ایک عظیم تعداد دیکھیں گے تو مرعوب ہو جائیں گے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ "یَرَوْنَ" کی ضمیر فاعل مسلمانوں کی طرف راجع ہو اور "ھُمْ" کی ضمیر مفعول "کَافِرُوْنَ" کی طرف راجع ہوا اور ﴿مِّثْلَیْھِمْ﴾ کی ضمیر مجرور مسلمانوں کی طرف راجع ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان کافروں کو اپنے سے دوچند دیکھتے تھے یعنی کافر مسلمانوں کی نظر میں چھ سو چھبیس دکھائی دیے۔ کفار اگرچہ فی الواقع مسلمانوں سے سہ چند تھے مگر مسلمان ان کو اپنے سے صرف دوچند دیکھتے اور سمجھتے تھے کیونکہ بہادر اور جری طبیعتیں اپنے سے دوچند سے مقابلہ کرنے کو معمولی بات سمجھتے ہیں لیکن دوچند سے زیادہ کا مقابلہ باعث تشویش اور پریشانی ہوتا ہے۔ چوتھا قول اور یہ درحقیقت قول نہیں بلکہ محض احتمال ہے وہ یہ کہ "یَرَوْنَ" کی ضمیر فاعل مسلمانوں کی طرف راجع ہو اور "ھُمْ" اور ﴿مِّثْلَیْھِمْ﴾ کی دونوں ضمیریں کافروں کی طرف راجع ہوں اور معنی یہ ہوں کہ مسلمان، کافروں کو کافروں سے دوچند دیکھتے تھے یعنی کافر مسلمانوں کو تقریباً دو ہزار دکھائی دیتے تھے اور اس قول کا کوئی قائل نہیں محض احتمال عقلی ہے غیر معقول بھی ہے اس لیے کہ جب مسلمان، کافروں کو دو ہزار کی تعداد میں دیکھیں گے تو طبعی طور پر مرعوب ہو جائیں گے تفصیل کے لیے تفسیر کبیر کی مراجعت کریں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ

فریفتہ کیا ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے جیسے عورتیں ف۱ اور بیٹے اور خزانے جمع کیے ہوئے

رجھایا ہے لوگوں کو مزوں کی محبت پر، عورتیں، اور بیٹے، اور ڈھیر جوڑے ہوئے

ف۱ یعنی جب ان میں پھنس کر آدمی خدا سے غافل ہو جائے۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا۔ "ماترکت بعدی فتنۃ اَضَرَّ عَلَی الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ" (میرے بعد مردوں کے لئے کوئی ضرر رساں فتنہ عورتوں سے بڑھ کر نہیں) ہاں اگر عورت سے مقصود اعفاف اور کثرت اولاد ہو، تو وہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب و مندوب ہے۔ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا کی بہترین متاع نیک بیوی ہے کہ اگر اس کی طرف دیکھے تو خوش ہو، حکم دے تو فرمانبردار پائے، کہیں غائب ہو تو پیٹھ پیچھے شوہر کے مال اور اپنی عصمت کے معاملہ میں اس کی حفاظت کرے۔ اسی طرح جتنی چیزیں آگے متاع دنیا کے سلسلہ میں بیان ہوئیں سب کا محمود و مذموم ہونا نیت اور طریق کار کے تفاوت سے متفاوت ہوتا رہے گا۔ مگر چونکہ دنیا میں کثرت ایسے افراد کی ہے جو عیش و عشرت کے سامانوں میں پھنس کر خدا تعالیٰ کو اور اپنے انجام کو بھول جاتے ہیں، اس لئے زُیِّنَ لِلنَّاسِ میں سطح کلام کی عام رکھی گئی ہے۔

الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ

سونے اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے ف۱ اور مویشی اور کھیتی یہ فائدہ اٹھانا ہے دنیا کی زندگی میں

سونے کے، اور روپے کے، اور گھوڑے پلے ہوئے، اور مواشی اور کھیتی۔ یہ برتنا ہے دنیا کی

الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ ﴿١٤﴾

اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانا ف۲

زندگی میں، اور اللہ جو ہے اسی پاس ہے اچھا ٹھکانا۔

بیان حقارت لذات دنیویہ

قَالَ تَعَالیٰ: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ... الی... وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں کافروں کا حال بیان فرمایا کہ وہ مال دولت کے نشہ میں چور ہیں اس لیے حق کو قبول نہیں کرتے اب ان آیات میں دنیوی لذات کا ہیچ اور فانی ہونا بیان کرتے ہیں کہ یہ تمام عیش وعشرت کے سامان محض چند روزہ ہیں اور عالم جاودانی کے مقابلہ میں بمنزلہ خواب کے ہیں پھر اس کے بعد آئندہ آیات میں حق تعالیٰ نے آخرت کی عظیم الشان اور جلیل القدر نعمتوں کو ذکر فرمایا جو آخرت میں اہل ایمان اور اہل تقوی کو عنایت ہوں گی۔

ان تمام آیات میں وفد نجران کی طرف اشارہ ہے کہ مال وجاہ کی محبت نے حق کے اتباع سے باز رکھا اور نصاریٰ کا سب سے بڑا عالم، ابو حارثہ، باوجود اعتراف اور اقرار کے اسی مال ودولت کی بدولت، ایمان وہدایت کی لازوال دولت سے محروم رہا۔

اور پھر لطف یہ ہے کہ ان آیات میں لذات کے اصول اور شہوات کے انواع اور اقسام کو بیان فرمایا کہ جن پر تمام دنیا کے تمتع اور فوائد کا دارومدار ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ آراستہ اور خوشنما کر دی گئی ہے عام طور پر لوگوں کے لیے محبت، خواہشوں اور نفس کی آرزوؤں کی لوگ شہوات اور نفسانی خواہشات پر اتنے فریفتہ ہوئے کہ ان کا عیب اور نقصان بھی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا ان شہوات کی ظاہری زیب وزینت تو نظر آتی ہے اور باطنی قبح ان کا نظر نہیں آتا اسی وجہ سے کبھی ان سے کنارہ کشی کا خیال بھی دل میں نہیں آتا بے شک شہوات کی محبت آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے۔ البتہ ① جو اولی الابصار ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے دل کی بینائی عطا کی ہے وہ شہوات اور خواہشات کے پیچھے اندھے نہیں بن جاتے۔ نفس کے مقابلہ میں عقل کا اتباع کرتے ہیں اور اپنی ابصار کو نابینا ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں اور دنیا کے ساز وسامان پر مفتون اور فریفتہ نہیں ہو جاتے

ف۱ یعنی جن پر نمبر یا نشان لگائے جائیں یا پانچ کلیاں گھوڑے جن کے ہاتھ پاؤں اور پیشانی پر قدرتی نشان ہوتے ہیں یا جو گھوڑے چراگاہ میں چرنے کے لئے چھوڑے گئے ہوں۔

ف۲ یعنی ابدی فلاح ان چیزوں سے حاصل نہیں ہوتی محض دنیا میں چند روز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کامیاب مستقبل اور اچھا ٹھکانا چاہتے ہو تو خدا کے پاس ملے گا۔ اس کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کی فکر کرو۔ اگلی آیت میں بتلاتے ہیں کہ وہ اچھا ٹھکانا کیا ہے اور کن لوگوں کو ملتا ہے۔

① اس عبارت سے ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ کا گزشتہ آیت ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ﴾ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ۔

بلکہ ان سے عبرت پکڑتے ہیں گزشتہ آیت یعنی ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ﴾ میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر تھا اب اس کے بعد ان شہوات اور خواہشات کے انواع اور اقسام کو ذکر فرماتے ہیں جن کی دھن میں ساری دنیا سرگردان اور حیران ہے یعنی ان شہوات اور خواہشات میں کہ جن میں آدمی پھنس کر خدا سے غافل ہو جاتا ہے ان میں سے سب سے اول عورتیں ہیں کہ دنیاوی لذتوں اور شہوتوں کا منتہی ہیں متاع دنیا میں سے کسی چیز کی محبت۔ عورتوں کی محبت کو نہیں پہنچتی اسی وجہ سے حدیث میں ہے "ماترکت ① بعدی فتنہ اضر علی الرجال من النسا"۔

حضور ﷺ نے فرمایا میرے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں جو مردوں کے لیے ضرر رساں ہو۔

اور دوسرے درجہ میں بیٹوں کی محبت اور تیسرے درجہ میں سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانوں کی محبت ہے کہ جو تمام خواہشوں اور لذتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور چوتھے درجہ میں خوبصورت اور فربہ گھوڑوں کی محبت ہے جو سفر اور سیر و تفریح کا ذریعہ ہیں اور ظاہری شان و شوکت اور عزت و وجاہت اور فخر و مباہات کا سبب ہیں اور پانچویں درجہ میں چوپاؤں اور مویشی کی محبت ہے یعنی اونٹ اور گائے اور بیل اور بھیڑ اور بکری کی محبت ہے جو انسان کا ذریعہ معاش ہیں گوشت اور دودھ کی غذا انہیں سے مہیا ہوتی ہے اور اون اور کھال اور چمڑا بھی انہیں چوپاؤں سے حاصل ہوتا ہے جس سے کمبل اور جوتے وغیرہ بنتے ہیں چھٹے درجہ میں کھیتی کی محبت ہے جس پر انسان کی حیات کا دارومدار ہے۔ زراعت اگرچہ ضرورت کے لحاظ سے سب سے اول ہے لیکن شہوت اور لذت کے لحاظ سے سب سے آخر ہے۔ اس لیے اس کو سب سے آخر میں ذکر فرمایا۔ شہوات کی یہ انواع ستہ جو بیان ہوئیں بس یہی چند روزہ دنیاوی زندگانی کا کل سامان ہے۔ جس کا تمتع اور انتفاع عنقریب ختم ہو جائے گا اور اللہ کے نزدیک نہایت عمدہ ٹھکانہ ہے جس کی لذت اور نفاست کی کوئی حد نہیں اور اس کی بقاء اور دوام کی کوئی انتہا نہیں عاقل کا کام یہ ہے کہ اپنی تمام ترہمت اور توجہ اس متاع آخرت کے حصول میں لگا دے اور چند روزہ متاع کے پیچھے لگ کر حقیقی اور دائمی متاع سے غافل نہ ہو جائے۔

لطائف و معارف

۱۔ شہوات۔ شہوت کی جمع ہے جس کے معنی خواہش اور رغبت کے ہیں لیکن اس جگہ شہوات سے مراد خواہش اور رغبت کی چیزیں ہیں محض خواہش اور رغبت مراد نہیں اس لیے کہ محبوب اور مزین حقیقۃً وہ مرغوبات اور مشتہیات ہیں۔ خود شہوت اور رغبت محبوب اور مزین نہیں لیکن اللہ جل شانہ نے توبیخ اور ملامت میں مبالغہ کرنے کے لیے قابل شہوت اور قابل رغبت چیزوں کو شہوات سے تعبیر فرمایا کہ تم ان اشیاء کی محبت میں اس درجہ مستغرق ہو گئے ہو کہ ان شہوات اور خواہشات کی محبت ہی تمہاری نظروں میں محبوب اور مزین بن گئی ہے اور بجائے اشیائے مرغوبہ کے ان کی رغبت ہی تمہاری مرغوب خاطر ہو گئی اور قابل اشتہاء چیزوں کی شہوت کی محبت ہی تمہاری محبوب اور مطلوب بن گئی ہے یہ عشق کا آخری درجہ ہے کہ محبوب کی محبت خود مستقل محبوب بن جائے اسی طرح قابل شہوت چیزوں کی شہوت کا محبوب بن جانا یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ شخص لذات اور شہوات کے عشق میں آخری درجہ پر پہنچ چکا ہے اور اس کی نظیر قرآن کریم میں یہ ہے ﴿اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ﴾ اور حدیث میں

① یہ ترجمہ من النساء الخ میں سے لفظ "مِنْ" کا ہے اشارہ اس طرف ہے کہ یہ مِنْ بیانیہ ہے۔

یہ ہے: "اللھم انی اسالك حبك وحب من یحبك وحب عمل یقرب الی حبك۔" نیز خواہش اور رغبت کی چیزوں کو شہوات سے تعبیر کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ ان اشیاء سے نفرت دلانا مقصود ہے اس لیے شہوات کا مفہوم ہی خست اور ذلت پر دلالت کرتا ہے اور شہوتوں کا اتباع بہائم کا کام ہے۔

۲-خیل مسومہ کے معنی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں بعض کہتے ہیں کہ خیل مسومہ سے وہ گھوڑے مراد ہیں جن پر نمبر یا نشان لگا ہوا ہو۔ مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مسومہ کے معنی موٹے تازے خوبصورت گھوڑے کے ہیں سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسومہ سے چرنے والے گھوڑے مراد ہیں یعنی جو گھوڑے چراگاہ میں چرنے کے لیے چھوڑ دیئے گئے ہوں اسی لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ علاوہ سواری کے جو گھوڑے چراگاہ میں چرتے ہوں ان پر زکوٰۃ ہے جیسے انعام (چرنے والے) مویشی میں زکوٰۃ ہے اسی طرح خیل سائمہ چرنے والے گھوڑوں میں بھی زکوٰۃ ہے تفصیل کے لیے بخاری شریف اور ہدایہ کی شروح کو دیکھا جائے۔

۳-ذہب ذہاب سے مشتق ہے جس کے معنی زوال اور فناء کے ہیں اور فضہ انفضاض سے مشتق ہے جس کے معنی تفرق اور جدا ہونے کے ہیں ان دونوں لفظوں کا اشتقاق ہی ان کے فناء اور زوال کی خبر دیتا ہے اس لیے آیت کو ﴿ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ پر ختم فرمایا یعنی یہ ساری چیزیں محض چندروزہ نفع کی ہیں اور کسی نے کیا خوب کہا ہے:

النار آخر دینار نطقت بہ والھم آخر ھذا الدرھم الجاری
والمرء بینھما ان کان ذا ورع معذب القلب بین الھم والنار

قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ

کہہ دے کیا بتاؤں میں تم کو اس سے بہتر پرہیزگاروں کے لئے اپنے رب کے ہاں باغ ہیں جن کے نیچے

تو کہہ، میں بتاؤں تم کو اس سے بہتر؟ پرہیزگاروں کو اپنے رب کے ہاں باغ ہیں جن کے نیچے

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ

جاری ہیں نہریں ہمیشہ رہیں گے ان میں اور عورتیں ہیں ستھری ف ۱ اور رضامندی اللہ کی ف ۲ اور اللہ کی نگاہ میں ہیں

بہتی ہیں ندیاں، رہ پڑے انہیں میں، اور عورتیں ہیں ستھری، اور رضامندی اللہ کی۔ اور اللہ کی نگاہ میں ہیں

بِالْعِبَادِ ۚ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ

بندے ف ۳ وہ جو کہتے ہیں اے رب ہمارے ہم ایمان لائے ہیں سو بخش دے ہم کو گناہ ہمارے اور بچا ہم کو دوزخ کے

بندے۔ وہ جو کہتے ہیں، اے رب ہمارے! ہم یقین لائے ہیں، سو بخش ہم کو گناہ ہمارے اور بچا ہم کو دوزخ کے

ف ۱ یعنی ہر قسم کی صوری و معنوی گندگی سے پاک وصاف ہوں گی۔
ف ۲ کہ اس سے بڑھ کر کیا نعمت ہو سکتی ہے بلکہ جنت بھی فی الحقیقت اس لئے مطلوب ہے کہ وہ محل رضا ہے۔
ف ۳ بندوں کے تمام اعمال واحوال اس کے سامنے ہیں جو جس جزاء وسزا کا مستحق ہوگا۔ بلاکم وکاست دی جائے گی۔ دنیا کی بہار، مرنے والے اور اس کے فانی=

النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ

عذاب سے ف۱ وہ صبر کرنے والے ہیں اور سچے اور حکم بجا لانے والے اور خرچ کرنے والے اور گناہ بخشوانے والے

عذاب سے۔ وہ محنت اٹھانے والے اور سچے۔ اور بندگی میں لگے رہتے اور خرچ کرتے اور گناہ بخشواتے،

بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

پچھلی رات میں ف۲

پچھلی رات کو۔

بیان نفاست نعمائے اخرویہ و مستحقین آنہا

قال تعالیٰ: ﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ... الی ... وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں لذات دنیویہ کی حقارت اور خساست کو بیان فرمایا اب ان آیات میں اخروی نعمتوں کی نفاست کو بیان فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ ان نفیس اور لازوال نعمتوں کے اہل اور مستحق کون لوگ ہیں۔

نیز گزشتہ آیت میں یہ بتلایا تھا کہ دنیا کے سامان سے فقط دنیا کی چند روزہ زندگی میں نفع اٹھایا جاسکتا ہے اب آئندہ آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ مستقل اور پائیدار فائدہ اور دائمی فلاح کے حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے نبی کریم ﷺ آپ ان لوگوں سے جو شہوات اور لذات کی محبت میں گرفتار ہیں یہ کہہ دیجئے کہ آؤ میں تم کو اس چیز کی خبر دوں جو اس متاع دنیا اور اس کی تمام شہوات اور لذات سے کہیں بہتر اور برتر ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ متقی اور پرہیزگار ہیں اور اپنے آپ کو شہوات اور لذات کی محبت اور پیروی سے بچا کر چلتے ہیں جیسے اہل صفہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے حضرات صوفیہ ایسے لوگوں کے لیے ان کے پروردگار کے نزدیک عجیب عجیب قسم کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ لوگ ان باغات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے داخل ہونے کے بعد کبھی بھی ان سے نہیں نکلیں گے اور ان کے لیے ایسی بیبیاں ہوں گی جو ظاہر اور باطن اور صورت و سیرت ہر اعتبار سے صاف اور ستھری ہوں گی اور ظاہری اور باطنی گندگی سے بالکل پاک ہوں گی اور ان سب نعمتوں سے بڑھ کر ان کو یہ نعمت ملے گی کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو رضامندی اور خوشنودی

= مزوں سے پرہیز کرنے والے سب اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیئے جائیں گے۔ یا یہ مطلب لیا جائے کہ پرہیزگار بندوں پر خدا کی نگاہ لطف و کرم ہے جو دنیا کی ابلہ فریب سحر کاریوں سے ان کو محفوظ رکھتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آپ نے فرمایا کہ جب خدا کسی بندہ کو محبوب رکھتا ہے تو اسی طرح دنیا سے اس کا پرہیز کرا دیتا ہے جیسے تم اپنے مریض کو پانی (وغیرہ) سے پرہیز کراتے ہو۔

ف۱ معلوم ہوا کہ گناہ معاف ہونے کے لئے ایمان لانا شرط ہے۔

ف۲ یعنی اللہ کے راستہ میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر بھی اس کی فرمانبرداری پر جمے رہتے اور معصیت سے رکے رہتے ہیں۔ زبان کے، دل کے، نیت کے معاملہ کے سچے ہیں۔ پوری تسلیم و انقیاد کے ساتھ خدا کے احکام بجالاتے ہیں۔ خدا کی دی ہوئی دولت کو اس کے بتلائے ہوئے مواقع میں خرچ کرتے ہیں۔ اور پچھلی رات میں اٹھ کر (جو طمانیت و اجابت کا وقت ہوتا ہے لیکن اٹھنا اس وقت سہل نہیں ہوتا) اپنے رب سے گناہ اور تقصیرات معاف کراتے ہیں۔ ﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ یعنی اکثر رات عبادت میں گزارتے اور سحر کے وقت استغفار کرتے کہ خداوندا! عبادت میں جو تقصیر رہ گئی اپنے فضل سے معاف فرمانا۔

کا پروانہ عطا ہوگا۔ اور جنت ہی فی الحقیقت اسی وجہ سے مطلوب ہے وہ رضاء خداوندی کا محل ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے خاص بندوں پر خاص نظر عنایت ہے۔

نکتہ:...... اس آیت میں "جَنّٰتٌ" (یعنی باغات) کا ذکر ان تمام شہوات اور خواہشات کے مقابلہ میں ہے جن کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے جنت کے متعلق ارشاد خداوندی ہے ﴿وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ﴾ یعنی جنت میں نفس کی تمام خواہش پوری ہوں گی اس آیت میں "من النساء" کے مقابلہ میں ازواج مطہرات کو ذکر فرمایا کہ جو حسن و جمال میں آفتاب اور ماہتاب سے بھی بڑھ کر ہوں گی اور حیض ونفاس وغیرہ کی آلائشوں سے بالکل پاک وصاف ہوں گی۔ اور جنت میں بنین یعنی بیٹے اور سب رشتہ دار بھی جمع ہوں گے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُم مِّنْ عَمَلِهِم مِّن شَيْءٍ﴾ رہے قناطیر مقنطرہ سو جنت کے مکانات سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنے ہوئے ہوں گے اور وہاں ایک اینٹ سونے کی ہوگی اور ایک چاندی کی اور گارہ مشک کا ہوگا اور جنت کے برتن اور اس کا سامان بھی سونے اور چاندی کا ہوگا اور موتیوں کے خیمے ہوں گے اور سواری کے لیے حقیقۃً برق رفتار گھوڑے ہوں گے اور لید اور پیشاب سے پاک ہوں گے اور جنت میں انعام اور حرث بھی ہوں گے غرض یہ کہ اس آیت میں جنت کا ذکر ان تمام شہوات اور متاع الحیوۃ اور دنیا کے مقابلہ میں ہے جن کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔

خلاصہ کلام:...... یہ کہ اہل ایمان کو آخرت میں یہ چیزیں ملیں گی۔ ۱-اپنے مالک خداوند کریم کا قرب نصیب ہوگا۔ ۲-رہنے کے لیے باغات ہوں گے۔ ۳-ہر دم ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ۴-ایسی بیویاں ملیں گی جو ظاہری اور باطنی آلائشوں سے پاک ہوں گی۔ ۵-سب سے اعلیٰ اور عمدہ یہ نعمت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ ان سے راضی ہو جائے گا بھلا کہاں یہ نعمتیں اور لذتیں اور کہاں وہ دنیوی آلائشیں۔

صفات متقین

اور جن عباد متقین کے لیے حق تعالیٰ نے سابق الذکر نعمتوں کا وعدہ فرمایا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو خاص طور پر یہ دعا ضرور مانگتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار۔ ہم دل وجان سے ایمان لا چکے ہیں۔ ہمارے پاس اگر ایمان کے سوا کوئی بھی عمل صالح نہ ہو تو تیری بارگاہ میں تنہا ایمان ہی مغفرت کا سبب بن سکتا ہے پس تو اپنی رحمت سے فقط ایمان ہی کو کافی قرار دے کر ہمارے تمام گناہوں کو بخش دے اور دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچالے اور یہ متقی لوگ بڑے صبر کرنے والے ہیں خدا کی راہ میں شدائد اور مصائب کا تحمل کرنے والے ہیں اور شہوات اور خواہشات سے مغلوب ہونے والے نہیں اور سچے اور راست باز ہیں اپنے اقوال اور افعال اور احوال اور نیتوں اور ارادوں سب میں سچے ہیں اور خشوع اور خضوع پر قائم رہنے والے ہیں اور خشوع اور خضوع ہی تمام عبادتوں کی روح ہے یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبودیت پر بالدوام قائم ہیں۔

ف ا:...... قنوت کے معنی خشوع اور خضوع کے بھی آتے ہیں اور اطاعت پر قائم ودائم رہنے کے آتے ہیں۔ آیت میں دونوں معنی بن سکتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی دولت کو خدا کے حکم کے مطابق خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلی رات میں

اٹھ کر استغفار کرنے والے ہیں یعنی باوجود اس اطاعت شعاری اور فرمانبرداری کے اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں سے سحر میں دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ اپنے فضل سے ہم کو معاف فرما۔

ف ۲:...... اخیر شب کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ اخیر شب کی نیند نفس کے لیے غایت درجہ لذیذ ہے ایسے وقت میں اٹھ کر دعا مانگنا شہوات نفس کا پورا مقابلہ کرنا ہے جو کمال ایمان کی دلیل ہے۔ نیز یہ وقت دعا کی قبولیت کا بھی ہے اور خدائے ذوالجلال کی بے چون وچگون اور بے مثال نزول اجلال کا وقت ہے یہ وقت دعا کے لیے غنیمتِ کبری ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ

اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا ف۱ اور فرشتوں نے ف۲ اور علم والوں نے بھی ف۳ وہی حاکم انصاف کا ہے کسی کی بندگی نہیں

اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اور فرشتوں نے، اور علم والوں نے، وہی حاکم انصاف کا۔ کسی کو بندگی نہیں

اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٨﴾

سوا اس کے زبردست حکمت والا ف۴

سوا اس کے، زبردست ہے، حکمت والا۔

رجوع بسوئے مضمون توحید

قال تعالیٰ: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ... الی ... هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

ربط:...... ابتداء سورت میں نصارائے نجران سے خطاب تھا جس میں توحید کا اثبات اور الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال تھا درمیان میں اور مناسب مضامین کا ذکر فرمایا اب پھر اصل مضمون توحید کی طرف رجوع فرماتے ہیں کہ جو اصل ایمان ہے کیونکہ توحید کی

ف۱ ابتداء میں نصاریٰ "نجران" سے خطاب تھا اور نہایت لطیف انداز سے الوہیت مسیح کے عقیدہ کا ابطال اور توحید خالص کا اعلان کر کے ایمان لانے کی ترغیب دی گئی تھی۔ درمیان میں ان موانع کا ذکر فرمایا جو انسان کو وضوح حق کے باوجود شرف ایمان سے محروم رکھتے ہیں یعنی مال واولاد اور سامان عیش وعشرت۔ ان آیات میں مومنین کی صفات بیان کرنے کے بعد پھر اصل مضمون توحید وغیرہ کی طرف عود کیا گیا ہے۔ یعنی توحید خالص کے ماننے میں کیا تردد ہو سکتا ہے۔ جبکہ خود حق تعالیٰ اپنی تمام کتابوں میں برابر اس مضمون کی گواہی دیتا رہا ہے۔ اور اس کی فعلی کتاب (صحیفۂ کائنات) کا ایک ایک ورق بلکہ ایک ایک نقطہ شہادت دیتا ہے کہ بندگی کے لائق رب العالمین کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهٗ اٰيَةٌ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ وَاحِدٌ ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾

ف۲ ظاہر ہے فرشتوں کی گواہی خدا کی گواہی کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے۔ فرشتہ تو نام ہی اس مخلوق کا ہے جو صدق وحق کے راستہ سے سرتابی نہ کر سکے۔ چنانچہ فرشتوں کی تسبیح وتحمید تمام تر توحید وتفرید باری پر مشتمل ہے۔

ف۳ علم والے ہر زمانہ میں توحید کی شہادت دیتے رہے ہیں اور آج تو عام طور پر توحید کے خلاف ایک لفظ کہنا جہل محض کا مترادف سمجھا جاتا ہے، مشرکین بھی دل میں مانتے ہیں کہ علمی اصول کبھی مشرکانہ عقائد کی تائید نہیں کر سکتے۔

ف۴ انصاف کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، زبردست ہو کہ اس کے فیصلہ سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔ اور حکیم ہو کہ حکمت ودانائی سے پوری طرح جانچ تول کر ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرے کوئی حکم بے موقع نہ دے۔ چونکہ حق تعالیٰ عزیز وحکیم ہے لہٰذا اس کے منصف علی الاطلاق ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ غالباً اس لفظ "قائما بالقسط" میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ کا بھی رد ہو گیا۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہو گا کہ ساری دنیا کے جرائم ایک شخص پر لاد دیئے جائیں اور وہ تنہا سزا پا کر سب مجرموں کو ہمیشہ کے لئے بری اور پاک کر دے۔ خدائے عادل وحکیم کی بارگاہ ایسی گستاخیوں سے کہیں بالا وبرتر ہے۔

شہادت ایمان کی اصل الاصول ہے اور توحید ہی پر خدا تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا دارومدار ہے گواہی دی اللہ تعالیٰ نے کہ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام کتابوں اور صحیفوں میں برابر اس مضمون کی گواہی دیتا رہا اور صحیفۂ کائنات کا ایک ایک ورق اس کی توحید کی شہادت دے رہا ہے۔

وفی کل شئی له شاهد یدل علی انه واحد

ہر گیا ہے کہ از زمین روید وحدہ لاشریک له گوید

اور فرشتوں نے بھی اس کی گواہی دی فرشتوں کی کوئی تسبیح اور تحمید اللہ کی توحید کے ذکر سے خالی نہیں اور علم والوں نے بھی ہر زمانہ میں توحید کی گواہی دی۔ علماء ہمیشہ دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے توحید کو ثابت کرتے رہے اور شرک کو باطل کرتے رہے یہاں تک کہ توحید کا مسئلہ اس درجہ واضح ہوگیا کہ مشرکین بھی اپنے کو مشرک کہنے سے عار کرنے لگے اور وہ معبود بھی اس شان کا ہے کہ ہر تدبیر کو انصاف اور اعتدال کے ساتھ قائم رکھنے والا ہے اس کی کوئی تدبیر عدل وانصاف سے باہر نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ مالک مطلق ہے اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے ظلم وہ ہے جو دوسرے کی ملک میں تصرف ہو اللہ تعالیٰ کی ہر تدبیر کا عین عدل اور عین حکمت ہونا یہ بھی اس کی توحید کی ایک مستقل دلیل ہے چنانچہ فرماتے ہیں اللہ کے سوا کوئی لائق بندگی نہیں اس لیے کہ الٰہ یعنی معبود کے لیے عزت اور حکمت کا ہونا ضروری ہے اور وہی عزت والا ہے اور وہی حکمت والا ہے اس کی عزت اور غلبہ کا یہ عالم ہے کہ کوئی اس کے عدل اور تدبیر کو توڑ نہیں سکتا اور حکمت کا یہ عالم ہے کہ اس کی کوئی شے مقتضائے حکمت کے خلاف نہیں۔

نکتہ: ...... عجب نہیں کہ لفظ ﴿قَآىِٕمًاۢ بِالْقِسْطِ﴾ میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ کے ابطال کی طرف اشارہ ہو کہ یہ کون سا عدل اور انصاف ہے کہ ساری دنیا کے جرائم تنہا ایک شخص پر لاد دیے جائیں اور پھر اس ایک شخص کو بے قصور پھانسی پر لٹکا دیا جائے تاکہ وہ معصوم شخص سارے گناہ گاروں کے لیے کفارہ بن جائے خدائے عادل قدوس اس قسم کی گستاخیوں سے پاک اور منزہ ہے۔ ﴿سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ﴾

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ

بیشک دین جو ہے اللہ کے ہاں سو یہی مسلمانی حکم برداری ف۱ اور مخالف نہیں ہوئے کتاب والے مگر جب

دین جو ہے اللہ کے ہاں، سو یہی مسلمانی حکم برداری۔ اور مخالف نہیں ہوئے کتاب والے، مگر جب

ف۱ "اسلام" کے اصلی معنی سونپ دینے کے ہیں۔ "مذہب اسلام" کو بھی اسی لحاظ سے اسلام کہا جاتا ہے کہ ایک مسلم اپنے کو ہمہ تن خدائے واحد کے سپرد کر دینے اور اس کے احکام کے سامنے گردن ڈال دینے کا اقرار کرتا ہے۔ گویا "اسلام" انقیاد وتسلیم کا اور "مسلمانی" حکمبرداری کا دوسرا نام ہوا۔ یوں تو شروع سے اخیر تک تمام پیغمبر یہی مذہب اسلام لے کے آئے اور اپنے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی قوم کو مناسب وقت احکام پہنچا کر طاعت وفرمانبرداری اور خالص خدائے واحد کی پرستش کی طرف بلاتے رہے ہیں لیکن اس سلسلہ میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام دنیا کو جو اکمل، جامع ترین، عالمگیر اور ناقابل تنسیخ ہدایات دیں، وہ تمام شرائع سابقہ حقہ پر مع شی زائد مشتمل ہونے کی وجہ سے خصوصی رنگ میں اسلام کے نام سے موسوم وملقب ہوئیں۔ بہرحال اس آیت میں نصاریٰ نجران کے سامنے خصوصاً اور تمام اقوام وملل کے سامنے عموماً اعلان کیا گیا ہے کہ دین ومذہب صرف ایک ہی چیز کا نام ہوسکتا ہے وہ یہ کہ بندہ دل وجان سے اپنے کو خداوند قدوس کے سپرد کر دے اور جس وقت جو حکم اس کی طرف سے پائے، بے چون وچرا گردن تسلیم جھکا دے اب جو لوگ خدا کے بیٹے، =

بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ

ان کو معلوم ہو چکا آپس کی ضد اور حسد سے ف۱ اور جو کوئی انکار کرے اللہ کے حکموں کا تو اللہ جلدی

ان کو معلوم ہو چکا آپس کی ضد سے۔ اور جو کوئی منکر ہو اللہ کے حکموں سے، تو اللہ شتاب

الْحِسَابِ ⑲ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ

حساب لینے والا ہے ف۲ پھر بھی اگر تجھ سے جھگڑیں تو کہہ دے میں نے تابع کیا اپنا منہ اللہ کے حکم پر اور انہوں نے بھی کہ جو میرے ساتھ ہیں ف۳ اور کہہ دے

لینے والا ہے حساب۔ پھر جو تجھ سے جھگڑیں تو کہہ، میں نے تابع کیا اپنا منہ اللہ کے حکموں پر، اور جو کوئی میرے ساتھ ہے۔ اور کہہ دے

اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۗ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا

کتاب والوں کو اور ان پڑھوں کو کہ تم بھی تابع ہوتے ہو پھر اگر وہ تابع ہوئے تو انہوں نے پائی راہ سیدھی اور اگر منہ پھیریں تو

کتاب والوں کو، اور ان پڑھوں کو کہ تم بھی تابع ہوتے ہو؟ پھر اگر تابع ہوئے تو راہ پر آئے۔ اور اگر ہٹ رہے تو

= پوتے تجویز کریں، مسیح و مریم کی تصویروں اور صلیب کی لکڑی کو پوجیں، خنزیر کھائیں، آدمی کو خدا یا خدا کو آدمی بنا دیں۔ انبیاء و اولیاء کو قتل کر ڈالنا معمولی بات سمجھیں، دین حق کو مٹانے کی ناپاک کوششوں میں لگے رہیں۔ موسیٰ و مسیح کی بشارات کے موافق جو پیغمبر ان دونوں سے بڑھ کر شان و نشان دکھلاتا ہوا آیا، جان بوجھ کر اس کی تکذیب اور اس کے لائے ہوئے کلام و احکام سے ٹھٹھا کریں، یا جو بیوقوف پتھروں، درختوں، ستاروں اور چاند سورج کے آگے سجدہ کریں اور حلال و حرام کا معیار محض ہوائے نفس کو ٹھہرالیں، کیا ان میں کوئی جماعت اس لائق ہے کہ اپنے کو مسلم اور ملت ابراہیمی کا پیرو کہہ سکے۔ العیاذ باللہ۔ " وفی روایة محمد بن اسحاق فقال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اسلموا۔ فقالوا قد اسلمنا۔ فقال (صلی اللہ علیہ وسلم) کذبتم کیف یصح اسلامکم وانتم تثبتون للہ ولدًا وتعبدون الصلیب وتاکلون الخنزیر (تفسیر کبیر)۔

ف۱ یعنی اسلام ایک واضح اور روشن چیز ہے جس قسم کے دلائل سے موسیٰ و مسیح کی رسالت یا تورات و انجیل کا کتاب سماوی ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے، اس سے بہتر، مضبوط اور زندہ دلائل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے موجود ہیں۔ بلکہ خود وہ کتابیں آپ کی حقانیت کی شہادت دے رہی ہیں۔ توحید خالص ایک صاف مضمون ہے جس کے خلاف باپ بیٹے کا نظریہ محض ایک بے معنی چیستاں ہو کر رہ جاتی ہے، جس کی کوئی علمی اصول تائید نہیں کرتا، اب جو اہل کتاب مخالف اسلام ہو کر ان روشن حقائق کو جھٹلائیں اور حق تعالیٰ کی طرف تکبر داری سے سرتابی کریں بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ محض ضد، حسد، عناد اور جاہ و مال کی حرص میں ایسا کر رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ﴾ کے فوائد میں خود ابو حارثہ بن علقمہ رئیس وفد نجران کا اقرار و اعتراف نقل کیا جا چکا ہے اور یہ ان لوگوں کی قدیم عادت ہے۔ یہود و نصاریٰ کے باہم جو اختلافات ہوئے یا ہر ایک مذہب میں جو بہت سے فرقے بنے، پھر مخالفت باہمی خوفناک محاربات اور خونریزیوں پر منتہی ہوئی۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ اس کا منشاء عموماً غلط فہمی یا جہل نہ تھا، بلکہ اکثر حالات میں محض سیم و زر کی محبت اور جاہ پرستی سے یہ فرقہ وارانہ اختلافات پیدا ہوئے۔

ف۲ دنیا میں بھی ورنہ آخرت میں تو ضرور ہے۔

ف۳ جیسا کہ دو فوائد پہلے نقل کیے جا چکے۔ وہ جھگڑتے تھے کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ یہاں ان کو بتلایا گیا کہ ایسا (فرضی) اسلام کس کام کا۔ آؤ دیکھو، اسلام اسے کہتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثار ساتھیوں کے پاس ہے۔ ابھی بیان ہو چکا کہ اسلام نام ہے تسلیم و انقیاد کا یعنی بندہ ہمہ تن اپنے کو خدا کے ہاتھ میں دیدے سو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین و انصار کو دیکھو کس طرح انہوں نے شرک، بت پرستی، بد اخلاقی، فسق و فجور اور ظلم و عدوان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان، مال، وطن، کنبہ، بیوی بچے، غرض تمام مرغوب و محبوب چیزیں حق تعالیٰ کی خوشنودی پر نثار کر دیں اور کس طرح ان کا چہرہ اور آنکھیں ہر وقت حکم الٰہی کی طرف لگی رہتی ہیں کہ ادھر سے حکم آئے اور ہم تعمیل کریں۔ اس کے بالمقابل تم اپنا حال دیکھو کہ خود اپنی خلوتوں میں اقرار کرتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہیں، مگر ان پر ایمان لائیں تو دنیا کا مال و جاہ چھنتا ہے۔ بہرحال باوجود وضوح حق کے اسلام کی طرف نہیں آتے تم جانو، ہم تو اپنے کو ایک خدا کے سپرد کر چکے ہیں۔

ع ۱۰

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

تیرے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے ف۱

تیرا ذمہ یہی ہے پہنچا دینا۔ اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے۔

بیان حقانیت اسلام وجواب مجادلہ مخالفین اسلام

قال تعالیٰ: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ... الی ... وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیت میں توحید کی شہادت کو ذکر فرمایا جو اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اب اس آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ دین صرف دین اسلام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں تحقیق وہ دین کہ جو اللہ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہے وہ صرف اسلام ہے۔ نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ اس لیے کہ اسلام کے معنی اپنے آپ کو ایک خدا کے حوالہ اور سپرد کر دینے کے ہیں اور مسلم اور مسلمان اس بندہ کو کہتے ہیں کہ جس نے ہمہ تن اپنے آپ کو خدائے واحد کے سپرد کر دیا ہو اور اس کے احکام کے سامنے گردن ڈال دی ہو اور بالفاظ دیگر اسلام، نام اطاعت اور فرمانبرداری کا ہے اور مسلم اس بندہ کا نام ہے کہ جو خدائے واحد کا فرمانبردار اور اطاعت شعار ہو شروع سے لے کر اخیر تک تمام انبیاء کرام کا یہی دین رہا ہے کہ ایک خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے پس جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور مسیح اور مریم علیہا السلام کی تصویروں کو پوجتے ہیں یا جو بیوقوف درختوں اور پتھروں اور چاند اور سورج اور ستاروں کو پوجتے ہیں ان کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں توحید اور اخلاص و اطاعت کے لحاظ سے تمام انبیاء اور تمام ادیان سماویہ متفق رہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ غرض یہ کہ اسلام اور توحید ایک واضح اور مسلم حقیقت تھی اس میں ذرہ برابر اختلاف کی گنجائش نہ تھی مگر شہوات اور لذات کی محبت نے خود غرضوں اور شہوت پرستوں کو اختلاف پر آمادہ کیا کوئی حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا قائل ہوا اور کوئی ان کی ابنیت اور فرزندیت کا قائل ہوا اور کوئی حلول کا قائل ہوا کہ معاذ اللہ خداوند قدوس حضرت مسیح علیہ السلام میں حلول کر آیا ہے اور کوئی اتحاد کا قائل ہوا کہ خدا تعالیٰ اور مسیح بن مریم علیہ السلام ایک ہیں اور اہل کتاب نے اس بارہ میں لاعلمی کی بناء پر اختلاف نہیں کیا مگر صحیح علم آنے کے بعد جان بوجھ کر اختلاف کیا اہل کتاب کو اس بات کا خوب علم تھا کہ اللہ کے نزدیک اسلام ہی پسندیدہ دین ہے کیونکہ توریت اور انجیل میں اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان فرمایا ہے اور یہ ان کا اختلاف اشتباہ اور خفاء کی بناء پر نہ تھا بلکہ محض باہمی حسد اور آپس کی ضد سے تھا۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے محمد بن جعفر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئی ان کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کو کسی نے نہیں جنا اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندہ اور رسول ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو اختلاف ہوا وہ یہودیوں کی عداوت کی بناء پر ہوا۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کی نبوت سے انکار کیا اور حضرت مریم پر تہمت لگائی اس لیے

ف۱ یعنی سوچ لو کیا تم بھی ہماری طرح خدا کے تابعدار بندے بنے ہو یا اب مانتے ہو، ایسا ہو تو سمجھو لو سیدھے راستہ پر لگ گئے اور ہمارے بھائی بن گئے ورنہ ہمارا کام سمجھا دینا اور نشیب و فراز بتلا دینا تھا، وہ کر چکے۔ آگے سب بندے اور ان کے اعمال ظاہری و باطنی خدا کی نظر میں ہیں، وہ ہر ایک کا بھگتان کر دے گا۔ (تنبیہ) ان پڑھ کہتے تھے عرب کے مشرکوں کو کہ ان کے پاس کتب سماویہ کا علم نہ تھا۔

نصاریٰ ضد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابنیت کے قائل ہو گئے کہ معاذ اللہ یہ خدا کے بیٹے ہیں اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس آیت میں اختلاف سے اسلام اور آں حضرت ﷺ کی نبوت میں اختلاف مراد ہے اور جو شخص اللہ کی آیتوں کا انکار یا اللہ کے حکموں سے انحراف کرے اور اسلام اور توحید کو نہ مانے تو خوب سمجھ لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے ان لوگوں سے اس اختلاف پر محاسبہ کرے گا اور سزا دے گا پس جب کہ دلائل اور براہین سے اسلام کی حقانیت واضح ہو گئی اس کے بعد بھی اگر اہل کتاب آپ سے کٹ حجتی اور مخاصمہ کریں اور اس صریح اور واضح امر میں آپ سے جھگڑا کریں تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں نے اور میرے متبعین نے تو اپنا چہرہ خالص اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے اور اسلام اور توحید کی راہ اختیار کر لی ہے یعنی میں نے اور میرے متبعین نے تو انبیاء کرام کا دین اختیار کر لیا ہے پس اگر تم تمام انبیاء کرام کی تعلیم کے برخلاف کسی کو خدا اور خدا کا بیٹا بناتے ہو تو بناؤ میں اور میرے متبعین اس سے بری ہیں اور آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جن کو کتاب دی گئی یعنی یہود اور نصاریٰ سے اور ان پڑھوں سے یعنی مشرکین عرب سے بھی جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ان سب سے یہ کہہ دیجئے کہ کیا تم بھی ہماری طرح اسلام میں داخل ہوتے ہو یا نہیں پس اگر یہ لوگ تمہاری طرح اسلام لے آئیں تو وہ تمہاری طرح ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر تمہاری طرح اسلام لانے سے منہ موڑیں اور الوہیت اور ابنیت مسیح کے عقیدہ پر اڑے رہیں تو آپ کا کوئی نقصان نہیں۔ آپ کے ذمہ فقط حق کا پہنچا دینا اور دلائل اور براہین سے واضح کر دینا ہے سو وہ آپ کر چکے اور اللہ کی نگاہ میں ہیں تمام بندے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

ف: ...... جو شخص دلائل اور براہن کو نہ مانے اور صریح عناد پر اتر آئے تو ایسے شخص کے سامنے بحث کرنا فضول ہے۔ اور ناحق اپنے وقت کا ضائع کرنا ہے اس لیے اتمام حجت کے لیے یہ بات کہہ کر کلام ختم کر دینا مناسب ہے کہ ہم تو خالص اللہ کے فرمانبردار بندے بن چکے ہیں اب تم اپنی جانو۔ ہم کسی پر زبردستی نہیں کرتے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ

بیشک جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کے حکموں کا اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ان کو جو

جو لوگ منکر ہیں اللہ کی آیتوں سے، اور مار ڈالتے ہیں نبیوں کو ناحق، اور مار ڈالتے ہیں جو

يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ

حکم کرتے ہیں انصاف کرنے کا لوگوں میں سے سو خوشخبری سنا دے ان کو عذاب دردناک کی یہی ہیں جن کی

کوئی کہے انصاف کو لوگوں میں سے، سو ان کو خوش خبری سناؤ دکھ والی مار کی۔ وہی ہیں جن کی

حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٢٢﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى

محنت ضائع ہوئی دنیا میں اور آخرت میں اور کوئی نہیں ان کا مددگار ف۱ کیا نہ دیکھا تو نے

محنت ضائع ہوئی دنیا میں اور آخرت میں، اور کوئی نہیں ان کا مددگار۔ تو نے نہ دیکھے

ف۱ حدیث میں ہے کہ "بنی اسرائیل" نے ایک دن میں تینتالیس نبی اور ایک سو ستر یا ایک سو بارہ صالحین کو شہید کیا۔ یہاں نصاریٰ نجران اور دوسرے کفار کو =

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ إِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ

ان لوگوں کو جن کو ملا کچھ ایک حصہ کتاب کا ف۱ ان کو بلاتے ہیں اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ وہ کتاب انہیں حکم کرے پھر

وہ لوگ جن کو ملا ہے کچھ ایک حصہ کتاب کا، ان کو بلاتے ہیں اللہ کی کتاب پر، کہ ان میں حکم کرے، پھر

يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ

منہ پھیرتے ہیں بعضے ان میں سے تغافل کر کے ف۲ یہ اس واسطے کہ کہتے ہیں وہ ہم کو ہرگز نہ لگے گی آگ دوزخ کی مگر

ہٹ رہتے ہیں بعض ان میں تغافل کر کر۔ یہ اس واسطے کہ کہتے ہیں ہم کو ہرگز نہ لگے گی آگ مگر

أَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَكَيْفَ إِذَا

چند دن گنتی کے اور بہکے ہیں اپنے دین میں اپنی بنائی باتوں پر ف۳ پھر کیا ہوگا حال جب

کئی دن گنتی کے۔ اور بہکے ہیں اپنے دین میں اپنی بنائی باتوں پر۔ پھر کیسا ہوگا جب

جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ

ہم ان کو جمع کریں گے ایک دن کہ اس کے آنے میں کچھ شبہ نہیں اور پورا پاویگا ہر کوئی اپنا کیا ف۴ اور ان کی

ہم ان کو جمع کریں گے ایک دن، جس میں شبہ نہیں۔ اور پورا پائے گا ہر کوئی اپنا کیا، اور ان کا

لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

حق تلفی نہ ہوگی ف۵

حق نہ رہے گا۔

=سنایا جا رہا ہے کہ احکام الٰہی سے منکر ہو کر انبیاء اور انصاف پسند ناصحین سے مقابلہ کرنا اور پرلے درجہ کی شقاوت وسنگدلی سے ان کے خون میں ہاتھ رنگنا معمولی چیز نہیں۔ ایسے لوگ سخت دردناک عذاب کے مستحق اور دونوں جہان کی کامیابی سے محروم ہیں۔ ان کی محنت برباد اور ان کی کوششیں اکارت ہونگی اور دنیا و آخرت میں جب سزا ملے گی تو کوئی بچانے والا اور مدد کرنے والا نہ ملے گا۔

ف۱ یعنی تھوڑا بہت حصہ تورات اور انجیل وغیرہ کا جو ان کی تحریفات لفظی ومعنوی سے بچ بچا کر رہ گیا ہے یا جو تھوڑا بہت حصہ فہم کتاب کا ملا۔

ف۲ یعنی جب انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ قرآن کریم کی طرف آؤ جو خود تمہاری تسلیم کردہ کتابوں کی بشارات کے موافق آیا اور تمہارے اختلافات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہے۔ تو ان کے علماء کا ایک فریق تغافل برت کر منہ پھیر لیتا ہے۔ حالانکہ قرآن کی طرف دعوت فی الحقیقت تورات وانجیل کی طرف دعوت دینا ہے۔ بلکہ کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ کتاب اللہ سے مراد تورات وانجیل ہی ہو۔ یعنی لو ہم تمہارے نزاعات کا فیصلہ تمہاری ہی کتاب پر چھوڑتے ہیں مگر غضب تو یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور پست اغراض کے سامنے خود اپنی کتاب کی ہدایات سے بھی منہ پھیر لیتے ہیں۔ نہ اس کی بشارات سنتے ہیں نہ احکام پر کان دھرتے ہیں۔ چنانچہ رجم زانی کے مسئلہ میں تورات کے حکم منصوص سے صریح روگردانی کی۔ جیسا کہ آگے سورۂ مائدہ میں آئے گا۔

ف۳ یعنی ان کے تمرد وطغیان اور گناہوں پر جری ہونے کا سبب یہ ہے کہ سزا کی طرف سے نڈر ہیں ان کے بڑے جھوٹ بنا کر کہہ گئے کہ ہم میں اگر کوئی سخت گنہگار بھی ہوگا تو گنتی کے چند روز سے زیادہ عذاب نہ پائے گا۔ جیسا کہ سورۂ "بقرہ" میں گزر چکا اور اسی طرح کی بہت سی باتیں گھڑ رکھی ہیں۔ مثلاً کہتے تھے کہ ہم تو اللہ کے چہیتے بیٹے ہیں یا انبیاء کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کر چکا ہے کہ ان کی اولاد کو سزا نہ دے گا مگر یونہی برائے نام قسم کھانے کو۔ اور نصاریٰ نے تو کفارہ کا مسئلہ نکال کر گناہ ومعصیت کا سارا حساب ہی بیباق کر دیا۔ اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔............=

ذکر بعض احوال شنیعہ یہود بے بہود

قال تعالیٰ: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ... الی... وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ﴾

شروع سورت میں روئے سخن زیادہ تر نصاریٰ کی طرف تھا اور گزشتہ آیات میں اہل کتاب کے عنوان سے یہود اور نصاریٰ دونوں کو خطاب تھا اب ان آیات میں خاص یہود کے بعض افعال شنیعہ کو بیان فرماتے ہیں کہ انبیاء اور اُن کی امت کے علماء کو قتل کرنا یہود کا خاص شیوہ ہے قرآن کریم کی متعدد آیات میں یہود کا قاتل انبیاء ہونا بیان ہوا ہے اس لیے اس آیت سے خصوصیت کے ساتھ یہود کو خطاب شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں تحقیق جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو دیدہ و دانستہ جان بوجھ کر ناحق قتل کرتے ہیں یعنی خود بھی جانتے ہیں کہ ہمارا یہ فعل سراسر ناحق ہے مگر حق کی عداوت اور دنیا کی محبت میں اتنے اندھے بنے کہ جو برگزیدہ صفات حضرات، حق اور ہدایت کو لے کر آتے تھے ان کو قتل کرنے لگے اور انبیاء کے بعد ان کی امت کے علماء اور صلحاء کو بھی قتل کرتے ہیں جو ان کو عدل اور انصاف اور حکمت کی باتوں کا حکم دیتے ہیں جیسا کہ آج کل یہود آپ ﷺ کے قتل کے درپے ہیں اور آپ ﷺ کے صحابہ کے قتل سے ان کو دریغ نہیں یہی ان کے اسلاف کا طریقہ تھا جس پر یہ گامزن ہیں۔ سو ایسے قسیُّ القلب لوگوں کو آپ دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے یہی وہ گروہ ہے جس کے اعمال حسنہ دنیا اور آخرت میں ضائع اور بے کار گئے یعنی دونوں جہان کی کامیابی سے محروم ہوئے اور دنیا اور آخرت کی ذلتیں سر پڑیں اور کوئی ان کا مددگار نہیں کہ ان کے اعمال کو حبط ہونے سے بچائے اور دنیا اور آخرت کی کسی ذلت اور مصیبت کو ان سے دفع کر سکے۔

فوائد

۱- ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب کس کو ہوگا تو آپ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ سخت عذاب اس شخص کو ہوگا جس نے خدا کے کسی نبی کو قتل کیا یا اس شخص کو قتل کیا جس نے اچھی بات کا حکم کیا اور بری بات سے منع کیا اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے یہ آیت پڑھی ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ﴾ سے ﴿وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ تک اور یہ ارشاد فرمایا اے ابو عبیدہ! بنی اسرائیل نے شروع دن میں تینتالیس نبیوں کو ایک گھڑی میں قتل کیا۔ اس پر بنی اسرائیل کے ایک سو ستر عابد و زاہد اور صوفی لوگ کھڑے ہوئے اور ان ناہنجاروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا بنی اسرائیل نے اخیر دن میں ان تمام نصیحت کرنے والوں کو بھی قتل کر دیا (اخرجہ ابن جریر)۔

۲- علماء، چونکہ انبیاء کے وارث ہیں اور ان کا مرتبہ انبیاء کے بعد ہے اس لیے علماء کے قتل کا جرم انبیاء کے قتل کے

=ف ۴ یعنی اس وقت پتہ چلے گا کہ کس اندھیرے میں پڑے ہوئے تھے۔ جب محشر میں تمام اولین و آخرین اور خود اپنے بزرگوں کے سامنے رسوا ہوں گے اور ہر عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا، نہ کفارہ کا مسئلہ یاد آئے گا، نہ نسبی تعلقات اور من گھڑت عقیدے کام دیں گے۔

ف ۵ یعنی فرضی جرائم پر سزا نہ ہوگی۔ ان کاموں پر ہوگی جن کا جرم ہونا خود تسلیم کریں گے اور جس قدر سزا کا استحقاق ہوگا، اس سے زیادہ نہ دی جائے گی نہ کسی کی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی ضائع ہو سکے گی۔

بعد دوسرے درجہ میں ہے۔

۳- آیت میں انبیاء اور علماء کے قاتلین کی دو سزائیں ذکر کی گئیں ایک حبط اعمال دوسرے ﴿وَمَا لَهُمْ مِنْ نُّصِرِيْنَ﴾ انبیاء کرام چونکہ منبع ہدایت تھے اس لیے ان کے قتل پر حبط اعمال کی سزا ملی۔ اور علماء چونکہ انبیاء کرام کے اعوان اور انصار اور معین و مددگار تھے اس لیے علماء کے قتل کی سزا میں ﴿وَمَا لَهُمْ مِنْ نُّصِرِيْنَ﴾ فرمایا یعنی ان کو خدا کی سزا سے کوئی بچانے والا اور مدد کرنے والا نہ ملے گا۔

استعجاب بر اعراض اہل کتاب

گزشتہ آیات میں اسلام کی حقانیت کو دلائل اور براہین سے واضح فرمایا اور اہل کتاب کو خاص طور پر اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی گئی مگر ان لوگوں نے اعراض کیا اب آئندہ آیات میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کا اسلام سے اعراض کرنا نہایت عجیب ہے کہ توریت اور انجیل کے عالم ہیں اور نبی کریم کی بشارت اور صفت جو توریت اور انجیل میں مذکور ہے اس سے واقف ہیں مگر پھر بھی اعراض کرتے ہیں۔

ابن عباس ﷠ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن بیت المدراس (یہودیوں کے مدرسہ میں) تشریف لے گئے اور وہاں جا کر ان کو اللہ کے دین کی دعوت دی۔ نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے کہا کہ آپ کا دین کیا ہے حضور پرنور ﷺ نے فرمایا کہ جو ابراہیم ﷤ کا دین تھا انہوں نے جواب دیا کہ حضرت ابراہیم ﷤ تو خود دین یہود پر تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا اگر یہ سچ ہے تو توریت لے آؤ اور اس میں دکھلا دو، یہ مضمون کس جگہ لکھا ہے کہ ابراہیم ﷤ دینِ یہود پر تھے ان دونوں شخصوں نے توریت لانے سے انکار کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ﴾ الخ یعنی اے نبی کریم ﷺ کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نظر نہیں کی کہ جن کو توریت کے علم کا ایک کافی حصہ دیا گیا جس سے حق اور باطل کا فرق ان پر واضح ہو سکے مگر تعجب ہے کہ ان لوگوں کو اسی اللہ کی کتاب (توریت) ① کی طرف بلایا جاتا ہے جس کے یہ حامل اور عالم ہیں اور اس پر ایمان کے مدعی ہیں تاکہ یہ توریت ان کے درمیان فیصلہ کر دے کہ ابراہیم ﷤ یہودی تھے یا نہیں اور جوان کا مقدمۂ زنا حضور پرنور ﷺ کے سامنے پیش ہوا توریت اس کا بھی فیصلہ کر دے کہ توریت میں رجم کا حکم مذکور ہے یا نہیں پس یہ لوگ اقرار کرتے ہیں کہ توریت اللہ کی کتاب ہے اور فصلِ خصومات کے لیے نازل ہوئی ہے مگر باوجود اس اقرار کے پھر بھی ان کا ایک فریق اس سے اعراض اور روگردانی کرتا ہے اور یہ لوگ اس وقتی اور عارضی اعراض پر اقتصار نہیں کرتے کہ اس وقت سے پہلے توریت کے احکام پر عمل کرتے رہے ہوں اور فقط اسی ایک موقعہ پر اعراض اور روگردانی کر بیٹھے ہوں۔ بلکہ یہ لوگ ہر حال میں اعراض کرنے والے ہیں یعنی

① اور بعض علمائے تفسیر نے اس جگہ کتاب اللہ سے قرآن کریم مراد لیا ہے کہ ان کو قرآن کریم کی طرف دعوت دی جاتی جو توریت اور انجیل کی بشارات کے موافق آیا ہے اور تمہارے اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے پس ان میں علماء کا ایک فریق اعراض کرتا ہے حالانکہ قرآن کی طرف دعوت دینا درحقیقت توریت اور انجیل کی طرف دعوت دینا ہے اور قرآن پر ایمان لانا توریت و انجیل پر ایمان لانا ہے مگر محققین نے اس جگہ کتاب اللہ سے توریت مراد لی ہے اس لیے ہم نے تفسیر میں اسی قول کو اختیار کیا۔

اعراض ان کی لازمی صفت اور دائمی عادت ہے۔

ف:...... ﴿يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ میں تولّی سے بالفعل اور وقتی طور پر اعراض کرنا مراد ہے۔ اور ﴿وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اعراض ان کا دائمی اور لازمی وصف تھا۔ اس لیے کہ جملہ اسمیہ ثبات اور دوام کے بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس لیے ﴿يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾ کے بعد ﴿وهم مُّعْرِضُوْنَ﴾ کا ذکر غایت درجہ بلیغ اور لذیذ ہوگا اور ان کے اس اعراض اور انحراف کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ ہم کو آگ ہرگز نہ لگے گی مگر چند گنتی کے روز یعنی چالیس دن کی مقدار کہ جس میں ان کے بڑوں نے گوسالہ کی پرستش کی تھی فقط اتنی مقدار عذاب ہوگا اور پھر مغفرت ہو جائے گی اور عذاب سے نجات مل جائے گی۔ اسی فاسد اعتقاد کی بناء پر یہ لوگ ایمان اور عمل کا اہتمام نہیں کرتے اگر خدا کے عذاب کو دائمی سمجھتے تو پھر اس کے مطابق اہتمام کرتے چند روزہ سمجھ کر پرواہ نہیں کرتے۔ حضرات انبیاء ﷺ کے انتساب پر اعتماد کیے ہوئے ہیں اور اپنی نجات کا اعتقاد کیے ہوئے ہیں اس لیے آخرت کی عقوبت کو سہل اور خفیف سمجھتے ہیں اور ایمان اور عمل صالح کا اہتمام نہیں کرتے حالانکہ تمام انبیاء کرام ﷺ اس بات کو بیان کرتے چلے آئے کہ نجات کا دارومدار ایمان اور عمل صالح اور تقویٰ پر ہے۔ بدون ایمان کے انتساب کچھ کام نہیں آئے گا اور یہی قرآن کریم کی تعلیم ہے اور دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ان کو دین کے بارہ میں ان اعتقادات اور خیالات نے جو یہ اپنی طرف سے بناتے رہتے ہیں کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے چہیتے بیٹے ہیں اور اس کے نبیوں کی اولاد ہیں اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کر لیا ہے اور کہ ان کی اولاد کو عذاب نہ دے گا مگر برائے نام اور نصاریٰ نے کفارہ کا مسئلہ نکال رکھا ہے کہ سارے عالم کے گناہوں کا حساب ایک اکلوتے بیٹے کے صلیب پر چڑھ جانے سے بے باق ہوگیا پس یہ لوگ اپنی ان افتراء پردازیوں پر آج دنیا میں اپنا دل خوش کر لیتے ہیں مگر یہ تو سوچیں کہ اس وقت ان کا کیا حال ہوگا کہ جب ہم سب کو حساب و کتاب کے لیے ایک دن جمع کریں گے جس کے بارہ میں ذرہ برابر کوئی شک و شبہ نہیں اور وہ دن ایسا ہوگا کہ ہر نفس کو اس چیز کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا جو اس نے دنیا میں کمایا تھا اور ذرہ برابر ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا کہ بلا جرم یا جرم سے زیادہ ان کو سزا دے دی جائے یا ان کی کوئی حق تلفی ہو جائے یعنی نیکیوں کا بدلہ نہ دیا جائے یا کم دیا جائے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ

تو کہہ یا اللہ مالک سلطنت کے تو سلطنت دیوے جس کو چاہے اور سلطنت چھین لیوے جس سے

تو کہہ، یا اللہ مالک سلطنت کے! تو سلطنت دیوے جس کو چاہے، اور سلطنت چھین لیوے جس سے

تَشَآءُ ؕ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

چاہے اور عزت دیوے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے تیرے ہاتھ ہے سب خوبی بیشک تو ہر چیز پر

چاہے، اور عزت دیوے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے، تیرے ہاتھ سب خوبی، بیشک تو ہر چیز پر

قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ

قادر ہے ف۱ تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرے دن کو رات میں ف۲ اور تو نکالے زندہ مردہ سے

قادر ہے۔ تو لے آوے رات کو دن میں اور تو لے آوے دن کو رات میں، اور تو نکالے جیتا مردے سے

وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾

اور نکالے مردہ زندہ سے ف۳ اور تو رزق دے جس کو چاہے بیشمار ف۴

اور تو نکالے مردہ جیتے سے، اور تو رزق دیوے جس کو چاہے بیشمار۔

بشارت غلبہ مومنین براعداء بعنوان مناجات ودعا

قَالَ تَعَالیٰ: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ ... الی ... وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

ربط:...... کفار، دنیا اور سامانِ دنیا پر مغرور تھے اور آنحضرت ﷺ کو اور آپ کے اصحاب اور احباب کو فقر وفاقہ کی وجہ سے بنظر حقارت دیکھتے تھے اس آیت میں اسی کے جواب کی طرف اشارہ ہے کہ سلطنت اور دولت کا عروج اور نزول اور عزت اور

ف۱ جیسا کہ پہلے نقل کیا جاچکا ہے وفد نجران کے رئیس ابوحارثہ بن علقمہ نے کہا تھا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں تو روم کے بادشاہ جو ہماری عزت اور مالی خدمت کرتے ہیں سب بند کرلیں گے۔ شاید یہاں دعا و مناجات کے رنگ میں اس کا جواب دیا کہ بادشاہوں کی سلطنت اور ان کی دی ہوئی عزتوں پر تم مفتون ہو رہے ہو، تو خوب سمجھ لو کہ کل سلطنت وعزت کا اصلی مالک خداوند قدوس ہے اسی کے قبضہ قدرت میں ہے جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے سلب کرلے۔ کیا یہ امکان نہیں کہ روم وفارس کی سلطنتیں اور عزتیں چھین کر مسلمانوں کو دے دی جائیں، بلکہ وعدہ ہے، کہ ضرور دی جائینگی، آج مسلمانوں کی موجودہ بے سروسامانی اور دشمنوں کی طاقت کو دیکھتے ہوئے بیشک یہ چیز تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اسی لئے یہود ومنافقین مذاق اڑاتے تھے کہ قریش کے حملے سے ڈر کر مدینہ کے گرد خندق کھودنے والے مسلمان قیصر وکسریٰ کے تاج وتخت پر قبضہ پانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ نے چند ہی سال میں دکھلا دیا کہ روم وفارس کے جن خزانوں کی کنجیاں اس نے اپنے پیغمبر کے ہاتھ میں دی تھیں فاروق اعظم (رض) کے زمانہ میں وہ کس طرح مجاہدین اسلام کے درمیان تقسیم ہوئے۔ اصل یہ ہے کہ یہ مادی سلطنت وعزت کیا چیز ہے جب خداوند قادر وحکیم نے روحانی سلطنت وعزت کا آخری مقام (یعنی منصب نبوت ورسالت) بنی اسرائیل سے منتقل کرکے بنی اسماعیل میں پہنچا دیا تو روم وعجم کی ظاہری سلطنت کا عرب کے خانہ بدوشوں کی طرف منتقل کردینا کیا مستبعد ہے۔ گویا یہ دعا ایک طرح کی پیشگوئی تھی کہ عنقریب دنیا کی کایا پلٹ ہونیوالی ہے۔ جو قوم دنیا سے الگ تھلگ پڑی تھی عزتوں اور سلطنتوں کی مالک ہوگی، اور جو بادشاہت کررہے تھے ان کو اپنی بداعمالیوں کی بدولت پستی وذلت کے غار میں گرایا جائے گا۔

(تنبیہ) بِيَدِكَ الْخَيْرُ بیشک خدا کے ہاتھ میں ہر قسم کی خیر وخوبی ہے اور "شر" کا پیدا کرنا بھی اس کے اعتبار سے خیر ہی ہے۔ کیونکہ مجموعہ عالم کے اعتبار سے اس میں ہزارہا حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ في الحديث الصحيح الخير كله في يديك والشر ليس اليك۔

ف۲ یعنی کبھی رات کو گھٹا کر دن کو بڑھا دیتا ہے، کبھی اس کا عکس کرتا ہے۔ مثلاً ایک موسم میں ۱۴ گھنٹہ کی رات اور دس گھنٹہ کا دن ہے۔ چند ماہ بعد رات کے چار گھنٹہ کاٹ کر دن میں داخل کردیئے۔ اب رات دس گھنٹہ کی رہ گئی اور دن ۱۴ گھنٹہ کا ہوگیا۔ یہ سب الٹ پھیر تیرے ہاتھ میں ہیں۔ کیونکہ شمس وقمر وغیرہ تمام سیارات بدون تیرے ارادہ کے ذرا حرکت نہیں کرسکتے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی رات۔

ف۳ یعنی بیضہ کو مرغی سے، مرغی کو بیضہ سے آدمی کو نطفہ سے نطفہ کو آدمی سے، جاہل کو عالم سے، عالم کو جاہل سے، کامل کو ناقص سے، ناقص کو کامل سے نکالنا تیری ہی قدرت کا کام ہے۔

ف۴ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں "یہود جانتے تھے کہ پہلے جو بزرگی ہم میں تھی وہی ہمیشہ رہے گی۔ اللہ کی قدرت سے غافل ہیں جس کو چاہے عزیز کرے اور سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور ذلیل کردے۔ اور جاہلوں میں کامل پیدا کرے (جیسے عرب کے امیوں میں سے کئے) اور کاملوں میں سے جاہل (جیسے بنی اسرائیل میں ہوا) اور جس کو چاہے (حسی ومعنوی) رزق بے حساب دیوے۔

ذلت سب خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اس طرح دعا مانگو ہم تم کو بے مثال سلطنت عطا کریں گے جس کو یہ مذاق اڑانے والے بھی دیکھ کر حیران اور دنگ رہ جائیں گے گویا کہ یہ دعا ایک طرح کی پیشن گوئی تھی کہ عنقریب دنیا کی کایا پلٹ ہونے والی ہے اور یہ بے سروسامان مسلمان قوم عزتوں اور سلطنتوں کی مالک بنے گی اور جو بادشاہت کر رہے ہیں وہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ذلت کے گڑھے میں گرائے جائیں گے اور یہ مادی سلطنت کیا چیز ہے جس خداوند ذوالجلال نے نبوت ورسالت کے منصب جلیل کو بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل کی طرف منتقل کر دیا تو اسے روم وعجم کی ظاہری سلطنت کا عرب کے خانہ بدوشوں کی طرف منتقل کر دینا کیا مستبعد ہے۔

شان نزول

غزوۂ احزاب میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے صحابہ کو خندقیں کھودنے کا حکم دیا ہر دس آدمیوں کو چالیس ہاتھ کھودنے کے لیے مقرر کیا صحابہ نے خندق کھودنا شروع کیا اس درمیان میں ایک بڑی چٹان نمودار ہوئی جس پر کدال کچھ کام نہ کرتا تھا جب آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ اس جگہ بہ نفس نفیس تشریف لائے اور سلمان رضی اللہ عنہ سے کدال لے کر اس چٹان پر ایک ضرب لگائی جس سے وہ چٹان شق ہوئی اور اس سے ایک ایسی روشنی نمودار ہوئی جس سے تمام مدینہ روشن ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندھیرے میں چراغ روشن ہو گیا ہے حضور ﷺ نے تکبیر پڑھی یعنی اللہ اکبر کہا اور صحابہ نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ اللہ اکبر کہا پھر حضور پرنور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں حیرۂ کے محلات دکھلائے گئے پھر آپ ﷺ نے دوسری ضرب لگائی اس سے بھی ایک روشنی نمودار ہوئی آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں روم کے سرخ محلات دکھائے گئے یہ کہہ کر آپ نے پھر تیسری بار کدال ماری جس سے پھر ویسی ہی روشنی نمودار ہوئی آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں صنعاء (جو ملک یمن کا دارالسلطنت ہے) کے محلات دکھلائے گئے اور مجھے جبریل امین علیہ السلام نے خبر دی ہے کہ عنقریب ان سب ممالک پر میری امت کا تسلط اور غلبہ ہوگا جب کافروں اور منافقوں نے یہ سنا تو کہنے لگے اے مسلمانو! تمہارا نبی بھی خوب ہے کیسی عجیب باتیں کرتا ہے یثرب سے اس کو مدائن اور حیرہ کی عمارتیں نظر آتی ہیں اور خوف کا حال یہ ہے کہ ایک معمولی دشمن کے ڈر سے تم سے خندقیں کھدوا رہے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی اے محمد ﷺ آپ ان کفار ناہنجار کے تمسخر اور استہزاء کی طرف ذرہ برابر التفات نہ کریں یوں کہو۔ یعنی اس طرح ہم سے دعا مانگو ہم آپ کے غلاموں اور خادموں کو سلطنت عطا کریں گے۔ اس طرح دعا مانگو اے اللہ مالک بادشاہی اور سلطنت کے ہم کو بادشاہی اور عزت عطا فرما تا کہ کوئی کافر تیرے دین اور تیرے نام لیواؤں کو ذلیل نہ کر سکے اور شان وشوکت کے ساتھ تیرے دین کے احکام جاری ہوں ہم اگرچہ قلیل اور ظاہر میں ذلیل ہیں مگر آپ کو سب کچھ قدرت ہے اس لیے کہ آپ مالک مطلق اور قادر مطلق ہیں جس کو چاہیں بادشاہی اور سلطنت عطا فرمائیں اور جس سے چاہیں سلطنت چھین لیں تیرے ہاتھ میں ہے ہر بھلائی بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں اور عزت کو ذلت سے اور ذلت کو عزت سے بدلنا ایسا ہی آپ کی قدرت میں ہے جیسا کہ نور کو ظلمت سے اور ظلمت کو نور سے بدلنا آپ کی قدرت میں ہے اس لیے کہ آپ کو یہ قدرت ہے کہ رات کے ایک حصہ کو دن میں داخل کر دیتے ہیں جس

سے دن بڑا ہو جاتا ہے اور کسی فصل میں دن کے کسی حصہ کو رات میں داخل کر دیتے ہیں جس سے رات بڑی ہو جاتی ہے مثلاً کسی موسم میں رات چودہ گھنٹے کی ہوتی ہے اور دن دس گھنٹہ کا پھر چند ماہ بعد رات کے چار گھنٹہ کاٹ کر دن میں داخل کر دیے جاتے ہیں جس سے دن چودہ گھنٹے کا ہو جاتا ہے اور رات دس گھنٹہ کی رہ جاتی ہے اور تو ہی نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے اور تو ہی نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے جیسے بیضہ سے چوزہ اور چوزہ سے بچہ اور عالم سے جاہل اور جاہل سے عالم اور مومن سے کافر اور کافر سے مومن اور تو ہی روزی دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار یہ آپ کی قدرت کاملہ اور جود و کرم کے چند نمونے ہیں اس لیے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے قلوب کو ایمان اور تقوی کے نور سے منور فرما اور ہم کو حکومت و سلطنت عطا فرما تا کہ تیرے اتارے ہوئے دستور اور قانون کو شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ دنیا میں جاری کر سکیں۔

فوائد

ا۔طبرانی کی معجم صغیر میں ہے کہ ایک جمعہ کو نبی کریم ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نماز میں نہ دیکھا تو خود ان کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا اے معاذ کیا بات ہے آج میں نے تم کو نہیں دیکھا۔ عرض کیا یا رسول اللہ ایک یہودی کا میرے ذمہ ایک اوقیہ (چالیس درہم) قرض تھا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے گھر سے نکلا راستہ میں اس یہودی نے مجھ کو روک لیا آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے معاذ کیا میں تمہیں ایسی دعا نہ بتاؤں کہ اگر تمہارے ذمہ پہاڑ کے برابر بھی قرض ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ادا کر دے وہ دعا یہ ہے:

"اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَرَحِيْمَهُمَا تُعْطِيْ مِنْهُمَا مَنْ تَشَاءُ وَتَمْنَعُ مِنْهُمَا مَنْ تَشَاءُ ارْحَمْنِيْ رَحْمَةً تغنيني بِهَا عَنْ رَّحْمَةِ مَنْ سِوَاكَ اللّٰهُمَّ اقْضِ عَنِّي الدَّيْنَ وَاَغْنِنِيْ مِنَ الْفَقْرِ وَتَوَفَّنِيْ فِيْ عِبَادَتِكَ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِكَ" (تفسیر قرطبی: ۵۲/۱، ودر منثور، وشرح حصن حصین، ص: ۲۰۹)

۲۔بزرگوں نے لکھا ہے کہ اس آیت کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس پر مداومت کرے اللہ تعالیٰ اس کو قرض سے سبکدوش فرماتا ہے۔

۳۔بعض بزرگوں نے یہ تخصیص بھی کی ہے ہر نماز کے بعد سات سات بار پڑھے اور بزرگوں نے اس عمل کو مجرب لکھا ہے۔

۴۔معجم طبرانی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اسم اعظم جس کے ذریعہ سے دعا قبول ہوتی ہے وہ آل عمران کی اس آیت میں ہے: ﴿اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾. (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۲۱۷)

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ

نہ بناویں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر اور جو کوئی یہ کام کرے

نہ پکڑیں مسلمان کافروں کو رفیق مسلمان چھوڑ کر۔ اور جو کوئی یہ کام کرے،

فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقٰةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ ۗ

تو نہیں اس کو اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ کرنا چاہو تم ان سے بچاؤ ف۱ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنے سے

وہ اللہ کا کوئی نہیں، مگر یہ کہ تم پکڑا چاہو ان سے بچاؤ۔ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے آپ سے۔

وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ ﴿٢٨﴾ قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ

اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ف۲ تو کہہ اگر تم چھپاؤ گے اپنے جی کی بات یا اسے ظاہر کرد گے جانتا ہے اس کو اللہ ف۳

اور اللہ ہی تک پہنچنا ہے۔ تو کہہ، اگر تم چھپاؤ گے اپنے جی کی بات یا ظاہر کرو گے، وہ اللہ کو معلوم ہے،

وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٩﴾ يَوْمَ تَجِدُ

اور اس کو معلوم ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ف۴ جس دن موجود پاویگا

اور اس کو معلوم ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن پاوے گا

ف۱ یعنی جب حکومت وسلطنت، جاہ وعزت، اور ہر قسم کے تقلبات وتصرفات کی زمام اکیلے خداوند قدوس کے ہاتھ میں ہوئی تو مسلمانوں کو جو صحیح معنی میں اس پر یقین رکھتے ہیں، شایاں نہیں کہ اپنے اسلامی بھائیوں کی اخوۃ ودوستی پر اکتفاء نہ کرکے خواہ مخواہ دشمنان خدا کی موالاۃ ومدارات کی طرف قدم بڑھائیں، خدا اور رسول کے دشمن ان کے دوست کبھی نہیں بن سکتے۔ جو اس خبط میں پڑے گا سمجھو کہ خدا کی محبت وموالات سے اسے کچھ سروکار نہیں۔ ایک مسلمان کی سب امیدیں اور خوف صرف خداوند رب العزت سے وابستہ ہونے چاہئیں۔ اور اس کے اعتماد ووثوق اور محبت ومناصرت کے مستحق وہی لوگ ہیں جو حق تعالیٰ سے اسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں۔ ہاں تدبیر وانتظام کے درجہ میں کفار کے ضرر عظیم سے اپنے ضروری بچاؤ کے پہلو اور حفاظت کی صورتیں معقول ومشروع طریقہ پر اختیار کرنا، ترک موالات کے حکم سے اسی طرح مستثنیٰ ہیں، جیسے سورۃ انفال میں ﴿وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ﴾ سے ﴿مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلٰى فِئَةٍ﴾ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ جس طرح وہاں تحرف وتحیز کی حالت میں حقیقۃً فرار من الزحف نہیں ہوتا، محض صورۃ ہوتا ہے۔ یہاں بھی الا ان تتقوا منهم تقٰة کو حقیقت موالات نہیں، فقط صورت موالات سمجھنا چاہیے جس کو ہم مدارات کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس مسئلہ کی مزید تفصیل سورۃ مائدہ کی آیت ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرٰى أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهٗ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ﴾ کے فوائد میں ملاحظہ کرلی جائے۔

ف۲ یعنی مومن کے دل میں اصلی ڈر خدا کا ہونا چاہیے۔ کوئی ایسی بات نہ کرے جو اس کی ناراضی کا سبب ہو، مثلاً جماعت اسلام سے تجاوز کرکے بے ضرورت کفار کے ساتھ ظاہری یا باطنی موالات کرے یا ضرورت کے وقت صورت موالات اختیار کرنے میں حدود شرع سے گزر جائے۔ یا محض موہوم وحقیر خطرات کو یقینی اور اہم خطرات ثابت کرنے لگے۔ اور اسی قسم کی مستثنیات یا شرعی رخصتوں کو ہوائے نفس کی پیروی کا حیلہ بنالے۔ اسے یاد رکھنا چاہیے کہ سب کو خداوند قدوس کی عدالت عالیہ میں حاضر ہونا ہے وہاں جھوٹے حیلے حوالے کچھ پیش نہ جائینگے۔ مومن قوی کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ رخصت سے گزر کر عزیمت پر عمل پیرا ہو۔ اور مخلوق سے زیادہ خالق سے خوف کھائے۔

ف۳ یعنی ممکن ہے آدمی اپنی نیت اور دل کی بات آدمیوں سے چھپا لے لیکن وہ اس طرح خدا کو فریب نہیں دے سکتا۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾

ف۴ جب علم اس قدر محیط اور قدرت ایسی عام وتام ہے تو مجرم کے لئے اخفاء جرم یا سزا سے بچ کر بھاگ جانے کی کوئی صورت نہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۛ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا

ہر شخص، جو کچھ کہ کی ہے اس نے نیکی اپنے سامنے اور جو کچھ کہ کی ہے اس نے برائی آرزو کریگا کہ مجھ میں

ہر شخص جو کی ہے نیکی روبرو۔ اور جو کی ہے برائی۔ آرزو کرے گا کہ مجھ میں

وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

اور اس میں فرق پڑجاوے دور کا ف۱ اور اللہ ڈراتا ہے تم کو اپنے سے اور اللہ بہت مہربان ہے بندوں پر ف۲

اور اس میں فرق پڑ جائے دور کا۔ اور اللہ ڈراتا ہے تم کو آپ سے۔ اور اللہ شفقت رکھتا ہے بندوں پر۔

ممانعت دوستان از دوستی دشمنان

قَالَ تَعَالٰی: ﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ ... الی ... وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾

ربط: ...... گزشتہ آیت میں یہ بتلایا گیا کہ عزت اور ذلت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے اب اس آیت میں اللہ تعالی اپنے دوستوں یعنی اہل اسلام کو حکم دیتا ہے کہ تم مسلمانوں کو چھوڑ کر دشمنان خدا کی موالات اور دوستی کی طرف کوئی قدم نہ اٹھانا اور کافروں کی ظاہری اور وقتی شان وشوکت کو دیکھ کر یہ گمان نہ کرنا کہ شاید ان سے دوستانہ تعلقات رکھنے سے کوئی دنیوی عزت وجاہت مل جائے گی، حاشا وکلا۔ ﴿اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ کافروں کے پاس جو عزت نظر آتی ہے وہ حقیقی عزت نہیں محض صورت ہے حقیقی عزت اللہ کے پاس سے ملتی ہے البتہ اگر کسی وقت بحالت مجبوری دشمنوں کے شر اور فساد سے بچنے کے لیے ظاہری طور پر ان کی موافقت کرلو تو اس کی ممانعت نہیں تدبیر اور انتظام کے درجہ میں کافروں سے اس قسم کی ظاہرداری بشرط ضرورت اور بقدر حاجت موالات کے حکم سے مستثنی ہے اس لیے کہ یہ موالات کی حقیقت نہیں بلکہ محض صورت ہے۔

شان نزول

حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ حجاج بن عمرو اور ابن ابی الحقیق اور قیس بن زید۔ اس قسم کے چند یہودی چند انصار سے کچھ خلا ملا رکھتے تھے تاکہ موقعہ پاکر ان کو دین اسلام سے برگشتہ کردیں (اکثر مسلمانوں کو ان کی اس بدنیتی کا حال معلوم نہ تھا مگر جو صاحب نظر تھے وہ پہچان گئے کہ یہود کا کیا مقصد ہے) چنانچہ رفاعہ بن منذر اور عبداللہ بن جبیر اور سعد بن خیثمہ ؓ نے ان مسلمانوں سے کہا کہ تم یہود کی اس جماعت سے بچتے رہنا کہیں تم کو دین سے برگشتہ نہ کردیں ان

ف۱ یعنی قیامت کے دن ہر نیکی بدی آدمی کے سامنے حاضر ہوگی عمر بھر کا اعمال نامہ ہاتھ میں پکڑا دیا جائے گا اس وقت مجرمین آرزو کریں گے کہ کاش یہ دن ہم سے دور ہی رہتا یا ہم میں اور ان برے اعمال میں بڑی دور کا فاصلہ ہوتا کہ ان کے قریب بھی نہ جاتے۔

ف۲ یہ بھی اس کی مہربانی ہے کہ تم کو اس خوفناک دن کے آنے سے پہلے ڈراتا اور آگاہ کرتا ہے۔ تاکہ برائی کے طریقے خصوصا موالات کفار ترک کرکے اور بھلائی کے راستہ پر چل کر اپنے خداوند قہار کے غصہ سے بچا لینے کا قبل از وقت انتظام کر رکھو۔ قرآن کریم کا یہ خاص طرز ہے کہ عموما خوف کے ساتھ رجاء اور رجاء کے ساتھ خوف کا مضمون سناتا ہے۔ یہاں بھی مضامین ترہیب کو معتدل بنانے کے لئے اخیر میں واللّٰہُ رَءُوفٌ بالعباد فرمادیا۔ یعنی خدا سے ڈر کر اگر برائی چھوڑ دو گے تو اس کی مہربانی پھر تمہارا استقبال کرنے کو تیار ہے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ آؤ! تم کو ایسا دروازہ بتائیں جس سے داخل ہو کر مغفرت ورحمت کے پورے مستحق بلکہ خدا تعالی کے محبوب بن سکتے ہو۔ ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

انصاریوں نے ان کی اس بات کو نہ مانا اس پر یہ آیت نازل ہوئی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ کافروں کو دوست نہ بنائیں مسلمان کو چھوڑ کر یعنی سوائے مسلمانوں کے کسی کو ظاہراً اور باطناً دوست نہ بنائیں اس لیے کہ ایمان نور ہدایت ہے اور کفر ظلمت وضلالت ہے اور نور اور ظلمت اور ہدایت اور ضلالت اور حق اور باطل میں دوستی ممکن نہیں اجتماع ضدین عقلاً ونقلاً محال ہے اور جو کوئی یہ کام کرے یعنی کافروں کو دوست بنائے تو ایسے شخص کو اللہ سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ کافر اللہ کے دشمن ہیں اور دشمن کا دوست بھی دشمن ہی ہوتا ہے اور مومن اللہ کے دوست ہیں۔ پس مومن رہتے ہوئے کافر کے ساتھ دوستی رکھنا ممکن نہیں۔ مگر ایک صورت میں محض تدبیر اور انتظام کے درجہ میں کافروں سے ظاہری دوستی کی اجازت ہے۔ وہ یہ کہ تم کافروں کے شر سے بچنا چاہو کسی خاص بچاؤ کے ذریعہ سے یعنی محض ان کے شر اور ضرر سے بچنے کے لیے حفاظتی تدبیر کے درجہ میں ان سے فقط بقدر ضرورت محض ظاہری تعلق پیدا کرنا جائز ہے۔ باقی دلی تعلق اور قلبی محبت کسی حال میں بھی جائز نہیں اور یہ بھی جائز نہیں کہ اس سلسلہ میں کسی معصیت کا مرتکب ہونا پڑے یا مسلمانوں کی جاسوسی کرنی پڑے اور مسلمانوں کے راز اور خبریں کافروں کو دینے لگے۔ فقط دفع شر اور دفع ضرر کے لیے بقدر ضرورت قواعد شریعت کے ماتحت کافروں سے فقط اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے تعلق رکھنے کی اجازت ہے باقی کافروں سے ایسا تعلق جو مسلمانوں کے لیے یا مسلمانوں کی حکومت کے لیے مضر ہو یہ کسی طرح اور کسی حالت میں جائز نہیں اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے یعنی اپنے ذاتی جلال اور قہر سے ڈراتا ہے کہ جو کافروں سے دوستی کرنے پر مرتب ہوگا اشارہ اس طرف ہے کہ کافروں کی دوستی پر خدائے قہار کا جو قہر مرتب ہوتا ہے وہ قہر ذاتی ہے قہر فعلی نہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم کافروں کی محبت خواہ اپنے سینوں میں چھپاؤ یا اسے اپنے کسی قول یا فعل سے ظاہر کرو تو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے اس لیے کہ اس کے سامنے ظاہر اور باطن سینہ اور زبان سب برابر ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے یعنی اس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے علم کی طرح اس کی قدرت بھی محیط ہے لہٰذا تم کو چاہیے کہ اس علیم وقدیر کے دوستوں سے دوستی کرو اور اس کے دشمنوں کی دوستی سے ظاہر و باطن میں احتیاط رکھو اور اس دن کے حساب و کتاب سے ڈرو کہ جس دن ہر نفس اپنے اعمال نیک و بد کو اپنی اصلی شکلوں میں حاضر کیا ہوا پائے گا اس وقت جب کہ اعمال اپنی اصلی شکلوں میں نمودار ہوں گے اس وقت ان اعمال کا حسن و قبح نظروں کے سامنے آجائے گا اور اس وقت یہ تمنا کرے گا کہ کاش میرے اور میرے برے اعمال کے درمیان ایک طویل اور دور دراز مسافت حائل ہوتی اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنے قہر اور جلال سے ڈراتا ہے اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بڑا مہربان ہے کہ ان کو پہلے ہی جتلا دیا کہ دنیا میں کن سے دوستی جائز ہے اور کن سے دوستی ناجائز ہے۔

فوائد

۱- کافروں سے موالات یعنی محبت کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو دینی حیثیت سے محبوب رکھا جائے یہ قطعاً کفر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دل سے ان کے مذہب اور دین کو برا سمجھے مگر معاملات دنیویہ میں ان سے خوش اسلوبی کے

ساتھ پیش آئے یہ بالاجماع جائز بلکہ ایک درجہ میں مستحسن ہے۔ تیسری صورت ان دونوں صورتوں کے بین بین ہے وہ یہ کہ دل سے تو ان کے مذہب کو برا سمجھے مگر کسی قرابت یا دوستی یا دنیوی غرض کی وجہ سے ان سے دوستانہ تعلقات رکھے اور ان کی اعانت اور امداد کرے یا کسی وقت مسلمانوں کی جاسوسی کرے۔ یہ صورت کفر تو نہیں مگر سخت گناہ ہے حاطب بن ابی بلتعہ کے قصہ میں یہی صورت پیش آئی کہ انہوں نے اپنی قرابت کی وجہ سے کفار کی مدد کی اور ان کے ساتھ ایک قسم کا سلوک اور احسان کیا سورۂ ممتحنہ کا نزول اسی قسم کی موالات کی ممانعت کے لیے ہوا ہے۔ (تفسیر کبیر)

۲- کافروں کی سی وضع قطع اختیار کرنا یہ علامت ہے کہ اس شخص کو کافروں کی وضع پسند ہے اور اسلام کی وضع اس کو ناپسند ہے اس لیے کہ تمام عقلاء کے نزدیک ظاہری حرکات و سکنات۔ قلبی کیفیات کی ترجمان ہوتی ہیں۔

۳- ﴿تُقٰىةً﴾ سے آیت میں، کافروں اور دشمنوں کے شر سے بچنے کی تدبیر مراد ہے جیسا کہ بیان ہو چکا باقی رہا شیعوں کا تقیہ سو آیت قرآنیہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ

تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تاکہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ

تو کہہ، اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو کہ اللہ تم کو چاہے، اور بخشے گناہ تمہارے۔ اور اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

بخشنے والا مہربان ہے ف۱ تو کہہ حکم مانو اللہ کا اور رسول کا پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت نہیں ہے

بخشنے والا مہربان ہے۔ تو کہہ، حکم مانو اللہ کا اور رسول کا، پھر اگر وہ ہٹ رہیں تو اللہ نہیں چاہتا

الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲

کافروں سے ف۲

منکروں کو۔

ف۱ دشمنانِ خدا کی موالات و محبت سے منع کرنے کے بعد خدا سے محبت کرنے کا معیار بتلاتے ہیں۔ یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ یا خیال ہو تو لازم ہے کہ اس کو اتباع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا۔ جو شخص جس قدر حبیب خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ چلتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بناتا ہے۔ اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ خدا کی محبت کے دعوے میں سچا اور کھرا ہے۔ اور جتنا اس دعوے میں سچا ہوگا، اتنا ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا۔ جس کا پھل یہ ملے گا کہ حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگے گا۔ اور اللہ کی محبت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے اور آئندہ طرح طرح کی ظاہری و باطنی مہربانیاں مبذول ہونگی۔ گویا توحید وغیرہ کے بیان سے فارغ ہو کر یہاں سے نبوت کا بیان شروع کیا گیا اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی دعوت دی گئی۔

ف۲ یہود و نصاریٰ کہتے تھے ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ﴾ ہم خدا کے بیٹے اور محبوب ہیں) یہاں بتلا دیا گیا کہ کافر کبھی خدا کا محبوب نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی محبوب بننا چاہتے ہو تو اسکے احکام کی تعمیل کرو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا مانو اور خدا کے سب سے بڑے محبوب کے نقش قدم پر چلے آؤ۔ وفد نجران نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم مسیح کی تعظیم و عبادت اللہ کی محبت و تعظیم کے لئے کرتے ہیں، اس کا بھی جواب ہو گیا۔ آگے خدا تعالیٰ کے چند محب و محبوب بندوں کا حال سنایا گیا اور وفد نجران کی رعایت سے حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے، جو تمہید ہے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کی۔ جیسا =

آغاز مضمون رسالت

وبیان آنکہ معیار محبت خداوندی اتباع رسول است

قال تعالیٰ: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي... الی... فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ﴾

ربط:......۱- گزشتہ آیات میں یہود اور نصاریٰ سے موالات کا حکم مذکور تھا اب ان آیات میں یہود اور نصاریٰ کے اس قول کی طرف تعریض ہے کہ جو یہ کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے دوست ہیں۔ ﴿نَحْنُ أَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَأَحِبّٰٓؤُهُ﴾ ان آیات میں حق جل شانہ نے ان کے جواب کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم اللہ کی محبت اور دوستی کے دعوے دار ہو تو ہمارے نبی علیہ السلام کا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھے گا یعنی اگر تم ہمارے نبی علیہ السلام کا اتباع کرو گے تو اس کا صلہ یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ تم کو محبین کے درجہ سے محبوبین کے درجہ تک پہنچا دے گا اور اس طرح تم محب سے محبوب بن جاؤ گے اور طالب سے مطلوب ہو جاؤ گے۔

۲- یا یوں کہو کہ گزشتہ آیت میں دشمنانِ خدا سے موالات اور محبت کی ممانعت کا ذکر تھا اب اس آیت میں انبیاء ورسل کی محبت اور متابعت کا ذکر ہے اور ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا معیار یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی رکھے اور اس کے دشمنوں سے دشمنی، عزت حضرات انبیاء کرام کی اتباع میں ہے۔

عزیز یکہ از درگہش سر بتافت ... بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

۳- یا یوں کہو کہ شروع سورت سے اب تک توحید کا بیان تھا اب یہاں سے نبوت ورسالت کا بیان شروع ہوتا ہے سب سے پہلے پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام کی اطاعت کا ذکر فرمایا اور پھر اس کے بعد والی آیتوں میں (یعنی ﴿إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوحًا وَّاٰلَ إِبْرٰهِيمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِينَ﴾ الخ) میں ان مقبول اور محبوب اور پسندیدہ اور برگزیدہ ہستیوں کا ذکر فرمایا کہ جن کی اطاعت اور متابعت اپنے اپنے زمانہ میں خدا تعالیٰ کی محبت کا معیار رہی اور اب نبی آخر الزمان کی نبوت اور رسالت کا دور دورہ ہے جو بلاشبہ خداوندِ ذوالجلال کے حبیب اور خلیل ہیں لہٰذا اب جو شخص اللہ کی محبت اور دوستی کا دعویٰ کرے تو اس کا معیار یہ ہے کہ وہ حبیبِ خدا محمد رسول اللہ ﷺ کا بے چون وچرا اتباع کرے ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنا محبوب بنالے گا اور تمام پچھلے گناہوں کو معاف کر دے گا جس درجہ ہمارے نبی علیہ السلام کا اتباع کرو گے اسی درجہ خدا کے محبوب بن جاؤ گے۔

۴- یا یوں کہو کہ گزشتہ آیات میں خدا کے دشمنوں سے محبت کی ممانعت تھی اب اس آیت میں خدا تعالیٰ کے بزرگ ترین حبیب اور خلیل کی محبت اور متابعت کا حکم ہے۔

۵- یا یوں کہو کہ گزشتہ آیت میں تخویف اور تہدید تھی تاکہ معصیت پر جری اور دلیر نہ ہو جائیں اور اس آیت میں تبشیر اور تسلی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جائیں چنانچہ فرماتے ہیں: اے ہمارے نبی آپ لوگوں سے یہ کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے زعم میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری پیروی کرو یعنی میری راہ پر چلو کیونکہ

= کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

محبت کا اقتضاء یہ ہے کہ محبوب کی مرضی اور خوشی کی تلاش ہو اور جن چیزوں سے محبوب کو نفرت ہو ان سے محب بھی نفرت کرے اور یہ بات آپ کے اتباع اور پیروی ہی سے ممکن ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں کا پتہ عقل سے نہیں چلتا بلکہ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کے ذریعہ سے اس کا علم حاصل ہوتا ہے اور حضرات انبیاء و رسل ہی کے ذریعہ حق تعالیٰ شانہ کی ذات و صفات کی صحیح معرفت اور اس کے اوامر اور نواہی کا صحیح علم حاصل ہوتا ہے اور محب اپنے محبوب کی معرفت اور طریقہ اطاعت کے علم کا حریص اور مشتاق ہوتا ہے تاکہ اس کی محبت کا اہل اور اس کے تقرب کا مستحق ہو سکے پس اگر تم اللہ کی محبت کے مدعی ہو تو میری راہ پر میرے پیچھے میرے نقش قدم پر چلو آؤ اللہ تعالیٰ تم کو اپنا محبوب اور مقرب بنا لے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے اور ان سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ محض محبت پر مغرور نہ ہو جاؤ بلکہ اس اللہ کی اطاعت کرو جس کی محبت کے تم مدعی ہو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو جو اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے، محبوب کا محبوب بھی محبوب اور واجب الاطاعت ہوتا ہے۔ پس اگر یہ لوگ آپ کی اطاعت اور اتباع سے منہ موڑیں اور یہ گمان کریں کہ ہمیں رسول کی اتباع کی ضرورت نہیں تو خوب سمجھ لیں کہ خدا کے فرستادہ اور محبوب کی اطاعت اور اتباع سے اعراض (گریز) کرنا کفر ہے اور تحقیق اللہ کافروں کو محبوب نہیں رکھتا یہود اور نصاریٰ یہ کہتے تھے کہ ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ﴾ کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ کافر خدا کا محبوب نہیں ہو سکتا۔ خدا کا محبوب وہی شخص ہو سکتا ہے جو خدا کے نبی اور رسول ﷺ کی بے چون و چرا اطاعت کرے۔

نکتہ: ...... ظاہر کلام کا مقتضی یہ تھا کہ "لَا یُحِبُّھُمْ" فرماتے ہیں لیکن بجائے ضمیر کے اسم ظاہر لائے اور یہ فرمایا کہ ﴿لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ﴾ تاکہ معلوم ہو جائے کہ نبی کی اتباع اور اطاعت سے اعراض کفر ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝ ذُرِّیَّةًۢ

بیشک اللہ نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے گھر کو اور عمران کے گھر کو ف۱ سارے جہان سے جو اولاد تھے

اللہ نے پسند کیا آدم کو، اور نوح کو، اور ابراہیم کے گھر کو اور عمران کے گھر کو، سارے جہان سے۔ کہ اولاد تھے

بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝

ایک دوسرے کی ف۲ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ف۳

ایک دوسرے کی، اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

ف۱ "عمران" دو ہیں، ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد، دوسرے حضرت مریم کے والد، اکثر سلف و خلف نے یہاں عمران ثانی مراد لیا ہے کیونکہ آگے اذ قالت امرأة عمران الخ سے اسی دوسرے عمران کے گھرانے کا قصہ بیان ہوا ہے اور غالباً سورۃ کا نام "آل عمران" اسی بناء پر ہوا کہ اس میں عمران ثانی کے گھرانے (یعنی حضرت مریم و مسیح علیہ السلام) کا واقعہ بہت بسط و تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

ف۲ خدا کی مخلوقات میں زمین آسمان، چاند، سورج، ستارے، فرشتے، جن، شجر، حجر سب ہی شامل تھے۔ مگر اس نے اپنے علم محیط اور حکمت بالغہ سے ملکات روحانیہ اور کمالات جسمانیہ کا جو مجموعہ ابوالبشر آدم علیہ السلام میں ودیعت کیا وہ مخلوقات میں سے کسی کو نہ دیا۔ بلکہ آدم کو مسجود ملائکہ بنا کر ظاہر فرما دیا کہ آدم کا اعزاز و اکرام اسکی بارگاہ میں ہر مخلوق سے زیادہ ہے۔ آدم کا یہ انتخابی اور اصطفائی فضل و شرف جسے ہم "نبوت" سے تعبیر کرتے ہیں کچھ ان کی شخصیت پر محدود و مقصود نہ تھا=

ذکر اصطفا بعض برگزیدگان خداوند انام علیہم الصلوٰۃ والسلام

قال اللہ تعالیٰ: ﴿إِنَّ اللهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ ... الی ... وَاللهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾

ربط :...... گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے معیار کا بیان تھا اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے چند برگزیدہ بندوں کا ذکر فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حقیقی محب اور محبوب تھے تا کہ ان کے حالات اور واقعات سن کر ان کے اتباع اور محبت کا شوق دل میں پیدا ہو اور یہ سمجھ لیں کہ حق تعالیٰ سے تعلق اور محبت بدون ان حضرات کی اتباع اور پیروی کے ناممکن ہے اور ان چند محبین اور محبوبین خدا کا ذکر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے ذکر مبارک کی تمہید ہے جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ بہر حال مقصود اس تذکرہ سے یہ ہے کہ بارگاہ خداوندی میں وصول بدون حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ناممکن اور محال ہے انہی حضرات کے اتباع سے خدا تعالیٰ کی محبت اور خوشنودی حاصل ہوسکتی ہے۔

سب سے پہلے جس نے دنیا کو خدا تعالیٰ کی محبت کی تعلیم دی اور اس کا طریقہ بتلایا وہ ہمارے محترم ترین باپ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں جو خداوند ذوالجلال کے خلیفہ ہیں اور علم اور معرفت میں فرشتوں سے بڑھ کر ہیں۔ اور سب سے پہلے خدا کے نبی اور رسول مکلّم ہیں۔

اور پھر حضرت نوح علیہ السلام اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور پھر آل عمران اور پھر سب سے اخیر میں ہمارے نبی اکرم سرور عالم سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں کہ جن کی بے چون وچرا متابعت اور اطاعت محبت خداوندی کا معیار ہے چنانچہ فرماتے ہیں تحقیق اللہ تعالیٰ نے آدم کو برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا کہ اپنی خلافت کا تاج ان کے سر پر رکھا اور مسجود ملائک بنایا اور جس نے ان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور ان کی ہمسری کا مدعی بنا اس کو ملعون اور مغضوب بنا کر اپنی بارگاہ سے نکال باہر کیا اور ان کے ایک عرصہ دراز کے بعد خاص طور پر نوح کو برگزیدہ بنایا کہ ان کی اتباع کرنے والوں کو نجات دی اور ان کی اطاعت اور اتباع سے اعراض کرنے والوں کو یک لخت غرق کیا اور ابراہیم کی اولاد میں سے بعض کو برگزیدہ اور پسندیدہ فرمایا جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کو دونوں کے لیے برکت کا وعدہ فرمایا اور علیٰ ہذا خاندانِ عمران میں سے بھی بعض

= بلکہ منتقل ہو کر ان کی اولاد میں نوح علیہ السلام کو ملا، پھر منتقل ہوتا ہوا نوح علیہ السلام کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا۔ یہاں سے ایک نئی صورت پیدا ہوگئی۔ آدم و نوح کے بعد جتنے انسان دنیا میں آباد رہے تھے وہ سب ان دونوں کی نسل سے تھے۔ کوئی خاندان ان دونوں کی ذریت سے باہر نہ تھا۔ برخلاف اس کے ابراہیم علیہ السلام کے بعد ان کی نسل کے علاوہ دنیا میں دوسرے، بہت خاندان موجود رہے لیکن جس خدا نے اپنی بیشمار مخلوقات میں سے منصب نبوت کے لئے آدم کا انتخاب کیا تھا اسی کے علم محیط اور اختیار کامل نے آئندہ کے لئے ہزاروں گھرانوں میں سے اس منصب جلیل کے واسطے ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے کو مخصوص فرما دیا۔ جس قدر انبیاء و رسل ابراہیم علیہ السلام کے بعد آئے ان ہی کے دو صاحبزادوں اسحاق و اسماعیل کی نسل سے آئے۔ چونکہ عموماً نسب کا سلسلہ باپ کی طرف سے چلتا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لحاظ سے وہم ہوسکتا تھا کہ ان کو نسل ابراہیمی سے مستثنیٰ کرنا پڑے گا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے "آل عمران" اور ذریۃ بعضھا من بعض فرما کر متنبہ کر دیا کہ حضرت مسیح جب صرف ماں سے پیدا ہوئے تو ان کا سلسلہ نسب بھی ماں ہی کی طرف سے لیا جائے گا نہ کہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کی والدہ مریم صدیقہ کے باپ عمران کا سلسلہ آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے تو آل عمران، آل ابراہیم کی ایک شاخ ہوئی اور کوئی پیغمبر خاندان ابراہیمی سے باہر نہ ہوا۔

ف۲ سب کی دعاؤں اور باتوں کو سنتا اور سب کے ظاہری و باطنی احوال واستعداد کو جانتا ہے۔ لہٰذا یہ وہم نہ کرنا چاہیے کہ یوں ہی کیف ما اتفق انتخاب کر لیا ہوگا وہاں کا ہر کام پورے علم و حکمت پر مبنی ہے۔

کو برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا۔ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ ﴿وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں عمران سے کون سے عمران مراد ہیں آیا عمران بن ماثان مراد ہیں جو حضرت مریم کے والد ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کے جد ہیں یا عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی مراد ہیں جو حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے والد ہیں اور آیت کے سیاق اور سباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں عمران بن ماثان، حضرت مریم کے والد مراد ہیں اس لیے کہ ان آیات کا نزول نصاریٰ نجران کے بارہ میں ہوا جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے الوہیت کے قائل تھے بہرحال اس عمران سے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد مراد ہیں تو اولاد عمران سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام مراد ہوں اور اگر عمران سے حضرت مریم کے والد مراد ہیں تو آل عمران سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہوں گے غرض یہ کہ ان سب حضرات کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا اور تمام جہانوں میں سے ان کو اپنی نبوت ورسالت کے لیے منتخب فرمایا درآنحالیکہ یہ جماعت ایک نسل ہیں جو ایک دوسرے سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک طینت اور ایک خمیر ہیں جو اصطفاء اور اجتباء کے یکے بعد دیگرے وارث ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سب اقوال کے خوب سننے والے اور سب ظاہری اور باطنی احوال کے خوب جاننے والے ہیں کہ کون شخص اصطفاء اور برگزیدگی کے لائق ہے اللہ کا اصطفاء علم وحکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

فائدہ

اس آیت میں صراحۃً اسماعیل علیہ السلام کا ذکر نہیں وجہ یہ ہے کہ ان آیتوں کا نزول ان لوگوں کے مقابلہ میں ہوا ہے جو حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آل عمران کی نبوت اور برگزیدگی کو مانتے تھے ان پر حجت پورا کرنے کے لیے ان حضرات کا ذکر کیا گیا جن کی محبت کے وہ دعوے دار تھے اس لیے اس الزام اور توبیخ میں ان افراد کا ذکر نہیں کیا گیا جن کی نبوت وبعثت کے وہ قائل نہ تھے نیز آیت میں کوئی کلمہ حصر کا نہیں کہ اصطفاء انہی حضرات میں منحصر ہے لہٰذا اگر اسماعیل کے اصطفاء کا اس آیت میں ذکر نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں دوسری آیتوں میں ان کا اور دوسرے حضرات انبیاء کا ذکر مفصل آیا ہے جن کا اس آیت میں ذکر نہیں فرمایا۔

نکتہ:...... ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى﴾ کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ آل ابراہیم اور آل عمران مثلاً عیسیٰ علیہ السلام سے جو خوارق اور معجزات ظہور میں آئے وہ ان کی برگزیدگی اور نبوت کی دلیل ہیں۔ نادانی سے ان کو الوہیت کی دلیل نہ سمجھ جانا۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ

جب کہا عمران کی عورت نے کہ اے رب میں نے نذر کیا تیرے جو کچھ میرے پیٹ میں ہے سب سے آزاد رکھ کر سو تو مجھ سے قبول کر

جب بولی عورت عمران کی، کہ اے رب! میں نے نذر کیا تیری، جو کچھ میرے پیٹ میں ہے آزاد سو تو مجھ سے قبول کر۔

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ

بیشک تو ہی ہے اصل سننے والا جاننے والا ف۱ پھر جب اس کو جنا بولی اے رب میں نے تو اس کو لڑکی جنی ف۲

تو ہے اصل سنتا جانتا۔ پھر جب اس کو جنی، بولی، اے رب! میں نے یہ لڑکی جنی۔

ف۱ عمران کی عورت کا نام ہے حنہ بنت فاقوذا اس نے اپنے زمانہ کے رواج کے موافق منت مانی تھی کہ خداوندا! جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں اسے =

وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ ؕ وَلَيۡسَ الذَّكَرُ كَالۡاُنۡثٰى ۚ وَاِنِّىۡ سَمَّيۡتُهَا مَرۡيَمَ وَاِنِّىۡۤ

اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ اس نے جنا اور بیٹا نہ ہو جیسی وہ بیٹی ف۱ اور میں نے اس کا نام رکھا مریم اور میں

اور اللہ کو بہتر معلوم ہے جو کچھ جنی۔ اور بیٹا نہ ہو جیسے وہ بیٹی۔ اور میں نے اس کا نام رکھا مریم، اور میں

اُعِيۡذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ ۝۳۶ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوۡلٍ حَسَنٍ

تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے ف۲ پھر قبول کیا اس کو اس کے رب نے اچھی طرح کا

تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو، اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے۔ پھر قبول کیا اس کو اس کے رب نے، اچھی طرح کا

وَّاَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيۡهَا زَكَرِيَّا الۡمِحۡرَابَ ۙ

قبول اور بڑھایا اس کو اچھی طرح بڑھانا اور سپرد کی زکریا کو ف۳ جس وقت آتے اس کے پاس زکریا حجرے میں پاتے

قبول کرنا اور بڑھایا اس کو اچھی طرح بڑھانا، اور سپرد کی زکریا کو۔ جس وقت آتا اس پاس زکریا حجرے میں،

= "محرر" (تیرے نام پر آزاد کرتی ہوں) اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تمام دنیاوی مشاغل اور قید نکاح وغیرہ سے آزاد رہ کر ہمیشہ خدا کی عبادت اور کلیسا کی خدمت میں لگا رہے گا۔ اے اللہ تو اپنی مہربانی سے میری نذر قبول فرما۔ تو میری عرض کو سنتا اور میری نیت واخلاص کو جانتا ہے۔ گویا لطیف طرز میں استدعا ہوئی کہ لڑکا پیدا ہو کیونکہ لڑکیاں اس خدمت کے لئے قبول نہیں کی جاتی تھیں۔

ف۲ یہ حسرت وافسوس سے کہا، کیونکہ خلاف توقع پیش آیا۔ اور لڑکی قبول کرنے کا دستور نہ تھا۔

ف۱ یہ درمیان میں بطور جملہ معترضہ حق تعالیٰ کا کلام ہے یعنی اسے معلوم نہیں کیا چیز جنی۔ اس لڑکی کی قدر وقیمت کو خدا ہی جانتا ہے جس طرح کے بیٹے کی اسے خواہش تھی وہ اس بیٹی کو کہاں پہنچ سکتا تھا۔ یہ بیٹی بذات خود مبارک ومسعود ہے اور اس کے وجود میں ایک عظیم الشان مبارک ومسعود بیٹے کا وجود منطوی ہے۔

ف۲ حق تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی۔ حدیث میں ہے کہ آدمی کے بچہ کو ولادت کے وقت جب ماں سے جدا ہو کر زمین پر آ رہتا ہے۔ شیطان مس کرتا ہے۔ مگر عیسیٰ اور مریم مستثنیٰ ہیں۔ اس کا مطلب دوسری احادیث کے ملانے سے یہ ہوا کہ بچہ اصل فطرت صحیحہ پر پیدا کیا جاتا ہے جس کا ظہور بڑے ہو کر عقل وتمیز آنے کے بعد ہوگا۔ لیکن گردوپیش کے حالات اور خارجی اثرات کے سامنے بسا اوقات اصل فطرت دب جاتی ہے جس کو حدیث میں "فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْيُنَصِّرَانِهٖ" سے تعبیر کیا ہے پھر جس طرح ایمان وطاعت کا بیج اس کے جوہر فطرت میں غیر مرئی طور پر رکھ دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت اس کو ایمان تو کیا موٹی موٹی محسوسات کا ادراک وشعور بھی نہیں تھا۔ اسی طرح خارجی اثراندازی کی ابتداء بھی ولادت کے بعد ایک قسم کے مس شیطانی سے غیر محسوس طور پر ہوگئی۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اس مس شیطانی کا اثر قبول کرے یا قبول کرلے تو آئندہ چل کر وہ برابر باقی رہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا تکفل چونکہ حق تعالیٰ نے کیا ہے اس لئے اگر فرض کرو ابتدائے ولادت میں یہ صورت ان کو پیش آئی ہو اور مریم وعیسیٰ کی طرح اس ضابطہ سے مستثنیٰ نہ ہوں تو اس میں پھر بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان مقدس ومعصوم بندوں پر شیطان کی اس حرکت کا کوئی مضر اثر قطعاً نہیں پڑ سکتا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ مریم وعیسیٰ علیہ السلام کو کسی مصلحت سے یہ صورت سرے سے پیش ہی نہ آئی ہو۔ اوروں کو پیش آئی مگر اثر نہ ہوا۔ اس قسم کے جزئی امتیازات فضیلت کلی ثابت کرنے کا موجب نہیں ہو سکتے۔ حدیث میں ہے کہ دو بچیاں کچھ اشعار گا رہی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر سے منہ پھیر لیا۔ ابوبکرؓ آئے مگر لڑکیاں بدستور مشغول رہیں، اسکے بعد حضرت عمرؓ آئے۔ لڑکیاں اٹھ کر بھاگ گئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "عمر جس راستہ پر چلتا ہے شیطان وہ راستہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے" کیا اس سے کوئی خوش فہم یہ مطلب لے سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ کو اپنے سے افضل ثابت کر رہے ہیں۔ ہاں ابوہریرہؓ کا مس شیطان کی حدیث کو آیت ہذا کی تفسیر بنانا بظاہر چسپاں نہیں ہوتا۔ الا یہ کہ آیت ﴿وَاِنِّىۡۤ اُعِيۡذُهَا بِكَ﴾ الخ میں واؤ عطف کو ترتیب کے لئے نہ سمجھا جائے۔ یا حدیث میں استثناء سے صرف مسیح کے مریم سے پیدا ہونے کا واقعہ مراد ہو۔ مریم ومسیح الگ الگ مراد نہ ہوں۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں صرف حضرت عیسیٰ کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

ف۳ یعنی گو لڑکی تھی مگر حق تعالیٰ نے لڑکے سے بڑھ کر اسے قبول فرمایا۔ بیت المقدس کے مجاورین کے دلوں میں ڈال دیا کہ عام دستور کے خلاف لڑکی کو قبول کرلیں۔ اور ویسے بھی مریم کو مقبول صورت بنایا اور اپنے مقبول بندہ زکریا کی کفالت میں دیا اور اپنی بارگاہ میں حسن قبول سے سرفراز کیا۔ جسمانی، روحانی، علمی، اخلاقی =

وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۖ اِنَّ

اس کے پاس کچھ کھانا ف۱ کہا اے مریم کہاں سے آیا تیرے پاس یہ کہنے لگی یہ اللہ کے پاس سے آتا ہے

پاتا اس پاس کچھ کھانا، بولا، اے مریم! کہاں سے آیا تجھ کو یہ؟ کہنے لگی، یہ اللہ کے پاس سے۔

اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے قیاس ف۲

اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے قیاس۔

قصہ حضرت مریم و حضرت عیسیٰ علیہما السلام

قال تعالیٰ: ﴿اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ ... الی ... بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

ربط:...... گزشتہ آیات میں حق تعالیٰ کے چند محب اور محبوب بندوں کا اجمالاً ذکر تھا اب اس کی تفصیل شروع ہوتی ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے آل عمران کا قصہ ذکر فرمایا جس سے مقصود یہ ہے کہ اہل کتاب کے دو بڑے گروہ یہود اور نصاریٰ دونوں کے خیالات اور مزعومات فاسدہ کا اور ان کی افتراء پردازیوں کا فیصلہ کر دیا جائے۔ یہود بے بہبود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں غایت درجہ تفریط کی ان کو ان کی شان عالی سے گھٹایا، اور ان کو کاہن اور جادوگر بتلایا اور نصاریٰ نے افراط کی یعنی ان کی تعظیم میں غلو اور مبالغہ کیا کہ ان کی ابنیت اور الوہیت کے قائل ہوئے اس لیے حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور طفولیت اور ان کی کہولیت اور ان کے بشری احوال کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا تا کہ یہ امر خوب واضح ہو جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنس بشر سے ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت سے ہیں۔ معاذ اللہ خدا اور خدا کے بیٹے نہیں اس لیے کہ احوال بشریت اور اطوار انسانیت سے گزرنا الوہیت اور ابنیت کے قطعاً منافی ہے حق تعالیٰ احوال اور تغیرات سے پاک اور منزہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر خدا ہوتے تو ماں کے پیٹ سے پیدا نہ ہوتے اور نہ ماں کی گود میں پرورش پاتے۔ الغرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور طفولیت اور کہولیت کو نصارائے نجران کے عقیدۂ الوہیت اور ابنیت کے ابطال کے لیے ذکر فرمایا۔

بعد ازاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور ان کے فضائل اور معجزات اور رفع الی السماء کو یہود کے رد کے لیے بیان فرمایا تا کہ یہود بے بہبود یہ سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو عزت دیتا ہے اور ان کے دشمنوں کو ذلیل اور خوار کرتا ہے

= ہر حیثیت سے غیر معمولی طور پر بڑھا یا جب مجاورین میں اسکی پرورش کے متعلق اختلاف ہوا تو قرعہ انتخاب حضرت زکریا کے نام نکال دیا۔ تا کہ لڑکی اپنی خالہ کی آغوش شفقت میں تربیت پائے اور زکریا کے علم و دیانت سے مستفید ہو۔ زکریا علیہ السلام نے پوری مراعاۃ اور جدوجہد کی۔ جب مریم سیانی ہوئیں تو مسجد کے پاس ان کے لئے ایک حجرہ مخصوص کر دیا۔ مریم دن بھر وہاں عبادت وغیرہ میں مشغول رہتی اور رات اپنی خالہ کے گھر گزارتی۔

ف۱ اکثر سلف کے نزدیک "رزق" سے مراد ظاہری کھانا ہے کہتے ہیں مریم کے پاس بے موسم میوے آتے گرمی کے پھل سردی میں، سردی کے گرمی میں۔ اور مجاہد سے ایک روایت ہے کہ "رزق" سے مراد علمی صحیفے ہیں جن کو روحانی غذا کہنا چاہیے۔ بہرحال اب کھلم کھلا مریم کی برکات و کرامات اور غیر معمولی نشانات ظاہر ہونے شروع ہوئے جن کا بار بار مشاہدہ ہونے پر زکریا علیہ السلام سے نہ رہا گیا اور از راہ تعجب پوچھنے لگے کہ مریم! یہ چیزیں تم کو کہاں سے پہنچتی ہیں۔

ف۲ یعنی خدائی قدرت اسی طرح مجھ کو یہ چیزیں پہنچاتی ہے جو قیاس و گمان سے باہر ہے۔

اور مال اور اولاد کی کثرت ان کے کچھ کام نہیں آتی۔ حق تعالیٰ کو یہ بھی قدرت ہے کہ اپنے کسی دوست کو دشمنوں کے نرغہ سے نکال کر آسمان پر لے جائے اور دشمنوں ہی میں سے کسی کو اپنے دوست کے ہم شکل بنا کر پھانسی پر لٹکوا دے اور تا کہ ان باتوں سے یہود یہ سمجھ جائیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقبول اور برگزیدہ بندے اور رسول برحق تھے اور کاہن اور ساحر نہ تھے غرض یہ کہ اس طریق سے یہود اور نصاریٰ دونوں کا خوب رد ہو گیا اور دونوں گروہ کے عقیدہ کا فاسد اور باطل ہونا خوب واضح ہو گیا۔

یا یوں کہو کہ ان حضرات انبیاء و مرسلین کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت اور رضا اور خوشنودی کا ذریعہ ان حضرات کا اتباع اور اطاعت ہے اور خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ نبی کی اطاعت ہے۔ ﴿فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾۔ اور صحیح دین بھی وہی ہے جو ان حضرات کا تھا اور وہی دین اسلام ہے اور جو دین تم نے اختیار کیا ہوا ہے وہ انبیاء و مرسلین کا دین نہیں، انبیاء و مرسلین کا دین بھی دین اسلام ہے جس کی طرف تم کو نبی آخر الزمان بلا رہے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ عمران کی بی بی نے جن کا نام حنہ بنت فاقوذا تھا اپنے زمانہ کے رواج کے مطابق حالت حمل میں یہ منت مانی کہ اے میرے پروردگار میں نے آپ کے لیے نذر کیا وہ بچہ جو میرے شکم میں ہے تیری عبادت کے لیے اور تیرے گھر کی خدمت کے لیے آزاد ہوگا۔ ماں باپ اس سے اپنی کوئی خدمت نہ لیں گے۔ باقی تمام دنیوی مشاغل سے آزاد ہو کر فقط تیری عبادت اور تیرے گھر کی خدمت میں لگا رہے گا پس تو اپنی رحمت سے میری اس نذر کو قبول فرمالے۔ تحقیق تو میری عرض و معروض کو سن رہا ہے اور میری نیت اور اخلاص کو جاننے والا ہے اس لطیف اور پاکیزہ عنوان سے دعا مانگنے میں اشارہ اس طرف تھا کہ مجھ کو فرزند عطا فرما کیونکہ لڑکیاں اس خدمت کے لیے قبول نہیں کی جاتی تھیں۔ پس جب خلاف توقع لڑکی جنی تو نہایت حسرت سے کہا اے میرے پروردگار میں نے تو اس حمل کو لڑکی کو جنا میری نذر تو اب کیا پوری ہوگی اس لیے کہ لڑکی قبول کرنے کا دستور نہ تھا۔ امرأۃ عمران تو حسرت کر رہی تھیں اور اللہ کو بہتر معلوم ہے کہ جو کچھ اس نے جنا۔ اور وہ فرزند جس کی وہ خواہش کرتی تھیں اس دختر کے برابر نہیں جو من جانب اللہ ان کو دی گئی۔

ف:...... یہ درمیان میں بطور جملہ معترضہ قول خداوندی ہے اور مطلب یہ ہے کہ عمران کی بیوی کی حسرت اس بناء پر ہے کہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ یہ لڑکی کس شان اور مرتبہ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ یہ لڑکی کیسی مبارک اور مسعود ہے اور اس کے وجود میں ایک ایسے عظیم الشان فرزند ارجمند کا وجود مخفی اور مضمر ہے جو خیر و برکت میں اس کے وہم و گمان سے کہیں بالا اور برتر ہے یہاں تک بطور جملہ معترضہ کلام خداوندی تھا اب آگے پھر عمران کی بی بی کا قول ہے اور تحقیق میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا۔ مریم کے معنی ان کی زبان میں عابدہ یعنی عبادت کرنے والی کے تھے حضرت حنہ کا مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ مریم کو اسم بامسمیٰ بنادے اور یہ عرض کیا کہ بارالہا میں مریم کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے شر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی ہی کو لڑکے کے عوض قبول فرمالیا نہایت عمدہ قبول کے ساتھ یعنی لڑکوں سے بڑھ کر اس لڑکی کو قبول فرمالیا اور مجاورین بیت المقدس نے بھی باوجود خلاف دستور ہونے کے اسی لڑکی کو قبول کر لیا اور مریم علیہا السلام کا لڑکی ہونا قبولیت کے لیے مانع نہ ہوا اور بڑھایا اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی کو اچھی طرح بڑھانا یعنی ان کی ظاہر اور باطنی تربیت فرمائی اور ان کی بالیدگی کو ایسا مکمل کیا کہ کوئی چیز ان کو بگاڑ نہ سکے اور ان کی قبولیت اور انبات حسن یعنی ان کی تربیت کی ایک صورت یہ پیدا فرمائی کہ اپنے ایک مقبول اور برگزیدہ بندہ یعنی حضرت

زکریا کو ان کا کفیل اور خبر گیر بنا دیا اور جب حضرت مریم کچھ سیانی ہو گئیں تو حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کے لیے مسجد کے قریب ایک حجرہ مخصوص کر دیا جو محراب کے قریب تھا جس میں رہ کر دن بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتیں جب کبھی حضرت زکریا مریم کے پاس محراب یعنی حجرہ میں آتے تو ان کے نزدیک کچھ کھانا رکھا ہوا پاتے۔ جس کا ظاہر میں کوئی سبب نہ تھا کیونکہ وہ کھانا نہ تو ان کے گھر کا تھا اور نہ باہر کا اس لیے کہ حضرت زکریا علیہ السلام جب چلے جاتے تھے تو حجرہ کا دروازہ بند کر دیتے تھے اور پھر تعجب یہ تھا کہ ان کے سامنے غیر موسم کا پھل رکھا ہوا دیکھتے سردیوں کا میوہ گرمیوں میں اور گرمیوں کا سردی میں اس لیے حضرت زکریا نے تعجب سے کہا اے مریم یہ تیرے لیے کہاں سے آیا مریم بولی یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے اللہ جس کو چاہے بغیر قیاس اور بغیر اندازہ اور بغیر وہم و گمان کے روزی دے اس کے رزق دینے کے لیے کسی ظاہری سبب کی ضرورت نہیں۔

فوائد

۱۔ صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے پیدا ہوتے وقت شیطان اس کو مس کرتا ہے یعنی چھوتا ہے جس سے وہ روتا ہے۔ مگر حضرت مریم اور ان کے بیٹے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سو یہ دونوں اس سے مستثنیٰ رہے اور چونکہ امراۃ عمران کی یہ دعا استعاذہ عین ولادت کے ساتھ تھی اس لیے اس وقت تک شیطان کا مس واقع نہ ہوا تھا اگرچہ قرآن کریم میں امراۃ عمران کی اس دعاء استعاذہ کا ذکر بعد ولادت کے واقع ہوا لیکن واو ترتیب وقوعی پر دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا اب یہ اشکال نہیں رہا کہ امراۃ عمران کی یہ دعا تو ولادت کے بعد ہوئی اور مس شیطان اس سے پہلے عین وضع حمل اور ولادت کے وقت ہوتا ہے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ دعا تو عین ولادت کے وقت تھی مگر قرآن کریم میں ذکر اس دعا کا بعد میں ہے یہ دعا ذکر میں مؤخر ہے اور وقوع میں مقدم ہے۔

۲۔ ولادت کے وقت شیطان ہر بچہ کو مَس کرتا ہے سوائے مریم اور ان کے بیٹے کے۔ لیکن عباد مخلصین کو یہ مس شیطانی کوئی ضرر نہیں پہنچاتا اور نہ اس مس سے ان کی عصمت اور نزاہت میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ اس ایک خاص خصوصیت کی بناء پر حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی اور انبیاء کرام علیہم السلام پر افضلیت ثابت ہوتی ہے۔

یہ امر بدیہی اور مسلم ہے کہ حضرت مریم، شان اور رتبہ میں ابراہیم خلیل اللہ اور موسیٰ کلیم اللہ علیہما السلام سے اعلیٰ اور افضل نہیں اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں یہ نہیں آیا کہ شیطان نے ان کو مس نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو خلت اور تکلیم سے سرفراز فرمایا اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت سے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کو مس شیطانی سے مستثنیٰ فرمایا اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام جو خدا کے مقدس اور معصوم بندے ہیں اگرچہ وہ اس ضابطہ سے مستثنیٰ نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں اس لیے کہ ان عباد مخلصین پر شیطان کی کوئی حرکت کارگر نہیں۔

حدیث میں ہے کہ جس راستہ پر عمر رضی اللہ عنہ چلتا ہے شیطان وہ راستہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے کیا کوئی خوش فہم اس سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل تھے اور معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ نہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھ سے

بھی افضل ہیں، بلکہ اس سے مقصود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک خاص فضیلت اور خاص خصوصیت بیان کرنی تھی۔ الغرض اس قسم کے خصوصی امتیازات سے فضیلت تو ثابت ہوتی ہے لیکن افضلیت ثابت نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو خاص خصوصیت دی ہے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ

وہیں دعا کی زکریا نے اپنے رب سے کہا اے رب میرے عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے اولاد پاکیزہ بیشک تو سننے والا ہے

وہاں دعا کی زکریا نے اپنے رب سے۔ کہا، اے رب میرے! عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے اولاد پاکیزہ، بیشک تو سننے والا ہے

الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ

دعا کو ف۱ پھر اس کو آواز دی فرشتوں نے جب وہ کھڑے تھے نماز میں حجرے کے اندر کہ اللہ تجھ کو خوشخبری دیتا ہے

دعا۔ پھر اس کو آواز دی فرشتوں نے، جب وہ کھڑا تھا نماز میں حجرے کے اندر، کہ اللہ تجھ کو خوشخبری دیتا ہے

بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ

یحییٰ کی ف۲ جو گواہی دیگا اللہ کے ایک حکم کی ف۳ اور سردار ہوگا اور عورت کے پاس نہ جائیگا ف۴ اور نبی ہوگا صالحین سے ف۵ کہا

یحییٰ کی، جو گواہی دے گا اللہ کے حکم کی، اور سردار ہوگا اور عورت پاس نہ جاوے گا، اور نبی ہوگا نیکوں میں۔ بولا،

رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ

اے رب کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور پہنچ چکا مجھ کو بڑھاپا اور عورت میری بانجھ ہے فرمایا اسی طرح اللہ

اے رب! کہاں سے ہوگا مجھ کو لڑکا؟ اور مجھ پر آیا بڑھاپا اور عورت میری بانجھ ہے۔ فرمایا اسی طرح اللہ

يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ

کرتا ہے جو چاہے ف۶ کہا اے رب مقرر کر میرے لئے کچھ نشانی ف۷ فرمایا نشانی تیرے لئے یہ ہے کہ نہ بات کریگا تو لوگوں سے تین

کرتا ہے جو چاہے۔ بولا، اے رب! مجھ کو دے کوئی نشانی۔ کہا، نشانی تیری یہ کہ نہ بات کرے تو لوگوں سے تین

ف۱ حضرت زکریا علیہ السلام بالکل بوڑھے ہو چکے تھے، ان کی بیوی بانجھ تھی، اولاد کی کوئی ظاہری امید نہ تھی۔ مریم کی نیکی و برکت اور یہ غیر معمولی خوراک دیکھ کر دفعۃً قلب میں ایک جوش اٹھا اور فوری تحریک ہوئی کہ میں بھی اولاد کی دعا کروں۔ امید ہے مجھے بھی بے موسم میوہ مل جائے۔ یعنی بڑھاپے میں اولاد مرحمت ہو۔

ف۲ دعا، قبول ہوئی، بشارت ملی کہ لڑکا ہوگا، جس کا نام یحییٰ رکھا گیا۔

ف۳ ایک حکم سے یہاں حضرت مسیح علیہ السلام مراد ہیں جو خدا کے حکم سے بدون باپ کے پیدا ہوئے۔ حضرت یحییٰ لوگوں کو پہلے سے خبر دیتے تھے کہ مسیح پیدا ہونے والے ہیں۔

ف۴ یعنی لذات و شہوات سے بہت زیادہ رکنے والا ہوگا۔ اللہ کی عبادت میں اس قدر مشغول رہے گا کہ عورت کی طرف التفات کرنے کی نوبت نہ آئے گی، یہ حضرت یحییٰ کا مخصوص حال تھا، جس سے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی ضابطہ نہیں بن سکتا۔ ہمارے پیغمبر علیہ السلام کا اعلیٰ امتیاز یہ ہے کہ کمال معاشرت کے ساتھ کمال عبادت کو جمع فرمایا۔

ف۵ یعنی صلاح و رشد کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوگا جسے نبوت کہتے ہیں یا "صالح" کے معنی "شائستہ" کے لئے جائیں یعنی نہایت شائستہ ہوگا۔

ف۶ یعنی اس کی قدرت و مشیت سلسلۂ اسباب کی پابند نہیں۔ گو اس عالم میں اس کی عادت یہ ہے کہ اسباب عادیہ سے مسببات کو پیدا کرے لیکن کبھی کبھی اسباب عادیہ=

اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع ۱۲

دن مگر اشارہ سے ف۱ اور یاد کر اپنے رب کو بہت اور تسبیح کر شام اور صبح ف۲

دن، مگر اشارت سے۔ اور یاد کر اپنے رب کو بہت اور تسبیح کر شام اور صبح۔

قصہ دعاء زکریا علیہ السلام برائے فرزند ارجمند

قَالَ تَعَالٰی: ﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ... الی ... وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ﴾

حضرت زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو چکے تھے اور اولاد سے ناامید ہو چکے تھے جب حضرت مریم کے پاس بے موسم پھل دیکھے تو یکا یک دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں بھی اولاد کی دعا کروں اللہ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ مجھ کو بھی بے موسم میوہ مل جائے (یعنی بڑھاپے میں اولاد مرحمت ہو جائے) کیونکہ مرد پیر اور زن عاقر سے اولاد کا پیدا ہونا بھی ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ گرمیوں میں جاڑوں کے پھلوں کا مہیا ہو جانا اس لیے کہ اللہ کی قدرت اور ارادہ کے لیے کسی سبب کا پایا جانا شرط نہیں پس اس وقت اور موقع کو دیکھ کر حضرت زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا مانگی کہ اے پروردگار جس طرح مریم پر تیری رحمت کی بارش ہوئی ہے اور قدرت کے کرشمے نمودار ہو رہے ہیں مجھ کو اپنے پاس سے بلا کسی سبب ظاہری کے پاکیزہ اولاد عطا فرما جو نفسانی اور شہوانی خیالات سے پاک اور منزہ ہو اور جسمانی اور روحانی دونوں حیثیتوں سے میرا فرزند ہو جو میرے بعد ظاہراً اور باطناً میرا قائم مقام اور جانشین ہو تحقیق آپ بڑے دعا کے سننے والے ہیں۔ یعنی قبول کرنے والے ہیں پس آواز دی ان کو فرشتوں نے درآنحالیکہ حضرت زکریا محراب میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں کہ آپ کے ایک لڑکا ہوگا جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ جن میں خاص طور پر یہ پانچ صفتیں ہوں گی۔

۱- پہلی صفت یہ ہوگی کہ وہ کلمۃ اللہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کلمہ کُن یعنی حکم خداوندی سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ اس وجہ سے ان کو کلمۃ اللہ کہنے لگے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سال یا چھ ماہ بڑے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی سب سے پہلے

= کے خلاف غیر معمولی طریقہ سے کسی چیز کا پیدا کر دینا بھی اس کی خاص عادت ہے، اصل یہ ہے کہ مریم صدیقہ کے پاس خارق عادت طریقہ سے رزق کا پہنچنا اور بہت سے غیر معمولی واقعات کا ظہور پذیر ہونا، یہ دیکھ کر مریم کے حجرہ میں بیساختہ حضرت زکریا کا دعا مانگنا پھر انکو اور ان کی بانجھ عورت کو بڑھاپے میں غیر معتاد طور پر اولاد ملنا، ان سب نشانات کو قدرت کی طرف سے اس عظیم الشان آیت الٰہیہ کی تمہید سمجھنا چاہیے جو مریم کے وجود سے بدون قربان زوج مستقبل قریب میں ظاہر ہونے والی تھی گویا حضرت یحییٰ کی غیر معتاد ولادت پر كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ فرمانا تمہید تھی كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ کی جو آگے حضرت مسیح کی غیر معتاد ولادت کے سلسلہ میں آیا چاہتا ہے۔

فے جس سے معلوم ہو جائے کہ اب حمل قرار پا گیا ہے تا کہ قرب ولادت کے آثار دیکھ کر مسرت تازہ حاصل ہو، اور شکر نعمت میں بیش از بیش مشغول رہوں۔

ف۱ یعنی جب تجھ کو یہ حالت پیش آئے کہ تین دن رات لوگوں سے بجز اشارہ کے کوئی کلام نہ کر سکے اور تیری زبان خالص ذکر الٰہی کے لئے وقف ہو جائے تو سمجھ لینا کہ اب استقرار حمل ہو گیا۔ سبحان اللہ نشانی بھی ایسی مقرر کی کہ نشانی کی نشانی ہو اور اطلاع پانے سے جو غرض تھی (شکر نعمت) وہ علیٰ وجہ الکمال حاصل ہو جائے گویا خدا کے ذکر و شکر کے سوا چاہیں بھی تو زبان سے دوسری بات نہ کر سکیں۔

ف۲ یعنی اس وقت خدا کو بہت کثرت سے یاد کرنا اور صبح و شام تسبیح و تہلیل میں لگے رہنا معلوم ہوتا ہے کہ آدمیوں سے کلام نہ کر سکنا گو اضطراری تھا تا کہ ان دنوں میں محض ذکر و شکر کے لئے فارغ کر دیئے جائیں لیکن خود ذکر میں مشغول رہنا اضطراری نہ تھا، اسی لئے اس کا امر فرمایا گیا۔

تصدیق کرنے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام تھے حضرت یحییٰ علیہ السلام لوگوں کو پہلے خبر دیتے تھے کہ حضرت مسیح پیدا ہونے والے ہیں۔

۲- دوسری صفت اس مولود میں یہ ہوگی کہ وہ اپنی قوم کا سردار ہوگا یعنی اپنی قوم میں علم اور حلم اور کرم اور تقویٰ اور زہد اور عبادت اور تمام عمدہ خصلتوں میں سب سے بڑھے ہوئے ہوں گے۔

۳- تیسری صفت ان میں یہ ہوگی کہ وہ عورتوں سے بے رغبت ہوں گے یعنی لذتوں سے اتنے دور ہوں گے کہ جو لذتیں شرعاً وعقلاً جائز اور مباح ہیں مثلاً نکاح ان سے بھی علیحدہ اور یکسو ہوں گے۔

۴- چوتھی صفت ان میں یہ ہوگی کہ وہ نبی ہوں گے۔

۵- پانچویں صفت یہ ہوگی کہ وہ نیکوکاروں میں سے ہوں گے یعنی اس گروہ سے ہوں گے جو سرتاپا صلاح اور نیکی تھے اور صغیرہ اور کبیرہ سے معصوم تھے۔ جاننا[1] چاہیے کہ یہاں صلاح سے وہ معمولی درجہ کی صلاح مراد نہیں جو عام مومنین صالحین کو حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ اعلیٰ درجہ کی صلاح مراد ہے جو منصب نبوت کے شایان شان ہو اور زجاج[2] سے منقول ہے کہ صالح وہ شخص ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو کما حقہ ادا کرتا ہو۔ (تفسیر قرطبی: ۴/ ۷۹)

اور بعض نے من الصالحین کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ صالحین سے انبیاء مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اولاد انبیاء سے ہوں گے۔

الغرض جب فرشتوں نے حضرت زکریا کو یہ مژدہ سنایا تو حضرت زکریا علیہ السلام نے فرط مسرت سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میرے لڑکا کیسے ہوگا اور تحقیق میری حالت تو یہ ہے کہ مجھ پر تو بڑھاپا آچکا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ میری عمر ایک سو بیس سال کی ہے اور بیوی کی عمر اٹھانوے سال کی ہے۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے دریافت کرنے کے طور پر یہ عرض کیا اور مقصود یہ تھا کہ فرزند کے پیدا ہونے کی کیا صورت ہوگی کیا مجھ کو اور میری بیوی کو جوان کر دیا جائے گا یا دوسری بیوی سے یہ بچہ عنایت ہوگا یا ہم دونوں کو اسی پیرانہ سالی کی حالت میں رکھ کر بچہ عنایت ہوگا حق تعالیٰ نے جواب میں فرمایا اسی طرح اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے اس کی قدرت ومشیت سلسلۂ اسباب کی پابند نہیں وہ بغیر اسباب کے بعد بھی جو چاہتا ہے کرتا ہے زکریا علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دیجیے جس سے معلوم ہو جائے کہ حمل قرار پا گیا تا کہ آثار ولادت دیکھ کر تیری نعمت کے شکر میں مشغول ہو جاؤں اور شکر کی بدولت اور مزید نعمت کا مستحق ہو سکوں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارہ سے اور اس وقت اگر چہ لوگوں سے بات کرنے کی قدرت نہ ہوگی سوا اس وقت تم اللہ کو کثرت سے یاد کرنا اور صبح وشام اس کی تسبیح میں لگے رہنا سبحان اللہ کیا نشانی ہے نشانی کی نشانی بھی ہے اور نشانی سے جو غرض تھی (یعنی شکر نعمت) وہ بھی پوری حاصل ہے۔ اور پھر اس پر لطف یہ کہ ذکر اور تسبیح کو تو اختیاری رکھا اور لوگوں سے بات کرنے کی قدرت ہی نہ رہی۔ تا کہ سوائے خدا کے ذکر وشکر کے کچھ کر ہی نہ سکیں پس ایک ہی چیز دونوں غرضوں کی

[1] والصلاح صفة تنتظم الخير كله والمراد به هنا ما فوق الصلاح الذى لا بد منه فى منصب النبوة البتة من اقاصى مراتبه كذا فى روح المعانى ۳/ ۱۴۱ و البحر المحيط ۲/ ۴۵۰ و تفسیر کبیر ۲/ ۶۲۳۔

[2] قال الزجاج الصالح الذى يؤدى لله ما افترض عليه وإلى الناس حقوقهم (تفسیر قرطبی ۴/ ۷۹)

علامت بن گئی حصول ولد اور شکر نعمت۔

ف ۱:...... حضرت زکریا علیہ السلام کو حق جل شانہ کی قدرت میں کوئی شک اور تردد نہ تھا ان کو یقین کامل تھا کہ حق تعالیٰ بڑھاپے میں بھی اولاد عطا فرما سکتے ہیں لیکن بڑھاپے میں بانجھ عورت سے اولاد کا ہونا خارق عادت ہے اس لیے بارگاہِ خداوندی میں خارق عادت امر کی درخواست کو خلاف ادب سمجھ کر سکوت کیا مگر جب حضرت مریم کی خارق عادت احوال کا مشاہدہ کیا تو اس نوع کی درخواست کی دل میں ہمت پیدا ہوئی اور عرض کیا کہ اے پروردگار مجھ کو ایک ولد صالح عطا فرمائیں جب حق تعالیٰ کی طرف سے بشارت آئی تو فرط مسرت سے عرض کیا ﴿أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ﴾ معاذ اللہ حضرت زکریا کو قدرت خداوندی میں کوئی شک نہ تھا بلکہ چونکہ ناامیدی کے بعد ایک خارقِ عادت امر کی بشارت ملی اس لیے اس مسرت میں اس کی کیفیت دریافت کرنے لگے تاکہ اس کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے اور نیز اس سوال کے جواب میں جب اس کیفیت کو بتلایا جائے گا تو حصولِ ولد کی بشارت اس مکرر بیان سے اور پختہ ہو جائے گی۔ بادشاہ اگر کسی شخص کو کوئی بشارت دے اور وہ شخص جوشِ مسرت میں بادشاہ سے یہ سوال کرے کہ حضور کے اس انعام سراپا اکرام کی کیا صورت ہوگی تو اس کا یہ سوال بادشاہ کی قدرت میں شک کی بناء پر نہیں بلکہ بطور لذت و فرحت ہے نیز جو چیز انسان کو تمنا اور آرزو کے بعد بحالت ناامیدی ملتی ہے اس کو سن کر خوشی میں مدہوش ہو جاتا ہے اور مختلف عنوان سے اس کو دریافت کرتا ہے تاکہ قلب کو خوب اطمینان ہو جائے اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام کے سوال کو سمجھئے۔

ف ۲:...... بعض [۱] کہتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام عنین تھے مگر صحیح یہ ہے کہ وہ عنین نہ تھے۔ اول اس لیے کہ حصور مبالغہ کا صیغہ ہے حصر سے مشتق ہے جو فعل متعدی ہے جس کے معنی اپنے اختیار سے روکنے کے ہیں اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حصور اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنے اختیار سے اپنے آپ کو شہوات اور لذات کے اتباع سے روکنے والے تھے۔ دوم یہ کہ حق تعالیٰ نے حصور کی صفت کو مقام مدح و ثناء میں ذکر کیا اور قابل تعریف، فعل اختیاری ہوتا ہے نہ کہ فعل اضطراری اور عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے کہ حصور وہ شخص ہے کہ جو باوجود قدرت کے عورت کے قریب نہ جاتا ہو۔ (تفسیر قرطبی: ۴/۷۸)

ف ۳:...... نکاح نہ کرنا غالباً یہ حضرت یحییٰ کی خصوصیت تھی ورنہ تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں نکاح کرنا افضل ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اگرچہ رفع الی السماء سے پہلے نکاح نہیں فرمایا لیکن نزول من السماء کے بعد نکاح فرمائیں گے جیسا کہ احادیث میں مصرح ہے۔

نکتہ:...... بعض ائمہ تفسیر نے لکھا ہے کہ مریم اس عورت کو کہتے ہیں کہ جس کو مردوں کی حاجت نہ ہو۔ لہٰذا گمان یہ ہے کہ چونکہ حضرت زکریا علیہ السلام نے فرزند کی یہ دعا حضرت مریم کے زمانہ تربیت میں مانگی اس لیے انہیں جیسا ایک فرزند حصور عطا کیا گیا کہ جس کو عورتوں کی ضرورت نہ ہو۔ واللہ اعلم

[۱] قال ابن مسعود وابن عباس وابن جبیر وقتادة وعطاء وابو الشعثاء والحسن والسدی وابن زید الحصور هو الذی یکف عن النساء ولا یقربهن مع القدرة وهذا اصح لوجهین احدهما انه مدح وثناء علیه والثناء انما یکون من الفعل المکتسب دون الجبلة فی الغالب والثانی ان فعولا فی اللغة من صیغ الفاعلین فالمعنی انه یحصر نفسه عن الشهوات. (تفسیر قرطبی: ۴/۷۸)

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ

اور جب فرشتے بولے اے مریم اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور ستھرا بنایا اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی

جب فرشتے بولے، اے مریم ! اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور ستھرا بنایا، اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی

الْعٰلَمِيْنَ ۝٤٢ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝٤٣ ذٰلِكَ مِنْ

عورتوں پر ف۱ اے مریم بندگی کر اپنے رب کی اور سجدہ کر ف۲ اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے ف۳ یہ

عورتوں ۔ ۔ اے مریم ! بندگی کر اپنے رب کی اور سجدہ کر، اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔ یہ خبریں

أَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ إِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُوْنَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ

خبریں غیب کی ہیں جو ہم بھیجتے ہیں تجھ کو ف۴ اور تو نہ تھا ان کے پاس جب ڈالنے لگے اپنے قلم کہ کون

غیب کی ہیں ہم بھیجتے ہیں تجھ کو۔ اور تو نہ تھا ان کے پاس، جب ڈالنے لگے اپنے قلم، کہ کون پا

يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝٤٤ إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ

پرورش میں لے مریم کو اور تو نہ تھا ان کے پاس جب وہ جھگڑتے تھے ف۵ جب کہا فرشتوں نے اے مریم

لے مریم کو ؟ اور تو نہ تھا ان کے پاس جب وہ جھگڑتے تھے۔ جب کہا فرشتوں نے، اے مریم !

ف۱ حضرت زکریا ویحیٰی علیہما السلام کا قصہ جو ضمنی مناسبات سے درمیان میں آ گیا تھا اور جس میں اصطفاء آل عمران کی تاکید اور حضرت مسیح علیہ السلام کے قصہ کی تمہید تھی، یہاں ختم کر کے پھر مریم ومسیح کے واقعات کی طرف کلام منتقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ مسیح سے پہلے ان کی والدہ کا فضل وشرف ذکر فرماتے ہیں یعنی فرشتوں نے مریم سے کہا کہ اللہ نے تجھے پہلے دن سے چھانٹ لیا کہ باوجود لڑکی ہونے کے اپنی نیاز میں قبول کیا۔ طرح طرح کے احوال رفیعہ اور کرامات سنیہ عنایت فرمائیں۔ ستھرے اخلاق، پاک طبیعت اور ظاہری و باطنی نزاہت عطا فرما کر اپنی مسجد کی خدمت کے لائق بنایا۔ اور جہان کی عورتوں پر تجھ کو بعض وجوہ سے فضیلت بخشی۔ مثلاً ایسی استعداد رکھی کہ بدون مس بشر تنہا اس کے وجود سے حضرت مسیح جیسے اولو العزم پیغمبر پیدا ہوں۔ یہ امتیاز دنیا میں کسی عورت کو حاصل نہیں ہوا۔

ف۲ یعنی خدا نے جب ایسی عزت اور بلند مرتبہ تجھ کو عطا فرمایا تو چاہیے کہ ہمیشہ اخلاص وتذلل کے ساتھ اپنے پروردگار کے آگے جھکی رہے اور وظائف عبودیت کے انجام دینے میں بیش از بیش سرگرمی دکھلائے تاکہ حق تعالیٰ نے تجھے جس امر عظیم کے بروئے کار لانے کا ذریعہ تجویز کیا ہے وہ ظہور پذیر ہو۔

ف۳ جیسے راکعین خدا کے آگے رکوع کرتے ہیں، تو بھی اسی طرح رکوع کرتی رہ۔ یا یہ مطلب ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کر اور چونکہ کم از کم رکوع میں امام کے ساتھ شریک ہونے والا اس رکعت کو پانے والا سمجھا جاتا ہے، شاید اس لئے نماز کو بعنوان رکوع تعبیر کیا گیا ہے۔ کما یفهم من کلام ابن تیمیه فی فتاواہ۔ واللہ اعلم۔ اس تقدیر پر اگر "اقنتی" میں "قنوت" سے قیام مراد لیں تو قیام، رکوع، سجود تینوں ہیئات صلوٰۃ کا ذکر آیت میں ہو جائے گا۔

(تنبیہ) ممکن ہے اس وقت عورتوں کو عام طور پر جماعت میں شریک ہونا جائز یا خاص فتنہ سے مامون ہونے کی صورت میں اجازت ہو یا مریم کی خصوصیت ہو یا مریم اپنے حجرہ میں رہ کر تنہا یا دوسری عورتوں کے ہمراہ امام کی اقتداء کرتی ہوں۔ سب احتمالات ہیں۔ واللہ اعلم۔

ف۴ یعنی ظاہری حیثیت سے آپ کچھ پڑھے لکھے نہیں، پہلے سے اہل کتاب کی کوئی معتدبہ صحبت نہیں رہی جن سے واقعات ماضیہ کی ایسی تحقیقی معلومات ہو سکیں۔ اور صحبت رہتی بھی تو کیا تھا، وہ لوگ خود ہی اوہام وخرافات کی اندھیریوں میں پڑے بھٹک رہے تھے کسی نے عداوت میں اور کسی نے حد سے زیادہ محبت میں آ کر صحیح واقعات کو مسخ کر رکھا تھا، پھر اندھے کی آنکھ سے روشنی حاصل ہونے کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ اندریں حالات "مدنی" اور "مکی" دونوں قسم کی سورتوں میں ان واقعات کو ایسی صحت اور بسط وتفصیل سے سنانا جو بڑے بڑے مدعیان علم کتاب کی آنکھوں میں چکا چوند کر دیں اور کسی کو مجال انکار باقی نہ رہے اسکی کھلی دلیل ہے کہ بذریعہ وحی آپ کو یہ علم دیا گیا تھا کیونکہ آپ نے بچشم خود ان حالات کا معائنہ کیا، اور نہ علم حاصل کرنے کا کوئی خارجی ذریعہ آپ کے پاس موجود تھا۔

ف۵ جب حضرت مریم نذر میں قبول کر لی گئیں تو مسجد کے مجاورین میں جھگڑا ہوا کہ انہیں کس کی پرورش میں رکھا جائے۔ آخر قرعہ اندازی کی نوبت آئی۔ سب نے=

اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي

اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے ایک اپنے حکم کی جس کا نام مسیح ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا مرتبہ والا

اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے ایک اپنے حکم کی، جس کا نام مسیح عیسیٰ ، مریم کا بیٹا، مرتبے والا

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ

دنیا میں اور آخرت میں اور اللہ کے مقربوں میں ف۱ اور باتیں کریگا لوگوں سے جب کہ ماں کی گود میں ہوگا اور جب کہ پوری عمر کا ہوگا اور

دنیا میں، اور آخرت میں، اور نزدیک والوں میں۔ اور باتیں کریگا لوگوں سے جب ماں کی گود میں ہوگا، اور جب پوری عمر کا ہوگا اور

الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ

نیک بختوں میں ہے ف۲ بولی اے رب کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا کسی آدمی نے ف۳ فرمایا اسی طرح

نیک بختوں میں ہے۔ بولی، اے رب ! کہاں سے ہوگا مجھ کو لڑکا ؟ اور مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا کسی آدمی نے۔ کہا، اسی طرح

= اپنے اپنے قلم جن سے تورات لکھتے تھے چلتے پانی میں چھوڑ دیئے کہ جس کا قلم پانی کے بہاؤ پر نہ بہے بلکہ الٹا پھر جائے اسی کو حقدار سمجھیں۔ اس میں بھی قرعہ حضرت زکریا کے نام نکلا اور حق حقدار کو پہنچ گیا۔

ف۱ حضرت مسیح علیہ السلام کو یہاں اور قرآن و حدیث میں کئی جگہ "کلمۃ اللہ" فرمایا ہے ﴿اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ یوں تو اللہ کے کلمات بیشمار ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ لیکن بالتخصیص حضرت مسیح کو "کلمۃ اللہ" (اللہ کا حکم) کہنا اس حیثیت سے ہے کہ ان کی پیدائش باپ کے توسط کے بدون عام سلسلہ اسباب کے خلاف محض خدا کے حکم سے ہوئی۔ اور جو فعل عام اسباب عادیہ کے سلسلہ سے خارج ہو عموماً اسکی نسبت براہ راست حق تعالیٰ کی طرف کردی جاتی ہے جیسے فرمایا ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ تنبیہ "مسیح" اصل عبرانی میں "ماشیح" یا "مشیحا" تھا۔ جس کے معنی مبارک کے ہیں۔ معرب ہو کر "مسیح" بن گیا۔ باقی دجال کو جو "مسیح" کہا جاتا ہے وہ بالاجماع عربی لفظ ہے جسکی وجہ تسمیہ اپنے موقع پر کئی طرح بیان کی گئی ہے۔ "مسیح" کا دوسرا نام یا لقب "عیسیٰ" ہے یہ اصل عبرانی میں "ایشوع" تھا۔ معرب ہو کر "عیسیٰ" بنا۔ جسکے معنی سید کے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے یہاں "ابن مریم" کو حضرت مسیح کے لئے بطور جزء علم کے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ خود مریم کو بشارت سناتے وقت یہ کہنا کہ تجھے "کلمۃ اللہ" کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ جس کا نام "مسیح عیسیٰ ابن مریم" ہوگا۔ عیسیٰ کا پتہ بتلانے کے لئے نہ تھا بلکہ اس پر متنبہ کرنا تھا کہ باپ نہ ہونے کی وجہ سے اسکی نسبت صرف ماں ہی کی طرف ہوا کرے گی۔ حتیٰ کہ لوگوں کو خدا کی یہ آیت عجیبہ ہمیشہ یاد دلانے اور مریم کی بزرگی ظاہر کرنے کے لئے گویا نام کا جزء بنادی گئی۔ ممکن تھا کہ حضرت مریم کو بمقتضائے بشریت یہ بشارت سن کر تشویش ہو کہ دنیا کس طرح باور کرے گی کہ تنہا عورت سے لڑکا پیدا ہو جائے۔ ناچار مجھ پر تہمت رکھیں گے اور بچہ کو ہمیشہ برے لقب سے مشہور کر کے ایذا پہنچائینگے۔ میں کس طرح براءت کرونگی۔ اس لئے آگے وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ کہہ کر اطمینان کر دیا کہ خدا اس کو نہ صرف آخرت میں بلکہ دنیا میں بھی بڑی عزت و وجاہت عطا کرے گا اور دشمنوں کے سارے الزام جھوٹے ثابت کر دے گا۔ "وجیہ" کا لفظ یہاں ایسا سمجھو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا﴾۔ گویا جو لوگ "وجیہ" کہلاتے ہیں انکو حق تعالیٰ خصوصی طور پر جھوٹے طعن و تشنیع یا الزامات سے بری کرتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے نسب پر جو خبیث باطن طعن کرینگے یا خدا انکو یا کسی انسان کو جھوٹ موٹ انکا باپ بتلائینگے یا خلاف واقعہ انکو مصلوب و مقتول یا بحالت زندگی مردہ کہیں گے یا الوہیت و ابنیت وغیرہ کے باطل عقائد کی مشرکانہ تعلیم ان کی طرف منسوب کریں گے، اس طرح کے تمام الزامات سے حق تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اعلانیہ بری ظاہر کر کے ان کی وجاہت و نزاہت کا علیٰ رؤس الاشہاد اظہار فرمائے گا۔ جو وجاہت ان کو ولادت و بعثت کے بعد دنیا میں حاصل ہوئی اسکی پوری تکمیل نزول کے بعد ہوگی جیسا کہ اہل اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے۔ پھر آخرت میں خصوصیت کے ساتھ ان سے ﴿ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ۭ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ کا سوال کر کے اور انعامات خصوصی یاد دلا کر تمام اولین و آخرین کے روبرو وجاہت و کرامت کا اظہار ہوگا۔ جیسا کہ سورۃ =

اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ

اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہے جب ارادہ کرتا ہے کسی کام کا تو یہی کہتا ہے اس کو کہ ہوجا سو وہ ہوجاتا ہے ف۱ اور سکھا دیگا اس کو

اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہے، جب حکم کرتا ہے ایک کام کو، تو یہی کہتا ہے اس کو کہ 'ہو' وہ ہوتا ہے۔ اور سکھادے گا اس کو

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ

کتاب اور تہ کی باتیں اور تورات اور انجیل ف۲ اور کریگا اس کو پیغمبر بنی اسرائیل کی طرف بیشک میں

کتاب اور کام کی باتیں، اور توریت اور انجیل۔ اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف، کہ میں

جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ

آیا ہوں تمہارے پاس نشانیاں لے کر تمہارے رب کی طرف سے ف۳ کہ میں بنا دیتا ہوں تم کو گارے سے پرندہ کی شکل پھر اس میں پھونک مارتا ہوں

آیا ہوں تم پاس نشان لے کر تمہارے رب کا، کہ میں بنا دیتا ہوں تم کو مٹی کی صورت جانور کی، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں،

فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ

تو ہوجاتا ہے وہ اڑتا جانور اللہ کے حکم سے ف۴ اور اچھا کرتا ہوں مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی کو اور جلاتا ہوں مردے اللہ کے

تو وہ ہوجاوے اڑتا جانور اللہ کے حکم سے، اور چنگا کرتا ہوں جو اندھا پیدا ہو، اور کوڑھی، اور جلاتا ہوں مردے، اللہ کے

= "مائدہ" میں مذکور ہے اور نہ صرف یہ کہ دنیا وآخرت میں باوجاہت ہونگے بلکہ خدا تعالیٰ کے اخص خواص مقربین میں ان کا شمار ہوگا۔

ف۲ یعنی نہایت شائستہ اور اعلیٰ درجہ کے نیک ہونگے اور اول ماں کی گود میں پھر بڑے ہو کر عجیب وغریب باتیں کرینگے۔ ان الفاظ سے فی الحقیقت مریم کی پوری تسکین کردی گئی۔ گزشتہ بشارات سے ممکن تھا یہ خیال کرتیں کہ وجاہت تو جب کبھی حاصل ہوگی مگر یہاں تو ولادت کے بعد ہی طعن وتشنیع کا ہدف بننا پڑے گا۔ اسوقت براءت کی کیا صورت ہوگی۔ اس کا جواب دیدیا کہ گھبراؤ نہیں، تم کو زبان ہلانے کی ضرورت نہ پڑے گی، بلکہ تم کہہ دینا کہ میں نے آج روزہ رکھ چھوڑا ہے کلام نہیں کرسکتی۔ بچہ خود جواب دہی کرے گا جیسا کہ سورۃ "مریم" میں پوری تفصیل آئے گی۔ بعض عرفین نے کہا ہے کہ ﴿وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ سے صرف مریم کی تسلی کرنی تھی کہ لڑکا گونگا نہ ہوگا۔ تمام لڑکوں کی طرح بچپن اور کہولت میں کلام کرے گا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ محشر میں بھی لوگ حضرت عیسیٰ کو یوں خطاب کرینگے یا عیسیٰ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ، اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَكَلَّمْتَ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا" اور خود حق تعالیٰ بھی قیامت کے دن فرمائینگے ﴿يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِىْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا﴾ کیا وہاں بھی اس خاص نشان کا بیان فرمانا اسی لئے ہے کہ مریم کو اطمینان ہوجائے کہ لڑکا گونگا نہیں عام لڑکوں کی طرح بولنے والا ہے۔ اعاذنا اللہ من الغوایۃ والضلالۃ۔

ف۳ معلوم ہوا کہ وہ بشارت سے یہی سمجھیں کہ لڑکا بحالت موجودہ ہونیوالا ہے۔ ورنہ تعجب کا کیا موقع تھا۔

ف۱ یعنی اسی طرح بدون مس بشر کے ہوجائے گا۔ خلاف عادت ہونے کی وجہ سے تعجب نہ کر حق تعالیٰ جو چاہے اور جس طرح چاہے پیدا کردے اسکی قدرت کی حد بندی نہیں ہوسکتی۔ ایک کام کا ارادہ کیا اور ہوگیا۔ نہ وہ مادہ کا محتاج نہ اسباب کا پابند۔

ف۲ یعنی لکھنا سکھائے گا، یا عام کتب ہدایت کا عموماً اور تورات وانجیل کا خصوصاً علم عطا فرمائے گا اور بڑی گہری حکمت کی باتیں تلقین کرے گا۔ اور بندہ کے خیال میں ممکن ہے کتاب وحکمت سے مراد قرآن وسنت ہو، کیونکہ حضرت مسیح نزول کے بعد قرآن وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق حکم کرینگے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ان چیزوں کا علم دیا جائے۔ واللہ اعلم۔

ف۳ یعنی پیغمبر ہو کر اپنی قوم بنی اسرائیل سے یہ فرمائینگے۔

ف۴ محض شکل وصورت بنانے کو "خلق" سے تعبیر کرنا صرف ظاہری حیثیت سے ہے۔ جیسے حدیث صحیح میں معمولی تصویر بنانے کو "خلق" سے تعبیر فرمایا "احیوا ما خلقتم" یا خدا کو "احسن الخالقین" فرما کر بتلادیا کہ محض ظاہری صورت کے لحاظ سے غیر اللہ پر بھی یہ لفظ بولا جاسکتا ہے۔ اگرچہ حقیقت تخلیق کے لحاظ =

اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

حکم سے ف۱ اور بتا دیتا ہوں تم کو جو کھا کر آؤ اور جو رکھ آؤ اپنے گھر میں ف۲ اس میں نشانی پوری ہے

حکم سے، اور بتا دیتا ہوں تم کو، جو کھا کر آؤ اور رکھ آؤ اپنے گھر میں۔ اس میں نشانی پوری ہے

لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ

تم کو اگر تم یقین رکھتے ہو اور سچا بتاتا ہوں اپنے سے پہلی کتاب کو جو تورات ہے اور اس واسطے

تم کو، اگر تم یقین رکھتے ہو۔ اور سچ بتاتا ہوں تورات کو، جو مجھ سے پہلے کی ہے، اور اسی واسطے

لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

کہ حلال کر دوں تم کو بعضی وہ چیزیں جو حرام تھیں تم پر ف۳ اور آیا ہوں تمہارے پاس نشانی لے کر تمہارے رب کی سو ڈرو اللہ سے

کہ حلال کر دوں تم کو بعض چیز، جو حرام تھی تم پر، اور آیا ہوں تم پاس نشانی لے کر تمہارے رب کی، سو ڈرو اللہ سے

= سے حق تعالیٰ کے سوا کوئی خالق نہیں کہلا سکتا۔ شاید اسی لئے یہاں یوں نہ فرمایا "اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ طَیْرًا" (میں مٹی سے پرندہ بنا دیتا ہوں) یوں کہا کہ میں مٹی سے پرندہ کی شکل بنا کر اس میں پھونک مارتا ہوں پھر وہ پرندہ اللہ کے حکم سے بن جاتا ہے بہرحال یہ معجزہ آپ نے دکھلایا اور کہتے ہیں بچپن میں ہی بطور "ارہاص" آپ سے یہ خرق عادت ظاہر ہوا تاکہ تہمت لگانے والوں کو ایک چھوٹا سا نمونہ قدرت خداوندی کا دکھلا دیں کہ جب میرے نفخ (پھونکنے) پر خدا تعالیٰ مٹی کی بے جان صورت کو جاندار بنا دیتا ہے اسی طرح اگر اس نے بدون مس بشر محض روح القدس کے نفخ سے ایک برگزیدہ عورت کے پانی پر روح عیسوی فائض کر دی تو کیا تعجب ہے بلکہ حضرت مسیح چونکہ نفخ جبرئیلیہ سے پیدا ہوئے ہیں اس مسیحائی نفخ کو اسی نوعیت ولادت کا ایک اثر سمجھنا چاہیئے۔ سورۃ "مائدہ" کے آخر میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ان معجزات و خوارق پر دوسرے رنگ میں کلام کیا جائے گا وہاں ملاحظہ کیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت مسیح پر کمالات ملکیہ و روحیہ کا غلبہ تھا۔ اسی کے مناسب آثار ظاہر ہوتے تھے۔ لیکن اگر بشر کو ملک پر فضیلت حاصل ہے اور اگر ابو البشر کو مسجود ملائکہ بنایا گیا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ جس میں تمام کمالات بشریہ (جو عبارت ہے مجموعہ کمالات روحانیہ و جسمانیہ سے) اعلیٰ درجہ پر ہوں گے اس کو حضرت مسیح سے افضل ماننا پڑے گا اور وہ ذات قدسی صفات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

ف۱ اس زمانہ میں اطباء و حکماء کا زور تھا۔ حضرت مسیح کو ایسے معجزات مرحمت ہوئے جو لوگوں پر ان کے سب سے زیادہ مایہ ناز فن میں حضرت مسیح کا نمایاں تفوق ثابت کریں بلاشبہ مردہ کو زندہ کرنا حق تعالیٰ کی صفت ہے، جیسا کہ باذن اللہ کی قید سے صاف ظاہر ہے مگر مسیح اس کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے توسعاً اپنی طرف نسبت کر رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ حق تعالیٰ قرآن کریم میں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم احادیث میں اعلان کر چکے ہیں کہ ازل سے ابد تک کسی مردہ کو دنیا میں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔ نرا دعویٰ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر اس نے قرآن میں ﴿فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ﴾ فرما کر یہ بتلایا کہ مرنے والے کی روح خدا تعالیٰ روک لیتا ہے اور سونے والے کی اس طرح نہیں روکتا تو یہ کب کہا ہے کہ اس روک لینے کے بعد دوبارہ اسے چھوڑ دینے کا اختیار نہیں رہتا۔ یاد رکھو! معجزہ وہی ہے جو حق تعالیٰ کی عام عادت کے خلاف مدعی نبوت کی تصدیق کے لئے ظاہر کیا جائے۔ پس ایسی نصوص کو لے کر جو کسی چیز کی نسبت خدا کی عام عادت بیان کرتی ہوں یہ استدلال کرنا کہ ان سے معجزات کی نفی ہوتی ہے سرے سے معجزہ کے وجود کا انکار اور اپنی حماقت و ضلالت کا اظہار ہے معجزہ اگر عام قانون عادت کے موافق آیا کرے تو اسے معجزہ کیوں کہیں گے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا بن باپ پیدا ہونا یا ابراء اکمہ و ابرص اور احیاء موتی وغیرہ معجزات دکھلانا اہل اسلام میں تمام سلف و خلف کے نزدیک مسلم رہا ہے۔ صحابہ و تابعین میں ایک قول بھی اس کے انکار میں دکھلایا نہیں جا سکتا آج جو ملحد یہ دعویٰ کرے کہ ان خوارق کا ماننا محکمات قرآنی کے خلاف ہے۔ گویا وہ ایسی چیزوں کو "محکمات" بتلاتا ہے، جن کا صحیح مطلب سمجھنے سے تمام امت عاجز رہی؟ یا سب کے سب محکمات کو چھوڑ کر اور "متشابہات" کے پیچھے پڑ کر "فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ" کے مصداق بن گئے؟ آجکل کے ملحدین کے سوا "متشابہات" کو "محکمات" کی طرف لوٹانے کی کسی کو توفیق نہ ہوئی۔ العیاذ باللہ۔ حق یہ ہے کہ وہ آیات جن کے ظاہری معنی کو ساری امت مانتی چلی آئی ہے "محکمات" ہیں۔ اور ان کو توڑ مروڑ کر محض استعارات و تمثیلات پر حمل کرنا اور معجزات کی نفی پر محض عادت سے دلیل لانا یہی "زائغین" کا کام ہے۔ جن سے حذر کرنے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے۔

ف۲ آئندہ کے لئے یعنی بعض مغیبات ماضیہ و مستقبلہ پر تم کو مطلع کر دیتا ہوں۔ عملی معجزات کے بعد یہ ایک علمی معجزہ ذکر کر دیا۔

ف۳ یعنی تورات کی تصدیق کرتا ہوں کہ خدا کی کتاب ہے اور اس کے عام اصول و احکام کو بحالہ قائم رکھتے ہوئے زمانہ کے مناسب حق تعالیٰ کے حکم سے چند =

وَأَطِيعُونِ ﴿٥٠﴾ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٥١﴾

اور میرا کہا مانو ف۱ بیشک اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو یہی راہ سیدھی ہے ف۲

اور میرا کہا مانو۔ بیشک اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا، سو اس کی بندگی کرو۔ یہ سیدھی راہ ہے۔

تتمہ قصہ حضرت مریم علیہا السلام

قال تعالیٰ: ﴿وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ ... الى ... هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ﴾

یہاں تک حق جل شانہ نے آلِ عمران اور آلِ ابراہیم کے اصطفاء اور ان پر اپنی توجہات وعنایات کے واقعات ذکر فرمائے اب آگے اور قصہ اسی سلسلہ میں بیان فرماتے ہیں جو درحقیقت حضرت مریم کے قصہ کا بقیہ تتمہ ہے اس لیے کہ سلسلۂ کلام کا آغاز حضرت مریم کے قصہ سے ہوا تھا۔ درمیان میں مناسبت کی وجہ سے ضمناً حضرت زکریا علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا اب آگے پھر حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ کا بقیہ ذکر فرماتے ہیں اور وہ دوسرا قصہ یہ ہے کہ جب فرشتوں کے ایک گروہ نے بالمشافہ حضرت مریم علیہا السلام سے کہا کہ اے مریم! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برگزیدہ کیا کہ اپنی کرامات وعنایات کا مورد بنایا۔ اور ابتداء میں باوجود لڑکی ہونے کے تجھ کو اپنی نیاز میں قبول فرمایا اور اب اخیر میں تجھ کو فرشتوں کے کلام اور خطاب سے عزت بخشی اور تجھ کو ظاہری اور باطنی عیوب سے پاک اور منزہ کیا اور اپنے پاک گھر یعنی مسجد اقصی کی خدمت کے لائق بنایا۔ ظاہری پاکی یہ عطا کی کہ حیض ونفاس سے پاک کیا اور باطنی طہارت ونزاہت یہ عطا کی کہ مس شیطانی سے تجھ کو محفوظ رکھا اور تمام جہانوں کی عورتوں کے مقابلہ میں تجھ کو بعض خصوصی فضائل اور امتیازات عطا کیے بلا مس بشر کے حضرت مسیح جیسا مبارک اور اولوالعزم پیغمبر فرزند تم کو عطا کیا جو تمہارے سوا اور کسی عورت کو نہیں عطا ہوا لہٰذا اے مریم ان نعمتوں کے شکریہ میں اپنے پروردگار کی بندگی میں لگی رہو اور اپنی نماز میں قیام کو طویل کرو اور سجدہ کرتی رہو تا کہ تم کو اللہ کا قرب حاصل ہو۔ ﴿وَاسْجُدِي وَارْكَعِي﴾ اور رکوع کیا کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو اس لیے کہ رکوع اگرچہ رتبہ میں سجدہ سے کم ہے لیکن راکعین کی معیت کی وجہ سے جب راکعین کے انوار وبرکات بھی اس کے ساتھ مل جائیں گے تو یہ رکوع قریب قریب سجود ہی کے قرب خداوندی میں معین اور مددگار ہوگا اور حضرت مریم علیہا السلام کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم یا تو اس بناء پر تھا کہ اس زمانہ کی شریعت میں عورتوں کو نماز جماعت میں شریک ہونے کی اجازت تھی یا حضرت مریم علیہا السلام کی خصوصیت تھی۔

نکتہ:...... جماعت میں شریک ہونے کے لیے غالباً رکوع کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ جس نے امام کیساتھ رکوع پالیا اس نے رکعت کو پالیا جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور اسی پر فقہاء امت کا اجماع ہے اور بعض علماء نے ﴿وَارْكَعُوا مَعَ

= مجزی وفرعی تغیرات کروں گا۔ مثلاً بعض احکام میں پہلے جو سختی تھی وہ اب اٹھا دی جائے گی۔ اس کا نام خواہ نسخ رکھ لو یا تکمیل اختیار ہے۔

ف۱ یعنی میری صداقت کے نشان جب دیکھ چکے تو اب خدا سے ڈر کر میری باتیں ماننی چاہئیں۔

ف۲ یعنی سب باتوں کی ایک بات ساری جڑوں کی اصل جڑ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو میرا اور اپنا دونوں کا یکساں رب سمجھو (باپ بیٹے کے رشتے قائم نہ کرو) اور اسی کی بندگی کرو۔ یہ جادۂ راستہ رضائے الٰہی تک پہنچنے کا یہی توحید تقویٰ اور اطاعت رسول ہے۔

الرّٰکِعِیْنَ﴾ کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اے مریم! جس طرح رکوع کرنے والے رکوع کرتے ہیں اسی طرح تم بھی رکوع کیا کرو یعنی رکوع میں مسلمانوں کی موافقت کرو اور جس طرح وہ نماز پڑھتے ہیں اسی طرح تم بھی پڑھا کرو۔

اب حق جل شانہ ان مضامین کے ضمن میں آنحضرت ﷺ کی نبوت کی ایک دلیل ذکر فرماتے ہیں جو ان واقعات کے بیان سے مترشح ہوتی ہے یہ باتیں اور یہ قصے حضرت حنہ اور مریم اور حضرت عیسیٰ اور حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کے ہم نے ذکر کیے منجملہ غیبی خبروں کے ہیں جن کی وحی ہم آپ ﷺ تک بھیج رہے ہیں یہ دلیل ہے آپ ﷺ کے نبی برحق ہونے کی اس لیے کہ کسی شے کے جاننے کی صرف تین صورتیں ہیں۔ عقل، یا خبر کا سننا، یا مشاہدہ کرنا قصص اور واقعات میں عقل کو دخل نہ ہونا بالکل ظاہر ہے۔ گزشتہ واقعات کو عقل سے معلوم کر لینا باجماع عقلاء محال ہے اور حضور ﷺ نے ان واقعات کو کسی سے سنا بھی نہیں اور اگر کسی کو یہ گمان ہے کہ توریت اور انجیل کے فلاں عالم سے حضور ﷺ نے سنا ہے تو اس کو چاہیے کہ اس عالم کو سامنے لائے یا خود اس سے پوچھ آئے اور حضور ﷺ چونکہ اُمی تھے اس لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ آپ ﷺ نے کسی کتاب میں دیکھ کر یہ واقعات بیان فرمائے وہ کون سی کتاب اور کون سا دفتر ہے جس میں یہ تمام واقعات تفصیل کے ساتھ لکھے ہوئے ہوں اور وہ کتاب اور دفتر کہاں ہے اور کس کتب خانہ میں ہے جسے حضور پرنور ﷺ دیکھ کر یہ واقعات بیان کرتے ہیں۔ معترضین خود جا کر اس کتاب اور دفتر کو دیکھ لیں اور دیکھ کر وہ بھی اسی طرح ان واقعات کو بیان کر دیں اب صرف تیسری صورت مشاہدہ کی رہ گئی کہ حضور ﷺ نے ان واقعات کو بچشم خود دیکھا ہو تو کسی ذی عقل اور ذی ہوش کو اس کا وسوسہ بھی نہیں آسکتا کہ حضور صدہا سال قبل کے واقعات کے وقت موجود تھے۔ پس جب کہ آپ نے ان واقعات کا نہ بچشم خود مشاہدہ کیا اور نہ کسی خارجی طریقہ وذریعہ سے آپ کو ان کا علم حاصل ہوا پس متعین ہو گیا کہ حضور ﷺ کو ان واقعات کا علم بذریعہ وحی کے معلوم ہوا کہ آپ اللہ کے برحق نبی ہیں جن پر اللہ کی وحی نازل ہوتی تھی اور بذریعۂ وحی کے آپ ﷺ کو انباء الغیب سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں اور آپ ان کے نزدیک نہ تھے جب وہ قرعہ کے لیے اپنے اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون شخص مریم کی پرورش کا کفیل اور خبر گیر ہو جائے اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ مریم کی پرورش کے بارہ میں جھگڑ رہے تھے۔ حق جل شانہ نے جب حضرت مریم علیہا السلام کو نذر میں قبول فرما لیا تو مسجد کے مجاورین میں جھگڑا ہوا کہ مریم علیہا السلام کو کس کی پرورش میں رکھا جائے، حضرت مریم علیہا السلام چونکہ سردار کی لڑکی تھیں اس لیے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ میری پرورش میں رہے حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا میں زیادہ مستحق ہوں میری بی بی اس لڑکی کی خالہ ہے وہ نہایت محبت سے اس کی پرورش کرے گی فیصلہ اس پر ہوا کہ ہر ایک اپنا قلم جس سے توریت لکھتے تھے بہتے ہوئے پانی میں ڈالے جس کا قلم پانی کی حرکت کے خلاف الٹا بہے وہ حضرت مریم علیہا السلام کا حق دار سمجھا جائے۔ اس میں قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے نام کا نکلا اور حق، حق دار کو پہنچ گیا۔ پس جب آپ ان واقعات اور حالات کے وقت موجود نہ تھے تو معلوم ہوا کہ ان امور کا علم آپ ﷺ کو بذریعہ وحی کے ہوا ہے۔ اور جس پر اللہ کی وحی کا نزول ہو وہ خدا کا نبی ہے۔

آغاز قصہ عیسیٰ علیہ السلام

اس وقت کو یاد کرو جب کہ فرشتوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے یہ بھی کہا اے مریم تحقیق اللہ تم کو بشارت دیتا ہے اپنے ایک کلمہ کی جو من جانب اللہ ہوگا یعنی ایک بچہ پیدا ہونے کی خوش خبری دیتا ہے جو بلا باپ کے تم سے پیدا ہوگا اور بلا باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے وہ کلمۃ اللہ کہلائے گا اور اللہ کی طرف اس نسبت اور اضافت سے اس کو ایک خاص شرف اور عزت حاصل ہوگی جس کا نام اور لقب مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ مسیح اصل میں مشیحا تھا عبرانی زبان میں اس کے معنی مبارک کے ہیں۔ معرب ہو کر مسیح ہو گیا جیسے موسیٰ موشا کا مُعَرَّب ہے باقی دجال کو جو مسیح کہا جاتا ہے وہ بالا جماع عربی لفظ ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسیح کے معنی پونچھ دینے اور زائل کر دینے کے ہیں چونکہ دجال سے تمام عمدہ خصلتیں پونچھ دی گئی ہیں اس لیے اس کو مسیح دجال کہتے ہیں اور عیسیٰ اصل میں ایشوع تھا یہ بھی عبرانی زبان کا لفظ ہے، عبرانی میں ایشوع کے معنی سردار کے ہیں عیسیٰ، ایشوع کا معرب ہے۔

نکتہ:...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن مریم (یعنی مریم کا بیٹا) اس لیے فرمایا حالانکہ خطاب خود حضرت مریم علیہا السلام کو ہے تا کہ اس پر تنبیہ ہو جائے کہ بغیر باپ کے پیدا ہوں گے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اولاد باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے ماں کی طرف منسوب نہیں ہوتی اب آگے اس مولود مسعود کے کچھ اوصاف بیان کرتے ہیں کہ وہ مولود مسعود دنیا اور آخرت میں باعزت اور آبرو والا ہوگا اہل دنیا اور اہل آخرت دونوں ہی کی نظر میں معظم اور محترم اور مرتبہ والے ہوں گے اس صفت کے ذکر سے حضرت مریم علیہا السلام کی تسلی مقصود ہے اس لیے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر باپ کے فرزند پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تو ممکن ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام بمقتضائے بشریت تشویش میں پڑ جائیں کہ دنیا میں کون اس کو باور کرے گا کہ لڑکا بغیر باپ کے پیدا ہوا۔ ناچار لوگ مجھ پر تو تہمت رکھیں گے اور بچہ کو ہمیشہ برے نام سے مشہور کریں گے میں کس طرح اپنی برأت ظاہر کروں گی حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تم گھبراؤ نہیں ہم نے برأت اور نزاہت کا انتظام کر دیا ہے حق تعالیٰ خصوصی طور پر تم کو تمام برے الزام اور تہمتوں سے بری کرے گا چنانچہ پہلی مرتبہ وجاہت کا ظہور اس طرح سے ہوا کہ پیدا ہونے کے بعد شیر خوارگی کی حالت میں کلام کیا اور یہ کہا ﴿اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا﴾ الخ اس کلام کو سنتے ہی دلوں سے تمام بدگمانیاں دور ہو گئیں اور سمجھ گئے کہ یہ مولود مسعود نہایت مبارک ہے محض خدا کے حکم سے بلا باپ کے پیدا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو بتلا دیا کہ جب کوئی اس بارہ میں تم سے کچھ سوال کرے تو تم اس بچہ کی طرف اشارہ کر دینا وہ خود اپنی طہارت و نزاہت کو بیان کر دے گا جس کی تفصیل سورۂ مریم میں آئے گی۔

دوسری بار وجاہت اس وقت ظاہر ہوئی جب دشمنوں نے پکڑنے اور قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے زندہ اور صحیح وسالم آسمان پر اٹھا لیا اور دشمن دیکھتے ہی رہ گئے۔ باقی دنیاوی وجاہت کی پوری پوری تکمیل، نزول من السماء کے بعد ہوگی جیسا کہ تمام اہل اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے اور وہ مولود مسعود فقط باعزت اور باآبرو ہی نہ ہوگا بلکہ اللہ جل شانہ کے خاص الخاص مقربین میں سے ہوگا۔ یعنی بارگاہ ایزدی کے ان مقربین میں سے ہوگا جو قرب ذاتی اور صفاتی سے متصف ہوں گے اور

تجلیات ربانیہ کے مورد اور مظہر ہوں گے اور ان کے مقرب ہونے پر وہ ارھاصات اور خوارق عادت دلالت کریں گے جو ان سے قبل از نبوت ظہور میں آئیں گے مثلاً وہ بچہ لوگوں سے ایسا حکیمانہ کلام کرے گا جیسا کہ انبیاء کا کلام ہوتا ہے حالانکہ وہ بچہ اس وقت ماں کی گود میں ہوگا اور اس کی یہ حالت مستمر اور دائم رہے گی یہاں تک کہ وہ معمر اور بڑی عمر کا ہوگا اور اس حالت میں بھی ایسا ہی کلام کرے گا۔ عہدِ طفولیت اور عہدِ کہولیت کے کلاموں میں کوئی تفاوت نہ ہوگا ان احوال کے مشاہدہ کے بعد کسی کو وہم بھی نہ ہوگا کہ گہوارہ اور ماں کی گود میں جو کلام سرزد ہوا تھا وہ کسی شیطان یا جن کا اثر تھا اور وہاں شیطان کا اثر یا گذر کہاں ہوسکتا ہے وہ نہایت شائستہ اور اعلیٰ درجہ کے نیک بختوں میں سے ہوں گے اور شیطان کا اثر فاسق اور فاجر اور بدکار لوگوں پر ہوتا ہے اور کسی نقصان اور دینی خلل اور فساد کا گذر عباد صالحین پر نہیں ہوسکتا۔

حضرت مریم علیہا السلام کا تعجب اور اس کا جواب

یہ بشارت سن کر حضرت مریم علیہا السلام سمجھ گئیں کہ وہ لڑکا بے باپ کے پیدا ہوگا اور اسی وجہ سے وہ کلمۃ اللہ اور ابن مریم علیہ السلام کہلائے گا یعنی میری طرف منسوب ہوگا اس لیے حضرت مریم علیہا السلام نے اس بشارت کو سن کر بطور تعجب یہ کہا کہ اے میرے رب میرے لڑکا کیسے ہوگا حالانکہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور بچہ عادۃً بغیر مرد کے تعلق کے پیدا نہیں ہوتا پس معلوم نہیں میرے جو بچہ ہوگا وہ کس طرح ہوگا آیا محض قدرت خداوندی سے بغیر باپ کے بچہ پیدا ہوگا یا مجھ کو نکاح کرنے کا حکم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کے واسطہ سے جواب میں فرمایا کہ ویسے ہی بلا باپ کے پیدا ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں پیدا کرتے ہیں یعنی وہ کسی چیز کے پیدا کرنے میں کسی سبب کا محتاج نہیں حق جل شانہ اس پر قادر ہے کہ وہ اشیاء کو بتدریج قانون عادت کے موافق مادہ اور سبب سے پیدا کرے اسی طرح وہ اس پر بھی قادر ہیں کہ دفعۃً بغیر مادہ اور بغیر اسباب کے کسی چیز کو پیدا کردے آخر اسی نے تو اپنی قدرتِ کاملہ سے اسباب کو بلا سبب کے اور مادہ کو بغیر مادہ کے پیدا کیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کو انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ''تو ہوجا'' پس وہ چیز فوراً ہوجاتی ہے لہٰذا تم اس بچہ کے بدونِ مسِ بشر کے پیدا ہونے پر تعجب نہ کرو وہ لڑکا اسی طرح ہوگا خدا کی غیر محدود قدرت کسی سبب اور مادہ کی محتاج اور پابند نہیں۔

خوارق عادات کے متعلق فلاسفہ اور ملاحدہ کے شبہات کے جوابات

جو لوگ پابند اسباب ہیں اور اپنی محدود معلومات اور مخصوص مزعومات کے موافق دنیا کی ہر چیز کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ اس قسم کی آیات قدرت کا اکثر و بیشتر انکار کر بیٹھتے ہیں انہی آیات قدرت میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی ہے، یہ لوگ اس کے بھی منکر ہیں حالانکہ ان کے پاس کوئی ایسی عقلی دلیل نہیں کہ جس سے وہ اس کو محال ثابت کرسکیں سوائے اس کے کہ یہ کہیں کہ بغیر باپ کے پیدا ہونا عادت کے خلاف ہے سو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ خلاف عادت ہونے سے کسی چیز کا محال ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔

روزمرہ کائنات میں ایسے عجائب وغرائب کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے جو پہلے سے ہرگز عادی اور معروف نہ تھے بلکہ وہم

وگمان میں بھی نہ تھے جن عجائب وغرائب کے اسباب وعلل معلوم ہو جاتے ہیں ان کو آج کل کی اصطلاح میں اکتشاف اور اختراع کہتے ہیں اور جن کے اسباب وعلل تک عقل کی رسائی نہیں ہو سکی ان کو فلتات طبعیہ سے تعبیر کر کے خاموش ہو جاتے ہیں یعنی جو چیزیں طبعی اور فطری طور پر ناگہانی اور اچانک طریقہ سے بلا کسی سبب اور علت کے ظہور میں آ گئی ہیں ان کو فلتات طبعیہ کہتے ہیں جس کا لفظی ترجمہ ہے (عالمِ کائنات کے اتفاقی کرشمے) جب اس قسم کی چیزیں ظہور میں آ جاتی ہیں تو ان کے غیر عادی اور خارقِ عادت وجود سے تو انکار ہو نہیں سکتا تو ان کو فلتات طبعیہ کے نام سے موسوم کر کے خاموش بیٹھ جاتے ہیں کہ عقل اور تجربہ نے ان کے اسباب وعلل بتلانے سے جواب دے دیا ہے اب ہم ان منکرین معجزات سے انہیں فلتات طبعیہ کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ جب ان فلتات طبعیہ کے ظاہری اور معلوم اسباب تو ہوتے نہیں تو دو حال سے خالی نہیں یا تو یوں کہو کہ ظاہری اسباب اگرچہ نہیں مگر ان کا ظہور اسباب خفیہ کے بناء پر ہوا ہے جو ہمیں معلوم نہیں ہو سکے یا یوں کہو کہ ان فلتات طبعیہ کے لیے اسباب ظاہرہ اور اسباب معلومہ کی طرح اسباب خفیہ بھی نہیں مطلقاً بلا کسی ظاہر اور خفی سبب کے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

اگر منکرین معجزات شق اول کو اختیار کرتے ہیں تو ہم یہ کہیں گے کہ جس طرح فلتات طبعیہ بلا کسی ظاہری اور معلوم سبب کے ظہور میں آ سکتے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اگرچہ ظاہراً کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا لیکن ممکن ہے کہ ان کا کوئی خفی سبب ہو جواب تک ہماری تحقیق میں نہ آیا ہو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے پیدا ہو جائیں اور اس طرح کی ولادت کا کوئی خفی سبب ہو جو ہماری تحقیق میں نہ آیا ہو پس کیا وجہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو تو آپ محال اور ناممکن بتائیں اور فلتات طبعیہ کو ممکن بلکہ ان کے واقع ہونے کے قائل ہوں۔

اور اگر شق ثانی کو اختیار کریں یعنی یہ کہیں کہ فلتات طبعیہ مطلقاً بلا کسی سبب کے ظہور میں آئے ہیں جس طرح ظاہر میں ان کے وجود کا کوئی سبب نہیں اسی طرح باطن میں بھی کوئی خفی سبب ان کے وجود کا نہیں تو اس صورت میں تو ان گرفتارانِ عادت کو اور بھی اعتراف کر لینا چاہیے کہ اسباب عادیہ لازم اور مطرد نہیں ان اسباب عادیہ کے بغیر بھی کائنات ظہور پذیر ہو سکتی ہیں لہٰذا اس اقرار واعتراف کے بعد آیات قدرت اور خوارق عادت کا محض اس بناء پر انکار کرنا کہ یہ اسباب عادیہ کے خلاف ہیں انتہائی نادانی اور کمال ابلہی سمجھا جائے گا۔

اگلے لوگوں نے اگر اس قسم کی چیزوں کا انکار کیا تو ان کو کچھ معذور سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ چیزیں اس وقت غیر مالوف اور غیر مانوس تھیں مگر اس زمانہ والوں کے لیے کیا عذر ہے جبکہ وہ سائنس کے حیرت انگیز تجربوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

آج کل تمام مغربی حکماء نے بالاتفاق تولد ذاتی کے امکان کو تسلیم کر لیا ہے کہ حیوان کا بدون حیوان کے محض جمادات سے پیدا ہونا بھی ممکن ہے اور دن رات اس کے تجربے ہو رہے ہیں۔

پس جب کہ حیوان کا بدون حیوان کے پیدا ہونا ممکن ہے تو پھر کسی حیوان کا ایک حیوان سے پیدا ہونا کیوں محال ہے یہ تو بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ اقرب الی الحصول ہے۔

آئے دن کوئی نہ کوئی نئی بات دریافت ہوتی رہتی ہے جو اب تک سربستہ راز تھی اسی طرح ممکن ہے کہ خوارقِ عادات بھی ایک سربستہ راز ہوں جو آئندہ چل کر کچھ منکشف ہو جائیں محض اپنے عدم علم کی بناء پر کسی چیز کا انکار کر دینا یا اس کو محال بتانا

سراسر بے عقلی ہے انسانوں کا علم اور تجربہ خواہ کتنا ہی وسیع ہو جائے بہر حال محدود اور متناہی ہے اس محدود اور متناہی علم اور تجربہ کی بناء پر خدائے قدوس کی غیر محدود کائنات پر حکم لگانا کھلی ہوئی سفاہت اور غباوت ہے اور جب انسان کا علم ہی حجت نہ ہو تو اس کی لاعلمی اور بے خبری کہاں سے حجت ہو جائے گی۔

ملاحدہ اور زنادقہ یہ چاہتے ہیں کہ جو چیز کتاب و سنت کے نصوص اور انبیاء کرام علیہم السلام کے اجماع سے ثابت ہے اور جس کو تمام امتیں بطریق تواتر نقل کرتی آئی ہیں۔ اس کو محض اپنی لاعلمی کی بناء پر رد کر دیں۔ آئے دن ہم ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں جو ہمارے معلوم شدہ قوانین کے خلاف ہوتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض حیوانات ایسے پیدا ہوتے ہیں کہ جن کے اعضاء عادت اور ہماری مقررہ تعداد سے زیادہ ہوتے ہیں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض حیوانات اپنی جنس کے علاوہ غیر جنس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے مشاہدہ سے انکار نہیں ہو سکتا اس لیے حکماء اور فلاسفہ اس قسم کے امور کو فلتات طبعیہ (عالم کائنات کے اتفاقی کرشمے) کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کے وقوع کا قانون ہماری عقل اور ادراک سے بالا اور برتر ہے ہمیں صرف چند روزمرہ پیش آنے والے امور کے متعلق کچھ تھوڑا بہت کوئی قاعدہ اور قانون معلوم ہے باقی اس قسم کے شاذ و نادر واقعات کے وقوع کے متعلق خداوند ذوالجلال کا کیا قانون ہے وہ کسی کو معلوم نہیں پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو بھی اسی پر قیاس کرو کہ یہ بھی منجملہ انہی شاذ و نادر واقعات میں سے ہے جس کا قانون سوائے خدا کے کسی حکیم اور فلسفی کو معلوم نہیں جدید اکتشافات کے ذریعہ ہم صرف چند ظاہری باتوں کو جان لیتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں اور خوش ہو جاتے ہیں مگر اس کی لم اور حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے اور یہی حق ہے۔

ہم انسان میں حس اور نطق کا مشاہدہ کرتے ہیں مگر اس کے تعلق اور رابطہ کو نہیں جانتے اور نہ جان سکتے ہیں یہ دیکھتے ہیں کہ دانہ سے گیہوں پیدا ہوتا ہے لیکن کس طرح اگتا ہے اور اس کی ڈنڈی سیدھی ہونے اور پتوں کے جھکنے میں کیا تناسب اور ربط ہے اور اس کی کیا حقیقت اور کیا علت ہے اس کی کچھ خبر نہیں غرض یہ کہ نادانی کا تو یہ عالم کہ کائنات کے ایک ذرہ کے حقیقت اور علت سمجھنے سے قاصر اور خالق کائنات کی خبروں پر نکتہ چینی کے لیے تیار۔

ع بریں عقل و دانش بباید گریست

فضائل و کمالات عیسیٰ علیہ السلام

اور اے مریم علیہا السلام تم اس بچہ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے یہ خیال مت کرو کہ ولادت کے بعد لوگ طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں گے بلکہ وہ مولود تمہاری عزت و وجاہت کا سبب بنے گا اس لیے کہ وہ مولود مسعود عجیب و غریب فضائل و کمالات کا معدن اور مخزن ہوگا جس کو دیکھتے ہی اہل فہم سمجھ جائیں گے کہ یہ پیکر فضائل و شمائل معاذ اللہ ولد الزنا نہیں ہو سکتا بلکہ نمونہ روح القدس ہے کہ جس کے پھونک مارنے سے مردے زندہ ہو رہے ہیں اور اس کے مبارک ہاتھ پھیرنے سے کوڑھی اور نابینا چنگے اور سکھے بن رہے ہیں اور اس مولود کی صفات یہ ہوں گی کہ اللہ تعالیٰ ان کو بلا کسی معلم اور بغیر استاذ کے

آسمانی کتابوں کے علوم اور دانائی اور حکمت کی باتیں سکھائے گا۔ اور بالخصوص ان کو توریت اور انجیل کا علم عطا کرے گا اور بنی اسرائیل کی طرف ایک عظیم الشان رسول بنا کر بھیجے گا جو صاحب معجزات ہوگا اور تحدی کے ساتھ ان سے یہ کہے گا کہ میں تمہارے پاس خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنی نبوت و رسالت کی ایک روشن نشانی لے کر آیا ہوں یعنی ایسے معجزات قاہرہ لے کر آیا ہوں جو میری رسالت کی روشن دلیلیں ہیں جن کو دیکھ کر تم بداہۃً یہ جان لوگے کہ یہ معجزات بلاشبہ مِنْ رَّبِّكُمْ یعنی تمہارے رب کی جانب سے ہیں اس لیے کہ اس زمانہ کے تمام حکماء اور اطباء ان کے مثل لانے سے عاجز اور درماندہ ہوں گے اور وہ معجزات یہ ہیں کہ میں تمہارے لیے اور تمہارے اطمینان کے لیے گارے سے پرندہ جیسی ایک صورت اور شکل بناؤں گا اور پھر اس مصنوعی صورت اور شکل میں پھونک ماروں گا پس وہ ظاہری صورت و شکل اللہ تعالیٰ کے حکم سے حقیقۃً زندہ پرندہ بن جائے گی اور اس کے علاوہ دوسرا معجزہ میرا یہ ہوگا کہ میں مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو ہاتھ پھیر کر اچھا اور چنگا کردوں گا اور مُردوں کو زندہ کردوں گا۔ اور یہ سب اللہ کے حکم سے ہوگا۔ ظاہراً اگرچہ میرا ہاتھ ہوگا مگر در پردہ اللہ کا حکم ہوگا اور مادر زاد اندھا ہونا اور کوڑھی ہونا یہ وہ بیماریاں ہیں جن سے تمام اطباء اور حکماء عاجز ہیں۔ بالخصوص مردہ کو زندہ کرنا یہ سب ہی سے بڑھ کر اعجاز ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں چونکہ طب کا چرچا تھا اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس قسم کے معجزات دیئے گئے تاکہ اطباء اور حکماء کا عجز ظاہر ہو۔

نکتہ:...... لفظ باذن اللہ کا تکرار الوہیت کا شبہ رفع کرنے کے ہے کہ مردہ کو زندہ کرنا بندہ کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام اور اس کا حکم ہے۔ اب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار معجزات کا ذکر ہوا: اول خلق کہیئۃ الطیر، دوم ابراء اکمہ، سوم ابراء ابرص، چہارم احیاء موتی۔ یہ چاروں معجزات فعلی تھے اب آگے پانچویں معجزہ کو ذکر کرتے ہیں جو علمی اور قولی معجزہ تھا وہ یہ کہ میں تم کو خبر دوں گا اس چیز کی جو تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھتے ہو یعنی بذریعہ وحی کے بعض مغیبات پر تم کو مطلع کروں گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چار عملی معجزات کے بعد یہ ایک علمی معجزہ ذکر فرمایا۔ تحقیق ان تمام علمی اور عملی معجزات میں میری صداقت کی پوری پوری نشانی اور علامت ہے تمہارے لیے یعنی تمہاری ہدایت کے لیے اگر تم ایمان لانا چاہو تو ایمان لے آؤ، میرے دعوائے نبوت کی صداقت، دلائل قاہرہ اور معجزات باہرہ سے تم پر واضح اور روشن ہو چکی ہے اور یہ پانچ معجزے میری نبوت اور رسالت کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں اور مجھ سے پہلے جو توریت نازل ہو چکی ہے میں اس کی تصدیق کے لیے آیا ہوں کہ بیشک وہ خدا کی کتاب تھی اور انبیاء کی یہی شان ہوتی ہے کہ آسمانی کتابوں کو سچا بتاتے ہیں اور ایک نبی دوسرے نبی کی تصدیق کرتا ہے اور میں اس لیے آیا ہوں کہ حلال کردوں تمہارے لیے ان بعض چیزوں کو جو تم پر حرام تھیں یعنی وہ بعض چیزیں جو تم پر توریت میں حرام تھیں، مثلاً اونٹ کا گوشت اور چربی اس کی حرمت کو منسوخ کروں گا اور مثلاً ہفتہ کے دن جو مچھلی کے شکار کی ممانعت تھی اس کو بھی منسوخ کردوں گا اور حاصل کلام یہ ہے کہ میرا نبی اور رسول ہونا تم پر خوب واضح ہو چکا ہے۔ کیوں کہ میں اپنی نبوت کی نشانی خدا کی طرف سے تمہارے سامنے پیش کر چکا ہوں پس اللہ سے ڈرو یعنی میری مخالفت اور تکذیب میں اللہ کے عذاب سے ڈرو اور بے چون و چرا میری فرمانبرداری کرو یعنی جو کہتا ہوں اس کو مانو تحقیق اللہ ہی میرا

پروردگار ہے اور وہی تمہارا پروردگار ہے یعنی ان معجزات کی وجہ سے مجھ کو اپنا رب اور خدا نہ سمجھنا رب میرا اور تمہارا وہی ایک خدا ہے جس کی ہم سب عبادت کرتے ہیں اور میں اس خدائے پروردگار کا برگزیدہ بندہ اور رسول ہوں معاذ اللہ اس کا بیٹا نہیں۔ یہ تین باتیں جو میں نے تم کو بتلائیں خدا تک پہنچنے کا یہی سیدھا راستہ ہے یعنی توحید اور تقویٰ اور اطاعت رسول اور توحید اور تقویٰ وہی معتبر ہے جو نبی اور رسول کی ہدایت اور تلقین کے مطابق ہو خود ساختہ توحید اور تقویٰ ہیچ ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ

پھر جب معلوم کیا عیسیٰ نے بنی اسرائیل کا کفر ف۱ بولا کون ہے کہ میری مدد کرے اللہ کی راہ میں ف۲ کہا حواریوں نے

پھر جب معلوم کیا عیسیٰ نے بنی اسرائیل کا کفر، بولا، کون ہے کہ میری مدد کرے اللہ کی راہ میں؟ کہا حواریوں نے،

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٥٢﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ

ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے ف۳ ہم یقین لائے اللہ پر اور تو گواہ رہ کہ ہم نے حکم قبول کیا ف۴ اے رب ہم نے یقین کیا اس چیز کا جو تو نے اتاری

ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے، ہم یقین لائے اللہ پر اور تو گواہ رہ کہ ہم نے حکم قبول کیا۔ اے رب! ہم نے یقین کیا جو تو نے اتارا،

وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٣﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ

اور ہم تابع ہوئے رسول کے سو تو لکھ لے ہم کو ماننے والوں میں ف۵ اور مکر کیا ان کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے

اور ہم تابع ہوئے رسول کے، سو لکھ لے ہم کو ماننے والوں میں۔ اور فریب کیا ان کافروں نے اور فریب کیا اللہ نے، اور اللہ کا داؤ سب سے

الْمٰكِرِيْنَ ﴿٥٤﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ ع ٥ ١٤

بہتر ہے ف۶ جس وقت کہا اللہ نے اے عیسیٰ میں لے لونگا تجھ کو اور اٹھا لونگا اپنی طرف اور پاک کر دونگا

بہتر ہے۔ جس وقت کہا اللہ نے، اے عیسیٰ! میں تجھ کو بھر لوں گا، اور اٹھا لوں گا اپنی طرف، اور پاک کر دوں گا

ف۱ یعنی یہ میرا دین قبول نہ کرینگے بلکہ دشمنی اور ایذاء رسانی کے درپے رہینگے۔

ف۲ یعنی میرا ساتھ دے اور دین الٰہی کو رواج دینے میں میری مدد کرے۔

ف۳ اللہ کی مدد کرنا یہی ہے کہ اس کے دین و آئین اور پیغمبروں کی مدد کی جائے جس طرح انصار مدینہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور دین حق کی مدد کر کے دکھلائی۔

ف۴ "حواری" کون لوگ تھے اور یہ لقب ان کا کس وجہ سے ہوا۔ اس میں علماء کے بہت اقوال ہیں مشہور یہ ہے کہ پہلے دو شخص جو حضرت عیسیٰ کے تابع ہوئے دھوبی تھے اور کپڑے صاف کرنے کی وجہ سے حواری کہلاتے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے ان کو کہا کہ کپڑے کیا دھوتے ہو آؤ میں تم کو دل دھونے سکھا دوں۔ وہ ساتھ ہو لئے۔ پھر ایسے سب ساتھیوں کا یہی لقب پڑ گیا۔

ف۵ پیغمبر کے سامنے اقرار کرنے کے بعد پروردگار کے سامنے یہ اقرار کیا کہ ہم انجیل پر ایمان لا کر تیرے رسول کا اتباع کرتے ہیں۔ آپ اپنے فضل و توفیق سے ہمارا نام ماننے والوں کی فہرست میں ثبت فرما دیں۔ گویا ایمان کی رجسٹری ہو جائے کہ پھر لوٹنے کا احتمال نہ رہے۔

ف۶ "مکر" کہتے ہیں لطیف و خفیہ تدبیر کو۔ اگر وہ اچھے مقصد کے لئے ہو، اچھا ہے۔ اور برائی کے لئے تو برا ہے اسی لئے "وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ" میں مکر کے ساتھ سیئی کی قید لگائی۔ اور یہاں خدا کو "خیر الماکرین" کہا۔ مطلب یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں اور خفیہ تدبیریں شروع کر دیں۔ حتیٰ کہ بادشاہ کے کان بھر دیے کہ یہ شخص (معاذ اللہ) ملحد ہے۔ تورات کو بدلنا چاہتا ہے سب کو بددین بنا کر چھوڑے گا۔ اس نے مسیح =

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ

تجھ کو کافروں سے اور رکھوںگا ان کو جو تیرے تابع ہیں غالب ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک

کافروں سے، اور رکھوں گا تیرے تابعوں کو اوپر منکروں سے قیامت کے دن تک۔

ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

پھر میری طرف ہے تم سب کو پھر آنا پھر فیصلہ کر دونگا تم میں جس بات میں تم جھگڑتے تھے سو وہ لوگ جو کافر ہوئے

پھر میری طرف ہے تم کو پھر آنا، پھر فیصلہ کر دوں گا تم میں جس بات میں تم جھگڑتے تھے۔ سو وہ جو کافر ہوئے،

كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

ان کو عذاب کرونگا سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں اور کوئی نہیں ان کا مددگار

ان کو عذاب کروں گا سخت عذاب، دنیا میں اور آخرت میں، اور کوئی نہیں ان کا مددگار۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور کام نیک کئے سو ان کو پورا دیگا ان کا حق اور اللہ کو خوش نہیں آتے

اور وہ جو یقین لائے، اور عمل نیک کئے سو ان کو پورا دے گا ان کا حق۔ اور اللہ کو خوش نہیں آتے

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ

بے انصاف ف۱ یہ پڑھ سناتے ہیں ہم تجھ کو آیتیں اور بیان تحقیقی بیشک

بے انصاف۔ یہ پڑھ سناتے ہیں ہم تجھ کو آیتیں، اور مذکور تحقیق۔

=علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم دے دیا ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر حق تعالیٰ کی لطیف و خفیہ تدبیر ان کے توڑ میں اپنا کام کر رہی تھی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ بیشک خدائی تدبیر سب سے بہتر اور مضبوط ہے۔ جسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔

ف۱ بادشاہ نے لوگوں کو مامور کیا کہ مسیح علیہ السلام کو پکڑیں۔ صلیب (سولی) پر چڑھائیں اور ایسی عبرتناک سزائیں دیں جسے دیکھ کر دوسرے لوگ اس کا اتباع کرنے سے رک جائیں۔ فبعث فی طلبہ من یاخذہ ویصلبہ وینکل بہ (ابن کثیر) خداوند قدوس نے اس کے جواب میں مسیح علیہ السلام کو مطمئن فرما دیا کہ میں ان اشقیاء کے ارادوں اور منصوبوں کو خاک میں ملا دوں گا۔ یہ چاہتے ہیں کہ تجھے پکڑ کر قتل کر دیں اور پیدائش و بعثت سے جو مقصد ہے پورا نہ ہونے دیں اور اس طرح خدا کی نعمت عظیم کی بے قدری کریں۔ لیکن میں ان سے اپنی یہ نعمت لے لوں گا۔ تیری عمر مقدر اور جو مقصد عظیم اس سے متعلق ہے پورا کر کے رہوں گا۔ اور تجھ کو پورے کا پورا صحیح و سالم لے جاؤں گا کہ ذرا بھی تیرا بال بیکا نہ کر سکیں۔ بجائے اسکے کہ وہ لے جائیں، خدا تجھ کو اپنی پناہ میں لے جائے گا۔ وہ صلیب پر چڑھانا چاہتے ہیں خدا تجھ کو آسمان پر چڑھائے گا۔ ان کا ارادہ ہے کہ رسوا کن اور عبرتناک سزائیں دیکر لوگوں کو تیرے اتباع سے روک دیں لیکن خدا انکے ناپاک ہاتھ تیرے تک نہ پہنچنے دے گا بلکہ اس گندے اور نجس مجمع کے درمیان سے تجھ کو بالکل پاک و صاف اٹھا لے گا اور اس کے بجائے کہ تیری بے عزتی ہو اور لوگ ڈر کر تیرے اتباع سے رک جائیں، تیرا اتباع کرنیوالوں اور نام لینے والوں کو قرب قیامت تک منکروں پر غالب و قاہر رکھے گا۔ جب تک تیرا انکار کرنے والے یہود اور اقرار کرنیوالے مسلمان یا نصاریٰ دنیا میں رہینگے ہمیشہ اقرار کرنیوالے منکرین پر فائق و غالب رہینگے۔ بعدہ، ایک وقت آئے گا جب تجھ کو اور تیرے موافق و مخالف سب لوگوں کو میرے حکم کی طرف لوٹنا ہے۔ اسوقت میں تمہارے سب جھگڑوں کا دو ٹوک فیصلہ کر دونگا اور سب اختلافات ختم کر دیئے جائینگے۔ یہ فیصلہ کب ہوگا؟ اس کی جو تفصیل ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ﴾ نے بیان کی گئی ہے وہ بتلاتی ہے=

=کہ آخرت سے پیشتر دنیا ہی میں اس کا نمونہ کر دیا جائے گا۔ یعنی اس وقت تمام کافر عذاب شدید کے نیچے ہونگے۔ کوئی طاقت ان کی مدد اور فریاد کو نہ پہنچ سکے گی۔ اس کے بالمقابل جو ایمان والے رہینگے انکو دنیا و آخرت میں پورا پورا اجر دیا جائے گا اور بے انصاف ظالموں کی جڑ کاٹ دیجائے گی۔ امت مرحومہ کا اجماعی عقیدہ ہے کہ جب یہود نے اپنی ناپاک تدبیریں پختہ کرلیں تو حق تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث کے موافق قیامت کے قریب جب دنیا کفر و ضلالت اور دجل و شیطنت سے بھر جائے گی، خدا تعالیٰ خاتم الانبیاء بنی اسرائیل (حضرت مسیح علیہ السلام) کو خاتم الانبیاء علی الاطلاق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت وفادار جنرل کی حیثیت میں نازل کر کے دنیا کو دکھلا دے گا کہ انبیائے سابقین کو بارگاہ خاتم النبیین کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام دجال کو قتل کرینگے اور اسکے بعد یہود کو چن چن کر مارینگے۔ کوئی یہودی جان نہ بچا سکے گا۔ شجر و حجر تک پکارینگے کہ ہمارے پیچھے یہ یہودی کھڑا ہے قتل کرو! حضرت مسیح صلیب کو توڑینگے۔ نصاریٰ کے باطل عقائد و خیالات کی اصلاح کر کے تمام دنیا کو ایمان کے راستہ پر ڈال دینگے۔ اسوقت تمام جھگڑوں کا فیصلہ ہو کر اور مذہبی اختلافات مٹ مٹا کر ایک خدا کا سچا دین (اسلام) رہ جائے گا۔ اسی وقت کی نسبت فرمایا ﴿وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ جسکی پوری تقریر اور رفع مسیح کی کیفیت سورۂ "نساء" میں آئے گی۔ بہر حال میرے نزدیک ثم الی مرجعکم الخ صرف آخرت سے متعلق نہیں بلکہ دنیا و آخرت دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ آگے تفصیل کے موقع پر فی الدنیا والاخرۃ کا لفظ صاف شہادت دے رہا ہے۔ اور یہ اس کا قرینہ ہے کہ الی یوم القیامۃ کے معنی قرب قیامت کے ہیں۔ چنانچہ احادیث صحیحہ میں مصرح ہے کہ قیامت سے پہلے ایک مبارک وقت ضرور آنے والا ہے جب سب اختلافات مٹ مٹا کر ایک دین باقی رہ جائے گا۔ وللہ الحمد اولاً وآخراً۔ چند امور اس آیت کے متعلق یاد رکھنے چاہئیں۔ لفظ "توفی" کے متعلق کلیات ابوالبقاء میں ہے۔ "التوفی الاماتۃ وقبض الروح علیہ استعمال العامۃ او الاستیفاء واخذ الحق وعلیہ استعمال البلغاء" اھ ("توفی" کا لفظ عوام کے یہاں موت دینے اور جان لینے کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن بلغاء کے نزدیک اس کے معنی ہیں پورا وصول کرنا اور ٹھیک لینا) گویا ان کے نزدیک موت پر بھی "توفی" کا اطلاق اسی حیثیت سے ہوا کہ موت میں کوئی عضو خاص نہیں بلکہ خدا کی طرف سے پوری جان وصول کر لی جاتی ہے۔ اب اگر فرض کرو خدا تعالیٰ نے کسی کی جان بدن سمیت لے لی تو اسے بطریق اولیٰ "توفی" کہا جائے گا۔ جن اہل لغت نے "توفی" کے معنی قبض روح کے لکھے ہیں، انہوں نے یہ نہیں کہا کہ قبض روح مع البدن کو "توفی" نہیں کہتے۔ نہ کوئی ایسا ضابطہ بتایا ہے کہ جب "توفی" کا فاعل اللہ اور مفعول ذی روح ہو تو بجز موت کے کوئی معنی نہ ہو سکیں۔ ہاں چونکہ عموماً قبض روح کا وقوع بدن سے جدا کر کے ہوتا ہے۔ اس لئے کثرت و عادت کے لحاظ سے اکثر موت کا لفظ اسکے ساتھ لکھ دیتے ہیں ورنہ لفظ کا لغوی مدلول قبض روح مع البدن کو شامل ہے۔ دیکھئے۔ ﴿اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ میں "توفی نفس" (قبض روح) کی دو صورتیں بتلائیں، موت اور نیند، اس تقسیم سے نیز "توفی" کو "انفس" پر وارد کر کے اور "حین موتہا" کی قید لگا کر بتلا دیا کہ "توفی" اور "موت" دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قبض روح کے مختلف مدارج ہیں۔ ایک درجہ وہ ہے جو موت کی صورت میں پایا جائے۔ دوسرا وہ جو نیند کی صورت میں ہو۔ قرآن کریم نے بتلا دیا کہ وہ دونوں پر "توفی" کا لفظ اطلاق کرتا ہے۔ کچھ موت کی تخصیص نہیں۔ ﴿يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ اب جس طرح اس نے دو آیتوں میں نوم پر توفی کا اطلاق جائز رکھا حالانکہ نوم میں قبض روح بھی پورا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر "آل عمران" اور "مائدہ" کی دو آیتوں میں "توفی" کا لفظ قبض روح مع البدن پر اطلاق کر دیا گیا تو کونسا استحالہ لازم آتا ہے۔ بالخصوص جب یہ دیکھا جائے کہ موت اور نوم میں لفظ "توفی" کا استعمال قرآن کریم ہی نے شروع کیا ہے۔ جاہلیت والے تو عموماً اس حقیقت سے ہی ناآشنا تھے کہ موت یا نوم میں خدا تعالیٰ کوئی چیز آدمی سے وصول کر لیتا ہے اسی لئے لفظ "توفی" کا استعمال موت اور نوم پر ان کے یہاں شائع نہ تھا قرآن کریم نے موت وغیرہ کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لئے اول اس لفظ کا استعمال شروع کیا۔ تو اسی کو حق ہے کہ موت و نوم کی طرح اخذ روح مع البدن کے نادر مواقع میں بھی اسے استعمال کر لے۔ بہر حال آیت حاضرہ میں جمہور کے نزدیک "توفی" سے موت مراد نہیں۔ اور ابن عباس سے بھی صحیح ترین روایت یہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے۔ کمافی روح المعانی وغیرہ زندہ اٹھائے جانے یا دوبارہ نازل ہونے کا انکار سلف میں کسی سے منقول نہیں۔ بلکہ "تلخیص الحبیر" میں حافظ ابن حجر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور ابن کثیر وغیرہ نے احادیث نزول کو متواتر کہا ہے اور "اکمال اکمال المعلم" میں امام مالک سے اس کی تصریح نقل کی ہے۔ پھر جو معجزات حضرت مسیح علیہ السلام نے دکھلائے ان میں علاوہ دوسری حکمتوں کے ایک خاص مناسبت آپ کے رفع الی السماء کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ آپ نے شروع ہی سے متنبہ کر دیا کہ جب ایک مٹی کا پتلا میرے پھونک مارنے سے باذن اللہ پرندہ بن کر اوپر اڑا چلا جاتا ہے کیا وہ بشر جس پر خدا نے روح اللہ کا لفظ اطلاق کیا اور "روح القدس" کے نفخ سے پیدا ہوا، یہ ممکن نہیں کہ خدا کے حکم سے اڑ کر آسمان تک چلا جائے۔ جس کے ہاتھ لگانے یا دم کرنے پر حق تعالیٰ کے حکم سے اندھے اور کوڑھی اچھے =

عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۵۹﴾

عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک جیسے مثال آدم کی بنایا اس کو مٹی سے پھر کہا اس کو کہ ہوجا وہ ہوگیا ف۱

عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے مثال آدم کی، بنایا اس کو مٹی سے، پھر کہا اس کو 'ہوجا' وہ ہوگیا۔

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۶۰﴾

حق وہ ہے جو تیرا رب کہے پھر تو مت رہ شک لانے والوں سے ف۲

حق بات ہے تیرے رب کی طرف سے، پھر تو مت رہ شک میں۔

ذکر عداوت یہود با عیسیٰ علیہ السلام وحفاظت خداوند انام وبشارت رفع الی السماء ومحفوظیت از مکر اعداء

قال تعالیٰ: ﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیۡسٰی مِنۡہُمُ الۡکُفۡرَ ... الی ... فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ﴾

حسب بشارت جب عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور پھر نبی ہوئے اور لوگوں کو توحید اور تقویٰ اور اپنی اطاعت کی دعوت دی اور سیدھی راہ کی طرف بلایا اور معجزات اور نشانات ان کو دکھلائے تو یہود بے بہبود نے آپ کی تکذیب کی اور آپ کے ایذاء اور قتل کے درپے ہوئے۔

حق جل شانہ نے ان آیات میں یہود کی عداوت کا ذکر کیا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی کیا کیا تدبیریں کر رہے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی حفاظت کا ذکر فرمایا کہ ہم نے ان کی حفاظت کی کیا تدبیر کی وہ یہ کہ ہم نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھالیا اور دشمنوں کی ساری تدبیریں اور امیدیں خاک میں ملا دیں۔ اصل مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بشارت دینا ہے کہ آپ دشمنوں سے بالکل مامون اور محفوظ رہیں گے اور زندہ آسمان پر اٹھائے جائیں گے چنانچہ فرماتے ہیں پس جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی جانب سے کفر اور انکار کو محسوس کرلیا اور دیکھ لیا کہ یہ لوگ میرے قتل کے درپے ہیں تو اپنے مخصوص اصحاب سے جو حوارئین کہلاتے تھے یہ کہا کہ کون ہے جو دشمنوں کے مقابلہ میں میری مدد کرے اللہ کی طرف ہو کر حوارئین بولے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے دین کے ہم آپ ہی کی دعوت اور تبلیغ سے اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیئے کہ ہم اللہ کے اور آپ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں اور پھر پیغمبر کے جواب کے بعد حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے ایمان کی پختگی اور استقامت

= اور مردے زندہ ہوجائیں، اگر وہ اس موطن کون وفساد سے الگ ہو کر ہزاروں برس فرشتوں کی طرح آسمان پر زندہ اور تندرست رہے، تو کیا استبعاد ہے۔ قال قتادہ فطار مع الملائکۃ فھو معھم حول العرش وصار انسیا ملکیا سماویا ارضیا (بغوی) اس موضوع پر مستقل رسالے اور کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ مگر میں اہل علم کو توجہ دلاتا ہوں کہ ہمارے مخدوم علامہ فقید النظیر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری اطال اللہ بقاءہ، نے رسالہ "عقیدۃ الاسلام" میں جو لعل وجواہر ودیعت کئے ہیں ان سے متمتع ہونے کی ہمت کریں میری نظر میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔

ف۱ نصاریٰ اس بات پر حضرت سے بہت جھگڑے کہ عیسیٰ بندہ نہیں اللہ کا بیٹا ہے۔ آخر کہنے لگے کہ وہ اللہ کا بیٹا نہیں تو تم بتاؤ کس کا بیٹا ہے؟ اس کے جواب میں یہ آیت اتری کہ آدم کے تو نہ باپ تھا نہ ماں عیسیٰ کے باپ نہ ہو تو کیا عجب ہے (موضح القرآن) اس حساب سے تو آدم کو خدا کا بیٹا ثابت کرنے پر زیادہ زور دینا چاہیئے۔ حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔

ف۲ یعنی مسیح علیہ السلام کے متعلق جو کچھ حق تعالیٰ نے فرمایا وہی حق ہے جس میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں۔ جو بات تھی بلاکم وکاست بتادی گئی۔

کے لیے یہ دعا کی اے پروردگار ہم ایمان لائے ان تمام چیزوں پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور دل وجان سے رسول کے تابع ہوئے پس ہم کو اپنے دین کے شاہدوں کے زمرہ میں لکھ دیجیے یعنی کاملین کے زمرہ میں ہمارا نام لکھ دیجئے۔ مقصود یہ تھا کہ جب ہمارا نام ماننے والوں کی فہرست میں لکھا جائے گا تو گویا کہ ہمارا ایمان رجسٹری ہو جائے گا کہ پھر لوٹنے کا احتمال نہ رہے گا اور یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے پکڑنے اور قتل کرنے کی خفیہ تدبیریں کیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت اور بچاؤ کی ایسی پوشیدہ تدبیر فرمائی جو وہم وگمان سے بھی بالا اور برتر تھی وہ یہ کہ انہی میں سے ایک شخص کو عیسیٰ علیہ السلام کے ہمشکل بنادیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا یہودی اسی ہم شکل کو عیسیٰ علیہ السلام سمجھ کر پکڑ کر لے گئے اور عیسیٰ علیہ السلام سمجھ کر اس کو قتل کیا اور سولی پر چڑھایا۔ اور خوش ہو گئے اور ادھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبریل گھر کے روشن دان سے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالے گئے اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر تدبیر کرنے والے ہیں کوئی تدبیر اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس وقت جبکہ دشمن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نرغہ میں لیے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پریشانی دور کرنے کے لیے پانچ بشارتیں دیں۔

بشارتِ اول: ...... فرمایا اے عیسیٰ تم گھبراؤ نہیں تحقیق میں تم کو ان دشمنوں کے نرغہ سے بلکہ اس جہان ہی سے تم کو پورا پورا لے لوں گا اور تمہارا کوئی جز ان میں باقی نہ چھوڑوں گا کہ جس کو یہ ہاتھ بھی لگا سکیں پکڑنا اور صلیب پر چڑھانا تو کجا تیرا سایہ بھی ان کو نہ ملے گا۔

بشارتِ دوم: ...... اور ان کافروں سے پورا پورا ایسے لینے کے بعد تجھ کو اپنی طرف اٹھالوں گا یعنی آسمان پر بلالوں گا جو ملائکہ کی قرارگاہ ہے۔ حق تعالیٰ نے اول ''توفی'' کی بشارت دی کہ دشمنوں کے نرغہ سے پورے پورے اور صحیح وسالم نکال لیے جاؤ گے۔ اور پھر دشمنوں سے نجات پانے کے بعد رفع الی السماء کی بشارت دی کہ فقط دشمنوں سے نجات اور رہائی نہ ہوگی بلکہ رفع آسمانی اور معراج جسمانی سے سرفراز کیے جاؤ گے۔

بشارتِ سوم: ...... اور میں تجھ کو ان ناپاک اور گندوں یعنی کافروں کے متعفن اور بدبودار پڑوس سے پاک کروں گا اور ایسی پاک وصاف اور مطہر اور معطر جگہ میں پہنچا دوں گا جہاں کفر اور عداوت کی نجاست کا رائحۂ کریہہ بھی محسوس نہ ہو سکے بلکہ ہر دم فرشتوں کی تسبیح وتقدیس کی خوشبوئیں سونگھتے رہو گے۔

بشارت چہارم ......: اور نا ہنجار یہ چاہتے ہیں کہ تجھ کو بے عزت کر کے تیرے دین کے اتباع سے لوگوں کو روک دیں سو میں اس کے بالمقابل تیری پیروی کرنے والوں کو تیرے مخالفوں پر قیامت تک غالب اور فائق رکھوں گا کہ ہمیشہ ہمیشہ تیرے خادم اور غلام، تیرے مخالفوں اور منکروں پر حکمران ہوں گے اور یہ نالائق ونا ہنجار تیرے پیروؤں کے محکوم اور باج گذار ہوں گے۔ قیامت تک یوں ہی سلسلہ چلتا رہے گا کہ نصاریٰ ہر جگہ یہود پر غالب اور حکمران رہیں گے چنانچہ اس وقت تک سنا بھی نہیں گیا کہ یہود کو نصاریٰ پر کبھی غلبہ نصیب ہوا ہو اور قیامت تک ایسا ہی رہے گا یہاں تک کہ جب قیامت قریب آجائے گی اور دجال کو جو ایک جزیرہ میں محبوس ہے جیل خانہ سے چھوڑ دیا جائے گا تو یہود بے بہبود اس کے اردگرد جمع ہو جائیں گے اور یہ کوشش کریں گے کہ اس کی سرکردگی میں اپنی حکومت قائم کریں اس لیے کہ دجال قوم یہود سے ہو گا اس وجہ سے تمام یہودی اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مسلمانوں سے جنگ کریں گے۔ اس وقت یکا یک عیسیٰ علیہ السلام بصد جاہ وجلال آسمان سے نازل

ہوں گے اور دجال کو جو یہود کا بادشاہ بنا ہوا ہوگا۔ اس کو خود اپنے دست مسیحائی سے قتل فرمائیں گے اور باقی یہود کے لشکر کا قتل و قتال اور اس گروہ کا بالکلیہ استیصال امام مہدی کے سپرد ہوگا امام مہدی مسلمانوں کے لشکر کو ساتھ لے کر دجال کے متبعین کو چن چن کر قتل کریں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے پہلے اگر چہ یہود، حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروؤں کے غلام اور محکوم تھے مگر زندہ رہنے کی تو اجازت تھی مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کے بعد زندہ رہنے کی بھی اجازت نہ رہے گی ایمان لے آ ؤ یا اپنے وجود سے دست بردار ہو جاؤ۔ اور نصاریٰ کو یہ حکم ہوگا کہ میری الوہیت اور ابنیت کے عقیدہ سے توبہ کرو۔ اور مسلمانوں کی طرح مجھ کو اللہ کا بندہ اور رسول سمجھو اور صلیب کو توڑیں گے جو نصاریٰ کا نشان ہے اور خنزیر کو قتل کریں گے جو یہودیوں کا خاص شعار ہے اسی طرح نصرانیت اور یہودیت کو ختم کریں گے اور سوائے دین اسلام کے کوئی دین قبول نہ کریں گے حتی کہ کسی کافر سے جزیہ بھی قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ جزیہ کا حکم اس وقت تھا جب تک کافر کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت تھی اب وہ اجازت اور مہلت ختم ہو چکی ہے اب سوائے اسلام کے کسی اور مذہب پر رہنے کی اجازت نہیں کیونکہ اب فیصلہ کا وقت یعنی قیامت قریب آ گئی ہے اس لیے اب سوائے دین اسلام کے کسی دین کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

بشارت پنجم: ...... الغرض حضرت عیسیٰ۔ نزول من السماء کے بعد اس طرح تمام اختلافات کا فیصلہ فرمائیں گے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں ﴿ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾۔ پھر تم سب کا میری طرف لوٹنا ہے پس اس وقت میں تمہارے اختلافات کا فیصلہ کردوں گا۔ وہ فیصلہ یہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے یہود کا یہ زعم باطل ہو جائے گا کہ ہم نے حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کر دیا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾۔ اور نصاریٰ کا یہ زعم باطل ہو جائے گا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے ہیں اور حیات مسیح کے مسئلہ کا بھی فیصلہ ہو جائے گا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان سے اترتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو روز روشن کی طرح یہ امر واضح ہو جائے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ قتل کیے گئے اور نہ سولی دیئے گئے بلکہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور اب عرصہ دراز کے بعد اسی جسم کے ساتھ آسمان سے نزول ہو رہا ہے۔

اب آئندہ آیت میں اس حکم کی قدرے تفصیل فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے پس جو لوگ کافر ہوئے ان کو سخت عذاب دوں گا دنیا میں اور آخرت میں دنیا میں قتل ہوں گے اور اسیر ہوں گے اور ان پر جزیہ مقرر ہوگا اور طرح طرح سے ذلیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں دوزخ کا دائمی عذاب ہوگا اور کوئی نہیں ان کا مددگار جو ان کو ہمارے عذاب سے بچا سکے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے سو اللہ تعالیٰ ان کو پورا حق دے گا اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا بے انصافی کرنے والوں کو یعنی جو اللہ اور اس کے رسول کا حق ادا نہ کریں۔ اور اللہ اور اس کے رسولوں کا حق ایمان لانا ہے۔

استدلال بر نبوت محمدیہ بقصۂ مذکورہ

چونکہ یہ قصہ بھی من جملہ انباء الغیب کے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ ﷺ کو بتلایا اس لیے اس سے آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں یہ قصہ ہم آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ جو منجملہ آپ کی دلائل نبوت

سے ہے اور نصیحت اور حکمت کی باتوں میں سے ہے جو ہر طرح سے موجب بصیرت ہے۔

نصاریٰ کے ایک استدلال یا شبہ کا جواب

﴿اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۵۹﴾ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ﴾

اس آیت میں حق جل شانہ نے نصارائے نجران کے ایک شبہ کا جواب دیا ہے جس کو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الہیت کے لیے بطور استدلال ذکر کرتے تھے وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے معلوم ہوا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے تھے حق تعالیٰ نے ان کے جواب کے لیے یہ آیت نازل فرمائی کہ عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا کچھ تعجب انگیز نہیں ہم نے آدم علیہ السلام کو اپنی قدرت سے بغیر ماں اور باپ کے مٹی سے پیدا کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے لیکن اپنی جنس کے ایک فرد سے تو پیدا ہوئے مگر آدم علیہ السلام تو بالکل ہی غیر جنس سے پیدا ہوئے پس اگر بغیر باپ کے پیدا ہونا دلیل الوہیت ہے تو آدم علیہ السلام اس کے زیادہ سزاوار ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ تحقیق عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی مثال ہے آدم کی تصویر کو مٹی سے بنایا پھر اس میں روح پھونکی اور اس قالب کو حکم دیا کہ زندہ آدمی ہو جا تو فوراً اسی طرح ہو گیا۔ جس طرح حکم ہوا تھا یہی بات حق ہے جو تیرے پروردگار کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں بتلادی گئی پس اے مخاطب تو ان لوگوں سے مت بن جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں شک اور تردد میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہود کی طرح نہ ان کی والدہ ماجدہ پر تہمت لگا اور نہ نصاریٰ کی طرح ان کو ابن اللہ سمجھ بلکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بتلادیا ہے۔ اس کے مطابق ایمان لا وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے برگزیدہ بندہ تھے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور جب دشمنوں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا۔

نکتہ: ...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ روح الامین یعنی جبرئیل امین علیہ السلام کے نفخہ سے پیدا ہوئے اور روح الامین کی طرح ان کا لقب بھی روح اللہ ہوا تو معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ صورۃً انسان اور بشر تھے مگر حقیقۃً جنس ملائکہ سے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان پر اٹھایا تاکہ اپنے ہم جنس فرشتوں میں زندگی بسر کریں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات دیئے گئے ان کو بھی رفع الی السماء سے خاص مناسبت تھی وہ یہ کہ مٹی کا پتلا پھونک مارنے سے باذن اللہ پرند بن کر اڑنے لگتا تھا اشارہ اس طرف تھا کہ ایک دن عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی طرح اڑ کر آسمان پر چلے جائیں گے اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے باپ آدم علیہ السلام کے مشابہ ہیں، اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے جیسے آدم علیہ السلام آسمان سے زمین پر اترے تھے ایسے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، حضرت آدم علیہ السلام کے ہبوط کے مشابہ ہوگا اور جس طرح آدم علیہ السلام کا ہبوط من السماء جسمانی تھا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول من السماء بھی جسمانی ہوگا۔

لطائف و معارف

۱۔ حواری، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ یار کا لقب تھا حواری اصل میں دھوبی کو کہتے ہیں، پہلے دو شخص جو حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کے تابع ہوئے وہ دھوبی تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ کپڑے کیا دھوتے ہو میں تم کو دل دھونے سکھادوں وہ ان کے ساتھ ہو گئے پھر اسی طرح سب ساتھیوں کا یہی لقب پڑ گیا (کذا فی موضح القرآن) غرض کہ حوارئین سے حضرت مسیح علیہ السلام کے انصار اور خاص اصحاب مراد ہیں۔ قاموس میں ہے کہ حواری کے معنی دھوبی یا خالص دوست یا نبی کے مددگار کے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص اصحاب، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاون ہونے کی وجہ سے حوارئین کے نام سے موسوم ہو گئے۔ صحیحین میں ہے کہ حضور پرنور ﷺ نے یوم خندق میں تین مرتبہ آواز دی۔ تینوں مرتبہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نبی کے لیے ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے۔

۲۔ مکر کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے مفسرین کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ مکر اصل لغت میں اس حیلہ کو کہتے ہیں جو دوسرے کے نقصان کا سبب ہو۔ اور یہ بظاہر قبیح اور مذموم ہے۔ اس لیے یہ لفظ مکر، منکرین عیسیٰ کے حق میں بطور حقیقت، استعمال ہوا ہے اور ''ومکر اللہ'' میں جو مکر کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، وہ بطریق مجاز ہے یعنی مقابلہ اور ازدواج کے طور پر استعمال ہوا ہے اس لیے کہ مکر ایک برا فعل ہے جس سے ذات باری تعالیٰ کو منزہ ہونا چاہیے اس لیے زجاج کا قول ہے کہ ''ومکر اللہ'' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے ان کے مکر کا بدلہ دیا، جیسے ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ میں برائی کے بدلہ اور سزا کو بطور مقابلہ برائی سے تعبیر کیا گیا ہے اور جیسے قرآن کریم میں جزاء خداع اور جزاء استہزاء کو خداع اور استہزاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔

محققین کی رائے یہ ہے کہ مکر اصل لغت میں کسی بُرے معنی پر دلالت نہیں کرتا تا کہ بغرض تنزیہ ''ومکر اللہ'' میں معنی مجازی مراد لیے جائیں کیونکہ اصل میں مکر کے معنی تدبیر خفی کے ہیں جو ایسے نامعلوم طریقہ سے کی جائے کہ دوسرے کو اس کا خیال بھی نہ ہو پس اگر یہ تدبیر کسی محمود اور مستحسن غرض کے لیے کی جائے تو یہ تدبیر بھی محمود اور مستحسن ہوگی اور اگر کسی غرض فاسد کے لیے کی جائے تو قبیح اور مذموم ہوگی۔ عرف میں اگرچہ لفظ مکر بری تدبیروں ہی کے لیے بولا جاتا ہے مگر حقیقت اور اصل لغت میں۔ اچھی اور بری دونوں ہی قسم کی تدبیریں مکر کے مفہوم میں داخل ہیں یعنی اگر کسی حکمت اور مصلحت سے کسی کے حق میں بھلائی کی تدبیر چپکے چپکے کی جائے تو وہ مکر محمود ہوگا اور اگر کسی غرض فاسد سے کسی کی برائی کے لیے خفیہ تدبیر کی جائے تو وہ مکر مذموم ہوگا اور ﴿وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ﴾ میں مکر کے ساتھ سیئ کی قید لگانا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ مکر اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی اب اس تحقیق کی بناء پر لفظ مکر۔ ﴿وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ میں اپنے حقیقی اور لغوی معنی میں مستعمل ہوا ہے مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں اگرچہ آیت میں مجازی معنی بھی صحیح اور درست ہو سکتے ہیں تاہم بہتر یہی ہے کہ معنی حقیقی مراد لیے جائیں۔ اصل لغت کے اعتبار سے مکر کے معنی میں کوئی برائی نہیں تا کہ بغرض تنزیہ اس کو مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ اور ذوق اور وجدان بھی یہی کہتا ہے کہ اللہ کا مکر محمود تھا اور بنی اسرائیل کا مکر مذموم تھا اس لیے کہ ﴿وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ کو ماقبل پر بطور عطف ذکر فرمایا ہے اور عطف تغایر کو چاہتا ہے۔

حکایت: ...... ''وقد سئل بعضهم كيف يمكر الله فصاح وقال لا علة لِصُنْعه وانشاء يقول۔

بعض اولیاء اللہ سے سوال کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کیسے مکر کرتا ہے تو ایک چیخ ماری اور یہ کہا کہ اللہ کے فعل کے لیے کسی

علت اور سبب کی ضرورت نہیں۔ اور اس کے بعد یہ شعر پڑھنے شروع کیے:

فَدَيْتُكَ قَدْ جُبِلْتُ عَلٰى هَوَاكَا　　وَنَفْسِيْ لَاتُنَازِعُنِيْ سِوَاكَا

قربان ہو جاؤں تجھ پر اے محبوب۔ میری جبلت اور فطرت میں تیری محبت داخل ہے اور میرا نفس تیرے سوا کسی کی کشمکش میں مبتلا نہیں ہوتا۔

أُحِبُّكَ لَابِبَعْضِيْ ، بَلْ بِكُلِّيْ　　وَاِنْ لَمْ يُبْقِ حُبُّكَ لِيْ حِرَاكَا

میں تجھ کو محبوب رکھتا ہوں مگر اپنے بعض اجزاء کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنے کل اجزاء کے اعتبار سے تجھ کو محبوب رکھتا ہوں اگرچہ تیری محبت نے مجھ میں ہلنے کی سکت باقی نہیں چھوڑی۔

وَيَقْبُحُ مِنْ سِوَاكَ الْفِعْلُ عِنْدِيْ　　وَتَفْعَلُهٗ فَيَحْسُنُ مِنْكَ ذَاكَا

اور تیرے سوا سے جو فعل صادر ہوتا ہے وہ میرے نزدیک قبیح اور برا ہوتا ہے اور جب اسی فعل کو تو کرتا ہے تو وہ نہایت مستحسن اور پسندیدہ ہوتا ہے۔ (روح المعانی: ۳/۱۶۹)

۳- یہود کا مکر یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور صلب کا ارادہ کیا اور اللہ کا مکر یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جبریل امین علیہ السلام کے ذریعہ گھر کے روشن دان سے آسمان پر اٹھوا لیا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کیں بادشاہ کے کان بھر دیے کہ یہ شخص معاذ اللہ ملحد ہے توریت کو بدلنا چاہتا ہے اور سب کو بے دین بنانا چاہتا ہے بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم دیا جب وہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرفتار کرنے کے لیے گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچانے کی یہ تدبیر کی کہ انہی لوگوں میں سے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہمشکل بنا دیا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا لوگوں نے اس شخص کو جو انہی میں کا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شکل بنا دیا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰ سمجھ کر پکڑ لیا اور سولی پر چڑھا دیا۔ جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سند صحیح کے ساتھ مروی ہے (تفسیر ابن کثیر (عربی): ۱/۳۶۵)

۴- لفظ "توفی" کے متعلق حافظ ابن تیمیہ الجواب الصحیح: ۲/۲۸۳، میں لکھتے ہیں کہ: "لفظة التوفی فی لغة العرب معناه الاستيفاء والقبض وذلك ثلاثة انواع احدها توفی النوم۔ والثانی توفی الموت والثالث توفی الروح والبدن جميعا"۔

یعنی لغت عربی میں توفی کے معنی استیفاء پورا پورا لے لینے اور اپنے قبضہ میں کر لینے کے ہیں۔ اور توفی کی تین قسمیں ہیں: ایک "توفی نوم"، یعنی خواب اور نیند کی توفی جس میں انسان کے شعور اور ادراک کو پورا پورا قبض کر لیا جاتا ہے اور دوسری "توفی موت"، یعنی موت کے وقت روح کو پورا پورا قبض کر لینا۔ اور تیسری "توفی الروح والجسد" یعنی جسم اور روح کو پورا پورا لے لینا۔ انتہی۔ یعنی روح اور جسم دونوں کو پورا پورا آسمان پر لے جانا۔

لفظ "توفی" کے متعلق ابوالبقاء اپنی کلیات میں لکھتے ہیں: "التوفی الاماتة وقبض الروح وعليه استعمال العامة او الاستيفاء واخذ الحق وعليه استعمال البلغاء اھ"۔ یعنی توفی کا لفظ عوام کے یہاں موت

دینے اور روح قبض کرنے کے لیے مستعمل ہوتا ہے لیکن بُلغاء کے نزدیک استیفاء یعنی کسی چیز کے پورا پورا لے لینے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ توفی کے اصل معنی تو استیفاء کے ہیں اور موت پر جو لفظ توفی کا اطلاق آتا ہے وہ بھی اسی وجہ سے آتا ہے کہ اس میں جان پوری پوری لے لی جاتی ہے۔ یا یہ کہ عمر پوری کردی جاتی ہے پس اگر فقط جان پوری پوری لے لی جائے تو بھی توفی ہے اور اگر جان اور جسم دونوں کو پورا پورا لے لیا جائے تو بدرجہ اولیٰ توفی ہوگی بلکہ اعلیٰ درجہ کی توفی ہوگی کیونکہ جن ائمہ لغت نے توفی کے معنی قبض روح کے لکھے ہیں انہوں نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ فقط قبض روح کو توفی کہتے ہیں اور اگر قبض روح مع البدن ہو تو اس کو توفی نہیں کہتے بلکہ ظاہر ہے کہ اگر قبض روح کے ساتھ قبض بدن بھی ہو تو بدرجہ اولی توفی ہوگی۔

غرض یہ کہ اصل لغت کے اعتبار سے توفی کے معنی استیفاء اور قبض کے ہیں جو اپنی معنی اصلی اور جنسی کے لحاظ سے نوم (نیند) اور موت اور رفع جسمانی سب پر صادق آتا ہے۔

دیکھیے حق جل شانہ نے اپنے اس ارشاد ﴿اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ میں توفی نفس کی دو صورتیں بتلائی ہیں ایک موت اور دوسری نوم یعنی نیند۔ اور ﴿حِيْنَ مَوْتِهَا﴾ کی قید لگا کر یہ بتلادیا کہ کبھی "توفی" موت کے وقت ہوتی ہے عین موت نہیں ورنہ شئ کا خود اپنے لیے ظرف ہونا لازم آئے گا اور ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ﴾ میں بھی "توفی" کا استعمال نیند کے موقعہ پر کیا گیا ہے۔

نکتہ:...... "توفی" کے اصلی معنی تو پورا پورا وصول کر لینے کے ہیں محاورۂ عرب میں لفظ "توفی" نوم اور موت کے لیے مستعمل نہیں ہوتا تھا لیکن قرآن کریم نے لفظ "توفی" کو نوم اور موت کے معنی میں اس لیے استعمال کرنا شروع کردیا تاکہ اہل عرب پر موت اور نوم کی حقیقت واضح ہو جائے کہ انسان کے بدن میں کوئی چیز پوشیدہ ہے جس کو حق تعالیٰ نوم اور موت کی حالت میں بندہ سے لے لیتے ہیں عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان مر کر نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ موت کو فنا اور عدم کے مرادف سمجھتے تھے اسی لیے وہ بعث یعنی قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے اور یہ کہتے تھے: ﴿ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾ حق تعالیٰ نے ان کے رد کے لیے یہ ارشاد فرمایا ﴿قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ﴾ یعنی آپ ان منکرین بعث سے کہہ دیجئے کہ تم مر کر فنا نہیں ہو جاتے بلکہ موت کا فرشتہ تم سے اللہ کا پورا پورا حق وصول کر لیتا ہے یعنی وہ ارواح جو اللہ کی امانت ہیں وہ تمہارے جسموں سے لے لی جاتی ہیں اور اللہ کے یہاں محفوظ رہتی ہیں قیامت کے دن پھر انہی ارواح کو تمہارے اجسام کے ساتھ متعلق کر کے حساب و کتاب لیا جائے گا چنانچہ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "تم اپنے آپ کو دھڑ سمجھتے ہو کہ خاک میں رل گئے تم جان ہو وہ فرشتہ لے جاتا ہے فنا نہیں ہوتے۔" اھ

۵- تمام امت محمدیہ کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے سلف اور خلف میں سے نہ کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء کا منکر ہے اور نہ نزول من السماء کا جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تلخیص حبیر، ص: ۳۱۹، میں اس پر اجماع نقل کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے احادیث نزول کو متواتر کہا ہے تفصیل کے لیے کلمۃ اللہ فی حیاۃ روح اللہ کو دیکھیے۔

اختلاف صرف اس میں ہے کہ رفع الی السماء سے پہلے کچھ دیر کے لیے موت طاری ہوئی یا نہیں یا حالت نوم میں

آسمان پر اٹھائے گئے۔

جمہور صحابہ و تابعین اور عامۂ سلف صالحین یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں ''توفی'' سے موت کے معنی مراد نہیں بلکہ ''توفی'' کے اصلی اور حقیقی معنی مراد ہیں یعنی کسی شے کا پورا پورا لے لینا کیونکہ دشمنوں کے ہجوم اور نرغہ کے وقت ''توفی'' کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی اور تسکین کے لیے ہے کہ اے عیسیٰ! تم دشمنوں کے ہجوم اور نرغہ سے گھبراتا نہیں۔ میں تم کو پورا پورا روح اور جسم سمیت ان نابکاروں سے چھین لوں گا۔ تیرا وجود ان کے لیے میری ایک عظیم نعمت تھا ان کے کردار سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ نابکار اور ناہنجار اس قابل نہیں کہ تیرے وجود کی نعمت کو ان کے لیے باقی رکھا جائے ان کی ناقدری اور ناسپاسی کی سزا یہ ہے کہ ان سے یہ نعمت پوری پوری واپس لے لی جائے۔ حضرت مولانا سید انور شاہ قدس سرہ اس بارہ میں فرماتے ہیں:

وُجُوْهٌ لَمْ تَكُنْ اَهْلًا لَخَيْرٍ　　فَيَاْخُذُ مِنْهُمْ عِيْسىٰ اَلْلّٰهُ

یہ چہرے کسی خیر کے قابل نہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

وَيَرْفَعُهٗ وَلَا يُبْقِيْهِ فِيْهِمْ　　كَاَخْذِ الشَّيْءِ لَمْ يُشْكَرْ عَلَيْهِ

اور اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھالیا اور ان میں باقی نہ چھوڑا۔ اور اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو ان سے ایسا لے لیا جیسا کہ اس شے کو لے لیا جاتا ہے جس کی ناقدری کی جائے۔

وَحِيْزَ كَمَا يُحَازُ الشَّيُّ حِفْظًا　　وَآوَاهُ اِلىٰ مَاْوىٰ لَدَيْهِ

اور ان سے چھین کر اپنے پاس ان کو خاص طور سے محفوظ رکھا اور اپنے قریب میں ان کو ٹھکانہ دیا۔

غرض یہ کہ آیت میں ''توفی'' سے پورا پورا لے لینے کے معنی مراد ہیں۔ موت کے معنی مراد ہیں اور نہ اس مقام کے مناسب ہیں اس لیے کہ جب ہر طرف سے خون کے پیاسے اور جان کے لیوا کھڑے ہوئے تو اس وقت تسلی اور تسکین خاطر کے لیے موت کی خبر دینا کہ میں تجھ کو موت دوں گا مناسب نہیں دشمنوں کا تو مقصود ہی جان لینا ہے اس وقت تو مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ تم گھبراؤ نہیں ہم تم کو تمہارے دشمنوں کے نرغہ سے پورا پورا اور صحیح و سالم نکال لے جائیں گے کہ دشمنوں کو تمہارا سایہ بھی نہ مل سکے گا پس اگر آیت میں ''توفی'' سے موت کے معنی مراد ہوں تو عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی تو نہ ہوگی البتہ یہود کی تسلی ہو جائے گی اور مطلب یہ ہوگا کہ اے یہود تم بالکل نہ گھبراؤ اور نہ مسیح کے قتل کی فکر میں خود ہی ان کو موت دوں گا۔ اور میں خود ہی تمہاری تمنا اور آرزو پوری کر دوں گا تمہیں کوئی مشقت نہ ہوگی یہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی نہ ہوئی بلکہ یہود کی تسلی ہوئی۔

۲- نیز یہ کہ توفی بمعنی الموت تو ایک عام شئ ہے جس میں تمام مومن و کافر انسان اور حیوان سب ہی شریک ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کیا خصوصیات ہے جو خاص طور پر ان سے توفی کا وعدہ کیا گیا۔

۳- نیز ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ سے بھی یہی معلوم اور مفہوم ہوتا ہے کہ اللہ کا مکر اور اس کی تدبیر یہود کی تدبیر اور مکر کے خلاف اور ضد تھی جیسا کہ ﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا﴾ ﴿وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا﴾ اور ﴿وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ﴾ ان تمام واقعات میں اللہ کی تدبیر کافروں کی تدبیر کے برعکس تھی۔

قوم صالح نے صالح علیہ السلام کے قتل کی تدبیریں کیں اور مشرکین مکہ نے نبی اکرم ﷺ کے قتل کی تدبیریں کیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی حفاظت کی تدبیر کی اسی طرح آیت زیرِ بحث میں مراد یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کی تدبیر کی کہ دشمنوں کے ہاتھ سے صحیح وسالم نکال کر آسمان کی طرف ہجرت کرا دی اب اس ہجرت کے بعد زمین پر جو نزول ہوگا۔ وہ اس زمین کے فتح کرنے کے لیے ہوگا جیسا کہ آنحضرت ﷺ ہجرت کے کچھ عرصہ بعد مکہ فتح کرنے کے لیے تشریف لائے اور تمام اہل مکہ مشرف باسلام ہوئے اسی طرح جب عیسیٰ علیہ السلام زمین کے فتح کرنے کے لیے نازل ہوں گے تو تمام اہل کتاب ایمان لے آئیں گے جیسے تمام اہل مکہ ایمان لے آئے تھے۔ امام رازی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ''توفی'' کے معنی کسی چیز کو پورا پورا لینے کے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ شاید کسی کے دل میں یہ خطرہ گذرے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی فقط روح اٹھائی گئی۔ روح اور جسم دونوں نہیں اٹھائے گئے (جیسا کہ نصاریٰ کا خیال ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے لاہوت کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے اور ناسوت زمین پر ہی رہا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ﴿مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ﴾ فرما کر آگاہ کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح اور جسم دونوں پورے پورے اٹھائے گئے اور یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی کے لیے ایسی ہوگی، جیسے ﴿وَمَا يَضُرُّونَكَ مِن شَيْءٍ﴾۔ (تفسیر کبیر: ۲/۴۸۱)

۴- ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ اس آیت میں ''توفی'' سے نوم (نیند) مراد ہے جیسا کہ ﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ﴾ میں ''توفی'' سے نوم (نیند) کے معنی مراد ہیں جو کہ توفی اور وفات کی ایک قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے سلایا اور پھر بحالتِ خواب ان کو آسمان پر اٹھایا۔ پس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اے عیسیٰ تم گھبراؤ نہیں میں تم کو سلاؤں گا اور پھر اسی حالت میں تم کو اٹھالوں گا۔

۵- ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''توفی'' سے موت مراد ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ بھی فرماتے ہیں کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے کہ آیت میں جو چیز پہلے مذکور ہے اس کا وقوع بعد میں ہوگا اور جو بعد میں مذکور ہے اس کا وقوع مقدم ہے یعنی رفع آسمانی پہلے ہوا اور یہ توفی بمعنی الموت قیامت کے قریب نزول من السماء کے بعد ہوگی اور آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے عیسیٰ میں اس وقت تم کو آسمان پر اٹھاؤں گا اور پھر آخری زمانہ میں تمہارے نازل ہونے کے بعد تم کو موت دوں گا۔

اس تفسیر کی رو سے ''رفع، توفی'' پر مقدم ٹھہرتا ہے اور آیت میں تقدیم و تاخیر کا قائل ہونا لازم آتا ہے لیکن یہ اعتراض قابل التفات نہیں اس لیے کہ واؤ ترتیب کے لیے وضع نہیں ہوا اور تقدیم و تاخیر نہ قواعد عربیت کے خلاف ہے اور نہ فصاحت و بلاغت میں مخل ہے امام رازی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:

"ومثله من التقديم والتاخير كثير في القرآن"۔ (تفسیر کبیر: ۲/۴۸۱)

''ابن عباس کی تفسیر میں جو تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے سو اس قسم کی تقدیم و تاخیر قرآن کریم میں بہت کثرت کے ساتھ موجود ہے۔''

اور قرآن کریم میں تقدیم و تاخیر کے نظائر اور شواہد ہم نے اپنے رسالہ کلمۃ اللہ فی حیاۃ روح اللہ میں لکھ دیے ہیں وہاں دیکھ لئے جائیں۔

ابن عباس ؓ سے باسانید صحیحہ منقول ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور قیامت کے قریب نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اور آیت ﴿إِنِّي مُتَوَفِّيكَ﴾ میں ''توفی'' سے توفی موت مراد ہے لیکن یہ اخیر زمانہ میں ہوگی۔

"اخرج اسحاق بن بشر وابن عساکر من طريق جوهر عن الضحاك عن ابن عباس في قوله تعالىٰ انی متوفيك ورافعك الى يعنى رافعك ثم متوفيك فى آخر الزمان۔"
(تفسیر درمنثور: ۳۶/۲)

''اسحاق بن بشر اور ابن عساکر ضحاک سے راوی ہیں کہ ابن عباس ؓ ﴿مُتَوَفِّيكَ﴾ کی تفسیر میں یہ فرماتے تھے کہ حضرت مسیح کا رفع مقدم ہے اور انکی وفات اخیر زمانہ میں ہوگی۔'' (تفسیر درمنثور)

پس اگر ابن عباس ؓ سے ﴿مُتَوَفِّيكَ﴾ کی تفسیر مُمِيتُكَ کے ساتھ منقول ہے تو انہی ابن عباس ؓ سے باسانید صحیحہ وجیدہ یہ بھی منقول ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور قیامت کے قریب نازل ہوں گے اور انہی سے یہ بھی منقول ہے کہ آیت میں تقدیم وتاخیر ہے تو پھر ان کے نصف قول کو ماننا اور نصف کا انکار کر دینا کونسی عقل اور کون سی دیانت ہے قادیان کے دہقان ابن عباس ؓ کے اس نصف قول کو قبول کرتے ہیں جو ان کی ہوائے نفسانی اور غرض کے موافق ہے۔ اور دوسرا نصف جو ان کی غرض کے خلاف ہے اس سے گریز کرتے ہیں یہ ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ تارک صلوۃ۔ ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ﴾ سے حجت پکڑتے ہیں اور ﴿أَنْتُمْ سُكَارٰى﴾ سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

نکتہ: ...... رہا یہ امر کہ اس تقدیم وتاخیر میں نکتہ کیا ہے سو نکتہ یہ ہے کہ ﴿إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ﴾ الخ سے مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی ہے کہ یہ دشمن جو آپ علیہ السلام کے قتل اور صلب کے درپے ہیں اور آپ کی جان لینا چاہتے ہیں یہ ہرگز آپ کے قتل کرنے اور سولی دینے پر قادر نہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو وقت مقدر پر طبعی موت سے وفات دیں گے اور فی الحال آپ کو اپنی طرف اٹھالیں گے آپ بالکل مطمئن رہیں کہ دشمن آپ کی جان نہیں لے سکیں گے۔ غرض یہ کہ دشمن جان لینا چاہتے تھے اس لیے توفی کا ذکر مقدم فرمایا جس سے مقصود دشمنوں سے محفوظ رہنے کی بشارت دینا ہے کہ موت ان کے قبضہ میں نہیں وہ ہمارے ہاتھ میں ہے جو ہمارے حکم سے اپنے وقت پر ہوگی۔

نیز ''توفی'' کی تقدیم میں ایک نکتہ یہ ہے کہ بیک وقت اور بیک لفظ یہود اور نصاریٰ دونوں کی تردید ہو جاتی ہے۔

یہود کی تردید اس طرح ہوئی کہ یہود ان کے مارنے میں کامیاب نہ ہوں گے اللہ تعالیٰ خود ان کو وقت مقرر پر وفات دے گا۔

اور نصاریٰ کی تردید اس طرح ہوئی کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں کیونکہ ان پر ایک وقت آنے والا ہے کہ اس وقت ان پر موت اور فناء آئے گی۔ اور فانی خدا نہیں ہو سکتا۔

۲- حق جل شانہ نے اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدوں کا ذکر فرمایا ہے:

ایک وعدہ توفی کا جس کی تفصیل گذر گئی۔

دوسرا وعدہ رفع الی السماء کما قال تعالیٰ: ﴿وَرَافِعُكَ إِلَيَّ﴾ یعنی اے عیسیٰ! میں تم کو اپنی طرف اٹھاؤں گا جہاں میرے فرشتے رہتے ہیں وہاں تم کو رکھوں گا اس آیت میں رفع سے جسمانی رفع مراد ہے اس لیے کہ ﴿وَرَافِعُكَ إِلَيَّ﴾ میں

خطاب عیسیٰ علیہ السلام کو ہے جو مجموعہ ہے جسم اور روح کا۔

(۲) اور یہاں رفع درجات اس لیے مراد نہیں ہو سکتا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے ہی سے حاصل تھا اور رفع جسمانی میں تو اور بھی رفع درجات حاصل ہو جاتا ہے رفع جسمانی، رفع درجات کے منافی نہیں اور فقط رفع روحانی اس لیے مراد نہیں ہو سکتا کہ رفع روحانی ہر مرد صالح کو بوقت موت حاصل ہوتا ہے۔ اس کو خاص طور پر بطور وعدہ ذکر کرنا بے معنی ہے۔

نیز باتفاق محدثین ومفسرین ومورخین یہ آیتیں نصارائے نجران کے حق میں ان سے مناظرہ اور ان کے عقائد کی اصلاح کے بارہ میں نازل ہوئیں اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور دشمنوں کے ہاتھ سے مقتول اور مصلوب ہوئے اور پھر دوبارہ زندہ ہو کر آسمان پر اٹھائے گئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں عقیدۂ ابنیت اور عقیدۂ قتل وصلب کی صریح لفظوں میں تردید اور نفی فرمائی کہ وہ خدا کے بیٹے نہ تھے بلکہ خدا کے بندہ اور رسول تھے اور یہود کا یہ زعم کہ ﴿إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ﴾ کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو قتل کر دیا، یہ بالکل غلط ہے۔ ﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ﴾ اور نصاریٰ کے تیسرے عقیدہ یعنی رفع الی السماء کی تصویب اور تصدیق فرمائی اور ﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ﴾ (یعنی دشمنوں نے نہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا اور نہ سولی دی) میں قتل اور صلب کی نفی کرنے کے بعد متصلاً یہ فرمایا ﴿بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ﴾ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا اگر عقیدۂ قتل وصلب کی طرح عقیدۂ رفع الی السماء بھی غلط تھا تو جس طرح ﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ﴾ کہہ کر عقیدۂ قتل وصلب کی صراحۃً تردید فرمائی اسی طرح بجائے ﴿بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ﴾ کے "مَا رَفَعَهُ اللّٰهُ" فرما کر عقیدۂ رفع الی السماء کی تردید فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہیں اٹھایا۔

تیسرا وعدہ، ﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ کا ہے تطہیر سے مراد یہ ہے کہ اہل کفر کے نجس اور ناپاک قرب و جوار سے الگ کر کے تم کو آسمان پر بلالوں گا۔

چوتھا وعدہ، یہ ہے کہ تیرے متبعین کو تیرے منکروں پر غالب رکھوں گا۔ اور تیرے دشمنوں کو کبھی حاکمانہ اقتدار نصیب نہ ہوگا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ جاننا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تابع اور پیرو نصاریٰ تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے اور آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح پیروکار مسلمان ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بندہ اور رسول مانتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وصیت ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ پر عمل کرنے والے ہیں۔ پس حاصل یہ نکلا کہ امت محمدیہ اور نصاریٰ ہمیشہ یہود پر غالب اور حاکم رہیں گے چنانچہ یہ وعدہ جلد ہی پورا ہوا کہ یہود ذلیل اور خوار ہوئے اور سلطنت ان کی ختم ہوئی اور پھر آج تک یہود جہاں کہیں بھی ہیں یا تو نصاریٰ کی رعایا ہیں یا اہل اسلام کی اور اس وقت فلسطین میں جو یہودیوں کی برائے نام حکومت قائم ہوئی ہے وہ درحقیقت نصاریٰ (امریکہ و برطانیہ) کی ہے نام یہود کا ہے اس برائے نام سلطنت کا وجود تمام تر نصاریٰ کے رحم وکرم اور اعانت اور امداد کا مرہون منت ہے اور قیامت تک ایسا ہی رہے گا صرف چالیس دن کے لیے دجال کا شور وغوغا ہوگا اور یہودی اس کے ساتھ ہوں گے سو اس چند روزہ شور وغوغا کو سلطنت نہیں کہا جا سکتا اور عجب نہیں کہ فلسطین میں یہ برائے نام حکومت اس لیے قائم ہوئی ہو کہ یہودی سب ایک جگہ جمع ہو جائیں اور عیسیٰ علیہ السلام اور

امام مہدی علیہ السلام کو نزول اور ظہور کے بعد قتل میں سہولت ہو کہ سب ایک جمع ہیں قتل کے لیے تلاش نہ کرنا پڑے۔

پانچواں وعدہ، فیصلۂ اختلاف ہے ﴿ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ یہ پانچواں وعدہ ہے جو اختلافات کے فیصلہ سے متعلق ہے تمام اختلافات کا آخری فیصلہ تو آخرت اور قیامت کے دن ہوگا لیکن یہود اور نصاریٰ اور اہل اسلام کے اختلافات کا ایک فیصلہ قیامت قائم ہونے سے کچھ روز پہلے ہی ہو جائے گا اور وہ مبارک وقت ہوگا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے اور یہود کو چن چن کر ماریں گے کوئی یہودی اس وقت اپنی جان نہ بچا سکے گا۔ حدیث میں ہے کہ اس وقت اگر کوئی یہودی جان بچانے کے لیے کسی شجر یا حجر کے پیچھے چھپ جائے گا تو شجر اور حجر میں سے آواز آئے گی "هذا یهودی ورائی فاقتله" یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے اس کو قتل کیجئے غرض یہ کہ اس طرح کی تیغ بے دریغ سے تو یہودیت کا فیصلہ اور خاتمہ ہو جائے گا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد صلیب کو جو کہ (نصرانیت کا نشان ہے) توڑیں گے جس سے نصرانیت کا فیصلہ اور خاتمہ ہو جائے گا۔ اور یہود اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئیں گے اور یہود عقیدہ قتل و صلب سے تائب ہو جائیں گے اور نصاریٰ عقیدہ ابنیت سے تائب ہو جائیں گے۔ اور مسلمان تو پہلے ہی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں صحیح عقیدہ رکھتے تھے اور ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے تھے مسلمان نزول کے بعد جب ان تمام چیزوں کا آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے تو مسلمانوں کا ایمان بالغیب ایمان شہودی بن جائے گا جس کے بعد ارتداد کا اندیشہ نہیں رہتا اور چونکہ مسلمانوں کا ایمان اور عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں بالکل صحیح ہوگا اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول مسلمانوں ہی کی ایک مسجد کے منارہ پر ہوگا اور مسلمان ہی آپ کے گردوپیش اور آپ کے معین و مددگار ہوں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول دین اسلام ہی کی تجدید کے لیے ہوگا۔

غرض یہ کہ اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے تمام اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا اور خدا تعالیٰ کا یہ آخری وعدہ دنیا کے اخیر میں پورا ہوگا۔

۷۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال کی عمر میں نبی بنائے گئے اور اسی سال کی عمر میں آسمان پر اٹھائے گئے اور آسمان سے نازل ہونے کے بعد چالیس سال زمین پر زندہ رہیں گے اور اس کے بعد وفات پائیں اور حجرۂ نبوی میں مدفون ہوں گے اس طرح وفات کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوگی۔ (کذا فی عقیدۃ الاسلام، ص: ۲۹)

فَمَنْ حَآجَّكَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا

پھر جو کوئی جھگڑا کرے تجھ سے اس قصہ میں بعد اس کے کہ آ چکی تیرے پاس خبر سچی تو تو کہہ دے آؤ بلاویں ہم اپنے بیٹے

پھر جو جھگڑا کرے تجھ سے اس بات میں بعد اس کے کہ پہنچ چکا تجھ کو علم، تو تو کہہ آؤ! بلاویں ہم اپنے بیٹے

وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ

اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جان اور تمہاری جان پھر التجا کریں ہم سب اور

اور تمہارے بیٹے، اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں، اور اپنی جان اور تمہاری جان۔ پھر دعا کریں، اور

لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ ۝٦١ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡقَصَصُ الۡحَقُّ ۚ وَمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ

لعنت کریں اللہ کی ان پر کہ جو جھوٹے ہیں ف۱ بیشک یہی ہے بیان سچا اور کسی کی بندگی نہیں ہے سوا اللہ کے ف۲

لعنت ڈالیں اللہ کی جھوٹوں پر۔ یہ جو ہے سو یہی ہے بیان تحقیق، اور کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے،

وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝٦٢ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِالۡمُفۡسِدِيۡنَ ۝٦٣ ع ۱۴

اور اللہ جو ہے وہی ہے زبردست حکمت والا ف۳ پھر اگر قبول نہ کریں تو اللہ کو معلوم ہیں فساد کرنے والے ف۴

اور اللہ جو ہے وہی ہے زبردست حکمت والا۔ پھر اگر قبول نہ کریں تو اللہ کو معلوم ہیں فساد کرنے والے۔

دعوت مباہلہ برائے اتمام حجت بر اہل مجادلہ

قال تعالیٰ: ﴿فَمَنۡ حَآجَّكَ فِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ... الی ... فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِالۡمُفۡسِدِيۡنَ﴾

ربط: ...... یہاں تک حق کو دلائل اور براہین سے ایسا واضح کر دیا گیا کہ جس میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی لیکن جو شخص یا جو

ف۱ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ نصاریٰ نجران اس قدر سمجھانے پر بھی اگر قائل نہ ہوں تو انکے ساتھ "مباہلہ" کر جسکی زیادہ موثر اور مکمل صورت یہ تجویز کی گئی کہ دونوں فریق اپنی جان سے اور اولاد سے حاضر ہوں اور خوب گڑگڑا کر دعا کریں کہ جو کوئی ہم میں جھوٹا ہے اس پر خدا کی لعنت اور عذاب پڑے۔ یہ "مباہلہ" کی صورت پہلے ہی قدم پر اس بات کا اظہار کر دے گی کہ کون فریق کس حد تک خود اپنے دل میں اپنی صداقت و حقانیت پر وثوق و یقین رکھتا ہے۔ چنانچہ دعوت "مباہلہ" سن کر وفد نجران نے مہلت لی کہ ہم آپس میں مشورہ کر کے جواب دینگے۔ آخر مجلس مشاورت میں ان کے ہوشمند تجربہ کار ذمہ داروں نے کہا کہ اے گروہ نصاریٰ! تم یقیناً دلوں میں سمجھ چکے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں اور حضرت مسیح کے متعلق انہوں نے صاف صاف فیصلہ کن باتیں کہی ہیں تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے بنی اسماعیل میں نبی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ کچھ بعید نہیں یہ وہی نبی ہوں، پس ایک نبی۔ ۔ ۔ مباہلہ و ملاعنہ کرنے کا نتیجہ کسی قوم کے حق میں یہی نکل سکتا ہے کہ انکا کوئی چھوٹا بڑا ہلاکت یا عذاب الٰہی سے نہ بچے۔ اور پیغمبر کی لعنت کا اثر نسلوں تک پہنچ کر رہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر کے اپنی بستیوں کی طرف روانہ ہو جائیں۔ کیونکہ سارے عرب سے لڑائی مول لینے کی طاقت ہم میں نہیں" ۔ یہی تجویز پاس کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن، حسین، فاطمہ، علی (رض) کو ساتھ لئے باہر تشریف لا رہے تھے۔ یہ نورانی صورتیں دیکھ کر ان کے لاٹ پادری نے کہا کہ میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دعا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے سرکا سکتی ہے، ان سے مباہلہ کر کے ہلاک نہ ہو، ورنہ ایک نصرانی زمین پر باقی نہ رہے گا۔ آخر انہوں نے مقابلہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے۔ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مباہلہ کرتے تو وادی آگ بن کر ان پر برستی اور خدا تعالیٰ نجران کا بالکل استیصال کر دیتا۔ ایک سال کے اندر اندر تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔ (تنبیہ) قرآن نے یہ نہیں بتلایا کہ مباہلہ کی صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی اختیار کی جا سکتی ہے اور یہ کہ مباہلہ کا اثر کیا ہمیشہ وہی ظاہر ہونا چاہیے جو آپ کے مباہلہ میں ظاہر ہونے والا تھا۔ بعض سلف کے طریق عمل اور بعض فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مباہلہ کی مشروعیت اب بھی باقی ہے مگر ان چیزوں میں جنکا ثبوت بالکل قطعی ہو، یہ ضروری نہیں کہ مباہلہ میں بچوں، عورتوں کو بھی شریک کیا جائے۔ نہ مباہلین پر اس قسم کا عذاب آنا ضروری ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مباہلہ پر آتا۔ بلکہ ایک طرح کا اتمام حجت کر کے بحث و جدال سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور میرے خیال میں مباہلہ ہر ایک کاذب کے ساتھ نہیں صرف کاذب معاند کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ابن کثیر کہتے ہیں ثم قال تعالیٰ مرا رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یباھل من عاند الحق فی امر عیسیٰ بعد ظہور البیان واللہ اعلم۔

ف۲ دعوت مباہلہ کے ساتھ بتلا دیا کہ مباہلہ اس پر کیا جاتا تھا کہ جو کچھ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق قرآن میں بیان ہوا وہی سچا بیان ہے اور خدا کی بارگاہ ہر قسم کے شرک اور باپ بیٹے وغیرہ کے تعلقات سے پاک ہے۔

ف۳ اپنی زبردست قدرت و حکمت سے جھوٹے اور سچے کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جو اس کے حسب حال ہو۔

ف۴ اگر نہ دلائل سے مانیں نہ مباہلہ پر آمادہ ہوں تو سمجھ لو کہ احقاق حق مقصود نہیں نہ دل میں اپنے عقائد کی صداقت پر وثوق ہے۔ محض فتنہ و فساد پھیلانا ہی پیش نظر ہے تو خوب سمجھ لیں کہ سب مفسدین اللہ کی نظر میں ہیں۔

گروہ معاند اور ضدی ہو اور باطل پر مصر ہو اس سے کیا معاملہ کیا جائے آئندہ آیات میں اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے ساکت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو مباہلہ کی دعوت دی جائے اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے ایسے لوگوں پر اتمام حجت کا یہ طریقہ ہے اور یہ امر ہم شروع سورت ہی میں لکھ آئے ہیں کہ سورۂ آل عمران کی شروع کی تراسی آیتیں نجران کے نصرانیوں کے حق میں نازل ہوئی ہیں اس آیت میں بھی انہی کو خطاب ہے کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں حق واضح ہو چکا ہے ان واضح اور روشن دلائل کے بعد بھی اگر یہ جھگڑا کریں۔ تو اے نبی کریم ﷺ آپ ان سے یہ کہہ دیں کہ تم اپنی عورتوں اور لڑکوں سمیت حاضر ہو جاؤ اور ہم بھی اسی طرح اپنی عورتوں اور لڑکوں کو لے آئیں۔ اور سب مل کر خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو جب جھوٹے پر حق تعالیٰ کا قہر آئے گا تو اس وقت معلوم ہوگا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا چنانچہ فرماتے ہیں پس جب کہ یہ بتلا دیا گیا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور وہ خدا اور خدا کے بیٹے نہ تھے اور نہ ولد الزنا تھے بلکہ وہ اللہ کے ایک برگزیدہ بندہ اور رسول برحق تھے اس پر بھی اگر آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں کوئی جھگڑا کرے اور کسی طرح حق کو نہ مانے بعد اس کے کہ پہنچ چکا ہے آپ کے پاس اس بارہ میں علم قطعی اور یقینی تو آپ ﷺ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ اب مناظرہ اور مباحثہ تو ختم ہوا تمہاری ضد اور عناد کے ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آؤ مباہلہ کریں اس طرح سے کہ بلائیں ہم سب مل کر اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنی ذاتوں کو اور تمہاری ذاتوں کو پھر ہم سب ایک جگہ جمع ہو کر اور مل کر عجز و زاری کے ساتھ حق تعالیٰ سے دعا کریں پس یہ دعا کریں کہ اللہ کی لعنت اور پھٹکار ہو جھوٹوں پر پس جو جھوٹا ہوگا اس پر اللہ کا قہر آئے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں افراط اور تفریط کرتے ہیں اور کسی طرح امر حق کو مانتے ہی نہیں اور کسی دلیل و برہان پر کان دھرتے ہی نہیں تو ایسے معاندین سے احقاق حق کی تدبیر اور فیصلہ کی آخری صورت یہ ہے کہ آپ ﷺ ان سے یہ کہہ دیں کہ تم اپنے آدمیوں کی ایک جماعت لے آؤ اور ہم مومنین کی ایک جماعت اپنے ساتھ لاتے ہیں اور پھر دونوں فریق مل کر دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر خدائے تعالیٰ کی لعنت اور عذاب ہو۔ اللہ تعالیٰ خود غیب سے جھوٹے پر کوئی قہر نازل فرمائے گا جس سے راست باز کی راستی اور صداقت ظاہر ہو جائے گی اور جب اس بددعا کا اثر ظاہر ہوگا تو عام لوگ خود ہی صادق اور کاذب کی تعیین کر لیں گے۔

چنانچہ جب آیت نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے نجران کے وفد کو بلایا اور یہ آیت پڑھ کر ان کو سنائی اور مباہلہ کی ان کو دعوت دی انہوں نے یہ کہا کہ ذرا صبر کیجئے ہم ذرا غور کر لیں اور باہم مشورہ کر لیں۔ کل آپ کے پاس آئیں گے اور بعض روایات میں ہے کہ یہ کہا کہ آپ ہم کو تین دن کی مہلت دیجئے اور یہ کہہ کر چلے گئے اور باہم مشورہ کیا۔

"قال السيد للعاقب قد والله علمتم ان الرجل نبی مرسل ولئن لاعنتموه انه ليستاصلكم وما لاعن قوم نبيا قط فبقي كبيرهم ولا نبت صغيرهم فان ابيتم ان تتبعوه وابيتم الا الف دينكم فوادعوه وارجعوا الى بلادكم۔" (در منثور: ۲/۳۹)

''مشورہ میں ان کے سردار نے عاقب سے کہا خدا کی قسم تم خوب جانتے ہو کہ یہ مرد نبی مرسل ہے اور اگر تم نے

اس سے مباہلہ کیا تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور واللہ کسی قوم نے کسی نبی سے مباہلہ نہیں کیا اور پھر ان کے بڑے زندہ رہے ہوں اور چھوٹے جوان ہوئے ہوں یعنی سب ہلاک ہوئے پس اگر تم ان کے اتباع اور پیروی کو نہ مانو اور اپنے ہی دین پر قائم رہنا چاہو تو اس شخص (یعنی آنحضرت ﷺ) سے صلح کر لو اور اپنے شہروں کو واپس چلے جاؤ۔"

یہ تجویز لے کر حضور پرنور ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور ادھر سے آنحضرت ﷺ امام حسین رضی اللہ عنہ کو گود میں لیے ہوئے اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی انگلی پکڑے ہوئے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیے ہوئے تشریف لا رہے تھے ان سے یہ فرما رہے تھے کہ میں دعا کروں تو تم آمین کہنا وفد نجران کے بڑے پادری نے ان نورانی صورتوں کو دیکھ کر یہ کہا کہ خدا کی قسم آج مجھ کو ایسے چہرے نظر آتے ہیں کہ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے اس بات کی درخواست کریں کہ یہ پہاڑ اس جگہ سے ہٹ جائیں تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی درخواست قبول کرے گا لہٰذا تم ان سے مباہلہ کر کے اپنے کو ہلاک اور برباد نہ کرو۔ ورنہ روئے زمین پر ایک نصرانی بھی باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے مباہلہ اور مقابلہ سے گریز کیا اور آپ سے صلح کر کے واپس ہو گئے۔ صلح اس پر ہوئی کہ ہر سال حضور ﷺ کو دو ہزار حلے (لنگی اور چادر) ایک ہزار صفر میں اور ایک ہزار رجب میں دیا کریں گے حضور ﷺ نے اس کو منظور فرمایا اور ان سے صلح کر لی۔ دلائل ابی نعیم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور پرنور ﷺ نے جب وفد نجران کو مباہلہ کی دعوت دی تو انہوں نے آپ سے تین دن کی مہلت مانگی۔ مہلت ملنے کے بعد مشورہ کے لیے بنو قریظہ اور بنو نضیر اور بنو قینقاع کے یہودیوں کے پاس گئے اور ان سے مشورہ لیا۔

"فاشاروا علیهم ان یصالحوه ولا یلاعنوه وهو النبی الذی نجده فی التوراة فصالحوا النبی صلی الله علیه وسلم علی الف حلة فی صفر والفٍ فی رجب ودراهم۔" (درمنثور: ۳۹/۲)

"یہود نے بالاتفاق یہ مشورہ دیا کہ آپ سے صلح کریں اور آپ ﷺ سے مباہلہ اور مقابلہ نہ کریں آپ ﷺ وہی نبی ہیں جن کو ہم توریت میں لکھا ہوا پاتے ہیں پس نصاریٰ نجران نے آپ سے صلح کر لی کہ ایک ہزار حلہ آپ کو صفر میں دیا کریں گے اور ایک ہزار رجب میں اور کچھ دراہم بھی۔"

غرض یہ کہ نصاریٰ میں جو لوگ دانا اور سمجھدار تھے ان کے مشورہ سے وفد نے مقابلہ اور مباہلہ سے گریز کیا اور جزیہ دینا قبول کیا تحقیق یہ جو کچھ عیسیٰ علیہ السلام کی بابت بیان کیا گیا یہی بیان تحقیق اور سچا بیان ہے اور سوائے اللہ کے کوئی بھی معبود نہیں تثلیث اور ابنیت کا عقیدہ بالکل غلط ہے اور تحقیق اللہ ہی عزت والا اور حکمت والا ہے۔ سچوں کو عزت دیتا ہے اور اپنے دست قدرت اور اپنی حکمت سے جھوٹے اور سچے کے ساتھ اس کے مناسب حال معاملہ کرتا ہے پس اگر اس کے بعد اہل کتاب کلمۂ عدل سے روگردانی کریں نہ دلائل کو مانیں اور نہ مباہلہ پر آمادہ ہوں تو سمجھ لو کہ تحقیق حق مقصود نہیں اور نہ دل میں اپنی صداقت پر وثوق اور اطمینان ہے مباہلہ سے انکار اس امر کی صریح دلیل ہے کہ وہ اپنے عقائد میں متزلزل ہیں اپنے عقائد کی صحت پر انکے پاس دلائل نہیں جس سے ان کو اپنے دعوائے حقانیت کا یقین ہو سکے محض شبہات کی بناء پر اپنے عقائد پر اڑے ہوئے ہیں اور نبی اکرم ﷺ سے جھگڑتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مقصود محض فتنہ اور فساد ہی ہے تو خوب سمجھ لیں کہ تحقیق

اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو خوب جاننے والا ہے اگر ان کو اپنے عقائد کی حقانیت پر یقین ہے تو پھر ایک جگہ جمع ہو کر اللہ تعالیٰ سے اس دعا اور التجاء کرنے میں کہ اللہ جھوٹوں پر لعنت کرے کیوں تردد ہے۔

فائدہ:...... روافض۔ اس آیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں ﴿اَبْنَآءَنَا﴾ سے حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما مراد ہیں اور ﴿نِسَآءَنَا﴾ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ﴿اَنْفُسَنَا﴾ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں تو ثابت ہوا کہ حضرت علی عین رسول اور رسول اللہ کی طرح مسلمانوں کے جان و مال میں تصرف کے حق دار ہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ اور جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ تصرف کا حق دار ہو وہی ان کا امام اور خلیفہ ہے۔

جواب:...... یہ ہے کہ ﴿اَنْفُسَنَا﴾ سے خاص حضرت امیر مراد نہیں بلکہ جماعت مؤمنین مراد ہے جو دین اور ملت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق ہیں۔ جیسا کہ ﴿وَاَنْفُسَكُمْ﴾ سے کافروں کی جماعت مراد ہے اور یہ مطلب نہیں کہ یہ سب نصاریٰ آپس میں ایک دوسرے کے عین ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک دین اور ایک ملت میں سب شریک ہیں اور قریب اور شریک دین اور رفیق ملت کے لیے لفظ نفس کا استعمال قرآن میں شائع اور ذائع ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ﴾ ﴿ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ ﴿لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ وقال تعالیٰ: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ وقال تعالیٰ: ﴿اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾۔ چونکہ حضرت امیر کو نسب اور قرابت اور مصاہرت اور اتحاد فی الدین والملت کی وجہ سے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص اتصال تھا۔ اس لیے لفظ نفس سے تعبیر کر دیا گیا اس تعبیر سے اتحاد اور عینیت اور مساوات کا گمان کرنا خیال باطل ہے ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صفات میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی ہو جائیں اور یہ امر فریقین کے نزدیک باطل ہے اس لیے کہ اگر ﴿اَنْفُسَنَا﴾ کا یہ مطلب ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سراسر عین رسول ہیں اور تمام صفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی ہیں تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اور رسول بھی ہوں اور خاتم النبیین اور تمام جن وانس کی طرف مبعوث بھی ہوں اور تمام انبیاء و مرسلین کے سردار بھی ہوں۔ نیز لازم آئے گا کہ معاذ اللہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نکاح بھی درست نہ ہو غرض یہ کہ ﴿اَنْفُسَنَا﴾ کے لفظ سے تمام صفات میں مساوی ہونا ثابت نہیں ہوتا البتہ بعض صفات میں شرکت اور موافقت مفہوم ہوتی ہے اور بعض صفات میں شرکت مفید مدعا نہیں اس لیے محققین شیعہ بھی اس کے قائل ہوئے ہیں کہ یہ آیت حضرت امیر کی محض ایک گونہ فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ افضلیت اور امامت اور خلافت بلافصل سے آیت کا ذرہ برابر تعلق نہیں اور یہی اہل سنت والجماعت کہتے ہیں۔

اور نساء کے معنی عورتوں کے ہیں اس کا اطلاق عام طور پر زوجہ (بیوی) پر ہوتا ہے جیسا کہ ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ﴾ میں بالاتفاق زوجہ کے معنی مراد ہیں۔ لہٰذا نساء کے لفظ سے بیٹی کے معنی مراد لینا اور یہ کہنا کہ ﴿نِسَآءَنَا﴾ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں لغت اور عرف کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں اور علی ہذا ﴿اَبْنَآءَنَا﴾ سے نواسوں کا مراد ہونا معنی حقیقی نہیں بلکہ معنی مجازی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾۔ اور معنی مجازی کے لحاظ سے لفظ ابناءنا

حسنین، کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بھتیجوں اور بھانجوں کو بھی شامل ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا

تو کہہ اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں کہ بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور شریک

تو کہہ، اے کتاب والو! آؤ ایک سیدھی بات پر ہمارے تمہارے درمیان کی، کہ بندگی نہ کریں مگر اللہ کو، اور شریک

نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا

نہ ٹھہراویں اس کا کسی کو اور نہ بناوے کوئی کسی کو رب سوا اللہ کے ف۱ پھر اگر وہ قبول نہ کریں

نہ ٹھہرائیں اس کی کوئی چیز، اور نہ پکڑیں آپس میں ایک ایک کو رب، سوا اللہ کے۔ پھر اگر وہ قبول

فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝۶۴

تو کہہ دو گواہ رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں ف۲

نہ رکھیں تو کہہ، شاہد رہو، کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں۔

دعوت اہل کتاب بلطف وعنایات

قَالَ تَعَالٰی: ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ... الی... فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾

ربط:...... ابتداء سورت سے یہاں تک نصاریٰ نجران سے محاجہ اور مناظرہ کا اور پھر مباہلہ کا بیان تھا محاجہ اور مناظرہ سے نصاریٰ پر دلیل اور برہان کے اعتبار سے حجت قائم کی اور مباہلہ کی دعوت سے ضمیر اور وجدان کے اعتبار سے ان پر حجت قائم کی اور ظاہر ہے کہ مباہلہ انتہائی اور آخری حجت ہے اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ اس آخری حجت کے بعد ان سے خطاب ہی چھوڑ دیا جاتا اس لیے کہ خطاب اس سے کیا جاتا ہے جو حق کا طالب ہو اور جو معاند اور مفسد ہے اس سے روگردانی ہی مناسب ہے لیکن باقتضاء رحمت ورافت پھر ان کو مخاطب بناتے ہیں کہ گو تمہاری ہٹ دھرمی انتہاء کو پہنچ چکی ہے مگر ہم اپنی بے پایاں رحمت سے پھر تم کو حق دیتے ہیں اس لیے آئندہ آیات میں پھر ان کو نرمی اور ملاطفت کے ساتھ حق اور توحید کی دعوت دی

ف۱ پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وفد نجران کو کہا اسلموا (مسلم بن جاؤ) تو کہنے لگے اَسْلَمْنَا (ہم مسلم ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی طرح انکو بھی مسلم ہونے کا دعویٰ تھا۔ اسی طرح جب یہود و نصاریٰ کے سامنے توحید پیش کی جاتی تو کہتے کہ ہم بھی خدا کو ایک کہتے ہیں بلکہ ہر مذہب والا کسی نہ کسی رنگ میں اوپر جا کر اقرار کرتا ہے کہ بڑا خدا ایک ہی ہے۔ یہاں اسی طرف توجہ دلائی گئی کہ بنیادی عقیدہ (خدا کا ایک ہونا اور اپنے کو مسلم ماننا) جس پر ہم دونوں متفق ہیں، ایسی چیز ہے جو ہم سب کو ایک کر سکتا ہے بشرطیکہ آگے چل کر اپنے تصرف اور تحریف سے اس کی حقیقت بدل نہ ڈالیں۔ ضرورت اسکی ہے کہ جس طرح زبان سے مسلم وموحد کہتے ہو، حقیقۃً وعملاً بھی اپنے کو تنہا خدائے وحدہ لاشریک لہ، کے سپرد کر دو۔ نہ اس کے سوا کسی کی بندگی کرو، نہ اسکی صفات خاصہ میں کسی کو شریک ٹھہراؤ، نہ کسی اور عالم، فقیر، پیر، پیغمبر کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو صرف رب قدیر کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ مثلاً کسی کو اس کا بیٹا پوتا بنانا، یا نصوص شریعت سے قطع نظر کر کے محض کسی کے حلال وحرام کر دینے پر اشیاء کی حلت وحرمت کا مدار رکھنا جیسا کہ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب امور دعوائے اسلام وتوحید کے منافی ہیں۔

ف۲ یعنی تم دعوائے اسلام وتوحید کر کے پھر گئے ہم بحمد للہ اس پر قائم ہیں کہ اپنے کو محض خدائے واحد کے سپرد کر دیا ہے اور اسی کے تابع فرمان ہیں۔

جاتی ہے۔

نیز گزشتہ آیات میں روئے سخن زیادہ تر نصاریٰ کی طرف تھا اب آئندہ آیات میں خطاب عام ہے جو یہود اور نصاریٰ دونوں کو شامل ہے نیز زبان سے یہود اور نصاریٰ دونوں توحید کے مدعی تھے کہ ہم خدا کو ایک مانتے ہیں اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ جب توحید ہمارے اور تمہارے درمیان مسلم ہے اور تمام انبیاء کرام ﷺ اس کی دعوت دیتے چلے آئے تو اس متفقہ اصول کا اقتضاء یہ ہے کہ سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی کو رب ٹھہرایا جائے اور نہ کسی کو خدا کا بیٹا اور پوتا بنایا جائے اہل کتاب بیشک زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ خدا بے شک وحدہ لاشریک لہ ہے مگر بایں اقرار طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ اے نبی کریم ﷺ آپ اُن کو پھر ایک دفعہ حق کی دعوت دیجیے اور ان کے ان مسلّمات سے ان پر حجت قائم کیجیے جن کے تسلیم کیے بغیر ان کو چارہ نہیں تا کہ اس قدر لاچار اور معقول ہو جانے کے بعد شاید کسی کو اتباع حق کا خیال پیدا ہو جائے اور وہ حق کو قبول کر لے اس لیے فرماتے ہیں ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ﴾ الآیۃ اے محمد ﷺ آپ ان سے کہیے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک سیدھی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر مسلم ہے جس پر قرآن اور توریت اور انجیل اور تمام انبیاء ﷺ کی شریعتیں متفق ہیں کسی کا اس میں اختلاف نہیں وہ توحید ہے کہ جس کا زبان سے سب اقرار کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ بنائیں آپس میں ایک دوسرے کو رب اور پروردگار خدا کو چھوڑ کر یہود اور نصاریٰ قولاً ان تینوں باتوں کو تسلیم کرتے تھے مگر عمل ان تینوں باتوں کے برخلاف تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے اور نصاریٰ تو کھلم کھلا تثلیث کے قائل تھے کہ باپ اور بیٹا اور روح القدس مل کر ایک خدا ہوتے ہیں اور اپنے احبار اور رہبان یعنی پادریوں اور راہبوں کو رب اور پروردگار کے مرتبہ میں مانتے تھے یعنی احبار اور رہبان کا ہر امر اور ہر نہی حق تعالیٰ کے حکم کی طرح بے چون وچرا واجب الاطاعت ہے اور ان کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جس کو چاہیں حرام کریں اور آیت میں ایک دوسرے کو رب بنانے سے یہی مراد ہے کہ اس کا ہر امر اور ہر نہی بے چون وچرا واجب الاطاعت ہو اور اس کو تشریع اور تحلیل اور تحریم کا کلی اختیار حاصل ہو اور یہی حقیقت شرک کی ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات مختصہ یا حقوق مختصہ میں کسی کو شریک گردانا جائے چنانچہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آیت ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ نازل ہوئی تو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم تو ان کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ حضور پرنور ﷺ نے فرمایا۔

"بلیٰ انهم حرموا عليهم الحلال واحلوا لهم الحرام فاتبعوهم فذلك عبادتهم اياهم۔" (اخرجه الترمذي واحمد)

''کیوں نہیں انہوں نے ان لوگوں کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور لوگوں نے اُن کی پیروی کی پس یہی ان کو معبود اور رب بنانا ہے۔''

یعنی غیر اللہ اور مخلوق کو رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے کہنے سے خدا کے حلال کردہ چیز کو حرام مان لیا جائے اور خدا کی حرام کردہ چیز کو کسی کے حکم سے حلال ٹھہرا لیا جائے ایسی ہی تقلید بلاشبہ حرام بلکہ کفر اور شرک ہے اور من دون اللہ کا مصداق ہے کہ اللہ کے حکم کو چھوڑ کر غیر اللہ کے حکم کو مانا جائے۔ اور روساء دین جو احکام چاہیں اپنی طرف سے مقرر کریں اور پھر ان کے احکام کی احکام منزل من اللہ کی طرح بجا آوری لازم اور ضروری سمجھی جائے یہ ہے احبار اور رہبان کو رب بنانا اور معاذ اللہ ثم معاذ اللہ رسول اللہ کی اطاعت اس کا مصداق نہیں بلکہ رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ اس لیے کہ رسول کا ہر امر ونہی، وحی خداوندی ہوتا ہے۔ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾۔

اور اسی طرح علماء اور اولیاء اور سلاطین اور حکام کی اطاعت بشرطیکہ شریعت کے موافق ہو وہ بھی در پردہ اللہ ہی کی اطاعت ہے چنانچہ حکم خداوندی ہے۔ ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾۔ آیت میں اولی الامر سے علماء اور امراء مراد ہیں۔

ہاں اگر کسی عالم اور حاکم کی اطاعت خلاف شرع ہو تو وہ بیشک ﴿بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ میں داخل ہوگی۔

تنبیہ:...... ائمہ مجتہدین کی تقلید کو اس آیت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ اس آیت کے مضمون میں داخل ہیں معاذ اللہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں کہ نصوص شریعت سے قطع نظر کر کے ائمہ مجتہدین کو یہ اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال یا حرام کر دیں اور نہ معاذ اللہ کسی امام نے خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا اور نہ خدا کی حرام کردہ چیز کو حلال بنایا۔ بلکہ ائمۂ مجتہدین تو قانون شریعت کے بہترین شارح اور مفسر ہیں اور چونکہ امت میں ائمہ مجتہدین کا علم اور فہم اور ورع اور تقوی مسلم ہے اس لیے ان کے سمجھے ہوئے کے مطابق شریعت کا اتباع کرتے ہیں اور اپنے ناقص اور ناتمام علم اور کم عقلی اور کم فہمی اور صلاح اور تقوی سے دوری کی وجہ سے اپنے سمجھے ہوئے پر اعتماد کو روا نہیں سمجھتے "رای العلیل علیلٌ"۔ نبی کریم اور صدیقین شہداء اور صالحین کے سمجھے ہوئے کے مطابق شریعت پر عمل کرنا یہی صراط مستقیم ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جس طرح نبی کریم ﷺ کے ارشادات آیات قرآنیہ کی تفسیر ہیں اسی طرح فقہاء کرام کے اقوال احادیث نبویہ کی شرح ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس اللہ سرہ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں: "ان اهل السنة والجماعة افترقت بعد القرون الثلاثة او الاربعة على اربعة مذاهب ولم يبق فى فروع المسائل سوى هذا المذاهب الاربعة فقد انعقد الاجماع المركب على بطلان قول يخالف كلهم وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تجتمع امتى على الضلالة وقال الله تعالىٰ ﴿وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا﴾۔

یعنی قرون ثلاثہ یا اربعہ کے بعد اہل سنت والجماعت ان چار مذہبوں (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) پر منقسم ہو گئے اور فروعی مسائل میں ان چار کے سوا کوئی پانچواں مذہب باقی نہیں رہا پس جو قول ان چاروں مذاہب کے خلاف ہو اس کے باطل

ہونے پر اجماع مرکب منعقد ہو گیا اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت گمراہی پر متفق نہ ہو گی اور ارشاد خداوندی ہے کہ سبیل المومنین یعنی مسلمانوں کے اجماعی مسلک سے انحراف برے انجام کا ذریعہ ہے۔

"وقال ابن الهمام في التحرير انعقد الاجماع على عدم العمل بالمذاهب المخالفة للائمة الاربعة"

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے عقد الجید میں ائمہ اربعہ کی تقلید کو سواد اعظم کا اتباع قرار دیا ہے اور ہندوستان میں خاص امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کو واجب قرار دیا ہے جس کا جی چاہے اصل کتاب کو دیکھ لے۔ پس اگر اصول مسلم کے بعد بھی اہل کتاب روگردانی کریں اور اس صاف اور سچی بات کو قبول نہ کریں جس پر تمام آسمانی کتابوں اور تمام پیغمبروں کا اتفاق ہے تو اے مسلمانو تم یہ کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ یعنی اللہ کے فرمانبردار اور اس کے حکم کے تابعدار ہیں حدیث میں ہے کہ حضور پرنور ﷺ نے جب وفد نجران سے کہا "اسلموا" "مسلمان ہو جاؤ تو کہنے لگے کہ "اسلمنا" ہم تو مسلمان ہیں اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ نصاریٰ نجران جو دعویٰ اسلام کا کرتے ہیں وہ غلط ہے اس لیے کہ جب توحید ہی کے قائل نہیں جو تمام شریعتوں کا مسلم اصول ہے تو پھر دعوائے اسلام بالکل غلط ہے۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ

اے اہل کتاب کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم کی بابت اور تورات اور انجیل تو اتریں اس کے

اے کتاب والو ! کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم پر ؟ اور توریت اور انجیل تو اتریں اس کے

بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ

بعد کیا تم کو عقل نہیں سنتے ہو تم لوگ جھگڑ چکے جس بات میں تم کو کچھ خبر تھی اب کیوں

بعد، کیا تم کو عقل نہیں ؟ سنتے ہو تم لوگ جھگڑ چکے، جس بات میں تم کو خبر تھی، اب کیوں

تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ

جھگڑتے ہو جس بات میں تم کو کچھ خبر نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ف۱ نہ تھا

جھگڑتے ہو، جس بات میں تم کو خبر نہیں ؟ اور اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔ نہ تھا

ف۱ جیسے دعوائے اسلام و توحید سب میں مشترک تھا اسی طرح حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی تعظیم و تکریم میں بھی سب شریک تھے اور یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک فرقہ دعویٰ کرتا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھے یعنی معاذ اللہ یہودی تھے یا نصرانی، اسکا جواب دیا کہ تورات و انجیل جن کے پیرو یہودی یا نصرانی کہلائے ابراہیم علیہ السلام سے سینکڑوں برس بعد اتری۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کو نصرانی یا یہودی کیسے کہہ سکتے ہیں بلکہ جس طرح کے تم یہودی یا نصرانی ہو، اس معنیٰ سے تو خود موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کو بھی یہودی یا نصرانی نہیں کہا جاسکتا۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت ہمارے مذہب سے زیادہ قریب تھی تو یہ بھی غلط ہے۔ اس کا علم تم کو کہاں سے ہوا؟ تمہاری کتابوں میں مذکور نہیں۔ نہ خدا نے خبر دی نہ تم کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو پھر ایسی بات میں جھگڑنا جس کا کچھ علم آدمی کو نہ ہو حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ جن چیزوں کی تمہیں کچھ تھوڑی بہت خبر تھی گو محض ناتمام اور سرسری تھی مثلاً مسیح علیہ السلام کے واقعات یا نبی آخر الزماں کی بشارات وغیرہ ان میں تم جھگڑ چکے لیکن جس چیز سے تمہیں بالکل مس نہیں نہ اس کی کبھی ہوا لگی اسے تو خدا کے سپرد کر دو۔ وہی جانتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام =

إِبۡرَٰهِيمُ يَهُودِيّٗا وَلَا نَصۡرَانِيّٗا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفٗا مُّسۡلِمٗا وَمَا كَانَ مِنَ

ابراہیم یہودی اور نہ تھا نصرانی لیکن تھا حنیف یعنی سب جھوٹے مذہبوں سے بیزار اور حکم بردار اور نہ تھا

ابراہیم یہودی، اور نہ نصرانی، اور لیکن تھا ایک طرف کا حکم بردار۔ اور نہ تھا

ٱلۡمُشۡرِكِينَ ۝٦٧ إِنَّ أَوۡلَى ٱلنَّاسِ بِإِبۡرَٰهِيمَ لَلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا ٱلنَّبِيُّ وَٱلَّذِينَ

مشرک ف۱ بیشک لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو تھی جو ساتھ اس کے تھے اور اس نبی کو اور جو

شرک و۔ لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو تھی، جو ساتھ اس کے تھے، اور اس نبی کو اور

ءَامَنُواْۗ وَٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ۝٦٨

ایمان لائے اس نبی پر ف۲ اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا ف۳

ایمان والوں کو۔ اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا۔

ابطال دعوائے اہل کتاب درباره ملت ابراہیم علیہ السلام

قَالَ تَعَالٰی: ﴿يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ... الی... وَٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ﴾

ربط:...... جس طرح دعوائے توحید میں سب مشترک تھے اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم وتکریم میں سب شریک تھے اور یہود اور نصاریٰ ہر ایک فرقہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھے عیسائی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے اور ہم ملت ابراہیمی پر ہیں اور ان سے زیادہ قریب ہیں اور یہودی یہ کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

= کیا تھے اور آج دنیا میں کونسی جماعت کا مسلک اس سے قریب تر ہے۔

ف۱ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے تئیں حنیف یا مسلم کہا ہے۔ حنیف کے معنیٰ؟ "جو کوئی ایک راہ حق پکڑے اور سب باطل راہیں چھوڑ دے"۔ اور مسلم کے معنی حکمبر دار، اب خود اندازہ کرلو کہ آج کس نے سب سے ٹوٹ کر خدا کی راہ پکڑی اور اپنے کو خالص اسی کے سپرد کر دیا ہے۔ وہی ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ اقرب واشبہ ہوگا۔ (تنبیہ) یہاں "مسلماً" میں اسلام سے خاص شریعت محمدیہ مراد لینے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تسلیم وتفویض اور فرمانبرداری کے معنی ہیں جو تمام انبیاء کا دین رہا ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس نام ولقب کو بہت زیادہ روشن کیا۔ ﴿إِذۡ قَالَ لَهُۥ رَبُّهُۥٓ أَسۡلِمۡۖ قَالَ أَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح حیات کا ایک ایک حرف جتلاتا ہے کہ وہ ہمہ تن اسلام اور تسلیم ورضا کے پیکر مجسم تھے۔ ذبح اسماعیل کے واقعہ میں ﴿فَلَمَّآ أَسۡلَمَا وَتَلَّهُۥ لِلۡجَبِينِ﴾ کا لفظ ان کی شان اسلام کو بہت وضاحت سے نمایاں کرتا ہے۔ صلی اللہ علیٰ نبینا وبارک وسلم۔

ف۲ اللہ تعالیٰ نے جتلا دیا کہ زیادہ مناسبت ابراہیم علیہ السلام سے اس وقت کی امت کو تھی یا پچھلی امتوں میں اس نبی کی امت کو ہے تو یہ امت نام میں بھی اور راہ میں بھی ابراہیم علیہ السلام سے مناسبت زیادہ رکھتی ہے اور اس امت کا پیغمبر خلقاً وخلقاً صورۃً وسیرۃً حضرت ابراہیم سے اشبہ ہے اور ان کی دعا کے موافق آیا ہے جیسا کہ سورۃ "بقرہ" میں گزرا۔ ﴿رَبَّنَا وَٱبۡعَثۡ فِيهِمۡ رَسُولٗا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيهِمۡۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلۡحَكِيمُ﴾ اسی لئے حبشہ کا نصرانی بادشاہ (نجاشی) مسلمان مہاجرین کو "حزب ابراہیم علیہ السلام" کہتا تھا شاید اسی قسم کی مناسبات کی وجہ سے درود شریف میں کما صلیت علی ابراہیم فرمایا۔ یعنی اس نوعیت اور نمونہ کی صلوٰۃ نازل فرمائے جو ابراہیم علیہ السلام وآل ابراہیم پر کی تھی۔ جامع ترمذی میں حدیث ہے: "إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وُلَاةً مِنَ النَّبِيِّينَ وَإِنَّ وَلِيِّ أَبِي وَخَلِيلُ رَبِّي" اس مضمون کی تفصیل آئندہ کسی سورت میں آئے گی انشاء اللہ۔

ف۳ یعنی اپنی راہ کے حق ہونے پر محض کسی کی موافقت ومشابہت سے دلیل جب پکڑے کہ اپنے اوپر وحی نہ آتی ہو۔ سو اللہ والی ہے مسلمانوں کا کہ (بے براہ راست) اس کے حکم پر چلتے ہیں (موضح القرآن)۔

یہودی تھے اور ہم اُن کی ملت پر ہیں اور اُن سے زیادہ قریب ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کے اس دعوے کے رد اور ابطال کے لیے یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ تم سب غلط کہتے ہو تم کو ابراہیم سے کیا واسطہ تم سب مشرک ہو اور ابراہیم علیہ السلام موحد اور مُسلم یعنی خدا کے فرمانبردار بندہ تھے ابراہیم علیہ السلام سے محبت کرنے والے اور ان کے طریقہ پر چلنے والے یہ نبی اور مسلمان ہیں چنانچہ فرماتے ہیں اے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ تم ابراہیم کے بارہ میں کیوں جھگڑتے ہو اور ان کو یہودی یا نصرانی بتلاتے ہو اور حالانکہ توریت اور انجیل حضرت ابراہیم کی ایک مدت دراز کے بعد نازل ہوئیں اور یہودیت اور نصرانیت توریت اور انجیل کے نازل ہونے کے بعد پیدا ہوئی اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک ہزار سال مقدم تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار سال قبل تھے پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ملت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور شریعت سے مقدم تھی تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف یہودیت اور نصرانیت کی نسبت کیسے ممکن ہوسکتی ہے پس کیا تم کو اتنی عقل نہیں کہ ایسی باطل بات زبان سے نکالتے ہو کہ جو جو طریقہ (یہودیت اور نصرانیت) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک ہزار یا دو ہزار برس بعد ظاہر ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے وجود سے پہلے کیسے اس کے متبع تھے آگاہ ہو جاؤ تم ہی وہ لوگ ہو جو اس چیز میں جھگڑ چکے ہو جس کا تمہیں کچھ تھوڑا بہت علم تھا اور اس کے متعلق تمہیں کچھ بقدر تھی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت وغیرہ کی تمہیں کچھ خبر تھی حالانکہ عقل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جب تک آدمی کو پورا علم نہ ہو اس بارہ میں بحث اور مناظرہ نہ کرے پس اے احمقو! اس چیز میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کیا مذہب اور مسلک تھا اور آج دنیا میں کون سی جماعت ان کے مسلک کے قریب ہے اور اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے اور جس چیز کو آدمی نہ جانتا ہو اس کو چاہئے کہ اس کے علم کو خدا کے سپرد کرے اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا کیا طریقہ تھا سنو ان کا طریق یہ تھا کہ ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی ولیکن حنیف تھے یعنی سب طرف سے بے زار ہو کر صرف ایک خدا کے فرمانبردار اور تابعدار تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے بلکہ موحد اور حنیف اور مُسلم تھے حنیف کا معنی ہیں کہ سب باطل راہوں کو چھوڑ کر راہِ حق پکڑے اور سب طرف سے ہٹ کر ایک طرف (یعنی خدا کا) ہو جائے اور مسلم کے معنی فرمانبردار اور تابعدار کے ہیں اور اے اہل کتاب تم نہ موحد ہو اور نہ حنیف ہو اور نہ مسلم ہو شرک میں مبتلا ہو نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو احکام خداوندی کو پس پشت ڈالے ہوئے ہو اور ثالث ثلاثہ کا عقیدہ رکھتے ہو اور حضرت عزیر اور حضرت مسیح کو ابن اللہ کہتے ہو تو پھر تم کیسے دم بھرتے ہو کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں تحقیق تمام لوگوں میں سے ملت اور مذہب کے اعتبار سے حضرت ابراہیم کے ساتھ سب سے زیادہ قریب اور خصوصیت رکھنے والے البتہ اول تو وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کے وقت میں حضرت ابراہیم کا اتباع اور پیروی کی وہ آپ کی امت کے آدمی تھے اور بلاشبہ آپ کے دین پر تھے اور پھر اس اخیر زمانہ میں یہ نبی اور مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ نزدیک ہیں۔ کہ جن کی شریعت کے اکثر احکام ملتِ ابراہیمی کے موافق ہیں اللہ کو ایک مانتے ہیں اور قربانی اور ختنہ کرتے ہیں اور خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں اور حج اور عمرہ بجالاتے ہیں اور غسل جنابت کرتے ہیں اور جن باتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش ہوئی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان میں پورے اترے مسلمان ان کو پوری طرح ادا کرتے ہیں اور اللہ مسلمانوں کا والی اور کارساز ہے اور

جس کا خدا والی ہو، اس پر کسی کا داؤ نہیں چل سکتا اور نہ اس کو کوئی راہ حق سے ہٹا سکتا ہے خلاصۂ جواب خداوندی یہ ہے کہ تم جو یہ دعوی کرتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھے یعنی معاذ اللہ یہودی یا نصرانی تھے اگر اس معنی کہ کہتے ہو کہ وہ توریت یا انجیل پر عمل کرتے تھے تو یہ صریح بے عقلی ہے توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک ہزار برس بعد میں ہوئے اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک ہزار برس بعد ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دین یہودی اور دین مسیحی کا پیرو بتلانا صریح بے عقلی ہے اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہودی یا نصرانی بتلانے کا یہ مطلب ہے کہ اس زمانہ میں اہل ہدایت اور اچھے دین داروں کا نام یہودی یا نصرانی تھا تو یہ بات بھی غلط ہے اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو حنیف اور مسلم کہا ہے اور حنیف کے معنی یہ ہیں کہ جس نے تمام باطل راہوں کو چھوڑ کر ایک حق کی راہ پکڑ لی ہو اور مسلم کے معنی حکم بردار اور تابع دار کے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے حوالہ اور سپرد کر دیا ہو اب تم خود غور کرو کہ یہ صفت تم میں ہے یا مسلمانوں میں اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہودی یا نصرانی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سب دینوں میں یہود یا نصاریٰ کے دین کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے زیادہ مناسبت ہے تو یہ بات بھی غلط ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سب سے زیادہ مناسبت اس وقت کی اُمت کو تھی اور پچھلی امتوں میں سب سے زیادہ مناسبت امت محمدیہ کو ہے کہ جس کا پیغمبر خلقاً وخُلقاً وصورۃً وسیرۃً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشابہ ہے اور ان کی خاص دعا ہے: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ﴾ الخ اور آپ کی امت کا بھی وہی نام ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں فرمایا تھا ﴿وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ اور آپ کی شریعت کے قواعد کلیہ وہی ہیں جو ملت ابراہیمی کے تھے اور غالباً اسی مناسبت کی وجہ سے درود شریف میں کما صلیت علی ابراھیم فرمایا۔ تشبیہ میں کسی اور نبی کا ذکر نہیں فرمایا۔

ضروری تنبیہ:...... یاد رہے کہ ﴿وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا﴾ میں ابراہیم علیہ السلام کے مسلم ہونے سے یہ مراد نہیں کہ آپ شریعت اسلامیہ کو مانتے تھے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی کیونکہ اس صورت میں بھی وہی اعتراض وارد ہوگا کہ یہ شریعت بھی تو توریت اور انجیل کی طرح ابراہیم علیہ السلام کے بعد میں نازل ہوئی پھر ابراہیم علیہ السلام اس شریعت کے کیونکر متبع ہو سکتے ہیں بلکہ اس آیت میں اسلام سے معنی لغوی یعنی تفویض اور تسلیم توحید اور اخلاص فی العمل اور فرمانبرداری کے معنی مراد ہیں جو تمام انبیاء کا دین رہا ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس نام اور صفت کو روشن کیا۔ ﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ﴿فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ﴾۔ اور یہی تفویض اور تسلیم اور توحید اور خلاص فی العمل۔ اصل حقیقت ہے شریعت محمدیہ یعنی اسلام کی اور اس سے اہل کتاب بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین بایں معنی اسلام تھا کیونکہ خود ان کی کتابوں میں ابراہیم علیہ السلام کے متعلق جو کچھ آیا ہے وہ بالکل اسی معنی پر منطبق ہے اور تمام انبیاء اپنے اپنے وقت میں اسی معنی کر اسلام کی دعوت دیتے چلے آئے یعنی توحید اور اخلاص فی العمل اور یہی لفظ اسلام اسی معنی اور حقیقت کے اعتبار سے مسلمانوں کے دین اور مذہب کا نام ہوگیا ہے پس اگر اس نام اور صفت اور اس معنی اور حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمان ہی ابراہیم علیہ السلام سے اقرب اور اشبہ ہوں گے اور نصاریٰ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا نسبت۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۗ وَمَا يُضِلُّوْنَ إِلَّآ أَنْفُسَهُمْ وَمَا

آرزو ہے بعضے اہل کتاب کو کہ کسی طرح گمراہ کریں تم کو اور گمراہ نہیں کرتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں

آرزو ہے بعض کتاب والوں کو، کس طرح تم کو راہ بھلادیں، اور راہ بھلاتے ہیں مگر آپ کو، اور نہیں

يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٩﴾ يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ يٰٓأَهْلَ

سمجھتے ف۱ اے اہل کتاب کیوں انکار کرتے ہو اللہ کے کلام کا اور تم قائل ہو ف۲ اے اہل

سمجھتے۔ اے کتاب والو ! کیوں منکر ہوتے ہو اللہ کے کلام سے ؟ اور تم قائل ہو۔ اے

الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٧١﴾ ع ۸

کتاب کیوں ملاتے ہو سچ میں جھوٹ اور چھپاتے ہو سچی بات جان کر ف۳

کتاب والو ! کیوں ملاتے ہو صحیح میں غلط؟ اور چھپاتے ہو سچی بات کو جان کر۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ أُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ

اور کہا بعضے اہل کتاب نے مان لو جو کچھ اترا مسلمانوں پر

اور کہا ایک لوگوں نے اہل کتاب میں، کہ مان لو جو کچھ اترا مسلمانوں پر

النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۗ

دن چڑھے اور منکر ہوجاتے آخر دن میں شاید وہ پھر جاویں ف۴ اور نہ مانیو مگر اسی کی جو چلے تمہارے دین پر ف۵

دن چڑھے ، اور منکر ہوجاؤ آخر دن ، شاید وہ پھرجاویں ۔ اور یقین نہ کریو مگر اسی کا جو چلے تمہارے دین پر،

ف۱ پہلے کہا تھا ﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یہاں بتلایا کہ جب مومنین کا ولی اللہ ہے تو تمہارا داؤں ان پر کیا چل سکتا ہے۔ بیشک بعض اہل کتاب چاہتے ہیں کہ جس طرح خود گمراہ ہیں مسلمانوں کو بھی راہ حق سے ہٹادیں لیکن مسلمان تو ان کے جال میں پھنسنے والے نہیں البتہ یہ لوگ اپنی گمراہی کے وبال میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ ان کی مغویانہ کوششوں کا ضرر خود ان ہی کو پہنچے گا جسے وہ فی الحال نہیں سمجھتے۔

ف۲ یعنی تم تورات وغیرہ کے قائل ہو جس میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے متعلق بشارات موجود ہیں جن کو تمہارے دل سمجھتے ہیں اور اپنی خلوتوں میں ان چیزوں کا اقرار بھی کرتے ہو۔ پھر کھلم کھلا قرآن پر ایمان لانے اور خاتم الانبیاء کی صداقت کا اقرار کرنے سے کیا چیز مانع ہے۔ خوب سمجھ لو قرآن کا انکار کرنا تمام پچھلی کتب سماویہ کا انکار کرنا ہے۔

ف۳ تورات کے بعض احکام تو اغراض دنیاوی کی خاطر سرے سے موقوف ہی کر ڈالے تھے۔ بعض آیات میں تحریف لفظی کی تھی۔ بعض کے معنی بدل دیئے تھے اور بعض چیزیں ملی جلی چھپا رکھی تھیں ہر کسی کو خبر نہ کرتے تھے جیسے بشارات پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

ف۴ ان آیتوں میں اہل کتاب کی چالاکیاں اور خیانتیں ذکر کی جارہی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ اپنے کچھ آدمی صبح کے وقت بظاہر مسلمان بن جائیں اور مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور شام کو یہ کہہ کر کہ ہم کو اپنے بڑے بڑے علماء سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہ نبی نہیں جن کی بشارت دی گئی تھی اور تجربہ سے ان کے حالات بھی اہل حق کی طرح کے ثابت نہ ہوئے اسلام سے پھر جایا کریں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے ضعیف الایمان ہماری یہ حرکت دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں گے۔ اور سمجھ لیں گے کہ مذہب اسلام میں ضرور کوئی عیب و نقص دیکھا ہوگا جو یہ لوگ داخل ہونے کے بعد اس سے نکلے۔ نیز عرب کے جاہلوں میں اہل کتاب کے علم و فضل کا چرچا تھا۔ اس بناء پر یہ خیال پیدا ہو جائے گا کہ یہ جدید مذہب اگر سچا ہوتا تو ایسے اہل علم اسے رد نہ کرتے بلکہ سب سے آگے بڑھ کر قبول کرتے۔ =

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ

کہہ دے کہ بیشک ہدایت وہی ہے جو اللہ ہدایت کرے ف۱ اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اور کسی کو بھی کیوں مل گیا جیسا کچھ تم کو ملا تھا یا وہ غالب کیوں آگئے تم پر

تو کہہ، ہدایت وہی جو ہدایت کرے اللہ، اس واسطے کہ کسی کو ملا جیسا کچھ تم کو ملا تھا، یا مقابلہ کیا تم سے تمہارے

رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

تمہارے رب کے آگے ف۲ تو کہہ بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جس کو چاہے اور اللہ بہت گنجائش والا ہے خبردار

رب کے آگے۔ تو کہہ، بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جس کو چاہے۔ اور اللہ گنجائش والا ہے خبردار۔

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

خاص کرتا ہے اپنی مہربانی جس پر چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے ف۳ اور بعضے اہل کتاب میں

خاص کرتا ہے اپنی مہربانی جس پر چاہے۔ اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔ اور بعض اہل کتاب میں

مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ

وہ ہیں کہ اگر تو ان کے پاس امانت رکھے ڈھیر مال کا تو ادا کردیں تجھ کو اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ اگر تو ان کے پاس امانت رکھے ایک اشرفی تو ادا نہ کریں

وہ ہے کہ اگر تو اس پاس امانت رکھے ڈھیر مال کا، ادا کرے تجھ کو، اور بعض ان میں وہ ہے، اگر تو اس پاس امانت رکھے ایک اشرفی، ادا نہ کرے

=ف۵ یعنی جو یہود مسلمانوں کے سامنے جاکر نفاق سے اپنے کو مسلمان ظاہر کریں، انہیں یہ برابر ملحوظ رہے کہ وہ سچ مچ مسلمان نہیں بن گئے۔ بلکہ بدستور یہودی ہیں۔ اور سچے دل سے انہی کی بات مان سکتے ہیں جو ان کے دین پر چلتا ہو اور شریعت موسوی کے اتباع کا دعویٰ رکھتا ہو۔ بعض نے ولا تومنوا الا لمن تبع دینکم کے یہ معنی کئے ہیں کہ ظاہری طور پر جو ایمان لاؤ اور اپنے کو مسلمان بتاؤ، وہ محض ان لوگوں کی وجہ سے جو تمہارے دین پر چلنے والے ہیں۔ یعنی اس تدبیر سے اپنے ہم مذہبوں کی حفاظت مقصود ہونی چاہیے کہ وہ مسلمان نہ بن جائیں یا جو بن چکے ہیں اس تدبیر سے واپس آجائیں۔

ف۱ یعنی ہدایت تو اللہ کے دینے سے ملتی ہے جس کے دل میں خدا نے ہدایت کا نور ڈال دیا تمہاری ان پر فریب چالبازیوں سے وہ گمراہ ہونے والا نہیں۔

ف۲ یعنی یہ مکاریاں اور تدبیریں محض از راہ حسد اس جلن میں کی جاتی ہیں کہ دوسروں کو اس طرح کی شریعت اور نبوت و رسالت کیوں دی جارہی ہے جیسی پہلے تم کو دی گئی تھی۔ یا مذہبی و دینی جدوجہد میں دوسرے لوگ تم پر غالب آکر کیوں آگے نکلے جارہے ہیں اور خدا کے آگے تمہیں ملزم گردان رہے ہیں۔ یہود ہمیشہ اس خیال کی اشاعت کرتے رہے تھے کہ دنیا میں تنہا ہماری ہی قوم علم شرعیات کی اجارہ دار ہے۔ تورات ہم پر اتری۔ موسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر ہم میں آئے پھر عرب کے امیوں کو اس فضل وکمال سے کیا واسطہ؟ لیکن تورات سفر استثناء کی عظیم الشان پیشین گوئی غلط نہیں ہوسکتی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے ایک موسیٰ جیسا (صاحب شریعت مستقلہ) نبی اٹھائے گا۔ اپنا کلام (قرآن کریم) اس کے منہ میں ڈالے گا۔ ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا﴾ چنانچہ بنی اسماعیل کو یہ دولت ملی اور وہ علم و فضل حجت و برہان اور مذہبی جدوجہد کے میدان مقابلہ میں نہ صرف بنی اسرائیل بلکہ دنیا کی تمام اقوام سے گوئے سبقت لے گئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔ (تنبیہ) اس آیت کی تقریر کئی طرح سے کی گئی ہے لیکن ہم نے وہی تقریر اختیار کی جس کی طرف مترجم محقق قدس اللہ روحہ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

ف۳ یعنی اللہ کے خزانوں میں کمی نہیں، اور اسی کو خبر ہے کہ کس کو کیا بڑائی ملنی چاہیے۔ نبوت، شریعت، ایمان و اسلام اور ہر قسم کی مادی و روحانی فضائل وکمالات کا تقسیم کرنا اسی کے ہاتھ میں ہے جس وقت جسے مناسب جانے عطا کرتا ہے۔ ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾

اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ

تجھ کو مگر جب تک کہ تو رہے اس کے سر پر کھڑا ف۱ یہ اس واسطے کہ انہوں نے کہہ رکھا ہے کہ نہیں ہے ہم پر امی لوگوں کے حق لینے میں

تجھ کو، مگر جب تک تو رہے اس کے سر پر کھڑا۔ یہ اس واسطے کہ انہوں نے کہہ رکھا ہے، نہیں ہم پر جاہلوں کے حق

سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ

کچھ گناہ ف۲ اور جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر اور وہ جانتے ہیں ف۳ کیوں نہیں جو کوئی پورا کرے اپنا قرار

کا گناہ۔ اور جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر جانتے (جان بوجھ کر)۔ کیوں نہیں! جو کوئی پورا کرے اپنا اقرار

وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ

اور وہ پرہیزگار ہے تو اللہ کو محبت ہے پرہیزگاروں سے ف۴ جو لوگ مول لیتے ہیں اللہ کے قرار پر اور اپنی قسموں پر

اور پرہیزگار ہے، تو اللہ چاہتا ہے پرہیزگاروں کو۔ جو لوگ خرید کرتے ہیں اللہ کے اقرار پر، اور اپنی قسموں پر

ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ

تھوڑا سا مول ف۵ ان کا کچھ حصہ نہیں آخرت میں اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ اور نہ نگاہ کرے گا

تھوڑا مول، اور ان کو کچھ حصہ نہیں آخرت میں، اور نہ بات کریگا ان سے اللہ، اور نہ نگاہ کرے گا

اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا

ان کی طرف قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے واسطے عذاب ہے دردناک ف۶ اور بیشک ان میں ایک فریق ہے

ان کی طرف قیامت کے دن، اور نہ سنوارے گا ان کو، اور ان کو دکھ کی مار ہے۔ اور ان میں ایک لوگ ہیں

ف۱ اہل کتاب کی دینی خیانت ونفاق کے سلسلہ میں دنیاوی خیانت کا ذکر آ گیا جس سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ جو لوگ چار پیسہ پر نیت خراب کرلیں اور امانتداری نہ برت سکیں ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ دینی معاملات میں امین ثابت ہوں گے۔ چنانچہ ان میں بہت سے وہ ہیں جن کے پاس زیادہ تو کیا، ایک اشرفی بھی امانت رکھی جائے تو تھوڑی دیر بعد مکر جائیں۔ اور جب تک کوئی تقاضہ کے لئے ہر وقت ان کے سر پر کھڑا نہ رہے اور پیچھا کرنے والا نہ ہو، امانت ادا نہ کریں۔ بیشک ان میں سب کا حال ایسا نہیں، بعض ایسے بھی ہیں جن کے پاس اگر سونے کا ڈھیر رکھ دیا جائے تو ایک رتی خیانت نہ کریں۔ لیکن یہی خوش معاملہ اور امین لوگ ہیں۔ جو یہودیت سے بیزار ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش بنتے جا رہے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ (رض)

ف۲ یعنی پرایا حق کھانے کو یہ مسئلہ بنالیا کہ عرب کے امی جو ہمارے مذہب پر نہیں، ان کا مال جس طرح ملے روا ہے۔ غیر مذہب والوں کی امانت میں خیانت کی جائے تو کچھ گناہ نہیں خصوصاً وہ عرب جو اپنا آبائی دین چھوڑ کر مسلمان بن گئے ہیں۔ خدا نے ان کا مال ہمارے لئے حلال کر دیا ہے۔

ف۳ یعنی جان بوجھ کر خدا کی طرف جھوٹی بات منسوب کر رہے ہیں۔ امانت میں خیانت کرنے کی خدا نے ہرگز اجازت نہیں دی آج بھی اسلامی فقہ کا مسئلہ یہی ہے کہ مسلم ہو یا کافر کسی کی امانت میں خیانت جائز نہیں۔

ف۴ یعنی خیانت و بدعہدی میں گناہ کیوں نہیں، جبکہ خدا تعالیٰ کا عام قانون یہ ہے کہ جو کوئی خدا کے اور بندوں کے جائز عہد پورے کرے اور خدا سے ڈر کر تقویٰ کی راہ چلے یعنی فاسد خیالات مذموم اعمال اور پست اخلاق سے پرہیز کرے، اسی سے خدا محبت کرتا ہے۔ اس میں امانتداری کی خصلت بھی آ گئی۔

ف۵ یعنی جو لوگ دنیا کی متاع قلیل لے کر خدا کے عہد اور آپس کی قسموں کو توڑ ڈالتے ہیں، نہ باہمی معاملات درست رکھتے ہیں نہ خدا سے جو قول و قرار کیا تھا اس پر قائم رہتے ہیں۔ بلکہ مال وجاہ کی حرص میں احکام شرعیہ کو بدلتے اور کتب سماویہ میں تحریف کرتے رہتے ہیں۔ ان کا انجام آگے مذکور ہے۔ حضرت شاہ صاحب =

يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ

کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب تاکہ تم جانو کہ وہ کتب میں ہے اور وہ نہیں کتاب میں

کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب، کہ تم جانو وہ کتاب میں ہے، اور وہ نہیں کتاب میں۔

وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

اور کہتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہے اور وہ نہیں اللہ کا کہا ف۱ اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں

اور کہتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہے، اور وہ نہیں اللہ کا کہا اور اللہ پر جھوٹ۔ بولتے ہیں

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ

جان کر کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ اس کو دیوے کتاب اور حکمت اور پیغمبر کرے پھر

جان کر۔ کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ اس کو دیوے کتاب اور حکم اور پیغمبر کرے، پھر

يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ

وہ کہے لوگوں کو کہ تم میرے بندے ہوجاؤ اللہ کو چھوڑ کر ف۲ لیکن یوں کہے کہ تم اللہ والے ہوجاؤ جیسے کہ تم

وہ کہے لوگوں کو کہ تم میرے بندے ہو اللہ کو چھوڑ کر، لیکن تم ربی ہوجاؤ، جیسے تھے تم

= لکھتے ہیں "یہ یہود میں صفت تھی کہ اللہ نے ان سے اقرار لیا تھا اور قسمیں دی تھیں کہ ہر نبی کے مددگار رہو۔ پھر غرض دنیا کے واسطے پھر گئے اور جو کوئی جھوٹی قسم کھائے دنیا لینے کے واسطے اس کا یہی حال ہے۔

ف۶ اس قسم کی آیت سورۃ "بقرۃ" کے اکیسویں رکوع میں گزر چکی، وہاں کے فوائد میں الفاظ کی تشریح دیکھ لی جائے۔

ف۱ یہ اہل کتاب کی تحریف کا حال بیان فرمایا۔ یعنی آسمانی کتاب میں کچھ چیزیں اپنی طرف سے بڑھا گھٹا کر ایسے انداز اور لہجہ میں پڑھتے ہیں کہ ناواقف سننے والا دھوکہ میں آجائے۔ اور یہ سمجھے کہ یہ بھی آسمانی کتاب کی عبارت ہے یہی نہیں بلکہ زبان سے دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ سب اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے۔ حالانکہ نہ وہ مضمون کتاب میں موجود ہے اور نہ خدا کے پاس سے آیا ہے بلکہ خود اس تحریف شدہ کتاب کو بھی بہیاتِ مجموعی خدا کی کتاب نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس میں طرح طرح کے تصرفات اور جعلسازیاں کی گئی ہیں۔ آج بائبل کے جو نسخے دنیا میں موجود ہیں ان میں باہم شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور بعض ایسے مضامین درج ہیں جو قطعاً خدا کی طرف سے نہیں ہوسکتے۔ اسکی کچھ تفصیل "روح المعانی" میں موجود ہے۔ اور اثبات تحریف پر ہمارے علماء نے مبسوط بحثیں کی ہیں۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء۔

ف۲ وفد نجران کی موجودگی میں بعض یہود و نصاریٰ نے کہا تھا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہاری اسی طرح پرستش کرنے لگیں، جیسے نصاریٰ عیسیٰ ابن مریم کو پوجتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ معاذ اللہ کہ ہم غیر اللہ کی بندگی کریں۔ یا دوسروں کو اسکی دعوت دیں؟ حق تعالیٰ نے ہم کو اس کام کے لئے نہیں بھیجا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی جس بشر کو حق تعالیٰ کتاب وحکمت اور قوت فیصلہ دیتا، اور پیغمبری کے منصب جلیل پر فائز کرتا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک پیغام الٰہی پہنچا کر لوگوں کو اسکی بندگی اور وفاداری کی طرف متوجہ کرے، اس کا یہ کام کبھی نہیں ہوسکتا کہ انکو خالص ایک خدا کی بندگی سے ہٹا کر خود اپنا یا کسی دوسری مخلوق کا بندہ بنانے لگے۔ اس کے تو یہ معنیٰ ہوں گے کہ خداوند قدوس نے جس کو جس منصب کا اہل جان کر بھیجا تھا، فی الواقع وہ اس کا اہل نہ تھا۔ دنیا کی کوئی گورنمنٹ بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدہ پر مامور کرتی ہے تو پہلے دو باتیں سوچ لیتی ہے: ۱- یہ شخص گورنمنٹ کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض کو انجام دینے کی لیاقت رکھتا ہے یا نہیں۔ ۲- گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو جادہ وفاداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس سے توقع کی جاسکتی ہے؟ کوئی بادشاہ یا پارلیمنٹ ایسے آدمی کو نائب السلطنت یا سفیر مقرر نہیں کرسکتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے یا اسکی پالیسی اور احکام سے انحراف کرنے کا ادنیٰ =

تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰۗىِٕكَةَ

سکھلاتے تھے کتاب اور جیسے کہ تم آپ بھی پڑھتے تھے اسے ف۱ اور نہ یہ کہے تم کو کہ ٹھہرا لو فرشتوں کو

کتاب سکھاتے، اور جیسے تھے تم پڑھتے۔ اور نہ یہ کہے تم کو، کہ ٹھہراؤ فرشتوں کو

وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ ع

اور نبیوں کو رب ف۲ کیا تم کو کفر سکھائے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو ف۳

اور نبیوں کو رب۔ کیا تم کو کفر سکھائے گا؟ بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکو۔

یہود کی شرارتوں اور خیانتوں اور افتراء پردازیوں کا بیان

قَالَ تَعَالٰی: ﴿وَدَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ... اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾

ربط: ......گزشتہ آیات میں اہل کتاب سے مناظرہ اور مباہلہ کا بیان تھا کہ یہ لوگ نہ تو کسی دلیل کو مانتے ہیں اور نہ مباہلہ پر آمادہ ہوتے ہیں معلوم ہوا کہ حق کی تحقیق مقصود نہیں بلکہ مقصود شرارت اور فتنہ پردازی ہے اس لیے آئندہ آیات میں یہود کی کچھ شرارتوں اور عداوتوں اور دغابازیوں اور فریب کاریوں کو بیان کرتے ہیں کہ کس کس طرح سے یہ لوگ حق اور باطل کو خلط ملط کرنے میں مکر اور فریب سے کام لیتے ہیں یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ تم حق پر اور سیدھے راستہ پر ہو مگر یہ لوگ تم کو دھوکہ دے کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ دور تک یہی سلسلہ کلام چلا گیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ اہل کتاب کی ایک جماعت دل سے آرزو رکھتی ہے کہ کسی طرح تم کو گمراہ کر دیں یعنی صحیح راستہ سے تم کو ہٹا دیں اور وہ کسی کو گمراہ نہیں کر رہے ہیں مگر اپنے آپ کو اور وہ سمجھتے بھی نہیں کہ اس کا

= شبہ ہو، بیشک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی قابلیت یا جذبہ وفاداری کا اندازہ حکومت صحیح طور پر نہ کر سکی ہو۔ لیکن خداوند قدوس کے یہاں یہ بھی احتمال نہیں۔ اگر فرد کی نسبت اس کو علم ہے کہ یہ میری وفاداری اور اطاعت شعاری سے بال برابر تجاوز نہ کرے گا تو محال ہے کہ وہ آگے چل کر اس کے خلاف ثابت ہو سکے۔ ورنہ علم الٰہی کا غلط ہونا لازم آتا ہے۔ العیاذ باللہ یہیں سے عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ سمجھ میں آجاتا ہے (کما نبہ علیہ ابو حیان فی البحر وفضلہ مولانا قاسم العلوم والخیرات فی تصانیفہ) پھر جب انبیاء علیہم السلام ادنیٰ عصیان سے پاک ہیں تو شرک اور خدا کے مقابلہ میں بغاوت کرنے کا امکان کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ اس میں نصاریٰ کے اس دعوے کا بھی رد ہو گیا جو کہتے تھے کہ ابنیت والوہیت مسیح کا عقیدہ ہم کو خود مسیح علیہ السلام نے تعلیم فرمایا ہے اور ان مسلمانوں کو بھی نصیحت کر دی گئی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ ہم سلام کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا کریں تو کیا حرج ہے اور اہل کتاب پر بھی تعریض ہو گئی جنہوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدائی کا درجہ دے رکھا تھا (العیاذ باللہ) تنبیہ: ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ﴾ الخ میں ابوحیان کے نزدیک اسی طرح کی نفی ہے جیسے ﴿مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا﴾ میں، یا ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ میں۔ وھو اصوب عندی۔

ف۱ موضح القرآن میں ہے "جس کو اللہ نبی بنائے اور وہ لوگوں کو کفر و شرک سے نکال کر مسلمانی میں لائے، پھر کیونکر ان کو کفر سکھلائے گا۔ ہاں تم کو (اے اہل کتاب!) یہ کہتا ہے کہ تم میں جو آگے دینداری تھی۔ کتاب کا پڑھنا اور سکھانا وہ نہیں رہی۔ اب میری صحبت میں پھر وہی کمال حاصل کرو۔ اور عالم، حکیم، عارف، مدبر، متقی اور پکے خدا پرست بن جاؤ۔ اور یہ بات اب قرآن کریم پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ف۲ جیسے نصاریٰ نے مسیح روح القدس کو بعض یہود نے عزیر کو۔ اور بعض مشرکین نے فرشتوں کو ٹھہرا لیا تھا۔ جب فرشتے اور پیغمبر خدائی میں شریک نہیں ہو سکتے تو پتھر کے بت اور صلیب کی لکڑی تو کس شمار میں ہے۔

ف۳ یعنی پہلے تو "ربانی" (اللہ والا) اور مسلم موحد بنانے میں کوشش کی، جب لوگوں نے قبول کر لیا تو کیا پھر انہیں شرک و کفر کی طرف لیجا کر اپنی ساری محنت اور کمائی اپنے ہاتھ سے برباد کر دے گا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔

وبال ان ہی کے سر ہے۔ یعنی ان پر دگنا عذاب ہوگا ورنہ خود تو پہلے ہی سے گمراہ ہیں گمراہ کو گمراہ کرنا مراد نہیں بلکہ گمراہ کر دینے کا وبال مراد ہے۔ یہود لیل ونہار مسلمانوں کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اور اپنی چالوں سے مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات ڈالنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور توریت کی ان آیات بینات کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے جو حضور پرنور ﷺ کے نبی برحق ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور علیٰ ہذا آنحضرت ﷺ کے معجزات کی طرف بھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے جو آپ ﷺ کی نبوت کے دلائل اور شواہد ہیں پس یہود کی یہ کوشش دوسروں کی تضلیل نہیں بلکہ درحقیقت خود اپنی ہی تضلیل ہے مگر ان کو اس کا شعور اور احساس بھی نہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور اس کا کیا انجام ہے۔

اب آئندہ آیات میں ایمان داروں کو ہوشیار کرنے کے لیے اہل کتاب کے چند مکر ذکر کرتے ہیں۔ (اول) یہ کہ اہل کتاب حضور پرنور ﷺ کے معجزات کو سحر بتاتے ہیں اور آپ ﷺ کی جو بشارتیں کتب سابقہ میں مذکور ہیں باوجود شہادت دینے کے ان کو چھپاتے ہیں اور طرح طرح سے ان کی تاویلیں کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں اے اہل کتاب کیوں کفر کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا دیدہ ودانستہ اور حالانکہ تم اپنی زبان سے اس کے قائل اور گواہ ہو کہ یہ آیتیں حق ہیں۔

ف:...... آیات اللہ سے یا تو توریت وانجیل کی وہ آیتیں مراد ہیں جن میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت اور نعت اور صفت کا ذکر ہے یعنی نبی کریم ﷺ اور قرآن عظیم کے متعلق جو بشارتیں توریت وانجیل میں مذکور ہیں تم خود اپنی خلوتوں میں ان کا اقرار کرتے ہو پس ایمان لانے سے کیا چیز مانع ہے خوب سمجھ لو کہ آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کرنا توریت اور انجیل اور تمام کتب سماویہ کا انکار کرنا ہے یا آیات اللہ سے قرآن کی آیتیں مراد ہیں یعنی تم خود بھی جانتے ہو کہ یہ اللہ کی آیتیں ہیں اور پھر بھی ایمان نہیں لاتے یا آیات اللہ سے نشانیاں یعنی معجزات مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ معجزات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ نبی برحق ہیں پھر کیوں آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہو۔ یہ تو ملامت ہوئی خود ان کی ضلالت یعنی خود ان کی گمراہی پر اب آئندہ آیت میں اضلال یعنی دوسروں کے گمراہ کرنے پر ملامت فرماتے ہیں اے اہل کتاب کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو اور سچ کے ساتھ کیوں جھوٹ کو ملاتے ہو اور کیوں حق اور سچی بات کو چھپاتے ہو اور حالانکہ تم جانتے ہو کہ یہ حق ہے اور یہ باطل اور یہ بھی جانتے ہو کہ حق کو چھپانا اور حق کو باطل کے ساتھ ملانا کتنا بڑا جرم ہے۔ قانون حکومت میں ایک حرف کا تغیر وتبدل بھی جرم عظیم ہے۔ اہل کتاب توریت کے بعض احکام کو تو دنیوی اغراض کی خاطر بالکل موقوف ہی کر ڈالتے تھے اور بعض آیت میں لفظی تحریف کرتے اور بعض آیات کے معنی پھیر ڈالتے یعنی تاویل فاسد کرتے اور بعض چیزوں کو چھپا کر رکھتے ہر کسی کو خبر نہ دیتے جیسے پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی بشارتیں پس "باطل" سے یہ تمام تحریفات اور تاویلات فاسدہ مراد ہیں کہ ان کو حق کے ساتھ خلط ملط کر دیتے تھے تاکہ حقیقت واضح نہ ہو غرض یہ کہ لفظی تحریف بھی کرتے تھے اور تاویل فاسدہ کے ذریعے سے معنوی تحریف بھی کرتے تھے اور کبھی حق بات کو چھپا کر رکھتے یہ تحریف کا نرالا طریق تھا کہ تحریف کا نام بھی نہ ہو اور تحریف کا مقصد حاصل ہو جائے جیسے ﴿لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوۃَ﴾ کو ذکر کر دینا اور ﴿وَاَنۡتُمۡ سُکٰرٰی﴾ کو چھپا لینا یہ بھی تحریف ہی ہے۔

اب آئندہ آیت میں یہود کی مسلمانوں کو دین حق سے گمراہ کرنے کی ایک عجیب وغریب سازش اور مکر وفریب کو ظاہر کرتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس ؓ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن صیف اور عدی بن زید اور حارث بن عوف نے آپس میں

مشورہ کیا کہ ہم میں سے چند لوگ صبح کے وقت چل کر محمد (ﷺ) پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ظاہراً ایمان لے آئیں اور پھر شام کو اس کا انکار کر دیں تا کہ لوگ شک اور تردد میں پڑ جائیں کہ یہ لوگ علماء اہل کتاب ہیں انہوں نے دین اسلام میں ضرور کوئی عیب اور نقصان کی بات دیکھی ہوگی جو داخل ہونے کے بعد اس سے پھر گئے شاید دوسرے لوگ بھی ہم کو اس طرح دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس مکر سے مطلع کر دیا اور بتلا دیا کہ وہ اس قسم کے مکر اور فریب سے مسلمانوں کو گمراہ نہیں کر سکتے اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور اہل کتاب کی ایک جماعت نے مشورہ کر کے یہ کہا کہ جو کتاب مسلمانوں پر نازل ہوئی ہے اس پر شروع دن میں ظاہراً ایمان لے آؤ اور پھر آخر دن میں اس سے منکر ہو جاؤ شاید مسلمان بھی شک میں پڑ جائیں اور اپنے دین سے پھر جائیں کہ یہ لوگ علم والے ہیں اور بے تعصب ہیں کہ اسلام میں داخل ہو گئے ان لوگوں نے دین اسلام میں ضرور کوئی خرابی دیکھی ہوگی جو داخل ہونے کے بعد اس سے پھر گئے ہیں۔ خلاصہ ① یہ کہ صرف مسلمان کے دکھلانے کے لیے صرف ظاہری طور پر مسلمانوں کی کتاب پر ایمان لاؤ اور صدق دل سے کسی کے قول کی تصدیق نہ کرو یعنی سچا ایمان جس میں دل اور زبان موافق ہوتے ہیں وہ کسی کے لیے بھی نہ لاؤ مگر جو شخص تمہارے دین کا پیرو ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو یہود، مسلمانوں کے پاس جا کر شروع دن میں ظاہراً ان کی کتاب پر ایمان لائیں اور بطور نفاق اپنے کو مسلمان ظاہر کریں ان کو یہ بات برابر ملحوظ رہے کہ وہ اس ظاہری ایمان کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمان نہ سمجھیں بلکہ صدق دل سے اپنے کو یہودی ہی سمجھیں اور سچے دل سے اسی شخص کی بات کو قبول کریں جو ان کے دین کا پیرو ہو سوائے اپنے مذہب والوں کے کسی کی بات کا یقین نہ کریں اس صورت میں ﴿لِمَنْ تَبِعَ﴾ میں لام زائد ہوگا اور بعض نے ﴿وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾ کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ تمہارا صبح کے وقت ظاہری طور پر ایمان لانا بھی محض ان لوگوں کے دین کی حفاظت کے لیے ہو۔ جو تمہارے ہم مذہب اور تمہارے دین کے پیرو ہیں اس صورت میں ﴿لِمَنْ تَبِعَ﴾ کا لام انتفاع کے لیے ہوگا یعنی اس تدبیر سے اپنے ہم مذہبوں کی حفاظت مقصود ہونی چاہیے کہ وہ آئندہ چل کر مسلمان نہ ہو جائیں یا جو ہمارے ہم مذہب مسلمان ہو چکے ہیں وہ اس تدبیر سے پھر واپس آ جائیں اے محمد ﷺ آپ یہود کے ان علماء اور رؤسا سے کہہ دیجئے کہ تمہارا یہ مکر و فریب سب بیکار ہے تحقیق ہدایت وہ ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے ہدایت ہو جس کے دل میں اللہ ہدایت کا نور ڈال دے اس کو کسی کا مکر و فریب گمراہ نہیں کر سکتا۔ اور تمہارا یہ مکر و فریب ہدایت نہیں۔ ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو عطا ہوئی اور اللہ جس کو چاہے تمہاری طرح کتاب اور دین دے کر ہدایت کر سکتا ہے کوئی وجہ انکار نہیں اور تم مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی یہ چالبازیاں اور مکاریاں اس لیے کر رہے ہو کہ تمہیں اس بات پر حسد ہے کہ کسی اور کو بھی تم جیسا دین اور کتاب اور حکمت دیا جائے جیسا پہلے تمہیں دیا گیا یہود کا یہ گمان تھا کہ نبوت و شریعت اور علم و حکمت بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص ہے۔ عرب کے امیین کو اس فضیلت اور نعمت سے کیا واسطہ ②، یا یہ مکر اور تدبیر تم نے

---

① اشارہ اس طرف ہے کہ ولا تومنوا کا عطف ﴿اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ﴾ پر ہے اور یہ جزء آیت کلام یہود کا بقیہ ہے اور ان کے کلام سابق پر معطوف ہے وکذلک قال ابن عطیۃ لا خلاف بین اهل التاویل ان هذا القول من کلام الطائفۃ۔ انتھی

② اشارہ اس طرف ہے کہ ﴿اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ﴾ کا عطف یوتی پر ہے اور "ان" کی وجہ سے منصوب ہے اور ﴿يُحَاۗجُّوْكُمْ﴾ کی ضمیر مرفوع احد کی طرف راجع ہے اور لفظ احد اگرچہ مفرد ہے مگر بلحاظ معنی جمع ہے اور "ان یوتی" الی آخرہ بتقدیر لام فعل محذوف کی علت ہے۔ ای لاجل ان یوتی احد مثل ما اوتیتم او

اس حسد اور جلن میں کی ہے کہ دین کی مددگاری میں رب کے سامنے تم پر کوئی غالب نہ آ جائے کیونکہ وہ ہدایت پر ہیں نہ کہ تم یعنی اس حسد نے تم کو اس مکر پر مجبور کیا تم کو حسد یہ ہے کہ دین کی مددگاری میں ہمارا مقابل کوئی اور کیوں ہو یا یہ معنی ہیں کہ یہ حسد اس بنا پر ہے کہ تم کو یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان تم کو خدا کے روبرو ملزم نہ ٹھہرائیں کہ توریت اور انجیل میں حضور پرنور ﷺ کی نبوت ورسالت کی بشارتیں مذکور تھیں اور یہ لوگ اس کا اقرار بھی کرتے تھے مگر باوجود اس اقرار اور اعتراف کے آپ ﷺ پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ آپ ان رؤساء یہود سے یہ کہہ دیجئے کہ تمہارا یہ حسد اور یہ تدبیر اس صورت میں کارگر ہوسکتی ہے کہ جب فضل اور انعام تمہارے ہاتھ میں ہو لیکن تحقیق فضل ونعمت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے تمہارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں وہ مالک الملک ہے جس کو چاہے عطا کرے اور تم اس کے انعام میں کسی قسم کی کمی اور تنگی بھی نہیں کرسکتے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بڑی گنجائش والا ہے یعنی اس کا فضل نہایت وسیع ہے اور خوب جاننے والا ہے کہ کون اس فضل وانعام کے لائق ہے وہ اپنی مہربانی اور بخشایش سے جس کو چاہتا ہے خاص کرتا ہے اور اس وقت اس نے اپنی رحمت سے مسلمانوں کو خاص فرمایا ہے اور خداوندِ ذوالجلال کی رحمت پر حسد کرنا فضول بلکہ حماقت ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے اس کے فضل کو کوئی روک نہیں سکتا۔

اہل کتاب میں سے اہل امانت کی مدح اور اہل خیانت کی مذمت

گزشتہ آیت میں اہلِ کتاب کی تلبیس اور کتمان حق کا بیان تھا اب اس آیت میں ان کی خیانت فی المال کا ذکر ہے کہ ان لوگوں میں امانت داری اور خدا ترسی نہیں چند پیسوں کے لیے خیانت سے دریغ نہیں کرتے۔ دین اور آخرت کے معاملہ میں ان پر کیسے بھروسہ کیا جائے البتہ ان میں بعض بعض اب بھی امین ہیں جن کو حق کے قبول کرنے میں دریغ نہیں چنانچہ فرماتے ہیں اور بعضے اہلِ کتاب سے ایسے امین ہیں کہ اے مخاطب اگر تو اس کے پاس کوئی خزانہ اور مال کا ڈھیر بھی امانت رکھ دے تو وہ تیری امانت تجھ کو واپس دے دیں گے اگرچہ تو ان سے اپنی امانت کا مطالبہ بھی نہ کرے پس جو شخص مخلوق کے معاملہ میں اس درجہ امین ہوگا تو وہ خالق کے معاملہ میں بدرجہ اولے امین ہوگا ایسا شخص توریت کے احکام میں اور نبی آخر الزمان ﷺ کی بشارتوں میں ذرہ برابر خیانت نہ کرے گا اس لیے کہ وہ اللہ کی امانت ہیں۔ عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ کسی شخص نے عبداللہ بن سلام ؓ کے پاس ایک ہزار اور دوسو اوقیہ سونا امانت رکھا آپ نے بعینہ اس کی امانت ادا کردی۔ یہ آیت ان کے بارہ میں نازل ہوئی اور بعض ان میں سے ایسے ہیں کہ اس کے پاس اگر ایک اشرفی امانت رکھ دو تو وہ بھی تجھ کو ادا نہ کرے گا مگر جب تک رہے تو اس کے سر پر کھڑا۔ یعنی جب مجبور ہوجائے تب امانت ادا کرے یہ آیت فخاص بن عازوراء یہودی کے بارے میں نازل ہوئی جس کے پاس کسی شخص نے ایک اشرفی امانت رکھی تھی۔ اور اس نے اس میں بھی خیانت کی اور ان کی یہ خیانت اس وجہ سے ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ناخواندوں اور ان پڑھوں یعنی عربوں کے مال میں ہم پر کوئی راہ نہیں یعنی ہم پر خدا کے یہاں عربوں کے مال میں کوئی مواخذہ اور مطالبہ نہیں۔ عربوں کے مال ہمارے لیے حلال

= اویحاجوکم عند ربکم قلتم ذلک القول ودبرتم تلک المکیدۃ ای فعلتم ذلک حسدا وخوفا من ان تذھب ریاستکم ویشارککم احد فیما اوتیتم من فضل العلم اویحاجوکم عند ربکم ای یقیمون الحجۃ علیکم عند اللہ اذ کتابکم طافح بنبوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وملزم ان تومنوبہ وتتبعوہ کذا فی البحر المحیط۔

ہیں۔ اہل کتاب کا یہ عقیدہ تھا کہ ہم اہل کتاب ہیں اور ساری دنیا جاہل ہے اور غیر اہل کتاب مثلاً قریش وغیرہ کے مال میں خیانت کرنے میں ہم پر مذہبا کوئی گناہ نہیں جیسے برہمنوں نے ہندوؤں کے بہکانے کے لیے بہت سی باتیں بنا رکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس دعوے کی تکذیب میں فرماتے ہیں۔ اور یہ لوگ اللہ پر دیدہ دانستہ جھوٹ بولتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کسی مخالف اور دشمن کے مال میں چوری اور خیانت کی کبھی اجازت نہیں دی ان لوگوں نے پرایا مال کھانے کے لیے یہ مسئلہ بنایا کہ غیر مذہب والوں کی امانت میں خیانت جائز ہے جان بوجھ کر جھوٹ بنالیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے امانت میں خیانت کی کبھی اجازت نہیں دی اور شریعت اسلامیہ کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ مسلمان ہو یا کافر، ہندو ہو یا یہودی یا نصرانی کسی کی امانت میں خیانت جائز نہیں اور یہ خود بھی جانتے ہیں کہ توریت میں کوئی ایسا حکم نہیں اور آج کل یورپین اقوام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً اور ایشیائی اقوام کے ساتھ عموماً عہد و میثاق کا پورا کرنا ضروری نہیں وقت کا جو تقاضا ہو اس پر چلتے ہیں کیوں نہیں ضرور خیانت پر مواخذہ ہوگا کیونکہ اس کے متعلق ہمارا قانون یہ ہے کہ جو شخص اپنے عہد کی وفا کرے خواہ وہ عہد خالق سے ہو یا مخلوق سے ہو اور پرہیزگاری کرے یعنی اللہ سے ڈرے کہ امانت میں کسی قسم کی خیانت نہ ہو جائے پس تحقیق اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو محبوب رکھتا ہے اور اللہ کا دوسرا قانون یہ ہے کہ تحقیق جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلہ میں دنیا کا تھوڑا سا مول یعنی حقیر معاوضہ خرید کرتے ہیں۔ یعنی معمولی نفع اور معمولی فائدہ کے لیے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھا بیٹھتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے آخرت کی نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے نہ کوئی بات کرے گا اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک وصاف کرے گا یعنی ان کے گناہوں کو نہیں بخشے گا اس لیے کہ خیانت حقوق العباد میں سے ہے اور ان میں لامحالہ قصاص یعنی بدلہ ہے اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہوگا آگ بھی ہوگی اور خطابِ تہدید و توبیخ بھی ہوگا اور نظرِ غضب بھی ہوگی اور کفر شرک کی نجاستوں اور گندگیوں سے پاک بھی نہ کیے جائیں گے اور یہ سب کچھ کیوں نہ ہو تحقیق ان اہل کتاب میں سے ایک ایسا گروہ ہے جو کتاب کو زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں اور اس میں کچھ اپنی طرف سے بھی ملا دیتے ہیں اور کتاب ہی کے لہجہ میں اس کو پڑھتے ہیں تاکہ تم اس ملائے ہوئے کو کتاب کا جزء سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا جزء نہیں ہوتا بلکہ وہ ان کی طرف سے ہوتا ہے یہ لوگ چالاکی سے آسمانی کتاب میں کچھ چیزیں اپنی طرف سے گھٹا بڑھا کر ایسے انداز اور لہجہ میں پڑھتے ہیں کہ ناواقف آدمی سن کر دھوکہ میں آجاتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ الفاظ اور عبارت بھی آسمانی کتاب کی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما ① سے مروی ہے کہ یہ آیت یہود اور نصاریٰ کے بارہ میں نازل ہوئی جو کتاب اللہ میں اپنی طرف سے زیادتی اور اضافہ کر دیتے تھے۔ (تفسیر ابن جریر: ۳/۲۳۱)

صحیح بخاری میں طرق متعددہ سے مروی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ فرماتے ہیں:

---

① روی الضحاك عن ابن عباس ان الاية نزلت فی الیهود والنصاری جمیعا وذلك انهم حرفوا التوراة والانجیل والحقوا بکتاب الله ما لیس منه (کذا فی روح المعانی: ۳/۱۸۱) واخرجه ابن جریر وابن ابی حاتم من طریق العوفی عن ابن عباس فی قوله وان منهم لفریقا یلوون السنتهم بالکتاب قال هم الیهود کانوا یزیدون فی کتاب الله ما لم ینزل الله (در منثور: ۲/۴۶)

"یا معشر المسلمین کیف تسألون اھل الکتب عن شئی و کتاب اللہ الذی انزلہ علی نبیہ احدث اخبار اللہ تقرء و نہ غضا لم یشب وقد حدثکم اللہ تعالیٰ ان اھل الکتاب قد بدلوا کتاب اللہ وغیّروہ وکتبوا بایدیھم الکتاب وقالوا ھو من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا افلا ینھاکم ما جاء کم من العلم عن مسئلتھم ولا واللہ ما راینا منھم احدا قط سألکم عن الذی انزل علیکم کذا فی تفسیر ابن کثیر تحت تفسیر قولہ تعالیٰ فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم"۔الخ (طبع بیروت: ۱/۱۱۷)

''اے گروہ مسلمین تم اہل کتاب سے کیسے پوچھتے ہو حالانکہ اللہ کی وہ کتاب جو اس نے اپنے نبی پر اتاری ہے وہ سب سے نئی اور آخری کتاب ہے جس کو تم تر و تازہ پڑھتے ہو اور اس میں کسی دوسری چیز کا ذرہ برابر شائبہ بھی نہیں یعنی بعینہ اللہ کی کتاب پڑھتے ہو اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم کو بتلا دیا ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب میں یعنی توریت وغیرہ میں تغیر وتبدل کر لیا ہے اور بہت سی چیزیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس میں شامل کر دی ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تا کہ اس سے کچھ دنیا کا فائدہ حاصل کریں کیا جو صحیح اور تازہ علم تمہارے پاس آیا ہے وہ تم کو اہل کتاب سے سوال اور استفادہ سے منع نہیں کرتا یعنی صحیح علم کے ہوتے ہوئے محرّف کتاب کی طرف کیوں نظر کرتے ہو علاوہ ازیں تمہارا اہل کتاب سے سوال کرنا غیرت کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ خدا کی قسم ہم نے تو اہل کتاب کو کبھی نہیں دیکھا کہ وہ تمہاری کتاب یعنی قرآن کے متعلق تم سے کچھ سوال کرتے ہوں پھر تم کیوں ان سے سوال کرتے ہو۔'' (رواہ البخاری)

اور تفسیر کبیر: ۲/۵۰۲ و تفسیر نیسابوری: ۳/۲۲۸، میں ابن عباس (۱) رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ آیت ان یہود کے بارہ میں نازل ہوئی جو کعب بن اشرف یہودی کے پاس توریت کا ایک نسخہ لے کر آئے جس میں نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کی ان صفات اور علامات کو بدل دیا تھا جو توریت میں آئی تھی بنی قریظہ نے ان کی لکھی ہوئی کتاب کو لیا اور اپنی کتاب میں اس کو ملا لیا۔

اور قفال مروزی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں ﴿لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ﴾ سے یہ مراد ہے کہ یہود بعض الفاظ کی حرکات اعرابیہ کو زبان موڑ کر اس طرح پڑھتے تھے کہ جس سے لفظ کے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے تھے جیسے راعنا کے معنی یہ ہیں کہ آپ ہماری رعایت فرمائیے لیکن یہود جب اس لفظ کو زبان موڑ کر پڑھتے تو یہ لفظ راعینا بن جاتا جس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہیں جو سراسر تحقیر ہے یا یہ کہ بعینہ یہی لفظ عبرانی اور سریانی زبان میں گالی تھا۔

خلاصۂ کلام:......جمہور مفسرین کے نزدیک جن میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد اور قتادہ وغیرہم رحمہما اللہ تعالیٰ بھی ہیں ﴿لَيًّا

① نقل عن ابن عباس انہ قال ان النفر الذین لا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ ولا ینظر الیھم کتبوا کتبا شوّشوا فیہ نعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وخلطوہ بالکتاب الذی کان فیہ نعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ثم قالوا ھذا من عند اللہ۔ (تفسیر کبیر: ۲/۵۰۲)

﴿بِأَلْسِنَتِهِمْ﴾ سے کتاب خداوندی میں لفظی تحریف کرنا اور اپنی طرف سے کسی چیز کا کتاب الٰہی میں ملا لینا مراد ہے اور قفال مروزی رحمہ اللہ کے نزدیک ﴿لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ﴾ سے حرکات اعرابیہ کو اس طرح توڑ موڑ کر پڑھنا مراد ہے کہ جس سے معنی بدل جائیں اور مطلب کچھ کا کچھ بن جائے جاننا چاہیے کہ ان دونوں معنوں میں کوئی تضاد اور منافات نہیں اس لیے کہ "لی" کے معنی پھیرنے اور موڑنے کے ہیں یعنی زبان کلام الٰہی اور کتاب خداوندی کو اس طرح مروڑے کہ وہ کلام راستی سے ہٹ کر کجی کی طرف آجائے اور اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ کتاب کی اصل عبارت ہی کو مسخ کر دیا جائے یعنی اس کے حروف اور الفاظ میں تغیر وتبدل کر دیا جائے یا اس میں کوئی دوسری چیز ملا لی جائے جیسا کہ علماء یہود وقریظہ کی نسبت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہوا اور یہ صریح تحریف لفظی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ الفاظ کی حرکات اعرابیہ کو اس طرح موڑ توڑ کر پڑھا جائے کہ معنی بدل جائیں اور کلام اصل معنی اور اصل حقیقت سے دور جا پڑے یہ دوسرے درجہ کی تحریف ہے اور یہود میں دونوں طرح کی تحریف شائع تھی کبھی اصل لفظ ہی کو بدل ڈالتے اور کبھی تلفظ اور قراءت میں ایسا تغیر وتبدل کرتے کہ جس سے لفظ کے معنی بدل جائیں۔

اور حق جل شانہ کا یہ ارشاد ﴿لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ اور پھر ﴿وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ یہ تاکید در تاکید اس امر کی صریح دلیل ہے کہ مقصود یہ بتلانا ہے کہ یہود تحریف میں اس قدر جری اور دلیر ہیں کہ بے خوف وخطر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور بے باکی کا یہ عالم ہے کہ تعریض اور کنایہ پر کفایت نہیں کرتے بلکہ صراحت کے ساتھ تحریفیں کرتے ہیں اور علانیہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور بہتان لگاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور یہ تحریف کرنے والے ایہام اور تعریض پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ صراحت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ بالکل اللہ کی طرف سے نہیں نہ صراحۃً نہ اشارۃً نہ کنایۃً نہ تاویلاً نہ استنباطاً نہ لفظاً نہ معنیً اور یہ لوگ بڑے ہی ڈھیٹ ہیں کہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ہم اللہ پر جھوٹ بول رہے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ یہ ہمارا ملایا ہوا ہے اللہ کی طرف سے بالکل نہیں۔

مسئلہ تحریف:...... کتب سابقہ کی تحریف کے بارہ میں جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ ان میں تحریف لفظی ہوئی اور بعض شاذ ونادر علماء اس طرف گئے ہیں کہ ان میں صرف تحریف معنوی ہوئی ہے کتب سماویہ کے اصل حروف والفاظ بعینہ محفوظ ہیں۔ جیسا کہ حضرت وہب ① بن منبہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ توریت وانجیل اسی طرح محفوظ ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کو اتارا تھا لیکن یہود تاویلات فاسدہ کے ذریعہ سے گمراہ کرتے ہیں (روح المعانی: ۳/ ۱۸۲)

علماء محققین سب اس طرف ہیں کہ توریت وانجیل میں تحریف لفظی بھی ہوئی ہے اور تحریف معنوی بھی اور اہل کتاب نے فقط تراجم میں نہیں بلکہ اصل کتاب میں تغیر اور تبدل کیا ہے کمی بھی کی ہے اور زیادتی بھی۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

---

① قال وهب بن منبه ان التوراة والانجيل كما انزلهما الله تعالىٰ لم يغير منهما حرف ولكنهم يضلون بالتحريف والتاويل وكتب كانوا يكتبونها من عند انفسهم ويقولون هو من عند الله وما هو من عند الله فاما كتب الله فانها محفوظة ولا تحول رواه ابن ابي حاتم۔ (روح المعاني: ۳/ ۱۸۲، وتفسير ابن كثير: ۱/ ۳۸۲)

وہب بن منبہ رحمہ اللہ کا یہ قول اگر ان سے صحیح اور ثابت بھی ہو جائے تو یہ محض ان کی رائے اور گمان ہے جو نا تمام استقراء اور ناقص تتبع سے ناشی ہوا ہے حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور یہ امر بدیہی ہے کہ کتب الٰہیہ میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوا ہے اور آج وہ اس طرح موجود نہیں جیسا کہ نزول کے وقت تھیں اور پھر علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس کے دلائل اور شواہد بیان کیے ہیں (روح المعانی: ۳/۱۸۲) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ وہب بن منبہ کے قول کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ وہب بن منبہ کے اس قول [1] سے کہ اللہ کی کتابیں محفوظ ہیں ان میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ کیا مراد ہے اگر ان کتابوں سے وہ کتابیں مراد ہیں جو فی الحال ان کے ہاتھ میں موجود ہیں تو ان میں تو بلا شبہ تحریف اور تبدل اور کمی اور زیادتی سب موجود ہے جس کا انکار ممکن نہیں اور اگر ان کتابوں کے تراجم مراد ہیں تو ان میں جو غلطیاں اور زیادتی اور کمی اور اوہام فاحشہ موجود ہیں تو وہ اس قدر کثیر ہیں کہ بیان سے باہر ہیں بلکہ اکثر بلکہ سب کا فہم ان تراجم کے بارہ میں فاسد اور کاسد ہے اور اگر اس سے اللہ کی وہ کتابیں مراد ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں تو بیشک ان کو محفوظ کہا جا سکتا ہے مگر اب ان کا کہیں نام و نشان نہیں اور نہ ان میں کلام ہے انتہی کلام ابن کثیر محصلا (۱/۳۷۶)

"اخرج ابن جرير عن عثمان بن عفان عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في قوله ﴿فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ﴾ قال الويل جبل في النار وهو الذي انزل في اليهود لانهم حرفوا التوراة زادوا فيها ما احبوا ومحوا منها ما يكرهون ومحوا اسم محمد صلى الله عليه وسلم من التوراة۔" (تفسیر درمنثور: ۱/۸۲)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ﴿فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ﴾ کی تفسیر میں فرمایا کہ ویل جہنم میں ایک پہاڑ ہے اور یہ فرمایا کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی اس لیے کہ یہود نے توریت میں تحریف کی توریت میں جس چیز کا اضافہ پسند کیا اس کو توریت میں زیادہ کر دیا اور جو چیز توریت میں ناپسند ہوتی اس کو توریت سے مٹا دیا اور محمد ﷺ کا نام بھی توریت سے مٹا دیا۔"

اور ایک اور حدیث میں ہے:

" لاتصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوهم وقولوا ﴿آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ﴾ الاية" (بخاری)

"اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب اور یہ کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر جو اللہ کی طرف سے پیغمبروں پر اتاری گئی۔"

اس لیے کہ اُن کی کتاب محرف ہے اور حق اور باطل مخلوط ہے یہ متعین نہیں کہ کونسا حصہ اللہ کا اتارا ہوا ہے اور کون سا حصہ ان محرفین کی طرف سے ملایا ہوا ہے لہٰذا اہل کتاب کی مطلقاً تصدیق مت کرو مبادا کہ اس سے ان کی تحریف اور ملاوٹ کی تصدیق ہو جائے اور نہ مطلقاً اس کی تکذیب کرو ممکن ہے کہ وہ بات اللہ کی طرف سے ہو تو اس تکذیب سے اللہ کی بات کی

[1] اصل عبارت یہ ہے کہ واما كتب الله فانها محفوظة ولا تحول (ابن کثیر: ۱/۳۷۶)

تکذیب لازم آئے گی اجمالی طور پر یہ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ نے جو اپنے پیغمبروں پر اتارا اس پر ایمان رکھتے ہیں اگر وہ حق ہوگا تو ﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ میں داخل ہوگا ورنہ نہیں باقی جو کتابیں اہل کتاب کے ہاتھ میں موجود ہیں ان میں چونکہ کمی اور زیادتی اور تغیر و تبدل سب کچھ ہو چکا ہے اور حق و باطل کا کوئی تمیز نہیں اس لیے ہم نہ ان کی تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب اس لیے تمام علماء محققین کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ موجودہ توریت اور انجیل محرف ہے جس میں ہر قسم کی تحریف ہوئی ہے کمی بھی ہوئی ہے اور زیادتی بھی ہوئی اور خود علماء توریت و انجیل کو بھی اس کا اعتراف اور اقرار ہے۔ قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ اس امر کا ذکر ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی صفت اور نعت توریت اور انجیل میں مذکور ہے اور اسی طرح صحابہ کرام ﷡ کے متعلق قرآن کریم میں منصوص ہے کہ ان کی صفات توریت اور انجیل میں مذکور ہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صحابہ کرام ﷡ کی یہ صفات توریت اور انجیل میں مذکور ہیں مگر موجودہ توریت و انجیل میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ پس اگر توریت و انجیل کو تحریف لفظی سے محفوظ مانا جائے تو ان آیات قرآنیہ کی تکذیب لازم آتی ہے۔

اور قرآن کریم میں جا بجا کتب سابقہ میں تحریف کی خبر دی گئی وہاں سب جگہ تحریف لفظی ہی مراد ہے کیونکہ تحریف معنوی تو قرآن کریم میں بھی ہوئی ہے بلکہ ملاحدہ اور زنادقہ قرآن کی تاویلات باطلہ میں یہود اور نصاریٰ سے بھی سبقت لے گئے۔ سرسید علیگڑھی اور غلام احمد قادیانی کی تحریفات اور تاویلات کو دیکھ لیجئے یہود اور نصاریٰ کے بھی کان کتر لیے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ الحمد للہ قرآن کریم جس طرح تحریف لفظی سے محفوظ ہے اسی طرح تحریف معنوی سے بھی محفوظ ہے اس لیے کہ احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ و تابعین کے بعد قرآن کریم کی مراد اس درجہ واضح ہوگئی ہے کہ اب اس میں کسی ملحد زندیق کی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہی فللہ الحمد والمنۃ۔

اطلاع:...... جس شخص کو کتب سابقہ کی تحریف لفظی و معنوی کی پوری تفصیل درکار ہو تو وہ ازالۃ الشکوک اور ازالۃ الاوہام اور اظہار الحق ہر سہ مصنفہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی کی مراجعت کرے۔

ایک ضروری تنبیہ:...... عبداللہ بن عباس ﷠ اور امام بخاری ﷫ کی طرف یہ منسوب ہے کہ وہ تحریف معنوی کے قائل ہیں اس لیے کہ صحیح بخاری میں ہے:

"قال ابن عباس يحرفون ويزيلون وليس احد يزيل لفظ كتاب من كتب الله ولكنهم يحرفونه ويتأولونه على غير تاويلهم۔"

ابن عباس ﷠ ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں یہود تحریف کرتے ہیں اور کتاب الٰہی کے الفاظ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں اور کسی مخلوق کی یہ مجال نہیں کہ اللہ کی کسی کتاب کے کسی لفظ کو زائل اور فنا کر دے لیکن کتاب الٰہی میں تحریف اور اس کی غلط تاویل کرتے ہیں۔

اس عبارت سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہوگیا کہ عبداللہ بن عباس ﷠ تحریف لفظی کے منکر ہیں اور اسی کو امام

بخاری رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔

یہ صحیح نہیں اس لیے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بطرق کثیرہ یہ منقول ہے کہ اہل کتاب نے توریت میں جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی صفات مذکور تھیں ان میں بڑا تغیر اور تبدل اور ردوبدل کر دیا تھا یہ روایتیں تفسیر درمنثور: ۱/ ۸۲ وغیرہ میں مذکور ہیں۔ وہاں دیکھ لی جائیں۔

لہٰذا یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کتب سماویہ میں تحریف لفظی کے منکر ہیں خصوصا جب کہ صحیح بخاری میں متعدد جگہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ منقول ہے کہ اے گروہ مسلمین تم اہل کتاب سے کیوں دریافت کرتے ہو حالانکہ تمہاری کتاب (قرآن) ابھی خدا کی طرف سے تازہ بتازہ نازل ہوئی ہے اور خالص ہے اور اس میں ذرہ برابر کوئی آمیزش نہیں ہوئی اور تحقیق اللہ نے تم کو خبر دے دی ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کتب سابقہ میں بہت سی چیزیں ملاوٹ کی ہیں اور قرآن کریم خالص دودھ ہے جس میں ذرہ برابر کسی قسم کی ملاوٹ نہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو ایک دوسری غرض سے نقل کیا ہے وہ یہ کہ اللہ کا کلام قدیم اور غیر مخلوق ہے کسی مخلوق سے اس کا زائل کرنا اور فنا کرنا ممکن نہیں البتہ بندہ اس میں تاویل اور تحریف کرسکتا ہے اور بندہ کا یہ فعل تاویل اور عمل تحریف حادث اور مخلوق ہے اس لیے کہ بندہ کے تمام افعال مخلوق اور حادث ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب التوحید میں اسی غرض کے لیے متعدد تراجم اور ابواب رکھے ہیں سب سے مقصد یہی ہے کہ اللہ کا کلام قدیم اور غیر مخلوق ہے اور بندہ کا جو فعل کلام خداوندی سے متعلق ہو یعنی بندہ کا تلفظ اور اس کی قراءت اور اس کی تلاوت اور اس کی کتابت یہ سب مخلوق اور حادث ہیں۔ یعنی کلام ملفوظ اور مقروٗ اور کلام متلو قدیم اور غیر مخلوق ہے اور بندہ کا تلفظ اور قراءت اور کتابت سب حادث ہے اسی طرح بندہ کا یہ عمل یعنی تحریف اور تاویل فاسد بھی مخلوق اور حادث ہوگا۔

اہل کتاب کا حضرات انبیاء پر افتراء اور اس کی تردید

گزشتہ آیت میں یہ ذکر تھا کہ اہل کتاب اللہ کی کتاب میں تحریف کرتے ہیں اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اب اس آیت میں حضرات انبیاء پر ان کی افتراء پردازی کا بیان کرتے ہیں کہ اہل کتاب یہ کہتے ہیں۔ معاذ اللہ۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے ابنیت اور الوہیت کے عقیدہ کی تعلیم دی ہے چنانچہ عیسائی الوہیت مسیح اور تثلیث کے مسئلہ میں جب دلیل اور برہان کے پیش کرنے سے عاجز ہوتے تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہم کو ایسا ہی حکم دے گئے ہیں خود حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا ہے اور اس قسم کے اور کلمات کا بھی ذکر کرتے ہیں جن سے اپنے زعم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس کا شریک الوہیت ہونا ثابت کرتے ہیں آئندہ آیت یعنی ﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ ﴾ الخ ان کی تردید اور جواب میں نازل ہوئی جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو کتاب اور حکمت دے کر بھیجتے ہیں

وہ خدا پرستی ہی کی دعوت دیتا ہے یہ ناممکن ہے کہ وہ نبی لوگوں کو اپنی بندگی کی طرف بلائے اور توریت اور انجیل میں صدہا مقامات پر خدا پرستی کی صریح تعلیم موجود ہے لہٰذا تمہارا یہ کہنا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے آپ کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا ہے صریح کذب اور افتراء ہے اور ان کی تصریحات کے صریح خلاف ہے بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے توحید کے بعد تم سے اس بات کا بھی عہد اور اقرار لیا تھا کہ جب تم نبی آخر الزمان ﷺ کا زمانہ پاؤ تو ضرور بالضرور ان کی تصدیق کرنا اور ان پر ایمان لانا اور ان کی نصرت اور اعانت کرنا اور ان کا وہی دین ہوگا جو تمام انبیاء و مرسلین کا دین ہے یعنی دین اسلام چنانچہ فرماتے ہیں کسی بشر کے لیے بشر ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور شریعت اور نبوت عطا فرمائیں باوجود اس کے پھر وہ لوگوں سے کہے اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ اس لیے کہ بشر کے سامنے اپنی بشریت کی عاجزی اور درماندگی ظاہر ہوگی اور عاجزی اور درماندگی کے ہوتے ہوئے ادنیٰ عقل والا بھی اپنی الوہیت کا گمان تک نہیں کر سکتا۔ اور پھر جس کو کتاب و حکمت اور نبوت عطا ہوگی وہ وہی شخص ہوگا جو لوگوں کو ایک خدا کی عبادت کی دعوت دے بعثت کا مقصد ہی توحید و تفرید ہے جس کا امر بالشرک کے ساتھ جمع ہونا ناممکن اور محال ہے اور لیکن وہ نبی تو یہ کہے گا کہ تم اللہ والے ہو جاؤ یعنی ایک خدا کی محبت اور اطاعت میں فنا ہو جاؤ اس لیے کہ تم دوسروں کو اللہ کی کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور اس وجہ سے بھی کہ تم خود بھی اس کتاب الٰہی کو پڑھتے رہتے ہو جو توحید و تفرید کی تعلیم سے بھری پڑی ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ نبی تم کو ربانیت کے حکم کے بعد یہ حکم دے کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو پروردگار ٹھہراؤ۔ فرشتے اور پیغمبر معاذ اللہ خدا اور پروردگار نہیں بلکہ پروردگار تک پہنچنے کا واسطہ اور راستہ ہیں اور انبیاء، کفر اور شرک کے مٹانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں کیا وہ نبی تم کو کفر اور شرک کی طرف لوٹنے کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم اسی کی تعلیم و تلقین سے مسلمان اور موحد ہو چکے ہو۔ ابن اسحاق اور بیہقی رحمہما اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب وفد نجران رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو ابو رافع قرظی یہودی نے کہا کہ اے محمد (ﷺ) کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی ایسی ہی پرستش کرنے لگیں جیسے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کرتے ہیں آپ نے فرمایا معاذ اللہ اور اس پر ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ﴾ سے ﴿مُسْلِمُوْنَ﴾ تک آیت نازل ہوئی۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ موضح القرآن میں فرماتے ہیں یہود مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تمہارا نبی ہم کو کہتا ہے کہ بندگی کرو اللہ کی ہم تو آگے سے اسی کی بندگی کرتے ہیں مگر وہ (یعنی تمہارا نبی) چاہتا ہے کہ میری بندگی کرو سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نبی کرے اور وہ لوگوں کو کفر سے (یعنی غیر اللہ کی عبادت سے) نکال کر مسلمانی میں لاوے پھر ان کو کیونکر کفر سکھاوے مگر تم کو (اے اہل کتاب) یہ کہتا ہے کہ تم میں جو آگے دینداری تھی کتاب کا پڑھنا اور سکھانا وہ (اب تم میں باقی) نہیں رہی اب میری صحبت میں وہی کمال حاصل کرو۔ انتہی۔ یعنی اب میری صحبت میں قرآن پڑھو اور پڑھاؤ اور سیکھو اور سکھاؤ اور عالم ربانی اور عارف یزدانی بنو۔

ف:...... عبادت اور بندگی تو اللہ ہی کی ہے مگر اطاعت اور پیروی نبی کی بھی ضروری اور لازم ہے شاید اس معترض نے عبادت اور اطاعت میں فرق نہ کیا اور اعتراض کر دیا کہ معاذ اللہ حضور پرنور ﷺ لوگوں سے اپنی بندگی چاہتے ہیں یہ اعتراض بالکل لغو اور مہمل تھا عبادت اور اطاعت میں زمین و آسمان کا فرق ہے عبادت خالص اللہ کا حق ہے اور بے چون و چرا اطاعت اور پیروی نبی کا حق ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ

اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم پھر آوے تمہارے پاس

اور جب لیا اللہ نے اقرار نبیوں کا، کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم، پھر آوے تم پاس

رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ

کوئی رسول کہ سچا بتادے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر

کوئی رسول، کہ سچ بتاوے تمہارے پاس والی کو، اس پر ایمان لاؤ گے، اور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا، کہ تم نے اقرار کیا؟ اور اس شرط پر لیا

عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ

میرا عہد قبول کیا بولے ہم نے اقرار کیا ف۱ فرمایا تو اب گواہ ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ

میرا ذمہ؟ بولے، ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا، تو اب شاہد رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ

الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨١﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٨٢﴾

گواہ ہوں ف۲ پھر جو کوئی پھر جاوے اس کے بعد تو وہی لوگ ہیں نافرمان ف۳

شاہد ہوں۔ پھر جو کوئی پھر جائے اس کے بعد، تو وہی لوگ ہیں بےحکم۔

ف۱ یعنی کوئی نبی اپنی بندگی کی تعلیم نہیں دے سکتا۔ بندگی صرف ایک خدا کی سکھائی جاتی ہے البتہ انبیاء کا حق یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں، انکا کہا مانیں، اور ہر قسم کی مدد کریں۔ عام لوگوں کا تو کیا ذکر ہے، حق تعالیٰ نے خود پیغمبروں سے بھی یہ پختہ عہد لے چھوڑا ہے کہ جب تم میں سے کسی نبی کے بعد دوسرا نبی آئے (جو یقیناً پہلے انبیاء اور ان کی کتابوں کی اجمالاً یا تفصیلاً تصدیق کرتا ہوا آئے گا) تو ضروری ہے کہ پہلا نبی پچھلے کی صداقت پر ایمان لائے اور اس کی مدد کرے۔ اگر اس کا زمانہ پائے تو بذات خود بھی اور نہ پائے تو اپنی امت کو پوری طرح ہدایت و تاکید کر جائے کہ بعد میں آنیوالے پیغمبر پر ایمان لا کر اس کی اعانت و نصرت کرنا، کہ یہ وصیت کر جانا بھی اس کی مدد کرنے میں داخل ہے۔ اس عام قاعدہ سے روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کا عہد بلا استثناء تمام انبیائے سابقین سے لیا گیا ہوگا اور انہوں نے اپنی اپنی امتوں سے یہی قول و قرار لئے ہوں گے۔ کیونکہ ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مخزن الکمالات ہستی تھی جو عالم غیب میں سب سے پہلے اور عالم شہادت میں سب انبیاء کے بعد جلوہ افروز ہونے والی تھی، اور جس کے بعد کوئی نبی آنے والا نہ تھا، اور آپ ہی کا وجود باوجود تمام انبیائے سابقین اور کتب سماویہ کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کرنے والا تھا، چنانچہ حضرت علی (رض) اور ابن عباس (رض) وغیرہ سے منقول ہے کہ اس قسم کا عہد انبیاء سے لیا گیا۔ اور خود آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انکو میری اتباع کے بدون چارہ نہ ہوتا۔ اور فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو کتاب اللہ (قرآن کریم) اور تمہارے نبی کی سنت پر فیصلے کریں گے۔ محشر میں شفاعت کبریٰ کے لئے پیش قدمی کرنا اور تمام بنی آدم کا آپ کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور شب معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء کی امامت کرانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی سیادت عامہ اور امامت عظمیٰ کے آثار میں سے ہے۔ اللھم صل علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ آل سیدنا محمد و بارک وسلم۔

ف۲ یہ الفاظ محض عہد کی تاکید و اہتمام کے لئے فرمائے کیونکہ جس عہد نامہ پر خدا تعالیٰ اور پیغمبروں کی گواہی ہو اس سے زیادہ پکی دستاویز کہاں ہو سکتی ہے۔

ف۳ جس چیز کا عہد خدا نے تمام انبیاء سے لیا اور انبیاء نے اپنی اپنی امتوں سے اب اگر دنیا میں کوئی شخص اس سے روگردانی کرے تو بلاشبہ پرلے درجہ کا بدعہد اور نافرمان ہوگا۔ بائبل، اعمال رسل، باب ۳، آیت ۲۱ میں ہے۔ "ضرور ہے کہ آسمان اسے لئے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا۔ اپنی حالت پر آویں کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے، تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے ایک نبی میری مانند اٹھائے گا۔ جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو۔

تذکیر میثاق انبیاء وتوبیخ برانحراف ازاں

قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ... الی... فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾

ربط:...... گزشتہ آیت میں یہ بتلایا کہ عبادت اور بندگی خاص اللہ کا حق ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی نبی اپنی بندگی کی تعلیم دے اب اس آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ انبیاء کا حق یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور بے چون وچرا ان کی اطاعت کریں اور ہر قسم کی ان کی مدد کریں ہر نبی کے زمانہ میں ہر امت سے یہی عہد لیا گیا ہے جس سے اہل کتاب اعراض اور روگردانی کر رہے ہیں اور پختہ عہد کے بعد روگردانی کرنا صریح فسق ہے اور اس آیت کے اخیر میں ﴿فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ میں فسق سے یہی بدعہدی مراد ہے چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے عہد و پیمان لیا پیغمبروں سے کہ البتہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور حکمت یعنی شریعت کا علم دوں اور پھر آئے تمہارے پاس کوئی رسول جس کے ساتھ دلائل نبوت اور شواہد رسالت ہوں اور وہ رسول تصدیق کرنے والا ہو تمہاری اس کتاب اور شریعت کی جو تمہارے ساتھ ہے تو البتہ تم اس رسول پر ضرور ایمان لانا اور فقط ایمان اور تصدیق پر اکتفاء نہ کرنا بلکہ جان و مال سے اس کی پوری پوری مدد بھی کرنا اور اس کے دین اور شریعت کی تبلیغ اور ترویج میں کوئی دقیقہ اٹھا کر نہ رکھنا پھر اس عہد کے بعد مزید تاکید اور توثیق کے لیے حق تعالیٰ نے فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس کام پر میرے پختہ عہد و پیمان کو قبول کر لیا سب نے کہا ہم نے اقرار کیا فرمایا تو اب شاہد اور گواہ رہو ایک دوسرے کے اقرار پر اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے گواہ ہوں۔ یہ تمام الفاظ عہد و میثاق کی تاکید و توثیق کے لیے فرمائے کہ جس عہد اور پیمان پر حق تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کی گواہی ہو اور مدعا علیہ کا اقرار اور شہادت بھی اس کے ساتھ مقرون ہو تو اس دستاویز کے پختہ ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے پس جو شخص پھر جائے ایسے پختہ عہد سے بھی جس پر خدا تعالیٰ کی اور اس کے تمام پیغمبروں کی گواہی ہو اور باوجود عہد اور اقرار کے نہ اس رسول پر ایمان لادے اور نہ اس کی مدد کرے تو ایسے ہی لوگ پرلے درجہ کے بدعہد اور بدکار اور نافرمان ہیں جو ایسے پختہ عہد و پیمان کی بھی پرواہ نہیں کرتے جاننا چاہیے کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرات صحابہ وتابعین کے دو قول ہیں ایک یہ کہ ﴿ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ﴾ میں۔ رسول سے عام رسول اور عام نبی مراد ہے دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ﴾ میں رسول سے خاص محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔

تشریح قول اول:...... اگر ﴿ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ﴾ میں رسول سے عام نبی اور پیغمبر کے معنی مراد ہوں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ہر نبی سے جو آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آئے یہ عہد لیا کہ جس کو ہم کتاب و حکمت دے کر بھیجیں اور اس کے بعد دوسرا نبی آئے جو پہلے انبیاء کی نبوت اور ان کی کتابوں اور حکمت کی اجمالاً یا تفصیلاً تصدیق کرنے والا ہو تو ضروری ہے کہ پہلا نبی بعد میں آنے والے نبی کی تصدیق کرے اور اس کی صداقت پر ایمان لائے اور اس کی مدد کرے یہ نہ ہو کہ پہلے نبی کا علم اور حکمت دوسرے نبی کی تصدیق اور نصرت سے مانع ہو اور اگر خود اس دوسرے نبی کا زمانہ نہ پائے تو اپنی امت کو اس کی پوری پوری ہدایت اور وصیت کر جائے کہ اگر بعد میں آنے والے پیغمبر کا زمانہ پاؤ تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ ایسی وصیت بھی آنے والے نبی کی نصرت اور اعانت میں داخل ہے۔

اور اس عموم میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بھی داخل ہوں گے کیونکہ جب عام طور پر اللہ تعالیٰ یہ عہد لے چکا کہ جو نبی اپنے سے پہلی کتاب وحکمت کا مصدق ہو اس کی تصدیق اور نصرت ضروری ہے تو نبی اکرم ﷺ کی تصدیق ونصرت بھی بطریق عموم اس عہد میں داخل ہوگی کیونکہ آپ بھی دلائل وشواہد کے ساتھ اللہ کے رسول ہیں اور سابقہ کتاب اور حکمت توریت وانجیل کے مصدق ہیں۔ لہٰذا یہود ونصاریٰ کو اپنے انبیاء کے عہد وپیمان کی بناء پر آپ پر ایمان لاکر آپ کی مدد کرنی چاہیے مقصود یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کو انبیاء سابقین کا عہد وپیمان یاد دلا کر ان کو معقول کیا جائے تاکہ معقول پسند طبیعتیں کفر اور انکار سے باز آ کر آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت کریں۔

تشریح قول دوم:...... اور اگر ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ میں رسول سے خاص محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات قدسی صفات مراد ہو تو آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء اور انبیاء نے اپنی قوموں اور امتوں سے اس بات کا عہد لیا کہ اگر محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوں اور تم ان کا زمانہ پاؤ تو ضرور بالضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا حضرت [1] علی اور عبداللہ بن عباس ﷺ سے آیت کے یہی معنی منقول ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آیات سابقہ سے لے کر آیت محولہ بالا تک برابر سلسلہ کلام آپ ہی کی نبوت کے اثبات میں چلا آرہا ہے اور یہی قول جمہور مفسرین کے نزدیک مختار اور راجح ہے امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ میں۔ حضرت علی ﷺ اور ابن عباس ﷺ کے قول کے مطابق خاص محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں لفظ رسول۔ اگرچہ نکرہ ہے مگر اشارہ معین اور مخصوص کی طرف ہے جیسے حق تعالیٰ کے قول ﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً﴾ الی قولہ ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ﴾ میں رسول سے حضور پرنور ﷺ کی ذات بابرکات مراد ہے (تفسیر قرطبی: ۴/ ۱۲۵)

دونوں قولوں میں فرق:...... ان دونوں تفسیروں میں فرق یہ ہے کہ اگر رسول سے عام نبی کے معنی مراد ہوں تو اس سے مقصود یہ ہوگا کہ حضرات انبیاء کرام ﷺ باہم متحد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مصدق اور معین ومددگار رہتے ہیں جیسا کہ ایک بادشاہ ایک وقت میں دو عامل دو مستقل ولایتوں میں بھیجے تو ہر عامل پر دوسرے عامل کے عمل اور ولایت کی تصدیق اور عند الضرورت اس کی نصرت اور اعانت ضروری ہے اگرچہ دونوں ولایتوں کے قوانین اور احکام جزئیہ میں کچھ اختلاف ہو لیکن حکومت کے دستور اساسی میں دونوں متفق ہوتے ہیں البتہ صوبہ اور ولایت کے حالات مختلف ہونے کی وجہ سے مالیہ اور محاصل اور ٹیکس کے احکام ہر صوبہ کے الگ ہوتے ہیں۔ ہاں اگر دو رسول بیک وقت ایک قوم میں بھیجے جائیں تو وہ دونوں شریعت کی ہر بات میں متفق ہوں گے جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون ﷺ دونوں کی شریعت کے احکام بالکل ایک تھے اور اگر ایک نبی اور رسول دوسرے نبی اور رسول کے بعد آئے تو جائز ہے کہ بعد میں آنے والا نبی پہلے نبی کے بہت سے احکام کو منسوخ کردے مگر اصول دین میں تمام انبیاء ورسل اول سے آخر تک متفق رہے ہیں۔ اور دوسرے قول کی بنا پر اگر رسول سے خاص

---

[1] قال علی ابن ابی طالب وابن عمہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ما بعث اللہ نبیا من الانبیاء الا اخذ علیہ المیثاق لئن بعث اللہ محمدا صلی اللہ علیہ وسلم وھو حی لیؤمنن بہ ولینصرنہ وامرہ ان یاخذ المیثاق علی امتہ لئن بعث محمد وھم احیاء لیؤمنن بہ ولینصرنہ۔" (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۷۸)

حضور پر نور ﷺ کی ذات بابرکات مراد لی جائے تو مقصود آیت سے آپ ﷺ کی سیادت اور خاتمیت کو بیان کرنا ہوگا کہ آپ ﷺ تمام اولین اور آخرین کے سردار ہیں کہ آپ کے اتباع اور نصرت کا عہد تمام انبیاء ؑ سے لیا گیا جیسا کہ شب معراج میں آپ نے انبیاء کی امامت فرمائی اور قیامت کے دن شفاعت کبریٰ کے مقام میں آپ ﷺ ہی کھڑے ہوں گے اور تمام بنی آدم آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گے یہ تو دلیل ہوئی آپ کی سیادت عامہ اور امامت کبریٰ کی۔ اور آپ کے خاتم النبیین ہونے کی دلیل یہ ہوئی کہ حق تعالیٰ کا تمام انبیاء سے یہ فرمانا ﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ کہ تم سب کے بعد ایک عظیم الشان رسول آئے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس عظیم الشان رسول کی آمد سب کے بعد ہوگی۔ اور اس کے بعد کسی کو نبی نہیں بنایا جائے گا۔ یہی معنی خاتم النبیین کے ہیں اور حضرت عیسیٰ ؑ آپ سے پہلے نبی بن چکے ہیں۔ البتہ عمر اُن کی طویل ہے اخیر زمانہ میں آپ کی امت کی مدد کے لیے آپ کی شریعت کے تابع ہو کر آسمان سے نازل ہوں گے۔

ف:...... یہ عہد یا تو عالم ارواح میں لیا گیا یا جس وقت حضرت آدم ؑ کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا گیا۔ اور پھر عالم شہادت میں ہر نبی کے زمانہ میں اس عہد کی تجدید ہوئی اور عہد الست کی طرح حضرات انبیاء نے اس عہد کو یاد دلایا تا کہ یاد کے بعد اس عہد کا ایفا کریں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا

اب کوئی اور دین ڈھونڈتے ہیں سوا دین اللہ کے اور اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے یا لاچاری سے ف۱

اب کچھ اور دین ڈھونڈتے ہیں سوائے دین اللہ کے، اور اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا زور سے،

وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٨٣﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ

اور اسی کی طرف سب پھر جاویں گے ف۲ تو کہہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اترا ہم پر اور جو کچھ اترا ابراہیم پر

اور اسی کی طرف پھر جاویں گے۔ تو کہہ، ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اترا ہم پر، اور جو کچھ اترا ابراہیم پر

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ

اور اسماعیل پر، اور اسحاق پر ،اور یعقوب پر، اور اس کی اولاد پر، اور جو ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو

اور اسماعیل پر، اور اسحٰق پر، اور یعقوب پر، اور اس کی اولاد پر، اور جو ملا موسیٰ کو، اور عیسیٰ کو، اور جو ملا سب نبیوں کو،

ف۱ یعنی ہمیشہ سے خدا کا دین اسلام رہا ہے، جس کے معنی ہیں حکمبرداری، مطلب یہ ہے جس وقت حق تعالیٰ کا جو حکم کسی راستباز اور صادق القول پیغمبر کے توسط سے پہنچے اسکے سامنے گردن جھکا دو۔ پس آج جو احکام و ہدایات سید المرسلین خاتم الانبیاء لے کر آئے وہی خدا کا دین ہے۔ کیا اسے چھوڑ کر نجات وفلاح کا کوئی اور راستہ ڈھونڈتے ہیں؟ خوب سمجھ لیں کہ خدا کا دین چھوڑ کر کہیں ابدی نجات اور حقیقی کامیابی نہیں مل سکتی۔ آدمی کو سزاوار نہیں کہ اپنی خوشی اور شوق ورغبت سے اس خدا کی حکمبرداری اختیار نہ کرے جس کے حکم تکوینی کے نیچے تمام آسمان وزمین کی چیزیں ہیں خواہ وہ حکم تکوینی ان کے ارادہ اور خوشی کے توسط سے ہو جیسے فرشتے اور فرمانبردار بندوں کی اطاعت میں، یا مجبوری اور لاچاری سے، جیسے عالم کا ذرہ ذرہ ان آثار وحوادث میں جن کا وقوع وظہور بدون مخلوق کی مشیت وارادہ کے ہوتا ہے حق تعالیٰ کی مشیت وارادہ کا تابع ہے۔

ف۲ سب کو آخر کار جب وہیں لوٹ کر جانا ہے تو عقلمند کو چاہیے کہ پہلے سے تیاری کر رکھے۔ یہاں نافرمانیاں کیں تو وہاں کیا منہ دکھلائے گا۔

مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ

ان کے پروردگار کی طرف سے ہم جدا نہیں کرتے ان میں کسی کو اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں ف۱ اور جو کوئی چاہے سوا

اپنے رب کی طرف سے، ہم جدا نہیں کرتے ان میں کسی کو اور اس کے حکم پر ہیں۔ اور جو کوئی چاہے سوا

الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ كَيْفَ يَهْدِي

دین اسلام کے اور کوئی دین سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا ف۲ اور وہ آخرت میں خراب ہے ف۳ کیونکر راہ دیگا

حکم برداری کے اور دین، سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا، اور وہ آخرت میں خراب ہے۔ کیوں کر راہ دے گا

اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ

اللہ ایسے لوگوں کو کہ کافر ہوگئے ایمان لا کر اور گواہی دے کر کہ بیشک رسول سچا ہے اور آئیں ان کے پاس

اللہ ایسے لوگوں کو کہ منکر ہوگئے مان کر، اور بتا چکے کہ رسول سچا ہے، اور پہنچ چکے ان کو

الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٦﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ

نشانیاں روشن اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو ف۴ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر

نشان۔ اور اللہ راہ نہیں دیتا بےانصاف لوگوں کو۔ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر

ف۱ یعنی جو کچھ جس زمانہ میں خدا کی طرف سے اترا۔ یا کسی پیغمبر کو دیا گیا، ہم بلاتفریق سب کو حق مانتے ہیں۔ ایک مسلم فرمانبردار کا یہ وتیرہ نہیں کہ خدا کے بعض پیغمبروں کو مانے بعض کو نہ مانے، گویا اخیر میں وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ کہہ کر اسلام کی حقیقت بتلادی اور آگاہ کردیا کہ اسلام کسی نبی برحق اور کسی آسمانی کتاب کی تکذیب کا روادار نہیں۔ اس کے نزدیک جس طرح قرآن کریم اور پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ ماننا کفر ہے ایسے ہی کسی ایک نبی یا کتاب سماوی کا انکار کرنے سے بھی انسان کافر ہوجاتا ہے۔ بیشک پیغمبر آخر الزمان کی یہی شان ہونی چاہیے کہ وہ تمام پہلی کتابوں اور نبوتوں کا مصدق ہو۔ اور اس طرح کی تمام اقوام کو جن کے پاس مقامی "نذیر" و "ہادی" آتے رہے تھے، جامعیت کبریٰ کے سب سے بڑے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کا راستہ بتلائے۔ (تنبیہ) اسی قسم کی آیت پارہ الم کے آخیر میں آچکی ہے اس کے فوائد ملاحظہ کرلئے جائیں۔

ف۲ یعنی جب خدا کا دین (اسلام) اپنی مکمل صورت میں آپہنچا تو کوئی جھوٹا یا نامکمل دین قبول نہیں کیا جاسکتا۔ طلوع آفتاب کے بعد مٹی کے چراغ جلانا یا گیس بجلی اور ستاروں کی روشنی تلاش کرنا محض لغو اور کھلی حماقت ہے۔ مقامی نبوتوں اور ہدایتوں کا عہد گزر چکا۔ اب سب سے بڑی آخری اور عالمگیر نبوت و ہدایت سے ہی روشنی حاصل کرنی چاہیے کہ یہی تمام روشنیوں کا خزانہ ہے جس میں پہلی تمام روشنیاں مدغم ہوچکی ہیں۔ فانک شمس والملوک کواکب۔ اذا طلعت لم یبد منھن کوکب۔

ف۳ یعنی ثواب و کامیابی سے قطعاً محروم ہو۔ اس سے بڑا خسارہ کیا ہوگا کہ راس المال ہی کھو بیٹھا۔ حق تعالیٰ نے جس صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا اپنے سوء اختیار اور غلط کاری سے اسے بھی تباہ کرڈالا۔

ف۴ جن لوگوں نے وضوح حق کے بعد جان بوجھ کر کفر اختیار کیا۔ یعنی دل میں یقین رکھتے ہیں اور آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں اقرار کرتے ہیں کہ یہ رسول سچا ہے۔ اسکی حقانیت و صداقت کے روشن دلائل، کھلے نشانات اور صاف بشارات انکو پہنچ چکی ہیں۔ اس پر بھی کبر و حسد اور حب جاہ و مال، اسلام قبول کرنے اور کفر و عدوان کے چھوڑنے سے مانع ہے جیسا کہ عموماً یہود و نصاریٰ کا حال تھا، ایسے ہٹ دھرم، ضدی معاندین کی نسبت کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ باوجود اس طرح کا رویہ قائم رکھنے کے خدا تعالیٰ انکو نجات و فلاح اور اپنی خوشنودی کے راستہ پر لے جائے گا یا جنت تک پہنچنے کی راہ دے گا۔ اسکی عادت نہیں کہ ایسے بے انصاف متعصب ظالموں کو حقیقی کامیابی کی راہ دے۔ اسی پر ان بدبختوں کو قیاس کرلو جو قلبی معرفت و یقین کے درجہ سے بڑھکر ایک مرتبہ مسلمان بھی ہوچکے تھے۔ پھر دنیاوی اغراض اور شیطانی اغواء سے مرتد ہوگئے۔ یہ ان پہلوں سے زیادہ کجرو اور بےحیا واقع ہوئے، اس لئے ان سے بڑھ کر لعنت و عقوبت کے مستحق ہوں گے۔

لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی ف۱ ہمیشہ رہیں گے اس میں ف۲ نہ ہلکا ہوگا ان سے

لعنت اللہ کی، اور فرشتوں کی، اور لوگوں کی سب کی۔ پڑے رہیں اس میں، نہ ہلکا ہو ان پر

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ

عذاب اور نہ ان کو فرصت ملے ف۳ مگر جنہوں نے توبہ کی اس کے بعد اور نیک کام کئے تو بیشک

عذاب، اور نہ ان کو فرصت ملے۔ مگر جنہوں نے توبہ کی اس کے بعد، اور سنوار پکڑی، تو البتہ

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٨٩﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ

اللہ غفور رحیم ہے ف۴ بیشک جو لوگ منکر ہوئے مان کر پھر بڑھتے رہے انکار میں ہرگز قبول نہ ہوگی ان کی

اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ جو لوگ منکر ہوئے مان کر، پھر بڑھتے رہے انکار میں، ہرگز

تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿٩٠﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ

توبہ اور وہی ہیں گمراہ ف۵ بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور مرگئے

قبول نہ ہوگی ان کی توبہ، اور وہی لوگ ہیں راہ بھولے۔ جو لوگ منکر ہوئے، اور مر گئے

كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ

کافر ہی تو ہرگز قبول نہ ہوگا کسی ایسے سے زمین بھر کر سونا ف۶ اور اگرچہ بدلا دیوے اس قدر سونا

منکر ہی، تو ہرگز قبول نہ ہوگا ایسے کسی سے، زمین بھر کر سونا، اگرچہ بدلہ دے یہ کچھ۔ ان کو

ف۱ یعنی خدا، فرشتے اور مسلمان لوگ سب ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ بلکہ ہر انسان حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنے اوپر لعنت کرتے ہیں۔ جب کہتے ہیں کہ ظالموں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت۔ گو اس وقت سمجھتے نہیں کہ یہ لعنت خود ان ہی پر واقع ہو رہی ہے۔

ف۲ یعنی اس لعنت کا اثر ہمیشہ رہے گا۔ دنیا میں پھٹکار اور آخرت میں خدا کی مار۔

ف۳ یعنی انہیں نہ کسی وقت عذاب کی شدت میں کمی محسوس ہوگی اور نہ ذرا سی دیر کے لئے عذاب ملتوی کرکے آرام دیا جائے گا۔

ف۴ ایسے سخت بے حیا مجرموں اور شدید ترین باغیوں کو کون بادشاہ معافی دے سکتا ہے؟ لیکن یہ اس غفور رحیم ہی کی بارگاہ ہے کہ اس قدر شدید جرائم اور بغاوتوں کے بعد بھی اگر مجرم نادم ہو کر سچے دل سے توبہ اور نیک چال چلن اختیار کرلے تو سب گناہ یک قلم معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ ذُنُوْبِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

ف۵ یعنی جو لوگ حق کو مان کر اور سمجھ بوجھ کر منکر ہوئے پھر اخیر تک انکار میں ترقی کرتے رہے، نہ کبھی کفر سے ہٹنے کا نام لیا، نہ حق اور اہل حق کی عداوت ترک کی، بلکہ حق پرستوں کے ساتھ بحث و مناظرہ اور جنگ و جدل کرتے رہے۔ جب مرنے کا وقت آیا اور فرشتے جان نکالنے لگے تو توبہ کی سوجھی۔ یا کبھی کسی مصلحت سے ظاہر طور پر رسمی الفاظ توبہ کہہ لئے یا کفر پر برابر قائم رہتے ہوئے دوسرے اعمال سے توبہ کرلی جنہیں اپنے زعم میں گناہ سمجھ رہے تھے۔ یہ توبہ کسی کام کی نہیں۔ بارگاہ رب العزت میں اس کے قبول کی کوئی امید نہ رکھیں۔ ایسے لوگوں کو سچی توبہ نصیب ہی نہ ہوگی جو قبول ہو۔ ان کا کام ہمیشہ گمراہی کی وادیوں میں پڑے بھٹکتے رہنا ہے۔

ف۶ یعنی دنیا کی حکومتوں کی طرح وہاں سونے چاندی کی رشوت نہ چلے گی، وہاں تو صرف دولت ایمان کام دے سکتی ہے۔ فرض کرو ایک کافر کے پاس اگر اتنا ڈھیر سونے کا ہو جس سے ساری زمین بھر جائے اور وہ سب کا سب پُن خیرات کر دے تو خدا کے یہاں اسکی ذرہ برابر وقعت نہیں نہ آخرت میں یہ عمل کچھ کام =

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۹۱﴾ ع ۱۱/۱۶

ان کو عذاب دردناک ہے اور کوئی نہیں ان کا مددگار ف ۱

دکھ کی مار ہے، اور کوئی نہیں ان کا مددگار۔

خلاصۂ حقیقت اسلام وعدم قبول غیر دینِ اسلام

قَالَ تَعَالٰی: ﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ... الی... وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ﴾

توحید اور رسالت کے بعد دین اسلام کی حقیقت کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں کہ اسلام اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا نام ہے اور یہی تمام انبیاء کا دین ہے اور اسلام ہی تمام کائنات کا دین ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ اسی دین کی دعوت دینے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں جس کی طرف تمام انبیاء دعوت دیتے چلے آئے آخرت کی نجات کا دارومدار یہی دین اسلام ہے اس کے سوا اللہ کے یہاں کوئی دین قبول نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

کیا یہ ① لوگ آنے والے رسول پر ایمان لانے اور اس کی نصرت کا پختہ عہد اور پیمان کرنے کے بعد بھی اللہ کے دین کو چھوڑ کر کسی اور دین کو ڈھونڈتے ہیں اور اپنے عہد وپیمان کا پاس نہیں کرتے کہ جس دین کی وہ رسول دعوت دے رہا ہے اس کو قبول کریں حالانکہ زمین وآسمان کے کل باشندے حق تعالیٰ ہی کے سامنے سر تسلیم ونیاز خم کیے ہوئے ہیں کوئی خوشی سے اور کوئی ناخوشی سے یعنی زبردستی سے اور قیامت کے دن سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

ف:...... احکام کی دو قسمیں ہیں ایک تشریعی جیسے نماز وروزہ جن میں بندے کے اختیار کو دخل ہے اور دوسرے تکوینی جیسے جلانا اور مارنا اور بیمار کرنا۔ احکام تکوینیہ کے تو سب مسخر ہیں کوئی اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا۔ کرھًا سے یہی تسخیری اطاعت مراد ہے اور طوعًا سے احکام تشریعیہ کی اختیاری اطاعت مراد ہے اور خوشی سے اطاعت کرنے والے فرشتے ہیں اور جن اور انس میں ایماندار لوگ ہیں کہہ دیجئے اے محمد ﷺ جس دین کی میں تم کو دعوت دے رہا ہوں وہی تمام انبیاء کا دین ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس چیز پر جو اتاری گئی ہم پر یعنی قرآن پر اور اس چیز پر جو اتاری گئی ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر جن کو خدا نے نبی بنایا اور جن پر خدا کی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے اور اس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دی گئی اور اس چیز پر بھی جو تمام پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی اور ہم انبیاء میں تفریق نہیں کرتے جیسا کہ یہود اور نصاریٰ کا حال ہے کہ کسی کی تصدیق کریں اور کسی کی تکذیب سب خدا کے

= دے گا۔ کیونکہ عمل کی روح ایمان ہے جو عمل روح ایمان سے خالی ہو مردہ عمل ہوگا۔ جو آخرت کی ابدی زندگی میں کام نہیں دے سکتا۔

ف ۱ یعنی اگر فرض کرو کافر کے پاس وہاں اتنا مال ہو اور خود اپنی طرف سے درخواست کرے کہ بطور فدیہ پیش کرے کہ یہ لے کر مجھے چھوڑ دو تب بھی قبول نہیں کیا جا سکتا اور بدون پیش کیے تو پوچھتا کون ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

① اشارہ اس طرف ہے کہ آیت میں ہمزہ استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے اور معطوف علیہ مقدر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے: ایتولون بعد میثاق الایمان والنصرة فغیر دین اللہ یبغون۔ یا تقدیر اس طرح ہے: ایفسقون فغیر دین اللہ یبغون۔

برگزیدہ اور فرستادہ تھے اور سب دین حق پر تھے۔ دین سب کا ایک تھا اور ان کی شریعتوں کے قوانین اور احکام میں جو اختلاف تھا وہ وقتی طور اسی زمانہ اور اس ملک اور اس کے باشندوں کے لحاظ سے تھا اور ہم سب اسی ایک خدا کے خالص فرمانبردار ہیں خالص خدا کی بندگی یہ دین اسلام کا خلاصہ ہے اور جو شخص اسلام کے سوا یعنی اللہ کی خالص بندگی کے سوا کوئی اور دین طلب کرے تو وہ دوسرا دین اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس لیے کہ یہ دین وہ دین نہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہو اور اس کو پسند کیا ہو اور وہ آخرت میں خسارہ والوں میں سے ہوگا یعنی اس کی نجات نہ ہوگی اللہ کے حکم کے سامنے گردن ڈال دینے کا نام اسلام ہے اور یہی تمام انبیاء کرام کا دین اور مذہب ہے اس کے علاوہ کوئی دین قابل قبول نہیں۔

بیان حکم مرتدین:...... اب تک ان لوگوں کا بیان تھا جنہوں نے اسلام میں داخل ہونے سے اعراض کیا اب آئندہ آیت میں ان لوگوں کا بیان ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام سے پھر گئے ایسے لوگوں کو شریعت کی اصطلاح میں مرتد کہتے ہیں پھر یہ مرتدین دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں جو اپنے کفر اور ارتداد پر قائم رہے اور ایک قسم وہ ہے جو تائب ہو کر پھر صدق دل سے اسلام میں واپس آ گئے آئندہ آیات میں دونوں کا بیان آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت اور توفیق اور عنایت سے نوازے جو دل سے ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے اور زبان سے اس شہادت اور اس اقرار کے بعد کہ یہ رسول اللہ کے برحق پیغمبر ہیں اور بعد اس بات کے کہ ان کے پاس آپ کی نبوت اور اسلام کی حقانیت کی واضح دلیلیں اور روشن نشان پہنچ چکے ہیں اسلام سے پھر گئے اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو ہدایت اور توفیق نہیں دیتا کہ اقرار کرنے کے بعد پھر جائیں۔ ایسے لوگوں کو توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی ظالم سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہٹ دھرم اور ضدی ہیں ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں ہوتی ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور تمام فرشتوں کی وہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دور رکھے اور ان پر تمام لوگوں کی لعنت ہے مؤمنین تو صراحۃً کفار پر لعنت بھیجتے ہیں اور کفار بھی حق بات نہ ماننے والے پر لعنت کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس لعنت کا مصداق وہ خود ہیں ہمیشہ رہیں گے اس لعنت میں اور عذاب لعنت میں داخل ہونے کے بعد نہ تو عذاب میں ان سے کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی مگر جن لوگوں نے اس کفر اور ارتداد کے بعد توبہ کر لی اور اپنے ایمان کی اور اعمال اور نفس کی اصلاح کر لی اور خرابی کے بعد اس کو درست کر لیا تو البتہ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول فرما کر ان کے جرم سے درگذر کرے گا ابن عباس ﷺ سے مروی ہے کہ انصار میں ایک شخص تھا اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا پھر نادم ہو کر اپنی قوم سے استدعاء کی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کسی کو بھیج کر دریافت کرو کہ میری توبہ بھی قبول ہو سکتی ہے اس پر یہ آیت ﴿كَيْفَ يَهْدِي اللهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ﴾ تا ﴿غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ نازل ہوئی۔ چنانچہ اس کی قوم نے اس کو بلوایا اور وہ پھر اسلام لایا۔ (نسائی و ابن حبان و حاکم)

تحقیق جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا اور پھر کفر میں بڑھتے گئے اور ترقی کرتے رہے کہ مسلمانوں کے ستانے اور حق کے مٹانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جان بوجھ کر اسلام کی دشمنی پر تلے رہے ایسے لوگوں کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی اس لیے کہ سمجھ بوجھ کر حق کی دشمنی کرنے والوں کو اول تو توبہ ہی نصیب نہ ہوگی جو قبول ہو اور اگر مرنے کے وقت یا اور کسی وقت کسی مصلحت سے ظاہری طور پر رسمی الفاظ توبہ کے محض زبان سے کہہ بھی دے مگر دل حق کی عداوت سے صاف نہ ہوا

تو ایسی توبہ کہاں قابل قبول ہوسکتی ہے اور ایسے ہی لوگ کامل اور پورے گمراہ ہیں جن کے دل حق کی عداوت سے لبریز ہیں اور اگر کسی وقت زبان سے کوئی لفظ توبہ کا نکلتا ہے تو وہ کسی مصلحت کی بناء پر ہوتا ہے جیسے آج کل کی سیاسی توبہ، یہی کمال گمراہی ہے کہ اس گمراہی کے مقابلہ میں گویا کوئی گمراہی نہیں کیونکہ یہ لوگ ایسے گمراہ ہیں جن کی گمراہی سے نکلنے کی کوئی امید نہیں جیسے وہ بیمار جس کے اچھے ہونے کی امید ہو وہ اس بیمار کے مقابلہ میں کیا بیمار ہے جس کے شفاء پانے کی امید ہی نہ ہو تحقیق جن لوگوں نے کفر کیا اور بدون توبہ کے کفر کی حالت میں مرگئے تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ایسے کسی شخص سے روئے زمین کے برابر سونا اگرچہ وہ سونے کی اتنی مقدار کو عذاب کے فدیہ اور معاوضہ میں لا کر پیش بھی کردے اور یہ کہے کہ مجھ کو عذاب سے چھوڑ دو تب بھی نہیں قبول کیا جائے گا اور بدون پیش کیے تو پوچھتا ہی کون ہے یعنی اگر بالفرض والتقدیر کافر کے پاس روئے زمین کے برابر سونا موجود بھی ہو اور بطور فدیہ کے عذاب سے رہائی کے لیے پیش بھی کرنا چاہے تب بھی قبول نہیں چہ جائیکہ خالی ہاتھ ہو اور ایک ذرہ کا بھی مالک نہ ہو تو ایسے کو کون پوچھتا ہے ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہوگا اور کوئی ان کا مدد کرنے والا نہ ہوگا جو ان کو عذاب خداوندی سے بچا سکے۔

ف:...... کافروں کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو کفر سے صحیح توبہ کریں اور اعمال صالحہ اختیار کریں۔ ایسے لوگوں کی توبہ قبول ہے اور ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے دوسرے وہ جو کفر سے توبہ تو کرتے ہیں مگر ان کی توبہ صحیح نہیں ہوتی بلکہ ان کی توبہ فاسد ہوتی ہے مثلاً یہ کہ دل سے توبہ نہ کریں محض زبان سے کسی مصلحت سے الفاظ توبہ کے کہہ دیں یا وقت نکلنے کے بعد توبہ کریں جیسے فرعون نے بالکل ڈوبتے وقت توبہ کی اسی طرح یہ لوگ جو ایسے وقت توبہ کریں جب موت بالکل سامنے آگئی تو ایسے لوگوں کی توبہ مقبول نہیں اس لیے کہ توبہ کی شرط مفقود ہے۔ دل میں ایمان نہیں۔ دل حق کی عداوت اور باطل کی محبت سے لبریز ہے محض زبان سے یا کسی مصلحت سے توبہ کی جارہی ہے یا توبہ کا وقت نکل چکا ہے اور وقت نکلنے کے بعد مجبور ہو کر توبہ کر رہے ہیں۔ اس آیت یعنی ﴿لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ﴾ میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے اور تیسرے وہ کہ جو تمام عمر کفر پر قائم رہے اور دن بدن کفر میں ترقی کرتے رہے اور بالآخر بغیر توبہ کے مرگئے اس آخری آیت یعنی ﴿فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا﴾ الخ میں یہی لوگ مراد ہیں پہلی آیت میں پہلی قسم کے کافروں کا حکم بیان ہوا اور دوسری آیت میں دوسری قسم کے کافروں کا اور اس آخری آیت میں تیسری قسم کے کافروں کا کہ ایسے لوگ اگر بالفرض والتقدیر قیامت کے دن روئے زمین کے برابر سونا بھی عذاب کے فدیہ میں دینا چاہیں تو وہ قبول نہ ہوگا اس لیے کہ آخرت میں ایمان اور اعمال صالحہ قبول ہوں گے مال وزر کی اس دن کوئی حقیقت نہیں۔

الحمد للہ کہ آج بروز دوشنبہ ۱۱ شوال ۱۳۷۸ھ بوقت چاشت شہر لاہور میں تیسرے پارہ کی تفسیر سے فراغت ہوئی۔

فللہ الحمد والمنۃ اللھم وفقنا لاتمام التفسیر وتقبلہ منا وتب علینا فانك انت السمیع العلیم وانك انت التواب الرحیم۔ آمین

سرٹیفکیٹ

قاری محمد اسلام میواتی
چیئرمین نمبر 042
Qari Muhammad Aslam Mewati

تاریخ 10-01-17
حوالہ نمبر 43

سرٹیفکیٹ تصحیح

"الحمدللہ بندہ قاری محمد اسلام نے "مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ" اردو بازار لاہور سے شائع کی جانے والی تفسیر "معارف القرآن مع تفسیر عثمانی" جلد اوّل کے عربی متن، ترجمہ کو حرف بحرف بغور پڑھا ہے۔ اور میں تصدیق کرتا ہوں کہ اب اسمیں کوئی لفظی و اعرابی غلطی نہیں ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ

قاری محمد اسلام
رجسٹریشن نمبر 042
رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمہ اوقاف حکومت پنجاب پاکستان
0306-6628331

10-01-17

قطر الیم

فی

تفسیر پارہ عم

محدث دوراں، ولی کامل، حکیم العصر

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید صاحب رحمۃ اللہ علیہ

امیر مرکزی عالمی مجلس تحفظ ختم نبوۃ

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑپکا

ترتیب جدید

انیس احمد مظاہری

استاذ الحدیث مدرسہ احسان القرآن والعلوم النبویہ لاہور

ناشر

مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ

29L.G حادیہ حلیمہ سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار

042-37242117,0321-4102117

Emial:maktabah.hr@gmall.com

صحاح ستہ، تاریخ طبری، تاریخ الکامل، تاریخ مسعودی، تاریخ ابوالفداء
تاریخ ابن خلدون، تاریخ الخلفاء وغیرہ کا مابہ الاشتراک اور خلاصہ

تاریخ اسلام

حصہ سوم

مؤرخ اسلام

علامہ اکبر شاہ خان

نجیب آبادی

احوال مصنف ○ ڈاکٹر محمد ایوب قادری ○ تحقیق وتخریج محمد ابو اسامہ زید دعمی

مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ

29LG ہال حلیمہ سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

042-37242117-0332-4377621

Email:maktabah.hr@gmail.com

دنیا و آخرت کی انمول دولت

تسکین قلب

کے لیے ایک مفید کتاب

سکونِ قلب

افادات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

قاری محمد طیب صاحب قاسمی

عارف باللہ حضرت عبدالحی عارفی رحمہ اللہ

مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ اُردو بازار لاہور ۰۳۳۳-۴۳۷۷۶۲۱
۰۳۲۱-۴۱۰۲۱۱۷

معارف القرآن اور تفسیر عثمانی ایک نظر میں

جلد اول
پارہ
۱ ۲ ۳
سُورۃ الفاتحۃ
تا
سُورۃ آل عمران

جلد دوم
پارہ
۴ تا ۷
بقیہ
سُورۃ آل عمران
تا
سُورۃ الانعام

جلد سوم
پارہ
۸ تا ۱۱
بقیہ
سُورۃ الانعام
تا
سُورۃ یونس

جلد چہارم
پارہ
۱۲ تا ۱۵
سُورۃ ھود
تا
سُورۃ الکہف

جلد پنجم
پارہ
۱۶ تا ۱۹
بقیہ
سُورۃ الکہف
تا
سُورۃ النمل

جلد ششم
پارہ
۲۰ تا ۲۳
بقیہ
سُورۃ النمل
تا
سُورۃ الصافات

جلد ہفتم
پارہ
۲۳ تا ۲۷
سُورۃ ص
تا
سُورۃ الحدید

جلد ہشتم
پارہ
۲۸ ۲۹ ۳۰
سُورۃ المجادلۃ
تا
سُورۃ الناس